
نیا دور



عنوانات

عنوان	مصنف	صفحہ
اپنی بات	ایڈیٹر	۲
نظمیں	اختر الایمان	۳
پانچویں سواروں میں ہم بھی (خودنوشت)	وجاہت علی سندیلوی	۴
قطعہ	حباب ہاشمی	۹
امبیدکر: احساس وفکر (نظم)	رباب رشیدی	۱۰
اکبر کی علامت سازی	نیر مسعود	۱۱
ہندوستان کا شاعر یکتا چلا گیا (نظم)	حفیظ بنارسی	۱۹
عہد نو کا عظیم المرتبت انسان	صلاح الدین عثمان	۲۰
غزل	عذرا پروین	۲۴
غزلیں	مظفر حنفی	۲۵
	اقبال ماہر	۲۵
علم روشنی ہے تو ناخواندگی اندھیرا	سراج حسین	۲۶
دھواں (نظم)	تسنیم فاروقی	۳۱
میخانہ (نظم)	منظور العباس	۳۱
لال پان کی بیگم (افسانہ)	بنت مسعود	۳۲
میرے جانے کے بعد (نظم)	خورشید عالم	۳۹
سورج ۔ پانی (نظمیں)	سید نظام علی	۳۹
تین نظمیں	قمر ادیب	۳۹
بہترین مذاق (افسانہ)	احمد نسیم صدیقی	۴۰
غزلیں	افتخار احمر ۔ سید عبدالستار ۔ اختر لکھنوی	۴۲
	ثریا خان ۔ اسرار حسین آسر ۔ راشد حسین بسوانی	۴۲
نقد وتبصرہ ـــــــــ	عمر انصاری ۔ راجندر بہادر موج خلیل اللہ خاں ۔ بشیر فاروقی ۔ مضطر انصاری ۔ سلیم عمر ۔ نظر محمود	۴۳
غزلیں ـــــــــ	دائم الایمان ۔ فیروز جبین	۴۶
نصف صدی نمبر تاثرات کے آئینے میں		۴۷

اپنی بات

ہندستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور وفاقی نظام کے تحت یہاں صوبہ اور مرکز کا اقتدار انتخابات کے ذریعہ سے عوام کے منتخب نمائندوں کو تفویض کیا جاتا ہے۔ اس جمہوری نظام نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور پنچایتی راج کے تحت اقتدار کی لامرکزیت وجود میں آئی۔

یوں تو جمہوریت کے بارے میں افلاطون سے لے کر اسپنڈل تک ہر طرح کے نظریات اور تصورات ملتے ہیں لیکن جمہوریت کا عملی تصور گزشتہ دو سو برس سے امریکہ میں بھرپور طریقے سے نظر آیا ہے اور لنکن کا یہ قول کہ "عوام کے ذریعہ، عوام کے واسطے، عوام کی حکومت" اعلیٰ ترین نظام جمہوری کا نصب العین پیش کرتا ہے۔ یوں تو دنیا کے بیشتر ممالک میں اب جمہوری نظام قائم ہے۔ مگر ہر پھول کا رنگ جدا ہے۔ کہیں تحریری دستور، کہیں روایات پر مبنی نظام، کہیں صدارتی طرز ــــ لیکن ہمارے ملک کے آئین سازوں نے ہندستانی جمہوریت کے جو خدوخال مقرر کیے وہ منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جس میں مکمل شخصی آزادی کا اس طرح اہتمام ہے کہ وہ دوسرے کی آزادی سے متصادم نہیں ہوتی۔

اپریل کا مہینہ بہت یادگار انداز میں انتخابات کے انعقاد کے پس منظر کا مہینہ تھا۔ اس مہینے کی دو باتیں اور بھی اہم ہیں پہلی بات تو ہندستانی آئین ــــ جس کا ایک اہم ترین رخ الکشن ہے، جس کے دستور سازوں میں بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بھی تھے اور ان کا یوم پیدائش اپریل میں ہی تھا۔ ہندستانی آئین کے مسودہ کی تیاری کمیٹی کے وہ سربراہ تھے اور انھوں نے اس آئین کی تیاری میں ہندستانی زندگی کے مستقبل کے لیے عظیم خدمت انجام دی تھی۔ ادارہ خراجِ عقیدت کے پھول بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔

اسی اپریل کے مہینے میں جلیان والا باغ کا دردناک سانحہ پیش آیا تھا جس میں امرت سر کی مقدس سرزمین پر ہزاروں ہندستانیوں کا ملا ہوا خون عظیم روشنی کا مینار بن گیا تھا۔ اس خون میں نہ ہندو رنگ تھا، نہ مسلمان، نہ سکھ، نہ عیسائی۔ نہ عورت نہ مرد ــ بلکہ اس خون کا صرف ایک ہی رنگ تھا اور اس رنگ کا نام تھا "ہندستانی" ــــ عظیم فرانسیسی مفکر کے لفظوں میں "کوئی قوم ماضی کی عظیم قربانیوں سے وجود میں آتی ہے"۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی یہی قربانی ہندستانی قوم کا روشن مستقبل بن گئی ہے۔!

ادارہ نیا دور ان تمام شہیدوں کی یاد کو سلام کرتا ہے جنھوں نے گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لیے آزادی و جمہوریت کی روح کو زندگی عطا کی۔

اپریل کے مہینے کی ایک یہ بھی خصوصیت رہی ہے کہ ہماری عظیم ہندستانی تہذیب کی وسیع النظری، باہمی احترام اور مذہبی رواداری کے تین نمونے اسی مہینے میں نظر آئے۔ سب سے پہلے تو عیسائیوں کا مقدس مذہبی تہوار "گڈ فرائی ڈے" جسے ایسٹر بھی کہتے ہیں۔ پھر بیساکھی کا تہوار بھی اسی اپریل میں ہوا جب ۱۶۹۹ء میں گرو گوبند سنگھ جی نے "خالصہ پنتھ" کا اعلان کیا ــــ اور اسی اپریل میں عید قرباں کا تہوار بھی ہے، جسے حج کے مقدس مذہبی فریضہ کے طور پر ہر سال لاکھوں مسلمان بجا لاتے ہیں اور خود ہمارے صوبے سے ہزاروں کی تعداد میں حج سے مشرف ہونے والے خوش قسمت افراد ہوتے ہیں۔

ادارہ ان سب تہواروں کے پرامن اور خیروخوبی سے منائے جانے پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

ـــــــــــ ایڈیٹر

مشہور شاعر اختر الایمان مرحوم کی زندگی میں میں نے نیا دور کے لئے ان سے کچھ نظموں کی درخواست کی تھی جو علالت کے سبب ان کی حیات میں تو مجھے نہیں مل سکیں لیکن انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ سلطانہ ایمان سے کہا تھا کہ وہ نیا دور کو ان کی نظمیں ضرور بھیج دیں۔ مرحوم کی اہلیہ نے ان کے انتقال کے بعد یہ دونوں نظمیں بھیجی ہیں جو قارئین کے لیے پیش ہیں۔ کاش کہ اختر الایمان زندہ ہوتے اور نیا دور میں اپنی چھپی ہوئی نظمیں خود پڑھتے۔

ــــــــــ ایڈیٹر

نروان

حواس بھی مجتمع ہوں سارے
دماغ بھی جاگتا ہو دل بھی
تمام سپتک کے سُر ملا کر
مراقبے میں ہو رُوحِ کُل بھی
کدورتیں ساری دھو کے اپنی
سکوں طلب جانِ مضمحل بھی
عظیم پیکر سا بن گئی ہو
جو تلملاتی کراہتی ہو
جو لمحہ لمحہ یہ چاہتی ہو
کوئی ہٹا دے نگاہ کے سامنے سے پردے
کوئی اچانک حیات کے بھید کھول ڈالے

(۱۷ر دسمبر ۱۹۹۱ء)

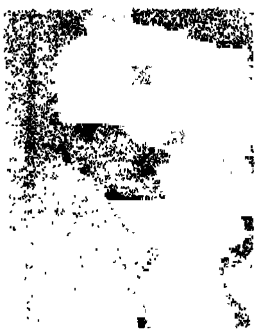
نقلِ مکان

کلی کھلی تھی اسی واسطے کہ پھول بنے
مہکتے پھول کو تم سے مشابہت دے دوں
تمھاری چاہ مرے کتنے کام آئی ہے
تمھارے قرب کی ضد ہے، موانست دے دوں
فضائے دہر کے بگڑے ہوئے مزاج کو میں
سکون چاہتی تھیں ساری مضطرب رُوحیں
مگر وہ دستِ شفا، سب کی احتیاج کو میں
سکون دے دوں، مری دسترس سے باہر ہے
کوئی وسیلہ نہیں میرے پاس درماں کا
یہ التجا ہے خدا سے توجہ فرمائے
فلک سنبھال چکا اب زمیں پہ آ جائے

(۱۸ر اگست ۱۹۹۱ء)

اختر الایمان

اے ۳، روی درشن۔ کارٹر روڈ۔ باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰



وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل۔ سندیلہ (ہردوئی)

پانچویں سواروں میں ہم بھی

مجھ پر سب سے زیادہ گہرا اثر میرے والد چودھری عشرت علی صاحب مرحوم کی شخصیت کا پڑا۔ مثبت بھی اور منفی بھی۔ ان کا شمار قصبہ سندیلہ کے بڑے زمینداروں میں ہوتا۔ سات لڑکیوں کے درمیان میں ان کا اکیلا لڑکا تھا۔ وہ بڑے وجیہ، خوش اخلاق اور خوش باش انسان تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے اور کسی ضرورت مند کے کام آنے میں وہ حتی الوسع کبھی دریغ نہ کرتے۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ مجلس آرائی اور مہمان نوازی کا انھیں بڑا شوق تھا۔ آئے دن دعوتیں کرتے رہتے۔ ہر صبح و شام ان کی کوٹھی کے برآمدے میں دس بارہ افراد جمع ہوتے اور چائے ناشتے، شربت، حقے اور پان کا دور چلتا۔ فصل پر آموں کی بھی ضیافت رہتی۔ ان نشستوں میں زیادہ تر قصبے کے ذی علم حضرات، شعراء، خاندانی افراد اور زمیندار طبقے کے بے فکر لوگ ہوتے۔ گفتگو کا سلسلہ چھڑتا تو دنیا جہان کا ہر موضوع مثلاً مذہب، تفسیر، فقہ، علم و ادب، فلسفہ، سیاست، تاریخ، شعر و شاعری، نئی ایجادیں، کوئی غیر معمولی مقامی واقعہ وغیرہ زیرِ بحث آتے اور ان پر بڑی آزادی سے تبادلۂ خیال ہوتا لیکن بڑے سنجیدہ انداز میں۔ کبھی کسی کی آواز بلند نہ ہونے پاتی۔ خود والد مرحوم کو اپنے خاندانی بزرگوں اور دیگر تعلقہ داروں کے (میرے دادا چودھری نصرت علی صاحب ایک عرصۂ دراز تک انجمن تعلقہ داران اودھ کے سکریٹری رہے تھے)۔ بہت سے دلچسپ واقعات یاد تھے اور وہ انھیں بہت پرلطف انداز میں سنایا کرتے۔ میں ان محفلوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتا اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

میں یکم مارچ ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوا۔ والد مرحوم نے بڑے ناز و نعم سے میری پرورش کی۔ ۲۴ مئی ۱۹۲۴ء کو میری والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ مجھے اور میں انھیں بہت چاہتا تھا۔ وہ مجھے دنیا کی سب سے زیادہ اچھی لگتی تھیں، ان کی دائمی مفارقت آٹھ برس کی عمر میں، میرے لیے ایک سانحۂ عظیم تھا۔ میں اچانک جس درد و غم سے دوچار ہو گیا تھا اس کی کسک آج اس بڑھاپے میں بھی محسوس کرتا ہوں اور جب کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہوں تو مجھے اپنی "آپا" یاد آجاتی ہیں۔ والد مرحوم یوں ہی مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتے اور والدہ مرحومہ کے بعد یہ التفات اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن ماں کی ناوقت جدائی سے مجھ میں جو ایک احساسِ محرومی پیدا ہو گیا تھا، اس کی کبھی کوئی تلافی نہیں ہو سکی۔ بچپن کی یہ دردمندی اور غم آشنائی میری فطرت ثانیہ بن گئی۔ دانستہ کسی کی دل آزاری کرنا تو بہت دور کی بات ہے میں اگر کبھی کسی سے زور سے بول بھی دیتا ہوں تو مجھے بڑی ندامت ہوتی ہے۔

والد مرحوم کو اپنی جائداد کے انتظام سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ صرف اس کی آمدنی خرچ کرنا جانتے۔ سارا کاروبار ضلع داروں اور اہل کاروں کے ہاتھوں میں تھا جن میں دو ایک کو چھوڑ کر سبھی خود غرض اور موقع شناس تھے اور انھوں نے والد مرحوم کی سادہ لوحی کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اپنی غیر معمولی داد و دہش، شاہ خرچیوں اور سات لڑکیوں کی شادیاں کرنے کے سلسلے میں والد مرحوم پر کافی قرضہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۰ء سے قبل جب تک میں نے سندیلے میں آکر وکالت شروع نہیں کی تھی وہ اکثر کافی پریشان کن مالی مشکلات میں مبتلا ہو جایا کرتے لیکن میں نے ان کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہیں پائی اور انھیں ہمیشہ ہشاش بشاش پُرامید اور زندہ دلی سے بھرپور دیکھا۔ وہ بڑے رجائیت پسند تھے۔

انھوں نے آج کے سامنے کل کی کبھی فکر نہ کی۔ مشکلوں اور پریشانیوں سے وہ
کبھی ہراساں نہیں ہوئے اور آخر دم تک ان کی آن بان اور زندگی کے
طور طریقوں میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

والد مرحوم کے کردار اور شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔
ان کی بعض باتیں مجھے غیر ذمہ دارانہ اور ناعاقبت اندیش محسوس ہوئیں
لیکن اس حیثیت سے میں نے انھیں اپنا ہیرو سمجھا کہ انھوں نے کبھی
زندگی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ ہمیشہ خود اس پر حاوی رہنے
کی کوشش کی۔ ان کی سب سے بڑی دین میرے لیے یہ تھی کہ وہ مجھ سے
ایک شفیق باپ کی طرح محبت کرنے کے علاوہ مجھ پر غیر معمولی طور سے
بھروسا اور میری رائے کا احترام کرتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ عام
طور سے ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا نہیں کرتا اور دونوں کے
درمیان مغائرت کی دیوار اٹھنا شروع ہو جاتی ہے۔ والد مرحوم کا
بھروسا میرے لیے ہمیشہ اس بات کا محرک رہا کہ میں ان کی توقعات
پر پورا اتروں۔ مجھے فخر ہے کہ اپنے انتقال ۱۳ر جنوری ۱۹۵۲ء سے صرف
ایک روز قبل انھوں نے میری غیبت میں اپنے چند اعزا اور احباب سے
جو عیادت کے لیے آئے ہوئے تھے کہا "میرے سو لڑکے بھی ہوتے
تو مجھے وہ لطف اور طمانیت نہیں دے سکتے جو مجھے ایک تنہا لڑکے
سے حاصل ہے۔"

چار برس اور کچھ مہینوں کی عمر سے میری تعلیم کا آغاز بغدادی
قاعدے اور اس کے بعد کلام پاک سے ہوا۔ کلام پاک ختم ہونے
کے بعد مجھے اُردو، ریاضی اور انگریزی پڑھانے کے لیے اسٹر صاحبان
کی خدمات حاصل کی گئیں۔ والد صاحب کئی برسوں تک میونسپل بورڈ
سندیلہ کے چیرمین رہ چکے تھے وہ اس وقت کے اسکولوں کی تعلیم و
تربیت اور ماحول سے غیر مطمئن تھے لہٰذا انھوں نے مجھے ان اسکولوں
میں نہیں بھیجا۔ انھوں نے انگریزی اخباروں میں اشتہار دے کر میرے
لیے اتالیق بلوایا۔ اس حیثیت سے بشیر احمد صاحب، بی اے (علیگ) نے کئی
سال تک میرے گھر پر رہ کر مجھے پڑھایا۔ ریاضی سے انھیں زیادہ
دلچسپی نہیں تھی لیکن انگریزی میں انھوں نے مجھے بہت رواں کر دیا۔
میں نے سندیلہ انگریزی اسکول میں صرف ایک سال تعلیم حاصل
کی۔ یہاں سے آٹھواں درجہ پاس کرنے کے بعد میرا داخلہ لکھنؤ کرسچین
کالج میں کرادیا گیا۔ وہاں سے میں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے
امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے میں نے بی اے
اور ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ سات آٹھ ماہ کی ٹریننگ لینے کے بعد میں نے
۱۹۴۰ء میں سندیلہ میں اپنی وکالت کا آغاز کر دیا۔

کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران، جہاں تک کورس کی کتابوں
کا تعلق تھا، میں صرف ایک اوسط درجے کا طالب علم رہا۔ نہ کسی امتحان
میں فیل ہوا اور نہ کبھی سکنڈ ڈویژن سے آگے بڑھ سکا۔ البتہ کورس
سے باہر کی کتابوں کے متعلق خصوصاً سیاست، سوشلزم، کمیونزم اور
نفسیات وغیرہ کے موضوعات پر میرا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی
رسالے اور ناولیں پڑھنے کا مجھے خاص شوق تھا۔ کالج اور یونیورسٹی
میں اگرچہ اردو ادب میرا مضمون نہیں تھا لیکن میں نے ایم۔ اے کے
کورس تک کی سب کتابیں محض اپنے ذوق سے پڑھ ڈالی تھیں۔
اور اپنے اُردو پڑھنے والے ساتھیوں سے اُردو کے شاعروں اور
ادیبوں کے سلسلے میں کلّا بہ کلّا بحث کیا کرتا۔ میری غالب سے دلچسپی
اسی زمانے میں شروع ہوئی۔

کرسچین کالج میں جب میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں
تھا تو مجھے معلومات عامہ کے ایک صوبائی مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا۔
یونیورسٹی میں بھی ایک کل ہند مضمون نویسی کے مقابلے میں، میں نے
انعام حاصل کیا تھا۔ میں یونیورسٹی یونین کے مباحثوں میں بڑی تیاری
اور سنجیدگی سے حصہ لیتا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے مناظرے کی حیثیت سے
میں نے الٰہ آباد، علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹی کے کل ہند مباحثوں میں
شیلڈ اور انعامات حاصل کیے تھے۔ ان مباحثوں میں میرے ساتھی
رحمت اللہ انصاری (فرنگی محلی) ہوا کرتے اور ہماری ٹیم شاید ہی کبھی کسی
مقابلے سے بغیر انعام لیے واپس آئی ہو۔ انعام اگر دونوں کو نہیں ملتا
تو ہم میں سے ایک کو ضرور ملتا۔

مجھے اپنے ہم مذاق دوستوں کے ساتھ باتیں کرنے اور
طلبا کی تحریکوں میں پیش پیش رہنے کا بڑا شوق تھا اور بہت جلد
کالج اور یونیورسٹی میں میرا شمار نیتاؤں کے زمرے میں کیا جانے لگا

چونکہ میں تقریر کرنے میں بھی مہارت رکھتا تھا لہٰذا میرے ساتھی طلبا، بھی مجھے آگے رکھنے کی کوشش کرتے ۔ فرقہ واریت کا زہر پھیلنا شروع ہو چکا تھا لیکن کم از کم طلبا میں قوم پرور عناصر کا پلّہ بھاری تھا۔ میں کرسچین کالج یونین کا ۱۹۳۳ء میں سکریٹری اور لکھنؤ یونیورسٹی یونین کا ۱۹۳۸ء میں وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ یونیورسٹی پارلیمنٹ میں جب سوشلسٹ پارٹی برسر اقتدار آئی تو میں وزیر داخلہ مقرر کیا گیا ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا میں جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوا۔ اسی زمانے میں تعلیمی حلقے سے باہر بھی میری سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جب ۱۹۳۷ء میں اسمبلی کے عام انتخابات ہوئے تو میں اپنی تحصیل کے کانگریسی امیدوار شانتی سروپ جی کا الکشن انچارج بنا اور ان کی حمایت میں دیہات کا دورہ کیا اور جلسوں، جلوسوں میں شرکت کی۔ میرا پورا خاندان نیشنل ایگری کلچرسٹ پارٹی کے امیدوار راجہ صاحب ہتھورا کی مدد کر رہا تھا شانتی سروپ جی تو جیت گئے لیکن میں نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ قصبے کے دوسرے مسلم زمینداروں کے خاندان میں ایک گمراہ نوجوان سمجھا جانے لگا۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت کی مخالفت اور کانگرس میں شمولیت خصوصاً مسلم زمینداروں سے تعلق رکھنے والے ایک فرد کے لیے ایک بڑی انہونی بات سمجھی جاتی ۔

والد مرحوم نے بھی اگرچہ وہ تحریک خلافت کے زمانے کے قوم پرور تھے، میری کھدّر پوشی اور بقول ان کے "سڑک کی سیاست" پر اظہار ناراضگی کیا ۔ البتہ میرے چچا زاد بھائی اور بہنوئی چودھری سطوت علی صاحب نے نہ صرف میری ہمنوائی کی بلکہ دوش بدوش میرے ساتھ رہے۔ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے سے قبل والد مرحوم کی لاعلمی میں کانگرس کی سبجکٹ کمیٹی کا ممبر بن کر میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ۱۹۳۶ء کے سالانہ اجلاس میں جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی تھی، شریک ہو چکا تھا۔ پنڈت جی کے خطبہ صدارت نے میرے جیسے نوجوانوں میں ملک کی آزادی کے لیے ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا ۔

رفیع احمد قدوائی مرحوم کی تحریک پر ۱۹۳۸ء میں جب میں وکالت کے دوسرے سال کا طالب علم تھا، پنڈت نہرو نے صوبہ کانگرس کے دفتر میں مسلم عوام رابطہ کمیٹی کے شعبے کا انچارج بنا دیا تھا۔ اس شعبے کا کام مسلم عوام تک کانگریس کا پیغام پہونچانا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ضلع کانگرس کمیٹیوں کو ہدایتیں بھیجنا پڑتیں اور مختلف مسلم آبادی کے حلقوں میں مختلف لیڈروں سے مشورہ کر کے ان کے دورے کے پروگرام مرتب کرنا پڑتے ۔ میری تحریک پر صوبہ کانگریس کے دفتر سے اُردو میں ایک پندرہ روزہ خبر نامہ بھی شائع ہونے لگا تھا۔ اس کا ایڈیٹر میں ہی تھا۔ پنڈت نہرو جب بھی صوبہ کانگریس کے دفتر آتے میرے شعبے کے کام کا جائزہ ضرور لیتے ۔ اور بڑی دلچسپی سے نئے نئے مشورے دیتے ۔

۱۹۴۰ء میں جب دوسری جنگ عظیم کے دوران صوبے کی کانگریسی حکومت نے استعفا دیا تو برطانوی گورنر کے حکم سے صوبہ کانگریس کمیٹی کا پورا دفتر پولیس کی تحویل میں آ گیا اور میرا شعبہ بھی ختم ہو گیا۔

اسی زمانے میں، میں نے مدینہ بجنور، الجمعیۃ دہلی، ہندوستان لکھنؤ اور دیگر قوم پرور اخباروں میں بہت سے سیاسی مضامین فرقہ وارانہ جماعتوں اور برطانوی سامراج کے خلاف اور ملک کی آزادی کی حمایت میں لکھے ۔ میں نے ایک کتابچہ 'غریب مسلمان کدھر جائیں' بھی اسی دور میں لکھا تھا۔ مسلم قوم پرور حلقوں میں اس کو کافی پسند کیا گیا۔ جب اس کتابچے کو قسط وار روزنامہ ہند کلکتہ نے شائع کرنا شروع کیا تو حکومت بنگال نے نہ صرف اس کے شمارے ضبط کر لیے بلکہ اخبار سے ضمانت طلب کر لی ۔

۱۹۴۰ء میں جب گاندھی جی نے 'بھارت چھوڑو' کی انفرادی ستیہ گرہ شروع کی تو ستیہ گرہ کرنے کے لیے میں نے بھی اپنا نام پیش کر دیا ۔ والد مرحوم کے اس زمانے میں پیر میں زہر باد کا پھوڑا نکل آیا تھا ۔ انھیں جب میرے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن گاندھی جی کو براہ راست ایک خط میں مجھے ستیہ گرہ سے منع کرنے کے لیے لکھا ۔ گاندھی جی کی جانب سے کماری امرت کور نے جواب دیا کہ ذاتی حالات کی بنا پر میرے لیے یہی بہتر

ہوگا کہ جیل نہ جاؤں اور باہر ہی رہ کر کانگریس کے اصلاحی پروگرام پر عمل پیرا رہوں اور ایک قلم کار کی حیثیت سے گاندھی جی کا پیغام زیادہ سے زیادہ عوام تک پہونچاؤں۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک میں نے ملک کی آزادی، قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر بہت سے مضامین لکھے۔

۱۹۹۲ء میں ان مضامین کی بنا پر حکومت اترپردیش نے مجھے جنگ آزادی میں حصہ لینے والے صحافی کی حیثیت سے ایک توصیفی سند، شال اور بیس ہزار روپے نقد عطا کیے اور مجاہدین آزادی کو دی جانے والی دوسری سہولتوں سے بھی نوازا۔ اُردو کے صحافیوں میں ریاست بھر میں یہ انعام صرف چند ہی لوگوں کو دیا گیا ہے۔

میری شادی ۷ ارمارچ ۱۹۳۹ء کو جب کہ میں نے ایل ایل بی (فائنل) کا امتحان بھی نہیں دیا تھا اور اس میں دو ہفتے باقی تھے، سعیدہ بیگم بنتِ شیخ محمودُالحق صاحب رئیس گورکھپور کے ساتھ ہوگئی۔ میری پانچ اولادیں ہیں۔ نہال عظمت ایڈوکیٹ، نجمہ یونس جمال، نصرت سپرنٹنڈنگ انجینیر، ڈاکٹر صبیحہ انور (صدر شعبہ اردو کرامت حسین گرلز ڈگری کالج لکھنؤ) اور نگار شکیل (بھوپال)

میری وکالت کی مصروفیتیں بڑھیں اور ۱۹۵۲ء میں زمینداری کا خاتمہ اور ۱۹۵۳ء میں والد مرحوم کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا، تو میری ذمہ داریوں میں بڑا اضافہ ہوگیا۔ میں نے اپنی زندگی کے بیس، پچیس سال بڑی سرگرمی سے عملی سیاست میں گزارے، دورے کیے، جلسے کرائے، جلوس نکالے، تنظیمیں بنائیں، الیکشن لڑائے، تقریریں کیں، پمفلٹ لکھے۔ غرض کہ اس سے متعلق سبھی پاپڑ بیلے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں خوش نصیب تھا جو میں نے اپنی مادرِ وطن کو دنیا کے سب سے بڑے سامراج کی غلامی سے آزاد ہوتے دیکھا، اور یہ میری مزید خوش نصیبی تھی کہ اس سلسلے میں ملک کے عوام نے جو جد و جہد کی اور جو ہفت خواں طے کیے اس میں اپنی بساط بھر مجھے بھی کچھ حصہ لینے کا موقع ملا۔

زندگی لاکھ ہو اک رقصِ شرر کی فرصت
کم نہیں ایک ہی لمحے کا اُجالا کرنا

نومبر ۱۹۵۳ء میں نگر مہاپالیکاؤں کے جو انتخابات ہوئے اس میں براہ راست عوامی انتخاب میں نگر پالیکا سندیلہ کا میں پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ بارہ ہزار میں نو ہزار سے بھی زیادہ ووٹ مجھے ملے۔

میری پریسیڈنسی کے زمانے میں پہلی دفعہ قصبے کی صدر سڑک سیمنٹ کی بنی، واٹر ورکس جاری ہوا، بجلی آئی اور رفیع احمد قدوائی لائبریری اور مطالعہ گھر قائم ہوا۔ جب ۱۹۵۸ء میں میرے عہدے کی مدت ختم ہوئی تو کانگریس نے از خود مجھے دوبارہ پریسیڈنسی کے لئے ٹکٹ دیا لیکن میری وکالت کی مصروفیتیں اتنی زیادہ بڑھ چکی تھیں کہ میرے لیے اس کا قبول کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً میں نے معذرت کرلی، اور اسے شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ اس کے بعد میں قصبے کی مختلف سماجی اور ثقافتی انجمنوں اور اداروں کا صدر یا سرپرست منتخب ہوتا رہا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ میں بار ایسوسی ایشن سندیلہ کا چار مرتبہ پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ اب سرپرست بنادیا گیا ہوں۔

لکھنے کا شوق مجھ میں بچپن ہی سے پیدا ہوگیا تھا۔ والد مرحوم کئی اخبار اور رسالے منگاتے۔ میں انھیں پڑھتا۔ خصوصاً ان کے افسانے اور معلوماتی مضامین پڑھ کر میرے ذہن میں بھی کردار اور پلاٹ کلبلانے لگتے اور جی چاہتا کہ میں بھی کچھ لکھوں لیکن "من چلتا ٹٹو نہیں چلتا" کا مضمون تھا۔ اظہارِ پُرخاطر خواہ قدرت نہیں تھی۔ لہٰذا دل کی دل ہی میں رہ جاتی۔ پھر بھی میں کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا سب سے پہلے پہل کرسچین کالج کی میگزین میں میرا ایک بہت مختصر افسانہ 'چوری' شائع ہوا۔ پھر جب میں یونیورسٹی میں تھا تو میرے کچھ افسانے ہفتہ وار پیغام لکھنؤ میں چھپے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش بڑھی اور ملک کی آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو میں سنجیدہ سیاسی مضامین لکھنے لگا اور یہ سلسلہ خاصی پابندی سے حصول آزادی تک جاری رہا۔

۱۹۴۵ء میں جب روزنامہ قومی آواز لکھنؤ جاری ہونے جارہا تھا تو رفیع احمد قدوائی مرحوم اور حیات اللہ انصاری صاحب کے اصرار پر میں اپنی اچھی بھلی وکالت چھوڑ کر اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگیا۔ اس کا مزاحیہ کالم پابندی سے میں ہی لکھتا۔

میرا بھی صحافت میں دل لگ گیا تھا کیوں کہ اس وقت ملک ایک تاریخی اور انقلابی دور سے گزر رہا تھا اور ملک کی آزادی اور ملک کی تقسیم کے سنسنی خیز قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن ایک سال کے اندر ہی والد مرحوم کے حکم کی تعمیل میں قومی آواز کی جوائنٹ ایڈیٹری سے مستعفی ہو کر میں سندیلہ واپس آ گیا اور پھر وکالت کی چکی پیسنے لگا۔

اس طرح ۱۹۵۲ء میں میں منصفی کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا، ٹریننگ اور تعیناتی کا حکم بھی آ گیا تھا لیکن والد مرحوم کی مرضی نہ پا کر اور ان کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر میں نے چارج لینے سے پہلے ہی استعفا بھیج دیا۔ اس وقت یہی محسوس ہوا کہ سیاست، صحافت اور ملازمت سے محروم کر کے والد صاحب مجھ پر کوئی جبر کر رہے ہیں لیکن آج میں یہ اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ انھوں نے جو سوچا وہی میرے لیے بہتر تھا اور میری صلاحیتوں کے مدنظر وکالت ہی میرے واسطے سب سے مناسب وسیلۂ معاش ہو سکتا تھا۔ اکثر جب یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں ہائی کورٹ وغیرہ کی بڑی عدالتوں میں وکالت کرتا۔ تو میں اس کا نعم البدل یہ سمجھ لیتا ہوں کہ سندیلے میں رہ کر مجھے اپنے والد کی خدمت اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آج کل کے نوجوانوں کو شاید اس قسم کے پرانے اخلاقی اقدار کے سمجھنے میں دشواری ہو۔

وکالت کی مصروفیتوں کے درمیان میں نے بہت سے سنجیدہ اور مزاحیہ افسانے لکھے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے علمی اور تنقیدی مضامین، تاثراتی خاکے اور انشائیے بھی کافی لکھے۔

میرے افسانے اور مضامین ملک کے مشہور اور موقر اخباروں اور رسالوں میں مثلاً ساقی دہلی، کلیم دہلی، نیرنگ خیال لاہور، بیسویں صدی دہلی، شمع دہلی، شاہراہ دہلی، نیا ادب لکھنؤ، ادب لطیف لاہور، ہندستان لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

میرے مزاحیہ افسانوں، انشائیوں، خاکوں اور مضامین کی جو رسالوں میں چھپے یا ریڈیو سے نشر ہوئے، مقابلتاً زیادہ پذیرائی ہوئی لہٰذا مزاح نگاری میری خصوصی شناخت بن گئی۔ جلسوں اور سیمناروں میں ایک مزاح نگار ہی کی حیثیت سے میں مدعو کیا جانے لگا۔

شاعری سے مجھے بچپن ہی سے لگاؤ تھا لیکن عام شعراء کی ناقدری دیکھ کر میں اپنا یہ ذوق دبائے رکھتا۔ صرف کبھی کبھی کچہری کی مصروفیت کے درمیانی وقفے میں شعر کہتا اور وہ بھی اپنے ایک شاعر دوست جو وکیل بھی ہیں، کو سنانے یا چڑانے کے لیے۔ اس قسم کے کلام کی میں نے کوئی یادداشت نہیں رکھی۔ البتہ ۱۹۸۰ء سے میں باقاعدہ شعر کہنے لگا۔ میں نے نہ اپنا کوئی تخلص رکھا ہے اور نہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کی کوشش کی ہے البتہ میرا کلام بعض اہم رسالوں مثلاً آج کل دہلی، نیا دور لکھنؤ، شاعر بمبئی، کتاب نما دہلی، بیسویں صدی دہلی، ایوان اردو دہلی، عصری ادب دہلی وغیرہ میں شائع ہو چکا ہے اور میری غزلوں کے مجموعے "روشنی" پر اتر پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۸۸ء میں دو ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔

ایک سیاسی کتابچے کے علاوہ میری ادبی مطبوعہ تصنیفات کی تعداد بیس ہے جن میں مزاحیہ افسانوں، انشائیوں، خاکوں اور مضامین کے آٹھ، سنجیدہ افسانوں کے پانچ، شاعری کے دو مجموعے، اردو پڑھنے کے دو قاعدے، تنقید پر دو کتابیں اور ایک رپورتاژ شامل ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی فرمائش پر میں نے شوکت تھانوی کے مضامین اور پطرس کے مضامین کے دو انتخابات بھی اپنے پیش لفظ کے ساتھ مرتب کیے۔ میری سات کتابوں پر مجھے اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور میر اکادمی لکھنؤ سے انعامات ملے۔

بچوں کے لیے میں نے جو آسان اردو قاعدہ لکھا اور جسے اتر پردیش اردو اکادمی نے اپنی جانب سے شائع کیا ہے، اس کے چار ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے میں نے دو قاعدوں کے علاوہ قریب بچیس کہانیاں، کئی نظمیں اور تین ناولٹ بھی لکھے ہیں ہاتھیوں سے جنگ، جنگل کی گڑھی اور جسونت نگر کے ہیرے۔ ان میں سے دو اردو اکادمی لکھنؤ اور ایک مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہونے والے ہیں۔

میرے بہت سے مضامین، افسانے اور مزاحیہ خاکوں کے

ترجمے ہندی کے معروف اخباروں اور رسالوں میں بھی مثلاً کادمبنی سریتا، کہانی وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرے بجیس مزاحیہ افسانوں کا ایک انتخاب "فسادی چچا" کے نام سے جلد ہی ہندی میں شائع ہونے والا ہے۔ میری کئی کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ایک مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ 'دودھ کے دُھلے' پاکستان میں بھی شائع ہوا ہے جس کا پیش لفظ ابنِ انشا مرحوم نے لکھا تھا۔

۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۶ء تک میں اترپردیش اُردو اکادمی کی مجلسِ عاملہ کا رکن رہا۔ چھ سال تک اکادمی کی انعامی کمیٹی کا بھی ممبر رہا، اور مقامی انجمن ترقی اردو کا متعدد بار پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں ریاستی انجمن ترقی اُردو کی مجلسِ عام سے اس کی مجلسِ عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا ہوں۔ اُردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے میں صرف اپنی تحریر سے نہیں بلکہ عملی طور سے بھی کوشاں رہتا ہوں۔

اترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے "اُردو ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں" مجھے اپنا خصوصی انعام دس ہزار روپیہ اور ایک سند ۱۹۹۰ء میں عطا کی۔ میر اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۰ء میں 'میر ایوارڈ'، اور ۱۹۹۳ء میں مجھے 'مولائے میر' ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۹۴ء میں مقامی انجمن ترقی اُردو نے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر سلام سندیلوی کے ساتھ مجھے بھی 'افتخارِ سندیلہ' کی ایک توصیفی سند اور شال عطا کی ہے۔

قریب ترپن سال تک محنت اور لگن کے ساتھ وکالت کرنے کے بعد اب میں اس پیشے سے دست بردار ہو چکا ہوں۔ صرف کبھی کبھار کسی بہت خاص مقدمے میں بحث کرنے اور اپنے وکیل ساتھیوں سے ملنے کے لیے کچہری چلا جاتا ہوں۔ سویرے گھنٹہ بھر ہوا خوری کے بعد دن بھر گھر ہی پر رہتا ہوں۔ اکثر کچھ دوست آشنا، نوجوان ادیب و شاعر یا پھر قانونی مشورہ لینے کے لیے بعض حضرات میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ میرا خالی وقت کچھ لکھنے اور زیادہ تر مطالعے میں گزرتا ہے۔ تھوڑا وقت اپنے گھر سے بہت قریب اپنی آرامی کی باغبانی میں بھی صرف ہو جاتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ اپنے کوائف میں اپنے کچھ ان بزرگوں، کرم فرماؤں، رفیقوں، دوستوں اور سیاسی اور ادبی دانش وروں کا بھی تذکرہ کروں جن سے مجھے نیاز حاصل ہوا، اور جن سے نہ صرف میں نے بہت کچھ سیکھا بلکہ جنھوں نے میرے خیالات اور رجحانات میں بڑی تبدیلیاں پیدا کیں لیکن اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

استحصال، نابرابری، ناانصافی، نسلی امتیاز، ذہنی غلامی وغیرہ کی زنجیروں کو توڑ کر عالمی سطح پر انسانوں کی ایک جنتِ ارضی بنانے کا نوجوانی میں جو خواب دیکھا تھا اسے ابھی شرمندۂ تعبیر ہونے میں بڑی دیر ہے۔ بہر حال یہی خوشی ہے کہ کام کرنے والے اپنا کام کر رہے ہیں اور جنگ جاری ہے۔ یہ ایک دو نسلوں کا کام بھی نہیں ہے

تازہ دم فرہاد اٹھیں گے نئے تیشے لیے
ہم نہ ہوں گے پر ہماری کوششیں رہ جائیں گی

مجھے اپنے دور سے اگر کوئی شکایت ہے تو صرف یہ کہ خود اپنے وطن میں عمر بھر میں انسانوں کے درمیان اٹھی ہوئی فرقہ واریت، مغائرت، تنگ نظری، جہالت، نفرت وغیرہ کی جن دیواروں کو گرانے کی کوشش کرتا رہا انھیں اب شامِ زندگی میں زیادہ مہیب شکل میں اور اونچا اٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے انسان کی بنیادی سمجھ، شعور اور اصابتِ رائے پر اعتماد ہے۔

سیاہ رات کے بعد سنہرا دن ضرور طلوع ہوگا ؎

تاریکیوں سے شب کی ہراساں نہیں ہوں میں
مجھ کو یقین ہے کہ سحر بھی قریب ہے

بیادِ فراق

جاں نثار ایسے ہیں اب کیاب اُردو کے لیے
تو کہ تھا اک گوہرِ نایاب اُردو کے لیے
آفریں صد آفریں اس دور میں تجھ کو فراق
کون پیتا ہے بھلا زہراب اُردو کے لیے

حباب ہاشمی
ای۔ ۱/۳۸ - جی۔ ٹی۔ بی نگر (کریلی) الہ آباد

امبیدکر: احساس و فکر

حالات کی پکار تھی امبیدکر کی سوچ — اک موجِ بے قرار تھی امبیدکر کی سوچ
ناساز گار عہد میں تحریک بن گئی — کس درجہ سازگار تھی امبیدکر کی سوچ
صدیوں کے عکس و نقش کو ہی ڈھونڈتی رہی — آئینوں کا غبار تھی امبیدکر کی سوچ
تازہ ہوا کے جھونکوں سے ماحول کھل اٹھا — پیغامِ خوش گوار تھی امبیدکر کی سوچ
مدت کے بعد ایک نئی صبح دے گئی — خورشیدِ انتظار تھی امبیدکر کی سوچ
بھٹی میں تجربے کی نکھرتی چلی گئی — معیارِ اعتبار تھی امبیدکر کی سوچ
دیکھو تو ایک آگ کا دریا تھا آس پاس — سوچو تو لالہ زار تھی امبیدکر کی سوچ
جو پستیوں میں رہتے تھے اور دل فگار تھے — ان سب کی غم گسار تھی امبیدکر کی سوچ
جب دیکھیے تو آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے — اپنے پہ اشک بار تھی امبیدکر کی سوچ
منزل کا ایک صاف تصور تھا ذہن میں — منزل کا خود وقار تھی امبیدکر کی سوچ
عرفانِ ذات پا کے سرافراز ہو گئے — کیا وجہِ افتخار تھی امبیدکر کی سوچ
دانشوری نے اس کو شفق رنگ کر دیا — انوار آشکار تھی امبیدکر کی سوچ

اسرار زندگی کے بتاتی چلی گئی
ہر چند سوگوار تھی امبیدکر کی سوچ

رباب رشیدی
۶۵۔ تارین
شاہجہاں پور

ڈاکٹر نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ، لکھنؤ

اکبر کی علامت سازی

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلّط کا اثر اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ قدیم و جدید کا تصادم، مغربیت کا بڑھتا ہوا غلبہ، مشرقیت کی پسپائی، نئی قدروں کے مقابل پرانی قدروں کی پامالی، ہندوستانیوں کی تہذیبی کشمکش، اور ایک سماجی انقلاب کے مختلف مظاہر وغیرہ اسی بنیادی موضوع کے ضمنی موضوعات ہیں جو اکبر کی شاعری میں بار بار اور طرح طرح سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اکبر سے پہلے ان موضوعات کو اس التزام اور اہتمام کے ساتھ نہیں برتا گیا تھا۔ اقبال کی شاعری کی طرح یہ بھی ایک نئی قسم کی شاعری تھی اور اقبال ہی کی طرح اکبر کو بھی اپنی شاعری کے لیے نئی علامتیں درکار ہوئیں۔ اقبال ہی کی طرح اکبر نے بھی کچھ پرانی علامتوں مثلاً شمع، چراغ، شیخ وغیرہ کو نئے مفاہیم میں استعمال کیا لیکن بہت سی ایسی علامتیں وضع بھی کیں جو مجرد الفاظ تک کے طور پر ہماری شعری زبان میں شامل نہیں تھیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اکبر نے اپنی بیشتر علامتیں انگریزی لفظوں سے بنائیں، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان علامتوں کی تعداد سوا سو سے متجاوز ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ اکبر، ہمارے سب سے بڑے علامت ساز شاعر ہیں اور ان کے یہاں ایک بالکل نیا اور مکمل علامتی نظام کارفرما ہے۔

اکبر کی علامتوں پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک فہرست (جو مکمل نہیں ہے) الف بائی ترتیب کے ساتھ پیش کر دی جائے۔ یہ فہرست کچھ اس طرح ہے:

آنر۔ آئس کریم۔ اخبار۔ اذان۔ اسپتال۔ اسپنسر۔ اسپیچ۔ استانی۔ اسٹیج۔ اسکول۔ امتحان۔ انجن۔ انگریز۔ انگریزی۔ انگلش اونٹ۔ ایروپلین۔ بابو۔ بال۔ بجلی۔ بدھو۔ بسکٹ۔ بگل۔ بل۔ بلب۔ بندر۔ بنگلہ۔ بوزنہ۔ پارک۔ پاکٹ۔ پالسی۔ پالش۔ پان۔ پانیر۔ پائپ۔ پتلون۔ پٹرولیم۔ پرڈہ۔ پلیٹ۔ پنشن۔ پھاگن۔ پیانو۔ پیرس۔ پیرو۔ تار۔ تھیٹر۔ ٹائپ۔ ٹٹو۔ ٹم ٹم۔ ٹیچر۔ جاکٹ۔ جمن۔ چائے۔ چراغ۔ چوٹ۔ چندہ۔ حسّو۔ حقّہ۔ خضر۔ دربار۔ دسمبر۔ ڈارون۔ ڈاکٹر۔ ڈبل روٹی۔ ڈنر۔ ڈولی۔ رجسٹر۔ ریل۔ سائنس۔ سایہ۔ سرٹیفکٹ۔ سرجن۔ سڑک۔ شمع۔ شیخ۔ شکسپیر۔ صاحب۔ صلو۔ فٹن۔ فرنیچر۔ فرنگن۔ فوٹوگراف۔ فیشن۔ قرآن۔ کالج۔ کل۔ کلرک۔ کلّو۔ کمپ۔ کمیٹی۔ کنٹوپ۔ کوٹ، کورس۔ کونسل۔ کیروسین۔ کیک۔ گریجویٹ۔ گزٹ۔ گملے۔ لائسنس۔ لکچر۔ لیمپ۔ لمنڈ۔ لنگور۔ لونڈر۔ لیڈر۔ ماسٹر۔ مٹن۔ مس۔ مسٹر۔ مسواک۔ مشین۔ مِل (اسٹوارٹ) مِل (کارخانہ)۔ ملٹن۔ موٹر۔ ناول۔ نصیبن۔ نل۔ نیٹو۔ نیچری۔ وارنش۔ ووٹ۔ ہوٹل۔ ہیٹ۔ یورپ۔

اکبر کے کلام سے بلکہ بڑی حد تک اس فہرست ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ علامتیں کن عناصر کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ اس طرح یہ علامتیں آپ اپنی وضاحت کر دیتی ہیں لیکن کہیں کہیں اکبر خود بھی کسی علامت کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

بدھو سے صرف ہند کا مسلم مراد ہے
مقصود عاجزی ہے غرور اک فساد ہے

چنانچہ اکبر کے یہاں بدھو اور اس قبیل کی مسلم عرفیتیں، جمن، حسو، پیرو، کلو، صلو، نصیبن وغیرہ اور کچھ ہندو نام بھی پس ماندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی علامتیں ہیں۔ کچھ شعر دیکھیے:

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

خلل نہ شغل میں بڑھ کے ہے، نہ حتو کے
کہ شیخ سدو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے

فقط مذہب سے تم میں عزت و تعت کی ہے یہ بو
وگرنہ اور کیا نسبت، کجا دیم کجا کلو

یہ بولے رو کے ہیرو اور گیا دین   دھرم دنیا سے اٹھا اور گیا دین

پوچھتے کیا ہو کہ تو ہیرو ہے یا ہر جنس ہے
بندہ جو کچھ ہے بہ ہر حالت بلا لیسنس ہے

حکم انگلش کا ملک ہندو کا   اب خدا ہی ہے بھائی ملو کا

رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن   وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

اسی طرح کالج کی علامت جو اکبر کے یہاں کثرت سے استعمال ہوئی ہے، اس طرح واضح ہوتی ہے ؎

بنایا تو نے چندوں کی فراوانی سے کالج کو
نئی تعلیم نے کھویا بزرگانہ مدارج کو

اکبر نے کالج کو نئی تعلیم کی علامت بنا کر اس کے بہت سے نقائص ظاہر کیے ہیں۔ مثلاً کالج کی تعلیم مذہبی عقائد کو مجروح کر رہی ہے :

نظر اُن کی رہی کالج میں بس علمی زوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

طفلِ دل محو طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا   ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

کالج میں مذہبی تعلیم اور نماز کا رسمی بندوبست بھی اکبر کے طنز کا نشانہ بنتا ہے ؎

کالج ہے دنیوی فوائد کے لیے   قائم ہے یہ ایسے ہی مقاصد کیلئے
مسجد میں یہاں جو مولوی صاحب ہیں   کپتان ہیں مذہبی قواعد کے لیے

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کالج والوں کی نظر میں مذہب سے وابستگی تاریک خیالی اور کم عقلی کے مترادف ہو گئی۔ یہ قطعہ دیکھیے ؎

میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے   اس چٹائی پہ نمازیں پڑھیں حسب دستور
چھوڑیئے آپ یہ ہنگامۂ تعلیم جدید   کاش ہی دے گا کسی طرح خداوند غفور

بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

تصوف بھی اس نئی تعلیم کا شکار ہوتا ہے :

لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوف پہ معترض   کالج کے کیڑے پڑ گئے دلق فقیر میں

کالج کی تعلیم میں ایک بڑا عیب اکبر کے نزدیک یہ ہے کہ یہ طالب علم کی دماغ شوئی کر کے اس کے نسلی مزاج کو مسخ اور ذہنی پس منظر کو غائب کر دیتی ہے۔ ذیل کی رباعی اور شعر میں انھوں نے اس مضمون کو بہت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے :

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا   قومی خصلت کا سر سے اٹھا سایہ
کہتے تھے ولد کو لوگ بیٹا لا بیہ   بیٹا للماسٹر کا وقت اب آیا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

نئی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی ہندستانیوں کو اچھی ملازمتیں نہیں ملتی ہیں اور قوم کو حقیقتاً اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے :

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

قطعہ

باغوں میں تو بہارِ درختوں کی دیکھ لی   کالج میں آ کے کانووکیشن کو دیکھیے
لیموئے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے   اب کاغذی ترقیِ نیشن کو دیکھیے

کالج کے متوازی اسکول ہے۔ اسکول کو اکبر نے زیادہ تر لڑکیوں کی نئی تعلیم کی علامت بنایا ہے جو انھیں کوئی دنیوی فائدہ پہونچانے کے بجائے حیا سے عاری اور خانگی فرائض سے غافل کر رہی ہے۔ بی نصیبن والا شعر اوپر گزر چکا ہے، کچھ اور شعروں میں اس علامت کی کارفرمائی دیکھیے :

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے ان کو بہت
کیمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی

داخلِ اسکول ہو دختر تو کچھ حاصل کرے   کیا نتیجہ صرف اگر بے باک ہو کر رہ گئی

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اور ذیل کا شعر جو ایک پوری روایت کے خاتمے کا نوحہ ہے کچھ تمہید چاہتا ہے۔ واجد علی شاہ کی بیگم نواب بادشاہ محل عالم کا بنایا ہوا ایک گیت اودھ کے مسلم گھرانوں میں بہت شوق سے گایا جاتا تھا۔ اس گیت کا نام "بِل مِل" رکھا گیا تھا اس لیے کہ اس کا مکھڑا یہ ہے:

بِل مِل کے پَنیا کو جائے ری نَندیا

اکبر کہتے ہیں ؎

اب نہ بِل مِل ہے نہ اب پَنیا کا وہ معمول ہے
اک نندیا تھی سو وہ بھی داخلِ اسکول ہے

نئی تعلیم ہی کے سلسلے میں اکبر نے مغرب اور مشرق کی علمی ادبی شخصیتوں کو بھی علامت بنایا ہے۔ مغربی علوم اور ادب فیشن میں داخل ہو رہے ہیں اور مشرقی افکار مسترد کیے جا رہے ہیں اور اس میدان میں مغرب مشرق پر غالب آتا جا رہا ہے۔ اکبر خود اس غلبے کو قبول کرنے پر تیار نہیں لیکن اسے ایک حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، اور اس پر کڑھتے ہیں ؎

کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مِل نہیں ملتا

غزالی و رومی کی بھلا کون سُنے گا   محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مِل ہے

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بُزِ اخفش تھے قبل اسکے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

مِل سے کہہ دو کہ تجھ میں خامی ہے   زندگی خود ہی اک غلامی ہے

بات بالکل صاف ہے پیچیدگی کچھ بھی نہیں
میں ہوں سعدی کا بھتیجا، وہ ہیں ملٹن کے غلام

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپا شیکسپیر
پڑھو گے حضرتِ سعدی کی بوستاں کب تک

ڈارون کو اس کے نظریہ ارتقا کی وجہ سے اکبر نے مغرب کی پست خیالی کی علامت بنایا ہے۔ ان کا یہ قطعہ طنزیہ شاعری کے شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے ؎

کہا منصورؔ نے خدا ہوں میں   ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست   "فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمت اوست"

اس علامت کے کچھ اور نمونے دیکھیے:

ڈارون صاحب یہ اچھا مسئلہ سمجھا گئے   دعویٰ مخدومیت میں مست ہر لنگور ہے

نیست کس مصروفِ کارِ خود بہ قلبِ مطمئن
یک فنا فی الآنزاست ویک فنا فی الڈارون

قطعہ

جورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں   تفرقہ دیکھیے ذرا ہم پہ یہ ہیں عجیب دن
عقل سپردِ ماسٹر، مال سپردِ آنجناب   جان سپردِ ڈاکٹر، روح سپردِ ڈارون

اور ڈارون ہی کے ذیل میں اکبر نے بندر، بوزنہ، لنگور کی بھی علامتیں بنائی ہیں:

تمھارے کھیت سے لے جائیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرتِ آدم بنے کیونکر

سرافرازی ہے اونٹوں کی تو گردن کاٹیے اُن کی
اگر بندر کی بن آئے توفیقِ ارتقا کہیے

گلہ میں نے کیا مجھ کو ترقی دی نہیں تو نے
تو بولا ارتقا چُپ رہیے بس کیا آپ بندر ہیں؟

ان شعروں میں ڈارون اور بندر کے علاوہ کچھ مزید علامتیں در آئی ہیں، یعنی ماسٹر، ڈاکٹر، آنر، اونٹ، ارتقا، اور ان شعروں کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان مزید علامتوں سے واقفیت ضروری ہے۔ اکبر کے بہت سے شعروں نے کئی کئی علامتوں سے ترکیب پائی ہے اور اکبر کی شاعری کا صحیح لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم ان کی بنائی ہوئی علامتوں کے پورے نظام سے واقف ہوں۔ ان علامتوں کی جو الف بائی فہرست ہم نے پیش کی ہے اس کو دو بڑے خانوں انگریزی اور ہندستانی، یا مغربی اور مشرقی یا جدید اور قدیم میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پھر ان خانوں کے اندر مزید خانے بنائے جا سکتے ہیں اور ان میں بھی بعض کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً انگریزی کے مقابل اُردو، فارسی، عربی ہیں۔ صاحب کے مقابل نیٹو ہے، انجن، ریل، موٹر کے مقابل اونٹ، میانہ اور ٹٹو ہیں، اور اونٹ کے مقابل

گائے ہے یعنی اونٹ ایک طرف مشرقی وسائل سفر کی علامت ہے دوسری طرف اسلام کی بھی علامت ہے۔ اکبر کے یہاں ان علامتوں کا استعمال دیکھیے ؎

انگریزی، عربی :

اکبر مجھے شک نہیں تری تیزی میں اور تیرے کلام کی دلآویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بے خوف لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

مادہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

صاحب، نیٹو :

مرزا غریب چُپ ہیں اُنکی کتاب رَدی بڈھا اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

میری نصیحتوں کو سُن کر وہ شوخ بولا
نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

اکبر اس اندیشے میں رہتا ہے غرق کافر و نیٹو میں ہے تھوڑا ہی فرق
کافری کا ہے علاج ایمان سے نیٹویت تو ہے پٹی جان سے
نیکوں کے حق میں کج ادائی نہ کرو اللہ کے ساتھ بے وفائی نہ کرو
نیٹو بھی رہو گے اور مرو گے بھی ضرور کہتا ہوں کہ دعوائے خدائی نہ کرو

نیٹویت پر کیا میں نے جو اظہار خیال
سُن کے صاحب نے کہا سچ ہے مگر ہم کیا کریں

صاحب کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ اکبر کے یہاں یہ علامت خالص انگریزوں کے علاوہ ان مغرب زدہ ہندستانیوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے جنھوں نے انگریزوں کے طور طریقے اختیار کر لیے ہیں، مثلاً

رہ گئے نا آشنا، احباب غائب ہو گئے
ہم نفس دو اک جو باقی تھے وہ صاحب ہو گئے

اونٹ، ریل، انجن :

اے شیخ جب نکیل نہیں دست قوم میں
پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے ریل ہو گئے

یا الٰہی! ہم غریبوں کا کہاں ہوگا نباہ؟
بدگماں اُشتر سے ہیں جب حضرتِ انجن نواز

اونٹ، گائے :

گائے کا تو کچھ ٹھکانہ بھائی گاندھی نے کیا
شیخ جی کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے دیکھیے

اونٹ نے گایوں کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا
پھر تو مینڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو

سینگ غائب ہے تو پھر گردن اُٹھانا ہے فضول
حضرت اشتر سے کہہ دو یا لدیں یا ذبح ہوں

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ اُبھرے ہیں اب
اونٹ رخصت ہو گئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

ٹٹو، موٹر :

کیا طعن شیخ جی کا ٹٹو جو اَڑ گیا ہے
حضرت کا بھی تو موٹر آخر بگڑ گیا ہے

اوپر کے شعروں میں پانچ جگہ شیخ کی علامت بھی استعمال ہوئی ہے۔ یہ اکبر کی بنائی ہوئی سب سے اہم اور ان کے کلام میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی علامت ہے اور یہ اکبر کی سب سے زیادہ کثیر المفہوم علامت بھی ہے۔ اس کے بعد کثرت استعمال کے لحاظ سے انجن اور پھر مس اور کالج کی علامتیں ہیں جو اکبر نے طرح طرح سے استعمال کی ہیں کالج کی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب انجن، مس اور شیخ کی علامتوں کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان علامتوں کے ذیل میں اکبر کی دوسری علامتیں بھی آگئی ہیں۔ پہلے انجن اور اس کے متعلقات کو دیکھیے

اکبر کے یہاں انجن محض ایک ترقی یافتہ وسیلۂ سفر کی نہیں بلکہ اس پورے صنعتی، مشینی اور مادی دور کی علامت ہے جو ہندستان بلکہ مشرق پر مغرب کے تسلط کو مستحکم کر رہا ہے اور مشرق کو مغرب کا محتاج بنا رہا ہے:

اُس کا پسینا ہے اور اس کے ہیں بھپارے
یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

یہ مادّی دور ذہنوں پر حاوی آ رہا ہے اور مذہب کی روحانیت کو اس

انجنی دور کی مادّیت سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہی ہے :

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز   بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز
اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

تسبیح وہ اب کہاں وہ تہلیل کہاں   قرآنِ مجید کی وہ ترتیل کہاں
کل کے آگے خیالِ فردا کس کو   جب ریل ہے سامنے تو جبریل کہاں

مال گاڑی پہ بھروسا ہے جنھیں اے اکبر
ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا

انجن کی موجد قوم کو خطاب کر کے کہتے ہیں :

عیسیٰ نے دلِ روشن کو لیا اور تم نے فقط انجن کو لیا
کہتے ہو کہ وہ تھے باپ سے خوش اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش

اس ایجاد نے سفر کے ہمائی طلسم، منزل کی جستجو، راستے کی تلاش، بھٹک جانے کے اندیشوں کے ساتھ صراطِ مستقیم پا جانے کی لذت کو قصۂ پارینہ بنا دیا ہے اس لیے کہ یہ مشین ناآشنائے راہ مسافر کو بھی اپنے آپ مقررہ راستے پر چلاتی ہوئی منزل تک گھسیٹ لے جاتی ہے اور اب مسافر کو کسی راہنما کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اکبر نے انجن اور ریل کی خود تراشیدہ علامتوں کے ساتھ راہ نما کی روایتی علامت خضر کو ملا کر اس موضوع کو خوب خوب برتا ہے۔ مثلاً :

کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نوجوان
خضر کی ہم کو نہیں حاجت یہاں تک ریل ہے

ہو مبارک جستجوئے خضر انھیں   ہم تو اب انجن کے پیچھے ہو لیے
حضرتِ خضر ٹکٹ مجھ کو دلا دیں اکبر   رہ نمائی کے لیے ہے مجھے انجن کافی

پیچھے انجن کے بس اب ہو لیں مسلماں بھائی
اب انھیں خضر کی اور راہ کی حاجت کیا ہے

بلکہ اکبر اپنے وقت سے آگے بڑھ کر انجن کو مشینوں کی پیدا کردہ اس ماحولیاتی آلودگی کی علامت بنا دیتے ہیں جو ان کے بعد آنے والے زمانے میں ساری دنیا کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے   کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

اور مشین فطرت کو کس طرح مسخ کر رہی ہے اسے بھی اکبر نے اسی علامت کے ذریعہ بڑے پرسوز انداز میں بیان کیا ہے :

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن
پیڑوں پہ نہ وہ طائر، صحرا پہ نہ وہ جوبن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل سے کہ ہیں پائیں
املی کی جگہ سگنل، قمری کی جگہ انجن

اکبر اس پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ قضا و قدر کے بہت سے مسئلے اور سفرِ حیات کے بہت سے مرحلے ہیں جہاں مشینی وسائل بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس مفہوم کو بھی اکبر نے اسی علامت کے ذریعے ادا کیا ہے، مثلاً :

اسے انجنوں کا خیال کیا جو ہو محو تاروں کی چال کا
وہ نظر زمیں پہ کیوں جھکے کہ جو آسماں سے قریب ہے

برق و بخارات کا زور اے حکیم   کب ہے پئے روح خطِ مستقیم
تار پہ جاتے نہیں اہلِ نظر   ریل سے کھنچتا نہیں قلبِ سلیم

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں   مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزلِ عدم اے اکبر   اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

دل کا ٹکڑا تو رہا باقی پئے نذرِ خدا   ریل میں کیا غم جو اکبر کھیت میرے کٹ گئے
اس کو پکڑ ہی رہا اور یہ خدا تک پہنچا   دلِ پرسوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا

انجن کی علامت کے کچھ اور رُخ دیکھیے :

کمر بندھی نظر آتی ہے آب و آتش کی   اُدھر سے نل اِدھر انجن کی آمد آمد ہے
شیخ سے چھوٹے، الجھے انجن میں   اس میں بک بک تھی اس میں بھک بھک ہے
میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا   رہ گئے نغمے حدی خوانوں کے ایسی تان لی

انجن کو یہ آگ ہو مبارک
انگریز کو بھاگ ہو مبارک

پڑھے گنگناتے تھے لالہ نہ بھجن   نہ آنکھوں میں انجن نہ دانتوں میں منجن
چھٹے ہم سے بالکل وہ اگلے طریقے   کہاں کھینچ لے جائے گا ہم کو انجن

نغمۂ مرغِ سحر سے نہیں انجن کو غرض
پیٹ انگاروں سے بھر دیجے بھک بھک میں ہیں

زیر پا ہے ریلوے اور سر پہ ہے انجن کی بھاپ
اب یہ کہنا چاہیے نیچے بھی آپ اوپر بھی آپ

ہے ذاتِ حضرتِ واعظ مسیح   ان کی خدمت میں بس اتنی عرض ہے
اونٹ پر چڑھنا تو سنت ہے ضرور   ریل پر چڑھنا مگر اب فرض ہے

ریلوے کو فائدہ جن سے ہے وہ لیڈر تو ہیں
رعب میدانوں میں تھا جن سے وہ غازی اب کہاں

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت   کبوتر اُڑ گئے انجن کی پیں سے

مِس کی علامت انگریز عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان بے حجاب اور بے باک عورتوں نے حسن و عشق کے مشرقی معیار بدل دیے ہیں۔ اور اہلِ ہند کی آنکھیں ان گوری چٹی بی بیوں کو دیکھ کر چکاچوند ہوئی جا رہی ہیں۔ اکبر کے یہاں اس علامت کے مختلف رُخ نمایاں ہوتے ہیں مثلاً یہ مسیں حسین ہونے کے باوجود مخصوص نسوانی کشش سے عاری اور خود فروش ہونے کے باوجود عشاق کے لیے بے فیض ہیں۔

اس مسِ شوخ سے راحت نہ ملے گی مجھ کو
عمر بھر خیر، وہ اک شب تو بھلا خوش رکھے

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے   ہاتھ اس مس سے ملانا چاہیے

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

بوئے وفا نہیں ہے مسوں کے اصول میں   بس رنگ دیکھ لیجیے گملے کے پھول میں

ان اصنامِ جدید کی دوستی زر و مال بھی چاہتی ہے اور بے چارے عاشق کو یہ دوستی نباہنے کے لیے طرح طرح کی مدوں میں خرچ کرنا اور قسم قسم کے بلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے:

اُفعیِ زلفِ مس کا تو سودا برا نہیں
پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس کے بل میں ہے

بساں خود فروش آخر فرستادند ایں بل ہا
طلب کردند چنداں زر کہ خون افتاد در دلہا
نشاطِ طبع برہم شد شکست آں رنگِ محفل ہا
الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

اور اس نئے طرزِ عاشقی کی تان بالآخر اس پر ٹوٹتی ہے کہ عاشق اپنا روایتی کردار چھوڑ کر دُنیاوی علائق کا اسیر ہو جاتا ہے ؎

پیدا ہوں کیسے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا
جو پھانستے تھے جال اب کوٹ سی رہے ہیں

جو حکمِ بُت کی جگہ حکمِ مس ہوا قائم
تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

اکبر کی دو بہت مشہور نظموں "رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار" اور "اک مسِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد" کے علاوہ بھی متعدد شعروں میں مس کی علامت کی مختلف معنویتیں سامنے آتی ہیں، مثلاً ؎

سرکش کو فکرِ حفظِ جاں اکبر کا شورِ الاماں
سائنس کا زور اک طرف حسنِ رخِ مس اک طرف

حسنِ مس پر کر نظر، مذہب اگر جاتا ہے جائے
قدرداں کو نرخ کی کیا بحث اکبر مال دیکھ

حورِ مس کو نئے گلگوں کو پری کہتے ہیں
شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو کھری کہتے ہیں

چٹھی اس مس کی ہے کہ یہ جادو ہے   دل جوشِ مفاخرت سے بے قابو ہے
ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے!   القاب میں دیکھیے "ڈیر گلو" ہے

محبت اپنی ہی پریوں سے رکھیں حضرتِ اندر
مسِ مغرور لندن ان کی چیری ہو نہیں سکتی

آ گئی زلفِ مساں زلفِ بتاں پر غالب   پیچ ہوتے تھے بہم افعی و دراسو کی طرح
نظارۂ مساں سے ترو تازہ کیجیے آنکھ   تفریحِ پارک میں سحر و شام کیجیے
مس کو دیکھا عاشقِ زلفِ چلیپا ہو گیا   مست تھا دل پھول کر روسی کا پیپا ہو گیا

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس
کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

ہیں لب سبز رنگ شمع بے گانہ ہے   جلتا ہے چراغ سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مسوں کے روئے روشن پہ نگاہ   جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

کیا ذوقِ عبادت ان کو ہو جو مس کے لبوں کے شیدا ہیں
حلوائے بہشتی ایک طرف، ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

مری فغاں پہ مسِ ناشناس بول اٹھی
کہ بابوؤں میں تو عادت ہے غل مچانے کی

کہو یہ رندانِ ایشیا سے کہ بزمِ عشرت کے ٹھاٹھ بدلیں
اڑن کھٹولا ہے اب مسوں کا گئی پری جان کی وہ ڈولی

وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے، پاگل کا مافک ہے

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے

شیخ صاحب دیکھ کر اس مس کو ساکت ہوگئے
ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے، چت ہوگئے

شیخ

شیخ، جیسا کہ عرض کیا گیا، اکبر کی سب سے اہم، سب سے زیادہ مستعمل اور کثیر المفہوم علامت ہے۔ اکبر کی سب سے زیادہ متحرک علامت بھی یہی ہے اس لیے کہ شیخ کا طبقہ اپنا کردار بدلتا بھی رہتا ہے۔ بنیادی طور پر اکبر کا شیخ ہندستان کے اس قدیم الخیال اور مذہب سے وابستہ مسلمان کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے فکری جمود اور بے عملی کی وجہ سے وقت کی دوڑ میں پچھڑا ہوا ہے۔ یہ اپنی ذات میں ایک ادارہ ضرور ہے لیکن تجدد کے سیلاب میں یہ ادارہ اپنی وقعت اور اثر کھو کر فنا اور بقا کی کشمکش سے دوچار ہے۔ اور اس صورتِ حال کی ذمہ داری بڑی حد تک خود اس پر بھی ہے۔ پہلے اس علامت کا بنیادی روپ دیکھ لیجئے:۔

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

اُبھرے ہیں عیب ان کے اور خوبیاں دبی ہیں
بے دین اگر نہیں ہیں تو شیخ جی غبی ہیں

حالِ دُنیا سے بے خبر ہیں آپ — گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے — چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

شیخ کی اسی صفت کو اکبر نے تثلیث اور تین کے ضلع کے ساتھ یوں ادا کیا ہے:

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ — گھر میں بیٹھے ہوئے واتین پڑھا کرتے ہیں

دل ان کے ساتھ باقی ہے نہ حاضر کا نہ غائب کا
خدا ہی ہے جو بیڑا پار ہو اب شیخ صاحب کا

مُریدان کے تو شہروں میں اُڑے پھرتے ہیں موٹر پہ
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی — چاقو ولایتی نہیں دیسی چھُرا سہی
شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے — اونٹ کے سو لغات جانتے ہیں
ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض — کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

ساتھ ان کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا
بندر کی طرح اونٹ اچھل ہی نہیں سکتا

نکالا شیخ کو مجلس سے اس نے یہ کہہ کر — یہ بے وقوف ہے مرنے کا ذکر کرتا ہے

چندے کی مجلس میں پڑھیے رو کے قرآن مجید
مذہبی محفل میں لیکن مثلِ دشمن جایئے

شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت
رد بٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جایئے

شیخ صاحب کو نہیں شاعروں کی بات سے کام
حسن کی قید نہیں، بس ہے مستّات سے کام

اور وہ مشہور شعر "شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ کہلا دیا آپ بی، اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے"

انجن اور شیخ کی علامتوں کا تصادم اکبر کے یہاں اس طرح ملتا ہے:

سُنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات — انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

دونوں کے سُر ملیں یہ قریباً محال ہے
انجن رہے جہان میں یا شیخ جی رہیں

شیخ کی اس حیثیت، بلکہ بے حیثیتی کا اثر ان کی آئندہ نسلوں پر کیا پڑ رہا ہے، اس کا اظہار اکبر نے شیخ کے بیٹوں کی ذیلی علامت کے ذریعے اس طرح کیا ہے:

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی — سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی — خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں، ایک پھانسی پا گئے

لیکن بالآخر شیخ کے طبقے تک کو نیا انقلاب اپنی لپیٹ میں لینے لگتا ہے۔ اور اس کے بھی بعض افراد میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، اسی کے ساتھ اس علامت

کا تحرک اچانک بڑھ جاتا ہے۔ پہلے یہ تبدیلی خفیف سی نظر آتی ہے:

شیخ کی وہ دھج نہیں، وہ شیخ کی داڑھی نہیں
دوستی مذہب سے ہے پر اس قدر گاڑھی نہیں

محلے میں نہ کی جب شیخ کی دعوت عزیزوں نے
تو بے چارہ کمیٹی ہی میں جاکر کود اچھل آیا

دیر میں ہنستے ہیں اب کعبے میں برسوں رو لیے
شیخ جی کرتے ہی کیا، بابو کے پیچھے ہو لیے

مذہب چھڑایا عشوۂ دنیا نے شیخ سے
دیکھی جو ریل، اونٹ سے آخر اتر پڑے

پھر یہ حالت ہوتی ہے:

تہذیبِ مغربی کی بھی ہے دارنش غضب
ہم کیا جنابِ شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے

شیخ دم سازِ پیانو ہو کے بھولے اپنی لَے
گو سُریلے ہو گئے لیکن بُری گت ہو گئی

اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے:

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت وضو کی اور مناجاتِ سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسبِ دستور تلاوت کرتے ہیں وہ پانیر کی

اور اب شیخ اپنے اندر تبدیلی کا خود بھی اعتراف کرنے لگتا ہے:

شیطاں نے دیا ہے شیخ جی کو نوٹس
بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ

آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر
فوراً داغوں گا اک ڈفیمیشن سوٹ

شیطاں کا سُنا جو شیخ صاحب نے قول
بولے کہ فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہَول

میں خود ہوں بدل گیا زمانے کے ساتھ
پڑھتی ہے مجھی پہ اب یہ دُنیا لاحول

شیخ میں تبدیلی کے مضمون کو سعدی کے قطعے ؎

گلے خوش بوئے در حمام روزے رسید از دستِ محبوبے بہ دستم

کے انداز میں باندھ کر اکبر نے پیروڈی کا یوں کمال دکھایا ہے:

یکے ذی مسلم در اسکول روزے فتاد از جانبِ بیگک بہ دستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی کہ پیشِ اعتقاداتِ تو پستم
بگفتا مسلم مقبول بودم ولے یک عمر بالمحد نشستم
جمالِ نیچری در من اثر کرد
دگر نہ من ہماں شیخم کہ ہستم

اور اب شیخ مس کے بھی اسیر ہو جاتے ہیں:

بولی وہ مس کہ شیخ جی پہلے مرے حریف تھے
اب سمجھ ان کو آ گئی دوست بھی ہیں غلام بھی

اور خلاصۂ کلام یہ کہ ؎

دُنیا ہی اب دُرست ہے، قائم نہ دین ہے
زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

شیخ کی علامت اکبر کے یہاں ان مذہبی ظاہر داروں کی بھی نمائندگی کرتی ہے جو خریدۂ سرکار ہو چکے ہیں۔ ان کو اکبر نے "شیخ کیپ" کا نام دیا ہے اور ان کے ذکر میں طنز و ظرافت کے ساتھ تلخ نوائی کی بھی آمیزش کر دی ہے ؎

اب شیخ شہر رہ گئے مُردوں کے واسطے زندوں کو لے رہے گے ہمارے شیوخ کیپ
اسپیچ مذہبی میں بھی یکتا ہیں شیخ کیپ لیکن یہ سب زبان پہ ہے، دل میں کچھ نہیں

ان کی کل کوششیں تھیں پولیٹکل
اس کو خالق کی جستجو نہ کہو
کیپ کے شیخ کو کہو مرحوم قدس اللہ سرہٗ نہ کہو

ہماری فہرست میں ابھی بہت سی علامتیں باقی ہیں مگر ان کے بعد بھی اکبر کا خزانہ علامات خالی نہیں ہوتا۔ معمولی سی تلاش سے ان کے یہاں مزید متعدد علامتیں دست یاب ہو جائیں گی، لیکن اس تلاش کے بغیر بھی یہ بات بہ تکرار کہی جا سکتی ہے کہ اکبر الہ آبادی ہمارے سب سے بڑے علامت ساز شاعر ہیں۔

□□

ہندوستاں کا شاعرِ یکتا چلا گیا

(حضرت نذیر بنارسی کی رحلت سے متاثر ہوکر)

گنگ و جمن کا شاہد و شیدا چلا گیا
ہندوستاں کا شاعرِ یکتا چلا گیا
زلفِ وفا سنوارنے والا چلا گیا
تھا جس کے سر میں پیار کا سودا چلا گیا
لعل و گہر لٹاتا رہا جو بہ طرزِ خاص
وہ تاجدار ملکِ سخن کا چلا گیا
جس کی زبانِ سادہ پہ سوٗ بانکپن فدا
وہ خوش کلام وہ سخن آرا چلا گیا
خونِ جگر سے جس نے "کتابِ غزل"[1] لکھی
وا حسرتا غزل کا وہ رسیا چلا گیا
کاشی کا وہ فقیر جسے کہتے ہیں نذیر
سب کو دکھا کے پیار کا رستا چلا گیا
اس کے الم میں صبحِ بنارس اداس ہے
اس کا جمال اس کا اجالا چلا گیا
اک ضوفشاں چراغ تھا خاموش ہو گیا
چرخِ ادب کا ایک ستارا چلا گیا
نم دیدہ جس کے غم میں جنوں بھی خرد بھی ہے
وہ آبروئے گلشن و صحرا چلا گیا
ہندی بھی سوگوار ہے اردو کے ساتھ ساتھ
دونوں زبانوں کا وہ چہیتا چلا گیا
وہ قومی ایکتا کا پیامی نہیں رہا
وہ امن و آشتی کا شناسا چلا گیا
دیتا رہا جو سب کو وطن دوستی کے جام
میخانے سے وہ نازشِ صہبا چلا گیا
وہ جاں نثارِ آلِ پیمبرؐ نہیں رہا
وہ مدح خوانِ فاطمہؑ زہرا[2] چلا گیا
خود ایک انجمن تھا جو اپنی ہی ذات سے
وہ جانِ فکر و فن وہ دلارا چلا گیا
شاعر بھی تھا طبیب[3] بھی نباضِ قوم بھی
تھا جو کئی غموں کا مداوا چلا گیا

حق اس کی مغفرت کرے بخشے اسے حفیظ
سوئے جناں وہ حق کا دِوانہ چلا گیا

حفیظ بنارسی
ملکی محلہ۔ آرہ ۔ ۸۰۲۳۰۱

---

[1] غزلوں کا مجموعہ [2] فاطمہ زہرا کی چادر کے عنوان سے نظم کی طرف اشارہ۔ [3] مرحوم کا اصل پیشہ طبابت تھا اور ان کے والد مرحوم اور بڑے بھائی بھی مشہور طبیب تھے

صلاح الدین عثمان
گومتی نگر۔ لکھنؤ

عہدِ نو کا عظیم المرتبت انسان

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کی "دبے کچلوں کی تحریکِ آزادی" Liberation Struggle کی سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ اس میں کبھی تشدد کا شائبہ تک نہ آنے دیا۔ ایسے افراد نے ہندستان میں صدیوں تک غیر انسانی مظالم سہے مگر جب وہ ان مظالم کے خلاف اٹھے تو امن اور صلح کے پیکر بن کر اٹھے۔ ڈاکٹر امبیدکر نے اس پُر امن تحریک کے ذریعے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو شاید وہ تشدد کے ذریعے نہ حاصل کر سکتے۔ آج ہندوستان میں دبے کچلے اور نام نہاد کمتر کہے جانے والے لوگوں کے لیے ایک اچھی زندگی کے اور ترقی کے نئے راستے کھلتے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر امبیدکر ہندستان کے سیاسی رہنماؤں میں غالباً سب سے زیادہ صاحبِ علم تھے۔ وہ اکیلے رہنما تھے جنھوں نے ڈی۔ ایس۔ سی، ڈی۔ لٹ بار ایٹ لا کی ڈگریاں اپنی محنت اور ذہانت کے بل پر حاصل کی تھیں۔ اور ایسے حالات میں جب وہ غریبی اور افلاس کا شکار تھے۔ انھوں نے یہ ڈگریاں ہندستان میں نہیں امریکہ۔ انگلینڈ اور جرمنی میں حاصل کی تھیں۔

ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے علم اور اپنے مرتبے کو ذاتی آرام و آسائش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ وہ غریب پیدا ہوئے اور ہمیشہ غریبوں میں رہے۔ جو کمایا اس کو اپنے ان بھائیوں کے ساتھ بانٹ کر کھایا جو سہولتوں سے محروم تھے۔ ان کے حقوق کے لیے لڑے۔ ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اسکول اور ہوسٹل قائم کیے۔ دیہاتوں میں کھیت مزدوروں کو قابلِ کاشت زمین دلانے کی تجویزیں حکومت میں پیش کیں۔ چھوٹے کسانوں کے حقوق کے تحفظ کی کوششیں کیں اور زمینداروں کی لاٹھیوں کا سامنا کیا۔

بمبئی میں مزدوروں کے حقوق کے لیے لڑے۔ اس زمانے میں ملوں میں اقوام و قبائل درج فہرست کو نوکری ملنا دشوار تھا۔ ان کی نوکریوں کے لیے جد و جہد کی۔ اس کے نتیجے میں بہت سے ٹریڈ یونین لیڈروں نے ان پر مزدوروں میں جات واد پھیلانے کا الزام لگایا۔ مگر الزام لگانے والے یہ بھول گئے کہ نوکری نہ ملنے کی وجہ بھی جات پات ہی تھی۔

ڈاکٹر امبیدکر کو ہندستان کی اقلیتوں سے بھی ہمدردی تھی۔ وہ ان کو دستوری تحفظات دینے کے اتنے ہی حامی تھے جتنے اپنے طبقے سے متعلق افراد۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک رسالہ "اقلیتیں اور آزاد ہندستان میں ان کے حقوق کے تحفظ کا دستوری نظام" بھی لکھا۔

ڈاکٹر امبیدکر کے دل میں اونچی ذات کے لوگوں کے لیے کوئی غصہ یا مخالفت کا جذبہ نہیں تھا۔ وہ اتنے دُور اندیش اور صاحبِ بصیرت تھے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ملک کے لوگوں کے دلوں میں نفرت اور دشمنی کے جذبات پرورش پاتے رہیں گے تو ملک تباہ ہو جائے گا۔ ان کو ایک بات کا یقین تھا کہ گزشتہ زمانے میں ان افراد پر ظلم و ستم کی وجہ "چتر ونشی" یعنی چار جاتوں والے سماج کا قائم ہونا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ورن آشرم کی بنیاد یہاں کی دھارمک کتابوں پر تھی جن میں اس کی تعلیم تھی اور جب تک اس تعلیم کا اثر لوگوں کے دماغوں پر باقی رہے گا۔ ہندستان میں جات واد باقی رہے گی۔ اسی لیے آخری عمر میں انھوں نے بودھ دھرم اختیار کر لیا تھا۔

ڈاکٹر امبیدکر بچپن ہی سے بہت حساس تھے۔ غربت کے مصائب تو وہ خوشی سے برداشت کر لیتے تھے مگر تحقیر کا برتاؤ ان کے دل میں گہرے گھاؤ چھوڑ جاتا تھا۔ جب وہ اسکول جانے لگے تو ان کو اپنے استادوں ہی کے ہاتھوں طرح طرح کی ذلتیں اٹھانا پڑیں۔ وہ کلاس روم میں سب لڑکوں سے پیچھے بٹھائے جاتے اور کلاس روم میں اسی وقت

داخل ہو سکتے تھے جب دوسرے سب لڑکے اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے۔ وہ بچوں کے گھڑوں سے پانی نہیں لے سکتے۔ چاہے کتنی ہی گرمی ہو وہ دن بھر پیاسے رہتے۔

ان کا ایسے طبقے سے متعلق ہونے کا جرم ہندستان کے آزاد ہونے تک ان کو ستاتا رہا۔ جب ڈاکٹر امبیدکر "بڑے آدمی" بن چکے تھے اس وقت بھی جب وہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹیو کونسل کے ممبر ہو گئے اس وقت بھی۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر یہ الفاظ دگر ہندستانی حکومت وزیر تھے۔ وہ کلکتہ دربے کچلوں کے ایک اخبار "پیپلس ہیرالڈ" کا اجرا کرنے گئے۔ ریلوے کے ایک بڑے افسر نے ان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کے وقت تک اس افسر کے ملازمین کو پتہ نہیں تھا کہ کھانا کھانے والے مہمان ایسے ہیں جن کا چھوا ہوا کھانا منع تھا۔ دوسرے دن جب ان کو پتہ چلا تو باورچی سمیت سب ملازموں نے نوکری سے استعفا دے دیا۔

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر امبیدکر امریکہ اور انگلینڈ سے یونیورسٹیوں کی ڈگریاں لے کر لوٹے۔ انھوں نے سوشیالوجی اور اقتصادیات میں ایم، اے کیا اور اقتصادیات میں لندن اسکول آف اکنامکس (لندن یونیورسٹی) میں ریسرچ یعنی تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں جہاں انھوں نے پڑھا تھا، ان کی ذہانت کی شہرت تھی۔ اتنے صاحب علم اور دانشمند آدمی کو وطن واپسی پر ہاتھوں ہاتھ لیا جانا چاہیے تھا اور کوئی اعلا عہدہ یا یونیورسٹی میں پروفیسر کی جگہ ملنا چاہیے تھی۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہوا۔ ان کو دو وقت کی روٹی کے لیے اسکول کے بچوں کو ان کے گھر جاکر پڑھانے کے لیے دو ٹیوشن کرنے پڑے۔

یہ ایک دل گداز داستان ہے مگر بہت ہی سبق آموز۔

ڈاکٹر امبیدکر کے والد راموجی سکپال فوج کی مہار رجمنٹ میں سپاہی تھے۔ انگریزوں نے سپاہیوں کے لیے بھی تعلیم کا انتظام کر رکھا تھا۔ راموجی سکپال نے مراٹھی ہی نہیں انگریزی بھی پڑھی تھی اور علم کے شیدائی تھے مگر آمدنی اتنی نہیں تھی کہ خود فوج کی دی ہوئی تعلیم کے آگے پڑھ سکتے یا اپنے بچوں کو پڑھا سکتے۔ بھیم راؤ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے والد صاحب نے طے کیا کہ چاہے جو کچھ ہو وہ اپنے اس بچے کو تعلیم ضرور دلائیں گے۔ لیکن جب بھیم راؤ پڑھنے کی عمر کو پہونچے تو ان کے والد فوج سے ریٹائر ہو گئے اور پنشن اتنی قلیل ملی کہ اس میں خاندان کا گزارا مشکل ہو گیا۔ مگر ان کے والد کو ان کی تعلیم کی اتنی لگن تھی کہ وہ نوکری سے سبک دوش ہو کر گھر واپس نہیں گئے بلکہ بمبئی آئے اور ایک جھگی جھونپڑی میں بس گئے۔ بھیم راؤ کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ بھیم راؤ کو بھی علم سے عشق تھا۔ وہ ہر مصیبت جھیل کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسکول میں ان کے ساتھ نہ ساتھیوں کا سلوک اچھا تھا نہ استادوں کا۔ بھیم راؤ کی یہ علم سے محبت ہی تھی جس نے اتنی جرأت اور قوت برداشت دی کہ وہ اسکول میں تعلیم مکمل کر سکے۔

۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم پوری کر لی اور ایک سرکاری اسکول (الفنسٹن ہائی اسکول) میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کچھ ٹیچروں نے ان کو داخلہ لینے سے روکنے کی کوشش کی اور ان سے کہا کہ وہ بجائے اسکول میں داخلہ لینے کے اپنے غریب ماں باپ کے لیے کچھ کمائیں۔ بھیم راؤ اس قسم کی باتیں پہلے بھی سنتے آئے تھے اس لیے کچھ توجہ نہ کی۔ اُستاد ان کے داخلے کو تو نہ روک سکے مگر تعلیم میں مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانہ میں اسکول میں ایک قدیم زبان پڑھنا ضروری تھا۔ امبیدکر سنسکرت پڑھنا چاہتے تھے مگر وہ اچھوت تھے۔ ان کو تو لکھنا پڑھنا ہی منع تھا اور سنسکرت تو دیوتاؤں کی زبان تھی، انھیں اس زبان کو پڑھنے کی اجازت کیسے مل سکتی تھی۔ امبیدکر کو جب سنسکرت نہ ملی تو انھوں نے اختیاری مضمون کی حیثیت سے فارسی لے لی۔ دوران اسکول انھوں نے اتنی فارسی پڑھ لی کہ وہ اردو اور فارسی کی کتابیں آسانی سے پڑھ لیتے۔

اختیاری زبان کا مسئلہ تو انھوں نے حل کر لیا مگر پھر دوسرا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جو اس سے زیادہ کٹھن تھا۔ والد کی پنشن میں گھر کی دو وقت کی روٹیاں چلنا دشوار تھا، اسکول کی فیس کیسے دی جاتی۔ امبیدکر کے اسکول میں ایک اُستاد ایسے بھی تھے جن میں انسانیت کا جذبہ تھا۔ اتفاق سے ان کی ملاقات مہاراجہ بڑودہ سایاجی گیکواڑ سے تھی جو نہایت مخیر آدمی تھے۔ امبیدکر کے استاد نے مہاراجہ سے کہہ کر ان کو ۲۵ روپیہ ماہوار کا تعلیمی وظیفہ مقرر کرا دیا۔ وظیفہ مقرر ہو گیا تو

کتابوں اور لباس کا سوال پیدا ہوا۔ امبیدکر کے پاس پھٹے پرانے کپڑوں کے علاوہ اتنے اچھے کپڑے نہ تھے کہ وہ ان کو پہن کر اسکول جاتے۔ الفنسٹن اسکول میں ان کے ایک استاد مسٹر مولر تھے، انھیں امبیدکر کی پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے ان کے لیے کتابوں اور کپڑوں کا انتظام کرا دیا۔ ہائی اسکول کرنے کے بعد وہ بڑودہ گئے جہاں ان کو ایک نوکری مل گئی، مگر اسی زمانے میں ان کے والد جن کو امبیدکر بہت چاہتے تھے سخت بیمار پڑ گئے اور وہ نوکری چھوڑ کر بمبئی آ گئے۔ کچھ دنوں بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ امبیدکر کے سر پر پورے خاندان کی ذمہ داری آ پڑی۔ نوکری کہیں مل نہیں رہی تھی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت مہاراجہ بڑودہ نے غریب گھرانوں کے چار لڑکوں کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جن لڑکوں کو امریکہ جانے کے لیے چنا گیا ان میں ایک امبیدکر بھی تھے۔ شرط یہ تھی کہ وہ تعلیم ختم کر کے دس سال ریاست بڑودہ میں ملازمت کریں گے۔ تعلیم کے لیے وظیفہ اتنا تھا کہ امبیدکر نے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ گھر کے اخراجات کے لیے بھیج سکتے تھے۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں امبیدکر امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی پہونچے، جہاں ریاست بڑودہ کی طرف سے ان کے داخلے کا سب انتظام کر دیا گیا تھا۔ کولمبیا یونیورسٹی میں ان کو ایک دوسری دنیا نظر آئی۔ وہاں نہ کوئی ان کی ذات پوچھتا تھا اور نہ انھیں نظر انداز کرتا تھا۔ نہ ہی امتیازی برتاؤ کرتا تھا۔ تحقیر کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ معلمین ان کے ساتھ نہایت ہمدردی کا سلوک کرتے۔ انھوں نے سیاہ فام امریکنوں کو بھی دیکھا، ترقی کے لیے ان کی جد و جہد کو بھی دیکھا۔ انھوں نے سیاہ فام رہنما بروکر واشنگٹن کا بھی ذکر سنا جو بہت بڑے سائنس داں اور بہت مشہور معلم تھے۔ بروکر واشنگٹن ایک غلام گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور محض اپنی محنت اور لگن سے بہت بڑے سائنس داں بن گئے تھے اور سیاہ فام لڑکوں کے لیے ایک بہت بڑا کالج قائم کیا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی سیاہ فام بچوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کے حالات سے امبیدکر بہت متاثر ہوئے۔

امبیدکر نے کولمبیا یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس، سوشیالوجی میں بی اے اور اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں بہت عسرت سے بسر کیا کیوں کہ ان کو اپنے وظیفے سے مستقل طور پر کچھ روپیہ گھر بھیجنا پڑتا اور کچھ روپیہ وہ انگلینڈ جانے کے لیے پس انداز کرتے رہے۔

۱۹۱۶ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے انگلینڈ روانہ ہوئے جہاں انھوں نے لندن اسکول آف اکنامکس کی مشہور درس گاہ میں اقتصادیات پر ریسرچ کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ وہ اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل بھی نہ کر پائے تھے کہ ریاست بڑودہ کے تعلیمی وظیفے کی میعاد ختم ہو گئی۔ امبیدکر کو مجبوراً ۱۹۱۷ء میں ہندستان واپس آنا پڑا یہاں پہونچ کر ان کے لیے ذلت اور تحقیر کا نیا دور شروع ہوا۔

ہندستان پہونچ کر امبیدکر نے بڑودہ کا رُخ کیا جہاں انھیں اپنے معاہدہ کی رو سے دس سال سرکاری نوکری کرنا تھی۔ ان کی قابلیت کے پیش نظر مہاراجہ بڑودہ نے ان کو اپنے ذاتی اسٹاف میں ملٹری سکریٹری کا عہدہ دیا۔ مہاراجہ ان کے علم و ذہانت کے کتنے ہی قدرداں رہے ہوں مگر بڑودہ کے عوام کے لیے وہ محض ایسے شخص تھے جو سماج میں کوئی عزت نہیں رکھتا تھا۔ یہ خبر کہ مہاراجہ نے ایک نظر انداز شخص کو اعلا عہدے پر مقرر کیا ہے، شہر میں تیزی سے پھیل گئی اور بڑودہ کے تمام ہوٹلوں اور مکانوں کے دروازے ان پر بند ہو گئے۔ تمام کوششوں کے بعد ان کو نہ تو کسی ہوٹل میں جگہ ملی نہ کوئی مالک مکان ان کو اپنا کرایہ دار بنانے کے لیے تیار ہوا۔ مکان کی تلاش کے دوران انھیں معلوم ہوا کہ بڑودہ کے پارسی انجمن کے ہوسٹل میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کمرے کرایے پر دیے جاتے ہیں تو امبیدکر ہوسٹل پہونچے اور منتظمین کو بتایا کہ وہ امریکہ سے اعلا ڈگریاں لے کر آئے ہیں اور مہاراجہ نے ان کو نوکری دینے کے لیے بڑودہ مدعو کیا ہے۔ ان کو وہاں ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا۔

قیام کا بندوبست تو ہو گیا مگر دفتر میں ذلت کا دور شروع ہوا۔ کوئی چپراسی ان کی میز کے نزدیک آنا پسند نہیں کرتا تھا اور فائلیں دور سے پھینک دیتا تھا۔ ان کو کوئی پانی تک دینے پر تیار نہ تھا۔ دو ایک دن یوں ہی گزر گئے کہ دفتر کے کسی آدمی نے پارسی انجمن کے

ذمہ داروں کو یہ اطلاع دی کہ ان کے یہاں کا نیا کرایہ دار درج فہرست ذات کا ہے۔ شام کو جب وہ ہوسٹل پہونچے تو دیکھا کہ ان کے کمرے کے آگے ایک مجمع ہے۔ دیکھتے ہی لوگوں نے انھیں برا بھلا کہنا شروع کیا کہ انھوں نے اپنی اصلیت چھپاکر کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور ان کا سامان ہوسٹل کے باہر پھینک دیا۔

ہوسٹل سے نکلنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ بڑودہ شہر میں ان کو سر چھپانے کی یہی ایک جگہ ملی۔ یوں تو امبیدکر بچپن سے ہی بہت سی ذلتیں سہتے آئے تھے مگر امریکہ پہونچ کر یہ زخم کچھ مندمل ہوگئے تھے۔ تحقیر اور ذلت کے اس تازہ زخم سے پرانے زخموں کے انکور بھی پھوٹ گئے۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے حالات پر روئے۔ رات بھر جاگتے اور روتے گزاری۔ دوسرے دن وہ مہاراجہ بڑودہ کے حضور پہونچے اور اپنی بپتا سنائی۔ مہاراجہ نے اپنے دیوان (وزیر اعلا) کو حکم دیا کہ وہ امبیدکر کے قیام کا انتظام کریں۔ دیوان بھی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے اور مہاراجہ بڑودہ اپنی تمام ہمدردیوں کے باوجود اس نوجوان کی مدد سے معذور رہے۔ انھوں نے یہ ضرور کیا کہ امبیدکر کو ریاست میں دس سال نوکری کی شرط سے آزاد کردیا۔ بڑودہ کے حادثے میں امبیدکر کا دل ٹوٹ گیا۔ مگر دبے کچلے افراد کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم بیدار ہوگیا۔ اس عزم میں غصہ نہیں غم تھا۔ جوش نہیں محکم ارادہ تھا۔ انھوں نے یہ طے کرلیا کہ وہ ان لوگوں کی "آزادی" کے لیے اپنی زندگی وقف کردیں گے اور انھوں نے یہ کرکے دکھا بھی دیا۔ بمبئی میں ان کو اگر کوئی نوکری ملی تو صرف گھروں پر جاکر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا کام مل سکا، جس میں آمدنی بہت کم تھی اور ذمہ داریاں بہت زیادہ۔

اس پریشانی کے دور میں ان کو معلوم ہوا کہ حکومت بمبئی کے ایک کالج سینڈ ہوم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس میں پروفیسر کی جگہ خالی ہے لارڈ سینڈ ہوم، جن کے نام پر یہ کالج قائم ہوا تھا، صوبہ بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے۔ لندن میں قیام کے دوران امبیدکر ان سے کئی مرتبہ ملے تھے اور وہ امبیدکر کی قابلیت اور ذہانت سے بہت متاثر تھے امبیدکر نے لارڈ سینڈ ہوم کو ایک خط لکھا کہ اگر وہ سفارش کردیں تو ان کو کالج میں نوکری مل جائے گی۔ لارڈ سینڈ ہوم نے حکومت بمبئی کو خط لکھا اور امبیدکر پہلی بار ان کے علمی مرتبے کے لائق نوکری ملی۔ امبیدکر بہت کامیاب پروفیسر ثابت ہوئے۔ کلاس میں ان کے لکچر اتنے مقبول ہوئے کہ دوسرے کالجوں کے لڑکے اپنے پرنسپل کی اجازت لے کر ان کے لیکچر سننے کے لیے آنے لگے۔ مگر امبیدکر کا مقصد سینڈ ہوم کالج میں نوکری کرنا نہیں تھا۔ وہ نوکری کرکے اتنا روپیہ پس انداز کرلینا چاہتے تھے کہ دوبارہ لندن جاکر اقتصادیات کے شعبے میں اپنی تحقیق مکمل کرلیں۔ چنانچہ وہ بمبئی کے چال کی اسی جھگی میں رہتے رہے جہاں وہ بمبئی آکر سب سے پہلے مقیم ہوئے تھے۔

سینڈ ہوم کالج میں نوکری ملنے کے بعد انھوں نے سماج کے نظر انداز افراد کی تنظیم کا کام شروع کردیا۔ خوش قسمتی سے مہاراشٹر میں مہاتما جوتی با فولے رہنما پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اپنی قابلیت اور قربانیوں سے نظر انداز افراد کے ایک طبقے کو ان کے صدیوں پرانے خواب غفلت سے بیدار کردیا تھا۔ یہ بیداری امبیدکر کے بہت کام آئی ان کے کام میں تعاون کرنے کے لیے انھیں بہت سے نوجوان مل گئے۔ امبیدکر چھٹی کے دن میں مہاراشٹر کے کسی نہ کسی ضلع میں جاتے اور اپنی تشکیل کردہ تنظیم کی شاخ قائم کرتے اور پسماندہ بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے۔ وہ اتنے مقبول ہوئے کہ ہر طرف ان کی مانگ ہونے لگی۔ جیسے ہی ان کو محسوس ہوا کہ ان کی تنظیم نے جڑ پکڑ لی ہے اور ان کے نائبین ان کی عدم موجودگی میں تنظیم کا کام چلاتے رہیں گے، انھوں نے سینڈ ہوم کالج کی نوکری سے استعفا دیا اور ستمبر ۱۹۲۰ء میں لندن پہونچ گئے۔ وہاں ریسرچ کے کام کو مکمل کرکے لندن اسکول آف اکنامکس میں اپنی تھیسس داخل کردی۔ لندن پہونچ کر انھوں نے قانون کے کالج گریز ان (Gray's Inn) میں بار ایٹ لا کی ڈگری کے لیے داخلہ لے لیا۔ اور قانون کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔ کچھ دنوں بعد ان کی تھیسس بھی منظور ہوگئی اور امبیدکر ڈی ایس سی اور بیرسٹری کی ڈگریاں لے کر واپس لوٹے۔

۱۹۲۳ء میں جب وہ بمبئی واپس پہونچے تو ہائی کورٹ میں بیرسٹر

کی حیثیت سے اپنے نام کا رجسٹریشن کرانے کے لیے ان کے پاس فیس نہیں تھی جو کئی ہزار روپیہ تھی۔ انھوں نے اپنے دوست ناول بھتا تینہ سے قرض لے کر فیس کے روپئے داخل کیے۔ ناول بھتا تینہ ان کے سچے دوست تھے اور ہر مالی پریشانی کے وقت ان کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر امبیدکر دوبارہ لندن گئے تو ناول بھتا تینہ ان کو وقت بوقت روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر امبیدکر کا شمار ذہین اور ہوشیار بیرسٹروں میں ہوتا تھا مگر ان کی آمدنی کم تھی۔ ان کے موکل زیادہ تر غریب طبقے سے آتے تھے اور لمبی فیس نہیں دے سکتے تھے۔ ڈاکٹر امبیدکر کو اس کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کی کھولی غریبوں کے محلّے میں تھی۔ وہ غریبوں کے بیرسٹر تھے۔ وہ غریبوں کے لیے صرف عدالتوں میں نہیں سیاسی، سماجی، اقتصادی ہر محاذ پر لڑتے تھے۔ ان کی قربانیوں نے پس ماندہ افراد میں نئی زندگی اور نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں جن طبقات کو سیاسی دنیا میں کوئی پوچھتا نہ تھا، ان کو سب پوچھنے لگے۔

۱۹۲۶ء میں جب برطانوی حکومت نے ہندستان میں صوبائی کونسلیں قائم کیں تو مہاراشٹر اور گجرات سمیت کئی صوبوں کی کونسل میں نظرانداز طبقے کے افراد کو نامزد ممبر بنایا گیا۔ ان میں کئی آدمی ڈاکٹر صاحب کے نائب تھے۔ خود ڈاکٹر امبیدکر بمبئی صوبائی کونسل کے ممبر بنے۔

اسی زمانہ میں حکومت برطانیہ نے ہندستان کے لیے نیا دستور بنانے کا فیصلہ کیا تو حق رائے دہندگی کے بارے میں تفتیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی South borogh commite بنائی۔ اس کمیٹی نے بمبئی میں ڈاکٹر امبیدکر کو مشورہ کے لیے مدعو کیا۔ ڈاکٹر امبیدکر نے کمیٹی کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں نظرانداز افراد کے لیے مجلس قانون ساز میں ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن اور جداگانہ انتخاب کی مانگ کی گئی تھی۔

ڈاکٹر امبیدکر کو یقین تھا کہ نظرانداز طبقے کے افراد کا مسئلہ سماجی نہیں سیاسی تھا اور اس کا حل صرف یہ تھا کہ ایسے افراد کے لیے مجالس قانون ساز میں نشستیں ریزرو کی جائیں اور جداگانہ انتخاب کا انتظام ہو اور سرکاری نوکریوں میں بھی ان کی نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ اس طرح ان کو ملک کے سیاسی نظام میں حصّہ ملے گا۔

۱۹۳۲ء میں حکومت نے ہندستان کے نئے دستور کا اعلان کیا تو اس میں ڈاکٹر امبیدکر کی مانگی ہوئی تجاویز موجود تھیں۔ جداگانہ انتخاب کے مسئلہ پر ہندستان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ یہ حکومت برطانیہ کی ہندستان کو تقسیم کرنے کی ایک چال ہے۔ انھوں نے اس کے خلاف مرن برت کا اعلان کر دیا۔ حکومت برطانیہ نے کہا کہ اگر پسماندہ طبقے کے رہنما ڈاکٹر امبیدکر گاندھی جی کے مطالبہ کو مان لیں تو حکومت کو اسے منظور کرنے میں دیر نہ لگے گی۔

اب پورے مسئلے کا فیصلہ ڈاکٹر امبیدکر کے ہاں اور نہیں پر تھا مہاتما گاندھی نشستوں کے ریزرویشن کے لیے تیار تھے۔ مگر جداگانہ انتخاب منظور کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مہاتما گاندھی کا مرن برت شروع ہوا تو ہندستان کے تمام چھوٹے بڑے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کے پاس دوڑے اور استدعا کی کہ وہ گاندھی جی کی جان بچانے کے لیے جداگانہ انتخاب کو ختم کر دیں۔ یہ گفتگو کئی دن تک جاری رہی ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے اس مطالبہ کو مشروط طور پر منظور کر لیا اور مہاتما گاندھی کی جان بچا لی۔

اس طرح سماج کے ایک ایسے طبقے کا فرد جس کا سایہ بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا، ہندستان کی قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔

□□

غزل

[illegible]

شکستگی پہ بھی رنجور ہو تو جشن کرو
کہ ظرفِ جاں بھی گر چور ہو تو جشن کرو

یہ اک نشہ بھی کہاں سب پہ یوں اترتا ہے
بہ وصفِ عشق جو مذکور ہو تو جشن کرو

جو "دار" ہو تو بین اپنے ہونے پر
کسی دشا سے جو منصور ہو تو جشن کرو

خلا اگر کرو محسوس خود کو تو بھی ہنسو
فضا جو دھند سے معمور ہو تو جشن کرو

غزلیں

ویرانی کو کم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا
پیہم وحشت ہم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

نرغے میں وحشی کو لے کر، جھرنے، طوفاں اور بگولے
مل جل کر ماتم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

ندیاں ریگستانی ہم سے، صحرا میں طغیانی ہم سے
آب و گل مدغم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

بے شک ہم عصیاں پیکر ہیں، اپنا دامن تر رکھتے ہیں
سب کی آنکھیں نم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

برپا ہے طوفانِ محبت، خشکی میں بھی پانی میں بھی
تقلیدِ آدم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

چاروں طرف ہنگامہ کیوں ہے خون میں تر ہر خامہ کیوں ہے
سچ کے ہاتھ قلم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

کچھ شیطان فرشتے بن کر، نورانی ملبوس پہن کر
مٹی پانی کم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

موجوں کو شمشیر بنا کر، آندھی کا پرچم لہرا کر
خوب مظفر رم کرتے ہیں قریہ قریہ، دریا دریا

پروفیسر مظفر حنفی
P-1/7.C.I.T. Scheme VII M
کلکتہ - ۵۴

نیا زمانہ نئی زندگی پکارے گی
نئی سحر کو نئی روشنی پکارے گی

ذرا اُداس ہوا تو خوشی پکارے گی
دلِ فسردہ کو زندہ دلی پکارے گی

سمجھ کے صحنِ گلستاں کا سرپرست مجھے
کہیں سے پھول کہیں سے کلی پکارے گی

بڑھے گی بادِ صبا میرے خیر مقدم کو
گل و سمن کی مجھے دلکشی پکارے گی

ہماری جرأتِ پرواز کو خلاؤں سے
مہ و نجوم کی تابندگی پکارے گی

سفر کی شام سجائے گی ریت کا بستر
نگارِ خواب کو واماندگی پکارے گی

نہنگِ ابر نگل جائے گا اُجالوں کو
فروغِ صبح کو تیرہ شبی پکارے گی

لبِ فرات نہ وہ قافلہ اب اُترے گا
کوئی حسینؑ نہ تشنہ لبی پکارے گی

بڑھیں گی حد سے زیادہ جو تلخیاں ماہرؔ
ضمیر جاگ اُٹھے گا خودی پکارے گی

اقبال ماہر
۲۲۷، نخاس کہنہ۔ الہ آباد ۳

سراج حسین

علم روشنی ہے تو ناخواندگی اندھیرا

تعلیم اور خواندگی کے بجائے عام طور پر لوگ روٹی کپڑا اور مکان کو ہی زندگی کی ضرورت مانتے ہیں کسی حد تک یہ ٹھیک بھی ہے لیکن زندگی ، اور ، خوشحال زندگی ، کے فرق کو اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ خواندگی کا ، خوشحال زندگی ، بنانے میں اہم کردار ہو

ہمارے سماج میں آج ان بڑوں اور بزرگوں کی تعداد زیادہ ہے جنھیں پڑھنے لکھنے کی عمر (بچپن) میں تعلیم حاصل کرنے اور پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں مل سکا یا تو ان کے وطن میں پڑھنے لکھنے کی سہولت نہیں تھی یا اسکول کالج نہیں تھے یا اگر اسکول کالج تھے بھی تو والدین نے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجا یا اگر اس کی اہمیت سمجھتے بھی تھے تو روزی روٹی اور غربت کی مجبوریوں نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ زندگی کو خوشحال بنانے اور اسے ترقی دینے کے پیش نظر ہمارے ملک کی مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ملک کو خواندگی کے عطیہ سے مالامال کر دیا جائے اس مقصد کے پیش نظر تعلیم کی بنیادی اکائی حرف شناسی اور خواندگی کو فروغ دینے کے لیے ۵ مئی ۱۹۸۸ء میں ایک تحریک چلائی گئی ، قومی خواندگی مشن ۔ (راشٹریہ ساچھرتا مشن) گو کہ تعلیم بالغان کے نام سے پہلے ہی کئی اسکیمیں چلائی گئیں لیکن کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا تھا۔

اس مشن کے تحت اس سمت میں کافی ترقی ہوئی۔ صوبہ کیرل کی خواندگی شرح ، ۹۱ ، ۸۹ فیصد ہوگئی اور صوبہ اتر پردیش میں آگرہ ضلع میں کامیابی ملی۔ ہماری حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ تین سال کے عرصہ میں ہم پوری ریاست کو مکمل طور پر حرف شناس بنا دیں گے۔

وہ لوگ جو کسی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ گئے ہیں اور ان کے دل کے گوشہ میں اپنے اندر علم کی کمی کا احساس تھا یا اب پڑھنے لکھنے کا شوق بیدار ہوا ہے تو انھیں بغیر کسی شرم اور جھجک کے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ کیونکہ آج کے موجودہ زمانے میں اپنے کو پڑھا لکھا بنانا اور عمر کے کسی بھی حصہ میں بھی علم کو حاصل کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی طرح کا عار یا شرم محسوس کی جانی چاہئے۔

حضرت محمدؐ نے بھی بارہا تعلیم پر زور دیتے ہوئے فرمایا ہے اُطلبوا العلم من المھد الی اللحد (گود سے لے کر گور تک علم حاصل کرو) یعنی علم کو حاصل کرنے کے لیے عمر کے کسی خاص حصہ یا کسی خاص وقت اور زمانہ کی قید نہیں ہے یعنی ماں کی گود سے لے کر قبر میں پہنچنے تک ۔ جب تک انسان کی زندگی ہے علم حاصل کیا جائے ۔

عربی زبان کی ایک مثل کلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم یعنی علم و حکمت کی بات تو کسی سمجھدار اور علم و حکمت کے متلاشی انسان کا گمشدہ مال ہے ۔ وہ جہاں جس حال میں جس جگہ بھی پڑا ہوا ہے اسے خوشی سے اٹھا لینا ہی سمجھداری کی بات ہے ۔

کیا علم آپ کی اپنی کھوئی ہوئی دولت نہیں ہے جسے پالینے اور اٹھا کر سینے سے لگا لینے میں آپ شرم محسوس کریں۔

اُطلبوا العلم ولو کان بالصین (علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو) یعنی اگر علم حاصل کرنے کے لیے زبردست صعوبتیں

بھی اٹھانی پڑیں تو اٹھایا جانا چاہیئے۔
وید میں کہا گیا ہے۔ "گیان قمراندھیرہ۔ گیانان جن شلا کیا۔
(گیان ہی پرکاش ہے اگیان ہی اندھکار ہے)
اور یہ بھی کہا گیا کہ "بدنے گیانم نہ مکتی"۔

خواندگی کا نشانہ حکومت نے ۹ سال کے بچوں سے لے کر ۳۵ سال تک کے افراد کو بنایا ہے۔ اس سے کم اور زیادہ عمر کے لوگ بھی اس سے استفادہ حاصل کریں ان کے لیے روک نہیں ہے لیکن کسی نتیجہ کو برآمد کرنے کے لیے اسکیم کا بنانا اور عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد کم خرچ میں زیادہ لوگوں کو خواندہ بنانا ہے اور اس کی بنیاد کا کھا رضاکارانہ ہے اس کے لیے حکومت نے رضاکار تنظیموں سے بھی ان کا بھرپور تعاون مانگا ہے۔ کوئی بھی تعلیم یافتہ انسان اس مہم کے لیے اپنی خدمات دے سکتا ہے اس کے لیے نہ کسی عمارت کی ضرورت ہے نہ کسی ساز و سامان کی۔ کھلے آسمان کے نیچے گھاس پر بیٹھ کر نا حرف شناس لوگوں کو پڑھایا جا سکتا ہے۔ جس علاقے میں غربت ہو اس علاقے میں پتھروں پر کوئلے سے حروف تہجی لکھ کر کسی بھی نا حرف شناس کو حرف شناس بنایا جا سکتا ہے اور اس کام کو اس انداز سے کیا بھی جا رہا ہے امریکہ کے معروف و مشہور صدر ابراہم لنکن کی سوتیلی ماں نے بھی انھیں زمین پر کوئلے سے لکھ تعلیم دی تھی۔

ملک کے جن صوبوں میں خواندگی شرح زیادہ ہے اور وجوہات یکساں رہنے پر بھی عورتوں میں خواندگی شرح اچھی ہے۔ بچوں کی اموات اور پیدائش کی شرح کم ہے۔

سماج کے دبے کچلے استحصال کے شکار افراد اور پسماندہ طبقہ کے لیے خواندگی ایک اہم ضرورت ہے۔ گھریلو صنعت ہو یا کوئی بھی کاروبار۔ حساب کی ضرورت تو ہر جگہ ہی پڑتی ہے اور حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ نہ ہو اس کے لیے کسان، دستکار اور تجارت پیشہ افراد کا خواندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ خواندگی انسان میں خود اعتمادی اور یقین پیدا کرتی ہے جو انسان کے ارتقاء کی ضامن ہے۔ کوئی ملک کس قدر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ہے اس کی کسوٹی وہاں کی تعلیمی استعداد سے ہی طے کی جاتی ہے۔

اترپردیش میں خواندگی کی شرح ۶۰، ۴۱ فیصد ہے جبکہ قومی سطح پر یہ شرح ۲۱، ۵۲ فیصد ہے۔ خواتین میں یہ شرح ۳۱، ۲۵ فیصد ہے جبکہ مردوں کی خواندگی کی شرح ۷۳، ۵۵ فیصد ہے۔ دیہی علاقوں میں خواندگی کی شرح ۴۶٫۶۶ فیصد ہے ان میں خواتین کی شرح ۰۲، ۱۹ فیصد ہی ہو۔ اس کے برعکس شہری علاقوں کی خواندگی شرح ۶۱ فیصد ہے اور ان میں خواتین کی خواندگی شرح ۳۸، ۵۰ فیصد ہے۔

مکمل خواندگی مہم صوبہ کے ۶۳ اضلاع میں چلائے جانے کے لیے مرکزی حکومت نے منظوری دے دی ہے۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت نے ۱۸ اضلاع میں پوسٹ لٹریسی پروگرام بھی چلائے جانے کی منظوری دی ہے۔ مستقبل قریب میں باقی ۵ اور ۱ اضلاع میں خواندگی مہم کی منظوری ملنے کے امکانات ہیں۔

صوبہ اترپردیش کے ۱۰ اضلاع دہرہ دون، کانپور نگر، چمولی، پوڑی گڑھوال، پتھورا گڑھ، الموڑہ، لکھنؤ، نینی تال، غازی آباد اور اٹاوہ کو چھوڑ کر باقی اضلاع میں خواندگی شرح قومی سطح سے بھی کم ہے۔ ستا اضلاع، مرادآباد، گونڈہ، بریلی، مہاراج گنج، رام پور اور بہرائچ کے دیہی علاقوں میں عورتوں کی شرح خواندگی صرف ۸۹، ۷ فیصد ہے۔ یوپی کے سبھی اضلاع کی ایک فہرست بھی اس مضمون کے آخر میں دی گئی ہو اترپردیش کے کل ۶۸ اضلاع میں سے ۷ اضلاع ایسے ہیں جہاں ۲۰ سے ۳۰ فیصد۔ ۲۱ اضلاع ایسے ہیں جنمیں ۳۰ سے ۴۰ فیصد ۲۴ اضلاع ایسے ہیں جن میں ۴۱ سے ۵۰ فیصد ۱۲ اضلاع ایسے ہیں جن میں ۵۱ سے ۶۰ فیصد اور ۴ اضلاع ایسے ہیں جن میں ۶۱ سے ۷۱ فیصد ہی خواندگی ہے۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۵ سال کی عمر کے ۹۰، ۲ کروڑ لوگ ناخواندہ ہیں جن میں خواتین بھی شامل ہیں۔ شہری علاقے کے ناخواندہ لوگوں میں تقریباً سبھی لوگ کسی نہ کسی روزگار سے لگے ہوئے افراد ہوتے ہیں۔

دیہی علاقے کے باشندے جو ناخواندہ ہیں ان کی مصروفیات کچھ مختلف ہیں۔ ان لوگوں کی مصروفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے خواندہ بنانے کی کارروائی کی جاتی ہے جو مہم کے منصوبہ میں شامل ہے

جہاں پڑھائی کا کام شروع ہو گیا ہے وہاں ان کے فارغ وقت کو دھیان میں رکھ کر ہی پڑھانے کا کام کیا جا رہا ہے۔

ناحرف شناس افراد کو حرف شناس بنانے کے لیے خواندہ افراد کی ضرورت ہے اور یہ ایسے فرد ہوں جو بے لوث اور رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات دینے کے لیے تیار ہوں اور ایسے ہی افراد کو تیار کرنے کی ضرورت بھی ہے جو رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات فراہم کر سکیں۔ اس تحریک میں ہر طبقہ کی نمائندگی کا منصوبہ ہے۔ یہ نمائندگی خاص طور سے خواتین میں ہے تاکہ پردہ نشین خواتین کو بھی پڑھا لکھا سکیں۔ اس کے لیے منتخب خواتین کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ناخواندہ کو خواندہ بنانے کے لیے ضلع سطح پر ضلع ساچھرتا کمیٹی (Z.S.S) بنائی گئی ہے اس میں سرکاری اور غیر سرکاری سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں۔ اس کے تحت مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ ساچھرتا سمیتی ہی پر پورے ضلع کو خواندہ بنانے کی ذمہ داری ہے یہاں کے رضاکار مقامی دشواریوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ناحرف شناسی کو ختم کرنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ یہ کمیٹی ضلع کے ڈی ایم کے زیر صدارت تشکیل کی گئی ہے کیونکہ سرکار کا ماننا ہے کہ سوسائٹی کے پڑھے لکھے لوگوں کی یہ سوشل ذمہ داری ہے کہ وہ ناخواندہ لوگوں کو تعلیم کی شمع سے روشن کریں۔

کمیٹی ناخواندہ افراد کا سروے کرا کر یہ طے کرتی ہے کہ کن علاقوں میں کس طرح خواندگی کے پروگرام چلائے۔ حکومت کی جانب سے پڑھانے والے افراد کو کوئی اُجرت نہیں دی جاتی ہے لیکن پڑھنے والے کو کتاب، کاپی، پنسل، ربر اور سلیٹ مفت مہیا کرائی جاتی ہے روزانہ کسی وقت محض دو گھنٹہ پڑھا کر سرکار کے ذریعہ مہیا کرائی گئی کل تین کتابوں کو ۲۰۰ گھنٹوں (۶ ماہ) میں ختم کرائے جانے کا پروگرام ہے اس میں حساب کا پڑھنا بھی شامل ہے۔

اردو زبان سے متعلق ناحرف شناس کو خواندہ بنایا جا سکے اس کے لیے وہ تمام افراد جو اردو زبان کو پڑھنا چاہتے ہیں انھیں اردو کی کتابیں مہیا کرائی جائیں گی اور جو لوگ ہندی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں انھیں ہندی کتابیں مہیا کرائی جا رہی ہیں۔

خواندگی کی مہم بالغ افراد کے ساتھ ساتھ نابالغ اور کم عمر لوگوں میں بھی چلائی جا رہی ہے اس کے لیے نان فارمل تعلیم کے نام سے اسکیم ہے جو ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کو خصوصی طور سے گاؤں کے مقامی باشندوں کی سہولت کے مطابق اختیار کی گئی ہے تاکہ بالغ ہونے پر کوئی شخص ناخواندہ نہ رہے ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ یہ محسوس کریں کہ بغیر علم کے بہتر زندگی نہیں بسر کی جا سکتی ہے۔ تعلیم سے ہی کسی خاندان اور اس کے افراد نیز عزیز و اقارب کی، دوست احباب کی اور سماج کی فلاح و بہبود ممکن ہے۔ اپنے صحت کے تئیں بیدار رہا جا سکتا ہے اور ہر شعبۂ حیات میں خود کفیل رہا جا سکتا ہے۔ یہ اچھا اور سنہرا موقع ہے۔ اپنی محنت، کوشش اور حکومت کے تعاون سے ناخواندہ کو خواندہ بنانے کی۔

حرف شناس اور ناخواندہ رضاکاروں کی تربیت

مکمل خواندگی مہم کے نفاذ کے لیے خواندہ رضاکاروں/سینکوں کی تربیت اور ان میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضلع سطح پر ضلع مجسٹریٹ کی نگرانی میں تربیت کیمپ لگائے جا رہے ہیں۔ خواندگی مہم کے نشانے کی وسعت اور مقررہ مدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خواندہ رضاکاروں کی تربیت تین مرحلوں میں کی جاتی ہے۔ اول ۱۰ ناحرف شناس پر ایک خواندہ رضاکار/سینک، دوم ۲۵ سے ۳۰ رضاکار پر ایک ماسٹر ٹرینر پر ایک لک کلیدی شخص (کی ریسورس پرسن)

خواندہ رضاکار/سینکوں کی تربیتی نصاب میں مندرجہ ذیل نکات کو خصوصی طور سے شامل کیا جاتا ہے۔

• نشانہ افراد کی حوصلہ افزائی اور ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنا لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے استعمال کا خصوصی طور پر ریاض جس میں پڑھنا لکھنا اور اعداد و شمار کے تمام ابواب شامل ہوں۔ صحیح موقع پر صحیح اطلاع دینے کی ہمت اور دئے گئے مشوروں کے مطابق سدھار کرنے کی تیاری، لکھنے پڑھنے میں سیکھنے والوں کو برابر کا حصہ بنائے رکھنے کی صلاحیت۔ ماسٹر ٹرینر کی تربیت میں ان نکات کو شامل کیا جاتا ہے۔

خواندہ سینکوں کی حوصلہ افزائی • خواندہ سینک کے ذریعہ دیہی تعلیم کمیٹی سے حوصلہ اطلاعات کا تجزیہ اور مستقبل کے پروگراموں کے سلسلے میں مشاورتی خدمات تعلیم دینے والے افراد کی صلاحیت کا تجزیہ۔

کلیدی شخص (کی ریورس پرسن) کی تربیت میں اوپر دیے گئے نکات کے علاوہ حسب ذیل نکات کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہ افراد لکھنؤ میں محکمہ تعلیم بالغان نبی اللہ روڈ نزد سٹی اسٹیشن (رانس منڈی) اور ساچھرتا نکیتن عالم باغ لکھنؤ میں تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ کے ذریعہ یہ افراد ایک ہفتہ کے لیے لکھنؤ میں بھیجے جاتے ہیں۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام ضلع ساچھرتا سمیتی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

ضلع کے حرف شناسی اسکیم کی سمجھ • خواندگی کو فروغ دینے کی ہمہ جہت کوشش • رضاکاروں / سینکوں کی لگاتار تربیت اور حوصلہ افزائی کے لیے پروگراموں کا انعقاد۔

مہم کے لیے ہر سطح پر کلیدی خدمات کی تیاری

خواندگی مہم میں کلیدی شخص اور ماسٹر ٹرینر کے انتخابات کے لیے حسب ذیل لیاقتوں کو دیکھے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرد جانکار اور متجسس ہو • فرد میں سیکھنے کی صلاحیت ہو • فرد معزز ہو • فرد مہم کو وقت دے سکے اور فرد میں رجائیت کا ہونا اشد ضروری ہے۔ خواندہ بنانے کے لیے تربیت کے طریقے، نصابی کم عملی زیادہ ہوں۔

خواندگی کا نشانہ ہے

پرائمری اسکول جانے والے تمام بچوں کو اسکولوں میں داخل کرانا اور انہیں درجہ ۵ تک کی تعلیم دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا۔ جو بچے پرائمری سطح کی تعلیم نہیں حاصل کر سکے ہیں یا درمیان میں ہی پڑھائی چھوڑ چکے ہیں انہیں حرف شناس مراکز یا نان فارمل تعلیم سنٹر پر خواندہ کرانا۔

خواندگی کیا ہے

خواندگی انگوٹھے کے نشان سے نجات کا نام نہیں ہے۔ خواندگی کا مطلب ہے کام کے مطابق پڑھنا لکھنا اور سمجھنا جس میں شامل ہے۔

- اپنے پسماندہ ہونے کی وجوہات اور ترقیاتی اسکیموں کے ذریعہ اس کا تدارک۔
- اپنی مالی حالت سدھارنے اور خوشحال بننے کے لیے ضروری ہنروں کو سیکھنا۔
- قومی ایکتا، بھائی چارہ، عورت مرد کے مساوی حقوق۔ فیملی پلاننگ اور فضائی آلودگی کی جانکاری

خواندگی کا پیمانہ ہے

سیکھنے والے کی پسند کے سبق پر کسی آسان پیراگراف کا ۳۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے عام بول چال کی زبان میں بول کر پڑھنا • آسان زبان میں لکھے چھوٹے پیراگراف کا ۲۵ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے خاموشی سے سمجھ کر پڑھنا۔ اپنے ارد گرد کے ماحول اور فضائی آلودگی وغیرہ کے متعلق آسان زبان میں لکھی ہوئی چیزوں کا سمجھ لینا۔
سات الفاظ فی منٹ کی رفتار سے سمجھتے ہوئے نقل لکھنا پانچ لفظ فی منٹ کی رفتار سے املا لکھنا۔ حروف اور الفاظ کے بیچ متعین دوری رکھتے ہوئے سیدھی لائن میں لکھنا۔ اپنے آپ خط لکھنے، عرضی لکھنے اور ضرورت پڑنے پر فارم وغیرہ بھرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
ایک سے سو تک عدد لکھنا، آسان حساب کر لینا یعنی سیکڑا تک جوڑ باقی اور دہائی عدد تک تقسیم ضرب کی جانکاری۔ میٹرک پیمانہ ناپ، تول، روپیہ، پیسہ، دوری کا پیمانہ اور گھڑی سے وقت معلوم کر لینا، تناسب اور سود سے متعلق حساب کی معلومات۔

خواندگی کی ضرورت کا احساس

لوگوں کو صرف سرکار خواندہ نہیں بنا سکتی ہے اس میں عوام اور عوامی نمائندوں کی شرکت ضروری ہے۔ خواندگی کی شرط ہے کہ لوگوں کو خواندگی کی ضرورت اور افادیت بتائی جائے تاکہ ناحرف شناس خود سے خواندہ ہونے کے لیے میدان عمل میں آ سکیں۔
حرف شناس کی زبان: پڑھائی اسی زبان اور بولی میں کرائی

جانی چاہیئے۔ جو لوگوں کی اپنی زبان اور بولی ہو اس لیے اتر پردیش میں ۱۰ فیصد خواندہ مراکز پر اردو تعلیم کا انتظام ہے اور صوبہ میں الگ الگ علاقوں کے لیے کتابیں تیار کی گئی ہیں۔ اردو میں فراہم کی جانے والی اس کتاب کا نام "ہم پڑھیں" حصہ اول، دوم اور سوم ہے۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ کے شعبہ اسٹیٹ ریورز سینٹر سے شائع ہوئی ہو۔

مہم میں آپ

آپ عوام کے نمائندہ ہیں ممبر پارلیمنٹ، ممبر قانون ساز اسمبلی، بلاک پرمکھ، پردھان یا سیاسی پارٹی کے صدر ہیں۔ آپکے پیچھے عوام کی ایک فوج ہے۔ یہ مہم آپکی ہے اس لیے مثبت ماحول بنانے سیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، حرف شناس سینک/رضاکار تیار کرنے اور مہم کی کامیاب نگرانی کے لیے اپنے ساتھیوں کو تیار کریں اور ضلع سا بھرتا سمیتی کی رہنمائی کرتے رہیں۔

آپ میڈیا سے جڑے ہیں۔ اخبار نویس، مدیر، شاعر/آرٹسٹ یا کلاکار ہیں۔ مہم کو عوامی بنانے میں آپ کا تعاون نہایت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

<u>آپ اساتذہ ہیں پرائمری ہائر سیکنڈری یا ڈگری کالج کے</u>

آپ کا تعاون اور بھی اہم ہے۔ آپ اپنے اوقات کی قربانی دیں ماسٹر ٹرینر بنیں، کلیدی شخص بنیں اور مہم کی کامیابی کے لیے اپنی اہم ذمہ داری سمجھتے ہوئے حوصلہ افزائی کریں۔

<u>آپ طالب علم ہیں تعلیم یافتہ نوجوان ہیں نہرو یوا کیندر یووک منڈل دل یا مہلا منڈل کے عہدیدار ہیں</u>:- آپ مہم کی ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہیں۔ آپ کے آس پاس کوئی ناحرف شناس نہ رہ جائے اس کے لیے کارگر کوشش کریں۔

<u>آپ مل مالک ہیں تاجر ہیں</u>:- آپ اپنے سے جڑے لوگوں کو خواندگی کے لیے اکسائیں۔ انھیں تقویت پہنچانے کے لیے وقت دیں۔ خواندہ رضاکاروں/سیکھوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی طرف توجہ دیں۔

<u>آپ وکیل ڈاکٹر یا انجینئر ہیں</u>:- آپ خواندگی مہم کے لیے ناحرف شناس صحت حرف شناسی کا کام کر سکتے ہیں۔ اس طرف تھوڑا فکرمند ہونا مہم کی رفتار کو تیز کر سکتا ہو۔

<u>آپ گھریلو خواتین کسان یا عام شہری ہیں</u>:- آپ خود مہم میں ہاتھ بٹائیں لوگوں کو تیار کریں۔ پڑھیں اور پڑھائیں۔ اپنے گھر، خاندان پڑوسی، گاؤں اور سماج کو خواندہ بنانے کا تہیہ کریں۔

<u>آپ رضاکار تنظیموں سے جڑے ہیں روٹیرین لائنس یا جے سینز کے ممبر ہیں</u>:- آپ خواندگی مہم میں اپنی حصہ داری سے صوبہ کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

<u>آپ آفیسر ہیں کرمچاری ہیں یا کسی عہدے پر ہیں</u>

آپ روزانہ کچھ وقت اس مہم کو دیں۔

<u>آپ عالم ہیں مسجد کے امام ہیں معلم ہیں</u>:- آپ کا ہر قدم باعثِ برکت ہے۔ مکمل خواندگی اور اصلاح کے لیے دو گھنٹہ ضرور صرف کریں۔ یہ ملک کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ہر فرد کی زندگی کو بھی خوشحال بنائے گا۔

سوسائٹی میں خواندگی کے لیے پیاس اور تڑپ پیدا کرنا وقت کا اولین تقاضہ ہے۔

□□

اہلِ قلم معاونین سے گذارش ہے کہ وہ نثری/شعری تخلیقات کی اصل کاپی ہی بھیجیں زیراکس یا کاربن کاپی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

——— ادارہ

دھواں

یہ برف کی دبیز تہ پہ رینگتا ہوا دھواں
جمی جمی سی ٹھنڈکوں پہ اونگھتا ہوا دھواں
تباہیوں کی تربیت میں ناچتا ہوا دھواں
یہ راکھ کے دبے شرر اچھالتا ہوا دھواں
یہ جھونپڑوں کے پھوس سے پکارتا ہوا دھواں
یہ زندگی کے مقبروں کو روندتا ہوا دھواں
حصارِ بن کے گاؤں گاؤں تیرتا ہوا دھواں
یہ کھڑکیوں سے روزنوں سے جھانکتا ہوا دھواں
بنامِ جنگ سرحدوں پہ چیختا ہوا دھواں
جلے جلے سے پیکروں میں گھومتا ہوا دھواں
یہ ذہن کو، ضمیر کو بکھیرتا ہوا دھواں
جنون میں ہوا کے رخ پہ بھاگتا ہوا دھواں
یہ روشنی کے راستوں کو روکتا ہوا دھواں
یہ بلڈنگوں کے حاشیوں کو چومتا ہوا دھواں
یہ چمنیوں سے بستیاں پھلانگتا ہوا دھواں
یہ آسماں پہ راکٹوں کا دوڑتا ہوا دھواں

یہ حادثے یہ تجربے تو زندگی کے ساتھ ہیں
کوئی دھواں ہو اسکے پیچھے میرے اپنے ہاتھ ہیں
یہ بات سوچنے کی ہے کہاں کہاں دھواں نہ ہو

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ ۳

میخانہ

یہ حسیں میخانہ، یہ رقص و سرود
یہ عالمِ مستی یہ دولت کا غرور
تم نے سوچا ہے کبھی
ان کی ہی دیواروں میں کتنی بے جان کہانی کے نشاں باقی ہیں
کسی بیوہ کی کہانی ہے انھیں میں پیوست
کتنی سنسان جوانی ہے انھیں میں پیوست
تم اگر غور سے دیکھو تو اسی ساغر میں
چند قطرے بھی تمھیں خوں کے نظر آئیں گے
اے مرے دوست کیسے سمجھاؤں
کتنے گلشن بنے ویرانے کیسے سمجھاؤں
چند منٹوں میں اتر جاتا ہے اس مے کا سرور
کیا بھلا سکتے ہو ان درد بھری آہوں کو
وہی آہیں جو کبھی تاج محل سے نکلیں
وہی آہیں جو کبھی لال قلعہ سے ابھریں
ان کی تاثیر محبت کی قسم کھاتا ہوں
جو کبھی آ کے میناروں سے ٹکراتی ہیں۔

منظور العباس سرکار
گورنمنٹ آئی۔ ٹی۔ آئی
لکھنؤ

افسانہ

تحریر: پھنیشور ناتھ رینو

ترجمہ: سبنت مسعود

سی ۲۲۔ دلکشا کالونی لکھنؤ

لال پان کی بیگم

کیوں برجو کی ماں ناچ دیکھنے نہیں جائے گی کیا؟

برجو کی ماں شکر قند اُبال کر بیٹھی دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ اپنے آنگن میں سات سال کا لڑکا برجو شکر قند کے بجائے تماچے کھا کر آنگن میں لوٹ لوٹ کر سارے بدن میں مٹی مل رہا تھا۔ چمپا کے سر بھی چڑیل منڈرا رہی تھی۔ آدھا آنگن دھوپ رہتے ہو گئی ہے۔ سہو آئن کی دکان چھوا اگڑ لانے سو ابھی تک نہیں لوٹی۔ دیا باتی کی بیلا ہو گئی۔ آئے آج لوٹ کے ذرا۔ باگڑ بجرے کی دیہہ میں لکرا چھی لگی تھی۔ اسی لیے باگڑ رہ رہ کر کود پھاند رہا تھا۔ برجو کی ماں باگڑ پر من کا غصہ اتارنے کا بہانہ کھوج چکی تھی..... پچھواڑے کی مرچ کی پھول گاچھ! اور کس نے کھلائی ہوگی۔ باگڑ کو مارنے کے لیے وہ مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا چکی تھی کہ پڑوسن مکھنی پھوا کی پکار سنائی پڑی۔

کیوں برجو کی ماں ناچ دیکھنے نہیں جائے گی کیا؟"

برجو کی ماں کے آگے ناتھ اور پیچھے پگھا نہ ہو تب نا پھوا!

گرم غصے میں بھی نکیلی بات پھوا کے دیہہ میں دھنس گئی اور برجو کی ماں نے ہاتھ کے ڈھیلے کو پاس ہی پھینک دیا۔ بیچارے باگڑ کو کرکاچھی پریشان کر رہی ہے۔ آہ، ہا، آئے..... آئے! ہرر، رر۔ ررا آئے، آئے!"

برجو نے لیٹے ہی لیٹے باگڑ کو ایک ڈنڈا لگا دیا۔ برجو کی ماں کا جی چاہا کہ جا کر اسی ڈنڈے سے برجو کا بھوت بھگا دے۔ لیکن نیم کے پاس کھڑی پنہارنوں کی کھلکھلاہٹ سن کر رک گئی۔ بولی ٹھہر تیرے بپّا نے بڑا ہٹ چھٹ بنا دیا ہے تجھے۔ بڑا ہاتھ چلتا ہے لوگوں پر ٹھہر۔

مکھنی پھوا نیم کے پاس جھکی کمر سے گھڑا اتار کر پانی بھر کر لوٹتی پنہارنوں میں برجو کی ماں کی بہکی ہوئی بات کا انصاف کرا رہی تھی: ذرا دیکھو تو اس برجو کی ماں کو! چار من پاٹ (جوٹ) کا پیسہ کیا ہوا ہے دھرتی پر پاؤں ہی نہیں پڑتے۔ انصاف کرو خود اپنے منہ سے آٹھ دن پہلے سے ہی گاؤں کی ائی گلی میں بولتی پھرتی ہے۔ ہاں اس بار برجو کے بپّا نے کہا ہے۔ بیل گاڑی پر بٹھا کر بلرام پور کا ناچ دکھالاؤں گا۔ بیل جب اپنے گھر ہے تو ہزار گاڑی منگنی مل جائے گی۔ سو میں نے ابھی ٹوک دیا۔ ناچ دیکھنے والی سب تو اوڑھ پہن کر تیار ہو رہی ہیں رسوئی پانی کر رہی ہیں۔ میرے منہ میں آگ لگے کیوں میں ٹوکنے گئی۔ سنتی ہو کیا جواب دیا برجو کی ماں نے۔

مکھنی پھوا نے اپنے پوپلے منہ کے ہونٹوں کو ایک طرف موڑ کر اینٹھتی ہوئی بولی نکالی۔ اللہ۔ رے ہاں، ہاں! بر۔ ر رجو کی میّا کے آگے ناتھ اور پیچھے پگھا نا ہی تب نا"

جنگی کی بہو برجو کی ماں سے نہیں ڈرتی۔ وہ ذرا گلا کھول کر کہتی ہے۔

پھوا سرب سٹل فٹی (سروے سیٹلمنٹ) کیا حاکم کے باسا (گھر) پر بھول چھاپ کناری والی ساڑی پہن کر اگر تو بھی بھیشا (بھینٹ سوغات) چڑھاتی تو تمہارے نام سے بھی دو تین بیگھا زمین کا پرچہ کٹ جاتا۔ پھر تمہارے گھر بھی آج دس من سونا بنگ پاٹ (جوٹ) ہوتا جوڑا بیل خریدتی، پھر آگے ناتھ اور پیچھے سیکڑوں پگھا ہوتے۔

جنگی کی بہو منہ زور ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس کی لڑکی ہے

میں ہی ہمینے ہوئے گونے کو نئی بہو ہو کر آئی ہے اور سارے کرما ٹولی کے سبھی جھگڑالو ماسوں سے ایک آدھ مورچہ لے چکی ہے۔ اس کا سسر جگی داماں چور ہے۔ سی کلاس ہے اس کا۔ خصم رنگی کرما ٹولی کا نامی لسٹیتا اس لیے ہمیشہ سینگ کھجاتی پھرتی ہے جگی کی بہو۔

برجو کی ماں کے آنگن میں جگی کی بہو کی گلا کھول بولی غلیل کی گولیوں کی طرح دندناتی ہوئی آئی۔ برجو کی ماں نے ایک تیکھا جواب کھوج کر نکالا لیکن دل مسوس کر گئی گوبر کے ڈھیر میں کون ڈھیلا پھینکے۔

جیبھ (زبان) کی جھال کو گلے میں اتار کر برجو کی ماں نے اپنی بیٹی چمپیا کو آواز دی: اری چمپیا آج لوٹے تو تیری موڑی (منہ) مروڑ کر چولہے میں جھونکتی ہوں۔ دن دن بے چال ہوئی جاتی ہے۔ گاؤں میں بھی تو اب تھیٹر بے اسکوپ کا گانا گانے والی پتریا بہوئیں آنے لگی ہیں۔ کہیں بیٹھ کر باجے نہ مریا سیکھ رہی ہوگی۔ ہرجائی ری چمپیا!

جگی کی بہو نے برجو کی ماں کی بولی کا مزہ لے کر کر پر گھڑے کو سنبھالا اور مٹک کر بولی۔ چل دیدیا چل اس محلہ میں لال پان کی بیگم بستی ہے نہیں جانتی دوپہر دن اور چوپہر رات بجلی کی بتی بھک بھک کر جلتی ہو۔

بھک بھک بجلی بتی کی بات سن کر نہ جانے کیوں سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھوا کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے بیچ سے ایک میٹھی گالی نکلی: شیطان کی نانی!"

برجو کی ماں کی آنکھوں پر جیسے کسی نے تیز ٹارچ کی روشنی ڈال کر چوندھیا دیا۔ بھک بھک بجلی۔ بتی! تین سال پہلے سروے کیمپ کے بعد گاؤں کی جلن ڈاہی عورتوں نے ایک کہانی گڑھ کے پھیلائی تھی چمپیا کی ماں آنگن میں رات رات بھر بجلی بتی بھک بھکاتی تھی۔ چمپیا کی ماں کے آنگن میں نال والے جوتے کی چھاپ گھوڑے کی ٹاپ کی طرح.... جلو جلو اور جلو! چمپیا کی ماں کے آنگن میں چاندی جیسے پاٹ سوکھتے دیکھ کر جلنے والی سب عورتیں کھلیان پر سونے جیسے دھان کے بوجھوں کو دیکھ کر بیگن کا بھرتا ہو جائیں گی۔

مٹی کے برتن سے ٹپکتے ہوئے سیال گڑ کو انگلیوں سے چاٹتی ہوئی چمپیا آئی اور ماں کے طمانچے کھا کر چیخ پڑی: مجھے کیوں مارتی ہے اے اے، اے! سہوآئن (ساہوکار کی بیوی) جلدی سے سودا نہیں دیتی ہیں۔ ایں ایں ایں"!

"سہوآئن جلدی سے سودا نہیں دیتی ہے نانی! ایک سہوآئن کی دکان پر ہی موتی جھڑتے ہیں جو جڑ گاڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بول گلے پر لات دیکر گلا توڑ دوں گی۔ ہرجائی جو دپھر کبھی تاہے نہ مریا، گاتے سنا! چال سیکھنے جاتی ہے ٹیشن کی چھوکریوں سے!" برجو کی ماں نے چپ ہو کر اپنی آواز اندازی کی اس کی بات جگی کے جھونپڑے تک صاف صاف پہنچ گئی ہوگی۔

برجو بیتی ہوئی باتوں کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دھول جھاڑتے ہوئے برتن سے ٹپکتے گڑ کو للچائی نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ دیدی کے ساتھ وہ بھی دکان جاتا تو دیدی اسے بھی گڑ چٹاتی۔ ضرور وہ شکرقند کے لوبھ میں رہا اور مانگنے پر ماں نے شکرقند کے بدلے.... اے میّا ایک انگلی گڑ دیدے! برجو نے ہتھیلی پھیلائی "دے نا میّا، ایک رتی بھر!" "ایک رتی کیوں اٹھا کے برتن کو پھینک آتی ہوں۔ پچھواڑے میں جاکے چاٹنا۔ نہیں بنے گی میٹھی روٹی... میٹھی روٹی کھانے کا منہ ہوتا ہے۔ برجو کی ماں نے ابلے شکرقند کا ٹوکرا روتی ہوئی چمپیا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ بیٹھ کے چھلکے اتار نہیں تو ابھی.... !"

دس سال کی چمپیا جانتی ہے۔ شکرقند چھیلتے وقت کم سے کم بارہ بار ماں اسے بال پکڑ کر جھک جھورے گی۔ چھوٹی چھوٹی کھوٹ نکال کر گالیاں دے گی۔ "پاؤں پھیلائے کیوں بیٹھی ہے اس طرح بے لجّی!" چمپیا ماں کے غصّے کو جانتی ہے۔

برجو نے اس موقع پر تھوڑی خوشامد کر کے دیکھا "میّا میں بھی بیٹھ کر شکرقند چھیلوں؟"

"نہیں" ماں نے جھڑکی دی ایک شکرقند چھیلے گا اور تین پیٹ میں۔ جاکے سدھو کی بہو سے کہو۔ ایک گھنٹے کے لیے کڑھائی مانگ کر لے گئی تو پھر لوٹانے کا کام نہیں جا جلدی!"

منہ لٹکا کر آنگن سے نکلتے نکلتے برجو نے شکرقند اور گڑ پر نگاہ دوڑائی۔ چمپیا نے اپنے جھبرے بالوں کی اوٹ سے ماں کی جانب دیکھا اور نظر بچا کر برجو کی جانب ایک شکرقند پھینک دیا...... برجو بھاگ گیا۔

سورج بھگوان ڈوب گیا۔ دیا بتی کی بیلا ڈوب گئی۔ ابھی تک گاڑی....."

چمپا بیچ میں ہی بول اٹھی۔ "کوڑی ٹولہ میں کسی نے گاڑی نہیں دی بیٹا! بپّا بولے ماں سے کہنا ٹھیک کر کے تیار رہنا۔ ملہیا ٹولی کے میاں جان کی گاڑی لینے جا رہا ہوں۔"

یہ سنتے ہی برجو کی ماں کا چہرہ اتر گیا۔ گنا چھاتی کی کمانی اتر گئی کھونٹے سے اچانک..... کوڑی ٹولہ میں کسی نے گاڑی نہیں دی! تب مل چکی گاڑی! جب اپنے گاؤں کے لوگوں کی آنکھ میں پانی نہیں تو ملہیا ٹولی کے میاں جان کی گاڑی کا کیا بھروسا۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں کیا ہوگا شکرقند چھیل کر رکھ دے اٹھا کر!..... یہ مرد ناچ دکھائے گا۔ بیل گاڑی پر چڑھا کر ناچ دکھانے لے جائے گا۔ چڑھ چکی بیل گاڑی پر۔ دیکھ چکی جی بھر کر ناچ۔ پیدل جانے والی سب پہنچ کر پرانی ہو چکی ہوں گی

برجو چھوٹی کڑھائی سر پر اوندھا کر واپس آیا۔ "دیکھ دیدیا مٹری ٹوپی اس پر دس لاٹھی مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔"

چمپا چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ ذرا سی مسکرائی بھی نہیں برجو نے سمجھ لیا میّا کا غصہ ابھی اترا نہیں ہے پوری طرح سے۔

جھونپڑی کے اندر سے باگڑ کو باہر بھگاتی ہوئی برجو کی ماں بڑبڑائی کل ہی پنچ کوڑی قصائی کے حوالے کرتی ہوں۔ راکس تجھے ہر چیز میں منہ لگائے گا۔ چمپا باندھ دے بچھڑا کو۔ کھول دے گلی کی گھنٹی ہمیشہ ٹنر ٹنر مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔

ٹنر ٹنر کرتے ہوئے برجو کو سڑک سے جاتی ہوئی بیل گاڑیاں یاد آئیں۔ ابھی بھگوان ٹولے کی گاڑیاں ناچ دیکھنے جا رہی تھیں جھنر جھنر بیلے کی جھنکی تو نے سنی.....

"بیسی بک بک مت کرو۔ باگڑ کے گلے سے جھنکی کھولتی بولی چمپا۔

"چمپا ڈال دے چولہے میں پانی۔ بپّا آ دے تو کہنا اپنا اڑن جہاز پہ چڑھ کر ناچ دیکھ آوے۔ مجھے ناچ دیکھنے کا سوکھ (شوق) نہیں۔ مجھے جگّو مت کوئی میرا ماتھا دکھ رہا ہے۔"

جھونپڑی کے باہر برجو نے پھسپھسا کر پوچھا۔ "کیوں دے دیا ناچ میں اڑن جہاز بھی اڑے گا؟"

پٹھانی پر گدڑی اوڑھ کر بیٹھی ہوئی چمپا نے برجو کو چپ چاپ اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "مفت میں مار کھائے گا بے چارہ۔"

برجو نے بہن کی گدڑی میں حصّہ لیتے ہوئے آرام سے گھٹنے سمیٹے اس نے چمپا کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا: "ہم لوگ ناچ دیکھنے نہیں جائیں؟ گاؤں میں ایک پنچھی بھی نہیں ہے۔ سب چلے گئے۔"

چمپا کو اب تل بھر بھروسہ بھی نہیں۔ سانجھ کا تارا ڈوب رہا ہے بپّا ابھی تک گاڑی لے کر نہیں لوٹے۔ ایک مہینہ پہلے۔ میّا کہتی تھی کہ بلرام پور کے ناچ کے دن میٹھی روٹی بنے گی۔ چمپا چھینٹ کی ساری پہنے گی۔ برجو چھینٹ پہنے گا۔

بیل گاڑی پر چڑھ کر.......

چمپا کی بھیگی پلکوں پر ایک بوند آنسو آ گیا۔

برجو کا بھی دل بھر آیا۔ اس نے من ہی من املی پر رہنے والے جن بابا کو ایک بیگن چڑھانے کی منت مانی۔ گاچھ کا سب سے پہلا بیگن اس نے خود جس پودے کو بویا ہے..... جلدی سے گاڑی لے کر بپّا کو بھیج دے جن بابا۔

جھونپڑی کے اندر برجو کی ماں چٹائی پر پڑی کروٹیں لے رہی تھی۔ اونہہ پہلے سے کسی بات کا منصوبہ نہیں باندھنا چاہئے کسی کو۔ بھگوان نے منصوبہ توڑ دیا۔ اس کو سب سے پہلے بھگوان سے پوچھنا ہے یہ کس جرم کی سزا ہے۔ کس چوک کا پھل دے رہے ہو بھولے بابا۔ اپنے جانتے اس نے کسی دیوتا۔ بزرگ کی مان منوتی باقی نہیں رکھی۔ سر دے سکے وقت زمین کے لیے جتنی منتیں مانی تھیں..... ٹھیک ہی تو ــ مہابیر کا چڑھاوا تو باقی ہی ہے۔ ہائے رے دیوا!... بھول چوک معاف کرو مہابیر بابا! منوتی (منت) دونی کر کے چڑھائے گی برجو کی ماں!....

برجو کی ماں کے من میں رہ رہ کر جگّی کی بہو کی باتیں چبھتی ہیں بھک بھک بجلی بتی!... چوری چکاری کرنے والے کی بیٹی بہو جلے گی نہیں! پانچ بیگھا زمین کیا حاصل کی ہے برجو کے بپّا نے۔ کیا مرد کیا عورت سبھی کی آنکھوں میں کرکری پڑ گئی ہے۔ کھیت میں پاٹ لگا دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کی چھاتی پھٹنے لگی۔ دھرتی چیر کر پاٹ لگا ہے۔ بیساکھی بادلوں کی طرح امڈتے آ رہے ہیں پاٹ کے پودے! تو لال۔ تو فلاں۔ اتنی آنکھوں

کی دھار بھلا فصل میں جہاں پندرہ من پاٹ ہونا چاہیے صرف دس من پاٹ کاٹنے پر وزن ہوا۔ ربی بھگت کے یہاں ......

اس میں جلنے کی کیا بات ہے بھلا۔ برجو کے بپّا نے تو پہلے ہی کرماٹولی کے ایک ایک آدمی کو سمجھا کر کہا تھا۔ زندگی بھر مزدوری کرتے رہ جاؤگے۔ سروے کا وقت آرہا ہے۔ لاٹھی کھڑی کرو تو دو چار بیگھے زمین حاصل کر سکتے ہو۔ سو گاؤں کی کسی مائی کا لال سروے کے وقت بابو صاحب کے خلاف کھانسا تک نہیں.... برجو کے بپّا کو کم سہنا پڑا ہے۔ بابو صاحب غصے سے سرکس ناچ کے باگھ (شیر) کی طرح دہاڑتے رہ گئے۔ ان کا بڑا بیٹا گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دے کر گیا۔ آخر بابو صاحب نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو بھیجا۔ برجو کی ماں کو موسی کہہ کر پکارا۔ یہ زمین بابو جی نے میرے نام سے خریدی تھی۔ میری پڑھائی لکھائی اس زمین کی آمدنی سے چلتی ہے۔ اور بھی کتنی باتیں۔ موہنا خوب جانتا ہے۔ اتا ذرا سا لڑکا زمین دار کا بیٹا ہے کہ......

چمپیا برجو سو گیا کیا؟ آجا برجو اندر، تو بھی آجا چمپیا۔ بھلا آدمی آئے تو ایک بار آج!“ برجو کے ساتھ چمپیا اندر چلی گئی۔

ڈھبری بجھا دے.... بپّا بلائیں تو جواب مت دینا۔ کھپچی گرا دے“

بھلا آدمی رے بھلا آدمی! منہ دیکھو ذرا اس مردکا۔ ماں دن رات اکساتی نہ رہتی تو رہ چکے تھے زمین۔ روز آکر ماتھا پکڑ کر بیٹھ جائیں: ”مجھے زمین نہیں لینی ہے برجو کی ماں، مجبوری ہی اچھی۔“

جواب دیتی تھی برجو کی ماں خوب سوچ سمجھ کر۔ چھوڑ دو جب تمہارا کلیجہ ہی نہیں تو ہوگا کیا؟“ جورو زمین زور کے نہیں تو کسی اور کے“

برجو کے باپ پر بہت تیزی سے غصہ چڑھتا ہے۔ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ برجو کی ماں کا بھاگ ہی خراب ہے جو ایسا گوبر گنیس گھر دار اسے ملا۔ کون سا سکھ، موج دیا ہے اس مرد نے۔ کولہو کے بیل کی طرح جتے ساری عمر کاٹ دی اسی کے یہاں۔ کبھی ایک پیسے کی جلیبی بھی لاکر دی ہے اس کے خصم نے۔

پاٹ کا دام بھگت کے یہاں سے لیکر باہر ہی باہر بیل ہاٹ (بیلوں کا بازار) چلے گئے۔ برجو کی ماں کو ایک بار نظری لوٹ (نوٹ) دیکھنے بھی نہیں دیا آنکھ سے۔ بیل خرید لائے اسی دن سے گاؤں میں ڈھنڈورہ پیٹنے لگے: برجو کی ماں اس بار بیل گاڑی پر چڑھ کر جائے گی ناچ دیکھنے..... دوسرے کی گاڑی کے بھروسے دکھائے گا...

آخر میں اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ وہ خود کچھ کم نہیں۔ اس کی زبان میں آگ لگے۔ بیل گاڑی پر چڑھ کر ناچ دیکھنے کی آرزو کیسے برے وقت اس کے دل میں آئی تھی۔ بھگوان جانے! پھر آج صبح سے دوپہر تک کسی نہ کسی بہانے اس نے اٹھارہ بار بیل گاڑی پر ناچ دیکھنے کا ذکر چھیڑا۔ لو خوب دیکھو ناچ! واہ رے ناچ۔ گدڑی کے نیچے دوشالے کا خواب!

کل سویرے پانی بھرنے کے لیے جب جائے گی۔ تیز و طرار لڑکیاں ہنسی ٹھٹھول کرتی اس کی اور ہنستی ہوئی جائیں گی۔ سبھی جلتے ہیں اس سے۔ ہنہ! دو بچوں کی ماں ہو کر بھی وہ جَس کی تَس ہے اس کا گھر والا اس کی بات میں رہتا ہے۔ وہ بالوں میں ناریل کا تیل ڈالتی ہے۔ اس کی اپنی زمین ہے۔ ہے کسی کے پاس ایک قطعہ زمین بھی اپنے اس گاؤں میں! جلیں گے نہیں۔ تین بیگھے میں دھان لگا ہوا ہے۔ لوگوں کی بری نظروں سے بچیں تب تو۔

باہر بیلوں کی گھنٹیاں سنائی پڑیں۔ تینوں سنبھل کر اسی پر دھیان لگائے رہے۔

”اپنی ہی بیلوں کی گھنٹی ہے کیوں ری چمپیا؟“

”چمپیا اور برجو نے ایک ساتھ کہا۔ ہوں۔ اوں، اوں“۔

”جب برجو کی ماں نے پھسپھسا کر کہا۔ شاید گاڑی بھی گھڑگھڑاتی ہے“

”ہوں اوں، اوں“ دونوں نے پھر ہنکاری بھری۔

”چپ گاڑی نہیں ہے۔ تو چپکے سے ٹٹی میں چھید کرکے دیکھ تو آ چمپی! بھاگ کے جا، چپکے چپکے!“

چمپیا بلی کی طرح آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹٹی کے چھید سے جھانک آئی۔

”ہاں بپّا! گاڑی بھی ہے“

برجو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سلا دیا: ”بولے مت!“ چمپیا بھی گدڑی کے نیچے گھس گئی۔

باہر بیل گاڑی کھولنے کی آواز ہوئی۔ برجو کے باپ نے بیلوں کو زور سے ڈانٹا۔ ہاں۔ ہاں آ گئے۔ گھر آنے کے لیے چھاتی پھٹی جاتی تھی۔

برجو کی ماں تاڑ گئی۔ ضرور ملد بیا ٹولی میں گانجے کی چلم چڑھ رہی تھی آواز تو بڑی کھنکناتی ہوئی نکل رہی ہے۔

"چمپیا۔ ا۔ ا" باہر سے پکار کر کہا اس کے باپ نے۔ "بیلوں کو گھاس دے دے۔ چمپیا۔ ا۔"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ چمپیا کے باپ نے آنگن میں آ کر دیکھا تو نہ روشنی نہ چراغ۔ نہ چولھے میں آگ۔ بات کیا ہے ناچ دیکھنے کو اتاولی ہو کر پیدل ہی چلی گئی کیا.... ۔

برجو کے گلے میں خراش ہوئی جسے روکنے کی اس نے پوری کوشش کی لیکن کھانسی جو شروع ہوئی تو وہ پانچ منٹ تک کھانستا ہی رہا۔

"برجو بیٹا۔ برجو ہن!" برجو کے باپ نے پچکار کر بلایا۔ "تیا غصّہ کے مارے سو گئی کیا۔ ارے ابھی تک لوگ جا ہی رہے ہیں؟"

برجو کی ماں کے من میں آیا کہ کس کر جواب دے، "نہیں دیکھنا ہے ناچ! لوٹا دو گاڑی۔"

"چمپیا! اٹھتی کیوں نہیں۔ لے دھان کی بالیاں رکھ دے۔" دھان کی بالیوں کا چھوٹا جھبّا جو بیڑے کے اوسارے پر رکھ کر اس نے کہا۔ "دیا بالو"

برجو کی ماں اٹھ کر اوسارے پر آئی۔ "ڈیڑھ پہر رات کو گاڑی لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ناچ تو اب ختم ہو رہا ہو گا۔"

ڈھبری کی روشنی میں دھان کی بالیوں کا رنگ دیکھتے ہی برجو کی ماں کے من کا سب میل دور ہو گیا.... دھانی رنگ اس کی آنکھوں سے اتر کر روم روم میں گھل گیا۔

"ناچ ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہو گا۔ ابھی ابھی بلرام پور کے بابو کی کمپنی گاڑی موہن پور ہوٹل بنگلہ سے حاکم صاحب کو لانے گئی ہے۔ اس سال آخری ناچ ہے۔ بالیوں کے پتے دروازے میں کھونس دے اپنے کھیت کے ہیں۔"

"اپنے کھیت کے؟" ہنستی ہوئی برجو کی ماں نے پوچھا: "پک گئے دھان؟"

"نہیں دس دن میں دھوپ چڑھتے چڑھتے لال ہو کر جھک جائیں ہمارے کھیت کی بالیاں۔ ملد بیا ٹولی جا رہا تھا۔ اپنے کھیت میں دھان دیکھ کر آنکھیں جم کے رہ گئیں۔ سچ کہتا ہوں بالیاں توڑتے وقت انگلیاں کانپ رہی تھیں میری!" برجو نے دھان کی ایک بالی سے ایک دھان لے کر منہ میں ڈال لیا۔ اور اس کی ماں نے ایک ہلکی سی ڈانٹ دی۔ "اسے۔ کیا لکڑ ہے رے تو!..... ان دشمنوں کے مارے قانون دھرم بچے؟"

"کیا ہوا ڈانٹتی کیوں ہے؟..."

"نئے ناج کی رسم سے پہلے ہی دھان جھوٹا کر دیا۔ دیکھتے نہیں؟"

"ارے ان لوگوں کا سب دھان صاف ہے۔ چہرئی، چر من ہیں یہ لوگ! ان دونوں کے منہ میں سب سے پہلے نیا ناج نہ پڑے کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس کے بعد چمپیا نے بھی دھان کی بالی سے دو دھان لے کر دانتوں تلے دبایا۔

"او میّا! اتنا میٹھا چاول؟"

"اور گمکتا ہے بھی دو دیا؟" برجو نے پھر منہ میں دھان لیا۔

"روٹی پوٹی تیار کر چکی کیا؟" برجو کے باپ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں"، مان بھرے سُر میں بولی برجو کی ماں۔ "جانے کا ٹھیک ٹھکانہ نہیں.... اور روٹی بنتی ہے؟"

"واہ خوب ہو تم لوگ۔ جس کے پاس بیل ہیں اسے گاڑی مانگنی نہیں ملے گی بھلا؟ گاڑی والوں کو بھی کبھی بیل کی ضرورت ہو گی.... پوچھوں گا تب کوئری ٹولہ والوں سے!..... لے جلدی سے روٹی بنا لے۔"

"دیر نہیں ہو گی؟"

"ارے ٹوکری بھر روٹی تو تو چٹکی مارتے بنا لیتی ہے۔ پانچ روٹیاں بنانے میں کتنی دیر لگے گی؟"

اب برجو کی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل کر کھیلنے لگی۔ اس نے نظر بچا کر دیکھا۔ برجو کا بپّا اس کی طرف ایک ٹک نہار رہا ہے۔ چمپیا اور برجو نہ ہوتے تو من کی بات ہنس کر کھولتے دیر نہ لگتی۔ چمپیا اور برجو نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوشی سے ان کے چہرے جگمگا اٹھے

میّا، بیکار گھسنا (غصہ) ہو رہی تھی نا؟

"چمپی ذرا کھٹلے میں جا کر نکھنی بوا کو آواز دے تو!"

"اے بوا۔ آ، آ، سنتی ہو بوا۔ آ۔ آ، میّا بلا رہی ہے۔"

بوا نے کوئی جواب سیدھے نہیں دیا۔ لیکن اس کی بڑبڑاہٹ صاف سنائی پڑی: ہاں! اب بوا کو کیوں گہارتی ہے! سارے ٹھسّے میں بس ایک بوا ہی تو بنا ہاتھ پنگھے والی ہے!"

"اری بوا۔" برجو کی ماں نے ہنس کر جواب دیا۔ اس وقت برا مان گئی تھی کیا؟ ناتھ پنگھے والے کو آ کر دیکھو دوپہر رات میں گاڑی لے کر آیا ہے۔ اچھا و بوا۔ میں میٹھی روٹی پکانا نہیں جانتی: بوا کھانستی کھنکھارتی آئی۔ اس سے گھڑی بھر دن رہتے ہی پوچھ رہی تھی کہ ناچ دیکھنے جائے گی کیا؟ کہتی تو میں پہلے ہی سے اپنی انگیٹھی یہاں سلگا جاتی۔"

برجو کی ماں نے بوا کو انگیٹھی دکھلا دی اور کہا: گھر میں اناج، دانا وغیرہ تو کچھ ہے نہیں۔ ایک باگڑ ہے اور کچھ برتن باسن۔ سو رات بھر کے لیے یہاں تمباکو رکھ جاتی ہوں۔ اپنا حقّہ لے آئی ہو نا بوا۔؟"

بوا کو تمباکو مل جائے تو رات بھر کیا پانچ رات بیٹھ کر جاگ سکتی ہے۔ بوا نے اندھیرے میں ٹٹول کر تمباکو کا اندازہ کیا۔ اوہو! ہاتھ کھول کر تمباکو رکھا ہے برجو کی ماں نے۔ اور ایک وہ ہے ساہوکار کی گھر والی! رام کہو! اس رات کو افیم کی گولی کی طرح مٹر بھر تمباکو رکھ کر چلی گئی گلاب باغ میلے اور کہہ گئی کہ ڈبّا بھر تمباکو ہے۔

برجو کی ماں چولہا سلگانے لگی۔ چمپیا نے شکر قند کو مسل کر گولے بنائے اور برجو سیر کی کڑھائی اوندھا کر اپنے باپ کو دکھانے لگا۔ سبھی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

برجو کی ماں ہنس کر بولی: "تاکھے (طاق) پر تین چار موٹے شکر قند ہیں دے دے برجو کو چمپیا۔ بے چارہ شام سے ہی....."

"بیچارہ مت کہو میّا! خوب سچّا رہا ہے" اب چمپیا چہکنے لگی: "تم کیا جانو، گدڑی کے نیچے منہ کیوں چل رہا تھا صاحب کا!"

"ہی ہی ہی!"

برجو کے ٹوٹے دودھ کے دانتوں کی دراز سے بولی نکلی: "بلیک مارٹن میں پانچ شکر قند کھا لیا! ہا، ہا، ہا۔" سبھی پھر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

برجو کی ماں نے بوا کا من رکھنے کے لیے پوچھا۔ "ایک بٹی گڑ ہے۔ آدھا ڈال دوں بوا!"

بوا نے بہت خوش ہو کر کہا: "اری شکر قند خود میٹھا ہوتا ہے اتنا کیوں ڈالے گی۔" جب تک دونوں بیل گھاس کھا کر ایک دوسرے کی دیہہ (جسم) کو جیبھ سے چاٹنے لگے۔ برجو کی ماں تیار ہو گئی۔ چمپیا نے چھینٹ کی ساڑی پہنی اور برجو بٹن کی جگہ بیینٹ پونسن کی ڈوری بند کروانے لگا۔

برجو کی ماں نے آنگن سے نکلتے وقت کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ "اون ہنہ اتنی دیر تک بھلا پیدل جانے والے رکے رہیں گے؟"

پورنیا کا چاند سر پر آ گیا ہے..... برجو کی ماں نے اصلی رولڈ گولڈ کا مانگ ٹیکا پہنا ہے آج پہلی بار۔ برجو کے بپّا کو ہو کیا گیا ہے۔ گاڑی جوتتا کیوں نہیں۔ منہ کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ مانو ناچ کی لال پان کی.....

گاڑی پر بیٹھتے ہی برجو کی ماں کے جسم میں ایک عجیب سی گدگدی لگنے لگی۔ اس نے بانس کی بلّی کو پکڑ کر کہا۔ گاڑی میں ابھی بہت جگہ ہے ذرا دا ہنی سڑک سے گاڑی ہانکنا۔"

بیل جب دوڑنے لگے اور پہیہ جب چوں چوں کر کے گھر گھرانے تو برجو سے نہیں رہا گیا..... "اڑنے جہاز کی طرح اڑاؤ بپّا!"

گاڑی جنگی کے پچھواڑے پہنچی۔

برجو کی ماں نے کہا: "ذرا جنگی سے پوچھو نا، اس کی پتوہو ناچ دیکھنے چلی گئی کیا!"

گاڑی رکتے ہی جنگی کے جھونپڑے سے آتی ہوئی رونے کی آواز سنائی دی۔

برجو کے بپّا نے پوچھا: "ارے جنگی بھائی کاہے کنّا روہٹ (عورتوں کا رونا) ہو رہا ہے آنگن میں؟" جنگی ہاتھ تاپ رہا تھا بولا۔ "کیا پوچھتے ہو، رنگی بلرام پور سے لوٹا نہیں۔ پتوہو ناچ دیکھنے کیسے جائے! آسرا دیکھتے دیکھتے ادھر گاؤں کی سبھی عورتیں چلی گئیں۔"

"اری ٹیشن والی تو روتی کاہے ہے۔" برجو کی ماں نے پکار کر کہا: "آ جا جھٹ سے کپڑا پہن کر۔ آ جا گاڑی پڑی ہوئی ہے!"

بیچارہ آجا جلدی!"

بغل کے جھونپڑے سے رادھے کی بیٹی سنہری نے کہا: "چاچی گاڑی میں جگہ ہے، میں بھی جاؤں گی۔"

بانس کی جھاڑی کے اس پار سریتا کا گھر ہے۔ اس کی بہو بھی نہیں گئی ہے۔ گلٹ کا جھمکی کڑا پہن کر جھمکتی آ رہی ہے۔

آ جا جو باقی رہ گئی ہیں۔ سب آجائیں جلدی؟

جگی کی بہو، سریتا کی بیوی اور رادھے کی بیٹی سنہری تینوں گاڑی کے پاس آئیں۔ بیل نے پچھلا پیر پھینکا۔ برجو کے بپّا نے ایک بھدّی گالی دی: "سالا لتاڑ مار کر لنگڑا بنائے گا بہو کو۔"

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ برجو کے باپ نے گھونگھٹ میں جھکی دونوں بہوؤں کو دیکھا۔ اسے اپنے کھیت کی جھکی ہوئی بالیوں کی یاد آ گئی۔

جگی کی بہو کا گونا تین مہینے پہلے ہی ہوا ہے۔ گونے کی رنگین ساڑی سے کڑوے تیل اور لٹھوا سندور کی خوشبو آ رہی ہے۔ برجو کی ماں کو اپنے گونے کی یاد آئی۔ اس نے کپڑے کی گٹھری سے تین میٹھی روٹیاں نکال کر کہا: کھا لے ایک ایک کر۔ سرایا کے سرکاری کوپ میں پانی پی لینا۔

گاڑی گاؤں سے باہر ہو کر دھان کے کھیتوں کے بغل سے جانے لگی۔ چاندنی کارتک کی..... کھیتوں سے دھان کے جھڑتے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ بانس کی جھاڑی میں کہیں دودھی کی بیل پھولی ہے جگی کی بہو نے ایک بیڑی سلگا کر برجو کی ماں کی طرف بڑھائی برجو کی ماں کو اچانک یاد آیا۔ چمپیا، سنہری، سریتا کی بیوی اور جگی کی بہو یہ چاروں ہی تو گاؤں میں بائسکوپ کا گیت گانا جانتی ہیں خوب۔

گاڑی نشان بناتی دھان کے کھیتوں کے بیچ ہو کر گئی ہے چاروں طرف گونے کی ساڑی کی سرسراہٹ جیسی آواز ہوتی ہے... برجو کی ماں کے ماتھے پر مانگ ٹیکے کی چاندنی چھٹکتی ہے۔

"اچھا، اب ایک بائسکوپ کا گیت گا تو چمپیا!..... ڈرتی ہے کا ہے؟ جہاں بھول جاؤگی، بغل میں ماسٹرنی بیٹھی ہی ہو۔

دونوں بہوؤں نے تو نہیں مگر چمپیا اور سنہری نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ برجو کے باپ نے بیلوں کو للکارا: "چل بھیا! اور ذرا زور سے... گا رے چمپیا۔ نہیں تو میں بیلوں کو دھیرے دھیرے چلنے کو کہوں گا۔"

جگی کی بہو نے چمپیا کے کان کے پاس گھونگھٹ لے جا کر کچھ کہا اور چمپیا نے دھیمے سے شروع کیا۔ "چندا کی چاندنی میں جھومے جھومے دل مرا...."

برجو کو گود میں لے کر بیٹھی ہوئی اس کی ماں کی خواہش ہوئی کہ وہ بھی ساتھ ساتھ گیت گائے۔

برجو کی ماں نے جگی کی بہو کی جانب دیکھا۔ دھیرے دھیرے گنگنا رہی ہے وہ بھی۔ کتنی پیاری بہو ہے۔ اور گونے کی ساڑی سے ایک خاص قسم کی خوشبو نکلتی ہے۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے اس نے! برجو کی ماں بیگم ہے۔ لال پان کی بیگم ہے۔ یہ تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ وہ سچ مچ لال پان کی بیگم ہے۔

برجو کی ماں نے اپنی ناک پر دونوں آنکھوں کو مرکوز کرنے کی کوشش کرکے اپنے روپ کی جھانکی لی۔ لال ساڑی کی جھلمل کناری مانگ ٹیکے پر چاند...... برجو کی ماں کے من میں اب کوئی تمنا نہیں۔ اسے نیند آ رہی ہے۔

□□

بہترین مذاق .... صفحہ ۱۴ کا بقیہ

چند لمحوں تک بورڈ کا کوئی بھی ممبر یہ کہنے کی ہمت نہیں پیدا کر سکا کہ:

"برائے مہربانی اگلا امیدوار"

جب چیرمین نے ہر ممبر کی طرف یکے بعد دیگرے دیکھا تو ہر ایک نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

جس امیدوار نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے وہ اپنے "سب سے عظیم مذاق" کی وجہ سے زمیں بوس ہو گیا۔

کیا مذاق ہے۔

□□

میرے جانے کے بعد

کتنا کچھ بدل گیا ہے یہاں
میرے جانے کے بعد
نہ گلیاں پہچان رہا ہوں
نہ سڑکیں

حسین پتھروں کے جنگل میں
ڈھونڈھتا ہوں اپنا وہ کھردرا مکان
جس کی دیواروں پہ
میری ہتھیلیوں نے
نہ جانے کتنے نام لکھے تھے
لہراتے دھوئیں کے مایاجال میں
ڈھونڈھتا ہوں مہندی کے وہ جھاڑ
جو مجھے
آتے جاتے پکارتے تھے اپنی سانسوں سے
کتنا کچھ بدل گیا ہے
میرے جانے کے بعد
لیکن میرے دوست
تمہارے ہاتھوں میں
میرے ہاتھوں کے لیے جو حرارت تھی
وہ ویسی ہی ہے
لگتا ہے
جیسے میں کل ہی یہاں سے گیا ہوں !!

خورشید عالم
۹۴/۶- سیمع ہاؤس
مالویہ روڈ - دیوریا
۲۷۴۰۰۱

سورج

تمہارے اُگنے سے زندگی شروع ہو
تمہارے ڈوبنے پر زندگی تھمے
تم اک آگ کا گولا ہو
پھر بھی تمہاری ایک جھلک پانے کو
ذرہ ذرہ بیتاب رہتا ہے
تمہاری روشنی سے سب پاتے روشنی
تمہاری روشنی اندھیروں کو دور کرتی ہے
تم غائب ہو تو لوگ کریں غم
تمہارے ایک کا وہ اربوں مقابلہ نہ کر سکے
تم اگر نہ ہوتے کائنات میں
نظام یہ زندگی بھی نہ ہوتی

پانی

تم ہی ہو سب کی زندگی
تم ہی ہو سب کا آسرا
تم ہی تالاب، ندی، دریا، سمندر
تم ہی بہتا ہوا جھرنا ہو
تپتے ریگستانوں میں تمہاری ایک
بوند کو سب ترستے ہیں
تم غائب ہو تو سوکھا پڑے
تم آؤ تو طوفان آئے
آدم سے لے کر قیامت تک
تمہارے ہی سب محتاج رہیں گے
نظام اگر تم نہ ہوتے
تو یہ دنیا بھی نہ ہوتی

سید نظام علی رضوی
آر - ایس پرا سیکٹر 'آئی'، علی گنج لکھنؤ

□

یہ تری یاد ہے
شبِ ہجراں
یا کوئی ٹوٹتا ہوا تارا
روشنی کی لکیر سی ابھرے
اور پل بھر میں
محو ہو جائے

□

دشمنی میٹھے کنوؤں سے
لوگ کہتے تھے
نہ کر
...... گھر کی ویرانی سے کر
کوچہ و بازار تک
ریت کے ٹیلے ہیں
اور پاگل ہوا کے قافلے

□

وہ لفظ تو سُنا نہیں
نہ جانے کیا کہا
مگر
لبِ خاموش جب کھلے،
فضا میں
عطر کی ہزار شیشیاں
الٹ گئیں !!

قمر ادیب
۱۴۰- ادریس گنج - ہردوئی
۲۴۱۰۰۱

انگریزی افسانہ

تحریر: میزا سندر جیت کور
ترجمہ: احمد نسیم صدیقی
(شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی)

بہترین مذاق

اروناچل پردیش کی ریاست اپنی تشکیل کے زمانے میں عملے کی بھرتی کررہی تھی۔ چوں کہ تقرری کے لیے کوئی باقاعدہ تنظیم یا بورڈ موجود نہیں تھا لہٰذا امیدواروں کی جانچ مختلف محکموں کے ذریعہ کی جارہی تھی۔ تقرری کے سلسلے میں سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ ایسے افراد کا انتخاب نہ ہو جو ترائی کے دشوار علاقے کی سخت زندگی کو برداشت نہ کرسکیں یا پھر جن کے کام کرنے کے طریقوں سے مقامی افراد کے احساسات مجروح نہ ہوں۔

یہ نکتہ اس بات کے مدنظر انتہائی اہم تھا کہ ریاست کے زیادہ تر اندرونی علاقوں میں قبائلی افراد علاحدگی کی زندگی گزار رہے تھے اور شاید باہری دنیا سے اُن کا یہ پہلا رابطہ بن رہا تھا۔ وہ لوگ رابن سن کروسو کی طرح اپنی محدود دُنیا میں رہنے کے عادی تھے وہ اپنے چند کپڑوں، عقائد و رواجوں کی وجہ سے میدانی علاقوں کے باشندوں سے بنیادی طور پر مختلف تھے۔ میدانی علاقوں کے افراد اپنی رسومات، زبان، مذہب اور طریقِ حیات سے وابستہ تھے۔ زیادہ تر قبائلی افراد اپنے تیز دھار ہتھیار لیے رہتے۔ ان کی 'داؤ' نامی چھوٹی تلوار جنگل میں درخت کاٹ سکتی تھی اور دو تلواریں مل کر کسی نیچے کا سر موںڈ سکتی تھیں۔ لیکن موقع پڑنے پر یہی تلوار تذلیل کرنے والے یا اپنے دشمن کا سر بھی قلم کرسکتی تھی۔ لہٰذا امیدواروں کے انتخاب میں یہ دیکھنا تھا کہ اپنی حرکتوں یا سلوک سے وہ کوئی مصیبت نہ کھڑی کردے یا اپنی جان خطرے میں نہ ڈال لے۔

میں جس محکمہ کی سربراہ تھی اسے ۲۰۰ نئی اسامیوں کو پُر کرنا تھا اشتہار کے جواب میں ہزاروں درخواستیں آئی تھیں۔ امیدواروں کی تعداد کو کم کرنے کے لیے ایک تحریری امتحان منعقد کیا گیا تھا جس میں ایک سوال تھا: "میں کون ہوں۔؟" اس سوال کے جواب میں امیدواروں کو دس جملوں میں اپنے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرنی تھیں جو ان کی درخواست میں پہلے سے موجود نہ ہو۔

دورانِ انٹرویو "میں کون ہوں؟" سوال کے جواب میں بڑی دلچسپ معلومات دیکھنے کو ملی۔ لوگوں نے اپنی شخصی خصوصیات اپنے خوف، اوصاف، پسند اور ناپسند کے بارے میں بڑی مختلف النوع باتیں لکھی تھیں۔ ایک امیدوار نے لکھا تھا کہ وہ گیت نظم کرنا اور اپنی تیار کردہ موسیقی پر انھیں گانا پسند کرتا ہے۔ انتخابی بورڈ کے ایک رکن کی فرمائش پر اس نے اپنا ایک گیت گاکر پیش بھی کیا۔

پھر ایک امیدوار سہاگ داخل ہوا۔ اس نے تحریری امتحان میں تقریباً صد فی صد نمبر حاصل کیے تھے اور اس کا کامیاب امیدواروں میں پہلا مقام تھا لہٰذا انتخابی بورڈ انتہائی اطمینان میں تھا کہ اس امیدوار کا انتخاب تو یقینی ہے اور انٹرویو محض رسم ادائیگی ہے۔ جب وہ امیدوار واپس جانے والا تھا کہ اچانک ایک رکن کی نظر اس کے ذریعہ دیے گئے "میں کون ہوں؟" سوال کے جواب پر پڑ گئی۔

اس نے لکھا تھا:

"میں مذاق کرنا پسند کرتا ہوں۔"

"تم کہتے ہو کہ تمھیں مذاق پسند ہے۔ ان میں سے کوئی واقعہ ہمیں بھی کیوں نہ بتاؤ۔"

"کس طرح کا؟" امیدوار نے دریافت کیا

"اپنا بہترین مذاق۔ جس سے تم خود سب سے زیادہ لطف اندوز ہوئے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اپنا سب سے بڑا مذاق سناتا ہوں۔" اس

نے کہا۔

اس نے اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتایا۔ اس کا تعلق ایک قصبہ سے لگے ہوئے ایک دیہات سے تھا جہاں سے وہ اپنی سائیکل کے ذریعہ قصبہ اپنے کالج جایا کرتا تھا۔ گاؤں میں ایک خاندان رہتا تھا جس میں ایک نوجوان لڑکی، اس کا اندھا باپ اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ لڑکی انتہائی خوبصورت تھی اور اس کی طرف گاؤں کے تمام مرد متوجہ ہوتے، مگر وہ ان میں سے کسی کی حوصلہ افزائی نہ کرتی۔

"وہ مغرور تھی ... خود پسند۔"

اس نے یہ بات بڑے تحقیر آمیز انداز میں کہی اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جو بتا رہے تھے کہ اس کے لیے "انگور کھٹے تھے"۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ایک دن جب وہ لڑکی گاؤں کے تالاب سے پانی بھر کر لا رہی تھی تو پھسل کر گر پڑی اور اس کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ غریب ہونے کے باعث وہ باقاعدہ علاج نہیں کروا پائی اس کا ایک کولھا دوسرے کے مقابل اوپر چڑھ گیا اور اس کا ایک پیر چھوٹا ہوگیا۔ اس کی چال ڈگمگانے اور لڑکھڑانے کا امتزاج بن گئی جو دیکھنے لائق ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ اب پہلے جیسا خوبصورت نہیں رہ گیا تھا، جسمانی تکلیف نے اس کا ناک نقشہ بگاڑ دیا تھا جب وہ پانی بھر کر لاتی یا کوئی بھی بوجھ لے کر چلتی تو اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ زیادہ واضح ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر قدم جو وہ آگے بڑھاتی وہ لڑکھڑاتی اور آگے کو ایسا جھکتی جیسے زمین سے کچھ اٹھا رہی ہو جبکہ اس کا اگلا قدم اسے پیچھے کر دیتا جیسے اسے پیچھے کھینچ رہا ہو۔ اس منظر سے وہ تمام لوگ لطف اندوز ہوتے جو پہلے اس کی توجہ پانے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ درحقیقت بعض لوگ راستے میں اس کا انتظار کیا کرتے تھے جب وہ پانی لینے جاتی تاکہ وہ اس مضحکہ خیز منظر کو دیکھ سکیں۔ یہ ان کا تفریح کا وقت ہوتا۔

"کسی نے اس کی مدد نہیں کی۔؟" بورڈ کے ایک رکن نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ فی الواقع کسی نے نہیں۔ اس کی مضحکہ خیز چال دیکھنا خود میں ایک تفریح تھی۔"

"یہی تمہارا بہترین مذاق تھا"۔؟ بورڈ کے ایک اور ممبر نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ میں نے تو صرف پس منظر بتایا ہے۔ اب میں اصل واقعہ کی طرف آرہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ایک دن ہم نے اسے قریبی جنگل میں دیکھا۔ وہ وہاں ایندھن کے لیے لکڑیاں لینے گئی تھی۔ اس نے ضرورت بھر لکڑیاں بٹور لی تھیں اور انھیں گٹھر میں باندھ بھی لیا تھا۔ ہم لوگ کچھ دور کھڑے انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں کہ وہ اس بوجھ کے ساتھ کیسے چلتی ہے۔

تبھی یہ ہوا کہ اس نے ایک خشک درخت کی لٹکتی ہوئی شاخ پکڑ کر کھینچی، جس سے شہد کی مکھیوں کا ایک چھتہ لٹکا ہوا تھا۔ لمحوں کے اندر سیکڑوں کی تعداد میں مکھیوں نے اس پر حملہ بول دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ زمین سے اٹھ کھڑے ہونے کے لیے وہ مختلف انداز سے اور ہر سمت ہاتھ پاؤں چلا کر جدوجہد کر رہی تھی اور اس کی یہ جدوجہد قہقہے بلند کر رہی تھی۔ وہ ایک عجیب نظارہ تھا۔ اپنی مدافعت کرتے ہوئے وہ تھوڑا کھڑی ہوتی پھر گر پڑتی۔ گویا وہ کسی نادیدہ دشمن سے کشتی لڑ رہی ہو۔ پھر وہ لڑکھڑاتی کھڑی ہوتی اور درد کی شدت سے گر پڑتی۔ وہ واقعی ایک اعلا درجے کا نظارہ تھا۔ کیا منظر تھا! ہم لوگ اپنے قہقہے نہیں روک پا رہے تھے۔"

جب وہ اس منظر کو بیان کر رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے سامنے اسی منظر کو دیکھ رہا ہو۔ وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا وہ اپنے گرد و پیش سے بیگانہ تھا۔ خوشی کے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔ بورڈ کے سات ارکان انتہائی سنجیدہ بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پتھر کی مانند سخت تھے۔ ان پر مکمل سکوت طاری تھا۔ یہ سکوت اسی وقت ٹوٹا جب ایک رکن نے بڑی مشکل سے "شکریہ" کہا۔ جو امیدوار کے جانے کا اشارہ تھا۔

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

مسکرا کر نگاہ کی ہوتی
کچھ تو صورت نباہ کی ہوتی

یوں تو سب نعمتیں ہیں جنت میں
بس اجازت گناہ کی ہوتی

ہائے وہ اس کا لطفِ بے پایاں
لغزشِ بے پناہ کی ہوتی

اُف یہ انبوہ غم گساروں کا
کاش ہم نے نہ آہ کی ہوتی

تم بھی سنتے غزل جو احمرؔ کی
تم نے بھی واہ واہ کی ہوتی

افتخار احمر

نہرولی ہاؤس خیالی گنج لکھنؤ

ہماری زیست ہی دُنیائے بے ثبات میں ہے
مگر نشاط کا پہلو بھی خواہشات میں ہے

یہاں پہ بس غمِ دوراں کی صرف بات نہیں
کسی کی ذات بھی شاملِ غمِ حیات میں ہے

یہ اور بات ہے ذرّے کو ہم سمجھ لیں پہاڑ
کوئی بھی کام ہو ہر کام ممکنات میں ہے

ترقیات کی دُنیا کہاں پہ جا پہونچی!
تصوّرات کی دنیا تصوّرات میں ہے

یہ اور چیز ہے اخترؔ مری نظر میں نہ ہو
قدم قدم پہ وہ لیکن تصوّرات میں ہے

اختر لکھنوی

ٹیڑھی بازار۔ مولوی گنج
لکھنؤ

نمِ شب سے سحر بھیگی ہوئی تھی
ہماری چشمِ تر بھیگی ہوئی تھی

اگر زخمی نہیں تھا وہ پرندہ
تو کیوں شاخِ شجر بھیگی ہوئی تھی

لہو برسا تھا شاید آسماں سے
قبا ہر جسم پر بھیگی ہوئی تھی

مری آنکھوں کو جانے کیا ہوا تھا
ردائے ہم سفر بھیگی ہوئی تھی

لہو زخموں سے میرے بہہ رہا تھا
نگاہِ چارہ گر بھیگی ہوئی تھی

اسرار حسین اسیر

محلہ مہند گرد ھی۔ شاہ جہاں پور

غزلیں

ندی وہ پار کرنا چاہتا ہے
جسے پانی کا اندازہ نہیں ہے

غلط فہمی اسے سب سے ہے لیکن
میرے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ہے

تلافی اب بھی کر سکتی ہے مِلّت
ابھی نقصان کچھ زیادہ نہیں ہے

مجھے وہ سب سے اچھا کہہ رہا ہے
مگر ملنے کو آمادہ نہیں ہے

ہزاروں خوبیاں تسلیم لیکن
کوئی کردار بھی سادہ نہیں ہے

سید عبدالستار

اسسٹنٹ ڈائرکٹر اعلیٰ تعلیم۔ الہ آباد

دل کسی عالم میں بھی لگتا نہیں کس سے کہیں
اب کوئی فریاد بھی سنتا نہیں کس سے کہیں

جن در و دیوار میں تھی پیار کی اک داستاں
اس مکاں میں چین اب ملتا نہیں کس سے کہیں

ہم نوا جتنے بھی تھے سب گم ہوئے جانے کہاں
ساتھ تو سایہ بھی اب دیتا نہیں کس سے کہیں

رہ گزر دُشوار ہے اور دور ہے منزل ابھی
اب تو تنہا یہ سفر کٹتا نہیں کس سے کہیں

ہے تصوّر میں ثریّاؔ جانے وہ کس کی شبیہ
اب تو نظروں میں کوئی جچتا نہیں کس سے کہیں

ثریّا خاں

ایم۔ ایس۔ ۹۶ سکٹر ڈی
علی گنج ایکسٹینشن
لکھنؤ

ہم بہ ایں حسرت انھیں دیکھا کیے
اس طرح لمحاتِ غم گزرا کیے

وہ نظر میری طرف اٹھتی رہی
اہلِ محفل رشک سے دیکھا کیے

ہم نے ان کو سونپ دی اپنی حیات
سب ہمیں ہر چند سمجھایا کیے

منزلِ دار و رسن دُشوار ہے
ہم سے پہلے یہ سوال اٹھا کیے

آہ راشدؔ اس نے دیکھا تک نہیں
زندگی بھر ہم یوں ہی تڑپا کیے

ڈاکٹر راشد حسین بسوانی

حسینی منزل، دائرہ ۱۴۳
بسواں ۔ سیتاپور

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: راز در راز
مصنف: رازؔ القادری قیمت: ۲۵/ روپے
ملنے کا پتہ: محلہ سوتھا چاہ بھنڈار۔ بدایوں

رازؔ القادری بدایونی ایک گوشہ نشین شاعر ہیں۔ شعر و ادب کی تمام سیاستوں سے الگ تھلگ انھوں نے اپنی دنیا بسائی ہے اور خاموشی کے ساتھ خدمتِ ادب کو اپنا شعار بنایا ہے۔

شاعری تسکینِ قلب اور تزکیہ نفس کا بھی ایک وسیلہ ہے۔ شاعر کے دل و دماغ پر جو گزرتی ہے اس کا اظہار وہ شعر کے ذریعہ کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنی شاعری سے وہی کام لیتا ہے جو کام کسی بڑے سانحے پر ایک عام آدمی آنسوؤں سے لیتا ہے۔

رازؔ القادری شاعری کے اس راز سے بخوبی واقف ہیں اور کہتے ہیں ؎

آنسوؤں نے تری پلکوں کے سہارے ڈھونڈے
جاگ اٹھی دل میں اگر حسرتِ دیدار کبھی

رازؔ القادری کی شاعری میں نعرے بازی کا عنصر شامل نہیں ہے وہ جو بات جس طرح سوچتے ہیں اسی طرح اسے نظم بھی کر دیتے ہیں،

یا سیکڑوں وعدے تھے آغازِ محبت میں
یا ایسے گئے جیسے آیا ہی نہ تھا کوئی

طبیعت رواں، زبان صاف ستھری، رازؔ القادری کلاسیکی روایات کی صالح اقدار کے معتبر امین کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مجموعہ کلام "راز در راز" یقیناً خاصے کی چیز ہے۔

——— عشرت انصاری

نام کتاب: "کانٹے دار فصل"
مصنف: محمد طارق قیمت: ۱۸/ روپے
ملنے کا پتہ: محمد طارق کھولاپوری۔ کھولاپور ضلع امراوتی مہاراشٹر

سماجی افسانوں میں محمد طارق کا ایک منفرد مقام ہے، ان کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ۱۱ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ سماج میں پھیلی ہوئی غلط رسموں اور اخلاقی برائیوں پر بے لاگ تبصرہ ہے اور ایک پیغام لیے ہوئے ہے۔ زندگی کے موجودہ مسائل کو اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ جب تک پورا افسانہ نہ پڑھ لیا جائے، تشنگی محسوس ہوتی رہتی ہے۔

انداز بیان سلیس، بے باک اور اثر پذیر ہے۔ ہر افسانہ دل پر دیرپا نقش چھوڑتا ہے جو ذہن کے گوشے میں ایک جگہ بنا لیتا ہے سماج کی غلط روایات کی عکاسی، درسِ فکر و عمل دیتی ہے اور خرابیوں کو دور کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہر افسانے میں ہلکی سی طنزیہ چبھن کے ساتھ کوئی نہ کوئی سماجی اہمیت کا اصلاحی و سبق آموز پہلو ضرور ہوتا ہے۔

زہریلا ناگ۔ بوجھ۔ ننھا بھارتی۔ چور آتے ہیں۔ دیوار اور جانشین وغیرہ قابل قدر افسانے ہیں۔ محمد طارق کے افسانے پڑھ کر پریم چند اور منٹو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اگر طارق نے کسی کی تقلید نہ کرتے ہوئے اپنی راہ الگ بنائی ہے۔

"کانٹے دار فصل" میں جیسی کرنی ویسی بھرنی پر زور دیا گیا ہے 'ایک نگاہ'، غالباً اُردو میں ایسا پہلا افسانہ ہے جس میں ایک انوکھا نفسیاتی تجزیہ پیش کر کے مقدس رشتے کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب سبق آموز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ افسانہ نویسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جس کا مطالعہ ضروری ہے۔

——— راجندر بہادر موج

نام کتاب: "بونسائی"
مصنف: تسنیم کوثر قیمت: ۱۰۰/ روپیے
ملنے کا پتہ: تسنیم کوثر۔ بیت المکرم، ڈاکٹر محمود شاہ لین
دریاپور گولہ۔ پٹنہ (بہار)

"بونسائی" تسنیم کوثر کے، ۱ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بونسائی کا مطلب ہے کسی قدآور اور تناور درخت کو پودے کی شکل میں کسی چھوٹے سے گملے میں لگا کر ڈرائنگ روم کی زیبائش کرنا۔

بونسائی ایک باوقار بوڑھے کی سرگزشت ہے جو جوانی میں عظیم شخصیت کا مالک تھا، اور اب گھٹنوں کے درد کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ نہ کھلی ہوا میں بیٹھ سکتا ہے اور نہ پودوں و پھولوں کا نظارہ کر سکتا ہے اور بونسائی کی طرح کمرے میں بند رہتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال فرض کی فارمل ادائیگی کی طرح کی جاتی ہے اور اس کا خاتمہ گھر کے افراد کی موجودگی میں ہو جاتا ہے۔

تسنیم کوثر اُردو افسانہ نگاری کی دُنیا میں ایک ابھرتا ہوا نام ہے آج کا افسانہ اسّی فیصدی گاؤں میں رہنے والوں کی زندگی کے مسائل سے کٹ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ تسنیم نے طیچن، ادھورے خواب، انوکھا رشتہ اور دو زمین لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کو گاؤں کے بھولے بھالے لوگوں کی زندگی کے مسائل سے ہمدردی ہے اور وہ ان کا تدارک چاہتی ہیں۔ ان کے افسانے زمین سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کی مایوسیوں، محرومیوں، چیلنجوں اور انسانی ذہن کی کشمکش کی فن کارانہ انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ تسنیم کوثر ایک حساس اور ذی شعور افسانہ نگار ہیں، وہ لکھنے سے پہلے اپنے ماحول اور کرداروں کا عمیق جائزہ لے کر منظم نقشہ مرتب کر لیتی ہیں۔

تسنیم کو افسانہ لکھنے کا آرٹ معلوم ہے اور وہ اس کے لوازمات سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو بہت ٹھونک بجا کر پیش کرتی ہیں، ان کی کردار نگاری میں مخصوص اپنائیت ہوتی ہے جو تخلیق سے خالق کے گہرے رشتے کی نشاندہی کرتی ہے۔ تسنیم کوثر کے افسانوں میں نیاپن ہے۔ انفرادیت ہے اور عصری حسیت بھی۔ ان کا اسلوب روایتی ہونے پر بھی دل پذیر ہے۔ ان کا طرز نگارش اتنا دل چسپ ہے کہ قاری افسانہ شروع سے آخر تک پڑھنے کے لیے مجبور ہے محترمہ تسنیم کوثر سے افسانوی ادب کی بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

——— ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

نام کتاب: خوشبو کے داغ
شاعر: علیم صبا نویدی۔ مرتب: ڈاکٹر سجاد حسین
قیمت: پچاس روپیے (۵۰/)
ملنے کا پتہ: تمل ناڈو اُردو پبلی کیشنز، ۲۶۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ
مونٹ روڈ۔ مدراس ۲۔۶۰۰۰

معروف شاعر علیم صبا نویدی کا زیر نظر شعری مجموعہ ۴۲ نظموں اور ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شعری مجموعے کی اشاعت سے قبل ان کے شعری مجموعے "لمسِ اول"، "نور السماوات" اور "اثر خامہ" منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۶۴-۱۹۶۱ء کی درمیانی مدت میں لکھی گئی نظمیں اس شعری مجموعے میں شامل ہیں۔

"خوشبو کے داغ" میں ایک حمد اور نعت کے علاوہ رومانی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں جذبہ صرف جذبہ نہیں فکر کی گہرائی کا آئینہ دار ہے۔ شاعر نے وارداتِ قلبی کے اظہار کے لیے صاف شستہ زبان اور دلکش پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ یہ نظمیں دلوں کو چھوتی ہیں اور احساسات پر ایک دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔ اس شعری مجموعے کو صبا نویدی کے تخلیقی جوہر کے ابتدائی نمونے کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔

"خوشبو کے داغ" میں شامل بیشتر نظمیں شاعری کے اضطراری عمل کی آئینہ دار ہیں، خوبصورت تراکیب جیسے لب صبح بہاراں۔ سکوتِ شب زلفِ شب رنگ۔ وادیٔ پرکیف۔ لیلیٔ محمل نشین وغیرہ میں رومانیت کی جو ایک زیریں لہر ہے وہی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ علیم صبا نویدی کا شعری مجموعہ

"خوشبو کے داغ" ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

بشیر فاروقی

نام کتاب: ڈوبتی شام
مصنفہ: امتیاز فاطمی   قیمت: تیس روپیے
ملنے کا پتہ: بلگرام ہاؤس۔ محلہ کرہ۔ مظفرپور (بہار)

امتیاز فاطمی صاحبہ ذی علم خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ شاد عظیم آبادی کی پرپوتی ہیں۔ شاد عظیم آبادی یوں تو بہترین شاعر تھے لیکن انھوں نے ناول بھی لکھا تھا۔ اس طرح وہ نثر نگار بھی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ جناب بہزاد فاطمی صاحب بھی اچھے نثر نگار ہیں اور اچھے شاعر بھی ہیں۔ اس خاندان کو اردو ادب سے ہمیشہ گہرا لگاؤ رہا ہے۔ شاید یہ نسلی طرۂ امتیاز ہے۔

حال ہی میں محترمہ امتیاز فاطمی صاحبہ کے اٹھارہ افسانے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں جو قابلِ ستائش ہیں۔ موصوفہ حساس اور ذہین خاتون ہیں، ان کے تجربے اور مشاہدے نہایت وسیع ہیں۔ سماج میں جو بدعنوانیاں ہو رہی ہیں ان سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ادب برائے زندگی میں یقین رکھتی ہیں اور ایسی جدیدیت کی بھی قائل نہیں ہیں جو افسانے کو معمہ بنا دے اور قاری سر پر ہاتھ رکھ کر سوچتا رہ جائے وہ تعطل پسند ہیں۔ بلند شعور و ادراک کی مالک ہیں۔ افسانے کے عوامل اور رموز سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے نہ تو پریم چند کی روایات کو افسانوں میں برتا ہے، نہ بیدی کے فن سے کوئی اثر لیا ہے اور نہ ہی کرشن چندر کے نقشِ قدم پر چلی ہیں بلکہ انھوں نے اپنے فن کے لیے الگ راہ بنائی ہے۔ انھوں نے سماجی حقیقت نگاری کو نئی جہت دی ہے اور اسلامی معاشرے میں سانس لینے والی خواتین کی سچی تصویریں بنائی ہیں۔

امتیاز فاطمی صاحبہ اپنے افسانے کو مقصدیت سے عاری نہیں ہونے دیتیں۔ ان کی کہانیوں میں کہانی پن بھی پایا جاتا ہے اور ان کی کردار نگاری میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ کرداروں کی زبان، ماحول اور شخصیت کے مطابق ہی استعمال کرتی ہیں۔ ڈوبتی شام۔ شمع مزار۔ شمع بجھتی ہے۔ مصنفہ کے بہترین افسانے ہیں جو اُردو ادب میں یادگار رہیں گے۔ اُمید ہے اُردو کے حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

مضطر انصاری

نام کتاب: پھول ایک ہی چمن کے
شاعر: کوثر صدیقی   قیمت: پچاس روپیے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی

"پھول ایک ہی چمن کے" کوثر صدیقی کی چونسٹھ نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ساری نظمیں بچوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ بچوں کے ذہنی نشو و نما کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔ موضوعات میں ہندوستان کے موسمیات تہوار، پرندوں اور تہذیب و ثقافت سے متعلق کئی نظمیں شامل ہیں، جو زبان و بیان کے اعتبار سے بھی لطف دیتی ہیں۔

کوثر صاحب کی نظموں میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے علم و عمل ریت و رواج اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہی ملک کے بعض اہم مسائل کی جانب بھی توجہ کی ہے اور ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ بچوں میں ابھی سے اپنے ملک کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ جیسے وطن دوستی۔ اتحاد و اتفاق، جہد و عمل اور سب سے اہم بات جو مجھے اس مجموعے میں نظر آئی وہ ہے اخلاقیات کا درس۔

اول تو اردو شاعروں نے بچوں پر جتنا لکھنا چاہیے ابھی تک نہیں لکھا ہے اُردو میں بچوں پر لکھنے والوں کے نام انگلیوں پر گنائے جا سکتے ہیں۔ وہ حضرات لائقِ ستائش ہیں جو صلے کی پروا کیے بغیر ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کوثر صاحب کی یہ کوشش کامیاب ہوگی۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ جس موضوع پر نظم لکھی جا رہی ہے لاکھ زبان آسان سہی لیکن کیا موضوع بھی ایسا ہے جس سے بچے

دل چسپی لے سکیں اور ذوق و شوق سے پڑھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے کوثر صدیقی، بچوں کے کامیاب شاعر ہیں۔

کتاب میں اچھے کاغذ، اچھی طباعت اور جگہ جگہ رنگین تصاویر کا استعمال کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے لیے مزید کشش پیدا ہو سکے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے لیکن کتاب بہرحال معیاری ہے۔

—— سلیم عمر

نام کتاب: "آئینۂ احساس"
شاعر: ناظر صدیقی   قیمت: ۱۰۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: ۱۰۵/۱۵۵ - ادبی سنگم
کانپور

ناظر صدیقی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ علم و فن کے رموز و نکات سے واقف شاعر۔ مشاعروں کی ہنگامہ خیزی سے گھبرا کر اب ریڈیو، ٹیلی ویژن اور رسائل تک محدود ہو گئے ہیں۔

"آئینۂ احساس" ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ "سنگِ احساس" پہلا مجموعہ تھا۔ ناظر کے یہاں عصری حسیت کی جلوہ گری بھی ہے اور وہ معنویت بھی جو عصری حسیت کے بطن سے جلوہ کرتی ہے۔ یہ مجموعہ لفظ کے تخلیقی عمل کا معتبر حوالہ ہے۔ ناظر نے کسی نئی یا پرانی تحریک کا لیبل اپنے اوپر چسپاں نہیں کیا ہے۔ وہ ۱۹۵۵ء سے شعر کہہ رہے ہیں اور اب تک کئی مجموعے ترتیب دے کر اپنی تحویل میں لے چکے ہوتے مگر وہ اپنے محتسب آپ ہیں۔ ٹکسال سے باہر ان کے یہاں کچھ نہیں ہے وہ نہ تو اپنا ضیاع کرتے ہیں نہ دوسرے کا۔ پڑھنے، یاد رکھنے اور لطف دینے والے اشعار ہی آپ کو اس مجموعے میں نظر آئیں گے۔ سادگی میں پرکاری تمام فنونِ لطیفہ کی آبرو ہے۔ یہ تمام چیزیں احتیاط نظر سے وجود میں آتی ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

اک شمع محبت تھی وہ یاروں نے بجھا دی
اب کیا ہے سرِ راہِ وفا کچھ بھی نہیں ہے

مندرجہ بالا شعر بظاہر بہت سادہ اور سہل ہے مگر گہری معنویت نے اسے سہل ممتنع کے زمرے میں شامل کر دیا ہے اسی منزل میں آکر فن اور فن کار ہماری توجہ اور داد کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ علامہ کوثر جائسی اور پروفیسر ابوالحسنات حقی کے مربوط اور مبسوط مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں۔

بہر طور "آئینۂ احساس" ایسا شعری مجموعہ ہے جس کے مطالعے کی سفارش اہلِ ذوق حضرات سے کی جا سکتی ہے۔ شعری مجموعوں کے جنگل میں آئینۂ احساس پر نظر ٹھہرتی ہے۔

—— مظہر محمود

غزل

دائم الایمان

نظامِ کاہکشاں راہ بھر میں رکھ آؤں
چراغِ شب کو تری رہ گزر میں رکھ آؤں

سنا ہے شہر کی بازار لٹنے والی ہے
ترے وجود کو لے جا کے گھر میں رکھ آؤں

اترنے والا ہے سورج ہرے درختوں پر
میں اپنا قد بھی دیارِ شجر میں رکھ آؤں

شہید ہو نہ سکے حشر تک کوئی پیاسا
فرات لے کے کفِ کوزہ گر میں رکھ آؤں

سفر طویل ہے مشکل ہے اس لیے دائمؔ
دعائے توبہ کو زادِ سفر میں رکھ آؤں

غزل

فرزند حسین زیدی

حسن دینا خدا حیا دینا
ورنہ یہ زندگی مٹا دینا

مجھ کو جینے کی مت دعا دینا
دردِ دل کی مگر دوا دینا

خود نہ سمجھیں تو بات ہی کیا ہے
رازِ دل کا نہ تم بتا دینا

عشق رسوا نہ ہو زمانے میں
دل میں پاکیزہ سی وفا دینا

کون ناکام جا رہا ہے جبیںؔ
تیرے در سے، ذرا صدا دینا

نصف صدی نمبر

تاثرات کے آئینے میں

محترمی امجد حسین صاحب۔ آداب

نیا دور کا نصف صدی نمبر دیکھ کر یکایک میری زبان پر میر کا وہ مشہور شعر آگیا جو انھوں نے دلی کے بارے میں کہا تھا۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو چیز نظر آئی تصویر نظر آئی

بس دلّی کی جگہ نیا دور تصور کر لیجئے۔ اور دیکھیے کہ آپ نے ناخدائے سخن کو کس طرح ہائی جیک کر لیا ہے۔

اس مجلد مجلے کے ۲۳۲ صفحات کے پندرہ ابواب کے ہر گوشے اور ہر گوشے کا ہر ورق مصوّراتی ہے۔ سرورق سے لے کر پشتے تک تخیل اور تزئین رقصاں ہیں۔ پرانے نمبروں کے سرورقوں کے عکس اور اردو کے عظیم ترین ادیبوں اور شاعروں کی نادر تصویروں نے اسے ہدیۂ یکتا بنا دیا ہے۔

مشمولات میں حسنِ ادراک اور جوہرِ احساس ہے۔ شعریات، نثریات، صحافیات، تنقیدات، لسانیات، طنزیات، شخصیات، ادبی نفسیات اور سماجیات کا ایک ایسا دریا ہے کہ ہر لہر میں علم کی ایک البیلی ندی رواں ہے۔ اکثر نگارشات حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ہیں اور بعض مضامین تو حقیقتاً اپنے شعبے کی گزشتہ نصف صدی کے رجحانات کا عالمانہ احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں اردو تحقیق، اردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت، بھوپال، آسام، فرخ آباد اور اجین ایسے اہم شہروں کے ادبی سفر اور اردو میں سفرناموں کی روایت تو واقعتاً نصف صدی نمبر کی یکتائیاں ہیں۔

صحافت کے گوشے میں نیا دور کی تاسیس اور کارناموں و مدیروں کے احوال تاریخِ صحافت کا تاریخی سامان ہیں۔ اس کے بانی مدیر سید علی جواد زیدی کا مضمون تو بالخصوص تبرکِ عالی ہے۔

حصولِ آزادی سے قبل موصوف نے "اطلاعات" کے نام سے پیدا ہونے والے سرکاری پریس نوٹوں کے ایک پلندے کو، جو کسی ادارت یا اداریے کے بغیر ہی شائع ہو جاتا تھا، اپنی فکر و تدبّر سے نہ صرف ایک چشمۂ علم و ادب بنا دیا بلکہ حقیقتاً اس کا نیا دور شروع کیا۔ یہ غالباً ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ اس کے چند ہی سال بعد جب وہ ایک مختصر سی مدّت پر لکھنؤ سے باہر گئے تو نیا دور پر ایک جان لیوا آفت آئی، اس کے عارضی انچارج نے اس وقت کے وزیر اطلاعات سے سیدھا رابطہ بنا کر اسے اس بنا پر بند کروانے کی تجویز منظور کرالی کہ ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہو جانے کی وجہ سے اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ اس وقت ریاست کے سکریٹری کے عہدے پر سر تیج بہادر سپرو کے فرزند آنند نرائن سپرو آئی۔ سی۔ ایس متمکن تھے، انھوں نے زیدی صاحب کی فریاد پر فوراً وزیر اعلا پنڈت گووند بلبھ پنت سے براہِ راست نمائندگی کر کے اسے بحال کرالیا۔

سید علی جواد زیدی نے نیا دور کی پیدائش پر ہی ایک سرکاری رسالہ بنانے کے بجائے اسے مستند اور معتبر ادبی اور ثقافتی جریدہ بنانے کی جو داغ بیل ڈالی تھی اس کی ایک حسین انتہا یہ نصف صدی نمبر ہے جو ادارے کی محنتِ شاقہ کا ثبوت ہے۔

سید علی جواد زیدی کا مضمون انھیں صرف ایک مورّخِ صحافت ہی کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن اتر پردیش کے اس رئیسِ قلم کا ملک کی ادبی زندگی میں ایک خاص مقام ہے۔ اس کا اعتراف نصف صدی نمبر کے کئی قلم کاروں نے بھی کیا ہے۔ یہ نہایت موزوں ہوگا کہ نیا دور جو خصوصی نمبر شائع کرنے میں تاریخی مہارت اور شہرت رکھتا ہے اور جسے آپ نے حسن و خوبی سے مزید نکھارا ہے، علی جواد زیدی پر بھی ایک نمبر مرتب کرے، جس میں ان کی بوقلموں تصانیف اور انگریزی زبان میں حال ہی میں شائع شدہ تاریخِ ادبِ اردو کے سیاق و سباق میں پورے اردو ادب پر نظر ڈالنے کا موقع پیدا ہو۔

آپ نے "نصف صدی" کے عنوان کی بھی بڑی منفرد توضیح کی ہے۔ وقت جبلیوں کی سوداگری نہیں کرتا بلکہ عقل و دانش کے

قدرتی اور شعوری طریق عمل کی گرہیں محفوظ کرتا ہے۔ یہ گرہیں تاریخ اور ادب کا موضوع بنتی ہیں اور اُردو ادب کے اوراق میں ہماری تہذیب و تمدن کے کئی عقدے وا شگاف ہوتے ہیں۔ نصف صدی نمبر اسی بشارت کا آبدار آئینہ ہے۔ اس سے یقیناً ہر عہد کے مزاج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس نمبر کی طباعت میں بڑی تاخیر ہوئی اور یہ تاخیر خاصی ناگوار تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ ؏

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

اسے دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ :

اے "متاعِ فقیر" یونہی آتے رہنا

———— گربچن چندن
نئی دہلی

مکرمی امجد حسین صاحب۔ آداب!

نصف صدی نمبر موصول ہوا۔ ساتھ میں دسمبر کا شمارہ بھی تھا۔ شکریہ!

حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی اتنی زندگی میں اُردو کا کوئی رسالہ اس قدر خوبصورت، باوقار اور مجلد نہیں دیکھا، جیسا کہ نصف صدی نمبر ہے۔ یقیناً یہ آپ کا ایک یادگار کارنامہ ہے جس کے لیے آپ تمام اُردو والوں کے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مضامین بھی اچھے اور تصاویر بھی نہایت دل کش ہیں۔ غرض کہ یہ نمبر سرتاپا ایک حسین شاہکار ہے۔ آپ کی حوصلہ مندی کی داد دینی چاہیے۔

———— نامی انصاری
کان پور

عزیز محترم! سیّد امجد حسین صاحب

نیا دور کا نصف صدی نمبر شدید انتظار کے بعد ۴ر مارچ ۱۹۹۶ء کو ملا۔ شکریہ۔ جنوری اور فروری کے مہینے انتظار کرتے کرتے گزر گئے۔ اس خوبصورت نمبر کے لیے دلی مبارکباد قبول کریں۔

اگر اس میں اُردو کے مختلف مراکز میں نصف صدی کے کام کا جائزہ ہوتا تو اور بھی زیادہ مفید ہوتا۔ بہر حال آپ کی محنت اور دل چسپی قابلِ ستائش ہے۔ خدا آپ سے اور بھی اچھے کام لے۔

آئندہ کسی موقع پر ایک نمبر نیا دور کے لیے مخصوص کریں تو بہت اچھا ہوگا۔ اس نمبر میں نیا دور میں شائع ہونے والے مقالات، افسانے، ڈرامے، خاکے، طنز و مزاح، نظم، غزل وغیرہ کا مکمل اشاریہ ۱۹۹۵ء تک ہو۔ تاکہ تحقیقی کام کرنے والوں کو رہنمائی حاصل ہو۔ اگر یہ کام آپ کے زمانے میں ہو جائے تو بڑا یادگار کام ہوگا۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

———— عبدالقوی دسنوی
بھوپال

آہ! نذیر بنارسی

"جنھیں محلوں میں رہنا ہے وہ سوچیں اپنا مستقبل
بہر صورت بسر کر لیں گے ہم اپنی ہمارا کیا"

گزشتہ مارچ کے اواخر میں اُردو شاعری کے افق پر وہ ستارہ بھی غروب ہو گیا جو نظیر اکبر آبادی کی شعری وراثت کے علمبردار نذیر بنارسی کی صورت میں گزشتہ ساٹھ برس سے جگمگا رہا تھا۔ ان کی وفات سے ایک دَور کا خاتمہ ہوتا ہے۔ انھوں نے قلندرانہ مزاج اپنایا درویشی کو اپنا شعار بنایا اور اس طرح زندگی بسر کی کہ ساری دُنیا انھیں بے نظیر سمجھتی رہی۔

ان کے اُٹھ جانے سے اُردو ادب کا جو عظیم نقصان ہوا ہے اس کی تلافی بہر حال مشکل ہے۔

ادارہ نیا دور بارگاہِ ایزدی میں دُعا گو ہے کہ حق تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

———— ایڈیٹر

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
قومی یک جہتی کے نام (نظم)	فضا ابن فیضی	۳
چند باتیں "زہر عشق" کے متعلق	رشید حسن خاں	۴
کربلائے عقل (نظم)	عبدالمنان صدیقی	۸
غزلیں	بیکل اتساہی۔ شجاع خاور	۹
تجربات و حوادث (خودنوشت)	عرفان عباسی	۱۰
رباعیات	ناوک حمزہ پوری	۱۹
وقت (نظم)	خورشید افسر بسوانی	۲۰
ندامت (نظم)	مہدی پرتاپ گڑھی	۲۰
ادب کے قدیم یونانی اور ہندستانی نظریات	خورشید انور	۲۱
غزل	محمود الحق محمود	۲۵
غزلیں	خان عزمی رُدولوی،	۲۶
	راز اناوی۔ پیام فتحپوری	۲۶
اردو شاعروں کا ارتقاء	منظر اعظمی	۲۷
غزل	اختر عمر اختر	۳۴
یہ اشک ریزیاں (نظم)	عنبر بہرائچی	۳۵
التوا (نظم)	یوگیندر بہل تشنہ	۳۵
تفتیش (طنز و مزاح)	دلیپ سنگھ	۳۶
غزلیں	طاہر تلہری	۳۹
	شاہد میر۔ ظفر اقبال	۳۹
بہت دیر کردی (افسانہ)	ارشاد امروہوی	۴۰
غزل	صدا لکھنوی	۴۲
خود اعتمادی کی جیت	دیپک پرکاش	۴۳
نقد و تبصرہ	نامی انصاری، وجاہت علی سندیلوی، تسنیم فاروقی، تسکین زیدی، آصف لکھنوی، عابد ظفر، مناظر عاشق ہرگانوی	۴۵
اوعمر آئینۂ ایام میں	——— قارئین	۴۸

اپنی بات

یوں تو انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی جہد آزادی کا نقطۂ آغاز ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کی لڑائی سے ہوا تھا، جب موہن لال اور میر مدن کی وفاداری اور میر جعفر کی غداری تاریخ کو ایک نیا عنوان دے گئی تھی۔ لیکن جہد آزادی پر اس وقت بھرپور شباب آیا تھا جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے عظیم سپوت سربکف ہوکر نکل پڑے تھے، ان میں بہادر شاہ ظفر، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، کنور سنگھ اور نواب آف باندہ جیسے معزز صاحبانِ اقتدار بھی تھے اور مولانا فضل حق خیرآبادی، مولوی احمد اللہ شاہ اور امام بخش صہبائی جیسے علماء کرام بھی۔ نیز جنرل بخت خاں اور تانتیا ٹوپے جیسے جری اور بہادر عوامی سورما بھی تھے اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے ہی نام رہے ہوں گے جنھوں نے اپنے خون کی سرخی سے ہندوستانی تاریخ کو روشنی بخشی تھی۔ موت اتنی شاندار بھی ہو سکتی ہے یہ کوئی ان جیالوں سے پوچھتا جو تختۂ دار کی طرف بڑھتے تو کہتے "ہم سربلند ہونے جا رہے ہیں" اور اُس رسی کو بوسہ دیتے جو ان کے گلے ملتی تھی۔

وطن سے محبت انسان کا ایمان ہونا چاہیے اور اس ایمان کا ایک جز اپنی تاریخ کی عظیم شخصیتوں کی یاد بھی ہے، آج ان شخصیتوں کو یاد کرتے ہوئے ہم انھیں سلام کرتے ہیں۔ لیکن شاید صحافت ان عظیم شخصیتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے کیونکہ دھیرے دھیرے ان کے تذکرے کم ہوتے جا رہے ہیں جبکہ یہ قصۂ پارینہ نہیں ہے کہ کبھی کبھی اسے دہرایا جائے۔ یہ خون کی مشعل ہے جس کی روشنی میں ملک کو آگے بڑھنا ہے۔

اسی ماہ میں محرم بھی گزرا۔ ہماری تہذیب کی یہ اعلا ترین خصوصیت رہی ہے کہ یہاں ہر کام مل جل کر کیا جاتا رہا ہے چنانچہ خوشی کے تہوار تو سبھی مل جل کر مناتے ہیں اور مسرت میں شرکت اچھی ہی لگتی ہے لیکن غم میں شرکت کرنا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ محرم کی بنیاد واقعاتِ کربلا پر ہے۔ کربلا عراق میں ہے، لیکن محرم اس طرح منایا جاتا ہے جیسے کربلا کے سارے کردار ہمارے اپنے دیش کے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ جس جذبۂ عقیدت کے ساتھ ہندوستان میں محرم منایا جاتا ہے وہ یقیناً منفرد ہے۔

اُردو ادب پر یہ کربلا کا احسان ہے کہ اس کا تین چوتھائی شعری حصہ واقعاتِ کربلا سے متاثر ہے اور شعراء کے حلقۂ ماتم میں غیر مسلم بھی ہیں۔ راقم الحروف نے اردو کے غیر مسلم مرثیہ نگاروں پر خامہ فرسائی کی ہے اور تقریباً پانچ سو معروف اور مستند مرثیہ نگاروں میں سو سے زیادہ غیر مسلم مرثیہ نگار ہیں۔ یہ تاریخ کا حسین ترین تہذیبی گوشہ دُنیا میں کہیں نہیں ملے گا جو ہمارے ملک میں ہے کہ باہمی احترام اور مذہبی رواداری اس منزل پر ہے کہ ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے مذہب کے رہنما کو خراجِ عقیدت پیش کرے۔ جہاں تک کربلا کا سوال ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی عظیم شخصیت ساری دنیائے انسانیت کے لیے مینارۂ نور ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی کے

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو　　ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

ایڈیٹر

قومی یک جہتی کے نام

ہر آغاز خوش انجام، قومی یک جہتی کے نام
میری سحر اور میری شام، قومی یک جہتی کے نام

مغبچے، ساقی اور میخوار ایک ہی جرعے سے سرشار
کسوتِ مینا، نشۂ جام، قومی یک جہتی کے نام

وہ کشمیر کے سیب، اخروٹ، یا ہوں ملیح آباد کے آم
ساری شرابِ پختہ و خام، قومی یک جہتی کے نام

علم و ثقافت، فکر و فنون ٹھہرے مشترکہ میراث
تلسی داس، عمر خیام، قومی یک جہتی کے نام

اُردو ہندی شعریات، رس اور رنگوں کی سوغات
خسروؔ، غالبؔ، میلا رام، قومی یک جہتی کے نام

تو کہ مکمل اک اعجاز، میرے عظیم اقبال کا ہے
نغمۂ ہندی تجھ کو سلام، قومی یک جہتی کے نام

سچ تو ہے یوں، یہ دورِ نو ہی، افرادِ جمہور کا ہے
اب کوئی آقا ہے نہ غلام، قومی یک جہتی کے نام

یہ بنگال ہے، وہ پنجاب، لاحاصل باتوں سے کیا
وقت کی حجت کا اتمام، قومی یک جہتی کے نام

بولیاں اتنی رنگارنگ، کلچر اتنے پہلودار
دہلی، حیدرآباد، آسام، قومی یک جہتی کے نام

مختلف اللون ایک گروہ، ایک کثیر النسل سماج
لازم ہے تشکیلِ نظام، قومی یک جہتی کے نام

سب کو مساوی بخشے ہیں، آئینِ ہندی نے حقوق
جمہوری شعبوں کی زمام، قومی یک جہتی کے نام

ملکی و ملی استحکام، ہر مذہب کی ہے تعلیم
نانک و چشتی کا پیغام، قومی یک جہتی کے نام

تہذیبی قدروں کا زوال، اخلاقی پستی کا عروج
کم تو نہیں یہ سب الزام، قومی یک جہتی کے نام

اقوامِ عالم کی بساط، اور سیاسی بازیگر؟
مہر بہ لب بیچارے عوام، قومی یک جہتی کے نام

حق میں ہمارے قاتل زہر، ہم آہنگی کا فقدان
پھر کیوں لکھیے مرگِ دوام، قومی یک جہتی کے نام

میری اُمنگیں، میرے خواب، خاکِ وطن جن سے نمناک
میں ہوں، دامن بھر انعام، قومی یک جہتی کے نام

میرے سخن کی وادی میں، دھوپ بھی ہے اور سایہ بھی
کچھ توضیح ہے کچھ ابہام، قومی یک جہتی کے نام

عصری تقاضوں سے معمور، کہیو فضا ایک ایسی غزل
ہوں جس کے اشعار تمام، قومی یک جہتی کے نام

فضا ابن فیضی
جمال پورہ، مئو ناتھ بھنجن

رشید حسن خاں

۱۷۶۔ [illegible]

چند باتیں "زہرِ عشق" کے متعلق

قدیم ترین مطبوعہ نسخہ

نواب مرزا شوق کی اس مثنوی کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ جو میرے علم میں ہے، وہ ۱۸۶۲ء کا چھپا ہوا ہے۔ میری معلومات کی حد تک یہ نسخہ ہندستان اور پاکستان کے کسی معروف کتب خانے میں موجود نہیں۔ اسی طرح میرے علم کی حد تک ان دونوں ملکوں کے کسی اسکالر نے اس نسخے سے براہِ راست استفادے کا ذکر نہیں کیا جن حضرات نے شوق لکھنوی اور ان کی مثنویات پر قابلِ ذکر کام کیا ہے ان میں سے کسی کی نظر سے یہ نسخہ نہیں گزرا۔ حسنِ اتفاق سے یہ نسخہ میرے ایک کرم فرما کی ملکیت تھا اور اب ان کی عنایت سے یہ میرے سامنے ہے۔ قدیم ترین مطبوعہ ایڈیشن ہونے کے ساتھ ساتھ میری نظر میں، یہ اس مثنوی کا معتبر ترین نسخہ ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:-

" خدای خالقِ دو جہاں کی توفیق سے
مثنوی زہرِ عشق
مطبع شعلۂ طور کانپور میں رونق گوینِ طبع ہوئی"

آخر میں مختصر سی عبارتِ خاتمہ ہے:

" تمت / الحمد للہ والمنۃ کہ مثنوی زہرِ عشق بتاریخ
بست نہم جنوری ۱۸۶۲ء / بمطبع شعلۂ طور کانپور
باہتمام شیخ عبداللہ / پرنٹر کارخانہ مذکور حلیہ طبع پوشید"

شوق اور مثنویاتِ شوق سے متعلق سب سے پہلی قابلِ ذکر کتاب عطاء اللہ پالوی کی "تذکرۂ شوق" ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ناشر: مکتبۂ جدید لاہور۔ اس کتاب میں اس نسخے کا حوالہ آیا ہے، چونکہ پالوی صاحب نے اس نسخہ کو دیکھا نہیں تھا، اس لیے حوالہ بھی نامکمل ہے اور ماخذ کا ذکر بھی درست نہیں۔ پالوی صاحب کی عبارت یہ ہے:

" زہرِ عشق کے جس سب سے قدیم مطبوعہ نسخے کا پتہ ملتا ہے، وہ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء کا چھپا ہوا ہے اور غالباً یہی نسخہ یورپ پہنچا تھا، جس کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے اٹھارھویں خطبے مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۶۸ء میں کیا ہے۔" (تذکرۂ شوق، ص ۹۱)

معلوم نہیں پالوی صاحب نے دتاسی کے خطبے کا حوالہ کس بنیاد پر دیا ہے یوں کہ دتاسی نے وہ لکھا ہی نہیں جسے پالوی صاحب نے اس سے منسوب کیا ہے۔ جس خطبے کا حوالہ پالوی صاحب نے دیا ہے، اس میں دتاسی نے یہ لکھا ہے:

" اردو کتابیں جو مجھے موصول ہوئی ہیں، یا جنھیں میں نے پڑھا ہے، ان میں .... مثنوی زہرِ عشق اور چراغِ ہدایت بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر باتصویر شائع ہوئی ہے۔"

(خطباتِ گارساں دتاسی، اٹھارواں خطبہ ص ۱۱۹، سالِ طبع ۱۹۳۵ء)

دتاسی نے کسی سنہ کا حوالہ نہیں دیا۔ اس نے ایک باتصویر نسخے کا ذکر کیا ہے، معلوم نہیں وہ کون سا نسخہ تھا۔ ۱۸۶۲ء کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، وہ باتصویر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پالوی صاحب نے اس نسخے کے سالِ طبع ۶۲ء کی مطابقت ۱۲۷۹ھ سے کی ہے۔ اگر تاریخ اور مہینے کا علم نہ ہو تب مطابقت میں عموماً دو سنہ لکھے جاتے ہیں، مثلاً ۱۸۶۲ء کو ۷۹۔۱۲۷۸ھ کے مطابق لکھا جاتا۔ چوں کہ تاریخ اور مہینہ معلوم ہے (۲۹ جنوری) اس لیے یہاں

... کی مطابقت ص ۱۲ و ۱۵ سے ہوگی" (ص ۱۱) سے نہیں۔

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے کلیاتِ نواب مرزا شوق لکھنوی مرتب کیا ہے (مطبوعہ اپریل ۱۹۷۱ء) اس کے مقدمے میں انھوں نے کسی حوالے کے بغیر لکھا ہے:

"سب سے قدیم ایڈیشن کا حوالہ گارساں دتاسی کے اشارہویں خطبے میں (۴ دسمبر ۱۸۶۲ء) ملتا ہے۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۲ء کا مطبوعہ بتایا ہے۔ غالباً سب سے پہلا ایڈیشن یہی ہوگا، مگر آج تک مذکورہ نسخے کا منظرِ عام پر آنا ثابت نہیں ہوا۔" (ص ۲۹)

بظاہر شاہ صاحب نے پالوی صاحب کے لکھے کو دہرایا ہے۔ اگر وہ حوالہ دیتے تو اس غلط بیانی کی ذمہ داری ان پر نہ آتی۔ اگر انھوں نے دتاسی کے مذکورہ خطبے کو دیکھا ہوتا تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ دتاسی نے ایسی کوئی بات لکھی ہی نہیں۔ اس نے ایک مختلف نسخے کا ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، مطبع شعلۂ طور کان پور کا یہ ایڈیشن اب تک کی معلومات کے مطابق زہرِ عشق کا قدیم ترین ایڈیشن ہے۔ کتابت کی غلطیاں اس میں کم سے کم ہیں۔ مسطر انیس سطری ہے۔ کل مکتوبہ صفحات اکتیس ہیں۔ کل اشعار پانچ سو انسٹھ (۵۵۹) ہیں۔ ص ۳۱ کی پندرھویں سطر پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد عبارتِ خاتمہ ہے جسے نقل کیا جا چکا ہے۔ صحتِ متن کے لحاظ سے بھی یہ معتبر ترین نسخہ ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ الحاقی اشعار سے یکسر خالی ہے۔ صرف ایک مثال: زہرِ عشق کے کئی مطبوعہ نسخوں میں آخری شعر یہ ہے ؎

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا، غم سے آشنائی کی

کلیاتِ شوق مرتبہ شاہ عبدالسلام میں بھی یہ شعر موجود ہے (ص ۱۰۸)، مگر یہ الحاقی شعر ہے۔ عطاء اللہ پالوی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نشان دہی کر چکے ہیں کہ یہ شعر مصحفی کے ایک شاگرد کا ہے۔ اس میں تقدم پالوی صاحب کو حاصل ہے۔ انھوں نے لکھا تھا: "تذکرے میں یہ شعر مجھے مصحفی کے ایک جواں مرگ شاگرد نواب جلال الدولہ مہدی علی خاں بہادر تہوری کے نام سے ملا ہے۔" (تذکرۂ شوق ص ۱۲۰)۔ پالوی صاحب نے تذکرے کا نام نہیں لکھا تھا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے ایک مضمون (ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ء) میں یہ نشان دہی کی ہے کہ یہ مصحفی کے تذکرے ریاض الفصحاء میں ہے۔ انھوں نے مہدی کی پوری غزل نقل کر دی۔ کان پوری نسخے میں یہ شعر موجود نہیں۔ مثنویاتِ شوق میں اختلافِ اشعار سے متعلق تفصیلات اس کے بعد ایک مستقل مضمون میں پیش کی جائیں گی؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعدادِ اشعار اور متنِ اشعار کے اختلافات بہت ہیں، یہ ایک مستقل مفصل مضمون ہی میں سما سکیں گے۔ میں نمونے کے طور پر محض ایک مثال پیش کروں گا۔ شاہ عبدالسلام صاحب کے مرتبہ نسخۂ زہرِ عشق' (مشمولہ کلیاتِ شوق) میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں ؎

لو مری جان جاتی ہوں اب تو　　یاد رکھیے گا میری صحبت کو
جو خدا پھر ملائے گا تم سے　　تو کہوں گی پھر حال آ تم سے
سُن کے میں نے دیا یہ اس کو جواب　　نہ کرو دل کو اس قدر بیتاب
کہتی تم کیا ہو، یہ خدا نہ کرے
یہ ستم ہووے کبریا نہ کرے　　(ص ۱۸۰)

یہ چاروں شعر قطعی طور پر الحاقی ہیں اور کسی نوسکھیے کے بنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نظامی بدایونی نے زہرِ عشق کا جو نسخہ شائع کیا تھا (نظامی پریس بدایوں، طبع اوّل ۱۹۱۹ء۔ طبع ثانی ۱۹۳۰ء) اس میں بھی یہ چاروں شعر موجود ہیں۔ اس نسخے میں دراصل ایسے پانچ شعر ہیں۔ پانچواں شعر یہ ہے ؎

عمر بھر ہم وفا نہ توڑیں گے
زندگی بھر نہ منہ کو موڑیں گے

میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ شاہ صاحب نے یہ چاروں شعر نسخۂ نظامی سے نقل کیے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پانچویں شعر کو کیوں چھوڑ دیا گیا۔ الحاقی اور غیر معتبر ہونے کے لحاظ سے پانچوں شعر برابر کی حیثیت

سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے کلیاتِ شوق کے مقدمے میں لکھا ہے کہ نول کشوری مجموعۂ مثنویات (سالِ طبع ۱۸۶۹ء) ان کے پیشِ نظر ہے جو دوسری بار ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا تھا، یہ ایڈیشن پیشِ نظر ہے اور (اس) میں یہ الحاقی اشعار موجود نہیں۔

عنوانات

ترغیبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق۔ ان تینوں مثنویوں کے جو قدیم نسخے میرے سامنے ہیں، ان میں سے کسی میں ذیلی عنوانات موجود نہیں۔ بہارِ عشق کے پہلے ایڈیشن (سلطان المطابع ۱۲۶۶ھ) میں بھی کوئی ذیلی عنوان نہیں۔ اس کے دوسرے ایڈیشن میں، جو مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد شائع ہوا تھا (مطبع محمدی ۱۲۶۸ھ) اس کے آخر میں "ترغیبِ عشقِ حقیقی" کے عنوان سے ۱۲۳ اشعار کا اضافہ کیا گیا۔ یہ عنوان خود مصنف (شوق) کا قائم کیا ہوا ہے۔ اس ایک عنوان کے سوا کوئی دوسرا عنوان اس نسخے میں نہیں پایا جاتا۔

ان مثنویوں کے جو مؤخر نسخے پیشِ نظر ہیں، ان میں زہرِ عشق کے نسخۂ نظامی بدایونی اور نسخۂ مجنوں گورکھپوری (سالِ طبع غالباً ۱۹۳۰ء) میں متعدد ذیلی عنوانات موجود ہیں۔ شاہ عبدالسلام کے مرتبہ کلیات میں شوق کی تینوں مثنویاں شامل ہیں (سالِ طبع ۱۹۷۸ء) ان تینوں مثنویوں میں بھی ذیلی عنوانات موجود ہیں۔ مجنوں نے زہرِ عشق کے دیباچے میں لکھا ہے:

> "مثنوی میں جو عنوانات ہیں، ان میں کچھ ترمیم کی گئی ہے۔ مثلاً عام نسخوں میں "رخصتی ملاقات کا پہلا موقع"۔ "رخصتی ملاقات کا دوسرا موقع" اور پھر "رخصتی ملاقات" کے عنوان ملیں گے۔ میں نے ان سب کو ملا کر "رخصتی" کا ایک عنوان رکھا ہے..... بعض نسخوں میں "چغلی کھانا ایک عورت کا دختر کے والدین سے" کی بھی ایک سرخی ہے۔ لیکن بعض نسخوں میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔ میں نے بھی اس ٹکڑے کو نکال دیا ہے۔"

(زہرِ عشق۔ مجنوں ایڈیشن ص ۳۹)

جن کے ذیلی عنوانات موجود ہیں ان کا مصنف سے کچھ تعلق نہیں۔ انھیں مختلف ناشروں یا ایسے مرتبین نے شامل کیا ہے جنھیں تحقیق سے کوئی علاقہ نہیں۔

جدید نسخوں میں سے اگر زہرِ عشق کے مجنوں ایڈیشن میں ذیلی عنوانات موجود ہیں، تو مجھے اس پر تعجب نہیں، یوں کہ مجنوں صاحب کے مزاج کو تحقیق سے دور کی بھی مناسبت نہیں تھی۔ تعجب ہے شاہ عبدالسلام کے طریقِ کار پر، خاص کر یوں کہ انھوں نے اپنے مرتبہ کلیاتِ شوق کے دیباچے میں یہ صراحت کر دی ہے کہ ۱۸۶۹ء کا شائع شدہ مثنویات کا نول کشوری ایڈیشن پیشِ نظر ہے (ص ۴۸)۔ نول کشور پریس سے یہی مجموعہ دوبارہ ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ذیلی عنوانات موجود نہیں۔

مثنوی زہرِ عشق کے نسخہ ہائے نظامی بدایونی، مجنوں گورکھپوری اور شاہ عبدالسلام (مشمولہ کلیاتِ شوق) میں شامل ذیلی عنوانات کی تفصیل یہ ہے:

(۱) نسخۂ نظامی بدایونی: "دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اور آخری وصیت"، آخری ملاقات، لڑکی کے غم میں والدین کی پریشانی کا منظر، جنازے کا نظارہ، عالمِ تنہائی میں قبر پر آہ و زاری، عاشق کی سخت جانی اور قصے کا خاتمہ (کل چھ عنوانات)

(۲) نسخۂ مجنوں: حمد، نعت، منقبت، بیانِ عشق، آغازِ داستان، نامۂ معشوقہ، نامۂ عاشق، جواب نامۂ عاشق، دو مہینے بعد معشوقہ کا پھر آنا، رخصتی ملاقات، جواب عاشق کا، جواب معشوق کی طرف سے، رخصتی ملاقات، معشوقہ کا جنازہ۔ (کل چودہ عنوانات)۔

(۳) نسخۂ شاہ عبدالسلام: حمد، نعت، منقبت، بیانِ عشق، آغازِ داستان، نامۂ معشوق، نامۂ عاشق، جواب نامۂ عاشق، دو مہینے بعد معشوقہ کا پھر آنا، دنیا کی بے ثباتی اور آخری وصیت، عاشق کا جواب، جواب معشوق کی طرف سے، رخصتی ملاقات، معشوقہ کا جنازہ، خواب۔ (کل پندرہ عنوانات)

ان تینوں مرتبین میں سے کسی نے یہ صراحت نہیں کی کہ انھوں نے

پیشِ نظر مطبوعہ نسخوں میں کون کون سے عنوانات تھے۔ میرے لیے یہ تعیین کرنا ممکن نہیں کہ ان میں سے کتنے عنوانات مختلف نسخوں سے منقول ہیں، اور کن عنوانات کا اضافہ مرتبین نے کیا ہے۔ جو بھی صورت ہو، تدوین کے نقطۂ نظر سے ایسے اضافوں کو قابلِ قبول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ پھر عرض کردوں کہ شوق کی تینوں مثنویوں میں سے کسی ایک کے پُرانے اور معتبر نسخوں میں (بہارِ عشق کے "ترغیبِ عشقِ حقیقی" کے ایک عنوان کے سوا) کوئی ذیلی عنوان نہیں پایا جاتا۔ یہ سب بعد والوں کے اضافے ہیں اور ناقابلِ قبول۔

یہاں ضمنی طور پر یہ عرض کردوں کہ دوسرے کے کلام پر اپنے پسندیدہ عنوانات چسپاں کرنے کی سب سے بڑی مثال کلیاتِ قلی قطب شاہ میں ملتی ہے ("سب سے بڑی مثال" عنوانات کی کثرت کے اعتبار سے لکھا گیا ہے) اس کلیات کو سب سے پہلے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے مرتب کیا تھا۔ اس کا واحد خطی نسخہ حیدر آباد سے ہے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے اسے دیکھا تھا۔ میرے استفسار پر انھوں نے مطلع کیا:

"آپ نے محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں میرے جس قول کا حوالہ دیا ہے، وہ میری مرتب کردہ تالیف "محمد قلی قطب شاہ: حیات اور شاعری" شائع کردہ ساہتیہ اکادمی دہلی کے دیباچے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ محمد قلی کے اصل دیوان میں غزل کی ہیئت میں تمام نظمیں ہیں، جنھیں عنوانات ڈاکٹر زورؔ نے عطا کیے ہیں۔"

(مکتوب بنام راقم الحروف)

زورؔ صاحب ہوں یا دوسرے لوگ، یہ عنوان تراشی کسی کے لیے جائز نہیں ہو سکتی اور اس طریق کار کو قطعی طور پر ناقابلِ قبول قرار دیا جائے گا۔

ہیروئنوں کے نام

جس طرح مثنویوں میں ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا، اسی طرح شوق کی تینوں مثنویوں کی ہیروئنوں کے نام بھی رکھ لیے گئے۔ ان مثنویات سے متعلق جو تحریریں میرے سامنے ہیں، ان کے مطابق اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری نے پہل کی ہے اور زہرِ عشق کی ہیروئن کا نام "مہ جبین" فرض کرلیا ہے:

"ماہ جبیں (میں نے اس کو لڑکی کا نام سمجھ لیا ہے) کی داستانِ محرومی کو میں نے بھی اسی عمر میں پڑھا، جس میں لوگ عموماً پڑھا کرتے ہیں۔"

(زہرِ عشق مجنوں اڈیشن ص ۱۰)

اس عبارت سے یہ تو معلوم ہوجاتا ہے کہ "مہ جبیں" مجنوں صاحب کا رکھا ہوا نام ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔

لفظ "ماہ جبیں" اور اس کا مخفف "مہ جبیں" مثنوی زہرِ عشق میں تین جگہ ملتا ہے اور ہر جگہ واضح طور پر بطور کلمۂ صفت آیا ہے۔ یہ داستانِ غم ایک سوداگر کے ذکر سے شروع ہوتی ہے:

جس محلے میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتے تھے ایک سوداگر

اس کے بعد تیسرا شعر ہے:

ایک دختر تھی ان کی ماہ جبیں شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں

اس شعر میں "ماہ جبیں" کلمۂ صفت کے طور پر آیا ہے، نام کے طور پر نہیں اور اس میں کسی طرح کے اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ مجنوں صاحب نے بہ قول خود اس کلمۂ صفت کو نام سمجھ لیا ہے؛ اگر انھوں نے اس شعر کی بنا پر یہ فرض کیا ہوتا، تو "ماہ جبیں" لکھتے جو اس شعر میں آیا ہے۔ انھوں نے "مہ جبیں" لکھا ہے اور اس لفظ کی یہ مخفف شکل دو شعروں میں ملتی ہے۔ پہلا شعر یہ ہے جس میں زہرِ عشق کے ہیرو کی ماں اپنے بیٹے سے پوچھتی ہے،

یہ کہو، مہ جبیں ملا ہے کون؟
تم کو ایسا حسیں ملا ہے کون؟

صاف طور پر یہ لفظ (مہ جبیں) بطور صفت آیا ہے۔ دوسرا شعر جس میں یہ لفظ آیا ہے، یہ ہے:

غیرتِ حور، مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر، تو وہ مکیں نہ رہے

یہ خود زہرِ عشق کی ہیروئن کہہ رہی ہے، اس لیے "مہ جبیں" کے نام کے طور پر آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ

مجنوں صاحب نے پہلے شعر (وہ یک فخر تھی ان کی ....)
رخ کی بنیاد پر اس صفت کو نام مان لیا ہے۔ شعر میں تو ماہ جبیں
آیا ہے، لیکن زبانوں پر مہ جبیں زیادہ آتا ہے، خاص کر نام کے
طور پر، اسی بنا پر اسے "مہ جبیں" بنا لیا گیا۔

"حیاتِ شوق" میں پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب "تنقیدی
اشارے" کی یہ عبارت یک جا نقل کی گئی ہے:

"مہ جبیں میں کم اور مہ لقا میں زیادہ ہمیں طوائف کی
جھلک نظر آتی ہے" (حیاتِ شوق، ص ۴۹۹)

یعنی سرور صاحب نے بھی "مہ جبیں" کو زہرِ عشق کی ہیروئن کا نام
مان لیا ہے (غالباً مجنوں کی تقلید میں)۔ مجنوں نے تو صراحت
کردی تھی کہ اسے میں نے نام سمجھ لیا ہے، مگر سرور صاحب کی
عبارت میں ایسی کوئی صراحت نہیں، اس وجہ سے ان کی عبارت
میں یہ لفظ گویا حقیقی نام کے طور پر آیا ہے۔ پڑھنے والا یہی سمجھے گا
کہ زہرِ عشق کی ہیروئن کا نام "مہ جبیں" تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ
انھوں نے (از خود، یا کسی کی تقلید میں) مثنوی بہارِ عشق کی ہیروئن
کا نام "مہ لقا" فرض کرلیا ہے اور یہاں بھی پڑھنے والا مبتلائے غلط فہمی
ہوگا کہ ایک فرضی نام کو حقیقی نام سمجھے گا۔ لفظ "ماہ لقا" مثنوی
"بہارِ عشق" کے قصے کے شروع ہی میں اس شعر میں آیا ہے:

ایک دن جو بڑا اسے سیر اٹھا
دیکھی کوٹھے پہ ایک ماہ لقا

قطعی طور پر واضح ہے کہ اس شعر میں "ماہ لقا" نام کے طور پر نہیں
کلمۂ صفت کے طور پر آیا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد حیدر نے اپنے تحقیقی مقالے "حیاتِ شوق"
میں "مہ جبیں"، "ماہ لقا"، "مہ پارہ"، ان تینوں صفاتی کلمات کو حقیقی ناموں
کے طور پر استعمال کیا ہے، مثلاً:

"یہ حقیقت ہے کہ مہ پارہ اور ماہ لقا میں طوائف
کی جھلک ہے، لیکن ماہ جبیں غلط راستے پر چلنے
کے باوجود غلط نظر نہیں آتی" (ص ۴۹۹)

لفظ "مہ پارہ"، مثنوی فریبِ عشق کے اس شعر میں آیا ہے:

جیسے استادہ اک نخل کیا — میں خجلت ہوا اُدھر کیا
دیکھا اس میں سے جھانک مہ پارہ — جیسے رو شمس سے چھٹ کے ستارا

یہاں بھی "مہ پارہ" واضح طور پر کلمۂ صفت آیا ہے۔
شوق کی تین مثنویاں ہیں اور ان کے حوالے سے تین ہیروئنوں کے نام
تراش لیے گئے۔ ہر کہیں یہ بات واضح طور پر کہہ دینا چاہیے کہ اصلاً
کسی مثنوی کی ہیروئن کا کوئی نام نہیں، "مہ پارہ"، "مہ جبیں"، "یا ماہ جبیں"
"مہ لقا" یا "ماہ لقا" فرضی نام ہیں، اس کی وضاحت کی جانا چاہیے۔
وضاحت کے بغیر ایسے مفروضات اور ایسی ایجادات سے بہت
غلط فہمی پھیلتی ہے۔ افسانے اسی طرح ہوا کرتے ہیں اور بعد کو وہ
خوش گمان حضرات کے طفیل واقعے کی حیثیت حاصل کر لیتے
ہیں۔

□□

کربلائے معلّٰی

کربلا اے ذی شرف اے مدفنِ سلطانِ دیں
تیرا ہر ذرہ ہے طاہر، تو ہے فردوسِ بریں
شاہدِ مظلومیت تو اہلِ بیتِ پاکؑ کی
عرش سے بھی کچھ سوا عظمت ہے تیری خاک کی
تجھ میں خوابیدہ ہے اک ضیغم نہایت خوش خصال
ظالموں نے جس کا لاشہ کردیا تھا پائمال
تھا بھنور میں کفر کے اسلام کا بیڑا پھنسا
جس کی جد و جہد سے وہ غرق ہونے سے بچا
جس نے باطل کو مٹا کر حق کو زندہ کردیا
جس کے دم سے پرچمِ اسلام ہے لہرا رہا
سر کٹا کر جس نے زندہ کردیا اسلام کو
اے حسینؑ ابن علیؑ صد آفریں اس نام کو

ناشر عبدالمنان صدیقی
محلہ بنگلہ
پرانا سیتاپور

غزلیں

سب کچھ تیرے پاس ہے سائیں
پھر کیسا سنیاس ہے سائیں

بھوکے ننگوں کے ہاتھوں میں
گیہوں اور کپاس ہے سائیں

مانوتا گرتی جاتی ہے
یوں تو بڑا وکاس ہے سائیں

جگ میں اطمینان بہت ہے
صرف ترا وشواس ہے سائیں

نئی نئی راہوں پر چلنا
میرا ہی اتہاس ہے سائیں

تو ہی اک محفوظ ہے شاید
باقی ستیاناس ہے سائیں

شاعر ہے بیکلؔ اُتساہی
لیکن کچھ بکواس ہے سائیں

بیکلؔ اُتساہی

سول لائن - بلرام پور
گونڈہ - ۲۷۱۲۰۱

دیکھئے کیسے گرے پڑتا ہے اک پر دوسرا
اب تو یہ کم بخت سر دیکھے کوئی در دوسرا

کچھ نہیں کھلتا ہے کیا میری نظر میں عیب ہے
ایک منظر میں نظر آتا ہے منظر دوسرا

شام کے یہ قہقہے اور رات کی یہ محفلیں
روئے تو اس رنگ میں میرے برابر دوسرا

یہ نہیں محتاج ہوتا آنکھ کے دریاؤں کا
وسعتوں میں دل کی بہتا ہے سمندر دوسرا

پہلے پتھر پر قلم کی دھار میں نے تیز کی
پھر نہیں پھینکا کسی نے مجھ پہ پتھر دوسرا

ذات کے گھر میں اگر ہوتا نہیں تیرا گزر
دیکھ لے بھائی شجاعؔ خاور کوئی گھر دوسرا

شجاعؔ خاور

۱۰- پارک لین
تال کٹورہ پارک - نئی دہلی

خود نوشت

عرفان عباسی
۱۹۰۔ باغ مستو۔ نیا گاؤں لکھنؤ

تجربات و حوادث

اپنی کہانی اپنی زبانی سُنانا، خود احتسابی کے بعد ذاتی حالات و واقعاتِ زندگی کا انکشاف کرنا بڑی احتیاط کا متقاضی اور دشوار کام ہے۔ تقریباً پون صدی کے سفرِ حیات کے سارے واقعات حادثات، اونچ نیچ، پیچ و خم، تعلقات و مراسم، دُکھ سُکھ، تلخی و شیرینی، معمولات و مصروفیات، گرد و پیش کے حالات، سیاسی، علمی و ادبی ہماہمی، تہذیب و تمدن، شرافت و نفاست اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی قدروں کا احاطہ کرنے کے لیے دفتر درکار ہے۔ نہ تمام باتوں کو ایک مختصر مضمون میں سمویا جا سکتا ہے اور نہ ضعیف حافظہ کے لیے یہ بار اٹھانا ممکن ہے۔ بہر حال تعمیل ارشاد کرتے ہوئے چند اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

عام متوسط گھرانوں میں پیدا ہونے والوں کی طرح میرے ماہ و سالِ ولادت بھی متنازعہ ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق اگست ۱۹۲۴ء ہے اور سرکاری اندراجات میں ۱۳ / فروری ۱۹۲۹ء درج ہے۔ بچوں کی عمر گھٹا بڑھا کر لکھانا عام بات ہے، خصوصاً قصبات میں اس پر سوچے سمجھے بغیر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ بہر حال تاریخ ولادت متنازعہ ہو سکتی ہے۔ ولادت نہیں۔

جہاں تک ولادت کا سوال ہے جیسے اور جن حالات میں متوسط الحال گھرانوں میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں، میں بھی بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور بقول رام لال نابھوی:

"پیدا ہوا۔ خاموش رہا۔ دایا نے تھپڑ جڑ دیئے۔
میں چیخ پڑا۔ تب سے آج تک چیخ رہا ہوں — چلّا رہا ہوں۔"

والدین کی تیسری اولاد ہوں، اس لیے کسی دھوم دھڑکے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پہلی دو اولادوں میں جشنِ ولادت منانے کے سارے حوصلے نکال لیے گئے ہوں گے۔ میری ولادت پر کچھ ہوا بھی ہوگا تو غالباً برائے نام — البتہ دادی مرحومہ کے مطابق میرے وارد ہونے ہی کے دن تھوڑے وقفے سے "مہراج" (ایک برہمن سپاہی) کی بکری نے بھی حدودِ تھانہ میں ہی یکمشت چار بچوں کو جنم دیا تھا۔ یہ دونوں خبریں سُن کر مہراج خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور نیم رقص کے عالم میں نکل کر چند گھنٹوں کے بعد دو بڑے جھوٹے لڈو بنوا کر تھانے کے صحن میں رکھے اور خوب تقسیم کیے۔ معلوم نہیں یہ اظہارِ مسرت میری ولادت باسعادت کے سلسلے میں تھا، اپنی بکری کے چار بچوں کی آمد کی خوشی میں تھا، یا بہ یک دن مع والدہ کی تعداد کے اعتبار سے اشرف المخلوقات سے ان کی بکری کے بازی مار لے جانے کے احساس کا نتیجہ تھا — بہر حال اسے غریبانہ جشنِ ولادت کہا جا سکتا ہے۔ بظاہر بکری کا دودھ اور چار بچے مہراج کے لیے نفع بخش تھے اور میں قرآن کی گود میں بیٹھ کر لاڈ و پیار کے صلے میں ان کا کثیف کرتا دھو تو نہ کر سکتا تھا — جو کرتا رہا۔

شعور کی منزل میں قدم رکھا تو محنت کش غریب ہم وطنوں کی آؤ بھگت نے اس تجسس کو جنم دیا کہ ہم ہیں کیا؟ جو سلوک وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں وہ ان کے بچوں کے ساتھ ہمارے یہاں نہیں ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اور پس منظر کی کھوج میں جو انکشافات ہوئے ان میں چند باتیں یوں تھیں کہ ہم تعلقدار و زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ اور عمائدین میں ہیں اور وہ سب پس ماندہ اور ہمارے خاندان کی رعایا ہیں۔ اس لیے ہماری عزت و احترام گویا ان پر فرض ہے۔ اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ تعلقدار اور زمیندار کیا ہوتے ہیں؟

یہ معزز و محترم کیوں سمجھے جاتے ہیں؟ لوگ ان سے مرعوب کیوں ہیں؟ جب کاوش و جستجو نے سب کچھ سمجھا دیا تو تحقیق کی روشنی میں اپنے گھر اور افرادِ کنبہ کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ علامت اور ریاست کا نام و نشان عدالتوں میں باقی تھا اور سارا خاندان مقدمہ بازی میں موجود رہا تھا۔ گھر میں نقش و نگار سے مرصع ایک ضخیم شجرہ۔ مقدمات کی چند مسلیں اور داستانِ ماضی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس زمانے کی چند باتیں حافظ میں محفوظ ہیں۔ کمہار مٹی کے گھڑے، صراحیاں اور آب خورے وغیرہ کھینچیوں میں بھر کر ہمارے گھروں میں بلا قیمت پہونچاتے تھے۔ قصاب معافی کی زمین پر قابض تھا، جس کے عوض ہفتہ میں دو بار گوشت دے جاتا تھا۔ (اس زمانے میں بکرے کے گوشت کا نرخ چار آنے سیر تھا)۔ ہر جمعہ کی صبح بار بر کمشل قینچی اُسترے سے مفت حجامت بنا جاتا تھا، اس کو معاوضہ سال میں دو بار فصل کٹنے اور غلہ تیار ہونے پر اناج کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ تقریباً ناقابل کاشت زمین پہ قابض اور خون پسینہ ایک کر کے اس سے کچھ اگانے والا ایک غریب جو ہماری گائے اور گھوڑے کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا، دودھ دہی کی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔

بس! یہ تھی روایتی تعلقداری اور امارت ـــــ کاشت وغیرہ سے کھانے پینے کا مسئلہ بخوبی حل ہو جاتا تھا۔ لیکن غیر معمولی مسائل کا سامنا کرنے اور دیگر ضروریاتِ زندگی پوری ہونے میں بعض وقت فارغ البالی و خوشحال ماضی کی کہانی پر معاشی تنگی کے احساس کا سایہ بہر حال پڑتا تھا۔

کنبہ میں انگریزی تعلیم حاصل کرنا حرام اور انگریزی حکومت کی ملازمت شجرِ ممنوعہ تھی۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ میرے قریبی عزیز جو خاصے قد آور، توانا، خوب رو اور شاق شکاری تھے، ایک بار ضلع کلکٹر کی فرمائش پر ان کے ساتھ شکار کے لیے چلے گئے۔ کلکٹر ان کے تجربات، حاضر دماغی اور نشانہ بازی سے بہت متاثر ہوا اور ان سے پوچھا:

"چودھری صاحب! آپ کیا کرتے ہیں؟"

جواب ملا: "کچھ نہیں۔ بیشتر وقت شطرنج اور شکار میں صرف کرتا ہوں۔"

کلکٹر نے شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد ایک حکم نامہ موصول ہوا، جس میں ان کے تھانے داری کے لیے انتخاب کی اطلاع دیتے ہوئے مقررہ تاریخ تک ٹریننگ کے لیے پہونچنے کی ہدایت کی گئی تھی ـــ اس انتخاب کا انکشاف ہوتے ہی کنبے کی خواتین نے حسبِ عادت سر جوڑ کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ لوگ کسی حادثے کے شبہ میں دوڑ پڑے۔ باہر اداس و مضمحل چہرے والے مرد (افرادِ کنبہ) موجود تھے۔ سبب دریافت کرنے پر جواب دیا گیا:

" ارے بھیا! خاندان کی ناک کٹ گئی۔ اب ہمارے خاندان کے نوجوان خاندانی روایات کو ٹھکرا کر انگریزی حکومت اور وہ بھی پولیس کی نوکری کرنے جا رہے ہیں۔"

آخر کار چند بزرگ وفد کی شکل میں کلکٹر سے ملے اور وہ انتخاب رد کرانے میں کامیاب ہو گئے ـــ خاندان نکٹا ہونے سے بچ گیا۔ یہ رنگ تھا تنگ دست لیکن روایت پرست خاندان کی آنا اور وقار کا۔

میرے پردادا حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب جید عالم، علومِ دینی و دنیاوی، عربی، فارسی و چند دیگر زبانوں پر بھرپور دست رس رکھنے والے خدا ترس، عابد، صوفی اور فقیر منش بزرگ تھے، حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا جس کے اثرات اب تک باقی ہیں ـــ دادا مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھی عالم باعمل صابر و قانع، منکسر اور بردبار تھے۔ وہ ہمہ وقت عبادت و ریاضت، تلاوت کلام پاک اور وظائف میں مشغول رہتے تھے لیکن صبح نماز و وظائف کے بعد چند منٹ مجھ سے مکتب کے اسباق سنتے تھے اور اکثر اس وقت فرماتے تھے:

"علم قرآنی، فرائض دینی اور سنت رسول اللہ ہی اصل علم بھی ہے اور زادِ آخرت بھی۔ باقی علوم دنیاوی ہیں جو صرف دنیاوی ضروریات پوری کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ دینیات کو اولیت دیتے ہوئے دیگر علوم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔"

والد بھی عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر عبور رکھنے والے اپنے دور کے اچھے، صاحبِ دیوان و تلامذہ شاعر تھے۔

میری تعلیم کا آغاز خاندانی رواج کے مطابق گھر یا مکتب سے ہوا تھا مگر مکتبی تعلیم کے بعد پرائمری و مڈل اسکولوں میں پڑھا پھر انگریزی کی طرف متوجہ ہوا جس کی اجازت نہیں تھی۔ میرے خاندان کی ایک شاخ میں جہاں ایک طرف دینی تعلیم کو ہی اولیت دی جاتی تھی وہیں دوسری شاخ میں اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ بیرسٹر، ماہر تعلیم، سیاست داں بھی تھے جن میں چچا، ماموں اور دادا وغیرہ کہا کرتا تھا کیوں کہ شجرہ کے مطابق ان سے یہی رشتے تھے۔ ان سب کے بچے انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو کر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوں گے کیونکہ ان کے یہاں مغربی تعلیم کو حرام نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اور میں اپنے کنبے کے دیگر افراد کی طرح صرف داستان ماضی دہراتا رہوں گا۔ ان متفرق تعیں ان کی سفارش، اصرار اور میرے شوق و ضد نے خاصی تگ و دو کے بعد بزرگوں سے اجازت حاصل کرنے کا معرکہ سر کر لیا۔ انھوں نے مجبوری اور بددلی کے ساتھ ہی آخرکار اجازت دے دی۔

اب میں نے حرف تہجی یعنی اے، بی، سی، ڈی کا ورد ان شروع کیا اور سلیٹ پر خوب لکھا۔ دو تین ہفتوں میں کیپٹل اور اسمال لیٹر بخوبی لکھنے لگا۔ میرے پھوپھا جو گوالیار اسٹیٹ سے پنشن یاب ہو کر آئے تھے، میرا شوق و محنت دیکھ کر خوش ہوئے اور باقاعدہ انگریزی پڑھانے لگے۔ انھوں نے تقریباً ایک سال میں اس قابل بنا دیا کہ معمولی مضامین وغیرہ لکھنے لگا۔ میرے ہم وطن ارتضیٰ کریم صاحب اسلامیہ اسکول لکھنؤ میں ٹیچر تھے۔ جب وہ گرمیوں کی تعطیلات میں آئے تو پھوپھا نے مجھے پیش کر کے کہا،

"ذرا ان کا امتحان لے کر دیکھو ان کی انگریزی کیسی ہے اور کس درجے میں داخلے کے لائق ہیں"۔ انھوں نے انگریزی میں چند سوالات کیے اور گاؤں کے موجودہ حالات پر مختصر مضمون لکھنے کی ہدایت کی، پھر اس کا اردو و ہندی ترجمہ کرایا۔ سب دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور چند نصابی کتابیں خود دے کر پھوپھا سے کہا۔

"اب یہ پڑھ لیجیے پھر لکھنؤ بھیج دیجیے، آٹھویں، نویں درجے میں داخلہ ہو جائے گا۔"

دوسرے سال لکھنؤ پہنچ کر ابتدائی تعلیم شروع کی، اور وہ زمانہ ایسا تھا کہ ذہنی ترقی اور لکھنؤ کے چند اہم تحریکات کا گریسی خیالات رکھنے والے نوجوانوں کے ساتھ قیام اور رنگوں میں دوڑنے والے انگریز دشمن خون — ان سب نے مل کر سیاسی سرگرمیوں میں ایسا ملوث کیا کہ حصول علم کا مقصد اور سارا ذوق و شوق ہوا ہو گیا۔ کبھی روپوشی اور کبھی نظر بند رہ کر تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ گھر میں باغی کا گزر نہیں اور احباب کے مسلط کردہ سیاسی عقائد سے انحراف ممکن نہیں۔ ویسے تو "وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے" پر یقین کامل — لیکن خمار بارہ بنکوی کا مصرعہ

انساں کو انساں سے اللہ بچائے

بھی غالباً ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا ہوگا۔ میری محرومی میں انسانی دخل بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی زمانہ میں چند معروف مقامی سیاست دانوں کے وسیلے سے رفیع احمد قدوائی صاحب تک رسائی ہو گئی ان کی مدد، حوصلہ افزائی اور قربت نے بڑا سہارا دیا برسوں ان کے ساتھ اور نجی عملے میں شامل رہا۔ کوئنس کالج لکھنؤ سے ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی کا سہارا لیا۔ پھر ہومیوپیتھک تعلیم مکمل کی۔

شروع میں کچھ دن عارضی طور پر یوپی سکریٹریٹ میں اس طرح داخل ہوا کہ ایک دن فیروز گاندھی صاحب سے ملنے نیشنل ہیرالڈ جا رہا تھا کہ کار کے بریک کی آواز نے متوجہ کیا۔ مڑ کر دیکھا تو کار سے فیروز صاحب نے سوال کیا،

"کہاں؟"

"آپ ہی کے یہاں جا رہا تھا۔"

"تو آؤ!"

کار مڑ کر کونسلرس ریزیڈنس کے پورٹیکو میں رکی، جہاں چند نوجوانوں کے ساتھ ایک صاحب جو خاکی ہاف پینٹ، سفید براق قمیص اور ہیٹ سے مرصع تھے، ایک کر نمسکار کے لیے پہنچے اور فیروز صاحب کے پیچھے پیچھے پرستش چند باجپئی

ٹے کرتے تک گئے۔ وہاں پہونچ کر فیروز صاحب نے سوال کیا،
"یہاں کیسے ٹھاکر صاحب؟"
جواب ملا، "سر! گورنمنٹ اسٹیٹ کے لیے کیر ٹیکر کی
چار عارضی جگہوں پر تقرری کے لیے انٹرویو لے رہا ہوں۔"
فیروز صاحب نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا،
"پوسٹ کے لیے ایج اور کوالیفیکیشن کیا رکھا ہے؟"
"سر! عمر تو ۱۸ سے ۲۲ سال اور علمی لیاقت گریجویشن قابل
ترجیح ہے لیکن کام کی نوعیت کے اعتبار سے ذہین، محنتی اور ذمہ دار
امیدوار منتخب کروں گا چاہے ایک آدھ انٹرمیجیٹ ہی ہو۔"
وہ صاحب چلے گئے اور فیروز صاحب نے باجپئی جی سے
کہا "آپ کے یہاں آنے کا یہ بھی فائدہ ہوا کہ عرفان روزی سے
لگ جائیں گے۔ میں بھی کہتا ہوں، آپ بھی کہہ دیجیے گا۔"
یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ چائے کی ٹرے تھامے ہوئے
ایک صاحب کے ساتھ وہ صاحب پھر آگئے۔ چائے نوشی کے دوران
فیروز صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،
"انھیں بھی رکھ لیجیے۔ آپ کی شرائط پوری کرتے ہیں۔ ان کے
برتاؤ اور کام سے آپ خوش ہوں گے۔"
انھوں نے ایک سلپ پر اپنا نام "ٹھاکر لال سنگھ" لکھ کر دیا
اور ہدایت کی کہ پرسوں کونسل ہاؤس کے مین گیٹ پر یہ سلپ دیجیے
گا وہ آپ کو مجھ تک پہونچا دیں گے ۔ مقررہ دن ان سے ملا اور
بلا تحریری درخواست و انٹرویو ملازمت کا سلسلہ اسی دن سے قائم ہو گیا
جس دن فیروز صاحب نے بات کی تھی۔ یہ عارضی جگہ تھی چند ماہ بعد
ملازمت ختم ہو گئی۔ لیکن سکریٹریٹ سے چند ماہ کی وابستگی کام آئی اور
کچھ دن بعد سکریٹریٹ ہی میں باقاعدہ تقرری ہو گئی۔ تقریباً
۳۸ سال ردا یتی فرائض منصبی انجام دے کر جرم ملازمت سے باعزت
بری ہوا۔ یعنی ڈپٹی آفیسر، اتر پردیش سکریٹریٹ کے عہدہ سے
پنشن یاب ہو گیا۔ میرے داخلہ اور ابتدائی زمانۂ ملازمت میں سکریٹریٹ
بہر حیثیت صاحب کا دفتر تھا۔ اس کی رونق، چہک مہک، افسران و
عملہ، عزت و وقار، ڈسپلن، برتاؤ، معیار کارکردگی وغیرہ سب میں

خصوصیت اور انفرادیت تھی، لیکن اب وہ کچھ اور ہو گیا ہے۔
شعر و ادب سے لگاؤ ورثہ میں ملا تھا۔ بزرگوں میں متعدد
شاعر و ادیب تھے۔ گھر میں شعر و ادب کا چرچا ہی نہیں شعری زبان
میں گفتگو ہی کا دبے کا رواں تھی، بات بات میں برمحل اشعار استعمال
ہوتے تھے۔ شعری نشستیں منعقد ہوتی تھیں جن میں مقامی شعرا کے
علاوہ اکثر بیرونی شعرا بھی شریک ہوتے تھے۔ موزونی طبع مادر فطرت
نے عطا کی تھی۔ اساتذۂ سخن سے فیض یاب ہونے کا موقع ماحول
نے فراہم کیا تھا، اور میں ٹوٹے پھوٹے اشعار بچپن سے ہی موزوں
کرنے لگا تھا، کبھی کبھی شعری نشستوں میں شریک ہو کر اپنے شعر
پڑھتا بھی تھا۔
میرا آغاز شباب تھا۔ لکھنؤ کے ادبی افق پر چمکنے والے آفتاب
ماہتاب سارے ماحول کو تابانی و درخشندگی بخش رہے تھے۔ جگہ جگہ
محفلیں سجتی تھیں جن میں سخن سنج و سخن فہم اور صاحبان کمال شریک ہو کر
قدرت کمال کے مظاہرے کرتے تھے۔ سارے ماحول پر کیف و سرور
سرخوشی و سرمستی کی فضائیں طاری اور علم و عرفان کی گھٹائیں چھائی
رہتی تھیں۔ تہذیب و تمدن کے سانچوں میں ڈھلی سیرتیں، شیریں
بیانی، حسین الفاظ و محاورات کی گلپاشی۔ اس سحر انگیز ماحول نے ایسا
رجھایا کہ لکھنؤ کو وطن ثانی کا درجہ دیتے ہوئے اپنی ذہنی تربیت کے
انتظام کی کوشش کی۔ کچھ جاننے اور سیکھنے کی آرزو میں اس کے
گلی کوچوں میں آباد ادبی مرکزوں تک رسائی حاصل کی۔ اب نہ کوئی
شعری و ادبی محفل چھوٹتی تھی اور نہ اس دور کے معروف شعرا و ادبا
میں کوئی بچا جس کی زیارت کی سعادت نہ حاصل کی ہو۔ میری
خوش قسمتی ہے کہ میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے لکھنؤ میں
نامور اور باکمال شعرا و ادبا کی آنکھیں دیکھی ہیں، ان کی بار بار زیارت
کی ہے۔ ان کی محفلوں میں حاضری کی سعادت اور شرف دست بوسی
حاصل کیا ہے اور ان کی تخلیقات کو انھیں سے سن کر کسب فیض کیا ہے
میرے لیے یہ اعزاز کم نہیں ہے۔ یہ وہ باکمالان ادب تھے جن کے
کارناموں کی مہک سے چمنستان اردو معطر ہے اور ان کے فیوض سے
اردو شعر و ادب کی آبرو اور وقار قائم ہے۔ ان تمام مشاہیر ادب کی

مکمل قربت کی مخصوص تشکیل نہیں ہو سکا جن کی زیارت و قربت کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں چند نام یہ ہیں:

مرزا ثاقب لکھنوی، صفی لکھنوی، نیاز فتحپوری، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، سراج لکھنوی، شفیق لکھنوی، اقبال مرادی، سالک لکھنوی، جوہر لکھنوی، حسرت موہانی، محشر لکھنوی، ظریف لکھنوی، سلام مچھلی شہری، بہزاد لکھنوی، شمیم کرہانی، افسر میرٹھی، شمس لکھنوی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، علی عباس حسینی، انیس احمد عباسی، شوکت تھانوی، پروفیسر آل احمد سرور، سید مسعود حسن رضوی ادیب، شفیق جون پوری، وصل بلگرامی، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، اقبال عظیم، غلام احمد فرقت کاکوروی، سبط حسن، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر اعجاز حسین، رونق صدیقی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، فراق گورکھ پوری، نازش پرتاپ گڑھی، ل۔ احمد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا علی نقی عرف نقن صاحب، فانی بدایونی، اطہر سہسوانی، مجاز ردولوی، مہذب لکھنوی، نازل لکھنوی، ذکی رسول پوری، شوق ردولوی، جگر بسوانی، شکیل بدایونی، بیخود موہانی، علی جواد زیدی، نشتر سندیلوی، وحشی کان پوری، شدید لکھنوی، جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی، نوح ناروی، اختر علی تلہری، منور لکھنوی، حکیم ناطق لکھنوی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، سید صدیق حسن زائر حرم حمید صدیقی، مولانا کلب حسین، جوان سندیلوی، حبیب احمد صدیقی، ذوالنورین فراز، مانی جائسی، دل شاہ جہاں پوری، ناچیز لکھنوی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، مرزا جعفر حسین، فرحت کان پوری، نشور واحدی، مہذب لکھنوی، جگر بریلوی، جویا آنولوی، اسلم لکھنوی جو میرے محسن، مخلص اور سیاسی رفیق بھی تھے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی سلسلے کے چند بزرگ وہ بھی تھے جن کی گرانقدر ادبی شخصیات سے مرعوب ہونے اور بزرگی و خوردی کے احساس کی وجہ سے نہ قربت حاصل کر سکا، نہ بے تکلف ہو سکا حالاں کہ انھیں بہت دیکھا اور سنا ان میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، حکیم صاحب عالم، اقبال سہیل، آرزو لکھنوی، عبدالباری آسی الدنی، آنند نرائن ملا وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

ملازمت کے ابتدائی زمانے میں ہی سکریٹریٹ کے ایک باذوق افسر نے ان دنوں کے ذکر کے ساتھ اطلاعات محکمے کی شعر گوئی کے شاعری کے ذکر کے ساتھ ملا اور مجھ سے سنانے کی فرمائش کی۔ چند قطعات سننے کے بعد اگروال صاحب نے میرے وطن کے بارے میں جاننا چاہا۔ میں نے اپنا گاؤں و ضلع بتایا تو انھوں نے کہا کہ تب تو آپ اپنے گاؤں کی زبان میں بھی شعر کہہ سکتے ہیں؟ اس موضوع پر ایک چھوٹی سی نظم کہیے۔ میں نے کمرے سے ملحق برآمدے میں بیٹھنے کی اجازت لی اور اسی موضوع پر کسی رسالہ یا اخبار میں انھیں دنوں چھپی نظم کے جو اشعار یاد آئے انھیں ان کی زبان بدل کر یعنی دیہاتی جامہ پہنا کر اور الفاظ کے الٹ پھیر کے بعد سنا دیا۔ انھوں نے وہ نظم آل انڈیا ریڈیو کے پنچایت گھر پروگرام میں نشر کرا دی۔ اس کا معاوضہ بھی ملا اور وہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہا۔ اسی زمانے میں کچھ غزلیں اور نظمیں "اطلاعات" اور "نیا دور" میں بھی شائع ہوئیں۔

انھیں دنوں برادر محترم علی جواد زیدی صاحب اور صباح الدین عمر صاحب مرحوم سے قربت ہوئی اور بیشتر وقت دفتر میں ان کے ساتھ گزرنے لگا۔ زیدی صاحب نہ میری شاعری کو قابل اعتنا سمجھتے تھے نہ دیہاتی زبان میں نظمیں نشر کرانے کے سلسلے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں حضرات بار بار نثر کی طرف متوجہ کرتے رہے اور میں اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے کتراتا رہا۔ ایک دن زیدی صاحب نے لیش پال جی کا ایک ہندی مضمون ترجمہ کے لیے دیا اور ترجمہ پڑھ کر حوصلہ افزائی بھی کی۔ یہ تھا مضمون یا نثر نگاری کا آغاز۔ پھر شاعری کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔

علمی کمی کی وجہ سے کچھ بن تو نہیں سکا لیکن کوانٹٹی بہت کی اور بقول غلام حسین صاحب مضامین کا انبار لگا دیا۔ کچھ دن مزدوری پر جاسوسی ناول لکھے (یعنی مشہور انگریزی ناولوں کے دو چار صفحات کا چربہ اڑایا، لفاظی کر کے ضخامت بڑھائی اور ناول تیار)۔ چھ سو سے زائد ادبی، تحقیقی اور دیگر موضوعات پر مضامین متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو سے تقاریر و فیچر وغیرہ نشر ہوتے رہے۔ پھر میری گوشہ نشینی اور دیگر مصروفیات کی نذر ہو گئے۔ ریڈیو کے متعلقہ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ وہ اب بھی اکثر مدعو کرتے ہیں لیکن تعمیل نہیں کر پاتا ہوں۔

شعر و سرکاری ذیمہ داریوں کی مصروفیات کی وجہ سے ادب سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستگی رہی۔ صحافت کا بھی مزا چکھا۔ اتنا لکھنؤ سے کئی اخبارات میں شریک کار رہا جو نکلتے اور بند ہوتے رہے۔ پھر مولانا آزاد کی صدارت میں تشکیل پانے والی انجمن (مجلس) اتحاد و ترقی کے تحت رسالہ "اتحاد" جاری کیا، جس کے سرپرست و نگراں رفیع احمد قدوائی صاحب مرحوم تھے۔ پھر نہ وہ زمانہ رہا، نہ رفیع صاحب رہے، نہ رسالہ رہا۔

لاتعداد مقالات و تبصروں کے علاوہ جو شائع ہو چکے ہیں، تقریباً پانچ ہزار شعراء کے حالات، ادبی خدمات اور تخلیقات و تصنیفات وغیرہ پر مشتمل تذکرے لکھ چکا ہوں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ادب شناس و ادب نواز حضرات کی حوصلہ افزائی کی بدولت "تذکرہ شعرائے اتر پردیش" (جسے ابتدائی دور میں عوامی شہرت و مقبولیت روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں برسوں مسلسل اشاعت سے حاصل ہوئی، جس کے لیے اس کے مدیران و ادارے کا شکرگزار ہوں) جس کا آغاز بے خوابی اور شب بیداری کے مشغلے کے طور پر ہوا تھا، بیس جلدوں تک پہونچ چکا ہے۔ یہ وہ محبانِ اردو زبان و ادب اور میرے محسن ہیں جنھوں نے کسی درخواست کے بغیر گراں قدر آراء کا اظہار اپنے خطوط، مضامین اور تبصروں میں کیا ہے، ورنہ برسوں سے گوشہ نشینی اختیار کر کے اپنے کام میں لگا ہوں، نہ عوامی زندگی سے واسطہ رکھا، نہ کسی جوڑ توڑ پر ہاتھ ڈالا تو پھر بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

"...... وہ کسی کو "حاجی" نہیں کہتے اس لیے کوئی انھیں "ملا" نہیں کہتا۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بے شمار اہلِ اردو کے دلوں میں عرفان صاحب کی عزت ہے، بے شمار لوگ ان کا ادب و احترام کرتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا یہ وہ صلہ ہے جو ساجی و ثقافت کے سہارے حاصل کی ہوئی شہرت سے کہیں زیادہ اہم اور دیرپا ہے۔"

میں شروع سے تذکرہ کی ہر جلد میں یہ درخواست کرتا رہا ہوں کہ اسے پڑھیے، اغلاط سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ ان کا ازالہ ہو سکے اور اس کی اصلاح کیجیے یا مشورہ دیجیے تاکہ وہ اس قابل بن سکے کہ اس کے کسی جز کا استعمال تاریخ ادب کی تدوین میں کیا جا سکے۔ لیکن ایسا کبھی کچھ نہیں ہو سکا۔ یہ اکثر سنا کہ دانشوری کی خوش فہمی میں مبتلا ایک خاص گروہ کے چند حضرات جو اخلاقی جرأت سے عاری ہیں، تذکرہ پڑھنے اور مجھ سے گفتگو کرنے یا مشورہ دینے کے بجائے صنفِ تذکرہ نگاری کو غیر اہم اور غیر افادی قرار دیتے ہوئے مخالفت کرتے ہیں، حالاں کہ ان میں بیشتر وہ ہیں جو تذکروں ہی کی بدولت فٹ پاتھ سے ایوانِ اردو تک رسائی کے قابل ہوئے ہیں اور اسی کی روٹی کھا رہے ہیں۔

ایسے تمام حضرات کے غور و فکر کے لیے یہاں عصری رجحانات اور صنفِ تذکرہ نگاری کے بارے میں بھی کچھ عرض کرتا چلوں۔ صرف دروغ گوئی کے سہارے افسانے اور کہانیاں گڑھ کر زبان و ادب کو زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ سماج کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسانا اور سحر زدہ کر کے دروغ پسند بنانا الگ چیز ہے اور معلومات کا خزانہ صنفِ تذکرہ نگاری، جو اپنے دامن میں ہزاروں سالہ تاریخ سمیٹے ہوئے ہے، الگ چیز ہے۔ اس صنفِ ادب نے ساری دنیا کو علمی، ادبی، تاریخی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور مذہبی معلومات سے مالا مال کیا ہے۔ اگر دنیا کے مذاہب کا تجزیہ کیا جائے تو تقریباً پچاس فیصد عقائد ہر مذہب میں ایسے ملیں گے جو محض تذکروں کے ذریعے ان مذاہب کے پیروؤں تک پہونچے اور جزوِ ایمان بن گئے بنیادی طور پر جن کی کوئی مستند چشم دید یا تحریری شہادت موجود تھی نہ ہے۔ ابتدائے صنفِ شاعری کو ہی لے لیجیے، اگر تذکرے نہ لکھے گئے ہوتے تو کیا زمانۂ جاہلیت میں ہونے والی شاعری اور اس دور کے شعراء کے ناموں سے ہم واقف ہوتے؟

ہم سب خانۂ ولدیت میں ایک نام لکھتے ہیں، حالاں کہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کا ثبوت کسی کے پاس نہیں ہے کہ لکھنے والے کا باپ وہی تھا یا ہے جس کا نام وہ خانۂ ولدیت میں لکھ رہا ہے۔ سرکاری پیدائشی ریکارڈ میں یہ تحریر تو ملتی ہے کہ فلاں شخص کے یہاں اس تاریخ اور وقت ایک بچہ پیدا ہوا،

[illegible] میں [illegible] اس کا باپ کہتا ہے ہے ترکے سے
اس کا باپ [illegible] سے خاصے باپ ہیں ۔ باپ ذکر کرتا ہے کہ
میں تمہارا باپ ہوں ۔ اور بچہ تسلیم کر کے تمام عمر تذکرہ ولدیت
میں وہی نام لکھتا رہتا ہے ۔ اگر صنف تذکرہ نگاری کو پرانے زمانے کی
چیز اور غیر افادی صنف ادب قرار دے کر مسترد کر دیا جائے تو خانۂ
ولدیت کا کیا بنے گا ؟ اسکولوں میں ملازمت وغیرہ کے لیے درخواستوں
میں، پاسپورٹ کے لیے فارم کے خانہ ولدیت پر کرنے کے لیے مغرب
سے کوئی سائنٹیفک طریقہ لائے ہیں کیا ؟ ــــــ ان لاتعداد افراد و
مورخین نے جن میں بعض مدعیان دانش وری بھی شامل ہیں، تذکرے
مدون کر کے اعلا اسناد حاصل کی ہیں کیا وہ غیر افادی اور غیر ضروری
صنف تذکرہ نگاری مسترد کیے جانے کے بعد اپنی اسناد سے دستبردار
ہو جائیں گے ؟ معاصر سہل پسند دانش ور تو غالباً تدوین تاریخ اردو
ادب کو بھی غیر افادی اور غیر اہم سمجھ کر صرف نفع بخش ادبی دھندے
پر ساری توجہ مرکوز کر رہے ہیں لیکن اگر مستقبل کا کوئی جیالا صاحب
علم اور اردو کا سچا شیدائی اس اہم ضرورت کی طرف توجہ کرے گا تو
صنفِ تذکرہ نگاری کے مسترد ہونے کے بعد اسے تدوین تاریخ ادب
کے لیے موادِ خام کیا مغربی ادب، کہانیوں یا افسانوں سے مل سکے گا ؟
یہ وہ سوالات ہیں جو نفع بخش ادبی کاروبار یا جوڑ توڑ کے بل پر مغربی
ممالک کی زیارت سے کہیں زیادہ اہم اور توجہ طلب ہیں ۔ محبانِ ادب سے
مخلصانہ، عاجزانہ اور مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس اہم مسئلہ پر
سنجیدگی سے غور فرمائیں ۔ علاقائی سطح پر ملک کے گوشے گوشے
کے شعرا و ادبا کے تذکرے لکھوائیں، مقامی تذکرہ نگاروں کی معاونت
فرمائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ صدیوں سے نظر انداز کی
جانے والی تاریخ ادب کی تدوین کی راہیں ہموار ہوں اور تذکروں سے
مناسب اور ضروری مواد اخذ کر کے مستند تاریخ ادب مرتب ہو سکے
مستند تاریخ کے بغیر زبان ذریعہ معاش تو ہو سکتی ہے زندہ نہیں رہ سکتی ۔

میری تذکرہ نگاری کے سلسلے میں ملک کے گوشے گوشے سے
تعلق رکھنے والے محبانِ اردو نے رابطہ سے جس طرح حوصلہ افزائی
اور [illegible] [illegible] سے تذکرے

[illegible] ہے میری بات [illegible] کا [illegible] ہے ۔ ۱۲
شاید اب [illegible] [illegible] کا [illegible] پیش کرنے کے لیے
ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہوگی ۔ اس سلسلے میں صرف چند اقتباسات
پیش کیے جا رہے ہیں جن سے تذکرہ کی نوعیت اور ترتیب و تدوین پر
کچھ روشنی پڑتی ہے ۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی :

"عرفان عباسی صاحب نے اپنے سر پر ایک پہاڑ اٹھا لینے کا
عزم کر لیا ہے یعنی اپنے سر پر اتنا بڑا کام لے لیا ہے جس کے کرنے
کے لیے ایک ادارے، ایک انجمن یا ایک اکادمی کے وسائل
کی ضرورت ہوتی ہے ۔۔۔۔ ہم لوگ ان کے عزم بالجزم کی جس قدر
داد دیں کم ہوگی ۔ سردست یہی دعا کر سکتے ہیں کہ خدا موصوف کو
طویل عمر عطا کرے اور ان کی صحت برقرار رکھے کیونکہ جتنا بھی
کام وہ کر جائیں گے وہ ایک دستاویزی حیثیت رکھے گا ۔ میری
تمام نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں ۔"

علی جواد زیدی :

"عرفان عباسی کا یہ تحقیقی کارنامہ عہدِ حاضر کی ادبی تاریخ
کا باوقار مواد ہے اور ہر اعتبار سے مستحقِ داد و مبارکباد ہے ۔"

ڈاکٹر مسعود حسن :

"عرفان عباسی سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ریاست کے
اردو شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کریں ۔ انھوں نے بڑی محنت اور
دیدہ ریزی سے ریاست کے کونے کونے سے معروف اور
غیر معروف شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے کلام کے نمونے
جمع کیے اور ادبی تاریخ کے ایک بڑے ذخیرے کو ضائع ہونے
سے بچا لیا ۔ ظاہر ہے کہ ان کی خدمت بہت قابل قدر ہے اور وہ سبھی
ادب دوستوں کے شکریے کے مستحق ہیں ۔"

ڈاکٹر شارب ردولوی :

"جناب عرفان عباسی نے جدید عہد میں تذکرہ نگاری
کو احیاء کیا اور [illegible] تذکرے لکھ کر اس کی [illegible] کا
احساس دلایا ۔ [illegible]

ایسے کاموں کو تنہا انجام دینے کے لیے جس دیوانگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بلا شبہ عرفان عباسی صاحب میں موجود ہے۔ عرفان صاحب نے ان شعرا کے تذکرے میں عام طور پر ذاتی معلومات اور مشاہدے کو بنیاد بنایا ہے اور جہاں اپنے عہد سے پہلے کے کسی شاعر کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کے حالات مستند کتابوں اور دستاویزات سے اخذ کیے ہیں اور مشکوک داستانوں اور کہانیوں کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے جس کی وجہ سے تذکرے کی اہمیت و افادیت اور بڑھ گئی ہے۔"

ڈاکٹر نیر مسعود :

"تذکرہ شعرائے اتر پردیش نہ صرف بجائے خود ایک تحقیقی کارنامہ ہے بلکہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ بھی ہے اس تذکرہ میں ایک طرف وہ مشہور شاعر ہیں جن سے ہمارے ادب کی آبرو قائم ہے۔ دوسری طرف ایسے بھی شاعر ہیں جو اپنے وقت کے حلقے میں معروف تھے لیکن اب ہم ان کے ناموں سے بھی برائے نام واقف ہیں۔ انھیں کلی طور پر فراموش کر دینا ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوتی۔ عرفان عباسی صاحب نے اس ناانصافی کا سد باب کر دیا ہے اس طرح انھوں نے ان شاعروں پر بھی احسان کیا ہے اور ادب سے دل چسپی رکھنے والوں پر بھی۔"

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی

"..... میں سمجھتا ہوں کہ یہ تذکرہ بے انتہا مفید و کارآمد ہے جو شعرائے اتر پردیش کی ایک واضح تصویر پیش کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا۔"

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی :

"تذکرہ شعرائے اتر پردیش علمی، ادبی، تحقیقی، تاریخی، سماجی اور کچھ کچھ سیاسی رجحانات کا بھی آئینہ دار ہے۔ اس کا مطالعہ عرفانِ ادب پیدا کرے گا۔ ادب کے طالب علموں خصوصاً تحقیق کرنے والوں کے لیے انتہائی اہم اور مفید ہے۔"

ڈاکٹر محمد رضوان علوی :

"موجودہ اور آئندہ نسلیں ان کے اس کارنامہ سے نہ صرف استفادہ کریں گی بلکہ جنونی کیفیت کے حامل اس مصنف کے ذوقِ تحقیق و جستجو کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکیں گی۔ میں عباسی صاحب کے لیے درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں کہ خدا انھیں اتنی مہلتِ حیات دے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی :

"یہ خاکے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خاکوں میں لکھنؤ کی تاریخ اور اس کا تمدن بند ہے۔ عرفان عباسی صاحب کی خاکہ نگاری آئندہ نسلوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ نئی نسل کے محققین جب موجودہ دور کے کسی شاعر پر قلم اٹھائیں گے تو اس کتاب کا مطالعہ ان کے لیے ناگزیر ہوگا۔"

صباح الدین عمر :

"عرفان عباسی صاحب اگر یہ خاکے نہ لکھتے تو شاید کچھ عرصہ بعد اس کتاب میں درج بہت سے غیر معروف مگر اچھے شاعروں کے ناموں سے بھی آنے والی نسلیں ناواقف رہ جاتیں۔ ان کی یہ کوشش جوئے شیر لانے سے کم نہیں، یقیناً لائق تحسین ہے کہ انھوں نے ایک گراں قدر ادبی خدمت انجام دے کر "نام نیکو رفتگاں" کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔"

ڈاکٹر عمار رضوی :

"یہ تحقیقی تذکرے اردو ادب میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ماخذ کا کام دیں گے۔"

امان اللہ خاں شیروانی :

"آپ جو کام کر رہے ہیں، بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی بے حد ضرورت ہے۔"

نازش پرتاپ گڑھی :

"آپ کے خاکے پڑھتا رہتا ہوں۔ بعض حضرات کے بارے میں میں نے اپنی معلومات میں اضافہ بھی کیا ہے۔ آپ کا یہ اقدام بے حد مستحسن بھی ہے اور بروقت بھی۔"

مولانا عبد السلام قدوائی : "قدماء کے حالات تو بہت مل جاتے

ہیں، حال کے اہلِ قلم اور صاحبانِ شعر و سخن کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان کو آپ زندگی جاوید عطا کر رہے ہیں۔ آپ کے یہ مضامین آئندہ لکھنے والوں کے لیے ماخذ کا کام دیں گے۔"

مطبوعہ کتب

۱. جنگِ آزادی اور قومی یک جہتی ۱۹۵۹ء } کتابچے
۲. بھارت جنگ اور قومی یکجہتی ۱۹۶۲ء } کتابچے
۳. "آپ" (دبستانِ لکھنؤ سے متعلق ۵۰ شعرا کے تذکرے) ۱۹۷۸ء
۴. "آپ تھے" (شعرائے قصباتِ اودھ) جلد اول ۱۹۸۱ء
۵. " " سوانح، تصاویر، کلام اور ادبی خدمات (جلد دوم) ۱۹۸۹ء
۶. "آپ ہیں": (موجودہ شعرائے اترپردیش) جلد اول ۱۹۸۰ء
تا ۹ (دو سو شعراء فی جلد) جلد دوم و سوم و چہارم ۱۹۸۵ء
۱۰. انتخاب کلام سلام مچھلی شہری (ناشر: اترپردیش اردو اکادمی)
۱۱. تذکرہ شعرائے ریختی ۱۹۸۹ء
۱۲. انتخاب کلام ناطق لکھنوی (ناشر: اترپردیش اردو اکادمی)
۱۳. دبستانِ امیر مینائی
۱۴. دبستانِ امیر مینائی (ترمیم و اضافہ شدہ اڈیشن) ۱۹۹۵ء
۱۵. نثر نگارانِ اردو (اترپردیش۔۱) جلد اول ۱۹۹۱ء (سوانح، تصاویر، خدمات اور فہرست تصانیف)
۱۶ تا ۲۲. تذکرہ شعرائے اترپردیش (۵۰ شعرا فی جلد) ۱۹۸۲ء (۱۹۳۰ء کے بعد وفات پانے والے اترپردیش کے مختلف اضلاع کے شعراء: سوانح۔ تصاویر۔ کلام اور خدمات) جلد اوّل تا ۱۷ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۵ء

غیر مطبوعہ مسودات

۱. اردو شاعری میں ہندوستانیت
۲. دبستانِ لکھنؤ کے ہندو شعراء
۳. اشاریہ شعرائے لکھنؤ
۴. نثر نگارانِ اردو (جلد دوم)
۵. اردو کے الو پڑھے شعراء
۶. دبستانِ داغ دہلوی
۷. سخنورانِ اترپردیش (۱۹۳۰ء سے قبل وفات پانے والے ایک ہزار شعراء کے سوانحی اشارے اور کلام دو جلدوں میں)
۸. تذکرہ شعرائے اترپردیش (جلد ۱۸ تا ۲۰)

زیرِ تکمیل مسودات

۱. "اردو ادب میں کون کیا؟"
۲. وفیاتِ اربابِ اردو (تا حال)
۳. شاگردانِ آرزو لکھنوی
۴. سخنورانِ اترپردیش (جلد سوم)
۵. طنز و مزاح کے دس شاعر

انعامات و اعزازات

میری بیشتر مطبوعہ کتابوں پر متعدد اردو اداروں، مختلف اردو اکادمیوں نے انعامات و اعزازات سے نوازا ہے۔ مجموعی خدمات کے اعتراف میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کا انعام بھی اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ شری نرائن دت تیواری صاحب کے ہاتھوں اختر الایمان اور امرت لال ناگر صاحب کے ساتھ مجھے بھی ملا تھا

حال ہی میں اترپردیش اردو اکادمی نے میری مجموعی ادبی خدمات کے لیے ۱۹۹۵ء کا گرانقدر اکیاون ہزار روپے کا انعام دینے کا بھی اعلان کیا ہے۔

میرا مخلص، ہمدرد اور محسن آنجہانی رام لعل نابھوی پیدائش کے وقت دایا کے ایک تھپڑ جڑ دینے پر ساری عمر چیختا اور چلاتا رہا ـــــ آخر مر گیا بیچارہ (اللہ اس کی آتما کو شانتی دے) میں وہ سخت جان ہوں جو دایا کے تھپڑ جڑنے کے علاوہ حادثات اور صدمات کے لا متناہی سلسلے، گردشِ زمانہ کی نوازشوں اور اسکے مسلسل لات گھونسے برداشت کرنے کے باوجود بقیدِ حیات ہوں۔

ایک ماہ کے عرصے میں مشفق باپ اور اکلوتے بیٹے کی اچانک موت کے صدمہ سے سنبھل نہیں سکا تھا کہ ۳۴ سالہ

تندرست، تین خورد سال بچوں کے نوجوان باپ (میرے داماد) کی اچانک حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ میرا کمزور ایمان اور بیمار دل ساتھ نہیں دے سکا اور شدید قلبی دورے کی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ علاج سے جان تو بچ گئی لیکن غلط علاج یا کسی دوا کی عدم موافقت کی وجہ سے نیند قطعاً غائب ہو گئی۔ شروع میں معالجین انجکشن وغیرہ سے سُلا دیتے تھے۔ پھر وہ بھی بے اثر ہو گئے۔ اس کے بعد تیز اثر خواب آور دوائیں تجویز کی گئیں جنھیں کئی ڈاکٹروں نے انتہائی مضر و مہلک بتایا تو ان کا مستقل استعمال ترک کر دیا گیا اور کئی دن و رات مسلسل بے خوابی کے بعد ایک دن استعمال کرتا رہا۔ کچھ دن بے حد پریشانی رہی پھر رفتہ رفتہ شب بیداری کا عادی ہو گیا۔ شب بیداری جو شروع میں اذیت ناک اور انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی، کچھ دن بعد نعمت غیر مترقبہ میں بدل گئی جب بے خواب راتیں تذکرہ نگاری کا وسیلہ بن گئیں اور میں نے تقریباً چوتھائی صدی کا طویل عرصہ اس عطیۂ قدرت کے سہارے مصروف کار رہ کر گزار لیا۔

برسوں سے صبح سے ۳ بجے شب تک مسلسل کام کرتا ہوں۔

کئی دن و رات کی بے خوابی اور محنت کے سبب جب اعضا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں تو وہی خواب آور دوا دو چار گھنٹے کے لیے غافل کر دیتی ہے ۔۔۔ تین شدید قلبی دورے جھیل چکا ہوں مقامی طور پر ہر ممکن علاج کے بعد سید سبط رضی صاحب کی پُرخلوص مدد اور دلچسپی سے جی۔ بی۔ پنت قلبی اسپتال دہلی میں داخل رہا موصوف کے اثرات کی بنا پر وہاں بڑی توجہ سے علاج و تیمارداری کی گئی۔ مائنر سرجری بھی ہوئی لیکن شریانیں خشک ہو کر مُڑ جانے کا شاید علاج ہی نہیں ہے۔ تقریباً آٹھ سال سے سخت پرہیز و پابندیوں کے ساتھ (نیس ڈاکٹروں کا تجویز کردہ علاج ہو رہا ہے اور دل کی ایک فی صد کارکردگی پر سلسلۂ تنفس جاری ہے۔

دیکھیے کب تک رہے

□□

رُباعیات

سر اپنا ہلالِ نو کیے خم آیا
اے اہلِ عزا! ماہِ محرّم آیا
دیکھو، سنو اے دیدہ وران و ذی گوش
ہر ثانیہ کرتا ہوا ماتم آیا

شبّیرؑ کی یہ زندہ کرامت دیکھو
قرآن میں تطہیر کی آیت دیکھو
عنوانِ جلالت حیاتِ جاوید
بن جاتی ہے کس طرح شہادت دیکھو

ایماں کی علامت ہے عزائے شبّیرؑ
جنّت کی ضمانت ہے عزائے شبّیرؑ
شبّیرؑ کے غم میں رونے والو! بخدا
صد جانِ عبادت ہے عزائے شبّیرؑ

قطرہ نہیں، ذخّار سمندر ہیں حسینؑ
ذرّہ نہیں، خورشیدِ منوّر ہیں حسینؑ
ہیں مظہرِ انوارِ الٰہی شبّیرؑ
آدم نہ کہو، آدمِ اکبر ہیں حسینؑ

اسلام کے ضامن و نگہباں ہیں حسینؑ
مومن کے لیے کعبۂ ایماں ہیں حسینؑ
اخلاقِ محمّدی کا آئینہ ہیں
علم و عرفانِ شہِ یزداں ہیں حسینؑ

ناوک حمزہ پوری
ڈاک خانہ شیر گھاٹی ۸۲۴۲۱۱ گیا

وقت

وقت کے ساتھ چلنے پہ مجبور کرتے ہو کیوں
وقت اندھا کنواں ہے
بچا لو مجھے
لڑکھڑانے لگا ہوں
سنبھالو مجھے۔
خواب ہے وقت
دھوکا ہے
پرچھائیں ہے،
وقت ایسی طوائف جو سکوں کی آواز تک
ساتھ دیتی ہے بس،
وقت ایسا ہے بہروپیا
روز چہرہ بدلتا ہے جو،
وقت کے ساتھ جو بھی چلا
عیش کرتا رہا،
وقت اک دل رُبا ہمسفر ہے
مگر
وقت کا کچھ بھروسہ نہیں
وقت کی سازشوں کا ٹھکانہ نہیں
وقت رہزن بھی ہے
وقت قاتل بھی ہے
وقت طوفاں بھی ہے
وقت ساحل بھی ہے
وقت اُس کا ہے جو قید کر لے اُسے
وقت اس کا جو مٹھی میں بھر لے اُسے

خورشید افسر بسوانی
بسواں ضلع سیتاپور (یوپی)

ندامت

پرندہ رات کا جب
افق کی وسعتوں میں گم ہوگیا
ہوا مصروف میں بھی اپنے بستر کی شکن چُننے میں
کچھ ٹوٹے ہوئے لمحات کی کرچوں سے
دامن اپنا بھرنے میں
مگر اک معتبر آواز نے چونکا دیا مجھ کو
موذن کی اذاں کانوں میں گونجی
بڑا ہے وہ خدا جس کے سوا دُنیا کی ساری قوتیں فانی
بھلائی کی طرف آنے کی دعوت
سماعت تک مرے آئی
تو مجھ کو یہ ہوا محسوس تھوڑی
دوامی کب ہے اس دنیا کا غم یا اس کی ہر راحت
حقیقت میں یہ ساری کائنات
اللہ کے نزدیک ـــــ
اک مکھی کے پر سے بھی کم قیمت
خدا ـــــ
میرے خدا، کچھ بھی نہیں تیرے سوا
مجھے مقصود ہے تیری رضا
میری جبیں خم ہے ترے آگے
میں نادم ہوں بہت گزرے ہوئے لمحوں کی نادانی سے
اے مولا!!

محمد مہدی پرتاپگڑھی
۲۸-۱، اسکول وارڈ
پرتاپ گڑھ

ڈاکٹر خورشید انور
جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

ادب کے قدیم یونانی اور ہندستانی نظریات

انسان کی غور و فکر کی صلاحیت مختلف چیزوں کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے کی جبلت اور مختلف تصورات و نظریات پر ردّ عمل کا اظہار اس کی مجموعی فطرت کا حصہ ہوتی ہیں، اس کی نظر کے سامنے جو بھی شے آتی ہے وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، سمجھ کر اس پر اپنی رائے قائم کرتا ہے اور اس رائے کے مطابق اپنے ردّ عمل کا اظہار کرتا ہے، کبھی اس کے اپنے نظریات و خیالات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں اور کبھی مشابہ، وہ اس شے کے متعلق دوسروں کے خیالات و نظریات کا مشاہدہ و مطالعہ کرتا ہے اور اپنے خیالات کے پیش نظر دوسروں سے اتفاق یا اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہے، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح علم کے میدان میں بھی انسان اپنی اسی فطرت کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا ہے، دنیا کے تقریباً تمام علوم سے متعلق مختلف اہلِ علم اکثر متضاد خیالات و نظریات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ کسی بھی مخصوص علم کے بارے میں تمام ماہرینِ علوم کے درمیان اتفاق رائے تلاش کرنے کی کوشش ایک بے سود عمل ہوگی، دورِ قدیم سے لے کر آج تک تمام علمی تصورات کے متعلق عالمین میں اختلاف رائے رہا ہے اور آج تک کسی بھی تصور کے متعلق عالموں کے درمیان مکمل اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔

تمام دیگر علوم کی طرح ادب میں بھی یہ اختلاف رائے ہمیشہ سے رہا ہے ادب کے مختلف پہلوؤں پر مختلف عالموں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور مختلف نظریات پیش کیے، کسی نے ادب کو احساس جمال کا اظہار تصور کیا، کسی نے ادب کو سماج سے خارج کر دینے کا مطالبہ کیا۔ کسی نے اسے اظہارِ ذات کا وسیلہ قرار دیا تو کسی نے اسے تنقید حیات سے تعبیر کیا اور کوئی اسے محض دل بہلاوے کی چیز سمجھتا رہا، کسی نے "ادب برائے ادب" [illegible] پیش کیا تو کسی نے "ادب [illegible]" [illegible] اور [illegible]

آئی، کوئی ادب میں کمٹ منٹ کی حمایت کرتا رہا تو کوئی اس کی مخالفت۔

ہومر دنیا کا پہلا معلوم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ادب کے متعلق نقطۂ نظر قائم کرنے کا آغاز بھی ہومر سے ہی ہو جاتا ہے، اس لیے کہ ہومر نے نہ صرف یہ کہ خود شاعری کی ہے بلکہ شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے یعنی ادب کے متعلق بحث اتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا خود ادب ہے۔

ادب سے متعلق نظریاتی بحث کے نقوش افلاطون کی "ری پبلک" سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں، افلاطون نے "ری پبلک" کے پانچویں حصے میں ادب کے بارے میں بحث کی ہے، یہ بحث تین ابواب پر مشتمل ہے، اس کتاب کا پانچواں حصہ "فلسفہ اور شاعری کا باہمی نزاع..."

(THE QUARREL BETWEEN PHILOSOPHY AND POETRY) ہے، اس حصے کے تینوں ابواب کے عنوانات اس طرح ہیں:

(الف) فن کا حقیقت سے رشتہ (RELATION OF ART TO TRUTH)

(ب) ڈرامائی شاعری جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے "عقل پر نہیں"

(DRAMATIC APPEALS TO THE EMOTIONS NOT TO THE REASON)

(ج) کردار پر ڈرامائی شاعری کا اثر (THE EFFECTS OF DRAMATIC POETRY ON CHARACTER)

ان ابواب میں افلاطون نے [illegible] شاعری کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

کے لیے وہ پلنگ کی مثال پیش کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

"پلنگ کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں اور جو ایشور کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ دوسرا وہ جو کہ لوہار بناتا ہے اور تیسرا وہ جو کہ رنگ ساز بناتا ہے۔ اس طرح ایک پلنگ حقیقت ہے جس کی نقل لوہار کرتا ہے اور لوہار کے پلنگ کی نقل رنگ ساز کرتا ہے جیسے رنگ ساز تیسرے درجے کی شے تخلیق کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح شاعر بھی تیسرے درجے کی حقیقت پیش کرتا ہے۔"

افلاطون کے مطابق شاعر اور شاعری کے سماج میں کوئی افادیت نہیں اور اسی وجہ سے وہ شاعر کو اپنی جمہوریہ سے خارج بھی کرتا ہے، ہومر کی مثال لے کر وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"لیکن جب ہومر ہمیں اہم ترین معاملات جیسے جنگ کے طریقے، مُدبری یا تعلیم کے بارے میں بتاتا ہے تو ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اس کی اہلیت کے بارے میں تحقیق کریں۔ ہم کو کہنا چاہیے عزیز ہومر ہم نے فنکار کو حقیقت سے تین درجے دور کی نقل کرنے والا ثابت کیا ہے۔ اگر انسانی تفوق کے بارے میں تمہارا علم واقعی اس قدر ہے کہ تمہیں دوسرے درجے پر رکھا جائے تو تم یہ بتا سکتے ہو کہ افراد یا شہریوں کو کن طریقوں سے بہتر یا بدتر بنایا جا سکتا ہے، یہ بھی بتاؤ کہ دنیا میں وہ کون سا ملک ہے جو تمہاری کوششوں کے باعث بہترین بن سکا ..... تو ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہومر سے لے کر اب تک شاعر اپنے موضوع (جس میں انسانی تفوق بھی شامل ہے) سے مشابہت پیش کرنے کا کام کرتا ہے لیکن حقیقت پر اس کی گرفت کبھی نہیں رہی۔" (انگریزی سے ترجمہ)

اس طرح افلاطون شاعری کو تیسرے درجے کی چیز مانتا ہے۔

افلاطون کے شاگرد ارسطو نے ادب کے متعلق بحث کو اور آگے بڑھایا اور پہلی بار ادبیات پر خصوصی طور پر ایک کتاب ارسطو کے قلم سے ہی وجود میں آئی۔ ارسطو کی بوطیقا (POETICS) شاعری کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے اور شاعری کے معیار، اس کی خصوصیات، اس کی خوبیوں، اور خامیوں اور مقاصد و ماہیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔

ارسطو شاعری یا دوسرے فنون کو نقل کی نقل ماننے کے بجائے صرف نقل مانتا ہے۔ اس کے نزدیک سارے فنون زندگی کی نقل ہیں اور یہ نقل انسانی عادات کا ایک حصہ ہے، وہ انسان کو سب سے زیادہ اور بہترین نقال تصور کرتا ہے، بوطیقا میں وہ ایک مقام پر لکھتا ہے:

"نقل کرنا بچپن سے ہی انسان کی جبلت ہے۔ اسی باعث وہ دوسرے جانوروں سے ممتاز ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقال اور اسی جبلت کے ذریعے وہ اپنی سب سے پہلی تعلیم پاتا ہے۔ اسی طرح آدمی قدرتی طور پر نقل سے حظ حاصل کرتے ہیں۔"

چنانچہ ارسطو نقل کو عیب نہیں بلکہ انسانی جبلت مانتا ہے۔ اسی طرح نام لیے بغیر وہ اپنے استاد افلاطون کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔ ارسطو شاعری کی درجہ بندی کرتا ہے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ٹریجڈی اور کامیڈی۔ وہ ٹریجڈی کو کامیڈی پر فوقیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک:

"کامیڈی کا مقصد ہے انسانوں کو جیسا ہم پاتے ہیں انھیں اس سے بدتر دکھایا جائے جبکہ ٹریجڈی کا مقصد انسانوں کو جیسے وہ ہیں اس سے بہتر دکھانا ہے۔"

ارسطو ٹریجڈی میں زبان اور کردار پر زور دیتا ہے کیونکہ اس کے مطابق صنف کی عظمت فن کی بلندی اور اس کی مجموعی ہیئت پر منحصر ہے۔

پھر اسی قسم کے خیالات قدیم ہندوستانی شعریات میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ قدیم ہندوستانی شعریات میں شاعری کے جو اصول و ضابطے وضع کیے گئے ان کی بنیاد اکثر ہیئت پر بھی رکھی گئی ہے۔ رس، دھونی، النکار، وکروتی اور اوچیتیہ کے مختلف نظریات پر مبنی ہندوستان کا قدیم ادبی سرمایہ حسن اور زبان کی عمدگی کے گرد و پیش بھی گھومتا نظر آتا ہے۔ عہدِ قدیم کے مختلف ہندوستانی ادبا نے شاعری کی روح" (काव्य-आत्मा) کو ہیئت سے منسوب کیا ہے اور اس کی بنیاد پر مختلف ادبی نظریات وجود میں آئے ہیں۔

سنسکرت شعریات کا سب سے قدیم نظریہ رس ہے۔ رس کا نظریہ سب سے پہلے بھرت منی کے ناٹیہ شاستر میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد

مختلف ادبی مفکرین اور مبصرین کے رَس کے متعلق نظریات وجود میں آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ رَس کی اہمیت سے اتفاق کرتے ہیں اور کچھ نظریات رس پر دیگر ادبی نظریات کو فوقیت دیتے ہیں۔

بھرت منی کے علاوہ بھاما، ڈنڈی، وامن، ادبھٹ، رودرت اور ابھی نوگپت کے نظریات اہمیت کے حامل ہیں۔

بھرت منی نے ناٹیہ شاستر کے چھٹے باب میں رسوں کے متعلق (रसविकल्प:) اور ساتویں باب میں رسوں سے وابستہ جذبات (भाव व्यञ्जक:) سے گفتگو کی ہے۔ چھٹے باب میں وہ آٹھ رس، سنگار، ہاسیہ، کرن، رودر، ویر، بھیانک، بی بھتسیہ اور ادبھت رس کا ذکر کرتا ہے[5]۔ اس کے بعد ان رسوں کے وابستہ نفسیاتی جذبات: رتی، ہاسیہ، شوک، کرودھ، اتساہ، بھئے، یوپوتسا اور وسمئے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ان بنیادی جذبات کے علاوہ اس نے ۳۳ معاون جذبات بھی بتائے ہیں جو کر مل کر رَس کی تکمیل کرتے ہیں، ساتویں باب میں بھرت منی جذبات کی تفصیل بیان کرتا ہے، اس سلسلے میں وہ دو لفظوں کا استعمال کرتا ہے، وبھاؤ اور انو بھاؤ۔

وبھاؤ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ وبھاؤ لفظ کا استعمال جامع علم کے معنوں میں ہوتا ہے۔ وبھاؤ لفظ وجہ کے مترادف ہے۔ لفظ ('शब्द') اداکاری (अभिनय) اور ستو (सत्त्व) جسم اور احساس کا مظہر) وبھاؤ (متعین کردہ) کے ذریعے ہی متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے وبھاؤ کہا گیا ہے۔ انو بھاؤ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ انو بھاؤ "تماش بین کو ابھینئے" اور "ستو" کے ذریعے انو بھاویت (متاثر) کرتا ہے چنانچہ اسے انو بھاؤ (تاثر) کہا جائے گا[6]۔

بھرت منی کا پورا رَس کا نظریہ انھیں حوالوں کی بنیاد پر مشتمل ہے۔ بعد کو آنے والے مختلف مکتب فکر عموماً انھیں نظریات کو بنیاد بناتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کوئی مکتبِ فکر رَس کو "کاویہ" میں بنیادی اہمیت دیتا ہے اور کوئی اسے دوسرے نظریات کے دائرے میں رکھ کر اسے معاون یا دوسرے درجے کی چیز تصور کرتا ہے۔

بھاما رسوں کو النکاروں کے دائرے میں محدود کر کے انھیں النکاروں کا ہی ایک حصہ بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری کا سب سے اہم پہلو حُسنِ اظہار ہے۔ بھاما اپنی تصنیف کاویہ النکار سنگرہ (काव्यालंकारः संग्रह) میں ڈراموں سے بھی رسوں کو خارج کر دینے کا بھی مشورہ دیتا ہے۔ اس طرح بھاما کا رسوں کے متعلق تصور، بھرت منی کے تصورات کے برعکس، ایک محدود نقطۂ نظر کی شکل میں ابھرتا ہے۔ اس کے یہاں حُسنِ اظہار جذبات سے زیادہ اہم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ النکاروں کو رسوں پر فوقیت دیتا ہے۔ بھاما دو قسم کے احساسات کا ذکر کرتا ہے اور انھیں پریئے (प्रेय) اور اور جسوی (ऊर्जस्वि) کا نام دیتا ہے۔ یہ احساسات روحانی عشق سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعری میں ان احساسات کے اظہار سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی شعر میں حُسن ہی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح پریئے اور اور جسوی بھی النکاروں کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ غرض کہ بھاما کی نظر میں کاویہ کی روح النکار ہیں رس نہیں۔

بھاما کے بعد ڈنڈی کا مکتبۂ فکر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈنڈی بنیادی طور پر "گن" مکتبۂ فکر کا بانی ہے۔ ڈنڈی کے یہاں "گن" سے مراد شاعری میں الفاظ اور خیال کا امتزاج ہے۔ یہی امتزاج کاویہ کی روح ہے۔ وہ دس گنوں کو کاویہ کی روح اور کاویہ کے اس قسم کے اسلوب کو "ویدربھی" (वैदर्भी) کہتا ہے۔ بھاما کی طرح ڈنڈی میں النکاروں کو رسوں کی طرح ترجیح دیتا ہے اور انھیں گنوں سے منسوب کر کے ویدربھی اسلوب کی وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح وہ بھی النکاروں کو ہی کاویہ کی روح تصور کرتا ہے۔

ڈنڈی رسوں کو تین النکاروں، پریئے، رسوار اور ارجسوی کی حدود میں داخل کر لیتا ہے۔ لیکن بھاما کے برعکس وہ رسوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور بھرت منی کے آٹھ رسوں کی وضاحت وہ اپنی تصنیف "کاویہ درش" میں کرتا ہے۔

چوتھا اہم مکتبۂ فکر وامن کا ہے۔ وامن دراصل "ریتی" مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری حُسن کی نمائندگی کرتی ہے اور شاعری میں حُسن خامیوں کی عدم موجودگی اور النکاروں اور گنوں کے مخصوص امتزاج سے پیدا ہوتا ہے[8]۔ اس کے مطابق کاویہ کی روح اسلوب (रीति) ہے۔ اسلوب یا ریتی گنوں کے ذریعہ بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ ریتیوں کو وہ تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے: ویدربھی، گوڑی اور پنچالی۔ ویدربھی کو وہ باقی دونوں ریتیوں پر فوقیت دیتا ہے۔

وامن رسوں کو گنوں کا بے حد ضروری حصہ تصور کرتا ہے۔ اس کا

بھاما یہ ہے کہ رس اسلوب میں "کا نتی" (شعور) پیدا کرتے ہیں۔ رسوں میں شرنگار کو وہ دوسرے رسوں کے مقابلے میں زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ بھاما اور ڈنڈی کی طرح وامن رسوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا بلکہ شاعری میں ان کو اہم درجہ دیتا ہے۔

رودرٹ دو مختلف مکتبۂ فکر: بھرت منی اور بھاما کے درمیان ایک کڑی ہے۔ بھاما کی طرح رودرٹ بھی رسوں کو النکاروں کے دائرے میں رکھتا ہے لیکن بھرت منی کی طرح وہ رسوں کو بھی پوری اہمیت دیتا ہے۔ اس نے بھرت منی کے آٹھ رسوں میں خود بھی ایک رس کا اضافہ کیا جو کہ شانت رس کہلایا۔

رودرٹ نو رسوں کو مانتے ہوئے پریئے کو بھی نو رسوں میں داخل کر دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ نو کی جگہ دس رسوں کا بیان اپنی تصنیف کاویہ النکار میں کرتا ہے۔ رودرٹ اپنے پیش روعالمین کے برعکس رسوں کو کاویہ کی بنیاد تصور کرتا ہے لیکن بھاما ڈنڈی اور وامن کی طرح ہی رودرٹ بھی النکاروں کو ہی کاویہ کی روح تصور کرتا ہے کیونکہ جب تک النکاروں کے ذریعہ کاویہ کو سجایا نہیں جائے گا کاویہ میں رسوں کی بنیاد پر ہی حُسن پیدا نہیں ہوگا۔

بھرت منی کے بعد رس کے نظریہ کا سب سے اہم مکتبۂ فکر ابھی نوگپت کا مکتبِ فکر ہے۔ ابھی نوگپت نے ہی رسوں کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا۔ میسن اور پٹوردھن نے اپنی تصنیف "شانت رس" میں ابھی نوگپت کو رس نظریہ کا بھرت منی کے بعد سب سے اہم فلسفی تسلیم کیا ہے۔

ابھی نوگپت نے رودرٹ کے شانت رس کے تصور کو بے حد اہمیت دی۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ ابھی نوگپت دیگر تمام اصناف ادب پر ڈرامے کو فوقیت دیتا ہے اور ساتھ ہی "تانترک اعمال" میں بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے باعث جب وہ ڈرامے اور تنترک کو ایک دوسرے سے وابستہ کرکے دیکھتا ہے تو اس پر تانترک کے سکون کی کیفیت غالب آتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ شانت رس اسے کافی اہم معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دوسری وجہ خود ابھی نوگپت کی "ابھی نو بھارتی" کی مندرجہ ذیل مثال میں دیکھی جا سکتی ہے:

"شانت رس وہ کیفیت ہے جہاں انسان تمام جیو آتماؤں کے لیے ایک جیسا محسوس کرتا ہے۔ اس کیفیت میں نہ غم ہے نہ خوشی اور نہ نفرت۔ شانت انسان کی فطری کیفیت ہے۔ دوسری کیفیات جیسے عشق وغیرہ بنیادی کیفیات کی بگڑی اشکال ہیں۔ یہ بگڑی شکلیں ذہن کی فطری کیفیات سے ابھرتی ہیں اور اسی میں ضم ہو جاتی ہیں۔"

غرضکہ ابھی نوگپت شانت رس کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور پورے رس کے نظریے کو کاویہ کی تشکیل کے لیے بے حد ضروری قرار دیتا ہے۔

رسوں کی طرح النکاروں کے بھی اولین نقوش بھرت منی کے ناٹیہ شاستر میں ہی ملتے ہیں۔ بھرت منی نے محض چار قسم کے النکاروں کا ذکر کیا ہے:

اپما (تشبیہ)، روپک (استعارہ) دیپکا (توضیحی) اور یمک (تجنیس)

بھاما نے بھرت کے ناٹیہ شاستر پر تبصرہ کرتے ہوئے ان النکاروں کی توسیع کی۔ "کاویہ النکار اسنگرہ" میں بھاما رسوت النکار کا نظریہ پیش کرتا ہے اور اسے وہ سنسکرت شعریات کے صنائع (काव्यालंकार) میں شامل کرتا ہے۔ بھاما کی اس تصنیف پر ادبھٹ نے تبصرہ کیا اور مندرجہ بالا چار النکاروں کی توسیع ادبھٹ نے بھی کی لیکن ادبھٹ نے النکاروں کی تعداد ۴۱ بتائی۔

النکاروں کی توسیع میں سب سے اہم نام ڈنڈی کا ہے۔ ڈنڈی نے النکاروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے پہلی بار النکاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ شبد النکار یا وہ النکار جن کی بنیاد الفاظ کے اثر پر ہے۔ اور ارتھ النکار یا وہ النکار جن کی بنیاد معنی پر ہے۔ اس تقسیم کے ذریعے ڈنڈی نے النکاروں کو صرف کاویہ کے ظاہری حسن تک ہی محدود نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے معنی میں بھی حُسن پیدا کرنے کا راستہ ہموار کیا۔

النکاروں، جن کا بنیادی مقصد "کاویہ" میں حُسن پیدا کرنا ہے کی تعداد پر کافی اختلاف رہا ہے۔ ڈنڈی، بھاما، ادبھٹ اور وامن وغیرہ نے النکاروں کی جو تعداد بتائی ہے وہ تیس سے چالیس کے درمیان ہے۔ ممٹ نے النکاروں کی تعداد اکسٹھ، رویاکا نے پچھتر، چندر لوک نے سو اور کووالیانند نے ایک سو پندرہ النکاروں کا ذکر کیا ہے۔

سنسکرت شعریات اور تیسرا اہم نظریہ 'ریتی' کا ہے۔ ریتی سے مراد اسلوب یا الفاظ کی مخصوص ترکیب ہے۔ وامن ریتی مکتبِ فکر کا بانی

سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ریتی کے دس گُن (خصوصیات) بیان کیے ہیں۔
یہ دس گُن : سوکماریہ، ماڈھریہ، سمادھی، سمتا، شلیش، پرساد، اَوج، کانتی، ارتھ ویکتی اور اُدارتا ہی کاویہ کی روح ہیں۔

اسلوب کی دو قسمیں، ویدربھی اور گوڑی، وامن نے ڈنڈی کے نظریات سے اخذ کیں اور اس میں تیسری قسم پنچالی کا اضافہ کیا اور یہی پنچالی اسلوب اس کے نظریات کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

دھونی کا نظریہ آنند وردھن نے اپنی مشہور تصنیف 'دھونیا لوک' (ध्वन्यालोक) میں دیا۔ آنند وردھن نے دھونیا لوک میں 'دھونی' کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کاویہ میں ایسے الفاظ کا استعمال ہونا چاہئے جو صرف سطحی نہ ہوں بلکہ اس میں باطنی معنی پنہاں ہوں۔ کوئی کاویہ تبھی پرکشش ہوگا جب وہ اپنے اندرونی مفہوم کے ذریعے قاری کو اپنی طرف رجوع کر لے اور ساتھ کاویہ کے اندر اثر بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور یہی اثر دھونی کے نظریہ کی بنیاد ہے۔

ابھی نوگپت کے ہم عصر کنتک (कुंतक) نے رس، النکار، ریتی اور دھونی کے نظریات میں ایک اور اضافہ کیا جو "وکرتی" کا نظریہ تھا۔ اس کی تصنیف وکروکتی جیوتا (वक्रोक्तिजीविता) اس نظریے کی وکالت کرتی ہے۔ اس کے نزدیک خالص ایہام ہی شاعری میں جمالیاتی انبساط پیدا کرتا ہے۔ وکروکتی سے مراد ہے کہ کسی خیال کا اظہار بلا واسطہ نہ ہو بلکہ بات کو پردوں میں کہا جائے۔ وکروکتی کے استعمال میں شلیش النکار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

ان قدیم ہندوستانی ادبی نظریات میں ایک پہلو مشترک نظر آتا ہے اور وہ پہلو ادب میں حُسن و جمال کی پیروی کا پہلو ہے۔ رس، النکار، دھونی، ریتی، وکروتی تمام نظریے ادب میں حسن و جمال کی بنیادی حیثیت پر ہی زور دیتے ہیں۔

چنانچہ قدیم یونانی نظریات کی ہی طرح قدیم ہندوستانی ادبی نظریات بھی ادب میں ہیئت کو مواد پر فوقیت دیتے ہیں اور اسی فوقیت کو تمام قدیم ادبی نظریات کی مشترک قدر تسلیم کیا جانا چاہیئے۔

حواشی:

۱ The Republic of Plato. Translated with Introduction by M. Cornford (Oxford, London, 1955) P. 319

۲ ایضاً۔ ص ۳۲۲۔ ۳ ارسطو۔ بوطیقا۔ مترجم عزیز احمد، دہلی ص ۴۷۔ ۴ ایضاً ص ۴۵۔

۵ Natyashastra by Bharat Muni Translated with commentary by Man Mohàn Das Vol. 10, Calcutta 1967. P. 81

۶ ایضاً ص ۹۲۔

۷ A Sankaran, Some Aspects of literary criticism in sanskrit or Theories of Rasa and Dhvani (New Delhi 1973) P. 28.

۸ Natyashastra, Edited with Abhinavbharti of Abhinavgupta by M. Rama Krishna Kavi, Vol. 17 (Oriental Institute Boroda 1956) P. 332.

غزل

راہ رو کوئی نہیں ہے، راہبر کوئی نہیں
پُر خطر ہیں راستے اور ہم سفر کوئی نہیں

تو نے ایسا کہہ کے رکھ لی لاج میرے عشق کی
چاہنے والے تو ہیں مجھ سا مگر کوئی نہیں

کی گئی جتنی دوا بڑھتا گیا اتنا مرض
کیا بزرگوں کی دُعاؤں میں اثر کوئی نہیں

ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب بھی تم کو بھیڑ میں
بھیڑ میں اس شہر کے تم سا بشر کوئی نہیں

جب کبھی نظریں ملیں دل میں خیال آ ہی گیا
اے مرے محمود اب ایسی نظر کوئی نہیں

محمود الحق محمود

اے ۶۸ بی۔ ہرا ریلوے کالونی
لکھنؤ

غزلیں

سناؤں کیسے غمِ دل اگر سوال کرے
جواب دل میں ہے اسکے مگر سوال کرے

کہاں یہ تاب کہ دیکھیں نظر بھر کر
ملے نگاہ تو ذوقِ نظر سوال کرے

حضر میں ہو تو ہمیں وقت دیکھتے رہیے
سفر میں ہو تو ہر اک ہم سفر سوال کرے

میرے قلم کا وہ پیکر ہے یا مرا محبوب
یہ میرے شعر کا ہر اک بشر سوال کرے

میں ایک ڈھلتی ہوئی شام وہ نمودِ سحر
میں مر ہی جاؤں وہ عزمی اگر سوال کرے

خان عزمی رُدولوی

ارشاد منزل
رُدولی ۲۲۵۴۱۱
(بارہ بنکی)

جو جینے کا سلیقہ کچھ نہیں ہے
تو مقصد زندگی کا کچھ نہیں ہے

بتاؤ یہ دھواں آیا کہاں سے
اگر تم نے جلایا کچھ نہیں ہے

فقط پیشِ نظر دنیا ہے اب تک
کسی کو فکرِ عقبیٰ کچھ نہیں ہے

لٹا بیٹھا ہے سب کچھ راہِ حق میں
اب اس کے پاس رکھا کچھ نہیں ہے

نگاہوں سے بیاں ہوتا ہے سب کچھ
زباں سے راز کہتا کچھ نہیں ہے

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

کٹرہ پیر دل خاں - اُردو روڈ
اٹاوہ - ۲۰۶۰۰۱

وہی ہیں میری دعائیں، نہیں اثر پھر بھی
مٹا ہوا ہوں محبت کے نام پر پھر بھی

وفا کی راہ میں سب کچھ لٹا کے دیکھ لیا
ہمارے حال پہ کب کی گئی نظر پھر بھی

یہ بے ثبات سہی، اس کو رائیگاں نہ کرو
کہ قیمتی ہے بہت عمرِ مختصر پھر بھی

بدل کے دیکھا ہے اکثر صبیح ہم نے مزاج کو
جہاں پہ جبر میں ہوتی نہیں سحر پھر بھی

ہزار قطرۂ جاں ہے قدم قدم پہ پیام
ہے راہِ عشق پہ جاری مگر سفر پھر بھی

پیام فتح پوری

نگر پالیکا کالونی
نسیم آباد
کان پور (یو پی)

پروفیسر منظر اعظمی
جاوید منزل - ای - ۲۰، ابوالفضل انکلیو (اوکھلا)
جامعہ نگر - نئی دہلی - ۲۵

اُردو مشاعروں کا ارتقاء

اُردو مشاعروں کی ابتدا کا سُراغ لگانے کے لیے اگرچہ فارسی اور عربی تک چھلانگ لگانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر عربی اور فارسی مشاعروں کے خدوخال کا بہت کچھ حصّہ چوں کہ اُردو مشاعروں کو ورثے میں ملا ہے اس لیے ان کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جن شعری اجتماعات کو ہم اُردو میں مشاعرہ کہتے ہیں، اس طرح کی کوئی روایت عربی اور فارسی میں بھی موجود تھی۔

اگر شعری اظہار محض انفرادی تسکین و احساسِ مسرّت نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شامل کرنا مقصود ہے تو خواہ اس کی شکل تضحیک، طنز، ناموری اور اظہار علمیت ہی کی کیوں نہ ہو، اس کا مزاج انفرادی سے زیادہ اجتماعی معلوم ہوتا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط نہیں کہ دُنیا کے پہلے شاعر نے جب سب سے پہلے شعر کہا ہوگا تو تخلیق کے احساسِ مسرّت یا حیرت میں دوسروں کو بھی ضرور بر شریک کیا ہوگا خواہ اس کا نتیجہ داد و تحسین یا تنقید و تعریض ہی کی صورت میں نکلا ہو۔ اگرچہ مختلف ملکوں اور قوموں کے الگ الگ حالات اور مختلف عناصر و عوامل کی موجودگی میں اُردو مشاعروں کی سی روایت قائم نہ ہوسکی مگر ان کے شعری اظہار کی مختلف صورتیں ضرور قائم ہوئیں۔ چنانچہ عربوں میں مختلف میلوں، ٹھیلوں میں خصوصاً عکاظ اور دوسرے سماجی اجتماعات کے موقعوں پر شعری مقابلوں اور مسابقوں کا پتہ چلتا ہے، جن میں اس عہد کے شعراء نے اپنی شعری صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ تنقید و تعریض کا بھی نشانہ بنے۔ شعر چونکہ ان کی گھٹی میں پڑا تھا اس لیے ان کی بدیہہ گوئی صرف میلوں ٹھیلوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ میدانِ جنگ میں بھی اس سے جذبات کو ابھارنے اور اپنے مقام و مرتبے کو جتلانے کا بھی کام لیا جاتا تھا یہ گویا شمشیر و سناں کے ذریعہ تفوق و برتری قائم کرنے سے پہلے فصاحت و بلاغت کی ایک الگ جنگ تھی جس کے ذریعے مقابل پر نفسیاتی دباؤ ڈال کر یا شکست کا احساس دلا کر اپنی بڑائی قائم کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے عرب لسان و زبان دونوں کے دھنی تھے اس لیے ان کے مقابلوں اور مسابقوں میں جنگ و جدل کا رنگ بھی لال چھپا ہوتا تھا۔ مقابلے اور جنگ و جدل کا یہ مزاج لکھنؤ میں انشاؔ اور مصحفیؔ کے مقابلوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ حالانکہ دلّی میں بھی طنز و تضحیک اور ہجو کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مگر لکھنؤ میں نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری:

> "دہلی میں اُردو شاعری ذاتی قسم کا ایک مشغلہ تھی دل بہلانے کا ایک بہانہ۔ لکھنؤ میں دربار سے تعلق کے سبب اسے ایک پیشہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔ بقول شخصے "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن"۔ شاعروں میں اوّل جذبۂ منافست پیدا ہوا جس نے بھڑک کر بعد میں رقابت و عداوت کی شکل اختیار کرلی۔ مشاعروں نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور شاعری دماغی ورزش بن کر رہ گئی۔ مشاعرے دلّی میں بھی منعقد ہوتے تھے لیکن دہلی کی شاعری کی طرح دہلی کے مشاعرے بھی نجی قسم کے تھے یہ مشاعرے نہ تھے مخصوص مجلسیں تھیں جن میں صرف شعراء شرکت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا کلام سُن کر محظوظ ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے مشاعرے شعر گوئی کے مقابلے تھے جن میں شعراء اپنے اپنے شاگردوں کے

ساتھ شریک ہو کر شعر گوئی کے جوہر دکھاتے اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔" ؎

بہر نوع عربوں کے مشاعروں میں جہاں ایک طرف انکی عربیت اور جنگجویانہ مزاج کی عکاسی ہوتی تھی وہیں دوسری طرف مشاعروں کے عوامی اور اجتماعی ربط وارتباط کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے ان مشاعروں میں سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے شعر جو اکثر و بیشتر قصائد کی شکل میں ہوتے تھے، شہرت کے ساتھ ساتھ اعزاز و اکرام بھی پاتے تھے۔ چنانچہ ایسے سات ممتاز قصیدے، جو سبعہ معلقہ کہلاتے ہیں، خانۂ کعبہ کے دروازے پر عزت و احترام کی علامت کے طور پر لٹکائے گئے۔ چوں کہ ان کی زندگی قبائلی تھی۔ اس لیے ہر قبیلے کی کوشش تھی کہ ان میں کوئی بڑا شاعر ضرور ہو، یا بڑے شاعر سے کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق ضرور ہو جو ان کی عزت و ناموری کا سبب بن سکے۔ ظہور اسلام کے بعد عہد نبویؐ اور دورِ خلافت میں مشاعروں کا محبوب موضوع ذاتِ نبویؐ تھی اس لیے کسی بھی اجتماعی موقع پر شعراء عموماً ذاتِ نبویؐ یا عظمتِ اسلام کے موضوع پر شعر کہہ کر اور سنا کر مسند احترام کے مستحق سمجھے جاتے۔ احادیث اور تاریخ میں ایسے کئی موقعوں کا ذکر ملتا ہے جن میں حضرت حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک اور دوسرے شعراء سے شعر کی صورت میں حضورؐ کا ذکر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ لیکن جب خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی اور انعام و اکرام کی کثرت ہو گئی تو شعراء دربار سے متعلق ہونے لگے۔ بنو امیہ کے زمانے میں کم اور بنو عباس کے زمانے میں کثرت سے شعراء کو نوازا گیا۔ اگرچہ درباروں کے ان مشاعروں میں شعراء عموماً شاہ وقت کی مدح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور بادشاہ اور درباریوں سے داد تحسین وصول کرتے۔ مگر دربار سے بیشتر شعراء کے تعلق نے مشاعروں کی عوامی حیثیت کو ختم نہیں تو کم ضرور کر دیا۔ اور جو شعراء اکا دکا صورت میں عوام کو مخاطب کرتے نظر آتے بھی ہیں تو اس کی حیثیت اجتماعی سے زیادہ انفرادی نظر آتی ہے۔

مشاعروں کی یہی درباری صورت تھی جو عربی سے فارسی میں منتقل ہوئی۔ چنانچہ شعراء کے یکجا ہونے کی سب سے قدیم روایت ہمیں جاحظ کے یہاں ملتی ہے، جس کے بقول نوروز اور مہرگان یعنی مہرگان کے جشن پر شعراء نوشیرواں کی مدح میں اس کے دربار میں قصیدے پڑھتے تھے جو اسی موقعے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ ؎

فارسی میں بھی مشاعروں کی نوعیت درباری معلوم ہوتی ہے۔ کسی ایسے مشاعرے کا پتہ نہیں چلتا جس میں عوام بھی شریک ہوں۔ دربار سے تعلق کی بنا پر مشاعروں میں تکلفات اور مختلف آداب و رسوم کا اضافہ ہوا تسلیمات اور کورنش اور آج کے آداب و تسلیمات کا رواج دربار ہی کا مرہون منت ہے۔ ابتدائی اردو مشاعروں میں بھی رکھ رکھاؤ، آداب و تہذیب اور دیگر تکلفات کا اہتمام جاگیردارانہ سماج اور دربار ہی کے تعلق کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اشعار میں مرصع سازی، باریکیِ خیال اور فکر سے زیادہ تزئینِ شعر کا استعمال بھی غالباً انھیں تکلفات ہی کے نتائج و آثار ہیں۔ ادب و احترام کے ساتھ ساتھ تقدیم و تاخیر کا خیال بھی دربار ہی کے حسبِ مرتبہ و منصب نشستوں کے التزام کا عکس ہے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ جیسے توصیفی الفاظ، بزرگوں کا جنبش چشم و ابرو کے ذریعہ تحسین، بے کیف اشعار پر خاموشی اور طنز و تعریض کے لیے ایک باریک سی مسکراہٹ کا اظہار یہ سب اسی درباری تہذیب و آداب کے مظہر ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے 'دلی کا ایک یادگار مشاعرہ' میں نشست گاہ کے اہتمام اور دوسرے ادب و آداب کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ مشاعروں کے دربار سے گہرے تعلق اور جاگیردارانہ تہذیب کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہی وہ روایتیں تھیں جو عرب و ایران سے چل کر ہندوستان پہونچیں۔ چنانچہ بقول ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم صاحب:

" اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں میں ایرانی اور دیسی علماء و فضلاء اور ادباء و شعراء کی مجالس مشاعرہ کا رنگ شاہانہ ہوا کرتا تھا۔ مغلیہ دور کے فارسی شعراء کے حالات و کوائف پر مشتمل تذکروں میں دہلی کی شاعرانہ مجالس کا کوئی جگہ ذکر ملتا ہے۔ مؤلف تذکرۂ حسینی نے نواب ظفر علی خاں امیر عہد شاہجہانی کے مشاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں مرزا صائب، ابو طالب کلیم، مرزا [illegible] ابراہیم فارغ جیسے عظیم المرتبت فارسی شاعر [illegible]

مرزا محمد افضل نے تذکرۂ کلمات الشعرا میں قطب الدین مائل اور دانش مند خاں کے مشاعروں کا حال لکھا ہے سراج الدین علی خاں آرزو نے تذکرۂ مجمع النفائس اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے تذکرۂ گلِ رعنا میں فارسی مشاعروں کی بعض کلی اور جزوی مجلسوں کا ذکر کئی جگہ کیا ہے جن میں عرس مرزا عبدالقادر بیدل، مجلس میر افضل ثابت اور مرزا عبدالقادر وابستہ کے مشاعرے محمد شاہی عہد تک بڑی آب و تاب کے ساتھ ہوتے تھے۔" ۵۱

مرزا عبدالقادر بیدل کے عرس کے موقع پر منعقدہ مشاعروں کا ذکر اُردو کے مختلف تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم صاحب ہی کے بقول:

"مرزا عبدالقادر بیدل کے عرس کے موقع پر منعقد ہونے والا مشاعرہ دہلی کے ریختہ گو شاعروں کی اولین آماجگاہ تھی۔" ۵۲

محمد داؤد رہبر صاحب کا بھی خیال ہے کہ شاعروں کی باقاعدہ ابتدا سودا کے اوائل عمر میں ہوتی ہے۔ مرزا بیدل کے عرس کے مشاعروں کے سلسلے میں ہی سودا نے مولوی ندرت کی ہجو میں یہ شعر لکھا تھا۔

عرس میں جا میرزا بیدل کے تئیں باشتود
شعر ناموزوں و پوچ اس رات کو پڑھتا تھا جو

قیاس یہ ہے کہ یہ پہلا عوامی مشاعرہ تھا جہاں شعرا داد شعر کے علاوہ ناموری اور شہرت بھی حاصل کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی ادب و آداب کا خیال رکھا جاتا تھا تاہم متعدد شعرا ایسے بھی تھے جو اس طرح کے عوامی مشاعروں میں جانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے جتنے بھی مشاعروں اور مراختوں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے وہ اسی شان وضع داری کے پس منظر میں عموماً بند بیٹھکوں اور گھروں پہ ہوتے تھے جہاں شرکت محدود تھی اور ادب و آداب جزو غالب تھا۔ اس طرح کے ابتدائی شاعروں میں میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے مشاعرے اور مراختہ غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ قابلِ ذکر شعری اجتماعات ہیں۔ مگر ان کی نوعیت آج کل کے مشاعروں سے کچھ الگ تھی۔

محمد شاہ کے عہد سے قبل دہلی کے مشاعروں کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا

البتہ مشاعروں کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ۱۱۰۰ء میں ولی کے دیوان کی کثرت مقبولیت کا ذکر کیا ہے اور ان کو ایک تاریخی ضرورت کہا ہے[۵۳] ظاہر ہے کہ جب ولی کا کلام گلی گلی پڑھا، گایا اور سنایا جانے لگا تو اس کی صورت کوئی نہ کوئی ضرور ہوگی جہاں زیادہ نہیں تو دس بیس آدمی ضرور مل بیٹھتے ہوں گے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ:

"(اس عہد میں) شاعر بننے کا شوق لوگوں کے دلوں میں اس حد تک سرایت کر گیا تھا کہ جو شعر کہنے کی استعداد نہ رکھتے تھے وہ سرقہ سے کام لیتے تھے اور دوسروں کی غزلیں اپنے نام پر پڑھ دیتے تھے۔ مرزا قطب علی بیگ ایسے سرقہ پیشہ شاعر تھے۔ اسپرنگر نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ دوسروں کے شعر اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔ میر افضل علی نیاز کا نے تو سلیم کا پورا دیوان سرقہ کر لیا تھا اور مشاعروں میں ان کی غزلیں اپنی غزلیں کہہ کر پڑھتا تھا۔" ۵۴

شیخ چاند مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں "تذکرۂ مردم دیدہ" از حاکم لاہوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ مراختہ خان آرزو "ہر قمری مہینے کی پندرہ تاریخ کو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا کرتا تھا۔" آگے لکھتے ہیں کہ:

"معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے مراختے کا سلسلہ بند ہوا تو (درد نے) اپنے یہاں یہ صحبت گرم کی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد درد نے یہ محفل اپنے یہاں کی بالکل بند کر دی اور میر تقی میر سے کہا کہ ان کے یہاں یہ مراختے منعقد ہوا کریں۔ چنانچہ میر کے یہاں یہ صحبت گرم ہونے لگی۔ ان کے سوا میر نے اپنے تذکرے میں چند اور مراختوں کا ذکر کیا ہے۔ مراختہ میر سجاد، مراختہ جعفر علی خاں ذکی، مراختہ علی نقی وغیرہ۔" ۵۵

میر تقی میر نے نکات الشعرا میں اپنے مراختے اور خواجہ میر درد کے مراختے کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے:

"مجلس ریختہ کہ بہ خانۂ بندہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است [illegible] بندہ [illegible] [illegible] در ایں مجلس

برخاستن مشغول بودند۔" ۹

اور مصحفی نے بھی "دستور الفصاحت" میں اس کی تصدیق کی ہے اور قدرت اللہ قاسم نے ہر مجلس مشاعرہ کے انعقاد کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ،

"تمامی شعرائے دارالخلافہ دہلی سخنہائے ساختہ حاضری می آوردند۔" ۱۰

مجموعۂ نغز میں مراختۂ غلام ہمدانی مصحفی کا بھی ذکر ہے، "در زمانے کہ وارد حضرت دہلی یک چند طرح مراختہ بہ خانہ خود انداختہ" ۱۱

ریاض الفصحا میں مصحفی، جعفر کے بیان میں لکھتے ہیں:

"پسر کلاں ایں بزرگ مجلس مشاعرہ ترتیب دادہ۔

نظم ریختہ بہ سمع مبارک ایشاں می رسانید۔" ۱۲

اس کے علاوہ مختلف تذکروں میں ایسے تقریباً انیس مشاعروں کا ذکر ملتا ہے جو مختلف رئیسوں اور شاعروں کے یہاں منعقد ہوتے تھے۔ بہت سے رؤسا جو دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوئے اپنے ساتھ یہ روایت بھی لیتے گئے۔ ان مشاعروں کی نوعیت بھی کم و بیش یہی ہوتی تھی۔ مگر بیشتر شعرا اور ان کے شاگرد ان میں شریک ہوتے تھے۔ ان میں داد و تحسین کے علاوہ طنز و تعریض کے چھینٹے بھی اڑائے جاتے چنانچہ ایسے ہی ایک مشاعرے میں محمد امان نثار نے میر کے اژدر نامہ کے جواب میں یہ شعر کہا تھا۔

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

قیاس کہتا ہے کہ ان میں اساتذہ اور ان کے شاگردوں کے علاوہ شاعروں خصوصاً میزبان شاعروں کے احباب یا مہمان بھی شریک ہوتے ہوں گے اور وہ اہلِ علم بھی جن کی شہر میں دھوم ہوتی ہو گی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے ۱۲۶۱ھ کے کچھ خیالی، کچھ واقعی یادگار مشاعرے میں، گلی کوچوں میں اس مشاعرے کی شہرت، قلعۂ معلی سے شاہزادوں کے گروہ کی آمد اور مولوی مملوک العلی جیسے اہل علم کی موجودگی اس بات کی گواہی دیتی ہے مگر ادب و آداب اور رکھ رکھاؤ کے یہ مشاعرے بہر حال خصوصی ہوتے تھے، اس لیے کہ یہ عموماً شرفاء اور رؤسا کے گھروں پر ہوتے تھے اور ان میں بلا کسی واسطے کے ہر شخص کی شرکت تحفظ کے خیال سے بھی پسندیدہ نہیں تھی اور جاگیر داری نظام کی طبقاتی حد بندیوں کے پیش نظر اس کا امکان کم تھا۔ ان مشاعروں میں وہ شعرا زیادہ کامیاب اور سرخرو ہوتے تھے جو اپنی بدیہہ گوئی، عروضی واقفیت اور اساتذۂ قدیم (بیشتر فارسی اکثر اردو) کے اشعار سے سند پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ورنہ ذرا سی شعری کوتاہی شخصیت کو کرکرا اور علمی دراز دستی کو گھٹا دیتی تھی۔ ان میں کبھی کبھار نوک جھونک، ٹوکا ٹوکی اور ہجو تک کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ مگر جیتی انھیں کی تھی جو اپنی بات کے لئے جواز بھی رکھتے تھے مگر بہر حال جو بھی ہوتا تھا علمی اور مہذب انداز سے ہوتا تھا۔ آج کل کی طرح نہ تو ہوٹنگ ہی ہوتی تھی اور نہ تالیاں ہی پٹتی تھیں۔ پسندیدہ اشعار کے لیے سبحان اللہ، جزاک اللہ اور مرحبا کہے جاتے تھے۔ ناپسندیدہ اشعار پر خاموشی اختیار کی جاتی تھی۔ حظ اور تفریح سے زیادہ لوگ ان مشاعروں سے بہت کچھ سیکھتے اور اپنے علم میں اضافہ ہی کرتے تھے۔

دہلی کی سیاسی تباہی اور معاشی ابتری کے بعد جب دہلی کے بیشتر شعرا لکھنؤ گئے تو انھوں نے وہاں کی شعری اور علمی فضا میں خاصی گہما گہمی پیدا کی۔ مگر چوں کہ وہاں کے بیشتر مشاعرے رؤسا اور شرفا کے منعقد کردہ تھے اس لیے ان میں بھی کم و بیش وہی کیفیت اور ان کی بھی کم و بیش وہی نوعیت تھی جو دہلی کے مشاعروں کی تھی البتہ انشا، عظیم بیگ اور مصحفی کے شاعرانہ مجادلوں کی نوعیت کچھ دوسری تھی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ پہل کس نے کی تھی لیکن یہ بات طے ہے کہ ہجو گوئی اور عریاں نگاری میں سبھی ملوث تھے۔ اس کے باوجود ان میں شعرا کی بدیہہ گوئی، اسناد کی بہم آوری، ان کی برجستہ گوئی کی خوبیاں بڑی واضح ہیں۔ ان سے اردو شاعری کے خزانے میں جدت تشبیہ، ندرت، استعارہ اور تلاش الفاظ تازہ کی صورت میں کافی اضافہ ہوا مگر چوں کہ بیشتر مشاعروں کا تعلق درباری انداز و مزاج سے تھا اس لیے ان میں بھی نشست گاہ کے اہتمام اور رکھ رکھاؤ، ادب و آداب اور تقدیم و تاخیر کے لحاظ پر زیادہ زور ملتا ہے۔ خم خانۂ جاوید، مجموعۂ نغز، ریاض الفصحا، دستور الفصاحت اور آب حیات وغیرہ میں بہت سے مشاعروں اور ان کی کیفیت کی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں۔ ان ہی سے کم سے کم ایسے دس مشاعروں

کلپتہ چھپتا ہے جو خاصے مشہور تھے۔

(١) مرزا سلیمان شکوہ کا مشاعرہ (٢) مشاعرہ مرزا رضا علی بیگ آشفتہ (٣) مشاعرہ مرزا حیدر خلیل (٤) مشاعرہ حسین علی خاں اثر (٥) مشاعرہ لالہ سرتی لال (٦) مشاعرہ قمر اللہ قمر (٧) مشاعرہ مرزا جعفر (٨) مشاعرہ نواب آغا میر (٩) مشاعرہ نواب سید محمد خاں رند، اور (١٠) مشاعرہ مرزا شناور۔

اسی طرح کے مشاعرے فیض آباد، بریلی، احمد نگر، فرخ آباد رام پور، عظیم آباد، مرشد آباد، حیدر آباد اور الہ آباد وغیرہ شہروں میں بھی منعقد ہوتے تھے۔ ان مشاعروں میں کم و بیش تکلفات بڑھ ہی گئے تھے اور دلی کی سادگی بھی لکھنؤ کی پرکاری میں بدل گئی تھی، ان میں تفریح اور حظ کا عنصر بھی نمایاں تھا مگر ادب و آداب، تکلف اور رکھ رکھاؤ بڑے چھوٹے اور استاد شاگرد کا لحاظ بھی خاصا نمایاں تھا۔ برجستہ گوئی اور رعایت لفظی کا خوبصورت سے خوبصورت تر التزام سرخروئی کی ضمانت تھا۔ دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کے مشاعرے اور ان کے طور طریقے نسبتاً بعد کے مشاعروں میں فقرے بازی، گروپ بندی، جملہ تراشی اور تحسین و تعریض کے مختلف پہلوؤں کی بنیاد نظر آتے ہیں۔ مصرعہ طرح کا رواج بھی ہو گیا تھا اور کم و بیش انیسویں صدی کے نصف آخر تک اسی طرح کے مشاعروں کا رواج تھا۔ اگرچہ 'ریاض الفصحا' کے مطابق شیخ مغل خانی نے ایک مجلس مشاعرہ کی بھی بنیاد ڈالی تھی جو بعد میں چل کر ادبی نشستوں کی صورت اختیار کر گئی۔ ان مشاعروں کی مشہور غزلیں اور اشعار گلدستوں کی صورت میں شائع بھی کیے جاتے تھے۔

١٨٧٤ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام 'مناظموں' کی بنیاد پڑی تھی۔ حالی اور آزاد نے ہیئت اور مرصع سازی سے زیادہ موضوع اور سادگی پر زور دیا جس میں دل فریبی سے زیادہ واقعیت کی کیفیت تھی، ان میں نظموں، رباعیات، قطعات اور نظم نما مثنویوں پر زور رہا۔ انجمن پنجاب کے ان موضوعی مشاعروں کا سلسلہ ١٨٨٣ء تک چلتا رہا اس طرح کے مشاعروں کی تحریک سب سے پہلے کرنل ہالرائیڈ کے کہنے پر محمد حسین آزاد نے شروع کی۔ انھوں نے پہلی بار ١٨٦٧ء کے اپنے ایک مضمون "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" سے اس کی ابتدا کی۔ اس کے علاوہ بھی آزاد نے رسالہ "انجمن مفید عام قصور" کی مختلف اشاعتوں میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اس طرح کی 'مجلس مناظمہ' کی صدائے بازگشت 'نظم سوسائٹی'، میرٹھ اور دہلی لٹریری سوسائٹی'، دہلی کی مختلف نشستوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد اور دوسرے شہروں میں بھی اسی طرح کے نظم گوئی کے مشاعرے ہونے لگے۔

ان مشاعروں میں پہلی بار روایتی مشاعروں سے ہٹ کر شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہل علم کے ذریعے اظہار خیال اور پھر ایک ہی موضوع پر مختلف شعراء کی نظم خوانی کی صورت ملتی ہے۔ گویا ان مجالس کا رنگ ادبی نشستوں جیسا تھا، جن میں نہ تو پہلا سا رکھ رکھاؤ اور ادب و آداب کی صورت ہے اور نہ دربار اور رؤسا کے تعلق سے جاگیردارانہ رنگ و روغن ہی۔ شرکاء بھی بیشتر وہ ہیں جو اہل علم ہیں۔ مسابقت اور نوک جھونک کا انداز بھی نہیں اچھے شعر پر واہ وا اور بے کیف شعر پر خاموشی نظر آتی ہے۔ زیادہ تر پوری نظم کے بعد مجموعی تاثر پر اظہار خیال ملتا ہے۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ نشستوں کی صورت حال سے اس کی بھی غمازی ہوتی ہے کہ ان میں بعض مدعو حضرات ہی شریک ہوتے تھے۔ مگر آغا محمد باقر کے ایک مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

"ہفتے کے دن شام کے وقت مکان انجمن میں ہفتہ وار ایک علمی لیکچر اور مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ اس میں اہل فضل و کمال اور طلباء بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اوسط حاضری ایک سو کے قریب ہوا کرتی تھی۔" ٣

اس طرح خصوصی مشاعرے ادبی نشستوں سے آگے بڑھ کر عوامی ہو چکے تھے اور دھیرے دھیرے مشاعروں کے جاگیردارانہ خدوخال کی جگہ جمہوری نقش و نگار لے رہے تھے اور قدیم ادب و آداب، اہتمام و التزام نئی جہتوں میں رواں دواں ہونے لگے تھے۔

اگرچہ اس مجلس مناظمہ اور موضوعی مشاعروں کا رواج فوری طور پر عام نہ ہو سکا تھا اور مجلس مقابلہ بھی بہ پہلو منعقد ہوتی رہی۔ فرحت اللہ

غیر طرحی مشاعروں اور گلدستوں کا بھی رواج ہوا۔ اگر ایک صورت ضرور تھی پیدا ہوئی کہ مشاعروں اور مناظموں میں شرکا کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور وہی مشاعرے جو پہلے درباروں سے متعلق تھے، گھروں اور حویلیوں سے ہوتے ہوئے انجمنوں سے دفاتر تک وسیع ہو گئے۔ اور شاعروں کے ساتھ ساتھ صفِ سامعین بھی آراستہ ہونے لگی۔ مشاعروں کے اس سفر میں ان کے تزک و احتشام اور انداز و مزاج میں بھی فرق آتا گیا۔ کم سے کم مجادلوں، نوک جھونک اور ہجوگوئی کا زور کم ہوگیا۔ شاعرانہ چشمک اور پردے پردے میں طنز و تعریض، فقرے بازی اور بذلہ سنجی البتہ باقی رہی۔ اگرچہ اس انداز میں بھی کبھی کبھی بدمزگی کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر مختلف اہلِ فکر اس پہلو کی اصلاح کی کوششیں کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں حامد اللہ افسر مرحوم کا ایک مضمون نومبر ۱۹۲۸ء کے "زمانہ" کانپور میں مشاعروں کی اصلاح کے عنوان سے چھپا، جس میں اصلاح کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

مشاعروں کے ارتقا کے سلسلے میں دو تین چیزوں کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے ان کے فروغ میں مدد دی۔ ایک محفلِ سماع، دوسری مثنوی اور واسوخت خوانی کے عوامی اجتماعات اور تیسری مجالسِ عزا یا مراثی کی مجلسیں۔ اگرچہ ان محافل کا مشاعروں سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ ان کا تعلق شعر خوانی سے ہے اور عام لوگ بھی ان سے متعلق ہیں، اس لیے قیاس یہ ہے کہ ان محافل نے مشاعروں سے عوام کی دلچسپی بڑھانے میں مدد دی ہوگی۔ محافلِ سماع عموماً عرسوں یا خانقاہوں تک محدود تھیں اور چونکہ ان کا تعلق حیات و موت اور حاضر و غائب دونوں ہی صورتوں میں کسی صاحبِ حال بزرگ سے ہوتا تھا، اس لیے ان کی ایک خاص نوعیت تھی۔ ان میں غزلیں، گیت اور دوہے وغیرہ پڑھے جاتے تھے، قول و قلبانہ سے ابتدا کی جاتی تھی اور کبھی کبھی ایک قوال اور بیشتر صورتوں میں متعدد قوالوں کی شرکت سے ان محافل میں حال پیدا کرنے اور عوام اور بزرگ کی خوشنودی حاصل کرنے کے جذبے کے سبب مسابقت کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ بعد میں سماع کی یہی محافل قوالی کا رنگ اختیار کر گئیں اور نعت و منقبت کے ساتھ ساتھ غزلیں اور عاشقانہ شعر خصوصاً سفلی خیز اشعار بھی شامل ہو گئے اور جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے برگ و ساز کا استعمال بھی عام ہو گیا اور گلے کے سوز و گداز کی جگہ اچھل کود بھی شروع ہو گئی۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بزرگوں کی محفلِ سماع میں برگ و ساز کی مناہی تھی۔ اگرچہ کچھ کے یہاں کچھ پابندیوں کے ساتھ اجازت ملتی ہے —— بہرحال کسی بزرگ کی موجودگی یا صاحبِ قبر کے رعب و جلال کے سبب یہ کیفیت قطعی نہیں تھی جو آج کی محافلِ قوالی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن بہرحال ان سے مشاعروں کے عام ہونے میں مدد ملی۔ شیخ نظام الدین اولیا کی محفلِ سماع اور ان میں امیر خسرو کی غزلوں کے پڑھے جانے کا حال معلوم ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل کے عرس کے موقع پر یہ محافل ضرور ہوتی ہوں گی جن سے کھلی محفلِ مشاعرہ کے انعقاد میں مدد ملی۔ لکھنؤ میں درگاہ حضرت عباس اور شاہ مینا کے عرس اور بعد میں نوچندی کے میلے کے موقع پر مشاعروں کے انعقاد کی بات بھی عام ہے جس کا ثبوت اب بھی نوچندی کے مشاعروں سے ملتا ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے عوامی اسٹیج کے سلسلے میں اندر سبھا سے پہلے لکھنؤ میں مثنوی اور واسوخت خوانی کی عوامی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ ان محفلوں میں مثنوی خواں کے لہجے کے اتار چڑھاؤ، اعضا کی جنبشیں اور حرکتیں مثنوی کے قصے کو اس کے کرداروں کے رول سے ہم آہنگ ہونے میں مدد دیتی تھیں۔ محفلیں عموماً کھلے بندوں ہوا کرتی تھیں جن میں عوام کثرت سے شریک ہوتے اور اپنی شاموں کو پُرلطف بناتے۔ ان محافل خصوصاً محافل سماع میں ترنم اور دھن کے ساتھ پڑھنے نے مشاعروں میں بھی ترنم کو رواج دینے میں مدد دی۔ اس لیے کہ جیسے جیسے مشاعرے عوامی ہوتے گئے، سامعین کی خوشنودی اور داد وصول کرنے کے نئے نئے طریقے بھی ایجاد ہوتے گئے۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے مشاعروں کے انعقاد کی وجہوں پر روشنی ڈالتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:

"چونکہ ہندوستان میں اب تک چھاپے خانے قائم

منعقد ہوتے تھے اس لیے شعرا کے پاس سوائے مشاعروں یا ادبی محفلوں کے اور کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے وہ اپنا کلام دوسروں تک پہونچا سکیں۔ مشاعرے جہاں ایک طرف صلاحیت و استعداد کے اظہار کا میدان تھے دوسری طرف گرمیِ محفل، لطف، بہجت اور انبساطِ خاطر کا وسیلہ بھی تھے۔ مشاعروں میں کلام کی داد و تحسین کے ساتھ ساتھ تنقیص و تنقید کا کام بھی ہو جاتا تھا جس سے شعرا کو اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح مشاعروں نے نہ صرف اُردو شعر و شاعری کو عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا بلکہ اصلاحِ سخن و زبان کے سلسلے میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ تذکروں میں اس دور کے جن مشاعروں کا ذکر ملتا ہے ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر وہ ہیں جو مرزا بیدلؔ کے عرس کے موقع پر یا پھر خان آرزوؔ، خواجہ میر دردؔ یا میر تقی میرؔ وغیرہ کے گھروں میں منعقد ہوتے تھے۔“ ؎۱۵

مراثی کی مجلسیں یا محافلِ عزا میں اگرچہ مذہب اور بُکا کا رنگ غالب تھا۔ مگر مراثی کی سنجیدہ بیانی کے ساتھ فقروں کی چستی، تشبیہوں کی ندرت، استعاروں کی جدّت، فصاحت و بلاغت کے نت نئے رنگوں نے جس بلندی کو چھو لیا تھا، ذوقِ ادب رکھنے والوں کے لیے بھی تسکین کا سبب تھا اور ان کی تاریخی حقیقت، غم انگیزی اور نت نئے واقعات کا بیان اہلِ علم کے شوق کو بھی مہمیز کرتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ عوام و خواص کی اس میں شرکت اور مرثیہ نگاروں اور مرثیہ خوانوں کی شہرت و عزت بھی مشاعروں کو عوامی ہونے میں مدد دیتے ہوں گے۔

مشاعروں کے عوامی اور جمہوری نقش و نگار نے ان کی مقبولیت اور ان کے واسطے سے اُردو زبان کی ہر دلعزیزی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ اردو زبان اور اس کی تہذیب کی علامت بن گئے۔ خصوصاً ترنم کے رواج نے ان کو اور بھی عوام پسند بنا دیا۔ اگرچہ اس سے مشاعروں کی علمی اور ادبی قدر و قیمت میں سوائے کمی کے اور کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

مشاعروں کا یہ پہلو بھی قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے سیاست میں دخیل ہو کر تحریکِ آزادی اور دوسری اہم سیاسی تحریکوں میں اپنا رول نمایاں طور پر ادا کیا۔ چکبستؔ، اقبالؔ، آغا حشرؔ اور ظریفؔ لکھنوی وغیرہ نے شعر و سیاست کو ہم آمیز کر کے سیاسی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کی۔ جگرؔ مرادآبادی، حفیظؔ جالندھری، سائلؔ دہلوی اور آلِ رضا وغیرہ نے ترنم کے ساتھ شعر پڑھنے کا انداز اس قدر مقبول بنا دیا کہ بعض شعرا جو ترنم سے شعر نہیں پڑھ سکتے تھے دوسروں سے اپنی غزلیں پڑھوانے لگے۔ مثلاً اصغرؔ گونڈوی کی غزل جگرؔ مرادآبادی اور آرزوؔ کی آرام لکھنوی پڑھا کرتے تھے۔ شعر و سخن کی انجمنوں کا دائرہ پورے ملک میں اس قدر وسیع ہو گیا گویا ایک جال سا بچھ گیا ہو۔ مختلف ادبی انجمنوں کے مابین مقابلوں اور سابقوں نے بھی مشاعروں کے فروغ میں حصہ لیا۔ شہرت، عزت اور کسی حد تک پیسے حاصل کرنے کے لئے نوآموز شعرا بھی کسی نہ کسی طرح ان میں پہونچنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں معاملہ کبھی کبھی الٹا بھی ہونے لگا تو انھوں نے مختلف اساتذہ کے دامنِ تربیت میں پناہ لینی شروع کی۔ سیمابؔ، ناطقؔ گلاوٹھوی اور جوشؔ ملسیانی وغیرہ نے اس سلسلے میں کافی اہم رول ادا کیا۔ ان کے ذریعے سے زبان و بیان، عروض و قوافی، بیان و بدیع اور دوسرے نکاتِ سخن سے نوآموز آشنا ہونے لگے۔

جہاں تک ترنم کی ابتدا کا سوال ہے تو مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے خیالی مشاعرے میں حکیم مومن خاں مومنؔ کے سر یہ سہرا باندھا ہے، مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض کے نزدیک سائلؔ دہلوی نے اس کی ابتدا کی اور بعض کے خیال میں ڈاکٹر اقبالؔ نے اس بدعتِ حسنہ کو رواج دیا۔ بہرحال ابتدا کسی نے کی ہو، مشاعروں کی ادبی قدر و قیمت پر بُرا اثر پڑا اور ان محافل کا جو علمی اور ادبی رنگ تھا، پھیکا ہو کر تفریح و تفنن تک محدود ہو گیا۔ اس کے علاوہ جمہوری قدروں کے فروغ کے سبب ان میں عوام کو اتنا دخل ہو گیا کہ وہ اگر چاہیں تو مشاعرے کی کامیابی بلکہ کبھی کبھار انعقاد بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض جگہوں کے مشاعرے اتنے مشہور ہوئے کہ کہتے ہیں کہ جو شاعر اس مشاعرے سے پار اتر گیا وہ ہر جگہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ان چیزوں نے اب تربیت یافتہ عوام کو قابو

میں پہ کچھ وقت سے جا بیجا نظامت نے شاعروں کو پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ہر لطیفے، اشعار اور چٹکلے سنا کر ان کو خوش رکھتے ہیں اور اپنی لیاقت سے مشاعرے کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس سلسلے کی بہت سی باتیں معدودہ شاعروں کے بارے میں کہی جاتی ہیں مگر اس وقت ان ساری باتوں کو نظر انداز کر کے صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ اُردو زبان کے فروغ میں ان کا بہت اہم حصّہ ہے۔ خصوصاً آج کے زمانے میں۔ اور ابتدا سے اب تک انھوں نے جو رول ادا کیا ہے اُردو زبان و ادب کی تاریخ ان کو فراموش نہیں کرسکتی۔

□□

حواشی:

۱ یہ بات صحیح نہیں کہ دلی کے مشاعروں میں صرف شعراء شرکت کرتے تھے بلکہ ان میں شاگردوں کی شرکت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۲ "اردو شاعری میں مقابلوں کی روایت" سہ ماہی اُردو کراچی اپریل، جولائی ۱۹۵۰ء جلد ۲۶ شمارہ ۳-۲ ص ۱۹۲

۳ بحوالہ مشاعروں کی روایت، از محمد داؤد رہبر، رسالہ اُردو دہلی اپریل ۱۹۴۵ء جلد ۲۵ شمارہ ۲ ص ۱۲۷

۴ مضمون "ادبی اور تاریخی پس منظر" مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ساتویں جلد اردو ادب (دوم) پنجاب یونیورسٹی مطبوعات طبع اوّل ۱۹۷۱ء ص ۵۱ (مضمون)

۵ ایضاً ص ۵۲

۶ دلی کا دبستان شاعری ص ۳۵

۷ دلی کے اٹھارھویں صدی کا شاعرانہ ماحول۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور ص ۳۰

۸ مضمون "شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتداء و ترقی" رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۵ء ص ۵۱۸

۹ نکات الشعراء ص ۱۲۸

۱۰ دستور الفصاحت ص ۲۸

۱۱ مجموعۂ نغز ج ۲ ص ۱۸۹

۱۲ ریاض الفصحا ص ۶۹

۱۳ مرحوم [illegible] پنجاب [illegible] جلد ۲۰ فروری ۱۹۳۷ء شمارہ [illegible]

۱۴ مضمون "سیاسی، تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر" ص ۲۲-۲۱ مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد ۶ اردو ادب (دوم) پنجاب یونیورسٹی لاہور طبع اول ۱۹۷۱ء

غزل

دل میں اللہ اللہ رکھنا
ذکرِ خدا سے زندہ رکھنا

اپنا زہد اور اِتقا
اپنا اپنا نقشہ رکھنا

جیسے مہکیں غنچے سب
ورد زباں پہ کلمہ رکھنا

اپنا اپنا عشق سجود
اپنا اپنا منصب رکھنا

پاسِ ذہن و پاک لباس
مسجد سا پاکیزہ رکھنا

روضے کی تصویر جو اُبھرے
نم کجھور کا سایہ رکھنا

دو دو لفظ دُعا کے بول
ہاتھ کو مثلِ کاسہ رکھنا

اسمِ محمد سب سے اعلا
ارفع ارفع ارفع رکھنا

یادِ نبیؐ میں جم کر اختر
روشن روشن جلوہ رکھنا

اختر عمر اختر
۱۴۸/۳۳۵، محمود نگر، لکھنؤ

اشک ریزیاں

یہ اشک ریزیاں،
کہ جن کی شرح کیلئے مجھے، کبھی نہ لفظ مل سکے
علامتیں نہ مل سکیں
کنائے بھی نہ مل سکے
مری ہر ایک سانس میں بچھا گئی ہیں موگرے
کوئی اذیتوں کا پل
مرے ہی لاشعور کی رگوں میں نو ربار ہو
کسی کی چاہتوں کا ایک شوخ مرغزار ہو
کسی کی سازشوں کے سلسلوں کا شاہکار ہو
یا مری ہی بے نیازیوں کا شاخسار ہو
یہ طے نہیں
یا مری ہی ذات میں شباب رُت کی ضرب ہو
کسی کی مہربانیوں سے جو ملا تھا ایک دن
اسی شفیق بان کا ہی عطر پاش کرب ہو
خبر نہیں،
مگر یہ اشک ریزیاں
مرے دروں کی ہر گلی میں تازگی کے سلسلے
بکھیر کرنے سنگار بھر رہی ہیں روز و شب

میں ایک بے گیاہ دشت میں ہوں
تم تو یہیں ہو کہیں
یہاں کی چاندنی میں وہ گلاب کروٹیں کہاں؟
یہاں کی دھوپ میں بھلا وہ گرم آہٹیں کہاں؟
یہاں صبا کے لمس میں بھلا گھلاوٹیں کہاں؟
پتا نہیں
تمھیں نے میرے جال میں رو پہلی مچھلیوں کے ڈھیر
بھر دیئے تھے ایک شب
تمھیں نے جگمگاتے موتیوں سے میری کشتیاں
بھری تھیں جھوم جھوم کر
تمھیں نے ان ہتھیلیوں میں اپنی شوخ انگلیوں کے
رنگ زار حل کیے تھے ایک دن
تمھیں تو یاد بھی نہیں
گھنیری چھاؤں کے درمیاں سنہری ریت پر
کئی شبیں تمھاری دھڑکنوں میں چاند ہو گئیں
تمھیں تو یاد بھی نہیں
کہ بھاگتی ہواؤں میں ندی کے بازوؤں پہ
میرے ساتھ ساتھ خوشبوئیں،
تمھیں بھی ایک چھپی امنگ میں ڈبو گئیں
تمھیں تو یاد بھی نہیں
کھلی کنار سیپیوں پہ میرے پاؤں کا لہو
تمھاری اوڑھنی میں جذب ہو گیا تھا ایک دن
بھلا سکیں گی کس طرح بھلا
یہ اشک ریزیاں

□□

عنبر بہرائچی

۲۔ اے ڈی ایم کمپاؤنڈ
دھونا پور
عتاسا گڑھ

وہ برگدوں کی چھاؤں، میرے ہاتھ سے نکل گئی
وہ آبشار کے لطیف زمزمے بچھڑ گئے
ہرن کی شاہ راہ جانے کن بنوں کی سمت مڑ گئی

التوا

ایک ہمدم دیرینہ کی بیماری سے متاثر ہو کر، جو پچھلے کئی ماہ سے گردے کی تکلیف کے باعث ڈائلیسز کا محتاج ہے۔

موت اس کے سامنے تھی!
اور وہ ٹوٹا ہوا سا شہ زور اس کو
جُل پہ جُل دینے کی خاطر
ڈھونڈھتا پھرتا تھا جینے کے بہانے!

لیکن
اس کے دل میں بیٹھا "چور"
یہ بھی جانتا تھا
ختم ہو جائے گی اک دن
اس کے جُل دینے کی قوت
اور اسکے جسم کی گرتی ہوئی دیوار جس کو
وہ بزورِ حیلہ سازی
آج تک تھامے کھڑا تھا
کل متاعِ خاک ہو گی!!

□□

یوگندر بہل تشنہ

۲۰۶۔ پی ڈی چیمبرس
۴۴ سرا رشی بندھو گپتا روڈ،
قرول باغ۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۰۵

مختصر افسانہ

دلیپ سنگھ

[illegible] نئی دہلی

۱۱۰۰۶۰

تفتیش

کچھ دن پہلے کی بات ہے میں کسی تقریب کے سلسلے میں اپنے چچا جان کے گھر پہ تھا۔ وہاں میری نظر ایک ایسی عورت پر پڑی جو عمر کی تو کچھ زیادہ تھی لیکن اس کے نقش و نگار میں اتنی جاذبیت تھی کہ ایک نظر دیکھنے کے بعد اسے پھر دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہو جاتی تھی۔

میں جب اسے دوسری بار دیکھ رہا تھا تو میرے چچا نے میری اس حرکت کو دیکھ لیا اور کہنے لگے۔ باز آجا برخوردار۔ اس عمر میں تمہیں ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ میں جھینپ گیا اور کہا۔ چچا جان ایسی کوئی بات نہیں میں تو اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ چچا کہنے لگے: ضرور دیکھا ہوگا برخوردار۔ میرے یار سوہن لال کی بیٹی سشما ہے۔

مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ چچا کا یار سوہن لال کون ہے اور اس کی کوئی بیٹی بھی ہے جس کا نام سشما ہے۔ لیکن چچا کے اس جملے میں مجھے راز نظر آیا۔ میں نے کہا۔ "اچھا سوہن لال جی کی بیٹی سشما ہے۔ تبھی تو میں کہوں کہ اسے میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔"

چچا مجھے بچپن سے جانتے ہیں اس لیے میرا جھوٹ پکڑنے میں انہیں زیادہ وقت نہیں ہوتی اور جب پکڑ لیتے ہیں تو میری پیٹھ پہ پیار سے ایک دھول جما دیتے ہیں چنانچہ انہوں نے دھول جمائی اور کہنے لگے کہ گدھے میں جانتا ہوں کہ تم آج سے پہلے سشما سے کبھی نہیں ملے۔ آؤ میں تیرا تعارف اس سے کرواؤں۔ میں جانتا ہوں کہ خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر تمہارے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اسے اس حالت میں [illegible] [illegible]

کھسیانا ہو کر کہا۔ چچا جان ماننا پڑے گا کہ آپ بہت محبت کے آدمی ہیں چچا میری بات سن کر بولے مجھے یہ ماننے میں کوئی اعتراض نہیں اگر تم بھی یہ مان لو کہ تم نہایت دل پھینک آدمی ہو۔ چچا کو جھوٹا ثابت کرنے کی چونکہ میرے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی اس لیے میں نے ان کی بات مان لی۔ چچا نے اسی وقت میرا سشما سے تعارف کروا دیا۔ میں نے اس تعارف کا فائدہ یہ اٹھایا کہ پوری تقریب کے دوران سشما کے ساتھ والی کرسی پر اپنے سوائے کسی اور کو نہ بیٹھنے دیا۔

سشما کون ہے یہ بتانے سے پہلے میں آپ کو اپنے چچا سے ملوانا چاہوں گا۔

میرے چچا ۵۸ سال کی عمر میں ریٹائر ہو گئے تھے۔ اس میں بظاہر کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ تمام سرکاری ملازم اٹھاون سال کی عمر پہ ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ حیرانی کی بات اگر تھی تو بس یہ کہ چچا سرکاری ملازم نہیں تھے دلّی کے چاندنی چوک میں ان کی اپنی دوکان تھی جہاں وہ موٹروں کے پرزے فروخت کیا کرتے تھے۔ چچا اپنے اٹھاون ویں جنم دن پر صبح کی طرح صبح دوکان پر گئے اور ایک گھنٹے میں دوکان بیچ، سامان بیچ کر گھر لوٹ آئے اور آکر اعلان کر دیا کہ وہ ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ہم سب نے بہتیرا سمجھایا کہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کی مجبوری صرف سرکاری ملازموں پہ عائد کی گئی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ بھی کبھی ریٹائر نہ ہوں۔ بیوپاری اور سیاستدان ریٹائر نہیں ہوا کرتے۔ لیکن چچا کسی سے مس نہ ہوئے [illegible]

[illegible] ہو سکتا یہ

بھلا ایک دن چچا اپنے گھر کے صحن میں دھوپ سینک کر اپنے چارپائی پر بیٹھے سے وہ صبح سویرے اٹھ جایا کرتے بیٹھ رہتے۔ بے وقت چائے کا مطالبہ کرتے رہتے اور بہت سی باتیں بیگم سے ڈانٹ کر رہتے۔ لیکن ایک بیٹے میں حالت یہ ہو گئی کہ چچی سے بھی ڈانٹ کھانے لگے کوئی معقول وجہ نہیں تھی تب انھیں خیال آیا کہ ریٹائرمنٹ میں وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ تو انھوں نے ایک بھینس میں ہی کر لیا ہے۔ باقی کی ریٹائرمنٹ کیسے کٹے گی۔

بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ کچھ کرنا چاہئے لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کریں۔ خیر سے ان کے پانچ بیٹے تھے۔ عام طور پر والدین اپنے بیٹوں کے لیے مناسب دلہنوں کی تلاش کرتے ہوتے اور پھر بہوؤں کی گھڑکیاں سنتے ہوئے عمر گزار دیتے ہیں لیکن چچا جان کے حصے میں یہ نوبت نہیں آئی تھا۔ وہ اپنے پانچوں لڑکوں کی شادی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ پانچوں لڑکے اپنی بیویوں کے ساتھ الگ الگ گھروں میں رہتے تھے اور الگ رہنے والی بہوئیں عام طور پر ساس سسر کے ساتھ الجھنے میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اچانک چچا کو خیال آیا کہ اپنے بیٹوں کے لئے بیویاں ڈھونڈتے ہوئے انھیں شادیاں کروانے کا جو تجربہ ہو چکا تھا اس کا فائدہ اٹھایا جائے اور وقت گزاری کے لیے اس شغل کو اپنا لیا جائے اس طرح وہ خدمت خلق بھی کریں گے۔

چنانچہ چچا جان خدمت خلق میں لگ گئے۔ اس کام میں کوئی برائی نہیں تھی۔ برائی تھی تو بس اتنی کہ چچا نے کبھی، مناسب رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شادی کے لیے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے بس ان کی شادی ہو جائے تو وہ خود بخود ایک دوسرے کے لیے مناسب بن جاتے ہیں۔

میں چونکہ ان دنوں کنوارا تھا اس لیے چچا نے میرا نام بھی اپنی لسٹ میں لکھ لیا اور میرے لیے رشتے تلاش کرنے لگے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے ایک لڑکی دکھائی جو بہت موٹی تھی۔ میں نے جب چچا سے اس امر کی شکایت کی تو کہنے لگے بھائی کیا ہے بیٹا گھر کی لڑکی ہے اس کی صحت اچھی ہے تمہارے یہاں آ کر جب فاقے کرنے پڑیں گے تو خود بخود مناسب سائز کی ہو جائے گی۔ پھر ایک بار انھوں نے مجھے ایک لڑکی دکھائی جو بہت دبلی تھی جب میں نے اعتراض کیا تو کہنے لگے کہ بیٹا شادی کا فیصلہ کیا ہے تو فکر

کہا سمجھا رہے ہیں۔ شادی ہو جائے گی تو اس کا موٹا ہو جانا یقینی ہے کہ ہر لڑکی شادی کے بعد کچھ اور ہو یا نہ ہو موٹی ضرور ہو جاتی ہے۔

چچا اسی طرح کی کینائیں مجھے دکھاتے رہے اور میں پہلو بچا کر نکلتا رہا لیکن ایک دن انھوں نے مجھے فون کیا کہ فوراً ان کے ہاں پہنچوں جہاں ایک مناسب رشتہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں جب ان کے ہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کا نام سوہن لال تھا چچا کے ساتھ چائے پی رہا تھا یقیناً وہی شخص میرا سسر بننے کی امید رکھتا تھا۔

سوہن لال جی کے ساتھ ان کی بیٹی تو نہیں تھی لیکن وہ خود اتنا خوبصورت آدمی تھا کہ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ایسا شخص صرف حسین بیٹیاں ہی پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ شادی کروں گا تو صرف سوہن لال جی کی بیٹی کے ساتھ۔

چچا نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سوہن لال ان کے پرانے دوست ہیں اور پولیس میں ڈپٹی ایس پی ہیں۔ تعارف کرانے کے بعد چچا نے سوہن لال جی سے کہا۔ سوہن لال میرے بھتیجے سے جو پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو انٹرویو کے لیے تیار کیا اور سوہن لال جی سے کہا فرمائیے۔

سوہن لال جی نے پوچھا۔ تمہارے والد کا نام رام لال تھا۔ میں نے کہا جی۔ یہ سنتے ہی سوہن لال نے اپنے تھیلے میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا۔ اس پر میرے والد صاحب کا نام لکھا اور اس کے نیچے دو لکیریں کھینچیں بالکل ویسے جیسے شجرۂ نسب بناتے ہوئے کھینچی جاتی ہیں۔ پھر بولے۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک بسنت کور کے ساتھ دوسری درگا دیوی کے ساتھ۔ درست ہے؟

میں نے کہا جی بالکل درست ہے۔ وہ کیا ہوا کہ میری پہلی ماں۔۔

سوہن لال نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ کرا دیا اور شجرۂ نسب میں میرے والد کے نام کے نیچے جو دو لکیریں کھینچ چکے تھے ان کے نیچے میری دونوں ماؤں کے نام لکھے۔ بسنت کور کے نام کے نیچے انھوں نے ایک اور لکیر کھینچی اور درگا دیوی کے نیچے آٹھ۔ پھر پوچھا۔ یہ ٹھیک ہے نا کہ بسنت کور سے ایک اولاد ہوئی اور درگا دیوی سے آٹھ؟

میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔

سوہن لال نے کھینچی ہوئی لکیروں کے نیچے میرے بھائی بہنوں کے نام

تھا جو ایک کی تعلیم نہایت گہری ہو، شادی شدہ تھے ان کی بیویاں یا خاندانوں کے نام لکھے اور پھر مجھ سے پوچھا کہ تمہارا علم کہاں تک ہے میں نے جواب دیا۔ ایم اے پاس ہوں یہ سنتے ہی ان کے چہرے پر وہ آثار پیدا ہو گئے جو مجرم کو غلط بیانی کرتے ہوئے دیکھ کر پولیس افسر کے علاوہ پیدا ہو سکتے ہیں اور بولے۔

"پاس ہو گئے ہو۔ تم نے صرف امتحان دیا ہے۔"

میں ذرا گھبرا گیا اور کہا۔ میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں۔

"پیپرز اچھے ہوئے ہوں گے لیکن غلط بیانی کرنے میں بہت خطرہ ہے میرے عزیز۔ تم تعزیرات ہند کی دفعہ ایک سو تراسی میں گرفتار کیے جا سکتے ہو۔"

میں نے سوہن لال کی طرف یہ جاننے کے لیے دیکھا کہ اس سے کیوں کہ وہ اپنے جانے ہوئے شجرہ کے ساتھ وہاں سے دفع ہو جائے لیکن اسے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ اس شخص کی بیٹی ضرور حسین ہو گی۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس شخص کی بیوقوفیوں کی سزا اس کی نازک اندام اور حسین بیٹی کو نہیں دوں گا کہ تعزیرات ہند کی کسی نہ کسی دفعہ کے تحت یہ یقیناً جرم ہو گا۔ میں نے اتنا ضرور کہا کہ میری آنکھوں کے سامنے میرے خاندان کا شجرۂ نسب بنا کر آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ سوہن لال کہنے لگے عزیزم میں ایک بیٹی کا باپ ہوں تفتیش کرنا میرا فرض ہے۔

میں سوہن لال جی کے سوالوں کا جواب جہاں تک ممکن ہو سکا جھوٹ کی مدد کے بغیر دیتا رہا کیونکہ مجھے اب تعزیرات ہند کی دفعہ ایک سو تراسی سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ سوہن لال جی آخر جاتے جاتے کہہ گئے کہ مجھے ان کا شجرہ بتانا پسند نہیں آیا۔ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میں تمہارا بیان اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں مجھے اپنی بیوی کے سوالوں کا جواب بھی دینا ہو گا۔ تمہارا تحریری بیان میرے پاس ہو گا تو مجھے آسانی ہو گی۔

مجھے شک ہوا کہ چچا کو شادی کے سلسلے میں میرا اتنا سنسنانا شاید اچھا نہ لگا ہو لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بڑی دلچسپی سے میرا اور سوہن لال کا مذاکرہ سن رہے تھے۔ انہیں اس بات کی ذرا بھر فکر نہیں تھی کہ ان کے بھتیجے کی بے عزتی ہو رہی ہے۔ وہ تو بس یہ جانتے تھے کہ اگر یہ معاملہ کسی طرح نپٹ جائے تو وہ فخریہ اپنے دوستوں سے کہہ سکیں گے کہ انہوں نے ایک اعلیٰ رشتہ لگایا ہے۔

جب تک سوہن لال جی نے میرا شجرہ تیار کیا میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آخر میں وہ کچھ کہیں گے لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ پیشہ ورانہ انداز میں کہنے لگے کہ میں اس سلسلے میں کچھ اور تفتیش کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا۔ ان کے چہرے سے مجھے ایسا لگا جیسے سوچ رہے ہوں کہ صرف ملزم کے بیان پر کر دینا عقلمندی نہیں۔ گواہوں کے بیانات بھی تو قلم بند کرنے ہوں گے۔

سوہن لال جی کے تفتیش کرنے کا انداز قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا حادثے یہاں کے پولیس والوں کا ہوتا ہے۔ چھ مہینے گزر گئے لیکن انہوں نے نہ ہاں کی نہ نہ کی۔ چچا کی معرفت جب بھی میں نے پچھوایا یہی جواب ملا کہ آپ خاطر جمع رکھئے۔ تفتیش جاری ہے۔

میں نے کافی دیر تک سوہن لال جی کی ان دیکھی بیٹی کی تصویر کو اپنے من مندر میں سجائے رکھا لیکن آہستہ آہستہ اس تصویر کے نقوش دھندلے پڑنے لگے چنانچہ میں نے ایک دن اپنے دفتر میں اپنی ایک رفیق کار سے شادی کر لی۔ اور شادی کے بعد نہ صرف سوہن لال جی کی بیٹی کو بلکہ سوہن لال کو بھی دل سے نکال دیا۔

چچا کی دعوت میں سشما سے باتیں کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو وہی سشما ہے جو قریب چھ مہینے میرے دل و دماغ پر حکمراں رہی ہو۔ سشما واقعی بڑی پیاری لڑکی ہے میرا اندازہ تھا کہ وہ اس وقت قریب ۲۵ سال کی ہو گی لیکن اس کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔ ہاں بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار نظر آ رہے تھے جو اس کی عمر کی چغلی کھا رہے تھے۔ سشما کی باتوں سے ہی مجھے پتہ چلا کہ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنا قصہ تو اسے نہیں سنایا کہ اب وہ بیتے وقت کی بات کی صورت اختیار کر چکا تھا لیکن مذاق مذاق میں اتنا ضرور کہا کہ یقیناً وہ شادی کے خلاف ہو گی ورنہ اتنی حسین لڑکی کو اس عمر تک لوگ کہاں کنواری رہنے دیتے ہیں۔

سشما میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تو مجھے لگا کہ اتنے خوبصورت دانت میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ بہر حال۔ (باقی [illegible] پر)

غزلیں

زور آور تھے کبھی ہم بھی جوانوں کی طرح
ڈھیرے ڈھیرے ڈھ گئے کچے مکانوں کی طرح

زندگی کی سب کتابیں ہم نے پڑھ کر دیکھ لیں
کچھ حقیقت کی طرح تھیں کچھ فسانوں کی طرح

سیل رسوائی کا جب خطرہ کوئی آئے نظر
ہم کو ساحل پر لگا دینا چٹانوں کی طرح

چند زخموں اور اشکوں کے سوا کیا دے سکی
زندگی نکلی ہمارے مہربانوں کی طرح

آنکھ سے عینک اداسی کی ہٹا کر دیکھئے
خوبصورت ہے زمیں بھی آسمانوں کی طرح

یاد ایام گزشتہ اور کچھ خواب حسیں
زندگی کی دھوپ میں ہیں سائبانوں کی طرح

ہم کو بھی دہرائے گا طاہر زمانہ ایک دن
اگلے وقتوں کی پرانی داستانوں کی طرح

طاہر تلہری
صدر بازار، تلہر
شاہجہاں پور ۲۴۲۳۰۷

کناروں پر جو گھر اٹھنے لگے ہیں
سمندر میں بھنور اٹھنے لگے ہیں

بتاؤ کس طرف نظریں جمائیں
کہ اب اہل نظر اٹھنے لگے ہیں

گلابی ہو چلی ہیں ان کی آنکھیں
گلابوں سے شرر اٹھنے لگے ہیں

کوئی لا کر غزل کا ساز دینا
کہ ہم پچھلے پہر اٹھنے لگے ہیں

جو پارینہ حویلی سے گری تھی
اسی مٹی سے گھر اٹھنے لگے ہیں

خدا کا شکر ہنگامے بھی شاہد
اب اپنے نام پر اٹھنے لگے ہیں

شاہد میر
کرشی وگیان کیندر، سرونج
ضلع ودیشا
۴۶۴۲۲۸
(مدھیہ پردیش)

سدا گردش میں رکھتا ہے مجھے افلاک کا محور
ہوائے تند میں جیسے خس و خاشاک کا محور

مرے سینے میں خنجر سے کوئی تیری پیوست
لہو دیتا رہا پھر بھی بدن کے چاک کا محور

نہ جانے کس نے رکھ کے ہر طرف بکھرا دیا مجھ کو
مکمل کر چکا تھا مجھ کو میری خاک کا محور

بہار غنچہ و گل دیکھتا تو دیکھتا کیسے
نظر کے سامنے تھا منظر سفاک کا محور

بھلا کر بھی سکوں اس کو ظفر یہ کیسے ممکن ہے
مرے ادراک میں ہے اس کے ہی ادراک کا محور

ظفر اقبال ظفر
۱۷۰۔ خیل دار
فتح پور۔ ۲۱۲۶۰۱
(یوپی)

افسانہ

آر شاد امروہوی
۲۰ نو اشرف روڈ، کلکتہ

بہت دیر کر دی

مہینے کی آخری تاریخوں میں قادر کچھ زیادہ ہی جھنجلا اٹھتا تھا اس لیے کہ بہتر سے بہتر لباس میں ملبوس شخص کی بھی جیب کاٹنے پر حساب کے کچھ پیسے، دو چار رسیدیں یا پھر دس پانچ روپے ہی اس کے ہاتھ لگتے تھے ـــــ اور پھر وہ انتہائی بھدے لفظوں میں متعلقہ فرد کو برا بھلا کہنے لگتا تھا:

"سالے خواہ مخواہ کے رئیس بنے پھرتے ہیں۔ جیب سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں نکلتی۔"

"معلوم ہوتا ہے جیسے آخری تاریخوں میں سب فقیر بن جاتے ہیں۔"

"اس طرح اپنی جیب کی کڑکی کیونکر دور ہوگی ـــ اپنا پیٹ کیونکر بھرے گا۔"

"ان کم بختوں کو بھلا اس کھوکھلی نمائش کی کیا ضرورت ہے۔ نہ جیب میں کچھ ملتا ہے نہ گھر میں۔"

"اس طرح تو غریب وامیر کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

"خواہ مخواہ جھوٹی شان وشوکت پر مرے جاتے ہیں چاہے گھر کا سامان قسطوں پر آتا ہو اور مہینہ مہاجن کے سودی روپے سے چلتا ہو لیکن دماغ کی اینٹھن نہیں جاتی۔ پتہ نہیں پوری طرح پیٹ بھی بھرا ہوتا ہے یا نہیں۔"

قادر ہمیشہ سے جیب کترا نہیں تھا البتہ حالات کی شکستگی اور اس سے پیدا ہونے والے جذبۂ انتقام کے تحت اس نے کچھ عرصہ جیب کتروں کی صحبت میں رہ کر ہاتھ ضرور صاف کر لیا تھا تاکہ وہ بھی کل ذی حیثیت انسان بن کر بڑے لوگوں سے اپنی مفلسی اور باپ کی بے وقت موت کا بدلہ لے سکے۔ اس کا باپ ایک مقامی اسکول کے باہر بیٹھ کر موسم کے پھل اور بچوں کی دل چسپی کا سامان فروخت کر کے اپنا اور اس کا پیٹ بھرتا تھا، ساتھ ہی تھوڑا بہت پس انداز کر کے اس کو اسکول میں تعلیم دلا رہا تھا تاکہ وہ بھی پڑھ لکھ کر کل کسی اسکول کالج میں ماسٹر بن سکے۔ اس کا باپ اپنی نظر میں ایک ٹیچر کو معاشرے کا نہایت تعمیری اور باعزت انسان تصور کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک ماسٹر ہی ایسا فرد ہوتا ہے جو ہزاروں بچوں کی زندگی کو بناتا سنوارتا ہے۔ اس کے باپ کے دل میں جیسے یہ احساس گھر کر گیا تھا۔ لیکن ابھی قادر انٹرمیڈیٹ کا پہلا سال ہی پاس کر پایا تھا کہ اس کے باپ کے پیٹ میں اٹھنے والا درد ایک دن شدت پکڑ گیا اور قادر کی افلاس زدہ دوڑ دھوپ باپ کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے نہ بچا سکی۔ اس کے باپ کی موت کا سبب آنتوں کا کینسر تھا جس کا علم دونوں ہی کو نہیں ہو سکا تھا۔ کم آمدنی کی وجہ سے اس کا باپ اپنا علاج کسی بڑے ڈاکٹر سے نہیں کرا سکا تھا۔ گھر کے مصارف سے کہیں زیادہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم پر خرچ کرتا تھا اور درد اٹھنے پر وہ کوئی درد کی معمولی گولی کھا کر درد کو دبا لیتا تھا۔ اس طرح باپ کی موت کے ساتھ خود قادر کا روشن مستقبل بھی افلاس کے قبرستان میں دفن ہو گیا تھا۔

اور اب وہ کسی بھی ذی حیثیت اور خوش لباس شخص کو دیکھ کر مشتعل ہو اٹھتا تھا اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا جب تک اس کی تندرست جیب پر ہاتھ صاف نہ کر دے۔ پرس یا جیب سے جو کچھ ہاتھ لگتا پہلے کسی ہوٹل میں جا کر شکم کا کھانا کھاتا، پھر باقی سے پیٹ ... [illegible]

ظاہر ہوتے ہیں کہ ایک بڑا آدمی جو کہ سماج میں عزت و وقار حاصل کر سکے ۔۔۔۔ وہ سوچتا ۔۔۔۔ اچھا ٹھاٹ دھندہ کون دیکھتا ہے، سامنے کی حیثیت پر سب کی نظریں پڑتی ہیں۔ جیب اور گھر میں روپیہ ہو تو دس عیب چھپ جاتے ہیں اور کسی کی زبان سے کوئی سوال نہیں ابھرتا۔

اس وقت جو شخص اس کے شکار کی نذر پر تھا وہ اطراف کے ماحول سے بالکل بے خبر نظر آرہا تھا جیسے وہ کسی کاروباری مسئلہ پر غور کر رہا ہو پھر مہینے کی ابتدائی تاریخیں بھی تھیں اس لیے قادر اپنے موجودہ شکار کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھا۔ پہلی آزمائش پر ہی اسے متعلقہ شخص کے کوٹ کی جیب خاصی اُبھری ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

بس میں کچھ دیر بعد جھٹکے شروع ہو گئے جن سے جیب کتروں کو اپنے کام میں بڑی مدد ملتی تھی، جیسے بس کے ڈرائیوروں سے ملی بھگت ہو۔ قادر تیسرے جھٹکے میں کامیاب ہو کر اگلے بس اسٹاپ پر اتر گیا اور پھر حسبِ معمول سناٹے کے مقام پر پہونچ کر اس نے کسی پولیس والے کی طرح پرس کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ پرس کی ظاہری جیب سے صرف چوالیس روپئے، دو ایک رسیدیں اور ایک پرچے پر کچھ اشعار لکھے ہوئے ملے۔ وہ جھنجلا اٹھا۔

"لعنت تیرے کی! کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا ۔۔۔۔ صرف چوالیس روپئے!"

"کیا یہ کوئی سفید پوش بابو یا شاعر تھا؟"

"ایسا نہیں ہو سکتا ۔۔۔۔ بعض ہوشیار لوگ موٹی رقم کسی خفیہ حصے میں رکھتے ہیں۔" قادر کے تجربے نے اسے دیگر جیبوں کی تلاش پر اکسایا۔ اور اس کا خیال درست ہی نکلا۔ پرس کی ایک خفیہ پرت سے ڈاکٹر کا نسخہ اور اس کے درمیان سو سو کے دو اور پچاس کا ایک نوٹ رکھا ملا۔ پچاس کے نوٹ کے درمیان اُردو میں مختصر سی تحریر کا ایک پرچہ بھی رکھا تھا۔ نوٹوں کی اس موجودگی اور ڈاکٹر کے نسخے نے قادر کو پرچہ پڑھنے پر مجبور کر دیا۔

"اخلاق بھیا!

یہ پرچہ اور نسخہ مجھے ایک لڑکے نے دیا ... اور پھر ... ٹھیک

ہو گیا ہے اور وہ آئی۔ سی۔ یو نٹ میں ایڈمٹ ہیں۔

آپ یہ دوائیں وغیرہ لے کر فوراً بلا پور اسپتال پہونچیں۔"

(فرزانہ)

پرچے کی مختصر مگر رحم طلب تحریر نے ایک مرتبہ قادر کے ضمیر پر کاری ضرب لگائی جس کے بعد اس کے بے رحم ہاتھوں میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی جیسے خود اس کے باپ کی موت کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا ہو اور اچانک ہاتھ کی صفائی دل کی صفائی میں بدل گئی ہو۔ وہ بڑبڑایا،

"قادر! یہ تو نے کیا کیا؟"

"آج تیرے ہاتھ کی صفائی کسی کے مشفق باپ کی زندگی کا صفایا کر دے گی۔ وہ باپ جو ہر وقت اولاد کا قیمتی سہارا بنا رہتا ہے جو اولاد کی بہتری کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر دیتا ہے"۔۔ قادر کے ضمیر نے اسے للکارا۔

"کیا تو اپنے باپ کی قربانیوں کو بھول گیا ۔۔ جا اور یہ سب کچھ اخلاق کو واپس کر دے"۔

"لیکن مجھے میرے باپ کو کس نے واپس کیا ۔۔؟" اچانک کسی انتقام کی آگ بھڑکی۔

"مگر قادر! تجھے آج تک اس انتقام سے کیا ملا؟ صرف مجرمانہ زندگی اور تھوڑی بہت رقمیں ۔۔ وہ بھی لوگوں کی آہوں میں لپٹی ہوئی ۔۔ پھر تو دن بدن ایک بڑا مجرم بنتا جا رہا ہے اور کسی دن بھی پولیس کے ہاتھ لگنے پر زبردست مار اور جیل کی ہوا کھائے گا جس کے بعد تیری مجرمانہ زندگی تجھ سے تیرے تمام تر حقوق چھین لے گی تو تو خوب جانتا ہے کہ ایک باپ کی بے وقت موت اولاد کا بہت کچھ چھین لیتی ہے"۔

"جا ابھی وقت ہے، واپس کر دے یہ سب کچھ۔"

"لیکن اب وہ شخص مجھے ملے گا کہاں؟"

"تو پھر تو خود ہی یہ دوائیں خرید کر اسپتال میں اس کی بہن تک پہونچا دے۔ تیرے باپ کی روح بھی خوش ہو گی۔"

قادر کے موجودہ تصادم نے اس کے قدم ایک میڈیکل اسٹور کی طرف موڑ دیے۔ دکان کے اندر خاصی بھیڑ تھی لیکن

کسی طرح بھاگ بھاگ کر میڈیکل اسٹور تک پہنچ گیا اور اپنی باری کا انتظار کیے بغیر بولا

"ارے بھائی صاحب! یہ کچھ دوائیں مجھے بھی دے دیجیے"

"لیکن آپ تو ابھی آئے ہیں، یہ لوگ بہت دیر سے کھڑے ہیں۔" سیلزمین نے اصول کی بات کی۔ "تھوڑی دیر انتظار کرنا۔"

"لیکن میرے بھائی میرا مریض زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا ارے ایک انسانی وجود کو منٹوں میں مٹی کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔" قادر کے لب و لہجے سے حقیقی درد و کرب چھلک رہا تھا۔

"ارے صاحب پہلے انھیں کو دے دیجیے۔" کئی لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا جیسے سب کے دلوں میں انسانیت موجزن ہو گئی ہو

قادر سب دوائیں لے کر دکان سے باہر نکلا اور سامنے سے آتی ہوئی بس پر سوار ہو گیا۔ بس میں نہ صرف خاصی بھیڑ تھی بلکہ خاصے خوش پوشش اور ذی حیثیت لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن اس وقت قادر کو ان سب کی جیبوں میں دکھ بھرے محسوس ہوئے۔ وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا اور بلرامپور اسپتال کے چوراہے پر دیگر مریضوں کے ساتھ وہ بھی اتر کر تیزی سے اسپتال کی طرف بڑھا اور اسپتال میں داخل ہو کر ادھر اُدھر جاتے ہوئے ڈاکٹروں سے آئی۔ سی۔ سی یونٹ کا پتہ معلوم کرنے لگا ایک ڈاکٹر جو اسی یونٹ کی طرف جا رہا تھا، اسے روک کر پوچھا۔

"سر! یہ آئی سی سی یونٹ کس طرف ہے؟"

"اُدھر سامنے۔ لیکن تم اس یونٹ میں داخل نہیں ہو سکتے۔" ڈاکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"تو سر آپ کی بہت مہربانی ہوگی، یہ دوائیں، انجکشن اور پرسیا مس فرزانہ کو دے دیجیے۔ ان کے والد کی حالت بہت نازک ہے یہ سب کچھ ان کے بھائی نے دفتر سے بھیجا ہے۔" قادر نے وہ سب کچھ تھما کر التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن بھئی تم نے بہت دیر کر دی۔ ان کے مریض نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی دم توڑ دیا۔"

"وہ بھی مر گئے۔" قادر دردناک لہجے میں بڑبڑایا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب یہ سب تو مس فرزانہ تک پہنچانا ہی ہے۔ میں تو

بار کے سالوں کی فکر کا ایک سوال لازم ہوں ہے تھوڑا سا کہ زبردستی پکڑ کر تھما کر ندامت بھری نگاہ سے ایک طرف چل پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک بار پھر اس کے باپ نے دم توڑ دیا ہو۔ اس نے اپنے پھر بیلے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو اب بے جان سے ہو گئے تھے اور اس کا جانتا وجود بھی دم توڑ چکا تھا۔!!

□□

غزل

بنائے آشیاں کی پختگی کچھ اور کہتی ہے
نگاہِ باغباں کی برہمی کچھ اور کہتی ہے

بہ عنوانِ تغافل برہمی کچھ اور کہتی ہے
ادا کچھ چاہتی ہے بے رُخی کچھ اور کہتی ہے

صراحی بھی ہے دورِ جام بھی ہے اور شمعیں بھی
مگر ان کی عدم موجودگی کچھ اور کہتی ہے

سہارا تو بہت دیتی ہے گو چشمِ کرم اُن کی
مگر ہم سے ہماری زندگی کچھ اور کہتی ہے

بکھر جائے نہ اے گلچیں کہیں شیرازۂ گلشن
شگفتہ پھول کی ہر پنکھڑی کچھ اور کہتی ہے

غمِ دوراں کی خواہش ہے تصدق ان پہ مر جائیں
تمنائے حیاتِ دائمی کچھ اور کہتی ہے

مرزا محمد ہادی صدا اکبری

ویپک ہی کاش

(بھریا۔ وص بادلانیاد)

خود اعتمادی کی جیت

انسان اگر جسمانی طور سے معذور ہوتا ہے تو اسے معذور نہیں سمجھنا چاہیے بشرطیکہ وہ ذہنی طور پر متوازن اور صحت مند ہو، اور اس میں کچھ کر سکنے کی صلاحیت اور حوصلہ موجود ہو۔ کوئی شخص اگر جسمانی طور پر معذور ہے اور اس میں کچھ کرنے کا حوصلہ، للک اور صلاحیت موجود ہے تو اسے معذور کہنا مجذوب کی بڑ ہے۔ اس کی زندہ جاوید مثال آزاد خاں کو دیکھنے میں ملتی ہے۔

آزاد خاں آج عمر کے ۴۰ برس پورے کر چکے ہیں۔ جب وہ آٹھ سال کے تھے تو انھیں مہلک بیماری نے آگھیرا جس سے ان کا ایک پیر بیکار ہو گیا۔ لیکن پیر کے بیکار ہونے سے آزاد خاں کے حوصلوں، اُمنگوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

گول چہرہ، گھنگھریالے بال اور کشادہ پیشانی کے مالک آزاد خاں آج بھی ایک ہی پیر سے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ سائیکل، اسکوٹر اور دیگر گاڑیاں چلاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب وہ محض بیساکھی کے سہارے چلتے تھے لوگ انھیں دیکھ کر ترس کھاتے تھے۔ لیکن آج جب اپنی محنت کی کمائی سے خریدے ہوئے اسکوٹر پر تیز رفتاری سے آزاد خاں چلتے ہوئے نظر آتے ہیں تو لوگ انھیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر آزاد خاں کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

آزاد خاں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے قریب ہی اسکول میں حاصل کی۔ ان کے والد حیات تھے اور خاندان خوش حال تھا اس لیے آزاد خاں کا بچپن بڑی خوش حالی میں گزر رہا تھا۔ کھیلنا، شرارتیں کرنا اور پڑھنا ہی ان کے مشاغل تھے لیکن قسمت سے ... سال کی عمر میں اچانک بخار آیا اور طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی۔ جب انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو پتہ چلا کہ اس بچہ کو پولیو ہو گیا ہے جس کے باعث اس کا ایک پیر بھی مفلوج ہو گیا ہے۔ اتنا سنتے ہی والدین کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ انھوں نے اپنی تمام امکانی کوششوں سے آزاد خاں کا علاج کرایا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کے علاج پر ہونے والے خرچ سے گھر کی معاشی حالت خراب ہونے لگی۔ آٹھ سال کی عمر کے بچے کو گھر کی معیشت سے کیا سروکار۔ لیکن اس بچے نے اپنے گھر کی اقتصادی حالت کو بگڑتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بچہ اندر ہی اندر گھٹنے لگا اور سماج سے الگ تھلگ رہنے لگا، پڑھنے لکھنے سے بھی جی چرانے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر گھر کے لوگ ملول اور پریشان رہنے لگے اور مالکِ ایزدی سے اس کی قسمت اور اچھے مستقبل کی دعا کرنے لگے۔

ابتدائی دنوں میں تو آزاد خاں نے اپنی اس مجبوری کو قسمت مانا۔ جب وہ بچوں کو آزاد فضا میں اچھلتے کودتے اور کھیلتے دیکھتے تو ان کی آنکھیں بھر آتیں۔

اپنے بچے کی اس کیفیت کو دیکھ کر آزاد خاں کے والد رمضان خاں اس کو تسلی دے کر حوصلہ بڑھاتے۔ بچہ جو پڑھنا ترک کر چکا تھا، انھوں نے اس کو پھر سے پڑھنے کا حوصلہ دیا۔ آزاد خاں نے ایک بار نئے عزم سے پڑھنا شروع کیا۔ ان کے والد انھیں اپنے کندھے پر بٹھا کر روزانہ اسکول پہنچاتے اور چھٹی ہونے پر گھر لاتے۔ یہ سلسلہ سات برس تک چلتا رہا۔ یہاں پھر ایک بار پھر وقت نے کروٹ بدلی اور رمضان خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ کے اعتماد کو پھر ٹھیس پہنچی۔ کیوں کہ اب پورے

گھر کی ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر آ پڑی تھی۔ قسمت کی انتہا کہ حالت بگڑتے بگڑتے اس منزل پر پہونچ گئی کہ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ ایسے نامساعد حالات میں بھی آزاد خاں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے اپنی تمام ہمت کو سمیٹ کر سینے والے اور آہنی عزم کے ساتھ ایک درزی کی دوکان پر سلائی کی تربیت لینی شروع کر دی۔ ان کی محنت رنگ لائی اور انھوں نے اس کام میں مہارت حاصل کر لی۔ اب ان میں وہ اعتماد پیدا ہو چکا تھا کہ وہ خود کو صحت مند لوگوں سے زیادہ بہتر محسوس کرنے لگے تھے۔ اب انھیں محسوس ہونے لگا کہ اب وہ اپاہج نہیں رہے ہے اس کے بعد انھوں نے سائیکل چلانی سیکھی جس کا ذکر انھوں نے اپنے دوستوں سے کیا کہ انھوں نے سائیکل چلانا سیکھ لی ہے تو دوستوں نے ان کا مذاق بھی اڑایا کہ تم اور سائیکل چلانا سیکھ جاؤ، یہ ممکن نہیں۔

سائیکل سیکھنے کے بعد آزاد خاں میں اور بھی خود اعتمادی آئی اور انھوں نے سوچا کہ میں وہ سب کر سکتا ہوں جو ایک صحت مند آدمی نہ کر سکے گا کیونکہ میں ذہنی طور پر تو پوری طرح صحت مند ہوں۔

۱۹۸۱ء میں یوم معذور کے موقع پر ٹسکو کمپنی میں آزاد خاں کو نوکری مل گئی۔ وہیں انھوں نے اسکوٹر چلانا بھی سیکھ لیا، جسے آج وہ بڑے اعتماد سے چلا رہے ہیں۔

۱۹۸۵ء میں سنٹرل اسپتال میں جونیئر ٹیلر ماسٹر کے لیے تقرری ہوئی اور اس وقت سے آج تک وہ وہاں محنت سے کام کر رہے ہیں اور اپنی زندگی کو بہت خوش حال محسوس کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔

• معذوروں سے ہمدردی تو کی جا سکتی ہے لیکن ان پر ترس نہیں کھایا جا سکتا۔ کیوں کہ ترس کھانے سے ان میں احساس کمتری پیدا ہوگا اور وہ ذہنی طور پر بھی معذور ہو جائیں گے۔

تفتیش ... صفحہ ۴۰ کا بقیہ

میں شادی کے خلاف نہیں ہوں۔ بس یہ حالات ہی اس قسم کے ہیں کہ میری شادی نہ ہو سکی لیکن آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے دفتر میں ایک لڑکا ہے جو مجھے دل و جان سے چاہتا ہے امید ہے کہ جلد ہی ہماری شادی ہو جائے گی۔

میں نے کہا سستا جی اپنی شادی میں مجھے ضرور بلائیے گا کیونکہ آپ کو دلہن کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی نہ سہی، کسی دوسرے کی سہی۔

سستا ایک بار پھر کھل کھلا کر ہنسی اور کہا: آپ بہت شریر آدمی ہیں۔

میں نے پوچھا کب کر رہی ہیں آپ شادی؟

کہنے لگیں میں تو تیار ہوں لیکن والد صاحب چاہتے ہیں کہ وہ لڑکے کے بارے میں تھوڑی تفتیش کر لیں۔ اسی لیے وقت لگ رہا ہے۔

میں نے کہا سستا جی میری ایک بات مانیں گی؟

• کہیے۔

• آپ اس لڑکے سے فوراً شادی کر لیجئے۔ والد صاحب کی تفتیش کا انتظار نہ کیجئے۔

پتہ نہیں سستا کو میری بات پسند آ گئی یا اس لڑکے کی محبت نے اسے مجبور کیا کہ اس نے ایک ہفتے کے بعد اس لڑکے سے شادی کر لی۔ سستا کے والد اس شادی پر بہت ناراض ہوئے اور جب انھیں پتہ لگا کہ اس شادی میں میرا بھی ہاتھ ہے تو انھوں نے میرے چچا سے شکایت کی۔ چچا مجھ پر بگڑے تو میں نے کہا کہ چچا ایک لڑکی تھی کنواری اور ایک لڑکا کنوارا تھا۔ میرے مشورہ سے اگر انھوں نے شادی کر لی تو کیا برا کیا کیونکہ آپ بھی تو ایسے ہی کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی تفتیش کی ضرورت سمجھی۔ آخر نتیجہ تو آپ ہی کا ہوں نا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے مناسب تھا۔

چچا کہنے لگے اگر تمہاری ہی قیمت ہو ایک دوسرے کے لیے مناسب بن جائیں گے۔ [illegible]

[illegible] رشتہ کر لیا ہے۔

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : " دھوپ کی چادر" (افسانوی مجموعہ)
مصنف : سید احمد قادری   قیمت : ۵/- روپیے
ملنے کا پتہ : مکتبہ غوثیہ۔ کریم گنج۔ گیا ۸۲۳۰۰۱
(بہار)

سید احمد قادری کے بیس افسانوں کا مجموعہ "دھوپ کی چادر" ان کے فکر و فن کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ، اس خاص علاقے کے احوال و آثار کی بھی نمائندگی کرتا ہے جس سے مصنف کی ذہنی اور جذباتی وابستگی استوار ہے کیوں کہ یہ اس کی جنم بھومی کا علاقہ ہے۔

اس کتاب کا پہلا افسانہ "اپنی عدالت" اگر ایک طرف انصاف اور انتقام کی دلدوز کہانی سناتا ہے تو دوسری طرف ایک ایسی پراسرار طاقت کی نشان دہی بھی کرتا ہے جس نے دبے کچلے لوگوں کو انصاف دلانے کے لئے اپنی ایک متوازی عدالت اور پولیس قائم کر رکھی ہے۔ جہاں سے کوئی ظالم بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح "ریت کی دیوار" بھی ایک ایسی سماجی ناانصافی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جہاں محض نوکری حاصل کرنے کے لیے ایک نوجوان اپنے چچیرے [illegible] کا قتل کروا دیتا ہے۔ اس افسانے میں جو نفسیاتی [illegible] ہے اس کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری اپنے گرد و پیش کی زندگی کے [illegible]

[illegible]

کے سامنے اُجاگر کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانے سیدھے سادے سپاٹ انداز کے ہیں۔ لیکن ان کا اختتامی فقرہ تصورات کو اُبھار کر پورے افسانے کا جواز پیدا کر دیتا ہے۔"

——— نامی انصاری

نام کتاب : "شبنم و گل" (شعری مجموعہ)
شاعر : پیام فتحپوری   قیمت : ۲۰/- روپئے
ملنے کا پتہ : دانش محل، امین آباد۔ لکھنؤ

پیام فتح پوری کا شمار دورِ حاضر کے معروف اُردو شعرا میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "شبنم و گل" میں نہ صرف ان کا تازہ کلام ہے بلکہ ان کے پچھلے شعری مجموعوں کا انتخاب بھی شامل ہے اور اس طرح اس کی حیثیت ایک کلیات کی سی ہو گئی ہے۔

پیام فتح پوری کے اظہار اور بیان کا انداز یوں تو کلاسیکی ہے لیکن اس میں انھوں نے دورِ حاضر کے محسوسات اور تقاضوں کو سمو کر اسے قدیم اور جدید کا ایک دلآویز سنگم بنا دیا ہے۔ ان کا کلام پوری طرح سے عصری حسیت کی ترجمانی کرتا ہے اور اس میں جدید فکر کی تازگی کے ساتھ جذبے اور احساس کے نئے ابعاد پائے جاتے ہیں۔ کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

فضائے تیرہ شبی میں بھی جی تو لیتے تھے
نہ پوچھیے نئے سورج کی روشنی کے ستم

بطن میں پلتا ہے جن کے آفتابِ انقلاب
ان سیہ راتوں کو میری سمت سے لاکھوں سلام

جانے کس یگ میں یہاں ابرِ کرم برسے گا [illegible]   زندگی دھوپ میں [illegible]

[illegible]

ہزار رنگ ہے ہوتی آرزو ہے [illegible]
تجھی میں تو اسی آشیاں میں رہتا ہے

یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ کلاسیکی غزل عوامی کے آداب پہ ملحوظ رکھتے ہوئے پیام فتح پوری کا سیاسی اور سماجی شعور نہ صرف بیدار ہے بلکہ دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔

——— وجاہت علی سندیلوی

> نام کتاب: "دھوپ دریا" (شعری مجموعہ)
> شاعر: شکیل اعظمی قیمت: پچاس روپے
> پتہ: ۵/۱۰۰۸ ہند اسٹورس۔ سید پورہ، مین روڈ
> سورت ۳۹۵۰۰۳

۱۳۶ صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ اپنی نظموں، غزلوں اور نثری منظومات کی شمولیت کے باوصف سورت کے نوجوان شاعر شکیل اعظمی کے افکار کا ترجمان ہے۔ ان کے یہاں پیرایۂ نظم بھی اپنے اختصار و خوش انجامی کی بدولت کامیاب ہے۔ کتاب میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے لیے ایک نظم اور بمبئی کی تین نظمیں موثر انداز میں ہیں جو بمبئی کے شہری شب و روز میں گھری ہوئی انسانیت کے لمحہ لمحہ احساسات کی تصویریں بھی ہیں۔

سچائی تو یہ ہے کہ دورِ حاضر کے شعری سرمائے کو بڑھانے میں جو نئی نسل اپنے لیل و نہار فکری وادیوں میں گزار رہی ہے ان میں یقیناً شکیل اعظمی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

——— تسنیم فاروقی

> نام کتاب: "تلخیاں" (انشائیے)
> مصنف: شبتر امام قیمت: چالیس روپے
> ملنے کا پتہ: حسینی سماج۔ پالی کالونی۔ پٹنہ
> (بہار)

شبتر امام کے گیارہ انشائیوں کا مجموعہ "تلخیاں" ان کے افکار و نظریات کا ترجمان ہے۔ اس مجموعہ میں شبتر کے انشائیے سیاسی [illegible] کے جیسے [illegible] وغیرہ انشائیے کم اور مضمون زیادہ نظر آتے ہیں۔ تخلیق کار کو مضمون اور انشائیہ میں فرق محسوس کرنا چاہیے کیونکہ ہر مضمون انشائیہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر مزاحیہ، طنزیہ یا تأثراتی مضمون کو انشائیہ کہا جا سکتا ہے۔ انشائیہ ادب کی ایک خاص صنف ہے جس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے۔ اس کا مقصد معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ قاری کے ذہن کو نئے افکار کی روشنی سے منور کرنا ہے۔

'کیتلی'، 'فرمائش'، 'آویزش' اس مجموعے کی بہترین نگارشات ہیں۔ شبتر امام نے بیانیہ انداز میں افسانوی طرز پر انشائیہ کے اسلوب و آہنگ کے ساتھ سیاسی، سماجی تبدیلیوں اور نجی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔

ان انشائیوں میں انبساطِ فکر کے ساتھ ایک پیغام بھی پوشیدہ ہے جو قارئین کے دلوں کو چھوتا ہے۔

——— تسکین زیدی

> نام کتاب: "تلاشِ آگہی" (شعری مجموعہ)
> شاعر: میر غضنفر علی باقری۔ قیمت: درج نہیں
> ملنے کا پتہ: کیپ فٹ پلازا۔ چادر گھاٹ، اسکول لین
> حیدر آباد

"تلاشِ آگہی" غضنفر علی باقری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر نظمیں اور غزلیں اور شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ قطعات اور متفرق اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں سلاست، روانی، برجستگی اور زبان و بیان کی دلکشی کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی صاف نظر آتی ہے۔ باقری صاحب نے آسان لفظیات میں اپنے جذبات و احساسات کو اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے جس میں حسن و عشق کے مضامین کم ہیں اور روزمرہ کی زندگی کے تجربات زیادہ۔ جو کسی کے دل کو چھو لینے کے لیے کافی ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

[illegible]

"آتش پیچاں" میں کچھ نظمیں موضوعاتی بھی ہیں جن میں سے چند بہت ہی دلکش ہیں۔ جیسے گوشۂ وردان، بسِ مرگ، نہیں میں اب جوان نہیں، قومی یکجہتی وغیرہ۔

——— آصف لکھنوی

نام کتاب: گنجینۂ عرفان
شاعر: صابر آروی قیمت: ساٹھ روپیے
ملنے کا پتہ: فیاض حسین۔ ایس۔ کے پوری بورنگ روڈ
پٹنہ (بہار)

صابر آروی کا "گنجینۂ عرفان" حدیثِ قدسی کی روشنی میں شعاعِ ایمان وزینۂ عرفان کے مترادف ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز خوش فکر شاعر ہیں کلاسیکی ادب پر بھی ان کی نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قصیدہ اور منقبت کے حتی فرق کو سمجھا اور اس کے بنیادی اصولوں پر کاربند رہے۔ منقبت میں اگر مناجات شامل نہ ہو تو وہ قصیدہ ہو جائے گی۔ اس کی ہیئت کا تعین بھی اب تک نہیں ہو سکا ہے مثنوی المخمس و مسدس کی شکل میں اس کا چلن رہا۔ اسی پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے منقبتیں کہیں۔

ان کے کلام میں دبستان لکھنؤ و دہلی کا امتزاج ہے لیکن دبستان لکھنؤ کی تقلید ملتی ہے۔ زبان و بیان میں علاقائی عنصر نہیں ملتا بلکہ زبان فصیح ہے۔ روایات سے انھوں نے انحراف نہیں کیا ہے ان کی شاعری کا خمیر اس روایتی ڈھانچے سے اٹھا جس میں میر انیس اور جوش ملیح آبادی جیسے شعراء ہیں چنانچہ ان کی شاعری میں لاشعوری طور پر ان کے خیالات در آئے ہیں۔

صابر آروی نے جوش ملیح آبادی، محسن کاکوروی، وحید اختر ہلال نقوی وغیرہ کی طرح تجربے نہیں کیے لیکن بیشتر نظموں میں اپنی کا التزام عصر کے توسط سے کیا۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔
انھوں نے سرورِ کائنات، مولائے کائنات حضرت علیؓ معصومۂ کونین فاطمہ زہراؓ، حسینؓ، حضرت عباسؓ اور امام عصر کی منقبتیں کہیں۔ جو ادب کی اعلیٰ قدروں پر کھری اترتی ہیں۔

"گنجینۂ عرفان" کا سرورق سادہ، کتابت و طباعت اور کاغذ اچھے ہیں۔

——— عابد نظر

نام کتاب: سنہرا گلاب
مصنف: شمیم عالم مصحفی قیمت: /۱۵ روپیے
ملنے کا پتہ: بانکا بلاک آفس، بانکا ۸۱۳۱۰۲
(بہار)

"سنہرا گلاب" بچوں کی کہانیوں اور ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں بچوں کے لیے بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں شامل ہیں۔ 'سنہرا گلاب' ایک لالچی زمیندار کی کہانی ہے، جسے اس بات کی فکر کھائے جاتی ہے کہ اس کی تین پشتیں تو عیش میں گزار لیں گی مگر چوتھی پشت کا کیا ہوگا۔ "اغوا" والدین کو بچوں کی بنیادی درس گاہ مانتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ "بہادر انسان" اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ بہادر وہ ہے جس نے اپنے غصے پر قابو پالیا ہے۔ 'توبہ میری توبہ' میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو فروغ دینے کا درس ہے۔ 'خواب کی تعبیر' میں مظلوموں کی آہ سے بچنے کی ترغیب ہے۔ 'بزرگی کا تحفہ' میں توبہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ 'حج اکبر' میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مشورہ ہے۔ 'نئی صبح' میں قرض دار کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی ہدایت ہے۔ 'نولکھا ہار' سے یہ سبق ملتا ہے کہ ضمیر کی عدالت دنیا میں سب سے بڑی عدالت ہے۔

کتابت کی معمولی غلطیوں سے قطع نظر "سنہرا گلاب" میں شامل کہانیاں بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے معاون ثابت ہوں گی۔

۹۵ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کی قیمت اس کی طباعت کتابت اور عمدہ کاغذ کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے۔

——— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

"اودھ آئینۂ ایام میں"

چند تاثرات

جناب امجد حسین صاحب

"اودھ آئینۂ ایام میں" نامی کتاب مجھے ملی۔ ایسی معلومات اور آگاہی اس سے پہلے کبھی کسی کتاب سے نہیں ملی جتنا اودھ آئینۂ ایام میں سے ملتی ہے۔ اس قدر معلومات افزا کتاب کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ لیکن بھائی اس قدر باریک لکھائی ہے کہ ٹھیک سے پڑھنے میں نہیں آتی۔

نیا دور آپ کی مہربانی سے ملتا رہتا ہے۔ نیا دور میرے خیال سے اتر پردیش کی شان بڑھاتا ہے۔ کیونکہ نیا دور سے ہم کو اس قدر معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں کہ ہم لکھنؤ کے ہو کر بھی لکھنؤ سے انجان تھے۔ ہم کو نیا دور سے لکھنؤ ملا۔ لکھنؤ کی عظمت اور لکھنؤ کی تہذیب کو ہم نے جانا۔ نیا دور زندہ باد!! میں نے آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ سچ لکھا ہے۔

———— (موسیقار) نوشاد علی
بمبئی

محبی تسلیم۔

"اودھ آئینۂ ایام میں" ملی۔ آپ نے "اودھ" پر اختصاص حاصل کر لیا ہے۔ نیا دور کے دو اودھ نمبر اور اب یہ کتاب۔ صوری اور معنوی' ہر دو لحاظ سے خوبصورت
دلی مبارک باد!

———— کالی داس گپتا رضا
بمبئی

برادر عزیز۔ خوش رہیے!
آپ کی کتاب "اودھ آئینۂ ایام میں" مل گئی تھی، شکریہ! میں نے اسے بڑی دل چسپی اور انہماک سے پڑھا ہے۔ اودھ کی زندگی کے ادبی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ کتاب واقعی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے اسے اپنی ذہانت اور محنت سے ترتیب دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اردو قارئین اس کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

———— جگندر پال
نئی دہلی

برادرم امجد حسین صاحب

کل کی ڈاک سے آپ کی کتاب "اودھ آئینۂ ایام میں" موصول ہوئی۔ کتاب نہ صرف ظاہری حسن سے تاباں ہے بلکہ یہ ایک کارآمد ریفرنس میٹریل ہے۔ یہ آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اہل ادب اس کی مناسب پذیرائی کریں گے۔

آپ کے بہت سے خوبصورت شمارے اور یہ کتاب دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ آپ کے محکمے کے ڈائرکٹر دوبہت نندن صاحب اعلا ترین ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ اس طرح کے محکمے کو ایسے ہی شخص کی رہنمائی نصیب ہو۔ میں جب وزارت خارجہ میں انڈیا پرسپیکٹوز کا چیف ایڈیٹر تھا تو میں اسے اسی بنا پر کامیاب بنا سکا کہ مجھے بھی ایک اعلا ادبی ذوق رکھنے والے افسر کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل تھی۔

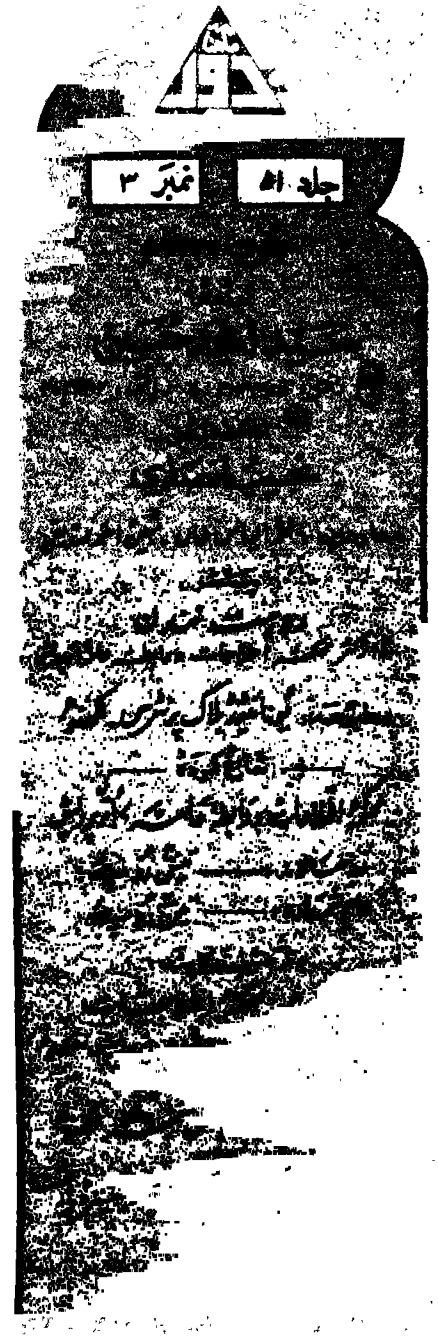
اس خوبصورت کتاب پر میری دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

———— دلیپ سنگھ
نئی دہلی

مکرمی امجد صاحب! ایک قیمتی سوغات "اودھ آئینۂ ایام میں" آپ کی شاندار کتاب ملی۔ یہ بہت اچھا کیا آپ نے کہ اپنے اودھ نمبروں کا عطر اس کتاب کی شکل میں لے آئے۔ ہر پہلو کا احاطہ ہو گیا ہے اس لیے لوگ بڑے شوق سے پڑھیں گے۔ مضامین بہت قیمتی ہیں مدت تک یہ حوالے کی بڑی اچھی کتابوں میں شمار کی جاتی رہے گی اور بہت سے لوگ اس سے مستفیض ہوں گے۔

عابد رضا بیدار پٹنہ

عنوانات



اپنی بات	ایڈیٹر	۲
عکس زندہ ہے (نظم)	باقر مہدی	۳
میں اور میرا تخلیقی سفر (خود نوشت)	رفعت سروش	۴
غزل	عامر ریاض	۷
غزلیں	مظفر حنفی	۸
	عابد پشاوری	۸
تلاشِ معنی	ظہیر احمد صدیقی	۹
شنیدہ - عبرت اور حیرت (نظمیں)	اختر بستوی	۱۸
دوہے	ڈاکٹر نریش	۱۸
چراغِ دیر	مجاور حسین رضوی	۱۹
غزل	عذرا پروین	۲۳
غزلیں	سلیمان اطہر جاوید	۲۴
	ایم، کوٹھیاوی راہی ۔ سعید عارفی	۲۴
عصرِ حاضر میں مولانا آزاد کی معنویت	کاظم علی خاں	۲۵
پاداش (نظم)	شورش صدیقی	۳۱
پانی (نظم)	صادق رضوی	۳۱
اردو افسانے کے ابتدائی نقوش	فیاض رفعت	۳۲
غزل	س۔م۔ فاضل	۳۸
غزلیں	نسیم عزیزی	۳۹
	مسعود الحسن ردولوی ۔ علی احمد جلیلی	۳۹
نئی آنکھیں (افسانہ)	نثار راہی	۴۰
نقد و تبصرہ	امیر احمد صدیقی ۔ نہال احمد صدیقی	۴۴
	محمد سبطین ۔ اقبال احمد اعجازی	۴۷
نصف صدی نمبر: تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۸

اپنی بات

انسانوں کی انتہا پسندی کہ اتنا بڑھی کہ موسم پر بھی اثر انداز ہونے لگی ۔ چنانچہ ؎

عجب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

یہ سمجھ ہی میں نہیں آسکا کہ کب کون سا موسم آیا اور کون سا موسم رخصت ہوا ۔ ابھی مزے دار گرمی نرمی سے چل رہی تھی کہ اچانک معلوم ہوا کہ الہ آباد ، بنارس اور اترپردیش کے کئی ضلعوں میں درجۂ حرارت چھیالیس ڈگری کو پار کر گیا ہے ۔ گزشتہ سال کو یاد کر کے دل دھڑکنے لگا جب مسلسل ایک ہفتے تک اترپردیش میں درجۂ حرارت ۴۷ ، ۴۸ ڈگری تک چلا گیا تھا ۔

اچانک دبے پاؤں آندھی آئی تو لوگ چونک اٹھے ۔ پھر سوچا آئی ہے تو چلی جائے گی ۔ لیکن وہ تو روزانہ آئی اور پھر ہر جون کی شب میں تو قیامتِ صغریٰ کا منظر لے کر آئی ۔ اندھیری رات میں برق و باراں ، تیز ہواؤں کے جھکڑوں سے جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت اور آب جو کہ تیزاب بن گیا تھا ۔ وسائل منقطع ، روشنی غائب ۔ ریل گاڑیاں کئی گھنٹوں تک پٹری پر کھڑی کپکپاتی رہیں ، چلنے کی ہمت نہ کر سکیں ۔ ہر شہر میں موسم خوش گوار ضرور ہوا لیکن ہزاروں مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ۔

آندھیاں تو آتی ہی رہتی ہیں چاہے کیسی ہوں ___ موسمی ہوں ، سیاسی ہوں ، معاشی ہوں ۔ ہر آندھی میں کونپلیں مسل جاتی ہیں ، ریت کے گھروندے ڈھے جاتے ہیں اور شیشے کے مکان ٹوٹ جاتے ہیں لیکن وہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں جو غالب کا مصرعہ گنگناتے رہتے ہیں ۔ ؎

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یعنی آندھی طوفان آتے ہیں گزر جاتے ہیں ۔ موسم بدلتے رہتے ہیں ان کی زیادہ پروا نہیں کرنی چاہیے اور موسم کے مطابق خود کو نہیں ڈھالنا چاہیے بلکہ موسم کو اپنے مزاج کے مطابق بنا لینا چاہیے ، یعنی اگر طوفان آئے تو گھر کی کھڑکیاں مت بند کیجیے بلکہ شعلہ جو بجلی کا دامن تھامنے کے لیے دوڑ پڑیے اور گرجتے بادلوں کے سامنے مسکرائیے اور خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اتنی گناہ گار دُنیا ہونے کے باوجود وہ اپنے رحم و کرم کو قہر و غضب میں نہیں بدلنے دیتا ۔ ورنہ ساری دُنیا پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ جنھیں تھوڑا سا اقتدار مل جاتا ہے وہ اپنے قہر و غضب کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ مگر وہ اقتدار مطلق رکھتا ہے ، ہر شے پر قادر ہے ، وہ انسان کو اپنے عتاب و عذاب کا نشانہ نہیں بناتا اعمال تو ایسے ہیں کہ اگر ہر جگہ طوفانِ نوح آجائے تو کوئی حیرت نہیں لیکن یہ اس کا فضل و احسان ہے کہ گرمی کو نرمی میں اور تپش کو خنکی میں بدل دیتا ہے ۔ ابھی وہ گرمی تھی کہ خدا کی پناہ ! بقول مصحفیؔ ؎

دن میں تمام روز حرارت بڑی رہی   تا شام دھوپ نہر کے اندر پڑی رہی

اور اب یہ عالم ہے کہ دھوپ درختوں کی چھاؤں میں منہ چھپائے پھر رہی ہے اور ہوا آہستہ آہستہ یہ مژدہ سنا رہی ہے کہ " بہار آنے والی ہے ۔ " اس لیے آئیے ! ملک کی بہتری و خوش حالی کے لیے طوفانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں ۔

ایڈیٹر

عکس زندہ ہوں !

شاعرِ اوّل کے نام

اور آزادی کے ساتھ ـــ میں بھی دِلّی آگیا
اک فسادی ریل میں جھگڑا ہوا
گِر کے لیکن بچ گیا ـــ !
گھر سے نِکلا دھوپ میں
اپنا سایہ چھوڑ کر
لکھنؤ میں زندگانی کے مَدارج طے کیے !
پھر بھی غربت نے مرا پیچھا نہ چھوڑا دُور تک
گھوم پھر کر ـــ بمبئی میں بس گیا !
سارے دانِش وَر بِکے جاتے تھے،
اک نیلام تھا
مجھ سے آوارہ کی کیا قیمت ہے
اک نانِ جویں ؟
اور میں بازار سے بھاگا،
کتابوں میں چھُپا ـــ !
ایک سرکش کو مِلی جینے کی راہ ـــ !
آج ستّر سال پُورے ہو گئے، زندہ ہوں میں !
یا کہ اپنا عکس بن کر آئینہ تکتا ہوں میں !

جس شخص سے مجھ ایسی طویل زندگی میں
سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ شاعر اوّل ہیں
جو ایک لمبے عرصے تک ناشناس آشنا تھا
وہ میرا محسن بھی رہ چکا ہے
باقر مہدی

باقر مہدی
۱۲/۱۲ - راوی درشن، کارٹر روڈ، باندرہ (ویسٹ)
ممبئی ۴۰۰۰۵۰

رفعت سروش
۴۲ بی - پاکٹ سی - سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

میں اور میرا تخلیقی سفر

نگینہ (ضلع بجنور) یو پی کا ایک روایتی قصبہ ہے۔ وہیں میرے آباو اجداد مدتوں سے رہتے آئے ہیں۔ میں جب اسکول میں داخل کرایا گیا تو میری تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۲۶ء درج کرائی گئی۔ کیوں کہ اور کوئی دستاویزی ثبوت دستیاب نہیں ہے اس لیے ظاہر ہے یہی تاریخ پیدائش ہے۔

میں سید شوکت علی ولد حافظ سید محمود علی کے گھر نگینہ میں پیدا ہوا۔ ایک مسجد کے غریب پیش امام کے گھر۔ بے حد مذہبی ماحول میں تربیت ہوئی۔ پرائمری اسکول کے کچھ درجات تک نگینہ میں پڑھا پھر اردو مڈل تک موانہ (ضلع میرٹھ) میں اور پھر ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا نگینہ کے جی ایچ پی ہائی اسکول سے۔

نگینہ فارغ البال جاگیر داروں اور ان کے مفلوک الحال اور خوشامدی مصاحبوں اور ملازموں کا قصبہ تھا اُن دنوں۔ صنعت و حرفت کے نام پر آبنوس کا کام ہوتا تھا یا کانچ کی شیشیاں بنانے کا۔ کچھ ساہوکار تھے جو عیش پرست جاگیر داروں کو منھ مانگا روپیہ قرض دے کر آہستہ آہستہ ان کی جاگیروں کے ٹکڑے اپنے نام لکھا لیتے تھے۔ نگینہ کے کچھ وکیلوں نے بہت شہرت پائی۔ سب سے زیادہ مشہور ہوئے حافظ محمد ابراہیم جو وکالت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی داخل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے مرکزی وزیر اور آخر عمر میں گورنر ہو گئے تھے۔

شعر و شاعری کا شوق جاگیر داروں سے ہوتا ہوا عام لوگوں تک بھی پہونچ گیا تھا، اس لیے میرے لڑکپن میں شاعروں کی خاصی تعداد تھی وہاں۔ داغ کے شاگرد اختر نگینوی زندہ تھے، ان کے علاوہ بابو فخرالدین محزوں اور خورشید عالم شمسی قابلِ ذکر شعراء تھے مجھے بھی ۱۹۳۸ء سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔ شروع شروع میں تو روایتی غزلیں کہیں۔ پھر طبیعت نے کہا ع

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

چنانچہ اس وقت کی نہایت جدید تحریک "حلقۂ اربابِ ذوق" سے متاثر ہوا۔ غزل گوئی ترک کی اور جدید طرز کی نظمیں کہنی شروع کیں۔ پہلے سید شوکت علی شوق نگینوی کے نام سے لکھتا تھا اور معمولی رسائل میں چھپتا تھا۔ پھر نیا رنگِ سخن ہی نہیں، نام بھی نیا اختیار کیا — رفعت سروش — اور اسی نام سے لاہور کے اعلا معیاری رسائل میں چھپا۔ ہمایوں۔ ادبی دنیا اور شاہکار وغیرہ۔ یہ ۱۹۴۳ء کے اوائل کی بات ہے، اس نام اور اس وقت کے نئے کلام کو اس قدر مقبولیت ملی کہ میں بھول ہی گیا کوئی سید شوکت علی شوق بھی تھا — (مگر اب مجھے وہ معصوم بچہ بہت یاد آتا ہے)

۱۹۴۳ء کے وسط میں، میں دہلی آیا اور حالات کے جبر نے مجھے نوکری کرنے پر آمادہ کیا۔ ان دنوں دوسری عالمگیر جنگ شباب پر تھی۔ شہر شہر جنگ کے دفتر کھلے ہوئے تھے اور دہلی تو جنگی دفتروں کا اڈا تھا۔ ان دفتروں میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد تھی میں بھی جی ایچ کیو میں بھرتی ہو گیا اور دو سال دہلی میں نوکری نہیں نوکریاں کرتے گزارے۔ دو سال میں چار پانچ دفتر بدلے۔

میرا ادبی ذوق دہلی آکر خوب پروان چڑھا۔ صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں کی صحبتیں میسر آئیں۔ اس پر مستزاد صفِ اول کے رسائل میں میری نظموں کی مسلسل اشاعت! ایک سرور سا تھا صبح شام ملنے والوں میں نہال سیوہاروی، عطا محمد شعلہ، جمیل الدین

مجاز، شکیل بدایونی، راز مرادآبادی، محمد حسن عسکری، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی اور بہت سے نوجوان شعراء۔ مجاز کی صحبت نے ترقی پسند تحریک کی طرف متوجہ کیا اور جب وسط ۱۹۴۴ء میں بمبئی پہونچا تو وہاں کے ماحول نے میری فکر کو اور مجلّی کیا۔ بمبئی پہنچ کر میں ترقی پسند مصنفین کی جماعت کا ایک فرد بن گیا۔ سید سجاد ظہیر، سید سبط حسن، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، کرشن چندر، قدوس صہبائی، ساحر لدھیانوی ــ کس کس کے نام گنواؤں۔ میں ان دنوں بے تکان نظمیں کہتا تھا اور ناقدانِ ادب ہمت افزائی کرتے تھے۔

میں بمبئی گیا تو تھا فلمی گانے لکھنے کے شوق میں۔ فلمی دنیا کی خاک چھانتے چھانتے آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ڈائرکٹر سید ذوالفقار علی سے ملاقات ہو گئی اور انھوں نے ریڈیو میں نوکری کرنے کی ترغیب دی۔ ظاہر ہے کہ میں بمبئی کی سڑکیں ناپتے ناپتے تھک گیا تھا۔ نوکری کرنے میں ہی عافیت سمجھی ــ بس وہ دن اور ۳۱ جنوری ۱۹۸۴ء کی شام ــ

۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء سے جو ریڈیو کے دفتر میں قدم رکھا تھا تو عمر کے ۵۸ سال پورے کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر ہی اس دفتر سے اترا، اور اب بھی ع

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

ریڈیو سے تعلق باقی ہے۔ کبھی فیچر، کبھی ڈرامہ، کبھی نظم۔ کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا ہوں ریڈیو کے لیے ــ درا صل آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت نے مجھے بہت کچھ دیا۔ یعنی گذر اوقات کے لیے روپئے کے علاوہ ــ ریڈیو میں مجھے بخاری صاحب جیسے نابغۂ روزگار سے براڈکاسٹنگ کے نکات سیکھنے کا موقع ملا۔ ریڈیو نے سکھایا کہ لفظ کی اہمیت کیا ہے۔ لفظ کا استعمال کیسے کیا جاتا ہے انسان سماجی زندگی کا جزو ہے۔ اس جزو اور کل کا رشتہ کیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی کیا اہمیت ہے اور آپ ریڈیو سے اپنی آواز یا دوسروں کی آوازیں نشر کر کے کتنا بڑا سماجی فرض پورا کر رہے ہیں اور ان فرائض کی ادائیگی میں کس قدر ذمہ داری کی ضرورت ہے یہ تمام باتیں میرے ذہن کا ایک حصہ ہی نہیں بن گئیں بلکہ میرے خون میں رس بس گئی ہیں۔

اس تناظر میں جب میں آج کل کی نشریات سنتا ہوں یا ٹیلی ویژن پروگرام دیکھتا ہوں تو کس قدر کوفت ہوتی ہے، اس کا بیان مشکل ہے ذرائع ابلاغ غیر محسوس طور پر اور بغیر اعلان کیے ملک اور معاشرہ کی تربیت کا فرض ادا کرتے ہیں۔ انسان کو زیادہ مہذب بناتے ہیں، زندگی کرنے کا بہتر سلیقہ سکھاتے ہیں۔ مگر آج ہمارے ذرائع ابلاغ نے "ترقیِ معکوس" کی ہے ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مگر اس بے لگام گھوڑے کو کہیں تو لگام دینی پڑے گی اور اس کی دراز رسی کو تنگ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ معلوم نہیں کہ نئی نسلوں کی تباہی کی رفتار کتنی تیز ہو جائے گی۔

میری رسمی تعلیم بھی ٹکڑوں میں ہوئی۔ نگینہ میں اسکول چھوڑا تھا تو بمبئی میں کالج جوائن کیا ــــــ دوسرے معنوں میں میں "کالج لائف" کی رنگینیوں سے محظوظ نہ ہو سکا۔ ہمارے طبقے کے اکثر نوجوانوں کا یہی المیہ رہا ہے۔ غریبی ہر ہر موڑ پر شب خون مارتی ہے۔

میں بمبئی میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۸ء تک رہا۔ یہ عرصہ میری تخلیقی سرگرمیوں کے عروج کا دور ہے۔ دوستیاں، رنجشیں، معاصرانہ چشمکیں، خطرات سے کھیلنا، بے خوف ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرنا اور اس پر اڑ جانا۔ یہ سب مجھے بمبئی نے سکھایا۔ میں نے اپنے قلم اور اپنی تخلیقی قوتوں کو پہلے سامراج کے خلاف اور پھر سماج کے ٹھیکیداروں کی غلط روش کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے استعمال کیا۔ میری تحریروں کی رگوں میں ترقی پسند جذبات و احساسات موجزن ہیں۔ مگر میں نے ادب کو ادب ہی سمجھا اسے صحافت کے درجے تک گرنے نہیں دیا۔ میری بمبئی کی زندگی بہت سے تجربات سے عبارت ہے۔ میری کتاب "بمبئی کی بزم آرائیاں" اس کا آئینہ ہے جس میں اپنے دوستوں اور اپنے ماحول کی لفظی تصویریں پیش کی ہیں۔

۱۹۵۸ء میں میرا تبادلہ ودودھ بھارتی کے پروڈیوسر کی حیثیت سے

آل انڈیا ریڈیو دہلی ہو گیا اور تب سے آج تک اسی شہر میں مقیم ہوں۔ [illegible] بھارتی سے ۱۹۶۴ء میں اردو مجلس کا پروڈیوسر مقرر ہوا اور اس ادبی اور ثقافتی پروگرام کو مقبولیت کی اعلیٰ سطح تک پہونچا دیا (یہ عام لوگوں کا خیال ہے) دہلی آکر میری ادبی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ یہاں ترقی پسند خیالات کے لیے جگہ کم تھی اور ماحول کلاسیکی ادب شعر کا عادی تھا۔ اس ماحول میں اپنے لیے مناسب جگہ پیدا کرنا دشوار مرحلہ تھا۔ بزرگانِ ادب جیسے تلوک چند محروم، زار دہلوی، بیخود دہلوی، منور لکھنوی، عرش ملسیانی، گوپی ناتھ امن وغیرہ حیات تھے، ان کے گلے سے شاعری کے نئے تجربے نہیں اترتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساغر نظامی، روشن صدیقی، علی جواد زیدی، جگن ناتھ آزاد، سلام مچھلی شہری، مخمور جالندھری اور فکر تونسوی وغیرہ بھی تھے جو نئی روشنی اور نئے تجربوں کا استقبال کرتے تھے۔ پھر ہماری نسل کے بعد آنے والوں کا نیا قافلہ تیار ہو رہا تھا (جو آج بہت توانا ہے) ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر قمر رئیس، بلراج کومل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غرض اس نئے شہر میں، جو آزادی کے بعد بہت بدل چکا تھا۔ میں نے اپنا نیا سفر شروع کیا۔ دفتر کی منصبی ذمہ داریوں کے علاوہ میری مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ آئے دن کے مشاعرے، شہر شہر مشاعرے پڑھنا، ایک شوق ہی نہیں ضرورت بن گیا تھا۔

اب تک میرا کوئی مجموعہ کلام نہیں شائع ہوا تھا جس کی وجہ میرے ذاتی حالات تھے۔ ۱۹۶۳ء کے شروع میں میرا پہلا مجموعہ "وادیٔ گل" شائع ہوا جس میں جدید رنگ و آہنگ کی نظمیں تھیں۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۲ء تک کا منتخب کلام۔ اور اس کے بعد میرے منظوم ڈراموں کا مجموعہ "عروجِ آدم" چھپا۔ گویا میری شاعری کی [illegible] سامنے آ گئیں۔ عروجِ آدم دراصل ان ریڈیائی [illegible]

اور ڈانس ڈرامے دہلی کے مشہور ثقافتی اداروں نے بہت شان سے پیش کیے۔ ان میں قابلِ ذکر ہیں "جہاں آرا"، "شاہجہاں کا خواب"، "حبہ خاتون"، "انارکلی"، "جہانگیر"، "روشنی کا کارواں"، "شانِ مغل"، "رنگ بسنتی"، "عورت" اور "قوس قزح" وغیرہ۔

ان اوپیراؤں اور ڈانس ڈراموں کو میں نے کتابوں کی صورت میں چھاپا۔ اس صنفِ ادب پر میری سات کتابیں ہیں جنھیں ناقدانِ ادب نے سراہا ہے اور مختلف اداروں اور اکیڈمیوں نے انعامات سے نوازا ہے۔ مختصر نظموں اور غزلوں کے بھی کئی اور مجموعے "وادیٔ گل" کے بعد شائع ہو چکے ہیں۔ "نقش صدا"، "ذکر اس پری وش کا"، "میری صدا کا غبار"، "کرب تنہائی"، "شاخِ گل"، "روشنی کا سفر"، "وادیٔ غزل"۔ یہ سب ایسے مجموعے ہیں جنھیں کئی کئی اکادمیوں نے انعامات سے نوازا۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اپنے دل کی بات میں نے اپنی مختصر نظموں اور غزلوں میں ہی کہی ہے۔ اگرچہ اوپیرا اور منظوم ڈرامے میری پہچان بن گئے ہیں۔

ریڈیو نے نثر لکھنے کا شوق بھی پیدا کیا۔ کیوں کہ ریڈیو پر بولنے والا اگر با محاورہ، رواں دواں اور سلیس زبان نہ لکھے تو وہ براڈکاسٹر نہیں۔ چنانچہ جب مجھے ذرا وقت ملا اور میں نے کچھ مضامین لکھے تو اہلِ ذوق نے میری نثر کی بہت تعریف کی۔ ہمت بڑھی۔ چنانچہ ذاتی تاثرات اور تنقیدی رنگ لیے ہوئے میرے مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "نقوشِ رفتہ"، "قلم کے [illegible]" اور "قافلہ"۔ پھر "بمبئی کی بزم آرائیاں" کے بعد "اور بستی نہیں یہ دلی ہے" لکھی۔ یہ خودنوشت ہے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۹۲ء تک پوری زندگی اور ماحول کا احاطہ کرتی ہے۔

ایک ناول "ریت کی دیواریں" اور نثری ڈراموں کے ۲ مجموعے [illegible]

نصف صدی سے زیادہ کا میرا تخلیقی سفر مجھ پر کئی راز افشا کر چکا ہے۔ میں شہرت اور معیار کو دو الگ الگ چیزیں مانتا ہوں۔ ہمارے دور میں بہت سے ادیب اور شاعر اس بات کی مثال ہیں کہ وہ بعض وجوہ کی بنا پر بہت مشہور ہیں، مگر ان کا کلام اس معیار کا نہیں۔ دراصل گروہ بندی نے اس وبا کو عام کیا ہے۔ گروہی تنقید نے بہت سے لوگوں کو بانس پر چڑھا دیا اور بہت سے مستحق لوگوں کو زمین سے اُٹھنے ہی نہیں دیا۔ مگر میرا ایقان ہے کہ وقت سب سے بڑا نقاد ہے ؎

مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

یہ دور افراط و تفریط کا دور ہے، بے شمار لکھا گیا ہے۔ وقت کی زد سے کیا بچے گا اور کیا ختم ہو جائے گا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ادیب اور شاعر جو اپنی کوئی انفرادیت رکھتے ہیں، ہر طلوع ہوتے ہوئے نظریے یا فلسفے کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ اور میرا خیال ہے کہ کل کو ان کا نقش باقی رہے گا۔

میرا قلم ہنوز چل رہا ہے، کوشش کرتا ہوں کہ ہر نیا شعر پہلے سے بہتر ہو۔ ہر نیا مضمون پہلے سے زیادہ جاندار ہو۔ اب ہم کیا کر سکے ہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ میں ۱۹۸۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈیڑھ سال غالب انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر رہا۔ اس کے بعد کسی کی نوکری نہ کرنے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ اب اس سال سے اپنا پورا وقت مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں ہی صرف کرتا ہوں۔

میں نے مشاعروں اور سیمیناروں کے سلسلے میں ہندستان کے مختلف شہروں کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کی۔ مثلاً سوویت یونین۔ عراق۔ عرب۔ پاکستان ـــ اس دور نے مجھے میری بساط سے زیادہ نوازا ہے۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، غالب ایوارڈ، آغا حشر کاشمیری عالمی ایوارڈ، میر ایوارڈ، نشان سجاد ظہیر۔ اور ان کے علاوہ دہلی۔ یوپی۔ بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیاں تقریباً ۱۵ اعزاز میری مختلف کتابوں کو دے چکی ہیں۔ میری نظمیں بہت سی کتابوں میں شامل کیے گئے ہیں۔ میرے کچھ تنقیدی ڈرامے اور مضامین درسی کتابوں میں بھی شامل ہیں۔ میرے منظوم ڈراموں پر ۱۹۸۶ء میں رعنا نور صاحبہ نے ایم۔اے کے لیے خصوصی مقالہ لکھا تھا اور بھوپال کی ایک طالبہ علیہ سلطان "رفعت سروش، شخصیت اور فن" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہی ہیں۔

اس وقت میری عمر ستر برس کے قریب ہے مگر ابھی کام کرنے کی قوت بحمداللہ موجود ہے اور مجھے امید ہے کہ جو کچھ اب تک لکھ چکا ہوں اس سے کچھ اور بہتر لکھ سکوں گا ؎

میں لفظ لفظ ہوں سروش اک یقینِ زندگی
میں حرف حرف اپنا اعتبار چھوڑ جاؤں گا

□□

غزل

کسی کی زلفِ معنبر کا سُرخ پھول کرے
نہ جانے کون سی ساعت ہمیں قبول کرے

یہ زندگی تو بہر حال قرض ہے اس کا
وہ جتنی قسطوں میں چاہے ہمیں وصول کرے

میں اس کے دستِ تصرّف میں ہوں وہ جب چاہے
مری ستارہ صفت خواہشوں کو دُھول کرے

وہ ایک پل مری آوارگی کا حاصل ہے
جو عمر بھر کے لیے مجھ کو با اصول کرے

اسی امید پہ اک عمر کٹ گئی عامرؔ
کوئی تو ہو جو ہمیں بے سبب ملول کرے

ڈاکٹر عامر ریاض

[illegible]

غزلیں

سب سے مہان میں ہوں، بلند آسمان میں
بہکار ہے تھے آپ مگر بھائی جان میں

میرا لہو رگوں میں تمہارے لیے رواں
میری نماز تم ہو، تمہاری اذان میں

تنکا ہوں، آئے آگ دکھائے کوئی مجھے
آندھی اُدھر کھڑی ہے ادھر دھان پان میں

میری جبیں پہ خاک ترے آستانے کی
چھوڑ آیا کہکشاں پہ قدم کے نشان میں

بس ایک آنچ کی ہے کسر، جل چکے ہیں پر
اے میرے شب چراغ، مرے مہربان میں

حاجت مرے بدن کو ترے خون کی نہیں
اے دوست لے رہا تھا ترا امتحان میں

مقطع مدد کو آئے مظفرؔ کنارے سے
گردابِ شعر چار طرف، درمیان میں

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر آف اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی
کلکتہ ۷۳۰۰۰۷

ذہن کیوں پتھر نہیں کس جُرم کا آخر ثمر ہے سوچنا
کس لیے اپنا مقدر سوچنا اور عمر بھر ہے سوچنا

وقت کے گرداب میں اک بے جہت تنکے کی صورت آدمی
اک بگولا کہہ رہا تھا زندگی اندھا سفر ہے سوچنا

ایک لقّ ودق بھیانک بے اماں بنجر بیاباں چار سو
آنکھ پتھر، دست و پا شل، کیا کوئی راہِ مفر ہے؟ سوچنا

گھر سے باہر بھی نہ نکلے ہم کہ چہرے پر سیاہی پوت دی
کس قدر مشاقِ فن اک فرقۂ اہلِ ہنر ہے سوچنا

جیسے رگ رگ میں ہر کوئی نوکِ نشتر اور لہو سب زہر ہے
تن کو پیہم چاٹتی کوئی زبانِ مرگ اثر ہے، سوچنا

کثرتِ نظارۂ صد رنگ سے حیران و خیرہ ہے نظر
اور اس پر زندگی خود فرصتِ یک دو نظر ہے سوچنا

گھنٹیاں گھنٹے بھجن بھی ہے اذانیں کیرتن غوغا و غُل
تو بھی عابدؔ، کیا خدا بندوں سے اتنا بے خبر ہے سوچنا

عابد پیشاوری
پروفیسر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی
جموں توی ۱۸۰۰۰۱

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

تلاشِ معنی

اشعار کا انتخاب کوئی حساب کا فارمولہ نہیں ہے کہ جو ایک شخص کو پسند ہو وہ دوسرے کے لیے بھی قابل قبول ہو۔ مزاج شعری اور جمالیاتی ذہنی انتخاب کے وقت شعوری اور لاشعوری طور پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں جب فانی کا یہ شعر پڑھا تو معلوم نہیں کیوں اتنا پسند آیا کہ آج تک نہ بھول سکا۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

آج عمر اور ذہن کی پختگی کی اس منزل پر بھی مجھے یہ شعر پسند ہے۔ اس وقت شعر کی تشریح ممکن نہ تھی مگر آج محسوس کرتا ہوں کہ محبت کو جس بلند مقام پر فانی نے پہونچا دیا اس تک پہونچنا ہر شاعر کے بس کا کام نہیں تھا۔

شعر میں بنیادی اہمیت اس کے جمالیاتی احساس کی ہے۔ وہ معاملہ حسن و عشق کا ہو یا مسائل زندگی کا۔ اگر جمالیاتی اقدار کا فقدان ہے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر شعر نہیں ہو سکتا۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل کو اسلئے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں تغزل رچا ہوا انداز جمالیاتی وصف کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھئے اور شاعر کے جمالیاتی ذوق کی داد دیجئے ؎

خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی — آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

فانی بدایونی

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعوا ہے شکیبائی کا
آپ نے خیر ستم سے تو نوازا ورنہ — کون دنیا میں محبت کا صلا دیتا ہے
کس سے کہوں کہ حسن کی خلوت میں بار یاب — آئینہ ہو سکا، دل حیراں نہ ہو سکا

جوہر بدایونی

دورِ حاضر کے کسی شاعر نے محبت کی کتنی نفسیاتی حقیقت کو بیان کیا ہے ؎

ترکِ تعلق تم نے کیا ہے — بولنا سب سے چھوڑ دیا ہے

غالب نے رشک کے مضمون کو کتنے حسن کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

محبت کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کشمکش کا حیرت انگیز اظہار میکش بدایونی کے اس شعر میں ملتا ہے ؎

اظہار محبت پہ عجب حال ہے ان کا — آنکھیں تو رضا مند ہیں، لب سوچ رہے ہیں

غزل میں اگر ایک طرف عشق و محبت کے معاملات کا اظہار ہوا ہے تو دوسری طرف شاعر کا حساس دل اپنے گرد و پیش کے واقعات سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ ذیل کے اشعار کے پس منظر میں سماجی، سیاسی، معاشی انتشار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میر نے خواہ اپنے عہد کی داستان بیان کی ہو مگر اس کی صداقت ہر زمانہ میں آشکار ہے ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

"دل" کو علامت مان لیجیے تو شعر کی وسعت اٹھارویں صدی سے پھیل کر بیسویں صدی سے آ کر مل جاتی ہے۔ "سنو ہو" کے ٹکڑے نے جو بے ساختگی پیدا کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں دوسرے انداز میں استفہام میں جواب بھی پوشیدہ ہے ؎

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل — یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد؟

اس خیال کو جوہر بدایونی نے دوسرے پیرایے میں پیش کیا ہے ؎

ہمدم اسی بہار کے آنے کی دھوم تھی — اک گوشۂ قفس بھی گلستاں نہ ہو سکا

وہ لوگ جو غزل کے مزاج سے واقف نہیں ہیں انھوں نے غزل کی علامتوں پر فرسودگی کا الزام لگایا ہے مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ علامتیں اپنے زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ اپنا دائرہ بدلتی رہتی ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر یہ علامتیں ہمارا ساتھ دیتی ہیں اور نئے معانی اور مفاہیم کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔

کچھ اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اظہار برمحل ہو جائے تو شعر کا لطف

دو بالا ہو جاتا ہے۔ ایسے اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ میر کا مشہور شعر ہے ؎

اب تو جاتے ہیں بت کدہ سے میر　　پھر ملیں گے اگر خدا لایا

مومن کا شعر تو یاد ہوگا۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے پالیمنٹ میں فریق مخالف کے جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا　　(اکبر)

ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو نئے سال کی مبارک دیتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ یہ سال سازگار ہوگا۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی نے اپنے شذرات میں اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے غالب کا یہ شعر لکھا تھا ؎

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

خواجہ میر درد کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے ؎

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

یگانہ نے درد کے شعر سے شاید متاثر ہو کر کہا تھا ؎

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش　　دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

فانی کے اس شعر کی مقبولیت کا اندازہ ہوگا ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

یہ اشعار بغیر کسی جستجو کے پیش کئے گئے ہیں۔ ان اشعار کی معنویت یہ ہے کہ ان کی گرہیں کھولتے چلے جایئے معانی کا بے کراں سمندر سامنے نظر آ جائے گا اور کہیں بھی شعر کا جمالیاتی احساس مجروح نہیں ہوگا۔ یہ اشعار ہر دور میں اپنے نکھار کے ساتھ تازگی کے ضامن رہیں گے ؎

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و میخانہ کوں
دیکھتا ہوں پر کہاں دیتا ہے تجھ مکھ کا صفا　　(قلی قطب شاہ)

کسی نے سہل ممتنع کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کی نثر نہ ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ اس کی نثر شعر کے لب و لہجہ ہی میں ممکن ہے۔ تاریخ ادب کا واقعہ تو سنا ہوگا کہ مومن خاں کے ایک شعر پر غالب اپنا پورا دیوان نذر کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔ غالب کے اس عہد میں بھی ... سہل ممتنع کی تعریف کا اظہار مقصود تھا۔ اب قلی قطب شاہ کے اس شعر کو پڑھئے ؎

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و میخانہ کوں
دیکھتا ہوں پر کہاں دیتا ہے تجھ مکھ کی صفا

محسوس یہ ہوگا کہ کوئی لفظ لغت کا محتاج نہیں ہے اور یہی شعر نثر کا بدل بھی قرار پائے گا۔ اس شعر کے فنی محاسن میں اس کی سادگی اور بے ساختہ پن ہے۔ ع دامن دل می کشد کہ جا اینجا است "میں نہ جانوں" میں جو برجستگی اور بے تکلفی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہ ہوگی۔ اس کے ساتھ متضاد چیزوں "کعبہ" "بت خانہ" اور "میخانہ" جو ہم آہنگی پیدا کی ہے اس نے ایک طرف شعر میں لطف پیدا کر دیا ہے اور دوسری طرف اس کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ مجھ کو کعبہ و بت خانہ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میرا مقصود نظر محبوب کی ذات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں محبوب سے مراد محبوب حقیقی ہے۔ شاعر کا کعبہ اور بت خانہ سے تعلق اگر ہے بھی تو صرف اس لئے کہ وہ محبوب حقیقی کے عکس ہیں۔ وہ کعبہ اور بت خانہ میں حقیقت کا متلاشی ہے ان میں اگر نور ایزدی نہیں ہے تو ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ غالب نے کہا ہے

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

شاعر بین السطور میں یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ کعبہ اور بت خانہ عبد اور معبود کے درمیان پردہ ہیں۔ جب تک درمیان سے یہ پردے نہیں ہٹیں گے، دیدار بھی ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے فانی نے کہا تھا ؎

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

اس میں کوئی شک نہیں کہ قلی قطب شاہ کا شعر سادگی کی وجہ سے دل پر اثر کرتا ہے مگر معنی کے اعتبار سے بھی اس کی تہہ میں پہونچنے کی کوشش کیجئے تو معنی در معنی پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سادگی دکنی شاعری کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے اور قلی قطب شاہ بھی اس ورثہ کے محافظ تھے۔ اگرچہ ان کا رجحان تصوف کی طرف نہیں تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جو اشعار صوفیانہ رنگ میں کہے ہیں وہ "آرائش گفتار" کی خاطر نہیں کہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں صوفیانہ اشعار کی نہ تعداد زیادہ ہے اور نہ ان میں تنوع ہے۔ البتہ ان کے اظہار میں خلوص کا عنصر نمایاں

سادگی ہے۔ قلی قطب شاہ کا مزاج دہبلا تھا اسلئے صوفیانہ افکار میں گہرائی اور گیرائی نہیں ملے گی۔ ان اشعار کے پس پردہ عوام کی تصوف سے دلچسپی کا اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح قلی قطب شاہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ تصوف کا ایک مثبت اثر ان کی شاعری پر یہ ضرور پڑا کہ انسانوں سے محبت انکا عقیدہ بن گیا۔ ایک دوسرے شعر میں اسی خیال کو پیش کرتے ہیں ؎

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت کیا ہر اک ریت میں عشق کا راز ہے

قلی قطب شاہ دوسرے صوفی شعرا کی طرح کفر و ایمان۔ دیر و حرم۔ کعبہ و بت خانہ ایک ہی تصویر کے مختلف رخ خیال کرتے ہیں۔ جسطرح سورج کی کرنیں ظاہری نظر میں کثرت کی نمایندگی کرتی ہیں مگر اصل میں ان کا منبع ذات واحد ہے۔ سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔

"وہ حسن ہزار شیوہ کی ہر ادا کو نظر فریب اور قابل پرستش سمجھتا ہے۔ تعینات اور امتیازات کی قید سے آزاد ہونے کی کوشش صوفی شعرا کی طرح محمد قلی کے یہاں بھی ہے"

موضوع سے قطع نظر اس زمانے کی زبان کی قدامت کو ذہن میں رکھئے اور اس شعر کی سادگی پر نظر ڈالئے۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی یہ زبان نہ صرف یہ کہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے بلکہ کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تصوف کو بعد کے لوگوں نے فلسفہ بنا دیا اور فلسفہ اچھے اظہار خیال کے لئے دقیق پیرایہ بیان چاہتا ہے مگر قلی قطب شاہ نے تصوف کو فلسفہ نہیں بننے دیا بلکہ اس کو لوگوں کی دھڑکنوں سے وابستہ کر دیا۔ اور یہی مخصوص لب و لہجہ اس شعر کی انفرادیت ہے ؎

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ کیا دوانے نے موت پائی ہے

(میر تقی میرؔ)

اس شعر کو پڑھئے تو محسوس ہوگا کہ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے لئے لغت کا سہارا لینا پڑے اور لطف یہ ہے کہ اس شعر کو نثر میں ادا کرنا چاہیں تو شعر ہی نثر کا بدل قرار پائے گا۔ علمائے ادب نے سہل ممتنع کی تعریف یہ کی ہے کہ شعر کی سادگی اس منزل پر ہو جہاں نثر میں اس کو بیان کرنا ممکن نہ ہو۔ اس شعر کی سادگی کے ساتھ اس کی بے ساختگی بھی قابل غور ہے۔ لفظ "دوانے" نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ فصاحت کی معراج ہے۔ "عقل گم ہونا" ایک طرف حیرانی کی وسعت لئے ہوئے ہے اور دوسری طرف اس جگہ پر استعمال نے معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔ میرؔ کے اس شعر کے دوسرے مصرعہ کی خوبی یہ ہے کہ ایک طرف وہ ضرب المثل بن گیا ہے اور دوسری طرف اس پر غور کیجئے تو اس میں معانی کی تہیں کھلتی چلی آئیں گی۔

مجنوں عشق لیلیٰ میں اتنا وارفتہ ہوا کہ اس کو اپنے وجود کا بھی احساس نہیں رہا اور اسی عشق نوردی میں اپنی جان دیدی۔ دوسرا مصرعہ "کیا دوانے نے موت پائی ہے" یہ جملہ استفہامیہ بھی ہے اور اس میں تعجب بھی شامل ہے کہ "کیا ایسا بھی ممکن ہے" اور سوالیہ اثباتیہ بھی ہے کہ "ہاں! دوانے نے موت پائی ہے۔ یہ کارنامہ وہی انجام دے سکتا تھا۔ اس کی تشریح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے۔

۱ - مجنوں کی موت نے عقل گم کر دی ہے۔ شاید کوئی دیوانہ دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ اس کا سبب سمجھنے سے عقل عاجز ہے۔

۲ - کتنی قابل رشک ہے اس دیوانے کی موت جس تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

۳ - کیا کوئی موت ایسی بھی ہوتی ہے جو اہل خرد کے لئے سوالیہ نشان بن جائے اور اس کا سبب معلوم نہ ہوسکے۔

مجنوں کا لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے اگر اس کو علامت مان لیں تو ہر صاحب عشق جو اپنے مقصد کے لئے جان دے سکتا ہے اس کے لئے مجنوں کا انتساب جائز ہے۔ رام نرائن موزوں کا وہ شعر تو یاد ہوگا جو انھوں نے سراج الدولہ کی شہادت پر لکھا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

میرؔ کے اس شعر کے پس منظر میں میرؔ کی زندگی اور ماحول پر نظر ڈالئے تو یہ شعر زندگی کی دھڑکنوں سے اور بھی قریب ہو جائے گا۔ بقول خواجہ احمد فاروقی

"ان کے پیچھے تاریخی اور تمدنی لوازمات چھپے ہوئے ہیں۔ ان سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے"

محبت کی ناکامی۔ مالی پریشانی۔ احباب کی بے وفائی۔ اسی کے ساتھ احساس کی شدت کہ جو عزیز تھے وہ ذلیل ہو گئے۔ ذلیلوں کو منصب اور اقتدار ملا۔ ان حالات کو میرؔ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ "اس ہوئے خون کے خود بھی شناور تھے" اسلئے ہر وہ چوٹ جو کسی پر

پائی تھی اس کے سبب وہ بیزاری محسوس کرتے تھے۔ اس لئے کسی نے کہا تھا کہ میر کی شاعری دلی اور دل کا مرثیہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ میر کے ناقد یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ اس مرثیہ سے الگ ہٹ کر ان کے یہاں زندگی کے مستند عناصر بھی موجود ہیں۔ جہاں کبھی کبھی موت زندگی کی علامت بن جاتی ہے۔

بقول اقبال: ؎ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

چنانچہ اس شعر میں بھی موت زندگی کی علامت بن کر قابل رشک ہو گئی ہے مگر زندگی اور موت کا یہ فلسفہ ہنوز حل نہ ہو سکا۔ اہل خرد اسی جستجو میں رہے کہ "مرگ مجنوں" کی حقیقت کا سراغ لگا سکیں مگر شاید اس راز کو سمجھنے کے لئے بھی فرزانگی کی بجائے دیوانگی کی ضرورت ہے۔

اس شعر کے پس منظر میں "عقل و عشق" کی کشمکش کو بھی ذہن میں رکھئے۔ جس میں عام طور سے ہمارے صوفیہ اور شاعروں کی تائید عقل کے مقابلے میں عشق کے حق میں ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عشق زندگی کو سود و زیاں کے پیمانے سے نہیں ناپتی اور نہ اس کے یہاں چوں و چرا ہے۔ یہ عشق کا معجزہ ہے کہ وہ "آتش نمرود" اس کے لئے "گلزار خلیل" بن جاتی ہے اور یہ عقل ہے "محو تماشائے لب بام ابھی" اس شعر میں بھی عقل کی بے بسی ظاہر ہے۔ مجنوں جو عشق کی نمائندگی کر رہا ہے اس کے راز اس کے ساتھ پردۂ خفا میں ہیں۔ اس وضاحت کے بعد شعر کو دوبارہ پڑھیے تو انکشاف معنی کا ایک نیا لطف آئے گا ؎

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ کیا دوانے نے موت پائی ہے

پنجہ ہے مراپنجۂ خورشید میں ہر صبح میں شانہ صفت سایہ رو زلف بتاں ہوں

(میر تقی میرؔ)

شعر کا مطلب بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رعایتوں کی وضاحت کر دی جائے، جو شعر کی بنیاد ہیں۔

"وہ پنجۂ خورشید" میں اضافت تشبیہی کی بجائے بہتر یہ ہے کہ "اضافت تخصیصی" مانا جائے۔ ظاہر ہے کہ سورج کی کرنوں کو پنجہ قرار دیا جائے۔ اس کے ساتھ شانہ کو بھی پنجے سے تشبیہ دی جاتی ہے پنجہ میں پنجہ ہونا کے معنی زور آزمائی کرنے کے ہیں مگر محاورے میں برابری کا دعویٰ مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ فارسی میں متعارف ہے۔ "پنجہ با خورشید می زند" یعنی خورشید سے ہمسری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ صبح کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وہی خورشید کے طلوع کا وقت ہے۔ سایہ رو زلف بتاں: حسینوں کی زلفوں کے سایہ میں چلنے والا، کنگھی زلفوں کے سایہ میں چلتا صاف اور واضح ہو۔ شانہ وغیرہ کی تشبیہ ... خورشید کی مراۃ التخیر اور خورشید و زلف میں ایک طرح کا تقابل ہے۔

ان رعایتوں کو جانے بغیر شعر کا مطلب واضح نہیں ہو سکتا تھا۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں کنگھی کی طرح ہمیشہ حسینوں کی زلفوں کے سایہ میں رہتا ہوں۔ گویا میری دسترس حسینوں کی زلف تک ہے۔ اس اعزاز پر میرا رتبہ اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ میں خورشید سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ یعنی خورشید روشنی کا سبب بڑا کرہ سہی مگر میں سواد زلف سے تعلق رکھنے کے باوجود بلکہ اس کی بدولت خورشید کا ہم رتبہ ہوں۔

شعر میں میرؔ نے اپنی قنوطیت کے خلاف ایک طرح کی رجائیت اور تعلی سے کام لیا ہے۔ تاہم اس میں رعایتوں کی مناسبت سے تصنع پیدا ہو گیا ہے اور جذبات کی گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ "ہر صبح" سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق صرف صبح سے ہے دن کے باقی اوقات سے نہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جہاں صبح ہوئی (یعنی آفتاب طلوع ہوا) میں اس سے حریفانہ برابری کرنے لگتا ہوں۔ اس میں دن کے باقی اوقات کی نفی نہیں ہے۔ بلکہ آفتاب سے برابری کرنا دن کے تمام اوقات پر حاوی ہے کیونکہ جب تک سبب (زلف بتاں کا تعلق) موجود ہے اس کا نتیجہ (پنجۂ خورشید سے ہم پنجہ ہونا) بھی لازماً پایا جائے گا ؎

پاؤں کو دیوار زنداں میرا دامن ہو گیا ناتوانی سے گریباں طوق گردن ہو گیا

(ناسخ)

غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ جب ناسخ کا کلام دلی پہونچا تو اس وقت ہم تین شاعر باذاق اور نام بر آور تھے۔ میں۔ مومن اور ذوق۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی مگر مومن خاں نے جو پہلے شاہ نصیر کے شاگرد تھے، ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرف توجہ کی اور میں نے بھی۔ مگر بعد کو میں نے میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے قدیم رنگ میں رہے۔ یہاں دلچسپ امر قابل غور ہے کہ شاہ نصیر جن کا سکہ رائج الوقت تھا اور ان کا براہ راست تعلق دلی کے دبستان شاعری سے تھا ان کی تقلید چھوڑ کر اس عہد کے نامور شعرا نے ناسخ کے انداز سخن کو اپنا رہنما بنا لیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نصیر کی شاعری میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اس کے مقابلے میں ناسخ کے یہاں دائرہ فکر محدود ہونے کے باوجود کچھ نئے امکانات کے نقوش نظر آتے ہیں۔ بقول نور الحسن ہاشمی: ـــــ

لکھنؤ کی رعایت لفظی اور تمثیل رنگ کا اثر نمودار ہونے لگا تھا۔"

غزل کا تعلق چونکہ معاملہ بندی سے ہے اور معاملہ بندی کا گہرا تعلق خیال بندی سے ہے اس لئے دہلی اور لکھنؤ کا یہ امتزاج غزل میں نکھر کر سامنے آگیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب طرز ناسخ میں شعر کہنا باعث افتخار خیال کیا جاتا تھا۔" ناسخ کے کلام کی بڑی خصوصیت تمثیل ہے۔" اس کے علاوہ خشک اور خیالی مضامین۔ نادر اور غریب تشبیہات۔ سنگلاخ زمینیں اور مبالغہ جو اکثر اغراق کی منزل سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ غالب اور مومن کے ابتدائی کلام پر نظر ڈالئے تو یہی خصوصیات نمایاں نظر آئیں گی۔ ناسخ کا جادو تھا جو اس عہد پر چھایا ہوا تھا۔

اس تمہید کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ناسخ کے ذہن کا تجزیہ کرنے میں سہولت ہوگی۔ اب اس شعر کو پڑھئے۔

پاؤں کو دیوارِ زنداں میرا دامن ہوگیا   ناتوانی سے گریباں طوق گردن ہوگیا

شاعر کہتا ہے کہ میرا پاؤں دامن میں الجھ گیا جس کی وجہ سے پاؤں گرفتار ہوگئے۔ گرفتاری کے لئے زنداں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زنداں کا کام میرے دامن نے کیا۔ میری ناتوانی کا یہ حال ہے کہ رہائی تو کیا ہوتی میرا گریبان میری گردن کا طوق بن گیا۔ لیجئے اسیری کی رسم مکمل ہوگئی۔ شاعر کا مقصد صرف اپنی ناتوانی کا اظہار ہے۔ باقی چیزیں دیوارِ زنداں۔ طوق گردن۔ دامن اور گریباں محض تکلفاتِ لفظی ہیں۔ مگر یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ عام طور سے گریبان کے چاک ہونے کا تو ذکر کیا جاتا ہے مثلاً میر کا مشہور شعر ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے   دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مگر گریباں کو "طوق گردن" کہنے میں ندرت یہ ہے کہ گریباں چاک نہیں ہوا ہے۔

زیر بحث شعر کو تکلفاتِ شعری کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ "دامن" کو "دیوار زنداں"، "گریبان" کو "طوق گردن" "پاؤں" کو "اسیر" کہنا محض ذہنی ورزش ہے۔ شاعر اپنی ناتوانی کی شدت بیان کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ طوق گردن ناتوانی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی زنداں کا خیال پیدا ہوا مگر ناتوانی اور قید خانہ کا باہمی ربط کس طرح پیدا کیا جائے۔ چوں کہ ناتوانی کا تعلق پاؤں سے ہے اسلئے دامن کو دیوار زنداں کے لئے منتخب کیا گیا۔ گریباں کو طوق گردن کے لئے انتخاب کیا گیا۔ لیجئے قید خانہ تیار ہوگیا۔ ابتدا میں بعض دہلوی شاعروں نے اس روایت کو اپنایا مگر دبستانِ لکھنؤ نے اس کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس میں نئے نئے راستے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی رنگ میں مومن خاں کا یہ شعر پڑھئے ؎

پاؤں زنداں سے لئے کیا سر اٹھاسکتے نہیں   حلقۂ زنجیر آخر طوق گردن ہوگیا

ناسخ اور مومن کے شعر کا تجزیہ کرتے وقت دونوں کے مزاج کے فرق کو سمجھنا ہوگا مومن کا تعلق دبستان دہلی سے ہے اسلئے جلد وہ اس کو چہ سے نکل گئے۔ ناسخ اپنے مزاج اور لکھنؤ کے ماحول سے بے نیاز نہ ہوسکے۔ اسلئے ابتدا سے آخر تک وہی رنگ سخن رہا۔ اہل لکھنؤ نے موضوع سے زیادہ زبان کی تراش خراش کو اہمیت دی صنائع بدائع۔ رعایت لفظی ان کا سرمایہ افتخار تھا۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔

"ناسخ اس وقت اپنے زمانے کے مزاج سخن اور معیار ادب کے نمائندے تھے" اس مزاج سخن کی وسعت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے دہلی اور لکھنؤ دونوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ معانی الفاظ کے تابع ہوتے ہیں۔ خیال شاعر کے ذہن میں ہوتا ہے اس کے اظہار کیلئے مناسب الفاظ کا ذخیرہ ہونا چاہئے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ اور معانی کے باہمی اشتراک اور توازن شعر کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں ؎

میری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے (غالب)

اس شعر کو سمجھنے کے لئے غالب کے ذہن کے تجزیہ کے ساتھ دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑیگا۔ پہلی بات یہ کہ غالب کا اگرچہ تصوف سے تعلق محض تفنن طبع کے اظہار تک ہے۔ ورنہ ان کا مسلک اور مزاج تصوف سے ہم آہنگ ہونے کو تیار نہیں ہے۔ البتہ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صوفیانہ مسائل کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے کوئی صوفی رموز تصوف بیان کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالب کی پوری زندگی ایک کشمکش کا شکار رہی ہے۔ "کعبہ کے کھنچے اور کفر کے روکنے" کی بات اسی کشمکش کا اظہار ہے۔ ہم زبان نہ ملنے کی شکایت۔ مفلسی اور اس پر یہ تمنا کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ در کعبہ اگر وا نہ ہوا تو واپس آگئے مگر نوابوں کی شان میں قصیدے لکھتے رہے۔ تصوف کو تفنن طبع کا ذریعہ خیال کرنا اور مسائل تصوف کی وجہ سے اپنے ولی ہونیکا دعوا۔ ایک نہیں اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ اس کشمکش میں وہ کسی نتیجہ پر پہونچنے کی بجائے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اس حیرت زدگی کی ایک مثال

[illegible] ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اب مندرجہ بالا شعر کو پڑھیے اور دیکھیے کہ جس 'حیرت' کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے اس کا اظہار یہاں کس طرح ہو رہا ہے۔ اس شعر کو تصوف کے دائرہ میں رکھ کر سمجھنا ہوگا ورنہ دوسرا مصرعہ بے ربط ہو جائے گا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے محبوبِ حقیقی سے جدا ہو کر جب دنیا میں آیا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ جس ہستی کو دیکھ کر آ رہا ہے وہی ہستی یہاں مختلف رنگوں میں موجود ہے۔ رنگوں کی یہ کثرت دیکھ کر اکثر لوگوں کو پہچاننے میں بھی دشواری ہوتی ہے بقول اصغر ؎

خودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

مگر وہ لوگ جو حقیقت کو جانتے ہیں وہ بھی رنگوں کی کثرت کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ جس ہستی کو دیکھ کر آ رہا ہوں وہ یہاں اتنے رنگوں میں جلوہ گر ہے اور اس عالم حیرت میں وہ نالہ کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ نالہ ذکر نے کا سبب ایک تو یہ ہے کہ 'عالم حیرت' میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ دوسرے نالہ تو اسلئے کیا جاتا ہے کہ محبوب حقیقی نے مجھے کیوں جدا کر دیا ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　وز جدائی ہا شکایت می کند

مگر اب وہی محبوب دوسرے انداز میں خود کار فرما ہے۔ تو نالہ کیوں کیا جائے۔

شعر میں معنی کے الجھاؤ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہستی کو "فضائے حیرت آباد تمنا" کہنا اور اس کے لیے "عنقا" کو فراہم کرنا اور اس کو "نالہ" سے تشبیہ دینا محض ذہنی ورزش ہے۔ شاعرانہ اعتبار سے بھی اس شعر کو کوئی خاص مقام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ شعر غالب کے ان اشعار میں سے ہے جن کو غالب کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان کے ذہنی ارتقا کے تسلسل میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا　　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

(بہادر شاہ ظفر)

ہمارے شعری سرمایہ میں رنج و غم کی داستان میر سے شروع ہو کر ظفر سے ہوتی ہوئی فانی پر ختم ہوتی ہے۔ ان تینوں کی زندگیاں غم و آلام کی [illegible] مگر غم کے اشتراک نے ان تینوں کو یکجا کر دیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر ابتدا سے آج تک برابر بحث چلی آ رہی ہے کہ اس میں شاعر کا حصہ کس قدر ہے اور استاد کے عطیات کو کس قدر دخل ہے۔ بہرحال یہ ہمارا یہ موضوع نہیں ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ استاد کی اصلاح سے قطع نظر ظفر کی غزلوں کے لب و لہجہ سے ان کا رنگ پہچانا جا سکتا ہے۔ انہی غزلوں میں ظفر کی یہ غزل مقبول ہوئی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا　　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

پوری غزل پر ایک ہی فضا چھائی ہوئی ہے۔ جس میں اپنی بے بضاعتی اور دنیا کی ناپائیداری کا ذکر ہے۔ غزل کی یہ فضا اس عہد کے انتشار اور غیر یقینی صورت حال کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری طرف بادشاہ کی بے بسی کی بولتی تصویر ہے۔ شاعر آرزوؤں اور تمناؤں کے ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں سامنے کے تمام راستے مسدود ہیں اور قوت فیصلہ کی کمی کے باعث یہ طے نہیں کر پا رہا ہے کہ کس بات کی آرزو کرے اور کس تمنا سے دستبردار ہو جائے۔ یہی بے بسی جب شدت اختیار کر لیتی ہے تو زبان پر بے اختیار آ جاتا ہے ؎

اڑ گئی صیاد اب دل سے ہوس پرواز کی
بیٹھا رہنے دے قفس میں ہم کو پر جھاڑے ہوئے

بین السطور میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اب ترک و حصول دونوں ان کے بس میں نہیں ہیں۔ شاید انسانی زندگی میں سب سے آزمائشی وقت وہی ہوتا ہے جب عمل اور خواہش ایک دوسرے کا اشتراک چھوڑ دیں۔ غالب نے اپنے ایک خط میں اپنی خواہشوں کی ناکامیوں کا ذکر کیا ہے مگر یہ خط ظفر کے احساسات کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔

"قلندری اور آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں۔ بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اور اگر تمام عالم نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں کوئی ننگا بھوکا نظر نہ آئے۔"

میرے نزدیک بہادر شاہ ظفر کے اس شعر کی ایک اہمیت اور ہے جس کا ذکر شروع میں کیا گیا۔ دوسری خصوصیت اس کی سادگی ہے۔ شاعر نے بے تکلفانہ انداز میں جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس شعر کو پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ کوئی لفظ بھی لغت کا مرہون منت نہیں ہے۔ اگر شعر کو نثر میں ادا کرنا چاہیں تو شعر ہی نثر بن جائیگا۔ البتہ اس میں شعری جمالیات کی تلاش بے سود ہے۔

شعر کا مطلب صاف ہے یعنی یا تو مجھے شاہانہ شان و شوکت عطا ہوتی یا مجھے فقیری کا تاج حاصل ہوتا۔ جب ظفر 'افسر شاہانہ' کی بات کرتے ہیں تو یقین ہے کہ ان کے سامنے مغل سلطنت کا ماضی آگیا ہوگا۔ اکبر کا جاہ و جلال۔ شاہجہاں کی شان و شوکت اور اورنگ زیب کا حوصلہ اور جوانمردی۔ اس کرب اور بے چارگی سے فرار حاصل کرنے کے لیے 'فوراً' "تاج گدایانہ" کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ "تاج گدایانہ" سے مراد ہے کہ فقیری اور درویشی کا تاج اگر اپنا لیا تو دنیا کی مکروہات سے محفوظ ہو جاؤں گا۔ 'تاج' سے چونکہ بادشاہت کا تصور ابھرتا ہے اسلیے اگر ایک طرف بادشاہ تخت و تاج سے سلطانی کرتا ہے تو دوسری طرف اہل اللہ بے تاج کے بادشاہ ہوتے ہیں اور یہ بادشاہت دنیا سے بے نیازی اور اللہ والوں کی صحبت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ شاعر کو اپنی ان دونوں محرومیوں کا احساس ہے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز کا خیال ہے کہ "حالات جو بھی جاں گسل ہوں مگر ظفر کو جو چیز مارے ڈال رہی تھی وہ تضاد کا شدید احساس تھا اور شاید یہی ان کی زندگی کا المیہ ہے۔" اس میں شک نہیں کہ زندگی 'تضادات' کا شکار ہے مگر ان تضادات کو جن حالات نے پیدا کیا ہے اس کی ذمہ داری سے خود ظفر اپنے آپ کو بری الذمہ خیال نہیں کر رہے ہیں۔ حالات اور عمر نے اس قابل نہیں رکھا کہ فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔ گویا ان کی حیثیت 'شاہ شطرنج' کی سی ہو گئی ہے۔ حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ خزانۂ شاہی کو لٹیروں نے لوٹ لیا مگر بادشاہ بے بسی سے دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر سکا۔ اس واقعہ کی مومن نے تاریخ نکالی ؎

تاریخ ایں معاملہ خود گفتہ اند شاں — بے کس دریں زماں شدہ سلطاں بو ظفر

۱۲۵۹ء = ۸۰ - ۱۳۳۹

اخلاقیات نے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ توکل۔ قناعت۔ دنیا کی بے ثباتی۔ دنیا کی آلودگیوں سے دامن کو پاک رکھنا۔ اگر ایک طرف ان عناصر نے ایک نئے انسان کو جنم دیا تو دوسری طرف اس کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا کی بے ثباتی کے تصور نے بے عملی اور زندگی سے فرار کے تصور کو بھی فروغ دیا۔ زندگی کی یہ متضاد کیفیت ظفر کی زندگی اور شاعری دونوں میں نظر آئے گی۔

ظفر کے کلام میں 'حال اور قال' کا کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ ان کے مشاہدات اور تجربات نے اشعار میں خلوص پیدا کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم ان کے غم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ غم محض ایک بادشاہ کی سلطنت کے زوال کا غم نہیں ہے۔ سیاست کے عروج و زوال تو اس ملک نے بہت دیکھے ہیں۔ یہ غم محض ایک شخصی ناکامی کا المیہ بھی نہیں ہے اس لیے کہ شخصی آلام کی داستانوں سے اردو شاعری بھری ہوئی ہے ماتم دراصل ایک تہذیب کے ختم ہونے کا ہے اگر اس کہانی کو صرف مغلوں سے وابستہ رکھا جائے تو یہ کہانی بابر کی جواں مردی سے شروع ہو کر بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر منتہی ہوتی ہے۔ اور یہ تہذیب ہندوستان کی مشترکہ میراث ہے۔ ظفر اس مشترکہ میراث کو زندہ رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے مگر مغرب سے آنیوالا سیلاب ہر اس فکر اور عمل کو ناکام بنا رہا تھا جو اس کی زد میں آ جاتا۔

موضوع سے قطع نظر شعر کے فنی محاسن پر نظر ڈالیں تو 'تاج' اور 'افسر' 'شاہانہ اور گدایانہ' میں صنعتوں کا جو اہتمام ہے وہ اہل فن سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ خوبی یہ ہے کہ ان صنعتوں کے استعمال میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ بعد کے اشعار میں بھی ان رعایات کا اہتمام کیا گیا ہے — 'خاکساری اور خاک' 'صوفی اور رند' 'جلانا اور چراغ'، 'زلف اور شانہ' 'بستی اور ویرانہ' وغیرہ مگر کسی شعر میں ان رعایتوں کی وجہ سے تصنع پیدا نہیں ہوا ہے۔ غزل کی پوری فضا کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے ؎

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر — ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

محو جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی (اصغر)

اصغر کے اس شعر کو پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے معنی تلاش کرنے کے لیے لغت کا سہارا لینا پڑے۔ مگر جب

اس کے معنی پر غور کریں تو ایک دنیا ئے معانی ہے جس کی تہہ کا سراغ لگانے کے لیے محض شعری مزاج کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک مفکر کا دماغ اور ایک صوفی کے دل کا بھی سہارا لینا پڑے گا۔ پہلے الفاظ کے معنی پر غور کیجیے "نمود جلوۂ بے رنگ" کا مطلب ہے وہ تصویر جس میں مصور نے ابھی رنگ نہیں بھرا ہے۔ "پہچانی ہوئی صورت" سے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ بے رنگ تصویر پہلے بھی دیکھ چکا ہے مگر یاد نہیں آتا کہ کب کہاں اور کس شکل میں دیکھی تھی۔ یاد نہ آنے کا سبب واضح ہے کہ کائنات کے نظاروں نے ہوش گم کر دیے ہیں۔ مرزا احسان احمد نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"عام خیال ہے کہ عاشق کی وارفتگی اور سرمستی جلوۂ حسن کے دیدار کا فیض اثر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادائے حسن کا نظارہ ناممکن ہے۔ کیونکہ جب ہوش ہی قائم نہیں رہتا تو شعاعِ جمالی کی جلوہ ریزیوں سے کیونکر کوئی کیف اندوز ہو سکتا ہے۔"

بقول پروفیسر ظفر احمد صدیقی

نشاں دو رست ہیں کچھ بے نشاں سے جو دیکھا تھا اسے دیکھیں کہاں سے

یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے اور کسی صورت میں دیکھا تھا اب وہ حقیقت جب مجاز کی صورت میں نمودار ہوئی تو اس میں مماثلت پر عقل متحیر ہے کہ کہیں حقیقت ہی تو بھیس بدل کر سامنے نہیں آگئی ہے۔ اب تک جو کچھ پیش کیا گیا وہ اس کے ظاہری معنی تھے۔ مختصراً اس شعر کا مفہوم اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ خدا کا عکس ہے۔ ابتدائے آفرینش میں ہم نے جو جلوہ دیکھا تھا اس نے دنیا میں آکر مختلف روپ اختیار کر لئے ہیں۔

اس شعر کی وضاحت اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ہستی مطلق نے اپنے اوپر تعینات کی کچھ بندشیں عائد کرلی تھیں۔ اس صورت میں ہستی مطلق کی دو حیثیتیں ہوگئیں۔ ایک اصل جو لاتعین ہے جو پردہ کے پیچھے چلی گئی ہے۔ دوسری غیر حقیقی جو چشم ظاہر میں نظر آرہی ہے۔ پہلی صورت میں جب وہ لاتعین تھا اس وقت ؎

نمود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

چشم ظاہر میں جو صورت نظر آرہی ہے وہ مظہر ہے کیونکہ تعینات میں حقیقت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ دیکھنے والے کو ابھی بے حجابی کا احساس ہے ؎

ہیں کامیاب دید بھی محروم دید بھی
جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا

مگر یہاں پر یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ وہ کون سی پہچانی ہوئی تصویر تھی جو اس کائنات میں دوسرے رنگ میں اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔ اس سوال کے جواب کے لئے غالب کے اس شعر کا سہارا لینا پڑے گا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس سوال کا جواب صرف ایک ہے کہ "خدا ہوتا"۔ جب کائنات کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا اور صرف ذاتِ باری تعالیٰ تھی اس وقت اس کو منظور اپنا دیکھنا ہوا۔ اس کے لئے اس نے ایک آئینہ خانہ تعمیر کیا جس کا نام کائنات تجویز ہوا۔ اس آئینہ میں اس کے مظاہر مختلف رنگ و روپ میں نمودار ہوئے۔ اس آئینہ کا مرکزی عکس انسان کی ذات تھی ؎

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا واں بھی شہود تیرا

اس سلسلہ میں صوفیہ کا یہ مقولہ یاد رکھنے کا ہے کہ "ہمارا وجود حق تعالیٰ پر موقوف ہے اور اس کا ظہور ہمارے ذریعہ سے ہے۔"

خالق اور مخلوق کے رشتہ کو تصوف نے بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ تصوف کا مسلک یہ ہے کہ کائنات خدا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب سے خدا ہے اس کا علم بھی ہے۔ عقل کا تقاضہ ہے کہ ذات کا تعلق علم سے ہونا چاہیے اور جب علم ہوگا تو معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ یہی معلومات ہیں جنھوں نے دنیا میں مظہر کی صورت اختیار کر کے ایک نیا نظم پیدا کیا۔ بے رنگی کو رنگ میں بدل دیا اور وحدت نے کثرت کی صورت اختیار کرلی۔ انسان جو اب تک وحدت کا شاہد تھا اس کثرت کو دیکھ کر ششدر اور حیران رہ گیا۔ اب اس شعر کو پڑھئے ؎

نمود جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

اس شعر کی معنوی خوبیوں سے قطع نظر اس کی فنی خوبیوں پر نظر ڈالیں تو اندازِ بیان میں الفاظ کا خوب صورت امتزاج نظر آئے گا۔ فلسفیانہ خیال کو غزل کے حسن کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ فلسفہ کی خشکی اس میں سرایت نہ کرنے پائے۔ یہ اصغر کی امتیازی خصوصیت ہے بقول مرزا احسان احمد "اگر شاعر کے اندازِ بیان میں شاعرانہ رنگینی اور لطافت نہیں تو اس کا تمام دریں حکمت بیکار ہے۔" اصغر نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شعر میں فلسفہ کی حقیقت نگاری کے ساتھ لطافتِ بیان کو قائم رکھا ہے۔ ان الفاظ پر غور کیجیے! "جلوۂ بے رنگ" "پہچانی ہوئی صورت" اور پھر "پہچانی نہیں جاتی" کا امتزاج اور ان سب پر "دھوکا کم ہوتا" یہ سب الفاظ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اجنبی نہیں ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ شاعر کی امیجری نے ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ اس کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ شاعر کے جمالیاتی تجربہ نے اندازِ بیان میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ پورے شعر کی فضا ماورائی ہے جس کا ارضی فضا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا کم نگاہ یہ سمجھے موسمِ بہار آیا

(جذبی)

رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے "شاعری فنونِ لطیفہ میں ہے۔ لیکن میں صرف اس فنونِ لطیفہ کا قائل ہوں جو اقدارِ عالیہ کے تابع اور فن کے مفسر ہوں۔" اس معیار کو سامنے رکھیے اور جدید شاعری کا مطالعہ کیجیے تو ایک اہم نام جذبی کا ابھر کر سامنے آئے گا۔ جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ اگرچہ ترقی پسند شاعر ہیں مگر انھوں نے اپنی شناخت ترقی پسندی کی بیساکھیوں پر قائم نہیں کی بلکہ اپنے فن کو اپنی شاعری کی شناخت قرار دیا ہے۔ جذبی کی غزل میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی مگر اسی کے ساتھ ان کی تمام فنی تخلیقات کی طرح ان کی ادبی تخلیقات میں ادیب اور شاعر کے منفرد روحانی تجربات بھی شامل ہیں۔ یہ تجربہ خواہ رومانی ہو یا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ۔ اب اس شعر کو پڑھیے

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا کم نگاہ یہ سمجھے موسمِ بہار آیا

اس شعر کا بنیادی وصف اس کی سادگی اور دل پذیری ہے اور اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجیے کہ حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ بھی ہے۔ اسی کے ساتھ اہلِ ہند کی سادگی اور معصومیت کا قصہ بھی ہے۔ اور خود فریبی کی داستان بھی۔ سماجی زندگی پر نظر ڈالیے جب بھی یہ شعر ایک نئے معنی ادا کرے گا۔ غزل کے شعر کی خوبی یہی ہے کہ ہر عہد میں اپنی معنویت کے ساتھ نمایاں رہتا ہے۔ فنی اعتبار سے دیکھیے تو "اک ذرا" میں جو بے ثباتی ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔ یہ وہی بے ثباتی ہے جو میر کے یہاں "کلی کا تبسم" کرنے پر زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میر کے یہاں زندگی کی اس حقیقت کا اظہار وسیع پیمانے پر ہے اور جذبی اس کا ایک محدود دائرہ میں تجزیہ کر رہے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "کم نگاہ" نے "اک ذرا" کی مزید توثیق کر دی۔ لمحات کے نکھار پر اس کے دائمی ہونے کا احتمال "کم نگاہ" کو ہی ہو سکتا ہے۔ "کم نگاہی" کے طنز نے شعر کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ ایک دوسری جگہ جذبی نے لکھا ہے

چمن پہ گذری سو گذری مگر یہ کیا کم ہے
کہ فاش ہو گئے جھوٹی بہار کے آئین

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تجربہ جذبی کا ہے مگر دوسرے بھی اختلافاتِ نظریات کے باوجود اس تجربہ میں شامل ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جو معاشرہ کے مختلف افراد کے درمیان جانی پہچانی علامتوں کے ساتھ ذہنی لین دین کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ابتدا میں اشارہ کیا گیا کہ جذبی نے غزل کی آبرو کی حفاظت کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ غمِ جاناں کی بات کر رہے ہوں یا غمِ دوراں کی۔ انھوں نے جمالیاتی احساس کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ ترقی پسند تحریک کا المیہ یہ ہے کہ اس نے اس توازن کو برقرار نہیں رکھا۔ جذبی کے یہاں جذبہ اور خیال کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس توازن نے ان کی شاعری کو پروپیگنڈہ کا شکار نہیں ہونے دیا۔ جذبی کا اگرچہ لکھنؤ سے تعلق نہیں ہے مگر زبان و بیان کا اہتمام اسی طرح کرتے ہیں۔ جس طرح ان کے دوسرے ہم عصر شعرا مجاز اور جاں نثار اختر کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

ادب میں شاعر ذاتی تجربہ میں عام طور سے مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ مگر جذبی نے اپنے مشاہدہ میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔

□□

شنیدہ

پرانی روش ہے کہ "دیدہ" کے آگے
"شنیدہ" کی تحقیر ہوتی رہی ہے
مگر "سُن" کے ہی نکتہ ہائے خرد کی
زمانے میں تشہیر ہوتی رہی ہے
تسلسل ہے ادراک کا اس سے قائم
کہ سوچا، کہا اور سُنا آدمی نے
زمانے میں سننے سنانے کے باعث
جلا پائی تفہیم و دانشوری نے

عبرت اور جبرت

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ "عبرت" ہے بڑی چیز
انساں کو گناہوں سے بچاتی ہے جو اکثر
افضل نظر آتی ہے مگر مجھ کو تو "جبرت"
قدرت کا یہ انعام ہے "عبرت" سے گراں تر
تفہیم کو ملتی ہے جلا اس کے سبب سے
ہوتا ہے قوی ذہن یہ دولت ہو اگر پاس
"جبرت" سے ابھرتے ہیں خیالات ہزاروں
"عبرت" تو فقط دیتی ہے اک خوف کا احساس

ڈاکٹر اختر بستوی
صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور - ۲۷۳۰۰۹

دوہے

تن کی آنکھیں جھیلتیں کیسے اس کا نور
موسیٰ خود مورچھت ہوئے جل گیا کوہِ طور

ماٹی چاک چڑھائی کے برتن کرے ہزار
برتن کو ماٹی کرے ایسا کون کمہار

تم کیا ہو تم تن نہیں، تن بدلا سو بار
ہر تن کا اک نام تھا، تھا اک گھر پریوار

تو جس کو اپنا کہے وہ گھر کس کا ٹھور
تجھ سے پہلے تھا کوئی بعد ترے کوئی اور

کیا نماز کیا آرتی کیا زکوٰۃ کیا دان
روزہ ورت کس کام کا جو من میں ابھیمان

سائیں تجھ میں یوں بسے جیوں لکڑی میں راکھ
جیوں روغن بادام میں جیوں انگور میں داکھ

روتے روتے چُک گیا آنکھوں کا سب نیر
اب کیسے دکھلاؤں میں تجھ کو من کی پیر

ڈاکٹر نریش
پروفیسر و صدر
شعبۂ جدید ادب پنجاب یونیورسٹی
چنڈی گڑھ ۱۴

پروفیسر مجاور حسین رضوی
اتر سوئیا ۔ الہ آباد

چراغِ دیر

یہ سارناتھ کے مندر سکونِ دل کا پیام
یہ دل کی طرح تراشے ہوئے حسین اصنام
یہ روشنی کے منارے رقیبِ ظلمتِ شام
ہر ایک ذرہ میں محفوظ اب بھی بدھ کا کلام
میرے وطن میں یونہی کس کا مان ہوتا ہے
ہریش چندر کا بھی امتحان ہوتا ہے

لہریں لیتی ہوئی گنگا کی ہر بوند میں ہزاروں شیش محل اور یہ سب محل ہماری روایتوں کے کنول کے درمیان نظر آتے ہیں لیکن یہاں سارناتھ کا مندر دیکھنا ہو یا ان سے نکلتے ہوئے جتھے دیکھنے ہوں دل میں سوزِ عشق ضروری ہے۔ اور یہی سوزِ عشق مجھے بھی اس دیار میں لایا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اسی نگر میں پجاریوں کے جتھے آج سے نہیں، ہزاروں برس سے آرہے ہیں اور مذہبی سنگم کا یہ شہر نہ جانے کب سے تاریخ کی شاہراہ پر کھڑا ہوا لوگوں کو بتا رہا ہے کہ یہ دیارِ حسن ہے۔ یہاں جو بھی آئے، خالی ہاتھ نہ آئے، علم و آگہی و معرفت کی بھری ہوئی جھولی لے کر آئے۔ اس لیے کہ شہر کی صبح علامتِ نور اور علامتِ حق ہے۔ آپ اسے کسی نام سے پکاریں — نام میں کیا دھرا ہے — رہے گی تو یہی کنارِ گنگا کی رام نگری!

البتہ جاتکوں میں لکھا ہے۔ کاشی کے راجہ برہم دت کے پرانوں میں اسے قطعی آزاد اور خود مختار علاقہ بتایا گیا ہے۔ شو پران میں کاشی کی عظمت کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ ایک سمت سے آواز آتی ہے "یہ نہیں جانتے"! منو کی بارھویں پشت میں اسے "کاشش" نے بنایا اور انھیں کے نام پر اس کا نام "کاشی" پڑا۔

یہ جن پد تھا، یا راجدھانی۔ وارانسی کا نام کیوں پڑا؟ ورنا اور اسی کے درمیان ہونے کی وجہ سے؟ وہ سوکھی ندی کون سی ہے؟

تاریخ کی ریشمی چادر ہٹائیے۔ وہ دیکھئے! رتھ دوڑ رہے ہیں، ان پر جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ سفید گھوڑے، پرتاپی راجہ اشومیدھ یگیہ کرنے چلے آرہے ہیں۔ ہاں مگر اس سے یہ نہ سمجھیے کہ یہ یدھ نگری تھی — نہ! یہاں تو کبھی جنگ ہوئی ہی نہیں۔ یہ تو یگیہ کا شہر ہے، علم کا مرکز، جینیوں کا، مہاتما بدھ کا مرکز۔ تھی کوئی کشش جو موحدِ اعظم شنکراچاریہ کو یہاں کھینچ لائی تھی۔ یہاں مناظرے بھی ہوئے تھے۔ مناظرہ میں وہ ہار جاتا تھا جسے غصہ آجاتا تھا۔ اس لیے کہ غصہ کی آگ علم کے چہرے کو جھلسا دیتی ہے اور شنکراچاریہ کے مخالف کو بحث میں غصہ آگیا تھا وہ ہار گیا، اچاریہ جیت گئے۔

یہ شہر دلدار ستاروں کی کہکشاں ہے۔ رامانج، ولبھ چاریہ سنت کبیر، تلسی داس، چیتنیہ مہاپربھو اپنی علم کی پیاس بجھانے اس شہر میں آئے۔

تاریخ کے کئی اوراق الٹیے —

یہ نویں صدی عیسوی ہے۔ عبا قبا پہنے، سفید عمامہ باندھے، بیاض سجی ہوئی مقطع داڑھی، گندمی رنگ، غلافی آنکھوں والا ابو معشر عرب سے چلا آرہا ہے۔ سوچتا ہے رات تو ہر دیس میں آتی ہے، ستارے تو ہر ملک میں جگمگاتے ہیں مگر یہ کیسا ملک ہے جہاں تاروں کی چمک سے یقیناً رگِ جاں پر چوٹ پڑتی ہوگی۔ قسمتوں کے دیپے جانے کب سے ٹمٹما رہے ہیں۔ گنگا کی لہروں کو اس کے بہاؤ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں تو چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ پھر رات

آتی ہے۔ پھر دیکھتے ہیں اور یہی سلسلۂ روز و شب وقت کا تعین بھی جاتا ہے اور ابو معشر ستاروں کی گردش اور مکانیت کے ماہر کو سمجھا جاتا تھا۔ ہیئت و نجوم کا مستند عالم ابو معشر دس برس تک بچاریوں کے اس شہر میں رہا۔ سنسکرت سیکھی، علم حاصل کیا اور قدر دانوں نے اسے سر آنکھوں پر جگہ دی۔

لکھتا ہے:

"ہندوستانی بڑی ترقی یافتہ قوم ہے اور ان کی تعداد بڑی ہے اور ان کا ملک بھی شریف ہے۔ تمام پرانی قوموں نے ان کی ہوشمندی اور مختلف علوم میں مہارت کی تعریف کی ہے۔ چین کے حکمراں ہندوستان کے راجاؤں کو عقل و دانش کا راجہ کہتے ہیں کیوں کہ یہ علوم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہندوستان ہر زمانے میں عقل کی کان اور عدل و انصاف و نظام حکومت کا سرچشمہ رہا ہے لیکن ہمارے ملک سے ان کا ملک دور ہے اس لیے ان کی علمی چیزیں بہت کم ہم تک پہونچی ہیں۔ اسی لیے ان کے فضلا کے بارے میں ہم کو کم واقفیت حاصل ہو سکی ہے۔ علوم نجوم میں تین مکتبۂ خیال ہیں،

۱. سدھانت (برہم گپت) ۲. اوج تقو (آریہ بھٹ)

۳. ارکنڈ (کھنڈ اکھدیک)۔ لیکن ہمیں صرف سدھانت حاصل ہو سکا۔"

اور عبا و قبا ہی نہیں، برہچز، تنگ کوٹ، ٹوپ والا، گورے رنگ والا برنیئر صاحب ۱۶۵۵ء میں یہاں آیا تو اس نے بھی کاشی آ کر عالموں سے درس حاصل کیا۔ اس کے سفرنامے میں ان کے عہد کے معاصر علماء کا تذکرہ ملتا ہے جس طرح عرب میں بازار عکاظ میں میلہ لگتا تھا۔ شعرا نابغہ کے پاس اپنے قصیدے لے جایا کرتے تھے، جسے وہ پڑھ لیتا تھا وہ قصیدہ مستند ہو جاتا تھا بالکل اسی طرح یہاں کے پنڈت اور شاستری دشاشمیدھ گھاٹ پر خیمہ لگا کر سودا کے لفظوں میں اعلان کرتے تھے، "اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے

دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے"

علمی نکات پر شمال و جنوب کے علماء میں غضب کی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ خیالات کی رسہ کشی جاری رہتی تھی۔

علم کی اس مقدس اور سنجیدہ فضا میں تھے کہ اچانک ساز بجنے لگے۔ نغمات نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ تو بالکل ہی دوسری دنیا ہے — ٹھمری کی ایک مخصوص لے فضا میں گونج رہی ہے۔ یہ تو کاشی کی دین ہے کون ہے؟ جس نے طبلے کی تان پر کشن مہاراج، گدائی مہاراج کا نام نہیں سنا۔ اور پھر رہتی دنیا تک ساز شہنائی میں سوز جو ہم کا نمونہ استاد بسم اللہ خاں ہیں۔ کبھی حرم میں دیکھیے، پر نور سفید داڑھی، رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو اور شہنائی کی دھن — رلاتی ہوئی۔

— رقص کی دنیا کی پائل آج بھی گوپی کرشن اور ستارہ دیوی کے گھنگروؤں کی آواز سے مرتعش ہے۔ یہ نہ سوچیے گا کہ ہر فن میں نام اہم ہے — نا! یہ بنارس میں زری کی شام و سحر کروڑوں بے نام فن کاروں کی دین ہے۔ اس کی چمک دمک دیکھیے تو اس کے ہر تار میں سو بار تارِ نظر الجھ کر رہ جائے۔ کبھی تو جگمگاہٹ کہکشاں کی راہ گزر کی ہمسری کرنے لگتی ہے اور کبھی اس کی دمک میں محبوب کے رخساروں کی گلابی اتر آتی ہے۔

بنارس ہمیشہ سے سرخرو رہا ہے۔ "کھیکے پان بنارس والا"۔ پان اور ندرہ یہاں کی شان۔ اور یہ بھی یاد رکھیے جب کسی کو پان دیا جاتا ہے تو ملا و جہی کے لفظوں میں اسے مان دیا جاتا ہے۔ یہ دل کی شکل والا برگ سبز ہماری تہذیب کا اس لیے بھی ایک بہت اہم رکن ہے کہ اسے پیش کرتے ہوئے سمجھاتے ہیں گویا ہم نذرانۂ دل لے کر آئے ہیں جس کی سرخی ہونٹوں سے جھلکے گی۔

اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس شہر کا تعارف غالب بنارسی نے بھی خوب کرایا ہے ؂

بے ڈھب کاشی نہ چھوڑیو وشوناتھ کا دھام
مرنے پر گنگا ملے، جیتے لنگڑا آم

اور دیکھیے! اب یاد آیا، ہندی ادب کے کیسے کیسے رتن یہاں رہے ہیں: جے شنکر پرشاد، ہری اودھ، رام چندر شکل، شیام سندر داس، آگرہ اور بہت سے نام — اور شاعر، ادیب، کتھاکار، صحافی۔

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ خواص خاقانی
جن کے لیے ہر بجوئہ آشوب تھا پایاب

اور یہیں بھارتیندو بھی رہے ہے ___ اُردو کے شاعر ___ غزل کے جادو کے اسیر۔ اُردو شاعری کی روایت کی سنہری کڑی!

اسی بنارس کے شہر اور کاشی نگری میں ابو حشر کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے شیخ علی حزیں محوِ خواب ہیں۔ وہی شیخ حزیں جنھوں نے سودا کے اس شعر پر ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

زانو پیٹ پیٹ کر تعریف کی تھی اور کہا تھا ایک مرغ قبلہ نما بچا تھا اسے بھی تڑپا کر قیامت کر دی۔

یہیں سے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ جاتے ہوئے غالب نے اسے دیکھا، عاشق ہوئے، مثنوی لکھی "چراغ دیر" کے عنوان سے شعر کہہ ڈالے اور حنیف نقوی نے اس کا منظوم ترجمہ بھی کر ڈالا۔

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور   بہشت خرم و فردوس معمور

اور یہی وہ شہر ہے جہاں سے واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں گزرے تھے۔ مثنوی حزنِ اختر" میں لکھا ؎

بنارس میں آکر رہے چودہ روز   وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ   اتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ

وہ مصروف خاطر ہوا اس قدر
فرشتہ بنا کہنے کو تھا بشر

تاریخ نے یاد دلایا کہ بنارس کبھی اودھ کا حصّہ تھا۔ مگر بکسر کی لڑائی کے بعد سے بنارس کی حیثیت آزاد ریاست کی ہو گئی تھی۔ اسی بنارس کے راجہ بلوان سنگھ نظیر اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ہر مہینے مشاعرہ کرایا کرتے تھے۔ فارسی کے مصرعوں پر تضمین بھی کیا کرتے تھے۔

فارسی دو بند دیکھیے ؎

حسب نسب میرے سب زمانہ ہے آگاہ
گدا تو کیا میرا رتبہ جانتے ہیں شاہ
عیاں ہے ہاں ہی سے گو شہرۂ سخن تا ماہ

میں ان کا بندۂ درگاہ ہوں خدا ہے گواہ
علی امامِ من است و منم غلامِ علیؑ
ہزار جان گرامی فدائے نامِ علیؑ

اُردو شاعری کی ساری روایات کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے یہ فخریہ شعر بھی ملاحظہ ہوں ؎

غلامِ سرورِ انجم سپاہ ہوں راجہ
میں نیّرِ فلکِ عز و جاہ ہوں راجہ
یہ سچ ہے ملکِ معانی کا شاہ ہوں راجہ
سخی ہوں خلق میں عالم پناہ ہوں راجہ
پس است حُبِّ حسینؑ و حسنؑ بہ سینۂ من
ہمیں زمرد و لعل ست در خزینۂ من

اس بحث سے کیا فائدہ کہ راجہ حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے یا ان کا جنت کا رشتہ تھا، اتنا تو مانا ہی جاتا ہے کہ وہ ایک اہم ادبی شخصیت تھے اور انہی شعرا میں جو بنارس کے حسن کے گرویدہ ہوئے وہ منیر شکوہ آبادی بھی ہیں، جنھوں نے کہا تھا ؎

باجے ہزاروں بجتے ہیں لیکن صدا ہے ایک
تقریریں مختلف ہیں مگر بولتا ہے ایک

ہم نے کیا مصالحہ اسلام و کفر میں
پانی ملا دیا ہے زمزم میں گنگ کا

بنارس کا مشہور میلہ "بڑھوا منگل" جب دیکھنے آئے تو انھوں نے منظر کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا ؎

کنارِ آب انبوہِ حسیناں   ہر اک جانب ہجوم مہ جبیناں
سنہری تھالیاں چومک سے روشن   بتاسے، دوب، تلسی، دھوپ، چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول   گگری، کالے تل، سیندور، گوگل
چڑھانے میں نہانے میں لبِ آب   جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
بھجن گاتے ہوئے پنڈے کسی جا
کہیں یگیہ ہے کہیں ہے ہون پوجا

دراصل بنارس کی یہی پہچان ہے جس کاشی کے اُردو شعرا پرستار ہیں وہ صبح اور وہ کاشی دراصل ایک تہذیبی علامت تھی جس کی

...سے بدل گیا تھا۔ ...شعرا ایسے تھے جن کے یہاں کبھی ...ات بھی باقاعدہ نازل ہوتی تھی اور جہاں جبیں پر ابرو کو رحل پر رکھے ہوئے قرآن سے استعارہ کرتے تھے۔ ایسے شاعر کے یہاں برقع کے کاڑھے پر صبا گنگا جل لاتی ہے۔ یہاں کی شعری روایات، اس کی وراثت بہت عظیم تھی۔ کچھ شعر سُنیے ؎

کب ہنسا تھا جو یہ کہتے ہو کہ رونا ہوگا
ہو رہے گا وہی قسمت میں جو ہونا ہوگا

ایسے دریا میں سلامت روی موج نہ ڈھونڈھ
پار ہونا ہے تو کشتی کو ڈبونا ہوگا

اک طرف دوست کا اصرار کہ آنکھیں کھولو
اک طرف موت تھپکتی ہے کہ سونا ہوگا

ہم کو اقبال مصیبت میں مزا ملتا ہے
ہم تو یہ جان کے ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

آج سے پچپن برس پہلے یہ غزل دلی میں قوال سے سنی تھی، ایک بزرگ ساتھ تھے دریافت کیا کہ "سارے جہاں سے اچھا" والے اقبال کی ہے۔

ارشاد ہوا ہاں۔ بارہ برس پہلے حیدرآباد میں اقبال اکیڈمی میں اقبال کے غیر متداول کلام میں اس کے دو شعر مطبوعہ دکھائی دیئے۔ خیال آیا کہ جو شعر یاد ہیں وہ بھی لکھ دو۔ چنانچہ لکھ تو دیا مگر دل نہیں چاہتا تھا کہ اسے علامہ اقبال کا تسلیم کیا جائے۔ حنیف نقوی نے تحقیق کی اور بتایا کہ اشعار اقبال بنارسی کے ہیں۔ یہاں پنڈت مدن موہن مالویہ نے یونیورسٹی قائم کی تھی، یہاں کاشی ودیا پیٹھ بھی ہے لیکن یہیں ڈاکٹر سمپورنانند بھی رہتے تھے۔ آنند تخلص کرتے تھے ان کی غزل کا ایک مقطع یاد ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مے آنند اب تو پیتے ہیں عاقبت کی خبر خدا جانے

یہیں حکیم کاظم بھی تھے جنھوں نے قصیدے کو ایسی اونچی مسند پر بٹھایا کہ کاظم حسین محشر وغیرہ کے ساتھ ان کا نام لیا جانے لگا۔ یہیں ڈاکٹر ناظم بھی ہیں جو اختر جونا گڑھی سے اچھے سانیٹ لکھ چکے ہیں

[illegible]

اور یہیں نظیر اکبرآبادی کی روایت کو آگے بڑھانے والا ... بھی تھا جس کے ہر شعر میں سو پھولوں کی مہک اٹھتی تھی۔ ان سب کے یہاں ایک قدر مشترک تھی...

یہ شہر جمال جہاں برسات کی گھنگھور گھٹا جیسا برس جانے والا حسن ملتا ہے جہاں شب انتظار میں جوانی کی انگڑائیوں کی یاد ہے جو اپنی حلاوت و مٹھاس کا روشن مینار اور جو خود اپنی ذات سے خوبصورت ہے مگر جس نے اپنا حسن تقسیم بھی کیا ہے۔ میرا جون پور اسی بنارس کی قسمت میں لکھا ہوا تھا اور یہیں سے محبوب کی زلف کے لام کی طرح بھوجپوری لہجہ شروع ہو جاتا ہے۔ کانوں میں "گہل، دَہل، دَہلس" جیسے لفظ رس ٹپکانے لگتے ہیں۔ اس زبان کی پرچھائیں نثر میں بھی تھی۔ اب بھلا یہ کون یاد رکھے گا کہ اُردو ناول کا نقطۂ آغاز "خط تقدیر" نہیں فسانۂ غوث ہے۔ خط تقدیر میں نہ تو کہیں دل دھڑکتا ہے اور نہ بے چینی ہوتی ہے نہ ہی تشویش ہے۔ لیکن فسانۂ غوث جو کہ ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا، اس میں تو سب کچھ ہے۔ ایک ملک کے بادشاہ کے دو وزیر اور بادشاہ کی تمنا کہ ایک ایسی عورت مل جائے جس میں حسن، عفت اور خوش آوازی تینوں صفت ہو۔ خردکیش وزیر ایسی عورت کا پتہ نہ لگا سکا لیکن بہروز وزیر نے تینوں صفتیں اپنی بیوی افضل النساء میں بتائیں۔ خردکیش نے ایک عیارہ کے ذریعہ افضل النساء کی برہنہ تصویر حاصل کرلی۔ افضل النساء کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھیس بدل کر بادشاہ کے پاس پہونچی، سارے حالات بتائے، خردکیش اور عیارہ کو سولی دی گئی اور افضل النساء پھر اپنے شوہر کو مل گئی۔

منشی کریم الدین کو ڈاکٹر محمود الٰہی جیسے معتبر نقیب ملے، بیچارے شیخ محمد کریم اللہ عرف غوث محمد قریشی بنارسی کو کوئی محقق نہ ملا۔ سہیل بنارسی نے بھی ان کا ذکر داستانوں میں کیا اور رہ گئے۔ حالانکہ ایک سو اٹھارہ صفحہ کا یہ ناولٹ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

بنارس میں تخلیقی ادب کی طرف بہت توجہ تھی۔ نئے نئے راستے تلاش کیے جانے لگے، شیخ کو ... جارجی اور ناتھ ... پرشاد طالب بنارسی ... [illegible]

بتایا تھا اور یہیں سے آغا حشر نے اپنی بلند آواز اور گھن گرج کے ساتھ کہا تھا:

"ہوا میں گرہ باندھنے کی ناکام کوشش مت کرو"

یا "موت کی سانس کا شعلہ تمھارے نگارستان عیش کو مقتلِ آرزو بنا دے گا۔" اسی سرزمین سے فسانۂ نادر جہاں سنانے والے عباس حسین ہوش اور علیم مسرور بھی اُبھرے تھے۔

لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسی شخصیت وجود میں آتی ہے جو تاریخ کی پروردہ نہیں ہوتی بلکہ تاریخ بناتی ہے۔ جس کی نرم و خنک روشنی چاند کی طرح پوری فضا کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ وہ دُبلا پتلا، چمکتی ہوئی آنکھ، سادہ دھوتی کرتہ۔ جس کی پیری کی ہڈیوں میں مچلتا ہوا شباب ــــ وہ انسان جس نے لمحی کو ادبی تاریخ کا ابدی لمحہ بنا دیا، جس نے سکھایا کہ وقت کی کسوٹی پر وہی ادب کھرا اترتا ہے جس میں آزادی کا جذبہ ہو، تعمیر کی روح ہو، تفکر ہو۔ جو ہمیں سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

جس نے ناول، افسانے، ڈرامے، تنقیدیں سب لکھی ہیں لیکن جس نے بہت پہلے مستقبل کے افق پر ابھرتی ہوئی اس تاریکی کو دیکھ لیا تھا جو سپیدہ سحری کے لیے خطرہ بن جاتی ہے جس نے اسلام کا "وشن ورچھ" لکھے جانے پر اپنے احباب کو خط کے ذریعہ لکھے جانے پر آگاہ نہیں کیا تھا بلکہ پورے ملک کو تعصب و نفرت کے خلاف آگاہ کیا تھا۔ وہ دشمن تھا نفرت کا، وہ پریم کا چندر رہا تھا اس لیے آج بھی وہی بنارس کی پہچان۔

اس کے اس شہر دلدار میں اس کی بنائی ہوئی روایت کو لوگ سینے سے لگائے رہے۔ یہاں شعبۂ فارسی کے سربراہ امرت لال عشرت تھے، اردو کے جانثار مجاہد اور شعبۂ اردو کے صدر حکم چند نیّر تھے۔ یہاں ماہر غالبیات اور ساری دنیا میں منفرد مولوی مہیش پرشاد بھی تھے۔

یہاں پرہلاد گھاٹ میں عربی کالج ہے اور یہاں شہنائی کی گونج میں گنگا کی لہر دلیسے نرم نرم کی بوندیں بوس و کنار کرتی نظر آتی ہیں اور یہیں سے تو گنگا کے ادبی متھرا ایک جاتے ہیں۔

ساز عنبر میں سوز حرم کی ہم آہنگی جو سیاہ رات کو صبح کی درخشانی

عطا کرتی ہے۔ جہاں ہرے کرشنا اور بسم اللہ الرحمن الرحیم ایک دوسرے سے مربوط ہیں کیوں کہ دونوں کا ماحصل سات سُروں میں چھپا ہی ہے۔

اس لیے آیئے ــــ اب چلیں ــــ کسی اور شہر میں جہاں کا نیا سفرنامہ لکھیں۔

□□

حاشیہ: [1] ڈاکٹر تاراچند: "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" ص ۱۷

غزل

میرا فلک دھواں مرے شہپر دھواں دھواں
کس نے لگی ہے آگ، یہ منظر دھواں دھواں

پہلے مرے حواس کیے تو نے بے کنار
پھر کر دیئے وہ سارے سمندر دھواں دھواں

اَب کے نہ جانے کون سا بھرنے چلا ہے رنگ
کیا سوچ کے ہے اب مرا آزر دھواں دھواں

میں دھند ہو گئی کہ ہے منظر دھواں دھواں
میں سُرمئی ہوں یا مری چادر دھواں دھواں

عذرا پروین

عبدالعزیز روڈ
چوک
لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

شہر چھپائیں تو کہاں گھر بھی نہیں پاس اپنے
کوئی سایہ کوئی چھپّر بھی نہیں پاس اپنے

اب وہ ساحل، نہ سمندر، نہ وہ کشتی، نہ بہاؤ
اب تو وہ ڈوبتا منظر بھی نہیں پاس اپنے

رات کے جتنے سہارے تھے سبھی چھوٹ گئے
تھا جو اک صبح کا اختر بھی نہیں پاس اپنے

تھا تو قطرہ ہی، پہ لگتا تھا سمندر، آنسو
اب وہ قطرہ، وہ سمندر بھی نہیں پاس اپنے

زندگی آج تلک اس کے سہارے گزری
وہ جو اک شخص تھا اندر بھی نہیں پاس اپنے

جب تلک دور تھا شکوہ تھا، بجا تھا لیکن
اب تو وہ پاس بھی رہ کر بھی نہیں پاس اپنے

سلیمان اطہر جاوید
۴۳-۱۰-۱، مارو تی نگر
تروپتی - ۵۱۷۵۰۲ (اے پی)

مری غزل میں مری بات اب نہیں ہوتی
یہ چیز نذرِ حکایات اب نہیں ہوتی

نہ تو خدا نہ فرشتہ نہ آدمی پیارے
رجوع تجھ سے مری ذات اب نہیں ہوتی

وہ مجھ کو چھو کے چلا جاتا ہے ہوا کی طرح
غزل رہینِ محاکات اب نہیں ہوتی

میں دیکھتا ہوں مگر وہ نظر نہیں آتا
شگفتہ صورتِ حالات اب نہیں ہوتی

نہ جانے کیا ہے کہ سینے میں دل نہیں جلتا
رواں وہ آتشِ جذبات اب نہیں ہوتی

ترا خلوص نمائش ترا خدا پیسہ
کہاں ہے تو جو ملاقات اب نہیں ہوتی

گئے دنوں سے ہی تجدیدِ آگہی راہی
کرو جو شرحِ خیالات اب نہیں ہوتی

ایم کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر "اشتراک" ویکلی۔ قاضی پور خورد
گورکھپور ۲۷۳۰۰۱

مر گئے جیسے دیوانے شہروں پہ حکومت کرنا کیا
لاشوں پر قائم ہو جس کی ایسی سیاست کرنا کیا

اپنے وطن کی ارضِ مقدس مر کر بھی نہیں چھوڑینگے
سانحہ کوئی دل پر گزرے لیکن ہجرت کرنا کیا

ٹوٹ کے بادل غم کا برسا اب کے دل کی دھرتی پر
آنسو کی سوغات بڑی ہے لیکر دولت کرنا کیا

دیواروں سے دھوپ اتر گئی تو غم نہ کرو بس صبر کرو
دوڑتے، بھاگتے ان لمحوں سے کوئی شکایت کرنا کیا

سپنے، یادیں، خط، تصویریں، خوشبوئے موسم کی
یہ ساری دولت میری ہے اس میں حیرت کرنا کیا

ہم تو گھر کے باہر خوشیاں ہی لینے جاتے ہیں گے
جو غم گھر میں خود آ جائیں ان کو رخصت کرنا کیا

کیوں اپنے ہمزاد سے آخر اتنا گھبراتے ہو سعید
دشمن کے دشمن بن جاؤ اس میں مروّت کرنا کیا

سعید عارفی
قانون گو پورہ
بہرائچ - ۲۷۱۸۰۱

غزلیں

ڈاکٹر کاظم علی خاں
۲۵-بی/۱۰ جاپلنگ روڈ، لکھنؤ

عصرِ حاضر میں مولانا آزاد کی معنویت

بیسویں صدی عیسوی میں ہندستان کے جن قدر آور دانشوروں نے صحافت، سیاست، خطابت اور علم و ادب کی مختلف وادیوں میں اپنے عہد آفریں ولازوال کارناموں کی بدولت "شہرتِ عام اور بقائے دوام" کے دربار میں بار پاکر "جریدۂ عالم" کے اوراق پر اپنے نام و مقام کے دوامی نقوش ثبت کئے ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں ؎

غالب بقول حضرت حافظ ز فیضِ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مولانا ابوالکلام آزاد نے جدید ہندستان کی تشکیل میں جو یادگار تعمیری کردار ادا کیا ہے وہ عصرِ حاضر میں تقویمِ پارینہ کی طرح کوئی بھلادی جانیوالی شے نہیں۔ آزاد ہندستان کی سماجی، سیاسی اور اخلاقی زندگی آج جن بیشمار ہلاکت خیز امراض و آزار میں گرفتار نظر آتی ہے اُن سے نجات پانے کے لئے عصرِ حاضر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مسیحائی کی کیسی اور کتنی شدید ضرورت ہے اس مقالے میں اسی مسئلے پر دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے۔

آزاد ہمارے غلام ملک کی تحریکِ آزادی کے ان باشعور اور دوربین رہبروں میں سے تھے جن کی کامیاب و کامران رہنمائی کی بدولت ہمارا کاروانِ تحریکِ آزادی ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی منزلِ مقصود پر پہنچا تھا۔ آزاد نے ہندستان کی سیاسی زندگی کے ایسے ناسازگار، تاریک و ہوش رُبا دور میں ہوش سنبھالا جب برٹش سامراج سے ٹکر لینا خود پر دار و گیر کے در کھولنے کے مترادف تھا۔ آزاد اس دورِ دار و رسن سے جس زبردست ہمتِ مردانہ کے ساتھ گذرے اس پر یہ مثل یاد آتی ہے ، ؎

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

آزاد ہماری جنگِ آزادی کے وہ مردِ مجاہد تھے جن کی ہمت و جوانمردی نے ہر مشکل آسان کردی ؎

مرد باید کہ ہراساں نشود   مشکلے نیست کہ آساں نشود

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندستان میں تعمیر ہونیوالے ایوانِ آزادی کے ان بنیاد گزاروں میں تھے جن کے افکار و نظریات کی بنیادوں پر یہ ایوان قائم کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی عمارت کی مزید تعمیر و توسیع اس کی بنیادوں سے چشم پوشی کر کے نہیں کی جاسکتی۔ جدید ہندستان کے ایوانِ آزادی کی مزید تعمیر میں اگر آزاد کے افکار و نظریات کو پیشِ نظر نہ رکھا گیا تو اس عمارت کا استحکام معرضِ خطر میں رہے گا اور یہ انہدام کے خدشے سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ آج آزاد ہندستان جن مختلف پریشان کن مسائل کے بحران و امتحان سے دوچار ہے ان میں سے بہت سی الجھنیں ہمارے نزدیک مولانا آزاد کے بنیادی افکار و نظریات سے ہماری دوری اور روگردانی کا نتیجہ ہیں۔ اسی بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ آزاد ہندستان کے جمہوری نظام کی مشین ایک ایسی کار ہے جو آزاد کے نظریات و افکار کے کارخانے میں تیار ہوئی تھی۔ اس کار کی کارکردگی برقرار رکھنے کیلئے آزاد کے افکار و خیالات وہ "پرچۂ ترکیبِ استعمال" ہیں جس کی ہدایات پر عمل کئے بغیر ملکی جمہوری اور سیکولر نظام کی یہ کار بے کار ہو سکتی ہے۔ عہدِ حاضر میں مولانا آزاد کی معنویت و اہمیت مذکورہ دو مثالوں کی مدد سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

آج اس موضوع پر غور کرنا یوں ضروری ہے کہ حال کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں پنہاں ہوتی ہیں اور دورِ حاضر کو عہدِ رفتہ کے حوالے کے بغیر صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے حال و مستقبل کو ماضی ہی کی بنیادوں پر تعمیر کرتی رہی ہیں اور اپنی موجودہ ترقیوں کے نگارخانے کی تشکیل و تزئین میں ماضی کے ساز و سامان سے بہت کچھ کام لیتی رہی ہیں۔ بقول پروفیسر آلِ احمد سرور:

"ماضی کبھی بالکل رخصت نہیں ہوتا، یہ حال ہی چھپ چھپ کر ظاہر ہوتا رہتا ہے اور برابر اسے متاثر کرتا رہتا ہے۔ یہ ہمارے مستقبل کو بھی بناتا یا بگاڑتا ہے۔"

اسی لیے ہمارے نزدیک ماضی کے پارینہ قصوں کو کبھی کبھی دہراتے رہنا چاہیے: ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات و کمالات کے بارے میں آل۔ اے۔ ڈگلس، پروفیسر ہمایوں کبیر، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، سید علی جواد زیدی اور دوسرے بہت سے اہلِ قلم کی کوششوں سے جو مواد دستیاب ہو چکا ہے اس کا تجزیاتی جائزہ بتاتا ہے کہ مولانا آزاد بیک وقت ایک ایسے عالم باعمل تھے جن کے علمی نشوونما میں بصارت و بصیرت کے دفتر کے دفتر صرف ہوئے تھے اور جن کے عمل میں جرأت و ہمت کے زبردست مخفی دھاروں کی آبیاری شامل تھی۔ قدرت نے انھیں جو غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا اُسکے بل بوتے پر انھوں نے اپنے علم کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیا تھا۔ قدآور دانشور اور باشعور سیاسی رہبر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے بے مثل و بیباک صحافی بھی تھے جن سے ہماری صحافت آج بھی بہت کچھ فیض حاصل کر سکتی ہے۔ اپنی ان صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ ایک ایسے سیاسی رہبر تھے جن کی سیاست میں فراست، بالغ نظری، خلوص اور دیانت داری کے بے پناہ جوہروں کی جلوہ گری ملتی ہے۔ ابوالکلام ایک نہایت کامیاب خطیب بھی تھے اور وہ اپنے افکار و نظریات کے مؤثر تقریری اظہار پر پوری طرح قادر تھے۔ مولانا آزاد کے افکار و نظریات کی روشنی اور انکی سرگرم و فعال شخصیت کی توانائی و گرمی آج بھی ہماری تاریک راہوں کو روشنی فراہم کر سکتی اور عہدِ حاضر کے پژمردہ ماحول کے لئے حیاتِ نو کی بشارت ثابت ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں مولانا آزاد کے افکار و نظریات اور اقوال و اعمال کا بافہم مطالعہ عصرِ حاضر میں جس معنویت و افادیت کا حامل ہے وہ "عیاں را چہ بیاں" کی مثال ہے۔

مولانا آزاد کو اپنی بے پناہ ذہنی صلاحیتوں کا پورا احساس تھا۔ مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک مکتوب میں آزاد نے لکھا ہے۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ کتنی چیزیں قبر میں جائیں گی۔"

آزاد نے اس بات کا اظہار بار بار کیا ہے کہ وہ اپنے عہد سے زیادہ اپنے بعد کے دور کے انسان تھے۔

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

اسی بات کو ابوالکلام آزاد سے قبل غالب نے شاعرانہ رنگ و آہنگ میں یوں کہا تھا۔

"میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں"

آزاد نے ایک جگہ اپنے وجود کو ایک ایسا ثمر قرار دیا ہے جو فصل سے قبل تیار ہو گیا ہو۔ بقول ڈاکٹر کامل قریشی مولانا آزاد کو شدید احساس تھا کہ "وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے (اور) انھیں سمجھنے والا زمانہ آگے آئیگا!" مولانا آزاد کا یہ احساس بھی آج ہمیں دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے کہ ہم ان کی فکر و نظر کی اصابت کو جانچ پرکھ کر یہ دیکھیں کہ ان کے افکار و نظریات عصرِ حاضر میں کس حد تک اپنی معنویت برقرار رکھتے ہیں؟

مولانا ابوالکلام آزاد کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا اور ان کی صحافت نے ان کے زبردست تبحرِ علمی سے تقویت حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنے سفرِ حیات کی مختلف منزلوں میں جن رسائل و جرائد کو جاری کیا تھا یا جن جریدوں میں ادارتی کام انجام دیئے تھے ان کی تعداد کم و بیش ایک درجن متعین ہوتی ہے۔ مولانا آزاد اپنی صحافت ہی کے راستے سے سیاست کی پُرپیچ وادیوں میں داخل ہوئے تھے اور ان کی سیاسی زندگی کو ان کی زبردست خطابت نے تقویت پہونچائی تھی۔ انھوں نے اپنی یادگار تحریروں اور تقریروں میں اپنے جن صالح افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی انکے جریدوں، صحیفوں اور تقریروں کے مجموعوں کے دامن میں ہماری رہبری و رہنمائی کے لیے موجود و محفوظ ہیں اور جدید ہندوستان کے روشن مستقبل کی تشکیل و تعمیر کے لیے ان کا تجزیاتی مطالعہ ناگزیر ہے۔ عہدِ حاضر کے متعدد مسائل کو حل کرنے میں ان سے مدد و رہنمائی مل سکتی ہے۔

مولانا آزاد ایک ایسے معاملہ فہم، ذہین و باشعور صحافی تھے جنھوں نے ہماری صحافت کو نئے معیار و اعتبار سے ہم کنار کر کے وقار عطا کیا تھا۔ ان کی

صحافت ذاتی اغراض کے بجائے ملکی مفاد کی بنیاد پر استوار ہوئی تھی۔ ان کا رسالہ الہلال کلکتہ نہ صرف خود ان کا صحافتی شاہکار تھا بلکہ اردو صحافت میں بھی یہ ایک ایسا گراں قدر کارنامہ تھا جس نے تاریخ صحافت اور تحریک آزادیِ ہند میں ایک عہد ساز و انقلاب آفریں باب کھولا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی صحافت میں علم و دانش کی روشنی اور جذبہ خلوص کی جو گرمی ملتی ہے وہ آج ہماری صحافت کے آمادہ بہ زوال معیار کو "زرد صحافت" کے "جنجال" سے نکالنے کے لئے ایک بے مثل مثال ثابت ہو سکتی ہے۔ صحافت کی پُر پیچ وادیوں کے خارزار کو مولانا آزاد نے جس سلامت روی و کامیابی سے طے کیا ہے وہ ہمارے بہت سے نافہم و کم نظر مدیروں کے لئے "صحافتی نصاب" کا ایک ناقابلِ فراموش و قابلِ تقلید سبق ثابت ہوگا۔ عصرِ حاضر میں ایسے اخبارات و رسائل کی کمی نہیں جو زرد و بیمار صحافت کے آزار میں گرفتار ہو کر ملکی مسائل کی تعداد کو گھٹانے سے زیادہ بڑھانے میں بری طرح مصروف نظر آتے ہیں۔ آج یہ راز کس باشعور و بافہم ہندوستانی پر آشکار نہیں کہ ہمارے بہت سے اخبار اپنے ذاتی، علاقائی یا فرقہ وارانہ مفاد کی غرض سے ملکی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں کے کارِ فضول میں مشغول و مصروف ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنی صحافت میں اس قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا ہے جو بدیسی سرکار سے آزادی کی جنگ جیتنے کے لئے ایک ناگزیر آلۂ کار کی حیثیت رکھتا تھا۔ برٹش سرکار نے اپنی DIVIDE AND RULE (پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے) کی جس پالیسی کو بروئے کار لا کر ہندوستان پر اپنا اقتدار برقرار رکھنے کا ذریعہ بنایا تھا آزاد نے اس پالیسی کے علی الرغم ہندوستانیوں میں باہمی اتحاد قائم کر کے ہندوستانی قوم کی بکھری ہوئی قوتوں کو جمع کیا اور انھیں تحریکِ آزادی کے قومی دھارے میں شامل کرنے کی پر خلوص کوششیں کی ہیں۔ آزاد نے جس طرح اپنے دور کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا اس سے ان میں وقت کی نبض شناسی کے زبردست ملکے کا پتہ چلتا ہے۔

آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کو اربابِ علی گڑھ کے اس نظریے سے نجات دلائی کہ سیاست کا میدان ہندوستانی مسلمانوں کے لئے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو سیاست سے کنارہ کش ہو کر یکسوئی کے ساتھ حصولِ تعلیم پر توجہ مرکوز رکھنا چاہئے[۱۰]۔ آزاد نے اسلامی علوم میں اپنی زبردست دسترس کو بروئے کار لا کر الہلال کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کرائی کہ مسلمانوں کے لئے ملک سے وفاداری کا جذبہ وہ اہم دینی اصول ہے جس سے روگردانی کرنا مسلمانوں کی مذہبی روایات کے منافی ہوگا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو بار بار بتایا کہ ملک کی آزادی کی جنگ ان کا ایمانی فریضہ ہے جسے وہ اپنے دوسرے برادرانِ وطن کے ساتھ ملکر ادا کریں[۱۱]۔ مولانا آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی کہ وہ قومی تحریک کے دھارے میں شامل ہو کر ہندوؤں اور اپنے دوسرے برادرانِ وطن کے شانہ بہ شانہ ملکی سیاست کے کارزار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ہندو مسلم میل ملاپ کو برقرار رکھکر ایک مقدس دینی فریضہ ادا کریں[۱۲]۔ آزاد نے کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کے خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کرنے اور ان کے پژمردہ دلوں کا اضمحلال دور کرنے کے لئے الہلال کے صفحات کو صحافتی جلال و جمال کی بجلیوں سے معمور کر دیا۔ الہلال سے مولانا آزاد کی تحریروں کے چند نمونے بطور مثال گوش گزار کئے جاتے ہیں۔

"آہ کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لیکر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتانِ خوابِ ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو کیونکہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیوں کہ تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے، جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج، اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔"[۱۳]

الہلال کلکتہ (مورخہ ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء) میں مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے اداریے بعنوان "تاریخِ آزادیِ ہند، جو لکھی جائے گی" میں ہندوستانی مسلمانوں کو یوں للکارا ہے۔

"جو ہونیوالا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئیگا، جبکہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا، غلامی کی وہ بیڑیاں جو اس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی، اور وہ سب کچھ ہو چکا

پیدا ہوا ہو، اضر ورت ہے۔ فرض کیجئے کہ اس وقت ہندستان کی قومی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی نسبت کیا لکھا جائیگا؟ اس میں لکھا جائیگا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کیلئے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا (کھوتا کذا۔ کھلونا) .... ہندستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم، اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک بہترین کر رہی!! اس میں لکھا جائیگا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسور انسانوں کا گلہ، جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھوں میں اپنے (اپنے کذا۔ اپنی) گردن کی رسّی (دیکھتا تھا) اور خوش (ہوتا تھا)، جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی۔ نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی، اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتی تھی۔ ایک معمول، جو اپنے سحر انداز کے ارادے پر زندہ ہو۔ ایک وجودِ شل، جو صرف زمین کیلئے بار ہو۔ ایک درخت، جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو، ایک پتھر، جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیے ہل نہ سکتا ہو، اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ، جو انسانیت کی پیشانی پر ہو.... پھر اس میں لکھا جائیگا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی، جو ...... "مسلم" تھی، جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ...... عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی ..... جو دنیا میں اس لئے بھیجی گئی تھی، تاکہ انسانی استبداد کی .... زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے۔ جو اسلئے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے نہ اس لئے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے ....،،

الہلال کا یہ تراشہ بھی دیکھئے؛

"یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی ہے۔"

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہندستان میں آباد مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اتحاد کی اہمیت پر بار بار روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے اتحاد کے اس سلسلے میں "وحدتِ ادیان" کے نظریے کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے:

"دنیا کے تمام مذاہب حق پر ہیں، لیکن دنیا کے پیروانِ مذاہب حق سے منحرف ہو گئے ہیں جس قدر بھی گمراہی ہے جس قدر بھی اختلاف ہے .... پیروانِ مذاہب کے فعل و عمل کا ہے۔ مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروانِ مذاہب کا انحراف دور ہو جائے، تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے ....،،

ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب وہ قدریں ہیں جو آزاد کے لیے متاعِ عزیز کی حیثیت رکھتی تھیں اور جن کا دفاع انھوں نے زندگی بھر کیا تھا۔ آزاد کی یہ پسندیدہ قدریں آج ہندستان میں فرقہ پرستوں اور دہشت گردوں کے حملوں کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ ان اقدار کو بچانا وقت کا شدید تقاضہ ہے۔ مولانا آزاد نے ان اقدار کے بارے میں بار بار اظہارِ خیال کر کے ہندستانیوں کو جو درس دیا تھا اسے یاد رکھنا عصرِ حاضر کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ اس باب میں آزاد کے خیالات حاضر ہیں۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان .... سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا، تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔"

"میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ

مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں ... میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں .... ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے .... ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم، اور ناقابلِ تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔" [۳۳]

مولانا آزاد نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے اور مطالبۂ پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ انھوں نے جس آزاد و متحدہ ہندستان کا خواب دیکھا تھا وہ ملک کے بٹوارے سے بکھر گیا۔ تقسیمِ ہند اور تشکیلِ پاکستان کے لیے جب حالات کی شدید مجبوریوں کے باعث مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل بھی رضامند ہو گئے اس وقت بھی ابوالکلام آزاد وہ واحد سیاسی رہنما تھے جو اس پر تیار نہ تھے [۳۴] تشکیلِ پاکستان کی تجویز کے خلاف آزاد نے جو دلائل پیش کیے تھے ان کی تفصیل "انڈیا ونس فریڈم" میں موجود ہے [۳۵] مولانا آزاد نے یوپی سے پاکستان جانے والوں کو روکنے کی اپیل یوں کی تھی۔

"آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ — آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعوا لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ — ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورتِ حال سے نمٹ سکتے ہیں، مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔"

(رسالہ ایوانِ اردو نئی دہلی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر دسمبر ۱۹۸۸ء ٹائیٹل آخری صفحہ)

پاکستان کے موجودہ حالات آج جس طرح آزاد کی اس بات کا اثبات کر رہے ہیں اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ یہ مثال بھی عصرِ حاضر میں مولانا آزاد کی معنویت پر دال ہے۔

مولانا آزاد نے تقسیمِ ہند اور تشکیلِ پاکستان کے متعلق یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ پاکستان کی تشکیل سے جتنے مسئلے حل ہوں گے ان سے زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے [۳۲] عہدِ حاضر میں آزاد کی یہ پیش گوئی جتنی صحیح ثابت ہو رہی ہے وہ "عیاں را چہ بیاں" کی مثال ہے۔ پنجاب اور کشمیر میں دہشت گردی کو پھیلانے میں پاکستان کا جو رول رہا ہے اس کی تفصیل بیان کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ ہمارے یہ معروضات عہدِ حاضر میں مولانا آزاد کی معنویت کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا آزاد نے یہ بھی کہا تھا:

"پانسہ پھینکا جا چکا ہے۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے۔ اب ہندستان اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ دوستانہ روابط پیدا کریں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں۔ اس کے علاوہ اگر دوسرے راستے اختیار کیے گئے تو وہ اور زیادہ پریشانی کا سبب بنیں گے۔"

("انڈیا ونس فریڈم"، ابوالکلام آزاد ص ۲۲۸ - اردو مفہوم)

مولانا آزاد نے "انڈیا ونس فریڈم" میں دہائیوں قبل جس بات سے آگاہ کیا تھا وہ آج بھی اپنی معنویت پوری طرح برقرار رکھتی ہے۔ ہند و پاک کے بہت سے مسائل دونوں ملکوں کے درمیان کشیدہ تعلقات کے پیدا کردہ ہیں۔ اور دونوں ملک دفاع پر جو اپنا کثیر سرمایہ صرف کر رہے ہیں اس سے ان دونوں ملکوں میں کتنے فلاحی کام ہو سکتے ہیں اسے کون نہیں جانتا؟

مولانا آزاد کے افکار و نظریات ہمارے نزدیک وہ سفینہ ہیں جو ہمیں موج و طوفان و بحران کے سیلاب میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ یہ سفینہ ہمیں مشکلات کی طغیانی میں بھی پار اتار سکتا ہے۔ عصرِ حاضر کے آزار، افکارِ آزاد کی مسیحائی کے متقاضی ہیں۔

□□

حواشی:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا دورِ حیات اگست / ستمبر ۱۸۸۸ء سے ۲۲ / فروری ۱۹۵۸ء تک کے درمیانی زمانے کو محیط رہا تھا۔ مولانا آزاد کے احوال و افکار پر جو بے شمار مصادر دستیاب ہیں۔ ان میں سے بعض اہم یہ ہیں:

(۱) موجِ کوثر: شیخ محمد اکرام۔ ادبی دنیا دہلی۔ سنہ اشاعت ندارد۔ کلاسیکل پرنٹرس دہلی ص ص ۲۵۰ تا ۲۷۸

(۲) ہندوستانی مسلمان۔ آئینۂ ایام میں: سید عابد حسین۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ طبع جنوری ۱۹۶۵ء ص ص ۱۳۷ تا ۱۵۵

(۳) مسلمانوں کا روشن مستقبل: سید طفیل احمد منگلوری۔ مطبع علیمی دہلی۔ طبع ۱۹۴۵ء۔

(۴) رسالہ ایوانِ اردو نئی دہلی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۳۲ نیز ص ۳۴۳ (مقالہ قاضی افضل حق قریشی)

(۵) رسالہ آج کل نئی دہلی۔ آزاد نمبر۔ نومبر ۱۹۸۸ء ص ۵ مع حاشیہ برص ۳۸ (مقالہ مالک رام) ص، نیز ص ۸۳ (مقالہ عبداللطیف اعظمی)

(۶) مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم۔ اردو اکاڈمی دلّی۔ طبع ۱۹۸۶ء۔

۲۔ اردوئے معلّٰی (حصہ اول): غالب۔ اکمل المطابع دہلی۔ مطبع اوّل مطبوعہ (۵) مارچ ۱۸۶۹ء ص ۴۱۵

۳۔ زیرِ تسوید مقالے کی اس تمہید میں ہم نے اپنے ایک مقالے "مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو زبان" کے تمہیدی حصّے کے بعض اجزا سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ دیکھیے: مقالات و نشریات: کاظم علی خاں۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ طبع ۱۹۹۳ء ص ۱۳۳

۴۔ بحوالہ مقالہ راقم الحروف مشمولہ کتاب مقالات و نشریات [illegible]
[illegible]

پسندیدہ شعر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دیکھیے: غبارِ خاطر: ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی۔ طبع ۱۹۶۷ء (متن) ص ۲۷۔

۶۔ دیکھیے: (۱) انگریزی کتاب "ابوالکلام آزاد۔ این انٹلیکچول اینڈ ریلیجس بایوگرافی" آئین ہنڈرسن ڈگلس۔ مرتبہ گیل مینونیز سی۔ ڈبلو ٹرال (C.W. Troll) دہلی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۳ء

[Abul Kalam Azad — An Intellectual and Religious Biography : Ian Henderson Douglas. Edited by Gail Minault and Christian W. Troll. Delhi Oxford Univercity. Press – 1993]

(۲) "انڈیا ونس فریڈم" (انگریزی) مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ و مترجمہ ہمایوں کبیر۔ اورینٹ لانگ مین لمیٹڈ نئی دہلی (مکمل متن) طبع ۱۹۹۲ء

[India Wins Freedom : Maulana Abul Kalam Azad (The Complete Version). Edited by Humayun Kabir. Orient Longman Limited,. New Delhi. Reprinted 1992]

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن: ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ طبع ستمبر ۱۹۶۹ء۔

(۴) کمالِ ابوالکلام: علی جواد زیدی۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۹ء۔

۷۔ غالب اور ابوالکلام: مرتبہ عتیق صدیقی۔ مکتبہ شاہراہ دہلی۔ طبع فروری ۱۹۶۹ء ص ۲۳

۸۔ بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے (مقالہ ڈاکٹر کامل قریشی)۔

۹۔ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی): مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔ طبع ۱۹۸۲ء (متن) ص ۶۶

۱۰۔ غبارِ خاطر ص ص ۹۰ تا ۹۱

۱۱۔ بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے ص ۱۳ (از مقالہ ڈاکٹر کامل قریشی)

۱۲۔ بحوالہ مقالات و نشریات [illegible] (باقی ص ۳۸ پر)

پاداش

کون جذبات کو پابند بنا سکتا ہے
کون محرومی کو آداب سکھا سکتا ہے
جانے کب تک میں چلایا نہیں ہے مجھکو
کتنے مجبوری کے کوڑوں کے نشاں ہیں دل پر
زہرِ غم پیا رہا خود سے اُلجھ کر اکثر
اب تو ان نیل میں ڈوبے ہوئے ہونٹوں کی قسم
اس کا احساس جلاتا ہے، ندامت ہے مجھے

لوگ کہتے ہیں کہ غم سے ہے تسلی دل کی
بے لبسی پیار میں غم خوار ہوا کرتی ہے
دل دبائے ہوئے اشکوں کی روانی روکے
سالہا سال بہت درد سہے ہیں میں نے
درد تو درد ہے غم خوار کہاں ہوتا ہے
کون کہتا ہے گناہ ہیں یہ روتے لمحے
کس نے معیار بنائے ہیں مجھے کیا معلوم

بے تعلق ہوئے تم خوف سے اندیشوں کے
میں نے بھی اپنی محبت کا بھرم توڑ دیا
شعلے اُٹھتے ہیں مگر جلد ہی بجھ جاتے ہیں
یوں بھی انجان سا رشتہ ہے محبت کیا ہے

یہی دستورِ تعلق یہی غم خواری ہے
یہ جو پاداش بلا کرتی ہے دلداری ہے

شورش صدیقی
[illegible] پیپر ل کالونی
[illegible]

پانی

اشک کی بوند ہے آنکھوں میں ذرا سا پانی
اور اُمڈ جائے تو دریا بھی ہے تھوڑا پانی
یوں تو بے رنگ ہے پانی کی حقیقت لیکن
روئی کا گالا نظر آتا ہے جمتا پانی
صبر کی قید یہ تھی خون نہ پانی ہو جائے
بند سب ٹوٹے ہوا سر سے جو اونچا پانی
باندھ کے سر سے کفن گھر سے نکلنا راہی
ریت کے دشت میں خون سستا ہے مہنگا پانی
چار سُو بوندیں برسنے لگیں کڑیوں کی طرح
آپ نے زلف سے کیا سوچ کے جھٹکا پانی
پہلے تو چاک کیا خوب زمیں کا سینہ
پھر مداوا کے لیے ٹوٹ کے برسا پانی
فتنہ گر ہم تو چلے چھوڑ کے مسکن اپنا
ہو گیا زہر ترے شہر کا دانا پانی
غم تو اس بات کا ہے کوئی حیادار نہیں
چلو بھر کافی ہے مر جانے کو مانا پانی
ٹھیک ہو سکتے ہیں اس شہر کے بگڑے حالات
میٹھا ہو جائے سمندر کا جو کھارا پانی
بحرِ الفت کے بھنور دیکھ کے غفلت میں نہ رہ
غرق ہو جائے گا صادق کہ ہے گہرا پانی

□□

صادق رضوی
رضوی کالج
باندرہ۔ بمبئی

ثاقب رفعت
۲۲۔بی، ... کالونی، لکھنؤ

اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش

انیسویں صدی کے نصف آخر کی تصانیف میں "رسوم ہند" ایسی تصنیف ہے جس میں افسانوی ادب کے نقوش سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ اس کے بارے میں وقار عظیم رقم طراز ہیں۔

"اس میں اہل ہند کے مذاہب۔ مختلف فرقے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عقائد اور بالخصوص شمالی ہند کے باشندوں کی خانگی زندگی اور ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا کام ۱۸۶۴ء میں شروع ہوا تھا۔ زبان اور طرز تحریر اتنا سادہ اور دلکش جو کسی مشرقی زبان میں ہی ممکن ہے اس کتاب کی تالیف میں کرنل ہالرائڈ کے ساتھ ہندو شریک تھے۔ اور دہلی کالج کے ایک عربی کے پروفیسر نے بھی مدد دی۔ یہ کتاب سرکار کی اس کمیشن کے زیر اثر لکھی گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تصانیف تیار کرائی جائیں۔

اس کتاب کے ہندو پروفیسر کا نام پیارے لعل آشوب تھا۔ "عمخانۂ جاوید" مرتبہ لالہ سری رام میں اس کا ذکر ہے۔ ان رسومات و عقائد کے علاوہ تین مختصر قصّے ہیں جن میں دو ہندو رسم و رواج سے متعلق ہیں اور تیسرا مسلمانوں کے عقائد و رسومات سے متعلق ہے۔ یہ قصّے اپنے جدید ترین اسلوب اور منطقی استدلال بیان کے اعتبار سے واضح طور پر ابتدائی افسانوں کے ذیل میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ پلاٹ فنّی شعور و تکنک کا احساس کردار نگاری اور مکالموں کی نفاست ان قصّوں کی نمائندہ خوبی ہے۔

مثلاً پہلا قصّہ جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سندر سنگھ اور من سکھی کا قصّہ ہے۔ اس قصّے کا خلاصہ یہ ہے کہ قصّے کی ہیروئن من سکھی ماں باپ کے انتقال کے بعد لاولد چچا سجان سنگھ اور چندر کور کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ یہ دونوں اسے ماں باپ کا پیار دیتے ہیں۔ من سکھی کے جوان ہونے پر اس کی شادی ایک غریب لیکن غیور طبیعت آدمی سندر سنگھ سے کردی جاتی ہے۔ سندر سنگھ بھی سسرال ہی میں رہنے لگتا ہے۔ اور کھیتی باڑی کے جملہ کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہے لیکن اس کے اس طرح سسرال رہنے پر من سکھی کے چچا اور چچی خوش نہیں تھے اور وہ اسے نکھٹو اور کام چور کے خطابات سے نوازتے رہتے تھے۔ اسی دوران سجان سنگھ کے یہاں لڑکا پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی محبت اور پیار کے چشمے اس کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور انھیں من سکھی اور سندر سنگھ کے وجود کھلنے لگتے ہیں۔

ایک دن ان کے یہاں ایک عیار سادھو نکل آتا ہے جو اپنی کشف و کرامات کا مظاہرہ اس طرح کرتا ہے کہ آنکھ بچا کر چاندی کی ڈلی چلم میں ڈال دیتا ہے اور پھر سجان سنگھ کے سامنے اسے نکال کر دیدیتا ہے۔ سجان سنگھ سادھو کی کرشمہ سازی کا قائل ہو جاتا ہے۔ سندر سنگھ سادھو کی عیاری کو سمجھ لیتا ہے۔ سادھو کو بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عیاری کو کام میں لاکر سجان سنگھ کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ اس کے یہاں ایک منحوس آدمی کا سایہ ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یقیناً اسے چاندی کی ڈلی کے بجائے سونے کی ڈلی ملتی سجان سنگھ سادھو کی چال میں آجاتا ہے اور اس طرح وہ سندر سنگھ سے برگشتہ خاطر رہنے لگتا ہے اور بار بار اپنی گفتگو میں سندر سنگھ کی نحوست کا تذکرہ کرتا ہے۔ سندر سنگھ کی حمیت و غیرت کو اس سے ٹھیس لگتی ہے۔ وہ گھر بار چھوڑ کر فوج میں نوکری کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ بیوی کی محبت وقتی طور پر اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ مگر اسے اپنی آن اور ذاتی وقار بیوی کی محبت سے زیادہ عزیز تھا وہ فوج میں جاکر بھرتی ہو جاتا ہے۔

سندر سنگھ کے چلے جانے کے بعد سجان سنگھ اپنی پتنی اور نومولود بچے کو لے کر گنگا اشنان کے لئے جاتا ہے، من سکھی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے سادھو کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ زیور کو دوگنا کرنے کا بہانہ کرکے

من سکھی اور شیاماں سنگھ کی بیٹی چندا کے تمام زیورات اتروالیتا ہے۔ صرف موہن کے گلے میں ایک زیور رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے حصول کے لئے عیار سادھو نے موہن کے اغوا کا پروگرام بنایا۔ رات کو وہ جس وقت موہن کو اغوا کرکے لے جارہا تھا تو من سکھی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سادھو کا تعاقب کیا۔ سادھو نے من سکھی کو پتھر مار کر زخمی کر دیا من سکھی زخم کی تاب نہ لاکر بیہوش ہو گئی۔ ادھر سندر سنگھ چھٹی لے کر گھر آگیا تھا اور اسے پتہ چلا تھا کہ من سکھی اپنے چچا اور بچی کے ساتھ گنگا اشنان کے میلے میں گئی ہے۔ وہ اس سے ملنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ شومئی قسمت سے راستے میں اس کا مقابلہ عیار سادھو سے ہو جاتا ہے۔ موہن کے رونے کی آواز نے سندر سنگھ کو ادھر متوجہ کیا تھا۔ سادھو سندر سنگھ کو دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ سندر سنگھ اس کا تعاقب کر کے اسے اپنے شکنجہ میں کس لیتا ہے۔ اور زیورات کی پوٹلی بھی اس سے چھین کر اپنے قبضے میں کر لی اور موہن کو ساتھ لیکر واپس ہونے لگا۔ راستے میں اسے من سکھی ملی جو بیہوش حالت میں سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد سندر سنگھ اسے ہوش میں لاسکا۔ مگر زخموں کی تاب نہ لاکر وہ چل بسی۔ سندر سنگھ کو اس کی موت کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اور دو محبت کرنیوالے زمانے کی ستم انگیزیوں کی وجہ سے موت سے ہم کنار ہو گئے۔

۱۸۶۴ء میں جبکہ میجر فلر ناظم تعلیمات تھے۔ حکومتِ پنجاب نے ہندوستانی زبان میں اعلیٰ درجے کی تصانیف تیار کرانے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا تھا۔ اس کمیشن کے سربراہ ڈی میکلوڈ (D. MECLOD) تھے جو بعد میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے "رسوم ہند" اسی کمیشن کے حسن کارکردگی کی ایک یادگار ہے۔" اس کتاب کی تالیف کمیشن کے قیام ۱۸۶۴ء کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی"۔ [1]

مؤلفین میں سب سے زیادہ نمایاں خدمات کیپٹن ہالرائڈ کی ہیں جو اس زمانے میں ناظم مدارس تھے۔ ۱۸۶۶ء میں جب کپتان ہالرائڈ ناظم تعلیمات ہو گئے تو انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ پیرس میں گارساں دی تاسی کو بھیجا۔ گارساں دی تاسی نے اس کتاب کے متعلق اپنے اٹھارھویں خطبے میں جو انہوں نے پیرس میں ۴ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو دیا تھا۔ مرقومۃ الذیل الفاظ لکھے ہیں۔

"کپتان ڈبلیو۔ آر۔ ایم ہالرائڈ نے "رسوم ہند" کا پہلا جزو ازراہ کرم مجھے بھیجا ہے اس کتاب میں اہل ہند کے مذاہب اور ان کے فرقوں کا اختصار سے حال بیان کیا گیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عقائد پر تبصرہ ہے اور بالخصوص شمالی ہند کے باشندوں کی خانگی زندگی اور ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسوم ہند کی تالیف و ترتیب کا کام لاہور میں ۱۸۶۴ء میں شروع ہوا۔ رسوم ہند کی زبان اور اس کا طرزِ تحریر سادہ ہے۔ اتنا سادہ جو کسی مشرقی زبان میں ممکن ہے۔ اس کتاب کے مکالموں کی زبان اس قسم کی ہے جو آج کل کے ناٹکوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں کپتان ہالرائڈ کے ساتھ ایک ہندو شریک تھے جو نارمل اسکول کے اوّل درجے کے مہتمم ہیں اور دوسرے دہلی کالج کے عربی کے ایک مسلمان پروفیسر نے بھی اس کام میں مدد دی تھی اس کے علاوہ دوسرے اہل علم دیسی لوگ بھی شریک تھے [2]

گارساں دتاسی نے "رسوم ہند" کے بارے میں یہ باتیں ۱۸۶۸ء میں کہیں اس کتاب کے سلسلے میں یہ معاصرانہ شہادت ہے جس سے واضح ہے کہ اس کی تالیف میں زیادہ حصہ کرنل ہالرائڈ کا ہے اور اس کے مددگاروں میں سررشتۂ تعلیم پنجاب کے دوسرے کارکنان بھی ہیں۔ گارساں دی تاسی اسی تالیف میں ہالرائڈ کے معاون کی حیثیت سے جس ہندو کا ذکر کرتے ہیں وہ ماسٹر پیارے لعل آشوبؔ ہیں۔ ان کا تذکرہ ان کے برادرزادے لالہ سری رام دہلوی نے اپنی تالیف "خمخانۂ جاوید" میں کیا ہے۔ چونکہ پیارے لعل آشوبؔ بھی "رسوم ہند" کے مؤلفین میں ہیں۔ اس لئے ان کے حالات کا ایک اقتباس "خمخانۂ جاوید" سے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مدِنظر رہے کہ ان حالات کی اشاعت کے وقت (۱۹۰۸) آشوبؔ زندہ تھے۔

"قبلہ و کعبہ منظمی و محترمی عالی جناب رائے بہادر ماسٹر پیارے لعل آشوبؔ راقم تذکرہ کے عم نامدار ہیں۔ ۱۸۳۶ء میں بمقام دہلی جو تین سو برس سے بزرگوں کا مسکن ہے پیدا ہوئے۔ پرانے دہلی کالج کے برگزیدہ متعلموں سے ہیں۔ ریاضی کے مشہور پروفیسر ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کسبِ علم اور حصولِ کمال کے شوق نے مرزا غالبؔ کی بھی خدمت میں پہونچایا تھا۔ دہلی کالج کے تمام درجے طے کرکے ۱۸۵۵ء میں

پہلی بار سرکاری ملازمت اختیار کی مگر ایک سال کے بعد پنجاب چلے آئے۔ عرصے تک گورنمنٹ کالج میں اور دہلی میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ [illegible] میں دہلی سے تبدیلی کے وقت جو سپاسنامہ اہل دہلی کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔ اس سے اس خلوص و عقیدت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے جو ہر طبقے کے لوگوں کو آپ کی ذات خاص کے ساتھ تھی۔ حضرت غالب مرحوم نے جو فقرہ اس کاغذ پر اپنے دستخط کے ساتھ نیچے لکھا تھا وہ قابل ذکر ہے۔

آپ لکھتے ہیں "بابو پیارے لعل کی مفارقت کا جو رنج مجھے ہوا ہے وہ میرا ہی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ دہلی میں میرا کوئی نہیں رہا۔

آپ نے لاہور آ کر سررشتہ تعلیم کے کیوریٹر کے نازک عہدے کے فرائض کو پندرہ سولہ برس تک نہایت بیدار مغزی و ہوشیاری سے انجام دیا۔ انھیں خدمات کے صلے میں جب ہندوستانیوں کو عہدہ انسپکٹری ملنے کی تجویز سرکار سے منظور ہوئی تو آپ ہی سب سے اول اس عہدۂ گرامی کے واسطے منتخب ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۵ء تک کامل بارہ سال تک دہلی اور جالندھر میں اس عہدے کا کام انجام دیا۔ ۱۸۶۴ء میں آپ ہی نے دہلی لٹریری سائٹی کی بنیاد ڈالی اور ایک عرصے تک اس کے سکریٹری رہے اور متعدد لیکچر علمی اور تاریخی مضامین پر دیئے۔ قیام لاہور کے زمانے میں کئی برس تک سرکاری اخبار کے اڈیٹر رہے۔ شمس العلماء پروفیسر محمد حسین آزاد اور شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی آپ کی وجہ سے ابتدائی زمانہ میں بہت کچھ فروغ پا چکے ہیں۔ بلکہ سنا ہے کہ مولانا حالی کو نیچرل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت سے ہوا اور آپ ہی کی مدد سے بہت کچھ کامیابی حاصل کی۔

منشی اور محترمی جناب بموس رائے صاحب نے اگرچہ نظم و نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا ہے مگر افسوس ہے کہ اپنے کلام کی ترتیب و تدوین نہیں فرمائی شاعری کی ابتدا مکتب ہی سے ہوگئی تھی۔ آپ کی تصانیف اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں سے چند کتابوں کے نام اس جگہ لکھے جاتے ہیں۔

"رسوم ہند" کے پہلے تین باب قصص ہند حصہ اول و سوم اردو کی تیسری کتاب ترجمہ تاریخ انگلستان کلاں رسالہ اتالیق پنجاب کے اکثر مضامین ترجمہ "دربار قیصری" [illegible] مولفہ مسٹر وہیلر"

اس شستہ اور بامحاورہ بلکہ برجستہ اور دل آویز ترجمے کے صلے میں جناب نواب گورنر جنرل بہادر کی طرف سے ایک تمغہ ایک جلد طلائی مرحمت فرمائی۔ [illegible] سے پنجاب یونیورسٹی کے فیلو ہیں۔ [illegible] میں رائے بہادر کا خطاب سرکار سے ملا ہے [illegible] میں کامل ۳۴ سال کی ملازمت کے بعد پنشن لیکر گئے لاہور گئے جو دہلی رہے۔ مگر اب مدت سے اپنے وطن مالوف میں سکونت پذیر ہیں"

اس قدر طویل اقتباس کو یہاں پیش کرنے کی ضرورت اسلئے آئی کہ اس سے مصنف "رسوم ہند" کے حالات پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "رسوم ہند" کے پہلے تین باب پیارے لال آشوب کے لکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ ایک معاصرانہ شہادت ہے اسلئے اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

ماسٹر پیارے لعل آشوب ۱۸۶۳ء میں لاہور پہنچے۔ اسی سال رسوم ہند کی تالیف کا کام شروع ہوگیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آشوب نے لاہور پہونچنے کے بعد سب سے پہلا تالیفی اور تصنیفی کام یہی کیا۔ رسوم ہند کے اولین تین باب جو آشوب کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ہندوؤں کی ذاتوں کا بیان (۲) ہندوؤں کی مذہبی باتوں کا بیان (۳) من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ۔

"رسوم ہند" کی اشاعت ۱۸۶۸ء میں ہوئی جس کا ایک نسخہ کپتان ہالرائڈ نے گارساں دی تاسی کو بھیجا تھا اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا خلیل الرحمن داؤدی نے ۱۸۶۹ء کے نسخے کو پیش نظر رکھ کر رسوم ہند کو اپنے دیباچے کے ساتھ لاہور سے مجلس ترقی ادب کی زیر نگرانی شائع کیا ہے۔

"رسوم ہند" میں دوسرا قصہ خوشحال چند اور ہیرا۔ دولت رام اور مونگا کروڑی مل اور گنگی کا قصہ ہے۔

اس قصے کو بھی طویل مختصر افسانے کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے قصے کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے۔ ہندو معاشرت اور تہذیب کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ مختلف رسم و رواج اور اقدار کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ کردار نگاری کا واضح شعور ملتا ہے۔ قصے میں ڈھیلے پن کے باوجود واقعات کو ایک لڑی میں پرو یا گیا ہے جو حالات کا منطقی نتیجہ ہیں۔ مکالمے نہایت شستہ ہیں اور دلی اور شمالی ہند کی ٹکسالی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ پیدائش سے لیکر شادی، بیاہ اور موت تک

کی کئی تہذیبی رسموں کا ذکر ہے جنھیں اس خوبی سے قصّے میں سمویا گیا ہے کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور وہ ایک پل بھی کتاب کو ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ قصّے میں بولی ٹھولی کا بھی مزہ ملتا ہے۔ جاٹ مردوں اور عورتوں کو ان کی مخصوص ہریانوی طرز کی کھڑی بولی کا استعمال کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جس سے قصّے میں فطری پن پیدا ہو گیا ہے۔ غدر کے حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔ الغرض قصّے زمان و مکان پر محیط ہیں اور ان میں اپنے دور کی ہند و تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ سماجی رجحانات کی بھی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ قصہ میں جگہ جگہ راگ بھی استعمال کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے لوک گیتوں کی ہندوستانی روایت اپنی پوری دلنوازی کے ساتھ ابھر کر آئی ہے۔ مثالوں اور محاوروں کا بھی برجستہ اور برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ قصے کے نقوش بالکل فطری ہیں جو عام انسانوں کی طرح نام و نمود کے خواہشمند ہیں۔ دولت کی ہوس میں اپنا گھر بار، بیوی بچے، ماں باپ چھوڑ کر شہر میں نوکری کر لیتے ہیں۔ خوشحال چند انگریزی فوج کے ساتھ راشن تولنے اور رسد سنبھالنے کا کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ انگریزوں کا سکھوں سے مقابلہ ہے۔ میدانِ کارزار میں دھواں اٹھ رہا ہے۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ لوگ مر رہے ہیں مگر خوشحال چند راشن میں ہیرا پھیری کر کے ہزاروں روپے جمع کر چکا ہے۔ مگر اس کی ہوس پوری نہیں ہوئی ہے۔

ایک پیراگراف ملاحظہ ہو۔

لڑائی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خوشحال چند کے پاس پچاس ہزار روپے سے زیادہ جمع ہو گئے مگر لالچ بری بلا ہے۔ اس جان جوکھوں میں روپیہ جمع کرنے کی خواہش دل سے نہ گئی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ راشن بانٹ رہا تھا اور کمسریٹ والا صاحب بھی اس کے پاس کھڑا ہوا تھا کہ یکایک صاحب کے ایک گولا آ لگا۔ اسے ڈولی میں ڈال کر ہسپتال میں لے گئے۔ خوشحال چند یہ حال دیکھ کر بہت ڈرا اور روتا ہوا صاحب کی ڈولی کی طرف دوڑ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر بولا "جاؤ ویل تم کیوں چلا آتا ہے۔ تم راشن کا بندوبست کریگا جو سپاہی کے پاس کھانا نہ ہوگا تو وہ کیونکر لڑے گا۔"

خوشحال چند لاکھوں روپے کما کر گھر لوٹتا ہے۔ نیا مکان بنواتا ہے رسم کے طور پر ہَوَن کراتا ہے۔ برہمنوں کا کھانا پینا کراتا ہے۔ انھیں بھوج کراتا ہے اس کے بیٹے دولت کی شادی ہو چکی ہے۔ ہیرا خوشحال چند کی بیوی۔ اپنی بہو مونگا کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی ہے۔ مونگا کا پیر بھاری ہے اور ہیرا بڑے ارمان سے اپنے پوتے کا منہ دیکھنے کی خوشی میں جی رہی ہے۔ ایک دن وہ خوشحال چند کے باپ نہال چند سے کہنے لگی۔

"لالہ جی تمہارے دولت کی بہو کا پیر بھاری ہے۔ سات آٹھ دن پیچھے اس کے ساسرے سے تساد آئے گی۔"

مونگا کو جب ساتواں مہینہ لگتا ہے تو اسے میکے سے ساد آتی ہے۔ پھر اسے ایک لڑکا ہوتا ہے اسی وقت ایک عورت زچّہ خانے کے پاس جا کر تھالی بجاتی ہے تاکہ لڑکا آئندہ کسی بھاری آواز سے نہ ڈرا کرے۔

خوشحال چند کو جیسے ہی یہ اطلاع ہوتی ہے تو وہ اپنے بزرگ باپ نہال چند کو خوشخبری سناتا ہے۔ فوراً ہمسائے سے پنڈت بلایا جاتا ہے۔ نہال چند اور خوشحال چند اسے ڈنڈوت کرتے ہیں تعظیم سے بٹھاتے ہیں۔ پنڈت لڑکے کی پیدائش کا وقت معلوم کر کے اس کا زائچہ بناتا ہے اور ظاہر میں خوب غور کر کے کہتا ہے۔

"سری مہاراج! یہ لڑکا سب کو بھاگوان ہوا ہے۔ دسویں بُرج کا برہسپت ایسا لڑا ہے کہ راج میں سابھا ہے۔ پانچویں گھر منگل بیٹھا ہے بدھیا ادھک پائے۔ پروا بھیٹی بدھیا کا جوگ ہے۔ بیوپار میں گھسالابھ ہو۔ مٹی میں ہاتھ ڈالے سونا ہو جائے۔"

یہ کہکر پنڈت جی نے جنم پتری لکھی اور اس لڑکے کا جنم نام ایسری داس رکھا مگر اس کے بعد عورتوں نے اس کا نام کروڑی مل مقرر کیا اور ننھا کہہ کر پکارتی ہیں۔ اس خوشحال چند نے پنڈت کو پانچ روپے دیئے وہ آشیرواد دیکر چلا گیا۔

دولت رام کی بہن خوشحالو رات کے وقت تاروں کے نکلتے ہی کٹورے میں پانی لیکر زچہ خانے میں جاتی ہے اور رسم کے طور پر اپنی بھاوج کی چھاتی دھوتی ہے۔ مونگا اسے ایک اشرفی دیتی ہے اور پھر بچے کو دودھ پلانا شروع کرتی ہے۔

ہندو گھرانوں کی اس طرح کی بہت سی رسموں، روایتوں اور رواجوں کے بیان سے قصّے کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

[illegible] اس کی تصدیق باقی ہے کہ یہ قصہ کس نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر [illegible] کے خیال کے مطابق اس قصے کے مصنف بھی پیارے لعل آشوب ہی ہیں اسلئے کہ سندر [illegible] اور [illegible] کا قصہ اور خوشحال چند اور [illegible] کا قصہ زبان و بیان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اس لئے اغلب ہے کہ یہ قصہ بھی آشوب ہی کا تحریر کردہ ہے۔ کرنل ہالرائڈ سے اس قصے کو اسلئے منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ جس شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ اس قصے میں ہندو معاشرت، اس کی تہذیب اور اس کی رسومات کا ذکر کیا گیا ہے اس کی توقع کسی انگریز سے کرنا عبث ہی ہوگا۔

اب ہم تیسرے اہم قصے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ جہاں آرا بیگم، اور محمد یوسف، گیتی آرا بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصہ ہے جو رسوم ہند کے صفحہ ۲۷۹ سے صفحہ ۳۵۱ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس قصے کی عبارت بھی سابقہ قصوں کی طرح مسلسل اور بامحاورہ ہے۔ فرق صرف ہندو اور مسلم معاشرت کا ہے۔

اس قصہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان میں سے اکثر خاندانی اور شرع کے بہت پابند تصور کئے گئے ہیں۔ اس سبب سے انھیں توہمات اور فرسودہ رسموں کا قائل نہیں دکھایا گیا ہے۔ جو ہندوستان میں کمتر درجہ کے مسلمانوں میں رائج ہیں اور نہ انھیں رقص و سرود اور اسی قسم کی دیگر لغویات سے وابستہ دکھایا گیا ہے۔ قصہ کے تمام کردار صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور احکام شرعیہ کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔

اس قصے میں بھی مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پیدائش، تعلیم، شادی بیاہ اور موت کے وقت اپنائی [illegible] رسموں اور عقیدوں کو مذہبی پابندیوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ [illegible] انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنیوالے سرخرو ہوتے ہیں اور مخالفت کرنیوالے مغضوب۔ حدیث اور دلائل و براہین کی مثالوں سے یہ نقش بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حاکم وقت کا ساتھ دیا جانا چاہئے خواہ ان کا تعلق کسی [illegible] مذہب سے ہو۔

[illegible] قصے کے [illegible] کردار [illegible] چار ہیں۔ گیتی آرا بیگم جن کی نسبت جہاں آرا بیگم کے بھائی جمیل الدین سے ہو چکی تھی اور جہاں آرا بیگم جو محمد یوسف سے منسوب ہوئی ہے۔ انھیں چاروں کرداروں کے گرد کہانی گھومتی ہے اور

انھیں کے دیکھنے سے مختلف رسوم [illegible] کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے سرپرست انگریزوں سے ان کا تعلق ہے۔

جہاں آرا کے باپ ناصر الدین کا مصنف نے اس طرح تعارف کرایا ہے جو تیس برس تک انگریزوں کی عملداری میں تحصیلداری کے فرائض منصبی انجام دینے کے بعد اپنے وطن مالوف دلی کو لوٹ رہے ہیں اور راستہ میں بیمار ہو جاتے ہیں۔

"ناصر الدین نامی ایک شریف زادہ، دہلی کا نامور رئیس۔ ذات کا شیخ بڑا خاندانی اور معزز آدمی تھا۔ اس کے باپ دادا کسی زمانے میں جاگیردار تھے۔ اور بادشاہوں کے وقت میں بڑے بڑے منصبوں پر سرفراز رہے تھے۔ علاوہ اس کے وہ خود بھی برا نہیں تھا اور اب مدت سے اپنی لیاقت اور کارگزاری کے باعث ضلع نورپور کے پرگنے نجیب آباد کا تحصیلدار ہو گیا تھا اور ہمیشہ بہت دیانت و امانت سے کام کرتا رہا۔ نہ کبھی کسی سے رشوت لی نہ کسی مقدمہ میں جانبداری کی۔ ہر دم خدا سے خوف کیا کرتا اور اپنی عزت اور خاندان کے نام کا بڑا خیال رکھتا۔ حاکم محکوم سب لوگ اس سے راضی تھے اور دل سے اس کی بہتری چاہتے تھے۔"

محمد جمیل الدین اور جہاں آرا بیگم اس کی اولاد ہیں۔ گیتی آرا بیگم اس کے بڑے بھائی کی اولاد ہے جس کے ماں باپ اسے بچپن ہی میں چھوڑ کر مر گئے، چھوٹی عمر ہی میں محمد جمیل الدین کا نکاح گیتی آرا بیگم سے کر دیا گیا۔ اور جمیل الدین کو تحصیل علم کی غرض سے ان کے چچا اور ناصر الدین کے چھوٹے بھائی محمد فیض الدین کے پاس دہلی بھیج دیا گیا تھا۔

نجیب آباد سے دہلی پہنچتے پہنچتے ناصر الدین کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ اور قصے میں اس کی تجہیز و تکفین کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔

ناصر الدین کے انتقال کے [illegible]

نجم النساء کے [illegible]

اور [illegible]

کرتا رہتا تھا۔

جہاں آرا بیگم کی [illegible]

دختر محمد یوسف کی بسم اللہ قرار پائی تو جہاں آرا بیگم بھی تقریب میں حصّہ لینے اپنی خالہ کے یہاں پردہ دار پالکی میں سوار ہو کر گئی۔ وہیں اس کی ملاقات دل افروز سے ہوتی ہے۔ دل افروز اسے اپنی بھائی محمد یوسف کے لئے پسند کر لیتی ہے آپس میں بہرحال ملاقات کے لئے کوئی نہ کوئی تقریب آن موجود ہوتی ہے۔

چند روز کے بعد رمضان کا مہینہ آتا ہے اور دل افروز کی چھوٹی بہن قمر زمانی کا جو سات برس کی تھی روزہ قرار پاتا ہے۔ دل افروز کی طرف سے روزہ رکھنے کا بلاوا دیا جاتا ہے۔ کنبہ کی سب عورتیں مدعو کی جاتی ہیں۔ نجم النساء جہاں آرا بیگم اور گیتی آرا کو بھی مدعو کیا گیا۔ چونکہ دور کے رشتے میں کنواریوں کا جانا مناسب نہیں خیال کیا جاتا اس لئے محض نجم النساء تقریب میں جاتی ہیں۔ اور اسطرح مصنف کو روزہ کی فضیلت اور اس کے آداب بیان کرنیکا موقع مل جاتا ہے۔ وہیں دل افروز نجم النسا بیگم سے جہاں آرا کے رشتہ کے لئے اپنے بھائی کو تجویز کرتی ہیں۔ بزرگوں تک بات پہنچتے ہی رشتہ پکا ہو جاتا ہے۔ محمد یوسف خوبصورت گبرو جوان ہے اور انگریزی رسالے میں اچھے عہدہ پر متمکن ہے۔

جمیل الدین ثقہ آدمی ہے اور حج کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ جہاں آرا بیگم اور محمد یوسف کی شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد غدر پڑ جاتا ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریزوں کا وفادار رہتا ہے اور ایک طبقہ ان کی زبردست مخالفت کرتا ہے۔

آخر میں انگریز سرخ رو رہتے ہیں اور غدر کو دبا دیا جاتا ہے۔ جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا انھیں جاگیریں عطا ہوتی ہیں۔ انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے اور مخالفین کو سولیوں پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

نجم النسا گیتی آرا مصائب میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ نجم النساء کا شوہر [illegible] انگریزوں کے خلاف جہاد کرتا ہوا مارا جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنی جان [illegible] کے لئے مولوی [illegible] الدین کے ساتھ انبالے کی طرف روانہ ہوتے [illegible] سے [illegible] ہو جاتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

والوں کی امداد سے اپنی چچی نجم النساء کی تجہیز و تکفین کی اور کسی طرح مصائب و تکالیف برداشت کرتے یہ لوگ انبالہ پہونچے۔ جہاں آرا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا شوہر محمد یوسف انگریزوں کا بہی خواہ رہا تھا اور غدر میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ اسے انگریزوں نے اعزازات سے نوازا۔ اس دوران میں جمیل الدین بھی فرائض حج کی ادائیگی کے بعد اپنے وطن دلی لوٹ آیا۔ اور گیتی آرا کی اس کے یہاں رخصت ہو گئی اور یہ لوگ خوشی خوشی دن گذارنے لگے۔

پورے قصّے میں بالقصد نماز، روزہ اور اس کی فضیلت کا بیان ہے اسی طرح بچے کی پیدائش اور اس کی بسم اللہ سے لیکر شادی تک کی رسموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قصّے میں فطری بہاؤ کی کمی ہے کردار بھی ترشے ترشائے ہیں۔ واقعات کی رفتار مدہم ہے اور داستانوں کی طرح مثالیت کا شکار ہوئے ہیں اس کے باوجود قصہ نہایت دلچسپ ہے اور یہ دلچسپی مذہبی عقائد و رسوم کے ذکر سے پیدا ہوئی ہے تعلیمی قصے میں اسطرح کھپایا گیا ہے کہ قاری کی دلچسپی بالکل ختم نہیں ہو پاتی۔

"رسوم ہند" کے یہ قصّے آج سے تقریباً سو سال قبل لکھے گئے ہیں لیکن مطالب کی صحت، حلاوتِ بیان اور سلاست بیان کے اعتبار سے گذشتہ سو سال میں کوئی دوسری کتاب اس پائے کی منصۂ شہود پر نہیں آئی ہے۔

"رسوم ہند" چونکہ نصابِ مدارس میں شامل تھی اس لئے بھی اس کے مصنفین نے جان بوجھ کر ہندو اور مسلمانوں کی معاشرت کو قصوں میں اساس بنایا تھا۔

محمد باقر نے اپنی تاریخ زبانِ اردو میں مولانا محمد حسین آزاد کو رسوم ہند کے مؤلفین و مصنفین میں شامل کیا ہے۔ اس لئے یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی طرزِ معاشرت پر مبنی جہاں آرا بیگم اور محمد یوسف، گیتی بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصّہ ان کا تحریر کردہ ہے۔ چونکہ محمد حسین آزاد بھی سررشتۂ پنجاب سے ایک زمانہ تک وابستہ رہے اور انھوں نے "قصص ہند" نامی کتاب کا ایک حصہ بھی لکھا جس کے دو قصّے پیارے لعل آشوب نے تحریر کئے تھے۔ [illegible] ہند کی تالیف کے وقت بھی [illegible] ہاتھ بٹایا ہوگا۔

حقیقت قریب کے رسوم ہند میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔
انھیں اردو ناول اور افسانے کا پیش رو قرار دیا جاتا ہے۔ کم سے کم راقم الحروف کی یہی رائے ہے۔ اس لئے کہ ان قصوں کا طرز تحریر روایتی قصوں سے بالکل جداگانہ ہے اور یہ فوق فطری عناصر سے بھی پاک ہیں اور اردو ناول اور افسانے کے جدید معیار پر پورے اترتے ہیں۔

□□

حواشی :

۱؎ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ "دیباچہ رسوم ہند" (ب) مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۶۱ء۔

۲؎ اقتباس از خطبات گارساں دتاسی۔ مترجم و شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔

۳؎ ساد کے لغوی معنی خواہش کے ہیں اور جب کسی عورت کے ساتواں مہینہ ہوتا ہے تو اسے مختلف کھانوں کی خواہش ہوتی ہے اور اسی سبب سے اور بعض قوموں میں عورت کے میکے سے اس کی سسرال میں مٹھائی اور ترکاری آتی ہے اسی کو ساد کہتے ہیں۔

مولانا آزاد کی معنویت ... صفحہ ۳۰ کا بقیہ

۱۳؎ "انڈیا ونس فریڈم"، مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۹۱

۱۴؎ ایضاً ص ۸

۱۵؎ ابوالکلام آزاد۔ این انٹلیکچوئل اینڈ ریلیجی اس بائیوگرافی" ص ص ۱۳۲ تا ۱۳۳ نیز ص ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

۱۶؎ ایضاً ص ص ۱۴۱ تا ۱۴۷

۱۷؎ بحوالہ کمالِ ابوالکلام ص ۱۰۷

۱۸؎ الہلال کلکتہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء ص ۵ (یو۔ پی اردو اکاڈمی عکسی اڈیشن جلد اوّل

۱۹؎ ایضاً ص ۱۱

۲۰؎ "وحدتِ ادیان" کے نظریے کی تفصیلات کے لئے دیکھیے :
(۱) ترجمان القرآن : ابوالکلام آزاد۔ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی جلد اوّل مطبوعہ سنہ ۱۹۸۰ء ص ص ۱۵۱ تا ۴۴۰
(۲) "ابوالکلام آزاد۔ این انٹلیکچوئل اینڈ ریلیجی اس بائیوگرافی" ص

غزل

مسرتوں کی حدوں تک جو جا رہی سے لگے
غموں کے دور میں لمحے وہ اک صدی سے لگے

خیالِ آمدِ شب سے شفق کے رنگ لیے
عروسِ شام کے رخسار چمپئی سے لگے

سحر کے وقت افق پر خمارِ شب کے طفیل
اُجالے تیرگی سے مل کے سُرمئی سے لگے

ملی نہ منزلِ عرفاں قریبِ راہِ تلاش
تو ذوق و شوق و تجسس بھی گمرہی سے لگے

وہی ہیں ہم یہ ہمارا نصیب ہے فاضل
جو اپنے دوستوں کو بھی ہم اجنبی سے لگے

س۔م۔ فاضل
ڈالی گنج۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۲

ص ص ۲۰۹ تا ۲۱۰
(۳) مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن ص ص ۳۹۷ تا ۴۰۱

۲۱؎ بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے ص ۱۹۹

۲۲؎ خطبات آزاد : ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی۔ طبع سنہ ۱۹۹۰ء ص ۲۰۵

۲۳؎ ایضاً ص ص ۲۹۷ تا ۳۰۰

۲۴؎ برائے تفصیل دیکھ : "انڈیا ونس فریڈم" ص ص ۱۹۷ تا ۲۰۴

۲۵؎ ایضاً ص ص ۱۴۹ تا ۱۵۲

۲۶؎ ایضاً ص ۱۵۰

غزلیں

بڑھ رہی تھیں زندگی کے دائروں کی آہٹیں
مچھلیوں کو چھو رہی تھیں پانیوں کی آہٹیں

شرم سے چہرے کی لالی بڑھ گئی تھی یک بیک
رُخ سے کیا ٹکرا رہی تھیں آئینوں کی آہٹیں

موت کی آغوش میں تھے لوگ سارے محوِ خواب
گو بجتی تھیں گھر میں خالی برتنوں کی آہٹیں

گھُپ اندھیرے میں اُجالے کی کرن پھوٹی کو ئی
کھڑکیوں سے چھن رہی تھیں چوڑیوں کی آہٹیں

تال پر گیتوں کے گھنگرو پاؤں کے بجنے لگے
وقت کے سینے سے پھوٹیں سسکیوں کی آہٹیں

ناقدینِ فن کا ہم گر جائزہ لینے لگیں
ہر قدم پر ہم سنیں گے خامیوں کی آہٹیں

آج اتنا غرق تھے منظر نگاری میں نسیم
کان تک ان کے نہ آئیں قافیوں کی آہٹیں

نسیم عزیزی
۱۳ بی۔ بیلیلیس روڈ۔ ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱
(مغربی بنگال)

دل ہمارا خوگرِ رنج و الم ہونے لگا
رفتہ رفتہ درد کا احساس کم ہونے لگا

آپ کے تیرِ نظر میں لگ نہ جائے اب نظر
اس کا مارا راہیِ ملکِ عدم ہونے لگا

کس قدر گمراہ ہوگی قوم کوئی کیا کہے
مشتبہ جب شیخ کا نقشِ قدم ہونے لگا

بڑھ رہا تھا دردِ دل کے ساتھ لطفِ زندگی
دیکھئے کیوں آپ آئے درد کم ہونے لگا

بھول کر تجھ کو ہوا ہوں قیدیِ دامِ فریب
سر ہمارا ہر درِ دولت پہ خم ہونے لگا

بندۂ احقر بھی اے مسعود اس کے لطف سے
محفلِ شعر و ادب میں محترم ہونے لگا

ڈاکٹر مسعود رُدولوی
۱۸۶/۱۷۔ فراش خانہ۔ وزیر گنج
لکھنؤ
۲۲۶۰۱۸

اُف یہ مقام تیرے جلال و جمال کے
تھک گئے ہیں پاؤں ہمارے خیال کے

اے زندگی خدا کے لیے چُپ نہ سادھنا
مجھ کو جواب چاہیئے اپنے سوال کے

کیا بات ہے کہ چہرے پہ جچتی نہیں نظر
کیا پیس کر لگائے ہیں ٹکڑے ہلال کے

گزری ہوئی بہار کا دیتے ہیں یہ پتہ
پتے خزاں کے ہیں انھیں رکھیے سنبھال کے

آئے تھے کدے کی طرف وقت کے قدم
رندوں نے رکھ دیا اسے ساغر میں ڈھال کے

چُن چُن کے ان کو اپنی قبا میں لگایئے
مصرعے نہیں ہیں پھول ہیں یہ ڈال ڈال کے

تاریخ ہے علی یہ مرے انتشار کی
لایا ہوں جوڑ جوڑ کے ٹکڑے خیال کے

علی احمد جلیلی
جلیل منزل
۲۲-۱-۷۳۳/۲، سلطان پورہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

افسانہ

نثار راہی
۵/۲۳۰۔ تیلی جامع مسجد
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

نئی آنکھیں

چند برس پہلے کی ہی تو بات ہے کہ جب تبریز بہت ہی ملنسار مخلص اور سب کے دکھ سکھ میں شریک ہونے والا ایک پیارا سا لڑکا تھا۔ "تھا" سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ خدا نخواستہ وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔ "تھا" سے مطلب اس کی ملنساری اور دکھ سکھ میں شریک ہونے سے ہے جو اب "تھا" ہو چکی ہیں۔ بڑھتے ہوئے "تناؤ" اور مہنگائی کے باوجود کچھ انسان آج کے دور میں بھی لمبی عمر پا لیتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کی ملنساری اور سچے خلوص کی عمر لمبی نہیں ہوتی۔ خلوص اور ملنساری کی عمر کم ہونے کی بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں

محلّے بھر کی آنکھ کا تارا تھا تبریز۔ اس وقت وہ پندرہ سولہ برس کا رہا ہوگا جب وہ محلہ کی آنکھ کا تارا بنا۔ ان دنوں وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد گھر میں بستہ پھینک کر اپنے رشتہ داروں کے گھر یا محلے کے کسی گھر میں چلا جاتا تھا۔ اپنی خوش مزاجی سے وہ سبھی کو مسحور کیے ہوئے تھا۔ بزرگ خواتین اس کی مزے دار باتیں سُن کر اس قدر ہنستی تھیں کہ ان کے پان میں رنگے ہوئے دانت نظر آنے لگتے تھے یا پھر منھ سے پان کی پیک اڑنے لگتی تھی۔ تبریز کو وہ پان تو دلی ہی نہیں، کبھی کھاتا تو کبھی کوئی میٹھی چیز کھلا دیا کرتی تھیں۔ اپنے گھر میں تو تبریز تھوڑی ہی دیر ٹکتا تھا لیکن زیادہ وقت پاس پڑوس کے گھروں میں گزارتا تھا اور کبھی کبھی بازار سے ان کا سودا سلف بھی لا دیتا تھا۔ بدلے میں بزرگ خواتین اس کو دُعاؤں سے نوازتی تھیں کہ زندگی میں وہ خوب ترقی کرے، اپنا گھر بسائے، خوبصورت دُلہن پائے اور پیارے پیارے بچوں کا باپ بنے۔

وقت بہر حال آگے بڑھتا ہے اور ہر ایک کے حالات بھی بدلتے ہیں۔ تبریز اگرچہ ایک پوسٹ ماسٹر کا بیٹا تھا لیکن پوسٹ ماسٹر شریف احمد نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی پوری توجہ، مسلسل کوششوں اور قربانیوں نے ایک دن اسے آرکیٹیکٹ بنا دیا۔ جس دن وہ آرکیٹیکٹ بنا، اس نے محلے میں گھر گھر جاکر مٹھائی بانٹی۔ سبھی خوش ہوئے۔ کچھ بزرگ خواتین نے اس کی بلائیں لیں اور دُعائیں دیں اور کچھ نے اس کے گھر جاکر اس کی ماں کو مبارکباد دی اور ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ اب وہ گھر میں بہو لانے میں زیادہ دیر نہ کریں۔ ویسے بھی اچھی دلہن ڈھونڈھنے اور شادی کی تیاریوں میں دو سال تو لگ ہی جائیں گے۔ تبریز کی ماں نے ان سے کہا کہ تبریز تو ان سبھی کا بیٹا ہے اس لیے وہ سب مل کر خوبصورت اور نیک سیرت لڑکی دیکھیں جو تبریز ہی کی طرح نیک اور ملنسار ہو۔

تلاشِ بسیار کے بعد محلے کی عورتوں نے آخر ایک لڑکی کھوج ہی نکالی۔ مہرالنسار۔ جو اپنے نام ہی کی طرح چاند جیسی حسین تھی۔ اس کے والد تعمیرات کے ٹھیکیدار تھے، جن کا شمار شہر کے بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ یعنی دلہن بڑے گھر کی تھی۔

سال سوا سال میں ہی تبریز کا کام اچھا چل پڑا، تو اپنا ارمان نکالنے کی جلدی سبھی کو ہوئی اور اس کی شادی مہرالنسار سے کردی گئی۔ خوبصورت دلہن اور جہیز کا ڈھیر سارا سامان دیکھ کر لوگ سوچنے لگے کہ اب تبریز کی شاندار زندگی شروع ہو چکی ہے۔ اتنے نیک لڑکے کی قسمت تو اچھی ہونا ہی تھی۔ یعنی شریف احمد اور ان کے گھر والوں کے دن اب پھر چکے تھے۔ اچھا بویا تھا تو اب اچھا کاٹنے کے دن آگئے۔ محلے کی بزرگ خواتین کو دولہا تو عزیز تھا ہی، اب دلہن پر بھی بچھی جا رہی تھیں اور خوب خوب دُعائیں دیتی

تھیں — "دودھ والا نہاؤ" پکوڑوں پھلوڑ وغیرہ وغیرہ

تبریز نے اپنی محنت اور صلاحیت کے بل پر بہت جلد ترقی کی، روپیہ خوب خوب آنے لگا۔ ماں باپ اور بھائی بہن خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے لیکن جب دولت میں اضافہ ہوتا ہی رہا تو میاں بیوی کو نئے مکان کی اور ایک کار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ شہر کے ایک خوش پوش علاقے میں، جہاں مالدار لوگ ہی رہتے تھے انھوں نے ایک شان دار بنگلا بنوایا۔ بنگلہ مکمل ہوا تو ایک دن وہ بھی آیا جب تبریز کو اپنا یعنی غریبوں کا محلہ اور محلے کے اپنے سارے لوگوں کو چھوڑنا تھا۔ اور ایک نئی دنیا میں جو کہ امیروں کی دنیا تھی، جاکر آباد ہونا تھا۔ اس تبدیلی کے لیے وہ مجبور تھا کیونکہ اونچی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی زندگی کا معیار اونچا ہو رہا تھا لیکن صحیح معنوں میں تو وہ تبھی اونچا ہو سکے گا جب وہ گندگی سے بھرا محلہ چھوڑ کر صاف ستھرے علاقے میں رہے اور بڑے لوگوں کے بیچ رہے۔ سماج میں اونچا ہوتے جانا اور بڑا ہونا بھلا کون پسند نہ کرے گا۔؟

محلے سے رخصت ہونے کا دن آگیا۔ دو ٹرکوں میں سامان لادا جا رہا تھا۔ محلے کی بزرگ خواتین یہ سنتے ہی دوڑی دوڑی آئیں کہ آج شریف احمد کا گھرانہ اور وہ بچہ تبریز کہ جو اُن کے بیٹے جیسا ہی تھا، سب کے سب ان سے جدا ہو رہے تھے۔ لیکن ان کے گھر جاکر معلوم ہوا کہ فی الحال تبریز اور اس کی دلہن ہی نئے بنگلے میں جا رہے ہیں اور گھر کے باقی افراد کچھ عرصے بعد یعنی بنگلے میں مزید کمرے بننے کے بعد ہی یہاں سے جائیں گے۔ کچھ تسلی تو ہوئی لیکن تبریز کی جدائی بھی کم تکلیف دہ نہ تھی کہ رشتہ خون کا نہ سہی دلوں کا تو تھا۔ جب بزرگ خواتین کی آنکھیں اُس کی جدائی پر نم ہو گئیں اور ان کی آواز بھرانے لگی تو تبریز بھی رو دیا۔ بچپن میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے دن، ان کی محبتیں، ان کی شفقت اور ان کا پیار بھرا برتاؤ۔ سب کے سب یاد آگئے۔ وہ ایک ایک سے کہنے لگا۔

"چچی۔ خالہ جان۔ اماں بی! آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جا رہا ہوں میں محلے سے جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کے دل سے کبھی نہ جاؤں گا۔ میں ہمیشہ آتا رہوں گا کیوں کہ آپ کے پیار کے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکوں گا۔"

جب رونے دھونے اور پیار کی بوچھاروں میں کچھ زیادہ ہی دیر ہونے لگی تو دلہن مہر النساء نے چپکے سے تبریز کے کان میں کہا کہ "دیر ہو رہی ہے، اندھیرا ہو جائے گا۔ نئے مکان میں سامان کیسے سجے گا۔؟"

بیوی کے کہنے پر تبریز نے ان سب کو سلام کیا اور فوراً گھر سے باہر آگیا۔

چمکتی دمکتی امیروں کی نئی بستی میں جاکر آباد ہونے کی خوشی بے شک تبریز کو تھی لیکن ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا رات دن کا ساتھ چھوٹنے کی کسک بھی دل میں تھی۔ تبریز نے سوچا کہ اگر وہ والدین کو ساتھ رکھنے کی ذرا بھی ضد کرتا تو وہ فوراً مان جاتے، لیکن بیوی نے بھی تو اکیلے میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ ابھی سب کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے بلا لیا جائے گا۔ تبریز نے سوچا کہ بیوی زیادہ عقل مند ہے اور اس کی سب سے زیادہ خیر خواہ بھی ہے اس لیے اس نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اور اب تو بیوی کی بات ماننے میں ہی بھلائی ہے، کیونکہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے جو اچھی طرح جانتی ہے کہ بڑوں کی طرح کس طرح رہا جاتا ہے۔

امیروں کے محلے کی یعنی نئے ماحول کی ہوا کچھ الگ قسم کی تھی اور رہن سہن کا طریقہ بھی کچھ جداگانہ تھا۔ جیسے کم بولنا، بلاوجہ اِدھر اُدھر کے لوگوں سے محبت کا اظہار نہ کرنا۔ غریب رشتہ داروں کو منہ نہ لگانا، روپے پیسے سے کسی کی مدد نہ کرنا اور کوئی ضرورتمند اُدھار مانگے تو اپنی کوئی مجبوری بتاکر صاف انکار کر دینا۔

بڑے لوگوں کی ان عادتوں سے تبریز پہلے ناواقف تھا اور نئے ماحول میں آکر یہ سب سیکھنے کو وہ تیار بھی نہیں تھا کیوں کہ انسانیت کو مجروح ہوتے دیکھنا اسے قطعی گوارا نہیں تھا۔ لیکن! اپنے میاں کو صحیح کرنے کا بیڑا بیوی نے اٹھا رکھا تھا اس کام میں بیوی کو ذرا سی دقت ضرور ہوئی کیوں کہ غریبوں

کے محلے میں ایک عرصے تک رہنے سے میاں کی عادتیں کافی بگڑ گئی تھیں جو اسے بڑی چھچھوری سی لگتی تھیں۔ تبریز یہ کیوں نہیں سمجھتا تھا کہ اب وہ ایک بڑا آدمی ہے اور بڑے آدمی کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔ اگر جلد ہی اس نے اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کیا تو بڑے لوگوں کی اس بستی میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔

یہ ساری باریکیاں تبریز سمجھتا ہی نہیں تھا لیکن مہرالنساء سمجھتی تھی کیوں کہ وہ بڑے گھر سے آئی تھی۔ دراصل اپنے میاں کو وہ ایک بے وقوف آدمی سمجھتی تھی جو محبت، انسانیت اور خدا ترسی کی رٹ لگائے رہتا تھا۔ یہ احمقانہ باتیں وہ اسی لیے تو کرتا تھا کہ اب بھی وہ اس پرانی غریبوں کی بستی میں دوڑا چلا جاتا تھا۔ غربت کے مارے وہ لوگ جانتے ہی کیا تھے، سوائے پیار محبت کے اور پیار محبت میں ذرا ذرا سی بات پر آنسو بہانے کے۔ اونچی سوسائٹی اور اونچی باتوں سے بھلا ان کا کیا واسطہ۔؟

مہرالنساء نے تبریز کو بڑے لوگوں کے گھر لے جانا شروع کر دیا۔ پھر ان کا کلب جوائن کرایا، اور پھر چھٹیوں میں ملک کے اچھے مقامات کی سیر کرانا شروع کی۔ دونوں شہر سے باہر جاتے تو بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرتے۔ بڑے ہوٹلوں میں ملک کے دولتمند لوگوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان سے انگریزی میں باتیں ہوتیں۔ ان کی بات چیت میں خلوص تو ہوتا ہی نہ تھا، الفاظ بھی ناپ تول کر بولے جاتے۔ ان کے ساتھ بات چیت کے دوران تبریز کے منہ سے جب کبھی کوئی ہلکی بات نکلتی تو فوراً بیوی کہنی سے ٹہوکا دیتی یا پاؤں پر پاؤں رکھ دیتی یا پھر آنکھ سے اشارہ کرتی۔ اب تبریز اتنا تو سمجھدار تھا ہی کہ بیوی کے اشارے کو جلد سمجھ لیتا اور چپ ہو جاتا یا بات کو بدل دیتا۔

مہرالنساء نے ایک بار گھر میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تبریز! تم بہت اناڑی ہو، دنیا داری کو بالکل نہیں سمجھتے ہو لہٰذا جیسا میں کہوں فوراً مان لیا کرو۔ آخر میں تمہاری بیوی ہوں اور تمہارا بُرا تو نہیں چاہوں گی۔ تب تبریز نے مسکرا کر "ہاں" کہہ دی تھی اور بیڈروم کا سوئچ آف کر دیا تھا۔ اس وقت تبریز کے پاس سوچ کر جواب دینے کا وقت بھی تو نہیں تھا۔

تبریز کی ماں بیٹے کے گھر آ کر رہنے لگی تھیں۔ انھیں اپنے ساتھ رکھ کر تبریز بہت خوش ہوا۔ مگر دونوں میاں بیوی کے پاس اماں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ اماں یا تو بچوں کو کھلاتی رہتیں یا ان سے باتیں کرتی رہتیں۔ جو لوگ تبریز اور مہرالنساء سے ملنے آتے وہ بھی اماں سے بات نہیں کرتے تھے۔ ایسے میں اماں کو اپنی رشتے کی اور محلے کی عورتیں اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے ہنسی خوشی کے پرانے دن یاد آنے لگے۔ ایک دن جلد آنے کا کہہ کر اماں جو اپنے گھر گئیں تو پھر واپس نہیں لوٹیں۔

بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا سلیقہ تبریز دھیرے دھیرے سیکھ ہی گیا۔ اور تب اسے خیال آیا کہ غریبوں کی بستی کے چھوٹے لوگ تو کنوئیں کے مینڈکوں جیسی زندگی گزار رہے تھے اور جو اپنی چھوٹی سی دُنیا میں ہی مست رہتے تھے اور جن کو مہذب زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اسے غریبی سے نکالا اور ایک مہذب انسان بنا دیا۔

اور پھر جیسے جیسے وقت آگے بڑھا، تبریز کے مزاج میں تبدیلی آتی گئی۔ چھوٹے لوگوں سے بچنا اور ان کی باتوں سے گھبرانا۔ ان کو نہ اپنا وقت دینا نہ پیسہ۔ جب یہ مزاج بنا تو غریبوں کی بستی سے اور غریب لوگوں سے اس کا ناتہ ہی ٹوٹ گیا۔ اگر کوئی اسے پچھلے وقتوں کی یاد دلا کر خلوص سے کوئی بات کرتا تو تبریز کی بھنویں تن جاتیں اور وہ سوچنے لگتا کہ کب اس احمق سے پیچھا چھڑایا جائے۔

وہ سوچتا کہ غریب اور امیر تو ایسے ہی ہیں جیسے دھرتی اور آسمان۔ دونوں کسی مقام پر ملتے ہوئے تو نظر آتے ہیں مگر وہ محض نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔ دونوں کبھی اور کہیں بھی نہیں ملتے۔

تبریز جو کبھی اس دھرتی کا انسان تھا، اب آسمان کا تارہ بن گیا تھا۔ مہرالنساء نے اسے کبھی نیچے دیکھنے ہی نہ دیا۔ ماں باپ کبھی کبھی آ کر اپنے بیٹے، بہو اور پوتے پوتی سے مل لیتے تھے۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے وہ۔ سفید بالوں اور جھریوں کے

چہروں والے۔ دونوں کے چہروں پر جھریاں ذرا جلد ہی آگئی تھیں۔ چہرے کی جھریوں کا شاید دل سے تعلق ہوتا ہے اگر دل خوش ہوتا ہے تو چہرے پر جھرّیاں ذرا دیر سے پڑتی ہیں اور کبھی کبھی نہیں بھی پڑتیں۔ لیکن اگر دل میں کوئی رنج ہو تو پھر وہ رنج جھرّیوں کی شکل میں چہرے پر آ ہی جاتا ہے۔

تبریز اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد تھا اس لیے ماں باپ کو اس سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ شادی کے بعد جو کئی برسوں سے جدا رہا تو اسی نے غم بھی زیادہ دیا۔ شریف احمد صاحب کا دل ایک تو پہلے ہی اپنے جوان بھائی کی موت سے کمزور تھا، پھر بیٹے کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا۔ ایک دن جو دل کا دورہ پڑا تو اسپتال لے جاتے لے جاتے ہی وہ دنیا چھوڑ گئے۔ دم دے کے وقت سب بچے ان کے سامنے تھے لیکن ان کی نظریں تبریز کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ تبریز سامنے ہوتا تو شاید دل قابو میں آجاتا۔ مگر نہ تبریز آیا اور نہ دل قابو میں آیا۔

ان کی اچانک موت نے سبھی کو رنجیدہ کر دیا۔ ماں کو یہ رنج تھا کہ دنیا سے جاتے ہوئے بھی ان کے شوہر اپنے بیٹے کو آخری بار دیکھنے کی حسرت پوری نہ کر سکے۔ بیٹا بہت دور تھا۔ بیوی کے ساتھ جاپان گیا ہوا تھا۔ جاپان میں ہندستانی سفارت خانے کے ایک افسر کو فون کیا گیا، جس نے تبریز کو ٹوکیو کے کچھ خاص ہوٹلوں میں ٹیلی فون سے تلاش کروانے اور اس تک باپ کی موت کی اطلاع پہونچانے کی پوری کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب دوسرے دن شام تک بھی ٹوکیو سے کوئی اطلاع نہیں آئی تو شریف احمد کے جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

اپنے والد کے انتقال کے پانچویں روز تبریز اور مہر النسا واپس لوٹے اور اپنے پرانے گھر پر آئے۔ تبریز بہت دکھی تھا خصوصاً اس بات پر کہ پچھلے چار پانچ ماہ سے اس نے اپنے والد کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آمد پر محلے کی بزرگ خواتین بھی آگئی تھیں انھوں نے دیکھا کہ رنج کے باوجود تبریز کے چہرے پر اب وہ پہلے کی سی اپنائیت اور خلوص کے نام و نشان بھی نہ تھے اور اس کی آنکھوں میں بڑی اجنبیت آگئی تھی۔ ان کو محسوس ہوا کہ تبریز کے چہرے پر محبت ٹپکانے والی اب وہ پرانی آنکھیں نہیں تھیں بلکہ ان کی جگہ نئی آنکھیں لگ گئی تھیں، جن میں نہ اپنوں کے لیے پیار کی تڑپ تھی اور نہ اپنائیت۔

تبریز اندر اندر بہت غمگین تھا۔ اس کو لگا کہ روح کی گہرائیوں میں اترا ہوا یہ غم تب ہی ہلکا ہو سکتا ہے جب وہ اپنا یہ غم اپنے رشتہ داروں اور محلے والوں کے ساتھ بانٹ لے۔ ایسا غم ان کے ساتھ بانٹ کر ہی ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ آج برسوں بعد محسوس ہوا کہ خون کے رشتے اور محبت کے رشتے کتنے مضبوط اور کتنے اہم ہوتے ہیں۔

وہ آگے بڑھ کر اپنی ماں اور محلے کی تسنیم خالہ کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا، مگر تبھی اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ دونوں اور محلے کی سبھی بزرگ خواتین اگرچہ اس کے پاس ہی کھڑی تھیں مگر اس سے ایک دم بے تعلق سی نظر آتی تھیں، جیسے اپنائیت و محبّت کا وہ پرانا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔

اور تب اسے احساس ہوا کہ آج وہ اس پرندے کی طرح تنہا رہ گیا ہے کہ جو اپنے جھنڈ کی اجتماعی اڑان سے کٹ کر راستے میں کسی درخت پر اکیلا پھل کھانے بیٹھ جاتا ہے اور جب جھنڈ کے سارے پرندے اڑتے ہوئے دور چلے جاتے ہیں تو پھر اپنی تنہائی اور غیر محفوظ ہو جانے کے احساس سے ڈال پر بیٹھا بیٹھا جھرجھری لے کر کانپنے لگتا ہے۔

□□

صرف دو شعر ملاحظہ ہوں ـــ

ہر لمحہ تغیر میں ہے نیرنگیٔ عالم   جس آن ہوں تصویر یہاں کیسے بنا لوں

وعدے کا کب یقین تھا پھر بھی بصد شوق
ہم بار بار جانب در دیکھتے رہے

ـــــــ امیر احمد صدیقی

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "جنون و خرد" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر نصیر الدین نصیر (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر محمد اصغر، ۱۶۰- سی، میڈیکل کالونی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"جنون و خرد" ڈاکٹر نصیر الدین نصیر کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو حمد و نعت، منقبت، قطعات، نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان کے پاس الفاظ کا ایک خزانہ ہے اور موضوع کے اعتبار سے اس کو برمحل اور برجستہ استعمال کرنے میں ان کو دست رس حاصل ہے۔ مولائے کائنات حضرت علیؑ کی شان میں ان کا قصیدہ ان کی والہانہ عقیدت اور قادر الکلامی کا مظہر ہے لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ڈاکٹر نصیر صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔

غزل ہماری سب سے مقبول صنفِ سخن ہے لیکن اس میدان میں وہی شاعر کامیاب نظر آتا ہے جس کو قوت مشاہدہ کے ساتھ زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہو۔ نصیر صاحب کی غزلوں میں یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ وہ غزل کے مزاج سے بخوبی آشنا معلوم ہوتے ہیں اس لیے ان کی غزلیں زبان و بیان کی لطافت سلاست اور روانی کے علاوہ انسانی جذبات و احساسات زندگی کے تلخ تجربات اور عصری حسیت کی آئینہ دار ہیں۔

امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مجموعۂ کلام "جنون و خرد" ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ نمونے کے طور پر

نام کتاب: "سمندر" (شعری مجموعہ)
شاعر: کالی داس گپتا رضا   قیمت: ۱۰۰/ روپیہ
ملنے کا پتہ: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
بمبئی ۴۰۰۰۲۰

کالی داس گپتا رضا دور حاضر میں اردو تحقیق کے اہم ستون ہیں۔ ان کے جیسے شخص کا شاعر ہونا ادبی کرامت یا معجزے سے کم نہیں کیوں کہ شاعر کے لیے دکھا ہوا دل، مضطرب، مجروح اور کرب سے بھرے ہوئے لمحات ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اور رضا صاحب کی زندگی میں بظاہر ان میں سے کسی بھی عنصر کا دور دور تک پتہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود ان کے یہاں ایک نیا لب و لہجہ ملتا ہے جو یہ احساس دلاتا ہے کہ درد و کرب کے لمحات اور دکھے ہوئے دل کے بغیر بھی فکر و فن میں دل کشی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کے موضوعات میں "لاشعور سے شعور تک"۔ نیل کمل۔ دیوار۔ زندگی کے صحرا میں۔ امرت منتھن۔ بھگوان بدھ کا تیاگ۔ باغ و داغ اور سب سے معرکہ کا حصہ وہ ترجمے ہیں جو قدیم مصری ادب سے متعلق ہیں ان میں آٹھویں صدی، تیرھویں صدی، سولھویں صدی اور پچیسویں صدی قبل مسیح کے ادب کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر میں اخلاقیات کا وہی تصور تھا جس کا تسلسل ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں یا عہد نامہ عتیق و جدید میں یا دیگر مذہبی کتابوں میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ـــ

تم غرور اپنی لیاقت کا نہ کرنا ہرگز
علم دانا ہی سے کیا، مل سکے تو جاہل سے بھی لو
سر تمھارا کبھی مغرور نہ اتنا ہو جائے

کہ کسی چیز کو خاطر میں ہی وہ لا نہ سکے

ایک عام قاری کو ان کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا آہنگ اور ترنم ہے۔ جو ان کی نظموں میں تقریباً ہر جگہ موجود ہے مہاتما گاندھی کی زبانی پر ان کی نظم اپنے آہنگ اور ترنم کی وجہ سے ایک خاص کیفیت رکھتی ہے۔ دو مصرعے ملاحظہ ہوں ۔

جہانِ بے ثبات میں، بہادری کی بات میں
کسی کو جو قیام ہے، وہ لکشمی کا نام ہے

مہاتما گاندھی پر ان کی نظم رعنائیِ خیال اور نغمگی کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتی ہے لیکن "زندگی کے صحرا میں" شاید اس مجموعہ کی سب سے خوبصورت نظم ہے، جسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ خیال و فکر کی جادوگری روایات سے ہٹ کر بھی خوبصورت پیکر تراش سکتی ہے۔

زمانی ترتیب کے اعتبار سے تخلیقات کی پیش کش نے اس مجموعے کو منفرد و ممتاز بنا دیا ہے۔ مجموعے کی ابتدا میں عبداللہ کمال کا پیش لفظ ہے جس میں انھوں نے بہت سے اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے جن سے کالی داس گپتا رضا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

——— ڈاکٹر نہال احمد صدیقی

نام کتاب: "فکرِ رسا" (مرثیہ)
شاعر: ڈاکٹر نتھونی لال وحشی مظفرپوری
قیمت: دس روپئے
ملنے کا پتہ: اُردو مرکز۔ عظیم آباد (بہار)

اُردو میں غیر مسلم مرثیہ نگاروں کے کارناموں پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بالخصوص جناب سید امجد حسین (مدیر نیا دور) نے اپنی موقر تصنیف "اُردو کے غیر مسلم مرثیہ نگار شعراء" میں اس موضوع پر سیر حاصل اور معلوماتی انداز میں روشنی ڈالی ہے مگر موصوف کا مقالہ بیسویں صدی کے دورِ آغاز پر ختم ہو جاتا ہے اس وجہ سے بیسویں صدی کے بعض بے حد اہم شعراء کا تفصیلی تذکرہ امجد صاحب کے یہاں نہیں ہے۔

نتھونی لال وحشی مظفرپوری بیسویں صدی کے ممتاز مرثیہ نگاروں میں ہیں۔ وہ علامہ جمیل مظہری کے معاصرین میں تھے۔ "فکرِ رسا" ان کے مرثیے کا سرنامہ ہے۔ اس کی حالیہ اشاعت کے لیے جابر حسین اور اُردو مرکز عظیم آباد لائق ستائش ہیں۔

وحشی کے اس مرثیے کی نشان دہی سفارش حسین نے "اُردو مرثیہ" میں کی ہے مگر مثال میں صرف ایک بند دیا ہے۔ اس کے دس برس بعد ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کی کتاب "اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" میں بھی اس مرثیے کا ایک بند ملتا ہے۔

کالی داس گپتا رضا نے پہلی بار یہ مکمل مرثیہ مطبوعہ صورت میں سید امجد حسین کو روانہ کیا تھا۔ اس مرثیے کا سن اشاعت غالباً ۱۹۴۱ء تھا۔ اب پچپن سال بعد بڑی اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ یہ مرثیہ شائع ہوا ہے۔

جناب جابر حسین صوبۂ بہار کی سربرآوردہ شخصیت ہیں۔ وہ قانون ساز کونسل کے صدر بھی رہے ہیں اور وزیر بھی۔۔ اس لیے یہ خوش گوار تعجب بھی ہوتا ہے کہ ایک سیاسی شخصیت اتنے شستہ ادبی ذوق کی مالک ہے۔ دراصل چندن پٹی اور کھاتی پٹی کے مردم خیز علاقے کے تہذیبی عناصر ان کا پس منظر رہے ہیں اور وہ خود مظفرپور کے بہت ہی اعلا خاندان کی سنہری تہذیبی روایات کے امین و پاسدار ہیں اس لیے اس کتابچے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

"اپنی بات" کے تحت انھوں نے بہت سی اہم معلومات مہیا کی ہیں۔ مثلاً ہم میں سے بہت کم لوگ اس سے باخبر ہیں کہ علامہ جمیل مظہری کے والد بزرگوار اور ان کے دادا مظہر حسین صاحب اپنے عہد کے نامور اساتذہ میں تھے اور یہ کہ بہار حسین آبادی بھی بڑے معرکے کے مرثیہ نگار تھے۔ شاد عظیم آبادی پایہ کے شاعر تھے لیکن ان کا کلام گم نامی کے اندھیرے میں ڈوبا رہا۔ اسی کے ساتھ جابر حسین کی دو سطروں کو نظر انداز کرنا گناہِ عظیم ہوگا۔ "اپنی بات" کے تحت وہ یہ بھی لکھتے ہیں؛

"ایک نفسیاتی ردعمل کے بطور بعض اوقات اُردو کے

غیر مسلم فن کاروں کے ساتھ بھی ادبی بے اعتنائیوں اور چشم پوشیوں کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔"

یہ بات اتنی ہی نادرست ہے کہ راقم الحروف اپنی تمام تر کم علمیوں کے باوجود یہ دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ کسی غیر مسلم فن کار کے ساتھ کم از کم گزشتہ پچاس برس میں نہ چشم پوشی ہوئی ہے نہ بے اعتنائی برتی گئی ہے بلکہ اردو میں اپنی روایات اور اپنے ہندی مزاج کی وجہ سے ہر فن کار کے ساتھ وہی رویہ اپنایا ہے جو اس کے ادبی مرتبے کے اعتبار سے اُسے ملنا چاہیے تھا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ تعارف ہی نہ ہو سکا ہو اور اس وجہ سے اسے اس کا مستحقہ مقام نہ مل سکا ہو۔ مگر یہ بات مسلم اور غیر مسلم سب پر یکساں طور سے صادق آتی ہے۔ اگر رام نرائن موزوں کا صرف ایک ہی شعر لوگوں کو یاد ہے تو پھر غدوری عظیم آبادی کا بھی ایک ہی مصرع زبان زد ہے۔!

یہ بے اعتنائی محققین سے عدم دلچسپی کی وجہ سے تو ہو سکتی ہے لیکن اس وجہ سے نہیں ہو سکتی کہ وحشی کے لفظوں میں "یہ ہندو کا کھیت ہے یا مسلمان کا کھیت ہے"۔

یہ چند کلمے ضروری تھے ورنہ سچ یہ ہے کہ محترم جابر حسین نے اس ۶۳ صفحے کے کتابچے کے ذریعہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے وحشی کی مرثیہ نگاری کے بارے میں بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُردو مرثیے کی تاریخ میں سب سے الگ ہیں اس لیے کہ ہندو روایات، ہندو اساطیر کو بنیاد بنا کر مرثیے کی روایات سے ہم آہنگ کرنا ان کا منفرد کارنامہ ہے۔

انھوں نے اپنے عقائد کے ساتھ اپنے فکر و فن کو ہم آہنگ کر کے دنیائے رنگ و بو میں نئی کیفیت کا اعلان کیا ہے۔ چہرہ کے دوسرے بند میں کس طنطنہ کے ساتھ اپنا تعارف کراتے ہیں ؎

گنگا کی اٹھتی لہر ہے طبع رواں مری — متھرا کی کوئلوں سے سنو داستاں مری
رادھا کی انگلیوں کا ہے جادو زباں مری — ڈوبی ہوئی ہر بیت کے دھن میں فغاں مری
نغموں کے اضطراب میں جنبش ہر ساز کی
دل میرا بانسری ہے مرے نے نواز کی

یہ بند جہاں ہندستان کی عظیم شعری و تہذیبی روایات کا احساس دلاتا ہے وہیں یہ میر انیس کی بھی بے ساختہ یاد دلاتا ہے۔

چھٹے بند سے "ساقی نامہ" شروع ہوتا ہے اور اس ساقی نامہ میں مندرجہ بیت نہ صرف یہ کہ مشترکہ تہذیب کی علامت بن جاتی ہے بلکہ اُردو شاعری کا مزاج نازک خطوط سے بنا ہے وہ بھی سامنے آجاتا ہے، کہتے ہیں ؎

پہنچا حرم میں بیعتِ ساقی کیے ہوئے
آنکھوں میں بت کدے کی بہاریں لیے ہوئے

نئے مرثیے کا جو رنگ و آہنگ جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری اور آلِ رضا کے ساتھ اُجاگر ہوا تھا اس کی بڑی خوبصورت جھلک وحشی کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے عقیدے اور اصولوں سے سر مُو تجاوز نہیں کرتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ کربلا کے پس منظر میں درسِ حیات دیتے ہوئے رمز زندگی سے باخبر کرتے ہیں۔ وحشی کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

ہوں تشنہ کام معرفتِ عشقِ کبریا — پینے سے مجھ کو کام ہے سنگھٹ میں جا بجا
بطحا و طوس و کاشی و پریاگ بندھیا — متھرا و کاظمین و جگناتھ و کربلا
اللہ رے تشنگی مرے ذوقِ صفات کی
گنگا سے ہمکنار ہیں موجیں فرات کی

اس بند میں مشترکہ تہذیب کا رچا ہوا احساس جلوہ گر ہے، باہمی احترام، رواداری اور مذہب کا انفرادی تصور ملتا ہے۔ وحشی نے بعد کے بندوں میں ہندستان کی رزمیہ داستان "مہابھارت" کا بیان کرتے ہوئے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس روایت کی بنیاد اس کے پس منظر میں علامہ دربندی کی "اسرار الشہادت" کی یہ روایت ہے کہ امام حسینؑ نے ہندستان آنا چاہا تھا۔ دوسری طرف ہندستان میں حسینی برہمنوں کی موجودگی بھی بہت سارے گوشے منور کرتی ہے چنانچہ اسی بنیاد پر منشی پریم چند نے اپنا ڈرامہ "کربلا" میں ایک ایسے قافلے کا تذکرہ کیا ہے جس نے میدان کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ حق جاں نثاری و جاں سپاری ادا کیا۔ اسی طرح کی روایت وحشی نے بھی نظم کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ خاندان کربلا پہنچا۔ وہ اپنا تعارف کراتا ہے ؎

بصرے میں ایک تاجر خوشحال ہند ہوں
کھتری ہے میری ذات میں بقالِ ہند ہوں

یہ بتاتا ہے کہ اس کے آباد اجداد کو حضرت علیؑ نے مالِ غنیمت کا پہرہ دار بنایا تھا۔ اپنے تعارف کے بعد وہ اذنِ شہادت چاہتا ہے۔ ۶۴ ویں بند میں وحشی نے لاجواب طریقے سے ایک بہت ہی حساس اور نازک پہلو کو پیش کیا ہے۔ امام عالی مقام کا ارشاد ہے ؎

مسلک یہی ہمیشہ سے آلِ عبا کا ہے
دُنیا ہماری آنکھ میں کنبہ خدا کا ہے

اس کے بعد والے بند کی بیت بھی لائقِ توجہ ہے ؎

سینے میں جس کے دل ہو انسان ہے وہی
جس میں سلامتی ہو مسلمان ہے وہی

مرثیے کی ادبی روایات کے مطابق وحشی نے کچھ بند تلوار کی تعریف میں بھی لکھے ہیں اور اس کے بعد بڑے فنکارانہ انداز میں ان کی معرکہ آرائی رجز اور ان کے زخمی ہو کے فرس سے گرنے پر امام عالی مقام کا تشریف لانا نظم کیا ہے۔ مصائب یا بین کے بند ایسے ہیں کہ شاید ہی دل کے نازک تاروں کو کسی نے اس طرح چھیڑا ہو۔ امام کی صدائے استغاثہ پر عالم کا اضطراب اور اس کا ردِ عمل آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے ؎

آنکھوں میں پھر رہا ہے سماں اس دیار کا
ہندو جواب دیتے ہیں آج اس پکار کا

ایک بند ملاحظہ ہو ؎

مت گونجے مسجدوں میں فسانہ حسینؑ کا
مندر بنیں گے تعزیہ خانہ حسینؑ کا
جب تک کہ ہو نہ جائے زمانہ حسینؑ کا
ہم چھیڑتے رہیں گے ترانہ حسینؑ کا

دشمن ابھی بہت ہیں امام غیور کے
کس طرح جوگ آمادہ ہیں خادم حضورؐ کے

اس کتابچے میں کل ۷۰ بند شامل ہیں۔ شاید یہ عدد بھی مخصوص تصور کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کربلا میں امام عالی مقام کے رفقاء کی تعداد بہتّر تھی۔

"فکرِ رسا" کی کتابت و طباعت عمدہ ہیں لیکن کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔

——— محمد سبطین

نام کتاب: زبورِ اخلاق (شعری مجموعہ)
شاعر: نقی احمد ارشاد قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر سیّد نثار احمد، ۳۴۸۔ ایم آئی جی
کنکڑباغ۔ پٹنہ

نقی احمد ارشاد کہنہ مشق شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ بارہ سال قبل شائع ہوا تھا۔ "زبورِ اخلاق" میں مراثی۔ سلام۔ نظمیں، غزلیں، رباعیات اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ وہ طویل عرصے سے مرثیہ کہہ رہے ہیں اور مرثیہ نگاری کی اس روایت کے پاسدار ہیں جس کا نقطۂ آغاز شاد عظیم آبادی کو قرار دینا چاہیئے۔ انھوں نے مراثی میں "جہاں تک ہو سکا ہے تاریخی حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جن کتابوں سے مواد لیے ہیں ان کا حاشیہ میں حوالہ بھی دیا ہے۔

انھوں نے مرثیوں میں شاد عظیم آبادی کی طرح اس بات کی کوشش کی ہے کہ قاری یا سامع واقعاتِ کربلا سے درس لے کر اُٹھے مرثیوں میں حضرت علی اصغر کی شہادت، جناب وہب کلبی کی شہادت سفرِ حضرت امام حسینؑ پر مرثیے لکھے ہیں۔ بعض ابیات بڑی خوبصورتی سے لکھی گئی ہیں ؎

تو ہے خاموش مگر حق کی صدا آتی ہے
ذرّے ذرّے سے ترے بوئے وفا آتی ہے

انھوں نے سلام بھی اچھے لکھے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کربلا سے جو کبھی بادِ صبا آتی ہے
اب بھی کانوں میں وہی حق کی صدا آتی ہے

جیسا کہ مجموعے کے نام سے ظاہر ہے، ارشاد صاحب علامہ اقبال سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں کے عنوانات اور اشعار بھی اس کی غمازی کرتے ہیں۔

——— اقبال احمد اعجازی

نصف صدی نمبر

تاثرات کے آئینے میں

محترم امجد صاحب آداب۔

نیادور کا نصف صدی نمبر مل گیا تھا، اس کے بعد آپ کی بھیجی ہوئی کتاب "اودھ آئینہ ایام میں" بھی ملی۔

نصف صدی نمبر پاکر میں چونک گیا تھا کیونکہ یہ خیال بھی نہیں تھا کہ آپ اتنی ضخیم، عظیم الشان اور تاریخ ساز دستاویز پیش کریں گے اگرچہ اس سے پیشتر آپ کے خصوصی اودھ نمبر بھی دیکھ چکا تھا مندرجات تو بلند پایہ اور معیاری ہیں ہی اور یہ توقع آپ سے بہرصورت تھی، مگر تزئین کاری میں بھی آپ ایک سنگ میل قائم کریں گے' یہ دیکھ کر بے پناہ مسرت ہوئی۔ مرحبا اور مبارکباد۔

"اودھ آئینہ ایام میں" شائع کرکے آپ نے ایک بڑی ادبی اور تہذیبی خدمت انجام دی ہے۔ مشمولات بلند سطح ہیں' اور مصنفین کی تحقیق و جستجو اور عرق ریزی ان سے مترشح ہے۔ اس کارنامے کے لیے بھی مبارکباد! اسی لگن، جانفشانی اور جدت طرازی سے کام کرتے رہیے کیوں کہ کام خود میں ایک صلہ ہے۔

——— م۔م۔ راجندر دہلی

مدیر محترم!

نیادور کا نصف صدی نمبر نظر نواز ہوا۔ رنگین اور دلکش سرورق جس پر پچاس شمعیں روشن ہیں، پسند آیا۔

اودھ نمبر کے ہندی روپ اور نصف صدی نمبر کے مضامین کے انتخاب، کتابت، طباعت اور تزئین کے لیے آپ کا ادارہ' ابوالفضل، حسن اختر اور تمام قلم کار مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سنگ مرمر کی ترتیب، تزئین، دل کی چاہت اور جسم کی محنت سے تاج محل کی تعمیر ہوتی ہے۔ تکمیل حسن کوئی معمولی شے نہیں۔ ہر صفحہ کاوش اور حسن کاری کا مرقع ہے۔

"حرفے چند"۔ "اپنی بات" مفید، مختصر اور جامع ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں اردو تحقیق، ادبی تنقید، نیا چیلنج، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت، ہم عصر اردو صحافت، اردو میں تحقیق آزادی کے بعد، ملتے جلتے عنوان ہوتے ہوئے بھی تنوع اور انفرادیت کے حامل ہیں۔

شہر شہر اور نگر نگر کی تمام تحریریں نئے گوشوں سے روشناس کراتی ہیں۔ سید محمد عقیل، عبدالقوی دسنوی، تاراچرن رستوگی، راجندر بہادر موج اور ظفر محمود کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔ صدیوں کا بھر دستہ اور ما بھی خوبصورت افسانے ہیں۔ شعریات میں علی سردار جعفری، مظہر امام، جگن ناتھ آزاد، ندا فاضلی' زاہدہ زیدی اور بیکل اتساہی زیادہ پسند آئے۔

یہ شمارہ نئی نسل کے تحقیق کے کاموں میں ممد و معاون ہوگا۔ حیدرآباد اور دکن کے علمی اور ادبی حلقوں میں بھی اسے بہت سراہا گیا ہے۔ 'سیاست' میں صلاح الدین نیر کا تبصرہ معیار اور توازن سے عبارت ہے۔ یہ نمبر یقیناً اردو ادب میں ایک قیمتی اور قابل قدر اضافہ ہے۔

——— ضیاء جبل پوری
کاماریڈی۔(اے پی)

مکرمی!

نیادور کا نصف صدی نمبر ملا۔ یہ نمبر ایک مستند دستاویز ہے نہایت عمدہ تصاویر' نہایت عمدہ طباعت نگارشات اور موضوعات کو جن دلکش عنوانات سے آپ نے نوازا ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے اور تخلیقات بھی اتنی جاندار ہیں کہ ان کا مطالعہ ہر ایک کے لیے نہایت ضروری ہے۔ آپ کی ادارت میں نیادور نے نئی جہتیں اور سمتیں دریافت کی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نمبر کو معیاری اور جاذب نظر بنانے میں آپ کی انتھک محنت کو دخل ہے۔ کس محنت اور لگن سے آپ نے سارا مواد اکٹھا کیا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو کبھی رسالہ نکالنے کی جسارت کرچکے ہیں۔ یہ آپ کی ذہانت و صلاحیت اور محنت کا ثمرہ ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے آئینے کا کام دے گا۔ اس نادر شمارہ کے لیے مبارکباد!

——— حکیم منظور حسن قریشی، امین

جلد ۵۱ نمبر ۴

عنوانات

عنوان	مصنف	صفحہ
اپنی بات	ایڈیٹر	۲
وہی تو بعدِ خدا ہیں برتر (نعت)	رباب رشیدی	۳
آپ بیتی (خودنوشت)	ولی الحق انصاری	۴
گیت ساون کا	بیکل اتساہی	۱۵
اقبال اور اکبر	اکبر حیدری کشمیری	۱۶
تلاش (نظم)	آسی زیدی	۲۵
اختر الایمان	غلام رضوی گردش	۲۶
غزل	جمیل روشی	۳۱
غزلیں	رئیس الدین رئیس	۳۲
	فاطمہ وصیہ جائسی	۳۲
	ناظم جعفری	۳۲
نینی تال	شیوانند نوٹیال	۳۳
اردو میں بچوں کے رسائل	اسعد ابراہیم علوی	۳۷
غزلیں	مظفر تاجپوری۔ راحت کاظمی	۴۰
	حیدر مصطفےٰ آبادی	۴۰
	رضوان خاں شکیل جے پوری	۴۰
اترپردیش میں گرونانک کی زیارت گاہیں	پرشوتم سنگھ سیٹھی	۴۱
کشکول (کہانی)	غضنفر	۴۳
نقد و تبصرہ	ڈاکٹر رحمت یوسف زئی	۴۴
	ایس اے رحمٰن۔ اسحٰق سنبھلی۔ فیصل کلیم	تا
	جمیل عسکری۔ کہکشاں عابدی۔ ظفر حسین	۴۷
اودھ آئینۂ ایام میں، چند تاثرات	قارئین	۴۸

اپنی بات

پانچ سال قبل راقم الحروف نے نیا دور کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ وقت کے اتار چڑھاؤ اور زمانے کے نشیب و فراز کے باوجود نیا دور شاہراہ ترقی پر گامزن رہا۔ اس پانچ برس میں نیا دور نے اپنی ایک سمت متعین کی اور وہ سمت تھی "بین موضوعاتی" ادبی شعور کی عکاسی۔ چنانچہ نیا دور کا شیخ علی حزیں نمبر ہو، قومی یکجہتی نمبر ہو یا جمہوریہ تاریخ ساز اودھ نمبر اور نصف صدی نمبر ہو یا گاندھی نمبر —— ان سب میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ اردو ادب کے مشترکہ تہذیبی پہلو کی تاریخی وراثت کو اجاگر کیا جائے۔ اپنے ساتھیوں کے پرجوش تعاون اور اہل علم و فن کی سرپرستی، بزرگوں کی رہنمائی اور ارباب اختیار و اقتدار کا غیر معمولی ہمدردانہ رویّہ —— ان سب نے تو یقیناً نیا دور کی غیر معمولی کامیابی میں اپنا کردار ادا کیا، لیکن یہ بھی اٹل سچائی ہے کہ نیا دور کے قارئین کا مسلسل اور نفیس ادبی ذوق اور گرم جوشی کے ساتھ ہر شمارے کا خیر مقدم —— یہ وہ اہم نکتے ہیں جن کا اعتراف نہ کرنا قدر ناشناسی ہوگی۔

اور یہ سب اپنی جگہ —— اگر مالک حقیقی کا فضل و کرم نہ ہو تو انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔!

اس لیے بزرگوں کی رہنمائی، اہلِ علم کی سرپرستی، احباب کے تعاون، قارئین کی قدردانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں سرِ نیاز جھکانا اور اس کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔

اسی کے ساتھ یہ یقین دہانی بھی ضروری ہے کہ اپنی بساط بھر، جتنی بھی صلاحیت ہے، اردو زبان و ادب کی خدمت فریضۂ حیات رہے گی —— اس زبان و ادب کی خدمت، جس نے ہندوستانی تہذیب کو منفرد رنگ و آہنگ دیا اور سلیقۂ حیات و شعورِ زندگی بھی دیا۔

آنے والے دنوں میں یہ ارادہ ہے کہ اب اردو ادب کی اصناف اور ان کے اسلوب پر خاص نمبر پیش کیے جائیں۔ انشاء اللہ جلد ہی اس سلسلے میں خوش گوار تفصیلات سے باخبر کیا جائے گا۔

یہ مہینہ ایک طرف دنیاوی اعتبار سے برسات کی ریشمی پھوار کے مزے لے کر آتا ہے اور بازاروں میں دنیا کے [illegible] کی ہزاروں قسموں کی بہار اور خوشبو سے فضا مہک اٹھتی ہے اور شدید تپش، لو، اور تمازتِ آفتاب سے چھٹکارا [illegible] وہیں اس سال اس مہینہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جشن عید میلاد النبیؐ اسی مہینے میں منایا جا رہا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی تہوار کسی ایک فرقے یا گروہ سے متعلق نہیں بلکہ پورا ملک اسے [illegible] سب کو عید میلاد النبی کی مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔ دراصل یہ جشن بھی اسی شخصیت کا [illegible] [illegible] کے لیے باعثِ رحمت ہے جس نے دنیا کو [illegible] عظمتِ [illegible] طرزِ زندگی اور طرزِ بندگی کی تعلیم دی۔ اسی لیے عید میلاد النبیؐ کی [illegible]

اس متبرک موقع پر دعا ہے کہ ہمارا ملک اپنی سنہری اور عظیم روایات کے ساتھ شاہراہ ترقی کی طرف [illegible] سنگِ گراں بنتے جائیں۔

—— ایڈیٹر

نذرانۂ عقیدت

حضورؐ سے پہلے ظلمتوں میں گھری ہوئی تھی یہ ساری دُنیا
محبتوں کے اُجالے لے کر وہ آئے، آکر سنواری دُنیا

سفر کی تکمیل ہوگئی ہے کہاں کو جانا، کہاں سے آنا
جمال اُن کا ہماری آنکھیں، خیال ان کا ہماری دُنیا

تمام تر عظمتوں کے مظہر، تمام تر رحمتوں کے پیکر
وہی تو بعدِ خدا ہیں برتر، انھیں سے ہے اتنی پیاری دُنیا

صداقتوں کے امین بن کر، سماعتوں کو یقین بخشا
نبیِؐ اکرم پہ جان صدقے، عجب طرح سے نکھاری دُنیا

یہ دیکھ کر، زخم کھانے والے کو یاد حرفِ دُعا ہی آئے
ہمارے آقا، ہمارے آقا، ہمارے آقا پکاری دُنیا

ستم کے حربے اُدھر سے ہوتے، اِدھر سے حُسنِ سلوک ہوتا
تبسّم زیرِ لب سے آخر نہ لڑ سکی جب، تو ہاری دُنیا

ہمیں غلامی پہ ناز اپنی، تمھیں عزیز اپنا زہد و تقویٰ
ہمیں مُبارک ہماری دنیا، تمھیں مبارک تمھاری دُنیا

دُرود پڑھتے رہے ہمیشہ کبھی کوئی غم نہ پاس آیا
بڑے سلیقے سے عُمر کاٹی بڑے مزے میں گزاری دُنیا

حضورؐ اب آپ ہی کی جانب یہ اک زمانے سے تک رہی ہے
اب اپنی حالت پہ رو رہی ہے غمِ حوادث کی ماری دُنیا

ہمیں نے خود کو گنوا یا ... ہمیں سے یہ ہوشیاری دُنیا

خدا کے دلبر، شفیعِ محشر، سبھی کے محسن، سبھی کے رہبر
رباب پُرچشم لطف آقا! دنوں سے دل پر ہے بھاری دُنیا

رباب ...

خود نوشت

پروفیسر محمد ولی الحق انصاری
دارالامان ، ۲۰۰ ، فرنگی محل
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

آپ بیتی

اپنے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ خانوادۂ علمائے فرنگی محل کا ایک فرد ہوں اور اس خاندان کے ایک بہت ہی مشہور بزرگ مولانا انوار الحق صاحب (جن کے نام سے منسوب محلہ رکاب گنج کے ایک علاقے میں ہمارا خاندانی قبرستان نیز محلہ "باغ مولوی انوار صاحب" آباد ہے) کی اولاد ہوں اور "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" کے مصداق لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس میں مشغول رہ کر ۱۹۸۷ء میں پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی کے عہدے سے سبکدوش ہوا لیکن پریسیڈنٹ ایوارڈ پانے کی وجہ سے ایک سال کی ملازمت میں خصوصی توسیع پاکر ۳۰ جون ۱۹۸۸ء کو یونیورسٹی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

میرے خاندان یعنی خانوادۂ فرنگی محل کے مورث اعلا حضرت ابو ایوب خالد انصاری ہیں جن کا سرمایۂ فضیلت نہ جاہ و منصب تھا اور نہ دولت و مال البتہ ان کے حصے میں وہ سعادت آئی تھی جس کی بزرگ سے بزرگ صحابیِ رسول کو تمنا تھی اور وہ تھا میزبانیِ رسولِ مقبول کا شرف، جس کے مقابلے میں ایک مسلمان کی نظر میں دولتِ کونین ہیچ ہے اور یہی وہ سرمایۂ امتیاز ہے جس پر آج تک ہمارے خاندان کو ناز ہے۔

انصاریانِ مدینہ جن کے ابو ایوب خالد انصاری ایک فرد تھے اوس اور خزرج نامی دو قبیلوں پر مشتمل تھے۔ بعثتِ رسول کے [illegible]

[illegible]

سال مدینہ سے بارہ افراد [illegible]

مبارکِ رسول پر بیعت کی۔ سالِ آئندہ یعنی ۱۳ھ میں حج کے موقع پر مدینہ سے آنے والوں میں پچھتر مسلمان بھی شامل تھے جن میں ابو ایوب کے ایک بیٹے ابو یعلیٰ انصاری بھی تھے اور یہی وہ حضرات تھے جنھوں نے عقبہ کی گھاٹی میں رسولِ مقبول کی ہر طرح کی اعانت کا وعدہ کیا اور انھیں مدینہ آنے کی دعوت دی اور زبانِ رسول سے "انصار" کا خطاب پایا۔

حملۂ چنگیزی کے وقت انصاریانِ ہرات کا ایک گروہ ہندستان آ گیا اور دہلی کے نواح میں سرسل نامی ایک قصبے میں قیام پذیر ہوا، لیکن حالات سے مجبور ہو کر چار پشت ہندستان میں رہنے کے بعد ہرات واپس چلا گیا (ملاحظہ ہو جشتیہ بہشتیہ تالیف علاء الدین برناوی مخطوطہ شیخوپورہ برناوہ) لیکن اس کے ایک فرد شیخ مخدوم شرف الدین ہندستان ہی میں رہ گئے اور دہلی میں وہ اور ان کے بیٹے مخدوم بدر الدین قیام پذیر ہوئے۔ لیکن حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے حکم سے برناوہ ضلع میرٹھ آ گئے۔ ان کے پوتے مخدوم علاء الدین بزرگ برناوہ کے علاوہ رائے بریلی ضلع میں پوری میں بھی قیام پذیر رہنے لگے اور وہیں ۸۴۶ھ (۱۴۴۰ء) میں بہت طویل عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ انھیں بزرگ کی حیات میں تیمور (متوفی ۸۰۷ھ/۱۴۰۴ء) کا ترکی اور ایران کے بعد افغانستان اور ہندستان پر حملہ ہوا اور اس فتنے کے دوران انصاریانِ ہرات [illegible]

پھر ہرات چھوڑ کر ہندستان [illegible]

[illegible]

علاء الدین [illegible]

انصاریان برناوہ کے ساتھ مقیم ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

قطبِ عالم شیخ علاء الدین کے بیٹے شیخ نظام الدین لودی سلاطین کے عہد میں برناوہ سے ہجرت کر کے اودھ کے ایک قصبہ سہالی چلے آئے اور یہاں مجلسِ درس آراستہ کی۔ اور شیخ نظام الدین کی آٹھویں پشت میں وہ نابغۂ روزگار پیدا ہوا جو علمی دنیا میں قطب الدین شہید کے نام سے مشہور ہے اور بانیِ درسِ نظامی ملا نظام الدین کا والد ہے۔

ملا قطب الدین کا واقعہ شہادت ۱۹ رجب (بروز دوشنبہ) ۱۱۰۳ھ (مارچ ۱۶۹۲ء) میں پیش آیا اور ان کی اولاد کے قیام کے لیے اورنگ زیب کے حکم سے لکھنؤ میں احاطہ چراغ بیگ میں ایک یوروپین کی خالی کوٹھی دے دی گئی۔ قطب شہید کے بڑے بیٹے ملا اسعد اورنگ زیب کے ہمراہ دکن میں تھے۔ دوسرے بیٹے ملا سعید (راقم الحروف کے جد) اپنے چھوٹے بھائیوں اور دیگر افرادِ خاندان کو لکھنؤ میں چھوڑ کر دکن چلے گئے اور خاندان کی سربراہی کے فرائض ان کے چھوٹے بھائی استاد الہند، بانیِ درسِ نظامی ملا نظام الدین نے سنبھال لیے اور اپنے بھائی اور بھتیجوں کے ساتھ درس کا وہ سلسلہ شروع کیا جس نے عالمگیر شہرت پائی اور فرنگی محل ایک عمارت کے بجائے ایک علمی ادارے کا نام پڑ گیا جس میں ملا نظام الدین اور ان کے بھائیوں کی اولاد میں سے بہتوں نے نہ صرف ہندستان بلکہ اسلامی دنیا کے اکثر علاقوں میں دینی رہنمائی کی۔ ان حضرات میں ملا عبدالعلی بحر العلوم، مولانا احمد عبدالحق، مولانا احمد انوار الحق، مولانا نور الحق، مولانا عبدالوالی، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالحلیم، مولانا عبدالحی، ملا محمد حسن، مولانا نعمت اللہ، مفتی محمد یوسف، ملا مبین، مولانا محمد ولی اللہ، مولانا رحمت اللہ، مولانا برہان الحق، مولانا عبدالوہاب، مولانا عبدالباری، مولانا [illegible] نعیم، مولانا عبدالباقی، مولانا رحمت اللہ [illegible] چشتی [illegible] ہیں۔

[illegible]

ڈاکٹر محمد نسیم انصاری ایف آر سی ایس کے دادا، جو مجاہدِ آزادی تھے اور پنڈت نہرو کے ساتھ جیل کاٹ چکے تھے) کی ڈائری کے ایک اندراج کے مطابق ۱۱ دسمبر ۱۹۲۴ء ہے۔ میری والدہ فرحت النساء بیگم کا تعلق سرسنڈہ ضلع بارہ بنکی کے ایک زمیندار خاندان سے تھا اور میرے نانا رزاق بخش صاحب عرف راجہ میاں کی پانچ اولادوں میں تنہا ان کے انتقال کے بعد تک زندہ رہیں لیکن میری عمر ڈھائی سال سے بھی کم تھی جب وہ مجھے اور میرے شیر خوار بھائی وسیم الحق کو چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ان کے انتقال کے چھ مہینے کے اندر میرے بھائی کا بھی انتقال ہو گیا اور مجھے ان کی شکل تک نہیں یاد ہے۔ والد صاحب کی لکھنؤ سے باہر تعیناتی کی وجہ سے میری پرورش اور تربیت کی ذمے داری میرے چچا منظور الحق صاحب (جو غازی پور یا پرتاپ گڑھ سے تبادلہ ہو کر لکھنؤ آ چکے تھے) اور چھوٹی پھوپھی بیگم شیخ محبوب علی صاحب کے سپرد ہوئی۔

میری پیدائش اور ابتدائی بچپن کے زمانے میں ہمارا گھر فرنگی محل کے غریب ترین گھرانوں میں تھا۔ میرے دادا فضل حق صاحب کا حیدرآباد میں انتقال ہو چکا تھا اور خاندان کا پورا بار میرے والد کے کندھوں پر آ چکا تھا جو اپنے والد کے انتقال کے وقت دینی تعلیم کے بعد انٹرنس کے امتحان میں شریک ہونے جا رہے تھے۔ خاندان کے کچھ بااثر افراد کے زور دینے کے باوجود انھوں نے فوری طور سے تعلیم ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال میٹرک پاس کرنے کے بعد (جو اس وقت مسلم گھرانوں کے لیے اہم بات تھی) والد صاحب قانون گو کی جگہ کے لیے بڑی امیدیں لے کر امتحان میں بیٹھے۔ لیکن ملازمت میں آنے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ جس محکمہ کا انھوں نے اپنے لیے انتخاب کیا تھا وہ ان کی فطرت سے بالکل میل نہ کھاتا تھا اور اس میں ترقی کے لیے اہلیت اور قابلیت سے زیادہ رشوت اور خوشامد کی ضرورت ہوتی تھی اور رشوت دینے کے لیے رشوت لینا بھی ضروری ہوتا تھا۔ ان حالات میں جو نتیجہ ہونا تھا وہ ظاہر ہے۔

[illegible]

نعیم الحق صاحب سے میرا غائبانہ تعارف کروایا۔ نعیم صاحب افغانستان میں تعلیم پانے کے بعد واپس آئے تھے اور انہیں وہاں تحریک کا بہت سا ایسا کلام ملا تھا جو بہت ہی کم نسخوں میں ملتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر نورالحسن صاحب کا اردو میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا تھا اور اس وقت سے آج تک ان کی حیثیت میرے بڑے بھائی کی ہے اور وہی سرکاری ملازمت سے مجھے یونیورسٹی میں لانے کے ذمہ دار ہیں۔

۱۹۴۷ء ہندستان کے علاوہ خود میری زندگی کا بہت اہم سال ہے۔ اس سال مجھے ایم اے کی ڈگری ملی اور ڈگری کے اعلان کے ڈھائی مہینے کے اندر ہی شفقت پدری سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ میرے والد سخت دردِ گردہ کی تکلیف میں باندہ سے لکھنؤ آئے۔ سرجن نگم صاحب نے فوری آپریشن تجویز کیا لیکن میڈیکل کالج میں آپریشن ہونے سے پہلے گردوں نے جواب دے دیا اور اس کے گھنٹہ بھر کے اندر چراغِ ہستی گل ہوگیا۔ اور اب ان کی تمام ذمہ داریوں کا سنبھالنے والا میں بے روزگار تھا۔ والد صاحب اپنی قلیل تنخواہ میں کچھ بھی پس انداز نہ کر سکے تھے۔ حیران تھا کہ پورے گھر کا خرچ کیسے چلے گا لیکن ع

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما

خدا نے میرے سر ذمہ داری ڈالی تھی اور اس پُر آشوب دور میں اسی نے میری مدد کی۔ ایک روز عالمِ پریشانی میں وکٹوریہ اسٹریٹ پر کھڑا تھا کہ اپنے ایک دوست محمد حسین (اثر صاحب مرحوم کے نواسے) کو جاتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حسین آباد اسکول میں سی۔ ٹی۔ گریڈ میں عارضی ملازمت کرلی ہے۔ میرے دریافت کرنے پر کہ کیا وہاں ویسی ہی کوئی دوسری جگہ ہے؟ محمد حسین نے بتایا کہ ایل۔ ٹی گریڈ میں وقتی طور سے ایک جگہ خالی ہے۔ میں اسی وقت ان کے ساتھ حسین آباد اسکول کے لیے روانہ ہوگیا۔

ہیڈ ماسٹر امیر احمد آبادی صاحب مجھ سے بحیثیت اپنے شاگرد کے واقف تھے، میرے حالات کو غور سے سننے کے بعد صرف اتنا کہا کہ فلاں کمرے میں جاکر نویں درجے کو انگریزی پڑھانا شروع کردو۔ میں حیران تھا کہ گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو تقرری کا اختیار کب سے مل گیا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مرزا جلال صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور انہی جناب نے میرا فوراً تقرر کردیا گیا اور انسپکٹر کو بعد میں مطلع کیا گیا۔ اس طرح مئی ۱۹۴۸ء تک میرا اقتصادی مسئلہ کچھ حد تک حل ہوگیا۔ اس ملازمت کے دوران ہی میں نے اپنا چھوٹا ہوا فارسی میں بی اے آنرز کا امتحان اور لا کے دوسرے سال کے امتحان پاس کرلیے۔ آنرز میں تقریباً ایک درجن طلبا تھے اور ان میں سب سے زیادہ نمبر مجھے ملے تھے۔ جون ۱۹۴۸ء میں حسین آباد اسکول تعطیلات گرما کی وجہ سے بند ہوگیا اور میں پھر بے کار ہوگیا۔ لیکن اسی دوران مجھے سکریٹریٹ میں ایک معمولی ملازمت چند روز کے لیے مل گئی جس کے ختم ہونے پر پھر بے کار ہوا۔ اس عرصے میں حسین آباد اسکول کھل گیا لیکن معلوم ہوا کہ جو جگہ مجھے ملی تھی اس پر ڈپارٹمنٹ سے کوئی صاحب بھیج دیے گئے ہیں لیکن ایک سی۔ ٹی گریڈ میں ساٹھ روپیہ ماہوار کی جگہ خالی ہے۔ میں نے اسی کو قبول کرلیا، لیکن پندرہ دن کے بعد ہی سکریٹریٹ کے فائننس ڈپارٹمنٹ سے میرا بلاوا آگیا جہاں اسّی روپیہ ماہوار تنخواہ اور پچیس روپیہ گرانی الاؤنس تھا۔

کئی مہینے تک میری سکریٹریٹ کی ملازمت کچھ روز رہتی اور کچھ روز نہ رہتی۔ میں بی اے (آنرز) کرچکا تھا اور ایک سال میں ایم اے اسپیشل کرسکتا تھا، چنانچہ کچھ روپیہ جمع کرکے ایم اے فارسی میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۴۹ء میں گولڈ میڈل کے ساتھ دوسرا ایم اے بھی پاس کرلیا۔ اس وقت سکریٹریٹ کے فائننس ڈپارٹمنٹ میں میں تنہا اکنامکس میں ایم اے تھا چنانچہ عارضی ہونے کے باوجود پانچ مہینے میں مجھے ترقی مل گئی۔ فائننس ڈپارٹمنٹ میں تین سال کی ملازمت ہی میں میں نے مقبولیت حاصل کرلی اور انڈر سکریٹری گوکل صاحب کی مہربانی سے مجھے پی ایچ ڈی اور ایل ایل ایم دونوں کی اجازت مل گئی۔

۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کے اکنامکس اینڈ اسٹیٹسٹکس ڈپارٹمنٹ میں میری انہیں مضامین میں ڈگری کی وجہ سے جگہ مل گئی۔ میں خوش تھا کہ کسی وقت بھی بے روزگار ہوجانے کی تلوار میرے سر سے ہٹ گئی۔

جب میں مذکورہ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کر رہا تھا تو استاد محترم عبدالقوی قانی صاحب کے ریٹائرمنٹ کے نتیجہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی لکچرر کی جگہ خالی ہوئی لیکن برادر محترم پروفیسر نذیر احمد جو اس وقت پی ایچ ڈی کر چکے تھے اس جگہ کے امیدوار ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں میرے درخواست دینے کا سوال ہی نہ تھا۔ نذیر صاحب کے ایران جانے کے بعد ان کی جگہ عارضی طور سے خالی ہوئی لیکن میرے حالات ایسے نہ تھے کہ چند مہینے کی عارضی لکچرر شپ کے بعد پھر بے کاری کا خطرہ مول لیا جاتا۔ اس عارضی جگہ پر رغیب صاحب کا تقرر ہو گیا اور نذیر صاحب کی واپسی پر رغیب صاحب بے کار ہو گئے لیکن کچھ عرصے کے بعد نذیر صاحب عارضی طور سے علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے اور رغیب صاحب کو پھر عارضی تقرر مل گیا جس کا سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا اور جگہ مشتہر ہونے کے باوجود بھری نہیں گئی اور آخر میں ایگزیکیٹو کمیٹی کے ایک رزولیوشن سے رغیب صاحب ہی اس پر مستقل کر دیے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد مسعود صاحب ریٹائر ہو گئے۔ اس وقت ان کے بیٹے اختر مسعود بھی اس جگہ کے امیدوار تھے۔ شعبہ میں سینیر ریڈر آل احمد سرور صاحب تھے جن کو سینیرٹی دلانے میں مسعود صاحب کا دخل تھا اور بظاہر آثار یہی تھے کہ اختر مسعود صاحب کا تقرر ہو گا لیکن

من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال

موسوی صاحب نے سرور صاحب کی سینیرٹی کے خلاف ریپریزنٹ کیا۔ موسوی صاحب کا ریپریزنٹ منظور ہو گیا اور ان کے سینیر ہونے کے اعلان کے بعد سرور صاحب کے بجائے وہ صدر شعبہ بنا دیے گئے۔ سرور صاحب استعفا دے کر چلے گئے اور موسوی صاحب نے پہلا اہم قدم جو اٹھایا وہ وائس چانسلر کو یہ لکھنا تھا کہ مسعود صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد لکچرر کی خالی ہونے والی جگہ زیادہ ہے جو واپس لے لی جائے۔

اختر مسعود صاحب پشاور چلے گئے اور میں بدستور یہ تماشے دیکھتا رہا۔ اسی زمانے میں گورنمنٹ نے پلاننگ شروع کی تھی اور سکریٹریٹ میں پلاننگ ڈپارٹمنٹ کھولا گیا تھا۔ اے۔ این۔ جھا آئی۔ سی۔ ایس سکریٹری تھے اور صدیق حسن صاحب آئی سی ایس مرحوم پلاننگ کمشنر تھے اور کے۔ اے۔ پی۔ اسٹیونسن جوائنٹ سکریٹری۔ ڈپارٹمنٹ کو صحیح طریقے سے چلانے کے لیے ودیا شنکر صاحب کو محکمۂ زراعت سے اور مجھے اسٹیٹسٹکس ڈپارٹمنٹ سے خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔

میں پلاننگ ڈپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا کہ ایک روز ایک سرکلر آیا کہ سرکار گورنمنٹ ڈسٹرکٹ گزیٹیروں پر نظر ثانی کر کے پھر سے لکھوانا چاہتی ہے جس کے لیے اعلا تعلیم یافتہ اسکالروں کی ضرورت ہے اور جو لوگ سکریٹریٹ میں کام کر رہے ہیں وہ بھی مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو سکتے ہیں۔ میں نے درخواست دے دی اور محض تفریحاً امتحان میں بیٹھ گیا۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ میرا انتخاب بھی ہو گیا۔ ڈپٹی سکریٹری ٹی۔ ڈی پانڈے صاحب میرے پلاننگ ڈپارٹمنٹ نہ چھوڑنے پر بضد تھے، لیکن میرے سمجھانے پر کہ چند مہینے کے بعد جب آپ ریٹائر ہو جائیں گے تو مجھے نئے لوگوں سے سابقہ پڑے گا۔ کیوں نہ ابھی سے نئے لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ وہ میری بات مان گئے۔ میں انٹرویو میں بھی کامیاب ہوا اور گزیٹیر ڈپارٹمنٹ جوائن کر لیا۔ پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے آخری دنوں کا میری ذاتی زندگی سے متعلق اہم واقعہ میری ایک نقلی شادی بھی تھی۔ میں ایک کنوئیں میں گر گیا تھا۔ لیکن بعض کنوئیں ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں اگر کوئی جاندار گر جاتا ہے تو وہ ابل کر اسے باہر پھینک دیتے ہیں۔ اور وہ کنواں بھی ایسا ہی تھا۔

میں نے گزیٹیر ڈپارٹمنٹ ۱۹۵۸ء میں جوائن کیا۔ گزیٹیر کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات کے مضامین نہایت محنت سے لکھا کرتا تھا اور اسی محنت کے نتیجے میں مجھے اعلاترین آئی سی ایس اور آئی اے ایس افسروں سے ہر قسم کی مدد ملتی رہی۔ اور آئندہ ایسی ہی مدد سے مجھے یونیورسٹی پہونچنے کا موقع ملا، جس کا ذکر آئندہ سطور میں کروں گا۔

اکتوبر ۱۹۵۹ء میں میری زندگی کے دو اہم واقعات پیش آئے۔ ایک میری شادی اور دوسرا کھیل کود کے میدان سے علمی دنیا

میں دلچسپی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۵۵ء میں میری ایک شادی ہوئی تھی جسے صرف Fake Marriage کہا جا سکتا ہے۔ ایک شام کو جب میں حسب معمول اپنے کلب میں ٹیبل ٹینس کھیل رہا تھا، میرے بھائی لطیف صدیقی آئے اور کہا کہ ماموں (چچا منظور الحق) نے مجھے فوراً بلایا ہے۔ دیکھا کہ عتیق بھائی (اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس) آئے ہوئے ہیں۔ دونوں نے مجھے حکم دیا کہ فوراً شیروانی پہن کر چلو۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بارہ بنکی کے ایک قصبے میں میرا نکاح ہونا ہے اور وہاں ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اس نازک صورت حال میں انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ گھنٹہ بھر کے موٹر کے سفر کے بعد اس قصبہ میں پہنچ کر میرا نکاح ہوگیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ جو صاحبزادی میری بیوی بنائی گئی تھیں آٹھویں درجے تک تعلیم یافتہ تھیں۔ رخصتی آئندہ پر چھوڑ دی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ رخصتی کے لیے یہ خواہش کی جا رہی ہے کہ میں اپنے گھر سے الگ ہو جاؤں اور جب وہ لوگ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو نکاح فسخ کرنے کی خواہش کی گئی اور پھر منظور چچا اور عتیق بھائی کے حکم کے مطابق میں بھی اس پر راضی ہوگیا۔ یہ واقعہ وقتی طور سے میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا لیکن خدا کی مصلحتیں کچھ اور ہی تھیں۔ جب جب خود اپنی غلطی سے اندھے کنوؤں میں گرا ہوں، ان کنوؤں نے مجھے خود اچھال دیا ہے اور ہمیشہ بہتر نتائج سامنے آئے ہیں۔ میری شادی کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔

مسولی کے واقعات کے بعد میں شادی سے متنفر ہوگیا تھا۔ چچا منظور الحق صاحب نے عم محترم حیات اللہ انصاری صاحب کو مجھے شادی کے لیے راضی کرنے اور لڑکی کا انتخاب کرنے کا مجاز کیا۔ حیات اللہ چچا کی بیوی بزم خواتین چلا رہی تھیں اور شہر بھر کی پڑھی لکھی لڑکیوں اور خواتین سے واقف تھیں۔ تقریباً ہر چوتھے پانچویں روز دو ایک لڑکیاں مجھے دکھائی جاتی تھیں جنھیں اپنے موڈ کے تحت میں رد کر دیتا تھا۔ ایک روز میں بلایا گیا اور ابھی تھوڑی ہی دیر حیات اللہ چچا سے گپ شپ کی تھی کہ تین صاحبزادیاں تشریف لائیں۔ بغیر کچھ بتلائے ہوئے حیات اللہ چچا کا حکم صادر ہوا کہ خوب اچھی طرح دیکھ کر ایک کا انتخاب

کرو۔ مجھے ان لڑکیوں کے چہرے پر شریف اقدار کے ساتھ ساتھ حسن بھی نظر آیا اور اپنے سابقہ فیصلے کی راہ پر میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ ان لڑکیوں کے جانے کے بعد چچی بیگم سلطانہ حیات نے بتایا کہ سب سے بڑی کا نام ماجرہ ہے اردو میں ایم۔اے ہیں اور تعلیم گاہ، انٹر کالج میں پڑھاتی ہیں۔ دوسری ان کی چھوٹی بہن ہیں عائشہ جو بی۔اے۔ بی، ایڈ ہیں اور تیسری ان کی بھانجی صفیہ ہیں جو اکنامکس میں ایم۔اے ہیں۔ صفیہ اور عائشہ ہم عمر ہیں اور ماجرہ ان سے چند سال بڑی ہیں۔ میری نظر انتخاب ماجرہ پر پڑی اور حیات اللہ چچا نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا اور ۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ہماری شادی ہوگئی۔ بعد کو پتہ چلا کہ ماجرہ چوتھے پانچویں درجے کے میرے کلاس فیلو اور ساتھ کے کھیلے ہوئے اخلاق احمد کی چھوٹی بہن ہیں۔ ماجرہ میری توقعات کے عین مطابق نکلیں۔ میرے دوست یوسف حسین مرحوم نے، جن کی بہن فاطمہ ماجرہ کے ساتھ پڑھاتی تھیں، مجھے بتایا کہ ماجرہ انتہائی خوش مزاج اور ہنس مکھ ہیں۔ ان کی بات لفظ لفظ صحیح ثابت ہوئی۔ میرے برخلاف انتہائی نفاست پسند ہیں۔ حسن سیرت کے علاوہ حسن صورت میں بھی ہزاروں میں انتخاب تھیں۔ آئندہ میرے ذوق سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا اور فارسی میں ایم۔اے کرنے کے بعد اردو میں پی۔ایچ۔ڈی بھی کر لیا۔ ان کی ایڈٹ کی ہوئی غزلیات مرزا محمد رفیع سودا کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور اسے اب تک شائع ہونے والے غزلیات سودا کے مجموعوں میں معتبر ترین سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ تعلیم گاہ نسواں سے بحیثیت پرنسپل ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئیں۔ شادی کے زمانے میں بھی میرے کھیل کود کے مشاغل جاری تھے۔ ایک رات جب میری بیوی اپنی والدہ کے پاس گئی ہوئی تھیں، دلہن نے کہا کہ "ولی صاحب! کب تک اپنا وقت فضولیات میں برباد کرتے رہیے گا۔ اب جب شادی کر ہی لی ہے تو آئندہ کی ذمہ داریوں کا بھی کچھ تو خیال کیجیے۔"

وہ دن میرے کھیل کا آخری دن تھا۔

چنانچہ پی ایچ ڈی کے چھوڑے ہوئے کام کو پھر سے شروع کیا۔

اور ولادت کی محنت کے بعد ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لی۔

درس و تدریس کا شوق ہمیشہ میری رگوں میں دوڑتا رہا ہے۔ لا تعداد پشتوں سے میرے آباؤ اجداد اسی میں منہمک رہے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی ملازمت اسی پیشے سے شروع کی اور جب حالات کے تحت اس سے الگ ہونا پڑا تب بھی شوقیہ طور سے یہ سلسلہ جاری رہا اور میرے گھر پر نہ جانے کتنے طلبا آجایا کرتے تھے۔

میرے پی ایچ ڈی کرنے کے کچھ مہینہ بعد عزیز گرامی مرزا محمد اطہر صاحب (موجودہ انچارج آرٹس سکشن شیعہ ڈگری کالج) جو اس وقت ایم اے کے طالب علم اور میرے ایک محترم دوست ملا طاہر صاحب کے صاحبزادے ہیں، میرے پاس تشریف لائے اور خواہش ظاہر کی کہ شہنشاہ حسین صاحب موسوی کے ریٹائر ہونے کے بعد کیونکہ شیعہ کالج میں کوئی فارسی پڑھانے والا نہیں ہے اس لیے میں اعزازی طور سے فارسی پڑھا دیا کروں۔ میں نے اسسٹنٹ ایڈیٹر گزیٹیر مسز جوشی سے مشورہ کیا انھوں نے اجازت دے دی۔ شیعہ کالج میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ میرے شام کے دو گھنٹے وہاں بی اے درجات کو فارسی پڑھانے میں صرف ہونے لگے۔ اس کالج کے میرے ساتھیوں میں ڈاکٹر محمد سعید صدر شعبۂ سیاسیات لکھنؤ یونیورسٹی اور سابق وزیر محترم جناب عمار رضوی صاحب جو انگریزی پڑھاتے تھے شامل ہیں۔ یہ ۶۴-۱۹۶۳ء کے سشن کا زمانہ ہے۔

نومبر ۱۹۶۴ء کی ایک شام کو جب میرے بیٹے سلیم انوار الحق کی ولادت کے بعد آپریشن میں خرابی ہونے کی وجہ سے میری بیوی ڈفرن اسپتال میں داخل تھیں۔ ڈاکٹر شریف الحسن مرحوم (سابق پرنسپل ممتاز ڈگری کالج)، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، جو احتشام صاحب کے الہ آباد چلے جانے کے بعد سینیئر ریڈر کی حیثیت سے صدر شعبۂ اردو و فارسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، کا خصوصی پیغام لے کر میرے پاس اسپتال آئے کہ ہاشمی صاحب فارسی میں ملنے والی لکچرر کی ایک نئی جگہ پر میرا تقرر کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ انھوں نے وائس چانسلر کی منظوری بھی حاصل کر لی ہے نیز یہ کہ مجھے دو دن کے اندر یونیورسٹی جوائن کر لینا چاہیے ورنہ جگہ کسی دوسرے امیدوار کو دے دی جائے گی۔ میں گزیٹیر ڈپارٹمنٹ میں ڈپوٹیشن پر تھا اور ایک دوسرے سرکاری محکمہ میں مستقل تھا لہٰذا یونیورسٹی جوائن کرنے کے لئے مجھے دو دن کے اندر دو محکموں سے Relleve ہونا تھا جو بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ دوسرے روز دفتر پہونچتے ہی میں نے مسز جوشی کو اس نئے تقرر سے آگاہ کیا۔ موصوفہ بہت خوش ہوئیں۔ اسی وقت ایک خط پی ڈبلو ڈی سکریٹری چشتی صاحب کو لکھا کہ وہ مجھے اپنے ڈپارٹمنٹ سے ریلیو کر کے واپس بھیج رہی ہیں اور وہ (چشتی صاحب آئی اے ایس) بھی مجھے اسی روز Relleve کر دیں، تاکہ میں یونیورسٹی جوائن کر لوں۔ ساتھ ہی ایک دوسرا خط وائس چانسلر ڈاکٹر داؤد صاحب کو بھیجا کہ وہ میرے آنے کا انتظار کریں۔ خصوصی چپراسی کے ذریعے یہ خطوط بھیجے گئے اور جس وقت گزیٹیر ڈپارٹمنٹ سے Relleve ہو کر میں چشتی صاحب کے پاس پہنچا تو وہاں کا غذات تیار تھے اور میں وہاں سے بھی ریلیو ہو کر دو بجے سے پہلے یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں چارج لے چکا تھا۔

یونیورسٹی میں تقرر سے مجھے کسی قسم کی مالی منفعت حاصل نہیں ہوئی بلکہ یونیورسٹی میں مجھے جو تنخواہ ملنا شروع ہوئی وہ میری گزیٹیر ڈپارٹمنٹ کی جگہ کی تنخواہ سے ڈیڑھ سو روپئے ماہانہ کم تھی۔

یونیورسٹی میں میری ملازمت کو چھ مہینے نہ ہوئے تھے کہ تعطیلات گرما میں یونیورسٹی بند ہو گئی۔ قاعدہ یہ تھا کہ اگر یونیورسٹی بند ہونے سے پہلے نوکری کے چھ مہینے پورے نہیں ہوتے تو تعطیلات گرما کی تنخواہ نہیں ملتی۔ میں نے مسز جوشی کو ان حالات سے ٹیلی فون پر آگاہ کیا۔ حکم ہوا کہ یونیورسٹی جس روز سے بند ہو اسی روز واپس چلے آؤ۔ چشتی صاحب کو بھی ہدایت کر دی گئی کہ ان کے ڈپارٹمنٹ میں واپسی کے بعد اسی روز مجھے پھر گزیٹیر بھیج دیا جائے۔ ویسا ہی ہوا اور میں یونیورسٹی بند ہونے کے روز ہی گزیٹیر پہونچ گیا۔ تعطیلات گرما میں وہاں کام کرتا رہا اور یونیورسٹی کھلنے کے بعد دونوں ڈپارٹمنٹوں سے ریلیو ہو کر میں پھر ۱۷؍ جولائی ۱۹۶۵ء کو یونیورسٹی پہونچ گیا اور ۱۹۶۷ء میں سلکشن کمیٹی کی منظوری کے بعد لکچرر کی جگہ پر مستقل ہو گیا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی زمانے میں میری تمام تر توجہ خود کو اپنے پیشے کا اہل بنانے اور ثابت کرنے کی طرف مرکوز تھی اور میرا سارا وقت لائبریری میں اور اس کے باہر مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ شعبہ میں میرے سبھی اساتذہ سے اچھے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ریڈر و صدر شعبہ تھے۔ ڈاکٹر عبدالاحد خان خلیل اردو میں پی ایچ ڈی تھے لیکن فارسی کے عارضی ریڈر بنا دیے گئے تھے اور سینیرٹی کے حساب سے رغیب حسین صاحب سینیر لکچرر تھے۔

اسی زمانے میں ڈپارٹمنٹ دو حصوں میں یعنی شعبۂ فارسی اور شعبۂ اردو میں تقسیم ہو گیا۔ رغیب صاحب شعبۂ فارسی میں ریڈر اینڈ ہیڈ ہو گئے، میں اور نیر مسعود صاحب لکچرر تھے۔

رغیب صاحب کے انتقال کے بعد میں بحیثیت سینیر لکچرر صدر شعبۂ فارسی ہو گیا۔ ریڈرشپ کے لیے میرے مقابلے پر الہ آباد سے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب سے درخواست دلوائی گئی اور علی گڑھ سے وارث کرمانی صاحب کو (جن سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے اور اب بھی ہیں) میرے مقابلے میں کھڑا کرایا گیا۔ سلکشن کمیٹی کے انعقاد سے ایک گھنٹہ قبل وہ میرے پاس تشریف لائے اور معذرت کے انداز میں فرمایا کہ وہ وطن کے قرب کی وجہ سے لکھنؤ آنا چاہتے ہیں۔ بہرحال اپنے دیرینہ تعلقات کی وجہ سے میں نے انھیں یقین دلایا کہ ان کے امیدوار بننے کا مجھ پر کچھ خراب اثر نہیں پڑا ہے اور یہ کہ نتیجہ کچھ بھی ہو میری طرف سے تعلقات میں تلخی نہیں آئے گی۔

انٹرویو کا وقت آ گیا تھا، میں نے کرمانی صاحب کو اپنے اسکوٹر پر بٹھایا اور ہم دونوں انٹرویو دینے یونیورسٹی پہونچ گئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد پتہ چلا کہ میں منتخب ہو گیا ہوں۔ یہ ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے اور اس کے بعد سے میں مستقل طور سے شعبہ کا سربراہ ہو گیا اور ۱۹۸۸ء تک اسی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں غالباً تنہا شخص ہوں جو پانچ حیثیتوں سے صدر شعبہ رہا یعنی بحیثیت لکچرر، بحیثیت عارضی ریڈر، بحیثیت مستقل ریڈر، بحیثیت پروفیسر اور بحیثیت ریٹائرڈ پروفیسر۔

میری ڈی لٹ کی تھیسس کا رپورٹوں کے تبادلے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب (جنھوں نے میری تھیسس پر بہت سے اعتراضات کیے تھے) کی رپورٹ دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بہت سے اعتراض بے بنیاد اور غلط ہیں۔ میں نے انھیں لکھا کہ میں ان کے اعتراضوں پر ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا جواب آیا:

"آپ جب چاہیں آ سکتے ہیں ... میں اپنی رائے نہیں بدلا کرتا۔"

قاضی صاحب کے بیشتر اعتراضوں کے جواب میں نے مع سندوں کے تیار کر لیے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات میں پورے دن میری بحث ہوتی رہی۔ میرے جوابوں نے انھیں مطمئن کر دیا تھا، لیکن کچھ غلطیاں انھوں نے ایسی بتائیں جن کی گرفت صرف انھیں کے پایہ کا عالم کر سکتا تھا۔ دوسرے روز بھی بحث کا سلسلہ جاری رہا اور تیسرے روز کی بحث کے دوران قاضی صاحب نے یکایک فرمایا:

"کاغذ لائیے رپورٹ لکھ دوں۔"

میں حیران تھا کہ قاضی صاحب نے کس طرح اپنی رائے بدل دی۔ دوسری رپورٹ رجسٹرار لکھنؤ یونیورسٹی کو بھیج دی گئی اور ریڈر کے انٹرویو سے تقریباً ایک مہینہ قبل مجھے ڈی لٹ کی ڈگری مل چکی تھی۔ قاضی صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے پاس صرف وہی مقالے بھیجے جاتے ہیں جنھیں رد کرانا مقصود ہوتا ہے۔ میرا پہلا اور آخری مقالہ تھا جسے ان کی منظوری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اور اسی دن سے میرے اور ان کے خصوصی دوستانہ تعلقات کی ابتدا ہوئی اور یہ تعلقات ان کی زندگی کے آخر تک برقرار رہنے کے بعد اب ان کے صاحبزادے قاضی مسعود صاحب سے بھی برقرار ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں وہ تنہا شخص ہوں جسے قاضی صاحب نے اس روز جب انھیں دستخط کرنا بھی تقریباً ناممکن ہو گیا تھا، اپنا آخری فوٹو مع اپنے آخری دستخط کے عنایت فرمایا۔

میرے دوسرے ممتحن ڈاکٹر غلام رضا ستودہ تھے، انھیں بھی میری تھیسس رد کرانے کے لیے ہی بھیجی گئی تھی لیکن اسی مقالہ کی بدولت میرے ان سے ایسے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے کہ آج بھی انھیں کے توسط سے میرا مقالہ تہران یونیورسٹی سے شائع ہونے کے لیے منظور ہو چکا ہے۔ میرے تیسرے ممتحن استاد حسین بحرالعلومی تھے، ۱۹۷۶ء میں جب میں پہلی بار ایران گیا تو وہ مجھ سے

باہر تھے اور جب دوبارہ گیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

۱۹۷۹ء میں جب میں مستقل ریڈر ہو چکا تھا تو پہلی مرتبہ مجھے بنیادِ فرہنگ ایران کی دعوت پر ایران جانے کا موقع ملا۔ اس چند ماہ کے سفر کے ایک ایک لمحہ سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کے دوران میں نے مشہد اور تہران کے تمام اہم کتب خانوں کو اچھی طرح کھنگال ڈالا اور کلیاتِ عرفی کی تدوین کے لیے بھی مجھے بہت کافی مواد ملا جس کی روشنی میں میں نے اپنے مرتبہ کلیاتِ عرفی پر مکمل طریقے سے نظرِ ثانی کی اور اب اس مقالے کا پہلا حصہ جو حصۂ نثر اور غزلیات پر مشتمل ہے، ستودہ صاحب کی مہربانی سے تہران یونیورسٹی سے اشاعت کے لیے منظوری حاصل کر چکا ہے۔

میرا ایران کا دوسرا سفر فردوسی پر سمینار میں شرکت کے سلسلے میں ہوا۔ یہ سفر چند روزہ تھا جس میں ایران جدید کا مطالعہ میں اس طرح نہیں کر سکا جیسا میں نے شاہ پہلوی کے دور میں اس کے عہد کے ایران کا کیا تھا۔ اس سفر میں میں نے تہران کو بہت کچھ بدلا ہوا پایا۔ ایک بڑی تبدیلی اس شہر میں یہ بھی تھی کہ ہوٹلوں میں بار کے بجائے ہر کمرے میں جانمازیں اور قرآن مجید کے نسخے ملے۔

۱۹۸۸ء میں ۳۰ جون کو میں ہمیشہ کے لئے یونیورسٹی سے علاحدہ ہوا۔ اور اسی روز سفرِ حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں میری شریکِ حیات اور دوسرے پانچ افرادِ خاندان ساتھ تھے۔ زیارتِ حرمین کے علاوہ جدّہ کو، جو دنیا کا روشن ترین شہر ہے، دیکھنے کا اور وہاں اپنے متعدد عزیزوں سے ملنے کا موقع ملا۔ مدینے شریف میں اپنے جد حضرت ابو ایوب انصاری کے مکان کی زیارت کی تمنا تھی لیکن ہمارے وہاں پہونچنے کے پہلے ہی مسجدِ نبوی کی توسیع کے سلسلے میں وہ منہدم کیا جا چکا تھا۔ مسجدِ نبوی سے متصل سعودی سرکاری کتاب خانے کے قریب ہی ایک ترک عالم کا کتب خانہ بھی دیکھا جس میں کچھ فارسی کے نوادر بھی تھے جن میں سب سے اہم نظم گزیدہ کا خطی نسخہ بھی تھا۔ میدانِ اُحد میں اس غار کی زیارت کا موقع ملا جہاں رسولِ پاک زخمی ہو کر استراحت فرما رہے تھے۔ بحیثیت مجموعی مشرقِ وسطیٰ اور اس کی سیاست کو سمجھنے میں یہ سفرِ مبارک کافی معاون ثابت ہوا۔

یونیورسٹی کے بائیس سالہ دور میں گیارہ سال میں پروفیسر اور تیرہ سال صدرِ شعبہ رہا اور اس دوران مجھے ہر وہ امتیاز حاصل ہوا جو ایک پروفیسر کو مل سکتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں مجھے سرکار کا سب سے بڑا اعزاز یعنی پریسیڈنٹ آف انڈیا کا سرٹیفکیٹ آف آنر ملا۔

یونیورسٹیوں اور پبلک سروس کمیشنوں کے علاوہ دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے بھی میرا قریبی تعلق رہا ہے چنانچہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ اتر پردیش اردو اکادمی کا برسوں ممبر رہا ہوں اور لکھنؤ کے مسلمانوں کے سب سے بڑے ادارے انجمن اصلاح المسلمین کا اس وقت بھی صدر ہوں۔ اس ادارے کے تحت ایک ڈگری کالج، ایک انٹر کالج اور ایک یتیم خانہ کے علاوہ دوسرے سماجی کاموں کے لیے بھی شعبہ جات قائم ہیں۔

میری زندگی اور فن پر ایم اے کے لیے دو تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ فارسی شاعری سے متعلق مقالہ جبار علی انصاری رضوان نے میرے ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل کیا جو "پروفیسر ولی الحق انصاری، شخصیت اور فن" کے عنوان سے ۱۹۹۰ء میں شائع بھی ہو گیا۔ دوسرا مقالہ جس کا تعلق میری اردو شاعری سے ہے، اندور یونیورسٹی میں عابدہ واجد نے پیش کیا۔ یہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

جہاں تک تصنیف و تالیف کا سوال ہے، پچاس سے زیادہ ریسرچ آرٹیکل لکھ چکا ہوں جس میں سے اکثر ہندوستان اور ایران کے اہم سمیناروں میں پڑھے بھی گئے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں زیادہ تر طویل ہیں اور بعض چھ چھ سات سات قسطوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین اردو، انگریزی اور فارسی تینوں زبانوں میں لکھے گئے ہیں، اور ان کا کتابی شکل میں شائع نہ ہونے کا ایک سبب یہی اختلافِ زبان بھی ہے۔

"عرفی شیرازی ۔ حیات اور شاعری" پر میں نے پی ایچ ڈی کی تھیسس انگریزی میں لکھی تھی جو یو جی سی کی مدد سے شائع ہوئی لیکن اس کی زیادہ کاپیاں پریس میں ضائع ہو گئیں اور خود میرے پاس بھی اب اس کی کوئی کاپی نہیں ہے۔ تھیسس کے علاوہ عرفی شیرازی پر میرے کچھ اردو مضامین "عرفی شیرازی" کے عنوان سے شائع

ہوتے تھے لیکن اس کتاب کی آخری کاپی بھی (جو کہ کتابت شدہ تھی) اب نہیں مل رہی ہے۔ ان تحقیقی مضامین کے علاوہ میرا اصل کام جو تحقیق کے ضمن میں آتا ہے اور جس پر میں نے زندگی کے بیس سے زیادہ سال خرچ کر دیئے، کلیاتِ عرفی کی تدوین ہے جس کے سلسلے میں ہندوستان، ایران، انگلینڈ کے علاوہ ترکی کے بھی تقریباً تمام اہم نسخے جن کا علم ہے، کام میں لائے گئے ہیں اور دوسرے ذرائع مثلاً بیاضیں، تذکرے، فرہنگیں وغیرہ میں جو کچھ عرفی کے نثر یا نظم کے ادب پارے مل سکے ہیں، ان کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ خان خاناں کے حکم سے ترتیب ہونے والا کلیاتِ عرفی چودہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا اور دوسرے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں کے برخلاف، (جن میں تقریباً آٹھ ہزار اشعار ملتے ہیں) میرے ترتیب دادہ نسخے میں یہ سب اشعار شامل ہیں۔ میرا ایک اور کام سفینۂ خوشگو کی ترتیب ہے لیکن یہ ابھی ادھورا پڑا ہوا ہے اسی طرح اردو میں دیوانِ رند اور دیوانِ پروانہ پر بھی کام غیر مکمل ہے میرا انتخاب کلیاتِ خواجہ آتش اردو اکادمی سے شائع ہوا۔ اسی طرح سودا کے غیر مطبوعہ کلام پر ایک اہم طویل مضمون بھی اتر پردیش اردو اکادمی کے رسالہ "اکادمی" میں شائع ہوا۔ اس سے قبل میں نے "شمالی ہند کے ادبی مراکز" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کے کچھ مضامین ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ اور سہ ماہی "فکر و نظر" علی گڑھ میں شائع ہوئے تھے۔ فارسی سے متعلق اردو میں لکھے جانے والے مضامین میں "شعر العجم اور ذکر عرفی شیرازی" ان مضامین میں تھا جسے قاضی عبدالودود صاحب نے بھی پسند کیا تھا (اگرچہ مرحوم دوست عزیزہ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اس کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو گئے تھے)

ریسرچ کو ابتدائی دور میں میں بہت اہمیت دیا کرتا تھا لیکن بعد کو اندازہ ہوا کہ تخلیق کا مرتبہ تحقیق سے کہیں اونچا ہے اس لیے کہ اگر تخلیق کار نہ ہوتے تو نہ تنقید کا وجود ہوتا اور نہ تحقیق کا۔ تخلیق کے میدان میں میں نے نظم کا انتخاب کیا۔ میں شاید پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ہی میں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ۱۹۴۲ء میں جب میں انٹرمیڈیٹ میں تھا تو پہلی مرتبہ میری ایک غزل ڈاکٹر احسن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے شیعہ کالج میگزین "محراب" میں چھپی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں والد مرحوم کے انتقال اور تقسیم ہند کے بعد کے مسائل نے دماغ کو اتنا پراگندہ کر دیا تھا کہ "کیسی غزل یہاں تو ہے مضمون ہی کچھ اور" کے مصداق شعر گوئی کی طرف توجہ برقرار رکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس زمانے میں مجسم پراگندہ روزی پراگندہ دل ہو رہا تھا اور اس کے بعد جب ذرا سنبھلنے کا موقع ملا تو اسپورٹس کا جنون اس طرح چھا گیا کہ پڑھنا لکھنا اور شعر گوئی سب چھوٹ گئے۔

میری شعر گوئی کا دوسرا دور ۱۹۶۰ء کے قریب شروع ہوا، جب کھیل کود کا جنون ختم ہونے کے بعد میں پھر علمی دنیا میں واپس آ گیا تھا۔ پہلے دور کی طرح اس مرتبہ بھی میری شاعری میرے چند مخصوص دوستوں تک محدود تھی۔ لیکن ۱۹۶۴ء کے ایک واقعہ کے بعد شعری نشستوں میں باقاعدہ شرکت ہونے لگی، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا ہوں۔ میرا اردو غزلوں کا حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہوا پہلا مجموعہ (مع کچھ فارسی اشعار کے اردو تراجم) کے "غزالانِ خیال" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ جو صرف اردو نظموں اور فارسی نظموں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے "فروغِ شعلۂ دل" کے عنوان سے ۱۹۸۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ تیسرا مجموعہ جو اردو غزلیات و قطعات اور فارسی غزلوں کے اردو غزلوں کی شکل کے تراجم پر مشتمل ہے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا، اور چوتھا مجموعہ "گلزار" جو نعتوں، منقبتوں اور قطعاتِ تاریخ پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۹ء میں ترتیب پا گیا تھا لیکن سالِ گزشتہ شائع ہو سکا۔ ایک اور مجموعہ جو اردو کی نئی اور پرانی غیر مطبوعہ غزلوں اور کچھ جدید فارسی شعراء کی جدید فارسی نظموں کے اردو تراجم اور عمر خیام کی کچھ زیادہ مستند رباعیات کے رباعی کی شکل میں ترجموں پر مشتمل ہے، ترتیب پا چکا ہے لیکن اس کے شائع ہونے کا اب تک انتظام نہ ہو سکا میری فارسی منظومات کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا "شعلۂ ادراک" جو فارسی غزلوں، قصیدوں اور نظموں پر مشتمل ہے ستمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا "خرمن گل" جس میں

تمامتر قطعات تاریخ اور چند غیر مطبوعہ غزلیں شامل ہیں جولائی ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ میری طنزیہ اردو نظمیں جنھیں کبھی بھی شائع کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا، میرے عزیز دوست اور لکھنؤ کی باغ و بہار شخصیت صباح الدین عمر صاحب مرحوم کے ہاتھ لگ گئی تھیں، جنھیں وہ باقاعدہ ترتیب دے کر مع اپنے پیش لفظ کے، میری مرضی کے خلاف شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے (مرحوم ایسا کر بھی چکے تھے اور میرے تمامتر احتجاج کے باوجود "خار زار ہجو" شائع کیا تھا)۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یادگار کے طور پر اور ان کی خواہش کے احترام میں محمود علی ظہور رضوی صاحب اسے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور مخلص دوست صباح الدین عمر صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں بھی اب اس کی مخالفت سے باز آگیا ہوں۔

ریٹائر ہونے کے بعد اپنے خاندان (جو ایک کمپوزٹ گروپ کی حیثیت رکھتا ہے) کے افراد کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے بیٹے محمد سلیم انوار الحق نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔اے کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔بی۔اے کی ڈگری فرسٹ ڈویژن میں حاصل کی اور آجکل اونیڈا ٹی۔وی میں سینیر سیلز آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ میری بیٹی ڈرِ ثمین نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ اور مینیجمنٹ اینڈ پروڈکٹی وِٹی سے ایم۔بی۔اے کیا۔ اس کی شادی عزیزم سید احمد شکیل ہاشمی کے ساتھ ہو چکی ہے۔

میں خود اپنے پر بیتے ہوئے واقعات سے اس کا قائل ہو چکا ہوں کہ انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک خدائی نظام کے تحت اس کی زندگی کا کاروبار چلتا رہتا ہے جس میں وہ اپنی کم فہمی کی وجہ سے کامیابیوں کو اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور ناکامیوں کو بدقسمتی پر محمول کرتا تھا۔ اس کا بھی قائل ہو چکا ہوں کہ انسان کی نیکیوں اور اعمال بد کا نتیجہ کچھ نہ کچھ حد تک اسی دنیا میں مل جاتا ہے ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد کر بھلا ہو بھلا کے اصول پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔ جہاں تک ممکن ہے کسی کی بھی دل آزاری سے اجتناب

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

گیت ساون کا

اک تو مہکی رت کی جوانی دوجے سہانی رات
سانوری غزل کہوں یا گیت

چھم چھم ناچے گگن سلونی ساون کی انگنائی میں
انگ انگ سے چوٹ اگائے آگ لگے پروائی میں
پور پور چنگاری چھیڑے یہ بیرن برسات
سانوری غزل کہوں یا گیت

ہری چنریا کھیت کی نکھری فصلوں کی رعنائی میں
ماضی کی تصویریں ابھریں دیواروں کی کائی میں
پاؤں میں چبھ چبھ جائے مہاور مہندی کس گئی ہات
سانوری غزل کہوں یا گیت

برکھا آنکھ مچولی کھیلے پینگوں پر امرائی میں
ڈوب گئی الغوزے کی لے کجری کی گہرائی میں
گوری کی دہلیز بھی تھرکے بوچھاروں کے ساتھ
سانوری غزل کہوں یا گیت

پنگھٹ پر چت چور کھو گیا چتون کی چترائی میں
بھری گگریا چھوچھی ہو گئی اک بے سُدھ انگڑائی میں
ٹونا مار گیا بیراگی جوگن کھا گئی مات
سانوری غزل کہوں یا گیت

بیکل یاد بنھر کی چھیڑے برہن کو تنہائی میں
ساگر ڈوب گیا پیالے میں پربت گم ہو رائی میں
مندر کا پیپل مانگے ہے بن دیوی سے پات
سانوری غزل کہوں یا گیت

بیکل اتساہی

سول لائن۔ بلرام پور
گونڈہ ۲۷۱۲۰۱

اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱ - نیا گاؤں (ایسٹ) لکھنؤ

اقبال اور اکبر

(۱)

ڈاکٹر اقبال اور اکبر الٰہ آبادی نہ صرف ہمعصر تھے بلکہ جدید اُردو شاعری کے معماروں میں قابلِ فخر ہستیاں تھیں، دونوں میں محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ اگرچہ سن میں اقبال اکبر سے بہت چھوٹے تھے لیکن اکبر ان کا احترام ہمیشہ کرتے تھے۔ اقبال کے دل میں بھی اکبر کے لیے محبت کا سرچشمہ موجزن تھا اور وہ انھیں اپنا پیر و مرشد کہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دونوں بزرگوں نے غالباً ابھی ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہ تھا۔ دونوں کا کلام مخزن لاہور، زمانہ کان پور اور اردوئے معلّٰی علی گڑھ وغیرہ میں شد و مد کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ دونوں میں خط و کتابت کا آغاز کب ہوا تھا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ ۱۹۱۱ء میں اکبر کو جب چوٹ لگی تھی اور اقبال کو اس کی خبر ہوئی تو انھیں صدمہ ہوا تھا۔ چنانچہ ۶ ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں اقبال انھیں لکھتے ہیں :-

"کل ظفر علی خاں صاحب سے سُنا تھا کہ جناب کو چوٹ لگی تھی اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ ملا دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے، تاکہ ہندستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔ میں تو آپ کو [illegible] سے کوئی مرید اپنے پیر [illegible] دل [illegible]

[illegible] آپ کے سامنے رکھ دوں۔

لاہور ایک بڑا شہر ہے، لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں ہے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔ مجھے یہ سُن کر مسرّت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں "غرّۂ شوال" پر چند اشعار لکھے تھے، زمیندار اخبار کے "عید نمبر" میں شائع ہوئے، ان کو ضرور ملاحظہ فرمایئے۔"[1]

اقبال کے خط کا جواب جو اکبر نے ۲۷ ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا، اس کے چند جملے یہ ہیں :

"..... آپ کی نظم میں نے پڑھی۔ ماشاءاللہ چشم بددور سیّد عابد حسین صاحب بی اے ایک نہایت ذہین اور وسیع الخیال موجود تھے۔ بعض اور بزرگوار بھی تھے۔ سب نے نہایت تعریف کی ..... خواجہ حسن نظامی صاحب تشریف فرما تھے۔ کل دہلی گئے۔ آپ کا ذکرِ خیر فرماتے تھے۔"[2]

اقبال نے اس خط کا تفصیلی جواب ۹ ر نومبر ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا، خط کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں درج ہے :

ترکوں کی فتح کا مژدۂ جاں فزا پہنچا، مسرّت ہوئی مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا... ... لاہور کی بستی میں کوئی ہمدم دیرینہ نہیں۔ نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں۔ قومی جلسوں سے بھی پہلو تہی کرتا [illegible] آپ کے خط جو میرے پاس [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ کی وفات کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔ خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے۔ کیا آپ (بادشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے) دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے؟" [illegible]

اکبر نے اقبال کے نام ایک خط ۳ر مارچ ۱۹۱۲ء کو لکھا تھا۔ خط میں اپنی پریشانیوں کا حال یعنی چوری کی واردات، ہاشم کی بیماری کا حال اور اپنی بیوی (ہاشم کی ماں) کی وفات کے بارے میں لکھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ:

"میں دیکھنے کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا۔ اب تو شکستہ حالی کیا، ہمیشہ دل کے لیے شکستہ حالی اچھی رہی ہے۔ آبِ رواں، آلی کا درخت، قمری کی آواز، جنگل کا سماں، مسجد کا صحن، جو بہت زیادہ دل کش ہے، نصیب نہیں ہوتا۔ ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزو مند ہوں ....

.... آپ میں تو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہوگی۔ لیکن آپ کو بھی بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی۔ حسن نظامی کی تحریر سے آپ کی مشغولیِ طاعت و قرآن خوانی کا ذکر دریافت کر کے خوش ہوا۔ اپریل میں ہی ہاشم کا امتحان ہے میں نہیں جانتا کس طرح آسکوں گا۔ گو قابلیت سفر بھی ہو۔ بہر کیف لاہور وغیرہ کے سفر کا ارادہ تو ہے۔ خدا پورا کرے"۔ [illegible]

ابھی تک اقبال اور اکبر کے درمیان ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اقبال چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اکبر سے ملاقات ہو جائے۔ انھوں نے اپریل ۱۹۱۲ء کے انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں شرکت کرنے کے لئے اکبر کو لکھا تھا۔ اس بارے میں اکبر ۲۹ر فروری ۱۹۱۲ء کے خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"حضرت اقبال کی مشغولی فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے۔ [illegible] اسلام کے جلسے میں وہ مجھے اصرار [illegible] [illegible] میری [illegible] [illegible] اسباب ہے [illegible]

شاید نجات پا جاؤں"۔ [illegible]

ظفر علی خاں ایڈیٹر روزنامہ زمیندار نے ۱۱ر اپریل ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں نظم "شمع و شاعر" پر تعریفی شذرہ لکھا اور اس کے چند بند شائع کیے۔ جب اکبر کی نظر سے یہ نظم گزری تو انھوں نے اس کی تعریف کی۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ۱۳ر اپریل کے خط میں ایڈیٹر کے نام کیا۔ یہ تاثرات ۱۹ر اپریل ۱۹۱۲ء کے "زمیندار" میں شائع ہوئے۔ اکبر کے یہ جملے قابلِ ذکر ہیں:

"ڈاکٹر اقبال کی نظم کے دو تین بند جو زمیندار میں چھپے ہیں، میں نے دیکھے۔ وہ نظم اس کی مستحق ہے کہ اسکی مدح کی جائے۔ یہ رباعی پیش کرتا ہوں ؎

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور ہر حرف ہے تجلیٔ حق کا ظہور
اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور"

اقبال اور اکبر کی پہلی ملاقات الہ آباد میں ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی۔ اس کا ذکر اکبر نے مرزا سلطان احمد کے نام ۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء کے خط میں یوں کیا ہے:

"ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی، صرف چند گھنٹوں کے لیے مجھ سے ملنے الہ آباد تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر اقبال صاحب بہ لحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں۔ آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے۔ وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم، فلاسفر، نیک دل بزرگ کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے"۔ [illegible]

اقبال کی دوسری ملاقات اکبر سے ۷ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو الہ آباد میں ہوئی۔ اس کا ذکر اکبر نے مرزا سلطان احمد کے نام ۹ر ستمبر اور عبدالماجد دریابادی کے خط میں ۱۷ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو اس طرح کیا:

"عید میں عشرت، اور خواجہ حسن نظامی صاحب میری تسلیِ خاطر کے لیے تشریف لائے تھے۔ پرسوں آپ کے دوست اور مداح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بسلسلۂ کان پور مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے .... دہلی گئے تھے۔ مرزا صاحب جو خود بھی اعلا پایہ کے فلاسفر، ممتاز دانشور اور ادیب ہیں

[illegible]

[illegible] اکبر کی تعریف کرتا نہیں تھکتا آیا۔ چنانچہ مرزا سلطان احمد صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر اقبال صاحب سے آپ کا ایڈریس دریافت کیا گیا تھا، ہنوز جواب نہیں آیا۔ لیکن پرچہ "اقبال" لدھیانہ میں آپ کا مضمون تحت عنوان "اقبال" نظر آیا۔ دل چاہا کہ اس کی مدح سرائی کروں۔ لیکن وہ خیال اس پیرائے میں ظاہر ہوا :

خوب ہے موعظت حضرت سلطان احمد
[illegible] انسان کو کہ خوب کہ سونا بہتر
غفلت دیکھے ہے جسم خانہ اکبر اچھا
[illegible] اقبال کا رونا بہتر

علم ہے ان کو اگر داد نہ دوں تا ہیں لیکن
اپنے تماح کا قدح نہ ہونا بہتر

چونکہ آپ نے اکبر اور اقبال کا ذکر اپنے مضمون میں کیا تھا اس بنا پر یہ اشعار موزوں ہو گئے ہیں۔ میں نے تو تبرکاً اقبال لو جیا کر لکھ دیئے ہیں۔"

اکبر ایک اور خط میں اقبال کی تعریف و توصیف میں مرزا صاحب کے نام رقم طراز ہیں :

"ڈاکٹر [illegible] اقبال میں کو سب سے آپ [illegible]
[illegible]

[illegible]

اچھا خیال رکھتا ہوں۔" ؎

غالباً یہ مرزا سلطان احمد مرحوم ہی تھے جنھوں نے اقبال کو سب سے پہلے غائبانہ طور پر اکبر سے متعارف کرایا تھا۔ مرزا صاحب نے ایک کتاب

کے نام حضرت کا تھا۔ ادھر ہی اقبال اسلام [illegible] کا [illegible] مقالات میں ان کے کلام کے ساتھ کیا ہے۔ [illegible] میں خط و کتابت بھی جاری تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ خطوط کہاں غائب ہو گئے۔ اقبال اور اکبر کے خطوط بہت ہی اہم و دلچسپ ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب نے مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیے۔ ان میں اقبال اور اکبر کا خاصا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی اب نایاب ہو چکی ہے۔ عرصہ ہوا کہ اس کا ایک نسخہ امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ میں میری نظر سے گزرا تھا۔ اب وہاں بھی وہ کتاب غائب کر دی گئی ہے۔ مرزا صاحب صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں :

"سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال یہ بھی ارادہ رکھتے ہیں کہ حضرت اکبر کے جو خطوط ان کے نام ہیں ان کا ایک انتخاب مع مقدمہ شائع کیا جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں گے تو وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے۔ جیسا کہ مکاتیب اکبر و خطوط اکبر [illegible] مجھ سے اس سے پہلے دہلی اور لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت اقبال مجاز ہیں کہ وہ اس ادبی مرحلے کو طے کریں اور اپنے نام کے خطوط چھاپ کر ملک و قوم کو مستفیض فرمائیں۔" ؎

خواجہ حسن نظامی اکبر اور اقبال کے [illegible] اخبار توحید میرٹھ کے ایڈیٹر [illegible] کی اشاعت میں [illegible]
[illegible]

[illegible]

اکبر [illegible] کے ساتھ [illegible]
اپنے خیالات کو لطیف پیرائے میں ادا کرتے تھے۔ اقبال فلسفی شاعر تھے۔ لیکن اکبر سے اتنا متاثر تھے کہ ان کی تقلید بھی کرنے لگے۔

تقلید کی یہ کوشش بہت زیادہ تھی۔ خواجہ صاحب اقبال کا وہ کلام جس
پسند کرتے تھے کہ انھوں نے اس کو "اکبری اقبال" سے تعبیر کیا۔ "اکبری اقبال"
کو خواجہ حسن نظامی نے [illegible] آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں ۱۹۱۴ء
میں شائع کیا۔ اکبری اقبال والی نظم کے علاوہ کتاب میں اقبال کی چند
ابتدائی نظمیں بھی ہیں۔ نظم کی ابتدا میں خواجہ صاحب کا پرلطف اور دلچسپ
دیباچہ بھی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبری اقبال
ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک
اکبری روش کو اپنایا ہے اور اکبر کی طرح کیوں کر تنگ قافیوں
کو کشادہ کیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں
بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آ گیا ہے۔"

خواجہ صاحب کے دیباچے کے بعد ص ۱ پر غالباً ناشر کی طرف سے
مرقوم ہے:

انجمن حمایت اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ جلسے
میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے لسان العصر سید اکبر حسین
صاحب پنشنر جج الٰہ آبادی کے رنگ میں بصدارت نواب
سر ذوالفقار علی خاں صاحب ذیل کی نظم پڑھی اور نظم
کا عنوان "[illegible]" رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بوجہ مصروفیت
انجمن کے لیے کوئی نظم تیار نہ کر سکے لیکن اراکین انجمن
کے اصرار پر صرف دو تین دن پہلے خیالات کو منظوم کرنا
شروع کیا۔

جلسے میں نظم پڑھنے سے قبل اقبال نے تمہید میں کہا تھا:
[illegible] کے لیے
[illegible]
[illegible] ہے اور اس میں ۱۲ شعر ہیں جبکہ اکبری اقبال
میں [illegible] شعر ہیں [illegible] ہے:

کبھی اے نوجوان مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟
(اکبر حیدری)

کے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر اور ان کے چٹکلوں کے ایک شعر
بھی ہوگا۔"

بعض اہل زبان نے اقبال کی اس اکبری تقلید کو ہدف نشانہ بنایا۔ غالباً
اکبر نے بھی اس تنقید کے بارے میں آگاہ کیا ہوگا۔ اکبر کے خط کے
جواب میں اقبال ۱۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو لکھتے ہیں:

"آپ کا نوازش نامہ ملا۔ جس کو پڑھ کر مسرت
ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں
اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی
مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے
جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی
میری ارادت اور عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور
ان شاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر
ساری دنیا متفق اللسان ہو کر کہے کہ اقبال ہیچ ہے
تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ شاعری سے میرا مقصد
بقول آپ کے حصول دولت و جاہ نہیں محض صداقت ہے
عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں علاوہ
کیا معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہتر طریق یہ ہے کہ
اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو
اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے
اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اسی خیال سے
چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے تھے۔ مگر [illegible]
بد مذاق نے ان کا مفہوم کچھ اور لیا اور میرے اس فعل
سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] میرے پاس [illegible] تھیں [illegible] ہے۔"

اقبال کا مزاحیہ کلام زیادہ تر زمانہ [illegible] میں "اکبر کے رنگ میں"
کے عنوان سے چھپتا تھا۔ اکبری اقبال کے علاوہ جنوری ۱۹۱۵ء کے

[illegible] ہوئے تھے ؎

[illegible] میں انگریزی — ڈھونڈی تو ہم نے عقلا کی راہ
[illegible] ہے مذاقِ سر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

بختِ مسلم کی شبِ تار سے ملتی ہے سحر
تیرگی میں ہے یہ شب دیدۂ آہو کی طرح
ہے اندھیرے میں فقط مولوی صاحب کی نمود
بن کے شمس العلما چمکے ہیں جگنو کی طرح

یہ اشعار بھی قابلِ ذکر ہیں ؎

بیٹھی محبوبِ حضرت کے ہاتھوں نصیبن — گئی عمر ساری میں اور شب بھر نہ آئی
نہیں بار صاحب کے ٹیبل پہ ان کو — پڑی کا روپ بسکٹ کا ہوا یہ خطائی

خدا کی زمیں تھی مزارع نے جوتی
کمائی مگر چودھری جی نے کھائی

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" لاہور نے ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء میں پہلا اقبال نمبر شائع کیا۔ اس میں سید فرید جعفری مچھلی شہری نے اکبر کے زیرِ اثر اقبال کا ظریفانہ کلام شامل کیا۔ صفحہ ۲۰۴ میں "آزادی کا انجن" کا کارٹون ہے۔ اس کے نیچے اکبر کے رنگ میں یہ شعر ہیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

ذیل کا قطعہ قابلِ توجہ ہے جو اکبر کی وفات کے بعد کہا گیا تھا ؎

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
دل گراں، ہمت سبک، وحشت فزوں، روزی تنگ
بے شک [illegible] کی بیاض میں
ہو گیا آخر [illegible] اسباب تنگ
[illegible] کا حکم تھا [illegible]

[illegible] ؎

کیا عجب پہلے [illegible]
کس طرح آیا [illegible] صاحب کا رنگ

ختم تھا مرحوم اکبر پہ [illegible] رنگِ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رک

قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کر دیا متروک دلی کے زباں دانوں نے ٹک

اودھ پنچ لکھنؤ کی ایک اشاعت جلد ۱۸ نمبر ۴۴ مطبوعہ ۱۹۲۲ء میں اعتراض کیا گیا کہ اقبال نے اکبر کے رنگ میں ظریفانہ شعر کہنے کے لیے پنچ کے مدرسے سے سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کیا، اس لیے اس نے اقبال کی تنقید میں اپنی طرف سے ایک نیا قطعہ شائع کیا۔ یہ قطعہ اقبال کے مقابلے میں زیادہ چست ہے۔ اس کی تمہید میں یہ دو شعر قابلِ ذکر ہیں ؎

طرزِ غالب کو بنایا پہلے جن صاحب نے مسخ
اب وہ رنگِ طبعِ اکبر پر بھی فرماتے ہیں ٹرک
رنگِ اکبر سے بھلا نسبت ہے کیا ان نظم کو
ہو گئے کیوں کہہ کے یہ سب کی نگاہوں میں سبک

تمہید کے بعد پنچ کا جو قطعہ ملتا ہے اس میں ذیل کا شعر دلچسپ ہے ؎

یوں تو فرماؤ کہ یہ روزی تنگ ہے کیا بلا
حضرت اکبر بھی کیا یوں ہی بتاتے تھے تنگ

یہ درست ہے کہ اقبال کا جو ظریفانہ کلام "اکبر کے رنگ میں" موجود ہے، اس میں وہ لطف، چاشنی، چبھن اور معنویت نہیں ہے جو اکبر کا طرۂ امتیاز تھا۔ بقول اکبر ؎

ہمارا شیخ جی کا کیا بھلا جوڑ
کجا کیوٹ کجا دیوانِ حافظ

اقبال اور اکبر میں بے تکلفی بھی تھی۔ آپس میں تحائف بھیجتے تھے۔ اقبال نے انھیں ایک مرتبہ کشمیری زعفران ارسال کی تھی۔ اکبر کو آم بہت پسند تھا۔ ایک مرتبہ اکبر سے آم کی فرمائش کی۔ اکبر نے آموں کا پارسل روانہ کیا۔ اقبال نے پارسل کی رسید [illegible] میں بھیجی ؎

جو سے فیض مسیحائی کا یہ سبب اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا

اگست ۱۹۱۵ء میں عید الفطر کے موقع پر کتب خانہ دار الاخبار اسلامی بدایوں میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں ایک مشاعرہ بھی شامل تھا۔ نظامی بدایونی نے اقبال اور اکبر کو بھی مشاعرے میں مدعو کیا تھا لیکن وہ شریک نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنی اپنی نظمیں روانہ کیں جو "اردو ادب کی چاشنی" کے عنوان سے اخبار "ذوالقرنین" بدایوں میں ۲۱ اگست ۱۹۱۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئیں۔ مشاعرے کی صدارت میر محفوظ علی نے کی تھی۔ اقبال کی نظم نظر ثانی کے بعد بانگ درا میں "عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں" کے عنوان سے موجود ہے۔ اکبر نے ایک بہت ہی پرانی نظم بھیجی جو ان کے کلیات اول میں موجود ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

خوش پھر رہی ہے خلق خدا صبح عید ہے
ہر سمت زیب و زینت دنیا کی دید ہے[12]

اکبر ڈاکٹر اقبال سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ "اقبال" کے عنوان سے ایک مختصر مگر معرکہ آرا نظم کہی تھی جو کلیات اکبر حصہ سوم میں موجود ہے ؎

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوق معرفت
یہ طریق راستی خودداری بے تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے، اہل دل تھے صاحب اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انھیں کا ہے یہ فیض تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبع عالی منزلت

نومبر ۱۹۱۴ء میں اقبال کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو اکبر نے نہایت [illegible]

[illegible]

رو کنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمت عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے
سال رحلت کا بیاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومہ ملت تھیں وہ نیکو صفات
"رحلت مخدومہ" سے پیدا ہے تاریخ وفات[13]

۱۳۳۳ ہجری

اکبر نے والدہ اقبال کی وفات پر ایک اور قطعہ تاریخ کہا جو مرحومہ کی لوح مزار پر کندہ ہے اور آج تک موجود ہے ؎

مادر مرحومہ اقبال رفت — سوئے جنت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبر با دل پر درد و غم — رحلت مخدومہ تاریخ وفات

۱۳۳۳ ہجری

زمانے کا یہ دستور ہے کہ وہ ایک حال پر قائم نہیں رہتا ہے، اس کے لیے تبدیلی لازم و ملزوم ہے۔ ایک وقت تھا کہ اکبر ڈاکٹر اقبال کو "آیۃ الٰہی" اور خواجہ حسن نظامی انھیں (اقبال کو) اکبر کا ترجمان تسلیم کرتے تھے اور بقول خواجہ صاحب اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبری اقبال ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبری روش کو نباہا ہے اور اکبر کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھئے ان حروف کے پردے سے کیا نکلنے والا ہے۔" (دیباچہ اکبری اقبال)

یہ خواجہ صاحب ہی تھے جنھوں نے اقبال کو "سر الوصال" کے لقب سے سرفراز کیا اور ان کی مثنوی کا نام اسرار خودی تجویز کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے ہی اپنے ہفتہ وار اخبار "توحید" میرٹھ کی یکم اگست ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں 'اسرار خودی' کی پہلی قسط اپنی تمہید کے ساتھ ۷۴ شعروں میں شائع کی تھی۔

جب دو سال بعد وسط ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو کچھ لوگوں نے اقبال کی مخالفت میں ایک محاذ قائم کیا۔ اقبال نے کتاب کو قوم کے ایک دردمند اور مسلمانوں کی عظیم خدمت [illegible]

[illegible]

سکے یہ شعر [illegible] ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

[illegible] در خانۂ صہبا گیرد
حاشش از زہر اجل ہمسایہ دار

[illegible] حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

خواجہ صاحب اقبال کی اسرار خودی کو لغو، سید سلیمان ندوی تنگ و پر خش، ملک محمد علی سگِ شیطان اور پیرزادہ مظفر احمد نے کفر سے تعبیر کیا۔ اکبر ابتدا میں ایک تماشائی کی طرح خاموش رہے انھوں نے اسرار خودی کو دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ بعد میں وہ بھی مخالفین میں شامل ہو گئے تھے۔ اکبر کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اقبال نے دیباچے میں مہاراجہ کرشن پرشاد کے ذکر خیر کے علاوہ حضرت امیر علیہ السلام کی بہت زیادہ تعریف کی اور مثنوی کا انتساب جو سر سید علی امام کے نام کیا وہ زیادہ پولیٹیکل ہے۔ فضلی نے اقبال کی رد میں مثنوی راز بے خودی تصنیف کی۔ اس میں خواجہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ ابتدا میں اکبر کا لہجہ بہت ہی نرم تھا۔ لیکن جوں جوں مخالفت کا زور بڑھتا گیا، اکبر نے بھی اپنی خاموشی توڑ دی۔ وہ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولوی عبدالماجد دریابادی کے نام لکھتے ہیں:

"مثنوی اسرار خودی مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت بڑا اثر ہوا صحیح نہیں۔ خودی کو بڑھانا چاہیے۔ مثنوی کی نسبت زیادہ کہنا نہ چاہیے کیونکہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے۔ شعر نہایت اچھے ہیں ؎

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

یہ خودی مستی و تصوف ہے۔ دیباچے میں پولیٹکل دانش مندی بھی ہے۔"

مرزا سلطان احمد جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ڈاکٹر اقبال کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ انھوں نے خواجہ صاحب اور ڈاکٹر اقبال

[illegible] خواجہ صاحب کی بہت سی باتیں [illegible]

اقبال کی مثنوی کی مخالفت پر قلم نہ اٹھائیں۔ غرض کہ ہم رندان بے سامان کے ساقی بنے رہے۔ [illegible] بر تیغ بکف آ مکن۔ ہم کو ان سے محبت ہے۔ "آنچہ بخود پسندی بدیگراں مپسند" پر عمل کرتا ہوں۔ میں نے شاید اقبال صاحب کو اپنا یہ شعر لکھا تھا ؎

واعظا! ایں نہ جنون است نہ کافر شدہ ام
اولت ناشدہ نخست و من آخر شدہ ام"

اس کے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب، صوفی صاحب، حافظ شیرازی صاحب کی حمایت میں لکھتے ہیں ؎

زیادہ دیکھتے ہیں نبض دیکھتے ہیں
وہ ڈاکٹر ہیں زمانے کی نبض دیکھتے ہیں

وفا کا رنگ بدل جاتا ہے یہ ان سے بعید
فقط موافق موسم لکھی ہے اک تمہید

عمل کا رنج نہیں قوت [illegible] ہے
کیا ہے فلسفہ جو تحریر بس غرض یہ ہے

جہاں میں قوت بازو دکھایئے اس وقت
مراقبے سے ذرا سر اٹھایئے اس وقت

اشعار ان پہ ہرگز تم اعتراض کا ہاتھ
یہی کہوں گا بہت خوب ہم ہیں آپ کے ساتھ

دکھایئے تو خدارا خودی کے جوہر کو
مراقبے سے اٹھائے خود اپنی گردن کو

شراب حضرت حافظ سے کچھ نہیں نقصاں
زمانہ [illegible] کا ہے یہ فقط سامان

بس ایک پیچ ہے کافی برائے مستی و حال
بقیہ سال ہے نذر طریق سعی و جدال

وہ خود ہی کہہ گئے ہیں یہ بیاں فکر معاش
ستمگرانے خود [illegible] پادشاہی باش

ابھی تک اکبر نے اقبال کی کوئی شعوری مخالفت نہیں کی تھی اور خواجہ صاحب کے بار بار اصرار کے باوجود اکبر شدت سے خاموش رہے۔ ان کی محبت میں اقبال کے تئیں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۶ء کو مرزا صاحب کے نام لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب بلا شبہ نہایت عالی خیال بزرگ ہیں اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی ہے۔ خدا مدد کرے ڈاکٹر صاحب کی [illegible]

خواجہ صاحب اکبر ہونہار لاڑلے سمجھ کر وہ بھی اقبال کی مثنوی کے خلاف کچھ لکھیں لیکن وہ خاموش رہے۔ اور اقبال بھی اپنے موقف پر قائم رہے۔ اکبر خواجہ صاحب کو ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"حضرت اقبال کے خطوط آئے۔ میں نے جواب بھی لکھے۔" ۱۸

اس کے بعد اکبر خواجہ صاحب کو یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں :

"میں بھی مضمون لکھوں گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ زوال اقبال سے مجھ کو بہت ہی ملال ہوا ہے۔ اس باب میں پھر لکھوں گا۔ میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں صرف کریں۔" ۱۹

۱۸ر جنوری ۱۹۱۶ء کو پھر خواجہ صاحب کے نام لکھتے ہیں :

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و یاس کا ہوگا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدت وجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ حضرت اقبال رہی خودی کو بڑھا کر "ہمہ ستم" کہہ دیں تو مطلب حاصل ہے ؎

حضرت اقبال اور خواجہ حسن پہلوانی ان میں ان میں بانکپن
جب نہیں ہے نور خواہی کیلئے آؤ گتکہ ہائیں خدا ہی کے لئے
عذر شوں میں کچھ تکلف ہی سہی اقبال کو تصوف ہی سکھائیے

۱۶ر فروری ۱۹۱۶ء کو پھر خواجہ صاحب کو اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں ،

"اقبال صاحب کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لیے بھیانک ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور صبر عطا کرے۔" ۲۰

اکبر کی ایک رباعی بھی اچھے دنوں کی یادگار ہے ؎

اقبال کے ساتھ اے خرد تو بھی گئی
حضرت کے ساتھ خود ہی تو بھی گئی
سچ کہتے ہیں حضرت کرامت اکبر
رخصت ہوئی فارسی تو اردو بھی گئی

ان باتوں کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے ہفت روزہ خطیب دہلی میں اقبال کے خلاف کئی مضامین لکھے۔ ان کے جواب میں اقبال نے بھی پنجاب کے مشہور اخبار "وکیل" امرتسر میں کئی مضامین شائع کیے۔ یہ سبھی مضامین ہم نے وکیل امرتسر سے نقل کر لیے ہیں۔ جب خواجہ صاحب اقبال کی تحریروں سے متاثر نہ ہو سکے تو اقبال نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس صورت حال سے خواجہ صاحب نے اکبر کو مطلع کیا۔ اس پر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور خواجہ صاحب کے نام ۱۶ر اکتوبر کو لکھا :

"میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ میں نے ان کا خط دیکھ کر آپ کو مخاطب کر کے چند شعر لکھے ؎

اے خواجہ کردہ اقبال کو رد قومی رکنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی
تم محو ہو ہر حسن کی تجلی میں اگر ہیں دشمن فتنہ رقیبان وہ بھی
پریوں کے لیے جنوں ہے تم کو اگر
دیووں کے لیے سلیمان وہ بھی

غرض کہ اقبال اور ان کے مخالفین کے درمیان اسرار خودی کا جھگڑا کئی سال تک جاری رہا۔ جب اقبال نے دیکھا کہ مخالفت کا سیلاب تھمنے نہیں پاتا تو انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ خود الہ آباد جا کر اکبر سے ملیں۔ اس کی اطلاع اکبر ۹ر مارچ ۱۹۱۸ء کے خط میں خواجہ صاحب کو دیتے ہیں۔

"تین سال پہلے اقبال میرے مہمان ہوئے تھے کل ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے۔ ۱۶ر یا ۱۷ر مارچ کو الہ آباد آجائیں گے۔" ۲۲

اس خط کے بعد اکبر نے خواجہ صاحب کو مطلع کیا کہ :

اقبالی گورنمنٹ نے شکایت حافظ کو واپس لیا۔
(اقبال کی اسرار خودی کی طرف اشارہ ہے)" ۲۳

ایک جگہ اور اکبر نے اقبال کی مثنوی پر اپنے رنج کا اظہار یوں کیا ہے :

"ڈاکٹر اقبال نے تصوف اور حضرت حافظ شیرازی پر جو اعتراضات کیے ہیں ان سے مجھے رنج ہوا اور یہ شعر نکل گئے ؎

مولوی پوری ہی چکے تھے ضد کا یہ ان سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام

[illegible] کے خلاف

[illegible] اپنے [illegible]

اقبال کی [illegible] عرفانِ حقیقت میں معرفت کی شراب تھی ۔

[illegible] معلوم ہوتی ہے ۔

بنیاد ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی

دہکی سے ہو رہی ہے صفائی دماغ کی [۲۳]

اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد ہی پروفیسر نکلسن نے اقبال سے اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی ۔ جب نکلسن کا ترجمہ چھپ کر آیا تو اس وقت بھی اقبال کی مخالفت کچھ کم نہ تھی ۔ اکبر کو جب معلوم ہوا تو ان سے [illegible] نہیں رہا گیا ۔ لکھ فرمایا ۔

" اقبال کی مثنوی کا یورپ میں ترجمہ ہوا اور اس کی بہت داد رہ گئی ۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ فارسی زبان ایشیائی فلسفہ اور عرفان اور اس کے یورپین قدردان ۔ اس پر اقبال صاحب شاداں و فرحاں ۔ اگر اہلِ ایران جو اہلِ زبان ہیں داد دیتے تو ایک امتیاز کی بات بھی تھی ۔ میں اس یورپین ترجمہ اور داد کو ہرگز قابلِ افتخار نہیں سمجھتا ۔ میں نے اسی پر کہا ہے ۔

رفیق سر ٹیفکٹ دیں تو عشق کو تسلیم

یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ [۲۴]

سید سلیمان ندوی نے اقبال کی مخالفت کے لیے خواجہ صاحب پر اعتراض کیا ۔ یہ بات اکبر کو گوارا نہ ہوئی ۔ انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کے خط میں سید صاحب کو لکھا ۔

" حسن نظامی صاحب کو آپ نے ٹوکا تھا ۔ کچھ معلوم ہے کہ حضرت اقبال کدھر جاتے ہیں ۔"

اس سے ایک دن پہلے ۲۷ مئی کو اکبر نے علامہ ندوی صاحب کو لکھا تھا کہ :

" آپ نے فلاں صوفی کی نظم کو عجب زندگی بخشی ۔ اقبال صاحب اس سے خوش نہ ہوئے ۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کس حق سے وہ بنتے ہیں ۔ میں تو صوفی نہیں بنتا ۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ میں پرسنل خدا کا ماننا ہوں جس کے معنی ہوئے شخصی ۔ یہ لفظ مغربی مصنفوں نے اختیار کیا ہے ۔ بمقابلہ فلاسفہ کے خدا کے جس وجود [illegible] سے الگ نہیں ہے ۔ اقبال صاحب کا مطلب یہ ہے کہ چند فلاسفی الگ خدا کو نہیں مانتے اور صوفی بھی ہمہ اوست کہتے ہیں لیکن میں پرسنل خدا کو نہیں مانتا ہوں ۔ اقبال صاحب نیک نیتی سے اعتقادات کا پہلا اختیار کرتے ہیں ۔ پروفیسر بھی تو ہیں ۔" [۲۵]

(باقی آئندہ)

حواشی :-

۱ ۔ اقبال نامہ جلد دوم صفحہ ۳۳ ۔ ۴۹ مرتبہ شیخ عطاء اللہ لاہور

۲ ۔ اقبال نامہ ص ۵۵ مرتبہ ، چراغ حسن حسرت ۔

۳ ۔ اقبال نامہ جلد دوم صفحہ ۳۰ ۔ ۴۹ (شاہد اکبر آبادی نے رسالہ تحفۂ دہلی بابت ستمبر ۱۹۱۲ء ص ۲۸ میں اکبر کی ایک نظم " جلسۂ دربار دہلی " ۳۶ شعر میں اپنی تمہید کے ساتھ شائع کی ۔ کلیاتِ اکبر میں نظم میں صرف ۲۳ شعر درج ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جشن تاجپوشی منعقدہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کی تقریبات میں اکبر بھی دہلی گئے تھے اور وہاں دو دن قیام کیا ۔ غالباً یہاں ان کی ملاقات اقبال سے ہوئی ہوگی ۔ اکبر کے ذیل کے دو شعر قابل ذکر ہیں ۔

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار	حکمِ حاکم سے جو تھا اجتماعِ انتشار
پیش رو شاہی تھے پھر بڑھ کر اس کے اہلِ جاہ	بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار

یہ اشعار کلیات میں موجود نہیں ہیں ۔ تفصیلات کے لیے راقم کا مضمون " اکبر الہ آبادی : بعض نئے گوشے " مطبوعہ سہ ماہی اردو کراچی بابت اپریل تا جون ۱۹۹۰ء ص ۵۵ ملاحظہ ہو ۔

۴ ۔ اقبال نامہ مرتبہ چراغ حسن حسرت ص ۵۳ ، ۵ ۔ خطوطِ اکبر بنام حسن نظامی ص ۹ [illegible] ۶ ۔ مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد ص ۳۹ ، ۷ ۔ خطوط شاہیر ص ۳۶ ، مکتوباتِ اکبر ص ۱۲۹ ۸ ۔ مکتوباتِ اکبر ص ۹۵ ، ۹ ۔ ایضاً ، ۱۰ ۔ ایضاً ص ۹۷ ، ۱۱ ۔ اقبال نامہ جلد ۲ ص ۳۴ ۱۲ ۔ نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات ص ۴۱ ، ڈاکٹر شمس بدایونی ۱۳ ۔ کلیاتِ اکبر حصہ سوم صفحہ ۵۳ ، ۱۴ ۔ بزم اکبر کراچی ص ۱۲۹ ، ۱۵ ۔ اکبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی ص ۲۲۴ ، ۱۶ ۔ مکتوباتِ اکبر بنام سلطان احمد ص ۱ ، ۱۷ ۔ ایضاً ۱۸ ۔ خطوطِ اکبر بنام حسن نظامی ص ۲۱ ، ۱۹ ۔ ایضاً ص ۲۲ ، ۲۰ ۔ ایضاً ص ۱۲۵ ، ۲۱ ۔ ایضاً ص ۵۹ ، ۲۲ ۔ ایضاً ص ۱۱۱ ، ۲۳ ۔ ایضاً ص ۱۱۱ ، ۲۴ ۔ بزم اکبر ص ۵۵ مرتبہ [illegible]

تلاش

تری تلاش!
تری جستجو! سبھی کو ہے
ازل سے "جذبۂ موسیٰ" ہی کارفرما ہے
ہر ایک دَور ہر اک عہد میں تسلسل سے
بدل بدل کے نئے رُوپ
تیری وحدت میں
کثیر شوق زیارت کے ساتھ غلطاں ہے۔
اسی کے ساتھ مگر "کوہ طور" شاہد ہے
تجھے نہ دیکھ سکا ہے کوئی نہ دیکھے گا !!

یہ اور بات کہ تو کائنات میں ہر سُو
ہر ایک شے میں نہاں ہے!
ہر ایک شے سے عیاں ہے!
چمن چمن میں بہاروں کی کارفرمائی
گلوں گلوں پہ ترے حُسنِ لازوال کا عکس
یہ نرم نرم سے سبزوں پہ نقرئی شبنم
ترے کرم کی
نمایاں شہادتیں ہیں سبھی !!

یہ کوہسار، یہ دریا، یہ آبشار تمام
تری جلالت و رحمت کی بات کرتے ہیں!!
یہ چاند اور یہ سورج، یہ حُسن کا ہکشاں
ترے جمال کے ہیں بے مثال آئینے !!!

یہ دشت اور بگولے
یہ تشنگی و سراب
زمیں کو گھیرے ہوئے ہر طرف سے بحر تمام
ترے غضب کی
ترے قہر کی علامت ہیں !!

میں اک حقیر سا ذرہ ہوں
ایک شاعر ہوں
تری تلاش، تری جستجو میں رہتا ہوں
کبھی میں اپنے ہی اندر تجھے تلاش کروں
کبھی میں ڈھونڈوں تجھے کائنات میں ہر سُو
درونِ ذات کے جلوے
یہ کائنات کا حُسن
یہ کاروبارِ حیات
ترے وجود کی روشن شہادتیں ہیں۔
مگر!
تجھے سمجھنے کی خاطر نظر ضروری ہے
نظر کے ساتھ بصیرت بہت ضروری ہے !!!

اسد زیدی سکندرپوری
۵/۴۹۴ سیکٹر-۵، وکاس نگر
کرسی روڈ، لکھنؤ

غلام رضوی گردش
حسنی پورہ، مئو ناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱

اخترالایمان

کہاں بجنور کا چھپر کہاں بینڈ اسٹینڈ بلڈنگ کی پانچویں منزل

اختر دو سے بنتو ہلے!

مراد برآئی، پہلی بار قریب سے دیکھا۔ صوفے میں دھنسے ہوئے مضمحل اور اداس، چارخانے کی معمولی تہبند اور سفید کھدر کا کرتا، ایک پاؤں فرش پر ایک صوفے پر، پاس ہی بیٹھ کر ہمہ تن گوش ہوا تو صوفے پر رکھا ہوا پاؤں بھی فرش پر رکھ دیا۔

کبھی سکندر، کبھی قلندر، کبھی بگولہ، کبھی خیال۔

موزوں قد، گٹھا گسرتی بدن، خاکی گاڑھی رنگت — ضبط توازن اور سکوت کا پیکر — ہمکلام ہوئے تو آواز شکستہ، مجروح اور تھکی تھکی سی محسوس ہوئی —

لاکھ مری آواز سن رہے ہو تم؟

سیاہ بادلوں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، بڑی بڑی آنکھوں میں غیر معمولی چمک، سیاہ دیدوں کے بیچ سفیدی کے قطرے خاصے پھیلے ہوئے، جیسے آنکھوں میں بجلی کے دو بلب روشن ہوں۔

بعد ازاں بارہا شنا، دیکھا اور برتا اور ہمیشہ یہی تاثر لے کر اٹھا — شخصیت میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں:

میں بظاہر جو بہت سادہ ہوں بے جوش نظر آتا ہوں تمھیں!

ایسا دریا ہوں جہاں سطح کے نیچے چپ چاپ

موجیں شوریدہ ہیں طوفان اٹھا کرتے ہیں

ٹھہرا پانی ہوں مگر اس میں بھنور پڑتے ہیں۔

اسّی برس اُدھر کی بات ہے، کاتک کی ٹھٹھری ہوئی رات کا پہلا پہر تھا، جب تاروں کی چھاؤں میں قلعہ نجیب آباد کے پٹھانوں کے ایک چھپر میں پیدا ہوئے۔ بچپن بڑی عسرت اور تنگ دستی میں گزرا۔

وہ اک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا۔

والد گاؤں کی مسجد میں پیش امامی کرتے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنے مسکن بدلتے رہتے۔ باپ کی انگلی پکڑے خانہ بدوش کی طرح بستی بستی، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں بھٹکتے رہے۔ ننھے سے معصوم دل نے اس دربدری سے گہرے اثرات قبول کیے اور اس طرح شمالی ہند کے سرسبز و شاداب کھیتوں کا پیار، حسن اور دلکشی ان کی روح میں رچ بس گئی — گاؤں ان کے وجود کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا —

سرِ شام بیری کے پیڑوں میں چڑیوں کا چہکار

وہی تیتروں کی صدا، کال کلچی کی آواز، [illegible] کا نغمہ

ہرے ٹھنڈے شیشم کے پتوں سے چھنتی ہوئی ہوک سی فاختہ کی

گھنے کانس کے پھیلے جنگل میں اڑتی بیوں کی قطاریں

وہیں کیکروں میں نئے گھونسلوں کی جگہ ڈھونڈتیں

بٹیروں کے دل، چوکڑی بھرتی ہرنوں کی ڈاریں

کہاں ہے یہ منظر؟

یہاں تو مجھے ہر طرف کارخانے

دھوئیں کے بگولے نظر آ رہے ہیں!

والدہ توہم پرست تھیں اور ان کی باتوں نے جیتے جاگتے [illegible]

"رات کو خوشبو کا جھونکا آئے —

یہ پیرِ ختا کی سواری جاتی ہے!"

اور پھر —

"جب تو میرے پیٹ میں تھا، میں نے اک سپنا دیکھا تھا
گود میں اپنی سانپ لیے بیٹھی ہوں — تیری عمر بڑی لمبی
ہے"

گاؤں چھوٹا تو دلی کا یتیم خانہ موید الاسلام، پھر اینگلو عربک کالج، کچھ عرصہ "ایشیا" میرٹھ کی ادارت، وہیں ایم اے فارسی میں داخلہ لیکن چار پانچ مہینے بعد افتاں و خیزاں دلّی واپس۔ کچھ عرصہ سپلائی ڈپارٹمنٹ اور ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت، ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ میں نزول اور ایم۔ اے فارسی سالِ اوّل میں فرسٹ پوزیشن۔

"اب آپ اپنے مستقبل سے بے فکر ہو جائیے!" پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سمجھایا۔ لیکن یونیورسٹی کی بندھی ٹکی زندگی پسند نہیں تھی اور پھر اپنی ڈگر کی تلاش۔ میراجی، راشد اور فیض سے دلی میں چھن چکی تھی۔ سائل دہلوی، بیخود دہلوی اور شاہد احمد دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھتے رہے — دیوانگی میں فرزانگی کا پہلو، فلسفۂ حیات اور فلسفۂ شعر از سرِ نو مرتب ہو رہا تھا۔ جب کتابیں ساتھ چھوڑ دیتیں، کتابِ زندگی پڑھنے لگے۔

یہ میں نے مان لیا علم ہے بڑی دولت
اگر کفن نہ بنے یہ تو کیا برائی ہے

علی گڑھ میں رشید صاحب نے بہت دل جوئی کی۔ پہلے تو بیگم راس مسعود سے ان کی غیر معمولی ادبی اور شعری صلاحیتوں کی خوب تعریف کی اور پھر انھیں اکسایا کہ جا کر ملاقات کر لیں۔ رشید صاحب کے حکم کی تعمیل تو کر دی لیکن چلتے وقت بیگم نے راستہ پر جو پچاس روپے رکھ دیے تو وہ سوہانِ روح ثابت ہوئے —

تھا رہو سے دھرتی کے جیسے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھڑ کے اُٹھے جیسے چھا تو کر دے کنگال

علی گڑھ سے اُردو کانفرنس میں شرکت کے لیے حیدرآباد پہنچے ... ہوتا ہے بمبئی کچھ اس طرح آئے کہ ... اب بنیادی سوال روٹی کا تھا۔

کالے گو کو جسم اُلفت کے اور میں نان شبینہ جو
کبھی چمن زاروں میں اُلجھا اور کبھی گندم کی بو
نافۂ مشک تتاری بن کر لیے پھری مجھ کو ہر سو

دراصل موید الاسلام میں داخلہ کے وقت اور پھر وہاں سے نکلتے وقت بوتن کا بکس سر پر تھا، وہ ساری زندگی نہیں اترا۔ تقریباً ۹۰ سال تک اس بوجھ کو ڈھوتے رہے۔

اختر الایمان کی شخصیت کا تصور اس بکس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ساری زندگی نہ گاؤں سے پنڈ چھوٹا نہ اس بکس سے۔ یہی بکس ان کے ضمیر کا علامیہ بن کر نظموں میں مختلف روپ بدلتا ہے —

مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

روح کی گہرائیوں میں رچا بسا گاؤں جہاں انھیں زندگی کے بے پایاں حسن کا احساس دلاتا وہیں اس بکس نے زندگی کی بھاگ دوڑ میں ان کا توازن برقرار رکھا، اس وقت بھی جب بمبئی میں ہن برستا۔

"آپ شہر سے اتنی دور رہتے ہیں، میرے لیے کوئی زمین دیکھیے، خریدنا چاہتا ہوں، میں وہاں ایک کاٹیج بنانا چاہتا ہوں لیکن وہاں وہ سب کچھ ہو، وہ سب کچھ جو مجھے پسند ہے۔!" لنچ کے دوران انھوں نے کہا۔

پھر وہی گھٹن، وہی آبسیشن!

اور ان کی پسند بھی کیا تھی؟ — باغ، کھلیان، کوئلیں، پپیہے، جوہڑ، نیلوفر، کنول، جھیلیں، ندیاں، ہرنوں کی ڈاریں، درختوں کے جھنڈ، موسموں کی آون جاون، آنچلوں کی مہک، پازیبوں کی جھنکار اور چوڑیوں کی کھنک —

کوئی کہتی ہے مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکھاری مری ساس
کوئی کہتی ہے بھری چاندنی آتی نہیں راس

گو مدتیں بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے
ناز میں جیسے ہے کوئی بھری محفل میں
"میری خوش نصیبی ہے آج ملاقات کی سعادت نصیب ہوگی"

"آپ جیسے شاعروں نے ... آپ نے اردو نظم کو نئی جہت عطا کی ہے ایسے [illegible] ہے!"

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ شاعری مختلف ہے، یہ واحد عالم نظم کی شاعری ہے۔ شاعری میرے نزدیک کیا ہے اگر میں اس بات کو ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں تو 'مذہب' کا لفظ استعمال کروں گا!"

اس زمانے میں شکاگو، حیدرآباد اور کشمیر کی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی کام ہو رہا تھا۔

"یہاں ایک لڑکی مجھ پر کام کر رہی ہے لیکن اس کے بجائے اس کے والد مجھے خط لکھتے ہیں۔ خوش خط ضرور ہیں لیکن میں نے انھیں لکھا، خط لڑکی کو ہی لکھنے دیجیے کیونکہ وہی بہتر سمجھ سکتی ہے کہ اسے کیا چاہیے۔!"

"آپ نے اپنی شاعری سے متعلق بہت کچھ کہا، لیکن اس شاعری کا ایک اہم پہلو اس کا ڈرامائی عنصر ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔!"

'آب جو' کا پیش لفظ میں نے بعد میں پڑھا جس میں اس پہلو کی طرف بھی اشارہ ہے۔

لیکن شاید وہ چاہتے تھے کہ میں گفتگو جاری رکھوں۔

"شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ شکسپیر کی طرح اختر الایمان کی شاعری بول کر پڑھنے والی شاعری ہے۔ میں نے اس طرح بھی آپ کے کلام کو پڑھا ہے۔!"

"فاروقی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں!" فوراً ارشاد ہوا۔

پھر مجھے ہال سے اٹھا کر لکھنے پڑھنے کے کمرے میں لائے۔ ہال کی پشت پر یہاں کتابوں سے بھرے شیلف، داہنی طرف اس کی اونچائی کمرے کی چھت تک۔ جو کتاب جتنی قیمتی اور نایاب وہ اتنی ہی بلندی پر۔ زمین پر آمنے سامنے دو چھوٹے چھوٹے تخت، جن پر گدے اور شفاف چادریں۔ فرش پر سرخ قالین، چھوٹی سی میز پر اردو اور انگریزی کے رسائل، مختلف سائز کے لیٹر پیڈ، متفرق کاغذات اور کلائی کی گھڑی۔ میں نے سوچا آخر گھڑی میز پر کیوں رکھی ہے، کہیں یہ بند تو نہیں ہو گئی۔

جب گھڑی بند ہو گی تو کیا
درد بھی سو جائے گا؟
ہم سوادِ وطن سے کہیں دور ہوں
درد سے چور ہوں
یا سوادِ وطن ہی میں رنجور ہوں
جب گھڑی بند ہو گی تو کیا جینے والے یہ پل
چھاؤں پا کر کہیں سب ٹھہر جائیں گے
وقت سے پہلے مر جائیں گے؟

چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک تصویر جس میں پنڈت جواہر لال نہرو "یادیں" کی تخلیق کے لیے انھیں ساہتیہ اکادمی کا انعام دے رہے ہیں۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بالکونی میں آکر جھانکا۔ سامنے بینڈ اسٹینڈ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہا لوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

جانے کیسے بات کا رخ میر کی طرف مڑ گیا۔ "میر کو گدائے متکبر کہا گیا ہے، انا پرست کہا گیا ہے، میں نہیں مانتا۔ میر کی طبیعت میں بڑا انکسار تھا HUMILITY بہت اچھی چیز ہے ـ

یہ توہم کا کارخانہ ہے   یاں وہی ہے جو اعتبار کیا"

نظموں کی ساخت کی طرح، خیال کی رو نے دوسرا چولا اختیار کیا۔

"دنیا کی بنیاد صرف دو چیزوں پر ہے، خوف اور لالچ،" میں نے کہا بھی ہے، 'دوسرا سوال'، 'میں' اور 'تاریخِ رائیگاں' بھی ہے!"

دس دن بعد پھر خدمت میں حاضر ہوا تو سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ مطالعے کا کمرہ، ڈھلے ڈھلے سے اختر الایمان، سفید براق کھدر کا کرتا اور پاجامہ، سیاہ کمانی والا سفید چشمہ، [illegible] اور محتاط انداز۔ سیاہ دیدوں کے بیچ سفیدی کے [illegible] رہ گئے ہوں۔ لب چھوٹے ہو گئے لیکن روشنی تیز ہو گئی ہے۔

چند جھلملاتے والی روشنی!

"دو لاکھ، جی ہاں دو لاکھ!" کہہ کر مسلم پروڈیوسر یا ڈسٹری بیوٹر سے کہا، اور وہ کھسک لیا۔ فلم بساط الٹ چکی تھی۔

سیانے جو کہا بات بگاڑی ٹھیک پڑی سادہ سی سال

اب 'سروساماں' کے کاتب عابد صاحب کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلے سے ہی آلتی پالتی مارے کمرے میں براجمان تھے۔ میں نے ایک فلمی رسالہ اٹھا کر ورق گردانی شروع کی جس میں ان کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔

"رپورٹنگ صحیح ہوئی ہے؟" بعد میں دریافت کیا۔

"جی نہیں، ایجاد بندہ بھی ہے!" ایسا محسوس ہوا جیسے مسکرانے سے ڈرتے ہوں۔

عابد صاحب کا تکیہ کلام تھا "سمجھا" جس کی رٹ لگائے جاتے ان کے ٹلنے کے بعد آہستہ سے کہا،

"پرانے قسم کے آدمی ہیں، عربی فارسی پڑھے ہوئے — بھلے برے یہی سب لوگ اپنی دنیا ہیں۔"

ان دنوں بمبئی میں ایک بزرگ محقق نے خود اپنی شخصیت اور کارناموں پر کتاب لکھ کر فرضی نام سے شائع کرا دی، جس کے بڑے چرچے تھے۔

"دیکھا آپ نے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں انھیں جانتا ہوں، عرق عرق والے لوگ ہیں!"

ویسے فلموں سے تعلق بس کاروبار کی حد تک تھا — مہورت، پریمیئر، سلور جبلی فنکشن، سب سے الگ تھلگ۔ کہیں پھنس گئے تو اور بات — نہ فلمی ہستیوں کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا شوق، نہ آٹوگراف دینے کا، موقع دیکھا اور چپکے سے کھسک لیے! بس کسی طرح کھنچ کھنچا گئے۔ پھر اتنی کھینچی کہ ٹوٹ گئی!

فلمی مصروفیات کم ہوئیں تو شاعری پر نیا جوبن آیا۔ لکھنے پڑھنے کے کام میں ... ہری آئی "نظم کی تلاش" ہنوز جاری تھی ...

... [illegible] ... گھٹن یا گیہوں کی بالیں ہیں

جنھیں میں نے منتقل کر دیا گودام میں اپنے
اور اب ویلیو پر بیٹھا کف افسوس ملتا ہوں
لیئم نیک خو کی طرح سو پہلو بدلتا ہوں
متاعِ رائیگاں ہے حسن قد و پوشاک نورانی
بہت بے چین کرتی ہے مجھے میری تن آسانی

کھانے کے دوران نجی زندگی کے بارے میں دلچسپ انکشافات ہوئے:

"میرے گھر میں کوئی خادم یا خادمہ نہیں۔ بس یوں ہی چلتا ہے!"

"جب میرا دل یہاں گھبرا جاتا ہے، یورپ چلا جاتا ہوں، فرینک فرٹ!"

"لہو پکارے گا کی ریلیز کے سلسلے میں کچھ مسائل درپیش ہیں، ابھی کچھ شوٹنگ باقی ہے!"

"ادھر سات برس سے میرا کاروبار ٹھپ ہے۔ لیکن میرے پاس فلیٹ بہت ہیں، ستر فلیٹ، ادھر ان کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، جب مجھے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، ایک فلیٹ بیچ دیتا ہوں۔"

پہلی فلم ۱۹۴۴ء میں "غلامی" تھی۔ پھر ان گنت فلمیں، سلور جبلی فلمیں — اور پھر فلیٹ، کار، ہوائی جہاز، فائیو اسٹار ہوٹل، فرینک فرٹ، ٹورنٹو، یورپ، کینیڈا — لیکن سروسرٹن کا پرانا ٹوٹا پھوٹا بکس جوں کا توں سلامت!

اسٹریٹ فورڈ آن اوان سے گوپ تھیٹر لندن کی پارٹنرشپ کا راستہ بہت پر پیچ تھا۔ راہ میں اصطبل کی رکھوالی، تھیٹر کی دربانی اور چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے تھے۔ پھوس کے چھپر اور مویدالاسلام سے بینڈا سٹینڈ بلڈنگ تک پہنچنے میں بھی راہ میں خطرناک کھڈ تھے جنھیں کامیابی سے عبور کرنے کے لیے جاں فشانی، قوت ارادی اور شوکت کردار کی ضرورت تھی۔ اس صبر آزما اور جاں سوز سفر کی داستان "یادیں" ہے۔

لیکن جس زمانے میں مجھے قربت کی سعادت حاصل ہوئی، گوپ تھیٹر نذر آتش ہو چکا تھا اور وہ بجھتی ہوئی آگ کے کنارے بیٹھے ہاتھ سینک رہے تھے —

آشفتہ خاطری مری مٹی میں ہے ملی ۔۔۔ تم یونہی مجھ کو دیکھ کے آزردہ ہو گئے

[illegible] کے [illegible] روشن

[illegible] مستقل ہو گئے، کیوں کہ ڈاکٹر نے

اوپر چڑھنے پر پابندی لگا دی اور جیڈا اسٹینڈ بلڈنگ

کی لفٹ اکثر خراب رہتی تھی۔

تقریباً دس سال کے طویل وقفے کے بعد جون ۱۹۸۸ء میں

اس فلیٹ میں اختر صاحب سے مختصر ملاقاتیں فقیر کا سرمایۂ

حیات ہیں۔

ایک روز شام کو پہونچا تو موصوف پورٹیکو میں ہی مل گئے۔

چپ چاپ اکیلے کھڑے وہ بچوں کے کھیل سے محظوظ ہو رہے تھے،

جو گیند اچھال کر اسے پکڑنے کے لیے ایک دوسرے پر پلے پڑتے

تھے ——

بھیڑ سے بچوں کی چھوٹی سی گلی میں دیکھو
ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آ کے مجھے
میں نے جا پکڑا اسے دیکھی ہوئی صورت تھی
کس کا ہے؟ میں نے کسی سے پوچھا
یہ حبیبہ کا ہے، رمضانی قصائی بولا
بھولی صورت پہ ہنسی آ گئی اس کی مجھ کو
وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے
دیر تک ہنستے رہے!

اختر صاحب پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر فلیٹ میں لے آئے۔
اچھی پرانی ڈھیر ساری باتیں ہوئیں، نئی پرانی بہت سی نظمیں سنائیں
بھولی بسری یادوں کی ان گنت شمعیں ایک ساتھ روشن ہو گئیں!

ان دنوں موصوف نے ایک بہت بڑا سیاہ خونخوار کتا پال رکھا
تھا جسے انگریزی میں ہدایات دی جاتیں ——— SIT DOWN,
DONT MOVE , GET INSIDE وغیرہ

بڑے گیانی تھے۔ فقیری میں امیری کے اور امیری میں
فقیری کے مزے لوٹے۔

سوانگ رچائے اور گند کی اس آباد خرابے میں

"ان کو پہچانا؟" ایک نوجوان کی طرف اشارہ تھا۔

"دانش! [illegible]"

"یہ تو ان دنوں یورپ میں کیٹرنگ کورس کر رہے تھے!" میں نے
توضیح کی۔

"اب شادی کر رہے ہیں، لڑکی کرسچین ہے لیکن بہت اچھی
اردو جانتی ہے!"

دانش سلمہٗ، ایک چپ ہزار چپ!

اختر الایمان نے آفاقی شاعری کی ہے ——— ایک دنیا گیر
پر! انھوں نے علامتی شاعری کی اور نظموں کے کامیاب تجربے بھی
کیے۔ ان کی شناخت موضوع کے تنوع، لہجے کی لوچ، زبان کے
تخلیقی استعمال اور نظم کے مخصوص ٹریٹمنٹ سے ہوتی ہے

اس شاعری میں وہ ارتکاز ہے جو بڑی اور پہلودار شاعری کا
طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے یہاں محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ زندگی کے
تجربوں کا فن کارانہ اظہار ہے۔ یہاں خیالات تخیلی تجربے بن گئے ہیں اور
ہمیں ہر نظم میں ارتقائے خیال کا احساس ہوتا ہے، بایں ہمہ
اچھوتی اور نادر ترکیبوں سے ان کے کلام کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔
اور یہیں تشبیہوں، استعاروں اور لفظی تصویروں کی ایک حسین و
جمیل دنیا ہے۔ یہ تصویریں مرئی، سمعی، بصری اور حرکی ہیں ——

دھوپ میں تیزی نہیں
ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے
دست شفقت ہے بڑی عمر کی محبوبہ کا
اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے
جیسے میں نیند میں ہوں!

لیکن کبھی کبھی دنیا مکروہ بھی نظر آتی ہے ——

ہم نشانہ ہیں انھیں تیروں کا جن کے لیے
زندگی پانی ہے، ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے
اس حسینہ کا نہ اخلاق نہ کردار کوئی
برف ہے، برف ذرا دیر میں گل جاتی ہے

اختر الایمان کی شاعری کا [illegible] ان کے [illegible]
ان کے یہاں پیڑ، پھل، پودے اور چرند پرند [illegible] انسان سے [illegible]

بس یہ چند جھلکیاں تھیں جن سے ہم ایک فنکار کے ناواقف ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اختر الایمان اپنے فن کے موجد تھے اور خاتم بھی!

اور ابھی میں ان کے متعلق یہی سوچ رہا تھا کہ ۱۹۹۴ء شروع ہو گیا اور

ان کی بیماری کے بگڑنے کی خبریں موصول ہونے لگیں ———

"جو فلیٹس میرے پاس ایک زمانے میں تھے وہ میری

بیماری میں بک گئے۔ اب کوئی فلیٹ نہیں سوا اس کے جس میں

رہتا ہوں۔"

دکھ پیالے پر زلزلے کے جھٹکے ریکارڈ ہونے لگے ———

"ڈائیلیسس اب میرا مقسوم بن گئی ہے۔ ہفتہ میں دو بار،

چار چار گھنٹے کے لیے ہسپتال میں حاضری دیتا ہوں۔"

لاوے کا سمندر شانت ہو چلا تھا ———

"تم ضرور میرے حق میں دعا کرتے رہو۔ تھوڑا بہت کام

رہ گیا ہے وہ بھی پورا ہو جائے تو اچھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ایک انجکشن ہے جو

نیویارک میں ہی بنتا ہے۔ انجکشن مہنگا ہے۔ ایک پندرہ سو کا ہے۔ مجھے

ہفتہ میں دو کی ضرورت ہے۔ چھ ہزار روپے مہینہ ڈائیلیسس پر خرچ

ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اسی سال کے آدمی پر اتنا خرچ ٹھیک

نہیں، میں صرف ڈائیلیسس پر ہی اکتفا کرنا چاہتا تھا مگر لڑکیوں کو

معلوم ہوا تو مجھ سے آکر لڑنے لگیں۔ میں بوڑھا آدمی تو ہوں ہی۔ ہتھیار

ڈال دیے لڑکیوں کے سامنے!"

پھر خبر آئی، فن کا وہ محل جسے پینسٹھ سال سے اپنے سر پر

ڈھو رہے تھے ۱۰ مارچ ۱۹۹۶ء کی شام کو زمین پر گر پڑا۔

NOT WITH A BANG BUT A WHIMPER

آسمان پر سورج روپوش ہو گیا!

اقبال کی طرح دنیا کی محفلوں سے اکتا گئے تھے اور غالب کی طرح

ایسی جگہ چل کر رہنے کی تمنا پوری نہیں ہوئی "جہاں کوئی نہ ہو"۔

شہر سے دور نہ زمین خرید سکے، نہ کاٹیج بنا سکے۔

نہ پوپ کی طرح وہ سرزمین ہاتھ آئی جو ———

WHOSE TREES IN SUMMER YIELD HIM SHADE

IN WINTER FIRE.

نہ ییٹس کا وہ خواب پورا ہوا ———

MINE BE A COT BESIDE THE HILL

اور نہ ہی ایٹس کی طرح، ایک "کُل آف ایٹس فری" میں کیبن بنانے

کی آرزو پایۂ تکمیل تک پہونچی!

بس پلک جھپکی ——— اور باغ، کھلیان، کونپلیں، پپیہے، جوہڑ

نیلوفر، کنول، جھیلیں، ندیاں، ہرنوں کی ڈاریں، درختوں کے جھنڈ

سب پیچھے چھوٹ گئے!

آخرش اپنے آبسیشن کے ساتھ ہی رخصت ہوئے!

تماشا ختم ہو گیا۔ مغل اعظم، وقت، قانون، ہمراز، داغ

آدمی ——— سب ڈبوں میں بند ہو گئیں۔ ممکن ہے فلم آرکائیوز پہنچ

گئی ہوں!

اور اب ایک آواز مسلسل سرگوشیاں کرتی ہے ———

"نامہ و پیام رُک جائے تو تشویش ہوتی ہے! تمہارے خط

کا انتظار رہتا ہے، بمبئی آنے کا ارادہ کر رہے ہو، ضرور آؤ، باتیں

کریں گے!"

دل میں ہوک سی اٹھی ———

"اب کیا خاک باتیں کریں گے!"

□□

غزل

جمیل عثمانی

اُدھر وہ جاں کی بخشش کو اپنی روتا رہا
اِدھر میں تھا کہ میں صدیوں کا بوجھ ڈھوتا رہا

یہ اتفاق تھا، قسمت تمہارا میرے گا
یہ اتفاق مگر بار بار ہوتا رہا

تمہارے آنسو میری آنکھ سے ٹپکتے تھے
تمہارا درد تھا دامن مرا بھگوتا رہا

سمجھ سکا نہ تری تھپکیوں کو عیاری
میں سادہ لوح تری لوریوں پہ سوتا رہا

وہ تنگ ذہن نگہباں رہا سمندر کا
میں خشک ہونٹ زباں پھیر کے بھگوتا رہا

غزلیں

شعور پہ سنگ ہے منظروں میں منظر آتش
ہو گیا سارا سمندر کا سمندر آتش

دیکھتا آتش ہوں نظر آتش ہے زباں پہ آتش
کر دیا کس نے مرے شہر کا ہر گھر آتش

کس کی یادوں نے یہ تبدیل کیا ہے موسم
برف کی رُت میں دہکنے لگی اندر آتش

صبح تا شام دیا ہے مجھے سورج نے جمود
رات آئے گی تو بن جائے گا بستر آتش

کل سے برسات کا آغاز بھی ہو جائیگا
آج ان سوکھی ہواؤں کا نہ دم بھر آتش

مصلحت کی یہ ردائیں نہ اُڑھاؤ لوگو
سر سے پا تک ہے مری سوچ کا پیکر آتش

مجھ سے کہتا ہے مرا جلتا ہوا گاؤں رئیس
تیرے گھر کو بھی نہ کر جائے منور آتش

رئیس الدین رئیس
۱/۲۶۵ دہلی گیٹ، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

آبادیاں اتنی ہیں کہ رستا نہیں ملتا
لیکن کوئی اس بھیڑ میں اپنا نہیں ملتا

جائیں گے کدھر آئی ہیں گلشن میں بہاریں
اب خاک اڑاتا ہوا صحرا نہیں ملتا

ٹھوکر میں ہوں پانی کی تڑپتی ہوئی موجیں
پیاسا کوئی ایسا لبِ دریا نہیں ملتا

اس دورِ پُر آشوب میں رہبر کی تمنا
ڈھونڈیں بھی تو اب نقشِ کفِ پا نہیں ملتا

ہوتی ہیں تبسم میں بھی کچھ غم کی لکیریں
اس رمز کو سمجھے کوئی ایسا نہیں ملتا

مشکل ہے بہت اب تو میسّر ملاقات
دل میں بھی خیال آپ کا آیا نہیں ملتا

فاطمہ وصیہ جائسی
۳۷۔ سبا تورن گلی
شاہ گنج
لکھنؤ

سکون و ضبط کا سارا نشان چاٹ گیا
یہ زلزلہ تو ہزاروں مکان چاٹ گیا

نگل گئی یہ زمیں کیسے کیسے لوگوں کو
جو گرد بن کے اُٹھے آسمان چاٹ گیا

بہت حسین بہت قیمتی سہی لیکن
وہ ایک ہیرا تھا جس کو جوان چاٹ گیا

سکوتِ غم سے بھی اکثر سکون ملتا ہے
ہمارے زخم کو یہ مہربان چاٹ گیا

ہمارے خون میں ڈوبا رہا ترا خنجر
درندہ آج خود اپنی زبان چاٹ گیا

تمام عمر سوال و جواب میں گزری
مرا دماغ تو یہ امتحان چاٹ گیا

نہ مل سکا مجھے ناظم سراغ اپنوں کا
کتاب کھول کے ہر داستان چاٹ گیا

ڈاکٹر ناظم جعفری
حکیم محمد جعفر روڈ
دال منڈی
وارانسی
۲۲۱۰۰۱

ڈاکٹر شیوانند نوٹیال
۔۔ تلک مارگ ، پیر پور ہاؤس ، ڈالی باغ لکھنؤ

نینی تال

کمالیوں میں نینی تال ضلع کا مخصوص مقام ہے ۔ نینی تال کا شمار ملک کے اہم علاقوں میں کیا جاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں پہلے سات دلکش جھیلیں تھیں ۔ آج بھی نینی تال میں سب سے زیادہ جھیلیں ہیں اگر نینی تال جھیلوں کا شہر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا ۔

اس ضلع کی خاص دلکش " نینی تال" (جھیل) ہی ہے ۔ تین سمتوں سے گھنے درختوں کے سایے اور اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں واقع نینی تال سطح سمندر سے ۱۹۳۸ میٹر کی اونچائی پر واقع ہے ۔ اس جھیل کی لمبائی ۱۳۵۸ میٹر، چوڑائی ۴۵۸ میٹر اور گہرائی ۱۵ سے ۱۵۶ میٹر تک بتائی جاتی ہے ۔ اس جھیل کے پانی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہاڑوں اور درختوں کا عکس واضح طور پر دکھائی دیتا ہے ۔ آسمان پر چھائے بادلوں کا عکس اس تالاب میں اتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ مناظر قدرت کے عاشق اسے دیکھنے کے لئے سیکڑوں کیلو میٹر دور سے نینی تال آتے ہیں ۔ جھیل میں تیرتی ہوئی بطخوں کے جھنڈ، تھرکتی ہوئی موجوں پر اٹھلاتی ہوئی کشتیاں اور رنگین ہوٹلوں کے مناظر اور چاند تاروں بھری رات نینی تال کی جھیل کی خوبصورتی کو بڑھانے میں چار چاند لگا دیتے ہیں ۔ اس جھیل کے پانی کی بھی اپنی ایک خصوصیت ہے ۔ گرمیوں میں اس کا پانی ہرا، برسات میں مٹیلا اور سردیوں میں ہلکا نیلا ہو جاتا ہے ۔

نینی تال جھیل کے دونوں جانب سڑکیں ہیں ۔ یہاں شام ہوتے ہی میدانی علاقوں سے آئے ہوئے سیاح جمع ہو جاتے ہیں ۔ نت نئے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں شام ڈھلتے ہی جب نینی تال شہر بجلی کی روشنی سے جگمگانے لگتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا شہر اس جھیل میں ڈوب سا گیا ہے ۔

نینی تال سیاحوں اور پہاڑوں پر چڑھنے کے شائقین کا پسندیدہ شہر ہے ۔ جسے دیکھنے ہر سال ہزاروں لوگ یہاں آتے ہیں ۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف نینی تال کی 'نینی دیوی' کے درشن کرنے اور اس دیوی کا آشیر واد حاصل کرنے کی خواہش لے کر آتے ہیں ۔ یہ دیوی کوئی اور نہ ہو کر خود "شیو پتنی" سندا (پاروتی) ہیں ۔ یہ تالاب انھیں کی یاد کا مظہر ہے ۔ اس سے متعلق ایک قدیم روائت مشہور ہے ۔

<u>نینا دیوی کا نینی تال</u> :- اس روایت کے مطابق دکش پرجاپتی کی بیٹی اوما کی شادی شیو سے ہوئی تھی ۔ شیو کو دکش پرجاپتی پسند نہیں کرتے تھے، لیکن وہ دیوتاؤں کے اصرار کو ٹال بھی نہیں سکتے تھے ۔ اسلئے انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی بادل ناخواستہ شیو کے ساتھ کر دی ۔ ایک بار دکش پرجاپتی نے سبھی دیوتاؤں کو اپنے یہاں یگیہ پر مدعو کیا ۔ لیکن اپنے داماد شیو اور بیٹی اوما کو مدعو نہیں کیا ۔ اس کے باوجود اوما اس یگیہ میں پہنچ گئی ۔ اپنے والد کے اس یگیہ میں جب اس نے سبھی دیوی دیوتاؤں کی توقیر نیز اپنی اور اپنے شوہر کی توہین ہوتے دیکھی تو بے حد رنجیدہ ہوگئی ۔ یگیہ کے ہون کنڈ میں یہ کہتے ہوئے وہ کود پڑی کہ " میں اگلے جنم میں بھی شیو کو ہی اپنا شوہر بناؤں گی ۔ آپ نے میرے اور میرے شوہر کی جو اہانت کی ہے اس کے نتیجہ کے طور پر یگیہ کے ہون کنڈ میں خود کو جلا کر میں آپ کے یگیہ کو ناکامیاب کرتی ہوں " ۔ جب شیو کو یہ معلوم ہوا کہ اوما ستی ہوگئی ہے، تو ان کے غصہ کی انتہا نہ رہی ۔ انھوں نے دکش پرجاپتی کے یگیہ کو تہس نہس کر ڈالا ۔ سبھی دیوی دیوتا شیو کے اس غصہ کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں شیو قیامت نہ برپا کر دیں ۔ لہٰذا دیوی دیوتاؤں نے مہادیو شیو سے گذارش کی اور ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا ۔ دکش پرجاپتی نے بھی معافی مانگی ۔ شیو نے ان کو آشیرواد دیا ۔ لیکن ستی کے جلے ہوئے جسم کو دیکھ کر ان میں دنیا سے بیزاری پیدا ہوگئی ۔ انھوں نے ستی کے جلے

ہونے جسم کو کندھے پر ڈال کر آسمان کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ ایسی صورت میں جہاں جہاں ستی کے جسم کے عضو گرے، وہاں وہاں مندر قائم ہو گئے۔ جہاں پر ستی کی آنکھیں گری تھیں، وہاں نینا دیوی کے روپ میں او ما یعنی پاروتی یا نندا دیوی کا عظیم الشان مندر بن گیا۔ آج کا نینی تال وہی مقام ہے جہاں پر اس دیوی کی آنکھیں گری تھیں۔ آنکھوں سے جاری آنسوؤں کی دھار نے یہاں پر جھیل کی شکل اختیار کر لی۔ اسی وقت سے یہاں پر شیو پتنی نندا (پاروتی) کی پوجا نینا دی کی شکل میں ہوتی ہے۔

گڑھوال کمایوں کی خاص دیوی نندا ہی ہے۔ اس پہاڑی علاقہ میں نندا کی پوجا جس انداز میں کی جاتی ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ نینی تال جھیل کی بناوٹ دیکھیں تو وہ آنکھ کی شکل کی جھیل ہے اس کی مذہبی اہمیت کی وجہ سے ہی اس جھیل کو فوقیت حاصل ہے۔ نندا دیوی کی پوجا یہاں پر اسی عہد سے ہوتی آرہی ہے۔

تری رشی سرودر : نینی تال سے متعلق ایک اور روایت بھی ہے۔ اسکند پُران کے 'مانس کھنڈ' میں ایک کتھا اس طرح کہی جاتی ہے کہ اتری، پلستیہ اور پلہہ نام کے رشی گرگاچل کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ میں انھیں یہ مقام ملا۔ اس مقام کی دلکشی پر وہ فریفتہ ہو گئے لیکن پانی کے نہ ہونے سے ان کا وہاں مقیم ہونا اور عبادت کرنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے تینوں رشیوں نے اپنے اپنے ترشول سے مان سرودر کو یاد کر کے زمین کو کھودا۔ ان کی اس کوشش سے تینوں مقامات پر چشمہ پھوٹ پڑا اور جھیل بن گئی۔ اسی لئے کچھ لوگ اس جھیل کو رشی سرودر کے نام سے پکارے جانے کو بہتر سمجھتے ہیں۔

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان تینوں رشیوں نے تین مقامات پر علیحدہ علیحدہ جھیلیں بنائی تھیں۔ نینی تال، کھرپا تال اور چامنی کا مالوا تال ہی وہ تین جھیلیں تھیں جنھیں تر رشی ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔

نینی تال کی کہانی خواہ کچھ بھی ہو اس علاقہ کے لوگ ہمیشہ یہاں نینا دیوی کی پوجا کے لئے آتے رہتے تھے۔ کمایوں کے تاریخی واقعات ایسی شکل اختیار کرتے رہے کہ سیکڑوں کیا ہزاروں برسوں تک اس جھیل کا علم باہر کے لوگوں کو نہ ہو سکا۔ اس دوران یہ علاقہ گھنے جنگل کی شکل میں پھلتا پھولتا رہا۔ لوگوں کا ذہن جھیل کی خوبصورتی پر نہ جا کر سیاسی سرگرمیوں میں الجھا رہا۔

۱۷۹۰ء سے ۱۸۱۵ء تک کا زمانہ گڑھوال اور کمایوں کے لئے بے حد تکلیف دہ رہا ہے۔ اس وقت اس علاقہ میں گورکھوں کی حکومت تھی۔ گورکھوں نے گڑھوالی اور کمایونی لوگوں پر بے حد مظالم ڈھائے۔ اسی زمانے میں برطانوی سامراج مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۸۱۵ء میں برطانوی فوج نے بریلی اور پیلی بھیت کی طرف سے گورکھا فوج پر حملہ کر دیا۔ گورکھا فوج کی شکست ہو گئی۔ اور اس علاقہ میں برطانوی حکومت قائم ہو گئی۔ ۲۷ اپریل ۱۸۱۵ء کو الموڑہ (لال منڈی قلعہ) پر برطانوی پرچم لہرا دیا گیا۔

انگریز پہاڑوں کے عاشق تھے۔ پہاڑوں کی سرد آب و ہوا ان کے لئے موزوں تھی۔ اس لئے انھوں نے گڑھوال کمایوں کے پہاڑی علاقوں میں خوبصورت شہر بسانے شروع کئے۔ الموڑہ، رانی کھیت، مسوری اور لینس ڈاؤن وغیرہ انگریزوں کے ہی ایما پر بسائے گئے۔

جدید نینی تال کی تلاش :

۱۸۳۹ء کی بات ہے ایک انگریز جس کا نام پی بیرن تھا۔ وہ شاہجہاں پور میں شکر کی تجارت کرتا تھا۔ اسے پہاڑی علاقہ میں سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ کیدار ناتھ اور بدری ناتھ کا سفر کرنے کے بعد یہ حوصلہ مند نوجوان انگریز کمایوں کی مخفی دھرتی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ایک بار کھیرنا نام کے مقام پر یہ انگریز نوجوان اپنے دوست کیپٹن دہیلر کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ مناظر قدرت کو دیکھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اس نے ایک مقامی شخص سے جب 'شیر کا ڈانڈا' علاقہ کی معلومات حاصل کی تو اسے بتایا گیا کہ سامنے جو پہاڑ ہے اسی کو شیر کا ڈانڈا کہتے ہیں اور وہیں پہاڑ کی پشت پر ایک خوبصورت جھیل بھی ہے۔ بیرن نے اس شخص سے جھیل تک پہنچانے کی گزارش کی، لیکن گھنے جنگلوں اور جنگلی جانوروں کے خوف سے وہ شخص تیار نہ ہوا۔ لیکن بیرن پیچھے ہٹنے والا شخص نہیں تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگوں کی مدد سے اس نے شیر کا ڈانڈا (۲۳۶۰) کو پار کر کے نینی تال کی جھیل تک پہونچنے کی کوشش کی۔ اس علاقہ میں پہونچ کر اور یہاں کی خوبصورتی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اسی دن یہ طے کر لیا کہ وہ اب شاہجہانپور کی گرمی کو خیرباد کہہ کر نینی تال کے اس علاقے کو ہی آباد کرے گا۔

پی بیرن "پلگرم" کے نام سے اپنی سیاحتی یادداشتیں مختلف اخباروں

میں بھیجتا رہتا تھا۔ بدری ناتھ، کیدار ناتھ کے بارے میں بھی اس نے بڑے دلکش پیرائے میں لکھا تھا۔ ۲۴ نومبر ۱۸۴۱ء کو کلکتہ کے "انگلش مین" نامی اخبار میں سب سے پہلے نینی تال کی جھیل کے بارے میں تفصیلی خبر شائع ہوئی تھی۔ بعد میں آگرہ اخبار میں بھی اس مقام کے بارے میں پوری تفصیل شائع ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں پہلی بار اس مقام کے بارے میں تفصیلات کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ پی بیرن نینی تال کے اس علاقہ کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے سارے علاقے کو خریدنے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے اس علاقہ کے ٹھوکدار سے گفتگو کی کہ وہ اس پورے علاقہ کو اس کے ہاتھوں فروخت کردے۔

پہلے تو ٹھوکدار نور سنگھ رضامند ہوگیا تھا لیکن بعد میں اس نے اس علاقہ کو فروخت کرنے سے انکار کردیا۔ بیرن اس علاقہ سے اتنا متاثر تھا کہ وہ ہر قیمت پر نینی تال کے اس پورے علاقے کو اپنے قبضے میں کرکے ایک خوبصورت شہر بسانے کا منصوبہ بنا چکا تھا جب ٹھوکدار نور سنگھ نے اس علاقے کو فروخت کرنے سے انکار کردیا تو ایک روز بیرن نور سنگھ کو اپنی کشتی میں بٹھا کر نینی تال جھیل کی سیر کرانے کی غرض سے لے گیا اور جھیل کے بیچ میں لے جاکر اس نے نور سنگھ سے کہا کہ تم اس علاقہ کو فروخت کرنے کے لیے جتنی رقم چاہو، لے لو لیکن اگر تم نے اس علاقہ کو فروخت کرنے سے انکار کیا تو میں تم کو اسی جھیل میں ڈبو دوں گا۔ بقول بیرن ڈوبنے کے خوف سے نور سنگھ نے اسٹامپ پیپر پر دستخط کردیئے اور بعد میں بیرن کے تصورات کا شہر نینی تال آباد ہوگیا۔ ۱۸۴۲ء میں سب سے پہلے مجسٹریٹ بیٹل سے بیرن نے کہا کہ انھیں کسی ٹھیکہ دار سے ملوادیں تاکہ وہ اسی برس ۱۲ بنگلے نینی تال میں تعمیر کراسکے۔ ۱۸۴۲ء میں بیرن نے سب سے پہلے پلگرم نام کے کاٹیج کی تعمیر کرائی تھی۔ پہلا پلگرم کاٹیج بیرن کا ہی اس نینی تال کے کنارے تعمیر ہوا تھا۔ بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس پورے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۸۴۲ء کے بعد نینی تال ایک ایسا شہر بن گیا جو نہ صرف پورے ملک میں بلکہ غیر ممالک میں بھی اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہوا۔

اترپردیش کے گورنر کا موسم گرما میں قیام نینی تال میں ہی ہوا کرتا تھا۔ چھ ماہ کے لیے اترپردیش کا سکریٹریٹ نینی تال منتقل ہوجاتا تھا۔ آزادی کے آٹھ دس برس بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

نینی تال میں کئی ایسے مقامات ہیں جہاں جاکر سیاح اپنے آپ کو ہی بھول جاتے ہیں یہاں سب لوگ موسم گرما میں ہی نہیں بلکہ سال بھر آتے رہتے ہیں۔ موسم سرما میں برف کے گرنے کے مناظر دیکھنے کے لیے ہزاروں سیاح یہاں پہونچتے رہتے ہیں۔ نینی تال میں قیام کے لیے مناسب انتظامات ہیں۔ یہاں بڑے سے بڑے عالیشان ہوٹل کے ساتھ ساتھ اترپردیش سرکار کا نینی تال کلب بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنا رہتا ہے۔ نینی تال میں آج جدید سہولیات کی کسی طرح کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے سیاح یہاں آنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ نینی تال میں اپریل سے جون اور ستمبر سے دسمبر تک دو سیزن ہوتے ہیں۔ اپریل سے جون تک کے سیزن میں زیادہ رونق رہتی ہے۔ پورے ملک سے سرمایہ دار، تاجر، صنعت کار، راجہ مہاراجہ اور سیاح یہاں آتے ہیں۔ اس سیزن میں نینی تال کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل بھی بھرے رہتے ہیں۔ اس موسم میں ٹینس، پولو، ہاکی، نٹ بال گولف، مچھلی کا شکار اور کشتی رانی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ان کھیلوں کے شوقین ملک کے مختلف شہروں سے یہاں آتے ہیں۔ پکنک کے لیے بھی لوگوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اسی موسم میں مختلف قسم کے ثقافتی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ مسٹر اور مس نینی تال کا انتخاب بھی اسی موسم میں کیا جاتا ہے۔ ستمبر سے دسمبر تک کا موسم بھی بڑا خوبصورت اور دلآویز رہتا ہے۔ ان دنوں آسمان صاف رہتا ہے۔ اکثر ہوٹلوں کا کرایہ بھی اس موسم میں کم ہوجاتا ہے۔ مناظر فطرت کے بیشتر عاشق اسی موسم میں نینی تال آتے ہیں۔ جنوری اور فروری کے مہینوں میں نینی تال میں برفباری ہوتی ہے۔

نینی تال شہر کی سیر کرنے کے بعد سیاح نینا پیک دیکھنا نہیں بھولتے۔ آج کل نینی تال کی کشش میں روپ وے کی سواری نے بھی اضافہ کردیا ہے صبح و شام اور دن میں بھی سیاح نینی تال کی جھیل میں جہاں بوٹ (ناؤ) کی سواری کرتے ہیں، وہیں اکثر گھڑسواری کا بھی مزہ لیتے ہیں۔ غرضکہ یہاں ہمیشہ چہل پہل بنی رہتی ہے۔ نینی تال کی زینت میں یہاں کی سات چوٹیاں خاص طور پر اضافہ کرتی ہیں۔

<u>چینا پیک (نینا پیک)</u> : سات چوٹیوں میں چینا پیک یا نینا پیک ۲،۶۰۰ میٹر کی اونچائی والی چوٹی ہے۔ نینی تال سے تقریباً ساڑھے پانچ کیلومیٹر کی دوری پر یہ چوٹی واقع ہے۔ اس چوٹی سے ہمالیہ کی اونچی اونچی چوٹیوں کے دیدار ہوتے ہیں۔ یہاں سے نینی تال کے مناظر بھی بڑے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ اس چوٹی پر لکڑی کا ایک کیبن ہے جس میں چاد کرسے اور

ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔

کلوری : ۲،۵۲۸ میٹر کی اونچائی پر دوسری چوٹی ہے جسے کلوری کہتے ہیں۔ یہ پکنک منانے کا بہت خوبصورت مقام ہے۔ یہاں پر محکمۂ جنگلات کا ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔

لینڈ یا کوٹا : ۲،۴۸۱ میٹر کی اونچائی پر یہ چوٹی واقع ہے۔ جو نینی تال سے تقریباً ساڑھے پانچ کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ یہاں سے نینی تال کے مناظر بڑے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

دیو پاٹا اور کیملس بیک : یہ دونوں چوٹیاں ساتھ ساتھ ہیں۔ جن کی اونچائی بالترتیب ۲۴۳۵ و ۲،۳۳۳ میٹر ہیں یہاں سے بھی نینی تال اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے مناظر بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔

ڈیروتھی سیٹ : دراصل یہ ایار پاٹا پہاڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک انگریز نے اپنی بیوی ڈیروتھی کی یاد میں جو ہوائی جہاز کا سفر کرتے ہوئے فوت ہو گئی تھی اس چوٹی پر ایک قبر بنائی، اسی قبر کے نام سے اس چوٹی کا نام ڈیروتھی سیٹ پڑ گیا۔ نینی تال سے چار کیلومیٹر دوری پر ۲،۲۹۰ میٹر کی اونچائی پر یہ چوٹی واقع ہے۔

اسنو ویو اور ھنی بنی : نینی تال سے صرف ڈھائی کیلومیٹر اور ۲،۲۷۰ میٹر کی اونچائی پر شیر کا ڈانڈا پہاڑ پر یہ چوٹی واقع ہے۔ یہاں سے ہمالیہ کا خوبصورت منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ہم رشتہ دوسری چوٹی ہنی بنی ہے جس کی اونچائی ۲،۱۷۹ میٹر ہے۔ یہاں سے بھی ہمالیہ کے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

ھنومان گڑھی : نینی تال میں ہنومان گڑھی سیاحوں اور مذہب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خاص توجہ کا مرکز ہے۔ یہاں سے پہاڑ کی کئی چوٹیوں کے اور میدانی علاقوں کے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ہنومان گڑھی کے قریب ہی سیاروں کے مطالعہ کے لیے حکومت اتر پردیش کا ایک اہم ادارہ بھی ہے۔

نینی تال کی خوبصورتی بے مثال ہے۔ پی بیرن نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس نے پہاڑی علاقوں کے ۱،۵۰۰ میل پیدل سفر میں نینی تال سے بڑھ کر خوبصورت مقام اور کہیں نہیں دیکھا۔ حقیقت میں نینی تال ایک فردوس ارضی ہے۔ یہ شہر آج ہندوستان کا بہترین پہاڑی شہر ہے۔ سیاحوں اور سیر سپاٹے کے شوقین لوگوں کی آماجگاہ ہے۔

□□

آپ بیتی ۔۔۔۔۔۔ صفحہ ۱۰ کا بقیہ

کرتا ہوں اور دوسروں کو (خواہ وہ میرے دشمن ہی کیوں نہ ہوں) نقصان پہنچانا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ حقوق الٰہی کی ادائیگی کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن حقوق عباد کی بجا آوری کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں۔ ۱۹۸۸ء میں حج کی سعادت حاصل کر چکا ہوں لیکن خود کو بندۂ مومن کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ گنہگار ہوں اور اپنے رب سے ان کی معافی کا خواستگار رہتا ہوں۔

آخر میں اپنے نوجوان عزیزوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ زندگی میں کامیابی کا راز سخت محنت میں پوشیدہ ہے۔ دوسروں کی سفارش کی تلاش کے بجائے خود اعتمادی پیدا کرنا چاہیے اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ جو کچھ بھی اس کی طرف سے پیش آتا ہے وہ اس کے بندے کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے، خواہ وقتی طور پر وہ کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ وقتی ناکامیوں اور ناساعد حالات سے پریشان و ناامید نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

اُردو کے مشہور شاعر محمود سروش کا ممبئی میں ۲ر جولائی ۱۹۹۶ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۵ سال کے تھے اور کافی عرصے سے علیل تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "متاعِ ہنر" حال ہی میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ ان کو اُردو فارسی اور انگریزی زبان و ادب پر یکساں عبور تھا۔

ادارہ نیا دور ان کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

احمد ابراہیم علوی
۳- ہیلتھ اسکوائر، لکھنؤ

اردو میں بچوں کے رسائل

قوموں کی تعمیر و تشکیل میں ادبِ اطفال کی اہمیت سبھی کو تسلیم ہے اسی لئے زندہ قومیں اپنے نونہالوں کی تربیت کے لئے بہتر سے بہتر ادب فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں انگریزی، فرانسیسی، چینی، جاپانی، روسی، جرمنی زبانوں میں بچوں کے لئے بہترین ادب موجود ہے لائبریریاں دیدہ زیب پرکشش اور انتہائی دلچسپ و معلوماتی کتابوں سے بھری پڑی ہیں اسکے باوجود ایک سے ایک خوبصورت رسائل نکل رہے ہیں جو اتنے پرکشش ہوتے ہیں کہ ایک جھلک دیکھنے کے بعد بچے مچل اٹھتے ہیں اور اتنے پُر از معلومات ہوتے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے بچے وہ کچھ جان جاتے ہیں جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہوتا۔ ان سے نہ صرف یہ کہ بچوں میں ذوق پیدا کیا جاتا ہے بلکہ ان کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے کیونکہ ان میں بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے، پڑھنے اور کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں جہاں بچوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی وہیں ان کیلئے اچھا ادب پیدا کرنے کی بھی کوئی خاص کوشش نہیں ہوتی۔ آزادی کے ۴۸ سال بعد بھی ناخواندگی برقرار ہے۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر حکومت خصوصی توجہ دے رہی ہے پھر بھی آبادی میں روز افزوں زبردست اضافے اور وسائل کی کمی کے سبب خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہو رہے ہیں۔ غریبی کے سبب لوگ بچوں کو اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجنے کے بجائے کام دھندے میں لگانا مفید سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ان پر بجائے کچھ خرچ ہونے کے خود ان ہی سے کمائی کروائی جاتی ہے۔ اسی لئے ہمارے ملک میں آج بھی کروڑوں بچے ایسے ہیں جن کو کھیلنا کودنا اور پڑھنا لکھنا چاہئے وہ سخت محنت کے کام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت کے علاوہ عوام کا زبردست پُرخلوص تعاون درکار ہے۔ عوام کو بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو سمجھ کر اسکی طرف خصوصی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری فلاحی و سماجی تنظیموں کو بچوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دینا چاہیے اور یہ بات سبھی کو سمجھنا اور سمجھانا چاہیے کہ جب تک قوم کے بچوں کی نگہداشت مناسب طریقے سے نہیں ہوگی ملک کو اچھے شہری، ہنرمند انسان اور باصلاحیت لوگ ہرگز نہ مل سکیں گے۔ قوم کو اوصاف حسنہ سے متصف کرنے، آج جو بیماریاں، بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں بڑھتی جارہی ہیں ان کو ختم کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ابتدا سے بچوں کی تعلیم و تربیت ان خطوط پر کی جائے کہ وہ غلط راہوں پر گامزن نہ ہوسکیں۔

بچوں کی بہترین طریقے سے تعلیم و تربیت کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ان کو ان کی نفسیات اور عمر کے تقاضوں کے مطابق انتہائی دلچسپ اور معتبر کتابیں اور رسالے فراہم کئے جائیں۔ ہمارے یہاں ہندی میں بچوں کے کئی اچھے رسائل نکل رہے ہیں اچھے اس معنی میں کہ ان کی طباعت گٹ اپ اور کاغذ وغیرہ اچھا ہوتا ہے اس لئے ان رسائل کو بچے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں لیکن ان میں بچوں کی صحیح تربیت کے لئے جس احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہیں برتی جاتی عموماً مزاح کا معیار گھٹیا ہوتا ہے اور جرائم کی بیخ کنی نہیں ہوتی بلکہ جرائم سے رغبت اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے اس کے برعکس اردو میں جو دو ایک رسالے نکلتے ہیں وہ اردو داں طبقوں کی عدم توجہی کے سبب تعداد اشاعت نہیں بڑھا پاتے ہیں لیکن ان میں جو مزاح ہوتا ہے وہ عموماً زیادہ تر معیاری ہوتا ہے اور جو کہانیاں وغیرہ ہوتی ہیں وہ بچوں کو ایمانداری راست گوئی اور حق پسندی کی ترغیب دیتی ہیں لیکن چونکہ زیادہ تر والدین اب خود اردو نہیں جانتے اس لئے وہ ان رسالوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ان کے گھر میں ہندی رسائل کا چلن ہوتا ہے بچے وہی چلتے ہوئے ہندی رسائل ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جو بھونڈہ مذاق اور اکثر بیہودہ باتیں بتاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں جو بچوں کے رسائل نکلتے ہیں ان کی تشہیر کی جائے تاکہ ان کا ہمارے گھروں میں چلن ہو جن کو پڑھ کر ہماری قوم

کے بچے مستقبل کے ذمہ دار اور فرض شناس شہری ثابت ہوں۔ ہم کو ان کی سرپرستی و ہمت افزائی کریں۔

اردو میں ابتدا سے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے اس لیے حالی، اقبال، نظیر اکبرآبادی، اسماعیل میرٹھی، حامداللہ افسر، ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، شفیع الدین نیر، تلوک چند محروم وغیرہ نے بچوں کیلئے بہت کچھ لکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کے بہت کم ایسے مشہور و مقبول ادیب اور شاعر ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے کچھ بھی نہ لکھا ہو۔ اسکے علاوہ بچوں کے لئے ایسے رسائل بھی نکلتے رہے ہیں جن سے بچوں میں پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں غنچہ، پیام تعلیم، تعلیم و تربیت، کھلونا، نور، نونہال، کلیاں، ٹافی، ننھا، میرا رسالہ، بچپن وغیرہ نے بچوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی ان رسائل نے کئی کئی نسلوں کی آبیاری کی لیکن بدقسمتی سے جن لوگوں کو ان رسائل کی طرف توجہ دینا چاہیے تھی ان کی ترقی اشاعت کے لیے ممد و معاون ہونا چاہیے تھا انہوں نے مجرمانہ تغافل سے کام لیا اس لیے ایک ایک کر کے سبھی رسائل بند ہو گئے اس کے بعد سب مل کر افسوس کرنے لگے ـــــ اردو میں بچوں کا کوئی رسالہ نہیں آخر بچوں کو کس طرح اردو پڑھنے کی ترغیب دیں، اردو میں بچوں کے لیے کچھ نہیں آخر بچے اردو سے دلچسپی کیسے لیں، وغیرہ وغیرہ لیکن اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ کوشش منصوبہ بند طریقے سے، اجتماعی طور سے کبھی نہیں کی گئی۔

اب عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں بچوں کے لیے کوئی اچھا رسالہ نہیں ہے یہ بات عادت کے مطابق بالکل آنکھ بند کر کے کہی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں ہے۔ دہلی، لکھنؤ اور بمبئی میں کتب فروشوں کے اسٹالوں پر اردو میں بچوں کے چھ ایسے رسائل دستیاب رہتے ہیں جو کہ خوبصورت، دیدہ زیب اور مفید۔ بچوں کے لیے انتہائی پرکشش ہیں، یہ رسائل ہیں ـــــ ماہنامہ "پیام تعلیم" نئی دہلی۔ ماہنامہ "اپنا ساتھی" بجنور۔ ماہنامہ "نور" رامپور، ماہنامہ "نرالی دنیا" نئی دہلی اور ماہنامہ "امنگ" دہلی۔ ان رسائل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی بہترین طور سے تربیت کے لیے ان رسائل کو بڑی توجہ، جانفشانی اور بڑی آرزو سے نکالا جا رہا ہے۔ ان رسائل کو نکالنے والوں کے پیش نظر مالی منفعت ہرگز نہیں ہے۔ ان رسائل کی قیمت نہ صرف بہت مناسب بلکہ بہت کم ہوتی ہے جبکہ معیار اور مواد بہت اعلیٰ ہوتا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اردو والے خواہ مخواہ کی مرثیہ خوانی کے بجائے جو لوگ ہر ممکن طریقے سے ادب و زبان کی خدمت کر رہے ہیں ان کی اہمیت کو سمجھیں اور ان کی سرپرستی و ہمت افزائی کریں۔

اگر آج ہر اردو والا یہ فیصلہ کر سکتا ہے جو کچھ ہو وہ کم از کم ایک اردو رسالہ اپنے بچوں کے لئے ضرور خریدے گا تو نہ صرف یہ کہ یہ رسائل لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے لگیں گے بلکہ ان کا معیار مزید بلند ہوگا یہ کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اچھا ماحول دیکھ کر بہت سے اور بھی بچوں کے رسائل نکلنے لگیں اس سے اردو کے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا ہو نہار اور باصلاحیت ادیب اور شاعر پیدا ہوں گے پھر اردو زبان کو اس طرح کے خدشات اور مسائل نہیں درپیش ہوں گے جن سے آج وہ نبرد آزما ہے۔

اس وقت اردو میں بچوں کے لیے جو رسائل آسانی سے بازار میں دستیاب ہیں اگر ان کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے تو یقیناً محبان اردو کو مسرت ہوگی اور ان میں یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ وہ ان میں سے کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور اپنے گھر پر اپنے بچوں کے لیے منگائیں۔

اردو اکادمی دہلی بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے گزشتہ ۹ برس سے ماہنامہ "امنگ" پابندی سے شائع کر رہی ہے۔ بچوں کا یہ رسالہ جس کے موجودہ ایڈیٹر ڈاکٹر صادق ہیں۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ پچاس صفحات پر مشتمل اس رسالے کی قیمت صرف تین روپے ہے جو رسالے کی دیدہ زیبی، طباعت، کاغذ اور مجموعی خوبیوں کے پیش نظر کچھ بھی نہیں ہے یہ رسالہ اگر لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو اور تب بھی مشکل سے دستیاب ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوگی۔ یہ رسالہ ایک طرح اردو زبان پر عائد کئے جانے والے تمام الزامات کا جواب ہے دنیا میں شاید ہی کسی زبان میں اتنا خوبصورت اور مفید رسالہ اتنی کم قیمت پر دستیاب ہو۔ اس رسالے میں بچوں کی نفسیات کے مطابق سب کچھ ہوتا ہے، بچوں کی تصاویر، انکی سرگرمیوں کی جھلکیاں، ان کے مقابلے ان کی معلومات میں اضافے کے لئے بہت سی مختصر اور دلچسپ باتیں پھر پیاری پیاری نظمیں اور مزیدار کہانیاں۔

ماہنامہ "نور" ادارۂ الحسنات رامپور سے شائع ہونے والا بچوں کا بچوں کے لئے ڈائجسٹ ہے جو کہ مسلسل ۴۳ سال سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ کتابی سائز کا یہ رسالہ عموماً ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کی قیمت گیارہ روپے ہوتی ہے جو بہت ہی مناسب ہے۔ آفسٹ پر شائع ہوتا ہے

کئی رنگوں میں ہوتا ہے سرورق عموماً دیدہ زیب ہوتا ہے اس میں بچوں کو نیک ایماندار اور فرض شناس شہری بنانے کے لئے بہت کچھ مواد ہوتا ہے انتہائی سبق آموز اور دلآویز کہانیاں، نظمیں بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے متعدد دلچسپ مقابلے اور بہت سی معلوماتی باتیں یکجا کی جاتی ہیں اسکے مدیر اعلیٰ عبدالملک سلیم بڑی محنت اور بڑے جذبے سے اس کو بچوں کیلئے بہترین تحفہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے پڑھنے والوں کا ایک اچھا حلقہ ہے۔ بہت سے بچے اس کے ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے اب مالی استحکام کے لئے اشتہارات لینا شروع کر دیئے ہیں۔ اس کو حکومت اترپردیش اور مرکزی حکومت کے اشتہارات ملتے ہیں جس سے امید کی جاسکتی ہے کہ اس کی مالی حالت ایسی سقیم نہیں ہوگی کہ اسکے بند ہونے کا عام حالات میں کوئی خطرہ برقرار رہے۔

ماہنامہ 'نور' کی بڑی اہمیت اسلئے ہے کہ یہ عرصے سے بچوں میں ستھرا ہوا ادبی ذوق پیدا کر رہا ہے۔ اردو پڑھنے والوں کی کئی نسلوں کی بحسن و خوبی آبیاری کر چکا ہے۔

دہلی سے شائع ہونے والا بچوں کا خوبصورت رسالہ "بچوں کی نرالی دنیا"، گزشتہ تین سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹر تنویر احمد ہیں۔ سید واجد علی شاہ جیلانی اس کو بچوں کے لئے پرکشش بنانے کے لئے اپنی فنکاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اس میں بچوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے ذہنی ورزش، فرینڈس کلب اور طرح طرح کے انعامی مقابلے ہوتے ہیں۔ دلچسپ اور پرلطف کہانیاں و نظمیں، معلوماتی مضامین، بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے معاون ہوتے ہیں، اس کا سرورق دیدہ زیب کتابت طباعت عمدہ اور کاغذ بھی اچھا استعمال ہوتا ہے۔

ماہنامہ بچوں کی "نرالی دنیا" کا سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا جو بہت پرکشش اور بچوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ اس میں نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر شامل ہیں قیمت ہے صرف بارہ روپے جبکہ صفحات ۹۰ ہیں۔

بھوپال سے النصر اکیڈمی بچوں کے لئے ماہنامہ "اچھا ساتھی" شائع کر رہی ہے۔ کتابی سائز کے اس رسالے میں ۴۸ صفحات ہوتے ہیں قیمت صرف چھ روپے ہوتی ہے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر سراج الدین ندوی ہیں۔

اس رسالے میں اگرچہ کاغذ اچھا استعمال نہیں ہوتا مگر طباعت اچھی اور روشن ہوتی ہے جس سے بچوں کے لئے کشش برقرار رہتی ہے یہ رسالہ مذہبی رسالہ ہے لیکن کہانیاں، نظمیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ اس رسالے کے ذریعے بچوں کی مذہبی معلومات میں اضافے کی زیادہ کوشش ہوتی ہے گزشتہ دو سال سے یہ رسالہ بچوں کے ادبی ذوق کو بڑھانے کی کوشش میں معروف ہے۔ اس رسالے کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس میں نئے نئے لکھنے والوں اور عموماً بچوں کو زیادہ موقع دیا جاتا ہے۔

ماہنامہ "پیام تعلیم" وہ رسالہ ہے جس نے ماضی میں بچوں کی ذہنی نشو و نما میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اس نے نسلوں کی آبیاری کی ہے اور اردو کے ادب اطفال میں گراں بہا اضافہ کیا ہے اس کے طفیل اردو کو اچھے لکھنے والے ملے خصوصاً شفیع الدین نیر نے اس کے ذریعے بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے اور ذمہ دار شہری پیدا کرنے کے قابل صد تحسین کارنامہ انجام دیا۔ اب اس کی ادارت کے فرائض شاہد علی خاں بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں سلیقہ مندی اور حسن انتظام کے لئے وہ شہرت رکھتے ہیں۔

کتابی سائز پر ماہنامہ "پیام تعلیم" ۹۶ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے اس کی قیمت صرف پانچ روپے ہوتی ہے۔ اس رسالے کو ممتاز اور مقبول ادیبوں اور شاعروں کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا ہے سو اب بھی حاصل ہے اس رسالے میں کارٹون اور بچوں کی سرگرمیاں وغیرہ بھی اہتمام سے شائع ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے بڑے دلچسپ اور ہمت افزا مقابلے بھی ہوتے ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کے بازاروں میں بچوں کے لئے جو رسائل دستیاب ہیں اس مختصر سے جائزے میں انکا اجمالی ذکر ہے بہت ممکن ہے ان کے علاوہ بہت سے اور بچوں کے رسالے نکلتے ہوں۔ کوشش یہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی اس طرح منظر عام پر آئیں کہ بچے بآسانی خرید کر پڑھ سکیں۔ اسطرح ان میں ادبی ذوق پیدا ہو اور وہ مستقبل کے قابل ذکر اور قابل فخر ادیب بنیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبان اردو اب منفی نقطہ نظر کو ترک کر کے عملاً کچھ کرنے کا عزم کریں کیونکہ اسی طرح کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور اسی سے اردو کی بقا ممکن ہے۔

ماضی میں اردو کے بہت سے معیاری رسائل بچوں کیلئے گوشہ رکھتے

(باقی صہ ۴۸ پر)

غزلیں

بزم میں اک فسانہ کہیے
شمع کو بھی پروانہ کہیے
اپنی اپنی دھن ہے سب کو
کس کس کو دیوانہ کہیے
ان کا تصور ہے جو سلامت
کیوں دل کو ویرانہ کہیے
طرفہ ستم ہے ان کا یہ کہنا
پھر سے ذرا افسانہ کہیے
مضطر صاحب! پانی کیسا
اشکوں کو دُردانہ کہیے

مُضطر تاجپوری

تاج پور ڈیہما
غازی پور (یو پی)

تغیرات کو کیوں آخر انقلاب لکھو
تم اس کو اپنی ہی زلفوں کا پیچ و تاب لکھو
جواب ہم نے وفا سے دیا جفاؤں کا
تم اس جواب سے بہتر کوئی جواب لکھو
میں اک مرقع ہوں گزرے ہوئے زمانہ کا
مجھے کھلی ہوئی تاریخ کی کتاب لکھو
تمہارے وعدے تمہیں یاد آ ہی جائیں گے
ہمارے غم کی شبوں کا تو کچھ حساب لکھو
گھر اس کے عشق میں حیدر لٹا دیا جس نے
اسے کچھ اور نہیں خانماں خراب لکھو

ڈاکٹر حیدر مصطفےٰ آبادی

نزد پولیس چوکی جہان آباد
رائے بریلی
۲۲۹۰۰۱

میری باتوں کا اعتبار تو کر
میں ترا ہوں تو مجھ سے پیار تو کر
آنے والا ضرور آئے گا
دل مرے تھوڑا انتظار تو کر
تجھ پہ میں جان تک لٹا دوں گا
دوستی مجھ سے پائدار تو کر
مجھ پہ تنقید کر رہا ہے تو
پہلے خود پہ ذرا وچار تو کر
خوبیاں اپنی گن تو لیں رضوان
خامیوں کا بھی کچھ شمار تو کر

رضوان خان

۹۶۔ شیخ سرائے
سیتاپور ۲۶۱۰۰۱

یہ تفرقوں کے اندھیرے ہیں یا شبِ غم ہے
چراغ سیکڑوں جلتے ہیں روشنی کم ہے
شبِ فراق میں یہ تیرگی کا عالم ہے
کہ جیسے چاند ستاروں میں روشنی کم ہے
نفس نفس میں سراسیمگی کا عالم ہے
ہر ایک سانس یہ کہتی ہے زندگی کم ہے
نظامِ زیست یہ کیسا ہے دوستو بتلاؤ
ہر ایک موڑ ہر ایک گام پر نیا غم ہے
نشاں خلوص و محبت کے بھی نہیں راحت
کچھ ایسے دورِ کشاکش میں ابنِ آدم ہے

راحت کاظمی

۱۸۔ جوہری محلہ، چوک
لکھنؤ

نیندوں میں سوتے رہنے کا موسم بدل گیا
بستر کو باندھ دیجیے سورج نکل گیا
جانے وہ کیسی پیاس تھی کیسا تھا معجزہ
سوکھی ہوئی زمین سے چشمہ ابل گیا
قسمت پہ اعتقاد تھا جن کو وہ گر گئے
میں اپنی کوششوں کی بدولت سنبھل گیا
باوقتِ گفتگو تو وہ اونچائیوں میں تھا
لیکن عمل کے وقت وہ پستی میں ڈھل گیا
میں اپنے دل کو جس سے گریزاں کیے رہا
پھر وہ خیال آ گیا پھر دل مچل گیا
اس راستے پہ قصدِ سفر مت کرو شکیل
جس پر تمہارا پاؤں سنبھل کر پھسل گیا

شکیل جے پوری

ڈاکخانہ ۔ کلی شاہ کالونی
گنگاپول ۔ جے پور
۳۰۲۰۰۲

پرشوتم سنگھ سیٹھی
۳۸۸ بی، سیکٹر ایل، اندرا نگر
لکھنؤ

اتر پردیش میں گورونانک کی زیارت گاہیں

گورونانک نے میل محبت اور امن و آشتی کو قائم کرنے اور توہم پرستی کو دور کرنے نیز لوگوں کی زندگی سدھارنے کے لئے نہ صرف ملک کے دُور دراز مقامات کے سفر کیے بلکہ انھوں نے غیر ممالک کے دورے بھی کیے۔

اتر پردیش میں بھی کئی مقامات کو ان کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے وہاں ایسے کرامات دکھائے جو آج تک زندہ جاوید ہیں۔ کماؤں کی پہاڑیوں میں "ریٹھا صاحب" ایک ایسا مقام ہے جہاں انھوں نے زہریلے ریٹھے کو میٹھا کر دیا۔ وہاں پر آج بھی وہ درخت موجود ہے جس سے میٹھے ریٹھے ملتے ہیں۔

پتھورا گڑھ ضلع کی چمپاوت تحصیل میں واقع ریٹھے کا وہ درخت دو پہاڑی ندیوں کے قریب واقع ہے۔

ہر سال ہزاروں اشخاص اس مقام کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور میٹھے ریٹھے کا پرشاد حاصل کرتے ہیں۔ گورونانک کے عقیدت مندوں نے وہاں پر ایک خوبصورت عبادت گاہ بنائی ہے جس میں عوام کے ٹھہرنے کے لیے کمرے بھی تعمیر کیے گئے ہیں جن میں لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ مقام چوں کہ سات ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے اس لیے عبادت گاہ کے منتظمین عوام کو بستر اور کمبل بھی فراہم کراتے ہیں۔ وہ نہ تو کمروں کا کرایہ لیتے ہیں اور نہ ہی بستروں اور کمبلوں کا کوئی معاوضہ۔

روایت ہے کہ جب گورونانک ہمالیہ کی پہاڑیوں پر سے اتر کر ریٹھا کے مقام پر پہونچے تو ان کے ساتھی مردانہ کو بھوک نے پریشان کیا۔ مردانہ نے گورونانک سے عرض کیا کہ "اب زیادہ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ کھانے کا بندوبست کریں۔"

گورونانک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ آگے چل کر کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔

مردانہ نے کہا "عالی جاہ! اب میں زندہ نہیں رہوں گا اگر کچھ کھانے کو نہ ملا۔"

گورونانک نے جب مردانہ کی حالت خراب ہوتے دیکھی تو انھوں نے اپنے دوسرے ساتھی بالا سے کہا کہ "اس درخت پر چڑھ کر ریٹھے توڑ لاؤ۔"

یہ سنتے ہی وہاں موجود سادھو ہنس پڑے اور انھوں نے کہا کہ "ریٹھے کھاتے ہی مردانہ اس دنیا کو چھوڑ دے گا۔"

گورونانک کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جب ریٹھے توڑے گئے تو وہ میٹھے نکلے، جنہیں کھا کر مردانہ نے اپنی بھوک مٹائی۔ اس درخت کی دوسری طرف کڑوے ریٹھے ہیں۔ جس طرف گورونانک نے درخت کو چھوا تھا صرف اسی طرف میٹھے ریٹھے ہیں۔

عبادت گاہ کے منتظمین ہر سال ریٹھے اکٹھے کرتے ہیں اور ملک و غیر ممالک سے زیارت کرنے والوں کو تبرک کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

وہ مقام "ریٹھا صاحب" کے نام سے منسوب ہے۔ ریل کے راستے سے ٹنک پور تک جانے کے بعد بس یا موٹر کے ذریعہ لوہاگھاٹ کے راستے "ریٹھا صاحب" جاتے ہیں۔ ٹنک پور سے یہ مقام ڈیڑھ سو کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔

ریٹھا صاحب میں کمروں یا سامان میں لوگ تالا نہیں لگاتے کیوں کہ چوری کی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ ایک بزرگ نے بتایا کہ گورونانک نے وہاں جاتے وقت دعا کی تھی کہ جو لوگ ریٹھا صاحب کی زیارت

پہ آئیں ان کے دل و دماغ سے ہر طرح کی برائی دور ہو گئی اور وہ پاک و نیک ہو کر رہیں۔

کناڈا سے آئے ایک شخص نے بتایا کہ وہ مدت سے ریٹھا صاحب کے متعلق سُن رہے تھے مگر یقین نہیں آتا تھا کہ ریٹھا جو زہر ہوتا ہے اور جسے کپڑے دھونے اور کیمیکل بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے وہ شہد کی طرح میٹھا بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بڑی مشکل سے میں اس مقام پر پہونچا اور گورو نانک کی کرامت دیکھی۔

انھوں نے مزید بتایا کہ میں تین دن تک اس مقام پر رہا اور عبادت گاہ کے کارکنوں سے متاثر ہوا۔ اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ میرے کمرے کے دروازے کھلے رہتے تھے مگر کسی قسم کی کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔

"دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کڑوا ریٹھا کسی شخص کے چھونے سے میٹھا ہو جائے۔ یہ درخت صدیوں سے پھل دے رہا ہے" واضح رہے کہ گورو نانک پانچ سو سال قبل وہاں گئے تھے۔

ملک کے دورے پر جب وہ نکلے تو متھرا پہونچ گئے۔ وہاں کے کچھ پنڈتوں نے گورو نانک سے پوچھا،

"کل جگ کہاں قیام کرتا ہے؟"

گورو صاحب نے جواب دیا کہ کل جگ کا کوئی شریر (جسم) نہیں ہے اور نہ ہی آج تک اسے کسی نے دیکھا ہے۔ یہ ایک ایسا دور ہے جس میں لوگوں کی نیت خراب رہے گی۔ کھوٹے کو کھرا، چوروں اور ٹھگوں کو چودھری مانا جائے گا۔ سچائی کو چھوڑ کر پاکھنڈ کا بول بالا رہے گا"

گورو نانک کی اس وضاحت سے لوگ ان کے مداح ہو گئے وہاں بھی ان کی یاد میں عبادت گاہ بنی ہے۔

گورو نانک جی اتر پردیش میں کئی اور مقامات پر بھی گئے تھے اور اپنے اُپدیشوں سے عوام کا دل جیتا تھا۔ ان مقامات میں نانک متہ صاحب، وارانسی، ہردوار، آگرہ اور الہ آباد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

□□

کشکول

صفحہ ۳۲ کا بقیہ

دباؤ سے دل و دماغ دُکھنے لگے۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ کشکول پھینک دے۔ مگر اسے وہ پھینک نہ سکا ـــــ شاید اس لیے کہ وہ بادشاہ نہیں تھا جس کے شاہی خزانے میں بے شمار دولت موجود تھی اور جس کے ہاتھوں کی ٹوپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں ـــ

شاید اس لیے کہ وہ درویش نہیں تھا، جسے بہشت کے میووں پر پورا یقین تھا۔

اچانک اس کی آنکھوں میں کشکول تھمانے والے چہرے اُبھر آئے اُن کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

کہانی سُنانے والے لب خاموش تھے۔

ان کے پیٹ دھنسے ہوئے تھے۔

اس کے اپنے پیٹ کی اینٹھن بڑھ گئی۔ آنتیں کُلبلانے لگیں۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کشکول سے چوہیا کو نکال لیا۔ اس کی کھال الگ کی اور بلغم نما گودا اپنے منہ میں ڈال لیا۔

منہ چلاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ بہت سی آنکھیں اس کی طرف حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

شاید ان آنکھوں کے کشکول میں ابھی تک چوہیا نہیں پڑی تھی۔ !!

□□

تصحیح

جون ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں شائع شدہ مضمون "چراغ دیر" میں صفحہ ۲۲ پر دوسرے کالم میں سطر ۲۵ پر دراصل "سہیل بخاری" ہے جسے غلطی سے سہیل بنارسی لکھ دیا گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

ـــــــ ادارہ

مختصر کہانی

غضنفر

[illegible]

کشکول!

اُس کے ہاتھ میں کشکول تھما دیا گیا۔

کشکول تھمانے والے وہ تھے جنھوں نے اسے سُنایا تھا:

"ایک بادشاہ کے پاس بے شمار دولت تھی، مگر بادشاہ اس دولت میں سے اپنے اوپر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں لوٹا ہوا مال اور مانگا ہوا اخراج شامل تھا۔

بادشاہ اپنے ہاتھوں سے ٹوپیاں بناتا اور انھیں بازار میں بیچتا اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔"

کشکول پکڑانے والوں سے اس نے یہ بھی سُنا تھا۔

"ایک بھوکے درویش کے آگے لوگ انواع و اقسام کی نعمتیں لیے کھڑے رہے اور وہ فقیر فاقے کرتا رہا۔ ایک دن وہ فاقے سے مر گیا مگر اس نے کسی کی بھیک قبول نہیں کی۔ مرتے وقت اس کی آنکھوں میں چمک تھی، چہرے پر نور تھا۔"

وہ کشکول لیے دروازے پر کھڑا تھا۔

آنے جانے والے کشکول میں کچھ نہ کچھ ڈالتے جا رہے تھے۔

ایک نے ایک کیلا ڈالا۔

اس کی نظر کیلے سے چپک گئی

پچکے ہوئے سیاہ چھلکے والے کیلے کا ایک سرا پھٹ گیا تھا جس میں سے گلا ہوا گودا باہر نکل آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کیلے کے اس سرے پر کسی نے پکا ہوا بلغم تھوک دیا ہو۔ اس سڑے سیاہ رنگت والے چھلکے سے کیلے کو دیکھ کر اسے یہ بھی محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کشکول میں کچلی ہوئی چوہیا ڈال دی ہو ——

کراہت کا احساس اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔

ایک نے پلیٹ کا جوٹھن پلٹ دیا۔ دال اور دہی میں سنا ہوا چاول دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے کسی نے کشکول میں اُلٹی کر دی ہو۔ اس کا جی متلانے لگا۔

کوئی میلا کچیلا، مڑا تڑا اگلا ہوا ایک روپے کا نوٹ ڈال گیا

کسی نے ایک سکہ پھینکا، مگر سکّے سے کھن کی آواز نہیں اُبھری۔!

ایک صاحب گھسی ہوئی اٹھنی ڈال گئے۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں کشکول نہیں کوئی ڈسٹ بن ہو۔ کراہت کا احساس اور شدید ہو گیا۔

"سالا ہٹا کٹا ہو کر بھیک مانگتا ہے ....." ایک صاحب ایک گندی سی گالی دے کر آگے بڑھ گئے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ دوڑ کر اس کی زبان کھینچ لے۔

ایک صاحب رُکے، اور اپنی قہر آلود نگاہوں سے نفرت اور حقارت برسا کر چل دیے۔

ایک اور صاحب رُکے۔ بڑی ہمدردی سے اسے دیکھا اس کے کپڑوں کے پیوند پر دیر تک نظریں جمائے رہے۔ پھر جیب سے کڑکڑاتا ہوا دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور نوٹ کو اس کی آنکھوں کے آگے لہرا کر کشکول میں ڈال دیا۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ اس کڑکڑاتے ہوئے نوٹ کو پھاڑ کر اپنے پیروں سے مسل دے۔

آنے جانے والے اسی طرح کشکول میں گلے سڑے پھل، سوکھی روٹی، جھوٹن، گھسی ہوئی اٹھنی، پھٹے ہوئے میلے کچیلے نوٹ، گالی، حقارت، نفرت، ترحم وغیرہ ڈالتے چلے گئے۔

اس کے کشکول کا وزن بڑھتا گیا۔ ذہن کی رگیں تن گئیں،

(باقی ۴۴ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "علامہ عبدالحئی احقر منگلوری : حیات اور کارنامے"

مصنف : سیّد قدرت اللہ الحسینی الباقوی۔ قیمت ۲۰/-

ملنے کا پتہ : دار قدرت، ۱۵۵۔ ادیاگری سکنڈ، میسور کرناٹک ۵۷۰۰۱۹

اس کتاب کا پیش لفظ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) نے لکھا ہے، فرماتے ہیں :

"تقریباً مستورالحال اور مجہول الکمال جنوب کی یگانۂ روزگار شخصیتوں میں علامہ عبدالحئی احقر کی ذات بھی ہے جو مولانا داآخذ منگلوری کے نام سے زیادہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ علامہ موصوف اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم بھی تھے۔ قادر الکلام شاعر اور ادیب بھی ......

افسوس کہ آج تک اس صاحبِ کمالات، کثیر التصانیف اور کثیر الجہات شخصیت پر نہ صرف جنوب بلکہ ہندستان بھر میں کسی مصنف کو قلم اٹھانے اور اس کے کمالات کی نقاب کشائی کی توفیق نہیں ہوئی۔ عزیز گرامی ڈاکٹر سید قدرت اللہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جنوب کے معاملہ میں حق شناسی اور حق نمائی کا فرض انجام دیا ....."

یہ اقتباس اس لیے پیش کیا گیا کہ احقر منگلوری کی شخصیت کے ساتھ ڈاکٹر قدرت اللہ کے علمی مرتبہ کا بھی اندازہ ہو سکے۔ علامہ احقر یا علامہ داآخذ کی حیثیت مناظر، خطیب اور مصلح قوم کی تھی۔ وہ حضرت ولی اللہ کی تحریک کے داعیوں میں تھے اور سیداحمد شہید کے سلسلے سے بھی وابستہ تھے۔ قلب ولیوری سے بھی علامہ احقر نے بہت کچھ کسب فیض کیا تھا۔ یوں تو ان کی شاعری ہو یا ان کی نثر سب پر ان کے نظریات حاوی ہیں لیکن انھوں نے ہر مرحلہ پر اس بات کی کوشش کی کہ نظریہ صرف ذہن کی چہار دیواری میں گھٹ کر نہ رہ جائے بلکہ عمل کے میدان میں بھی نظر آئے۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء تک وہ جہاں بدعات و رسم پرستی کے خلاف لکھتے رہے وہیں عملی طور پر خطابت کے جوہر کے ساتھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بھی بناتے رہے ان کے عہد میں ان کو شمشیرِ عریاں بھی کہا جاتا تھا۔ ان کے خطب میں ان کے کتب سے زیادہ دل کشی ہے۔ ان کے تقریباً سو خطبات ہیں ان کی ایک کتاب امام اعظم حضرت ابوحنیفہ کے مسلک و مسائل کے مطابق ہے۔ وہ ایک اچھے سوانح نگار بھی ہیں۔ انھوں نے تفسیر بھی لکھی ہے اور اس کتاب میں ان کے جملہ کمالات کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کی اہمیت علامہ احقر بنگلوری کے حیات اور کارنامے سے زیادہ ان چند ضمنی باتوں کی وجہ سے بھی ہے جو برسبیل تذکرہ آگئی ہیں۔ مثلاً :

"سید احمد کے خلیفہ مولانا سید محمد علی واعظ راجپوری مدراس تشریف لائے تھے۔ ان کے وعظ سے متاثر ہو کر موسیقاروں نے آلاتِ موسیقی توڑ دیے تھے۔"

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ علامہ جیسے بزرگ انیسویں صدی کے وسط میں جب شمالی ہند میں شاگردانِ ناسخ اور انیس و دبیر شاعری میں صناعی کے جوہر دکھا رہے تھے اس وقت بنگلور میں بھی یہ چراغ روشن تھا اور علم عروض کے سلسلے میں احقر کے اکتسابات آج بھی قابلِ توجہ ہیں۔

ڈاکٹر قدرت اللہ کی کاوش قابلِ داد ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں بعض بے حد اہم نکات اٹھائے ہیں۔

امید ہے کہ اہلِ علم حضرات اس کتاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

——— ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

نام کتاب: کیڑے مقدرت کا شاہکار
مصنف: ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی
قیمت: پینتالیس روپے (۴۵/-)

ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی ایک ماہر حشرات الارض ہیں اور اپنی ۳۲ سالہ تحقیق کے دوران انھوں نے کیڑوں مکوڑوں کی زندگی کے دل چسپ گوشے تلاش کیے ہیں۔ کیڑے مکوڑے جنھیں حشرات الارض کہا جاتا ہے، ہماری زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ یوں تو آٹھ لاکھ اقسام پر مشتمل کیڑوں کا سب سے بڑا گروپ ہے مگر ان میں مکھی، مچھر، چھپکلی، شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، لال بیگ (کاکروچ) اور دیمک سے آئے دن واسطہ پڑتا ہے۔ یہ کیڑے مکوڑے ہمارے بہترین دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ ایک طرف یہ کیڑے ہماری فصلیں تباہ کرتے ہیں اور بیماریاں پھیلاتے ہیں تو دوسری طرف ہمارے دشمن کیڑوں کو مار کر ہماری مدد کرتے ہیں۔

چیونٹیوں کو لیجیے۔ یہ جب اپنا گھر بناتی ہیں تو نیچے کی مٹی اوپر لے آتی ہیں اور اس طرح بننے والے سوراخوں سے جو ہوا اندر جاتی ہے وہ زمین کی بہتری کا سبب بنتی ہے۔ مکھی، مچھر اگر بیماریاں پھیلاتے ہیں اور دیمک بے حد ضرر رساں ہے تو شہد کی مکھیاں، ریشم اور لاکھ کے کیڑوں کی مصنوعات سے ملک کو خاصا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح تتلی بھی ایک کیڑا ہے جس کے نقش و نگار قدرت کا حسین شاہکار کہے جا سکتے ہیں اور ہمارے لیے لطف و انبساط کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ غرض کہ کیڑے جہاں حقیر، گندے اور نقصان دہ ہیں وہیں خوبصورت، چمک دمک والے اور انتہائی مفید بھی ہیں۔

ڈاکٹر فاروقی نے اپنی کتاب کے ذریعہ جس کا سرورق بامعنی اور خوبصورت ہے، طرح طرح کے حشرات الارض سے متعارف کرایا ہے اور ان کے بارے میں اہم اور دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں بلکہ یوں کہیے کہ کیڑوں کی دنیا کی پکی تصویر کھینچ دی ہے اور انسانی زندگی میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ——— ایس، اے، رحمٰن

نام کتاب: زرد موسم (شعری مجموعہ)
شاعر: کیفی سنبھلی قیمت ۵۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: صدیقی بک ڈپو جگت، سنبھل، مرادآباد
۲۴۴۳۰۲

کیفی سنبھلی پیدائشی شاعر ہیں، ان کی شاعرانہ صلاحیتیں خداداد ہیں، بقول حضرت معجز سنبھلی: "ایک طالب علم کو اپنے سالانہ طرحی سالمہ میں بحیثیت شاعر سلام پڑھتے سنا، یہ طالب علم تھا اقبال قاسم کیفی سنبھلی ——— سلام سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کیفی پر یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے۔ ان کا شعور بتا رہا تھا کہ کیفی بچپن سے شعر کہنے کا ہی نہیں شعر سمجھنے کا بھی شعور رکھتا ہے۔ کیفی کے اس شعور اور شاعری کی عمر کیفی کے سن و سال سے بھی آگے چل رہی ہے۔"

کیفی سنبھلی پر حضرات اہل بیتؑ کی محبت اور عقیدت عشق کی حد تک حاوی ہے۔ زرد موسم اگرچہ غزلوں کا مجموعہ ہے مگر غزلیات کے شعروں اور مصرعوں تک میں واقعاتِ شہادت اور مصائب کربلا کی جھلک ملتی ہے۔

کیفی کے یہاں انسانی احساسات ہر قدم پر ملتے ہیں۔ وہ انسانوں کے کرب، مٹتی ہوئی اخلاقی قدروں، بے وفائیوں اور زر پرستی پر سخت حیران اور پریشان نظر آتے ہیں۔ انھوں نے انسانوں کو جھنجھوڑا ہے۔ آدمیت کے احیاء کی کوشش کی ہے، اخلاق کو اپنانے پر زور دیا ہے مگر فن کو کہیں نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کے یہاں قدیم شاعری کی معنویت اور جدید شاعری کا حسن ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ زبان بہت سہل اور نئی نسل کے لیے عام فہم ہے۔ ایک پرانے نظریے کو نئے الفاظ میں کس خوبی سے ادا کیا ہے ملاحظہ ہو۔

ایسا محاذِ جنگ پر اکثر لگا مجھے
اپنا ہی تیر تھا جو پلٹ کر لگا مجھے

واقعاتِ کربلا کا تاثر ملاحظہ ہو

نہ مصلحت نہ کبھی التجا کے لہجے میں ستم سے بات کرو کربلا کے لہجے میں

[illegible]
امتحان [illegible] ہو جاتی ہے وہ
جیسے سمندر کو کشتیاں نکلتی ہیں

اسحاق سنبھلی ـــــــــــــ

نام کتاب: "اُردو رامائن"
مترجم/مصنف: بابو سنگھ بالیان قیمت: ۲۵/- روپے
ملنے کا پتہ: کیپٹن سبھاش کمار سیوا استھان
میرٹھ

انسانی قدروں پر ایمان رکھنے والے اور مذہب کو اپنی روح میں جذب کر لینے والے جناب بابو سنگھ بالیان (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) سچے رام بھگت ہیں۔ رام جو سچائی کی علامت ہیں، بالیان صاحب اس سچائی کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ یہ اُردو رامائن اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے بقول ان کے اس کا براہ راست ترجمہ نہیں کیا گیا۔ مگر یہ ترجمے کی ضمن میں ہی آئے گی۔ اس خوبصورت کتاب میں نہ صرف بھارت بلکہ دنیا بھر میں چھپی رامائنوں کی تفصیل بھی ہے اور اُردو شعراء کے شری رام کی عقیدت میں کہے گئے اشعار بھی درج ہیں۔ سرورق پر علامہ اقبال کا یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں ان کو امامِ ہند

اُمید ہے کہ اُردو حلقوں میں بابو سنگھ بالیان کے جذبے کو سراہا جائے گا اور کتاب کی اشاعت سے محبت کی فضا کو فروغ حاصل ہوگا۔

ـــــــــــــ فیصل کلیم

نام کتاب: ادیبوں کے اَدبی لطیفے
مرتبہ: نارنگ ساقی قیمت: ۱۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: این ۲۳۹، گریٹر کیلاش فرسٹ
نئی دہلی

جسے ہنسنا نہیں آتا، اسے جینا نہیں آتا۔ یہ وہ مشہور مقولہ ہے کہ جس میں زندگی کا [illegible] کی زندگی کا بھی جزو [illegible] علامہ اقبال [illegible] ہنسی آتی ہے کہ ایسی بھاری بھرکم شخصیت کے مالک شخص لطیفہ باز تھے اور اپنی بذلہ سنجی کی وجہ سے اپنے قیام لندن کے دوران خاصے مقبول تھے جعفر نقوی نے اقبال کی ظرافت کے بہت سے واقعات قلم بند بھی کیے ہیں۔ دراصل کسی بھی شخصیت کا یہ متبسم پہلو بہت اہم ہوتا ہے کہ اس سے نہ صرف اس شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بلکہ اس دور کو سمجھنے میں مزا بھی آتا ہے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لطیفہ کہتے کس کو ہیں ــ؟ دراصل الفاظ سے ذہن کو گدگدانے کا نام لطیفہ ہے۔ طنز میں بے تکی بات ظاہر کر دی جاتی ہے لیکن لطیفے میں اچھی خاصی بات کو بے تکا بنایا جاتا ہے اور لفظ کی یہی جادوگری کھلبلی پیدا کرتی ہے۔

لطیفے کی سطح بھی مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً چھوٹے بچے کو منہ بنا کے ہنسایا جاتا ہے تو یہ لطیفہ نہ ہوگا لیکن اگر آپ اپنے چھوٹے بھائی کی مٹھائی یہ کہہ کے کھانا شروع کر دیں کہ "دیکھو ایسے کھائی جاتی ہے" تو یہ لطیفہ ہوگا چنانچہ اسی طرح کے واقعات ادیبوں کی زندگی سے بھی متعلق رہے ہیں سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے ان لطیفوں کے ذریعے سے ایسا سماں باندھا ہے کہ یہ لطیفے اُردو کے ہر طالب علم کی زبان پر ہیں اور رہیں گے۔ اس کے بعد سے تو پھر دریا کا بہاؤ ہے۔ بہت سے پہلے پروفیسر شمیم حنفی فراق اور مجاز کے لطیفے اپنے مخصوص انداز میں لکھا کرتے تھے۔ سیرت نگاری کے سلسلے میں کسی ادیب اور شاعر کا ذکر آتا تھا تو اس کے لطیفے بھی درج کیے جاتے تھے۔

مبارکباد کے مستحق ہیں محترم نارنگ ساقی جنہوں نے تقریباً سوا فراد کے لطیفے درج کیے ہیں۔ آغاز انشاء سے ہوتا ہے۔ بعض شعراء کے لطیفے زیادہ دلچسپ ہیں بعض لطیفے کم کثیف زیادہ ہیں۔ اس کتاب کے کچھ بہت اہم نکات ہیں۔ مثلاً اس کا تعارف مالک رام نے لکھا ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ڈیڑھ صفحہ قتیل شفائی اور ڈیڑھ صفحہ گوپی چند نارنگ نے بھی لکھا ہے۔ علاوہ نارنگ کے عنوان سے مشفق خواجہ نے ساڑھے تین صفحے لکھے ہیں اور

اس انداز [illegible] قاری ڈر کے مارے تین سطریں
پڑھنے کے بعد ہی الٹ دیتا ہے۔ دلیپ سنگھ نے پیش گفتار
میں البتہ بڑے معرکے کی ڈھائی سطریں لکھی ہیں:

"اس کتاب میں شامل لطیفے نہ صرف قاری کو دلچسپی
کا سامان فراہم کرتے ہیں بلکہ متعلقہ ادیبوں کی شخصیت کو بھی
سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔"

اس کتاب کی سب سے معرکہ خیز خوبصورتی ہر ادیب کی ولادت و وفات کا سن و تاریخ ہے۔ یہ احتیاط برتی گئی ہے کہ جو لوگ زندہ ہیں ان کی صرف تاریخ ولادت ہے۔

کتاب میں بے شمار تصویریں اس لیے بھی ہیں کہ اگر لطیفے پڑھ کر ہنسی نہ آئے تو ان تصویروں کو دیکھ کر ضرور آجاتی ہے۔ اکثر تصویریں چھوٹے بچوں کو ڈرانے کے کام آسکتی ہیں۔

اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کتاب خرید کر تصویریں دیکھ لیجیے۔ ہنسی نہ آئے تو پیسے واپس۔

——— جمیل عسکری

نام کتاب: "جگت موہن لال رواں اور انکی شاعری"
مصنف: محمد اشفاق عارف قیمت ۲۰۰/- روپیے
ملنے کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

اس کتاب میں محمد اشفاق عارف نے جگت موہن لال رواں کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے مصنف نے کافی مشقت کر کے رواں کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کے بارے میں کافی مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ ایک دستاویز بن گئی ہے۔

رواں اردو کے ایک باوقار اور کہنہ مشق شاعر تھے وہ اردو ادب کے غیر مسلم شاعروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ رواں حالی اور محمد حسین آزاد کی نئی شاعری کی تحریک سے کافی متاثر تھے اور اسی لیے انھوں نے مثنوی کی صنف کو اپنے لیے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

دورِ حاضر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے غیر مسلم شاعروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے۔ اس لحاظ سے عارف صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے ریسرچ کے لیے یہ موضوع منتخب کیا۔

کتاب کی کتابت اور طباعت معقول ہے۔ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

——— کہکشاں عابدی

نام کتاب: "چھلکتے پیمانے" (شعری مجموعہ)
شاعر: شیام لال ورما مست الہ آبادی قیمت ۱۲۵/- روپیے
ملنے کا پتہ: ۱۰۶۔ اشوک نگر پارک، الہ آباد

"چھلکتے پیمانے" شیام لال ورما مست الہ آبادی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ان کے دل اور دماغ کی کاوشوں کا نچوڑ ہے"۔ اس مجموعہ میں لمبے چوڑے پیش لفظ کے بجائے مشہور افسانہ نگار اوپیندر ناتھ اشک کے قلم سے نکلی ہوئی مختصر تحریر شامل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خود ہی اپنے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے جو ایک شاعر کی شاعری اور حالات کے لیے ضروری اور مفید ہوتا ہے۔

اردو شاعری کی جان غزل ہے۔ مست کی غزلوں میں سادگی، لطافت اور حلاوت ہے۔ فرسودہ موضوعات سے نئی بات پیدا کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے ان کے کلام کی شوخی، رنگینی اور بانکپن داغ اور جگر کی یاد دلاتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

انجام سے ہم آگاہ نہ تھے آغاز محبت کر بیٹھے
افسوس کہ اپنی ہستی کو خود وقفِ مصیبت کر بیٹھے

ان کی نظمیں بھی خوب ہیں "ہولی" اور "دنیائے نسوانیت سے خطاب" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی نعتوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے (مجموعہ میں تبرکاً ۳ نعتیں شامل ہیں) انھوں نے دلو رام کوثری لاہوری کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے دربارِ رسالتؐ میں درود و سلام بھیجا ہے۔

——— ظفر حسین

"اودھ آئینہ ایام میں"
چند تاثرات

مکرمی امجد صاحب!

آپ کا بھیجا ہوا تحفہ "اودھ آئینہ ایام میں" ملا۔ چار سو صفحات میں آپ نے اودھ کو ہر پہلو سے پیش کیا ہے۔ اس کامیاب کوشش پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

——— پروفیسر قیوم صادق۔ گلبرگہ

محترم امجد حسین صاحب!

بحمداللہ کتاب "اودھ آئینہ ایام میں" وصول ہوئی۔ کتاب کے دیکھتے ہی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بڑھ گیا۔ رسالہ نیا دور لکھنؤ میں شائع شدہ اودھ کی تاریخ و تہذیب سے متعلق مضامین کو مناسب عناوین کے تحت مرتب و مدون کر کے کتابی صورت میں شائع کر کے آپ نے ایک یادگار کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ اودھ میں یادگار رہے گا۔

میں آپ کو اور ادارہ نیا دور سے متعلق دیگر حضرات کو اس کارنامے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

——— حکیم سید محمد کمال الدین حسینی۔ علی گڑھ

مکرمی تسلیم!

آپ کی ارسال کردہ کتاب "اودھ آئینہ ایام میں" وصول ہوئی جس کے لیے شکرگزار ہوں۔

آپ نے نیا دور کے دونوں شماروں کو کتابی شکل میں منتقل کر کے ایک اہم اور مفید کام انجام دیا ہے، جس کے ذریعہ جدید و قدیم اودھ کا تقابلی مطالعہ ممکن ہو گیا ہے۔

کسی موضوع پر مضامین یکجا کرنا، لکھوانا، پڑھنا، سنوارنا اور ترتیب دینا خاصا مشکل کام ہے۔ آپ نے ایک لائق ایڈیٹر کی حیثیت سے اس فرض کو نہایت محنت اور جاں فشانی سے بحسن و خوبی انجام دیا ہے جس نے اسے یادگار بنا دیا ہے اور مختلف گوشوں پر چھوٹے چھوٹے اقتباسات نے اس میں چار چاند پیدا کر دیا ہے۔

اس کتاب کے بعض مضامین اس قدر دلچسپ، فکر انگیز اور معلوماتی ہیں کہ اگرچہ میں انھیں نیا دور میں پڑھ چکا تھا لیکن قند مکرر کے طور پر کتابی شکل میں پڑھ کر مزید لطف محسوس کیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

——— عظیم الشان صدیقی
جامعہ ملیہ نئی دہلی

محترم امجد حسین صاحب! ہدیۂ خلوص

آپ کی مرتب کردہ کتاب "اودھ آئینہ ایام میں" ملی، بے حد شکریہ۔
کتاب بیحد خوبصورت شائع ہوئی ہے اور اودھ کے سلسلے کی مکمل دستاویزی جانکاری آپ نے اس کتاب میں شامل کر دی ہے۔ یہ ایک طرح کا تحقیقی کام ہی ہے ... اودھ پر جب بھی کوئی لکھنا چاہے گا یہ کتاب اس کی مجبوری ہوگی۔

میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ خدا کرے آپ شگفتہ ہوں۔

——— مشتاق احمد نوری۔ پٹنہ

اردو میں بچوں کے رسائل۔ صفحہ ۳۱ کا بقیہ

تھے۔ "آج کل" اور "نیا دور" میں بچوں کے لیے کئی صفحات ہوتے تھے اس سے بڑے لکھنے والے بھی بچوں کے لیے لکھنے کی طرف مائل ہوتے تھے اور بچوں کے لیے بھی یہ رسائل باعث کشش رہتے تھے۔ اب اگر نیا دور لکھنؤ ہر شمارے میں چار صفحات بچوں کے لیے چھوڑ دے اور اس میں بچوں کے لیے ان کی زبان میں ان کی فہم اور نفسیات کے مطابق کہانیاں، نظمیں، معلوماتی مضامین دیے جانے لگیں تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ نیا دور کی کتابت طباعت کا معیار قابل تحسین ہے۔ اس کو بڑے اور نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہتا ہے جب یہ بچوں کے لیے گوشہ نکالے گا تو بہت سے اچھے لکھنے والے جو پہلے بھی بچوں کے لیے لکھتے رہے ہیں لیکن کوئی اچھا رسالہ نہ ہونے کی وجہ سے اب بچوں کے لیے نہیں لکھ رہے ہیں وہ اس طرح متوجہ ہوں گے اس طرح بچوں کے لیے بہت کچھ یکجا ہو جائے گا۔

ماہنامہ نیا دور

جلد ۵۱ | نمبر ۵

عنوانات

عنوان	مصنف	صفحہ
اپنی بات	ایڈیٹر	۲
آزادیٔ وطن (نظم)	عشرت انصاری	۳
تعارف نامہ (خودنوشت)	م. م. راجندر	۴
یادوں کی رہ گزر (۲)	علی جواد زیدی	۸
سونے اور جاگنے کے درمیان (نظم)	فیاض رفعت	۱۷
اردو املا و قواعد	گوپی چند نارنگ	۱۸
غزلیں	ضیا قادری	۲۲
غزلیں	پروین کمار اشک۔ عبدالمتین نیاز	۲۲
اقبال اور اکبر (۲)	اکبر حیدری کشمیری	۲۳
۱۵ اگست (قطعات)	عبدالمنان صدیقی	۲۸
غزلیں	کاظم جرولی	۲۹
غزلیں	سیدہ شان معراج۔ جاوید برقی	۲۹
کچھ داغ، کچھ غالب	عابد پشاوری	۳۰
غزل	صدا لکھنوی	۳۴
غزلیں	شاہ جہاں بانو یاد	۳۵
غزلیں	عتیق الہ آبادی۔ پیکر جعفری	۳۵
غزلیں	حسن ترابی۔ زاہد لکھنوی	۳۵
اپنی تو عادت ہے گھبرانے کی (طنز و مزاح)	محمد زماں آزردہ	۳۶
داستان (افسانہ)	رتن سنگھ	۳۹
ہر بچے کو خواندہ بنایا جائے گا	خورشید ظفر	۴۲
جشن آزادی (قطعہ)	اختر عمر اختر	۴۳
نقد و تبصرہ	سید محمود الحسن۔ نہال احمد صدیقی	۴۴
نقد و تبصرہ	ناوک حمزہ پوری۔ سلیم عمر۔ رضوان حیدر	۱۰
نقد و تبصرہ	محسن رضا۔ سہیل احمد۔ سلمیٰ رضوی	۴۷
تاثرات کے آئینے میں	خطوط قارئین	۴۸

اپنی بات

اہلِ وطن خصوصاً نیا دور کے قارئین کو یوم آزادی کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ۱۵؍اگست ۱۹۹۶ء کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ہم آزادی کی نصف صدی کی تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں میں ملک نے غیر معمولی ترقی کی ہے جہاں ایک سوئی بھی نہ بنتی تھی وہاں اب ایٹمی توانائی کے ری ایکٹر کام کر رہے ہیں۔ عام آدمی پچاس برس قبل ٹی وی، فریج اور گیس سلنڈر کے نام سے بھی واقف نہیں تھا، لیکن اب یہ اشیاء ہر شہری زندگی کا لازمہ بن چکی ہیں۔ دیہاتوں میں جگہ جگہ آب پاشی کا نیا طریقہ رائج ہے اور کھاد اور پیداوار کے دیگر جدید طریقے موجود ہیں جن کا آزادی سے قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سماج میں بھی عدم مساوات کا خاتمہ ہوا اور بڑی حد تک سماجی انصاف کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں ان سب عوامل کی بنا پر آج ساری دنیا میں ہندستان ایک اہم طاقت بن کر ابھر رہا ہے اور دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت کا وقار بلند ہو رہا ہے۔

یہ سارے پہلو بہت روشن اور تابناک ہیں۔ آج کے دن ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ آبادی میں زبردست اضافے کی وجہ سے ہر روز نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ پچاس برس قبل ملک کی آبادی چالیس کروڑ (بشمول پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش) تھی۔ اب یہ آبادی ایک ارب سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ملک میں گزشتہ چند برسوں میں بڑی تیزی سے اخلاقی قدروں کا زوال ہوا ہے اور انھیں اقدار میں سے ایک اہم قدر عدم تشدد کی ہے جس کی اصطلاح کو تقریباً فراموش کیا جا چکا ہے اور دہشت گردی کا اور تشدد کا رجحان عوام میں بڑھ رہا ہے۔

اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ۱۵؍اگست کی تاریخ میں جشن مناتے ہوئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ پورے ملک سے ناخواندگی دور کرنے اور سماج میں برابری لانے کے لیے پورے طور سے کوشش کریں گے اور ملک میں دہشت گردی اور تشدد کے رجحان کو ختم کرنے کے لیے مہاتما گاندھی کے پیغام کی تجدید کرتے ہوئے اس کی اشاعت کریں گے۔

ہمارا عظیم وطن اپنی شاندار سنہری تہذیبی روایات کی بنا پر ساری دنیا میں سربلند رہا ہے اقبال نے سچ کہا تھا ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

تو آئیے! آج کے دن ہم سب قومی پرچم کو سلام کرتے ہوئے جنگِ آزادی کے شہیدوں کی یاد میں سر جھکاتے ہوئے یہ عہد کریں کہ ہم اور وطن کے وقار، سالمیت، سربلندی اور خوش حالی کے لئے جدوجہد کرتے رہیں گے۔

——— ایڈیٹر

آزادیِ وطن

۱۵ / اگست ۱۹۹۶ء

آزادیِ وطن کا جو چرچا وطن میں ہے
خوشبو کھِلے گلاب کی سارے چمن میں ہے

ہیں دل کے حوصلے کہ ہمالہ کی چوٹیاں
بجلی کی کوئی رَو ہے، جو ہر جان و تن میں ہے

آنکھوں کی پُتلیاں ہیں، کہ روشن چراغ ہیں
سینے میں دل ہے، یا کوئی آہوِ ختن میں ہے

پاکیزگی ہواؤں کی، موجِ خیال میں
پانی میں وہ نشہ، جو شرابِ کُہن میں ہے

شوخی ہوا کی، اور یہ برگ و شجر کے ساتھ
اک تھرتھری سی جیسے کہ سارے بدن میں ہے

نظروں سے پھُوٹتی ہے کرن آفتاب کی
خوشبو جو یاسمن میں ہے، ہر پیرہن میں ہے

دھرتی میں بوڑھی ماں کا نِسرا قدم سبھاؤ
ممتا کی ہے سُگندھ، جو دشت و دمن میں ہے

اس کا بھی ہاں خیال ضروری ہے دوستو
کچھ خون بھی شہیدوں کا شامل چمن میں ہے

چکھّے ہیں ہم نے دار و رسن کے بھی کیا مزے
اللہ رے ذائقہ کہ جو کام و دہن میں ہے

صحنِ چمن میں سرو پہ جاتی ہے جب نظر
لگتا ہے کوئی ویر کھڑا جیسے رن میں ہے

بِن اُنگلیوں کے چھیڑے نج اٹھتے ہیں دل کے تار
گلشن میں ہے جو گونج وہی سارے بن میں ہے

ہر بُوالہوس کے جام اُجالوں سے ہیں بھرے
اب چاند ہے گہن میں نہ سُورج گہن میں ہے

پنہاں میں کچھ عیاں ہے عیاں میں نہ کچھ نہاں
کچھ اس بلا کا قُرب سکوت و سخن میں ہے

بات اپنی بس عمرؔ یہی کہہ کے تمام کر
تہوار آج سب سے بڑا یہ وطن میں ہے

عمرؔ انصاری
۲۰- امین آباد پارک، لکھنؤ- ۱۸

خودنوشت

م۔م۔راجندر

۶۸۰، چترودہار، دہلی ۱۱۰۰۹۲



تعارف نامہ

مختصر ہو یا طویل، خودنوشت سوانحی خاکے میں ایک خطرہ جو لاحق ہوتا ہے وہ خودستائی اور خودنمائی کا ہے۔ آپ اپنا دامن کتنا بھی بچائیں اور کئی باتوں سے کنی بھی کاٹ جائیں مگر اس سے مفر ممکن نہیں۔ اس کی ایک سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ آپ کو صیغۂ متکلّم میں اپنی اور اپنے خاندان کی ناکامیوں اور حصولیابیوں کی داستان رقم کرنی ہوتی ہے اور آپ کوشش کے باوجود اس چکنے فرش پر پھسلنے سے نہیں بچ سکتے جسے اَنا اور خودپسندی از خود تعمیر کر دیتی ہے۔ اپنے مختصر بائیوڈاٹا یا تعارف نامے میں بھی، جو ہم ادیبوں کو تیار کر کے رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ اکادمیاں اور ثقافتی ادارے اسے طلب کرتے رہتے ہیں، اس پہلو سے دامن بچانا بڑا مشکل ہوتا ہے کہیں تو مشکل اور نہ کہیں تو واقعات بلکہ بسااوقات حقیقت سے روپوشی ہوتی ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ سوانح عمری تو حکمرانوں اور سیاست دانوں، مدبّروں اور سائنس دانوں کی ہونی چاہیے، خواہ وہ خودنوشت ہو یا دوسرے اسے قلم بند کریں۔ ہم آج کے دَور کے ادیب اور شاعر تو دوسروں کی مانند عام انسان ہوتے ہیں اور عوام کو ان کے حالات زندگی میں کیا دل چسپی ہوگی۔ بہرکیف ادیب کی اپنی زندگی، محسوسات اور فلسفے کا نچوڑ تو' ایک پوری جماعت اور طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے، اس کی تخلیقات میں مستور بلکہ ان سے مترشح ہوتا ہے۔

اس کمترین نے انبالہ چھاؤنی میں ۱۲ر اگست ۱۹۲۳ء کو ایک ذی علم کائستھ گھرانے میں آنکھ کھولی اور عمر اب بہتّر سال سے تجاوز کر گئی ہے میں اپنے والدین کا پانچواں بیٹا تھا اور انھوں نے میرا نام مدن موہن لعل رکھا تھا اور یہی میرا اصل نام ہے۔ ہمارا کنبہ کافی بڑا تھا۔ میری پیدائش کے بعد بھی میری ایک بہن اور تین بھائی پیدا ہوئے یعنی ہم ایک بہن اور آٹھ بھائی تھے۔ ان میں سے تین بھائی، دو بڑے اور ایک چھوٹا فوت ہو گئے ہیں۔ میرے دادا منشی برج لال جنھیں ہم باباجی کہا کرتے تھے، اُردو اور فارسی کے اچھے معلّموں میں شمار ہوتے تھے اور ان کی سارے انبالہ میں بڑی عزّت تھی۔ میرے والد محترم آنجہانی شری جگ موہن لال بھٹناگر، ان کی واحد اولاد تھے۔ وہ پرانے زمانے کے گریجویٹ تھے اور آر' ایم' ایس میں انسپکٹر تھے، جو اُن دنوں کافی بڑی ملازمت تھی۔ مگر میری پیدائش سے تقریباً دس سال پہلے انھوں نے اس ملازمت کو چھوڑ کر بزنس کرنے کی ٹھان لی۔ ان کے اس اقدام کی تمام گھر والوں، جملہ رشتہ داروں اور احباب نے مخالفت کی تھی مگر انھوں نے کسی کی نہیں سُنی اور ملازمت سے استعفا دے دیا۔

ان کا ارادہ پہلے انبالہ اور پھر پنجاب کے دوسرے بڑے شہروں میں انگریزی کے جدید چھاپے خانے قائم کرنے کا تھا، اس کے لیے بہت بڑے سرمائے کی ضرورت تھی جو ان کے پاس نہیں تھا۔ مگر باباجی کا بہت رسوخ تھا اور وہ تھے بھی شرافت کے پُتلے۔ والد صاحب نے ان کی مدد اور توسط سے شہر کے بنیوں اور ساہوکاروں سے ایک لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم پرونوٹ لکھ کر سُود پر لے لی۔ پھر وہ اتر پردیش میں سکندرآباد گئے اور اونے پونے داموں میں اپنے بزرگوں کی جائداد میں حصّہ اور اپنے باغات وغیرہ بیچ آئے۔ ان کے پاس اب اتنا سرمایہ تھا جو آج کے کم سے کم پچاس ساٹھ لاکھ روپے کے برابر ہوگا۔ انھوں نے ولایت سے مشینیں منگوا کر ہمارے سب سے بڑے بھائی برج بھوشن لعل کے نام پر بھوشن الیکٹرک پریس قائم کر دیا جو انبالہ کا سب سے بڑا جدید پریس تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک اینگلو انڈین مینیجر بھی رکھا۔ کام اتنا آیا اور اتنی تیزی سے بڑھا کہ دو تین سال میں ہی ہمارا شمار شہر کے ممتاز اور دولت مند گھرانوں میں ہونے لگا۔ ہماری اپنی دو گھوڑوں کی بگھی تھی۔

سارے انبالے میں اس وقت، انگریز افسران کو چھوڑ کر، دو تین سے زیادہ کاریں نہیں تھیں مگر والد صاحب بھی ولایت سے کار منگوانے کی سوچ رہے تھے۔ رجمنٹل بازار کی سب سے کشادہ سڑک پر ہماری اپنی دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر ہماری رہائش تھی اور نیچے کی منزل میں پریس تھا۔

میرے والد بہت زیادہ کھانے پینے والے آدمی تھے اور لوگ انھیں انگریزی میں 'شراب کا یونانی دیوتا' کہا کرتے تھے۔ انھوں نے پریس کے معاملات میں ذاتی طور سے بہت کم دلچسپی لی اور کوئی نگرانی بھی نہ رکھی۔ وہ شروع سے ہی بہت خرچیلے تھے اور دوستوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے، ذرا ذرا سی بات پر پُرتکلف پارٹیاں کر ڈالتے تھے، بزنس کی تمام باگ ڈور اینگلو انڈین منیجر کے ہاتھ میں دے رکھی تھی جو غیر دیانت دار بھی تھا۔ نتیجے میں جس تیزی سے کاروبار بڑھا تھا اسی تیزی سے کم ہوتا گیا۔ بزنس شروع کیے ہوئے ابھی مشکل سے سات سال ہی ہوئے تھے کہ سارا کام چوپٹ ہو گیا۔ قرض خواہوں نے گھبرا کر چکر لگانے شروع کر دیے، کورٹ میں نالش کر دی اور ستمبر ۱۹۲۶ء میں والد صاحب چار لاکھ سے اوپر کی رقم کے دیوالیے قرار دیے گئے اور ان کے خلاف قرقی کی ڈگری دے دی گئی۔ تین دن تک سرِ عام مشینوں، دوسرے سامان، مکان، بگھی حتیٰ کہ ماں کے زیورات تک کی کورٹ اور پولیس کے آدمیوں کی نگرانی میں نیلامی ہوتی رہی۔ ان دنوں کسی کا دیوالہ نکل جانے کا مطلب اس کی اور اس کے خاندان کی عزت کی نیلامی بھی تھا۔

یہ سب کچھ میری پیدائش کے تین سال بعد ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ اگرچہ میں صرف تین سال کا تھا مگر مجھے ابھی تک نیلامی کا وہ سارا منظر یاد ہے۔ صرف ہمارے پہننے کے کپڑے، چند برتن اور کچھ صندوق جن میں کچھ پرانا سامان بند تھا، چھوڑ دیے گئے تھے۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور چارپائیاں وغیرہ جن کی بولی نہیں لگی پولیس اور کچہری کے قرقی کرانے والے آدمی لے گئے تھے۔ ہمیں ہماری بلڈنگ کے خریدار نے اوپر والی منزل کو خالی کرنے کے لیے پندرہ دن کی مہلت دے دی تھی۔

ہم پندرہ دن کے اندر ہی بنگالی محلے میں ایک دو کمروں کے کچے مکان میں جس میں نل اور بجلی بھی نہیں تھی مگر کرایہ صرف چار روپے تھا، منتقل ہو گئے۔ اب ہمارا گزارے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ اس محلے میں کچھ رشتہ دار رہتے تھے مگر ہر روز کسی کی کون مدد کرتا۔ باباجی بھی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے اور اس زمانے میں ماسٹر کی پنشن نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہ بوڑھے اور کمزور ہونے کے باوجود پست ہمت نہیں تھے انھوں نے جمن بازار میں ہی ایک کمرہ تین روپے ماہوار کرایے پر لیا اور اس میں بچوں کا ایک اسکول کھول دیا۔ کھلے موسم میں وہ اپنی کلاس سڑک کے پار میدان میں لگا لیتے اور بارش ہونے کی صورت میں بچے کمرے میں جوں توں کر کے بیٹھ جاتے۔ باباجی چھاتہ ہاتھ میں لے کر صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتے اور دو میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے اپنے اسکول پہونچ جاتے اور شام کو پانچ بجے سے پہلے نہ لوٹتے۔ کسی بچے سے دو آنے اور کسی سے چار آنے فیس لیتے تھے اور کچھ بچے فیس ادا کرنے کی حیثیت میں بھی نہیں ہوتے تھے۔ بچے کے داخلے کی تاریخ سے اس کی فیس کی ادائگی کی تاریخ طے ہوتی تھی۔ باباجی کو اس طرح تقریباً ہر روز ہی کبھی چار آنے کبھی آٹھ آنے اور کبھی روپیہ تک مل جاتا تھا۔ گھر میں اسی سے روٹی چلتی تھی۔ بابوجی یعنی میرے والد اِدھر اُدھر سے اُدھار بھی لیتے رہتے تھے۔ مجبوری میں ماں اڑوس پڑوس کی عورتوں سے، جو غریب ہونے کے باوجود فراخدل تھیں، آٹا وغیرہ اُدھار لے لیتی تھی۔ خدا وہ مصیبت کے دن کسی کو نہ دکھائے جو ہم نے سالہاسال دیکھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات گھر میں روٹی بھی نہیں بنتی تھی اور ماں صرف آلو یا کوئی اور چیز اُبال کر اور نمک لگا کر ہم بچوں کو کھلا دیتی تھی۔ بابوجی نے پریس کی نیلامی کے بعد پھر زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا۔ ان کے خوش گوار موسم کے دوست ان سے کنی کاٹ چکے تھے اور ان کی صحبت میں اب صرف دو تین ایسے آدمی تھے جو ان سے بھی زیادہ نادار اور قلاش تھے اور ان سے ہی دونّی چونّی مانگتے رہتے تھے۔

والد صاحب اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جانے کیا کیا کر کے، کس کس سے مانگ کر وہ ہم بچوں کو پڑھاتے رہے۔ اگرچہ بلاشبہ ہمارے نام اسکول سے فیس کی نادائیگی کے سبب بار بار کٹتے رہے اور کبھی کبھی سارا سال بھی ضائع ہو گیا۔ آج سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے کیسے اپنے آٹھ بیٹوں اور ایک بیٹی کو پال پوس کر بڑا کیا اور سخت نامساعد حالات میں کالج کی اعلا تعلیم بھی دلوا دی۔

میں ابتدا سے ہی بہت سوچنے والا سنجیدہ مزاج لڑکا تھا۔ اسکول میں ہمیشہ میری اُردو، فارسی اور انگریزی غیر معمولی طور پر اچھی رہی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ قدرت کی دین تھی کیوں کہ میں تو پڑھتا بھی نہیں تھا اور درسی کتب سے جی چُراتا تھا۔ جب بارہ تیرہ سال کا تھا تو مجھ میں دو شوق ابھر آئے۔ ایک اُردو کے دستیاب جاسوسی ناول پڑھنے کا اور دوسرا اداکاری کا۔ تنہائی میں میں اپنے ہی دماغ سے گڑھے ہوئے مکالمے بولتا جو رنج و غم میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ میرے ہم عمر ناپختہ دوست کہا کرتے تھے کہ میں ایک بڑا اداکار بنوں گا۔ جاسوسی ناولوں کے پڑھنے کے شوق سے جُڑا ہوا ایک خبط یہ سوار ہوگیا کہ ان کے ابواب کے پسندیدہ ٹکڑوں کو اپنے ہاتھ سے کسی کاپی میں لکھ کر اس کاپی کو لائبریری کی کتاب کی طرح حفاظت سے رکھنے لگا۔ میرا خط شروع سے ہی باریک مگر کاتب کے خط کی طرح خوبصورت تھا۔

میں نے ۱۹۴۱ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کرلیا، ایک دن بابوجی مجھے کچھ بتائے بغیر اپنے ساتھ چھاؤنی کی طرف ایک کوٹھی میں لے گئے۔ گیٹ پر "خورشید الاسلام چیف انجینئر" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بابوجی اندر چلے گئے، صاحب سے ملے اور مجھے ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے بولے کہ یہ لڑکا بڑا ہوشیار ہے۔ اگر آپ کی کچھ عنایت ہوجائے اور مدد مل جائے تو یہ کالج میں پڑھ سکے گا۔ انھوں نے بابوجی کی ساری بات سنی، مجھ سے دو ایک سوال پوچھے اور اسی وقت میرے ابتدائی اخراجات کے لیے پچیس روپے نقد اور دو سال کے لیے میرا پندرہ روپے مہینہ وظیفہ مقرر کردیا جو مجھے باقاعدگی سے ملتا رہا۔ اس روز میں بہت اُداس اور بے چین رہا اور بابوجی کا جو ایک زمانے میں خود اتنے امیر تھے، میرے لیے کسی کے آگے یوں گڑگڑا کر ہاتھ پسارنا بالکل اچھا نہیں لگا، مگر کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عمر کی مختلف منزلوں میں اس بارے میں جب بھی سوچا تو ان کی عظمت کے آگے میرا سر جھک گیا۔

ہمارے آباد اجداد کب اور کن حالات میں اتر پردیش سے ہجرت کرکے پہلے رہتک اور پھر انبالے آبسے تھے، نہ میں نے کبھی جاننا چاہا اور نہ کسی نے مجھے بتایا۔ مگر چونکہ میری پیدائش اور تعلیم پنجاب میں ہوئی، قدرتی طور پر 'پنجابیت' مجھ میں سرایت کر گئی۔ میں نے اکثر یہ چاہا ہے کہ کاش میں اپنے وطن عزیز کے ہر صوبے میں رہ سکتا اور وہاں کے لوگوں کی زبان اور طور طریقے سیکھ سکتا۔!

وقت کہاں سے کہاں سرک گیا ہے۔ ہماری زندگیوں کا وہ الم ناک باب کب کا ماضی کی گود میں سما چکا ہے۔ نئے مواقع سامنے آئے اور ہم سب بھائی اور بہن ترقی کرتے چلے گئے۔ آج ہم کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ جب آرام اور آسائش کے دن لوٹے تو والدین راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔ رب العزت اتنا رحیم اور کارساز ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ جب میری شادی اس وقت کی ادیبہ رانی بھٹناگر سے ۱۹۴۹ء میں ہوئی تو میں صرف ایک چارپائی چند کپڑوں اور چند برتنوں کا مالک تھا مگر افسانہ نگار کے طور پر بہت شہرت تھی۔ شمع والوں نے دو ہزار روپئے دے کر میرے ناول "آگ اور دُھواں" کے جملہ حقوق خرید لیے اور حکومت ہند نے ساہتیہ منڈل کے توسط سے مجھ سے گاندھی جی کی سوانح عمری کا اُردو میں ترجمہ کرالیا اور تین ہزار روپئے اس کے مل گئے۔ ان روپوں سے شادی ہوگئی۔ مگر فضل ربّی دیکھیے کہ ۳۵، ۳۴ سال کی عمر ہونے سے پہلے ہی ساری آسائشیں نصیب ہوگئیں! میں سرکاری ملازم بھی تھا اور انڈین ایرفورس کے جوائنٹ ڈائرکٹر پرسنیل (آفیسرز) کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ میں نے کئی بیرونی ممالک کا سفر بھی کیا ہے۔

پڑھنا لکھنا ہمارے خاندان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ اس ہیچمدان نے انگریزی اور اُردو دونوں ادبیات میں ایم اے کیا ہے اور فارسی کی آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ میری ہمشیرہ شکنتلا سریواستو ہندی کی مشہور و معروف ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ چھوٹے بھائی آئی۔ ایم۔ لال پنجاب میں ڈسٹرکٹ گزیٹیرز کے ایڈیٹر اور انگریزی کے مشہور مصنف تھے جن کی امریکہ میں چند سال ہوئے قبل از وقت موت ہوگئی۔ ایک اور چھوٹے بھائی جے موہن لال بھٹناگر دلّی میں انگریزی کے صحافی اور مشہور انگریزی رسالے "سی انڈیا" کے مالک ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر دِجے موہن وَشِشٹھ نے کافی عرصے تک اُردو میں افسانہ نگاری کی، اور اب بھی کبھی کبھار کوئی افسانہ لکھ کر کسی رسالے کو بھیج دیتے ہیں۔ انھیں سائنس نے کھینچ لیا۔ وہ کینیڈا میں مقیم ہیں اور ان کا شمار آفاقی سطح پر

چوٹی کے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔

میرے دونوں بچپن کے شوق پورے ہو گئے۔ میں نے ایک فلم میں آنجہانی پرتھوی راج کپور کی مدد سے ایک سولہ سالہ لڑکے کا پارٹ بھی کیا اور بعد میں ریڈیو کے بہت سے ڈراموں میں بھی اداکاری کی۔ مگر یہ شوق ۱۹۵۰ء/ میں ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب میری طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئی تھی تو میں نے اپنا قلمی نام ن.م. راشد کے تتبع میں م.م. راجندر رکھ لیا تھا۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۴۲ء میں ہی جب میں کپورتھلہ میں ایف۔اے کا طالب علم تھا، لاہور کے مشہور اور مقبول عام فلم ویکلی "چترا" میں چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل خدمتِ ادب میں لگا ہوا ہوں اور ادبی زندگی نصف صدی سے اوپر ہو گئی ہے میں نے جلد ہی چوٹی کے ادبی رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا اور برصغیر کا شاید ہی کوئی بلند پایہ ادبی رسالہ ہو جس میں میرے افسانے یا مضامین نہ شائع ہوئے ہوں۔ 'ہمایوں' اور 'ادب لطیف' جیسے رسائل میں میری روشناسی خان بہادر میاں عبدالعزیز فلک پیما کی مرہونِ منت ہے جو ۱۹۴۲ء میں کپورتھلہ ریاست کے چیف منسٹر تھے اور اُردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے۔

اگرچہ میری شناخت ایک افسانہ نگار کے طور پر ہے تاہم میں نے بجز شعر گوئی ہر صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ تنقیدی اور علمی نوعیت کے مضامین تو میں شروع سے لکھتا آیا ہوں، مگر الکٹرانک میڈیا کے لئے بہت سے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ میں اب تک ریڈیو اور ٹی۔ وی پر تین سو سے زائد ادبی پروگراموں اور بحثوں میں حصّہ لے چکا ہوں جو شاید ایک ریکارڈ ہو۔ میں نے عورتوں اور بچّوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے اور مزاحیہ مضامین اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ چونکہ میرے پڑھنے والوں نے میرے افسانوں کے علاوہ میری دوسری تحریروں کو بھی پذیرائی بخشی ہے اور ان کی بھی مانگ رہتی ہے۔ میں اپنے فن کی ہمہ جہتی کو بھی اسی رب العالمین کی بخشش اور کرم سے منسوب کرتا ہوں۔

میں کسی بھی تفریق اور امتیاز بشمول مذہبی، علاقائی، قومی اور نسلی میں یقین نہیں رکھتا۔ میں عالمی سطح پر امن، مفاہمت اور بھائی چارے کے نصب العین میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ میں تو انسانوں اور خدا کی دوسری مخلوقات بالخصوص حیوانات کے مابین "جیو اور جینے دو" کے اصول کے کاربند ہونے میں سمجھدار انسان کے پہل کرنے کا منتظر ہوں۔ میرا ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی میں اعتقاد راسخ ہے اور میں فرقہ پرستی کا دشمن ہوں۔ اپنے افسانوں اور دوسری تحریروں میں میَں اسی پیغام کو سمونے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

آخر میں بصد عجز وانکسار اپنی تصنیفات اور سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے اس ناچیز کی حوصلہ افزائی کی چند ضروری تفصیلات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

تصنیفات

۱. نقوش (افسانوی مجموعہ۔ لاہور ۱۹۴۵ء)
۲. کھوکھلے ابنار (افسانے)
۳. آگ اور دھواں (ناول)
۴. آکاش گنگا (کچھ مشہور افسانوں کا ہندی ترجمہ)
۵. روشنی کے مینار (افسانے)
۶. زندگی کا رقص (افسانے)
۷. ایک دھنش، سات رنگ (قومی یک جہتی کے موضوع پر کچھ افسانوں کا ہندی ترجمہ)
۸. باجی راؤ پیشوا اور مستانی (ڈرامے)
۹. رنگ محل (افسانوی مجموعہ)
۱۰. ایک لڑکی سپنوں کی (افسانے)
۱۱. گنگو دادا کا اسکول (ہندی افسانے)

تراجم

۱. ماں (کارل چاپیک کا ڈرامہ انگریزی سے اُردو میں برائے غالب انسٹی ٹیوٹ)
۲. آنندو رام بروا (مشہور آسامی سنسکرت اسکالر کی سوانح حیات برائے ساہتیہ اکادمی)
۳. اچھوت (ملک راج آنند کے شہرۂ آفاق ناول کا اُردو ترجمہ برائے ساہتیہ اکادمی)
۴. آتم کتھا (گاندھی جی کی مختصر سوانح عمری کا اُردو ترجمہ برائے حکومت ہند ۱۹۴۸ء)

(باقی ص ۴۱ پر)

علی جواد زیدی
۱۸۶ وشواس کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

یادوں کی رہ گزر

امین آباد اور لکھنؤ یونیورسٹی (۲)

ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی جناب علی جواد زیدی کی یادوں اور یادداشتوں پر مشتمل اِس سلسلے کی پہلی قسط اودھ نمبر حصّہ دوم (اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء) میں شائع کی جاچکی ہے۔ ــــــ ایڈیٹر

طلباء کی منظم تحریک کی ابتدا لکھنؤ یونیورسٹی ہی سے ہوئی تھی اس لیے یہ قوم کی نوجوانی اور ترقی پسندی کا محوری نقطہ بن گئی تھی اور طلبار کے حلقوں میں اس کی یہ حیثیت غیر رسمی طور پر تسلیم بھی کی جاتی ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی ترقی پسند عناصر نمایاں تھے، دوسرے عناصر بھی موجود تھے جو کھل کے مخالفت تو نہیں کرتے تھے مگر لکھنؤ کے فنی اور لسانی تفوق کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ اُردو اور ہندی ہی نہیں، انگریزی، فارسی اور عربی میں بھی ایسی ہستیاں تھیں جن کی انفرادی پہچان تھی۔ ان میں سے چند حضرات سے آپ متعارف ہوچکے ہیں۔ یہی حال کھیل کود کی دنیا میں بھی تھا اور عملی سیاست میں بھی یہاں کے طالب علموں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کے حصّہ لیا اور آزادیِ وطن کی خاطر قربانیاں دیں۔ اسی پہلو پر کچھ اور روشنی ڈالنا قرینِ انصاف اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے ضروری ہے۔

لکھنؤ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پہلا اجلاس یہیں ہوا اور پھر اس کا مستقل صدر دفتر بھی یہیں بن گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے چند دنوں تک یہ دفتر گنگا پرشاد ورما ہال کی بالائی منزل پر رہا اور پھر اسی سے ملحق پریم نرائن بھارگو کے مکان سے ملے ہوئے ایک کمرے میں منتقل ہوگیا۔ جہاں روزانہ شام کو تحریک کے فعال افراد جمع ہوجاتے تھے۔ طلبار کی کانفرنسیں ہوتی رہتی تھیں۔ شہر، ضلع، صوبہ کی سطح پر مختلف کانفرنسیں ہوتیں اور عام طور سے ان کے اجلاس قریب کے گنگا پرشاد ہال میں ہوتے تھے۔ احتجاجی جلسے یا عام سیاسی تقریریں سامنے کے امین الدولہ پارک میں (جسے جھنڈے والا پارک کہا جاتا تھا) ہوتی تھیں یا پھر امین آباد پارک میں۔ قدیم لکھنؤ کے یہ نظر نواز اور دل فریب سبزہ زار آہستہ آہستہ تباہ ہوگئے۔

امین الدولہ پارک کی تاریخی اہمیت ہے کہ یہاں سامراج کے رُعب اور طاقت کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی جگہ قومی پرچم لہرایا گیا۔ آزادی کے پہلے کا پرچم جس پر بیچ میں اشوک چکر کی جگہ چرخہ ہوا کرتا تھا۔ لہرانے والوں میں موہن لال سکسینہ کا نام لیا جاتا ہے جو پارک کے سامنے ہی رہتے تھے اور آزادی کے بعد مرکزی حکومت میں وزیر بھی ہوئے۔ پہلے یہ پرچم لہراتے وقت قومی ترانہ نہیں گایا جاتا تھا بلکہ ایک سادہ آسان زبان میں گیت تھا: "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی نقش ہوکر رہ گئی ہے کہ بمبئی کے مشہور قوم پرور انگریزی روزنامہ "بمبئی کرانیکل" میں ۱۵ر اگست ۱۹۴۰ء کو یہی شاہ سرخی شش کالمہ شائع ہوئی تھی "ZANDA UNCHA RAHE HAMARA"۔ امین الدولہ پارک میں لہرایا جانے والا جھنڈا برطانوی نگاہوں میں فوراً کھٹکا، سامراجی عتاب

میں اسے ہٹا دیا گیا۔ پرچم بلند ہوتا اور ہٹتا رہا۔ آخر میں حکومت نے ہار مان لی۔ یہی علاقہ سابق وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا کا بھی مرکز کا رتھا ان کی گرفت شہر لکھنؤ کی سیاست پر بہت مضبوط تھی۔ وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے مگر کٹر ہندی پرست تھے اور یونیورسٹی کی انتظامیہ میں بھی خاصا دخل تھا۔ وہ زندگی بھر مجرّد رہے۔ لیکن ان کا سیاسی اور سماجی کنبہ خاصا بڑا۔ ضلع لکھنؤ کی سیاست میں ان کے حریف بابو ترلوکی سنگھ تھے جو گاندھیائی تھے اور رفیع صاحب کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ ان کو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بلرام سنگھ "بچّو دا" کہتے تھے۔ بلرام سنگھ چھوٹے بھائی تھے اور سوشلسٹ ہونے کے باوجود بھائی کی حمایت میں ضلع اور شہر کی سطح پر گپتا جی کے مخالف ہو جایا کرتے تھے۔ بلرام سنگھ بڑے مجلسی، سچّے دل سے سیکولر اور آئینی داؤں پیچ میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ طلباء کے کمیونسٹ حلقوں میں وہ EVIL GENIUS (طاغوتی عبقری) کہے جاتے تھے۔ مدّتوں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سیاست پر چھائے رہے اور آخر میں ترلوکی بابو کے قائم کیے ہوئے کئی اسکولوں اور کالجوں کی دیکھ بھال میں وقت گزار کر گھسیاری منڈی کے مکان میں آخری سانسیں لیں۔ یہ اور ترلوکی سنگھ دونوں ہی گپتا جی کی طرح تجرّد کی زندگی بسر کرتے رہے۔

ہاں تو اسی امین الدولہ پارک کے ارد گرد طالب علموں کی تحریک کے مراکز جنگِ آزادی کے دنوں میں بڑی ہماہمی اور سرگرمی کے عینی شاہد رہے ہیں۔ آزادی کے بعد ان دونوں پارکوں کی شکلیں پہچانی نہیں جاتی تھیں اور ان کی فکری فضا تو دور دُور تک نظر نہیں آتی۔

۱۹۳۶ء میں منظم طلباء کی تحریک شروع ہو گئی تھی اور تبھی سے میں اس اُبھرتے ہوئے دائرے میں پھاند پڑا اور گہرائیوں تک ڈوبتا چلا گیا۔ گھر والے خلاف تھے، پرانے دوست احباب مخالفت کرتے تھے۔ بڑا حلقہ مسلم لیگ میں شامل تھا یا حکومت دوست تھا۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ بہت کچھ جھیلا اور اس پر ہرگز نادم نہیں ہوں۔ نمود و نمائش سے دُور رہا۔ لیکن جو کام کرتا ہے اس کا کام تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ "یہ دُھن کا پکّا اور فکر و عمل کا سچّا ہے۔ اسے مانو یا رد کر دو، یہ اپنی ڈگر سے ہٹنے والا نہیں"۔ ان سرگرمیوں کا اثر پڑھائی پر بھی پڑا اور فرسٹ ڈویژن سے اچھے سکنڈ ڈویژن پر آکر رک گیا۔ بعض وقت دل محسوس کرتا ہے کہ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے سہارا دیے ہوئے تھی ورنہ درسیات سے غیر معمولی بے پروائی کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں مسلسل فیل ہوتا چلا جاتا۔ عام طور سے آخری دو تین ہفتے تک کی پڑھائی ہوتی، وہ بھی سیاست کی بے رحم دخل اندازی کی وجہ سے مسلسل نہ ہو پاتی۔ اس منظر نامے میں امین الدولہ پارک اور امین آباد پارک کا بڑا حصہ ہے اور میرے جُرم میں دونوں شریک غالب ہیں۔

امین الدولہ پارک کا ذکر زیادہ رہا لیکن امین آباد پارک کا بھی حصّہ طالب علموں کی تحریک اور عام ثقافتی اور تہذیبی مشاغل میں کم نہیں تھا۔ دونوں ہی جگہ بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، بڑے بڑے جلوس یہاں آکر بھی تھمتے اور پھر تقریریں ہوتیں، نعرے بلند ہوتے، آل انڈیا نوعیت کے بڑے مشاعرے بھی ہوتے۔ اس میں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے اسی کے نیچے اسٹیج بنتے، تخت اور پھر اوپر دریاں اور کرسیاں بعض ہندستان گیر شہرت کی مالک ہستیاں جب یہاں تقریر کرنے آتیں تو پارک چھلک اٹھتا اور مجمع ارد گرد کی سڑکوں تک پھیل جاتا۔ ایک گوشے میں تاریخی مندر ہے جو چودھری خلیق الزماں کی میونسپل بورڈ کی چیئرمینی کے زمانے میں اور ان کی حمایت سے بنا۔ اس پر کسی زمانے میں جو بنیادی پتھر نصب تھا اس پر اُن کا نام بھی کندہ تھا۔ وہ مسلم لیگ میں تو بہت بعد میں گئے۔ پارک کے دوسرے سرے پر ہرا بھرا سبزہ زار تھا جس پر شام کو نماز جماعت ادا ہوتی تھی۔ تقسیم کے بعد جو تارکینِ وطن انتہائی پریشانی کی حالت میں پاکستان سے آئے انھوں نے پہلے امین آباد کی سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی پٹری والی دوکانیں لگائیں لیکن اب اس سرے پر کپڑوں کا بہت بڑا بازار ہے جس میں دو روپیہ سہ روپیہ دوکانیں ہیں۔ غرض ان مشہور سیرگاہوں کا نقشہ ہی بدل چکا ہے اور بڑے جلسوں، جلوسوں اور ریلیوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے حضرت گنج کے وسیع پارک کو جو شاہانِ اودھ کی فطرت دوستی کی یادگار تھا۔ نام تو اب حضرت محل پارک ہے لیکن ان کا مجسمہ قدامت پرستوں کی مخالفت کے ڈر سے نصب نہیں کیا گیا۔ اب ایسا بھی کیا ڈرنا۔ مختصر یہ کہ شہر میں ایسی جگہ تقریباً نایاب ہے جہاں نوجوان اور ادھیڑ عمر والے سیر و تفریح کو جا سکیں۔ شاید اب نہ تفریح کا حوصلہ ہے اور نہ سیاست کی مادی

ہوئی قیادت کو اس کی فکر ہے! دکھ ہوتا ہے کہ یہ ثقافتی اور تاریخی تاریخی آزادی کے بعد بھی ہوئی ہے۔ امین الدولہ پارک کے نیچے شاید زمین دوز کار پارکنگ بننے جا رہی ہے۔ آنکھوں کو سب سے زیادہ کھٹکنے والا منظر ان پولیس چولداریوں کا ہے جو اب مستقل طور سے پارک کے ایک گوشے میں نصب کر دی گئی ہیں۔

یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں اس وقت یہ دونوں پارک تفریح گاہ سے زیادہ سیاست کی آماجگاہ تھے۔ جہاں ہندستان کے چوٹی کے لیڈر اور مشہور خطیب اپنی خطابت اور دیدہ وری کے جوہر دکھاتے تھے۔ ان میں اس دور کے مشہور خطیب مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے ایک جلسے کا منظر تھا کہ ایک طرف شاہ صاحب کی تقریر دلوں کو گرما رہی تھی تو دوسری طرف لکھنؤ کے سامعین کے شوقِ خطابت اور ذوقِ سماعت کو زوروں کی بارش آزمانے لگی، لیکن ہمارے ہنر دوست اور ادب نواز لکھنوی مجمع کی اکثریت محویت کے عالم میں تقریر سنتی اور دادِ تحسین کی آوازوں اور تالیوں کی گونج سے مقرر کو گویا "مکرر ارشاد" کہتی رہی۔

جلسہ ہائے عام کا ذکر چل رہا ہے تو لگے ہاتھوں دو عظیم جلسوں کا بھی بارے کچھ بیاں ہو جائے۔ یہ دونوں جلسے لکھنؤ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے منعقد ہوئے۔ فیڈریشن کے صدر کی حیثیت سے ان سے میرا راست تعلق تھا۔ بہت کم نوٹس پر اطلاع ملی کہ مسز وجے لکشمی پنڈت جیل سے رہا ہو کر آئی ہیں۔ فوراً ان سے رابطہ قائم کر کے ان کی رضامندی حاصل کی گئی۔ فوری ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی کا انتظام کیا گیا، لاؤڈ اسپیکر مہیا کیا گیا اور نوجوان احراری لیڈر عبدالرشید سے اعلان کرنے کو کہا گیا۔ وہ سارے پرانے لکھنؤ کا چکر لگا کے لوٹے تو اب حضرت گنج اور یونیورسٹی میں اعلان کرنا باقی تھا۔ یونیورسٹی میں مختلف طالب علم لیڈروں سے رابطہ قائم کر کے ان کے ذمے ہوسٹلوں اور درجوں میں اعلان کی ذمہ داری سونپنا تھی۔ مجبوراً لاؤڈ اسپیکر بھی میں نے ہی سنبھال لیا صدر کوئی لاٹ صاحب تو نہیں ہوتا تھا کہ عام قائدین کی طرح ایسے کام والنٹیروں کے لیے مخصوص کرتا۔ بعد میں بعض جاگیردار طلبا مجھے "مساواتی صدر" کہہ کر چھیڑتے تھے۔ بہرحال شام کو پارک میں وقت سے پہلے پہونچ کر بلرام سنگھ، چندولی اوستھی، صدیق احمد صدیقی، جگدیش چندر دکشت، ہاشم قدوائی وغیرہ مصروفِ انتظام تھے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو چکا تھا۔ مجمع وقت سے پہلے ہی آنا شروع ہو چکا تھا۔ کیوں نہ ہوتا، وجے لکشمی پنڈت کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ موتی لعل نہرو کی بیٹی، جواہر لعل نہرو کی بہن، آنند بھون الہ آباد کی رونق، سابق وزیر اتر پردیش، غیر معمولی حُسن کی مالک اور اتنی ہی ذہین، خوش تقریر، خوش تحریر اور نباضِ سیاست۔ جس نے سُنا اس کی یہی تمنا تھی کہ ذرا ایک جھلک قریب سے دیکھ لیں۔ اس وقت مجھے اعظم حسین اعظم (مدیر روزنامہ سرفراز لکھنؤ) کی ایک نظم یاد آ رہی ہے جو انھوں نے اس کے پہلے مسز پنڈت کی گرفتاری پر لکھی تھی۔ اس کے دو بند آپ بھی عام جذبات کا اندازہ لگانے کے لیے سُن لیں ؎

دھوم جس کے نور کی محلوں میں کاشانوں میں ہے
اب وہی شمعِ شبستاں تنگ زندانوں میں ہے
جس کا شیوہ تھا جلانا خوردہ پروانوں میں ہے
ہائے اب محمل نشیں لیلیٰ بھی دیوانوں میں ہے
سوئے مقتل کھینچ کر قاتل کو ارماں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

وہ ترا بے باک جذبہ وہ ترا جوشِ عمل
تھی اسیری کی نہ کچھ پروا نہ کچھ خوفِ اجل
فکر تھی تو یہ ارادوں میں نہ آ جائے خلل
ہوش مندانہ ہر اک تقریر، دل کش، برمحل
ڈال دی مُردہ دلوں میں جان اس انداز سے
وہ تڑپ اُٹھا جسے دیکھا نگاہِ ناز سے[3]

وجے لکشمی کا ذکر آ گیا تو ع لطیف بود حکایت دراز تر گفتم۔ ہاں تو جب وجے لکشمی پنڈت پارک میں پہونچیں تو "وجے لکشمی پنڈت زندہ باد" "جواہر لال نہرو زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ میرے اعلان کرتے ہی ہر چہرہ خوشی سے کھِل گیا اور جوشِ محبت و مسرت میں تمتما اٹھا، نعرے اور نعرے!! مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میں نے کیا کہا اور کن الفاظ میں تعارف کرایا۔ پہاڑی چشمے کی طرح جذبات پھوٹ

نکلے تھے اور مجمع تالیوں سے میرا دل بڑھا رہا تھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ لوگ تو وجے لکشمی جی کو سننے کے لیے آئے ہیں میرے تعارفی کلمات کو نہیں۔ میں نے ان سے تقریر کی درخواست کی، وہ اُٹھیں، پھر نعرے اور تالیاں — ایک طوفان تھا جو اُبل رہا تھا۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور تقریر شروع کی، آہستگی اور نرمی کے ساتھ۔ فوراً ایک سناٹا چھا گیا، کہ سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سُنی جا سکتی تھی۔ کوئی چالیس منٹ تک کی تقریر میں آزادی کی لگن، قربانی کا جذبہ، نوجوانوں اور طالب علموں کے جوش و ہمت کی داد اور خود حقیر کے بارے میں چند ہمت افزا جملے! سب کچھ سمیٹ لیا۔ تالیاں، نعرے اور ایک ایسا جذبہ جگا دیا جس سے نوجوان چہروں پر شمعیں روشن ہوگئیں۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ وہ ڈائس سے نیچے اُتریں تو مجمع نے چاروں طرف سے والہانہ انداز میں گھیر لیا۔ بہ مشکل انھیں گاڑی میں بٹھایا گیا۔ انھوں نے مجھے گاڑی میں بٹھا لیا اور سیدھے چارباغ کے لیے روانہ ہوگئیں۔ پیچھے ایک گاڑی میں بلرام سنگھ بھی آ گئے۔ ایک بڑا مجمع اسٹیشن پر بھی رخصت کرنے کے لیے آ گیا۔ مسز پنڈت سیدھے یورپین اسٹائل ریستوراں کی طرف مڑ گئیں اور مجھے بھی ساتھ لے گئیں اور بلرام سنگھ کو بھی۔ ہم تینوں کے علاوہ ان کی پرائیوٹ سکریٹری بھی تھیں جن کا نام غالباً مس کیلب تھا۔ اب انھوں نے چائے، توس، انڈے ہم سب کے لیے آرڈر کیے۔ مجھے یاد آیا کہ میری جیب تو خالی ہے۔ خیر چائے ختم ہوتی گئی اور میری پریشانی بڑھتی گئی۔ ویٹر بل لیے مسز پنڈت کی طرف آیا تو میں نے اشارے سے منع کیا۔ مسز پنڈت نے محبت آمیز ترشی سے سرزنش کی:

"میں بڑی بہن ہوں، میرے ہوتے ہوئے آپ کیسے بل مانگ رہے ہیں"؟!

میں نے کہا، "لیکن آپ تو اس وقت ہماری مہمان ہیں۔"

انھوں نے کہا: "یہ ریستوراں ہے۔" اتنے میں انھوں نے پرس کھول کر پیسے دے ہی دیئے اور ہماری دل جوئی کے لیے کہا:

"بھائی! لکھنؤ تو میرا گھر ہے۔"

غرض ان کی اس نوازش نے ہمارا بھرم رکھ لیا، ورنہ نہ میرے پاس اس وقت پیسے تھے اور نہ بلرام سنگھ کی جیب میں۔ لیکن وہ کاؤنٹر پر پہونچ کر منیجر سے گفتگو کر آئے تھے۔ انتظام تو ہو ہی جاتا۔

دوسرا یادگار جلسہ راجہ جی (راج گوپال آچاریہ سابق وزیر اعلا مدراس بعد میں پہلے ہندستانی گورنر جنرل ہوئے) کا تھا۔ راجہ جی سے میں ایک بار گاندھی جی کے سیوا گرام وردھا میں مل چکا تھا۔ رواروی کی ملاقات تھی۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں کانووکیشن کو خطاب کرنے آئے تھے۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو ہماری گزارش پر انھوں نے ایک جلسۂ عام میں شرکت کی منظوری دے دی۔ یہ جلسہ بھی اسی امین آباد پارک میں گھنٹہ گھر کے زیر سایہ شام کے وقت لکھنؤ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ مسز پنڈت کے جلسہ کے مقابلے میں مجمع کم تھا۔ پھر بھی پورا پارک شائقین سے چھلک اُٹھا تھا۔ میں نے صدر کی حیثیت سے راجہ جی کا تعارف کرایا۔ اب راجہ جی تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ سشتہ و رفتہ انگریزی میں۔ یونیورسٹی کے کانووکیشن ہال میں جلسہ ہوتا اور صرف طلبا کا مجمع ہوتا تو وہ پوری طرح محظوظ ہوتا، لیکن یہاں تو نوّے فی صد سے بھی زیادہ غیر انگریزی داں تھے۔ اب سوال ہوا کہ ترجمانی کون کرے؟ میں نے اس کے پہلے کبھی ترجمانی نہیں کی تھی لیکن ع

بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد

(انسان کے سر پر جو بھی آتی ہے گزر جاتی ہے) کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ راجہ جی دو تین جملوں کے بعد رُک جاتے اور میں شروع کرتا — "راجہ جی کہتے ہیں"... راجہ جی نے مجمع کو بے چین ہوتے دیکھ کر چپکے سے کہا، "راجہ جی کا نام بار بار مت لیجیے۔"

میں نے براہ راست ترجمہ شروع کیا۔ لیکن مجمع کا رنگ دیکھتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ آپ انگریزی میں پوری تقریر کر لیں۔ میں بعد میں ترجمہ کر دوں گا۔ ان کی اجازت پا کر میں نے اعلان کر دیا۔ اب مجمع مطمئن ہوگیا اور پوری تقریر سکون سے سُنی۔ جگہ جگہ پر تالیاں بھی بجیں۔ آخر مجمع میں انگریزی جاننے والے، طلباء اور عام لوگ بھی تو تھے، پھر ڈائس پر ہم خود پہل کرتے تھے، وہ بیٹھے تو میں نے فوراً پوری روانی اور جوش سے ساری تقریر اُردو میں کر ڈالی۔ صرف ذہنی نوٹ تھے۔ میں نے بغیر رُکے ہی تقریر ختم کی۔ اب کے جگہ جگہ پر تالیاں زیادہ زور سے بجیں۔ آخر میں راجہ جی نے لکھنؤ کے مجمع کی خوش ذوقی اور میری ترجمانی کی دریغ القلبی

سکے ناشر بھی ہیں اور یہ پر انگریزی میں کئی مضامین لکھ کر نوازا بھی ہے ۔
میرے ترقی پسند دوستوں میں وہ بھی شامل ہیں ۔ ان کا نام ایک اچھے ادبی ماہنامے "کتاب" کے مدیر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا تھا ؎

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

جوش ملیح آبادی جب بھی لکھنؤ میں ہوتے تو ان کا قیام اکثر و بیشتر امین آباد کے رائل ہوٹل میں ہوا کرتا تھا ۔ ہم جیسے نوجوان بھی ان کی خدمت میں سننے اور کچھ سیکھنے جایا کرتے تھے ۔ شام کو وہ امین آباد سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے دوست خاندانی رئیس مرزا جعفر حسین (ایڈووکیٹ) کی قیام گاہ پر بھی جایا کرتے تھے جہاں مشروبات کے ساتھ شاعری کا دور چلتا ۔ مجاز، سردار، یہ دونوں اور دو ایک اور حلقۂ خاص کے شعراء جو وہاں موجود ہوتے وہ شریک ہوتے ۔ وہاں سبھی رند مشرب نہ ہوتے بلکہ مشہور طبیب اور ادب نواز شاعر حکیم سید محمد قاسم صاحب مالک معدن الادویہ، علی عباس حسینی اور اعظم بھی موجود ہوتے ۔ ان کی شاعری رند مشربی اور عالم مستی کی بےباک برجستہ شاعری کے بڑے چرچے رہتے ۔ آخر میں مرزا صاحب کی پرتکلف دعوت ہوتی جو شاہانہ انداز رکھتی تھی ۔ فقیری میں شاہی ، فاقہ مستی میں جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ اور ادبی آن بان اس دور کے خاص حلقوں میں ضرب المثل سی بن گئی تھی ۔ خدا غریقِ رحمت کرے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے ۔ !

اسی امین آباد پارک کے ایک کونے پر چائے کی دو کانیں تھیں ، ان میں ایک چھوٹی سی دوکان پر شعراء کا ایک چھوٹا سا گروہ شام کو جمع ہو جاتا تھا ۔ ان میں عمر انصاری، سلام مچھلی شہری اور فرقت بھی ہوتے ۔ کبھی کبھی میرے دوست صباح الدین عمر بھی آنکلتے ۔ وہ شاعر تو تھے لیکن یہ راز بہت بعد میں آشکار ہوا ۔ احراریوں میں دھمی صاحب برابر آتے ۔ امین سلونوی کی مشہور انڈی پنڈنٹ نیوز سروس اسی امین آباد کی پشت پر تھی ۔ یہ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی خبریں دیتی تھی اور طالب علموں کی تحریک سے متعلق خبریں اخبارات تک پہونچانے میں اس کا خاص رول رہا ہے ۔ شام کو یونیورسٹی کے وہ طلبا جو ہوسٹلوں میں نہیں رہتے تھے وہ تفریحاً بھی ادھر آتے اور ان چائے خانوں اور کتب فروشوں کی دوکانوں کی رونق بڑھاتے ان کی اور شاعروں اور ادیبوں کی بدولت ان طلباء کا رشتہ ادبی دنیا سے استوار ہوتا اور تحریک کے دھارے میں نئی تیزی آتی رہتی ۔

امین آباد کی دل کشی کے ان مختلف پہلوؤں کے باوجود گنجنگ[۵] کی بات ادھر ہی سمجھی جاتی تھی ۔ پھر بھی امین آباد کی دلفریبی اور معنویت اپنا مستقل وجود رکھتی تھی ۔ اس کے آس پاس امین سلونوی کی اُردو نیوز ایجنسی (ا۔ن۔س) ، لاٹوش روڈ پر نسیم انہونوی مرحوم کا نسیم بک ڈپو جس میں "سرپنچ" اور "حریم" کے دفاتر تھے ۔ میرے عزیز ترین دوست اور رفیق کار صباح الدین عمر صاحب بھی یہیں رہتے تھے اور قریب ہی میرے استاد اُردو مرحوم حامد اللہ افسر صاحب کی قیام گاہ تھی ۔ ذرا اور آگے بڑھیے تو مشہور زمانہ نیاز صاحب اور ان کا "نگار" تھا ۔ غرض یہ علاقہ عطر مجموعہ تھا اور یونیورسٹی سے اس کا ادبی رابطہ قوی تھا ۔

□□

حواشی :

۱ ہمارے شہر میں "ح" کا تلفظ عام حلقوں میں "ھ" کی طرح ہوتا ہے ۔ پڑھے لکھے لوگ "ز" کی طرح بولتے ہیں ۔

۲ مشہور شاعر شمیم کرانی کے برادر بزرگ ۔ اب انھیں کی طرح سرفراز بھی مرحوم ہو گیا ۔ ہمارے شہر لکھنؤ سے کیسے کیسے ہندستان گیر شہرت کے مالک اخبار و رسائل نکلے ۔ اب باقیات میں صرف قومی آواز رہ گیا ہے ۔ خدا نظر بد سے بچائے ۔

۳ سازِ خاموش : سید اعظم حسین اعظم (اعلیٰ پریس دلی ۱۹۸۱ء ص ۲۱۰-۲۰۶)

۴ جیل کے پہرے دار رات بھر ہاتھ میں لالٹین لیے ہوئے سارے بیرکوں کا چکر لگاتے اور ان کے تالے، جنگلے، بیل (زنجیریں) اور لالٹین دیکھتے اور اعلان کرتے ہوئے چلتے کہ سب قیدی ٹھیک ہیں یعنی کوئی فرار نہیں ہوا ہے ۔

۵ روز شام کو تفریح کے لئے حضرت گنج جانا اور وہاں لذت کام و دہان کے امکان اور نظارۂ ماہ وشوں کی بے تعلق جھلکیاں دیکھنے کے سامان کو نوجوان طلباء اور طالبات نے "گنجنگ" کا نام دے رکھا تھا ۔ اب وہ بھی نہ رہا ۔ نظارے اتنے عام ہوئے کہ ان میں کوئی کشش باقی نہ رہی ۔

خدا اور بندے کے درمیان

فیاض رفعت
۳۳-سی، دل کشا کالونی۔
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

میرے خُدا !
سولہ اپریل کی دُھواں دُھواں شام کو
میں دُہائیاں دیتا رہا
زار زار روتا رہا
مگر میرے خدا تم چُپ رہے !
— کیا
میری عبادتیں میرے سجدے
سب ضائع ہوئے ؟
میرے نالوں نے ہفت خواں
طے کیا —
دھرتی پاتال اور آسمان
چرند پرند اور چوپائے
ندی نالے اور سمندر
پھول خوشبو اور کانٹے
مجھے دیکھ کر سب روتے تھے ۔
اے میرے خدا !
میں نے تم سے مانگا بھی کیا تھا
بس ایک چادر کا کونہ ہی
تو مانگا تھا
اور یہ چادر کا کونہ بھی
میں نے کسی بدنصیب اور محروم
شخص کے لیے مانگا تھا
جس کا روم روم
تمھاری حیرت زا سرشاری میں ڈوبا
الوہی نغموں کی تانیں اڑاتا
تمھاری حمد و ثنا میں ڈوبا
اپنی پھٹی پھٹی خاموش آنکھوں سے
میرے اور تمھارے کرم کا منتظر رہا
اور تم خاموش رہے !
— اور
وہ محروم و مجبور شخص
بے نیل و مرام اپنا کھُلا سر لیے
افتاں و خیزاں دنیا کے بازار
میں نکل گیا،
سنگسار اور لہولہان ہونے کے لیے
اب —
رات کے مہیب اندھیرے میں
زخمی پرندے جیسی کھُلی کھُلی
حیرت زدہ اس کی آنکھیں
مجھے سوتے میں جگا دیتی ہیں
ہنستے میں رُلا دیتی ہیں،
جیسے —
سوال کر رہی ہوں
مجھے بتا ! کہاں ہیں وہ لوگ
جنھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا
کہ وہ میرے کھُلے سر کو
حفظ و امان کی چادر سے
ڈھک دیں گے ۔!!
اے میرے خدا !
اب تو ہی بتا
سوالوں کے عذاب میں گھری
میری شکستہ رُوح
نجات کی تلاش میں
کہاں کہاں بھٹکے گی ۔!!

■■

پروفیسر گوپی چند نارنگ
دہلی یونیورسٹی ۔ دہلی

اُردو املا و قواعد : مسائل و مباحث

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس عہد کے ان معدودے چند صاحبانِ علم میں سے ہیں جن کی اردو شناسی کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اردو میں ادیبوں اور مصنفین کی کمی نہیں لیکن اہل الرائے کا درجہ کتنوں کو حاصل ہے ، اس کا جواب آسان نہیں ۔ آزادی کے بعد اردو کے زمین و آسمان اس تیزی سے بدلے ہیں کہ بہت سی اگلی خوبیاں قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہیں ۔ بازار کی رونق تو بڑھ گئی ہے لیکن مال کی وقعت اتنی ہی گر گئی ہے ۔ اب وہ لوگ کہاں ہیں جو علم کی کسی ایک ادا پر پوری کی پوری زندگیاں کھپا دیتے تھے ۔ اب تو جسے دیکھیے چھپنے کی ہوس کا شکار ہے :

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

اب لگن اور دلسوزی کے مال کو کون دیکھتا ہے لوگ لیبل پر جاتے ہیں ۔ ملمع سازی کی اس ہا و ہو میں گہری لگن اور یکسوئی سے اپنی مستی کو نبھاتے جانا اور اپنے علمی کام کو کیے جانا بہت بڑی سعادت ہے جو صرف چند لوگوں ہی کے حصے میں آتی ہے اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان میں بھی خاص ہیں ۔ فتح پور کا خیال آتے ہی نیاز صاحب اور نگار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ نیاز صاحب نام کے نیاز تھے ، اصلاً وہ سراپا ناز تھے ۔ فرمان صاحب نام کے فرمان ہیں ، اصلاً سراپا نیاز ہیں ۔ نیاز و فرمان یا فرمان و نیاز کا رشتہ بھی کم مثالی نہیں ۔ نیاز صاحب سے نیاز مندی کا جو حق فرمان صاحب نے ادا کیا ہے ، کیا کسی کو ایسی توفیق ہوگی ۔ رسالہ نگار بیادگار نیاز آج تک اسی لگن اور شان سے نکلے جا رہا ہے ۔ اور اب تو نیاز لیکچرز کا سلسلہ بھی قائم کیا گیا ہے اور ہر سال پورے اہتمام و انصرام سے نیاز مرحوم کی یاد ان کے شایانِ شان منائی جاتی ہے جس میں ہند و پاک دونوں ملکوں کی سرکردہ شخصیات شریک ہوتی ہیں اور علمی جشن کی سی کیفیت ہوتی ہے ۔ جلسے جلوس کوئی بڑی بات نہیں ، لیکن کسی علمی روایت کی طرح ڈالنا اور کسی کی یادگار مناتا اور مناتے رہنا فقط سعادت ہی نہیں کارنامہ بھی ہے ۔

بادۂ پارینہ کے خصائص میں ہے کہ جتنی عمر رسیدہ ہو ، اتنی ہی لذت افزوں ہوتی ہے ۔ فرمان صاحب کے علمی کارناموں میں بالیدگی بھی وقعت کے ساتھ ساتھ آئی ہے ۔ انھوں نے اپنے علمی سفر کی کوئی منزل عشق کی ایک جست میں طے نہیں کی بلکہ جو کام بھی کیا پوری توجہ اور محنت سے کیا ، جو کچھ بھی لکھا رسان اور اطمینان سے لکھا ۔ یوں تو ان کی تصانیف اور تالیفات کی تعداد چالیس(۴۰) سے کیا کم ہوگی لیکن ہر کارنامہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے کہ جا اینجا است ۔ بیشک لغتِ کبیر کا کام ایسا کام ہے گویا فرمان صاحب کی تخلیق کا ایک رمزیہ بھی تھا ۔ اس بڑے لغت کا کام حضرت جوش ملیح آبادی کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور جس میں جناب ابواللیث صدیقی اور جناب شان الحق حقی جیسے اہل علم اور محققین شریک رہے ، اس کو جس علمی وقار سے فرمان صاحب نے جاری رکھا اور اس کی جلد سات سے جلد ۱۲ تک کے کام کو جس محققانہ ذمہ داری اور کار آگہی سے مرتب اور شائع کیا ، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے ۔ وہ اس عظیم منصوبے کو بائیس جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔

ویسے فرمان صاحب کے علمی کاموں کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس سب کا جائزہ لینے کو دفتر بھی ناکافی ہے ۔ انھوں نے تحقیقی اور علمی کتابیں بھی لکھی ہیں ، تنقید بھی لکھی ہے اور تدوین و تالیف کا حق بھی ادا کیا ہے ۔ ان کے کام کو کئی شقوں میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے ، مثلاً اصناف سے متعلق کتب : "اردو رباعی کا فنی اور تاریخی ارتقا" "شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" "اردو کی منظوم داستانیں" "اردو شاعری کا فنی ارتقا" "اردو نثر کا فنی ارتقا" "اردو افسانہ اور افسانہ نگار" "اردو کی نعتیہ شاعری" "اردو کی نعتیہ شاعری" "فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت" "اردو کی بہترین مثنویاں" وغیرہ ، دوسرے شخصیات پر مونوگراف مثلاً "غالب شاعر امروز و فردا" "اقبال سب کے لیے" یا "میر انیس حیات اور شاعری" یا "قمر زمانی بیگم" جس میں خط و کتابت بھی ہے ۔ نیز "نیاز فتح پوری شخصیت اور فن" "مولانا جوہر حیات اور کارنامے" "مولانا حسرت موہانی شخصیت اور فن" "سر سید احمد خاں" وغیرہ ؛ تیسرے تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے جیسے "تحقیق و تنقید" "نیا اور پرانا ادب" "تاویل و تعبیر" "ادبیات و شخصیات" اور اس نوع کی کتابیں ؛ اور چوتھے زبان اور مسائل زبان سے متعلق کتابیں مثلاً "زبان اور اردو زبان" "اردو املا اور رسم الخط اصول و مسائل" "ہندی اردو تنازع" "قومی یکجہتی اردو اور پاکستان" "تدریس اردو" "اردو املا و قواعد : مسائل و مباحث" جو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔

سر دست مجھ کو ان کی علمی یافت کے دوسرے منطقوں کے بارے میں کچھ نہیں کہنا میں گفتگو کو فقط آخری شق تک محدود رکھوں گا ورنہ یہ تحریر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے گی اور اس شق میں بھی فقط ایک موضوع پر نظر ڈالوں گا یعنی اردو زبان کا مزاج اور املا ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ۔ ان کے دیگر کمالات اپنی جگہ پر میرے نزدیک سب سے اہم یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے مسائل پر ان کی نظر گہری

ہے۔ دیکھا جائے تو مسائلِ زبان میں املا کہنے کو ایک محدود موضوع ہے، لیکن دقتِ نظری اور اصابتِ رائے ہی کا انداز کرنا ہو تو عشقِ نبرد پیشہ کے صلائے پر لبیک کہنے کے لیے اتنی سی زمین بھی بہت ہے۔ بنیادی اہمیت تصورِ زبان کے تئیں ذہنی رویے اور ترجیحات کی ہے، یعنی لسانی معاملات میں جو معروضی فاصلہ اور سائنسی نظر ضروری ہے اس کی شہادتیں کتنی اور کیسی ہیں۔ اگر بنیادی تصور ہی ذہن میں صاف نہیں تو ترجیحات مشکوک ہوسکتی ہیں اور دیوار سیدھی اٹھ ہی نہیں سکتی۔ بعض حضرات کے نزدیک 'اردو گھر کی لونڈی ہے' لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اردو سادہ زبان نہیں ہے بلکہ کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہہ سکتا ہے۔ جس نے تین تین چار چار عالمی خاندانوں سے رس جس پایا ہو، جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو، جس نے قوسِ قزح کی طرح رنگوں کو کشید کیا ہو، جس کا حسن تہ در تہ اور پہلو در پہلو ہو، وہ زبان کچھ بھی ہوسکتی ہے سادہ نہیں۔ اردو کی امتزاجی کیفیت ایسی جہت اندر جہت ہے کہ اس کے سامنے کے اچھروں کا احاطہ کرتے ہوئے بھی اچھے اچھوں کا ماتھا کھل جاتا ہے۔ اردو کی ادا شناسی کے تقاضے سخت ہیں اور اس میں ایک دو نہیں متعدد مقامات سخت آتے ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ 'بادرد کسے رسد کہ دردے دارد'۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس وادی کو کیسے طے کیا ہے اور راہ کی دشواریوں کو کیسے سہل کیا ہے، اسی سے کچھ اندازہ اس ادا شناسی اور رمز آشنائی کا ہوگا جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔ زیرِ نظر تحریر ایک مختصر کوشش ہے اور بنیادی مقدمے کی توثیق کے لیے بھی فقط خاص مثالوں سے دلیل لانے پر اکتفا کی جائے گی۔

اردو زبان کے مسائل پر پہلا مضمون فرمان صاحب نے نگار لکھنؤ میں جون ۱۹۵۱ میں لکھا۔ "اردو زبان اور رسم الخط" غالباً یہ مضمون ان کے مجموعے "زبان اور اردو زبان" مطبوعہ کراچی میں شامل ہے۔ ۱۹۷۳ء میں سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی فرمائش پر اردو املا پر ایک مضمون لکھ کر بورڈ کے اراکین کو دیا جس کی ایک نقل جناب شان الحق حقی کے پاس تھی جسے انھوں نے اردو نامہ شمارہ پچاس بابت مارچ ۱۹۷۵ء میں شائع کر دیا۔ رسم الخط اور اردو املا کے دونوں مقالوں کو ملا کر نگار پاکستان کا مسائلِ زبان نمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور یہی دو مقالے سنگ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے مارچ ۱۹۷۷ء میں "اردو زبان اور رسم الخط : اصول و مسائل" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیے۔ مقتدرہ قومی زبان سے جون ۱۹۹۰ء میں "اردو املا و قواعد: مسائل و مباحث" کے نام سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتبہ جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں مسائلِ زبان اور قواعد کے بارے میں جو مضامین رسالہ اردو نامہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے تھے، ان کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اردو املا والا مضمون اپنی اہمیت کے پیشِ نظر اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مقتدرہ قومی زبان کی اردو املا اور رموزِ اوقاف کمیٹی کے بھی صدر تھے، اور املا کے بارے میں جو سفارشات مرتب کی گئیں ان میں بھی فرمان صاحب کا مشورہ اور فیصلہ شامل تھا۔

پاکستان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس احساس کو عام کیا کہ اردو املا انتشار اور خرابی کا شکار ہے۔ جس طرح جس کا جی چاہتا ہے لکھتا ہے اور اس بارے میں بے راہ روی اور من مانی عام ہے۔ مثال کے طور پر کنواں کو کواں، کوا اور کنوا چار طرح سے لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح گاؤں کو بھی گانو، گانوں یا گاوں لکھا جاتا ہے۔ انھیں، انہیں۔ انھوں انہوں، تمھیں تمہیں، ہائے دو چشمی سے بھی لکھے جاتے ہیں اور کبھی دار ہ سے بھی، صحیح کیا ہے، کسی کو پروا نہیں۔ کیجیے لیجیے دیجیے کبھی یا سے کبھی ہمزہ سے جیسا جس کا جی چاہے، کسی قاعدہ کی پیروی ضروری نہیں سمجھی جاتی، اسی طرح مسالا، مسالہ، مصالحہ، مصالہ چار طرح سے، علیحدہ، علاحدہ، علحدہ تین طرح سے، سیکڑا، سینکڑا، سیکڑہ، سینکڑہ چار طرح سے عام چلن میں ہیں۔ لفظوں کو بھی ملا کر یا الگ الگ لکھنے کے بھی اصول نہیں ہیں، اور افراتفری عام ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس کی پیروی کریں۔ بعض الفاظ عربی سے آئے ہیں، بعض فارسی سے اور بعض ہندی یا پراکرتوں سے آئے ہیں۔ اصل میں شکل کچھ تھی، اردو میں آکر کچھ ہوگئی، جیسا کہ مصالحہ سے ظاہر ہے نہ صرف املا بدل گیا، کہیں کہیں تو معنی میں بھی تصرف ہوگیا۔ اردو کا دامن عربی فارسی سے بھی بندھا ہوا ہے اور ہندی پراکرت سے بھی۔ اگر چلن کی پیروی کریں تو اصل کی نفی ہوتی ہے جیسے اصل میں زکاۃ ہے اردو میں زکات ہوگیا ہے، اسی طرح صلات، توراث، مسمات وغیرہ۔ اور اگر اصل کی پیروی کریں تو چلن سے انحراف ہوتا ہے۔ فیصلہ کس بنا پر کریں۔ مسئلہ فقط اصل زبان کا نہیں، ثقافتی، معاشرتی اثرات اور تاریخ کا بھی ہے جسے نظر انداز کریں تو دوسری پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی لفظ مجرد لفظ نہیں، پوری تاریخ ہوتا ہے۔ اس کا دامن، مذہب، معاشرت اور تاریخی اثرات سب سے بندھا ہوتا ہے۔ کوئی فردِ واحد خواہ وہ کتنا بڑا عالم ہو یا کوئی ادارہ خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، ایسا حکم نہیں لگا سکتا جو زبان کی داخلی حرکیت کے خلاف جاتا ہو۔ اگر کوئی ایسا حکم لگا بھی دیا جائے تو اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا، اور دیر سویر وہ حکم کالعدم ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسے احکام کاغذ کی زینت بنے رہتے ہیں یا اپنے وضع کرنے والے کے جوشِ اصلاح کا نشان بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس مسئلے سے جڑا ہوا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اردو کی اپنی کوئی لسانی بنیاد یا کسوٹی ہے جس کو معیار مانا جائے۔ ملکی یا قومی یا ثقافتی ترجیحات نہایت اہم ہوتی ہیں اور کوئی ذی شعور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی اپنی خاص ترجیحات ہیں جن کی بدولت عربی فارسی بولنے والے ممالک سے خاص رشتوں کا ہونا فطری ہے، اور یہی وہ زبانیں ہیں جن کے جذب شدہ اثرات اردو کا امتیازی نشان ہیں۔ پاکستان میں اردو کا ان زبانوں کی طرف مائل ہونا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن اردو اگر تمام و کمال ان کی طرف مائل ہوتی ہے تو اردو اردو نہیں رہتی۔ یعنی اردو وصل کی خواہاں تو ہے لیکن ایسے وصلِ کُلی کی نہیں جس سے اس کا اپنا الگ وجود ہی باقی نہ رہے۔ گویا اردو میں کہیں نہ کہیں کوئی داخلی توازن کارگر ہے جس سے تھوڑا بہت انحراف تو ہوسکتا ہے کُلی انحراف نہیں ہوسکتا۔ جن زبانوں میں لین دین کا سلسلہ ہوتا ہے یہ ان کا نازک پہلو ہے کہ زبانیں بھی اپنی داخلی حرکیت کے ہاتھوں وحدت الشہود کی قائل ہوتی ہیں وحدت الوجود کی نہیں، یہ اثرات قبول کرتی ہیں انضمام نہیں چاہتیں، بلکہ محبت کرنے والوں کی طرح جو لاکھ فنا فی الذات ہو جائیں رہتے دو الگ الگ وجود ہیں۔ زبانیں بھی فقط اسی حد تک اخذ کرتی ہیں جس حد تک خود ان کی انفرادیت اور تشخص مجروح نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اردو باوصف اس کے کہ عربی فارسی کی مقروض ہے، عربی فارسی کا

قلِ ثانی نہیں ہے۔ بلکہ اسی طرح بادصف اس کے کہ اردو، ہندی اور پراکرتوں کی مقوّم ہے، اردو، ہندی اور پراکرتوں کا ظلِ ثانی نہیں ہے گویا اردو کا اپنا لسانی مزاج، اپنی پہچان، اپنی تشخّص اور اپنی آزادانہ حیثیت ہے۔ اردو کی یہ آزادانہ حیثیت بالروحیت کیا ہے؟ لسانی مسائل پر کام کرنے والوں کے لیے یہ ہمیشہ ایک نازک مسئلہ رہا ہے اور اچھے اچھوں نے اس راہ میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ گویا یہ راہ بھی پلِ صراط ہے، بال سے باریک اور تلوار سے تیز۔ اس راہ میں مارے جانے والوں کی داستانیں خاصی عبرتناک ہیں اور یہاں اس کی گنجائش بھی نہیں۔ بعضوں کو تو اتنی توفیق بھی نہیں کہ اپنی انتہا پسندیوں کو اعتدال پر لے آئیں۔ غرض اردو کے اپنے تشخّص اور آزادانہ لسانی حیثیت کے شعور کے لیے بڑی کارآگہی اور سلامت روی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی نظر کی اصابت کا کھلا ثبوت ہے کہ اس راہ میں اُن کے قدم کہیں نہیں ڈگمگائے اور اردو کی گنگا جمنی خوش امتزاجی کو پہچاننے میں وہ کبھی کسی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ یہی ان کی لسانی ادا شناسی کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔

اس سلسلے کی بحثیں اٹھاتے ہوئے انھوں نے نہ صرف انشاء اللہ خاں انشا کی مشہور رائے کو سند مانا ہے بلکہ اسے بطور رہنما اصول کے برتا بھی ہے:

"جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہوگیا، خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کی صحت اور غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیونکہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔"

میں نے ایک جگہ انشا کے اس بیان کو اردو زبان کی خود مختاری اور آزادانہ حیثیت کا میگنا کارٹا کہا ہے۔ اس بیان کو دُہرا دینا جتنا آسان ہے، اس کے مضمرات پر نظر رکھنا، اس کو پوری طرح سمجھنا اور زبان کی اصولی بحثیں کرتے ہوئے اور املا کی سفارشات طے کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا اتنا ہی دقت طلب ہے کیونکہ کہیں یہ بیان عقائد سے ٹکراتا ہے کہیں اصل ماخذ سے اور کہیں ثقافتی ترجیح سے اور کہیں تاریخ سے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے فیصلوں کی اہمیت اس میں ہے کہ انھوں نے حتی الامکان اردو کی اردوئیت اور بحیثیت زبان اردو کی خود مختاری اور آزادی پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ اپنے فیصلوں کے ذریعے ملک کے اعلیٰ ترین اداروں میں اسے تسلیم بھی کرایا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ اصول دو دھاری تلوار بھی ہے، جو اِدھر سے بھی اردو کا دفاع کرتی ہے اور اُدھر سے بھی۔ میں دو تین مثالیں عربی فارسی اثرات سے دوں گا اور دو تین مثالیں ہندی پراکرت اثرات سے، ان سے ڈاکٹر فرمان پوری کی لسانی سلامت روی کا کافی ثبوت فراہم ہو جائے گا، زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

عربی فارسی اثرات سے فقط ہمزہ، الف مقصورہ، اور ہم زبان حروف کے مسائل کو لیا جائے گا۔ ہمزہ کا مسئلہ اردو املا کا خاص مسئلہ ہے۔ عربی میں ہمزہ باقاعدہ حرف ہے، الف کی الگ کوئی حیثیت نہیں، یہ ہمزہ کا قائم مقام ہے جبکہ اردو میں الف باقاعدہ مصوتہ ہے اور ہمزہ محض ایک حرف ہے اور حرف بھی بغیر کسی صوت کے۔ اور تو اور عربی میں لفظ املا ہمزہ کے بغیر نہیں لکھ سکتے لیکن اردو میں لفظ املا کو ہمزہ کے ساتھ کوئی نہیں لکھتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ہمزہ کی تمام تر صورت حال سے بحث کرنے کے بعد فیصلہ دیا ہے اور صحیح فیصلہ دیا ہے:

"ہمزہ عربی زبان کے لیے مخصوص ہے اور حرفِ مستقل کی صورت میں عام طور پر لفظ کے شروع، درمیان اور آخر تینوں جگہ آتا ہے جیسے اَمر، سائل، سوٗ، ابتدار وغیرہ میں، لیکن اردو میں ہمزہ حرف اصلی کے طور پر کسی لفظ میں نہیں آتا۔ چنانچہ اردو کا کوئی لفظ نہ ہمزہ سے شروع ہوگا اور نہ ہی اس پر ختم ہوگا۔"

بظاہر یہ بہت سادہ سا فیصلہ ہے لیکن عام تحریر میں ہزاروں لفظ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ بعض حلقوں سے اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو میں ہمزہ چونکہ الف کا قائم مقام ہے یا لفظ کے بیچ میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی نشان ہے، یہ لفظ کے بیچ میں تو آسکتا ہے، یعنی سائل، قائل، مائل، غائب، نائب، مصائب وغیرہ۔ لیکن بہت سے لفظ اردو میں بغیر ہمزہ کے صحیح ہیں۔ ایسے لفظوں کی فرمان صاحب نے کئی شقیں قائم کی ہیں اور ان کی جامع درجہ بندی کی ہے مثلاً انشا، اخفا، القا، ابتدا، اشتہا، ارتقا، التوا، اقتدا، ابتلا، استعفا، استغنا، استدعا، یا عربی جمعیں جیسے شعرا، امرا، فقرا، وزرا، حکما، روسا، غربا، اشقیا، اغنیا، اولیا، انبیا وغیرہ۔ فرمان صاحب اس سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور نہایت صحیح اطلاق کرتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں کہ عربی کے بہت الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے حروفِ اصلی میں ہمزہ نہیں ہے، لیکن چونکہ دو مصوتے یکجا ہوئے ہیں اردو میں انھیں یا سے نہیں ہمزہ سے لکھنا چاہیے: مثلاً مضائقہ، معائنہ، شائع، ضائع، مائع وغیرہ۔ اسی طرح فارسی الفاظ فرمائش، نمائش، پیمائش، آرائش، زیبائش اگرچہ اصل میں یائے سے ہیں، لیکن اُردو میں ان کو یا سے نہیں ہمزہ سے لکھنا مناسب ہے۔ یہ بحث فرمان صاحب نے پوری تفصیل سے کی ہے ویسے دیکھا جائے تو ہمزہ کا اصول اردو کے لسانی نظام کی داخلی آزادی کا عجیب و غریب ثبوت ہے یعنی ایک طرف تو سیکڑوں ہزاروں عربی فارسی الفاظ اردو میں بغیر ہمزہ سے لکھے جاسکتے ہیں، دوسری طرف سیکڑوں ہزاروں ہندی پراکرت الفاظ جن کی اصل میں ہمزہ کا سوال ہی نہیں، وہ سب بغیر ہمزہ کے لکھے ہی نہیں جاسکتے، جیسے نائی، رائی، بھائی، مہنگائی، اکائی، پائی (آنہ پیسہ)، یا ہندی افعال کی سیکڑوں ہزاروں صورتیں، مثلاً آئے، جائے، کھائے، لائے، گائے، یا ہندی جمعیں جیسے آئیں، جائیں، کھائیں، لائیں، گائیں، یا آؤں، جاؤں، کھاؤں، لاؤں، گاؤں، یا آؤ، جاؤ، کھاؤ، لاؤ، گاؤ، یا آیئے، جایئے، کھایئے، لایئے، گایئے، یا آئی، لائی، وغیرہ، یا پھر ہندی اسمائے معرفہ مثلاً رامائن، کیکئی، لکھنؤ وغیرہ بھی اردو میں ہمزہ کے بغیر نہیں لکھے جاسکتے۔

ہمزہ ہی کی طرح کا ایک مسئلہ (لیکن جو اتنا وسیع نہیں ہے) الف مقصورہ کا ہے یہ بھی عربی تصور ہے اور اردو کے حروف تہجی میں اس کا وجود نہیں لیکن اردو میں بعض الفاظ میں (اور اہم الفاظ میں) الف مقصورہ استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس بارے میں اسی اردو اصول کو اپنایا ہے جس پر اجماع رائے ہے۔ ان

کا بیان ہے :

" عربی کے بعض الفاظ میں ی کے اوپر الف لکھا جاتا ہے جیسے موسیٰ، مولیٰنا، علیحدہ، دعویٰ، تقویٰ، مصطفیٰ، معریٰ، مدعیٰ، معلیٰ، ادنیٰ، اعلیٰ وغیرہ۔ اردو میں ی کی ضرورت نہیں صرف الف سے لکھنا چاہیے جیسے مولا، مولانا، علاحدہ، دعوا، تقوا، مصطفا، معرا، مدعا، معلا، ادنا، اعلا وغیرہ" اس میں انھوں نے فقط ایک استثنا کیا ہے اور صحیح کیا ہے کہ " اسم علم میں اصل املا قائم رہے گا جیسے موسیٰ، عیسیٰ، سلمیٰ کو اسی طرح لکھا جائے گا " اس بحث کا ایک حصّہ یہ بھی ہے کہ عربی میں چھوٹا الف صرف ی کے اوپر نہیں کبھی کبھی دوسرے حروف کے اوپر بھی لکھا جاتا ہے جیسے اسمٰعیل، اسحٰق۔ یہاں الف ی کا بدل نہیں، اس لیے اس الف کو بھی اردو میں پورا لکھنا مناسب ہے مثلاً اسماعیل، اسحاق۔

عربی فارسی اثرات میں اردو زبان کے نظم کی برتری کو تسلیم کرنے کی تیسری مثال ہم آواز حروف کی ہے، مثلاً،

ذ ز ض ظ حروف عربی میں الگ الگ آواز دیتے ہیں۔

یہی حال ث س ص

یا ت ط

یا ح ہ

کا ہے۔ اردو میں حروف کے ان سیٹ میں باہم گر قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک زمانے میں ان الگ الگ حروف کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی کہ اردو میں چونکہ ان حروف کا الگ الگ صوتی وجود نہیں ہے، ان کو ایک طرح لکھنا چاہیے۔ اس کی باقاعدہ کوششیں ہوئیں۔ رسالے بھی نکالے گئے۔ ہر چند کہ بظاہر یہ تجویز سائنٹفک معلوم ہوتی ہے اور لگتا یہی ہے کہ اردو کی اردوئیت کی بنا پر پیش کی جا رہی ہے کہ جب ذ ز ض ظ کی آواز ایک ہی ہے تو ان کو ایک طرح کیوں نہ لکھیں، لیکن اصلاً یہ تجویز نہ تو سائنٹفک ہے نہ اردوئیت کی زائیدہ ہے کیونکہ اردو میں سیکڑوں ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جن کا معنیاتی امتیاز فقط ان حروف کے الگ الگ ہونے سے قائم ہوتا ہے۔ ان کو ایک کر دیں تو اردو لفظیات کا خاصا حصّہ (اور اہم حصّہ) ملیامیٹ ہو جائے گا۔ گویا زبان کے نظم میں صوتی سطح ہی سب کچھ نہیں، ملفوظی اور صرفی سطح بھی اہم ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس نہایت اہم نکتہ کے رمز شناس ہیں، اور وہ ۱۹۵۱ء ہی سے ایسی یک طرفہ اصلاحات کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے ان حروف کو حروفِ تہجی میں جوں کا توں برقرار رکھنے پر اصرار کیا ہے کیونکہ یہ حروف لاکھ بے صوت سہی، بے معنی نہیں ہیں اور اردو لفظیات کا ناگزیر حصّہ ہیں۔ ان کے بغیر اردو کے ملفوظی اور معنیاتی نظام کا تصور ممکن نہیں اس لیے جہاں تک ان حروف کا تعلق ہے جیسا سنو ویسا لکھو کے اصول پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

اب لیجیے ہندی اور پراکرت اثرات کو، اس ضمن میں یہاں صرف دو شقوں کا ذکر کافی ہے، اول اردو کا مصوتی اور اعرابی نظام اور دوم اردو کی ہکار و معکوسی آوازوں کا نظام۔ ان دو شقوں ہی کی بحث سے اس تحریر کا مرکزی مقدمہ ثابت ہو جائے گا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اردو کا ایک اہم مسئلہ اعراب اور حروفِ علت یعنی مصوتوں کا ہے۔ اردو کے مصوتے وہ نہیں ہیں جو عربی کے ہیں۔ اسی طرح اردو کے مصوتے بھی وہ نہیں جو فارسی کے ہیں۔ یہ بات اردو کے ہند آریائی زبان ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اردو کی آزادانہ لسانی حیثیت اسی سے ظاہر ہے کہ اردو زبان مشرقِ وسطیٰ نژاد نہیں جنوبی ایشیا نژاد ہے۔ اعراب اور حروفِ علت کے بیان میں اچھے اچھوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اُردو کے اعراب تین ہیں، زبر، زیر پیش اور حروف بھی تین ہیں الف واؤ اور یائے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے صاف لکھا ہے کہ اردو میں اعراب یا حروفِ علت چھ نہیں دس ہیں اور یہ سو فیصد وہی ہیں جو ہندی کے ہیں۔ گویا حروف علت میں مطابقت مکمل ہے (۱۹۶۲ء کے زمانے سے راقم الحروف ان کی نشان دہی کرتا رہا ہے، ملاحظہ ہو مضمون " اُردو کی آوازیں" یا کتابچہ " اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو ") ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہ صرف ان کی صحیح شناخت فرمائی ہے بلکہ مُل مِل مَل مال مُولا مُول مَول مَیلا میلا میل کے اقلی جوڑوں کے گوشوارے سے ان کا حتمی امتیاز بھی ثابت کیا ہے۔ پاکستان میں اس سلسلے کی پہلی کامیاب کوشش کا کریڈٹ فرمان صاحب کو جاتا ہے۔

یہی معاملہ اردو کی ہکار اور معکوسی آوازوں کا ہے جہاں ہندی اور پراکرتوں سے مطابقت مکمل ہے۔ اس بارے میں بھی فرمان صاحب نے اردو کی اردو شناسی اور رمز آشنائی کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے حروفِ تہجی میں باقاعدہ

بھ پھ تھ جھ چھ دھ کھ گھ

ٹ ٹھ ڈ ڈھ ڑ ڑھ۔

ان چودہ آوازوں کو جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں اور خالص ہندی آوازیں ہیں، اردو میں شامل رکھا ہے۔ یہ حروف چودہ بنیادی آوازوں کے لیے ہیں جن کے بغیر عام اردو کا ایک صفحہ تو کیا ایک پیرا بھی نہیں لکھا جا سکتا، اور اردو آوازوں کی یہ وہ شق ہے جو اردو کو سامی خاندان اور ایرانی خاندان کی زبانوں سے یکسر الگ قرار دیتی ہے اور ہند آریائی خاندان سے جوڑتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری فقط ان چودہ آوازوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے، وہ لھ مھ نھ کے اضافے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں اور واضح طور پر لکھتے ہیں " یہ تمام آوازیں ہندی سنسکرت اور علاقائی زبانوں سے آئی ہیں " (ص ۱۲) ــــ امالہ کی بحث بھی ہندی اثرات کی بحث ہے یعنی الف کی آواز کو ے میں بدلنے کا عمل جو عربی فارسی الفاظ پر بھی بڑے پیمانے پر لاگو ہوتا ہے۔ یہاں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے امالہ سے بھی پورا انصاف کیا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو کی آزادانہ لسانی حیثیت اور اردوئیت کے نہایت موثر وکیل ہیں۔ ابھی ہم نے دیکھا کہ اردو خواہ کیسی خوشہ چیں زبان ہو اور اس نے کہاں کہاں اور کس کس کے گل بوٹوں سے اپنے دامن کو سجایا ہو، اس کا داخلی نظام اس کا اپنا نظام ہے۔ اردو بیشک عربی فارسی اور ہندی سنسکرت کی احسان مند ہے کہ ان سے اردو میں کیا کیا کچھ آیا اور خود اردو نے اپنے باطنی تحرک اور اپنے حسن و لطافت سے اس میں کیا کیا اضافے کیے۔ لیکن اردو کے اپنے داخلی نظام کے معاملات میں ان میں سے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

غزلیں

قصرِ تعمیر ارادوں کے وہ کرتا ہوگا
برف کے ٹکڑے فصیلوں میں وہ بھرتا ہوگا

لہریں دامن میں سمندر سے تو بھرتا ہوگا
وقت سارا ترا ساحل پہ گزرتا ہوگا

دورِ حاضر میں حوادث کو بنا کر سیڑھی
فکر و احساس کے آنگن میں اترنا ہوگا

اپنے کردار کو محفوظ تو رکھ جانِ وفا
یہ تو آئینہ ہے، گرتے ہی بکھرتا ہوگا

زندگی سعیٔ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
وقت سے پہلے نہ ہرگز کوئی مرتا ہوگا

مثلِ ماہی ضیاؔ دھاروں کے مخالف چلنے
کون دریائے محبت میں اترتا ہوگا

ضیاء قادری
سی-۶۲-اے، سیکٹر ڈی سی،
علی گنج، لکھنؤ
۲۲۶۰۲۰

میرے خلاف آکاش میں کوئی سازش کرتا رہتا ہے
میری قسمت والا تارا گردش کرتا رہتا ہے

یا تو آگ دکھاتا رہتا ہے وہ میری فصلوں کو
یا پھر میرے کھیتوں پر وہ بارش کرتا رہتا ہے

پہنچ کے منزل پر بھی بھولا نہیں سفر کے محسن کو
پھٹے پرانے جوتے پر بھی پالش کرتا رہتا ہے

دودھ کی خالی بوتل سے بھی بچے کا ہے عشق عجیب
تھک جاتے ہیں ہونٹ مگر وہ کاوش کرتا رہتا ہے

باغِ انگور کا چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں
پاگل بوڑھا پل پل "کشمش کشمش" کرتا رہتا ہے

جانے کیا سندیسہ بھجواتا ہے خوشبو کے نام
شام سویرے اشکؔ ہوا سے گزارش کرتا رہتا ہے

پروین کمار اشکؔ
گورشتا اسٹریٹ
پٹھان کوٹ
۱۴۵۰۰۱

پر ذرا ٹوٹے ہوئے سے مری تقدیر کے ہیں
حوصلے زندہ مگر آج بھی تعمیر کے ہیں

جب لہو آنکھ سے ٹپکے گا چمک جائیں گے
رنگ پھیکے ابھی احساس کی تصویر کے ہیں

خواب جو تم نے دکھائے تھے وہ سب دیکھ لیے
مسئلے اب تو یہاں خواب کی تعبیر کے ہیں

خوب پہچانتا ہے دل، ترے تیروں کا مزاج
زخم جتنے بھی لگے ہیں وہ ترے تیر کے ہیں

زندگی ایک تسلسل غم و آلام کا ہے
اور ہم لوگ بھی قیدی اسی زنجیر کے ہیں

نفرتیں پھوٹ پڑیں بن کے لہو کا سیلاب
کتنے زہریلے یہ جملے تری تقریر کے ہیں

صاحبِ لوح و قلم اس کے سوا کوئی نہیں
سارے گل بوٹے نیازؔ اس کی ہی تحریر کے ہیں

عبدالمتین نیازؔ
۲۶- صوفیہ ہاؤس،
موتیا پارک۔ بھوپال ۱۰

اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱۔ نیا گاؤں (ایسٹ)، لکھنؤ

اقبالؔ اور اکبرؔ[1]

(۲)

اکبرؔ صوفی اور پکے صوفی تھے۔ اقبالؔ کے فلسفۂ اسرارِ خودی و بےخودی سے سخت بیزار تھے اور اقبالؔ کا مذاق اس طرح اُڑاتے تھے:

جناب اقبالؔ نے یہ پوچھا کہ بے خودی کی یہ مشق کیسی
کہا کسی نے حضور والا سبب جو اس کا ہے مجھ سے سنیئے
خودی کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ بعض صاحب خدا بنے تھے

ادبار بےخودی سے جو سازش میں مست ہے
اقبالؔ اب خودی کی سفارش میں مست ہے
کارِ جہاں خدا کے ارادوں کا ہے مطیع
ہر ایک لیکن اپنی ہی خواہش میں مست ہے
اقبالؔ اپنے بس کا نہیں کیا کرے کوئی
اکبرؔ فقط دعائیں گزارش میں مست ہے

اقبال نے تصوّف پر کئی مضامین لکھے۔ لیکن اکبر ان سے متاثر نہیں ہوئے اور مخالفت کرتے رہے۔ وہ بظاہر اقبال کے طرزِ فکر سے پریشان تھے اور کہا کرتے تھے کہ اقبالؔ تصوف کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔ وہ اقبال کے گرو نطشے کو اخلاق کا طاعون سمجھتے تھے۔ مزید برآں برگسانی، نطشائی اور اقبالی خیالات کو ادب کا ادبار کوڑھ (برص) اور عقیدے کا کوڑھ بتاتے تھے ؎

کالج کے کیڑے پڑ گئے دلق فقیر میں

اس اثنا میں اقبال نے اسرارِ خودی کا دوسرا حصّہ بھی شائع کیا اور اکبر کی خدمت میں ایک نسخہ ارسال کیا۔ اکبر نے کتاب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس بارے میں ۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء کے خط میں مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:

اقبالؔ صاحب نے رموزِ بیخودی عنایت فرمائی ہے لیکن میں نے اسے ہنوز نہیں دیکھا۔ نہ اس کی امید ہے نہ دل چاہتا ہے..... اسرارِ خودی کی تمہید دیکھ چکا۔ میرے کلیات حصّہ اوّل میں صفحہ ۹۵ پر ایک شعر آپ ملاحظہ فرمائیں گے ؎

خودی و بیخودی دونوں ہیں عکسِ صورتِ جاناں
اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

یہ شعر ابتدائی زمانے کا ہے لیکن اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں پر حاوی ہے۔ مولانا روم اور مسٹر تلک کا مرکب بہت قوی ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہو... میں نے تو اسے پڑھا ہی نہیں۔ آپ نے ماحصل نکالا ہو تو لکھ بھیجیئے گا۔"[1]

اقبالؔ اپنے دونوں حریفوں کو (اکبر اور خواجہ صاحب کو) سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ تصوّف کے خلاف نہیں بلکہ وہ عجمی تصوّف کے خلاف ہیں۔ چنانچہ ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے خط میں مولوی عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

"اقبالؔ صاحب نے جب سے حافظؔ شیرازی صاحب کو اعلانیہ بُرا کہا ہے، میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی اسرارِ خودی آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب رموزِ خودی شائع ہوئی ہے

---

[1] اس مضمون کی پہلی قسط جولائی ۱۹۹۶ء کے شمارے میں پیش کی گئی تھی، یہ دوسری اور آخری قسط ہے ـــــ مدیر

میں نے نہیں دیکھی۔ دل نہیں چاہا۔" ۵

۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو، ہی اکبر کے نام اقبال نے ایک طویل خط لکھا تھا، اس کے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

"کل اور آج دو خط آپ کے موصول ہوئے۔ میں نے خواجہ صاحب پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے مے کشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی، جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا لیکن اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ خواجہ صاحب کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ ان کی شخصیت سے، ان کے اشعار میں مے سے مراد وہ مے ہے جو حافظ کے کلام سے پیدا ہوتی ہے۔

معاف کیجیے۔ مجھے تو آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کے وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ کے متعلق لکھے گئے ہیں، باقی اشعار پر شاید نظر نہیں فرمائی۔ کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تاکہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔

عجمی تصوف سے لٹریچر میں دل فریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے۔ اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمان کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ قنوطی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے۔"

یہ خط بھی اکبر کو اثر انداز نہیں کر سکا اور انھوں نے اقبال کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس کے بعد اقبال نے ایک اور خط گویا اتمام حجت کے لیے ۳۰ر جولائی ۱۹۱۸ء کو روانہ کیا۔ اس میں لکھتے ہیں:-

"مخدومی! آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں یہ بات درست نہیں ہے۔ مگر میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے گزشتہ خط میں بھی عرض کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لیے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجیے اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا ___

آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

اور مثنوی اسرار خودی کے مضامین میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ یہ بات تو میں نے پہلے حصے میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر بیان کی ہے ۔

رند کے اندر حرائے دل نشیں　　ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو، سوئے خود گام زن　　لات و عزائے ہوس را سر شکن

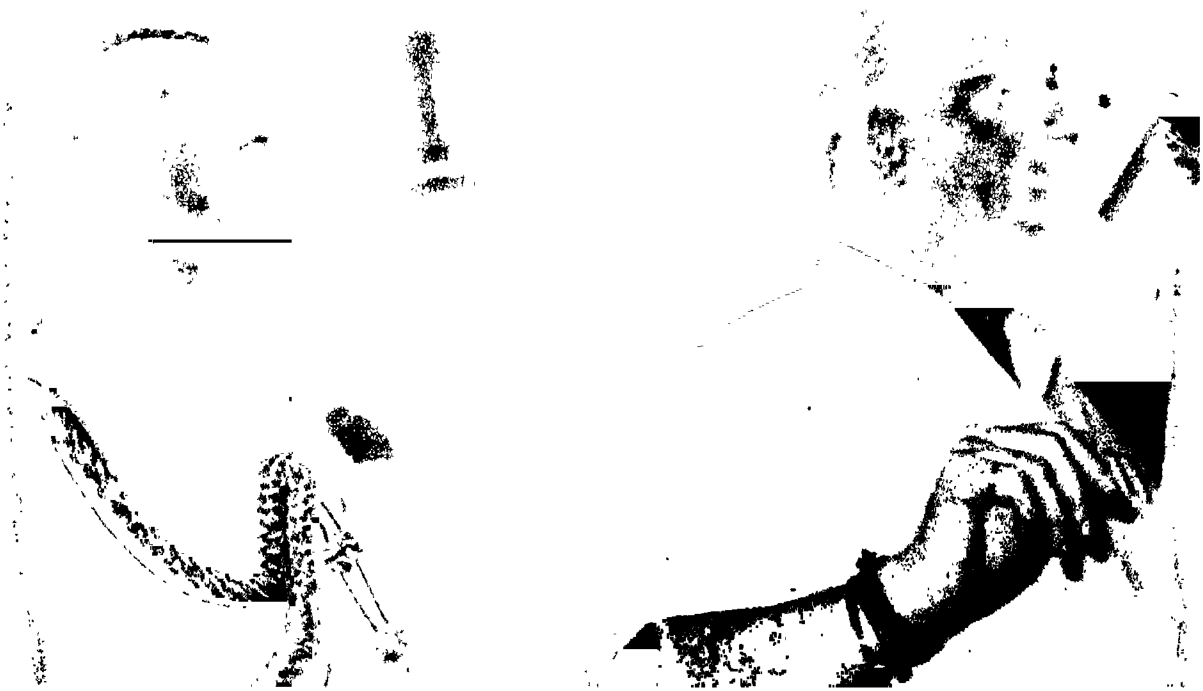
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

دوسری وہ بیخودی ہے جو بعض صوفیائے اسلام اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذات انسانی کو ذات باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ فنا ذات باری میں ہے، نہ احکام باری میں۔ پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم کی بے خودی تمام مذاہب و اخلاق کی جڑ کاٹنے والی ہے لیکن ان دونوں قسموں کی بیخودی پر معترض ہوں اور بس۔ حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات کو چھوڑ کر اللہ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت فرمائیے۔ عنایت کیا رحم کیجیے اور اسرار خودی کو











ایک دفعہ اول سے آخر تک پڑھ جائیے۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اس کی تکلیف سے اس نے آہ و فریاد کی۔ اسی طرح آپ کا اعتراض مجھ کو تکلیف دیتا ہے۔" ؎

اس خط کے بعد کوئی ایسی شہادت دستیاب نہیں ہوسکی کہ اقبال اور اکبر وغیرہ کے درمیان کسی قسم کی معرکہ آرائی جاری رہی ہوگی۔ اقبال نے حافظ شیرازی کے خلاف تمام اور سر سید علی امام کے انتساب سے کچھ اشعار اسرار خودی کے دوسرے اور اس کے بعد کے ایڈیشنوں سے حذف کر دیئے۔ دیباچہ بھی ہمیشہ کے لیے کتاب سے خارج کر دیا۔

اس طرح یہ جھگڑا ۱۹۱۸ء کے وسط میں ختم ہوگیا اور آپس میں اخلاص و محبت کا رشتہ تینوں اصحاب میں پھر سے استوار ہوگیا۔ اکبر نے اسرار خودی پر تبصرہ بھی لکھا جو زمانہ کان پور میں اگست ۱۹۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اکبر کے ایک قلمی خط مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۲۰ء سے جو راقم کے پاس موجود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کسی مقدمے میں الہ آباد گئے تھے اور وہاں تین دن تک اکبر کے مہمان رہے تھے۔ یہ خط اکبر نے عزیز لکھنوی کو لکھا تھا۔ اقبال ۲۹ر فروری ۱۹۲۰ء کو اکبر سے ملے تھے۔ اکبر ایک دوسرے خط میں ۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو خواجہ صاحب کے نام لکھتے ہیں:

"۲۹ر فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے تھے کسی مقدمے میں ضلع گیا کو گئے۔ مجھ سے ملنے کو اس طرف سے گزرے۔ تین دن رہے۔ ان میں میں نے پولیٹکل نشاط طبع پایا۔ دنیا بر امید قائم۔"

لاہور پہونچکر اقبال نے اکبر کی ملاقات کو مفید اور اطمینان بخش قرار دیا اور اسے اپنے لیے خوش بختی سمجھتے رہے۔ چنانچہ ۱۷ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اکبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں اپنے کو خوش نصیب جانتا ہوں کہ آپ سے ملاقات ہوگئی اور دو روز لطف صحبت رہا۔ آپ کی باتیں نظم ہوں یا نثر، نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ کوئی ایسا آدمی آپ کے پاس نہیں ہے جو ان رموز و حقائق کو جو آپ کی زبان فیض ترجمان سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے ہیں، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرتا جائے اگر میں الہ آباد میں ہوتا تو وہی کام کرتا جو باسول نے جانسن کے لیے کیا تھا۔

آپ کے پاس سے جدا ہونے کو دل تو نہ چاہتا تھا مگر لاہور واپس ہونا ضروری تھا۔ اب دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے؟ کیوں نہ آپ لاہور تشریف لائیں، پورا شہر آپ کے دیدار کا متمنی ہے۔ لاہور تک سفر کرنے اور الہ آباد بہ آرام واپس بھیجنے کی ذمہ داری میری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی صحت درست نہیں رہتی اور میرا اتنی دور آپ کو مدعو کرنا بے معنی ہے۔ مگر کیا کروں۔ دل جو نہیں مانتا خیر انشاء اللہ پھر جلد ملاقات ہوگی۔ امید ہے آپ کا مزاج عالی اچھا ہوگا۔" ؎

اس خط کے بعد غالباً دونوں بزرگوں میں کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو اکبر کا انتقال ہوا تو اقبال پر بڑا صدمہ گزرا۔ اس موقع پر اقبال نے فارسی کا مرثیہ کہا جس میں مرحوم کے تئیں شان دار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مرثیہ مشرق کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کے ایڈیشنوں سے خارج کردیا گیا۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر   چیا آتش بحق بود روشن دلیلے
سر ذروۂ طور معنی کلیمے   بہ بت خانۂ دور حاضر خلیلے
نوائے سحر گاہ او کارواں را   اذان درائے پیام رحیلے
زدلہا برافگندہ لات و عزّیٰ   بجا نہا کشا شدہ سلسبیلے

دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

اقبال نے ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو اکبر کے صاحبزادے سید عشرت حسین کے نام ایک تعزیتی خط اور تار بھی دیا تھا۔ خط یہ ہے:

"مخدومی! السلام علیکم
ابھی زمیندار سے آپ کے والد بزرگوار اور میرے مرشد معنوی کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا الیہِ راجعون

اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لیے الہ آباد کا سفر کریں۔ انھوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا بھی تھا کہ امسال ضرور ملنا۔ بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت تقریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔ اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بخیل ہے۔ زمانہ سیکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے اکبر ایسے (نظر) آتا ہے۔ کاش انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لیے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔ خدا تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے میں نے ابھی ایک تار بھی آپ کو دیا ہے۔" ۵۵

اقبال ایک اور جگہ اکبر کے بارے میں ۱۹؍ ستمبر ۱۹۲۱ء کو گرامی صاحب کے خط میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"اکبر مرحوم کے انتقال سے پہلے ہی میری طبیعت افسردہ ہو رہی تھی ـــ اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے بلکہ شاعری چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیت میں کم بلند نہ تھا۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی۔ یوں تو کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی کو رفیق اعلیٰ سے ملنے کے لئے ایک تڑپ تھی مگر گزشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے۔ کوئی خط ایسا مشکل سے ہوگا جس میں انھوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے، زندگی سے محبت ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروسِ حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے، اور اختلاط کا نتیجہ انس ہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو میں نے تو یہ کلیہ مولانا اکبر مرحوم کی صورت میں نہیں پایا۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ مسلمانانِ ہند کو اپنے نقصان کا شاید پورا احساس نہیں ہے۔" ۵۶

آخر میں ہم اقبال اور اکبر کے ایک مشترکہ دوست منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کان پور کا وہ مختصر سا تبصرہ درج کرتے ہیں جو "ہمارے معاصرین" کے عنوان کے تحت "زمانہ" بابت نومبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔ تبصرہ نگار دونوں بزرگ شاعروں کے خیالات اور طرز کلام کا مقابلہ درج ذیل الفاظ میں کرتا ہے :

"اکبر اور اقبال کی شاعری کی دنیا ایک دوسرے سے بالکل جدا اور نرالی ہے۔ اکبر قومی معاشرت کا مصلح اور اقبال روحانی شائستگی کا منادر ہے۔ اکبر مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں تنبیہ کرتا ہے کہ ہمارے طرز معاشرت اور تہذیب کا اصلی اور وطنی جوہر مفقود نہ ہونے پائے۔ وہ محبِ وطن ہے اور جب دیکھتا ہے کہ قومی معاشرت اصلیت اور مشرقیت سے خالی ہو رہی ہے تو کراہنے لگتا ہے۔ اکبر کی تمام عمر اس کوشش میں گزری ہے کہ ہمارے جسدِ قومی پر مغربیت کا ملمع نہ چڑھنے پائے۔ اقبال کا نقطۂ خیال اس سے بھی بلند ہے۔ اس کی دنیائے شاعری بالکل نرالی ہے۔ مجاز کی پروا نہیں رکھتا صرف حقیقت کی طرف دیکھتا ہے۔ مجاز اور حقیقت کے امتیاز سے اس کی آنکھیں ہر وقت نم رہتی ہیں ؎

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہے وہ

اسی کی تلاش و جستجو میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور جب اسے نہیں پاتا تو رو دیتا ہے اور اس کی آہ و زاری اشعار بن جاتی ہے ..... اکبر طرزِ معاشرت میں قوم کو قیدِ فرنگ

سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اقبال قیدِ حیات میں مکدّر رہتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک منزل خیال کرتا ہے۔ آخرت کی موت کو زندگیِ جاوید کی ابتدا سمجھتا ہے۔ موت سے بھی اسے لڑنے میں عار نہیں اور اپنے خدا سے بھی حق پر حجت و تکرار کرنے میں اسے تامل نہیں ہے۔ وہ روحانی نجات کو اہل اور حقدار بنانا چاہتا ہے۔ وہ کبھی کبھی خدا کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا ہے لیکن ہمیشہ بے نیازی اور خود داری کا پہلو لیے۔ اس کی مثال اس فقیرِ بے نوا کی سی ہے جو ایثارِ نفس، خلوصِ نیت اور صدقِ عقیدت کی رضا رکھتا ہے اور اسی لیے اپنی روحِ پُرفتوح سے واقف ہے۔"

مضمون کے اختتام سے قبل یہ کہنا مناسب سمجھا گیا کہ انجام کار اسرارِ خودی کی مخالفت کا سیلاب جو دو ڈھائی سال تک پورے شباب پر جاری تھا، اس کا کیا نتیجہ نکلا تھا؟ جناب بشیر احمد ڈار خواجہ حسن نظامی کے ہفت روزہ "خطیب" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے یہ اعلان کیا تھا کہ:

گزشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی ایچ ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلہ تصوف میں اختلاف واقع ہوا تھا۔ گفتگو آگے بڑھتی، مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے روکا اور دوسری جانب بھی ممانعت فرمائی۔ میں حضرت اکبر کی ذات کو اپنا مرشد معنوی تصور کرتا ہوں اس لیے گفتگو سے دست بردار ہو گیا اور خلقت کی اس شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی بحث نہ کر سکا۔ کیوں کہ بدنامی بہتر تھی اپنے رہنمائے روح کی عدم تعمیل ارشاد سے۔" ۷۵

ہماری رائے میں دراصل اقبال صوفیوں اور مولویوں کی مخالفت کے دباؤ سے عاجز آ چکے تھے اس لیے انھوں نے تصوف کے خلاف حافظ شیرازی سے متعلق تمام اشعار کتاب کے دوسرے اور بعد کے ایڈیشنوں سے خارج کر دیے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اقبال نے اسرارِ خودی کو سر سید علی امام کے نام منسوب کر کے پولیٹیکل دانش مندی کا اظہار کیا تھا۔ اقبال نے انتساب کے کچھ شعر حذف کر دیئے اور باقی اشعار تمہید میں شامل کیے۔ اس کے علاوہ مخالفت ہی کی وجہ سے کتاب کا دیباچہ بھی حذف کر دیا۔ البتہ نائب حق اور انسان کامل حضرت امیر علیہ السلام کی تعریف کے تمام اشعار جوں کے توں رکھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیائے اسلام کے تمام صوفی کسی نہ کسی طرح سے باب العلم سے کچھ نہ کچھ مناسبت رکھتے ہیں اور انہی کی ذات کو علمِ تصوف کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی صاحب نے اکبر کے انتقال کے کچھ ہی مہینوں بعد ایک کتاب "خطوط اکبر بنام حسن نظامی" کے عنوان سے شائع کی۔ اکبر کے ان خطوط میں اقبال کا ذکر اکثر و بیشتر درج ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے کتاب کی ابتدا میں اعتراف کیا ہے کہ مخالفت کے دوران اقبال نے انھیں جو خط لکھے تھے وہ انھوں نے لوگوں کی نگاہ سے چھپائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس تیسرے حصّے میں میرے مکرم دوست جناب ڈاکٹر شیخ اقبال صاحب کا تذکرہ کثرت سے ہے اور ان کی مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی پر مباحثے ہیں اور ہر خط نہایت طویل اور معانی و حقائق کا ایک دفتر ہے لیکن چونکہ جناب ڈاکٹر صاحب نے اسرارِ خودی کی اس روش کو بدل دیا جس پر خامہ فرسائی کی گئی تھی اور جس پر میرا اور ڈاکٹر اقبال صاحب کا اختلاف پیدا ہوا تھا اور میں نے دیکھا کہ آخر زندگی میں حضرت اکبر بھی جناب ڈاکٹر اقبال کے مداح و مشتاق ہو گئے تھے اور اموراہم میں ان کو اپنا محرمِ راز و شریکِ بزم فرمانے لگے تھے، اس واسطے سے میں نے ان خطوط کو آیاتِ منسوخ کی طرح صحیفۂ مکتوبات سے جدا کر دینا ضروری سمجھا، بلکہ ان کے اندر لاجواب معنی و حقائق نہ ہوتے تو ان کو ضائع کر دیتا مگر ضائع کرنے کو دل نہ چاہا اور صاف عوام کی نظروں سے محفوظ

کہہ دیئے گئے:" ۵ے

ایک اور جگہ خواجہ صاحب نے دہلی کے "پاکستانی یوم اقبال" کے موقع پر کہا تھا:

" اقبال ساری اسلامی دُنیا کے مسلمانوں کو متحد کرکے کُل جہاں میں پاکستان بنانا چاہتے تھے اور انہی کی تحریک سے میں نے ۱۹۱۱ء میں مصر، فلسطین، شام اور حجاز کا سفر کیا تھا۔ واپس آکر میں نے اقبال سے کہا تھا کہ منکورہ ملک انگریزی تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہوگئے ہیں کہ مجھے وہاں اسلامی اتحاد کی امید نظر نہیں آتی"۔

اس کے بعد اقبال نے مثنوی اسرار خودی لکھی اور حضرت حافظ شیرازی کے کلام پر اور بعض صوفیوں کے عقائد ترکِ دنیا پر تنقید کی، جس کو میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ناموزوں خیال کرکے اس سے اختلاف کیا۔ کچھ عرصے تک اخبارات میں اختلافی مضامین شائع ہوئے۔ مگر آخر میرا ان کا اتحاد خیال ہوگیا، اور میں نے تسلیم کرلیا کہ ترکِ دنیا کا وہ تخیل جو بعض صوفیائے کرام کا ہے وہ وقتِ حاضر کے لیے موزوں نہیں ہے کیونکہ قرآن میں خدا نے جو دُعا سکھائی ہے اس میں دُنیا کی بھلائی کو مقدم اور آخرت کی بھلائی کو مؤخر رکھا گیا ہے۔

اس کے بعد دہلی کے پاکستانی یوم اقبال میں کہا تھا کہ میرے مریدوں کی غلط فہمی دور ہونی چاہیئے کیونکہ میری اور اقبال کی صفائی اور صلح ہوگئی تھی اور ہم دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا"۔ ۹ے

اسرار خودی کی بے جا مخالفت میں جو بھی عوامل کارفرما رہے ہوں، ان میں اصل مخالفین خواجہ صاحب اور اکبر الہ آبادی ہی تھے۔ بعد میں دونوں کو اپنی مخالفت کا احساس شدت سے ہوا۔ اکبر کو بھی آخر کار اقبال کی میانہ روی، صبر و استقلال اور کمالِ ظرف دیکھ کر اعتراف کرنا پڑا ۱۰ے

احباب نکتہ چیں کے ذہنوں کا حرف دیکھا
ان پر کبھی بھی لیکن آتا نہ حرف دیکھا
یہ بادہ مضامین پھر اس پہ ہوش شرعی
اقبال ہی کا اکبر میں نے یہ ظرف دیکھا

□□

حواشی:

لے مکتوبات اکبر بنام سلطان احمد ص۹۳
۲ے مقدمہ شرح اسرار خودی از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۳ے ایضاً
۴ے اقبال نامہ حصہ دوم ۵ے انوار اقبال ص۱۹۳
۶ے کلیات مکاتیب اقبال ص۲۷۳ مظفر حسین برنی
۷ے انوار اقبال
۸ے خطوط اکبر بنام حسن نظامی ص۳ مطبع شاہجہاں پریس دہلی اگست ۱۹۲۲ء
۹ے معاصرین اقبال کی نظر میں ص۳۴۳ محمد عبداللہ قریشی
۱۰ے صوفی پنڈی بہاء الدین گجرات پنجاب ص۲۰ بابت مارچ ۱۹۲۰ء

---

۱۵ / اگست
(قطعات)

آج ہے پندرہ اگست مسرور ہیں اہل وطن
یوم آزادی ہے یہ شاداں نہ ہوں کیوں مرد و زن
ہوگیا کافور غم ہر اک دل رنجور سے
کس قدر شاداب ہیں ہر شخص کے دل کے چمن

مبارک ہو تمھیں اہلِ وطن پندرہ اگست آیا
خوشی و خرّمی و شادمانی ساتھ ہے لایا
نظر آتے ہیں شاداں طفل اور پیر و جواں کیسے
ہوئے آزاد تو ہر ایک دل نے ہے سکوں پایا

ماسٹر عبدالمنان صدیقی
محلہ بنگلہ، پُرانا سیتاپور (یو۔پی)

غزلیں

مفلسی میں بھی یہاں خود کو سنبھالے رکھنا
جیبیں خالی ہوں مگر ہاتھوں کو ڈالے رکھنا

روز یہ کھال ہتھیلی سے اُتر جاتی ہے
اتنا آسان نہیں منہ میں نوالے رکھنا

گاؤں پوچھے گا کہ تم شہر سے کیا لائے ہو
میرے معبود سلامت مرے چھالے رکھنا

زندگی تو نے عجب کام لیا ہے مجھ سے
زرد پتوں کو ہواؤں میں سنبھالے رکھنا

جب بھی سچ بات زباں پر کبھی لانا کاظمؔ
ذہن میں اپنے کتابوں کے حوالے رکھنا

کاظمؔ جرولی

۱۱۵۔ نعیم منزل، نخاس
لکھنؤ ۳

سو غم لگے ہیں گھات میں ایسا نہ کیجیے
تنہائیوں پہ اتنا بھروسا نہ کیجیے

ابتک فضا میں ہے انہیں وعدوں کی بازگشت
اب حسنِ اعتبار کا دعویٰ نہ کیجیے

ڈس لے گا ایک روز یہی ناگ کی طرح
خلوت کدے میں بیٹھ کے سوچا نہ کیجیے

عریاں حقیقتوں سے مفر کی تلاش میں
خوابوں کی سرزمین کو ڈھونڈا نہ کیجیے

بے جا نوازشات کی تشہیر کے لیے
خود اپنے ہی خلوص کو رسوا نہ کیجیے

سیدہ شانِ معراج

تارین ٹیکلی۔
شاہ جہاں پور

کیسی تھیں کیسی ہو گئیں آنکھیں
تم کو دیکھا تو کھو گئیں آنکھیں

لیکے پلکوں پہ اشک لوٹ آئیں
تیرے ہمراہ جو گئیں آنکھیں

تیرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھتے ہی
تیری پلکوں پہ سو گئیں آنکھیں

کوئی موسم ہو ہنستی رہتی ہیں
کتنی خوددار ہو گئیں آنکھیں

آئیں چپکے سے خوشبوؤں کی طرح
کہہ دو خوابوں سے سو گئیں آنکھیں

کیوں ہو خاموش کچھ کہو جاویدؔ
کس تصور میں کھو گئیں آنکھیں

جاوید برقی

نشاط گنج، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷

عابد پیشاوری
شعبۂ اُردو۔ جموں یونیورسٹی۔ جموں

کچھ داغ کچھ غالب

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

غالب نے یہ شعر اگرچہ نواب تجمل حسین خاں کے لئے کہا تھا لیکن نواب مرزا خاں داغ پر بھی بخوبی چسپاں ہوتا ہے۔ یوں بھی غالب اور داغ کے ستارے بہت کچھ ملتے ہیں اور آپس میں ٹکراتے بھی ہیں۔ مثلاً دونوں کی ولادت اگرچہ الگ الگ مہینوں میں ہوئی لیکن دونوں کا انتقال فروری میں ہوا۔ دونوں کے اجداد ایک تھے، (غالب کی سسرال داغ کی ننھیال تھی۔) دونوں بزرگ و خورد معاصر تھے۔ دونوں بڑے شاعر تھے، دونوں اپنے اپنے انداز کے مؤجد و خاتم تھے، ایک اردو کو رشکِ فارسی بتاتا رہا، دوسرا اسے فارسی کا سایہ ہونے سے بچاتا رہا، دونوں شاہ خرچ اور قرض خواہوں سے پریشان تھے، دونوں نے کلکتے کا سفر کیا اور دونوں زندگی بھر کلکتے کی یادیں سینے میں سمیٹے رہے۔

ایک نے کہا ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں   اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

دوسرا پکارا ؎

یہ حسیں یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر   داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلے

دونوں نے اس سفر کی یادگار ایک ایک مثنوی کہی، غالب نے فارسی میں داغ نے اردو میں، دونوں نوابینِ رام پور سے متعلق تھے۔ داغ نواب یوسف علی خاں ناظم کے عزیز بھی تھے شاگرد بھی۔ داغ کی خالہ نواب ناظم سے وابستہ تھیں۔ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد داغ کو اپنی خالہ کے پاس رام پور میں رہنا پڑا۔ اس زمانے میں نواب صاحب نے داغ کو کچھ تعلیم بھی دی تھی۔ اسی طرح وہ خود اپنے بچپن میں غالب سے پڑھتے تھے۔ داغ نواب کلبِ علی خاں کے ملازم و مصاحب تھے۔ غالب دونوں نوابوں کے استاد تھے۔ شاگردوں کے باب میں دونوں خوش بخت تھے۔ دونوں کو بے شمار شاگرد ملے۔ غالب کو سیکڑوں داغ کو ہزاروں، لیکن دونوں کے ستارے متخالف بھی تھے۔ داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں کو غالب اپنا دشمن جانتے تھے۔ داغ کے استاد ذوق غالب کے سب سے بڑے حریف تھے۔ داغ مولوی غیاث الدین، مؤلف غیاث اللغات سے فارسی پڑھے تھے، غالب نہ مولوی صاحب کو مانتے تھے نہ ان کی فارسی کو۔ غالب کو حج بیت اللہ کی حسرت ہی رہی اگرچہ انھوں نے بادشاہ سے یہ قرار کرنا چاہا ؎

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں   حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

لیکن نواب کلبِ علی خان سفر و حضر میں ہمیشہ داغ کو ساتھ رکھتے تھے، چناں چہ ؎

یہ سنا جو حضرتِ داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے یہی فکر ہے شب و روز عزمِ سفر سے خوش

اور جب واپس آئے تو کہا ؎

ساتھ نواب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

غالب حیوانِ ظریف تھے، داغ ان سے سوا خوش طبع بھی تھے اور شوخ طبع بھی۔ چنانچہ حج کعبہ سے بھی شوخی کا پہلو نکال لیا ؎

گئے تھے داغ تلاشِ صنم میں کعبے کو   خدا نے مفت کیا ہے ثواب میں داخل

داغ کی وہ غزل جس کا مطلع و مقطع ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے   دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا   جو دیا اے خدا دیا تو نے

خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر کہی گئی تھی۔

غالبؔ نہ صرف سوچ سوچ کر شعر کہتے تھے بلکہ اپنے کہے ہوئے اشعار پر زندگی بھر غور و فکر کرتے رہے اور ان کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ اسی لیے ان کا کل سرمایۂ اردو تقریباً ۱۸۰۰ شعر ہے۔ اس کے برعکس داغؔ عموماً فی البدیہہ، بے تامل، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے ہوئے چلتے پھرتے شعر کہنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ابتدائی دور کا ضخیم دیوان غدر میں تلف ہو جانے اور آخری دور کا ایک دیوان چوری ہو جانے کے باوجود ان کی یادگار ہزاروں اشعار موجود ہیں۔ امیرؔ مینائی کو ایک خط میں داغؔ نے لکھا :

> میں نے یہ غزلیں مجبوراً ڈھائی گھنٹے میں کہیں، ڈیڑھ گھنٹے میں دو غزلیں اور ایک گھنٹے میں ایک غزل۔ منشی فریدالدین صاحب ملازمِ سرکار گھڑی رکھکر اشعار لکھتے تھے۔ خدا جانے یہ کیا امتحان تھا اور کیوں تھا۔

ایک اور خط میں کنور اعتماد علی خاں حسرتؔ کو لکھا :

> یہاں جو کچھ میں لکھتا ہوں وہ فی البدیہہ ہوتا ہے۔ یہ دو گھنٹے کی فکر ہے جو ملفوف بھیجتا ہوں۔ حضوری فرمایشات ایسی ہی ہوتی ہیں .... فی الفور اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ حضورِ پرنور کا راضی کرنا بہت مشکل ہے۔

اس کے باوجود کیسے کیسے شعر نکالتے ہیں ؎

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا ہے
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

گر تو کسی بہانے سے آجائے وقتِ نزع
ظالم کریں ہزار بہانے قضا سے ہم

رات کی رات کا مہماں ہے مریضِ ہجراں
صبح تم آئے تو کیا آئے سحر کچھ بھی نہیں

فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

ملے مجھ سے تو فرمایا تمہیں کو داغؔ کہتے ہیں
تمہیں ہو ماہ کامل میں تمہیں رہتے ہو لالے میں

یہ کہتے ہیں بلبل سے وہ گل ہاتھ میں لے کر
تو دیکھ ملا کر اسے گالوں سے ہمارے

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

رخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی

ان اشعار میں داغؔ کی تمام شعری خصوصیات نہ سہی لیکن ایک خصوصیت بہت واضح ہے : اردو زبان پر ان کی قدرت۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بیٹھا بے تکلف گفتگو کر رہا ہے۔ نہ عطف و اضافت، نہ موٹی موٹی تراکیب، نہ پیچیدہ استعارے نہ گنجلک خیالات، نہ فلسفہ بگھارنے کی کوشش نہ تصوف کی اصطلاحیں۔ داغؔ کے نزدیک شاعری کا مقصد تفلسف و تصوف نہیں بلکہ اپنے محبوب سے دل کی بات کہنا سننا ہے۔ اس معاملے میں وہ مومنؔ کے پیرو معلوم ہوتے ہیں جو غزل کے کوچے سے قدم باہر نہیں نکالتا۔ وہی جانی پہچانی روزمرہ کی باتیں ہیں جو ہر دل میں ہوتی ہیں لیکن جنھیں ہر شخص بیان نہیں کر پاتا۔ بقولِ غالبؔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

سخن میں یہ تاثیر پیدا ہوتی ہے تجربے کی سچائی اور بیان کی صفائی سے۔ اقبالؔ نے داغؔ کے مرثیے میں ٹھیک ہی کہا ہے ؎

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون
تھی زبانِ داغؔ پر وہ آرزو جو دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

یعنی جو دوسروں کے ہاں قال ہے داغؔ کے ہاں حال ہے۔ چنانچہ وہ اگر غزل میں معمولی باتیں بھی کہتے ہیں تو مزا دے جاتی ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ ایک بزرگ کے حوالے سے فرماتے ہیں :

> نواب کلب علی خاں کا عہد تھا۔ بحرؔ، تلقؔ، اسیرؔ، امیرؔ، منیرؔ وغیرہ موجود تھے۔ جب داغؔ کے پڑھنے کی نوبت آئی تو مشاعرہ گونج اٹھا .... منیرؔ اپنی بے مثل غزل پڑھ چکے تھے مگر وہ عام فہم شعر یہاں کہاں تھے۔ داد دلخواہ نہ ملی۔ داغؔ کی واہ واہ منیرؔ پر گراں گزری۔ مشاعرے سے باہر آکر داغؔ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا : کیوں میاں داغؔ تمہاری

غزل مجھ سے بھی زیادہ پرزور تھی؟ داغ نے کہا ہرگز نہیں، میری کیا طاقت کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں ... درمیان میں چند صاحب یہ گفتگو کرتے نظر آئے کہ بھائی غزلیں تو سب نے پڑھیں مگر جب زاغ بیانی نے اپنا منھ نکالا تو پھر سارے عندلیب اپنا نغمہ بھول گئے۔ داغ کو وہ داد ملی کہ اللہ اللہ۔ خود نواب صاحب لوٹ لوٹ گئے۔ داغ نے منشی اسماعیل حسین منیرؔ یادگارِ ناسخ سے کہا، حضرت! اس مقبولیت کو کہئے۔ منیرؔ مرحوم چپ ہو گئے۔

اکثر داغ کی غزل پر واہ واہ کا ہنگامہ دیکھ کر بعض شعرا نے اپنی غزلیں پھاڑ کر ان کے آگے ڈھیر کر دیں۔ حالیؔ کا قول ہے کہ رام پور میں امیرؔ نے ان سے کہا کہ "بھئی مشاعرے میں کیا جائیں۔ ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور مشاعرہ ختم ہوتے ہی داغ کی غزل ہر زبان پر ہوتی ہے۔" اور یہ داغ کی شستہ اور شیریں زبان کا کرشمہ تھا۔ جس طرح غالب بار بار اپنے اندازِ بیان کا ذکر کرتے ہیں اسی طرح داغ جا بجا اپنی اردو پر فخر و ناز کرتے نظر آتے ہیں ؎

کیوں داغ دہلوی کی زباں مستند نہ ہو پیدا کیا خدا نے اسے تخت گاہ میں
غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے
اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
نشانِ داغِ سخنور کی قبر کا ہے یہی بجائے سبزہ زمیں سے زباں نکلتی ہے

لیکن محض زباں کے بل بوتے پر دلوں میں مقام نہیں بنایا جا سکتا جب تک بیان میں صداقت اور انداز میں قدرت نہ ہو۔ معمولی باتیں بھی داغ کے قلم سے نکل کر غیر معمولی ہو جاتی ہیں ؎

فلک نے کینہ لیا تو نے ظلم میں نے وفا وہی ازل میں ملا جسکو جو پسند ہوا
اے داغ نہ دے جان محبت میں کہ ناداں پھر زندہ جہاں میں کوئی مر کر نہیں ہوتا
بیکس رہیں گے حشر میں کب مجرمانِ عشق رحمت کہے گی ہم ہیں گنہگار کی طرف
دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے
بندہ چاہے جو خدائی کو ملی سکتی ہے لوگ قسمت کو لئے پھرتے ہیں قسمت کیسی
میرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے چمن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

دی شبِ وصل مؤذن نے اذاں پچھلی رات ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا
رہتا ہے عبادت میں ہمیں موت کا کھٹکا ہم یادِ خدا کرتے ہیں کرلے نہ خدا یاد
اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری

اندازِ بیان کی طرفگی کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب داغ کے اُن اشعار کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے غالب جیسے نابغۂ روزگار کی زمینوں اور قوافی میں کہے ہیں۔ غالب کے اشعار زبان زد ہیں، داغ کے اشعار دیکھئے ؎

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُر الم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
مبارک ہو یہ گھر غیروں کو تم کو پاسبانوں کو
ہمارا کیا اجارہ ہے نکالا تم نے ہم نکلے
عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا؟

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر دیکھنے والے کو دیکھا چاہئے
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
رہتی ہے کب بہارِ جوانی تمام عمر مانندِ بوئے گل اِدھر آئی اُدھر گئی

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
میرا طریقِ عشق جدا ہے جہان سے
چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر رہ گزر کو میں

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

داغ کا دور بھی عجب دور تھا۔ لوگ طوائفوں سے عشق کرتے تھے، شراب پیتے تھے لیکن شعر تصوّف کے کہتے تھے۔ البتہ داغ کا معاملہ برعکس ہے۔ وہ طوائفوں سے عشق کرتا ہے، شراب نہیں پیتا ؎

گو ہے عاشق مزاج و شاہد باز داغ لیکن شراب خوار نہیں

وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے لیکن شعر تصوّف کے نہیں عاشقانہ کہتا ہے۔ وہ حج کرتا ہے لیکن فسق و فجور سے تائب نہیں ہوتا۔ غالب شعر گوئی کے لئے کچھ تصوّف کچھ نجوم لگا رکھتا ہے لیکن جب آخری دور میں غزل کی فرمایش

ہوتی ہے تو پکار اٹھتا ہے : ”غزل کہوں تو معشوق کس کو قرار دوں“ گویا غزل کہنے کے لیے معشوق کا ہونا ضروری ہے۔ داغ اس کے لیے آخری عمر تک، بلکہ مرتے دم تک کہ مرنے کے بعد بھی وہ لطیف جان کو روتا پیٹتا چھوڑ جاتا ہے، ایک نہ ایک طوائف کو لگا رکھتا ہے تاکہ رئیس زادگی کا بھرم بھی قائم رہے اور شاعری بھی تازہ اور جوان رہے۔ چنانچہ آخر تک اُن کے کلام سے شوخی اور چلبلاپن نہیں جاتا۔ اسے فرضی اور خیالی باتیں بنانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ آپ بیتی کو اشعار میں ڈھالتا رہتا ہے اور تاثیر خون بن کر اس کے کلام کی رگوں میں دوڑتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ محض مشق و ممارست کے بل بوتے پر چہکتے بولتے شعر نکال لیتا ہے۔ عمر بھر شراب کو نہ چھونے کے باوجود داغ نے مے و میخانے پر کچھ بہت اچھے اور دل میں اتر جانے والے شعر نکالے ہیں ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد   ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

رند کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور   کیا چیز حرام ہو گئی ہے
مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد   کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
میخانے میں جاتا تھا چھپے چوری سے زاہد   للکار کے میں نے بھی کہا دیکھ لیا ہے

دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ زاہد تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خُم مجھ کو

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت اِدھر کہاں

رقیب بھی اردو غزل کا ایک مستقل کردار ہے لیکن چوں کہ یہ کردار بھی عموماً فرضی اور خیالی ہے اس لیے اس میں دل کشی کم ہی پیدا ہو پاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں فیض کی ایک نظم ”رقیب سے“ نے ہمارے نقّادوں کو متوجہ کیا ؛ ”آکہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے“ اس آغاز میں یقیناً کشش ہے لیکن آگے چل کر یہ نظم ایک طرح کے پراپیگنڈے میں بدل گئی ہے۔ داغ کی غزل میں رقیب کا کردار عام شعرا سے خاصا مختلف دکھائی دیتا ہے، شاید اس لیے کہ طوائفوں سے تعلقات نے انھیں ایسے کئی کرداروں سے ملایا ہوگا ؎

سمائیں اپنی نگاہوں میں ایسے ویسے کیا   رقیب ہی سہی ہو آدمی ٹھکانے کا
بلائے عشق تو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو   مرا رقیب بھی رویا گلے لگا کے مجھے
وہ اس ادا سے وہاں جا کے شرمسار آیا   رقیب پر مجھے بے اختیار پیار آیا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف، شکووں کا مزا جاتا رہا

تمہارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑوں گا
سمجھ لینا کہ دو مردے گڑیں گے ایک مدفن میں

غیر کو بھی ملا لیا ہم نے   وہ بنائیں گے راز دار کیسے
ایسا تنگ آئے ہاتھ سے دل کے   روئے ہم غیر سے گلے مل کے
کچھ تذکرۂ رنجشِ معشوق جو آیا   دشمن کے بھی آنسو نکل آئے مرے آگے
تم خواہ عداوت اسے سمجھو کہ محبت   رہتی ہے رقیبوں کی مجھے تم سے سوا یاد

آخر میں کچھ داغ کی حیات : کشمیری ماں کا یہ دہلوی بیٹا ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چاندنی چوک دہلی میں دن کے دو بجے پیدا ہوا۔ ابھی پانچ برس کا بھی نہیں تھا کہ باپ کو ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کو قتل کروانے کے جرم میں پھانسی ہو گئی۔ خالہ نواب یوسف علی خاں، والیِ رامپور، سے وابستہ تھیں چنانچہ تقریباً ۱۳ برس کی عمر تک نواب مرزا خاں کی پرورش رام پور میں ہوئی۔ اس اثنا میں والدہ نے مرزا فخرو، ولی عہد بہادر شاہ ظفر، سے نکاح کر لیا۔ اس طرح ۱۴ برس کی عمر میں داغ لال قلعے میں داخل ہوئے اور اسی زمانے میں استادِ شاہ شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ خوشنویسی میں میر پنجہ کش کے شاگرد ہوئے۔ فنونِ سپہ گری : تلوار چلانا، تیر اندازی اور بندوق چلانا خود مرزا فخرو نے سکھایا۔ شہ سواری کی تعلیم بندو خاں سے لی اور بانک اور پھکیتی کی مرزا سنگی بیگ سے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا، ۱۸۵۷ء میں غدر۔ داغ رامپور چلے گئے لیکن دہلی آتے جاتے رہے کہ نواب یوسف علی خاں نے کوئی خاص خدمت ان کے سپرد نہیں کی تھی، محض ولی عہد کے مصاحبوں میں داخل کر دیا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے تو انھوں نے داغ کو داروغہ فراش خانہ و اصطبل بنا دیا۔ داغ کا رنگ کالا تھا، اس پر اصطبل کی داروغگی۔ مقربینِ سرکار و دربار کے رقیبوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک ستم ظریف نے اصطبل کے دروازے پر لکھوا دیا ؎

شہرِ دلی سے آیا اِک خوش فکر آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

شعر کی فنّی پختگی اور رعایتِ لفظی قابلِ داد ہے۔ لیکن نواب مرزا خاں داغ کو اِس کے خالق کا پتہ نہ چل سکا ورنہ یقیناً اُس سے کچھ سلوک کرتے۔ غرض ۲۴ برس تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران میں کلکتے کی سیر بھی کی اور حج بھی کیا۔ ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوا تو داغ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے ؎

پہلے تو پوچھتا تھا زمانہ ہماری بات
اب ہے یہ حال کوئی ہمیں پوچھتا نہیں

۱۸۸۸ء میں داغ حیدرآباد پہونچے۔ یہاں سب سے پہلے آلم اور رنج [illegible]ر شاگرد ہو [illegible] پھر تو تانتا لگ گیا، لیکن مقصودِ اصلی حاصل نہ ہوا۔ [illegible] پاس تھا [illegible] ہو گیا۔ تنگ آکر واپس چلے گئے۔ دہلی میں ابھی دس ماہ ہی قیام کیا تھا کہ وہاں سے طلبی ہوئی۔ قرض ادھار لے کر مارچ ۱۸۹۰ء میں پھر حیدرآباد پہونچے۔ ایک سال بعد فروری ۱۸۹۱ء کو رات میں نظام کی غزل اصلاح کے لیے پہونچی اور صبح آٹھ بجے دربار میں حاضر ہونے کا حکم بھی۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں ساڑھے چار سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں نظام کی سالگرہ کے موقع پر نہ صرف بلبلِ ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک کے خطابات ہی ملے بلکہ روزِ ورود سے تنخواہ بھی ایک ہزار روپیہ ماہوار کر دی گئی جو اردو کے کسی اور شاعر کو کسی زمانے میں نہیں ملی۔ دو ہزار روپیہ سالانہ کا ایک موضع بھی بطورِ جاگیر عطا ہوا۔ اولادِ معنوی یعنی شاگردوں کی تعداد کئی ہزار لیکن اولادِ صُلبی میں صرف ایک بیٹا جو رام پور میں پیدا ہوا اور مر گیا۔ [illegible] نے بیوی کے بھانجے کو متبنیٰ کیا تھا داغ نے بیوی کی بھانجی کو [illegible] ۱۸۹۸ء میں بیوی کا انتقال ہو گیا۔ امیر مینائی کے تعزیت نامے کے [illegible] لکھا: تعزیت نامہ آیا اور مجھ کو بھی رلایا ؎

[illegible] طوفاں ہے غم ہجر میں رونا کیا ہے
[illegible] معلوم کہ انجام کا ہونا کیا ہے

تمام عمر [illegible] رفیق اور عاشقِ زار مجھ سے چھٹ گیا۔ کس سے کہوں کیا کروں۔ سخت صدمہ ہے۔ کوئی عزیز پاس نہیں ... مرحومہ زبانِ اردو پر بہت قابض تھیں۔ اکثر محاوروں میں مجھ کو مدد ملتی تھی۔

داغ ادھیڑ عمر ہی سے مختلف عوارض سے مبتلا رہنے لگے تھے، اہلیہ کے انتقال نے اور توڑ دیا۔ آخر ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو ۷۵ سال کی عمر میں اردو زبان و غزل کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ؎

داغ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

بے شمار شاگردوں اور ممتاز ہم عصروں نے مرثیے کہے، تاریخیں کہیں۔ دو مستقل تاریخی مادّے ہیں: "نواب مرزا خان داغ" اور "فصیح الملک داغ"۔ معتبر ترین شاگرد علّامہ اقبال نے لاجواب مرثیہ کہا، دو شعر ہیں ؎

چل بسا داغ آہ میّت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں

□□

غزل

مجھے کیا غم جو غم سے غیر حالت ہوتی جاتی ہے
خوشی یہ ہے کہ تکمیلِ محبت ہوتی جاتی ہے

نہ جانے کون سے عالم میں لے آیا جنوں مجھ کو
کہ اپنی زندگی سے آپ نفرت ہوتی جاتی ہے

ہر اک تارِ نفس الجھا ہوا ہے غم کے کانٹوں میں
حیاتِ نور رہینِ یاس و حسرت ہوتی جاتی ہے

مجازی زندگی ڈھلنے لگی رنگِ حقیقت میں
محبت حُسن معراجِ محبت ہوتی جاتی ہے

جدھر بھی غور سے دیکھا ترا جلوہ نظر آیا
نظر اب آئینہ دارِ حقیقت ہوتی جاتی ہے

صدا لایا ہے اس منزل پہ ذوقِ مے کشی مجھ کو
کہ یہ عادت مری اب میری فطرت ہوتی جاتی ہے

——— مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی۔ گولہ گنج لکھنؤ

غزلیں

نہ جانے کون ہے وہ جس کی بددعاؤں سے
ہمیں نجات نہیں مل سکی سزاؤں سے
ہم اک چراغ اکیلے تھے گھر کے آنگن میں
تمام عمر الجھتے رہے ہواؤں سے
دہائی میری وفاؤں کی لوگ دینے لگے
دیا جواب جفاؤں کا جب جفاؤں سے
مسافروں کو بھٹکنے سے کون روکے گا
تمام راستے خالی ہیں رہنماؤں سے
نہ بولنے کی قسم کھا کے یادؔ ہم چپ ہیں
ہمارے کان مگر تھک گئے صداؤں سے

شاہجہاں بانو یادؔ دہلوی

سہرو منزل
گولہ گنج۔ لکھنؤ

ہاتھیوں کا جو مرے سامنے لشکر بھی ہے
چونچ میں ننھی ابابیل کے پتھر بھی ہے
بچ نہ پائے گا سزا سے کبھی قاتل مرا
اب گواہوں میں مرے قتل کا منظر بھی ہے
میری آواز کو خاموش نہیں کر سکتے
بولتا نوک پہ نیزے کی مرا سر بھی ہے
ظلم تو سوچ کے یہ آپ ہی مر جائے گا
صبر کا دل میں مرے ایک سمندر بھی ہے
اب چمن والوں کی ہو خیر ترابی کیسے
قتل و غارت بھی یہاں گرمیٔ محشر بھی ہے

مظفر سلطان حسن ترابی

لکچرر گورنمنٹ انٹر کالج
مراد آباد

مطلب پرست سب ہیں کوئی رہنما نہیں
دنیا کا تجربہ ہے مرا تجربہ نہیں
اس پر عیاں نہ ہونے دیا میں نے دل کا حال
کاغذ کو سادہ چھوڑ دیا کچھ لکھا نہیں
اب بھی ملیں گے ہاتھ بہت سے اسی طرح
یہ اور بات ہے کہ سروں پر ردا نہیں
تسلیم کرلیں آؤ خطاوار دونوں ہیں
اس کے سوا اب اور کوئی راستہ نہیں
زندہ مرا ضمیر ہے اس واسطے عتیقؔ
شیطاں صفت جو تھے انھیں سادھو کہا نہیں

عتیق الہ آبادی

۲۶/۲۲۔ اسیہ گنج
الہ آباد

آئی جو تیری یاد تو تڑپا کیے ہیں ہم
تیرے حسیں خیال سے بہلا کیے ہیں ہم
وحشت نہ پوچھیے کہ شبِ غم میں کیا رہی
دامن کے تار تار سے الجھا کیے ہیں ہم
معصومیت میں ان کے شرارت چھپی رہی
ترچھی نظر کی اوٹ سے دیکھا کیے ہیں ہم
بٹھلا دیے حجاب کے پہرے تو کیا ہوا؟
دل کی نگاہ سے انھیں دیکھا کیے ہیں ہم
ان کی زباں سے آج یہ پیکرؔ نکل گیا
سارے جہاں میں آپ کو رسوا کیے ہیں ہم

پیکر جعفری

اترولہ۔ گونڈہ

اس سے اچھا نہیں عنوان فسانے کیلئے
پھونک دو میرے نشیمن کو زمانے کے لیے
آگ سے کھیلنا آسان نہیں ہے ہمدم
حوصلہ چاہیئے دامن کو بچانے کے لیے
زندگی میری اگر باعثِ رسوائی ہے
کوئی تدبیر کرو مجھ کو مٹانے کے لئے
راہبر یوں تو ہر اک گام پہ ملتے ہی رہے
کوئی مخلص نہ ملا راہ بتانے کے لیے
ظرف چھلکے نہ کہیں ہوش میں رہنا زاہدؔ
آج بیٹھے ہیں سبھی جام اٹھانے کے لیے

زاہد لکھنوی

ماتھر روڈ، صاحب گنج، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۳

طنز و مزاح

پروفیسر محمد زماں آزردہ
شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی۔ جموں

اپنی تو عادت ہے گھبرانے کی!!

ھر آدمی کی زندگی میں ایک منزل وہ آجاتی ہے جب اس کو آدمیت کے آثار سے کم اور اپنی عادتوں سے زیادہ پہچانا جاتا ہے۔ بلکہ آدمی کی شناخت کم اور عادتوں کی پہچان زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کبھی اس کے برعکس ہو تو تعجب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بڑی سیدھی اور خوش سلیقہ خواتین کے لئے بھی مشہور ہے کہ بہت بولتی ہیں۔ چنانچہ کسی آدمی کے سامنے اگر کوئی خاتون نہ بولے تو اس کو تعجب ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ بولتے کم اور چیختے زیادہ ہیں اسی طرح سے ایک اور ہمارے کرم فرما ہیں جو بولتے نہیں بلکہ بحث کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر عادت کے پیچھے ایک کہانی، ایک قصہ، کوئی حادثہ، کوئی واقعہ یا کوئی ضرورت ہوتی ہے مگر اس جدید دور میں قصے کہانیوں پر کون کان دھرتا ہے اور نہ اسباب وعلل کی فکر کرنے کی کسی کو فرصت ہے لوگ صرف نتیجہ دیکھتے ہیں اور نتیجہ چاہتے ہیں۔ یہ نتیجہ کتنا ہی گمراہ کن کیوں نہ ہو مگر ہے تو نتیجہ — کسی عادت کے پیچھے کونسی ضرورت اور کونسا حادثہ یا واقعہ کارفرما ہے اس کی کسی کو فکر نہیں۔ بہرحال عادت ایک نتیجہ ہے اور یہ نتائج آدمی کی شناخت کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ بعض عادتیں انسان کی زندگی کے ساتھ اس طرح جڑ جاتی ہیں کہ طبیعت ثانیہ کی صورت اختیار کر کے سوانح حیات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ آپ چاہے آدمی کی ذات کو منفی کر لیجئے مگر اس کی عادتوں کا ذکر ضرور کرنا ہوگا۔

حالانکہ ہمارے جو دوست ہر دم گھبرائے ہوئے رہتے ہیں وہ ہم کو اپنے مقابلہ میں زیادہ ذمہ دار نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ گھبراہٹ صرف دوراندیشی کی نشانی ہے کوتاہ اندیش کبھی نہیں گھبراتے۔ مگر اس کا کیا کہیئے کہ اُن کی دوراندیشی کسی کو نظر نہیں آتی مگر ان کی لرزا دینے والی گھبراہٹ کا تماشا ہر آدمی دیکھتا ہے۔

ہم تو ذاتی طور پر ان کی ہوشمندی، دوربینی اور عقلمندی کی دل ہی دل میں داد دیتے ہیں مگر آپ سے کیا عرض کریں کہ ہماری بھی عجیب عادت ہے دوسروں کی گھبراہٹ سے بڑی سنجیدگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایک بار کیا ہوا کہ ہمیں ان کا ہم سفر ہونے کا شرف حاصل ہوا گاڑی صبح پانچ بجے تھی اور گھر سے اسٹیشن تک کا سفر دس منٹ کا تھا۔ ہمارا ریزرویشن ایک مہینہ پہلے اس لئے ہو گیا تھا کہ یہ ہمارے دوست نے خود کرایا تھا۔ ہم کراتے تو زیادہ سے زیادہ ایک دن پہلے ہو جاتا۔ کیوں کہ ہم نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ زیادہ آرام سے سفر وہی کرتا ہے جو ریزرویشن پہلے سے نہ کرائے۔ وہ اس طرح کہ ریزرویشن والا مسافر گاڑی، ڈبے اور کنڈکٹر کے تابع ہوتا ہے اور بغیر ریزرویشن والے مسافر کے یہ سب بشمول عام مسافروں کے یعنی جن کا ریزرویشن ہوتا ہے، تابع ہوتے ہیں۔ اس کی ان سب کو ضرورت ہے اور عام مسافر کی کسی کو ضرورت نہیں۔ مگر لوگوں کی دوراندیشی کو کیا کہیئے۔

خیر۔ ہم بات کر رہے تھے اپنے دوراندیش دوست کی۔ سفر کی تاریخ سے ایک دن پہلے ہم نے اپنے دوست کو یقین دلایا کہ ہم وقت پر اسٹیشن پہونچیں گے۔ پہلے تو وہ گھبرا کے یہ کہنے لگے کہ وقت پر پہونچیں گے، تب ہو چکا سفر۔ کم سے کم ایک گھنٹہ پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ جانا چاہئے۔ ہم نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارا تو ریزرویشن ہے۔ اس پر وہ اور گھبرا کے بولے۔ اس کا کیا بھروسہ۔ کبھی کبھی پلیٹ فارم بدل جاتا ہے اور اگر جلدی میں دوسری گاڑی میں سوار ہو گئے تو کیا ہوگا۔ ہم نے کہا ایسا بہت کم ہوتا ہے اس پر وہ کہنے لگے کہ ہاں! ہوتا تو بہت

کم ہے مگر اس کا کیا ٹھیک ہے کہ آج نہیں ہوگا۔ ہم نے کچھ لطف لیتے ہوئے کہا، آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہم جلدی پہونچیں گے —— صبح پونے چار بجے گھر سے چلیں گے اور چار بجے تک پہنچ ہی جائیں گے۔ اس پر وہ ایک دم گھبرا گئے کہ لگتا تھا اپنا گریباں چاک کریں گے اور بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں کہنے لگے ایسا غضب نہ کیجیے۔ اگر رکشہ نہ ملا تو کیا کریں گے۔ ٹریفک کے جام ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ اور ہاں یہ بھی بتایئے کہ سامان کیا ہے۔ ہم نے بڑے اطمینان سے کہا کہ سامان کوئی زیادہ نہیں ہے۔ بس ایک بریف کیس اور چھوٹا سا بستره۔

ہمارے اطمینان پر وہ بڑی بے اطمینانی سے بولے، "اگر قلی نہ ملے تو کیا خود اٹھا پائیں گے"۔ ہم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بڑا ہلکا سامان ہے۔ بستر ہلکا سا ہے اور بریف کیس میں ایک دو جوڑے کپڑے اور کچھ ضروری کاغذ رکھنا ہوں گے۔ یہ سن کر بڑی بے چینی سے بولے، "کیا ابھی کاغذ بریف کیس میں رکھے نہیں"۔ ہم نے کہا کہ دیکھیں گے ابھی تو بڑا وقت ہے ان کو ذرا تلاش بھی کرنا ہے۔ یہ سنتے ہی اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور کہنے لگے، "تب ہو چکا سفر۔ سفر کا سارا مزا ہی کرکرا ہو کے رہ جائیگا۔ اب تک آپ نے اپنے ضروری کاغذ نہیں رکھے۔ سامان نہیں باندھا۔ تب پہنچ گئے اسٹیشن اور ہو لیے سوار"

ہم نے ان کو تسلّی دینے کی غرض سے کہا کہ کاغذ ڈھونڈنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے اور پھر سامان تو بندھ ہی جاتا ہے۔

یہ سننا تھا کہ وہ اور پریشان ہو کر کے کہنے لگے، "اب وقت ہی کونسا رہ گیا ہے۔ مان لیجیے کہ آپ کو زکام ہو گیا، کوئی اہم مہمان آگیا، کسی ہمسایہ کا انتقال ہو گیا، تب آپ کا سامان کیسے ٹھیک ہوگا اور کاغذ کیسے ڈھونڈیں گے۔ پھر یہ کوئی ایسا ویسا سفر نہیں۔ انٹرویو کیلئے جانا ہے"

یہ سننا تھا تو ہم بھی تھوڑا بہت گھبرا گئے گو کہ یہ ہماری عادت نہیں مگر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، چنانچہ ہم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا کہ یوں تو زکام ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اور ہمارے ہاں کوئی اہم مہمان بھی نہیں آتا۔ پھر یہاں ہم ہی اور ولا کے ہمسایہ ہیں ہمارا کوئی سایہ ہی نہیں تو ہم سایہ کہاں سے آئے۔ ویسے بھی ایک زمانے سے کسی کے کھانسنے کی آواز نہیں سنی۔ اس بستی میں ابھی شہنائیاں بجنے کی نوبت نہیں آئی تو کسی کا انتقال کیسے ہو سکتا ہے۔

اس پر وہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے۔ "یہ سب آپ کی خوش فہمی ہے۔ زندگی میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا کوئی قاعدہ قانون نہیں۔ ایسے میں اگر گاڑی چھوٹ گئی تو۔

ہم نے عاجز ہوتے ہوئے کہا کہ اتنی دور اندیشی بھی مناسب نہیں۔ گاڑی چھوٹ گئی تو کیا ہوا۔ ہم نے کسی کو لکھ کے تھوڑے ہی دیا ہے کہ اس انٹرویو میں ضرور ہی شامل ہوں گے یا یہی نوکری کریں گے۔ پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ یہ نوکری ہم کو مل ہی جائے گی۔ ویسے بھی آپ کی عادت ہے گھبرانے کی۔

لوگ جب زندگی سے تنگ آ کے گھبرا جاتے ہیں تو اس خیال سے تسلّی ہو جاتی ہے کہ مر جائیں گے تو زندگی کے مصائب سے چھوٹیں گے اور آرام پائیں گے۔ مگر دور اندیشی ذوقؔ کی زبان سے یوں پریشان کرتی ہے کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یعنی آدمی زندگی سے بھی گھبرائے اور مرنے پر بھی راضی نہ ہو۔ واہ! غالبؔ کی کیا بات ہے زندگی سے بھی لطف لیتے ہیں اور موت سے بھی نہیں گھبراتے کہتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہمارے دوست نے ہماری تقریر سن کے بڑے مشفقانہ انداز میں کہا، "آپ ہماری باتوں سے گھبرا گئے۔ بھائی ہم نے اپنے تجربے کی بنیاد پر آپ سے یہ سب کہا۔ ہم نے کئی بار یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہونچے، سامان بھی نہیں تھا، ریزرویشن بھی تھا اور گاڑی چھوٹ گئی —— ہم آپ سے اس لئے اصرار کرتے ہیں۔ خیر آپ کی مرضی۔ جیسے چاہیں ویسے کیجیے لیکن پلیٹ فارم پر ایک گھنٹہ پہلے ضرور پہنچیے۔

ہم نے ایک سعادت مند خورد کی طرح سے اطمینان دلایا اور وہ چلے گئے۔ مگر جاتے ہوئے کئی بار تاکید کی کہ دیر نہ ہونے پائے۔

ابھی صرف شام کے پانچ بجے تھے۔ ہم نے سوچا کہ تھوڑا آرام کرلیں اس کے بعد کھانا کھائیں اور بعد میں سامان اپنا باندھیں اور پھر جلدی سوجائیں تاکہ صبح چار بجے اسٹیشن پہنچ جائیں۔ یہی سوچ کے ہم لیٹ گئے کہ اسی میں آنکھ لگ گئی اور آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ہم گھبرا کے اٹھے، اُٹھ کے بیٹھ گئے، گھڑی دیکھی تو شب کے آٹھ بج رہے تھے۔ دروازہ کھولا تو ہمارے ہم سفر دوست اپنا سامان لیے ہوئے کھڑے تھے۔ ہم نے ایک نظر ان کو اور ایک نظر اپنے کمرے کو دیکھا اور بے اختیار ہو کے کہا، کیا ابھی چلنا ہے۔

اس پر وہ گھبراتے ہوئے بولے، "ہم نے سوچا کیا پتہ آپ کی آنکھ صبح نہ کھلے اور ہم اسٹیشن پہنچ کر پریشان ہو جائیں اس لیے یہاں چلے آئے۔ تاکہ صبح آپ کو جگائیں۔"

ہم اپنے دوست کی احتیاط کی داد دے رہے تھے اور اپنی خوش نصیبی پر فخر محسوس کرنے لگے کہ ایسے دوستوں کی عنایت سے ہم اس مرتبہ انٹرویو ضرور دے پائیں گے۔

ہم نے بھی محض احتیاطاً پوچھا کہ کھانا آپ نے کھالیا کیا؟ انہوں نے جواب دیا، "ہاں کھالیا بلکہ کل دوپہر کے لیے بھی ڈبے میں کھانا لے آیا ہوں۔" ہم نے چونکتے ہوئے کہا کہ سات ہی گھنٹے کا تو سفر ہے، دہلی پہونچ کے کھائیں گے کھانا ساتھ اٹھانے کیا ضرورت ہے۔

ہماری اس نصیحت کے جواب میں وہ بگڑتے ہوئے بولے، "گاڑی کیا موت کا فرشتہ ہے جو ہمیشہ وقت پر پہنچے، کیا پتہ اب کے لیٹ ہو جائے۔ کہیں کوئی پٹری اکھاڑ دی گئی ہو۔

اس گفتگو سے ہم بھی گھبرانے لگے۔ ہم نے فوراً ہی پوچھا کہ پٹری کیوں اکھاڑی گئی ہوگی۔

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا، "ممکن ہے کسی مسافر اور قلی میں جھگڑا ہو گیا ہو۔ کسی شہر میں بجلی فیل ہو گئی ہو، کسی سیاسی لیڈر نے لوگوں کو تشدد پر اکسا دیا ہو، کہیں کسی فیکٹری کے مزدور ہڑتال پر ہوں۔ ان سب کے غصے کی تان ریل کی پٹری پر ٹوٹتی ہے اور کس پر بس چلے گا۔"

ہم نے گھبرا کے کہا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ گاڑی پٹری سے اتر بھی سکتی ہے۔

وہ بولے "اور کیا" ہمارا چہرہ اتر گیا مگر اپنی قوت کو سمیٹتے ہوئے بولے، اسی لیے آپ نے کھانا ساتھ اٹھایا ہے۔ انہوں نے بڑی متانت سے کہا، "اور کیا یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

ہمارے ہاتھ پاؤں کچھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ ہم نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا، اس میں تو ہماری موت بھی ہو سکتی ہے۔

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا، "یہ بھی ہو سکتا ہے" تب ہم نے ان کو گھورتے ہوئے کہا، "یہ سب ہوا تو ہم انٹرویو نہیں دے سکیں گے انٹرویو نہیں دیا جائے گا تو نوکری بھی نہیں ملے گی۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ سفر میں سو خطرے ہیں اور سفر نہ کرنے میں ایک ہی۔"

یہ سن کر وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے، "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سفر تو ضرور ہی کرنا ہے۔ وہ اس لیے کہ ریزرویشن ہو چکا ہے۔"

ہم نے بڑے اطمینان سے کہا آپ کا بہت بہت شکریہ کہ ریزرویشن آپ نے کرادیا مگر ہم تو آپ کی گفتگو سے اتنا گھبرا گئے کہ محض ریزرویشن کے لیے اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ آپ ضرور جائیے۔ ہم آپ کو اسٹیشن پہونچا دیں گے۔"

چاہیے تو یہ تھا کہ ہمارے اس فیصلے سے ان کو چین آجاتا لیکن ان کی بے چینی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ہم گھبرا کے اٹھے اور اپنے دوست سے کہا کہ "آپ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جائیے ہم کھانا کھا کے آتے ہیں۔"

ہم کھانا کھا کے آئے تو میز پر ایک تحریر ملی۔ "آپ کے فیصلے نے گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا ہم نے سوچا تھا کہ ایک سے دو بھلے بہر حال آپ کی مرضی۔ لیکن آپ وقت پر جاگ جائیں تو اسٹیشن آ کے دیکھ لیجیے کہ ہم پلیٹ فارم پر سو نہ گئے ہوں۔ اب ہم اسٹیشن چلتے ہیں۔ آپ اپنا ٹکٹ خود ہی منسوخ کرائیے۔"

یہ تحریر پڑھ کے ہم نے اطمینان سے تیاری کی۔ گھڑی کا الارم تین بجے صبح پر رکھا اور سو گئے۔ ٹھیک تین بجے آنکھ کھلی۔ اطمینان سے چائے بنا کے پی لی اور کچھ کام وام کیا اور اسٹیشن پہنچے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ہمارے دوست پلیٹ فارم پر ایک بینچ پر بیٹھے بیٹھے سو رہے ہیں۔ ہم نے جب یہ دیکھا کہ گاڑی کے چھوٹنے میں پندرہ منٹ ہیں تو ہم نے جگایا اور ہمارے اطمینان اور ان کی گھبراہٹ دونوں کو گاڑی پر

افسانہ

رتن سنگھ
۲۲۔ ادارت نگر۔ نربدا روڈ
جبل پور

داستان

بات پرانے زمانے کی ہے۔

ایک آدمی کو بہت بھوک لگی۔ روٹی کی نہیں، پیسے کی۔ اس نے اپنے گھر کے سکھ کو چھوڑا، بیوی، بچوں کے ساتھ کو بھولا، اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ پردیس میں جاکر وہ مٹی کے ساتھ مٹی ہوا۔ اس کو چھل کپٹ بھی کرنے پڑے، ٹھگی یاری بھی کی۔ کئی تو یہاں کہتے ہیں کہ اس نے قتل بھی کیے۔ تب کہیں جاکر اس کی بھوک کسی حد تک مٹ پائی۔ اس کے پاس اتنا روپیہ پیسہ آگیا، اتنا آگیا کہ اپنے گھر سے جو بڑا سا تھیلا لے کر چلا تھا، وہ سارا سونے کے سکوں سے بھر گیا۔ اب اس نے ایک گھوڑا خریدا۔ اپنا روپیہ پیسہ اس پر لادا، اور خوش خوش گھر کی طرف چل دیا۔

اب اس راستے میں ایک بہت بڑا جنگل پڑتا تھا۔ اس جنگل میں وہ ایک پیڑ کے نیچے آرام کر رہا تھا تو اس پیڑ کی گھنی ٹہنیوں کے بیچ چھپے ہوئے ایک چور نے تاڑ لیا کہ اس آدمی کے پاس بہت پیسہ ہے۔ وہ اس پیسے کو ہتھیانے کی بات سوچنے لگا۔ اس نے سوچا کہ مسافر تھکا ہوا ہے جب اس کی آنکھ لگ جائے گی تو میں اسے مار کر اس کا پیسہ اور گھوڑا لے کر چل دوں گا۔ مسافر کے سو جانے پر جب وہ پیڑ سے اتر کر اسے مارنے جا رہا تھا تو ایک دوسرے آدمی نے اچانک اس کا تلوار والا ہاتھ پکڑ لیا، اور قتل کے ارادے سے آئے چور کو اس نے مار دیا۔ اس ہنگامے میں مسافر کی نیند کھل گئی اور اس نے اپنے بچانے والے کا شکریہ ادا کیا۔

اب جان بچانے والے آدمی نے پیسے والے آدمی سے کہا۔

"یہ دنیا ایک طرح سے بہت بڑا جنگل ہے۔ اس میں جگہ جگہ ٹھگ، لٹیرے اور چور چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ چلو میں تمھیں اس جنگل کے پار پہنچا دیتا ہوں۔ راستے میں میرا گھر پڑتا ہے۔ تم اگر چاہو تو وہاں کچھ دیر آرام بھی کر سکتے ہو۔"

لیکن جب یہ اس کے گھر پہنچا تو بچانے والے کی بیوی نے سوچا کہ میرا آدمی تو مورکھ ہے۔ اس آدمی کی جان بچا کر خوش ہو رہا ہے یہ نہیں سوچتا کہ اتنا پیسہ اگر مل جائے تو ہماری زندگی خوشیوں سے بھر جائے گی۔ اس لیے اس نے یہ کیا کہ دو گلاس دودھ کے بھر کر لائی ایک میں اس نے موٹی بالائی ڈالی اور دوسرے میں پتلی۔ موٹی بالائی والا گلاس اس نے اپنے پتی کو دیا اور پتلی بالائی والا مسافر کو۔ مسافر کے گلاس میں اس نے زہر ملا دیا تھا مقصد یہ تھا کہ مسافر مر جائے گا تو سارا پیسہ ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔

اب اس کا پتی کچھ زیادہ ہی شریف آدمی تھا۔ اس نے سوچا میری بیوی سے غلطی ہو گئی۔ اسے موٹی بالائی والا گلاس گھر میں آئے مہمان کو دینا چاہیے تھا۔ اور اس نے گلاس بدل لیے۔

اب مسافر کیا دیکھتا ہے کہ دودھ پیتے ہی وہ فرشتہ صفت انسان جس نے چور سے اس کی جان بچائی تھی وہ وہیں گر کر ڈھیر ہو گیا۔ مسافر سمجھ گیا کہ وہ ایک مرتبہ پھر موت کے منہ سے بچ گیا ہے۔

اب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چلا۔ چلتا گیا، چلتا گیا۔ اس کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر وقت چوکتا کہ کہیں کوئی چور اچکا یا لٹیرا تو اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔

آخر اس نے لمبی مسافت طے کر لی۔ منزلیں مارتا چلا گیا پیچھے چھوڑتا چلا گیا اور آخر وہ اپنے گھر پہونچ گیا۔

لیکن گھر پہنچنے سے پہلے اس نے سوچا کہ اپنی بیوی کا امتحان لینا چاہیے کہ وہ سچ مچ اس سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ اس لیے

اس نے یہ کیا کہ ایک پھٹا پُرانا کُرتا پہنا۔ منھ پر کچھ مٹی بھی مل لی۔ اپنے گھوڑے کو تو اس نے گھر کے باہر نیم کے پیڑ کے نیچے ایک آڑ میں باندھ دیا اور خود بُری سی صورت بنا کر پھٹے حال بیوی کے سامنے پہنچا۔ پہلے تو بیوی نے اسے پہچانا نہیں۔ لیکن جب اس نے پہچان بھی لیا تو بھی اس کی کوئی آؤ بھگت نہیں کی۔ یہاں تک کہ پانی کو بھی نہیں پوچھا۔

یہ آدمی پریشان ہو گیا ۔"میں نے یہ روپیہ کماتے ہوئے کیا کیا سپنے دیکھے تھے اور یہاں یہ حال ہے کہ اپنی بیوی بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہے۔" یہ سوچ کر اس کا من اچاٹ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ عورت اس پیسے کا سکھ بھوگنے کے لائق نہیں ہے۔ اور شاید اس پیسے کے لائق میں بھی نہیں ہوں۔ پیسے کا سُکھ تو انسان کو بیوی بچوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

یہی سوچتے سوچتے اس نے اپنا فقیروں والا لبادہ اُتارا اور پھر وہی امیرانہ ٹھاٹ والے کپڑے پہن کر جب وہ گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو اس کی بیوی نے اسے پہچان لیا۔ وہ افسوس سے ہاتھ ملتی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی۔ لیکن مرد کا دل بُجھ چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور یہ جا، وہ جا۔

اپنے گھر سے باہر آ کر اس نے سوچا کہ اب وہ کیا کرے۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ کدھر جائے، کدھر نہ جائے کہ اچانک اس کی نظر کچھ لوگوں پر پڑی جو راستے میں کھڑے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سب چور، ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ وہ سب کے سب اس پر نظریں جمائے ہیں کہ میں کدھر جاتا ہوں۔ شمال، جنوب، مشرق، مغرب میں جدھر بھی جاؤں گا یہ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

اس نے سوچا کہ اس پیسے کے رہتے ہوئے میری جان کو بھی خطرہ ہے لہٰذا اس پیسے سے کسی نہ کسی طرح نجات پانا ہی چاہیے۔

دل ہی دل میں فیصلہ کر کے وہ ایک طرف کو ہو لیا۔ اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو اس کا پیچھا کرنے والے اس کے آس پاس ہی کہیں چلے آ رہے تھے۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ اس کی نیند حرام ہو گئی۔

وہ ذرا آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھے برگد کے نیچے بہت سے سادھو سنیاسی لیٹے ہوئے تھے۔ شاید سفر کے تھکے تھے۔ اس لیے برگد کا سایہ پا کر وہ گہری نیند میں تھے۔ نیند تو اسے بھی آ رہی تھی۔ اس لمبی مسافت میں اس پیسے کے رہتے ہوئے اسے ایک رات بھی چین کی نیند نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس پیسے سے نجات حاصل کر لوں۔ یہ سادھو لوگ ہیں، ان کو پیسہ دوں گا تو دھرم بھی ہو گا۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے سارے سونے کے سکّے برابر برابر بانٹ کر ہر سادھو کے پاس رکھ دیئے۔ اس طرح اسے بڑا سکون ملا اور وہ وہیں پر برگد کے نیچے سو گیا۔ اسے بڑی گہری نیند آئی اور وہ لمبی تان کر بے فکر ہو کر سویا۔

لیکن اِدھر یہ ہوا کہ جن سادھوؤں کے پاس اس نے سونے کے سکّے رکھ دیئے تھے وہ گہری نیند میں ہونے کے باوجود کچھ بُرے بُرے ڈراؤنے خواب دیکھنے لگے اور ان کی نیند ٹوٹ گئی ۔ وہ چونک کر جاگ پڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس سونے کے سکّے کسی نے رکھ دیئے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ نیند ٹوٹنے کی کیا وجہ تھی۔ ان کے گورو نے مشورہ دیا کہ ہم سنیاسیوں کا اس دھن دولت سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔

تبھی ان کی نظر اس آدمی پر پڑی جو روپیے والے تھیلے کو خالی کر کے اسے زمین میں بچھا کر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ روپیہ اسی آدمی نے ان کے پاس رکھا ہے۔ انھوں نے وہ سارے سکّے پھر اسی کے پاس ڈھیر کر دیئے اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ لیے۔

سونے کے سکّوں کا اس کے پاس ڈھیر لگا تھا کہ اس کی نیند پھر سے اُچاٹ ہو گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ پیسے تو پھر اسی کے پاس واپس آ گئے ہیں۔

اب وہ کرے تو کیا کرے۔

دور سے اسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا۔ ضرور لٹیرے ہوں گے۔ وہ مجھے مار دیں گے اور پیسہ چھین لیں گے۔ پیسہ چھننے کا اسے افسوس نہیں ہو گا۔ لیکن اس کی جان بھی تو جائے گی۔

تبھی اسے زمین میں ایک بڑا سا گڈھا دکھائی دیا۔ وہ گڈھا دراصل کسی سانپ کا بِل تھا۔ اس نے سارے کے سارے سکّے اس گڑھے کے راستے اس بل میں ڈال دیئے اور بے فکر ہو کر وہاں سے

چل دیا۔

سانپ کے بل میں جب بہت سے سکے پہونچے تو وہ خوشی کے مارے پھول گیا۔ واہ! بڑھاپے میں روزی روٹی کا انتظام ہوگیا!

اب سانپ یہ کرتا ہے کہ ایک سکّہ باہر لے آتا ہے اور بل کے پاس ہی کہیں رکھ کر چھپ جاتا ہے۔ جیسے ہی کوئی راہ گیر اسے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اُسے ڈس لیتا ہے۔ اس طرح اس کا دوسروں کو ڈسنے کا شوق پُورا ہوجاتا ہے۔

کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ اب تک سانپ کا ایک بھی سکّہ خرچ نہیں ہوا ہے۔ اسے اپنے خزانے سے دوسرا سکّہ نکالنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

اور یہ آدمی، جس نے روپے پیسے کی شکل میں مادی دنیا کی موہ مایا چھوڑ دی تھی، وہ دنیا کے اسی جنگل میں بڑے چین سے زندگی گزار رہا ہے۔ یگوں بیت گئے۔ وہ اب تک زندہ ہے، جیے جا رہا ہے اور اس کے سامنے لوگ آتے ہیں، سونے کا سکّہ اٹھاتے ہیں اور سانپ انھیں ڈس کر دوسری اندھیری دُنیا کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔

اگر کہیں روشنی ہے تو صرف اسی آدمی کی جھونپڑی کی طرف جس کے دل میں اس سکّے کا کوئی لالچ نہیں۔

اور اس سکّے کو پانے والوں کی تو داستان بہت لمبی ہے۔ اگر بیان کرنے لگوں تو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آئے گی۔ اس لیے اس داستان کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ آپ سُکھ سے رہیں یہی دُعا کرتا ہوں۔

□□

خوُدنوشت ۔۔۔ صفحہ، کا بقیہ

۵۔ پہاڑ پر آگ (انیتا ڈیسائی کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ انگریزی ناول کا اُردو ترجمہ۔ برائے ساہتیہ اکادمی)

انعامات و اعزازات

۱۔ مہاراجہ رندھیر سنگھ ایوارڈ (کالج میگزین میں بہترین کہانی کے لیے) ۱۹۴۳ء

۲۔ نیو اٹلانٹک انٹرنیشنل ایوارڈ (مشہور کہانی سرخ ساڑی کے انگریزی ترجمے کو، جو خاکسار نے خود کیا تھا، ہندستانی موضوع پر بہترین کہانی کا ایک بڑا انعام۔ ۱۹۴۸ء)

۳۔ نئی تحریریں ایوارڈ، مدھیہ پردیش (۱۹۶۲ء)

۴۔ مغربی بنگال اکادمی ایوارڈ (۱۹۶۶ء)

۵۔ لائنس کلب (دہلی) انعام اور اعزاز برائے مثبت نگاری (۱۹۶۸ء)

۶۔ غالب ایوارڈ (۱۹۸۵ء)

۷۔ حکومت ہند، سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ ایوارڈ (۱۹۸۹ء)

۸۔ ہندی اکادمی دہلی ایوارڈ برائے کہانی (۱۹۹۰ء)

۹۔ دہلی اُردو اکادمی ایوارڈ برائے بچوں کا ادب (۱۹۹۲ء)

۱۰۔ اترپردیش اردو اکادمی کا انعام (کتاب رنگ محل پر) ۱۹۹۳ء

□□

اُردو املا و قواعد ۔۔۔۔۔۔۔ صفحہ ۲۱ کا بقیہ

کوئی بیرونی زبان حَکَم نہیں ہوسکتی۔ اردو کے لسانی معاملات میں قولِ فیصل کسی دوسرے کا نہیں خود اردو کا اپنا ہوگا یعنی اردو کے داخلی نظام کی رو سے ہوگا۔ کسی بھی زبان کی لسانی خودمختاری اور آزادی کی بنیاد یہی ہے۔ اس نظام کو سمجھنا اور اس کی روشنی میں مسائل کو حل کرنا اردو کی روح سے ہم کلام ہونا اور اس کے مزاج سے انصاف کرنا ہے۔ اس کا حق جیسا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ادا کیا ہے انھیں کا حصّہ ہے۔ اردو کے ایسے پارکھ اور اداشناس ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ زبان کی دنیا عجیب آزادی کی دنیا ہے۔ زبان، مذہب، ثقافت، تاریخ، ان سب سے جُڑی ہوئی ہے، لیکن زبان کی اندرونی مملکت میں سکّہ کسی دوسرے کا نہیں خود اُسی زبان کا چلتا ہے۔ زبان کا چلن پُراسرار طور پر معاشرت اور استعمالِ عام سے قائم ہوتا ہے۔ یعنی زبان شے نہیں "فارم" ہے، یا زبان ساخت ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے فیصلے صحیح خطوط پر اس لیے بھی ہیں کہ وہ زبان کی ساخت کا ساتھ دیتے ہیں۔ اوپر ہم نے فقط بنیادی مسائل سے استنباط کیا ہے۔ ذیلی معاملات کو بھی انھیں پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی اہمیت زبان کے تصور اور اس کے تئیں ذہنی رویے کی ہے۔ اگر طبیعت زبان کی مزاج آشنا ہے اور ترجیحات غیرلسانی نہیں تو لامحالہ ذہن صحیح نتائج ہی تک پہنچے گا۔ فرمان صاحب عربی فارسی اثرات اور ہندی پراکرت اثرات کے بیچ اُردو کا لسانیاتی خوش امتزاجانہ توازن برقرار رکھنے کے پل صراط سے جس کامیابی سے گزرے ہیں، اس کے لیے وہ پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ایسے اہلِ علم اور صاحبِ نظر کسی بھی زبان کے لیے باعثِ فخر ہوا کرتے ہیں۔

□□

ریاستی حکومت کے عزائم

روایتی تعلیم کے توسّط سے

ہر بچّے کو خواندہ بنایا جائے گا

پُرانے زمانے میں جب انسان غیر تعلیم یافتہ تھا اس وقت وہ جنگلوں میں زندگی گزارتا تھا۔ جہالت، بربریت اور وحشی پن اس کی زندگی کا طرزِ عمل تھا۔ جیسے جیسے علم کی روشنی دنیا میں پھیلی انسان ترقی کرتا گیا اور ترقی کرتے کرتے آج بیسویں صدی کے اس سائنسی دور میں آ پہونچا۔ چنانچہ بیسویں صدی کا ربعِ آخر بیداریٔ علم اور ترقی کا عہد بن گیا۔

آج تعلیم کے مختلف رُخ ہمارے سامنے ہیں جن میں روایتی تعلیم، غیر روایتی تعلیم، تکنیکی تعلیم، سائنسی تعلیم اور تعلیم بالغان کو بطورِ خاص فروغ حاصل ہوا۔ غیر روایتی تعلیم آج ایک قومی پروگرام ہے جس کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے ایک موثر لائحۂ عمل تیار کیا ہے، جس کے تحت آج ملک گیر پیمانے پر غیر روایتی تعلیم کو ترقی دینے کا کام کیا جارہا ہے۔

غیر روایتی تعلیم کا پروگرام چھ سے چودہ برس کے ان طلبا و طالبات کے لیے بنایا گیا ہے جو یا تو اسکول گئے ہی نہیں یا جنھوں نے درمیان ہی میں اسکول چھوڑ دیا ہے۔ یہ تعلیم، بیسک تعلیم کو وسیع تر کرنے کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ اس پروگرام کا یہ بھی مقصد ہے کہ ایسے بچّوں کو پڑھنا لکھنا، حساب کتاب کی معلومات بہم پہونچانا اور انھیں اپنی عملی زندگی میں وقتاً فوقتاً پیش آنے والے مختلف مسائل کو حل کرنے کے لائق بنانا نیز یہ کہ اگر وہ آگے تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو اسکول میں داخلہ لے سکیں۔ غیر روایتی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بچّوں کی دل چسپیوں، خواہشات اور ان کے روز مرہ کے معاملات پر منحصر رہتی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غیر روایتی تعلیم کا سلسلہ ایک کم خرچ اور کم وقت میں مکمل ہو جانے والا تعلیم کا ذیلی سلسلہ ہے جس کے ذریعہ ریاست میں اسکول نہ جانے والے ۶ سے ۱۴ برس کے طلبا و طالبات کو داخلہ دلاکر بیسک تعلیم فراہم کی جائے گی۔ اس کے توسط سے بنیادی تعلیم (بیسک ایجوکیشن) کو قبولِ عام بنانے کی موثر کوشش کی جارہی ہیں۔

بچّوں کی مردم شماری کی ایک رپورٹ کے مطابق اترپردیش میں ۶ سے ۱۱ برس کے لڑکے اور لڑکیوں کی کل تعداد ۱۸۴۵۰۶۸۳ ہے، اس میں اسکول جانے والوں کی تعداد ۱۰۵۲۵۰۰ ہے۔ باقی تعداد ان بچّوں کی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اسکول نہیں جا سکے یا درمیان ہی میں اسکول چھوڑ چکے ہیں۔

حکومت نے یہ عزم کیا ہے کہ تعلیم سے محروم بچّوں کو ہر حال میں تعلیم دلائی جائے۔ ریاست کے سکریٹری برائے تعلیم بالغان و غیر روایتی تعلیم جناب سراج حسین غیر روایتی تعلیم کو روایتی تعلیم کے طرز پر ایک تحریک چلاکر کامیاب بنانے میں سرگرمِ عمل ہیں۔

حکومت اترپردیش نے ابھی حال ہی میں ریاست کے تعلیمی نقطۂ نظر سے پس ماندہ طبقوں خاص طور سے طالبات کو تعلیم کے اصل دھارے سے جوڑنے کے لیے ریاست میں ۱۵۰۰ غیر روایتی تعلیمی مراکز کو مکتبوں کے توسّط سے چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ رواں مالیاتی سال میں غیر روایتی تعلیم کے ۵۰۰۰ مراکز کھولے جائیں گے۔

حکومت اترپردیش نے غیر روایتی تعلیم کے لیے مکتبوں کا انتخاب کرنے اور ان میں تعلیم شروع کرنے کے طریقۂ کار کے واسطے تفصیلی ہدایات جاری کی ہیں۔ ان ہدایات کے مطابق سب سے پہلے کمانڈ ایریا میں چلنے والے مکتبوں کی فہرست وقف سروے انسپکٹر اور

ضلع اقلیتی بہبود افسر کی نگرانی میں تیار کی جائے گی اور ان مکتبوں کو ترجیح دی جائے گی جن میں زیادہ سے زیادہ طالبات دینی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

مکتبوں میں غیر روایتی تعلیم کے مراکز کھولنے سے قبل مکتبوں کی انتظامیہ کمیٹی سے گاؤں تعلیمی کمیٹی منظوری حاصل کرے گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کمانڈ ایریا میں سب سے نزدیک واقع بیسک اسکول کے ہیڈ ماسٹر غیر روایتی تعلیم کے دائرے میں آنے والے اقلیتی لڑکے اور لڑکیوں کی فہرست تیار کریں گے جس کی گاؤں تعلیمی کمیٹی منظوری دے گی۔ مکتب کی انتظامیہ کمیٹی انسٹرکٹروں کا ایک پینل تیار کرے گی اس پینل میں شامل انسٹرکٹروں کو گاؤں تعلیمی کمیٹی کی منظوری سے مرکز چلانے کے لیے مدعو کیا جائے گا۔

گاؤں تعلیمی کمیٹی میں سرکاری حکم نامہ کی رو سے اقلیتی فرقہ کا ایک ممبر لازمی طور پر شامل کیا جائے گا۔ ان مراکز پر انھیں لڑکے اور لڑکیوں کا رجسٹریشن کیا جائے گا جو روایتی تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں۔

مرکز کے لیے مطلوب نصابی کتابیں اور دوسری ضروری اشیاء مکتب کی انتظامیہ کمیٹی کے نمائندے اور گاؤں تعلیمی کمیٹی کے نمائندے کی موجودگی میں انسٹرکٹروں کو دستیاب کرائی جائیں گی۔

مکتبوں پر چلائے جانے والے یہ مراکز اردو میڈیم سے چلائے جانے والے غیر روایتی تعلیمی مرکزوں سے مختلف ہیں۔ مکتبوں میں اردو عربی کی تعلیم تو دی ہی جاتی ہے۔ طلباء کو ہندی کی بھی معلومات ہو جائے اس پروگرام کا یہی مقصد ہے۔

ظاہر ہے کہ اس اسکیم سے ان لڑکیوں کو تعلیم فراہم ہو جائے گی جو کسی وجہ سے ناخواندہ رہ گئی ہیں یا جنھوں نے درمیان میں اسکول چھوڑ دیا ہے۔

اترپردیش میں مارچ ۱۹۹۶ء تک غیر روایتی تعلیمی مرکزوں پر ۱۳،۶۲۲۹ بچوں کا رجسٹریشن کیا گیا جس میں ۶۳،۳۸۲ لڑکے اور ۷۲،۸۴۷ لڑکیاں شامل ہیں۔ اسی طرح اردو مرکزوں پر مجموعی طور سے ۱،۰۱،۶۱۷ طلباء کا رجسٹریشن کیا گیا جن میں ۴۶۹۰۵ لڑکے اور ۵۴،۷۱۲ لڑکیاں ہیں۔

ریاست کے ۷۰ اضلاع میں ۵۹۶ پروجیکٹ چل رہے ہیں۔ ان کے تحت ۵۸۱۰۷ غیر روایتی تعلیمی مراکز سرگرم عمل ہیں جن میں ۴۸۹۳ اردو تعلیم کے مراکز ہیں۔ ان مرکزوں پر مجموعی طور سے ۵۸۱۰۷ انسٹرکٹر برسرکار ہیں جن میں اعلا ذاتوں کے ۲۹۸۵۶، درج فہرست ذاتوں کے ۱۰۸۰۸ اور پس ماندہ ذاتوں کے ۱۷،۴۴۳ انسٹرکٹر شامل ہیں۔

۱۹۹۵ء کے امتحان میں مجموعی طور سے ۲۳۳۲۰ امیدوار شامل ہوئے جن میں ۲۲۳۲۹ امیدوار کامیاب ہوئے۔

سبھی کے لیے تعلیم فراہم کرنے کا ریاستی حکومت کا عزم اس بات کی دلیل ہے کہ ریاست کے ہر بچے کو خواندہ بنا کر سبھی کو شاہراہ ترقی پر گامزن کیا جا سکے تاکہ خوشحالی کی منزل آسانی کے ساتھ مل سکے۔ بچوں کو تعلیم فراہم کرنے کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بچوں کے سرپرستوں کی اہمیت ناگزیر ہے۔ اگر والدین بیدار اور پرعزم ہوں گے تو وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا کر ملک اور ریاست کی تعمیر و ترقی میں ممد و معاون ہوں گے۔

یہ بھی سچ ہے کہ کوئی بھی حکومت بغیر عوامی تعاون اور اس کی حصہ داری کے اپنے تعمیر و ترقی کے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی تحریک بغیر عوامی تعاون کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو خواندہ بنانے کے لیے آگے آئیں اور ہمارے سماج سے ناخواندگی دور ہو جائے۔ یہی ہم سب کا فریضہ ہے۔

—— ڈاکٹر خورشید ظفر

جشنِ آزادی

جشنِ آزادی! میں لکھتا ہوں قطعہ اک تیرے نام
جوش میں تخیل ہے اور دل میں ہے حد احترام
اس کشاکش میں بھی عہدِ نو کا اک پیماں لیے
جشنِ آزادی سے ہم کو مل گیا اعلا مقام

—— اختر عمر اختر، محمود نگر لکھنؤ

ایسی ادبی تخلیقات جن سے ہماری نسل استفادہ کر سکتی تھی، ہم تک نہ پہونچ سکیں۔

جابر حسین صاحب نہ صرف یہ کہ سیاست داں اور دانشور ہیں بلکہ ایک اچھے محقق بھی ہیں، انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ "قصرِ جہاں" کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ سکا۔

حیرت ہے ایسے مفکر مرثیہ گو شاعر کو کیسے نظر انداز کر دیا گیا جبکہ ان کے کلام میں فکر و تسلسل اور جذبہ و طمطراق کا سمندر موجود ہے جو مذہبی عقیدت، تاریخی حقائق اور زبان و بیان کے محاسن کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔ میرے نزدیک یہی خوبیاں ان کی مرثیہ نگاری کو انفرادیت بخشتی ہیں۔

"قصرِ جہاں" ۴۴ صفحات پر مشتمل مرثیہ ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت میں دیدہ زیبی اور نفاست ہے۔

علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے اس مرثیے کا مطالعہ ضروری ہے بلکہ اس مرثیے کو ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔

——— سلیم عنبر

نام کتاب: "برگِ حنا" (مجموعۂ غزلیات)
شاعر: مہدی علی قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: اُردو مرکز۔ عظیم آباد۔ پٹنہ (بہار)

اُردو مرکز عظیم آباد مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے مختصر مگر بہت اچھے شعری مجموعے شائع کیے ہیں۔ خصوصاً اس کے روحِ رواں جناب جابر حسین لائقِ ستائش ہیں کہ انھوں نے اس مرکز کو ادب اور شعری جہت اس طرح عطا کی ہے کہ وہ لعل و گہر جس پر وقت کی گرد پڑی ہوئی تھی اسے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

"برگِ حنا" جناب مہدی علی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں "ابتدائیات" کے زیرِ عنوان جابر حسین لکھتے ہیں کہ:

"... ان کی غزلیں کلاسیکی روایات اور عصری تخلیقیت سبب فکر و فن کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں، الفاظ و تراکیب رموز و علائم سب کے سب وہی ہیں جو غزلیہ شاعری کی جان ہیں۔ احساس کی شدت اور جذبے کی آنچ نے ان کی شاعری میں جان ڈال دی ہے ان کی غزلیں کلاسیکی اندازِ فکر میں دورِ جدید کے کرب کا خوبصورت اظہار ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ جناب علی مہدی گزشتہ ۳۴ برس سے مشقِ سخن کر رہے ہیں اور ان کی غزلوں میں پختگی کے ساتھ عصری حسیت بھی نظر آتی ہے۔ بعض اشعار بہت اچھے ہیں ؎

دھوپ اور چھاؤں کا تو ربط پُرانا ہے مگر
آج کیوں سایۂ دیوار نہیں ملتا ہے

یوں تو انھوں نے اپنے مقطع میں مہدی کے ساتھ حنا کی رعایت رکھی ہے ان کے یہاں سرخیٔ حنا یا رنگِ حنا اکثر ملتے ہیں لیکن بہرحال ان کا مفہوم نکل آتا ہے اور اسے رعایتِ لفظی پر نہ محمول کیا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن ایک شعر کے مقطع سے ساری رعایتوں کا بھرم ختم ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

کھیل ہی کھیل میں ہر ایک نے پیسا مہدی
اپنے اس نام کی کیا خوب سزا پائی ہے

مہندی پیسی جاتی ہے اور مہندی حنا کو کہتے ہیں۔ مَہدی کے معنی ہدایت کرنے والا اور اسے حنا یا مہندی سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا لہٰذا مہدی کو مہندی سمجھنا فاش غلطی ہے۔

——— ڈاکٹر رضوان حیدر

نام کتاب: "ماں" (منظومات)
شاعر: رضا سرسوی قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: ایمانیہ پبلی کیشن۔ ۲۴۹۴، ترہاہا بہرام خاں، دریا گنج نئی دہلی

زیرِ نظر کتاب "ماں" جناب رضا سرسوی صاحب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس نظم کے ۶ ذیلی عنوان کے تحت انھوں نے عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ عورت جو اشرف المخلوقات کی ایک صنف ہے اور جسے مَردوں نے صنفِ نازک کہہ کر خود کو برتر ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ممتا کا جو بوجھ ایک عورت اٹھا سکتی ہے وہ باپ کے بس کی بات نہیں اور بقول پیام اعظمی ؎

بوجھ ممتا کا اٹھا لے تو کلیجہ پھٹ جائے

عورت ایثار و قربانی کا ایسا سرچشمہ ہے جس کا خشک ہو جانا دنیا کی تباہی و بربادی کا باعث بن سکتا ہے۔

ماں مفلسی میں بھی ماں ہوتی ہے اور آسودہ حالی میں بھی۔ ماں اس وقت بھی ماں ہوتی ہے جب اس کے گرد و پیش خدمت کے لیے سیکڑوں کنیزیں ہوتی ہیں اور اس وقت بھی ماں ہوتی ہے جب وہ خود کسی کی کنیز یا لونڈی ہوتی ہے۔ بقول شاعر ؎

موت کی آغوش میں جب تھک کے سو جاتی ہے ماں
تب کہیں جا کر رضاؔ تھوڑا سکوں پاتی ہے ماں

'ماں' بیٹے کے پاک و پاکیزہ لفظ کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہوئے جناب رضاؔ سرسوی نے اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں کا جس خوبصورتی اور دیانت داری کے ساتھ احاطہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ؎

شادیاں کر کر کے بچے جا بسے پردیس میں
دل خطوں سے اور تصویروں سے بہلاتی ہے ماں
مرتے دم بچہ نہ آ پائے اگر پردیس سے
اپنی دونوں پتلیاں چوکھٹ پہ رکھ جاتی ہے ماں

رضاؔ سرسوی صاحب کا دوسرا کلام مثلاً نوحہ۔ سلام۔ منقبت۔ قطعات اور حمد وغیرہ بھی ان کی مرصع سازی کا نادر نمونہ ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اہلِ ذوق حضرات کے لیے کارآمد و مفید ہے

——— محسن رضا

نام کتاب: "رضا لائبریری جرنل"
مرتبین: پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی
ملنے کا پتہ: رضا لائبریری۔ حامد منزل۔ رام پور

ہندوستان میں اردو کی دو ایسی لائبریریاں ہیں جو اپنی اہمیت و افادیت کی بنا پر بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں۔ ایک خدا بخش لائبریری پٹنہ دوسری رضا لائبریری رام پور۔ زیر نظر جرنل اسی رضا لائبریری کا شمارہ نمبر ۲ ہے۔ یہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ پہلا شمارہ ۱۹۸۹ء میں نکلا تھا یعنی دو شماروں کے درمیان چھ سال کا بڑا وقفہ ہے۔ کاش ایسی اہم ترین لائبریری سے اب بغیر کسی تعطل کے مفید عام جرنل پابندی سے شائع ہونے لگیں۔ ان شماروں سے اس عظیم الشان کتب خانے کا تعارف تفصیل کے ساتھ اردو دنیا میں ہوتا رہے گا۔ موجودہ شمارے میں ہی ڈاکٹر وجہی نے اردو مخطوطات کی جو فہرست دی ہے وہ ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہے۔ مولانا آزاد لائبریری پر ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کا مضمون بھی قابل ذکر ہے۔ پھر تذکرہ 'خزانۂ عامرہ'، علم تفسیر کے فروغ میں رام پور کا حصہ، تفسیر کاشف الحقائق اور عبد الہادی خاں کاوش کا مضمون زبدۃ التفاسیر للقدما المشاہیر، نیز مولانا عبد السلام خاں کا علمائے رامپور کی خدمات۔ پروفیسر گیان چند جیسے بزرگ ادیب کا ڈاکٹر اسپرنگر کی مرتبہ فہرست مخطوطات پر عالمانہ جائزہ۔ غرض اس شمارہ میں شامل ۲۸ مضامین اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں جو نہ صرف لائق مطالعہ ہیں بلکہ محفوظ رکھنے والے ہیں۔ یہ جرنل ہر اعتبار سے معیاری اور دیدہ زیب ہے۔

——— سہیل احمد

نام کتاب: "رقصِ تنہائی" (شعری مجموعہ)
شاعر: علی اصغر   قیمت: ۵۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ شعر و حکمت، حیدر آباد (اے پی)

"رقصِ تنہائی" علی اصغر کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے درس و تدریس میں مصروف ہیں اور انگریزی زبان و ادب کے معلم ہیں۔ وہ لفظوں کے کھوکھلے پن کے بجائے جذبات کی سچائی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ علی اصغر ایک فطری شاعر ہیں اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے صحیح جوہر ان کی مختصر نظموں میں کھلتے ہیں۔ کسی بھی موضوع کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ وہ ایک مختصر نظم میں بیان کر دیتے ہیں وہ ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا کمال ہے۔ امید ہے کہ "رقصِ تنہائی" ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

——— سلمیٰ رضوی

"اودھ آئینۂ ایّام میں"

چند تاثرات

مکرّمی امجد حسین صاحب

دو تین دن پہلے نیا دور کے تین شمارے (مارچ، اپریل، مئی) ملے۔ یہ تینوں شمارے ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، ان میں کئی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مارچ کے شمارے میں وارث کرمانی کی خود نوشت، عنوان چشتی کا "تصوّف کا نظریاتی پہلو" اور راحت علی خاں کا شوق بہرائچی پر مضمون پسند آئے۔ راحت علی خاں کا مضمون پڑھ کر شوق بہرائچی کی یاد تازہ ہوئی اور ان مشاعروں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی جن میں انھوں نے اپنا کلام سنایا تھا اور سامعین میں میں بھی شریک تھا۔

اپریل کے شمارہ میں نیّر مسعود کا مضمون "اکبر کی علامت سازی" قابلِ قدر ہے۔ وجاہت علی سندیلوی کی خود نوشت بھی دلچسپ لگی۔ آپ نے نیا دور کو واقعی ہر لحاظ سے دل کش بنا دیا ہے۔ اس سے پہلے لکھنؤ پر جو خاص نمبر دو جلدوں میں شائع ہوئے اور جنھیں بعد میں کتابی صورت میں پیش کیا گیا وہ خاصے کی چیز تھا۔ کتابت اور طباعت کا معیار بھی قابلِ تعریف ہے۔ میں آجکل علیل ہوں اس لیے زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ یہ خط بھی اپنے ایک عزیز سے لکھوایا ہے۔

——— (پروفیسر) آل احمد سرور، علی گڑھ

ڈیئر روہت نندن صاحب!

میں آپ کو اور ساتھ ہی نیا دور کے مدیر کو ایسا شاندار نصف صدی نمبر نکالنے کے لیے دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ اس نمبر کے مضامین اور اس کی طباعت دونوں ہی بہت عمدہ ہیں۔ اس نمبر میں مشہور مصنّفوں اور شاعروں کی تصویریں ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کے ساتھ چھپی ہیں وہ مجھے بے حد پسند آئیں۔ زیادہ تر تصویروں کی تاریخی اہمیت ہے اور ان کے ساتھ دی گئی تاریخیں حوالے کے نقطۂ نظر سے کافی اہم ہیں۔

——— شمس الرحمان فاروقی۔ الہ آباد

عزیز محترم امجد حسین صاحب۔

"نصف صدی نمبر" کے بعد آپ نے جنوری ۱۹۹۶ء کو ایک مفید اور خوبصورت نیا دور کا "گاندھی نمبر" دیا۔ دیکھ کر بہت جی خوش ہوا، دل سے دعا نکلی کہ خدا کرے مفید نمبروں کا یہ سلسلہ تادیر قائم رہے۔ اس نمبر میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہوا۔

آج ابراہیم یوسف صاحب کے یہاں گیا تو آپ کی کتاب "اودھ آئینۂ ایّام میں" دیکھنے کو ملی۔ مسرت ہوئی۔ آپ خوب کام کر رہے ہیں۔ لیکن حیرت ہوئی کہ آپ نے اس نعمت سے مجھے کیوں محروم رکھا؟ خدا کرے آپ بخیر ہوں اور نیا دور کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہوں۔

——— عبدالقوی دسنوی، بھوپال

قابلِ تعظیم امجد صاحب!

حکومت اتر پردیش کے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ کا شاید اس سے خوبصورت اور تاریخ ساز کارنامہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس نے "اودھ آئینۂ ایّام میں" سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس کارنامے کے لیے محکمہ کے نگراں روہت نندن صاحب کے ساتھ آپ خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کے لیے اس صدی کا یہ بہترین تحفہ ہے۔

——— ناشر نقوی۔ پٹیالہ

برادرم امجد صاحب!

آپ کی ارسال کردہ کتاب "اودھ آئینۂ ایّام میں" ملی۔ کتاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ نیا دور اودھ نمبر اوّل اور دوم کی کامیابیاں ہی کیا کم تھیں کہ ان دونوں خاص نمبروں کے انتخابی مضامین پر مشتمل اتنی اچھی اور مفید کتاب کو منظرِ عام پر لانے میں بھی آپ نے کامیابی حاصل کر لی۔

کامیابیوں کا یہ سلسلہ اس قدر قابلِ رشک ہے کہ نظرِ بد کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس اس لیے فنا بھی ہو جاتا ہے کہ ان کامیابیوں کے ساتھ بے شمار دلوں کی دعائیں شامل ہیں۔

امید ہی نہیں، یقین ہے کہ ایسے اہم اور جامع نمبر اور کتاب کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔ آمین!

——— عطا عابدی۔ دہلی

نیا دور

جلد ۵۱ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

دفتر : ۲۱۳۳۴۸ * رہائش : ۲۶۳۲۸۲

جوائنٹ ایڈیٹر

نجیب انصاری

معاونین : محمد الیاس خان ۔ مبین احمد صدیقی

پبلشر :

رونق تمدن

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس ۔ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ ۔ اترپردیش

زرِ سالانہ ——— تیس روپے

عام شمارہ ——— تین روپے

ترسیلِ زر کا پتہ :

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات

عنوانات

عنوان	مصنف	صفحہ
اپنی بات	ایڈیٹر	۲
نذرِ حافظ شیرازی	علی سردار جعفری	۳
غزل	جگن ناتھ آزاد	۵
یادوں کی رہ گزر (۳)	علی جواد زیدی	۶
دوہے	بیکل اُتساہی	۱۳
غزل	تسنیم فاروقی	۱۳
داغ کے تعلق سے	کالی داس گپتا رضا	۱۴
میر انیس (نظم)	شوق لکھنوی	۲۰
غزل	سیلانی سیوتے	۲۰
کوئی بتلائے کہ ہم ... (خود نوشت)	عتیق اللہ	۲۱
غزلیں	صبا جائسی	۲۶
	بشیر فاروقی ، شارق ابجےپوری	۲۶
مقامات (کہانی)	جوگندر پال	۲۷
پہاڑ کی صدا (نظم)	طپش صدیقی	۳۱
دوہے	گوہر خیر آبادی	۳۱
۱۹۴۱ء کی ڈائری کا ایک سیاہ ورق	شہرام سرمدی	۳۱
روبوٹوں کا انتظام	سید محمد صدر الاسلام	۳۲
ایک نظم	عذرا پروین	۳۵
فنگر پرنٹس (نظم)	ڈاکٹر سخاوت شمیم	۳۶
نذرِ انور مرزاپوری (نظم)	محب مرزاپوری	۳۶
غزل	جمیل دوشی	۳۶
"ادیب" الہ آباد میں پریم چند	ظفر حیدری	۳۷
ستم ظریفی تو اس کی دیکھو	سید امجد حسین	۴۳
نقد و تبصرہ	مناظر عاشق ہرگانوی ۔ احمد ابراہیم علوی ۔ ظفر اقبال ظفر فیروزہ مسعود ۔ اسحٰق سنبھلی ۔ علی باقر زیدی ۔ توقیر چال ۔ سید محمد فصیح	۴۴ تا ۴۷
"اودھ آئینہ ایام میں" (تاثرات)	رشید کوثر فاروقی	۴۸

اپنی بات

ابھی کچھ دن گزرے کہ رکشا بندھن کا بہت معصوم اور پیار محبت سے بھرا تہوار گزرا۔ اس تہوار کا ایک رُخ بے حد معصوم تقدس اور پاکیزہ محبت کی علامت بن گیا ہے —— اس تہوار میں بہنیں بھائی کو راکھی باندھتی ہیں اور دراصل کسی کے ہاتھ میں بندھی ہوئی راکھی دیکھ کر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بہنوں کا چہیتا ہے۔ دُنیا کے کسی بھی ملک میں تہذیبی بنیادوں پر رشتے کی اس معصومیت کا سُراغ نہیں ملتا۔

ستمبر کے اس مہینے میں جنم اشٹمی کا تہوار ہے۔ یہ دن بھگوان شری کرشن کا جنم دن ہے۔ کرشن جی کے بارے میں اور خصوصاً گیتا میں جو معرفت کا درس دیا گیا ہے، اس سلسلے میں اُردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اُردو شاعروں میں نظیر اکبرآبادی سے لے کر بیسویں صدی تک مختلف جہتوں سے کرشن جی کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سرکار ختم المرسلینؐ پر محسن کاکوروی کی کہی ہوئی مشہور نعت میں بھی متھرا اور کاشی کا تقدس نمایاں ہے ؏

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے آرزو اسی کا

غزل کے مشہور شاعر یگانہ نے لکھا ہے

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں — یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

سیماب اکبرآبادی نے کرشن جی کو محبت کی علامت قرار دیا ہے، کہتے ہیں

جو مشرب اس کا نہ اس طرح عام ہوجاتا — جہاں سے محو محبت کا نام ہوجاتا

پھر مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے

اگر کرشن کی تعلیم عام ہوجائے — تو کام فتنہ گروں کا تمام ہوجائے

ساغر نظامی نے کرشن جی کو یوں یاد کیا ہے ؎

اے گوپال جھوم کر بجاؤ بانسری پھر

اُردو شعرا نے کرشن جی کو عرفان، بصیرت اور آگہی کی بنیاد پر فرائض حیات کی انجام دہی کے لیے خود یاد رکھا ہے اور انھیں محبت اور جمالیاتی تصورات کا پیکر بھی قرار دیا ہے۔

جنم اشٹمی کا تہوار ان تمام اقدار کی نمائندگی کرتا ہے اور ہمارے ملک میں سب لوگ ان تہواروں کو مِل جُل کر اس لیے مناتے ہیں کہ یہ تہوار ہماری تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہزاروں برس کے سیلاب میں روشنی کا مینار بن کر آج تک زندہ و پائندہ ہیں۔

—— **ایڈیٹر**

علی سردار جعفری
۱۰۔ سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ ممبئی
۴۰۰۰۳۶

نذرِ حافظ شیرازی

کلامِ حافظ شیراز پر رقصاں ہیں خنداں ہیں
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

ریاست مہاراشٹر کی انجمن ترقی اُردو (ہند) نے خانۂ فرہنگ ایران اور نہرو سنٹر کے اشتراک اور تعاون سے تین دن کا جشنِ حافظ شیرازی منعقد کیا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۵ء سے دوسری جنوری ۱۹۹۶ء تک بمبئی کا نہرو سنٹر حافظ کے نغمات اور دانش ورانِ ایران و ہند کے پُرمغز مقالات سے گونجتا رہا۔ اس موقع پر خواجہ حافظ شیرازی کی کتابوں اور تصاویر کی نمائش کا خاص اہتمام خانۂ فرہنگِ ایران نے کیا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی مہربانی اور تعاون سے کچھ نادر نمونے خدابخش لائبریری کی طرف سے بھی شامل کیے گئے تھے اس طرح جنّت نگاہ اور فردوس گوش ایک جگہ جمع ہو گئے۔

اس تقریب میں ایران کے ایک مغنی نے حافظ کی غزلیں ایرانی ترنم اور لہجے میں سنائیں۔ اُردو میں بھی لسان الغیب کے کچھ منتخب اشعار کے ترجمے کیے گئے (پوری پوری غزلوں کے ترجمے ممکن نہیں تھے)۔ اس نیک کام میں میرے علاوہ مجروح سلطان پوری اور ڈاکٹر رفیعہ شبنم نے بھی حصّہ لیا۔ ان ترجموں کو ہندستانی ترنّم اور موسیقی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

میں نے ترجموں کے علاوہ ایک سجع بھی کہا جس کی بنیاد حافظ کا ایک شعر ہے جو ایک قصیدے میں نظم ہوا ہے، اس میں میرا نام آگیا ہے یہ قصیدہ حضرت علی کی شان میں ہے۔ دیوان کے بعض نسخوں میں شامل ہے اور بعض نسخوں میں نہیں۔ کلامِ حافظ کی ابھی تک مکمل تدوین نہیں ہوئی ہے۔ بہت ساری غزلیں اور اشعار ان کے نام سے منسوب ہیں اور انھیں کے معلوم ہوتے ہیں، بغیر کسی تصدیق کے ان کو الحاقی نہیں کہا جا سکتا۔

سجع اور ترجمے نیا دور کے لئے حاضر ہیں، ان کی زبان اور بیان میں حافظ کے رنگ کو برقرار رکھنے کی حقیر سی کوشش کی گئی ہے بس یہ کوشش ہی ہے۔ اور اتنی سعادت کافی ہے۔ سخن کا ترجمہ ممکن ہے لیکن اعجازِ سخن کا ترجمہ ناممکن ہے، اور حافظ کا ہر لفظ فصاحت اور بلاغت کا معجزہ ہے۔

سجع

مجھے ہے بلبلِ شیراز سے جو نسبتِ خاص
عطا ہوا ہے نہ ہوگا کسی کو بھی یہ وقار
ہر ایک لفظ ہے پروردگارِ موسمِ گل
ہر ایک حرف ہے گہوارۂ نسیمِ بہار
صریرِ خامہ ہے معجز رقم نوائے سروش
سرودِ خامشی گلبانگ گلشنِ اسرار
ہے شعرِ حافظِ شیریں سخن ترانۂ جاں
ہے جس میں اسمِ علی مثلِ گوہرِ شہوار
"علی امام و علی ایمن و علی ایماں
علی امین و علی سرور و علی سردار"

غزل

حسنِ یوسف سے دمک اُٹھے گا کنعاں غم نہ کر
خانۂ غم ایک دن ہوگا گلستاں غم نہ کر
دورِ گردوں سے ہے اگر دو چار دن کو نامراد
ایک سا رہتا نہیں ہے حالِ گرداں غم نہ کر

بہ جہاں عمر باقی ہے تو ہوگا نغمہ زن
چمن گل کے سائے میں بہ خوش الحاں غم نہ کر

شوق کعبہ اور زیر پا بیابانوں کی راہ
سرزنش کرتے ہیں گر خار مغیلاں غم نہ کر

کنج فقر و خلوت تاریک شب میں حافظا
لب پہ ہے جب تک دعا و درس قرآں غم نہ کر

ذو شعر

جس سے پر نقش ہے یہ دائرہ مینائی
کس کو معلوم ہے کہ وہ گردش پرکار ہے کیا

ہو جو مقدور تو پوچھیں کہ نگارندۂ غیب
یہ بتادے کہ پس پردہ اسرار ہے کیا

غزل

شراب و عیش نہاں کیا ہے کار بے بنیاد
چلو چلیں صف رنداں میں ہرچہ بادا باد

یہ انقلاب زمانہ پہ اتنی حیرت کیوں
کہ اس کو ایسی ہزاروں ہیں داستانیں یاد

کسے خبر ہے کہ کاؤس و کے پہ کیا گزری
بتائے کون ہوا کیسے تخت جم برباد

ادب سے جام اٹھاؤ کہ دست رنداں میں[1]
ہیں کاسۂ سر جمشید و بہمن اور قباد

بہ حسرت لب شیریں ہے آج تک خونبار
برنگ لالہ و گل اشک دیدۂ فرہاد

قطعہ

دن کو پینے سے تو دل ہوتا ہے زنگ آلودہ
دن کو کرتے ہیں ہنرمند ہنر کا ساماں

ہے وہی وقت مے صبح فروغ اے ساقی
رات کر دیتی ہے جب پردۂ شام آویزاں

غزل

حاصل کارگہ کون و مکاں کچھ بھی نہیں
جام مے لاؤ کہ اسباب جہاں کچھ بھی نہیں

جان و دل ہیں شرف صحبت جاناں کے لیے
یہ نہیں ہے تو متاع دل و جاں کچھ بھی نہیں

ہم لب بحر فنا منتظر ساغر ہیں
ساقیا فرصت لب تا بہ دہاں کچھ بھی نہیں

زہد پر اپنے بہت ناز نہ کر اے زاہد
عرصۂ صومعہ و دیر مغاں کچھ بھی نہیں

نام حافظ رقم نیک بہا ہے لیکن
پیش رنداں رقم سود و زیاں کچھ بھی نہیں

شعر

پلا ساقی مے باقی کہ جنت میں تو ترسیں گے
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلے کو

شعر

جس نے یہ طرز سخن مجھ کو سکھائی حافظ
یار شیریں سخن نادرہ گفتار ہے وہ

□□

[1] اس غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر میں ایران کے جلیل القدر بادشاہوں کے نام ہیں۔

غزل

جانے یہ کیا جنون ہے مجھ تیرہ بخت کو
ڈالا ہے آگ پر جگرِ لخت لخت کو

ظاہر کے خان وماں سے گزر جا کہ اہلِ دل
ساحل پہ پھینکتے چلے آئے ہیں رخت کو

آہن دلی سے پیش نہ آ تو کہ میری آہ
کر دے گداز چاہے تو دلہائے سخت کو

حور و قصور و خلد مرے کام کے نہیں!
دیوانۂ ازل نہ چھوئے رخت و بخت کو

فن کاسۂ گدائی نہیں ہے، مری سنو
ٹھکرا دو اہلِ فکر و نظر تاج و تخت کو

اے دل! غلامیٔ درِ میخانہ کو نہ چھوڑ
اس سے مفر نہیں ہے کسی نیک بخت کو

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
اے ۵۹۔ گورنمنٹ کوارٹرز۔ گاندھی نگر۔ جموں

بہار عمر باقی ہے تو ہوگا نغمہ زن
چہرۂ گل کے سامنے میں مرغ خوش الحاں غم نہ کر

شوق کعبہ اور زیر پا بیابانوں کی راہ
سرزنش کرتے ہیں گر خار مغیلاں غم نہ کر

کنج فقر و خلوت تاریک شب میں حافظا
لب پہ ہے جب تک دعا و درس قرآں غم نہ کر

دو شعر

جس سے پر نقش ہے یہ دائرۂ مینائی
کس کو معلوم ہے کہ وہ گردش پرکار ہے کیا
ہو جو مقدور تو پوچھیں کہ نگارندۂ غیب
یہ بتا دے کہ پس پردۂ اسرار ہے کیا

غزل

شراب و عیش نہاں کیا ہے کار بے بنیاد
چلو چلیں صف رنداں میں ہر چہ بادا باد

یہ انقلاب زمانہ پہ اتنی حیرت کیوں
کہ اس کو ایسی ہزاروں ہیں داستانیں یاد

کسے خبر ہے کہ کاؤس و کے پہ کیا گزری
بتائے کون ہوا کیسے تخت جم برباد

ادب سے جام اٹھاؤ کہ دست رنداں میں[1]
ہیں کاسۂ سر جمشید و بہمن اور قباد

بہ حسرت لب شیریں ہے آج تک خونبار
برنگ لالہ و گل اشک دیدۂ فرہاد

قطعہ

دن کو پینے سے تو دل ہوتا ہے زنگ آلودہ
دن کو کرتے ہیں ہنرمند ہنر کا ساماں
ہے وہی وقت مے صبح فروغ اے ساقی
رات کر دیتی ہے جب پردۂ شام آویزاں

غزل

حاصل کارگہ کون و مکاں کچھ بھی نہیں
جام مے لاؤ کہ اسباب جہاں کچھ بھی نہیں

جان و دل ہیں شرف صحبت جاناں کے لیے
یہ نہیں ہے تو متاع دل و جاں کچھ بھی نہیں

بسمہ لب بحر فنا منتظر ساغر ہیں
ساقیا فرصت لب تا بہ دہاں کچھ بھی نہیں

زہد پر اپنے بہت ناز نہ کر اے زاہد
عرصۂ صومعہ و دیر مغاں کچھ بھی نہیں

نام حافظ رقم نیش بہا ہے لیکن
پیش رنداں رقم سود و زیاں کچھ بھی نہیں

شعر

پلا ساقی مے باقی کہ جنت میں تو ترسیں گے
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلے کو

شعر

جس نے یہ طرز سخن مجھ کو سکھائی حافظ
یار شیریں سخن نادرہ گفتار ہے وہ

□□

---

[1] اس غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر میں ایران کے جلیل القدر بادشاہوں کے نام ہیں۔

غزل

جانے یہ کیا جنون ہے مجھ تیرہ بخت کو
ڈالا ہے آگ پر جگرِ لخت لخت کو

ظاہر کے خان و ماں سے گزر جا کہ اہلِ دل
ساحل پہ پھینکتے چلے آئے ہیں رخت کو

آہن دلی سے پیش نہ آ تو کہ میری آہ
کر دے گداز چاہے تو دل ہائے سخت کو

حور و قصور و خلد مرے کام کے نہیں!
دیوانۂ ازل نہ چھوئے رخت و بخت کو

فن کاسۂ گدائی نہیں ہے، مری سنو
ٹھکرا دو اہلِ فکر و نظر تاج و تخت کو

اے دل! غلامئ درِ میخانہ کو نہ چھوڑ
اس سے مفر نہیں ہے کسی نیک بخت کو

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
اے ۲۵۔ گورنمنٹ کوارٹرز۔ گاندھی نگر۔ جموں

علی جواد زیدی
۳/۱۸۶ وشال کھنڈ، گومتی نگر
لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

— ۳ —

عمر کے اعتبار سے اُس زمانے کی یونیورسٹیوں میں لکھنؤ یونیورسٹی نسبتہً نوجوان درس گاہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس صوبے میں کئی اور یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں، لیکن اس بڑھتے، پھیلتے ہوئے دائرے میں بھی اس کی ایک امتیازی شان قائم ہے۔ ۱۹۳۰ میں جب میں نے یہاں داخلہ لیا تو یہ تعلیمی ادارہ ایک درس گاہ کے علاوہ بہت کچھ اور بھی تھا۔ سماجی اور ثقافتی سطحوں پر اس کی ایک پہچان پہلے بھی تھی یعنی ہند۔ ایرانی تہذیب کا لکھنوی نکھار، نئی جہتوں نے کئی رنگین نقش و نگار بنائے اور نئے خطوط و دوائر کا اضافہ کیا۔ عصری حالات بالخصوص آزادی کی جد و جہد کی سیاست سے متاثر ہو کر مزید تبدیلیاں دبے پاؤں اس فضا میں داخل ہوتی جا رہی تھیں اور ایک نئی گہما گہمی پہلی ہی نظر میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ ترقی پسندی اور بائیں بازو کے رجحانات کے فروغ میں ہماری یونیورسٹی ہراول کو دارادا کر رہی تھی۔ لیکن عام انقلابی سیاسی رَو کے باوجود یہاں روایتوں کا احساس اور ایک حد تک احترام بھی تھا۔ لکھنؤ کے مقابلے میں الہ آباد سیاسی طور سے موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو جیسی قد آور ہستیوں کی بدولت زیادہ اہم تھا۔ اُدھر اعتدال پسند (Leberal) لیڈر تیج بہادر سپرو کا نام نمایاں تھا، جن کی قانون دانی کی طرح اردو دوستی نے افسانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ لسانی اعتبار سے "ہندی ساہتیہ سمیلن" کی ہندی دوستی سے زیادہ اردو دشمنی کا رَویہ "چھیڑ خوباں سے چلی جائے" کا منظر پیش کر رہی تھی اور دوسری طرف دلی سے "انجمنِ ترقیِ اُردو" لغت سازی اور ادب میں سائنسی اور فنی اضافوں کے ساتھ اس چھیڑ چھاڑ کی خاموش تماشائی نہیں تھی۔ لکھنؤ میں الہ آباد کے برعکس اردو اخبارات اور رسائل زیادہ چھپ رہے تھے۔ اور سرگرمیوں کو شہر ہی نہیں بلکہ دور دور تک پھیلا رہے تھے۔ اُدھر بنگال سے انقلابی رَو کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کی نرم رَو مگر قومی ادبی لہر، رابندر سنگیت کا تموّج اور قاضی نذر الاسلام کی گرم بیانی اور پنجاب سے اقبال کی فکر و نظر کی پرچھائیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ دُور، مغربی اثرات اب فرانس اور برطانیہ سے زیادہ روسی ادب سے عبارت تھے۔ تعلیمی محاذ بھی آکسفورڈ اور کیمبرج کے ساتھ جرمن یونیورسٹیاں بھی جاذبِ توجہ تھیں اور قریب، ہندستان میں علی گڑھ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، بنارس ہندو یونیورسٹی اور کاشی ودیا پیٹھ سے کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اِن نئے رجحانات کی وراثت کو خود لکھنؤ کی زندہ اور قوی روایات جذب کر کے ہماری یونیورسٹی کی شخصیت نئی توانائی اور آب و تاب پیدا کر رہی تھیں اور "چیزے دگر" بنتی جا رہی تھی:

آفاقہا گردیدہ ام، بسیار گلہا چیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

(نئے نئے آفاق کی سیر کی ہے اور بہت سے پھول چُنے ہیں، بہت سے خوباں، دیکھے ہیں لیکن تو اَور ہی چیز ہے!)

یہ میں اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ میں اس شہر کا عاشق ہوں اور نہ اس لئے کہ میرے ذہن میں اپنی تعلیم گاہ کے لیے خصوصی جذبۂ تفوق ہے، بلکہ اِس لیے کہ وقت کے ساتھ بدلنے والے راقم سطور کی طرح یہ درس گاہ بھی ہر میدان میں ترقی پسندی کا پرچم لیے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی اور بدلتی جا رہی تھی، بدلتی جا رہی تھی۔

یہ بڑی ہلچل اور تبدیلیوں کا دَور تھا۔ واقعات و حوادث کی تیز رفتاری پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں تو یادوں کا ایک طوفان ذہن کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ کچھ جھلکیاں پچھلی دو قسطوں میں قارئین کے سامنے پیش کی جا چکی ہیں۔ آج نئے پہلوؤں اور پُرانی یادوں پر گفتگو مقصود ہے۔

نئے افکار وخیالات ومباحثِ علمی وسیاسی کا گرم جوشی سے استقبال اور اُن کو آغوشِ فکر وعمل میں سمیٹ لینے کا قوی جذبہ جیسا کہ اس عہد کی لکھنؤ یونیورسٹی میں دیکھنے میں آیا، ویسا اور اس سُرعت اور وابستگی کے ساتھ کہیں اور نہیں تھا۔ اس کے محرکات دو تین ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام اور اسی سال طالب علموں کی ہندوستان گیر تحریک کا آغاز، صوبائی خودمختاری کی بدولت اظہار کی آزادی اور آزاد خیال اداروں کا قیام فضا میں ایک جزرومد کی سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلبا کی یونینوں کے قیام کے لیے جد وجہد کے بعد وہاں آزادی اجتماع و اظہارِ خیال کے لیے عام مظاہرے ہونے لگے اور سیاسی ہی نہیں بلکہ سماجی سطح پر بھی آزادہ روی کا رجحان نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں آئے دن یونیورسٹیوں کے بیدار مغز اساتذہ یا عام سیاسی لیڈر مدعو کیے جاتے تھے اور ان کی تقریروں سے بیداری کی ایک نئی لہر دوڑنے لگی تھی۔ ماہرین تعلیم وفن کے علاوہ جدید ترین اقتصادی اور سماجی خیالات کے انقلابی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے آچاریہ نریندر دیو، پروفیسر ہمایوں کبیر، مسٹر شومیندر ناتھ ٹیگور، نریندر دت مجمدار، مسز سروجنی نائیڈو، خان عبدالقیوم خاں اور کنور محمد اشرف جیسے اصحاب کی آمد اور کھچا کھچ بھرے ہال کے روبرو ان کی تقریریں دلوں میں نئی امنگیں بھر رہی تھیں۔ کیمپس کے باہر بھی چھوٹے چھوٹے اجتماعات ہوتے جن میں ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، پی۔ سی۔ جوشی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر ناگر، احمد علی وغیرہ شرکت کرتے اور مارکسی فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ ان اجتماعات کو اسٹڈی سرکل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اگرچہ باضابطہ سیاسی سرکلیں ان پر مستزاد تھیں۔ بحثوں کا محور مارکسی فلسفہ زیادہ رہتا۔ پس منظر ادب وثقافت کا ہوتا۔ کھل کر بحث ومباحثہ ہوتا اور نظمیں یا افسانے وغیرہ پڑھے جاتے اور ان کا بیباکانہ تجزیہ اور کبھی کبھی بے دردی کی حد تک پہنچی ہوئی بے لاگ تنقیدیں بھی سننے کو ملتیں۔ خالص مارکسی جماعت کے باہر سوشلسٹوں کا بھی گروپ تھا۔ اس میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر مینن، پری پورنانند، الٰہ آباد کی پورنیما بنرجی اور بہار کے رام برکش بینی پوری کے علاوہ سیٹھ دامودر سروپ، موہن لال گوتم، راجا رام شاستری بھی شامل تھے، لیکن یہ کم فعّال حلقہ تھا۔ لوہیا اور گوتم وغیرہ کافی ہاؤس میں برابر آتے اور اپنی بے باکی اور ذہانت کی چمک دکھا جاتے۔ یہاں مجمع زیادہ متنوّع ہوتا اور گفتگو میں وسیع مطالعے کی جھنکار کے علاوہ نئی تخلیقات اور ان پر آزاد تبصرہ سننے کے مواقع فراہم ہوتے۔ میں کافی جوش سے ان سبھی اجتماعات میں حصّہ لیا کرتا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت لکھنؤ میں کئی اہم ترقّی پسند یکجا ہو گئے تھے۔ سیّد سبط حسن، سردار جعفری، مجاز، عبادت بریلوی، حبیب احمد خاں اور اگر دخل در معقولات کی گنجائش ہو تو مجھے بھی اس گروہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ انصار ہروانی اخبار نویسوں میں شامل ہو چکے تھے، لیکن طلبہ کی تحریک سے قریب تھے۔ قاضی جلیل عباسی بھی ترقّی پسند خیالات کی پاداش میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکالے جاچکے تھے، اور سردار کی طرح انھیں بھی یہاں پناہ ملی تھی اور ہمارے حلقے کے اہم رکن تھے۔ بعد میں رکن پارلیمنٹ و منسٹر بھی ہوئے۔ غرض پرانی فکری عمارتوں کی لیس پوت سے زیادہ شکست و ریخت کے مناظر دیکھنے میں آرہے تھے۔ اس سمندر منقن سے جو زہر بھی نکلتا اس کو آبِ حیات کی طرح پی جانے والے موجود تھے اور ان کے جرأت آمیز تجربے اور سماجی مخالفتوں کی پروا نہ کرکے قربانیاں دینے کا ولولہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو دوست اس زمانے میں زیرِ تعلیم تھے انھیں ایسے مناظر کی ذہنی بازیافت میں مشکل نہ پیش آئے گی کہ یونیورسٹی کے QUADRANGLE (مستطیل سبزہ زار) میں تیسرے پہر کے قریب لڑکے جمع ہیں اور اپنے پسندیدہ شاعر کو زینے پر رومالوں کا فرش بناکر بٹھا دیتے اور اس سے قومی اور انقلابی نظمیں سنتے اور داد دیتے بلکہ بعض اوقات خوشی کے نعرے، تالیوں بلکہ دو ایک بار جذباتی رقص کا بھی مظاہرہ کر بیٹھتے۔ علی سردار جعفری، مجاز اور یہ بندۂ ناچیز اور ہندی کے نئے لہجہ کے شاعر گرجا کمار ماتھر پر ایسی کرم فرمائیوں کی بارش ہوتی اور وہ لوگ خوشی سے دوستوں کے پرخلوص اصرار کے آگے سر جھکا دیتے۔ مجاز مقبول ترین شاعر تھے۔ مخلوط مجمع ہوتا۔ زیادہ تر نظمیں سینیر شعرا ہی کی نہیں بلکہ بعض ذہین طلبا کو بھی سنانی یا سننی پڑتیں اور ان کے بعض اشعار، مصرعے یا بند کے بند چند طلبا کو یاد ہو گئے تھے۔ سلام مچھلی شہری رومانی شاعر تھے، لیکن ترقّی پسندوں کے بہت قریب تھے۔ وہ بھی آجاتے

اور ان موقعوں پر انھیں بھی یونیورسٹی والا سمجھ لیا جاتا تھا۔

جب کسی اہم مفکر کو تقریر کی دعوت دی جاتی تو بعض اوقات تقریر سے پہلے کسی شاعر سے اس کا کلام بھی سنا جاتا۔ مشاعرے اس پر مستزاد تھے۔ اس کے علاوہ خوش تقریر طلبا اسٹرائکوں کے موقعے پر تقریریں کرتے۔ اور خطابت کے جوہر دکھاتے۔ ہندی اردو کی تفریق ان موقعوں پر اٹھ جاتی۔

اس لسانی یک جہتی کے سلسلے میں مجھے دو کوی سمیلن یاد آتے ہیں۔ ایک تو بنارس ہندو یونیورسٹی کا کوی سمیلن تھا۔ وہاں رہائی کے بعد مجھے میرے دوست راج نرائن (جو بعد میں اپنے وقت کے مشہور سلسٹ لیڈر ہوئے) زبردستی بلا لے گئے اور مجھ سے پوچھے بغیر صدر سے کچھ مشورہ کرکے مجھ سے کہا کہ تمھیں بھی کچھ سنانا ہوگا۔ میں انکار کر ہی رہا تھا کہ میرا نام پکار دیا گیا اور میں رکتا جھجکتا مائک تک پہنچ ہی گیا۔ مجمع نے پرجوش پذیرائی کی، یہی نہیں بلکہ کئی نظمیں سنانے اور بعض نظموں کو مکرر سنانے پر بھی اصرار کیا۔ اس زمانے میں میں نے تجربتاً ہندی کے عام رواج پائے ہوئے الفاظ و محاورات کا بعض نظموں میں بے تکلف استعمال کیا تھا۔ وہ نظمیں خصوصیت سے پسند کی گئیں۔ مثلاً ع

"تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی" "یا مسافر راستے میں رک نہ جانا" یا ع "کاہے کی یہ سوچ ہے تجھ کو کاہے کی یہ چنتا ہے" وغیرہ۔ جوانی کا زمانہ تھا نظمیں تقریباً زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ ایک اور ایک اور کے شور میں دو نظمیں سنائیں پھر بیٹھنے لگا تو شور شروع ہوا تو راج نارائن اور صدر کے اصرار پر کچھ اور نظمیں سنانا پڑیں۔ تب مجمع نے مجھے اتنی مہلت دی کہ میں ذرا دم لے سکوں۔ کوی سمیلن کے دوسرے دور میں پھر وہی نعرے بلند ہونے لگے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ مجھے پہلے سے کوی سمیلن کا علم نہیں تھا۔ آپ لوگوں کے اصرار پر کچھ نظمیں سنا دیں۔ مجھے آج ہی شب کی ٹرین سے واپس جانا ہے۔ پھر بھی مجھے دو چھوٹی چھوٹی نظمیں سنانے کے بعد ہی اجازت ملی۔ پہلے سے کار مہیا کر دی گئی تھی۔ اس سے قیام گاہ پر پہنچ کر سامان سمیٹا اور اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ مشاعرہ ہندی والوں کے کثیر مجمع میں بنارس جیسے تاریخی شہر میں اور ہندی کوی سمیلن میں پرخلوص پذیرائی کے لیے ہمیشہ یاد رہے گا۔

آج یہ خیال ذہن میں نشتر سا چبھوتا ہے کہ یا تو گھنٹہ دو گھنٹہ زبانی نظمیں سنا سکتا تھا اور آج اسّی برس پورے کرنے کے بعد مشکل ہی سے دو نظمیں پوری کی پوری یاد ہوں گی۔ تقریباً پچیس برس سے تو میں نے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔

صرف ایک اور کوی سمیلن کا ذکر کرنا چاہوں گا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے بینیٹ ہال میں ہندی کے ممتاز شاعر سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا جی کی صدارت میں ہوا تھا۔ نرالا جی سے معمولی سی یاد اللہ تھی۔ ان کی نظمیں سننے کے لیے چپکے سے ہال میں داخل ہوا۔ دو ایک شاعروں کو سن پایا تھا کہ سامعین میں سے کسی نے نرالا جی کے قریب آ کر ان سے کہا کہ مجھ سے بھی کچھ سنانے کو کہیں۔ انھوں نے "میرے دوست" کہہ کر میرا تعارف کراتے ہوئے کچھ سنانے کا حکم دیا۔ میں نے عذر کیا کہ میں نے ہندی میں تو کہا نہیں ہے۔ ڈائس کے قریب بیٹھے ہوئے کسی سامع نے کہا کہ "تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی"؟ سنائیے۔ سامعین میں شامل کچھ افراد غالباً پہلے بھی سن چکے ہوں گے۔ کیونکہ اس نظم کا یونیورسٹی سے گہرا تعلق تھا۔ نرالا جی کی محبت آمیز فرمائش کے بعد مجال انکار نہ رہی۔ اس نظم کو بھی غیر معمولی طور سے پسند کیا گیا۔ خود نرالا جی نے اس نظم کی تعریف کرکے میرا دل بڑھایا۔ اس کے بعد میں نے اکثر یہ سوچا ہے کہ اردو ہندی کی یہ لڑائی کتنی مصنوعی اور بے اصل ہے۔ آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ لسانی خیر سگالی کی اس فضا میں کتنی کمی آ گئی ہے۔ سیاست نے ہمارا تہذیبی چہرہ مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔

اسی بینیٹ ہال میں مسز سروجنی نائیڈو کی آمد پر ایک جلسے کی روداد سنائے بغیر یہ سلسلہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جلسے کا انعقاد یونیورسٹی یونین کی طرف سے ہوا تھا۔ اس زمانے میں یونین کے صدر میرے عزیز دوست (آج انگریزی کے مشہور صحافی) سید محمد جعفر تھے۔ اور نائب صدر کاشی ناتھ بامزئی تھے۔ جعفر میرے گہرے دوست تھے۔ اچھے مقرر بھی تھے اور مارکسی خیالات کے حامل بھی، بلکہ کچھ دور کی عزیز داری بھی بنتے بھائی (سجاد ظہیر) کے رابطے سے ہوتی تھی۔ کاشی ناتھ بامزئی کشمیر سے آنے والے طالب علموں میں نمایاں اور طلبہ کے کرسپانڈنٹ تھے۔ افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ بڑے سیکولر

خیالات رکھتے تھے۔ جلسے کے کچھ پہلے میرے پاس آئے اور عجیب غریب سوال کرکے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ ایسا موقع میری زندگی میں پھر نہیں آئے گا۔ تعارفی تقریر کرنے کا مجھے موقع دلوا دیجئے۔ میں نے کہا "پیارے بھائی یہ تو صدر کا حق ہے۔ جعفر کیوں دست بردار ہوں گے اور میں کس طرح اُن سے کہوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ خود انھیں سے یہ فرمائش کریں۔ کشادہ دل واقع ہوئے ہیں۔ ممکن ہے، مان جائیں"۔ بامزئی نے کہا کہ "صدارت تو جعفر صاحب ہی کریں گے، میں تعارفی تقریر کروں گا۔ میں نے جعفر صاحب سے کہا تھا لیکن وہ کچھ بولے نہیں"۔ اتنے میں جعفر خود وہاں آگئے۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے بامزئی کی فرمائش اور اپنے اوّلین ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کہ آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا لیکن یہ صورتِ حال عجیب سی لگتی ہے۔ بامزئی لکھی ہوئی تقریر ہاتھ میں لیے تھے۔ جعفر نے برادرانہ بزرگی کے ساتھ، لیکن قدرے تکدّر کے ساتھ اسے منظور کر لیا۔ اپنی صدارتی تقریر کو انھوں نے مسز سروجنی نائیڈو کی تقریر کے خاتمے پر منحصر کر دی، اور اس میں شک نہیں کہ فی البدیہہ ہونے کے باوجود اُن کی تقریر بہتر تھی اور اُس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ البتہ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بامزئی سے میری دوستی پائیدار ہوتی گئی اور اس کا سلسلہ حکومتِ ہند کی ملازمت اور کشمیر کے دورِ قیام تک پھیلتا رہا۔

سروجنی نائیڈو سے یہ میری پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ آگے کی ملاقاتوں کا نقطۂ آغاز یہی جلسہ ثابت ہوا۔ جلسے میں میرے لیے سامع کے علاوہ اور کوئی حیثیت نہیں تھی۔ طلبا میں سے کسی نے یکایک فرمائش کر دی کہ زیدی سے نظم سنیں گے۔ میں بالکل تیار نہیں تھا۔ مسز نائیڈو جو خود انگریزی کی مشہور شاعرہ تھیں۔ اور "بلبلِ ہند" NIGHTINGALE OF INDIA کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ کانگریس کے معزز ترین لیڈروں میں شمار ہوتی تھی اور مسحور کر دینے والی خطیبہ تھیں۔ وہ اردو شاعروں پر خصوصیت سے مہربان رہتی تھیں۔ اس میں ان کی حیدرآبادیت کو بھی دخل رہا ہوگا۔ غرض، انھوں نے بے تامل صدر جعفر سے کہا کہ اُن کو ضرور پڑھوایئے۔ میرا نام پکار دیا گیا۔ میں سوچتا ہوا اٹھا کہ کیا پڑھوں۔ اتفاق سے اسی روز صبح کو ایک نظم لکھی تھی ع "مسافر راستے میں رک نہ جانا" ابھی نظرِ ثانی کی منزل سے بھی نہیں گزری تھی۔ وہ جیب میں تھی۔ اُسی کو نکال کے سُنانا شروع کر دیا۔

اُس وقت یہ نظم بے عنوان تھی۔ بعد میں "منزلیں" کے عنوان سے میرے پہلے مجموعۂ نظم "رگِ سنگ" (۱۹۴۴ء اشاعت گھر، حیدرآباد دکن) میں شامل ہوئی۔ اس نظم کا کسی خاص واقعے سے تعلق نہیں تھا بلکہ اُس پورے دَور کے ترقی پسند جوانوں کے جذبات و محسوسات و محرکات و عزائم کا عکس تھا۔ احتشام حسین صاحب نے مقدمے میں نظم کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

"...... راہ کی دشواریوں کا اندازہ لگا کر اس پر چلنا رومان پسندی نہیں ہے۔ جس کی نظر میں نقد کی طاقت نہیں اس کے لیے دونوں کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ لیکن جواد زیدی دونوں (جذبہ و فکر) کا فرق جانتے ہیں ع

غلط راہیں دکھاتا ہے طبیعت کا اُبال اب بھی
یہ کاذب صبح راتوں کو بنا کرتی ہے جال اب بھی

اس لیے وہ اُن منزلوں کا پتہ لگا کر آگے جانا چاہتے ہیں جو اس راہ کے ہر مسافر کو ضرور پیش آئیں گی۔ "منزلیں" ایک دلکش نظم ہے جو اس ذہنی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جو لوگ آرام اور سکون کی زندگی بسر کرنا چاہیں ان کے لئے وہ بھی موجود ہے، زندگی کی تمام لطافتیں ہیں جن سے جوانی آسودگی حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ضمیر کو خود غرضی کے داغ سے ملوث کر کے اعلیٰ مقاصدِ زندگی سے منھ موڑ لیا جائے۔ جواد زیدی کو یہ آسودگی یہ اطمینانِ قلب حاصل ہو سکتا تھا لیکن ان کی منزل دوسری ہے۔ جس میں آج تکلیف کل آرام ہے۔ آج موت کل زندگی ہے۔ یہ ہر ایماندار انسان کی منزل ہے[لے]۔"

نظم کے بعض اجزا یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ہزاروں منزلیں ایسی ملیں گی ۔ جہاں ہر گام پر کلیاں کھلیں گی
جہاں ہوں گی محبت کی بہاریں ۔ تمنا کی، مسرت کی پھواریں
جہاں دل لوٹنے والی ادائیں ۔ دکھائیں گی سکھائیں گی وفائیں

جہاں بل کھانے والی چال ہوگی   نظر موجوں کا رنگیں جال ہوگی
جہاں دکھلا کے دل آویز راہیں   تجھے بہکائیں گی تیری نگاہیں
جہاں فطرت کے کچھ رنگیں نظارے   کریں گے تجھ کو پردوں سے اشارے
مگر تو ان کے دھوکے میں نہ آنا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

ملیں گے تجھ کو کچھ ایسے محل بھی   جہاں جلتے ہیں عشرت کے کنول بھی
جہاں ہر شاخ اک محراب سی ہے   جہاں ٹھنڈی ہوا پُر خواب سی ہے
جہاں شیشوں میں بہتی آگ بھی ہے   جہاں للچانے والا راگ بھی ہے
جہاں مانگے کی عزت بھی ملے گی   جہاں شاید حکومت بھی ملے گی
ترے سر پر خدائی ہاتھ ہوگا   ہر اک قانون تیرے ساتھ ہوگا
نہ بن جانا کہیں ان کا نشانا
مسافر! راستے میں رک نہ جانا

کچھ ایسی وادیاں تجھ کو ملیں گی   جہاں بربادیاں تجھ کو ملیں گی
جہاں اجڑے ہوئے گھر روتے ہونگے   جہاں ٹوٹے ہوئے در سوتے ہونگے
جہاں پُرشور ہوگی نوجوانی   جہاں پُردرد ہوگی ہر کہانی
جہاں چھوڑیں گے تجھ کو ساتھ والے   جہاں تپکیں گے تیرے دل کے چھالے
جہاں دار و رسن کے جال ہونگے   جہاں دل قید میں پامال ہونگے
کہیں گھبرا کے یاں ٹھوکر نہ کھانا
مسافر! راستے میں رُک نہ جانا

تری منزل ہے آزادی کی منزل   تمنّاؤں کی آبادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہیں   غلامی کی سلاخیں توڑنا ہیں
لگے بڑھنے وہ تاریکی کے سائے   بڑھے جانا قدم رُکنے نہ پائے
فضا تاریک ہے مشعل جلا دے   اندھیرے راستوں کو جگمگا دے
وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا   مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے   تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا نہ ہرگز ہچکچانا
مسافر! راستے میں رک نہ جانا

آخر میں مسز نائڈو کے حکم اور طلبہ کے اصرار پر مجھے ایک اور نظم سُنانا پڑی۔ یہ نظم میری ذاتی زندگی کے ایک اہم موڑ کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ نظم طویل ہے لیکن اس کے صرف پہلے اور آخری بند میرے احساسات کی عکاسی کی نشاندہی کے لیے نقل کیے جاتے ہیں ؎

تم شُسنہ تر تا، تم کو ملتا، تم اس دنیا کو کیا جانو
یہ راہ کٹھن، یہ کوس کڑے، کچھ سوچ تو لو کچھ پہچانو
اس راہ خطر سے لوٹ چلو، گھر جاؤ، مرا کہنا مانو
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

اس کے بعد کے بندوں میں راستے کے خطرات، مشکلات، قربانیوں کے امکانات، ماحول اور معاشرے کے ٹکراتے ہوئے مفادات اور تضادات کا اشاراتی اظہار تھا اور پہلے سے آگاہ کر دینے کے بعد آخری بند میں میں نے خود اپنا موقف بیان کیا تھا:

میں مست شرابی میرا کیا؟ میں تو سب کچھ ٹھکرا دوں گا!
سنسار کے سارے پاپوں کا سنسار سے میں بدلہ لوں گا
یہ موقع ہے بڑھ جانے کا، پھر جو ہوگا سو دیکھوں گا
کیا تم یہ سب کر پاؤ گی؟
کیا ساتھ مرے تم جاؤ گی؟

اس کے کچھ دنوں بعد مرحوم ن۔ م۔ راشد کا مجموعہ سامنے آیا اور اسی سے ملتے جلتے موضوع پر اُن کی بھی ایک نظم چھپی ع
تم مرے ساتھ کہاں جاؤ گی؟

میری نظم پڑھ کر مرحوم نواب جعفر علی خاں اثر صاحب نے ایک مضمون لکھا اور موازنہ کرتے ہوئے میرے سوال کے اندازِ تخاطب کو مثبت اور بہتر قرار دیا تھا۔ بہتری کا سوال نہیں اُٹھتا، یہ ذہنی اور فکری ساخت کا سوال ہے۔ دونوں نظمیں مصنفین کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ ہاں، یہ فرق ضرور ہے کہ ساری مشکلات کی نشاندہی کے بعد میں پھر بھی محبوبہ سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ ان خطرات کے باوجود ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو بسم اللہ! خیر اس جلسے کے اختتام کی داستان مختصر سہی لیکن میری آپ بیتی کا اہم حصّہ ہے۔ جب میری پہلی نظم "مسافر راستے میں رُک نہ جانا" ختم ہوئی تو خطیبۂ خوش نوا، بلبل ہند نے والہانہ تالیوں کے شور میں تقریر شروع کی اور رسمی تخاطب کے بجائے انھوں نے FELLOW TRAVELLERS

(عزیز ہم سفرو!) سے مجمع کو مخاطب کیا۔ اور میری نظم کے بارے میں چند جملے کہے اور پھر ان کی خوش بیانی کا دریا موجیں مارنے لگا۔ مجمع پر گویا جادو چل گیا تھا۔ آخری نظم سننے کے بعد انھوں نے میری نظموں کے بارے میں چند ہمت افزا کلمات کہے اور محبت و شفقت بھرے لہجے میں فرمایا کہ مجھ سے ملتے رہیئے اور کوئی کام ہو تو بے تکلف کہیئے۔ میں اپنی سرگرمیوں میں الجھا ہوا تھا، لکھنؤ میں وہ کہاں آتیں۔ ایسا کوئی کام ہی نہ پڑا کہ میں اُن تک جا کر عرضِ حال کرتا، لیکن اس ہلکی سی بھنوری دنیا میں گھوم پھر کر وہ مقام آ ہی گیا کہ ان تک رسائی کی کوشش کروں۔ جد وجہد آزادی ایک خاص موڑ تک آ چکی تھی اور ملک تقسیم کے کگارے تک پہنچنے والا ہی تھا کہ گاندھی۔ جناح مذاکرات کا بمبئی میں آغاز ہوا۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا میں جنرل سکریٹری تھا اور مجھے ایک اور رفیقِ کار رامیشور پرشاد مصرا کے ساتھ گاندھی جی سے ملنا ضروری تھا۔ پہلے سے رابطہ قائم کیے بغیر، ملاقات کے وقت اور تاریخ کا تعین کرائے بغیر جوانی، طالب علمی اور کچھ شاعری کی نظم بیزاری اور بے پروائی میں سیدھے وارد بمبئی ہو گیا۔ پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے مذاکرات کے دوران تمام ملاقاتیں اور پروگرام یکسر ملتوی کر دیے ہیں۔ بڑے بڑے نہیں جا سکتے تھے ہیری کیا بساط تھی۔ مذاکرات کا نظام الاوقات یہ تھا کہ صبح کو گاندھی۔ جناح مذاکرات ہوتے اور سہ پہر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوتا جس میں مذاکرات کی رفتار سے کمیٹی کو مطلع کیا جاتا اور کل کی گفتگو کے بیرونی خطوط طے ہوتے۔ اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین شہر میں موجود ہیں۔ جو ڈھونڈے سو پائے۔ بالآخر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نائیڈو آئی ہوئی ہیں اور بھولا بھائی دیسائی کے دولت کدے پر مقیم ہیں۔ اُن سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم ہوا۔ انھوں نے محبت آمیز استفسارات کیے اور دوسرے دن پانچ بجے شام کو مدعو کیا۔ وہاں پہنچنے پر چائے سے تواضع ہوئی اور فرمائش ہوئی کہ تازہ نظم کہی ہو تو سُناؤ۔ میں نے جواب دیا کہ تازہ ترین نظم مہادیو دیسائی کی موت پر "لاش" کے عنوان سے کہی ہے۔ اسے کئی بار لکھنؤ اور بمبئی کے مختصر مجموں میں سُنا چکا تھا۔ زبانی یاد تھی۔ پورے تاثر کے ساتھ سُنا دی۔ یاد دلاتا چلوں کہ مہادیو دیسائی گاندھی جی کے پرائیوٹ سکریٹری

اور انھیں کے ساتھ قید تھے۔ قید ہی کی حالت میں اُن کی موت ہو گئی تھی۔ مسز نائیڈو نے نم پلکوں کو پونچھتے ہوئے کہا کہ "بہت اچھی نظم ہے، میں باپو کو سُناؤں گی بلکہ تم موٹے موٹے حرفوں میں لکھ دو تو میں انھیں پڑھاؤں گی بھی۔" میں نے کہا کہ "یہ بڑی عزت افزائی ہو گی، میں کل ہی لکھ کر حاضر کر دوں گا۔" ان کے استفسار پر میں نے بمبئی آنے کا مقصد بتایا کہ طلبا کے مسائل پر چند لمحے اُن سے گفتگو مقصود ہے۔ یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ سب ملاقاتیں بند ہیں۔ اب آپ ہی مشکل کُشائی کر سکتی ہیں۔" کہنے لگیں "بہت مشکل ہے، لیکن کوشش کروں گی۔" دوسرے دن میں اپنی نظم صاف صاف اور موٹے حروف میں لکھ کر لے گیا۔ خوش ہوئیں۔ "باپو دیکھ کر متاثر ہوں گے۔" "کل شام کو ٹیلی فون کر لینا۔ اگر تمھیں ملاقات کا وقت مل گیا تو بتا دوں گی۔" اگلے دن انھوں نے بتایا کہ "کل ڈھائی بجے کا وقت دیا ہے۔" میں خوشی سے اُچھل پڑا اور شکریہ ادا کیا۔

اب اس تاریخی دن کی واردات سُنیے۔ ہم گھر سے بہت پہلے نکلے۔ کار کا انتظام نہ ہو سکا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ پٹرول کی بیحد کمی تھی اور ٹیکسیاں مشکل سے ملتی تھیں۔ انتظار کے بعد ریل، بس اور آخر کار ٹیکسی کا سہارا لیتے ہوئے تقریباً بیس منٹ بعد پہنچے۔ مسز نائیڈو برلا ہاؤس کے برآمدے میں غیظ و غضب کے عالم میں برس پڑیں۔ "گاندھی جی سے ملاقات طے کرنے کے بعد آج تک کسی نے دیر سے آنے کی ہمت نہیں کی۔ لوگ بہت پہلے سے آ جاتے ہیں لیکن آپ تو ٹھہرے شاعر!" مجھے اپنی بدبختی اور اس ناشنیدنی تاخیر پر سچ مچ رونا آ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی داستان سُنائی۔ رُندھی ہوئی آواز میں درخواست دُہرائی۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح بولیں "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میرے منت سماجت کے بعد خاموشی سے چلی گئیں۔ میں اور ساتھی مصرا وہیں جمے رہے۔ کہاں اور کیسے جاتے؟ تھوڑی دیر بعد آئیں۔ کہنے لگیں "میں کچھ نہیں کر سکتی!" میں نے کہا کہ "آپ کے سوا ہے کون جس سے میں کچھ کہوں گا۔" سکون کے ساتھ ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں جا کر خورشید بہن سے ملیے۔ ہم وہاں گئے۔ وہ ہمدردی سے پیش آئیں۔ مسز نائیڈو نے ان سے سفارش کر دی تھی۔ انھوں نے اگلے دن کا وقت دے دیا۔

بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پھر باہر آکر مسز نائیڈو سے اُن کی مزید مہربانی پر اظہارِ تشکر کیا۔ اگلے دن ملاقات ہو گئی۔ گاندھی جی کو میں نے تسلیم کی۔ یہ بھی خواہ مخواہ کی اکڑ تھی۔ سب پاؤں چھوتے تھے، لیکن جب گفتگو کے بعد اٹھنے لگا تو بے اختیار اُن کے پاؤں چھو لیے۔ یہ شخصیت کا جادو! اس عرصے میں بمبئی کے کانگریسی لیڈر ایس۔ کے پاٹل بھی آکر پائین فرش فردکش ہو گئے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے کہ "باپو، یہ لوگ میرے پاس جب بھی ضرورت ہو آسکتے ہیں۔" باپو نے کہا کہ طلبا کے معاملات میں آپ بی۔ جے کھیر جی سے مل سکتے ہیں۔ پاٹل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ طلبا کی اکثریت یا تو سوشلسٹ تھی یا کمیونسٹ۔ باپو نے وزیر اعلیٰ سے رجوع کرنے کو کہا کہ وہ کانگریس سے وابستہ ہونے کے باوجود خالص گاندھیائی تھے اور سبھی پارٹیاں اُن کے خلوصِ کار کی معترف تھیں! گاندھی جی سے یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ ایک بار پہلے بھی سیواگرام میں اُن کے درشن کر چکا تھا اور دوسری بار بنارس یونیورسٹی میں بھی دیدار ہو چکے تھے۔ میری سیاسی فکر پر مارکسیت کا واضح نقش تھا۔ لیکن جنگِ آزادی میں گاندھی جی کے کردار بالخصوص سماجی تبدیلیوں اور تنگ نظریوں کے خلاف اُن کی جنگ کا مجھ پر اثر ضرور تھا۔ کچھ حضرات تو مجھ پر گاندھی وادی ہونے کا الزام لگاتے ہیں لیکن میرا پہلا مجموعہ کلام اس کا شاہد ہے کہ میرے خیالات کئی اہم نقاط پر گاندھی واد کے مخالف تھے۔

یونیورسٹی کے باہر ایک اہم ثقافتی ادارے کی شکل میں آل انڈیا ریڈیو" کی شاخ لکھنؤ کا افتتاح، تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں چیب ڈائرکٹر تھے۔ بعد کو ڈائرکٹر جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اور بھی کئی ڈائرکٹر آئے۔ سب کے نام گنانے سے نہ کوئی فائدہ ہوگا نہ نقصان لیکن چیب (chib) صاحب اُردو کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ یہ ہندی، اردو، ہندوستانی سب کا مِلا جُلا دَور تھا۔ حفیظ جاوید، عادل رشید، شوکت تھانوی، کرشن چندر، گرجا کمار ماتھر، کل محمد شاہ نے اس اسٹیشن کے پروگراموں کو ملک بھر میں مقبول بنا دیا۔ دلّی میں بھی ن م۔ راشد، میرا جی، فیض احمد فیض، بخاری برادران، مجاز نے دھومیں مچا رکھی تھیں۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کے باوجود ریڈیو والوں نے شروع ہی سے پروگراموں میں مدعو کرنا شروع کیا۔ لوگ مجھے زیادہ تر ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ میرے مضامین اور تبصروں سے میری تنقیدی روش پر بھی نگاہیں پڑنے لگی تھیں۔ میری تقریریں اور نظمیں برابر نشر ہوتی رہتی تھیں۔ رسائل میں "زمانہ" کانپور، "نیرنگِ خیال" لاہور، "نیا ادب" لکھنؤ اور بہت سے دوسرے رسائل میں لکھتا رہتا تھا۔ لیکن عام طور سے ریڈیو کے لیے یا رسائل کے لیے جو کچھ لکھا وہ بیحد رَواروی میں لکھا۔ اُن کی نقلیں بھی محفوظ نہیں۔ نام لوگ جاننے لگے تھے۔ ریڈیو کے سلسلے میں صرف دو واقعات کا ذکر کروں گا۔ ایک تو نووارد شعراء کا مشاعرہ جس میں سردار جعفری، بہ خادم، جذبی، اور شاید فیض نے اپنا کلام سُنایا تھا۔ نظم کا عنوان تھا "کشمکش" علی العموم پسند کی گئی۔ دوسرے ہندی، اردو کا ملا جُلا مشاعرہ اور کوی تمیلن تھا جس میں اردو والوں کے علاوہ ہندی کے ہری ونش رائے بچن "مدھوشالا والے" اور ماکھن لال چترویدی، گرجا کمار ماتھر وغیرہ شریک ہوئے۔ اردو والوں میں میں بھی تھا۔ اس میں بھی ہندی اور اردو دونوں ہی حلقوں سے داد ملی۔ ایک اور اہم واقعہ ریڈیو اسٹیشن سے میری نظم "لاشش" کا براڈکاسٹ ہو جانا اور اس پر حکومت کی طرف سے استفسار سے پرسش۔ جواب کی تیاری میں میں نے بھی کرشن چندر کا ہاتھ بٹایا۔ جس وقت میں یہ نظم سُنا رہا تھا کئی آنکھیں باقاعدہ نَم آلود ہو گئی تھیں۔ پنڈت آنند نرائن مُلا بھی انھیں میں تھے! یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ قرۃ العین حیدر کے ناول میں جگہ ملی اور کراچی کے پریس کلب میں با اصرار سُنی گئی۔

اسی زمانے میں مکتبہ اُردو لاہور سے چودھری برکت علی صاحب لکھنؤ نئے مسودے لینے کی غرض سے تشریف لائے۔ مجھ سے علی عباس حسینی کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ وہ میرے ساتھ یونیورسٹی چلنے پر مُصر ہوئے۔ میں جا ہی رہا تھا، میں بخوشی یہ خدمت انجام دینے پر راضی ہوا۔ تانگے کا سفر گولا گنج سے یونیورسٹی تک براہ امین آباد طے ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ راستے بھر لوگ مجھ سے دعا و سلام کرتے چلتے ہیں۔ یونیورسٹی پہنچ کر وہ احتشام صاحب وغیرہ سے ملے۔ اُن کا غالباً یہ اثر پڑا کہ میں بیحد مقبول شاعر ہوں۔ انھوں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن رخصت ہونے سے پہلے مجھ سے با اصرار فرمائش کی کہ میں اپنا مجموعہ کلام انھیں طباعت

دوہے

سکھی! اور سب ٹھیک ہے، ہے دُکھ کی یہ بات
پیا بسے پردیس میں، دیوالی کی رات

(۲)

تم بن چاند نہ دِکھ سکا، ٹوٹ گئی اُمید
بن درپن بن نین کے، کیسے منائیں عید

(۳)

عُمر بڑھی تو گھٹ گئے خواہش کے دن رات
عقل کی بگیا پھل گئی، سُوکھ گئے جذبات

(۴)

پیسے کی بوچھار میں لوگ رہے ہمدرد
بیت گئی برسات جب موسم ہوگیا سرد

(۵)

ٹرین چلی تو چل پڑے، کھیتوں کے سب جھاڑ
بھاگ رہے ہیں ساتھ ہی، جنگل اور پہاڑ

(۶)

گوری! گورے رنگ پر، کاہے کو مغرور
اُجلے دن کے بعد ہے کالی رات ضرور

(۷)

کانٹوں بیچ تو دیکھیے، کِھلتا ہوا گلاب
دُکھ کا پہرہ ہے لگا سکھ پر بنا حساب

(۸)

بیکل تو بھی کس لیے کھڑا عدالت بیچ
نام ترا چھپ جائے گا کسی کی پگڑی کھینچ

بیکل اُتساہی
سول لائن۔ بلرام پور
گونڈہ
۲۷۱۲۰۱

غزل

اپنے پیروں کے لیے بار ہوئے جاتے ہیں
ہم کہ آساں تھے سو دُشوار ہوئے جاتے ہیں

دُھوپ اتنی ہے کہ جل جانے کو ہے دامنِ رُوح
چھاؤں ایسی ہے کہ بیمار ہوئے جاتے ہیں

اپنے چہرے پہ خود اپنا ہی قصیدہ لکھ کر
لوگ انسان سے اخبار ہوئے جاتے ہیں

عرض و اظہار کا کچھ حق بھی دیا جاتا ہے
آپ ہر بات پہ تلوار ہوئے جاتے ہیں

ہم نے وحدت کی طرف گھوم کے دیکھا ہی نہیں
ذرّے یکجا ہیں تو کہسار ہوئے جاتے ہیں

جس سے خدشہ ہو ضرر کا اسے کہتے ہیں سلام
حادثے زیست کا معیار ہوئے جاتے ہیں

درودیوار کو حسرت کہ دُکاں ہو جائیں
گھر کے گھر شہر میں بازار ہوئے جاتے ہیں

وقت سے تیز سواری نہیں ہوتی تسنیم
اور ہم حاصلِ رفتار ہوئے جاتے ہیں

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

کالی داس گپتا رضا
۴۳ اے جل ... نیپین سی روڈ
ممبئی ۴۰۰۰۳۶

داغ کے تعلق سے

"وہ صورتیں الٰہی" از: مالک رام فروری ۱۹۷۴ء

"(سائل صاحب اور میں) باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلیے آپ کے دادا جان (غالب) کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں ..... چونسٹھ کھبا کے پاس..... احاطے میں .... (سائل صاحب) مختلف قبروں کی نشان دہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف (مرزا الٰہی بخش خسر غالب) کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے (غالب کے برادر نسبتی) علی بخش خاں کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں (رام پوری) ہیں۔" (ص ۹۱)

افسوس کہ آج تک معروف کی بیوی (غالب کی ساس) کے کوائف نہیں معلوم ہو سکے شاید سائل صاحب کچھ بتا سکتے۔

"کوئی گھنٹہ بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو خضر میرزا مرحوم تھے، دوسرے ظہیر دہلوی کے نواسے سید اشتیاق حسین شوق۔ خضر میرزا، میرزا زین العابدین خاں عارف کے بھتیجے اور سائل صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے، بلکہ رشتے کے بھائی ہوتے تھے۔ سائل نواب احمد بخش خاں کے پرپوتے تھے اور خضر میرزا ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے کے بیٹے۔ گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جدِ اعلیٰ ایک ہی تھا۔ خضر میرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ نوکری سے پنشن پانے کے بعد اب یہیں مہرولی میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے تھے اور سارا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر اسّی برس سے زیادہ تھی لے لیکن اس کے باوجود جسم نہایت چاق و چوبند، طبیعت حد درجہ حاضر اور حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انھوں نے بیسیوں ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل آئے۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ باوجود پیرانہ سالی اور تدین کے انھیں غیر شستہ بلکہ عریاں لطیفے کہنے میں باک نہیں تھا۔ .... معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں شعر بھی کہتے اور خضر تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

خضر یہ بھی خدا کی قدرت ہے
بت ہمیں راستہ بتاتے ہیں

اس کے ساتھ انھوں نے مومن کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن ۔ رات کاٹی خدا خدا کر کے"

(ص ۹۴)

حمیدہ سلطان احمد نے اپنی کتاب "خاندان لوہارو کے شعراء" (۱۹۸۱ء) میں بعض باہر کے شاعروں کو شامل کیا ہے مگر خضر میرزا کو بطور شاعر شریک نہیں کیا۔ غالباً انھیں علم نہ تھا کہ خضر مرزا شاعر تھے اور کبھی خضر تخلص سے شعر کہا کرتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ثبوت بہم پہونچایا ہے

اور یہ کتاب "خاندان لوہارو کے شعراء" سے بہت پہلے چھپی ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ نصیر مرزا کا تعلق خاندان لوہارو سے قطعی نہیں تھا۔

"ایک دن ان (داغ) سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: آپ کے خاندان نے انھیں نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا تسلیم نہیں کیا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔؟

یاد نہیں ہمارے قریب کونسی کتاب رکھی تھی اس میں داغ کی تصویر بھی تھی، اسے کھول کر یہ تصویر مجھے دکھلاتے ہوئے بولے: تم نے ہمارے خاندان کے کئی آدمیوں کو دیکھا ہے اور ہمارے بزرگوں میں سے بعض کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ اب یہ تصویر دیکھو اور خود فیصلہ کرلو۔

اس میں شک نہیں کہ داغ اور لوہارو خاندان کے افراد میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ وہی وضع قطع، وہی نقشا، وہی خدوخال۔ اگر قیافہ کوئی چیز ہے تو اسے مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس خاندان میں سے نہیں تھے۔

میں نے جب اس رائے کا اظہار کیا تو فرمایا:—

بلاشبہ جو کچھ تم نے کہا، بالکل سچ ہے۔ بس ایک فرق تھا۔ ہمارے خاندان میں سب کا رنگ بہت گورا چٹّا رہا ہے، داغ صاحب اس کے برعکس، اچھی خاصی سانولی رنگت کے تھے۔ لیکن تم پڑھے لکھے آدمی ہو، جانتے ہو کہ یہ بات ایسی نہیں کہ محض اس وجہ سے ہم انھیں خاندان سے خارج کردیں۔ مجھے تو ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ غیر ہیں۔ میں تو انھیں چچا جان کہا کرتا تھا۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی ہوئی ہے تو لوہارو خاندان والوں نے داغ کو اس لیے ان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا کہ انگریز انھیں ریاست کا وارث نہ قرار دے دیں۔ سارا خاندان شمس الدین احمد خاں کے خلاف تھا اور ننہال کی طرف سے داغ کی پشت پر کوئی تھا نہیں، اسلیے وہ لوگ آسانی سے اس میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بعد کو جب نواب امین الدین خاں گدّی پر بیٹھ گئے اور اب اس کا اندیشہ نہیں رہا تھا، تو آہستہ آہستہ ان کی مخالفت میں کمی آتی گئی۔"

(ص ۶۹)

اب یہ تسلیم کیا جاچکا ہے کہ داغ نواب شمس الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔

خاندانِ لوہارو کے شعراء

از حمیدہ سلطان احمد ۔ جون ۱۹۸۱ء

الف (ص ۱۴۳):

"الجواب از ہز ہائی نس لوہارو"

خوشا وقتے ز بہر فرخِ مہجور از نیّر
مبارک باد عید الفطر در دلکش نوا آمد
ز آمد آمدِ نامہ بسر گرمیِ ہنگامہ
چہ گوید حال دل خامہ کہ بہر او چہا آمد
برادر جاوداں مانی بریں فضلِ سخن دانی
بہ ظلّ لطفِ سبحانی، ز فرخ ایں دعا آمد"

سیّد احمد شفیع نیر فریدآبادی (۱۸۶۷ء تا ۱۹۰۶ء) نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے داماد اور نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا کے بہنوئی تھے۔ ان کی بیگم کا نام رضیہ سلطان بیگم تھا۔ شادی ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔ فرخ مرزا (ولادت ۲۶ر جنوری ۱۸۶۰ء) اپنے والد نواب علائی کی وفات (۳۱ر اکتوبر ۱۸۸۴ء) کے بعد والی لوہارو مقرر ہوئے تھے۔ نیّر ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے کسی عید الفطر پر فارسی میں ایک قطعۂ تہنیت فرخ مرزا کو بھیجا۔ جس کے جواب میں نواب فرخ مرزا نے مندرجۂ بالا قطعہ نیّر کو لکھا، جس میں دو جگہ فرخ تخلص آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی شعر کہتے تھے، لیکن "خاندان لوہارو کے شعراء" میں ان کو شامل نہیں کیا گیا۔

(ب) لوہارو والوں نے ایک عرصے تک نواب مرزا خاں داغ کو نواب احمد بخش خاں کا پوتا اور نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا نہیں مانا، لیکن اب تو سب مانتے ہیں۔ پھر ایسے جیّد اور عہد ساز شاعر کو "خاندان

لوہارو کے شعراء" میں شامل کرنا سخت ناانصافی ہے . اگر چہ
اس شمولیت سے خود خاندانِ لوہارو کی شان میں اضافہ ہوتا.

(ج) لوہارو مہاراجہ بختاور سنگھ والیِ الور نے اپنی طرف سے نواب احمد بخش خاں کو عطیہ دیا تھا. وہیں سے خاندانِ لوہارو کی بنیاد پڑی . لہٰذا خاندانِ لوہارو کے شعراء میں صرف وہی شاعر شامل کیے جا سکتے ہیں جو نواب احمد بخش خاں کی اولادِ نرینہ سے ہیں . بیٹیوں کو اسی صورت میں شامل کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ خود شعر کہتی ہوں . ان کے شوہر یا اولاد خاندانِ لوہارو کے رکن نہیں کہے جا سکتے .

"خاندانِ لوہارو کے شعراء" میں کل ۲۱ شاعروں کو شامل کیا گیا ہے مگر ان میں آٹھ شاعر خاندانِ لوہارو سے نہیں ہیں . ان کے نام یہ ہیں :

۱. حسین علی خاں شاداں ۲. زین العابدین خاں عارف
۳. باقر علی خاں کامل ۴. غلام حسین خاں مسرور
۵. غلام حسن خاں محو ۶. مطلبی فریدآبادی
۷. احمد شفیع نیر فریدآبادی ۸. سید ہاشمی فریدآبادی

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ خود حمیدہ سلطان احمد صاحبہ کا بھی خاندانِ لوہارو سے کوئی تعلق نہیں ہے ، سوائے اس کے کہ ان کی نانی بگا بیگم ، نواب ضیاء الدین احمد خاں کی بیٹی تھیں . اس طرح غالب سے بھی کوئی رشتہ نہیں سوائے اس کے کہ حمیدہ سلطان بیگم صاحبہ کے یتیم نانا کی غالب نے پرورش و پرداخت کی تھی . مگر نانا مرزا باقر علی خاں کامل اور نانا کے والد زین العابدین خاں عارف کو غالب نے کبھی گود نہیں لیا تھا .

ماہنامہ "پیامِ یار" لکھنؤ متفرق شمارے
جنوری ۱۸۸۸ء تا جنوری ۱۸۹۵ء

منشی نثار احمد نثار لکھنوی مرحوم چوک لکھنؤ میں عطر کی دکان کرتے تھے . خود شاعر تھے اور شاعروں سے گہرا ربط رکھتے تھے . ۱۸۸۲ء میں انھوں نے ایک ماہنامہ "پیامِ یار" کے نام سے نکالا جو بہت مشہور رہا . اس ماہنامے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ملک بھر کے منتہی اور مبتدی شاعروں کا کلام چھپتا تھا . رسالے کے شمارے اب بہت کمیاب ہیں . میرے کتب خانے میں اس کے ۴۲ شمارے ہیں جو جنوری ۱۸۸۸ء سے جنوری ۱۸۹۵ء تک پھیلے ہوئے ہیں . تفصیل یہ ہے :

۱۸۸۸ء	جنوری تا مئی . جولائی . ستمبر . نومبر . دسمبر	۹
۱۸۸۹ء	جنوری تا جون . اگست تا دسمبر	۱۱
۱۸۹۰ء	جنوری تا ستمبر	۹
۱۸۹۱ء	فروری تا اپریل . اگست . ستمبر	۵
۱۸۹۲ء	فروری . جولائی	۲
۱۸۹۳ء	فروری . مارچ . اگست	۳
۱۸۹۴ء	اپریل . جون	۲
۱۸۹۵ء	جنوری	۱
	میزان :	۴۲

ان میں داغ کی ۲۷ طرحی غزلیں ہیں ، جن کے مطلعے حروفِ تہجی کے اعتبار سے یوں ہیں ؎

xx ۱. دیکھنا حشر میں جب تم پہ مچل جاؤں گا
میں بھی کیا وعدہ تمھارا ہوں کہ ٹل جاؤں گا — مئی ۱۸۸۸ء

۲. تو ہی اپنے ہاتھ سے جب دلربا جاتا رہا
دل کی بھی پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا — فروری ۱۸۸۸ء

۳. اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا — جولائی ۱۸۹۲ء

۴. قبضہ کرتا ہے ہر اک حور شمائل اپنا
آج ہم وقف کیے دیتے ہیں لو دل اپنا — فروری ۱۸۹۲ء

۵. شوق ہے اس کو خود نمائی کا
اب خدا حافظ اس خدائی کا — مارچ ۱۸۹۳ء

x ۶. بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا
وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا — اگست ۱۸۹۰ء

x ۷. غیر کو منہ لگا کے دیکھ لیا
جھوٹ سچ آزما کے دیکھ لیا — جون ۱۸۹۰ء

۸۔ جانچ لو ہاتھ میں پہلے دلِ شیدا لے کر
نہیں پھرنے کا مری جان یہ سودا لے کر — اگست ۱۸۹۱ء

۹۔ آئے ہیں ترے کوچے میں ہم گھر سے نکل کر
اب جائیں کہاں عرصۂ محشر سے نکل کر — اپریل ۱۸۹۱ء

۱۰۔ ان کو کہاں ہے صبر و تحمل عتاب میں
دم بھر کے بعد اور خط آیا جواب میں — فروری ۱۸۹۱ء

× ۱۱۔ دل گیا تم نے لیا ہم کیا کریں
جانے والی چیز کا غم کیا کریں — جنوری ۱۸۹۰ء

× ۱۲۔ صاف کب امتحان لیتے ہیں
وہ تو دم دے کے جان لیتے ہیں — مارچ ۱۸۹۰ء

×× ۱۳۔ اللہ رے تلوّن، ابھی کیا تھے، ابھی کیا ہو
شوخی ہو تو شوخی ہو، حیا ہو تو حیا ہو — ستمبر ۱۸۸۸ء

×× ۱۴۔ مرے زخمِ جگر کا بوسہ لے کر جب نکلتا ہے
لبِ سوفار کو غصّے سے وہ چٹکی میں ملتا ہے — جنوری ۱۸۸۸ء

۱۵۔ وہ دل لے کے چپکے سے چلتے ہوئے
یہاں رہ گئے ہاتھ ملتے ہوئے — جنوری ۱۸۹۵ء

۱۶۔ رہتی ہے اطلاع انھیں دل کے حال سے
ملتی ہیں گالیاں مجھے پہلے سوال سے — جون ۱۸۹۴ء

۱۷۔ قیامت ہیں باقی ادائیں تمھاری ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمھاری — اپریل ۱۸۹۴ء

۱۸۔ یہ ٹپکتا ہے رنگِ بسمل سے
ہولی کھیلے گا آج قاتل سے — اگست ۱۸۹۳ء

۱۹۔ مرادیں مانگ رہا ہوں قضا کے آنے کی
بُری گھڑی تھی دلِ مبتلا کے آنے کی — ستمبر ۱۸۹۱ء

۲۰۔ پرسش جو ان سے ظلم کی روزِ جزا ہوئی
اتنا ہی کہہ کے چھوٹ گئے وہ خطا ہوئی — مارچ ۱۸۹۱ء

× ۲۱۔ پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے — ستمبر ۱۸۹۰ء

× ۲۲۔ وہ نیم وعدہ کر کے فراموش ہو گئے
امیدوار ہوش سے بے ہوش ہو گئے — جولائی ۱۸۹۰ء

× ۲۳۔ ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے
ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے — اپریل ۱۸۹۰ء

× ۲۴۔ سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی
یہی کم بخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی — دسمبر ۱۸۸۹ء

× ۲۵۔ یہ جو ہے حکم مرے پاس نہ آئے کوئی
اس لیے روٹھ رہے ہیں کہ منائے کوئی — جون ۱۸۸۹ء

× ۲۶۔ آئے بھی تو وہ منھ کو چھپائے مرے آگے
اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے — مئی ۱۸۸۹ء

× ۲۷۔ تم نے بدلے ہم سے گن گن کے لیے
ہم نے کیا چاہا تھا اس دن کے لیے — اپریل ۱۸۸۹ء

ان طرحی غزلوں میں سے غزل نمبر ۱، ۱۳، ۱۴ ("مچل جاؤں گا" "ابھی کیا ہو" اور "جب نکلتا ہے") گلزارِ داغ مطبوعہ ۱۸۷۸ء میں شامل ہیں اور غزل نمبر ۶، ۷، ۱۱، ۱۲، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷ آفتابِ داغ مطبوعہ ۸۵/۱۸۸۴ء میں موجود ہیں۔ باقی سب کلام مہتابِ داغ مطبوعہ ۱۸۹۴ء (؟) میں ہے گویا واقعی طرح پر کہا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۴ غزلیں پہلے ہی سے گلزارِ داغ اور آفتابِ داغ میں موجود تھیں اور طرح کے اعلان ہونے پر وہی غزلیں (جن کے اشعار دیوان میں شامل اشعار سے عموماً کم ہیں) 'پیامِ یار' کو برائے اشاعت فراہم کر دی گئیں۔ داغ ایسا کر لیا کرتے تھے۔ جب احسن مارہروی مرحوم نے اپنے گلدستے کے لیے طرحی غزل مانگی تو داغ نے لکھا (زبانِ داغ ص ۴۵)

"مہتابِ داغ کو ملاحظہ کرو، میری غزل اس زمین میں ہے ..." گویا وہاں سے لے کر گلدستے میں شائع کر دو۔ یہی عمل انھوں نے یہاں بھی روا رکھا۔ غزل نمبر ۱۳ ــ

اللہ رے تلوّن! ابھی کیا تھے، ابھی کیا ہو

کو طرحی غزل بنانے میں داغ نے خاصی ایڈیٹنگ سے کام لیا ہے۔ گلزارِ داغ میں اس زمین میں دو طویل غزلیں ہیں۔ انھوں نے دونوں میں سے اشعار لے کر ایک غزل تیار کر لی اور پیامِ یار میں چھپوا دی۔

اس کے کل شعر ۲۶ ہیں۔ ۱۲ شعر غزلِ اوّل سے اور ۱۴ ہی غزلِ دوم سے۔ پانچ مطلعے ہیں۔ پہلے تین غزلِ اوّل سے لیے گئے ہیں اور دو غزلِ دوم سے۔ مقطع غزلِ اوّل کا ہے۔

وہ غزلیں جو طرح پر کہی گئی تھیں، جب مہتابِ داغ میں داخل کی گئیں تو کچھ نہ کچھ نظرِ ثانی بھی ضروری تھی۔ اگرچہ داغ کا کلام پہلی ہی نظر میں نہایت پختہ اور اُستادانہ ہوتا تھا اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہ ہوتی تھی، پھر بھی کہیں کہیں نہایت معمولی پھیر بدل ہوا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔ چند ترامیم ملاحظہ کیجیے ؎

پیامِ یار مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

ترمیم: " " شکوے "

پیامِ یار اب دل ہے مقامِ بےبسی کا یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

ترمیم: " " بےکسی کا " "

پیامِ یار ؎ عیش و عشرت میں اِدھر ہے تو مصیبت میں اُدھر
ایک ہو کر کبھی اِس کا ہے کبھی دل اپنا

ترمیم " " اُن کا " "

پیامِ یار ؎ مُرادیں مانگ رہا ہوں قضا کے آنے کی

ترمیم: " مان " "

بُری گھڑی تھی دلِ مبتلا کے آنے کی

پیامِ یار ؎ ایسے لینے سے تو ہے جان کا دینا بہتر

ترمیم: " " " اچھا

کیا جیے گر جیے احسان کسی کا لے کر

پیامِ یار ؎ دُنیا ہی میں ملتی ہے اسے دوزخ و جنّت

ترمیم: " ملتے ہیں " "

انسان ذرا سیر کرے گھر سے نکل کر

پیامِ یار ؎ بے در بدر ہوئے نہ نکلتا تھا یہ غبار

ترمیم: " " " نہ نکلتا کبھی غبار

آج ان سے صاف صاف مری برملا ہوئی

پیامِ یار ؎ دیکھا دل ان کا غیروں نے سینے پہ رکھ کے ہاتھ

ترمیم: " " غیر نے "

وہ کاش دیکھتے نہ مجھے اضطراب میں

پیامِ یار ؎ مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

ترمیم: " " گئے "

پیامِ یار ؎ مری التجا پر بگڑ کر وہ بولے نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا

ترمیم: " " کہنا

پیامِ یار ؎ وہ نیم وعدہ کر کے فراموش ہو گئے

ترمیم: " " جو خاموش "

امیدوار ہوش سے بےہوش ہو گئے

غزل نمبر ۶ کے، جس کا مطلع ہے ؎

بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا

کُل ۱۴ شعر پیامِ یار میں شائع ہوئے تھے اگرچہ مہتابِ داغ میں اس غزل کے ۱۸ شعر ہیں۔ پیامِ یار میں شائع شدہ غزل کا یہ شعر مہتابِ داغ میں نہیں ہے ؎

ستم ہی کیے جاؤ ہم بھی ہیں حاضر
ہمیں حوصلہ دیکھنا ہے کسی کا

اتفاق سے پیامِ یار میں چھپی ان غزلوں میں داغ کے بعض مشہور اور معنی خیز اشعار بھی آ گئے ہیں ؎

حُسنِ معشوق سے بھی حُسنِ سخن ہے کمیاب
ایک ہوتی ہے ہزاروں میں طبیعت اچھی

اے داغ ہے دکن سے بہت دُور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سیّد جلال سے

کہتے ہیں اسے زبانِ اُردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

حیدرآباد میں کی قدر ہماری اے داغ
شاد آباد رہے خسروِ عادل اپنا

دلّی سے چلو داغ کرو سیرِ دکن کی گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

نہ رہا لُطف اِس زمانے میں میرزا داغ میرزائی کا

نہیں کھیل اے داغ، یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

"نوابِ مرزا خاں داغ"
از: تمکین کاظمی
مطبوعہ ۱۹۶۰ء

" ایک روز داغ کی بیوی نے خوب آڑے ہاتھوں لیا کہ اب تک تو آپ رنڈیوں کا گانا ہی سنا کرتے تھے مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے تعلقات بھی پیدا کر لیے ہیں۔ داغ نے انکار کیا تو بیوی نے کہا،

" اور جو چوری پکڑ کر بتا دی ؟ "

یہ سُن کر داغ اندر سے ہنستے ہوئے باہر آنے لگے اور بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار
اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

کسی شاگرد نے اس طرح ہنستے اور شعر پڑھتے ہوئے دیکھ کر حیرت ظاہر کی تو داغ نے کہا۔ مضمون تمھاری استانی کا ہے، جسے میں نے نظم کر دیا ہے۔ پھر سارا قصّہ سنا دیا۔"

(صفحہ ۲۷۵)

معلوم ہوتا ہے یہ لطیفہ محض درج بالا شعر کو سامنے رکھ کر گھڑ لیا گیا ہے۔ دہلی اور رام پور میں تو داغ کی یافت کبھی اتنی نہ تھی کہ وہ رنڈیوں کا گانا سنتے اور شاہدانِ بازاری سے ملاقات رکھ سکتے۔ اس لیے اگر یہ واقعہ ہوا بھی ہوگا تو حیدرآباد ہی میں ممکن ہے۔ داغ رام پور سے ۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو مستعفی ہوئے تھے۔ دربارِ نظام سے وابستگی ۶ فروری ۱۸۹۱ء کو ہوئی اور تنخواہ کا حکم ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو صادر ہوا۔ اس لیے طوائفوں کا ناچ گانا اس تاریخ کے بعد ہی سے ممکن ہے۔ مگر اس کا کیا کیجیے کہ یہ شعر اس غزل سے ہے جو داغ کے دوسرے دیوان آفتابِ داغ (مطبوعہ ۱۸۸۴/۸۵ء) میں شامل ہے۔ اتفاق سے ۱۸۹۰ء میں پیامِ یار کے ایک شمارے کے لیے بھی یہ طرح مقرر ہوئی۔ داغ کے پاس برسوں کی کہی ہوئی غزل تیار ہی تھی، انھوں نے وہی بھیج دی۔ چنانچہ جون ۱۸۹۰ء کے شمارے کی غزلوں میں داغ کی یہ غزل بھی شامل ہے اور یہ شعر بھی۔

"بادۂ سرجوش"
از: جوش ملسیانی
مطبوعہ ۱۹۴۰ء

" حُسنِ ساقی کیا ہے پُرجوش ہے
انجمن کی انجمن بے ہوش ہے"

اس غزل کے کل نو شعر ہیں۔ تیسرا شعر ہے ؎

اک جہاں ہو جس کا مشتاقِ جمال
سخت حیرت ہے وہ کیوں روپوش ہے

اور مقطع یہ ہے ؎

آبِ کوثر، جوش! ہو جس پر فدا
وہ مرا اشکِ ندامت کوش ہے

آخر ۱۹۴۸ء میں جب میں رسالہ داستان (جالندھر) کی اشاعت کے سلسلے میں جوش صاحب کی خدمت میں پہونچا تو انھوں نے مجھے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" کی ایک جلد عنایت فرمائی۔ میں نے تخلص کی رعایت سے کتاب کے نام "بادۂ سرجوش" کی داد دی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ نام حقیقت میں ان کے استاد حضرت داغ کا دیا ہوا ہے۔ جب میں نے یہ غزل (جو اصلاً ۸ شعر کی تھی) اصلاح کے لیے بھیجی تو اس کا مقطع یہ تھا ؎

اک جہاں ہو جس کا مشتاقِ جمال
جوش! حیرت ہے کہ وہ روپوش ہے

حضرت داغ نے لفظ جوش قلم زد کر کے اس پر "سخت" بنا دیا اور "کہ وہ" کو "وہ کیوں" سے بدل دیا یعنی ؎

سخت حیرت ہے وہ کیوں روپوش ہے (باقی ص۳۰ پر)

میر انیسؔ

اُردو تری حیات کا عنواں انیسؔ تھے — بزمِ ادب کی شمعِ فروزاں انیسؔ تھے
چرخِ سخن کے مہرِ درخشاں انیسؔ تھے — اقلیمِ شعر و نظم کے سلطاں انیسؔ تھے

ہے آج تک زبان پہ قبضہ انیسؔ کا
ملکِ سخن میں چلتا ہے سکّہ انیسؔ کا

دُنیا میں مثلِ فصلِ بہاراں رہے انیسؔ — شاہد ہیں گل کہ جانِ گلستاں رہے انیسؔ
ظاہر پرستیوں سے گریزاں رہے انیسؔ — مدّاحیِ حسینؑ پہ نازاں رہے انیسؔ

تحسین و آفریں کا شوراک خراج تھا
منبر اگر تھا تخت علم سر کا تاج تھا

کس کو نصیب ہوگی جو شانِ انیسؔ ہے — معیارِ اعتبار بیانِ انیسؔ ہے
مقیاسِ حسن و فیض زبانِ انیسؔ ہے — ہے کعبۂ سخن کہ مکانِ انیسؔ ہے

دُنیا میں سر چھپانے کو جا بھی کہاں ملی
بیتِ انیسؔ ہی میں زباں کو اماں ملی

ایسے فصیح جن پہ فصاحت کو ناز ہے — ایسے بلیغ جن پہ بلاغت کو ناز ہے
ایسے سلیس جن پہ سلاست کو ناز ہے — ایسے خلیق خلق و مروّت کو ناز ہے

عارف ہیں اہلِ علم کہ گوہر نفیس ہے
مانوس ہے سخن تو زباں ہم جلیس ہے

احمدؐ کا تذکرہ تو کہیں مرتضٰےؑ کا ذکر — مدحِ حسنؑ کبھی تو کبھی فاطمہؑ کا ذکر
شہ کی رضا کے واسطے جانِ وفا کا ذکر — اوجِ کلام کے لیے ربِّ علیٰ کا ذکر

شاعر کا مدّعا دلِ زہرؑا کا چین ہے
یہ گلستانِ نظم بنامِ حسینؑ ہے

جس کو نہیں زوال وہ شہرت ہوئی نصیب — شاہی کو رشک آئے وہ سطوت ہوئی نصیب
جھپکے نگاہِ مہر وہ طلعت ہوئی نصیب — خود چرخ جھینپ جائے وہ رفعت ہوئی نصیب

عزّت ملی ہے فاطمہؑ کے نورِ عین سے
یہ مرتبے انیسؔ نے پائے حسینؑ سے

مرزا محمد اشفاق شوقؔ لکھنوی
شاہ گنج۔ نخاس، لکھنؤ۔۳

غزل

عیب بھی آج ہنر لگتا ہے
ہر شیشہ گوہر لگتا ہے

خاکستر ٹوٹی دیواریں
یہ بھی کوئی گھر لگتا ہے

اب تو سوا نیزے کے اوپر
یہ سورج اکثر لگتا ہے

کیسے کہوں میں اس کو محافظ
جس سے مجھ کو ڈر لگتا ہے

ماضی کی رنگیں یادوں کا
محل آج بھی کھنڈر لگتا ہے

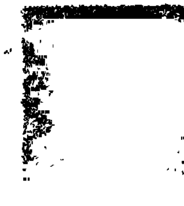
جانے کیوں یہ چاند پرانا
پہلے سے بہتر لگتا ہے

سیلانیؔ ہر محسن اب تو
بارودی لشکر لگتا ہے

سیلانی سیوتے
۸۰۔ مومن پورہ جنسی
جہانگیرآباد
بھوپال
(مدھیہ پردیش)

خود نوشت

ڈاکٹر عتیق اللہ
۲۲۱ - غالب اپارٹمنٹ - پٹیم پورہ
دہلی - ۱۱۰۰۳۴



کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

میں ۲۱ فروری ۱۹۴۱ء کو اجین (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوا قبلہ والد صاحب ۱۹۱۰ء میں دہلی منتقل ہوئے بعدہ بھوپال اور پھر اجین وہ مردان (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آبا وسط ایشیا سے سمرقند و بخارا منتقل ہوئے۔ جلال آباد (افغانستان) میں ایک عرصۂ دراز تک سکونت اختیار کی۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں یعنی غزنوی کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے۔ غیر منقسم ہندوستان میں جس علاقہ کو ریاست سوات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسی میں شہر مردان کی تحصیل نادا گئی ہے جسے انھوں نے ہمیشہ کے لیے آباد کر لیا۔ آبا ر سپاہی پیشہ تھے یا بیشتر وہ نادر روزگار ہستیاں تھیں جنھوں نے جگہ جگہ دینی مکاتب کھولے۔ تبلیغ و تربیت دین جیسے فرائض ادا کیے۔ والد بزرگوار نے بھی فقہ کی تعلیم پشاور میں پائی تھی۔ ترکے میں ہزاروں ایکڑ کاشت کی زمین ملی تھی۔ ان میں کئی چلغوزوں کے باغات اور گاؤں بھی تھے مگر زر و حرص زر نہ طمع زمین ان کے پیروں کی زنجیر بنی۔ تمام دنیاوی تمتعات کو خیرباد کہہ کر جب سے پنجاب کے دریاؤں سے ادھر سرزمین گنگ و جمن پہ قدم رکھا سو یہیں کے ہو کر رہ گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ انھوں نے دہلی کے بعد بمبئی، بھوپال اور پھر اجین کو آباد کیا شہر اجین ہی اُن کی طویل ترین پناہ گاہ ثابت ہوا۔ اور ۱۹۸۲ء میں یہیں انھوں نے اپنی آخری سانسیں لیں۔

میری ولادت اجین ہی میں ہوئی۔ والدہ کا وطن مولود بھوپال تھا۔ ان کا تعلق بھی ایک معروف دینیاتی گھرانے سے تھا۔ آبا کا سلسلہ سرزمین ٹونک سے جا کر ملتا ہے۔ ننھیال میں بھی تعلیم و تعلّم کی روایت تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ والدہ مرحومہ حنیفہ بیگم اور خالہ بی انوری بیگم نے اجین اور اس کے نواح میں پہلی بار ۱۹۱۵ء میں باقاعدہ مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کھولے۔ سرکار نے باہمی گفت و شنید کے بعد ۱۹۲۲ء میں انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ اجمیں میں آج بھی یہی اسکول تعلیم نسواں کے اہم مراکز ہیں۔

ہم بارہ بہن بھائیوں میں سے کل چار ہی بچے ہیں۔ بڑے بھائی کا نام نبیاللہ ہے جو کراچی پاکستان میں ہیں وہ میرے بھانجے اقبال چودری کے ماہانہ رسالے بزبان انگریزی ECONOMIC REVIEW، (کراچی) سے منسلک ہیں۔ مجھ سے چھوٹے بھائی فرید اللہ دبئی میں ایک اعلا سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ ہمشیرہ ظاہرہ جہاں اجین ہی میں ایک اسکول میں معلّمہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

والدہ ۱۹۵۷ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ میں نے انٹرمیڈیٹ ہی کیا تھا اور چونکہ معلّمی خاندانی پیشہ تھا سو مجھے اور ہمشیرہ کو فوراً ملازمت مل گئی میری سب سے بڑی بہن طیبہ جہاں اجین کی وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے ۱۹۴۴ء میں ودّیا کیور گرالیار سے مڈل پاس کیا تھا پھر انھیں والدہ کے قائم کردہ سرکاری اسکول میں ٹیچر شپ مل گئی تھی مگر شومیٔ قسمت وہ عین ایام جوانی میں ہم سے رخصت ہو گئیں۔

میری ابتدائی تا اعلیٰ تعلیم اجین ہی میں ہوئی ۱۹۶۷ء میں وکرم یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات سے بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا پوری یونیورسٹی میں میرٹ کے لحاظ سے میری پوزیشن دوسری تھی ۱۹۶۹ء میں ایم اے انگریزی ادبیات سے پاس کیا اور ۱۹۷۱ء میں اردو ادبیات سے ایم اے میں فرسٹ پوزیشن رہی۔ ابتدائی اسکولی اساتذہ کے استثنا کے ساتھ ایسا کوئی استاد نہیں ملا جس کا نقش تا بہ دیر قائم رہا ہو یہی صورت اعلیٰ تعلیم تک برقرار رہی۔

ثریا ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو میری رفیق سفر بنیں۔ ان کے والد جناب عطا الٰہی صدیقی مرحوم اجین میونسپل کارپوریشن میں اکٹرائے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ نہایت نفیس مہذب اور خلیق انسان تھے۔ شاعری کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے۔ خود بھی بہت اچھے شاعر تھے اور روایتی شاعری کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ نوجوان شعرا کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ مشاعرے بڑے خوش اسلوبی سے انعقاد کراتے۔ اکثر

ان کے دولت خانے پر شعری نشستیں ہوتیں نہایت مہمان نواز تھے اس لیے اکثر کوئی نہ کوئی شعرا ان کے یہاں بسیرا بھی ڈالے رہتے تھے۔ شاعری ہی وہ قدر مشترک تھی جس نے مجھے ان سے قریب کر دیا تھا۔ یہی قدر مشترک رشتۂ ازدواج کی موجب بنی تھی۔

شاعری کی اولین تحریک مجھے اپنے گھر ہی سے ملی۔ والد بزرگوار ہمیشہ گلستاں بوستاں اور انوار سہیلی کا ورد کیا کرتے تھے۔ سعدی اور حافظ کی شاعری کے پرستار تھے بلکہ ان حضرات کا بیشتر کلام انھیں ازبر تھا۔ فارسی اور پشتو یا دری زبان تھی طبیعت میں بڑی خفگی دری تھی مگر جتنا خفگی تھا اتنے ہی منکسر، نرم خو اور خوش طبع بھی تھے بڑی ہمشیرہ اور خالہ زاد بہن بھی شاعری کا ذوق رکھتی تھیں اور بزرگوں سے چھپ چھپا کر شاعری کیا کرتی تھیں۔ بعدازاں ان کی شاعری نعت و منقبت کی حدود میں محصور ہو کر رہ گئی۔ باقاعدہ شاعری میرے بھانجے اقبال حیدری عرف شہزادے میاں کیا کرتے تھے انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شغف تھا۔ بہنوئی صاحب خود بھی شعر کہا کرتے تھے اور بڑا اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ اقبال بھائی جان کا کلام ۱۹۴۴ کے لاہور کے رسائل میں شائع ہوا کرتا تھا۔ وہ نظم گو اور تجربہ پسند شاعر تھے بے حد ذہین اور طباع۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان منتقل ہوئے۔ ماہنامہ جام نو، کراچی کے مدیر ہوئے۔ انگریزی زبان میں اپنا رسالہ کاناٹک ریویو کراچی سے جاری کیا۔ اقتصادیات پر پاکستان کا سب سے مقدم اور مقبول ترین جریدہ مانا جاتا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ۱۹۸۵ کے لگ بھگ منظر عام پر آیا۔ اقبال بھائی جان کا حوالہ اتنا طویل ہو گیا اس کا بھی ایک سبب ہے کہ میرے اندر شاعری کا ذوق انھیں کا پیدا کردہ ہے۔

مجھے رسائل اور کتب بینی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اکثر گھر ہی میں کتابوں کی نمائش لگایا کرتا تھا یا لائبریری ترتیب دیا کرتا تھا۔ میرے شوق کو والدہ مرحومہ نے خوب ہوا بخشی۔ وہ میری پہلی تربیت گاہ تھیں۔ اکثر ترنم کے ساتھ میرے اچھے برے، غلط صحیح اشعار سنتیں اور رسالوں و کتابوں کی خرید کے لیے ہمیشہ مجھے نوازتی رہتی تھیں۔ انھیں کے مشورے پر اجین کے ایک بزرگ شاعر کاشف الہاشمی کو اپنی غزلیں بغرض اصلاح دکھانے لگا مگر کچھ دنوں ہی میں محسوس کیا کہ موصوف فن شاعری کے رموز سے ہی واقف نہیں ہیں۔ محض مصرعوں کو بدلنے یا نئے شعر کا پیوند لگانے یا موجود لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے بدلنے کا نام اُستادی نہیں ہے۔ میرے نزدیک استاد شعر کے لیے عروضیات کا ماہر ہونا ضروری ہے جس سے وہ بڑی حد تک نابلد تھے۔ میں نے بہت جلد اپنے آپ کو ان سے علاحدہ کر لیا۔ اور اپنے مطالعہ اور وجدان کو مشعل راہ بنایا۔ جس عمر کے حصے میں کسی لائق استاد کی رہنمائی ضروری تھی وہ میسر نہیں آئی اس کا قلق تا ہنوز ہے۔ اطمینان اس بات کا ہے کہ اس کمی کو اپنے مطالعہ کی مدد سے ہمیشہ پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور یہ کوشش تا ہنوز جاری ہے۔ ممکن ہے استاد میسر آ جاتا تو ذہن ہی کند ہو جاتا۔ فن عروض پر مہارت بھی حاصل ہو جاتی مگر پوری زندگی کے لیے گمراہی بھی مقدر بن سکتی تھی۔

مجھے جن شعراء کے کلام نے بے حد متاثر کیا تھا ان میں مخدوم، مجاز، فراق، فیض جاں نثار اختر اور دیگر ترقی پسند شعراء تھے جن کا اس زمانے میں طوطی بول رہا تھا نیاز فتحپوری کا جادو تھا جو سر چڑھ کے بولتا رہا۔ میں دسویں میں تھا اور پابندی کے ساتھ ماہنامہ نگار پڑھتا۔ اخبار مدینے کا اداریہ اور اداریہ کی زبان ہمیشہ جادو کی طرح اثر کرتی تھی۔ سوغات کے جدید نظم نمبر ۱۹۶۲ اور تحلیق دہلی نے نئے تصور شعر سے متعارف کرایا۔ نئی شاعری کرنے لگا۔ اس سفر میں صادق میرے قدم بہ قدم تھے ہم دونوں کے سنگھائے میل تقریباً ایک سے ہیں۔ دونوں نئے کی جستجو میں تھے روشن خیال، روایت شکن۔ تجربے کے دل دادہ ۱۹۶۸ء میں ہم دونوں جدا ہو گئے۔ وہ اپنی اہلیہ نال کے ساتھ اورنگ آباد منتقل ہو گئے اور ان کے بعد ۱۹۷۲ء میں مولانا آزاد کالج اورنگ آباد میں میرا تقرر بحیثیت اردو لیکچرر کے ہو گیا۔

۱۹۷۱ میں میری غزلوں کا پہلا مجموعہ ایک سو غزلیں حیدر آباد سے شائع ہوا اس مجموعہ میں ۱۹۷۱ تا ۱۹۹۵ کی غزلیں شامل تھیں اس ۵-۶ برس کے دور میں بیشتر شعراء نظم ہی کی طرف متوجہ تھے اور ان کی انفرادیت بھی نظم ہی میں متشکل ہو رہی تھی۔ بعض شعراء نے اپنی انفرادیت منوائی تھی جیسے عمیق حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی براج کومل، قاضی سلیم، بشر نواز، باقر مہدی اور وحید اختر وغیرہ۔

ان شعراء میں ترقی پسند عناصر بھی کار فرما تھے حالانکہ ترقی پسندوں کے موضوعات و مسائل اور ان کی بلند آہنگی اور تعمیم سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی خطابت اور طوالت انھیں گوارہ تھی۔ اختر الایمان کے بعد یہی وہ شعراء تھے جنھوں نے مختصر نظموں کو رواج دیا اور اسے مقبول بنایا۔ ان شعراء کے کلام میں جیسی نثریت تھی اگرچہ کلام موزوں تھا۔ غنائیت اور معقول عام جمالیاتی کے تصور کو رد کرنے کی غرض سے ان شعراء نے اور انھی میں نثری نظم کو ترجیح دی تھی ان شعراء سے قبل اس قسم کا کامیاب تجربہ مجید امجد، اختر الایمان، میرا جی اور مخدوم جالندھری کی نظموں کی صورت میں موجود تھا۔ مجید امجد کا [illegible]

نظمیں نثری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی قرأت بھی عام قرأت سے مختلف تاثر عطا کرتی ہو گی مگر یہ حضرات بجا بجا اضافات سے بھی کام لیتے ہیں اور مصرعوں کی اکائی کو بھی توڑ دیتے ہیں غیر متوقع تاملات اور وقفے PAUSES ان کی نظموں میں تواتر کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔

اس قسم کی نثریت جو کہ متداول رومانویت کا واضح ردعمل تھی ابھی بھی غزل سے کوسوں دور تھی میرے قریب ترین معاصرین میں محمد علوی، شہریار، ندا فاضلی، تھے ان کے یہاں غزل کا ایک نیا کردار ابھرا تھا۔ ان کے اسالیب ہلکے پھلکے تھے آہنگ قطعی دھیما اور لفظیات میں بھی بڑی عمومیت اور سادگی پن تھا پھر بھی ان میں احساس کی گہرائی اور تجربے کا تناؤ تھا جو اردو غزل کے لیے قطعی نئی چیز تھی باقی عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے مگر غزل میں ان کی انفرادیت بہت بعد میں قائم ہوئی شروع میں بانی پر فراق اور پھر ناصر کاظمی کا اثر تھا۔ دوسرے مجموعہ کلام کے بعد ان کی انفرادیت کا نقش گہرا ہو گیا اور وہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ بانی کے یہاں لسانی تازہ کاری تھی وہ ایک منتخب اختراعی ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی غزل میں کلیشیز کبھی نہیں برتے۔ ان کی عمر نے وفا نہیں کی اور وہ بہت جلد ہم سے رخصت ہو گئے ان کے تینوں مجموعہ ہائے کلام جدید غزل کی تاریخ میں نمایاں ترحیثیت رکھتے ہیں

میرے ابتدائی کلام کا بیشتر حصہ ماہنامہ شب خون الٰہ آباد میں شائع ہوا۔ ابتدا میں میری توجہ صرف اور صرف نظموں کی طرف تھی بعد ازاں غزل کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء کی اردو غزل کا جائزہ لیا جائے تو میری غزل اپنے مضامین، ادائگی لب و لہجہ اور تلفیظ کے اعتبار سے قطعی مختلف نظر آئے گی جس میں بڑی حد تک نثریت اور تیکھا پن تھا۔ یہ نثریت نظموں میں اختر الایمان ——— اور عمیق حنفی کے یہاں بھی تھی۔ فاروقی نے یہ بجا کہا ہے کہ میری غزل کا کردار عمیق حنفی کی نظم کا کردار ہے اظہار میں انتہائی بے تکلفی بلکہ بے دردی یعنی عموماً پامال تشبیہات و استعارات سے گریز اور نئی، محمد و علوذان کی جستجو در اصل میری غزل شکست خوردہ سپاہی کی غزل ہے جس کا آہنگ بلند ہے مگر وہ آہنگ اندر ہی اندر شکستوں سے چور ہے۔ شاید اسی لیے فاروقی نے میرے اولین مجموعہ کلام ایک سو غزلیں پر جب تبصرہ لکھا تو ان کے ابتدائی کلمات یہ تھے۔

"اس کتاب کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر بھونڈے پن، زبان کی LEFT HANDEDNESS لہجے کی کرختگی کا ہوتا ہے۔ ایک ... اندھا ہوا ... سپاہی کے لبس کا کام نہیں ہے۔ ایسی شاعری خاصی صبر آزما ہوتی ہے۔"

دراصل میرے اظہار میں بالخصوص لسانی تجربے میں کسی ارادے کو دخل نہ تھا بلکہ ہر ایک ایسے شخص بلکہ نوجوان کی شاعری تھی جس کے بیشتر آبا کا پیشہ سپاہ گری تھا اور یہ لوگ وہ تھے جو حق و انصاف کے پاسدار تھے اور آزادیوں کے متوالے جنھوں نے کئی کئی ماہ افغانستان اور موجودہ پاکستان کے درمیانی دروں اور پہاڑیوں میں گذارے تھے۔ میرے تین حقیقی چچا انگریز سپاہیوں کی گولیوں سے شہید ہوئے وہ بھی جوان العمری میں۔ یہی گرم خون ایک لاوے کی طرح میرے رگ و پے میں بھی موجزن تھا۔ اسی بنا پر میری غزلوں کے پہلے دور میں انھیں کیفیات و احساسات کا اظہار ایک ایسے لہجہ میں ملتا ہے جو کھردرا، تشنج آمیز اور ناہموار ہے۔

اس قسم کی شاعری کا تجربہ واقعتاً نیا بھی تھا اور انوکھا بھی نیز کم از کم ۱۹۶۵ تا ۱۹۷۲ء میری نظر میں ایسا کوئی شاعر نہیں ہے جس کی غزلوں میں اس قدر کرختگی اور شکستگی ہو۔

اس نوعیت کے بعض اشعار درج ذیل ہیں جن سے میرے اندرونی تناؤ اور ذہنی پراگندگی کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے ؎

طلوع ہوتے ہوئے دن کی پیٹھ پر چڑھ کر — سیاہ دیو مری ہڈیاں چباتا ہے
وہ سنگ پاش اذیت کی تاب لا نہ سکا — میں اپنی چیخ میں پیوست ہو کے گونج اٹھا
جلد پر لوٹ پڑے سانپ کئی — اس نے چابک ابھی برسائے نہ تھے
ادھر صداؤں پہ کوئی صدائیں دیتا ہے — میں عنکبوت کے تاروں میں پابدست ادھر
اپنے ہاتھوں سے کاٹ چھانٹ دیا — چہرہ پہچان میں نہ آتا تھا

اس طرح سیاہ دیو کا ہڈیاں چبانا۔ اپنی ہی چیخ میں پیوست ہو کر گونج اٹھنا۔ جلد پر ایک ساتھ کئی سانپوں کا ٹوٹ پڑنا اور اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ہی کاٹ چھانٹ دینا وغیرہ تجربات غزل کے لیے قطعی نامانوس تھے۔ پھر یہ کہ ان غزلوں میں کنکھجورے سانپ، سپنولے، مکڑیاں، کاکروچ، گدھ، چیلیں اور چمگادڑیں وغیرہ کیڑے مکوڑے اور پرندے اس تواتر کے ساتھ بار بار نمودار ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو خاصہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ان اشعار کی تہہ میں چھپی ہوئی سچائیوں، انسانی دردمندی اور حقیقی جذبوں تک قاری کی نگاہ پہنچ سکتی ہے جسے انسان کی روحانی اور وجودی بےچینیوں کا ادراک ہے اور جو نئی غزل کو روایتی غزل کے پیمانوں سے ناپنے کی سعی نہ کرتا ہو۔ یہ سچے تجربات کی شاعری تھی۔ اسی لیے فرسودہ

اور پیپا معاینوں اور لسانی کوششوں سے قطعی مختلف تھی۔ غزل کی محفوظ روایتوں سے گریز کی ایک مثال جس میں غزل ایک ایسی زبان سے متعارف ہوتی ہے جو نئی اور تخلیقی تھی نیز جو مستعد محاورے کی نفی کرتی تھی شمس الرحمٰن فاروقی نے میری اس نوعیت کی شاعری کے بارے میں لکھا تھا۔

عام لوگ اس (شاعری) کو برداشت کرنے پر اسی وقت راضی ہو سکیں گے جب وہ ان تمام خامیوں یعنی بھونڈے الفاظ، ناموزوں مصرعوں اور زبان کی غلطیوں کے باوجود اتنی ہوئی سچی شاعری کی فضا میں دردمندی اصلی تجربات سے ہم آہنگی اور استعارہ و پیکر کی خوشگوار تازگی کے نمایاں عناصر کو پہچاننے پر تیار ہو سکیں گے۔ ایک سو غزلیں معلموں، مدرسوں، مکتبی نقادوں اور میٹھے میٹھے سپ اور گڑوا تھو پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے نہیں ہے۔

ایک سو غزلیں ساری کی ساری بھونڈے پن کا تاثر فراہم نہیں کرتیں اس میں ان اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جو تجربے کی شدت اور روحانی بے چینی کے ترجمان ہیں مگر ان کی لسانی تنظیم اور مصرعے کے بناؤ میں بڑی قطعیت اور صلابت ہے شاید میرے مجموعہ کے انھیں اشعار کے پیش نظر فاروقی اس نتیجے تک پہنچے ہیں۔

"اس مجموعہ کا بیشتر حصہ اچھی شاعری اور کچھ حصہ بہت اچھی شاعری کا نمونہ ہے عتیق اللہ کا اسلوب اپنے بہترین لمحات میں ایک انتہائی منفرد اسلوب ہے جس کے ذریعہ ایک غیر معمولی طور پر حساس اور دردمندانہ شخصیت کا اظہار ہوا ہو"

میری نظر میں درج ذیل اشعار وہ ہیں جن سے میری انفرادیت متعین ہوتی ہے۔ یہی میرا مخصوص لہجہ ہے۔

قدم قدم وہ بچھڑتا چلا گیا مجھ سے — میں بار بار اسے راستہ بتاتا تھا
میں ایک کاغذ کا پر تولتا پرندہ تھا — اڑان بھر نہ سکا اور چمن سے لوٹ گیا
کون کہہ سکتا ہے کچھ دیر میں کیا ہو جائے — کوئی جاتا ہے ذرا دیر مجھے ٹھہرا کر
مجھ میں خود میری عدم موجودگی شامل رہی — ورنہ اس ماحول میں جینا بڑا دشوار تھا
ہر ایک سمت ہی دریا اس آب تھی اس کے — مگر وہ مجھ سے زیادہ مجھے پیاسا لگا
چیختا ہے مرے اعصاب میں صحرا کا بدن — کتنا پیاسا ہوں مجھے کھود کے دیکھا جائے
شہر شیشے کی طرح اپنا بھرم رکھتا ہے — ایک پتھر کسی جانب سے گرایا جائے
کوئی صورت نکل ہی آئے گی — ہر کسی سمت سے پکارتا ہوں
توجہ کیا کر پتھر انگیٹھی آنکھیں میری — خدا کے نسخہ سے ہو یہ سنگ شیشہ تو دیکھوں
میں آگ ہی بجھاؤں گا اور تو بھی جل ہی جائے گا — اس اعتماد سے اب میرا انتظار نہ کر

۱۹۷۲ میں میرا تقرر بحیثیت اردو لیکچرر کے مولانا آزاد کالج اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں ہو گیا جہاں اردو شعر و ادب کا ایک بہتر ماحول تھا۔ ایک طرف یعقوب عثمانی (مرحوم) تھے جن کی نگاہ کلاسیکی ادب و فن پر گہری تھی۔ باوجود اس کے نئے ادب کے معترات پر بھی وہ حد درجہ ازفہم کے ساتھ غور کرتے تھے لکھنؤ ان کا مولد تھا مگر ایک بار جب انھوں نے اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہہ دیا تو پھر اورنگ آباد سے جو وفاداریاں قائم کی تھیں تابہ آخر انھیں نبھاتے رہے۔ یہ ان کی وضع داری بھی تھی اور اہل اورنگ آباد کا تاریخی اور روایتی اخلاص بھی جو ان کے پیروں کی زنجیر بن گیا۔ یعقوب عثمانی کا دم غنیمت تھا۔ وہ اپنے آپ میں ایک پوری مجلس تھے۔ بزرگوں میں بزرگ اور نوجوانوں میں جوان۔ صاحب علم بھی تھے، صاحب نظر بھی جس نے معاصر نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ؎ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

یعقوب عثمانی صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عصمت جیسے لسانیات، قواعد اور عروضیات کے ماہر محقق و نقاد بھی تھے۔ عصمت جاوید مقامی گورنمنٹ کالج میں اردو لیکچرر تھے۔ میں نے اسی کالج کے پرنسپل کی نگرانی میں ۱۹۷۶ء میں پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان جدیدیت اور اردو نظم مکمل کیا۔ اورنگ آباد جو ہمیشہ علم و ادب کا مرکز رہا ہے اور مولوی عبدالحق کی علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کو جہاں نئی سمت ملی تھی انگریزی اردو ڈکشنری جیسا بلند کوش منصوبہ وہیں اپنی تکمیل کو پہنچا تھا۔ اور یہ وہ سلسلہ ہے جو عصمت جاوید کی تحقیقی اور لسانی کاوشوں تک برقرار رہتا ہے۔

اسی فضا نے ماضی قدیم میں سراج اورنگ آبادی کو جنم دیا تھا اور موجودہ زمانوں میں اس سلسلے کو جن شخصیتوں نے برقرار رکھا ہے ان میں سکندر علی وجد (مرحوم) جیسے اہم نظم گو شاعر تھے جو جدید و قدیم کا بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ان کے بعد اور ان کے علاوہ قاضی سلیم اور بشر نواز جیسے شاعر تھے جن کا شمار جدید اردو شاعری کے ان قلیل ترین ناموں میں ہوتا ہے جن کی بصیرت نئی ہے۔ طرز احساس نیا ہے۔ تجربہ جن کی پہچان ہے۔ اس کی رونق محفل کو اپنے فکر و فن سے جن حضرات نے دوبالا کر دیا تھا ان میں جوگندر پال کی افسانہ نگاری تھی۔ شمیم احمد کی تنقید تھی۔ فضیل جعفری کی غزل گوئی اور صادق کی نظم گوئی

تھی۔ رفعت نواز اور محمود شکیل جیسے افسانہ نگار تھے جو ۱۹۷۲ء تک خاصے معروف ہو چکے تھے اور جن کے افسانے ہندو پاک کے موقر رسائل میں شائع ہو رہے تھے بے پی سعید جیسے شاعر تھے جو فن کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ جاوید نوجوانوں میں سب سے ہونہار تھے۔ ابتدا ہی سے ان کی غزل ایک ایسے طرز احساس کی نمائندہ تھی جو نامانوس اور نیا تھا

مولانا آزاد سوسائٹی کے ارباب حل و عقد نے میری صلاحیتوں کے پیش نظر سہ ماہی غبار خاطر کا اجرا کیا۔ شمیم احمد مجھ سے سینئر تھے اس لیے میں نے خود ان کا نام پر پوز کیا نتیجتہً میری حیثیت نائب مدیر کی ہو گئی اور میں نے کچھ جرح کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا بہرحال یہ رسالہ تین برسوں تک جاری رہا۔

۱۹۷۶ء میں میری زندگی میں زیادہ رنگین سفر بن گئیں۔ اسی برس میں دہلی منتقل ہو گیا۔ فروری ۱۹۷۷ء میں یو جی سی کی سینئر فلوشپ مل گئی اور اسی ماہ سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ایم اے کی کلاسیں بھی مجھے دی جانے لگیں ۱۹۷۸ء میں میری دوسری کتاب قدر شناسی (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) منظر عام پر آئی۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں بحیثیت اردو لکچرر کے باقاعدہ تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۷۸ء ہی میں تناظر کا اجرا عمل میں آیا جس کی ادارت مجھے سونپی گئی تھی۔ تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ تنقید کا نیا محاورہ شائع ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں حکومت پاکستان کی دعوت پر ڈاکٹر محمد حسن کی قیادت میں ایک ڈیلیگیشن پاکستان گیا تھا جو سات پروفیسرز پر مشتمل تھا ان میں ایک میں بھی تھا۔ ہم لوگوں نے پاکستان کی پانچ یونیورسٹیوں کا دورہ کر کے وہاں کی اعلا سطح پر دی جانے والی اردو تعلیم اور اس کی سمت و رفتار کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔

دہلی میں اردو نظم آزادی کے بعد ترتیب دی جس میں ایک طویل مقدمہ تھا جو آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم اور اس کے رجحانات و تحریکات نیز اسالیب پر محیط تھا۔ ۱۹۹۱ء میں میرا دوسرا مجموعہ "بین کرتا ہوا شہر" زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ شعری مجموعہ میری نظموں اور غزلوں پر مشتمل تھا۔ ایک سو غزلیں ۱۹۷۱ء اور بین کرتا ہوا شہر ۱۹۹۱ء کے مابین ۲۰ برسوں کا فاصلہ ہے ان برسوں میں میری توجہ تنقید پر رہی ۱۹۸۵ء سے ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ کا کام کر رہا تھا۔ یہ ایک بڑا حوصلہ شکن عظیم منصوبہ تھا جس کی پہلی جلد جو ۶۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اب کہیں جا کر مکمل ہوئی ہے اور وہ بھی صرف اے سے ڈی تک کے الفاظ کی توضیحات پر مبنی ہے۔

بین کرتا ہوا شہر یقیناً میرے طویل شعری سفر کا ایک نیا سنگ میل ہے اس میں ایک سو غزلیں کی کرختگی اور شور مفقود ہے۔ یہ ایک ایسے شہر کی داستان ہے جو مسلسل بربادیوں اور تباہیوں کی طرف رواں ہے۔ خوف یہاں بھی افق تا افق مسلّط ہے۔ بے یقینی یہاں بھی برقرار ہے۔ روحانیت کا وہ میلان بھی ابھرا ہے جو میری شاعری میں ایک نئے تجربے کا حکم رکھتا ہے اسے عقیدے کی طرف واپسی کا میلان بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں زبان کا تجربہ بھی نیا ہے۔ میرے نزدیک بین کرتا ہوا شہر کی غزلوں میں تجرید کا پہلو بہت واضح ہے جبکہ ایک سو غزلیں میں اظہار کی منطق نہایت واضح اور جذبے دو ٹوک تھے۔ برخلاف اس کے اس مجموعہ میں سکوت کا سماں روشن ہے درج ذیل اشعار انھیں آثار کے مظہر ہیں ؎

کتنے برسوں کے بعد آنکھ کھلی
اور اسی روز مجھ کو مرنا تھا

سر برہنہ سواریاں تھیں اور
رات کا بے کنار صحرا تھا

یہ صرف و حاصل گزیدہ دنیا نہ میرے دن ہیں نہ میری راتیں
کہاں تلک دیکھتے ہی جاؤں سماعتیں کچھ نظر میں رکھ دے

یہ کون سے گم شدہ جہنم کا دشت پھر سامنے ہے میرے
میری رسائی کی حد میں آنے لگا تھا وہ اب فلک کہاں ہے

اک اندھیرا ہوں سر سے پاؤں تک
پھر یہ پہلو میں کیا چمکتا ہے

کس کے پیروں کے نقش ہیں مجھ میں
میرے اندر یہ کون چلتا ہے

زخم سا دل پہ ابھر آیا ہے کوئی نقش پا
دیکھئے آگے قدم اپنے کہاں رکھتا ہے وہ

روشنی رکھتا جائے گا تو ہاتھ پر
اور میں تحریر کرتا چلا جاؤں گا

مارا جاؤں گا بے موت
خواب اگر سچا ہوتا ہے

دیکھتا ہوں اُسے روزن خواب سے
رشتۂ دید سا درمیاں کچھ تو ہے

ہم سے بھی بہت پہلے یہاں آیا تھا کوئی
جب ہم نے قدم رکھا یہ خاکداں ویراں تھا

کچھ سکے تو اسے جا کے خود ہی بتلاؤں
کہ آج سوکھے ہوئے شجر پہ پھر ہوئی سرسر

ادھر ادھر سے بچاتا ہے وقت میرے لیے
کبھی کبھی ہی سہی انتظار کرتا ہے

دور اس کی روانگی کا تھا
ہر طرف سے گذر گیا ہوں میں

□□

غزلیں

پیتھول سے ہاتوں میں جب پتھر گئے
خواب کے سُوکھے سمندر بھر گئے

اے خُدا یہ حادثہ کیسے ہوا؟
چیخنے سنّاٹے اپنے گھر گئے

آنکھ پتھرائی تھی، پتھرائی رہی
اشک اپنے کام لیکن کر گئے

جس جگہ جاکر سبھی پتھر ہوئے
ہم کو دیکھو، ہم وہاں اکثر گئے

دَرد سارے جاگ اُٹھیں جن سے صبا
ایسی خوشیوں سے بہت ہم ڈر گئے

کبیر احمد صبا جائسی

ولی منزل
بدر باغ۔ علی گڑھ

بات اُس کی ہے جو بات اپنی بنا لے جائے
بارشِ سنگ میں سر اپنا بچا لے جائے

دل نے تو کتنے ہی منصوبے بنا رکھے ہیں
اب جدھر ہم کو رُخِ سیلِ ہوا لے جائے

اس قدر ڈوب کے تو چاند کو دیکھا مت کر
چاند اک دن تری صُورت نہ چُرا لے جائے

میرا پیغامِ محبّت ہے یہ ہر شخص کے نام
زخم دے جائے مجھے مجھ سے دُعا لے جائے

اے سمندر! میں کوئی برگ نہیں ہوں کہ جسے
جس طرف چاہے تری موج بہا لے جائے

تیز ہو جاتا ہے ہر روز ہوا کا جھونکا
وہ تری زلف کی خوشبو نہ اُڑا لے جائے

جو مجھے سنگِ سرِ راہ سمجھتا ہے بشیر
سکّۂ زر مجھے سمجھے تو اُٹھا لے جائے

بشیر فاروقی

۵۱۵۔ مراد علی لین۔ درمیان سبھا مارگ لکھنؤ

عشق کو عشق ہی کچھ اور نہ سمجھا جائے
خود یہ پارس ہے عبث اسکو نہ پرکھا جائے

فرض کہتے ہیں کسے اس کا تقاضہ کیا ہے
خوب واقف ہیں، یہ ہم کو نہ بتایا جائے

وعظ اور پند کا اے شیخِ حرم کیا حاصل
صرف انسان کو انسان بنایا جائے

جس میں آئے نظر انساں کا حقیقی چہرہ
ایسا آئینہ کوئی سامنے لایا جائے

اس پہ تہمت نہ لگے اس کی نہ ہو رُسوائی
زیست آئینہ ہے بے داغ ہی رکھا جائے

یہ مناسب نہیں تفریق گُلاب و گل میں
باغبانی کا یہ انداز ہی بدلا جائے

حُسن اور عشق کے مابین جنابِ شارق
ایک پردہ ہے جو حائل نہ ہٹایا جائے

شارق اجے پوری

اردو روزنامہ سنگم
دریاپور۔ پٹنہ
۸۰۰۰۰

جوگندر پال
۲۰۴ ۔ منداکنی انکلیو۔ نئی دہلی
110019

افسانہ

مقامات

نیند میں آدمی کی موت واقع نہ ہو چکی ہو تو وہ پَو پھٹنے کے آگے پیچھے جاگ ہی پڑتا ہے۔ بہت دیر سے سہی، جمال نے بھی آنکھ کھول لی ہے۔ اس کا خواب ٹوٹ گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی نظروں میں پیوند پیوند اُڑ رہا ہے۔

"امّی! ـ امّی ـ ی!" ـــ وہ ننھا سا ہے اور کھویا ہوا ہے اور رو رو کر اس کی گھگھی بندھی ہوئی ہے ـــ امّی! ـ ہر طرف لوگ ہی لوگ ہیں۔ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا ہے اور اپنی ناک کی سیدھ میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ اور کھوتا جا رہا ہے کسی نے بھی اسے روک کر نہیں پوچھا ہے، کہاں جا رہے ہو بالک ـ؟" مگر وہ بلک بلک کر پکار رہا ہے ـــ امی! ـ امّی کے پاس! ـ اور پھر ایک دم دو بانہوں نے کہیں سے کوند کر اسے لپیٹ لیا ہے اور اپنی امّی کو دیکھے بغیر اسے پتہ چل گیا ہے کہ وہ امّی ہی ہے اور ـــ امّی کی پیشانی پر سے راستہ سیدھا ان کے گھر ہی کو جاتا ہے ـــ

آؤ! ـــ

جمال کے بچپن کے گالے پھر ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئے ہیں۔ سپنا پھر گھنا اور گہرا ہونے لگا ہے اور اس کی آنکھیں مُند گئی ہیں۔

"پڑھو! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــ پڑھو، بسم اللہ۔"

"بسم اللہ"

"الرحمٰن الرحیم"

"الرحمٰن"

"الرحیم"

"الرحیم"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔"

"مولوی صاحب! لوگوں کے دس دس ہوتے ہیں، پر میرا تو ایک ہی ہے۔ میرے جمال کو جلدی سے قرآن حفظ کروا دیجئے۔ میں پورے دس کا نذرانہ پیش کروں گی۔"

"پڑھو جمال ـ"

"پڑھ تو رہا ہوں مولوی صاحب۔"

"نہیں، دل سے پڑھو! خدا کے الفاظ کو دل سے پڑھو گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔"

جمال نے آنکھیں کھول لی ہیں اور کھلی آنکھوں سے بھی اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو اسے یقین آ گیا ہے کہ وہ ابھی سویا ہوا ہے۔

"ابھی ابھی تو امّی ہمارے ساتھ تھی خورشید۔ کہاں گئی؟ ـ" جمال نے گھبرا کر اپنی بیوی سے پوچھا ہے

"امّی! ـــ جاؤ خورشید۔ دیکھو، امّی کہاں رہ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں موتیا اُترا ہوا ہے۔ خورشی۔ جاؤ، ہاتھ پکڑ کر لے آؤ۔"

"امّی نظر نہ آئے تو دوسرے بھی آپ کو دکھائی نہیں دیتے۔"

"جاؤ خورشی! امّی بے چاری کہیں ٹھوکر کھا کر گر پڑے گی۔"

"مجھ بیچاری کی طرف بھی آپ کیوں دھیان نہیں دیتے ـ؟ جب سے شادی ہوئی ٹھوکریں کھائے جا رہی ہوں۔"

"جاؤ خورشید!"

"آپ کی بیوی بننے سے تو اچھا تھا میں بھی آپ کی ماں ہی ہوتی۔"

"اچھا! تم یہیں ٹھہرو۔ میں خود ـ"

"نہیں، میں گھر جا رہی ہوں۔"

"خورشید!"

"نہیں!"

نصف شب ہولی ہے اور ایک پاگل بوڑھیا جمال کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہی ہے ——

"نہیں، جمال بیٹے! دروازہ کھولو —— میں پاگل نہیں ہوں — جمال — جما —— ل !!"

"سو جاؤ امّی!

"نہیں، بیٹے، دروازہ کھولو اور میرے پاس آؤ —— میرے پاس آکر بیٹھو بیٹے" — کھٹ کھٹ — ٹھ !

جمال نے بڑی بے بس نظر سے بیوی کی طرف دیکھا ہے "نیند کی ایک اور گولی دے آؤں خورشی - ؟"

"مارنا چاہتے ہیں تو دے آیئے — پہلی گولی دیئے ابھی پورا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔"

کھٹ — ٹ — ٹھ ٹھ — کھٹ !

"سو جاؤ امّی! کل سویرے آفاق بیٹے کا اسکول کا امتحان ہے خُدا کے لیے سو جاؤ۔"

"چُپ چاپ لیٹے رہیے۔ زیادہ توجّہ دیں گے تو امّی کا پاگل پن بڑھ جائے گا۔"

"میں پاگل نہیں ہوں بہو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے بھی اپنے پاس بٹھالو جمال بیٹے۔ میں دم سادھ کر بیٹھی رہوں گی —— کھولو ——"

کھٹ — ٹھ ——

"اُف فوہ! خُدارا اپنی ماں کو پاگل خانے بھیج دیجئے، یا ہم سب کو۔ سُنیے، آفاق بھی جاگ پڑا ہے۔ ابھی ابھی سویا تھا۔ اس کا امتحان۔"

"جمال! م —— جمال — ل!" — کھٹ۔ کھٹ۔ ٹھ !

جمال نے دیوانہ وار اُٹھ کر دروازہ کھولا ہے اور ماں کو تیزی سے کھینچ کر چارپائی پر پٹخ دیا ہے — وہ چیخنے لگی ہے اور —— اور جمال کے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہوئے اکڑنے لگے ہیں —— اور وہ ایک دم سنبھل کر رک گیا ہے —

"نہیں —— !"

جمال اپنی مرحوم ماں کے خالی بیڈروم میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں میں اپنی ماں کی —— صرف ناک، یا صرف ماتھا یا سَر یا کوئی اور حصّہ گھوم رہا ہے —— اب ماں کی آنکھیں جھپک رہی ہیں —— اب ہونٹ ہل رہے ہیں —— اب ٹھوڑی —— جمال اس کے انگوں کو جوڑ جوڑ کر اس کی پوری شبیہ بنا لینا چاہتا ہے —— یہ ماتھا — اور یہاں یہ آنکھیں اور —— لیکن ماتھا آنکھوں کی جگہ پر سرک آتا ہے —— نہیں، اب وہ کبھی اپنی ماں کی صورت نہیں دیکھ پائے گا۔ اپنی ماں کی صورت اس کے دل و دماغ میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہے —— نہیں! ——

جمال کے خوابیدہ چہرے پر جنبش ہوئی ہے۔ جیسے کوئی مچھلی کانٹے میں اٹک کر تالاب کی ساکن سطح پر پھڑپھڑائی ہو۔

"امّی تو پاگل تھی خورشید — اسے کیا معلوم تھا، وہ کیا کر رہی تھی؟ اس کی کُل کائنات ایک میں ہی تھا۔ اور جب میں نے بھی اس سے منھ موڑ لیا تو باؤلی اور باؤلی کیوں نہ ہو جاتی؟ —— تمہیں معلوم ہے خورشید اوپر اوپر سے تو میں اس کا علاج کروا رہا تھا لیکن جی ہی جی میں دُعائیں مانگا کرتا تھا کہ خدا اُسے اٹھا لے —— ہاں خورشی، اور کیا — میں ہی اسے موت کی طرف دھکیلتا رہا ہوں۔ مگر بے ذہن ماں کو کبھی اپنے بیٹے پر شبہ نہ گزرا۔ ذہن ہوتا تو گزرتا۔ مگر مرنے سے چند گھڑیاں پہلے —— تم نے دیکھا؟ وہ ایسے ہو گئی جیسے کبھی پاگل تھی ہی نہیں —— اس نے باری باری ہم سب سے پیار کیا۔ میں سب سے آگے تھا لیکن مجھ سے وہ سب کے بعد ملی — جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے خورشی، اس سے بچھڑنا، ہم پل پل ٹالتے ہیں — ہے نا؟ — وہ مجھے کس کر بھینچ لینا چاہتی تھی لیکن ہڈیوں کے گچھے میں اپنی باہیں اُٹھانے کا بھی دم نہ رہا تھا میں اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا اور اسے بازوؤں میں بھر کر جانے سے روک لینا چاہتا تھا لیکن — لیکن —"

بادل کے ٹکڑے آسمان میں یکجا ہو کر نیچے اترنے لگے ہیں اور اترتے ہوئے پانی پانی ہو کر بہہ نکلتے ہیں اور جمال غوطے کھائے جانے کے باوجود ڈوب نہیں رہا ہے۔ وہ بھی بہتا جا رہا ہے اور ایک پُل کے نیچے سے بہہ گیا ہے تو پھر وہی پُل آگیا ہے اور وہ پھر

بہہ گیا ہے تو پھر وہی پُل ـــ پھر وہی ـــ پھر ـــ اور اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس طلسمی عمل سے آزاد کرنا چاہا ہے۔

شاید وہ جاگ پڑا ہے؟ ـــ نہیں، ابھی نہیں ـــ

ایک بات سُنو خورشید! سنو گی تو شاید ہنس دو گی ـــ امی کو مرے ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں؟ پانچ ـــ نہیں، چھ ـــ مگر مجھے لگتا ہے، امی مری نہیں، ہمیں یونہی وہم ہو گیا ہے وہ مر چکی ہے ـــ ذرا سوچو۔ ماں مر جائے، ہماری زمین ہی مر جائے تو ہم کیونکر اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکتے ہیں؟ ـــ نہیں خورشی۔ ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ کون سی ماں چاہے گی کہ اس کے لہلہاتے پودے کھڑے کھڑے سُوکھ جائیں؟ قدرت معصوموں کے ساتھ بے انصافی نہیں برتتی، ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے ـــ ہمیشہ!

"آئی آفاق! ـــ" بیٹے کی آواز سُن کر ماں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اسی کی طرف بھاگی ہے ـــ "لو بیٹے آ گئی ـــ!" بس یہاں سے یہیں تک بھاگتے ہوئے آفاق کی ماں کو کئی سال بیت گئے ہیں۔

"بھئی خورشید! بیچ میں ذرا رک کے ہمیں بھی دیکھ لیا کرو۔"

جمال اپنی بیوی کا راستہ روک لینا چاہتا ہے اور اس پر ٹکٹکی باندھ کر ٹھٹھک جاتا ہے ـــ وہی باؤلا سا چہرہ، دودھیلی ممتا میں ڈوبی ہوئی جھریاں، تشویش ـــ

"اتنی رات ہو گئی ہے، آج پھر آفاق نہیں آیا ـــ آفاق کے ابا سُن رہے ہو؟ آفاق ابھی تک کیوں نہیں آیا ـــ؟"

اور آفاق کا ابا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے ـــ

"جایئے، پتہ کیجئے، آفاق کے ابا! ـــ ٹھہریئے! سنیئے! نہیں، پہلے میری سُنیئے آفاق کے ابا۔ آج میں آفاق کے لیے چاند کا ٹکڑا دیکھ کے آئی ہوں ـــ"

"آؤ آفاق بیٹا۔ تم تو ہمارے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں بیٹھتے سُنو! میں تمہارے لیے دُلہن دیکھ کے آئی ہوں" ـــ

"نہیں امی ـــ شادی میری ہے، آپ لوگوں کی نہیں۔ ـــ دراصل میں ـــ سچائی یہ ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے ـــ اگر آپ لوگوں نے چاہا تو میں اپنی بیوی کو یہاں لے آؤں گا، نہیں تو ہم دونوں الگ رہیں گے"۔

"الگ رہیں گے ـــ ؟! آفاق کے ابا! سُن رہے ہو ـــ؟ ہمارا بیٹا ہم سے الگ رہے گا ـــ مجھے چکر آ رہا ہے۔ مجھے تھام لو۔"

"آؤ بہو ـــ آؤ بیٹی! تم تو میرے لاڈلے کی دُلہن ہو۔ میں تم دونوں سے الگ کیسے رہ سکتی ہوں؟ ـــ آؤ! ـــ"

پھر وہی پُل آ گیا ہے اور جمال غوطے کھا کھا کے اس کے نیچے سے بہہ گیا ہے۔ پھر ویسے ہی بار بار وہی پُل ـــ جمال نے اتنے زور سے سر جھٹکا ہے گویا وہ جاگ پڑا ہو۔

مگر وہ بدستور تار تار سویا پڑا ہے۔

"دیکھئے امی! اپنے بیٹے کی طرف کم توجہ برتا کیجئے۔"

"کیا کہہ رہی ہو بہو ـــ ؟! ـــ میں نے تو اندھی باؤلی ہو کر اپنے آفاق کو اونچا کیا ہے"...

"لیکن امی! اب تو میں اونچا ہو گیا ہوں نا!"

"لیکن مجھے تو اب بھی ویسے ہی منے سے لگتے ہو۔"

میں اب منا سا نہیں رہا امی۔ آپ کے اس قدر پیار اور توجہ سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔

بادل دھرتی کو سوکھا چھوڑ کر آسمان کی طرف اٹھنے لگے ہیں ـــ برس جاؤ، خدا کے لیے برس جاؤ!

"آفاق کے ابا! آفاق کے....."

"ہاں بھئی خورشی، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"بہو نے میکے سے کہلوا بھیجا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہے گی۔ جب تک آفاق کوئی الگ بندوبست نہیں کر لیتا وہ میکے سے نہیں لوٹے گی ـــ اب کیا ہو گا آفاق کے ابا ـــ یہ کیا ہو رہا ہے خدایا؟ ـــ میرا خون پانی ہو رہا ہے لیکن تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو آفاق کے ابا! ـــ"

"آفاق! ـــ اِدھر آؤ بیٹا ـــ نہیں، جلدی میں بھی ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ ـــ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا ـــ کیا یہ سچ ہے بیٹا، تم ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے ـــ؟"

اس میں حرج ہی کیا ہے آبا؟ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ ہمیں اپنی زندگی اپنی طرح جینا ہے"!

"ہمیں کون، بیٹا ہم ـــــ تم اور بہو نا ـ؟ مگر بیٹا، تمھاری ماں کی اور ہم سب کی خواہش ہے کہ ہمیں بھی ہموں میں شامل کیے رکھو ـــــ نہیں بیٹا۔ پہلے میری بات ذرا آرام سے سن لو ـــــ ہماری محبّت صرف ایک شخص کے لیے رہی کیوں نہ ہو، اس میں دراصل وہ ساری محبتیں بھی کام کر رہی ہوتی ہیں جو ہمیں اوروں سے بھی ہوں ـــــ ہاں بیٹا آفاق! ماں یا بہن سے پیار کیے بغیر کوئی اپنی محبوبہ سے پیار نہیں کر سکتا ـــــ ہاں بیٹا۔ جو سب سے پیار کرتا ہے وہی صرف ایک سے پیار کر سکتا ہے ـــــ اب جاؤ خدا تمھاری مدد کرے"!

باہر سے کھنکھناہٹ سی محسوس کر کے جمال کے ماتھے کے بیشتر دونوں کواڑ ذرا سے ہلے ہیں اور کوئی آواز کیے بغیر چوپٹ کھل گئے ہیں اور وہ ابھی کواڑوں کے اندر باہر ہی ہے کہ اسے پیرِ سال ممتا کی آواز گرتی پڑتی سنائی دیتی ہے:

"آفاق کے ابّا! ـــــ آفاق کے ـــــ نہیں، آفاق نہیں! میں پاگل نہیں ہوں ـــــ!"

جمال نے بڑی گہری رکھی ہوئی نظر سے بے تاب آواز کی پرچھائیں کو دیکھا ہے اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لینے کے لیے بے اختیار بڑھ آیا ہے ـــــ

"امّی! ـــــ میری پیاری امّی!" ـــــ

□□

داغ کے تعلق سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ـــــ صفحہ ۱۹ کا بقیہ

مگر غزل مقطع سے محروم ہوگئی۔ چنانچہ اُستاد نے اصل مقطع کے نیچے شاید ازراہِ شوخی، اس مقطع کا اضافہ کر دیا ؎

نشہ آور ہے سخن تو کیا عجب
جوشؔ بھی تو بادۂ سرجوش ہے

بعد میں جوشؔ صاحب نے اس مقطع کی جگہ نیا مقطع کہہ کر غزل میں داخل کیا ؎

آبِ کوثر جوشؔ ہو جس پر فدا
وہ مرا اشکِ ندامت کوش ہے

مگر اُستاد کے دیے ہوئے قافیے "بادۂ سرجوش" کو سر آنکھوں سے لگایا اور پہلے مجموعۂ کلام کا عنوان بنا کر اس سے اپنے کلام کو معزز کیا۔

□□

حواشی:

[1] یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس کا ہے۔ اس طرح خضر مرزا کی ولادت ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ متعین کی جا سکتی ہے۔ گویا غالبؔ کے انتقال کے وقت عمر بارہ، تیرہ سال ہوگی۔ حکیم امجد علی خاں (حافظ ویران شاگرد ذوقؔ کے نواسے) کا انتقال ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو ہوا، وہ بھی اس محفل میں شریک تھے۔

[2] نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخؔ مرزا والیِ لوہارو

[3] نواب مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ اُن کے چھوٹے بھائی تھے، ان کا بھی سوائے اس رشتے کے لوہارو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ معروفؔ کا ریاست لوہارو کی طرف سے کوئی وظیفہ بحیثیت وارث مقرر نہ تھا۔ البتہ انھیں خاندانِ لوہارو میں شمار کرنے میں اس لیے تامّل نہیں کہ نواب احمد بخش خاں اور معروفؔ کا تعلق بہت گہرا تھا اور وہ معروفؔ کو خود سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔

یادوں کی رہ گزر: صفحہ ۱۲ کا بقیہ

کے لیے دوں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ اُن کی فرمائش قبول کی اور کہا کہ مجموعہ ابھی زیرِ ترتیب ہے۔ مرتب ہو جائے تو پیش کر دوں گا۔ آج وہ ہوتے تو دیکھتے کہ حالات کتنے بدل گئے ہیں۔ جن چہروں سے لکھنؤ عبارت تھا، وہ چھپ گئے یا بدل گئے۔ جن فضاؤں میں ہم سانس لیا کرتے تھے وہ بھی بدل گئیں۔ لکھنؤ ہی پر کیا منحصر ہے، سارا زمانہ بدل گیا ہے۔ کیا ہم خود نہیں بدل گئے ہیں؟

□□

حواشی:۔ [1] مقدمہ "رگِ سنگ" صفحہ ۱۹-۱۸ (طبع اول) [2] حُسن۔ [3] نزاکت۔ [4] اپنے وقت کے زبردست قانون داں اور کانگریس کے چوٹی کے لیڈر۔

پہاڑ کی صدا

"مری وادی میں ہے پھولوں کی دنیا"
میں گل پوش و گل افروز و گل افزا
مری گردن میں ہے ندیوں کی مالا
"ابلتا ہے مرے پہلو سے چشمہ"
"مرے دامن میں ہے شفاف دریا"
گہر پاش و گہر تاب و گہر زا
میں پہنے ہوں سمن زاروں کا گہنا
"مری چوٹی پہ قدرت کا تماشا"
نظارہ ہے مرا تخیل افزا
"ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ"

دریا کی صدا

"مری لہروں میں بجلی کا خزانہ"
مری شورش میں دھرپد کا ترانہ
رواں ہوں میں بہ طرزِ والہانہ
"مری رَو میں محبت کا فسانہ"
"مرے دھارے میں عظمت کا ترانہ"
فرازِ کوہ کا دل کش فسانہ
مرے طوفاں میں اسرارِ زمانہ
"مرے گرداب میں چنگ و چغانہ"
نظارہ ہے مرا تخیل افزا
"ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ"

طپش صدیقی
۳۳۸/۹۹، کنگھی محال
کانپور

دوہے

صحرا صحرا کون ہے؟ دریا دریا کون؟
دل کی گواہی لے کے پھر وہ تو خود ہے مَون

O

عقبیٰ سے غافل ہوا بھولا سچی راہ
جس کے دل میں آ گئی اِس دنیا کی چاہ

O

خود کو چھوٹا جو کہے وہی بڑا کہلائے
اُڑے خاک زمین سے آسمان تک جائے

O

سات سمندر پار سے آئی یہ آواز
ڈوبو تو ساتھی بنو نکلو تو ہمراز

O

نادانی کی راہ میں دکھ ہی دکھ ہاتھ آئے
کیوں جامن کی ڈال میں جھولا ڈالا جائے

O

پیاس کی شدت اے گہر! آنا مجھے رُلائے
خالی ساغر ہاتھ کا اشکوں سے بھر جائے

گہر خیر آبادی
کالا پیادہ۔ خیر آباد
سیتاپور ۲۶۱۱۳۱

۱۹۴۱ء کی ڈائری کا ایک سیاہ ورق

رابندر ناتھ ٹیگور کی آخری سانسوں کے نام

وہ کون تھا
جو کل
صبح سویرے
طوفانی موجوں کے رُخ پر
کشتیٔ جاں کو لے کر
نعرے لگاتا
گیت سُناتا
آگے بڑھتا جاتا تھا

اور
شام ڈھلے
یہ کون نظر آتا ہے وہاں
ریت کے دریا
کاغذ کی کشتی
اکھڑی اکھڑی سانسوں کے چپّو کے سہارے
چھوتا ہوا بے نام کنارے

کوئی نہیں جو بتلائے
میں نالاکناں
حیران و پریشاں
تاریخ کے بے حس پاؤں (۳) کو پکڑے
پوچھ پوچھ کر رہ جاتا ہوں
"یہ کس کا سایہ کشتیٔ جاں سے اُتر رہا ہے
چپکے چپکے؟"
۱۹۴۱ = ۱۹۳۸ + ۳ ء

شہرام سرمدی
۲۳۴ بی زہرہ باغ۔ سول لائنز
علی گڑھ

سید محمد صمد الاسلام
خرم نگر، گاندھی نگر، لکھنؤ

روبوٹوں کا انتظام

پچپن ہزار ٹن کا بحری جہاز بحر اوقیانوس Atlantic ocean میں شمالی امریکہ کی طرف رواں تھا۔ جہاز ۱۴۰ میٹر لمبا اور ۲۹ میٹر چوڑا تھا یہ ایک خطرناک طوفان میں گھرا ہوا تھا۔ ہوائیں ڈیڑھ سو کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تھپیڑے مار رہی تھیں اور جہاز تنکے کی طرح اچھل رہا تھا۔ لہریں بیس پچیس میٹر اوپر اٹھ رہی تھیں۔ جہاز کے عملے میں کپتان داؤد کے علاوہ ۹۸ لوگ اور تھے جو انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ زیادہ تر لوگ دعائیں مانگ رہے تھے، پچھلی آدھی رات تک یہ لوگ کھیل کود اور ناچ گانے میں مشغول تھے۔

یہ جدید قسم کا جہاز تھا اور اس پر سارا کام کمپیوٹروں اور روبوٹوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ جہاز کے سامان میں چائے کے بڑے بڑے لکڑی کے بکس تھے جو نہ صرف نیچے بلکہ اوپر عرشے پر بھی لدے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کشش ثقل کا مرکز CENTRE OF GRAVITY کافی اونچائی پر تھا۔ اس لیے جہاز کے کسی ایک طرف پلٹ جانے کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا یہ کبھی ۱۵ ڈگری زاویے پر داہنی طرف اور کبھی ۲۰ ڈگری بائیں طرف جھک جاتا تھا۔ اگر کسی طرف پورا پلٹ جاتا تو کچھ بھی نہ بچ نہیں سکتا تھا۔

کپتان داؤد ایک روز قبل کمانڈر روبوٹ کو جس کا نام ایس، آر تھا، جہاز کی کپتانی کا چارج دے چکے تھے۔ روبوٹ ایس، آر کے ماتحت دوسرے بہت سے روبوٹ تھے، جو ایس۔ آر کے برقی اشاروں پر کام کرتے تھے۔ یہ روبوٹ جہاز کو چلانے والی مشین PROPELLER انجنوں، بجلی گھر اور اسٹیرنگ کو صحیح طریقے سے چلانے کا کام کر رہے تھے۔

کیپٹن داؤد بہت پریشانی کے عالم میں تھے۔ آگے پیچھے اور داہنے بائیں سے سمندری لہروں سے سیکڑوں ٹن پانی اندر آ گیا تھا۔ بڑے بڑے پمپ پانی کو سمندر میں واپس ڈال رہے تھے۔ جہاز کے عرشے پر پانی کا ایک پائپ رسنے لگا تھا، اسے ٹھیک کرنے ایک روبوٹ آیا اور پھسل کر سمندر میں جا گرا۔ ایک دوسرے روبوٹ نے کرین سے لٹکی رسی اپنے جسم سے باندھی اور سمندر میں اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے کود پڑا۔ اس نے گرنے والے روبوٹ کو جا پکڑا۔ تیسرے روبوٹ نے کرین کے ذریعے دونوں کو اوپر کھینچ لیا، اور یہ لوگ اپنے اپنے کام پر لگ گئے۔ اگر کوئی آدمی سمندر میں اس طرح گرتا تو کچھ عرصے تک کام کرنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ تھوڑی بہت قے کرتا اور کچھ نہیں تو اسے تھوڑی دیر صدمہ ضرور رہتا۔

کیپٹن داؤد سب سے اوپری کیبن میں سمندر کو اور اپنے جہاز کو بڑی سراسیمگی کی حالت میں دیکھ رہے تھے۔ ان کے کمرے میں مختلف آلات اور میٹر وغیرہ نصب تھے۔ اچانک روبوٹ ایس آر ان کے پاس آیا اور بولا:

"یہ کمرہ محفوظ نہیں ہے۔ آپ فوراً نیچے والے کمرے میں چلے جائیے"۔

داؤد نے کہا: "کیوں؟ اس کمرے میں جو آلات لگے ہیں، انھیں دیکھنا میرے لیے ضروری ہے"۔

ایس آر بولا: "یہ کمرہ پندرہ بیس منٹ میں ٹوٹ کر گر جائے گا کیونکہ طوفان کی وجہ سے اس کے کئی جوڑ کمزور ہو گئے ہیں۔ (کمرہ لوہے اور لکڑی سے بنا ہوا تھا) دوسرے یہ کہ یہاں کے کچھ آلات بھی غلط اطلاعات دے رہے ہیں اور یہاں کی اطلاعات صحیح حاصل کرنے کی صلاحیت میرے اندر کے نظام میں موجود ہے۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

بادلِ ناخواستہ کیپٹن داؤد پیچھے کمرے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایس آر کو بلا کر کہا:

"ایس آر! جہاز کی کمانڈ مجھے دے دو اور تم میرے ساتھ رہو۔"

ایس آر بولا: "میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا کیونکہ آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ جہاز اور اس کے عملے کی حفاظت کر سکیں۔"

داؤد نے غصے سے ڈانٹ کر کہا: "تمہیں میرا حکم ماننا ہے۔ میں نے تمہیں ذمہ دار بنایا تھا اور اب سب ذمہ داریاں مجھے سونپ دو تم کسی کام میں دخل نہ دو صرف میری مدد جس طرح میں کہوں، کرو۔"

ایس آر: آپ کا دل و دماغ اس وقت اعتدال پر نہیں ہے آپ کے دل کی دھڑکن اس وقت ۱۲۲ فی منٹ ہے۔ اعصاب میں شدید تناؤ ہے، اور دماغ الجھن میں ہے۔"

داؤد: "تم یہ سب یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

ایس آر: آپ کے جسم سے ٹکراتی ہوئی مقناطیسی لہروں کے ذریعے یہ سب مجھے معلوم ہو رہا ہے۔"

داؤد: "تم کتنے ہی قابل کیوں نہ ہو۔ کیا میرا حکم کوئی معنی نہیں رکھتا۔؟"

ایس آر: "اس وقت آپ کا حکم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ پروگرام نمبر ۲۲۸ کے مطابق اگر آپ کی طبیعت ناساز ہو اور آپ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل نہ ہوں تو جہاز اور عملے کی حفاظت کرنے کا ذمہ میرا ہو جاتا ہے اور آپ کے کسی بھی حکم کی تعمیل سے میں انکار کر سکتا ہوں۔"

داؤد: یہ پروگرام نمبر ۲۲۸ غلطی سے تمہارے اندر داخل ہو گیا ہوگا۔ اگر تم میرا حکم نہیں مانو گے تو میں تمہارے برقی رابطے منقطع کر دوں گا۔"

ایس آر: "کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ میرے اندر برقی بیٹریاں موجود ہیں۔ مجھے برقی رو کی احتیاج نہیں ہوگی اور میں کام کرتا رہوں گا۔"

داؤد: "تو پھر میں تمہیں توڑ پھوڑ دوں گا۔"

ایس آر: "آپ کے یہ الفاظ آپ کی دماغی حالت کے آئینہ دار ہیں ۔۔۔ آپ یہ بھول گئے کہ میرے ماتحت میری حفاظت کر رہے ہیں اور میں ان سب کی حفاظت کر رہا ہوں۔

کپتان داؤد کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور اپنے مقابلے میں روبوٹ کی برتری کے قائل ہو گئے۔ اسی وقت داؤد والا اوپری کمرہ ٹوٹ کر نیچے گرا، جیسے کئی روبوٹوں نے مل کر ایک کنارے کر دیا۔ طوفان کی شدت میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ کپتان اور عملے کے لوگ لائف بیلٹ LIFE BELT پہنے ہوئے تھے جس سے ان کا سینہ اور پیٹھ ڈھکی ہوئی تھی۔ (لائف بیلٹ میں چار بہت ہلکے لکڑی کے ٹکڑے ایک کپڑے میں سلے ہوتے ہیں، اس کے پہننے سے آدمی ڈوب نہیں سکتا۔

ایک دم سے جہاز داہنی طرف جھک گیا۔ وہ اسی حالت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جھکنے کی وجہ یہ تھی کہ سیکڑوں ٹن پانی جہاز میں داہنی طرف جمع ہو گیا تھا، اس کو سارے پمپ مل کر فوراً سمندر میں واپس نہیں ڈال سکتے تھے۔ بائیں طرف لٹکی ہوئی بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں سمندر میں کرینوں کے ذریعے اتاری جا رہی تھیں تاکہ جہاز ڈوبنے کی صورت میں سب لوگ اس میں سوار ہو کر خود کو تقدیر کے حوالے کر دیں۔ سب لوگ دعائیں مانگ رہے تھے اور کسی خوش آئند تبدیلی کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ داؤد بار بار ایس آر سے پوچھ رہے تھے کہ جہاز سیدھا ہونے کا کیا امکان ہے۔ اور اگر ہے تو کتنی دیر لگے گی۔

ایس آر یہی جواب دیتا تھا کہ کوشش ہو رہی ہے اور یہ کہ آپ فلاں دوا کا استعمال کریں اور آرام کریں۔ داؤد کو الجھن یہ تھی کہ روبوٹ بجائے کوششوں کی تفصیل بتانے کے دوا کھانے اور آرام کرنے کا مشورہ دیے جا رہا تھا۔

کیپٹن داؤد کو جہازوں پر کام کرنے کا ۲۵ سال کا تجربہ تھا۔ تین سال پہلے وہ کیپٹن ہوئے تھے۔ کئی طوفانوں سے گزر چکے تھے، اور ان طوفانوں میں وہ بچاؤ کے لیے انتظامی امور میں سرگرم رہتے تھے۔ لیکن اس بار خود کچھ نہ کر سکنے کی وجہ سے بے یقینی کی کیفیت تھی اور بے کار ہو جانے کا احساس کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھا۔ انسان کسی کام میں کامیاب ہونے پر خوش ہوتا ہے اور ناکامیاب ہونے کی صورت میں کم سے کم یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اس نے پوری کوشش کی تھی لیکن

کامیاب نہ ہوسکا اور اب تو کامیابی اور ناکامی دونوں قسم کی شاباشی سے روبوٹ کھسک گئے جنہیں کسی بات پر خوشی یا رنج نہیں ہوتا۔ اس طرح داؤد کو خود ایک حصہ معطل ہوجانے کا بہت افسوس تھا۔

طوفان اب دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا۔ صبح سوا پانچ بجے یہ شروع ہوا تھا، اب شام کے چار بجنے والے تھے۔ جہاز کی حالت اب اعتدال پر آ رہی تھی۔ دس گھنٹوں سے طوفان میں گھرے ہوئے لوگوں کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ لوگوں کو کھانے پینے کی فکر لاحق ہوئی۔ جہاز سیدھا ہوکر دس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ منزل ابھی اسّی کلو میٹر دُور تھی۔ اس علاقے میں کئی جگہ سمندری پہاڑ ہیں اور سب کو اطمینان تھا کہ روبوٹ جہاز کو ان پہاڑوں سے بچاتے ہوئے لے جائیں گے اور ان سے ٹکر نہ ہوگی۔

کپتان داؤد میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کا ایک نائب محمود ہے جو میرا دوست ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔ ایس آر اور داؤد کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ محمود کی زبانی مجھے معلوم ہوئیں۔ میں حیران تھا کہ روبوٹ انسانوں سے زیادہ قابل کس طرح ہو گئے جبکہ یہ انسانوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ دوسرے دن میں داؤد کے پاس گیا وہ ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"داؤد! یہ بتاؤ کہ یہ روبوٹ کس طرح اتنے قابل ہو گئے کہ انسانوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔"

داؤد نے کہا "یہ ہمارے الیکٹرانک انجینئروں کی تخلیق ہیں۔ اور ایک انجینئر سلیم جنھوں نے انھیں بنانے میں کافی کام کیا ہے، وہ ان کے بارے میں زیادہ بتا سکیں گے۔ بہتر ہوگا کہ آپ خود ایس۔ آر سے اس کی قابلیت کے بارے میں معلوم کریں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ روبوٹ چلتے پھرتے کمپیوٹر ہیں اور تقریباً ایک ہزار پروگرام ان میں داخل کیے گئے ہیں۔ نیز بات کرنے اور حسبِ موقع جواب دینے کی صلاحیت بھی ان کے سافٹ ویر میں داخل ہے۔"

داؤد نے جیب سے ایک آلہ نکال کر آن کیا۔ چند سکنڈ میں ایس آر وہاں آگیا۔ داؤد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی صاحب ہیں۔ یہ کچھ سوالات تم سے پوچھنا چاہتے ہیں۔

ایس آر نے مجھ سے کہا۔ "پوچھئے۔ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ کس طرح آپ سب کام کر لیتے ہیں اور کس طرح آپ کوئی مخصوص کام کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔"

ایس آر: "مجھ میں انسانوں کی طرح سوچنے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ میرے جسم کا بیشتر حصہ سافٹ ویر پر مشتمل ہے، جن میں برقی تاروں کی ہزاروں شاخیں ہیں۔ ان میں برقی رو گزرنے کے منطقی راستے LOGIC CIRCUIT ہیں۔ ان راستوں میں کئی طرح کے ٹرانسسٹر سوئچ لگے ہیں اور یہ سوئچ اس طرح کام کرتے ہیں کہ اگر دو باتوں یا دو کاموں میں سے کوئی ایک کرنا ہو تو ایک قسم کے سوئچوں سے برقی رو گزرے گی، یہ اینڈ گیٹ (ANDGATE) کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم کے دو سوئچ آر گیٹ (ORGATE) ہوتے ہیں۔ یعنی کسی ایک سے برقی رو گزرے گی۔ تیسری قسم کے سوئچ ہاں یا نہیں کے مطابق برقی رو گزاریں گے یا نہیں گزاریں گے۔ اس قسم کے اور بہت سے ٹرانسسٹر سوئچ ہیں، جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کون سا کام کرنا ہے۔ دراصل پروگراموں میں جو مجھ میں داخل ہیں، پہلے ہی سے مختلف وجوہ اور فیصلے موجود ہیں جن کے مطابق برقی رو گزرتی ہے اور مجھے عمل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ میری ہر حرکت ان برقی اشاروں سے ممکن ہے اور میرے ہر عضو کے جوڑ میں برقی موٹریں فٹ ہیں جن سے میں حرکت کرتا ہوں۔ مجھ میں الٹراسانک نظام، راڈر اور مقناطیسی لہروں کا نظام موجود ہے، جن کے ذریعہ حسبِ ضرورت معلومات حاصل کر کے وجوہ کا تعین کرتا ہوں تب فیصلہ کرتا ہوں۔"

میں نے یہ سب سن کر کہا: "اچھا یہ بتلایئے کہ جب مختلف قسم کی معلومات ایک ساتھ ملتی ہیں تو ان کی پذیرائی اور مناسب عمل کا تعین کیسے کرتے ہیں، کیونکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر انسان کو بہت سی معلومات ایک ہی وقت میں حاصل ہوجائیں اور ان میں کچھ پریشان کن بھی ہوں تو اکثر قوتِ فیصلہ کمزور ہوجاتی ہے اور وہ غلط فیصلے بھی کر سکتا ہے۔"

ایس آر بولا، "اصل میں یہ ضروری نہیں کہ کئی معلومات ایک ساتھ حاصل کروں بلکہ خاص اور ضروری بات کی تلاش ہوتی ہے۔ باقی امور پر

ایک طائرانہ نظر رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مجھے یک سُوئی رہتی ہے جو انسانوں کو بہ مشکل حاصل ہوتی ہے، مجھے خوشی یا رنج کسی بات پر نہیں ہوتا۔ میں جذبات سے عاری ہوں۔ انسان ایسے نہیں ہیں۔"

"اچھا ایس آر، یہ بتائیے کہ اگر کوئی آپ کی صلاحیتیں ختم کرنا چاہے تو کیسے کر سکتا ہے؟"

ایس آر بولا: "اس سوال کا جواب میں نہیں دوں گا۔ مجھے بنانے والے مجھے ختم بھی کر سکتے ہیں لیکن ہر شخص ایسا نہیں کر سکتا۔"

میں نے پوچھا، "اس وقت آپ کے ماتحت کیا کر رہے ہیں؟"

"اس وقت وہ اسٹیئرنگ کنٹرول لیوروں کو سیدھا کر رہے ہیں جو طوفان میں ٹیڑھے ہو گئے تھے۔"

"اس وقت سمندر کی کیا حالت ہے۔؟"

آر ایس: "اس جگہ سے آٹھ نو میٹر دور ایک سمندری پہاڑ ہے جو سطح آب سے صرف سات میٹر نیچے ہے اور کوشش ہے کہ جہاز اس سے ٹکرائے بغیر نکل جائے۔"

میں نے سوچا کہ یہ روبوٹ میرے ہر سوال کا جواب دے رہا ہے، تو کوئی ایسا سوال بھی کرنا چاہیے جس کا جواب اسے نہ آتا ہو۔

میں نے پوچھا: "اچھا کمانڈر روبوٹ، یہ بتائیے کہ آپ کو خدا کے وجود پر یقین ہے یا نہیں۔؟"

ایس آر: "یقین، بے یقینی اور شک۔ ان الفاظ سے مجھے کوئی مطلب نہیں ہے۔ میرے موجد کو خدا ہی نے عقل دی ہے کہ جو کام انسان نہیں کر سکتا وہ مجھ سے کرا سکتا ہے۔ اس لیے خدا کا وجود برحق ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "یہ بتائیے کہ آپ کے خیال میں خدا کیسا ہے اور کیا ہے؟"

ایس آر بولا، "کائنات کی تمام قوتیں اور خوبیاں ایک جگہ جمع ہیں اور وہ خدا ہے۔ اس کے کچھ اصول ہیں اور قادر مطلق ہے۔"

میں نے کہا، "ایس آر! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" تب وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہر شعبے میں اس طرح کے روبوٹ کام کرنے لگیں تو کیا انسان عضو معطل ہو کر نہیں رہ جائے گا۔؟

کیا روبوٹ انسانوں کا بدل بن سکتے ہیں؟

دُنیا کو جنت بنانے کی لاکھوں انسانوں نے اب تک کوشش کی ہے۔ کیا روبوٹ اس کام کو کر سکتے ہیں۔؟

□□

ایک نظم

سُنو!
ہم جنگل میں رہتے ہیں
اور گھنے جنگلوں میں کبھی سویرا نہیں ہوتا
اونچے پُرانے مہیب درختوں نے
مرے باطن کی دھرتی کو ڈھانپ رکھا ہے
اور اتنے پیچھے،
دُور کہیں سُورج کو چھوڑ دیا ہے
کہ سُورج کا تصوّر بھی اب ہماری دھرتی پر
گُناہ ہے!
اور "گناہ" کی بے گناہی پر اصرار کرنے والے
سُورج کا
ایسے دوشت منظر میں بسیرا نہیں ہوتا۔

سُنو!
ہم گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں
اور گھنے جنگلوں میں کبھی
سویرا نہیں ہوتا!!

عذرا پروین
۴۰۱/۷۲ عبدالعزیز روڈ
چوک لکھنؤ
۲۲۶۰۰۳

فنگر پرنٹس

جو میرا امتیاز ہیں، میری دلیل ہیں
وہ صرف انگلیوں کے نشانات ہیں مرے

میرے وجودِ خاک میں سب کچھ ہے کیا نہیں
لیکن ہے جو بھی کچھ وہ کسی سے جدا نہیں

ہر وقت سب کے سامنے دل کی کتاب ہے
یوں دیکھیے تو چہرہ مرا لاجواب ہے

طلعت جبینِ شوق کی ہے غیرتِ قمر
بالا ہے سرو سے قدِ رعنا مرا جگر

جسمانیت میں کیا ہے کوئی بات ہی نہیں
اس طرح دیکھیے تو مری ذات ہی نہیں

لیکن یہ انگلیوں کے نشاں بے نظیر ہیں
میرے ثباتِ ذات کے گویا سفیر ہیں

رہتے ہیں میرے ساتھ یہ دمساز کی طرح
مجھ کو نصیب ہیں کسی اعزاز کی طرح

بے مثل ہیں یہ جیسے کہ منصور کا مقام
اور منفرد ہیں جیسے کہ غالب کا ہو کلام

سُلجھے ہوئے نئے ادبی ذوق کی طرح
پیچیدہ ہیں مگر یہ رہِ شوق کی طرح

چہرہ ملے، مزاج ملے، خانداں ملے
لیکن کسی سے بھی نہ کبھی یہ نشاں ملے

جو میرا امتیاز ہیں، میری دلیل ہیں
وہ صرف انگلیوں کے نشاناتِ ہیں مرے

ڈاکٹر سخاوت شمیم
کوٹ پتلی — جے پور
(راجستھان) ۳۰۳۱۰۸

نذرِ انور مرزاپوری

اک حسیں کردار کا حامل وہ انساں اٹھ گیا
شہرِ مرزاپور کا نازِ غزل بنخواں اٹھ گیا

محفلِ شعر و سخن کی شان کہلاتا تھا وہ
رُوحِ نغموں کی غزل کی جان کہلاتا تھا وہ

جس کی دھن پر رقص کرتی تھی غزل شام و سحر
جس کو آتا تھا ترنم ریز ہونے کا ہنر

آخری دم تک ادب کی پاسداری اس نے کی
تاجداروں کی طرح سے تاجداری اس نے کی

سچ یہ ہے سب کو اجل سوئے بقا لے جائیگی
آج ان کو اور کل ہم کو قضا لے جائے گی

اپنے پرتو سے غزل کی شام روشن کر گیا
شہرِ مرزاپور تیرا نام روشن کر گیا

محب مرزاپوری
حازیہ ٹولہ۔ (ٹیڑھی نیم)
مرزاپور
۲۳۱۰۰۱

غزل

تم سے پیغام نظروں سے نہ چھلکایا کرو
نا سمجھ ہوں میں مجھے لفظوں میں سمجھایا کرو

ساتھ دینا ہو مسافر کا تو پاس آیا کرو
حوصلو! منزل سے پہلے ٹوٹ مت جایا کرو

وقت کی چلتی ہوئی یہ دھوپ اور راہِ وفا
اب یہ ہم کس سے کہیں تم ہی ذرا سایا کرو

آئیں کیسے اُن کو ڈر ہے دیکھتے رہتے ہو تم
چاند تارو جب شبِ وعدہ ہو چھپ جایا کرو

وہ اگر ڈرتے ہیں دُنیا کی نگاہوں سے جمیل
ان سے یہ کہہ دو کہ خوابوں ہی میں آ جایا کرو

جمیل دوشی
او۔ ایس۔ ڈی کالک وبھاگ
سچیوالیہ لکھنؤ

ظفر حیدری
ہمدانیہ کالونی، بمنہ
سری نگر ۱۹۰۰۱۰

"ادیب" الہ آباد میں پریم چند

منشی پریم چند (۱۸۸۱ء- ۱۹۳۶ء) اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ ان کا اصلی نام دھنپت رائے اور لقب پریم چند تھا۔ ابتدا میں نواب رائے کے فرضی نام اور "د۔ ر" (دھنپت رائے) کے تحت لکھتے تھے۔ فارسی سے کماحقہٗ واقف تھے اور آٹھ سال تک گھر میں فارسی زبان پڑھی بھی تھی۔ شروع میں محکمۂ تعلیم میں ایک مدرّس کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی ۱۹۰۴ء میں پہلا ناول ہندی میں "پریما" کے نام سے انڈین پریس الٰہ آباد نے شائع کیا۔ (تاریخ ادبِ اُردو ص ۱۲۸، رام بابو سکسینہ)
اُن کے افسانے اُردو کے مشہور و نامور رسالوں: زمانہ کان پور، ادیب الہ آباد، العصر لکھنؤ، صبحِ اُمید لکھنؤ، ہزار داستان لاہور، اور نیرنگ خیال لاہور وغیرہ میں چھپتے تھے۔ ان رسالوں میں افسانوں کے علاوہ پریم چند کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ زمانہ کان پور جلد ۷ نمبر ۴ صفحہ ۲۳۲ بابت اکتوبر ۱۹۰۶ء میں "حال کی بعض کتابیں" کے عنوان سے مضمون چھپا تھا۔ اس میں بعض ایسی کتابوں پر موصوف نے مفصل ریویو لکھے ہیں جو اَب عنقا کا حکم رکھتی ہیں۔ زمانہ کان پور جلد ۷ نمبر ۵ بابت نومبر ۱۹۰۶ء ص ۲۹۱ میں پریم چند کا ایک تاریخی مضمون "رانا پرتاپ" کے نام سے چھپا ہے۔ یہ مضامین پریم چند کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہیں، اور ان کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔

مخزن لاہور، اُردوئے معلّٰی علی گڑھ، زمانہ کان پور کی طرز پر انڈین پریس الہ آباد کی طرف سے "ادیب" کے نام سے جنوری ۱۹۱۰ء میں ایک علمی رسالہ نکلنا شروع ہوا۔ یہ ساڑھے تین سال تک زندہ رہا۔ مئی ۱۹۱۱ء تک ادیب الہ آباد نوبت رائے نظر لکھنوی کی ادارت میں چھپتا تھا۔ جون ۱۹۱۱ء سے دسمبر ۱۹۱۲ء تک مشہور فلمی اداکارہ مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ ان کے بعد اُردو کے شاعر اور انشار پرداز سید محمد قاسم رضوی (متوفی ۱۹۲۲ء) کی ادارت میں جنوری ۱۹۱۳ء سے جون ۱۹۱۳ء تک یہ رسالہ چھپتا رہا۔ اس کے فوراً بعد ادیب دم توڑ گیا اور جولائی سے کوئی پرچہ نہیں نکلا۔

ادیب الہ آباد میں مشہور و معروف ادبی ہستیوں کا کلام اور ان کے نثری شہ پارے چھپتے تھے۔ چند لکھنے والے یہ ہیں: نوبت رائے نظر (نقاد لکھنوی)، شاہ دلگیر اکبر آبادی، شاد عظیم آبادی، حکیم برہم فتحپوری، سید محمد فاروق (سید القلم)، پریم چند، بشن نرائن در ابر، یاس عظیم آبادی احمد علی شوق قدوائی، پیارے لال شاکر میرٹھی، منوہر لال زتشی، تیرتھ رام، عرش گیاوی، ماہ عظیم آبادی، سید علی حیدر نظم طباطبائی، شیو نرائن شمیم، نادر علی خاں نادر کاکوروی، حسیر عظیم آبادی، سرور جہان آبادی۔

شاکر میرٹھی نے لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ "العصر" کے نام سے مارچ ۱۹۱۳ء میں جاری کیا، جو دسمبر ۱۹۱۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ شاکر "العصر" جلد ۲ نمبر ۱، ۲ میں ادیب الہ آباد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "الہ آباد کا نامور رسالہ ادیب جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے دنیائے ادب میں چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا تھا اور جس کے علمی و لٹریری کارنامے مدت تک اربابِ ذوق نہیں بھول سکتے۔ افسوس ہے کہ جولائی ۱۹۱۳ء سے بند ہو گیا اور تشنہ کامانِ ادب کو اپنی یاد میں لذت کشِ حسرت چھوڑ گیا۔ اس کے بند ہو جانے کا افسوس گو تمام ہی خواہانِ اردو کو ہے لیکن جو صدمہ ہم کو یا حضرت نظر لکھنوی کو محسوس ہو سکتا ہے وہ اور ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اردو میں صرف ادیب ہی پہلا

رسالہ تھا جو یورپ اور مصر و قسطنطنیہ کے زرّیں رسائل کے مقابلے میں فخریہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے ظاہر کر دیا تھا کہ نفاستِ طبع اور مذاقِ سلیم کا احساس ابھی ہندستان کے افراد سے مفقود نہیں ہوا ہے۔ اس گلشنِ ادب کی آبیاری کا فخرِ اولین جناب نظر کو حاصل رہا۔ موصوف نے ایک برس چار ماہ اس کو ایڈٹ کیا۔ ان کے بعد ہم ایک برس آٹھ ماہ تک اپنی امکانی کوشش سے اس کی خدمت کرتے رہے۔ ہمارے بعد میر جسیر چھ ماہ ادیب کی خدمت گزاری اور اپنے فرائض ایڈیٹری کی ادائی میں مصروف رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ تیسرے دور کا مستقبل جس قدر شان دار بتایا گیا تھا اسی قدر نامبارک ثابت ہوا۔"

ادیب الہ آباد کے جملہ شمارے ایک کتب خانے میں ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ بہت ہی صاف ستھرا اور غلطیوں سے پاک چھپتا تھا۔ کاغذ بہت عمدہ اور کتابت شان دار ہوتی تھی۔ تصویریں ولایتی آرٹ پیپر پر ہوتی تھیں۔ عزیز لکھنوی، میر بادشاہ علی تخلص بقا، مرزا کاظم حسین محشر، سید بندہ کاظم علی جاوید، مسز سروجنی نائیڈو، ریاض خیرآبادی، شوکت میرٹھی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ششرر لکھنوی اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کی تصویریں قابلِ ذکر ہیں۔

ادیب الہ آباد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پریم چند کے ۵ نادر افسانے موجود ہیں جو موصوف کی کسی کتاب میں نہیں چھپے ہیں۔ صرف ایک افسانہ "بے غرض محسن" ہے جو ادیب بابت شمارہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔ وہ پریم پچیسی میں شامل کیا گیا ہے۔ جو افسانے پریم چند کے کسی مجموعے میں نہیں چھپے ہیں ان کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ خوفِ رسوائی ادیب ستمبر ۱۹۱۱ء
۲۔ دھوکے کی ٹٹی " نومبر ۱۹۱۲ء
۳۔ کیفرِ کردار " جولائی ۱۹۱۲ء
۴۔ سگِ لیلیٰ " اپریل ۱۹۱۳ء

افسانوں کے علاوہ پریم چند کا ایک نادر و نایاب تنقیدی اور معلومات افزا مضمون ادیب فروری ۱۹۱۰ء میں بعنوان "اُردو زبان اور ناول" شائع ہوا۔ یہ مضمون پریم چند سے متعلق کسی کتاب میں شائع نہیں ہوا اور اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ مضمون آج سے ۸۶ سال قبل چھپا تھا۔ اس سے پریم چند کے تنقیدی شعور اور ناول سے متعلق وسعتِ نظر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ناول نویسوں کو خیال رکھنا چاہیے کہ اُردو ناول کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے۔ انھیں استادانِ فن کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کا فرض ہے کہ طبائع انسانی کا بہ نظرِ غائر مشاہدہ کریں۔ اونچے جذبات کے نمونے پیش کریں۔"

چوں کہ یہ مضمون پریم چند کی کسی کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے اسلیے ذیل میں من و عن درج کیا جا رہا ہے:

"اُردو زبان اور ناول"

"ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا کہ اُردو زبان میں ناول نویسی اور ناول خوانی کی دھوم تھی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی عاشق حسین اور حکیم محمد علی۔ یہ اسمائے گرامی انھیں دنوں کی یادگار ہیں۔ حالاں کہ ان صاحبوں میں سے بجز مولوی محمد علی کے اور کسی کو مالی فروغ نہیں حاصل ہوا، اور ہندوستان کے سوا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ان کی آمدنی بڑے بڑے راجاؤں کی آمدنی سے ٹکر کھاتی۔ تاہم ان کی کتابیں پڑھنے والے اور ان کی قدر کرنے والے کم نہ تھے۔ یہ لوگ اس صنفِ ادب میں پیش رو کا کام کر گئے۔ اُردو دنیا کے لیے ناول ایک اچھوتی چیز تھی۔ زبان میں ایک ایسی چیز کا رواج ہو رہا تھا جو معمولی افسانوں سے زیادہ دلآویز اور معمولی مثنویوں سے زیادہ پُرلطف تھی۔ اس لیے پبلک نے حسبِ حیثیت ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور برائے چندے ناولوں کی خوب گرم بازاری رہی۔ متذکرہ بالا مصنفین کے سوا اور کتنے ہی درجہ دوئم و سیوم کے ناول نویس بھی میدان میں آئے اور اپنی یادگاریں چھوڑ گئے۔ رینالڈس کا کوئی ناول ترجمہ ہونے سے نہ بچا۔

یہ ترجمے بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ شاید عام اُردو خواں حضرات کو انگریزی مصنّفین میں بجز رینالڈس کے کسی دوسرے مصنف سے مطلق دل چسپی نہ ہوگی۔ دربارِ لندن کے اسرار، روزالیمبرٹ، طلسمی فانوس، حرم سرا، ایلن پرسی ـــ یہ کتابیں مجنونانہ جوش سے پڑھی جاتی تھیں اور "عبرت" کو تو لوگ فسانہ نگاری کی معراج سمجھتے تھے۔ راقم کو بھی اُن دنوں ناول لکھنے کی دُھن سوار تھی۔ شاعری کی طرح ناول نویسی بھی بے کاری کا مشغلہ ہو رہا تھا۔ ناول کے چند صفحے لے کر ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جو اپنے تئیں شاعر کہا کرتے تھے اور نثر میں بھی دعویٰ کمال رکھتے تھے۔ نومشق مصنّفوں کو دادِ کلام لینے کا خبط ہوتا ہے۔ راقم کو بھی یہی ہوس ان کی خدمت میں لے گئی۔ مگر پہلا سوال جو انھوں نے مجھ سے کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے "عبرت" کا مطالعہ کیا ہے۔ راقم نے معذرتاً کہا کہ وہ کتاب ابھی نظر سے نہیں گزری۔ مولوی صاحب نے فوراً منھ پھیر لیا۔ اور بولے، پہلے اسے خوب غور سے پڑھ جائیے اور تب ناول لکھنے کے لیے قلم اُٹھائیے۔ گویا "عبرت" ناول نہیں، بلکہ ناول گر تھا۔ اس تیز روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کس و ناکس نے ناول لکھنا شروع کیا۔ اسکول اور کالج کے طلبا، اور معمولی لیاقت کے لوگ جنھیں سو پچاس شعر یاد ہو گئے، قلم لے کر بیٹھ گئے اور سماں باندھنا شروع کر دیا۔ کئی کئی صفحے تک بے سر و پیر کی بکواس کے بعد بازاری حسن و عشق کا قصہ چھیڑ دیا۔ موقع موقع سے اشعار چسپاں کر دیئے۔ عاشق کی بے قراری اور معشوق کی بے نیازی دکھائی، کچھ دنوں تک جُدائی کی تکلیفیں رہیں۔ میاں عاشق پر جنون سوار ہو گیا۔ تب دوستوں کی ہمدردیوں نے پوشیدہ ملاقاتیں کرائیں اور عاشق و معشوق کا وصال ہو گیا۔ قصہ تمام ہوا۔ شرر اور سرشار کے سوا قریب قریب سبھوں نے یہی طرز اختیار کیا۔ اسی خاکے پر ہر ایک مُصنّف اپنی لیاقت اور مذاق کے موافق رنگ بھر لیا کرتا تھا۔ آخر ناولوں کی ایسی افراط ہو گئی کہ پڑھنے والے تنگ آ گئے۔ منّ و سلویٰ بھی اگر افراط سے ملے تو اس سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ یہ خاصۂ انسانی ہے۔ سنجیدہ مذاق کے لوگوں میں رفتہ رفتہ ناول خوانی کا شوق کم ہونے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ناولوں کا بازار سرد ہو گیا۔ حضرت شرر نے قصّے لکھنا ترک کر دیا اور جنیدؒ مجنوں کے حالات تفتیش کرنے لگے۔ محمد علی صاحب نے فسانہ نگاری کو خیر باد کہہ دیا، اور آج کوئی مصنّف ایسا نہیں ہے جسے ہم خصوصیت سے ناولسٹ کہہ سکیں۔

اس امر کی تنقیح کہ اُردو ناولوں کی بے قدری کے کون کون اسباب محرک ہوئے آسان نہیں، ملک کا افلاس اور ناولوں کی کثرت ایسے عام وجوہ ہیں جو ہندستان کی ہر ایک زبان پر یکساں جاری ہیں۔ بنگالی اور گجراتی پبلک اردو خواں پبلک سے زیادہ مالدار نہیں اور نہ ان خطوں میں ناول نویسوں کی تعداد اُردو ناول نویسوں سے کم کہی جا سکتی ہے۔ جس زبان کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں ہوں، اس پر آدھے درجن ناولسٹوں کا بار قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا۔ مگر گجرات اور بنگال میں ناولوں کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور اُردو کی کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج شرر کے ناول بہت کم پڑھے جاتے ہیں اور "عبرت" کی طرف بہت کم کسی کی نگاہ پڑتی ہے۔ فسانۂ آزاد کی بھی آج اتنی قدر نہیں ہے جتنی آج سے کئی سال پہلے تھی۔ رینالڈس کے ترجمے بھی کم و بیش ناقدری کی زد میں آ گئے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سرد بازاری کے خارجی اسباب سے قطع نظر کر کے معنوی اسباب ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے۔

اُردو ناول کے حُسن و قبح پر اس کے قبل بعض ادبی اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ افسانہ خواں طبقے کی تعداد دو بڑے حصّوں میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ ایک عامیانہ مذاق والے اور دوسرے سنجیدہ مذاق والے۔ اردو ناول ان دونوں کو مایوس

۱؎ حضرت شرر نے پھر ناول نویسی شروع کر دی ہے اور ان کے دو نئے ناول حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ (ایڈیٹر "ادیب")

کر دیتا ہے۔ نہ الجھی ہوئی بیسن بندیوں اور پیچیدہ ترکیبوں کا لطف عامیانہ مذاق کو آتا ہے اور نہ سطحی خیالات و جذبات اور بسا اوقات اخلاق سے گرے ہوئے کیرکٹر سنجیدہ مذاق کو پسند کرتے ہیں۔ عامیانہ مذاق چاہے موزوں اشعار پر لوٹ بھی جائے مگر مذاق متین کی ضیافت کا سامان بہت کم کسی ناول میں نظر آتا ہے۔ اردو کا چارلس ڈکنس موجود ہے۔ مگر اُردو کا تھیکری، چارلس ریڈ، میری کارلی، جارج ایلیٹ ابھی وجود میں نہیں آئے۔ اس بے قدری کی ایک اور وجہ ہے۔ اُردو ناول نویس اب تک بجز سرشار کے تقریباً سب مسلمان تھے اور انھوں نے اپنی کتابوں میں اس ہندو جذبہ کی مطلق پروا نہیں کی جو مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئن کے تعشق سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ہندوستان ریویو میں ایک مسلمان نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ اکثر بنگالی ناولوں میں ہندو ہیرو اور مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا گیا ہے، جسے پڑھ کر مسلمانوں کے خون میں جوش آجاتا ہے۔ اُردو کے کئی مشہور ناولوں میں اس لغویت کی بالکل پروا نہیں کی گئی۔ علاوہ بریں اب ناول میں یہ ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ عالم شباب میں شادی نہ کرنے سے کیا کیا اخلاقی نتائج پیدا ہوتے ہیں، یا پردہ کرنے سے کیا کیا نقصانات ظہور میں آتے ہیں یا صغر سنی میں شادی کہاں تک مضر ہے۔ یہ مسائل اب بحث و مباحثہ کی منزلیں طے کر چکے اور امر مسلّم کے درجے تک پہونچ گئے۔ صفت تو یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں کو ایسے مسائل پر ناول لکھنے کی جراُت کیونکر ہوئی۔ اگر ایک ناول نویس یہ دکھا سکتا ہے کہ پردہ کرنے سے نقصانات پیدا ہوتے تو دوسرا اسی منطق سے اس کی ضد پایۂ ثبوت کو پہنچا سکتا ہے۔ اب وہ زمانہ گیا جب ان مباحث کو لوگ ناولوں میں ڈھونڈا کرتے تھے۔ ایسے اخلاقی مسائل کا تصفیہ افسانہ گو کی خلّاقیوں سے نہیں ہوا کرتا۔

لیکن ناولوں کی اس کشادہ بازاری کا خیر مقدم کرنے کے لئے ہم تیار ہو جاتے اگر اس کا اثر ہماری ناول نویسی کا معیار اونچا کر دیتا۔ اگر فسانہ نگار طبائع انسانی کے سچّے نمونے پیش کرنے لگتے۔ بد قسمتی سے اس کا اثر ناولوں کو ملک عدم کی طرف لے جا رہا ہے۔ ۱۹۰۹ء کے اردو مطبوعات کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صوبے میں صرف دو ناول شائع ہوئے۔ یہ صوبہ اردو زبان کا مرزبوم ہے۔ جب یہاں یہ کیفیت ہے تو اور مقامات کا کیا ذکر۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے شیدائی اور معاونین اس خیال کو دور کرنے کی کوشش کریں کہ ناول پڑھنا لغو محض اور تضیع اوقات ہے۔ جس طرح ہر ایک صنف کلام میں اعلیٰ ادنیٰ کی قید لگی ہوئی ہے اسی طرح ناولوں کی کیفیت بھی سمجھنا چاہیے۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ادبی دنیا میں قصے کا وہی رتبہ ہے جو کسی محفل میں صدر مجلس کا۔ کسی زبان کا ادب لے لیجئے۔ افسانہ کا رنگ غالب نظر آئے گا قصے کا رنگ مذہب۔ اخلاق، سیاست، غرض جمیع مشاغل زندگی پر حاوی نظر آتا ہے۔ قصوں کے ذریعے سے اخلاق کی تزئین، معرفت کے رموز، تاریخ کے انقلابات، زمانۂ قدیم سے ظاہر ہوتے چلے آتے ہیں۔ عربی ادب کا نام ایک قصہ الف لیلیٰ سے روشن ہے۔ ہارون رشید کے زمانے میں طرز تمدن، طرز سیاست، طرز تعلیم، اخلاق و آداب کی اس سے بہتر تاریخ نہیں مل سکتی۔ عربی ادب کے شعرا، فلسفہ نگار، مورخین کسی کے نام سے دُنیا آشنا نہیں ہے۔ مگر الف لیلیٰ کی داستان شاید ہی کسی بد قسمت شخص کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اُردو میں بنگلہ ادب سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے مگر بنکم بابو کا نام ہر شخص جانتا ہے۔ گو بندرام ترپاٹھی کا جو گجراتی زبان کے مشہور و معروف ناول نویس تھے۔ پچھلے سال جب انتقال ہوا تو ایک گجراتی رسالے نے ایک کارٹون کے ذریعہ سے یہ دکھایا تھا کہ گجراتی ادب کا آفتاب غروب ہو گیا۔ جس طرح بنکم بابو بنگلہ ادب کے بادشاہ تھے اسی طرح گو بندرام گجراتی ادب کے تاجدار تھے۔ علیٰ ہذا اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں، جن سے معلوم ہو جائے گا کہ ناول نویس کا رتبہ ادبی دُنیا میں کیا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کو لے لو، ڈکنس اور تھیکری،

اسکاٹ اور ایلیٹ کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ شکسپیئر کو بھی نصیب نہیں۔ سر جان لبک نے اپنی ایک کتاب میں دنیا کی بہترین سو کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اسکاٹ کے سب قصے اس میں موجود ہیں۔ لارڈ بیکنسفیلڈ جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں کئی بار وزیر اعظم رہے۔ لارڈ لٹن جو ہندوستان کے وائسرائے رہ چکے ہیں، انگریزی ادب کے رکن سمجھے جاتے ہیں اور یہ دونوں اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہیں۔ اب کی کانگریس کی پریسیڈنشل تقریر میں آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی نے رومیش چندر دت کی وفات پر اظہار ماتم کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کو ان کے ملکی اور سیاسی خدمات پر ترجیح دی تھی۔ کسی صوبے کا کمشنر ہو جانا، کسی ریاست کا دیوان بن جانا، ہر ایک شخص کے حیطۂ اقتدار میں ہے۔ مگر فاتح بنگالہ اور سنسار لکھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ بنگلہ ادب کے موجودہ صدر نشین بابو رابندر ناتھ ٹھاکر ہیں اور وہ اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہیں۔ جرمن زبان کا سب سے مشہور مصنف "گیٹی" ہے اور وہ ناولسٹ ہے۔ کاؤنٹ ٹالسٹائی روس کے موجودہ ادب کے بادشاہ ہیں اور وہ ناولسٹ ہیں۔

ان مثالوں سے یہ کافی طور پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ناول نویس کا رتبہ ہر ایک زبان کے ادب میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے اور ادبی دنیا اس کے احسانات و خدمات کے بوجھ سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں کیا یہ افسوس اور عبرت کا مقام نہیں ہے کہ اردو زبان میں ناول اور ناول نویسی کی یہ بے قدری ہو رہی ہے۔ اس میں زیادہ قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی قدیم طرز کے افسانوں کا نعم البدل ناول ہی رہے گا۔ گویا ناول ادب کا وہ اہم ترین حصہ ہے جسے افسانہ کہتے ہیں۔ کیا حامیان اردو اپنے ادب کا اس بے دردی سے گلا گھونٹیں گے۔ دنیائے تخیل میں مشرق ہمیشہ سے مغربی اقوام کا محسود رہا ہے۔ وہ بلند پروازیاں، وہ وسعتِ خیال، وہ بندش کی رنگا رنگی جو مشرقی افسانوں میں نظر آتی ہے، مغربی قصوں میں عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ یورپ باوجود اس قدر ادبی مزاولت کے آج تک "الف لیلیٰ" کا ثانی نہ پیدا کر سکا۔ قصہ حاتم طائی ایک عام کتاب ہے مگر مغرب میں شاید ہی کسی نے ایسا دلآویز قصہ لکھا ہو۔ باغ و بہار بھی اپنے طرز کی بے نظیر کتاب ہے۔ کیا دلدادگانِ اردو افسانہ نگاری کی بے قدری کر کے ایسے ادبی معجزات کے لیے میدان باقی نہ رکھیں گے۔

یہاں پر اس خیال کی تردید کرنے کی بھی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ قصہ خوانی ایک فضول عادت ہے۔ بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ ناول خوانی سے ذوق بگڑ جاتا ہے اور طبیعت میں کسی بات پر غور کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ ان اصحاب سے ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ آپ فطرت کے قواعد کلیہ نظر انداز نہ کریں۔ اچھی سے اچھی چیز کا بے جا استعمال بھی مضر ہوتا ہے۔ نعمت لطیف بھی اعتدال سے زائد ہو جائے تو معدے کو تکلیف دیتی ہے۔ اگر کسی شخص کو خدا نے نظرِ تمیز نہیں عطا کی تو اس میں جنس کا کیا قصور ہے۔ اچھے برے کی تمیز ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے۔ ناول ہی پر کیا فرض ہے۔ ادنیٰ قسم کی شاعری، ادنیٰ مذاق کا فلسفہ، تعصب سے بھری ہوئی تاریخ سبھی اپنے اپنے دائرے میں نقصان رساں ہوتے ہیں مگر اس خیال سے شاعری، فلسفہ یا تاریخ کو عضو بیکار نہیں سمجھا جاتا۔ پھر ناول نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس میں اچھے برے کی قید نہ رکھی جائے۔ اعلیٰ مذاق کا ناول انسان کی عادات پر اس سے بدرجہا زیادہ خوشگوار اثر پیدا کرتا ہے جتنا کہ کوئی فلسفیانہ، مذہبانہ یا شاعرانہ تصنیف کر سکتی ہے۔

دنیا کی تاریخ تمدن میں بعض اوقات ناول نے ایسے ایسے معرکے کے مسئلے طے کر دیے ہیں جن پر ملکی مدبر، فلسفر اور مورخ مدتوں تک سر کھپاتے رہے۔ غلامی کی قبیح رسم کا انسداد ایک ناول ہی کی بدولت ہوا۔ ابھی حال ہی میں ہیگ میں پیس کانفرنس کا جلسہ ہوا جس کا مدعا یہ تھا کہ روئے یورپ میں باہمی صلح و آشتی کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کانفرنس کو سب سے زیادہ مفید یہی تجویز معلوم

ہوئی کہ صلح پر ایک پرزور ناول لکھا جائے۔ اس کے لیے پانچ ہزار پونڈ صلہ قرار پایا۔ یہ ناول ہالینڈ کی ایک مصنفہ نے "آرمس ڈاؤن" کے نام سے لکھ کر گراں بہا عطیہ حاصل کیا۔ ان دو انگریزی الفاظ کے معنی ہیں "تیغ درنیام"۔ اس کانفرنس میں دنیا کے کل سربرآوردہ اقوام کے وکیل شامل تھے۔ ان کے ذرائع لامحدود تھے۔ وہ اس موضوع پر فلسفیانہ، مورخانہ، غرض ہر ایک صنف کی تصنیف لکھوا سکتے تھے۔ مگر انھیں ناول ہی سب سے زیادہ کارگر معلوم ہوا۔ جو لوگ سب ناولوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں وہ غالباً یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ تاریخ یا پالیٹکس یا فلسفہ کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لیے ممکن نہیں۔

دُنیا میں زندگی کی زبردست کشمکش ہو رہی ہے، انسانی آبادی کا بیشتر حصّہ کسبِ معاش کی فکروں میں پریشان رہتا ہے۔ سارے دن اور کچھ رات گئے تک ہمارے دل و دماغ کا عطر سا نکلتا ہے۔ ایسی حالت میں فلسفہ، پالیٹکس یا تاریخ کا مطالعہ بجائے دلچسپی کے خود ایک ریاضت شاقہ ہو جائے گا جنھیں فرصت ہے، جنھیں ہوادار کمروں میں آرام کرسیوں پر لیٹے لیٹے یا دن بھر میں دو چار گھنٹوں کی سیر سپاٹے کے بعد لقمۂ طبیعت کھانے کو مل جاتا ہے، ان کے لیے تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، ریاضی، منطق سب کچھ زیبا ہے۔ مگر ایسے لوگ فی صدی کتنے ہیں؟ آبادی کا بہت بڑا حصّہ وہی ہے جس کو چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے فکرِ معاش کی نذر کرنے پڑتے ہیں۔ یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ آج یورپین زبانوں میں سائنس، فلسفہ اور تاریخ کے اکثر موضوع پر ناول لکھے جاتے ہیں تاکہ انسانی آبادی کا یہ مصروف حصّہ ان مسائل سے بالکل غیر مانوس نہ ہو جائے اور علم کے خشک مسئلے اقل درجہ کی دماغی کاوش سے اس کے ذہن نشین ہو جائیں۔ اہلِ یورپ نے ناول کو ادب کا سب سے ضروری صیغہ تسلیم کر لیا ہے اور ناول نویسی کو سائنس کا رتبہ دے دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اُردو پبلک یورپین علم و ادب کی اس رفتار سے بے خبر ہے۔

ناول نویسوں کو بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اُردو ناول کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے۔ انھیں استادانِ فن کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کا فرض ہے کہ طبائع انسانی کا نظرِ غائر سے مشاہدہ کریں۔ اونچے جذبات کے نمونے پیش کریں۔ پبلک کا ادبی معیار روز بروز اونچا ہوتا جاتا ہے اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان میں بھی وہی خوبیاں دیکھنے کے متمنی ہیں جن کی نگاہیں عادی ہو رہی ہیں۔ بندشوں میں جدّت، خیالات میں تازگی، جذبات میں عمق۔ یہ اچھّے ناول کے ضروری لوازم ہیں بنگلہ زبان کے ناولوں کا مطالعہ ان کے لیے بہت سبق آموز ثابت ہوگا۔ ناول لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ شاید کسی صنفِ ادب میں اس قدر جذبِ خیال، اس قدر دماغی انہماک اور اس قدر زورِ تخیّل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں راتیں خیال میں ڈوب کر کاٹنی ہوں گی۔ انھیں صبح و شام تنہا پُر فضا مقامات کی سیر کرنی ہوگی تب کہیں ان کے قلم سے پرزور ناول نکلے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا، سب پبلک بے دلانہ کوششوں سے آسودہ ہو جاتی تھی۔ پبلک کی نقادانہ نگاہ اب پختہ ہوتی جاتی ہے۔ ہمارے ناول نویس اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں زمانہ کے ساتھ ساتھ قدم بڑھانا چاہیے۔"

(د۔ر)

□□

ہندی کے مشہور افسانہ نگار اور نقّاد امرت رائے کا ۱۴ اگست ۱۹۹۶ء کو الٰہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۵ برس کے تھے۔

امرت رائے اُردو اور ہندی کے عظیم ناول نگار منشی پریم چند کے صاحبزادے تھے۔

اس عظیم افسانہ نگار کی موت پر ادارۂ نیا دور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ (ایڈیٹر)

ستم ظریفی تو اس کی دیکھو ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

۹ر اگست ۱۹۹۶ء کو اچانک یہ خبر ملی کہ دلیپ سنگھ نہیں رہے۔ بہت دیر تک یقین نہیں آیا۔ یہاں تک کہ ان کے تعزیتی جلسے میں بھی یہی کیفیت طاری رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو اس وعدے کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی۔ وعدہ تھا "طنز و مزاح نمبر" میں لکھنے کا۔ میں نے انھیں عنوان دیا تھا: "دل سے دریا تک"۔ انھوں نے اس عنوان کے متعلق وضاحت چاہی تھی کہ مذکورہ عنوان کی پوری طرح وضاحت کر دیں۔ میں نے ان کو خط لکھ کر اس کی وضاحت بھی کر دی تھی اور میں ان کی شگفتہ تحریر کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ یہ خبر ملی —
اخبارات میں لکھا گیا:

" طنز و مزاح نگاری کا ایک ستون گر گیا — اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان — مشترکہ تہذیب کا بہت بڑا نمائندہ نہ رہا — " وغیرہ وغیرہ

ان سب کے ساتھ میں یہ سوچتا ہوں کہ میرا ایک 'بزرگ دوست' 'سرپرست'، بہترین رفیق، مخلص قدردان مجھ سے بچھڑ گیا۔ مجھے اب تک دلّی کی وہ شام یاد ہے جب انھوں نے پریس کلب میں مجھے مدعو کیا تھا اور کہا تھا: "دیکھیے! کھلاتے کھلاتے ہنسا رہا ہوں۔ ہنساتے ہنساتے کھلا رہا ہوں" — ان کی شگفتہ تحریر ان کا منفرد اسلوب، ہر فقرے میں چھپا ہوا طنز یا پھر مزاح — بھلائے نہیں جا سکتے۔ وہ وزارت خارجہ سے منسلک تھے اور سبکدوش ہونے کے بعد بھی بے حد مصروف رہتے تھے۔ ابھی حال ہی میں وہ سیاحت کے لیے مختلف ممالک کو گئے تھے۔ ان کا سفر نامہ بھی شائع ہو چکا ہے جسے تبصرے کے لیے انھوں نے مجھے بھی بھیجا تھا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے تعزیت پیش کروں۔ اس لیے کہ لگتا ہے اردو کے ہونٹوں سے ہنسی گر پڑی اور بڑا گہرا سناٹا ہے۔

دلیپ سنگھ سفر سے آئے تھے اور پھر بہت بڑے سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ وہاں بھی کامیاب رہیں گے اور لاکھوں سوگواروں کے آنسوؤں کی بوندیں روشن چراغ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ چلیں گی اور دعا ہے گروُ سے آپ کی شردھا آپ کی آتما کو شانتی دے گی۔

تحقیق کی دُنیا کو ناقابل تلافی نقصان

۱۱ر جولائی ۱۹۹۶ء کو ڈاکٹر پرکاش مونس کا اپنے آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کا مشغلہ وکالت تھا لیکن اُردو ادب سے ان کی وابستگی اور ان کا ذوق و شوق ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے ان کے حقیقی چھوٹے بھائی پروفیسر گیان چند جی نے فرمایا کہ اُردو ادب سے ان کی وابستگی کا سبب اُنکے بھائی پرکاش مونس صاحب تھے۔ انھوں نے اپنے سارے خاندان کو اُردو پڑھوائی۔

"ڈاکٹر پرکاش مونس کا تحقیقی مقالہ "اُردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" بے حد وسیع اور معلومات آفریں ہے۔ اس مقالے کی وسعت اور ان کے تبحر علمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مقالہ لسانیات کے نازک گوشوں کو روشن کرتا ہے اور دکنیات سے لے کر دورِ حاضر تک کی ادبی تاریخ کا مطالعہ اس کا موضوع ہے۔ کہنے کو وہ لاولد تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری اُردو دنیا ان کی وارث ہے۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ادارہ نیا دور پروفیسر گیان چند کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

سید امجد حسین

نام کتاب : "کہانی انکل" (ناول)
مصنف : غضنفر   قیمت : اسّی روپے
ملنے کا پتہ : نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

"کہانی انکل" غضنفر کا تجرباتی ناول ہے جس میں معاشرے ملک اور عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے روز روز کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات کے ساتھ سازشیں جڑی ہوئی ہیں اور چالبازیوں کی کارفرمائی ہے۔ مصائب اور مسائل کی پیچیدگی ہے۔ معاشرے کی زبوں حالی کا المیہ ہے، ریاکاری کی گھٹن ہے، خود پناہی کی کاوشیں ہیں طمع اور تصنع کی پروردہ حرارت ہے۔ طبقاتی اونچ نیچ ہے، توہم پرستی کی مضبوط جڑیں ہیں، بعض تاریخی حقائق ہیں۔ غصے اور غم سے بھری ہوئی آواز ہے اور نئے ادراک کا آہنگ ہے۔ زندگی کے پرخلوص مشاہدے اور حقیقت پسندانہ اظہار کے اثرات ہیں۔ ان سب میں حال کا شعور ہے اور مفاہیم و معانی اور عرفان کے مختلف مرحلوں کی نشان دہی ہے۔

اس ناول میں فن کا نیا تصور ابھرتا ہے کیونکہ اس میں الگ الگ بارہ کہانیاں ہیں۔ کہانی کا دھندا، باہر کی بھیڑیں، ٹھپّے والا سانڈ، گدھوں کے سینگ، فقیری سنگ ریزہ، کوّا اور کلہاڑا، سپیرا سانپ، کہانی کیشن، بھولی ہوئی لومڑی، گائے اور راکشش، سپنا، بونی اور کہانی سنانے والی زبان وغیرہ ایک دوسرے سے پیوستہ کہانیاں ہیں جن میں فکر کی انگلیاں، حواس کی کھڑکیاں کھولتی ہیں اور بے نقاب چہروں اور شفاف نظروں کا رد عمل سامنے آتا ہے۔ یہ ناول بڑی حد تک معنوی طور پر علامتی ہونے کے باوجود انتہائی واضح انداز بیان میں ہے جسے ہر خاص و عام سمجھ سکتا ہے۔

— مناظر عاشق ہرگانوی

نام کتاب : گلاب (نظموں کا مجموعہ)
شاعر : ظہیر الدین ظہیر۔ قیمت : دس روپئے
ملنے کا پتہ : فردوس بک ہاؤس۔ بھوسیتا چوک دھارواڑ

ظہیر صاحب بچوں کے لیے بہت ہی مفید، سبق آموز، پیاری پیاری نظمیں لکھتے ہیں۔ یہ کام بہت سنجیدگی اور مستعدی سے کرتے ہیں جو قابلِ ستائش ہے۔

"گلاب" بچوں کے لیے لکھی گئی اکتالیس نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں حمد، نعت، منقبت اور دعا کے علاوہ وطن سے محبت اور وطن کی عظمت سے معمور نظمیں شامل ہیں ان نظموں کی زبان بہت ہی آسان، عام فہم اور سبک و رواں ہے، انداز بھی دل نشیں ہے۔ یہ نظمیں بچوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہیں۔ ان نظموں کے ذریعہ وطن سے محبت کرنا، نانی، ماں، باپ، استاد بھائی بہن کی عزت کرنا اور ان کی شفقتوں کے سبب ان کی عظمت اور اہمیت کو سمجھانا مقصود ہے۔

اس کتاب میں جو کمی ہے وہ یہ کہ اس کی کتابت اور طباعت میں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے، کتابت جلی اور روشن ہوتی اور طباعت اجلی اور صاف ہوتی نیز کاغذ بھی اچھا ہوتا تو یہ کتاب بچوں کے لیے اور کشش کا باعث ہوتی۔ سرورق کسی حد تک مناسب ہے۔ اس کتاب کو ایک اچھی کوشش کہا جائے گا۔ امید ہے کہ یہ بچوں کیلئے ایک اچھا تحفہ ثابت ہوگی۔

— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب : "دہلیز پر اترتی شام"
شاعر : مصور سبزواری   قیمت : اسّی روپے
ملنے کا پتہ : موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مصور سبزواری کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور قبولیت کی سند پا چکے ہیں۔ ان کا تعلق شعراء کی اس نسل سے ہے جنھوں نے جدید

رجحانات اور رویوں کو اپنی شاعری کا محور بنایا، اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اشعار کے پیکر میں اس طرح ڈھالا کہ ان کا فن بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتا رہا۔

مصور نے اظہارِ ذات کا سفر جذبہ و احساس میں قوت گویائی زندہ رکھنے کے لیے کیا ہے۔ اس سفر میں وہ جلے بھی ہیں اور بجھے بھی ہیں

سبھی کی یاد کی شاخوں کو کاٹنا ہو گا
یہ نخل ہجر بہت زہر چھوڑ جائے گا

ہم تو اخلاص گزیدہ ہیں کئی برسوں سے
جسم میں خون کی لہر... رت گزری

مصور کے اشعار غزل کے عصری تقاضوں کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں جن میں صداقتوں کی آبداری بھی ہے اور تجربوں کی تابناکی بھی ہے

پہچان کا اثاثہ وہ جب ہار جائے گا
پھر سے نئے خریدنے بازار آئے گا

"دہلیز پہ اتری شام" میں غم دوراں ہی نہیں، غم جاناں کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے لیکن ان کا اپنا ایک منفرد رنگ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ نئے انداز سے قرطاس تمنا پر رنگ بکھیر رہے ہیں۔ یہی رنگ کہیں جا کر ایک خوش نما دھنک کی صورت اختیار کر جاتے ہیں تو کہیں شفق کی سرخیوں میں وجد آفریں کیفیت طاری کر دیتے ہیں

گل خوابیدہ کو تکتے ہوئے تھک جائے گی
جب وہ جاگے گا مری آنکھ جھپک جائے گی

جہاں مصور نے علامات کا سہارا لیا ہے، وہیں مربوط لفظیات کی ترکیب نے ان کے کلام میں امیجری پیدا کر دی ہے۔

بوئے سفال، دیت، تحریر ہوا، ذات، زنجیر صبا، اثاثہ، خواد، زوالِ جاں، زہر قند، چوب خشک، شہزادی کہسار، سرائے، زہر اور اسی طرح کے دیگر الفاظ سے انھوں نے مختلف تصویریں بنائی ہیں۔ وہ جذبوں کو برتنے اور حقیقتوں کو فکری توانائی کے ساتھ شعری سانچے میں ڈھالنے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔

مصور نے زندگی کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی، نئے راستے کی تلاش عصری حسیت کے بھرپور اظہار کے ساتھ کی ہے اور اسی روشنی میں ان کا شعری سفر جاری ہے۔

——— ظفر اقبال ظفر

نام کتاب: "لفظ لفظ نوحہ" (شعری مجموعہ)
شاعر: محمد فاروق نازکی قیمت /۱۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: نابلس پبلی کیشن۔ سری نگر
کشمیر

آجکل کی بیشتر شاعری بندھی ٹکی ڈگر پر چل رہی ہے۔ شعرا خود کو مقبول بنانے کے لیے ایسی روش اختیار کیے ہوئے ہیں جن میں شعری روایت کا اجتماعی شعور پس پردہ چلا جاتا ہے اور پیش نظر میں محدود انفرادیت نہایت بھونڈے انداز میں سترپردوں میں لپٹی دکھائی دیتی ہے۔ بزعم خود انھیں گمان ہے کہ وہ انفرادیت کی لے تیز کر رہے ہیں اور صوتیاتی اعتبار سے شاعری کی نئی بوطیقا ترتیب دے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نئی شعریات کا تعلق محض زندگی کی نام نہاد مصنوعی تلخ اور برہنہ حقیقتوں کو اجاگر کرنا رہ گیا ہے۔ لفظیات کو تجربے کا نام لے لے کر کچھ یوں توڑا مروڑا جا رہا ہے کہ آہنگ اور موسیقی کے مروجہ اصول بری طرح مجروح ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں فاروق نازکی نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے جس جدت اور ندرت کے ساتھ موسیقی اور مٹھاس کو لے کر روحانی کرب اور نفسیاتی پیچ و تاب نیز انتشار و شوریدگی کو پیش کیا ہے وہ قابل ستائش ہے وہ ہمیں ایک الگ دنیا کی سیر کراتے ہیں

کم و بیش ۲۵ برسوں سے نازکی شعر و ادب کی دنیا میں شامل ہیں 'لفظ لفظ نوحہ' کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے عہد بلکہ آنے والے عہد کو بھی بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعصب اور فرقہ واریت کے اعلانیہ مخالف ہیں اور مذہبی رواداری ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کتاب کا انتساب ہی اس بات کو واضح کر دیتا ہے۔ انتساب سوم ناتھ سادھو کے نام ہے۔

نازکی کی غزلوں میں شخصی احساس کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور

موزوں اظہار برابر شریک ہیں مثلاً ؎

جنوں آثار موسم کا پتہ کوئی نہیں دے گا
مجھے اے دشتِ تنہائی صدا کوئی نہیں دے گا

شاعر سماج کا سب سے ذی حس انسان ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام میں کسی طرح کا احتجاج نہ ہو۔ لیکن نازکی کے یہاں یہ کیفیت ایک لڑائی کا رُخ اختیار کر گئی ہے اور یہ لڑائی ان کی خود اپنے آپ سے ہے ؎

تم نے مانگی ہے دُعا ٹھیک ہے چپ چاپ رہو
بات پتھر میں اُترتی ہے مگر آہستہ

مجھے یقین ہے کہ فاروق نازکی کے شعری مجموعہ "لفظ لفظ نوحہ" کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

——— فیروزہ مسعود

نام کتاب: "آبِ گہر" (شعری مجموعہ)
شاعر: سید الحسن خاں گہر خیرآبادی ۔ قیمت ۶۰/- روپیہ
ملنے کے پتے: گہر خیرآبادی، محلہ کالا پیادہ خیرآباد۔ سیتاپور
(۲) نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد
لکھنؤ

سید الحسن خاں گہر خیرآبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل اُردو کی نازک صنف ہے۔ اگرچہ غزل کو تمام شعری اصناف میں جو برتری حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اُردو غزل کی ہر دلعزیزی کا راز بھی شاید اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس کی کشادگی اور وسعت میں ہر نوع اور ہر رنگ کے موضوع و مضمون کو خود میں سمونے کی صفت موجود ہے

گہر خیرآبادی کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں صرف شوکتِ الفاظ، حُسنِ تغزل اور عمدہ تراکیب ہی نہیں فکر انگیز سنجیدگی زمانۂ حال کی سوزش اور عوامی احساسات پوری طرح موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

وَرق وَرق جو زمانے کے شاہکار میں تھا
وہ زندگی کا صحیفہ بھی انتشار میں تھا
میں قتل ہو کے زمانے میں سرفراز رہا
کہ میری جیت کا پہلو بھی میری ہار میں تھا
یہ اندھیرے کا سفر کتنا ہے مشکل یارو!   راستہ بھی نہیں ہموار خدا خیر کرے

گہر صاحب کا کلام ایک حساس اور دردمند دل کے تلخ و شیریں، نرم و نازک اور سادہ و پیچیدہ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ مثلاً ؎

پتّوں کو کیا خبر ہے کہ شاخوں سے توڑ کر
یہ سرپھری ہوا انھیں لے جائے گی کہاں

اُن کے یہاں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کی دردمندی پوری طرح موجود ہے ملاحظہ ہو ؎

سُرخ ہے خونِ وفا سے زندگی کی رہ گزر
حادثے کیا کیا ہوئے اس راہ میں مت پوچھیے

زبان سلیس اور سادہ ہے۔ اُمید ہے کہ "آبِ گہر" کو اُردو دُنیا میں قبولیت حاصل ہوگی۔

——— (مولانا) اسحٰق سنبھلی

نام کتاب: "صدائے ابوذرؓ" (شعری مجموعہ)
شاعر: اخلاق حسین واصف عابدی ۔ قیمت: ۲۰/- روپے
ملنے کا پتہ: واصف عابدی، محلہ انصاریان، چھوٹا المباڑہ
سہارن پور

واصف عابدی ایک کہنہ مشق زود گو شاعر ہیں جنھیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے "صدائے ابوذرؓ" سے قبل ان کے پانچ مجموعے 'حریمِ فکر'۔ 'موجِ کوثر'۔ 'محرابِ نظر'۔ 'لہجوں کے چراغ' اور 'صحیفۂ عصمت' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

ابتدا میں "دُعائے مشلول" کا منظوم ترجمہ ایک طویل نظم کے ذریعے پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد مدح اور منقبت ہیں۔ "نذرانۂ عقیدت بارگاہ سید المرسلینؐ" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اوصاف کیا بیاں ہوں رسولِ کریمؐ کے
پردے اُٹھائے کون الف لام میم کے
کھوئے ہوئے حواس ہیں فکرِ سلیم کے

سرکارِ تاجدار ہیں خُلقِ عظیم کے

اللہ مدح خواں ہے رسالت مآبؐ کا

قرآن پڑھ رہا ہے قصیدہ جناب کا

واصف عابدی کی زیادہ تر نظمیں مختصر ہیں، جن کا کوئی نہ کوئی عنوان ہے مثلاً نورِ امامت۔ بارگاہ قمر بنی ہاشم۔ جذبۂ بیدار۔ ہدایت کے ستارے، بارگاہ معصومۂ عالم میں، داستانِ حرم (نذرِ اقبال)۔ آنسو۔ ایثارِ خلیل نذرانۂ عقیدت۔ بارگاہ خواجہ غریب نواز وغیرہ۔

ان مختصر نظموں میں جو باتیں بیان کردی گئی ہیں ان کے لیے طویل نظمیں درکار تھیں، اور یہی ایجاب و اختصار واصف عابدی صاحب کی نمایاں شعری خصوصیات ہیں۔ نظموں میں فصاحت و بلاغت کو بھی وہ کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ دُعائے مشلول کا منظوم ترجمہ ان کی شاہکار نظم ہے۔

——— علی باقر زیدی

نام کتاب: "صہبائے حقیقت" (مجموعۂ نعت)
شاعر: شاعر فتحپوری قیمت: ساٹھ روپے
ملنے کا پتہ: جگر اکاڈمی ۸۹/۸۸۔ چمن گنج
کان پور

شاعر فتحپوری کے دو شعری مجموعے "تیر نیم کش" اور "متاعِ ہنر" طبع ہوکر پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ نعت "صہبائے حقیقت" ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو نعتوں، منقبتوں اور سلاموں پر مشتمل ہے۔

نعتیہ اشعار کہتے وقت ربُّ العزّت اور سرکارِ دو عالمؐ کے فرقِ مراتب کا جائز التزام برقرار رکھنا یعنی حدودِ نعت سے آگے بڑھ جانا یا تنقیص سے بچنا نعت گو شاعر کے لیے بے حد ضروری ہے بقول عرفی شیرازی نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے سے کم نہیں ہے۔

شاعر فتح پوری نے نعتیہ اشعار میں جو کچھ کہا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعۂ نعت مقبول بارگاہِ رسالت مآبؐ ہوگا اور عقیدت مندانِ حضورِ اقدسؐ کو روحانی آسودگی فراہم کرے گا۔

"صہبائے حقیقت" کی طباعت، کتابت اور سرورق معیاری ہیں اور قیمت بھی مناسب ہے۔

——— توقیر جمال نجیب آبادی

نام کتاب: "مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کے علمی و ادبی کارنامے"
مصنف: راہی فدائی (ظہیر احمد باقوی) قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ: ۶/۱۸۴ برہان الدین اسٹریٹ، کڈپہ
۵۱۶۰۰۱

مدرسہ باقیات صالحات کو ام المدارس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کتاب کے توسط سے راہی فدائی نے اس مدرسہ کے علمی و ادبی کارناموں کی دو سو سالہ زرّیں تاریخ کے تابناک نقوش پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ام المدارس باقیات صالحات کی خشتِ اوّلیں ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری نے رکھی تھی۔

اس کتاب میں فدائی صاحب نے ان تمام شعرا، و ادبا کو شامل کرلیا ہے جو بہ ظاہر مختلف مقامات کے باشندے تھے مگر حقیقتاً ان کی ذہنی تربیت، فکری بالیدگی اور تعمق نظری کا منبع و مرکز بانی باقیات کی مقدس شخصیت اور مدرسہ باقیات کا نورانی، علمی و ادبی ماحول رہا ہے۔

مصنّف نے ایسے تمام حضرات کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی طرح ام المدارس سے وابستہ ہیں مگر تفصیلی طور پر ام المدارس کے تعلیمی ماحول، نصاب تعلیم کی طرف دھیان نہیں دیا جو کہ ضروری تھا۔

کتاب مجلد ہے۔ گٹ اپ، کتابت و طباعت اور کاغذ نفیس ہے۔ ہر نقطۂ نظر سے جامع اور مصنّف کی عرق ریزیوں کا حاصل ہے اور تشنگانِ علم و ادب کے لیے بے حد بیکراں۔

——— سید محمد اللہ فصیح

"اودھ آئینۂ ایام میں"

گرامی منزلت سید امجد حسین صاحب !

"اودھ آئینہ ایام میں" اور کرم نامہ ملا۔ سراپا سپاس ہوں کہ آپ نے یاد رکھا اور یاد فرمایا۔

اردو کی خوش طالعی تھی کہ نیا دور کو آپ جیسا مستعد اور مستقل مزاج مدیر نصیب ہوا۔ جب سے آپ نے نیا دور کی ذمہ داری سنبھالی ہے، یہ مجلہ بہ لحاظِ روح و پیکر خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شمارہ رنگ و نور و نغمہ کا ایک دل کش و دل کشا خواب۔ اور یہ کتاب تو لکھنؤ کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ وہی ذوقِ جمال، وہی لطافت و نظافت و نفاست وہی "حسنِ خط" جس کے شیفتہ غالب بھی تھے۔ وہی رچاؤ، بناؤ اور وہی رکھ رکھاؤ۔ سوادِ حروف میں شامِ اودھ کی مہک، ورق ورق "تختۂ گل جیسی چکن" اور صفحے صفحے پر 'فسانۂ عجائب' کا لکھنؤ متبسم، جدول کی بیلیں لگتا ہے ابھی جھوم اٹھیں گی اور پھول ابھی لہکنے لگیں گے۔

پھر اس عروسِ جمیل و لباسِ حریر پر معنوی دل آویزیاں مستزاد۔ آپ نے کتنے ریاض سے اودھ کی تاریخ و تہذیب کے تقریباً تمام مظاہر کا احاطہ کیا ہے۔ موضوع تو بہت عمیق اور وسیع ہے لیکن جتنا کچھ پیش کیا جا چکا ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ یہ اہم دستاویز مستقبل کے کسی محقق کے لیے سنگِ اساس بن سکتی ہے۔ گیان چند صاحب کی ژرف نگاہی و دور بینی بھی مبارک باد کی مستحق ہے کہ انھوں نے اس مواد کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی تحریک فرمائی۔

یوں تو کتاب کے تمام مشمولات مفید و منتخب ہیں لیکن پروفیسر مجاور حسین رضوی اور ڈاکٹر محمد حسن کے مضامین بطورِ خاص فکر انگیز اور توجہ طلب ہیں کتاب نے بعض واقعات و مقامات سے متعلق ایسی معلومات بھی فراہم کرادی ہیں جنھیں بزرگ فراموش کر چلے تھے اور جن سے نئی نسل ناآشنا یا نیم آشنا تھی۔ وقیع ترین مضامین وہ تھے جن میں لکھنؤ کی مشترک تہذیب کا، جسے گنجی زمزمی کہنا شاید زیادہ مناسب ہو، مرقع پیش کیا گیا ہے۔ آج بھی لکھنؤ میں ہندستان کے اور شہروں کی نسبت ہندو مسلم باہم قریب ترین، ایک جیسی زبان بولتے ہیں، ایک جیسی نشست برخاست رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ گو طوفانِ سیاست کی ہلچل نے اس جوئے رواں کو کہیں کہیں گدلا کر دیا ہے مگر اصل دھارا آج بھی سجل اور نرمل ہے۔ کیا عجب کہ آپ کی یہ کتاب آئینے کا کام کرے، شہر کے چہرے پر جو داغ دھبے آئے ہیں وہ دھو لیے جائیں اور لکھنؤ اپنے آپ کو پھر سنوار لے۔ اس مقصد کے لیے اچھا ہو اگر اس کا ہندی اڈیشن بھی شائع ہو سکے۔

آپ نے اپنے پیش لفظ میں دنیا کی رفتہ و گزشتہ ثقافتوں اور ہندستانی تہذیب کا جسے اس "مردم چشمِ جہاں" نے پروان چڑھایا، موازنہ بلکہ محاکمہ کرتے ہوئے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ یہ تہذیب اعلیٰ انسانی و آفاقی اقدار پر قائم تھی۔ سچ یہ ہے کہ نمود اور نمو میں، نمائش اور نشو و نما میں یہی فرق ہوتا ہے۔ جناب روہت نندن نے بھی پتے کی بات کہی ہے کہ شعرِ اردو میں سنسکرت شاعری کے تمام رس موجود ہیں۔

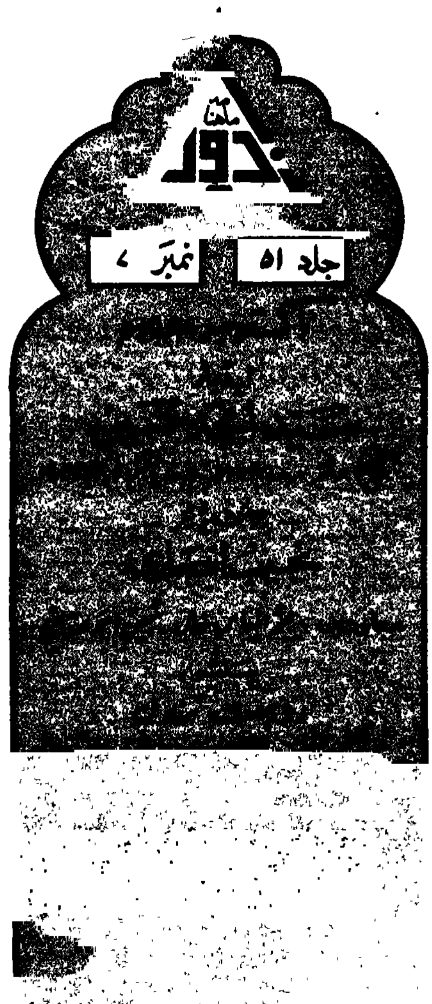
سیدہ محترمہ قرۃ العین حیدر کے 'شہرِ آرزو' میں کتنی دل ریشی و دل سوزی ہے! یہ معلوم کر کے کہ وارثانِ نول کشور کی پیش کش کہ ہمارے گودام سے کتابیں لے کر محفوظ کرلو، 'ناپذیرا رہی'، دل ہل گیا کہ یا اللہ، ہم اردو والوں کی بے حسی و بد نصیبی یہاں تک پہنچی۔ آپ نے بڑی ذہانت سے اس نظمِ منثور یعنی "اودھ آئینہ ایام میں" کا خاتمہ 'شہرِ آرزو' ہی پر کیا ہے جس سے ماضی کا یہ طربیہ، حال کا نہایت موثر المیہ بھی بن گیا ہے۔ خدا کرے اس کی تاثیر عام ہو، محرکِ عمل ہو اور دیر پا ہو۔

اور ہاں، آپ نے 'نیا دور' بھیجتے رہنے کا بھی وعدہ فرمایا تھا جو شاید اس لیے پورا نہیں کیا کہ میں اپنی نظم و نثر نہ بھیج سکا۔ اب یہ کتاب آپ نے مرحمت فرمائی تو بہت محجوب ہوں اور اس حسنِ طلب کی داد دیتا ہوں کہ یہ بھی لکھنوی تہذیب ہی کی ادا ہے۔ لفظ ادا پر یاد آیا کہ اردو کے عالی مرتبت نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھی اپنے نظر افروز مضمون "داستانِ امیر حمزہ" میں لکھنؤ کی اداؤں کے بارے میں کچھ لکھا ہے اور بڑی تیکھی ادا سے لکھا ہے۔

——— رشید کوثر فاروقی

پونا۔ ۴۱۱۰۴۲

عنوانات



ابتدائیات	ایڈیٹر	۲
مہاتما گاندھی (نظم)	گلزار دہلوی	۳
سوانحی کوائف	قیوم صادق	۴
انتظار (نظم)	عارف ایوبی	۴
ترتیں ہوگئیں پانی کی کوئی بوند گرے (نظم)	انیس انصاری	۵
مصلح قوم کی نذر (نظم)	رباب رشیدی	۵
یادوں کی رہ گزر (۴)	علی جواد زیدی	۶
غزلیں	غلام مرتضیٰ راہی	۱۲
	مست حفیظ ۔ کاوش الہ آبادی	۱۲
گلزار نسیم : ایک بازیافت	مجاور حسین رضوی	۱۳
غزلیں	شبنم گورکھپوری	۲۱
	حامد مینائی ۔ فوق کریمی	۲۱
رشتوں کی مروت (کینیڈین کہانی)	ترجمہ : وقار ناصری	۲۲
غزلیں	ضیاء قادری	۳۰
	شاہد کلیم ۔ معراج احمد	۳۰
فریج جو (انگریزی کہانی)	ترجمہ ، احمد نسیم صدیقی	۳۱
غزل	اصغر یاسر	۳۴
بازار (نظم)	بھگوان داس اعجاز	۳۴
غزل	ماجد جائسی	۳۴
تنقیدی اور اشتراکی حقیقت نگاری	خورشید انور	۳۵
غزل	علی رضا حسینی	۳۸
غزلیں	علی احمد جلیلی	۳۹
	طفیل انصاری ۔ عروج جھانسوی	۳۹
دوہے	پرویز اختر	۳۹
ہندستانی تہذیب کے فروغ میں مغلیہ عہد کا تعاون	آر۔ کے۔ شکل	۴۰
غزلیں	نسیم اختر ۔ مخمور کاکوری ۔ مضطر تاجپوری	۴۳
	سجاد لکھنوی ۔ اختر عزیز	۴۳
نقد و تبصرہ	نامی انصاری، فاطمہ وصیہ جائسی، شکیل اشرف، تسکین زیدی	۴۴ تا
	عابد نظر، ماہ ناز فاطمہ، فصیح ہاملی، جمیل عسکری	۴۷
	قارئین	

اپنی بات

ہندوستان کی تاریخ میں ایسی قدروں کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے جن سے اعلیٰ سماج وجود میں آسکے۔ یہ قدریں محض خیالی نہیں تھیں بلکہ ان کے عملی نمونے بھی ہندستانی روایت کے جزو تھے۔ مثلاً اطاعتِ والدین۔ چنانچہ یوں تو رام چندر جی نے اخلاقیات کے بہت سارے گوشے روشن کیے، لیکن بقول مولانا ظفر علی خاں ؎

میں تیرے شیوۂ تسلیم پہ سر دُھنتا ہوں

یہ حقیقت ہے کہ ان کے کردار میں شیوۂ تسلیم کا ــــ روشن اور تابناک پہلو رہتی دنیا تک یادگار اور زندہ رہے گا۔
اسی کے ساتھ اس معرکہ کی وجہ سے بھی جو نیکی اور بدی کی قوتوں کے درمیان پیش آیا اور آخر میں نیکی کی قوتوں کی فتح ہوئی جس کی یادگار دسہرہ کا تہوار ہے۔ اُردو شعراء میں بیشتر نے رام چندر جی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے خصوصاً علامہ اقبال کی نظم اُردو کی شعری روایات کا درخشاں باب ہے۔ اُردو میں منظوم رامائن بھی لکھی گئی اور کئی شعراء نے رامائن لکھی، جن کی تعداد تقریباً ۴۹ ہے۔ جن میں خوشتر، جگت برلیوی اور گرو نرائن کافی مشہور ہوئے۔ دسہرہ کے تہوار کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں جہاں نیکی کی بدی پر فتح اور سچائی کی جیت ہے وہیں اخلاق کے اور بھی پہلو ہیں، اس میں دلیری اور شجاعت کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں، اسی لیے دسہرہ کا تہوار بہادری اور شجاعت کے جذبات پیدا کرتا رہتا ہے۔

ہندستان کے خمیر میں سچی بہادری اور حقیقی شجاعت کا تصور ہے۔ بہادری کے معنی جان لینا نہیں بلکہ اعلیٰ ترین اصولوں کی حفاظت کے لیے جان دینے کی جرأت مندی ہے۔ ہندستان اس اعتبار سے تاریخ کا روشن ترین حصہ پیش کرتا ہے کہ اسی ملک کے ایک اہم فرزند نے یہ سمجھایا کہ ظلم کا مقابلہ کرنا اور صبر و تحمل نیز قوتِ برداشت سے ظالم کو شکست دینا چاہیے۔ ظلم کا جواب ظلم نہیں ہو سکتا۔

دوسری اکتوبر کو صرف ہندستان ہی نہیں، ساری دنیا کے لوگ مہاتما گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کو یاد کرتے ہیں، جس فلسفہ نے ایک نئے انداز سے ہمت اور حوصلے کے ساتھ ظلم کا مقابلہ کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کی اشاعت کی جتنی ضرورت دورِ حاضر میں ہے، شاید اتنی ضرورت اس وقت بھی نہ تھی جب سارا ملک بدیسی حکمرانوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔

آج انتہا پسندی، دہشت گردی اور تشدد کی قوتیں بڑی تیزی سے اُبھر رہی ہیں اور ان قوتوں سے دنیائے انسانیت کو بہت بڑا خطرہ ہے اس لیے دوسری اکتوبر کو ہم سب کو یہ عہد کرنا چاہیے کہ مہاتما گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کو اور ان کی اخلاقی تعلیمات کو (جو ہندستانی روایات کا ناگزیر جز ہیں) عام کرتے رہیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ رام چندر جی سے لے کر مہاتما گاندھی تک ہماری روایات کی اعلیٰ اخلاقی سطح ہے، جس نے اقوامِ عالم میں ہمیں ماضی میں بھی سربلند رکھا تھا اور انشاء اللہ حال و مستقبل میں بھی ہندستان دنیا کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

ـــــــــــ ایڈیٹر

مہاتما گاندھی

(روشنی کی ایک شعاع)

ڈاکٹر اے ایم زتشی گلزار دہلوی
سی ۹۹، سیکٹر ۲۶، نوئیڈا ۲۰۱۳۰۱
غازی آباد

اے وطن کی جنگِ آزادی کے سالارِ عظیم — مرتبہ دانِ پیامِ صادقِ رام و رحیم
بربریت اور تشدّد کے مخالف بے گماں — جبر و استبداد و ظلم و جور کے قاطعِ غنیم
امنِ بھارت، امنِ مشرق، امنِ عالم کے نقیب — پست و پسماندہ ملل کے رہبرِ اعظم، زعیم
ہادیٔ آزادیٔ افریشیا جانِ جہاں — صدقے تیری شانِ قربانی پہ خانانِ رحیم
تو تہی دست و فقیرِ بے سر و ساماں تھا — تیرے آگے سب تھے شرمندہ رفیقانِ نعیم
تو نے موتی اور جواہر ایسے بھارت پر لٹائے — اجمل و انصاری و آزاد تھے تیرے ندیم
تو نے اک رشتے میں گوندھے ایسے دُرِّ شہوار — جو وطن کی بحرِ آزادی کے تھے دُرِّ یتیم
تو نے راجہ، راجن و پٹابھی و آصف پٹیل — چن کے بھارت رتن، بھارت پر کیا لطفِ عمیم
تو نے پھونکا ایشیا میں ایسا آزادی کا صُور — سارے مشرق میں تیری آواز تھی صوتِ کلیم
حدِّ خاور سے تری آواز اے شعلہ نوا — تا بہ حدِّ باختر، باطل شکن بے خوف و بیم
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی خاطر سے جیا — وارثِ اعلیٰ ترین آدرش پر جانِ عظیم
حفظِ ایماں کے لیے دی جاں پئے انسانیت — آدمیت کو عطا تو نے کیا ذوقِ سلیم
تیری کوشش تھی وطن میں ختم ہو سب چھوت چھات — امتیازِ ذات ٹوٹے، اور رہے ذاتِ کریم
قوم کی یک جہتیٔ کامل کا تو اوتار تھا — فخرِ بھارت، نازِ مشرق، نسلِ آدم کے ندیم
مرتبہ دانِ دیارِ کعبہ و کاشی تھا تو — شرق کا نبّاض اور رفتارِ مغرب کا علیم
گر چمن بندی ہو مشرق کی ترے انداز پر — باغِ مشرق سے اٹھے پھر جھوم کر بوئے شمیم
الغرض جب نام گاندھی کا لیا گلزار نے — کہہ گئی یہ شعر میرے کان میں موجِ نسیم

"در کفِ جامِ شریعت، در کفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند، جام و سنداں باختن!"

'پروفیسر قیوم صادق'

صادق منزل ۔ سی بی آئی کالونی ۔ راجپور روڈ
گلبرگہ - ۵۸۵۱۰۲

سوانحی کوائف

نام : شیخ محمد عبدالقیوم صادق (قیوم صادق)

ولدیت : محمد قاسم شاہد

پیدائش : ۶ر جون ۱۹۴۴ء تعلقہ احمد پور ضلع لاتور (مہاراشٹر)

ابتدائی تعلیم : احمد پور میں ۔ مڈل اسکول ضلع بیدر

ہائی اسکول : اودگر حیدر آباد ۱۹۵۸ء

پی یو سی : ۱۹۵۹ء ملند مہاودیالیہ اورنگ آباد

بی اے : گورنمنٹ کالج اورنگ آباد ۱۹۶۲ء

ایم اے : مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد ۱۹۶۵ء

ریسرچ کے لیے علی گڑھ میں بھی قیام رہا۔

ریسرچ اسکالر : انجمن اسلام، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ و سینٹ زیویرس کالج بمبئی ۔

پی ایچ ڈی : بمبئی یونیورسٹی ۱۹۷۷ء (نگراں پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ۔ ندوی صاحب کے انتقال کے بعد پروفیسر نظام الدین گوریکر) ۔

ملازمت : ۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۱ء محکمہ ڈائرکٹر آف کالجیٹ ایجوکیشن بنگلور کے تحت کالجوں میں لکچرار :

گورنمنٹ مہارانی ویمنس کالج میسور ۱۹۷۱ء - ۱۹۶۷ء

گورنمنٹ کالج ہاسن ۷۵ - ۱۹۷۱ء

گورنمنٹ کالج بیدر ۸۱ - ۱۹۷۵ء

شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی میں ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو بحیثیت لکچرار تقرر ہوا ۔ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو ریڈر ۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۹۲ء کو پروفیسر اور جون ۱۹۹۱ء تا حال صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ ۔

تصانیف

۱۔ اردو ادب میں تنقید کی اہمیت
۲۔ اردو زبان کا تنقیدی ورثہ
۳۔ دکنی غالب ملا وجہی
۴۔ نوائے ملناڈ
۵۔ غالب نمبر مہارانی گنج میسور
۶۔ شعلۂ ادب
۷۔ بیجاپور کی اردو مثنویاں (تحقیقی مقالہ)
۸۔ دکنی ادب ۔
۹۔ نوائے گلبرگہ
۱۰۔ نذر بیدر

انعامات

۱۹۸۱ء میں اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور کرناٹک اردو اکادمی بنگلور نے "بیجاپور کی اردو مثنویاں" پر ایوارڈ دیا ۔

□□

آنسو

شبِ غمناک کی تابانیاں
تمہاری یاد کی جلوہ سامانیاں
میری آنکھوں کے گوشوں پر
دو موتی
اور ان پر چمکتے
دو تارے
تمہیں دل میں اترنے کا
راستہ دکھانے کے
منتظر ہیں !

□□

مُدتیں ہوگئیں پانی کی کوئی بُوند گرے

سوچ کی ریت میں سب کھوگئیں گلیاں دل کی
دُور تک پھیلا ہے سنّاٹے کا پھیلا بنجر
اجنبی گرم ہوا پھرتی ہے وحشی کی طرح
خامشی تیر کی مانند گھسی جاتی ہے
لفظ ہاتھوں سے بہت دُور اُڑے جاتے ہیں
یہ کبوتر کبھی لوٹیں گے منڈیروں کی طرف
مدّتیں ہوگئیں معنی کی کوئی بوند گرے
سوچ کی ریت میں آنکھوں کی نمی خشک ہوئی
خالی ہتھیلی میں نہیں درد کا سکّہ کوئی
کیسی وحشت ہے کہ لیلیٰ سے سنبھالے نہ بنے
کیسی چٹان کہ شیریں سے بھی کاٹے نہ بنے
دریا مہیوال اُتارے تو اُتارے نہ بنے
ایسی تنہائی پکاریں تو پکارے نہ بنے

اور ایسا بھی نہیں راہیں سبھی ختم ہوئیں
راہیں ایسی بھی ہیں چھولو تو ہری ہو جائیں
آنکھیں ایسی ہیں کہ سُورج کی طرح جلتی ہیں
درد کی آنچ میں چاندی سی پگھلتی جائیں
پیڑ کے سائے بلاتے ہیں ٹھہر جاؤ یہیں
پیر بوجھل ہیں تھکن سے ابھی ایسا بھی نہیں
چاہتیں ایسی ہیں کہہ دوں تو مری ہو جائیں

سوچ کی ریت میں کب کھوگئیں گلیاں دل کی
کھود کر دیکھیں تو شاید کہیں پانی مل جائے
چل کے صحرا میں پکاریں کوئی رستہ کھل جائے
زور سے چیخیں تو شاید کوئی آواز آئے
آگ دہکائیں دلوں میں تو کوئی بات بنے
سوچ کی ریت پہ پانی کی کوئی بوند گرے
یہ بھی ممکن ہے کہ دریا کی طرح بہہ جائیں
یا کنارے کہیں پتھر کی طرح رہ جائیں

انیس انصاری آئی اے ایس
سچیوالیہ - لکھنؤ

مصلحِ قوم کی نذر

اک مسیحا نظر فلسفی باعمل
ایسے ہوتے ہیں کم آدمی باعمل

سوچ کی آنچ میں، فکر کی دُھوپ میں
تپ کے کندن بنی زندگی باعمل

اک چراغ اور ہواؤں سے لڑتا ہوا
یوں بھی کہیئے کہ اک روشنی باعمل

آتشِ شوق سینے میں جلتی ہوئی
موجِ آنکھوں میں اک درد کی باعمل

چاہے خلوت میں ہو چاہے محفل سجے
دونوں رُخ سے رہی آگہی باعمل

شامِ غم میں نقیبِ سحر کی طرح
ہر نفس گفتگو کام کی باعمل

چارہ سازی بھی کی غم گساری بھی کی
کس قدر مضطرب اک جری باعمل

سوز بھی ساز بھی رنگِ اعجاز بھی
اور لفظ و بیاں بھی سبھی باعمل

جذبۂ صدق سے خواب لَو دے اُٹھا
مل گئی کیسی تعبیر بھی باعمل

رباب رشیدی
۱۲۹ - تازی خانہ۔ لکھنؤ

علی جواد زیدی
۱۸۶/۲ وشواس کھنڈ، گومتی نگر
لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

(۴)

طنز و مزاح کے حاشیے

'میری یادوں کی رہگزر' میں طنز و مزاح کو حاشیائی حیثیت حاصل ہے۔ "اودھ پنچ" کا دورِ اوّل ختم ہو چکا تھا اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اس کی نشاۃِ ثانیہ شروع ہوئی، لیکن بزرگانِ طنز و مزاح سے میری ملاقاتیں بعد میں ہوئیں اور نسبتاً ایک جواں سال مزاح نگار سے پہلے۔ اس وقت محمود آباد کے کالون ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ محمود آباد سے اپنے وطن محمد آباد گہنہ ضلع اعظم گڑھ جاتے ہوئے اکثر لکھنؤ سے گزرنا پڑتا۔ وہاں سید اعظم حسین اعظم (مدیر "ادب" و ہفتہ وار "سرفراز" لکھنؤ جو بعد میں سہ روزہ بلکہ روزنامہ ہو گیا) کے یہاں غلام احمد فرقت کاکوروی سے ملاقات ہو گئی۔ فرقت اور اعظم استاد بھائی (شاگردانِ آرزو لکھنوی) تھے۔ دونوں صحیفہ نگار بھی تھے لیکن فرقت کا رجحان طنز و مزاح کی طرف تھا۔ اعظم مشہور افسانہ نویس علی عباس حسینی کے بھانجے اور فرقت نمایاں صحافی انیس احمد عباسی کے بھانجے اور داماد تھے اور انھیں کے اخبار روزنامہ حقیقت میں کام بھی کرتے تھے۔ لکھنؤ میں فرقت سے ملاقات ناگزیر تھی کیونکہ وہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن اعظم کے یہاں آتے جاتے۔ وہاں یا پھر دفتر "حقیقت" جا کر ان سے ملنا گویا میرے وظائف میں داخل ہو گیا تھا کیوں کہ وہ اپنی بذلہ سنجیوں اور زود آمیزیوں کی وجہ سے بہت جلد گھل مل جاتے اور بڑے چھوٹے کا فرق واضح نہ ہو پاتا۔ یوں فرقت اور اعظم مجھ سے عمر میں پانچ چھ برس بڑے تھے لیکن مجھے بھی شعر و ادب سے شغف تھا اور گاہے ماہے کسی اخبار یا رسالے میں کچھ لکھ دیا کرتا تھا۔ ان ذہنی قربتوں کی وجہ سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ اعظم بھائی سے ننھیالی رشتے داری بھی تھی اس لیے بھی اور طبعاً بھی وہ اپنے کو لیے دیے رہتے لیکن فرقت کی طبیعت میں لپک اور لہک زیادہ تھی۔ فوراً گھل مل جاتے اور ہنسی مذاق اور قہقہوں کے تو گویا بادشاہ تھے باغ و بہار، مرنجاں مرنج اور چٹکلوں، لطیفوں کے ماہر خصوصی تھے اخبار "حقیقت" میں خبروں کے ترجمے کے علاوہ "کفِ گل فروش" کے عنوان سے مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے، چند دنوں کے بعد اسی ادارے سے وابستہ رہتے ہوئے ہفتہ وار "صداقت" بھی نکالا۔ اور ان کی فرمائش پر میں نے کئی نوجوان ادیبوں اور شاعروں پر مضامین بھی لکھے۔ ان میں علی سردار جعفری، شمیم کرہانی، سلام مچھلی شہری کا نام مجھے یاد آ رہا ہے۔ ان مضامین کی نقل میرے پاس موجود نہیں اور جن شماروں میں مضامین چھپے وہ بھی میری بے پروائی سے ادھر اُدھر ہو گئے۔ بعد میں صرف یادداشت کے طور پر انھیں اکٹھا کرنے کی فکر ہوئی تو نہ فرقت کے یہاں پتہ چلا، نہ دفتر "حقیقت" میں، صبر کر لیا۔

فرقت بے تحاشا لکھتے تھے۔ ان کے فکاہی کالم ہوں یا ہزل اور مزاحیہ نظمیں، بیشتر قلم برداشتہ لکھی گئی تھیں، لیکن ان کے مزاج میں مزاح کا جو فطری جھکاؤ تھا وہ اس اُبال میں بھی ایک کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے ہم عصروں میں اپنے لیے ایک جگہ بنا لی۔ کوئی مخصوص حلقہ تو نہ تھا لیکن اس دور کے لکھنؤ میں فرقت، شوکت تھانوی، امین سلونوی، نسیم انہونوی اور بعد میں عابد سہالوی اور احمد جمال پاشا کی وجہ سے ایک دائرہ سا بن گیا تھا

جس نے "اودھ پنچ" کے بکھرتے ہوئے دائرے کی لاج رکھ لی تھی۔ فرقت نے بعد میں خاصا نام کمایا، بالخصوص نظم آزاد کی مخالفت میں "مداوا" کی بدولت۔ وزیر آغا نے گواہی دی ہے کہ "اُردو کے تحریف نگاروں" میں ایک اور مشہور نام فرقت کاکوروی کا ہے۔ . . . اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقت کی بعض تحریفیں مثلاً عبدالمجید بھٹی کی نظم "سادہ سوال" کی تحریف "ٹیڑھا سوال" اور میراجی کی نظم "محرومی" کی تحریف "مظلومی" خاصی کامیاب ہیں"۔[1] ان کی کتاب "مداوا" میں شامل تحریفیں نظم معرّیٰ آزاد کی جذباتیت کے خلاف صف آرا تھیں اس لیے ان میں بہاؤ یا روانی نہیں بلکہ شعوری کاوش ہے۔ لیکن انھوں نے تحریف کے علاوہ موازنہ، تقابلِ مزاحیہ یا مبالغۂ خندہ آور سے بھی کام لیتے ہوئے کئی اچھی نظمیں کہی ہیں، ان میں وی ایم ہال (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وقارالملک ہال) اور عائلی منصوبہ بندی پر بھی ان کی نظمیں خوش گوار ہیں۔ وی' ایم' ہال (ہوسٹل) میں رات کو کتے بہت شور مچاتے تھے اور فرقت دیر تک جاگتے اور لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ نظم میں "شاید یہ وی. ایم. ہال ہے" تضمینی مصرعہ تھا، اس کے ایک بند میں آہستگی سے یہ بھی کہہ گئے ؎

کُتّا یہاں قوّال ہے
شاید یہ وی' ایم' ہال ہے

خاندانی منصوبہ بندی میں مزاحیہ مبالغہ ہے لیکن تشہیری نظم کے اعتبار سے مشاعروں میں خاصی کامیاب رہی ہے۔

ان کی دو عادتوں کا ذکر کیے بغیر ان کا ذکر نامکمل رہ جائے گا۔ وہ صرف ترکاریاں کھاتے تھے۔ کسی ماحول میں بھی رہیں، سبزی خوری انھوں نے کبھی ترک نہیں کی۔ دوسرے جاڑے، گرمی، برسات ہر موسم میں اور میدان، پہاڑ جہاں بھی ہوں، علی الصبح ٹھنڈے پانی سے نہانا۔ ایک بار کشمیر میں میرے ہی یہاں قیام تھا۔ صبح سویرے ٹھنڈے پانی سے نہانے چلے۔ میں نے کہا کہ گیزر موجود ہے۔ میرے یہ بتانے پر کہ "یہ سری نگر ہے لکھنؤ نہیں، یہاں درجۂ حرارت بہت کم ہوتا ہے"۔ بے پروائی سے بولے: "کوئی فرق نہیں"۔ اور تھوڑی دیر میں عادی مجرم کی طرح نہا کر باہر نکل آئے۔ یہی نہیں بلکہ گھر کے باہر تفریح کے لیے جانے کو آمادہ ہوگئے۔ میں نے یہ کہہ کر بہ مشکل روکا کہ چائے پی کر جایئے، چائے تیار ہے۔

گھر میں آنے کا خاص انداز تھا۔ بے اطلاع آتے اور زینوں پر چڑھتے ہوئے صدا دیتے آگے بڑھتے ؎

"اماں جواد! ابھی تک سو رہے ہو"۔

گھر بھر کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں اور کہتے کہ:

"میں جانتا تھا کہ تم کچھ لکھ رہے ہوگے"۔

اس وقفے میں زور زور کے قہقہوں کا ایک سلسلہ جاری رہتا۔ افسوس کہ ان کی موت بڑی عبرت ناک ہوئی۔ کسی مشاعرے سے واپس آرہے تھے۔ ڈبے میں بالائی برتھ پر خاموشی سے سو رہے تھے کہ وقت معین آپہنچا۔ گاڑی مغل سرائے اسٹیشن پر رکی تو معلوم ہوا کہ جان جان آفریں کو سپرد کر چکے ہیں۔ جیب میں کوئی پتہ وغیرہ نہیں ملا۔ لاوارث سمجھ کر انجمن اسلامیہ نے تدفین کرادی۔ پولیس نے بعد میں ان کی اٹیچی کھولی تو ان کی ڈائری میں پتہ درج ملا۔ تار سے اطلاع دی گئی۔ بیٹا فوراً روانہ ہوا لیکن وہاں وہ زیر زمین خوابیدہ تھے۔ کبھی خاموش نہ رہنے والا، ہمیشہ قہقہے مارنے والا اور دوسروں کو ہنسانے والا ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

فرقت میرے بہت اچھے دوستوں میں تھے۔ ان پر تفصیل سے کچھ لکھنے کا مدتوں سے ارادہ کر رہا تھا۔ آج ان کا ذکر آ ہی گیا تو حکایت دراز تر ہوگئی لیکن ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک بار بہت بضد ہوگئے تھے تو ان کے مزاحیہ خاکہ (نا روا) پر میں نے مقدمہ بھی لکھا تھا۔ یہ ہلکے پھلکے خاکے تھے، مزاحیہ تنقید کا عنصر اور بھی ہلکا تھا۔

زمانی اعتبار سے فرقت کا ذکر بعد میں آنا چاہیے تھا لیکن چوں کہ مزاح نگاروں میں سب سے پہلے میری ملاقات انھیں سے ہوئی اس لیے ان کے تذکرہ کو اولیت مل گئی۔ میں تو اپنی یادوں کو سمیٹ رہا ہوں کوئی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں۔ اس لیے سب سے اہم ذکر یعنی بزرگانِ طنز و مزاح کا تذکرہ اب کرنے جا رہا ہوں۔ "اودھ پنچ" کی نشاۃ ثانیہ کی طرف

اسشارہ شروع میں کرچکا ہوں جو حکیم ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں شروع ہوا۔ اس کے بانی منشی سجاد حسین کاکوروی کے کارناموں کا غلغلہ اب بھی بلند تھا۔ اس دور کے شماروں کی جلد بندیاں کرا کے کئی گھروں اور کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی تھیں، لیکن خود میرے یہاں کی جلدیں اب میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئیں۔ کتب خانوں میں میرے علم کی حد تک صرف راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے یا شاید حیدرآباد کے ایک کتب خانے (کتب خانۂ آصفیہ) میں محفوظ ہیں۔ لیکن مجھے یہ ذہنی مسرت حاصل ہے کہ میں نے اس کے بہت سے شماروں اور کئی جلدوں کو پڑھا ہے اور اس کے نثر و نظم کے سرمایے اور کارٹونوں سے محظوظ ہوا ہوں۔ میں نے منشی سجاد حسین کے ناول بھی پڑھے ہیں اور "حاجی بغلول" تو اب بھی میری کتابوں کے ذخیرے میں کہیں دبا پڑا ہوگا۔ مجھی پر کیا منحصر ہے، میرے دور میں شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ ادب دوست ایسا ہوگا جس نے "اودھ پنچ" سے کسی نہ کسی طرح استفادہ نہ کیا ہو۔ کیوں کہ "اودھ پنچ" ایک اہم سنگ تھا۔ اس کا طنز و مزاح نیے مقصد نہیں بلکہ اصلاح پسندی اور قوم پروری کا اچوک حربہ تھا۔ بقول رشید احمد صدیقی "اودھ پنچ "نے ایک طرف ان حیثیات سے بغاوت کی جو مشرق کے لیے باعثِ ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں اور دوسری طرف اس نے کورانہ تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جس کی بنا پر لوگ مغرب کی پذیرائی اور پرستش کر رہے تھے۔" منشی سجاد حسین شروع سے کانگریس کے فعال رکن تھے اور مرتے دم (۱۹۱۵ء) تک اسی مسلک پر قائم رہے۔ میرے دوست عبدالقوی کے لفظوں میں وہ ایک زندہ دل اور بے باک صحافی تھے اور محبِ وطن ہندستانی۔ "اودھ پنچ "کے دورِ اوّل کے قارئین میں چکبست کا بیان قابلِ نقل ہے:

"اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ پوٹ رہتے تھے جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی ...... آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بڑا حصہ ہے۔" ۲۵

میری یادوں میں یہ تاریخی دخل در معقولات اس لیے بھی ہے کہ نثر میں "اودھ پنچ" اور اس کے معاونین قلمی اور نظم میں اس کے خاص شاعر اکبر الہ آبادی نے نئی ترقی پسندانہ اور قوم پرورانہ روایات کی بنیاد ڈالی تھی جس کا سلسلہ بعد کے دور میں حکیم ممتاز حسین عثمانی کی نثر اور ظریف لکھنوی کی نظم میں دیکھنے میں آیا بلکہ بعد میں بھی یہ سلسلہ احمق پھپھوندوی اور احمد جمال پاشا کے یہاں اتر پردیش میں اور باہر ضمیر اور واہی تک پہونچا۔ اس دور کے بہت سے مزاحیہ نثاروں اور ناظموں سے میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان کو مشاعروں میں سنا اور کتابوں میں پڑھا ہے۔

۱۹۲۸ء کے آس پاس لکھنؤ آنے پر جن طنز و مزاح لکھنے والوں سے ملاقات کا موقع ملا ان میں ممتاز حسین عثمانی اور سید مقبول حسین ظریف نمایاں تھے۔ ظریف اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے اور ممتاز حسین عثمانی اودھ پنچ کے دورِ ثانی کے بانی ہونے اور اس کے احیا سے ایک نئی پود سامنے لانے کے لیے اس عہد کے ادب میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں ظریف کے علاوہ چودھری محمد علی، شیخ ممتاز حسین جون پوری اور شہباز نے بھی اپنے لیے ایک مقام بنایا۔ سید مقبول حسین ظریف کے نام سے میں پہلے ہی واقف تھا وہ میری چچی کے حقیقی ماموں تھے۔ وہ اکثر ان کے اشعار اپنی ہم عمر خواتین کی صحبت میں سنایا کرتی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں دس بارہ برس کا رہا ہوں گا۔ ظریف مشہور شاعر لسان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی کے رشتے کے بھائی بھی تھے۔ میں ان کی خدمت میں بھی نیازمندانہ حاضر ہوا، مشاعروں میں بھی ان کا ظریفانہ کلام سنا اور کچھ خصوصی محفلوں میں بھی لیکن زیادہ تر اُن کو "اودھ پنچ" اور "سرپنچ" کے صفحات پر پڑھنے کا موقع ملا۔ ہزلیہ شاعری کے علاوہ انھوں نے کئی اصلاحی نظمیں بھی کہی ہیں جن کا طنز تیکھا ہے۔ "سرپنچ" نے ایک بار اپنے سالانہ شمارے میں شاعروں کو خطابات دیے تھے ان میں ظریف کے لیے ملک الشعراء کا خطاب چنا تھا۔ اس سے ہم عصر مزاحیہ شاعری میں ان کے کلام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی نظم "میونسپلٹی کا الکشن" خاص طور سے مشہور ہوئی۔ ایک نظم میں مسلمانوں کی ان رسوم کا خاکہ اڑایا گیا جو اسلامی

اخلاق و تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ صفی لکھنوی نے ان کا دیوان "دیوانگی" کے نام سے مرتب کیا جسے راجہ محمود آباد مرحوم نے شائع کرادیا ہے۔ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، ان کے طنزیہ لہجے میں ایک تیکھا پن ہے لیکن تلخی نہیں ہے۔

میونسپل الکشن کے سلسلے میں امیدوار کو سب سے پہلے جس ووٹر کے پاس جانا پڑا، اس کا حلیہ دیکھیے ؂

دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، تنا بیٹھا ہوا
اک سڑا سی کا حقہ پی رہا تھا کج ادا
جاتے ہی تسلیم کی جب اس کو باصد احترام
منہ کو ٹیڑھا کر کے بولا کو ہے بالیکم سلام
ریلوے میں تھے ملازم خود بھی تھے چلتے ہوئے
آپ کی تنخواہ تو کم، ٹھاٹھ تھے لیکن بڑے
دیکھ کر صورت کو ان کی اس طرح کہنے لگے
آئی ایم ویری بزی میک ہیسٹ جلدی بولیے
پھر کہا، یو آر کنڈیڈیٹ بٹ نو بولڈ مین
تم کو اپنا ووٹ کیسے دے گا صاحب اولڈ مین

حکیم ممتاز حسین عثمانی کے صاحبزادے سے جوبلی کالج میں ملاقات ہوئی اور وہ مجھے اپنے گھر لے گئے جہاں اس نابغۂ روزگار شخصیت سے نیاز مندانہ تعارف ہوا۔ بڑے کمرے میں دو تین تخت ملا کر آرام گاہ دفتر، دیوان خانہ اور دارالمطالعہ بنایا گیا تھا کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور اس ہجوم میں وہ بڑے سکون کے ساتھ سر جھکائے کچھ نہایت تیز رفتاری سے لکھتے جاتے تھے۔ بزرگانہ لطف سے ملے۔ اتنے میں کاتب نے کچھ پروف پڑھنے کے لیے دیے، اسے اپنے ایک ساتھی کی طرف بڑھادیا۔ یہ سرفراز" لکھنؤ کے نئے مدیر ناظم انصاری تھے، اُن سے وہیں پہلی ملاقات ہوئی۔ خود بھی شاعر اور طنز و مزاح کے رسیا تھے اس وقت ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے بلکہ آرام کرتے کرتے اٹھ بیٹھے تھے۔ اس عرصے میں عثمانی نے جو صفحے لکھ لیے تھے وہ کاتب کے حوالے کیے۔ کاتب کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے دوسری طرف برآمدے میں ایک چھوٹا پریس تھا جس پر سنگی طباعت لیتھو پر ہوتی تھی اور مشین ہاتھ سے چلائی جاتی تھی۔

سامنے بکھری ہوئی کتابوں میں لغات کی مختلف جلدیں اودھ پنچ کی کچھ پرانی فائلیں، عربی و فارسی ادب کی منتخب کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ اس زمانے میں وہ "انوار اللغات" پر" ادبار اللغت" کے عنوان سے تبصرہ کر رہے تھے۔ بیس سے زیادہ قسطوں پر پھیلتے ہوئے اس سلسلے کا میں نے مطالعہ کیا تھا۔ خاصے کی چیز تھا۔ غالباً اس سے بعض مقامات پر اثر لکھنوی نے بھی اپنے وقت پر استفادہ کیا ہے۔ یہ سلسلہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے کاش آندھرا اُردو اکادمی یا اتر پردیش اُردو اکادمی حیدر آباد اور لکھنؤ میں موجود فائلوں سے اس سلسلے کو یکجا کر کے اشاعت کا بندوبست کرے۔

اسی زمانے میں میرے استاد فارسی جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب اور بیخود موہانی سے ادبی مباحثہ چھڑا ہوا تھا۔ اخباروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رسائل بھی نکلے۔ آخر میں بیخود صاحب نے ان کو یکجا کر کے "گنجینۂ تحقیق" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کی ایک نقل ممتاز حسین عثمانی کو بھی بھیجی یا مل گئی۔ عثمانی کے تبصرے بھی دیکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ تبصروں میں وہ اکثر کتابوں کے نام میں تحریف کر دیا کرتے تھے چنانچہ اس کتاب پر تبصرہ "گنجینۂ ناتحقیق" کے عنوان کے تحت کیا۔ ارباب نظر اس تحریف کی نشتریت اور طنز دونوں کو بیک نظر محسوس کر سکتے ہیں۔

لکھنؤ میں اسی دور کے آس پاس ایک اور مزاحیہ رسالے "مزیخ" کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس کا بھی ایک حلقہ تھا، جس کے سرگروہ نسیم انہونوی (مالک و پبلشر) تھے، ان کے علاوہ شوکت تھانوی اور امین سلونوی خاص طور سے پیش پیش تھے۔ احمق پھپھوندوی کا کلام بھی کبھی کبھی چھپ جایا کرتا تھا۔ موخر الذکر مجاہد آزادی تھے۔ کئی بار جیل گئے۔ ان جیل یاتراؤں میں ایک بار فراق گورکھپوری کا بھی ساتھ ہوگیا۔ وہاں کچھ اور بھی موزوں طبع موجود تھے۔ انھوں نے وہاں بھی محفل مشاعرہ جمادی۔ اتر پردیش اُردو اکادمی نے ان مشاعروں کی روداد شائع کرادی ہے۔ سیاسی نظریات سے قربت کی وجہ سے

احمق صاحب سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بعد میں انھوں نے ہندی اُردو لغت مُرتّب کر کے ایک بڑی کمی پوری کردی۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے اصلی نام مصطفےٰ خاں مدّاح کے نام سے لکھی ہے۔ سیاسی طنز و مزاح پر عقیدت کی چھاپ لگانے والوں میں احمق کا نام یادگار رہے گا۔ اچھے اور مخلص دوست تھے، سنجیدہ مذاق رکھتے تھے۔

اس گروہ میں سچ یہ ہے کہ شوکت تھانوی کی سیمابی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کا وطن بندرابن تھا جس سے کرشن جی کا نام وابستہ ہے۔ شوکت کا نام محمد عمر تھا، لیکن وہ اپنے تخلص شوکت اور وطن تھانہ بھون کے وسیلے سے ہی جانے پہچانے گئے۔ مجھ سے لکھنؤ پہونچتے ہی ملاقات ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ راہیٔ پاکستان نہ ہوگئے۔ وہ سرپنچ کی ادارتی ذمہ داریوں میں بھی شریک تھے اور اس کے مستقل لکھنے والوں میں بھی بہت زود نویس تھے۔ کچھ دنوں اخبار "حق" سے بھی وابستہ رہے اور وہاں سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔ اب یہ دونوں بند ہو چکے ہیں۔ آخرکار وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ریڈیو کی لکھنؤ شاخ ۱۹۳۸ء میں کھولی گئی۔ اس کے بعد ان سے وہاں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ریڈیو مشاعروں کی نظامت میں وہ ایک انفرادی شان کے بانی اور خاتم ہوئے۔ پاکستان جاکر بھی ریڈیو ہی سے وابستہ رہے۔ لیکن وہاں جانے کے بعد ان سے رابطہ قائم نہ رہا۔ ان کی طرّاری، تیزیٔ طبع اور جدّت پسندی کی طرح شاعروں کی بھی یاد آتی رہی۔ ایک بار انھوں نے مشاعروں کے طرز پر لکھنؤ میں ایک "مناثرہ" بھی منعقد کیا جس میں صرف نثری مضامین پڑھے گئے، عنوان تھا "بیسویں صدی میں لکھنؤ اسکول کے خدّام" مجھے بھی انھوں نے مدعو کیا تھا۔ میں اس زمانے میں بی۔اے (غالباً سالِ اوّل) کا طالب علم تھا۔ اس اہم اجتماع میں شمول صرف شوکت کی تحریک اور اصرار پر ہی ممکن ہو سکا۔ میں نے لاکھ جان چھڑانا چاہی مگر وہ نہ مانے۔ وہاں میں نے جب یہ اعلان کیا کہ لکھنؤ اسکول کے نام کی کوئی شے وجودِ حقیقی نہیں رکھتی اور اگر رہی بھی ہو تو بیسویں صدی میں اس کی تلاش اور پھر اس کی خدمات کا ذکر سعیِ لاحاصل ہوگا۔ ایک نوجوان طالب علم کی اس جرأت پر کچھ لوگ برہم، کچھ چیں بہ جبیں ہوئے لیکن چونکہ

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسکول بنانے کا شوق ہو تو ہمیں علی گڑھ، اعظم گڑھ، لاہور، حیدرآباد کی بات کرنا زیادہ زیب دے گا۔ میرے مقالے کے خاتمے پر اقبال احمد سہیل اپنی نشست سے اٹھ کر ڈائس کے پاس آئے اور بڑی گرم جوشی سے بزرگانہ انداز میں تعریف کی۔ اس ایک تعریف نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور میں مزید مواد فراہم کرتا رہا۔ کئی برس کے بعد میری کتاب "دو ادبی اسکول" وجود میں آئی جس کے اب تک تین اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بقول پروفیسر محمود الہٰی، "اس کتاب نے دو اسکولوں (لکھنؤ۔ دلی اسکولوں) کے تضاد کو "اقلیدس کا نقطۂ موہوم" بنا دیا ہے۔"

شوکت تھانوی کی خاص شہرت "سودیشی ریل" کی وجہ سے ہوئی۔ اگرچہ اس پر جاگیردارانہ فکر کا ہلکا سا سایہ محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا اثباتی پہلو یہ تھا کہ ہماری روایتی سست روی اور ذاتی مفاد کی خاطر عوام کے مفاد کو نظر انداز کرنے کے رجحان کو جائز طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ موجود ہوتے تو دیکھتے کہ اب سودیشی ریل کافی تیز رفتاری سے چلنے لگی ہے۔ اگرچہ ہماری غیر ذمہ دارانہ روش اب بھی بعض اوقات جھلکیاں دکھا جاتی ہے۔ ان کے کئی اور مجموعے "موجِ تبسم"، "بحرِ تبسم"، "سیلابِ تبسم"، "طوفانِ تبسم" بھی شائع ہوئے ہیں جن میں بذلہ سنجی اور مزاحیہ منظر آفرینی کے نمونے مل جاتے ہیں۔ کچھ ناول بھی ہیں "خدانخواستہ"، "کتیا" وغیرہ۔ "شیش محل" میں انھوں نے مختصر مزاحیہ خاکہ نگاری کی ہے لیکن کردار نگاری ایک جھلک سے آگے نہیں بڑھتی۔ بس مزاح ان خاکوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

شوکت تھانوی کا ذکر تمام کرتے ہوئے ان کی ایک تحریف (Parody) کی مثال یاد آ گئی جو علامہ اقبال کے مردِ مومن کے تصور سے متاثر ہے:

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن
انگریز مقابل ہو تو اولاد ہے مومن

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن

ہر جنگ کا سپاہی ہو تو اک فصلِ بہاراں
کالج میں اگر ہو تو پھر آزاد ہے مومن

بنیادی طور پر امین سلونوی اخبار نویس تھے اور اڈمی پنڈنٹ نام کی ایک خبر رساں ایجنسی کے مالک بھی۔ کچھ دنوں اودھ اخبار سے بھی وابستہ رہے اور "سرپنچ" سے بھی، لیکن مزاح کی دنیا میں ان کا نام "بیوی کے لکچر" کی بنا پر زندہ ہے۔ اس کا ہندی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ مشاعروں کو منظم کرنے کا بھی انھیں بڑا سلیقہ تھا۔ بڑی نوک پلک کے لوگوں میں تھے اور ساری زندگی ایک ہی طرز پر گزار دی۔ اخبار نویسی کی وجہ سے حلقۂ ملاقات و شناسائی بہت وسیع تھا لیکن حلقۂ احباب مختصر تھا۔ اس میں "سرپنچ" کے حلقہ کے علاوہ یہ حقیر اور ہمارے ساتھی صباح الدین عمر مرحوم بھی شامل تھے۔ بہت ملاقاتیں رہتیں۔ بہت سے ادبی منصوبے بنتے بگڑتے، کبھی کبھی اختلاف رائے بھی ہوتا لیکن ہمارے رشتے استوار سے استوار تر ہوتے گئے۔ میں نے نسیم انہونوی اور امین سلونوی کے ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسہ اتر پردیش اُردو اکادمی میں منعقد کرایا تھا جو خاصا کامیاب رہا۔ ماشاء اللہ ان کے صاحبزادے حسین امین بھی صحافی ہیں۔ امین صاحب نے جب کانگرس کے لکھنؤ اجلاس کی روداد دوبارہ شائع کرائی تو اصرار کر کے مجھ سے مقدمہ لکھوایا۔ میں نے بہت انکار کیا لیکن نہ مانے، کہنے لگے میں تو اس پر ایک مجاہد آزادی ہی سے مقدمہ لکھواؤں گا اور وہ بھی ایسا مجاہد جس کا حلقہ کار لکھنؤ رہا ہو۔

بزرگانِ ادب میں جوشؔ ملیح آبادی نے بھی کچھ طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک "فتنۂ خانقاہ" کے یکایک خانقاہ میں آجانے سے جو گھبراہٹ ہو رہی ہے اس کا ذکر بڑی نشتریت سے کیا ہے

ع اک شیخ کے تو ہاتھ سے تسبیح گر پڑی

یا ع ملنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں

انہیں ظاہر پرستی اور دکھاوے کے زہر کو نشانہ بنایا گیا ہے اور جب نوجوانی میں پہلی بار انہیں کی زبان سے ایک مخصوص صحبت میں یہ نظم سُنی تھی تو بڑا لطف آیا تھا لیکن اب جو پڑھا تو وہ کیف کم ہو چکا تھا لیکن "مہاجن" نامی نظم میں اب بھی مہاجن کے کردار اور قرض خواہ کی مجبوری بیک نظر صرف دو شعروں میں سامنے آجاتی ہے اور مشاعروں میں اکثر اس کی فرمائش ہو جایا کرتی تھی۔

کہنیاں تکیے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی
چشت صدری دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی
ہنس کے غوطے آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کا دل میں امتحاں لیتا ہوا

اودھ پنچ کا کوئی دورِ سوم تو نہیں ہوا لیکن احمد جمال پاشا (۱۹۸۷-۱۹۳۹) کے پیکر میں آخری بار انگڑائی ضرور لی۔ انھوں نے لکھنؤ میں ماہنامہ "اودھ پنچ" کی اشاعت شروع کی اور اس کے کئی خصوصی شمارے شائع کیے۔ اس رسالے کو بہت مقبولیت ملی۔ انھوں نے اودھ پنچ کی روایت میں فنی اور اسلوبی اضافے کیے۔ "اسکالر" کا "پیروڈی نمبر" نکالا۔ کئی پیروڈیاں (تحریفیں) بالخصوص قاضی عبدالودود اور آل احمد سرور کی تحریفیں پسند کی گئیں۔ قومی آواز میں مزاحیہ کالم نویسی بھی کی۔ کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اس شعلۂ مستعجل کے کئی مسودے آج بھی محتاج توجہ ہیں۔ پاشا جب بھی ملتے بڑے خلوص سے ملتے اور مجھ سے بزرگوں کا سا برتاؤ کرتے جس پر میں نے کئی بار نرمی سے ٹوکا بھی۔ ہر بار کہتے کہ اس روایت سے ترقی پسندی کے باوجود انحراف پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر داری نہیں فطرت تھی۔ ان کی یاد جب بھی آتی ہے بہت ستاتی ہے۔

اسی دور میں چودھری وجاہت علی سندیلوی سے بھی ملاقات ہوئی وہ خوش قسمتی سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور اس جوار کے طنز و مزاح کی آبرو ہیں۔ اسلوب میں لطیف مزاح، طباعی، جدت پسندی، کردار و مناظر کی مضحکہ خیزی سب کچھ موجود ہے۔ پھر تیکھا سماجی اور سیاسی طنز بھی ہے اور بذلہ سنجی بھی۔ وجاہت بھائی یونیورسٹی کے ساتھی ہیں، وضعداری اب بھی نبھائے جا رہے ہیں۔ یہ پتہ بہت بعد میں چلا کہ ان کے سنجیدہ ظاہر کے پس پردہ ایک اچھا طنز و مزاح کا یار کبھی اظہار کے لیے پر تول رہا ہے۔ آج بھی جب ملتے ہیں تو دوستانہ آن بان اور مخلصانہ مسکراہٹ کی شان وہی ہے۔

□□

حواشی:

۱؎ اُردو ادب میں طنز و مزاح: وزیر آغا ص ۱۵۲

۲؎ مضامین چکبست صفحہ ۲۹-۲۲۸

غزلیں

جانے کیوں جلدی میں تھا سایا بہت
شام تک آگے نکل آیا بہت

سر مرا دشمن کے نیزے پر رہا
فتح کا پرچم تھا لہرایا بہت

قد مرا اوروں سے کچھ اونچا رہا
میرا سایا سب کے کام آیا بہت

جب ضرورت تھی مرے کھیتوں کو کم
آسماں نے مینھ برسایا بہت

آئینہ دکھلانے والا ایک دن
آئینے میں خود بھی شرمایا بہت

ابر کا ٹکڑا تھا مجھ پر مہرباں
سایا سایا میں نکل آیا بہت

غلام مرتضیٰ راہی
رانی منزل ۱۳۵۔ پنی
فتح پور ۲۱۲۶۰۱

بن کر جو فرزانے نکلے
پرکھا تو دیوانے نکلے

چادر اوڑھے ہم بھی انا کی
لے کر زخمی شانے نکلے

ہم بھی کانٹوں کی بستی میں
پھولوں کو مہکانے نکلے

خود ہی گرے ہیں منہ کے بل وہ
جو ہم کو سمجھانے نکلے

کیسے کہیں قاتل کی صف میں
سب جانے پہچانے نکلے

سورج کی کرنیں سر چھائیں
دھوپ میں جب دیوانے نکلے

بزم سخن سے بزم جہاں تک
مست بھی شہرت پانے نکلے

مست حفیظ رحمانی
۲۷۱۔ پرانا سیتاپور
۲۶۱۰۰۱

چھوٹا جو تیر اہل جفا کی کمان سے
سورج لہولہان گرا آسمان سے

چھت میں شگاف پڑتے ہی اک راستہ کھلا
لاشوں کی بھیڑ نکلی شکستہ مکان سے

دنیا کے حادثات کی یلغار اور میں
بوڑھا درخت لڑتا رہا اطمینان سے

پامال کر کے نکلا ہے سائے کی لاش کو
شعلہ دھوئیں کا پہنے کفن سائبان سے

تہذیب لیکے ہاتھ میں کشکول آج بھی
لفظوں کی بھیک مانگے ہے اردو زبان سے

کیوں نسل نو نے بیچی ہیں بوڑھی حویلیاں
پوچھو لحد میں سوئے ہوئے صاحبان سے

کاوش بلند ہو کے گرا یوں زمین پر
جیسے پتنگ گرتی ہے اونچی اڑان سے

کاوش الہ آبادی
۲۳۰۔ دائرہ شاہ اجمل
الہ آباد

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
۵۲۴۔ اترسوئیا (حسن منزل) الہ آباد

گلزارِ نسیم : ایک بازیافت

تحقیق نتیجہ خیز حقائق کی بازیافت ہے۔ یہ ضروری ہے کہ محقق ذہنی دیانت کے ساتھ تخلیق کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی تمنّا اور تڑپ رکھتا ہو اور قاری کے سامنے اسی شکل میں پیش کرنا بھی چاہتا ہو۔ اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ منطق سے باخبر ہو' اور جن نتائج تک وہ پہونچے وہ اصولِ درایت پر پورے اتریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی فکر اور اپنے علم کو ترتیب دینے کی صلاحیت کے ساتھ ضبط و نظم کا پابند ہو۔ اور اپنے موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی فکر کو نقطۂ تحقیق پر مرکوز کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ ایسی ذہنی صداقت جو حقائق کے سورج کو بغیر گہن دیکھنے کی عادی ہو' انتخابیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہر رطب و یابس کو اکٹھا کرنا اور لالہ و گل کے ساتھ خار و خس کو بھی پیش کرنا تحقیق نہیں' مِنم کا بھی کھاتہ تیار کرنا ہے۔

یہ خصوصیت بھی اگر ہو تو بہتر ہے کہ محقق اپنی شخصیت کو قاری پر مسلط نہ کرنا چاہتا ہو اور موضوع کے بجائے خود اپنی ذات کو محورِ فکر بنانے کی کوشش میں نہ لگا رہے۔ یہ ٹھوس حقیقت ہے کہ انانیت، خودستائی اور "میں میں" کی ممیاہٹ میں اور کڑھی ہوئی علمی شخصیت میں بَیر ہوتا ہے۔ اسی لیے سچا محقق عموماً اپنے پیش کردہ نتائج سے اپنی شخصیت کو الگ رکھتا ہے۔ اکثر محققین نے جب کسی شخصیت پر تحقیقی کام کیا تو اس کی آڑ میں اپنی شخصیت ابھارنے کی کوشش کی اور افسوس ناک طور پر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، اس کے کارناموں کی صحیح تصویر بن سکی اور نہ ہی شخصیت کا حقیقی تعارف ہو سکا۔

تدوینِ متن کے سلسلے میں دکنیات میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں جہاں ایک ہی متن کئی بار مختلف افراد نے پیش کیا اور صاحبِ متن کی شخصیت کو پس پشت ڈال کر مرتب متن نے اپنے قد کو اونچا کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے متون مجموعۂ اغلاط ہی رہے۔

متن میں ذرا سی غلطی بھی حد درجہ گمراہ کُن ہو سکتی ہے۔ اگر متن ہی سے باخبری نہیں ہے اور صحت کے ساتھ متن کی قرأت نہیں کی جا سکتی تو نہ تخلیق کا حُسن سامنے آسکتا ہے نہ اس کے نقائص گرفت میں آسکتے ہیں نہ ہی اس کی تاریخیت کا عرفان ہو سکتا ہے۔ حقائق جمع کرنا اس میں سے منتخب کرنا، حوالوں کو منطق کی کسوٹی پر کس کر اعتبار و استناد سے آراستہ کرنا تدوینِ متن کے لیے ناگزیر ہے اور بغیر اس کے اصلی متن تک رسائی ممکن ہی نہیں۔

تدوینِ متن کا مسئلہ اس وقت اور بھی اہم ہو جاتا ہے جب داستانوں کی تحقیق کا مرحلہ ہو۔ داستانوں کے طلسم کشا اور صاحبِ قِران گیان چند نے اپنی لوحِ طلسم یعنی "اُردو کی نثری داستانیں" میں تقریباً تمام داستانوں کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ کسی داستان کی تدوین کا حوصلہ نہ کر سکے۔ انہی کے الفاظ ہیں :

"تحقیقِ متن کی دُنیا سیمیا کی سی نمود ہے"۔

اور اس "سیمیا" کو وہ متن کی کیمیا میں نہ بدل سکے۔

دراصل داستانوں کا متن مُرتّب کرنے کے لئے اس کی تخیلی دُنیا سے لطف اندوز ہونے کی ضرورت ہوتی ہے' مدرسہ کا قاری اس سے عاری ہوتا ہے۔ داستانیں صرف واقعات کا پلندہ یا بچوں کا قصہ نہیں ہوتیں بلکہ ان داستانوں میں بڑی حد تک ملک کا وقار، طبقات کی

شدتِ احساس اور تہذیبی گروہوں کا جذباتی رجحان بھی چھپا ہوتا ہے۔ داستان نظم میں ہو یا نثر میں، اس کا اسلوب، اس کا ڈرامہ اور علم معنی و بیان و بدیع کی نزاکتوں پر گہری نظر ہونی چاہیے۔ داستان سازکی بنائی ہوئی دُنیا میں سورج کی گرمی اور چاند کی خنکی سود و زیاں والی دُنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کے گلدستے سے خوشبو پیدا کرتا ہے، اور ایسے پیکر تراشتا ہے جو کرنوں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور محقق اگر ان رموز سے بے خبر ہے تو وہ داستان کا متن ترتیب نہیں دے سکتا۔

رشید حسن خاں تحقیق کے مردِ مومن ہیں۔ ان کے عشقِ تحقیق کا قافلۂ سخت جاں آج بھی سرگرم سفر ہے۔ وہ ان تمام صفات سے متصف ہیں جو ایک محقق میں ہونی چاہئیں، خصوصاً داستانوں کے متون مرتب کرنے کے سلسلے میں ع

نہ اُن کا کوئی مقابل نہ ان کا کوئی بدل

انھوں نے بڑی خوش سلیقگی اور نفاست کے ساتھ امتیاز علیخاں عرشی سے ملی ہوئی تحقیقی وراثت کو اپنے قلم کی پلکوں پر سجا کر اب تک محفوظ رکھا ہے۔ اور عالمانہ انداز میں اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

داستانوں کے وہ ماہر ہیں اور اس سے قبل "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" جیسی نثری داستانوں کا متن مرتب کر چکے ہیں۔ "گلزارِ نسیم" منظوم ہے۔ حالاں کہ اس کا اصل قصہ نثر میں ہے اور دیاشنکر نسیم نے جسے شعری پیکر عطا کر کے اسے "دوآتشہ" بنادیا ہے۔ اس کی ادبی اہمیت پر اُردو کے خدائے نثر نے یوں روشنی ڈالی ہے:

"پنڈت صاحب نے ہر مضمون کو تشبیہ کے پردے اور استعارہ کے پیچ میں ادا کیا اور وہ ادا معشوقانہ خوش ادائی نظر آئی، اس کے پیچ، وہی بانکپن کی مروڑ ہیں جو پری زادیں بانکا دوپٹا اوڑھ کر دکھلاتی ہیں اور اکثر مطالب کو بھی اشاروں اور کنایوں کے رنگ میں دکھایا ہے باوجود اس کے زبان فصیح اور کلام شستہ اور پاک ہے۔

اختصار بھی اس مثنوی کا ایک خاص وصف ہے جس کا ذکر کرنا واجب ہے کیوں کہ ہر معاملہ کو اس قدر مختصر کر کے ادا کیا ہے، جس سے زیادہ ہو نہیں سکتا، اور ایک شعر بیچ میں سے نکال دو تو داستان برہم ہو جاتی ہے۔"[۱۰]

آزاد نے مثنوی کی جس حسین انداز میں توصیف کی ہے اس کے علاوہ بھی دورِ حاضر کے تناظر میں اس کے کچھ ایسے گوشے بھی ہیں جو گہری معنویت رکھتے ہیں:

(۱) اس مثنوی کا لکھنے والا ہندو ہے اور "ہر" سے اپنے کلام کا آغاز کرتا ہے لیکن اسلامی اصطلاحات و تلمیحات و قرآنی ترجمے نگینے کی طرح اپنے اشعار میں جڑتا چلا جاتا ہے۔

(۲) اُردو کا یہ واحد قصہ ہے جس کے مصنفین یا مولفین کا سلسلہ بنگال سے کشمیر تک پھیلا ہوا ہے۔ عزت اللہ بنگالی، نہال چند لاہوری اور نیرنگ بہار باغِ کشمیر دیاشنکر نسیم نے اس قصہ کو زندۂ جاوید بنادیا ہے۔

(۳) اس کا قصہ بھی کامروپ سے امرکنٹک کی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا ہے۔

(۴) اس میں علمِ بدیع کی وہ ساری صناعی موجود ہے جو اُردو شاعری میں انیس و دبیر کے علاوہ کسی کے یہاں نہیں ملے گی۔

(۵) اس کی یہ اہم ترین خصوصیت ہے کہ اُردو میں کسی شعری تخلیق پر اتنا زبردست ادبی معرکہ نہیں ہوا جتنا اس مثنوی پر ہوا یہ معرکہ اتنا اہم ہے کہ ایک عام طالب علم اگر صرف اس معرکہ کو پڑھ لے تو جملوں کی ساخت، صرفی و نحوی تراکیب، روزمرہ غرضیکہ زبان و بیان کے ہزاروں گوشے تاریکی سے روشنی میں آجائیں۔

اتنی اہم مثنوی کی تدوین مشکل نہ سمجھی گئی اور اس کے بہت سے متون مرتب کیے گئے۔ خود رشید حسن خاں صاحب اس کا ایک ایڈیشن مرتب کر چکے ہیں۔[۱۱] چکبست، قاضی عبدالودود اور اصغر گونڈوی بھی اسے مرتب کیا ہے۔ دورِ حاضر کے بہت سارے افراد اپنی کر

کی فہرست کی زلف کو دراز کرنے کے لئے بہت سارے متون کو اُٹھا سیدھا مقدمہ لکھ کر شائع کراتے رہتے ہیں اور یونیورسیٹوں میں ماشاء اللہ لکچرر، ریڈر، پروفیسر بنے رہتے ہیں، ایسے افراد نے بھی گلزارِ نسیم کو مرتب کیا ہوگا۔ اس طرح کے نسخوں سے قطع نظر، معتبر نسخوں میں اصغر گونڈوی کا مرتبہ نسخہ یادگارِ نسیم وقیع اور اہم تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نسیم کی شخصیت اور ان کے کلام کے فنی محاسن پر بھی اپنے مقدمہ میں روشنی ڈالی تھی۔ لیکن یہ تسلی بخش نہ تھا، جس طرح نذیر احمد گلستاں کے بابِ پنجم میں بہت سارے اشعار پر قلم پھیر دیا کرتے تھے، مولانا اصغر گونڈوی بھی، جہاں کہیں شعر میں جنسیت دکھائی دی، اسے قلم زد کر گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تیسری دہائی میں تحقیق اس منزل تک نہیں پہونچی تھی کہ جس سے آج کے طالب علم کو تشفی ہو اور وہ گلزارِ نسیم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر زاویۂ نظر سے باخبر ہو سکے!

اس قصے کے علاقے، اس کے محل وقوع، اس کی اساطیری اہمیت پر لکھا گیا ہے لیکن وہ منتشر صورت میں رہا۔ گیان چند نے امر کنٹک کی پہاڑیوں کی سیر کرائی۔ رام گڑھ کے جنگل میں لے گئے۔ دلدل کا منظر دکھایا، اور دلدل کے بیچ میں قلعہ اور رات کو طلسماتی روشنی وغیرہ سے متعارف کرایا۔

ہندی ساہتیہ سمیلن والوں نے مانک ہندی کوش میں لکھا کہ:

"اگستیہ نام کا درخت وپھول بگلے کی طرح سفید ہوتا ہے گُل بکاؤلی کے لیے لکھا کہ ہلدی کی ذات کا پودا جو عام طور سے دلدل میں ہوتا ہے۔ لمبوترا اور خوشبودار اور آنکھوں کے امراض کے لیے مفید ہوتا ہے۔" اس کی اساطیری اہمیت پر بھی کافی موشگافیاں ملتی ہیں۔ مثلاً سون بھدر بکاؤلی پر عاشق ہوا اور پھر جوہلا پر عاشق ہو گیا۔ بکاؤلی نے لات مار کر دونوں کو پانی بنا کر بہا دیا — دریائے نربدا اور سون "سزا یافتہ کردار" ہیں۔

محترم حیات اللہ انصاری نے بتایا کہ جہاں سے دریائے سون و دریائے نربدا نکلتے ہیں وہاں بکاؤلی نام کا ایک پودا ہوتا ہے اس میں پھول بھی آتا ہے آج کل اس کا سوکھا پھول دو، دو روپے میں بکتا ہے۔ اور مقامی دوا ساز ایک پھول لے کر گائے کا گھی اور کافور اور جانے کیا کیا ملا کر دوا بناتے ہیں۔

گلزارِ نسیم کے موجودہ نسخے میں ان تمام اساطیری اور طلسماتی قصوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے محاکمہ کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کسی اور علاقے میں اور اس میں "امر کنٹک" کا بھی علاقہ شامل ہے۔ تحریری صورت میں اس سے پہلے کوئی کہانی نہیں ملتی۔ اس سلسلے کی یہ بات بھی ہے کہ عزت اللہ نے لکھا ہے کہ "در شہر از شہرہائے شرقستان تاجدار بود کہ اورا زین الملوک گفتندے"؟

تاجدار کے نام سے یہاں بحث نہیں، کیوں کہ وہ مؤخر صورت ہوگی۔ اصل بحث شرقستان سے ہے۔ ہندستان کا مشرقی علاقہ وہی ہے جس میں آسام و بنگال شامل ہے.... اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کہانی کا ہیرو بنگال کے علاقے سے آیا تھا اور امر کنٹک کے علاقہ سے ہیروئن کو اور پھول کو ساتھ لے گیا تو اسے قرینِ قیاس کہا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس قصہ کی قدیم ترین تحریری شکل کیوں علاقۂ بنگال سے تعلق رکھتی ہے۔ عزت اللہ کی صراحت کے مطابق یہ قصہ بہت مشہور تھا ظاہر ہے کہ ہیرو جب ہیروئن کو (اور شاید پھول کو بھی) اپنے دیس واپس لے گیا ہوگا تو اس کی محیر العقول مہم جوئی، خطر پسندی اور بہادری اور پھر کامیابی کی داستانیں تو اسی کے دیس میں بنی ہوں گی اور انھوں نے وہیں شہرت پائی ہوگی"؟

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کہانی کا علاقہ اور محل وقوع کیا ہے اور یہ کس طرح کامروپ سے لے کر وسطی ہندستان تک کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہے۔

اس کا قصہ مکمل طور سے ہندستانی اور سیکولر ہے، زین الملوک، تاج الملوک، روح افزا غیر ہندستانی سے لگتے ہیں۔ محمودہ میں ہلکی سی اسلامیت کی جھلک ہے، لیکن یہ سارے نام بالکل اسی طرح سے سیکولر ہیں جیسے آنجہانی مالک رام نے اپنے بچوں کے نام رکھے تھے یا جیسے بیسویں صدی کے آغاز تک راج بہادر، تاج بہادر اور

اقبال بہادر نسیم کے نام رکھے جاتے تھے۔

رشید حسن خاں نے تذکرہ پہلو کے ساتھ بڑی فراخدلی سے قصہ کے اجزاء و عناصر کے سلسلے میں گیان چند کے نتائج تحقیق کو مختصراً پیش بھی کیا ہے اور ان کا اعتراف بھی کیا ہے۔

قصۂ گل بکاؤلی کی منظوم حیثیت پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ بھی درج کیا ہے۔ کراچی میں "اردو ادب کی تاریخ مرتب کی گئی" مرتب ہیں عبدالقیوم لکچرر کراچی یونیورسٹی۔ ان کی اس تاریخ میں حبیب اللہ غضنفر صاحب لکچرر اردو کالج کراچی کا ایک مضمون ہے "دیسی زبانوں کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ" اس سلسلے میں انھوں نے ۱۴۲۶ پر اس عہد کے ایک بڑے شاعر نوازش خاں کا تذکرہ کیا ہے جس نے گل بکاؤلی کا قصہ پہلی بار نظم کیا۔ یہ نوازش خاں ۱۶۳۸ء میں حیات تھے، ۱۷۶۵ء میں انتقال ہوا۔ چٹگام کے رہنے والے تھے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" میں بھی ان کا تذکرہ ہے ؎[۵]

رشید حسن خاں نے تفصیلی بحث کرکے یہ ثابت کیا کہ یہ قصہ عزت اللہ کے بعد کا ہے اور اس طرح گل بکاؤلی کا توقیت نامہ بھی تیار کر دیا کہ ۱۷۲۰ء اور ۱۷۳۰ء کے درمیان عزت اللہ نے لکھا پھر ریحان کی مثنوی ۱۷۹۷ء سے ۱۷۹۸ء کے درمیان، نہال چند کی مذہب عشق " ۱۸۰۳ء میں اور پھر گلزار نسیم ۱۸۳۸ء میں لکھی گئی۔ انھوں نے رفعت کی مثنوی اور تلسی رام عزیز کی مثنوی قصۂ گل بکاؤلی کے سلسلے میں بھی حقائق پر سے پردہ ہٹایا ہے: نہال چند لاہوری نے جو ترجمہ کیا تھا اس میں اصل متن سے کہیں کہیں انحراف بھی ہے۔ اس کا بھی ذکر ہے اور یہ کہ میر شیر علی افسوس نے جگہ جگہ "مذہب عشق" کی سست عبارت کو "چست و درست کیا ہے"۔

ریحان کی مثنوی یا اس سے استفادے یا سرقے پر بھی اچھی بحث ملتی ہے۔ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں عزیزی ڈاکٹر محمد کلیم الحق قریشی نے بڑی دیدہ ریزی اور کد و کاوش کے ساتھ ریحان کی مثنوی کو مرتب کیا اور مقدمہ لکھا، ان کے پیش نظر ریحان کا نسخہ حیدرآباد اور نسخہ کراچی بھی تھا۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ اور کسی بھی استاد کو ان پر بجا طور سے فخر ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ریحان کی مثنوی کی زبان اور اس کے لہجہ پر غور نہ کر سکے اور سرسری طور سے اس جہاں سے گزر گئے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ریحان اور نسیم کے متحد المضامین اشعار ساڑھے سینتیس (۳۷½) اشعار قرار پاتے ہیں۔ جہاں تک ذاتی خیال ہے رفعت نے ریحان سے استفادہ کیا ہے، نسیم نے نہیں۔

رشید حسن خاں نے جہاں عزیزی ڈاکٹر محمد کلیم الحق قریشی کے مقالہ پر جرح کی ہے وہیں سید خورشید علی حیدرآبادی کے اس مضمون کی بھی حلاجی کی ہے جس میں انھوں نے ریحان کی مثنوی کو متعارف کرایا تھا۔ اس مثنوی کے بارے میں رشید حسن خاں سے اتفاق کرتے ہوئے یہ لکھنا پڑتا ہے کہ:

(۱) ریحان لکھنوی نہ تھا بلکہ اردو جاننے والا بنگالی رہا ہوگا۔

(۲) موزوں طبع تھا لیکن متشاعر تھا۔ اس کے صرف تین مصرعے درج ہیں:

مصرع پوشاک بناس سب چھنالیں
مصرع استاد جی واہ آفریں باد
جیسے ہو کوئی مٹھائی رنگیں

رشید حسن خاں نے اس کے دو شعر اور نقل کیے ہیں ؎

وہابیوں نے ہے سر اٹھایا یک خلق کو ہے غرض ستایا

جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے، وہابی تحریک انیسویں صدی کی ہے اٹھارھویں صدی کی نہیں، کم از کم ۱۷۹۰ء کے بعد کی ہی تھی۔ مرتب متن نے اس سلسلے میں صفحہ ۱۰۱ سے ۱۲۳ تک مدلل بحث کرکے یہ ثابت کیا کہ نسیم کے پیش نظر ریحان کی مثنوی ہونے کا امکان ہے لیکن استفادے یا سرقے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

نسیم کے حالات زندگی بھی ممکنہ استناد کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور قطعیت کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیا شنکر نسیم اپنے آبائی مذہب پر ہی رہے۔ اس کے ساتھ چکبست کی ان روایتوں کو بھی رد کیا ہے جن سے نسیم کی شخصیت خواہ مخواہ کے لیے ایک تنگ مزاج غیر مسلم کی بنتی ہے۔ وہ اشعار جن پر مبینہ طور سے

نسیم کی گرہ لگانے کا ذکر ہے ان کے بارے میں کالی داس گپتا رضا پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ اس بازیافت میں بھی چکبست کی اس غیر ضروری جانبداری کی تردید کی گئی ہے۔ اصغر نے نسیم کی غزلوں کا بھی ذکر کیا ہے ان کی غزلوں کے دو مصرعے ہر لمحہ ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔

؎ جان پڑی تب بازشکم سے مر کے وبال دوش ہوئے

؎ یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا

لیکن رشید حسن خاں نے نسیم کی غزلوں پر غالباً اس لیے روشنی نہیں ڈالی کہ وہ ان کے دائرہ کار سے باہر تھی۔ البتہ نسیم کی شخصیت پر وہ جتنی معلومات فراہم کر سکے وہ انھوں نے اکٹھا کر دیں۔

اس بازیافت کا بے حد اہم حصہ معرکہ چکبست و شرر پر محاکمہ ہے صفحہ ایک سو ستائیس سے ایک سو چالیس تک اس معرکہ کا پس منظر بیان کیا گیا ہے صفحہ ۲۴۷ سے یعنی ضمیمۂ تشریحات سے صفحہ ۵۲۰ تک اختلافِ نسخ کے ساتھ اس معرکہ کی حلاجی بھی کی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اس معرکہ میں حصہ لیا تھا ان کے خیالات بھی اور ان کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اس ضمیمۂ تشریحات میں بہت ساری ضمنی باتیں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً معرکہ چکبست و شرر کے مرتب کا نام تو سید محمد شفیع شیرازی تھا لیکن نقاد لکھنوی کے نام سے جو بزرگ اس معرکہ میں کود پڑے تھے ان کا اسم گرامی نوبت رائے نظر تھا۔[۷]

"جیب" اور "جیب" کی معلومات آفریں بحث میں پتہ چلا کہ جیب مذکر ہے اور جیب مؤنث ہے[۸]

اس لطیف فرق سے بس گہری نظر رکھنے والے ہی باخبر ہوتے ہیں۔ ایک جگہ لفظ "آشنا" کا بیان ہے۔ ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس لفظ کے ایک معنی پیراک کے بھی ہیں[۹]

اسی طرح ریگِ ماہی کی بحث پڑھیے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں جہاں تک "ریگِ ماہی میں اضافت کا تعلق[۱۰] ہے تو یہ مرکب لازم "بغیر کسرۂ اضافت درست ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں اضافت مقلوب ہے۔ ماہیِ ریگ (ریت کی مچھلی) مقلوب ہو کر ریگِ ماہی بن گیا۔ یہ مسلم ہے کہ ترکیب مقلوب میں اضافت کا زیر نہیں آسکتا۔ اضافت کا زیر مضاف کے حرفِ آخر کے نیچے آتا ہے۔ ق میں جو "ریگِ ماہی" ہے اسی بنا پر وہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ مجھے زیادہ تعجب اس پر ہے کہ اُردو لغت میں اسے مع کسرۂ اضافت "ریگِ ماہی" لکھا گیا۔ مرتبین لغت نے اس لفظ کی ساخت پر غور ہی نہیں کیا۔[۱۱]

معلومات کا ایک پُر سکون سمندر ہے جس سے ہر سطح کا طالب علم استفادہ کر سکتا ہے۔ کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں :

'حلوا' الف سے ہے[۱۲]

'اختراع' کو عموماً مؤنث سمجھا جاتا ہے، مذکر ہے[۱۳]

ناسخ کا شعر نوراللغات میں غلط درج ہو گیا۔ گرفت کی گئی اور بتایا گیا کہ یہ شعر ناسخ کا نہیں ہے۔ ایک جگہ یہ بھی نظر سے گزرا کہ مالک دروغہ جہنم کو تو کہتے ہی ہیں، حضرت یوسفؑ کو جس نے خریدا تھا اس کا نام بھی مالک تھا۔ یہاں ضمناً یہ عرض کرنا ہے کہ اِرَم بنی عاد کا بادشاہ تھا اور شداد کا دادا تھا۔ اسی کے نام پر شداد نے اپنی ساختہ جنت کا نام 'باغِ ارم' رکھا تھا۔

لغات و محاورہ پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ضمیمہ حصۂ دوم میں جہاں صحیح قرأت کے لیے تلفظ و املا لکھا گیا ہے، وہیں روزمرّہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دو مثالیں پیش ہیں : ،

" 'رَضا' خوشنودی کے معنی عربی میں .... آصفیہ میں رِضا ہے یعنی 'ر' پر زَبَر بھی ہے زیر بھی۔ سننے میں بالعموم بالفتح اوّل آتا ہے :"

دوسری مثال لفظ 'خوش خبر' کی ہے۔

نسیم کا شعر ہے ؎

شادی کی خبر سے خوش خوش آئی مشتاق کو خوش خبر سنائی

شرر و چکبست کے مباحثہ کے ساتھ فارسی کے اور حیرت انگیز طور پر خاور نامہ سے اور ذوق کے شعر سے مثال پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ نسیم نے غلطی سے اس لفظ کو پیش نہیں کیا بلکہ وہ اسی طرح اس کا استعمال درست سمجھتے تھے۔

بے شمار الفاظ کے لیے صحیح تلفظ اور ان کی ادائیگی کے لیے اعراب

بھی لگائے گئے ہیں اور روزمرہ بھی لکھ دیا ہے۔

یہ دُرست نہیں ہے کہ محقق اس کو کہتے ہیں جو اقلیدسی زبان لکھتا ہو اور تنقیدی صلاحیت سے بے بہرہ ہو۔ بلکہ اگر تجزیہ اور تحلیل کے بغیر تفہیم کی کوشش کی جائے گی تو وہ بے معنی ہو گی اور تنقیدی عمل تجزیہ اور تحلیل سے ہی عبارت ہے۔

رشید حسن خاں کی تحقیق میں 'دریافتِ محض' نہیں ہے بلکہ اعلیٰ ترین تنقیدی بصیرت ملتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

" بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے — جو غنچہ کو گل کرے صبا ہے
بولا وہ یہی تو چاہتا ہوں — گل پاؤں تو میں ابھی ہوا ہوں

یہ شعر بھی حسنِ تعبیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ بیان وہی جنسی عمل کا ہے۔ غنچہ کا استعارہ بہت اچھا ہے۔ کلی کے کھلنے کو جنسی عمل کی تکمیل کی علامت قرار دیا ہے ..... محمودہ کا یہ کہنا کہ ہوا تو چلتی ہی رہتی ہے جس ہوا سے کلی کھل سکے اسے صحیح معنوں میں صبا کہنا چاہیئے۔ اشارتاً یہ خیال ہے کہ جنسی عمل کی تکمیل نہ ہو تو پھر صبا کے وجود (یعنی مرد کے وجود) کا حاصل کیا۔ اس کے جواب میں تاج الملوک کا یہ کہنا کہ مجھے پھول مل جائے تو میں ابھی ہوا بن جاؤں، پہلودار اندازِ بیان ہے اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مجھے پھول (گلِ بکاؤلی) مل جائے تو میں بھی وہی کام کروں جو بادِ صبا صبح کے وقت انجام دیتی ہے یعنی کلی کو کھلاتی ہے (مُراد یہ ہے کہ جنسی عمل کی تکمیل ہو جائے)

ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ پھول مل جائے تو میں ابھی ہوا ہو جاؤں یعنی فوراً چل دوں، ہوا ہو جانا محاورہ ہے"[۱۴]

عملی تنقید کے اس اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر جی چاہتا ہے کہ دو مثالیں اور درج کی جائیں تاکہ گلزارِ نسیم کی تدریس کے وقت فاضل اساتذۂ کرام یہ دیکھیں کہ اشعار سمجھانے کے لیے اور طالب علم میں ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔

" جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

اس سے پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ شمشاد دم بخود کھڑا تھا۔ یعنی ساکت خاموش۔ اس شعر کا پہلا مصرعہ بھی اسی مفہوم کو دُہرا رہا ہے کہ ہر درخت چپ چاپ دم بخود تھا۔ دم بخود ہونے اور سوچ میں کھڑے رہنے کا مضمون اس نسبت سے پیدا کیا ہے کہ ہوا سے پتیاں تک نہیں ہل رہی ہیں مگر دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان اس صورتِ حال کے منافی ہے، ہوا چلنے سے پتے ہلتے ہیں اور ایک دوسرے سے رگڑ بھی کھاتے ہوں، اسے (عالمِ حیرت و افسوس میں) ہاتھ ملنے سے تعبیر کیا ہے لیکن پتوں کا ہوا سے اس طرح متحرک ہونا، درختوں کے دم بخود کھڑے ہونے کے منافی ہے۔ نخل اور برگ کی رعایت نے معنوی پہلو کی طرف شاعر کی توجہ منعطف نہیں ہونے دی اور بیان کی اس خامی تک اس کی نظر نہیں پہونچ سکی۔ اس شعر کے دونوں مصرعوں میں الگ الگ انداز سے صنعتِ حسنِ تعلیل ہے۔ درخت کے ساکن ہونے کی وجہ ہوا کا نہ چلنا، مگر شاعر نے ایک شاعرانہ وجہ اس کے لیے فراہم کی ہے کہ وہ حیرت و افسوس کی تصویر بن گیا تھا، ساکت، دم بخود۔ دوسرے مصرعے میں ہوا سے متحرک ہونا اصل وجہ ہے، مگر یہاں بھی شاعر نے ایک دوسری شاعرانہ وجہ بتائی ہے۔

یہاں مجھے ثاقب لکھنوی کا یہ مشہور شعر یاد آ گیا ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے [۱۵]

نسیم سے تقابل منظور نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ صرف یہ کہنا ہے کہ ہوا سے پتوں کے متحرک ہونے سے ایک دوسرے شاعر نے ایک مختلف کام لیا ہے اور حسنِ بیان کے لحاظ سے وہ کامیاب رہا ہے"

عملی تنقید کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو ؎

" بیڑی تھی رُخِ جنوں کی کاکل — پابوسیٔ گل کو آیا سنبل

اس سے پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ بکاؤلی کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ اس شعر میں نہایت عمدہ شاعرانہ تعبیرات کے ذریعہ اس خیال کو ادا کیا ہے کہ وہ تو محبت کی زنجیروں میں خود گرفتار تھی — کاکلوں کو زنجیروں سے تعبیر کیا ہے۔ کاکلیں چہرہ پر بکھرتی ہیں۔ اس رعایت سے رُخِ جنوں کہا گیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں "بیڑی" آیا ہے بیڑیاں پیروں میں ڈالی جاتی ہیں۔ اس نسبت سے دوسرے مصرعہ میں "پا" کا لفظ لایا گیا ہے۔ رُخ اور کاکل پا اور بیڑی میں مناسبت ہے۔ مگر ان سب رعایتوں سے بڑھ کر یہ تعبیر بے مثال

ہے کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی گئیں، تو ایسا معلوم ہوا کہ گُل کے پیر چومنے کے لیے سنبل نے اپنی لٹیں پھیلادی ہیں۔ گل سے مُراد بکاؤلی ہے اور سنبل (بالچھڑ) تو شعرا محبوب کی زلفوں سے اور گیسُو سے تشبیہ دیتے ہیں اس نسبت سے اسے زنجیروں سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ (نسیم نے خود بھی کہا ہے، "مشکیں کس لی نہ تو نے سنبل")۔ سنبل پھیل کر پھول کی شاخوں میں (یعنی پیروں) میں لپٹ جاتا ہے یعنی گل کے پیر چُوم رہا ہے۔ بکاؤلی کے پیروں میں بیڑیاں بھی ایسی ہی معلوم ہوتی ہیں جیسے اس کی قدم بوسی کے لیے آئی ہوں۔" ۱۱۶

اس بازیافت میں بے شمار محاسن ہیں۔ اس کے ماخذ کے سلسلے کے مباحث گل بکاؤلی کے قصّہ اور دیگر ہندستانی قصّوں کے درمیان مماثلتوں کی تلاش، معرکہ چکبست و شرر میں جرأت مندانہ ایمانداری کے ساتھ محاکمہ اور دونوں کی انتہا پسندی کی نشان دہی، گلزار نسیم کے مختلف نسخوں کے درمیان اختلاف نسخ کی تشریح معانی و بیان کے ساتھ علم بدیع کی روشنی میں گلزار نسیم کی صنعتوں اور دیگر محاسن کا تذکرہ..... یہ سب مل کر اس بازیافت کو نہایت اہم بناتے ہیں لیکن ان سب سے بالاتر وصف اصل متن یعنی شیخ عزت اللہ بنگالی کے فارسی کے متن کی پیش کش ہے۔ اس متن کا تذکرہ پڑھا اور سُنا گیا مگر اسے دیکھنے کا شرف پہلی بار ملا۔

رشید حسن خاں کی عالی ظرفی قابلِ ستائش ہے۔ اس کتاب کا انتساب نیّر مسعود کے نام ہے۔ انتساب عموماً دنیاوی فائدہ کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ انتساب علمی دیانت کا بھی مظاہرہ ہے اور اپنے سے کم عمر محقق کے لیے اعترافِ خدمات کا درجہ رکھتا ہے۔ نیّر مسعود بہت بڑے باپ کے بہت بڑے بیٹے ہیں اور بقول شخصے موتی لال نہرو کے جواہر لال نہرو ہیں۔ حالاں کہ وہ فارسی کے فارس میدان کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن اُردو ادب کو بھی انھوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ شاید گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی انھیں (اور ہم سب کو) اتنی مسرّت نہ ہوتی جتنی گیان چند کے توصیفی کلمات اور رشید حسن خاں کے اس انتساب سے ہوئی ہے۔ اس انتساب کے لیے رشید حسن خاں کو مبارک باد!

عالی ظرفی کے ساتھ وہ اعلیٰ اخلاقی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ جس عربی عبارت کو وہ خود نہ پڑھ سکے تھے انھوں نے اس کے لیے بنارس کے ظفر احمد صدیقی سے مدد لی۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے شاعر کی نشاندہی کی اور اشعار نقل کر کے بھیجے۔ رشید حسن خاں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اسی طرح وہ شعر نمبر ۱۴۰

دانا تھی جہل خانہ آئی   بگڑی ہوئی کو بنانے آئی

جہل خانہ کو جیل خانہ پڑھتے تھے۔ مولانا عرشی نے متوجہ کیا کہ پُرانا لفظ جہل خانہ ہے۔ انھوں نے اپنی اصلاح بھی کی اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی۔

ایک بات ـــ اسے ایک ادنیٰ سے طالبِ علم کی تمنّا سمجھنا چاہیے، اگر موصوف نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہوتی کہ نسیم نے ہر جگہ قلم کی اہمیت کی طرف کیوں متوجہ کیا اور حمد باری کو قلم کا ثمرہ کیوں قرار دیا، اور میر حسن نے ساقی کو کیوں مخاطب کیا ہے، تو کتنا اچّھا ہوتا! درس گاہوں کے لاکھوں اساتذہ انھیں دُعائیں دیتے۔!

تحقیق میں توقیت نگاری دل چسپی پیدا کرتی ہے اور اس میں تاریخ کا سا مزا آنے لگتا ہے۔ راقم الحروف کو یہ لکھنے کا حق ہے کہ اگر سلیقۂ تحریر ہے تو اس طرح کی تحقیقی کتابیں پُراسرار اور تجسّس سے بھری ہوئی ناولوں سے زیادہ دل کش اور دل چسپ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ناولوں سے معلومات نہیں فراہم ہوتیں۔ اور یہاں ہر جا بجا دیگر نظر آتا ہے۔ سلیقۂ تحریر کے لیے شائستہ مگر خوبصورت زبان ضروری ہے۔ رشید حسن خاں کے دو تین جملے ملاحظہ ہوں۔

"بعض مقامات پر انداز بیان نے یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ سخن فہمی پر طرف داری کا زنگ غالب آگیا تھا۔"

"دونوں طرف سے ایسی تحریریں لکھی گئیں جنھیں پڑھ کر معقولیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور شائستگی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔"

اتنی خوبصورت زبان لکھنے والا جب "استعلالات" لکھتا ہے تو ایسا

معلوم ہوتا ہے جیسے ذوقِ سلیم کا اسپِ صبا رفتار سکندری کھا گیا ہو۔ کیسے ان لوگوں سے شکوہ کیا جا سکے گا جو لفظوں کی "سینڈوچ" بناتے ہیں اور تیسر بٹیر زبان لکھتے ہیں۔

اسی طرح صفحہ ۲۹۹ پر "مختامات" کا لفظ ملا۔ ہو سکتا ہے کہ "مختصرات" کی کتابت کی غلطی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راقم الحروف کو ناواقفیت کی بنا پر یہ لفظ کھٹکا ہو۔ حالانکہ عبا بر دوش و عمامہ بر سر افراد سے بھی اس طرح یہ لفظ سننے کو نہ ملا۔

ص ۲۰۴ پر ایک مصرعہ غلط درج ہو گیا۔ لکھا ہے کہ ؎

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

دراصل یہاں لفظ "مقامے" ہے۔ میر انیس کا مشہور بند ؎

"ہے کجی عیب مگر... الخ" کی بیت ہے،

داند آنکس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

رشید حسن خاں کی مرتبہ کتابوں میں اغلاط تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتیں لیکن ص ۱۶۰ پر شعر نمبر ۱۴۸ میں "چکھوں" کے بجائے "چیکوں" ہو گیا ہے۔ اشعار کے متن کے سلسلے میں کہیں کہیں ان سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مثلاً شعر نمبر ۱، "صیادنی" کے بجائے "صیاد تھی" زیادہ بہتر ہوتا۔ شعر نمبر ۱۲ میں "سلطنت ہی" کے بجائے "سلطنت سے" مرجح معلوم ہوا۔ اسی طرح شعر نمبر ۱۹۷ میں دوسرا مصرعہ "ملنے میں اُتاروں آسماں سے" زیادہ اچھا لگتا ہے۔

انھوں نے صنعتوں کی نشاندہی میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اصغر گونڈوی نے بھی بڑی اچھی مثالیں پیش کی تھیں۔ انھوں نے اسقام کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن رشید حسن خاں نے نسیم کے اسقام سے اکثر صرفِ نظر کیا ہے۔ مثلاً شعر نمبر ۳۳۵ میں جو جیب کے تنافر کی طرف بھی متوجہ کر دیتے تو اچھا ہوتا۔

استخارہ کے معنی (۱۲۷۰) لکھتے ہیں،

"کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں غیبی اشارہ معلوم کرنا۔

(۱) عشاء کی نماز بعد دُعائے استخارہ پڑھ کر اس امید میں سو جانا کہ خواب میں رہنمائی ہو۔

۲۔ دُرود اور مقررہ دُعا پڑھ کر تسبیح کا تھوڑا سا حصہ دونوں چٹکیوں سے پکڑنا اور دو دو دانے کر کے طرح دینا۔ آخر میں طاق سے اجازت اور جفت سے مخالفت کا حکم لگانا۔

۳۔ خاص دُعا پڑھ کر قرآن کریم کھولنا اور مقررہ اصول کے مطابق حکمِ الٰہی دریافت کرنا۔ دیوانِ حافظ سے فال لینا" [19]

استخارہ کے اصل معنی ہیں طلبِ خیر۔ اس میں پہلے معنی پر القا، کا اطلاق ہوگا۔ دوسرے معنی میں دراصل استخارے کا ایک طریقہ ہے۔ تیسری شکل فال کی ہے، استخارہ کی نہیں۔ استخارہ کی ایک قسم ذات الرقاع کہلاتی ہے۔ ایک استخارہ سجادیہ ہوتا ہے۔

یہ کچھ فقرے اس لیے بھی لکھے گئے کہ اس اہم تحقیقی کارنامے کو صحیفۂ آسمانی نہ سمجھ لیا جائے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ بکاؤلی کے پھول کی طرح ذوقِ سلیم کی آنکھوں کو ادبی بصیرت عطا کرتا ہے۔ تحقیق کی دنیا میں جو ایک طرح کا سناٹا سا ہو گیا تھا اسے رشید حسن خاں نے دور کیا ہے۔ وہ اُردو تحقیق کی آبرو ہیں اور گلزارِ نسیم کی یہ بازیافت اُردو تحقیق کا ایسا پھول ہے جس کی خوبی دلوں کو تسخیر کرتی ہے اور جس کی مہک لازوال ہے۔

□□

حواشی: [1] آبِ حیات: محمد حسین آزاد، اُردو اکادمی ایڈیشن ص ۲۴۴

[2] راقم الحروف وہ ایڈیشن نہ پڑھ سکا [3] خالص شہد (ر.ح)

[4] مقدمہ گلزارِ نسیم: رشید حسن خاں ص ۳۸، [5] ص ۴۴ تا ۴۶

[6] یہ استاد جی بمعنی استاد اگر اہلِ لکھنؤ سنتے تو شاعر کی بے تکان گردن مار دیتے

[7] ص ۲۳۸ [8] ۲۸۶ [9] ص ۱۸ [10] ص ۲۸۷

[11] ص ۲۸۷، [12] ص ۲۸۸ [13] ص ۲۹۷ [14] ص ۳۰۱

[15] ص ۳۱۹ [16] ۳۹۲

[17] اس فارسی متن کو پڑھنے سے کچھ دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں، سودا کا مشہور قصیدہ اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل "عزت اللہ کے قصیدہ رائیہ جو حضرت علی کی شان میں ہے اس سے بہت متاثر ہے۔

ایک بات اور... ملا وجہی کی "سب رس" میں جس طرح کچھ اشعار الحاقی ہیں، شیخ عزت اللہ کے یہاں بھی نعت کے بعد کے اشعار متن کے اشعار سے میل نہیں کھاتے۔

[18] عوام کبھی کبھی خواص سے زیادہ سمجھ رکھتے ہیں۔ عام لوگوں کی زبان پر جیل خانہ کے بجائے جہل خانہ ہی چڑھا رہتا ہے۔

[19] ص ۵۵۴ [illegible] مرتبہ رشید حسن خاں

غزلیں

دل پر ستم و جور کے احسان بہت ہیں
اس دور میں رسوائی کے سامان بہت ہیں

اے دیدۂ مشتاق حدیثِ غمِ دل میں
مضمون فقط ایک ہے عنوان بہت ہیں

بیگانہ ہیں تفریقِ حدِ سود و زیاں سے
ہم ہوش کے عالم میں بھی نادان بہت ہیں

ٹکرائیں نہ کیوں دل سے خیالات کی موجیں
اس بحر میں اٹھتے ہوئے طوفان بہت ہیں

اس دورِ ترقی میں بھی احساس کے مارے
حالات کے تیور سے پریشان بہت ہیں

یہ رنگ، یہ نکہت، یہ گہرتابیٔ شبنمؔ
ہنستے ہوئے پھولوں کے نگہبان بہت ہیں

شبنم گورکھپوری
۱۵۴، دولت پور
گورکھ پور
۲۷۳۰۰۱

بدنصیبی سے ہمیں اُن کو مٹا دیتے ہیں
وہ نشانات جو منزل کا پتا دیتے ہیں

جب گزرتے ہیں کسی اُجڑی ہوئی بستی سے
جتنے سنسان دریچے ہیں صدا دیتے ہیں

احتیاط آج بھی قائم ہے محبت میں تری
نام لکھتے ہیں ترا اور مٹا دیتے ہیں

اپنی تنہائی کے ماحول سے کیا لینا ہے
شام آتی ہے چراغوں کو جلا دیتے ہیں

وہ سلامت ہے تو یہ ناز و ادا باقی ہے
ہم تو ہر دم اسے جینے کی دعا دیتے ہیں

وہ مقامات بھی آتے ہیں وفا میں اکثر
دل پہ احساس کی دیوار گرا دیتے ہیں

حالِ دل ہم سے کوئی پوچھے ہے جب بھی حامدؔ
ایک ٹوٹا ہوا آئینہ دکھا دیتے ہیں

حامد مینائی
تارین ٹولی
شاہ جہاں پور

گم کہاں ہیں صداقتیں مت پوچھ
مجھ سے اپنی حقیقتیں مت پوچھ

روز اک تازہ زخم ملتا ہے
دوستوں کی عنایتیں مت پوچھ

عہدِ طفلی سے نوجوانی تک
غنچہ و گل کی نکہتیں مت پوچھ

لمس احساس کو بتا دے گا
لبِ لب کی حلاوتیں مت پوچھ

ہر مصیبت کو سہہ گئے ہنس کر
جو پڑی ہیں مصیبتیں مت پوچھ

کون گمنام مر گیا اے فوقؔ
کس نے پائی ہیں شہرتیں مت پوچھ

ڈاکٹر **فوق کریمی**
کریمی بلڈنگ
انوپ شہر روڈ
علی گڑھ

کینیڈین کہانی

تحریر: ایلس منرو

ترجمہ: وقار ناصری
شیش محل حسین آباد لکھنؤ

رشتوں کی مُروّت

کنیڈین نژاد ایلس منرو انگریزی ادب کی مشہور مصنفہ ہیں، ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کے لیئے انھیں متعدد انعامات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ کہانی کار ریش پال کے صاحبزادے آنند نے ان کے مجموعے "سم تھنگ آئی ہیو بین مینِنگ ٹو ٹیل یو" کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کہانی آنند کے ترجمہ شدہ مجموعہ سے لی گئی ہے اور ان کی اجازت سے اُردو میں پیش کی جارہی ہے۔

و۔ ن

میں اکثر سوچتی ہوں کہ مان لیجیئے کبھی مجھے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانا پڑے تو وہ آپ ہی مجھ سے میرے خاندان کے لوگوں کے بارے میں پوچھے گا۔ تب مجھے اپنے بھائی کے بارے میں بتانا ہی پڑے گا۔ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ماہر نفسیات مجھے پاگل قرار دے کر بند کرا دے گا۔

یہی بات میں نے اپنی ماں سے کہی تو وہ ہنسی۔ "اچھا، اس لڑکے کے ساتھ اتنی سخت نہ ہو۔"

"لڑکا؟" میں نے کہا۔ "مرد کہو، مرد۔"

ماں ہنس کر مان گئی۔ "لیکن یاد رکھو، پاگل سے اللہ بھی محبت کرتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"آپ کو کیسے پتہ۔؟ آپ تو لامذہب ہیں۔" میں نے کہا۔

کچھ باتوں پر اس بیچارے کا بس نہیں تھا۔ مثال کے طور پر پیدا ہونا۔ وقت بھی چُنا تو کیسا۔ وہ اسی ہفتہ پیدا ہوا جس ہفتہ میں نے اسکول جانا شروع کیا۔ ڈر سے میری جان نکل رہی تھی۔ اب تو اسکول جانے سے پہلے بچّے نرسری اور کنڈر گارٹن میں جاتے ہیں۔ تب ایسا تھوڑے ہی تھا۔ میں پہلی بار اسکول جا رہی تھی۔ سارے بچّوں کے ساتھ ان کی اپنی اپنی مائیں تھیں۔ لیکن میری ماں کہاں تھیں؟ اسپتال کے زچہ خانے میں! میرے لیے جھینپ سے مر جانے کی بات تھی۔ ان دنوں ایسی باتوں پر کتنی شرم آتی تھی۔

پیدا ہونے یا نہ ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا، اور نہ ہی میری شادی کے وقت قے کر دینے میں اس کی کوئی غلطی! کیا کہہ سکتی ہوں۔ فرش اور میز تو کیا، شادی کا کیک تک اسکی قے سے تر ہو گیا تھا۔ لوگ سمجھے وہ پیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا اسے سچ مچ بہت زور کا فلو ہو گیا تھا اور اسی فلو کی شدّت سے میں اور ہیرولڈ اپنے ہنی مون کے دوران بستر پر پڑ گئے تھے۔ میں نے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا کہ کوئی فلو ہو جانے پر لیس کشیدہ میز پوش، چاندی کے شمعدان اور شادی کے کیک پر قے کی بوچھار کر دے، اسے بدقسمتی کہہ لیجیئے۔ ہو سکتا ہے عام طور پر لوگ جی متلانے پر کسی نالی یا نابدان کے قریب ہوتے ہیں یا باقی لوگ قے روکنے یا اُبکائی دبانے کی کوشش کچھ زیادہ ہی کرتے ہوں کیونکہ وہ میرے منّے بھیّا جیسے سب کے لاڈلے، سب کی آنکھوں کے تارے تھوڑے ہی ہیں۔ اسے فطرتاً مزاجاً مریخ (منگل) کہہ لیجیئے۔ بعد میں اسی نام سے وہ خود کو پکارنے لگا تھا۔ پیدا ہونے کے دن سے شادی برات کے دوران قے

کرشمے تک کے درمیان اس نے کیا کیا، اسے جانے دیجئے۔ میں صرف اتنا کہوں گی کہ دمہ کے دورے پڑنے کی وجہ سے اسے ہفتوں اسکول سے چھٹی مل جاتی اور وہ گھر میں پڑا ریڈیو پر آنے والے سیریل ڈرامے سُنا کرتا۔ جب ہم دونوں میں کُٹّی نہیں ہوتی تو میں اس سے ہر دن "بگ سسٹر" اور "روڈ آف لائف" نیز جی، جی اور پاپا ڈیوڈ کے ڈراموں کی کہانی سنتی۔ کہنا پڑے گا کہ اسے ڈرامہ کے کرداروں کو یاد رکھنے میں اور منظر نامے کی پیچیدہ باتوں کی تہ تک پہونچنے کی سمجھ تھی۔ گیٹ وے ٹو بک لینڈ" معیاری ادبی کتابوں کا ایک سیٹ ماں نے ہم دونوں کو خرید کر دیا تھا۔ ان میں سے کافی پڑھی تھیں۔ بعد میں یہی سیٹ وہ چُپ چاپ ایک پُرانی کتابوں کی دُکان کو دس ڈالر میں بیچ بھی آیا تھا۔ ماں کا کہنا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اسکول میں پڑھائی میں اول آسکتا ہے۔ بہت گہری سمجھ ہے اس کی۔ وہ سمجھاتیں ـــ" دیکھ لینا کسی دن اس کے کرشمے ہم سب کو حیران کر دیں گے"ـــ ان کی بات صحیح نکلی، اور ایسا ہوا بھی۔

دسویں کلاس میں ایک چھوٹی سی بات ہو جانے کے بعد سے وہ اسکول چھوڑ کر گھر ہی پر رہنے لگا۔ ہوا یہ کہ ایک ٹیچر کی میز کی دراز سے حساب کا سوال چرا کر نقل کرنے والے ایک گٹ کے ساتھ وہ بھی پکڑا گیا تھا۔ اسکول بند ہو جانے کے بعد ایک چوکیدار اس کے لیے کلاس کے کمرے کا دروازہ کھول دیتا کیوں کہ 'بھائی کا کہنا تھا، وہ پڑھائی سے متعلق ایک خاص کام کر رہا تھا۔ ایک طرح سے ٹھیک ہی تھا۔ ماں نے سب کو سمجھایا" اس نے صرف شہرت حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا۔ دمہ ہونے کے بعد سے وہ کھیل کود میں کہاں حصّہ لے پاتا ہے۔"

پھر بھیّا کی نوکری، کام ڈھونڈنے کی بات۔ ارے! میں اب تک اس کے نام کی جگہ اسے بھائی، بھیّا ہی کہتی رہی ہوں۔ اس کا نام کیمرن ہے، مخفف کیم۔ ماں کا خیال تھا کہ ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا کسی بڑے پُر ایمان دار تاجر پر یہ نام جچے گا۔ (ماں اسے ایسا ہی کچھ بنتے بھی دیکھنا چاہتی تھیں) سوال تھا، وہ کرے گا کیا، کیسے اپنی روزی کمائے گا؟ اپنے ہی ڈھنگ کا کوئی کام ـــ چاہے اس کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا ہو۔ اپنی مرضی سے کرنے کے لیے گزارے کی رقم دینا تو سرکار نے ابھی شروع کیا ہے۔ پہلی نوکری اسے ایک سینما ہال میں ٹکٹ لینے والے کی ملی۔ لی کیا، اماں نے دلا دی، بلکہ اسٹریٹ کے انٹرنیشنل تھیٹر کے مینیجر کو وہ جانتی تھیں، یہ نوکری اسے چھوڑنی پڑی کیوں کہ اندھیرا بھرے ہال میں اسے ڈر لگتا تھا۔" اندھیرے میں بیٹھے اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر ایک عجیب سی کپکپاہٹ ہوتی ہے"۔ وہ کہتا۔ صرف ٹکٹ لینے کے کام میں یہ دشواری تھی۔ جب وہ خود سینما دیکھنے جاتا تو اندھیرے میں بیٹھنے میں کوئی دُشواری نہ ہوتی۔ سینما دیکھنے کا اسے خوب چاؤ ہو گیا تھا۔ وہ سینما ہالوں میں پورا دن گزار دیتا۔ پہلے ایک فلم کو دو بار دیکھتا، پھر دوسرے ہال میں جا کر وہاں دکھائی جا رہی فلم دیکھتا۔ وقت گزارنے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا، تاکہ ماں اور ہم لوگ سمجھیں وہ گرے ہاؤنڈ بس کے اڈے پر کام کر رہا ہے۔ ہر صبح وہ گھڑی دیکھ کر گھر سے نکلتا اور رات کو ٹھیک وقت پر واپس آجاتا۔ بس کے آفس کے انچارج جھکّی بڑھوؤں کے بارے میں اور وہیں ۱۹۱۹ء سے کام کر رہی ایک کبڑی عورت کے قصّے ہمیں بتاتا۔ چیونگم چباتی لڑکیوں کو دیکھ کر وہ بڑھیا کیسے جھلّا جاتی تھی۔ بھئی خوب کہانی بناتا تھا۔ وہ تو کہو ماں نے ایک دن شکایت کرنے کے لیے اس کے آفس میں فون کر دیا کہ اس کے نام کے ہجّے میں معمولی سی غلطی ہونے کی وجہ سے اس کی تنخواہ اتنے دن روکنا واجب نہیں تھا ورنہ یہ کہانی بھی اتنی ہی دلچسپ ہو جاتی جتنا ریڈیو پر آنے ناٹک۔ تب جا کر پتہ لگا کہ جناب نے دوسرے دن کی دوپہر میں ہی کام چھوڑ دیا تھا۔

خیر، ماں کا کہنا تھا کہ کسی شراب خانے میں بیٹھ کر بیئر پینے سے تو سینما ہال میں بیٹھنا اچھا تھا۔ وہ کم سے کم غنڈوں کی صحبت میں سڑکوں پر آوارہ گردی سے تو بچا تھا۔ ماں نے پوچھا کہ کون سی فلم اسے سب سے زیادہ پسند تھی، اس کا جواب تھا:

"سیون برائڈس فار سیون برادرس"۔

ماں نے فوراً کہا، "دیکھو! اس کی دل چسپی کھلی ہوا میں کام کرنے کی ہے، وہ بھلا بند آفس میں کیسے کام کر سکتا ہے"۔

ماں کے کسی رشتہ دار کا فریزر روڈلی میں ایک فارم تھا، اسے وہاں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہاں میں بتا دوں میرے باپ میرے اور کیم کے باپ مر چکے تھے۔ وہ تبھی گزر گئے تھے جب کیم دمہ کے غضب کی وجہ سے ریڈیو ڈرامے سنا کرتا تھا۔ ان کے انتقال سے کوئی فرق نہیں پڑا، کیوں کہ وہ پی۔ جی۔ آئی ریل کمپنی میں کنڈکٹر کی نوکری کرتے تھے اور آدھے وقت بلوایٹ شہر میں رہتے تھے۔ پی۔ جی۔ آئی کی لائن اسکوئے مِش سے شروع ہوتی تھی۔ نہیں، ان کے چلے جانے کے بعد کوئی فرق نہیں آیا۔ ماں ہمیشہ کی طرح ایٹن کے ڈپارٹمنٹ اسٹور میں کام کرتی رہیں۔ کام پر جانے کے لیے پہلے ناؤ سے اس پار جاتیں، پھر بس لیتیں۔ میں کھانا پکانے کا کام سنبھالتی۔ ماں جاڑوں میں راستوں کی چڑھائی چڑھ کر گھر لوٹتیں تو اندھیرا گھنا ہو چکا ہوتا۔

فارم پر کیم ٹکا نہیں، اس کی شکایت تھی کہ ماں کے رشتہ دار کٹر مذہبی تھے اور اس کی روح کی طہارت کرنے کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اس کی الجھن ماں نہیں سمجھتیں تو کون سمجھتا؟ انھوں نے ہی تو اسے بچپن سے ہر بات میں آزادانہ طور سے سوچنا سمجھنا سکھایا تھا۔ پھر کیم کناڈا کے مغرب کی طرف بیچ بیچ ہائیک کرتا گھومنے نکل گیا۔ بیچ بیچ میں اس کے خط آتے رہتے، روپیوں کی فرمائش بھی۔ شمالی کیوبک پہونچنے کا بندوبست کر سکیں تو وہاں نوکری مل سکتی تھی۔ ماں نے پیسے بھیج دیئے۔ اس نے خبر دی کہ کام نہیں بنا، لیکن پیسے واپس نہیں بھیجے۔ پھر لکھا اپنے دو دوستوں کے ساتھ ترکی چڑیوں کا فارم کھولنے جا رہا ہے۔ فارم کا نقشہ اور کتنی پونجی لگے گی، پورا حساب بھیجا۔ ہم لوگ سمجھے کہ ان کا پیورینا کمپنی سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ اتنی بڑی کمپنی کے کام میں کیا خطرہ۔؟

فارم میں باڑھ آجانے سے سب ترکی چڑیاں ڈوب گئیں مگر تب جب ماں پیسے بھیج چکی تھیں اور اپنی سمجھ بوجھ طاق پر رکھ کر ہم بھی۔ ماں کہتیں، "یہ مصیبت کا مارا جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے چوپٹ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہوئے واقعات کسی کو بتائیں تو لوگ کہیں گے کہانی گڑھ دی ہے۔"

ماں سب سمجھتی تھیں۔ ہر بدھ کو ان کی چھٹی ہوتی تھی۔ کیرن کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر دوپہر بعد میں ان سے ملنے جاتی تھی۔ بعد میں اسی گاڑی میں ٹامی بیٹھنے لگا تو کیرن پہلو میں چلتی۔ لونس ڈیل اور کنگس روڈ پر گھومتے ہماری بات چیت ہمیشہ ایک موضوع پر ختم ہوتی ——

"اس لڑکے سے مجھے اب کچھ نہیں لینا دینا ہے۔" ماں کہتیں۔ "وہ جو چاہے کرے اگر میرا ہاتھ نہیں چھوڑے گا تو زندگی میں کیا کرے گا۔"

میں زیادہ کچھ نہ کہتی، انھیں میری رائے معلوم تھی۔ آخر میں عموماً کہتیں، "ارے گھر میں رہتا ہے تو رونق رہتی ہے۔ وقت اچھا کٹتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی تھوڑا ہنس لیتی ہوں۔" یا۔ "دمے کی تکلیف اور سر پر باپ کا سایہ نہیں، اس نے بھی کافی مصیبتیں جھیلی ہیں، جان بوجھ کر تو بیچارے نے کسی کا دل نہیں دکھایا۔"

پھر کہتیں۔ "ایک کام اس نے اچھا کیا، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لڑکی کے بارے میں۔"

ان کا اشارہ اس لڑکی کی طرف ہوتا جو ایک دن کیم کو ڈھونڈتی آ پہونچی تھی اور جس نے ہمیں بتایا کہ اونٹریو صوبہ کے ہملٹن شہر میں اس کی اور کیم کی منگنی ہو چکی تھی۔ بعد میں کیم نے اسے خط لکھا کہ اپنے خاندان میں گردے کی جان لیوا بیماری کا سلسلہ ہونے کی وجہ سے وہ شادی کی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ لڑکی یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھنے سننے میں لڑکی بری نہیں تھی۔ وہ بیل ٹیلی فون کمپنی میں کام کرتی تھی۔ ماں کے خیال میں کیم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور سچی بات کہہ کر اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں جو ہوا، اچھا ہوا۔ کم سے کم وہ لڑکی زندگی بھر کیم کا بوجھ سنبھالنے سے تو بچ گئی۔

یہ بات صحیح ہے کہ کیم کی شادی ہوجانے سے ہم سب کے سر کا بوجھ ہلکا ہوجاتا۔

مگر تب کی بات تب تھی اور اب کی اب۔ سب جانتے ہیں کہ وقت بدل گیا ہے۔ کیم اب آرام سے ہے۔ کبھی وہ ماں کے گھر رہتا ہے کبھی نہیں، پچھلے ڈیڑھ برس سے تو وہ وہیں ہے۔ ماتھے کے اوپر کے بال ہلکے ہوگئے ہیں جو ۳۴ برس کے مرد کے لیے عام ہے پیچھے کندھوں تک اڑتے اڑتے بال سفید ہو چلے ہیں۔ وہ موٹے کھُردرے ٹاٹ جیسے کپڑوں کا سادھوؤں جیسا لبادہ پہنے رہتا ہے۔ (ہیرو سے میں نے کہا کہ اسے اگر سنیاس لے کر دھونی رمانے کا شوق ہے تو دھونی کا انتظام میں خوشی سے کر دوں گی) اس کے سینے پر لٹکتی طرح طرح کی مالاؤں میں بڑے بڑے لاکٹ، صلیبیں، ہرن کے دانت کے تعویذ اور پتہ نہیں کیا کیا ٹنگے رہتے ہیں۔ پیروں میں بان کی چپلیں جنھیں اس کا کوئی دوست بناتا ہے۔ غریبوں کو دیا جانے والا سرکاری گزارہ اسے بھی ملتا ہے اسے 'روزی کمانا' کہنے کی ناشائستگی کون کرنا چاہے گا۔ کبھی اسے اپنا پیشہ بتانا پڑے تو وہ کہہ دیتا ہے "پادری"۔

سچ میں! اپنے کو پادری کہنے والے ان لوگوں کا پورا فرقہ ہے۔ کٹ سیلانو شہر میں ان کی اپنی عمارت ہے۔ کیم بھی کبھی کبھی وہاں رہ جاتا ہے۔ ہرے کرشنا منڈلی سے ان کی چلتی رہتی ہے۔ دونوں میں فرق بس اتنا ہے کہ یہ لوگ کیرتن نہیں کرتے، صرف چہروں پر مسکراہٹ لیے یہاں وہاں گھومتے رہتے ہیں۔ کیم نے ایک مہینے سے لَے میں ہموار آواز میں بولنا شروع کر دیا ہے جسے سن کر ہی مجھے چڑ آنے لگتی ہے۔ کئی بار دل کرتا ہے کہ اسے سامنے کھڑا کر کے کہوں:

"چلی میں ہولناک زلزلہ آیا اور دو لاکھ آدمی مر گئے۔ امریکیوں نے ویت نام میں ایک اور گاؤں پھونک ڈالا....." میں بس یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا وہ اسی سریلی آواز میں کہتا رہے گا کہ

"ب۔و۔ت۔ خو۔ب' ب۔و۔ت۔ا۔چھے۔"

اس نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، وہ کھاتا ہے موٹا پسا اناج اور ساگ سبزیاں۔ ایک دن وہ باورچی خانہ میں آیا جب میں چقندر کاٹ رہی تھی۔ "چقندر جڑ دار سبزی ہے، اس کا کھانا ممنوع ہے نا۔

سمجھتی ہو نہ کہ تم قتل کر رہی ہو۔" اس نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم"۔ میں نے کہا۔ "مگر تم فوراً یہاں سے دفع نہیں ہوجاتے تو کسی کا قتل ضرور ہوجائے گا۔"

کہہ چکی ہوں کہ بیچ بیچ میں ماں کے یہاں رہنے لگتا تھا۔ اس پیر کو جب ماں کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ گھر ہی پر تھا۔ انھیں متلیاں آرہی تھیں۔ دو تین دن پہلے کیم نے انھیں زود ہضم سبزی کی غذا دینا شروع کی تھی۔ ماں ایک عرصے سے غذا آزمانے کا وعدہ کر رہی تھی اور کیم نے انھیں سمجھایا کہ گوشت، شکر جیسے ضلالتی کھانے سے جو زہریلے مادّے ان کے اندر جمع ہو گئے تھے، وہ سب متلی میں نکلتے رہے تھے۔ وہ کہتا رہا کہ جیسے ہی وہ سب اناپ شناپ اگل دیں گی وہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ قے کر کر کے ان کی طبیعت اور خراب ہوگئی مگر کیم کو کہیں باہر جانا تھا۔ ہر ہفتہ پیر کی رات اس کا پادری گروہ اپنے اڈے پر جمع ہو کر ورد کرتا تھا، اگر بتیاں جلا کر آرتی کرتا تھا اور جن بھوت بھی جگاتے ہوں تو کیا پتہ۔ تقریباً پوری رات باہر رہ کر گھر لوٹا تو ماں کو غسل خانے کے فرش پر بے ہوش پایا۔ اس نے ٹیلی فون کیا تو کسے، مجھے۔!

"ارے ویل! اچھا ہو کہ تم یہاں آکر ماں کو سنبھالو۔"

"انھیں کیا ہوا۔؟"

"ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔"

"کیا مذاق ہے، انھیں فون دو۔"

"کیسے دوں۔؟"

"کیا مطلب۔ کیسے دوں؟"

"قسم کھاتا ہوں۔" اس نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"ابھی وہ ہوش میں نہیں ہیں۔"

میں نے فوراً فون کر کے ایمبولنس ماں کے گھر بھجوائی۔ تب جاکر صبح پانچ بجے انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ماں کے پُرانے واقف کار ڈاکٹر کو بھی میں نے فون کیا۔

ڈاکٹر نے اسپتال پہونچ کر شہر کے مشہور ماہرِ قلب ڈاکٹر ایلس بیل کو بلوا بھیجا۔ میں نے کپڑے بدلے، ہیرو کو جگا کر خبر سنائی اور گاڑی

نکال کر لائنس گیٹ اسپتال پہونچی۔ دس بجے سے پہلے مجھے ماں کو دیکھنے نہیں دیا گیا۔ وہ انتہائی نگہداشت والے شعبے میں تھیں جس سے ملحق بھونڈے ڈھنگ سے سجائی انتظار گاہ تھی۔ لال تکلیف دہ کرسیاں اور گدیوں سے بھرے گملے میں لگا ہرے پلاسٹک کا پودا۔ وہاں میں گھنٹوں بیٹھی ریڈرز ڈائجسٹ پڑھتی رہی۔ پڑھتے میں سوچ رہی تھی کہ آخر یہ ہونا ہی ہے، ماں کا وقت آ گیا ہے۔ اسی پل ماں ان دروازوں کے پیچھے آخری سانسیں گن رہی ہے۔ ہم کتنا بھی سوچیں 'چاہیں یا نہ چاہیں' ہونی ہو کر رہے گی۔ اپنے سے جڑی ماں کی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی، ان کا روز کام پر جانا۔ پہلے ناؤ پر، پھر بس میں۔ لوٹتے وقت کبھی اس دکان کبھی اس دکان سے سودا لینا۔ ہفتہ میں ایک بار شام کے وقت مجھے ساتھ لے کر لائبریری جانا، کتابوں سے بھرا جھولا اٹھائے، ہمارا بس میں گھر لوٹنا اور راستے میں چینی آدمی کی دکان سے، منہ میٹھا کرنے کو، انگور خریدنا۔ بدھ کی وہ دوپہریں جب بچے چھوٹے تھے اور انھیں ساتھ لے کر ماں کے یہاں کافی پینے جاتی تھی اور وہ ایک مشین میں کاغذ اور تمباکو ڈال کر ہم دونوں کے لیے سگریٹ بناتی تھیں۔ پھر خیال آیا، روزمرہ کے یہ کام ہم کر جاتے ہیں، دن بھی کٹتے جاتے ہیں اور یقین نہیں ہوتا کہ زندگی کا مطلب بس یہی ہے۔ دماغ میں ہمیشہ بنا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی دن کچھ ہوگا اور جب یہ گزرے گا تو ہمیں سمجھ میں آئے گا کہ زندگی اس رات دن کے ڈھرے سے الگ کچھ اور نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ آرام سے بیت رہی زندگی کے درمیان ہم خاص طور پر چاہتے ہی ہوں کہ کچھ ہو، کچھ گزرے، مگر ہونی مطلوب رہتی ہے۔ پھر خود ہماری موت کے دن، ماں کی موت کے پل، انہی پلاسٹک کی کرسیوں اور پلاسٹک کے پودوں اور باہر روزمرہ کی زندگی کی ویسی ہی چہل پہل کے درمیان سمجھ میں آتا ہے کہ ہماری زندگی کا دائرہ بس اتنا ہے اور کتابوں کا جھولا اٹھائے گھر کے راستے کی چڑھائی، بس پر سوار ہو کر پار کرنے جیسی چھوٹی چھوٹی باتیں اور انگوروں سے بھرے ہوئے لفافے کی یاد اتنی تیکھی اور 'یا اللہ' اتنی پیاری بن جاتی ہے کہ ان دنوں کو پھر سے جی سکنے کے لیے ہم کیا نہیں کر سکتے۔

جب ان لوگوں نے مجھے ماں کے پاس جانے دیا تو میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ پتلیاں اوپر چڑھ جانے کے کارن ادھ مندی پلکوں کی درار سے آنکھوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ نقلی دانتوں کے بغیر ان کا منہ ڈراؤنا سا لگتا تھا۔ دانت لگائے بغیر ہمارے سامنے کبھی نہ آتی تھیں۔ اس بات پر کیم اکثر انھیں چھیڑتا تھا۔ اب ان کا منہ دانتوں کے بغیر تھا۔ سارے وقت میں سوچ رہی تھی، ساری زندگی، جب وہ جوان تھیں تب بھی ان کے چہرے کے سانچے میں آثار تھے کہ کسی دن وہ ایسی لگیں گی۔

اسپتال کے لوگوں نے کوئی امید نہیں بندھائی۔ ہیرو آئے ماں کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے:

"ویل! بھلے برے کے لیے تیار رہو جاؤ۔"

ان کی بات ٹھیک تھی، لیکن میں کچھ نہ کہہ سکی۔ ماں میری تھیں، ہیرو کے دل میں ان کی پرانی یادیں کیا اٹھتیں۔ ان کا قصور نہ ہونے پر بھی ان سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ نہ ہی میں یہ سننا چاہتی تھی کہ بھلے برے کے لیے تیار رہوں۔ اسپتال کے ریستوراں میں جا کر ہم دونوں نے کچھ کھایا پیا۔

"اچھا ہو کہ تم کیم کو فون کر دو۔"

"کیوں۔؟"

"وہ جاننا چاہے گا۔"

"تمھیں کیسے پتہ کہ وہ جاننا چاہے گا؟ کل رات اس نے انھیں اکیلا چھوڑ دیا اور آج صبح جب وہ بیہوش ملیں تو اتنی عقل نہیں تھی کہ ایمبولنس بلا لے۔"

"پھر بھی اس کا جاننے کا حق ہے۔ اسے یہاں آنے کو تمھیں کہنا چاہیے۔"

"وہ تو شاید ان کی تدفین ہنچ رسم سے کرنے کی تیاری میں مشغول ہوگا۔"

لیکن ہمیشہ کی طرح ہیرو نے مجھے منا لیا اور میں نے فون کیا کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میرا جی ہلکا ہوا۔ فون کرنے کا فرض بھی نبھ گیا اور کیم کے گھر نہ ہونے کی میری شکایت بھی ٹھیک نکلی۔ ہیرو

چلے گئے اور میں اکیلی بیٹھی رہی۔

اُس رات تقریباً سات بجے کیم آیا، مگر اکیلا نہیں، اس کے ساتھ اس کے فرقے کے پادریوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب کیم جیسے موٹے ٹاٹ کا لبادہ اور گلے میں ویسے ہی کئی طرح کے گنڈے تعویذ لگے ہار پہنے تھے۔ بال سبھی کے لمبے تھے اور سبھی عمر میں کیم سے چھوٹے لگتے تھے، سوائے ایک بڑھئو کے، جن کی عمر خاصی رہی ہوگی۔

ان بڑھئو کی داڑھی سفید تھی اور پاؤں ننگے۔ مارچ کی ٹھنڈ میں ننگے پاؤں ــ اور بنا دانتوں کا پوپلا منھ۔ خدا کی قسم! اس ضعیف انسان کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں کیا ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پادریوں نے اسے سالویشن آرمی سے پکڑ کر، ٹاٹ کا لبادہ پہنا کر، فقیر، اولیا دکھانے کو ساتھ لے لیا تھا۔

کیم نے کہا: "یہ میری بہن ویلری ہے۔ یہ برادر مائیکل ہیں، یہ برادر جان ہیں، یہ برادر لوئی..." وغیرہ وغیرہ۔

"کیم! اسپتال والوں کی باتوں سے تو مجھے کوئی آس نہیں بندھتی۔ ماں ختم ہونے والی ہے۔"

"ہمیں امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔" کیم نے پُراسرار مسکراہٹ سے کہا۔ "ہم سارا دن بچانے کا کام کر رہے تھے۔"

"تمھارا مطلب ہے دُعائیں کر رہے تھے؟"

"دُعا سے زیادہ برمحل لفظ عمل کرنا ہے۔ اگر تم میرا منشا سمجھ سکو تو۔"

"صحیح بات ہے، میں کبھی کچھ سمجھ نہیں پاتی۔"

"یقین کرو، عمل کرنا ہی سچی عبادت ہے۔" کیم نے کہا، اور اس کے ساتھی ویسی ہی پُراسرار مسکراہٹ لیے میری طرف دیکھتے رہے۔ وہ لوگ ایک جگہ کھڑے نہ ہو کر لگاتار اِدھر اُدھر آگے پیچھے ڈول رہے تھے، جیسے بچے پاخانہ پیشاب روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کسمساتے ہیں۔

"اچھا۔ ان کا کمرہ کدھر ہے۔؟" کیم نے مصروف لہجے میں کہا۔

مجھے خیال آیا، اگر بسترِ مرگ پر پڑی ماں بیچ بیچ میں اپنی ادھ کھلی پلکوں کی دراز سے درویشوں کی اس بھیڑ کو دیکھ پائے تو کیا ہو؟

وہی ماں جو تیرہ برس کی عمر میں دین و عمل سے اعتقاد اُٹھ جانے کی وجہ سے یونی ٹیرین چرچ میں شامل ہو گئی تھیں اور جس نے بعد میں مناجات سے خدا کا نام نکال دینے کے سوال پر (ماں اس کی ماننے والی تھیں) اختلاف ہو جانے کی وجہ سے وہ مسلک چھوڑ دیا تھا ــ انہی ماں کے آخری بیدار لمحے اس کشمکش و پنج میں بیت رہے ہیں کہ کیا علاقہ و زمانہ کے آگے پیچھے ہو جانے سے وہ سینکڑوں سال پہلے کے کسی مذہبی اجتماع میں پہونچ گئی ہیں اور اپنی قوتِ خیال کا بقایا ان درویشوں کی موجودگی کی وجہ سمجھنے میں ضائع کر رہی ہیں۔

خدا کا شکر کہ نرس نے منع کر دیا۔ چھوٹے ڈاکٹر کو بلایا گیا، اس نے بھی 'نا' کر دی۔ کیم نے زور نہ دے کر سر جھکا کر ایسے ہلایا جیسے ان کی اجازت مل گئی ہو۔ اپنی منڈلی کو اس نے انتظار گاہ میں بلا لیا اور وہاں، ٹھیک میری آنکھوں کے سامنے وہ چالو ہو گئے۔ بڑھئو کو سر جھکا کر اور آنکھیں بند کرا کے بیچ میں بٹھا دیا گیا۔ انھیں بیچ بیچ میں ہلا کر اسی انداز میں برقرار رہنے کی تاکید کرنا پڑ جاتی تھی باقی لوگ بڑھئو کے اردگرد ایک حلقہ سا بنا کر باری باری سے اندر۔ باہر، اندر۔ باہر کے رُخ منھ کیے بیٹھ گئے اور انھوں نے سر ہلاتے جھوم جھوم کر گنگنانا اور وظیفہ کرنا شروع کر دیا۔ سب الگ الگ لفظوں اور آوازوں کی ادائیگی کر رہے تھے۔ ان کا وظیفہ انگریزی میں نہ تھا، وہ سواحلی یا سنسکرت میں ہو سکتا تھا یا کسی اور زبان میں۔ ان کی آواز دھیرے دھیرے اونچی ہو کر مشترک ورد بن گئی اور پھر سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ صرف بڑھئو اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ لگتا تھا وہ اونگھ رہے ہیں۔ منڈلی اپنی اپنی جگہ کھڑی ٹھکنے اور تالی بجانے لگی تھی تالیاں ایک لے میں نہیں بج رہی تھیں۔ وہ کافی دیر یہی سب کرتے رہے۔ ان کے ناچ گانے کی آواز بہت اونچی نہ تھی مگر ان کی ہُو حق کی وجہ سے نرسیں، اسپتال کے دوسرے ملازم نیز میرے جیسے انتظار کرتے لوگ آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ اس معمولی انتظار گاہ میں ہورہا یہ پاگل پن اتنا عجیب، اتنا غیر متوقع تھا کہ کسی کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ سبھی آنکھیں پھاڑے یہ نظارہ ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے خواب تھا جو جلد ہی ٹوٹے

جائے گا اور ان کی نیند کھل جائے گی۔

تبھی انتہائی نگہداشت والے حصے سے نکل کر ایک نرس نے کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔؟ یہاں شور وغل کرنے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔"

لیکن کسی کے بھی نہ رکنے یا اس کی بات نہ سننے پر اس نے منڈلی کے ایک کم عمر رکن کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ہم ایک عورت کو بچانے کا کام کر رہے ہیں جو بہت بیمار ہے۔" اس نے نرس سے کہا۔

"پتہ نہیں آپ لوگ کیا کام کر رہے ہیں، لیکن کسی بیمار کی مدد نہیں کر رہے ہیں۔ اچھا، یہ کمرہ خالی کر دیجئے۔ یہ درخواست نہیں ہے خالی کرنا ہی ہوگا۔"

"اگر آپ کا خیال ہے کہ ہماری ثناخوانی کی آواز سے کسی مریض کو پریشانی یا تکلیف ہو رہی ہے تو آپ بھول کر رہی ہیں۔ یہ ورد ایسی لے میں کیا جا رہا ہے جو بے حس دماغ تک پہونچ کر سکون دے گا اور جسم میں بسے شیطانی اثرات کو باہر کھینچ دے گا۔ یہ ورد پانچ ہزار برسوں سے چلا آرہا ہے۔"

"یا اللہ!" نرس ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ لوگ کون ہیں؟"

مجھے نرس کو سمجھانا پڑا کہ وہ میرا بھائی تھا۔ اور اس کے ساتھ سمجھ لیجئے اس کے دوست، اور میرا ان امور سے کچھ نہیں لینا دینا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"ماں کی حالت میں کچھ فرق آیا؟"

"کوئی فرق نہیں۔" اس نے کہا۔ "ان سب کو یہاں سے باہر کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"ٹھنڈے پانی سے نہلا کر شرابور کر دو۔" پاس کھڑے ایک ملازم نے کہا۔

اس دوران رقص، یا ورد کہیے، چلتا رہا اور نرس سے بات کرنے کو رُکا نوجوان بھی رقص میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے نرس سے کہا:

"میں تھوڑی دیر کے لیے گھر جا رہی ہوں، وہیں سے فون کر کے ماں کی حالت پوچھ لوں گی۔"

اسپتال سے نکلی تو اندھیرا دیکھ کر میرے تعجب کا ٹھکانا نہ رہا۔ منھ اندھیرے سے رات کے اندھیرے تک سارا دن اندر بند گزار دیا تھا۔ گاڑی پارک کے میدان میں پہونچ کر مجھے رونا آگیا۔ کیم نے بس اپنے فائدے کے لیے یہ سب تماشا کیا تھا، میں نے خود سے کہا۔

گھر پہونچ کر یہ بات میں نے ہیرو سے دہرا دی۔

ہیرو نے میرے لیے ایک جام بنایا۔

"لگتا ہے یہ اخباروں میں شائع ہو کر رہے گا۔" میں نے کہا "شہرت کے لیے کیم کا موقع۔"

ماں کا حال جاننے کے لیے ہیرو نے اسپتال میں فون کیا تو جواب ملا کہ کوئی نئی خبر نہیں ہے۔

"آج شام جو نوجوانوں کی ٹولی انتظار گاہ میں تھی، انھوں نے آپ کو۔ کسی کو پریشان تو نہیں کیا؟" ہیرو نے پوچھا۔ "کیا وہ لوگ بنا جھنجھٹ کے چلے گئے تھے؟"

ہیرو مجھ سے دس برس بڑے ہیں، ٹھنڈے مزاج کے ہر کسی سے بہت صبر سے پیش آنے والے۔ تب میرا خیال تھا کہ وہ کبھی کبھی مجھ سے چھپا کر کیم کو روپے پیسے بھی دے دیتے تھے۔

"وہ بنا جھنجھٹ کیسے چلے گئے تھے۔" انھوں نے کہا۔ "تم اخباروں کی فکر چھوڑ دو تھوڑا سو لو۔"

دیر تک ارادہ تو نہیں تھا، لیکن صوفے پر لیٹتے ہی میں سو گئی۔ اس مشروب اور دن بھر کی تکان کا اثر تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو کمرہ دن کی روشنی سے بھرا تھا۔ ہیرو نے رات میں ایک کمبل میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ کمبل گھسیٹتی، نیند سے لڑکھڑاتے قدموں سے میں باورچی خانے میں گئی۔ دیوار پر لگی گھڑی پونے چھ بجا رہی تھی۔ میں نے سوچا، ماں چل بسیں۔

فون ماں کے شناسا ڈاکٹر کا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا، اچھی خبر ہے۔ اس صبح ماں کا حال پہلے سے بہتر تھا۔

ایک کرسی کھینچ کر میں وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں بانہیں اور سر

باورچی خانے کے کاؤنٹر پر رکھ لیا۔ کچھ دم لے کر فون اٹھایا تو ڈاکٹر کو کہتے سنا کہ ماں کی حالت ابھی بھی نازک ہے اور اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کیفیت بالکل عیاں ہو جائے گی۔ ڈاکٹر نے زیادہ امید تو نہیں بندھائی مگر اتنا کہا کہ ماں پر دواؤں کا اثر ہو رہا تھا۔

یہ بات خاص طور پر غیر متوقع تھی۔ انھوں نے کہا، کیونکہ ماں اسپتال کافی تاخیر سے پہونچی تھیں اور شروع میں دواؤں کا کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حالاں کہ پہلے کچھ گھنٹے جھیل جانا اچھے آثار تھے۔ میں نے سوچا، کل تو کسی نے اس علامت کو اہمیت نہیں دی تھی۔

فون رکھ دینے کے بعد میں گھنٹہ بھر وہاں بیٹھی رہی۔ پھر کافی بنانے کے لیے پیالے میں پاؤڈر ڈالا، مگر ہاتھ اتنے کانپ رہے تھے کہ پہلے تو پیالے میں اُبلتا پانی ڈالنا مشکل، پھر پیالہ ہونٹوں تک نہ لے جا سکی۔ کافی بھرا پیالہ ایسے ہی پڑا رہنے دیا۔ آخر کار سونے کے کپڑے پہنے۔ ہیرو باورچی خانہ میں آئے، مجھے دیکھ کر بولے:

"حوصلہ رکھو ویل! کیا ماں چل بسیں؟"

"کچھ بہتر ہیں۔ لگتا ہے دوائیں اثر کر رہی ہیں۔"

"تمھارا چہرہ دیکھ کر تو کچھ اور ہی لگا تھا۔"

"میں خود حیران ہوں۔"

"کل دوپہر میں تو ان کے بچنے کی رتی بھر امید نہیں تھی۔"

"کیا کہوں۔ مجھے خود یقین نہیں ہو رہا۔"

"یہ سب وسوسہ ہونے کا تناؤ ہے۔" ہیرو نے کہا۔ "ہم سب اپنے کو کسی خدشہ کے لیے تیار کر لیتے ہیں۔ اس خدشے کے ٹل جانے پر ایک عجیب تاثر، مسرت کا نہ ہو کر مایوسی کا سا ہوتا ہے۔"

"مایوسی!" یہ لفظ میرے دماغ میں جم سا گیا۔ ماں کا بچ جانا میرے لیے کتنی مسرت اور اطمینان کی بات تھی، لیکن اندر ہی اندر میں سوچ رہی تھی کہ اپنی ساری لاپروائی، پاگل پن اور ماں کی دیکھ بھال نہ کرنے کے باوجود کیم نے انھیں مرنے نہ دیا تھا۔ مجھے قبول کرنا پڑا کہ اپنے دل کے کسی کونے میں مجھے مایوسی کا احساس بھی ہوا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ ہیرو میرے جذبات کو خوب سمجھتے ہیں، لیکن اس کے بارے میں مجھ سے وہ کبھی کچھ نہ پوچھیں گے۔ اسی سبب، اس صدمے کی وجہ سے میں کانپ کانپ جاتی تھی سوال ماں کے مرنے جینے کا نہ تھا۔ یہ میری اصلیت ظاہر ہو جانے کی بات تھی۔

ماں اچھی ہو گئیں۔ ایک بار بہتر ہو جانے کے بعد ان کی حالت پھر نہیں بگڑی۔ تین ہفتہ اسپتال میں رہیں، تین ہفتے گھر پر آرام کرتی رہیں، پھر کام پر لوٹ گئیں۔ کام کے گھنٹوں میں انھوں نے تھوڑی تخفیف کر دی۔ پورے دن کے بجائے دس بجے صبح سے سہ پہر چار بجے تک، جیسا اپنے گھر اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرتی عورتیں بالعموم کرتی ہیں۔ کیم اور اس کے دوستوں کے اسپتال آنے کے بارے میں ہر کسی کو بتاتیں مثلاً:

"بھلے ہی اور باتوں میں میرا یہ لڑکا نکما ہو، مگر بھئی ماننا پڑیگا کہ جان بچانے میں ماہر ہے۔" یا، "کیم کو پیر فقیر بن جانا چاہیے، میرے ساتھ تو اس نے معجزہ ہی کر دکھایا۔"

کچھ عرصہ بعد کیم نے کہنا شروع کیا تھا اور ابھی بھی کہتا ہے کہ اس کو ایمان و عمل پر اعتقاد نہیں رہا، اور ان پادریوں کی صحبت نیز گوشت اور اصل جڑ والی ترکاریوں کے پرہیز سے وہ تنگ آ گیا ہے۔ اب اس کا کہنا ہے کہ محاسبۂ نفس کے اس دور سے گزرنا اس کے لیے اچھا ثابت ہوا۔ ایک دن ماں کے گھر گئی تو دیکھا وہ ایک پرانا سوٹ اور ٹائی آئینے کے سامنے پہن کر دیکھ رہا تھا صارفین کے لیے درس میں بھی کھاتے کا نصاب لے کر اس کا ارادہ اب محاسب بننے کا ہے۔

میں جو ہوں، اس سے مختلف ایک شخصیت میں اپنے کو ڈھالنے کی میں نے سوچی تھی ـــ اس بارے میں ابھی بھی سوچتی ہوں۔ خود شناسی کے لیے دی آرٹ آف لِوِنگ نام کی کتاب بھی پڑھی تھی۔ کتاب پڑھتے وقت تو بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں، لیکن بعد میں میری شخصیت تقریباً جیسے پہلے تھی ویسی ہی رہی۔ جیسا ہیرو نے بھی ایک بار کہا تھا، آخر کیم نے ایسا کیا کیا جس سے مجھے کوئی گزند پہنچی ہو۔ اور ماں کے مرتے مرتے بچ جانے کی رات جو کچھ میں نے

باقی صـ۴۲ـــ

گیت

اب بھی سینے میں کروٹ بدلتا ہے دل
گرمیٔ عشق میں اب بھی جلتا ہے دل
کیا کبھی موم بن کر پگھلتا ہے دل
کیا مرا نام لے کر دھڑکتا ہے دل

آنکھ بند کر کے کیا مجھ میں کھو جاؤ گے
آئینہ توڑ دو ہر طرف پاؤ گے
میری تصویر سے گر بہلتا ہے دل
کیا مرا نام لے کر دھڑکتا ہے دل

سُرخ لب پر ہنسی کتنی مخمور سی
زُلف کالی گھٹا آنکھیں بلّور سی
ان گھٹاؤں میں گھر کر مچلتا ہے دل
کیا مرا نام لے کر دھڑکتا ہے دل

حُسن خوشبو نزاکت یہ رخسار و لب
شام کی وہ شفق اور یہ بیدار شب
سوچو کب کیوں کہاں پر مچلتا ہے دل
کیا مرا نام لے کر دھڑکتا ہے دل

دھڑکنوں میں بسی یہ میری آس ہے
موم کی ایک مورت مرے پاس ہے
دیکھ کر جس کو میرا پگھلتا ہے دل
کیا مرا نام لے کر دھڑکتا ہے دل

دوستوں کی عنایت سے ہے تو ضیا
دشمنِ دل کو رکھ اپنے پہلو ضیا
جس کی قربت سے تیرا سنبھلتا ہے دل
کیا مرا نام لے کر دھڑکتا ہے دل

ضیاء قادری اجمیری
سی ۶۲، سیکٹر ڈی سی،
علی گنج، لکھنؤ

تفاوت

دُشمنی کے نام پر
مسمار تو نے کر دیا میرا مکاں
میرے دشمن ہو گئے ہیں
وقت اور موسم بھی تیرے ساتھ ساتھ
تیز بارش
تیز آندھی
تیز دھوپ

جسم آخر جسم ہے
نرم و نازک پھول کی مانند
کب تک ظلم کو سہتا رہے؟
اینٹ گارا اور پتھر
میں نے اک اک چیز کو
ترتیب سے پھر رکھ دیا
اور عمارت بن گئی ــــ لیکن
وہی تیشہ زنی کے کھیل کا آغاز پھر
ٹوٹتے گرتے در و دیوار کی آواز پھر

اپنے اپنے کام میں مصروف ہم
تو کہ اک تخریب گر ــ غوغائے رستاخیز ہے
میں کہ اک معمار ــ میرا فن حیات انگیز ہے

شاہد کلیم
دودھ کٹورا
آرہ ــ ۸۰۲۳۰۱
(بہار)

اقرار

ٹینی سن کی نظم
Maud سے خیال

اُس نے
محسوس کر کے میرا پیار
بار بار دیکھ کر مرا اصرار
بہت سوچ کر آخرکار
بس ایک لفظ کے ذریعے
اپنی چاہت کا
خود بھی کر لیا اقرار
اور وہ لفظ تھا "ہاں"
جس میں میری جنت تھی نہاں
مجھکو ایسا لگا اس کا طرزِ اظہار
جیسے پتہ کسی خزانے کا
اُس نے دیا ہو پہلی بار!

ڈاکٹر معراج احمد
پروفیسر شعبہ سماجیات
لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

انگریزی کہانی

تحریر: سامرسٹ مام

ترجمہ: احمد نسیم صدیقی
شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

فرنچ جو

وہ کیپٹن بارٹ لیٹ تھے جنھوں نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تھرس ڈے آئی لینڈ جانا زیادہ لوگ پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ تورس اسٹریٹ میں واقع ہے اور اس کا نام اس وجہ سے پڑا کہ کیپٹن کوک نے اسے جمعرات کے دن تلاش کیا تھا۔ میں وہاں اس لیے گیا تھا کیوں کہ سڈنی میں مجھے لوگوں نے بتایا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جسے خدا نے سب سے آخر میں بنایا تھا۔ انھوں نے متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں دیکھنے کے لائق کچھ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ میں یہاں تک جاپانی ٹرامپ میں آیا تھا اور کنارے تک مجھے ایک چھوٹی سی کشتی چھوڑ گئی تھی۔ آدھی رات ہو رہی تھی اور گھاٹ پر کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ مجھے لانے والے ملاحوں نے بتایا تھا کہ اگر میں بائیں جانب مڑ کر چلوں تو مجھے ایک دو منزلہ عمارت ملے گی اور یہی یہاں کا ہوٹل ہے۔ کشتی مجھے تنہا چھوڑ کے آگے بڑھ گئی تھی۔ مجھے اپنے سامان سے علاحدہ ہونا اچھا نہیں لگتا لیکن رات کے وقت گھاٹ پر قیام کرنا اور سخت پتھروں پر سونا زیادہ ناپسند تھا۔ لہٰذا میں نے کندھے پر جھولا ڈالا اور چل پڑا۔

مہیب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں ان کے بتلائے ہوئے راستے پر سو قدم سے زیادہ چل چکا تھا اور خوفزدہ تھا کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں آ گیا۔ لیکن تبھی مجھے ایک عمارت نظر آئی جو اتنی اہم ضرور لگ رہی تھی کہ ہوٹل ہو۔ کوئی روشنی نہیں ہو رہی تھی لیکن اب تک میری نظریں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں کہ میں نے دروازہ دیکھ لیا۔ میں نے دیاسلائی جلا کر دیکھا مگر کوئی گھنٹی نظر نہیں آئی۔ میں نے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ اپنی چھڑی سے زیادہ زور سے دستک دی۔ تب میرے سر کے اوپر ایک کھڑکی کھلی اور ایک نسوانی آواز نے مجھ سے دریافت کیا:

"کیا چاہتے ہیں۔؟"

"میں ابھی شکامارو (کشتی) سے اُترا ہوں۔ کیا مجھے ایک کمرہ مل سکتا ہے۔؟"

"میں نیچے آ رہی ہوں۔"

تھوڑی دیر میں ہی لال فلالین کے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کے بال کالی لٹوں کی شکل میں اس کے کاندھوں پر پڑے تھے اور وہ اپنے ہاتھ میں ایک پیرافین لیمپ لیے ہوئے تھی۔ اس فربہ مگر پستہ قد عورت نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ مجھے اوپری منزل پر لے گئی۔ وہاں مجھے اس نے ایک کمرہ دکھاتے ہوئے کہا:

"اب تم بیٹھ جاؤ۔ میں تمھارے لیے بستر تیار کرتی ہوں ـــــ اس سے قبل کہ تم 'جیک رابنسن' الفاظ ادا کر سکو۔ تم کھانے میں کیا لوگے۔؟ میں سمجھتی ہوں کہ وہسکی کا ایک گھونٹ تمھارے لیے بہت بہتر رہے گا۔ تم رات کے اس پہر میں غسل کرنا شاید پسند نہیں کروگے۔ میں صبح تمھارے لیے تولیہ لے کر آؤں گی۔"

بستر تیار کرنے کے دوران اس نے مجھ سے دریافت کر لیا کہ میں کون ہوں اور تھرس ڈے جزیرے پر کیا کرنے آیا ہوں ـــ وہ سمجھ سکتی تھی کہ میں جہازی نہیں ہوں، کیوں کہ تقریباً بیس برس سے تمام جہازی لوگ یہاں آتے رہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں۔ میں ان میں سے نہیں تھا جو کسٹم کے معائنے کے لیے آتے ہیں۔ اس نے سُن رکھا تھا

کہ سڈنی سے وہ لوگ کسی شخص کو بھیج رہے ہیں۔ میں نے اس سے دریافت کیا:

کیا کوئی پائلٹ یہاں قیام پذیر رہے ؟"

"ہاں۔ یہاں کیپٹن بارٹ لیٹ نامی پائلٹ موجود تھا۔"

"کیا تم اس سے واقف ہو۔ ؟"

"وہ بلاشبہ ایک خبطی شخص تھا۔ اس کے سر پر بال قطعی نہیں تھے۔ وہ شراب کو دُور رکھنے میں بڑی احتیاط کرتا تھا۔"

اب تک بستر تیار ہوچکا تھا اور اسے اُمید تھی کہ میں اس پر آرام سے سو سکتا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ چادر صاف ہے اور ایک شمع روشن کر کے وہ رخصت ہوگئی۔

کیپٹن بارٹ لیٹ واقعی خبطی تھا، جس سے میری ملاقات دوسرے دن ہوئی۔ تھرس ڈے جزیرہ سے روانہ ہونے سے قبل میں سمندری کچھوے کا سوپ اتنی مرتبہ پی چکا تھا کہ اب یہ میرے لیے نعمت نہیں رہ گیا تھا۔ جب میں نے دورانِ گفتگو کیپٹن سے یہ ذکر کیا کہ میں فرانسیسی زبان بول سکتا ہوں تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جاکر فرینچ جو سے ملوں۔

"اس بوڑھے آدمی کے لیے یہ ایک سنہرا موقع ہوگا کہ وہ کچھ دیر غیر ملکی زبان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ اس کی عمر اس وقت تیرانوے برس ہے۔"

گزشتہ دو سال سے وہ اپنے بڑھاپے اور معذوری کے باعث اسپتال میں تھا اور میں وہیں اس سے ملنے گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس نے اپنے سائز سے بڑا فلالین کا پاجامہ پہن رکھا تھا وہ تھوڑی جھریوں اور متحرک آنکھوں والا بوڑھا شخص تھا۔ اس کی بھنویں گھنی، داڑھی چھوٹی مگر سفید تھی۔ وہ مجھ سے فرانسیسی میں گفتگو کر کے بہت خوش ہوا، اور مجھ سے اپنے آبائی وطن کو رسیکن کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ لیکن اس نے انگریزی بولنے والوں کے درمیان اتنے دن گزارے تھے کہ اب وہ اپنی مادری زبان فصاحت کے ساتھ نہیں بول پا رہا تھا اور انگریزی الفاظ کو فرانسیسی انداز میں ادا کر رہا تھا۔ نیز فرانسیسی طرز پر سے نئے الفاظ کی تشکیل کرتا جا رہا تھا۔ وہ تیز تیز بول رہا تھا حالاں کہ زیادہ تر اس کی آواز صاف تھی البتہ کبھی کبھی اتنا دب جاتی تھی جیسے وہ قبر سے بول رہا ہو۔ اس کی کھوکھلی آواز میرے اندر خوف کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ درحقیقت میں اسے اس دنیا کا باشندہ سمجھنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کا اصل نام جوزف ری پاؤلی تھا اور وہ ایک شریف النفس انسان تھا۔ وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے جنرلوں کے بارے میں ہم نے باسویل کی 'جانسن' نامی کتاب میں پڑھا ہے۔ لیکن اسے اپنے ان اجداد سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

"ہمارے خاندان میں اتنے زیادہ جنرل ہوئے ہیں مسٹ" وہ بولا ـــ "تمھیں بتاؤں کہ نپولین بوناپارٹ بھی میرے ہی سلسلۂ نسب میں ہوا۔ میں نے باسویل کو کبھی نہیں پڑھا ہے، میں نے کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ میں نے زندگی جی ہے۔"

وہ فرانسیسی فوج میں ۱۸۵۱ء میں شامل ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج سے ۵۰ سال قبل وہ توپ خانے کے لیفٹننٹ کی حیثیت سے اپنے چچازاد بوناپارٹ کی طرح کریمیا میں روسیوں سے لڑا تھا اور کیپٹن کی حیثیت سے ۱۸۷۰ء میں پرشیا میں لڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گنجے سر کا وہ زخم دکھایا جو اسے نیزے سے لگا تھا اور پھر بڑے ڈرامائی انداز میں اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے نیزے سے حملہ کرنے والے اس سپاہی کے جسم میں تلوار اتار دی تھی کہ وہ اسے نکال ہی نہیں سکا تھا۔ سپاہی مُردہ ہو کر گر پڑا تھا اور تلوار اسی کے جسم میں رہ گئی تھی۔ لیکن مملکت ختم ہوجانے پر وہ کیونسٹوں کے ساتھ ہوگیا۔ چھ ہفتوں تک وہ موسیو تھیرس کی قیادت میں سرکاری افواج کے خلاف لڑتا رہا۔ میرے خیال میں تھیرس کی شخصیت فرضی تھی اور یہ بات میرے لیے حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ کچھ مضحکہ خیز بھی تھی کہ فرینچ جو ایک ایسے شخص کے بارے میں نفرت کے زبردست جذبے کے ساتھ بات کرے جسے گزرے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا ہو۔ جب وہ تحقیر آمیز الفاظ استعمال کر رہا تھا تو اس کی آواز چیخ میں بدل گئی تھی۔ یہ اس کے تصور کے وہ نفرت انگیز جملے تھے جو اس نے اس اوسط درجے کے سیاست داں کے خلاف کونسل میں استعمال

کیے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں فرینچ جو پر مقدمہ چلا تھا اور نیو کلاڈونیا میں اسے پانچ برس کی سزا ہوئی تھی۔

"انھیں مجھے گولی مار دینا چاہیے تھی۔" اس نے کہا، "مگر بزدل یہ ہمت نہیں کرسکے۔"

اس کے بعد ایک جہاز میں لمبے سفر کا موقع آیا تھا اور ایک مرتبہ پھر اس کا غصہ اُبل پڑا، جب وہ اپنے ذلیل کیے جانے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ حالاں کہ وہ ایک سیاسی قیدی تھا۔ انھوں نے اسے گھٹیا مجرموں کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ جہاز میل بارن میں ٹھہرا تھا اور اس کے ایک ہم وطن کورسیکن افسر نے اسے فرار ہونے کا موقع فراہم کردیا تھا۔ وہ تیر کر کنارے پہنچا تھا اور اپنے دوست کے مشورے کے مطابق سیدھا پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ اس نے وہاں جو کچھ بتایا اسے کوئی نہیں سمجھ سکا تھا، لہٰذا ایک مترجم کو بلایا گیا۔ پھر اس کے کاغذات کی جانچ کی گئی اور اسے متنبہ کردیا گیا کہ وہ کسی فرانسیسی جہاز میں داخل نہ ہو تو وہ محفوظ رہے گا۔

"آزادی ۔۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوکر چیخا، "آزادی ۔!!"

بعد ازاں متعدد مہموں کا سلسلہ رہا۔ اس نے طباخی کی، فرانسیسی زبان پڑھائی، سڑکیں صاف کیں، سونے کی کانوں میں کام کیا، آوارہ گردی کی، فاقے کیے اور بالآخر نیوگینا کا راستہ پکڑا۔ یہاں اسے سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربوں سے گزرنا پڑا، وہ اتفاقاً وحشیوں کے علاقے میں جا پہونچا تھا جہاں آج بھی آدم خور رہتے ہیں۔ تقریباً ننانوے ناکام کوششوں اور بال بال بچ جانے کے بعد وہ ایک جنگلی قبیلے کا راجہ بننے میں کامیاب ہوا۔

"میرے دوست! میری طرف دیکھو۔" وہ بولا: "میں جو خیرات پر یہاں اسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوں، کسی زمانے میں حکمراں رہا ہوں۔ ہر اس چیز کا جو میری نظر میں تھی ۔۔ ہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں راجا رہا ہوں۔"

لیکن اس کا ٹکراؤ برطانیہ سے ہوگیا اور اسے اپنی خود مختاری سے دست بردار ہونا پڑا۔ وہ ملک سے فرار ہوگیا اور اس نے ایک بار پھر اپنی نئی زندگی شروع کی۔ واضح رہے کہ وسائل اس کے ساتھ تھے کیوں کہ تھرس ڈے جزیرے پر وہ اچانک موتیوں کے جہازوں کے ایک بیڑے کا مالک بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آخر کار وہ جنت میں پہنچ گیا ہے اور اب ایک معمر شخص کی حیثیت سے وہ ایک خوش حال و باعزت بڑھاپے کی تمنا کر رہا تھا مگر ایک طوفان نے اس کی کشتیوں کو برباد کردیا اور وہ تباہ ہوگیا جس سے وہ دوبارہ پنپ نہ سکا۔ اب نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کے لیے وہ کافی بوڑھا ہوچکا تھا اور تب سے وہ بڑی جدوجہد کے بعد روزی کماتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے حالات کے تحت اسپتال کی ہمدردانہ پیش کش قبول کرلینا پڑی۔

"لیکن تم واپس فرانس یا کورسیکا کیوں نہیں گئے؟ چوتھائی صدی قبل کمیونسٹوں کو عام معافی دے دی گئی تھی۔"

"فرانس یا کورسیکا میرے لیے ۵۰ برس بعد کیا معنی رکھتے ہیں؟ میرے ایک بھانجے نے میری زمین پر قبضہ کرلیا۔ ہم کورسیکا کے باشندے نہ کبھی بھولتے ہیں اور نہ درگزر کرتے ہیں۔ اگر میں واپس جاتا تو مجھے اس کو قتل کرنا پڑتا۔ وہ صاحبِ اولاد ہے۔"

"نرالے بوڑھے فرینچ جو!" بستر کے قریب کھڑی نرس نے مسکرا کر کہا۔

"بہرحال تمھاری زندگی بہت عمدہ رہی۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔

"کبھی نہیں ۔۔ کبھی نہیں۔!! میں نے تکلیف دہ زندگی گزاری ہے میں جہاں بھی گیا، بدقسمتی نے وہاں میرا تعاقب کیا۔ میری جانب دیکھو ۔۔ میں ازکار رفتہ ہوں۔ میں قبر کے علاوہ کسی لائق نہیں ہوں۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میری کوئی اولاد نہیں ہے جسے میری بدقسمتی وراثت میں ملے۔"

"ارے جو! میرا خیال تھا کہ تم خدا پر یقین نہیں رکھتے۔" نرس نے حیرت ظاہر کی۔

"یہ سچ ہے۔ میں ایک دہریا ہوں مجھے کوئی ایسی علامت نہیں ملی جس سے ثابت ہو کہ یہ کائنات کسی نظام کے تحت چل رہی ہے۔" اس نے اپنے کندھے اچکائے۔

"بہرکیف مجھے اس گندی دُنیا میں زندگی کو بہتر طریقے سے جینے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اب میں خود جا کر دیکھوں گا کہ ان پردے

(باقی)

غزل

زرد پتے جو شجر اپنے گرا دیتا ہے
موسمِ گُل کے وہ آنے کا پتہ دیتا ہے

جانے کیوں تو وہ چراغوں کی بڑھا دیتا ہے
پھر دریچوں سے ہواؤں کو صدا دیتا ہے

میرے ہمراہ کبھی چل کے تو دیکھو یارو
تپتے صحرا کا سفر کتنا مزا دیتا ہے

راہ میں پیڑ لگانے کا عمل ہے کیا خوب
جو مسافر بھی گزرتا ہے دُعا دیتا ہے

جب بھی یادوں میں گزرتا ہوں گلی سے اسکی
ایسا لگتا ہے کوئی پھول بچھا دیتا ہے

اصغر یاسر
تادین، بہادر گنج - پنڈت شری دھر شکلا مارگ
شاہ جہاں پور

بازار

آیا ہے بازار میں یہ کیسا ٹھہراؤ
خریدار خود بک گیا کرتے کرتے بھاؤ

یہی وا ہمہ دے گیا، دل کو گہرا گھاؤ
ہم بکتے بازار میں، گگن چُومتے بھاؤ

گھومے ہیں آکاش میں دیکھے ہیں بازار
شیشے کے شوکیس میں، ماٹی کے مینار

دوست نہیں دشمن نہیں پھر کیا ہے سنسار
اڑتے پتوں کا لگا، آندھی میں بازار

گڑا خزانہ مل گیا، کھودا ایک مزار
شہر نے قبرستان کا، نام رکھا بازار

سوداگر بازار میں، رہے ابھی تک گھوم
ہم کتنے ہاتھوں بکے، یہی نہیں معلوم

بھگوان داس اعجاز
ڈی ۱۵/۴ بلجیت نگر
نئی دہلی
۱۱۰۰۰۸

غزل

ستم سے چشم پوشی یوں نہ ہم کرتے تو کیا کرتے
زباں مقروض تھی اظہارِ غم کرتے تو کیا کرتے

نہ لکھتے ظلم کو عینِ کرم کرتے تو کیا کرتے
بکے تھے ہاتھ اربابِ قلم کرتے تو کیا کرتے

ہماری ہر تباہی کے تماشائی تھے دوست اپنے
نہ پھر دُشمن اگر مشقِ ستم کرتے تو کیا کرتے

اِدھر سازش زمانے کی اُدھر تقدیر کی گردش
ہم اپنی زندگی کے دن نہ کم کرتے تو کیا کرتے

جھکی جاتی ہے جب ذکرِ ارم پہ شرم سے گردن
گنہ گار آپ کے فکرِ ارم کرتے تو کیا کرتے

فضائیں ان کے کانوں پر اثر انداز کیا ہوتیں!
نہ چُپ رہتے یہ پتھر کے صنم کرتے تو کیا کرتے

شکارِ انقلاباتِ زمانہ ہیں سبھی ماجد
غمِ اسکندر و دارا و جم کرتے تو کیا کرتے

ماجد جائسی
۳۵ - عاشق حسین بلڈنگ
حسن گنج
کمان پورہ

ڈاکٹر خورشید انور
شعبۂ اردو۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

تنقیدی اور اشتراکی حقیقت نگاری

حقیقت نگاری بنیادی طور پر ایک نظریاتی سوال ہے۔ چنانچہ محض حقیقت نگار مصنفین کی تخلیقات کے مطالعے سے ہی حقیقت نگاری کی معنویت کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے ہمیں فلسفے کا سہارا لینا ہوگا۔

سب سے پہلے تو یہ سوال اُٹھتا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ وسیع معنوں میں حقیقت کا مطلب پورا عالم وجود حقیقت ہے۔ اس کی ہر شے اس کا ہر ذرّہ حقیقت ہے۔ مختصراً حقیقت سے مراد ہے وجود۔ جو کچھ بھی وجود میں ہے وہ حقیقت ہے۔

اپنے گرد و پیش کی دُنیا کا مشاہدہ کرنے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تمام چیزیں اور مظاہر PHENONENON یا تو مادیت ہیں یا پھر ان کا تعلق احساسات سے ہے۔ مادی اشیا اور مظاہر کے دائرے میں وہ سب کچھ آتا ہے جس کا معروضی وجود ہے۔ یعنی جو انسانی شعور سے باہر اور اس سے آزاد اپنا ایک علاحدہ وجود رکھتا ہے کائنات میں لاتعداد مادی اشیا اور مظاہر موجود ہیں اور ان کے علاوہ وہ سب جن کا تعلق انسانی شعور سے جذباتی یا احساسی مظاہر ہیں۔ یہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ حقیقت ہیں۔ حقیقت سے متعلق یہ خیال غیر متنازعہ نہیں ہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ افلاطون ظاہری دُنیا کو حقیقت نہیں مانتا اسی طرح دیگر روحانی فلسفی IDEALIST PHILOSOPHY بھی مادی دنیا کو حقیقت نہیں مانتے۔ لیکن حقیقت پھر بھی حقیقت ہے۔ کسی کے نہ ماننے سے وہ غیر حقیقی نہیں ہو جائے گی۔ پھر اس تضاد سے کائنات کے متعلق دو نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مادی نظریہ ہے اور دوسرا روحانی۔ ادب میں حقیقت نگاری کا مخالف نقطۂ نظر روحانی نقطۂ نظر۔ مادی اور روحانی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے متعلق معلومات حقیقت نگاری کو صحیح طور سے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوگی۔

فلسفے کا بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا مادیت اور روحانیت یا دوسرے الفاظ میں مادّے اور شعور کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو اس سوال کا حل دریافت کرنے سے متعلق ہے کہ مادّے اور شعور میں بنیادی حقیقت کس کی ہے؟ آیا مادّے سے شعور پیدا ہوا یا شعور سے مادّہ۔ جن فلسفیوں کی نظر میں مادّہ بنیادی اور شعور ثانوی حقیقت رکھتا ہے یا شعور مادّے کی پیداوار ہے وہ مادیت کے حامی فلسفی ہیں۔ مادیت پرست فلسفیوں کی نظر میں انسانی ذہن کی باطنی شکل کی تفتیش اور اس کی ماہیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسکے برعکس جن فلسفیوں کی نظر میں شعور کو بنیادی حقیقت حاصل ہے وہ روحانیت پرست فلسفی ہیں۔ ان کے مطابق روح یا شعور کا وجود مادے سے پہلے ہے اور شعور نے ہی مادّے کو جنم دیا ہے — افناسیوف نے دونوں نظریات کی وضاحت اس طرح کی ہے:۔

> "مادّیت عموماً سماج کے ایسے ترقی پذیر طبقات کا عالمی نقطۂ نظر رہا ہے اور ہے جس کی دل چسپی انسانیت کی فلاح و بہبودی اور اس کی اقتصادی اور تہذیبی ترقی میں رہتی ہے۔ بردہ داری SLAVERY کے سماج میں مادیت کا استعمال سماج کے جمہوریت پسند حصوں میں رجعت پسند اور غلام رکھنے والے آقاؤں کے خلاف جد و جہد میں کیا گیا۔ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں مادّیت نے جاگیرداروں اور کلیسا

کے خلاف جنگ میں اُبھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے عقلی ہتھیار بنا کا کام کیا۔ آج ہمارے عہد میں مادیت سامراجی رجعت پسند عناصر کے خلاف جدوجہد عالم انسانیت کے ترقی پسند طبقوں کا مضبوط ہتھیار ہے۔ اس کے برخلاف جدوجہد میں زوال پذیر طاقتوں کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ اس وجہ سے بھی وہ مذہب کی مددگار بن جاتی ہے۔ روحانیت اور مذہب ہمیشہ محنت کشوں کا استحصال کرنے میں مدد کرتے رہے ہیں۔ آج بھی روحانیت اور مذہب سرمایہ داروں کے وفادار سنتری اور طرف دار بنے ہوئے ہیں۔[۱۱]"

(انگریزی سے ترجمہ)

مادیت اور روحانیت کے اس فرق کو سمجھ لینے کے بعد حقیقت کی نوعیت کو مادی نقطۂ نظر سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

مادیت کے مطابق حقیقت حرکت پذیر ہوتی ہے۔ تمام اشیاء اور مظاہر کے اندر ان کی ضد ANTI-THESIS بھی ہوتی ہے اور ان میں مسلسل تضاد چلتا رہتا ہے۔ یہی تضاد اور اندرونی کشمکش تبدیلی اور ترقی کی بنیاد ہے۔ ترقی یا تبدیلی کے سبب ہی آج کی حقیقت آنے والے کل میں اس دور کی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی حقیقت جنم لیتی ہے۔ مادیت کے نزدیک پرانے زمانے کا گزر جانا اور نئے زمانے کا وجود میں آنا حقیقت کے ہر شعبے میں مسلسل چلتا رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں نئی حقیقتوں کا پرانی حقیقتوں پر حاوی ہونا ہی ترقی ہے۔

حقیقت کی ظاہری شکل اور اس کی فطرت میں اکثر فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ زمین چپٹی ہے لیکن درحقیقت زمین گول ہے۔ چنانچہ کسی شے کو صرف دیکھنے سے ہی اس شے کی مادیت کا پورا علم ہو جائے، ایسا نہیں ہے۔

حقیقت سے متعلق ان خیالات کی روشنی میں ادب کے حقیقت پسند نظریے کی تشریح بہتر طور پر کی جاسکتی ہے۔

آج عالمی ادب میں حقیقت پسندی کا نقطۂ نظر جس منزل پر پہنچ چکا ہے وہاں اس کی دو شکلیں ہو جاتی ہیں۔ تنقیدی حقیقت نگاری CRITICAL REALISM اور اشتراکی حقیقت نگاری SOCIALIST REALISM تنقیدی حقیقت نگاری اور اشتراکی حقیقت نگاری کے بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ہلکاچ نے لکھا ہے:

"اشتراکی حقیقت نگاری، تنقیدی حقیقت نگاری سے صرف اس لیے ہی مختلف نہیں ہے کہ اشتراکی حقیقت نگاری اشتراکیت کے نظریات پر مبنی ہے۔ یہ اس لیے بھی مختلف ہیں کہ اشتراکی حقیقت نگاری کا مقصد ان طاقتوں کا بیان کرنا ہے جو اشتراکیت کے لیے 'اندر' سے کام کر رہی ہیں۔" [۱۲]

معروضی حقیقت کے ساتھ ادب کے لازمی رشتے کی وجہ سے ہر عہد کے، ہر ملک اور زبان کے ادب میں حقیقت کا اظہار لازمی طور پر ملتا ہے۔ ایسی ایک بھی ادبی تخلیق نہیں ہوسکتی جس میں حقیقت نگاری بالکل نہ ہو۔ ہر ادبی تخلیق میں کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی طور پر حقیقت کی عکاسی ضرور ہوتی ہے۔ دراصل بالکل غیر حقیقی ادب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ فن اور ادب کا کام ہی زندگی اور فطرت کی حقیقت کو فنی علامتوں کے ذریعہ پیش کرنا ہے لہذا ہر عہد اور ہر ملک کا ادب اپنے ہم عصر سماج کی حقیقتوں پر تھوڑی بہت روشنی تو ضرور ڈالتا ہے۔

حقیقت نگاری کے متعلق اکثر ایک بات کہی جاتی رہی ہے کہ ہر آدمی کی اپنی منفرد حقیقت نگاری ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ دراصل یہ خیال خود اپنے آپ میں بہت ذاتی سا ہے۔ معروضی حقیقت کو ہی حقیقت نگاری کا واحد پیمانہ مانا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ زمین چپٹی ہے یا سورج زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے تو یہ خیال نہایت ذاتی اور ساتھ ہی غلط ہوگا۔

جدید معنوں میں حقیقت نگاری ایک ادبی نظریے کے ساتھ ہی ایک فنی تخلیقی طریقہ کار بھی ہے۔ اس شکل میں حقیقت نگاری ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہے۔ حقیقت نگاری کا آغاز علوم

کی ترقی کے اس عہد میں ہوا جب لوگوں کے سامنے سماجی ارتقا کے تسلسل اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کی ضرورت تھی۔ جب انسان نے شعوری طور پر یہ سمجھنا شروع کیا کہ انسانی حرکات اور سماجی تبدیلیاں مافوق الفطری عناصر کی وجہ نہیں بلکہ معروضی وجوہات کے تحت ہوتی ہیں۔ فلاور نے لکھا ہے:

"اٹھارھویں صدی کے اس دور میں، جس میں نمایاں طور پر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مصنفین میں یہ خیال زور پکڑنے لگا ہے کہ ادب اخلاقی، سماجی اور یہاں تک کہ سیاسی مقاصد کو بھی پورا کرسکتا ہے۔ بیشتر صورتوں میں ادب اقتصادی اور سماجی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ تخلیقی ادب کا ایک حصہ ماریو MARIVAUX، پریو PREVOST اور رتیف دالابرتوں RETIF dala, BRETONNE اپنا مواد سماج کے پس ماندہ طبقوں میں تلاش کرتا ہے لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں انقلاب (فرانس) کے بعد ہی ممکن ہوسکا کہ عوام خصوصاً شاعروں اور ناول نگاروں کے لیے مواد کا ذریعہ بنتے۔ ہیوگو HUGO بالزاک BALZAC لامارٹین LAMARTINE جارج سانڈ GEORGE SAND اور یہاں تک کہ وینی VIGNY استیلو STELLO جیسے ناول میں اور دوسرے چھوٹے مصنفین نے ایسا ادب تخلیق کیا جس میں مزدور اور کسان اہل بنے۔" ۳۵

سماجی تجزیے یعنی انسان کا سماج کے مابین مطالعہ اور اس ادب میں عکاسی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے۔ حقیقت نگاری انسان کو اس کے سماجی ماحول سے، جس میں وہ زندہ اور حرکت پذیر رہتا ہے، علاحدہ کر کے نہیں دیکھتی۔ حقیقت نگاری کا مقصد سماجی رشتوں کی جدلیات کو ان کے اپنے تضادات کی روشنی میں سمجھنا اور ان کی عکاسی کرنا ہے۔ حقیقت نگاری روزمرہ کے مختلف واقعات اور حقائق کے پس پشت مختلف سماجی طاقتوں کے درمیان جاری رہنے والی کشمکش کی تصویر پیش کرتا ہے۔

حقیقت نگاری حقیقت کی مثالی TYPICAL عکاسی کرتی ہے۔ مارگریٹ ہارکنس MARGERETTE HARKNESS کو ۱۸۸۸ء میں لکھے گئے خط میں اینگلس نے لکھا ہے:

"میری رائے میں حقیقت نگاری سے مراد تفصیل کی سچائی کی، عام حالات میں عام کرداروں کی حقیقت سے پر تخلیق ہے۔" ۳۶

حقیقت نگار کے نزدیک کسی کردار یا فرد کی ذاتی خصوصیات کا کل اس کے گرد و پیش مختلف صورت حال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حقیقت نگار ادیب کسی کردار کی خوبیوں اور خامیوں کا اسی شکل میں مطالعہ کرتا ہے اور اس کی عکاسی کرتا ہے۔ حقیقت نگاری میں نمائندہ کردار کی عکاسی سے مراد یہ ہے کہ مصنف ماحول کی ان سبھی وجوہ اور نتیجہ خیز واقعات کو یکجا کر کے انھیں سانچے میں ڈھالتا ہے جنھوں نے کسی کردار کو جنم دیا ہے۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اشتراکی حقیقت نگاری منظر عام پر آئی۔ گورکی کا مشہور ناول "ماں" اشتراکی حقیقت نگاری کی پہلی اہم تصنیف مانی جاسکتی ہے۔ ڈیوڈ کریگ کے لفظوں میں:

"۱۹۱۰ء کے آس پاس گورکی، رابرٹ ٹریسل اپٹان سنکلیر اور دیگر مصنفین کی تخلیقات ایک نیا (ادبی) ادارہ یا روایت وجود میں لائیں جو کہ آج اشتراکی حقیقت نگاری کہی جائے گی۔" ۳۷

اشتراکی حقیقت نگاری، تنقیدی حقیقت نگاری کی ہی توسیع ہے اور بقول لکاچ اس کا مقصد اشتراکیت کے لیے "اندر" سے کام کرنے والی طاقتوں کا کام بیان کرنا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری دو نظاموں کے درمیان چلنے والی جدوجہد میں سرمایہ داری کے خلاف اشتراکیت کا عقلی ہتھیار ہے۔ تنقیدی حقیقت نگاری حقائق کا تجزیہ کرتی ہے لیکن اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان چلنے والی جدوجہد میں لازمی طور پر اشتراکیت کی طرف دار نہیں بنتی۔ جب کہ اشتراکی حقیقت نگاری ان لوگوں کا فن ہے جو یا تو سرمایہ داری سے نجات پا چکے ہیں یا اس کے لیے نتیجہ خیز لڑائی لڑ رہے ہیں۔

بریخت کے الفاظ میں ،

"اشتراکی حقیقت نگاری کی تصنیف مزدور طبقے کو ادب کا مرکز بناتی ہے اور (اس طبقے سے) خیر خواہی رکھنے والے عوام کو متاثر کرتی ہے۔" ۶

اشتراکی حقیقت نگاری میں کمٹ منٹ کا نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کے ساتھ اس کے مخالفین مسلسل ادب میں کمٹ منٹ کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ آج بھی یہ موضوع بحث کا عنوان بنا ہوا ہے کہ ادب میں کمٹ منٹ کا نظریہ جائز ہے، یا نہیں۔ ادب میں کمٹ منٹ کی حمایت میں لکھے گئے ایک مضمون میں میکس ادرے نے لکھا،

"ادب میں کمٹ منٹ کے جدید تصور کی عظیم ترین جدت پسندی یہ ہے کہ یہ خود ادب سے غیر منفک INSEPARABLE ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ محض اس فرسودہ قول کو نہیں دہراتا کہ فن میں خارجی حقیقت کے لیے جگہ ہونی چاہیے بلکہ تقریباً جارحانہ طور پر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ مصنف تب ہی عظیم ہو سکتا ہے جب وہ سماج (یا عہد میں مطالبہ کرنے والے عوام) کے سامنے خارجی حقیقت کے اصل کو پیش کرے۔ اس کے تضادات اور مسائل کو پیش کرے۔ مصنف کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اس ڈرامے کا محض تماشائی نہ بنا رہے جسے وہ پیش کر رہا ہے بلکہ خود ایک کردار بن جائے۔ مصنف سے جو توقع کی جاتی ہے وہ یہ کہ وہ ہوش مند کردار بنے۔" ۷

چنانچہ کمٹ منٹ ادب سے غیر منفک ہے۔ یہ ادب کو کسی خاص دائرے میں قید نہیں کر دیتا بلکہ صرف اتنا مطالبہ کرتا ہے کہ ایک باشعور مصنف سماج کی اکائی کی طرح اس کے تضادات اور مسائل کی عکاسی کرے۔

□□

حواشی:

1. v. Afnasyev; Marxist Philosophy (Progress Publishors, Moscow 1978) P. 17-18.
2. George Lukaes, The Meaning of Contemporary Realism. (Merlin, London-1979) P. 93.
3. J. E. FLOWER, Literature and the left in France, Mcmillian, London (1983) P. 4.
4. Marx Englis' on literature and Art, Progress Publishers, Moscow (1971) P. 107.
5. David Craig, Marxist on literature, An Anthology (Edited) Penguin, London (1975) P. 13.
6. Brecht or Theatre 'The Development of an Aesthelics, Translated and Notes by John willett : Mathueu & Co. London (1976) P. 269.
7. Max Adereth, what is literature Engagee, Marxist on literature, (Edited) P. 445.

غزل

جب سے مزاجِ گردشِ دوراں بدل گیا
اندازِ بادۂ خوشی، رنداں بدل گیا

کیوں حوصلوں پہ تنگ ہے دامانِ زندگی؟
کیوں کر خیالِ دشت و بیاباں بدل گیا

اب جسم و جاں پہ بار ہے کیوں جامۂ حیات
شاید وہ اضطرابِ رگِ جاں بدل گیا

زندانیٔ فریبِ مسلسل رہی حیات
اندازۂ جراحتِ پنہاں بدل گیا

ہم گو شہیدِ روحِ تغزل رہے مگر
ذوقِ لطیف و سازِ غزل خواں بدل گیا

تغیر کارخانۂ ہستی نہ ہو سکی
ذوقِ نگاہِ یار کا ساماں بدل گیا

سید علی رضا حسینی
۹۶/۲۳ کرنیل گنج، کان پور-۲۰۸۰۰۱

غزلیں

فکر کو اوجِ معانی سے نکھارا جائے
آسمانوں کو زمینوں پہ اُتارا جائے

ہم بھی رکھتے ہیں کفِ دست میں اپنے پتھر
کانچ کے گھر سے نہ پتھر ہمیں مارا جائے

کیا یہی آج کی تہذیبِ چمن ہے یارو
پھول پامال ہوں کانٹوں کو سنوارا جائے

آپ سب کو تو گھنے پیڑ کے سائے بخشیں
اور سورج مرے آنگن میں اتارا جائے

زندگی اب تو حوادث کے حوالے ہے علی
ساتھ لے جائے جہاں وقت کا دھارا جائے

ڈاکٹر علی احمد جلیلی
جلیل منزل، ۱/۴۳۳-۱-۲۲
سلطان پورہ
حیدرآباد
۵۰۰۰۲۴

سر پر اک سائبان رکھتے ہیں
ایک ٹوٹا مکان رکھتے ہیں
پاؤں جس کے زمیں پہ رہتے ہیں
بس وہی آسمان رکھتے ہیں
زخم کھانے کا حوصلہ دیکھو
دوستوں کا جہان رکھتے ہیں
مہر و الفت وفا کے شیدا ہیں
اہلِ دل کیسی شان رکھتے ہیں
کیا غزل ہے طفیل صاحب کی؟
شعر اس کے زبان رکھتے ہیں

طفیل انصاری
۹۰۔ مفتی محلہ
جون پور ۲۲۲۰۰۱

□

زندگی کو تباہ مت کرنا
کوئی ایسا گناہ مت کرنا
جو بھی کہنا ہو آج کہہ دینا
وعدۂ سال و ماہ مت کرنا
کر چکے جس گناہ سے توبہ
اس کی جانب نگاہ مت کرنا
جو رہِ حق سے تم کو بھٹکا دے
اس سے تم رسم و راہ مت کرنا
جس سے ٹوٹے عروج دل کوئی
بھول کر وہ گناہ مت کرنا

عروج جھانسوی
پھول باغ، پچھیا پورہ
جھانسی
۲۸۴۰۰۲

دوہے

کیسا ہوں پردیس میں، کیا لکھوں حالات
بیڑی سگرٹ پھونکنا، جگنا ساری رات

چاروں طرف طوفان ہے، نیا بے پتوار
ہم سے پوچھو دوستو، کیا ہوتا ہے پیار

جیون ہی بن واس ہے، دیکھو میرا حال
تم نے تو بس رام جی، کاٹے چودہ سال

ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے، انساں نظر نہ آئیں
ویسے تو آبادیاں، نس دن بڑھتی جائیں

دھیرے دھیرے کھل گیا، اپنوں کا بہروپ
گٹھری باندھی، چل پڑے، چھاؤں ملے یا دھوپ

پرویز اختر
قاضی سرائے
چاند پور
۲۴۶۷۲۵

آر۔ کے۔ شکل

ہندستانی تہذیب کے فروغ میں مغلیہ عہد کا تعاون

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستان میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہندستانی تہذیب کو زبردست نقصان پہنچا، لیکن تاریخی پس منظر پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے برسر اقتدار آنے اور خاص طور سے مغلیہ سلطنت کے دوران ہندستانی تہذیب نے جو ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے مغلیہ عہد میں ادب، آرٹ، فلسفہ، فن تعمیر وغیرہ کو جو فروغ حاصل ہوا، اسی بنیاد پر اس ملک کی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کہلائی اور یہاں کی دیگر تہذیبوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی شناخت کو لافانی بنائے رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ یوں تو یونانی، رومی، فرانسیسی، پرتگالی اور انگریز بھی اس ملک میں آئے اور کچھ عرصہ کے لیے انھوں نے حکومت بھی کی لیکن ان کے اقتدار کے زوال کے بعد ہندستانی تہذیب کے کسی بھی حصے پر ان کی چھاپ باقی نہ رہی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ہندستانی تہذیب کو نہ تو متاثر ہی کر سکے اور نہ ہی اپنی چھاپ چھوڑ سکے۔

مغل بادشاہوں نے ہندستانی تہذیب کے مختلف شعبوں میں جو دلچسپی دکھائی اس کو بام عروج تک پہونچانے میں جو تعاون کیا وہ ہندو راجاؤں کے عہد حکومت میں بھی ممکن نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ بھگتی شاعری کے عظیم ترین شاعر تلسی داس کی لافانی تخلیق ؛ "رام چرت مانس"، پر بھی اس عہد کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ان شہنشاہوں کے طرز زندگی اور افتاد طبع میں علم و فن اور ادب و موسیقی کے تئیں گہری دلچسپی کا سبب ایک طرف اگر ہندستانی طرز فکر تھا تو دوسری طرف تصوف اور اسلامی فلسفہ تھا۔

یہ عناصر اس عہد کے ہندستان کی معاشرت میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ یہاں کی تہذیب کا جزو لاینفک بن گئے۔

دنیا کے متعدد ممالک کی قدیم تہذیب اب تک ختم ہو چکی ہے لیکن ہندستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی تہذیب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہی اس تہذیب کو کوئی نقصان ہی پہونچا ہے۔

ہر ذی روح کے لیے محبت اور عدم تشدد کے جذبات جو گوتم بدھ اور مہاویر جیسے سنتوں نے پیدا کیے تھے، آج بھی زندہ و تابندہ ہیں۔ غیر ملکی حکمرانوں کے ہندستان میں تخت نشین ہونے کے باوجود یہاں کی تہذیب پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ مغل حکمرانوں نے تو یہاں کی تہذیب کو اور تقویت بخشی اور اسے برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندستانی تہذیب میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کی بھگتی تحریک کے زیر اثر مسلم سماج میں قوالی کا رواج ہوا۔ قوالی کی تکنیک اور جذبہ ایک حد تک شمالی ہند کی کلاسیکی موسیقی سے ملتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ایک نئی طرز موسیقی کا آغاز ہوا۔

اکبر کے دربار میں موسیقاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہتی تھی۔ تان سین ایک ایسے موسیقار تھے جو اکبر کے دربار سے بطور خاص وابستہ تھے۔ انھیں ہندستانی موسیقی کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا ہے گوالیار میں ان کی قبر آج بھی موجود ہے۔ عہد حاضر کے موسیقار ان کی قبر کو اپنی زیارت گاہ سمجھتے ہیں۔ تان سین کی گائی ہوئی راگ راگنیاں آج تک ہندستان بھر میں رائج ہیں۔ شاہجہاں کے عہد حکومت کے دوران بھی فن موسیقی نے جو عروج پایا وہ ناقابل فراموش ہے۔

ہندی زبان کا ادب بنیادی طور پر مذہب سے متاثر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغلیہ حکومت کے قیام کے بعد ہندستان میں جو امن و انتظام کی فضا قائم ہوئی تھی وہ اپنے آپ میں ایک مثال تھی۔ اس کا فائدہ ہندی کے شعری ادب کو ملا اور اس پس منظر میں ہندی شاعری کے فروغ میں مختلف شعرا نے اپنا بھرپور تعاون دیا۔ مغلیہ عہد کے کچھ شعرا جن کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، وہ ہیں ہری داس رسکھان، شری بھٹ، پرمانند داس وغیرہ۔ ان میں رسکھان کو خصوصی حیثیت حاصل ہوئی۔ کیونکہ رسکھان مسلم سماج کا حصہ ہوتے ہوئے بھی کرشن کے معتقد تھے۔ مسلمانوں پر ہندوؤں کی بھگتی تحریک کا اثر پڑا۔ رسکھان اس کی بہترین مثال ہیں۔

مغلیہ عہد میں مذہبی بیداری کے ساتھ ادب کی ترقی کی رفتار میں اور تیزی آئی۔ اس کے ساتھ فن تعمیر کے میدان میں بھی خاصی ترقی ہوئی اور قدیم ہندستانی طرز اور مسلم طرز کے امتزاج سے عالی شان عمارتوں اور عظیم محلوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ بغور دیکھا جائے تو فنِ تعمیر کی ترقی میں اکبر کے عہد میں خاصی تیزی آئی۔ مغل شہنشاہوں میں شاہ جہاں بھی فن تعمیر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس کے بنوائے ہوئے محل، قلعے، باغات مساجد وغیرہ کشمیر، لاہور، اجمیر، آگرہ اور دہلی وغیرہ میں آج بھی موجود ہیں۔ مغل عمارتوں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں قدیم ہندستانی فنِ تعمیر کے تقریباً سبھی اجزا و علامات کا امتزاج ہو گیا تھا۔ فنِ تعمیر کی دنیا کو اکبر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے فنون کے امتزاج سے ایک نیا رُخ عطا کیا۔ بعد میں اس طرز کو ہندستانی قومی طرز کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ہندو مذہب اور اسلام کے قریب آنے سے مغل عہد حکومت میں ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا جسے نہ تو ہندو تہذیب کا نام دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مسلم تہذیب کا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبوں کے آپسی تال میل اور قربت کی ہی دین تھی یہ نئی تہذیب۔ ہندستان میں مستقل طور سے بس جانے والے مسلم فرقے کے لوگ اب غیر ملکی نہیں رہ گئے تھے۔ ہندستان کے باشندوں کے لیے وہ بھی ہندستانی ہو گئے تھے ان کے مذہب پر بھی ہندستانی تہذیب کی چھاپ واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔

بغور دیکھا جائے تو ہندستانی زبان پر بھی مغلیہ عہد کی واضح چھاپ نظر آئے گی جس کا ثبوت ہندو تہذیب کی عکاس اور عظیم تصنیف "راماین" سے ملتا ہے۔ عظیم شاعر تلسی داس نے "رام چرت مانس" میں عربی اور فارسی الفاظ کا امتزاج کر کے یہ ثابت کر دیا کہ مغلیہ عہد کے شعرا میں زبان کے معاملے میں کوئی تعصب نہیں تھا۔ اس عظیم تصنیف میں غنی، غریب، لائق، باغ، صاحب وغیرہ کے الفاظ کے استعمال سے (جو عربی، فارسی کے الفاظ ہیں) صاف ظاہر ہے کہ اس عہد میں زبان کا کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ مذہبی معاملات میں شہنشاہ اکبر نے ہمیشہ رواداری کا ثبوت دیا۔ ان کے بعد جہانگیر اور شاہجہاں بھی ان کے نقشِ قدم پہ چلے۔ مغل بادشاہوں نے ہندو گھرانوں میں اپنے ازدواجی رشتے قائم کر کے قومی یک جہتی کی ایک عمدہ مثال پیش کی ہے۔ ہندو گھرانوں میں شادیوں کے باوجود انھوں نے اپنی ہندو رانیوں کے مذہبی عقائد کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو رسم و رواج کا اثر ان بادشاہوں پر بھی پڑا اور آہستہ آہستہ دونوں فرقوں کے افراد ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور یہ قربت گزشتہ سارے حدود کو پار کر گئی۔

قومی یک جہتی کی جڑیں مغل حکومت کے قیام کے بعد مضبوط تر ہوتی گئیں۔ خاص طور سے مغل شہنشاہ اکبر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہندستانی تہذیب کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اکبر نے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو اعلا عہدوں پر فائز کیا۔ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس نے ہندوؤں کے تئیں رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ مغل حکومت میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو بھی خاصی اہمیت دی گئی جس کی مثال راماین اور مہابھارت ہیں، جن کے فارسی ترجمے کرائے گئے۔ ہندی شاعری کے لحاظ سے مغلیہ عہد کو سنہری دور تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندی ادب کے فروغ میں عبدالرحیم خانخاناں کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ فارسی زبان کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ خانخاناں سنسکرت زبان کے بھی زبردست عالم تھے مغلیہ دورِ حکومت میں ہی اُردو زبان وجود میں آئی جسے ہندو اور مسلمان

دونوں ہی بآسانی سمجھنے لگے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی تعلقات میں استحکام لانے میں اُردو زبان نے بھی اہم رول ادا کیا۔ مختصر یہ کہ ہندو حضرات بھی مسلم تہذیب سے متاثر ہو کر اسے اپنانے لگے تھے، کائستھوں، کھتریوں اور کشمیری برہمنوں نے روزمرّہ کی زندگی میں بھی مسلمانوں کے طرزِ زندگی کو اپنا لیا تھا اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔ ہندوؤں کے شادی بیاہ میں بھی سہرا اور جامہ وغیرہ کا استعمال ہونے لگا تھا۔ ہندستانی لباس میں پائجامہ، شیروانی داخل ہوئی اور ہندستانیوں نے اسے بخوشی قبول کرلیا۔

غرض کہ اس عہد میں ہندی زبان کے فروغ، ہندو مسلم اتحادؔ فنِ تعمیر، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

□□

فریج جو ....

ص ۳۳ کا بقیہ

پُورے نظام کی حقیقت کیا ہے۔"

نرس نے مجھ سے کہا "اب مریض کے پاس سے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔"

میں نے فریج جو کا ہاتھ پکڑ کر الوداع کہی ــ اور اس سے دریافت کیا کہ آیا میں اس کے لیے کچھ کرسکتا ہوں۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔" اس نے کہا۔ "میں صرف مرنا چاہتا ہوں۔" اس کی چمکدار کالی آنکھیں روشن ہوگئیں۔

"میں تمھارا شکر گزار ہوں گا اگر تم مجھے سگریٹ کا ایک پیکٹ دے سکو۔"

□□

رشتوں کی مُروّت ......

ص ۲۹ کا بقیہ

سوچا تھا، اس کے بعد میں کیم سے کس قدر بہتر ہوں۔ میں نے ٹھان لی ہے کہ اپنے کو بدلنے کی پھر کوشش کروں گی۔ ایک دن ماں کے یہاں جاتے وقت بازار سے کیک لیتی گئی۔ سب کی طرح کیم بھی اب یہ چیزیں شوق سے کھاتا ہے۔ گرمیوں میں انھیں باہر کھلے میں بیٹھنا پسند ہے۔ احاطے سے آتی ان کی بات چیت کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ ماں کسی نووارد سے کہہ رہی تھیں:

"ارے ہاں، میری اس دُنیا کو چھوڑ جانے میں کوئی کسر نہیں بچی تھی جب کیم، یہاں بیٹھا یہ پاجی کیم اپنی ہپی منڈلی کے ساتھ اسپتال آپہونچا اور سب میرے کمرے کے باہر ناچنے لگے ....."

کیم زور دے کر بولا۔ "یا اللہ! بھلی عورت، ہپی نہیں ایک قدیم مذہبی مسلک کے مقلّد۔" مگر واضح تھا کہ اپنے پرانے مسلک کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

مجھے عجیب سا لگا۔ جیسے میں شعلوں پر چلتی ساتھ ہی منتر پڑھ رہی ہوں کہ میرے پاؤں نہ جلیں۔

خاندانوں میں مروّت کہاں شروع اور کہاں ختم ــ یہ میرے لیے راز ہی ہے۔

□□

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ممتاز صحافی اور لکھنؤ کی بیشتر ادبی اور سماجی تنظیموں کے رُوحِ رواں سلیم عمر مختصر سی علالت کے بعد داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ ایک ہر دلعزیز، وسیع النظر، روشن خیال اور سب کے وقت پر کام آنے والے انسان تھے۔ مرحوم ہاشم رضا عابدی الہ آبادی (ایم پی) کے قریب ترین معتمد، دست راست اور "قومی جنگ" رامپور کے عرصے تک اہم ستون رہے۔ اِدھر کچھ عرصہ قبل روزنامہ "قومی آواز" سے منسلک ہو گئے تھے مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ پُورے لکھنؤ سے منسلک تھے۔ انھوں نے زندگی کی صرف ۴۸ بہاریں دیکھی تھیں۔ وہ اُردو کے ممتاز شاعر اور مجاہدِ آزادی اسلم لکھنوی کے بیٹے تھے۔ ان کی جواں مرگی ان کے احباب کے لیے انتہائی روح فرسا ہے پروردگارِ عالم ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

ایڈیٹر

غزلیں

موج بلا طوفاں ساحل سے ٹکرائی نہیں
اک قیامت آنے والی تھی مگر آئی نہیں
فن سے نسبت اور لفظوں سے شناسائی نہیں
آج کا فن کار دیوانہ ہے سودائی نہیں
پتھروں سے میں نے سیکھی صنعتِ شیشہ گری
یہ ہنرمندی کہیں خیرات میں پائی نہیں
چاند بھی نکلا اُدھر جس سمت روشن تھے چراغ
تھی جہاں ظلمت وہاں تک روشنی آئی نہیں
جس طرف چاہے نکل جا جوشِ وحشت میں نسیم
وسعتِ صحرا حریفِ آبلہ پائی نہیں

نسیم اختر
صاحب گنج، لکھنؤ

نسیم صبح سے کہہ دو نہ سر اُٹھا کے چلے
چمن میں رازِ ثباتِ بہار پا کے چلے
یہ ان کی کم نگہی، یہ حجاب کا عالم
کبھی جو سامنے آئے تو منھ چھپا کے چلے
رہِ طلب میں تھیں دشواریاں بہت لیکن
چبھے جو خار تو ہم اور دل بڑھا کے چلے
اُٹھا جو مضطرِ غمگیں میں اُن کی محفل سے
تو میرے ساتھ کئی قافلے بلا کے چلے
جنابِ احسن و تنویر و خرم اے مضطر
یہ پھول وہ ہیں جنھیں آرزو کھلا کے چلے

مضطر تاجپوری
تاج پور ڈیہمہ۔ غازی پور

میں قید ہو کے بسر زندگی کروں کیسے
حصارِ زیست سے باہر قدم رکھوں کیسے
مجھے تو نقشِ قدم پر کسی کے چلنا ہے
میں اپنی منزلِ معراج پر رکوں کیسے
مجھے حیات کا اپنی ثبوت دینا ہے
سناں پہ سر بھی اگر ہو تو چپ رہوں کیسے
یہ مانا تو رگِ جاں سے قریب تر ہے مگر
نظر نہ آئے تو دل کو ملے سکوں کیسے
کسی کے عشق میں چاہے زبان کٹ جائے
میں خوفِ دار سے سجاد چپ رہوں کیسے

سجاد لکھنوی
۱۴۴/۱۶۸، گولہ گنج
لکھنؤ

کشتی کو ابھی اپنی جلانا بھی نہیں ہے
لیکن ہمیں گھر لوٹ کے جانا بھی نہیں ہے
مدت سے مرے شہر کا موسم نہیں بدلا
کس وقت بدل جائے ٹھکانا بھی نہیں ہے
کیوں خوش ہے کھجوروں کے درختوں کو گرا کر
پیپل کا تجھے پیڑ لگانا بھی نہیں ہے
تنہائی ہے سچ بولنے والے کا مقدر
اک تم ہی نہیں ساتھ زمانہ بھی نہیں ہے
وہ سوچ رہا ہے کہ مری زد پہ ہے مخمور
حالاں کہ مری سمت نشانہ بھی نہیں ہے

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
معرفت تقی پبلک لائبریری
کاکوری، لکھنؤ

صبر والے قرار والے ہیں
ہم الگ کاروبار والے ہیں
اپنا چہرہ نظر نہیں آتا
آئینے سب غبار والے ہیں
گل کھلائے ہیں وقت نے کیسے
پھول رکھتے تھے، خار والے ہیں
کج کلاہی سنبھالتے کیسے
پیرہن تار تار والے ہیں
ریت جیسی ہے شخصیت ان کی
گفتگو سے بہار والے ہیں

اختر عزیز
"احمد منزل"
۱۲۷۔ رونڈی پور
الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "فصلِ آگہی" (شعری مجموعہ)
شاعر: سلیم انصاری   قیمت: /۵۰ روپئے
ملنے کا پتہ: روشن درسی کتب خانہ، ۵۵۱ موتی نالہ جبلپور (ایم پی)

"فصلِ آگہی" سلیم انصاری کا پہلا مجموعۂ کلام ہونے کے باوجود انتخاب ہے اور اسی لیے قاری کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہے۔

اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں اور ان دونوں اصنافِ سخن میں سلیم انصاری نے اپنے افکار و تصورات کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے اس سے نہ صرف ان کی سلامتیِ طبع ظاہر ہوتی ہے بلکہ اظہار کے پیچ و خم سے ان کی واقفیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ان کی غزلوں پر جدید رنگ غالب ہے جس میں تجربے کی آنچ اور شاہدے کا پرتو بہت نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عطا عابدی نے ان کی غزلوں کا سخت انتخاب کیا ہے جس کے نتیجے میں زیادہ تر غزلیں محض تین چار اور پانچ شعروں پر مشتمل ہیں لیکن اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان کی غزلیں رطب و یابس سے بڑی حد تک پاک ہو گئی ہیں اور ان کی امیج ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت سے ابھری ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

مرے بدن پہ لبوں کے نشان رکھ دینا
نئی زمیں پہ نیا آسمان رکھ دینا

سلیم انصاری کی نظموں کے موضوعات تقریباً وہی ہیں جو ان کی غزلوں میں بکھرے پڑے ہیں مگر نظموں میں اختصار اور رمزیت کے بجائے ارتکاز اور تفصیل ہے کہ یہ نظم نگاری کا فنی تقاضہ بھی ہے

سفر لاسمتیت، انحرافِ سفر، روشنائی کا کرب اور دعا کا شمار ان کی اچھی نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر خالد محمود کی تقریظ کے علاوہ عشرت ظفر اور ڈاکٹر محمود شیخ کے تفصیلی دیباچے بھی شامل ہیں جن میں شاعر کے فکر و فن کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: "رشکِ فارسی" (شعری مجموعہ)
شاعر: شجاع خاور   قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۸۔۳۱ کوچہ پنڈت لال کنواں۔ دہلی ۶

شجاع خاور کا یہ مجموعہ "رشکِ فارسی" جو ان کی غزلیات پر مبنی ہے، نہایت خوبصورت ہے، سادگی اور پُرکاری اس کی خصوصیت اور مزاج کی بے باکی ودرّاکی ایک ایک شعر سے نمایاں ہے۔

شجاع صاحب بے جا لفظیات کے قائل نہیں، بات کو سیدھے سادے انداز میں کہہ ڈالنا ان کی خصوصیت ہے۔ عروض اور بحر سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد بھی عروضیے ہونا ان کو بالکل پسند نہیں۔ دیکھیے اپنے بارے میں وہ خود کیا کہتے ہیں:

"بعض مدبرین مجھے کچھ مخصوص لفظیات کے استعمال سے پرہیز کی تلقین کرتے ہیں گویا کچھ دیگر لفظیات کے استعمال کی تلقین کرتے ہیں مگر ان مہربانوں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ قابلِ استعمال اور ناقابلِ استعمال ہر دو قسم کی لفظیات کی دو جامع فہرستیں تیار کر کے بھجوا دیں یا حکومت سے کہہ کر شائع کرا دیں تاکہ میں نقل کر لوں اور دیگر شریف الطبع و فرمانبردار شعراء کی طرح انھیں دو فہرستوں کے مطابق شعر کہتا رہوں جس سے ادب میں امن قائم رہے اور میری شرپسند لفظیات کے فتنے سر نہ اٹھایا کریں۔" ؎

ہم جاہلوں کی بات تو ہے جاہلوں کی بات
ان عالموں کو بھی تو میاں کچھ نہیں پتہ

اسی طرح بیشتر اشعار ہیں جنھیں پڑھ کر رُوح بشاش ہوجاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ کتاب اچھی طرح پڑھ لی جائے اور یہ خوبی کچھ کم نہیں میرا خیال ہے کہ یہ کتاب جو واقعی رشکِ فارسی ہے، قبولِ عام حاصل کرے گی اور ذہن و دل پر بہترین نقش چھوڑے گی۔ اسلیے چاہیے کہ خرید کر پڑھی جائے۔

——— فاطمہ وصیّہ جائسی

نام کتاب: "بُوند بُوند برسات"
شاعر: سلیمان آصف　　قیمت: ۱۰۰/- روپیے
ملنے کا پتہ: فلاحی بُک ڈپو، پیلی کوٹھی
وارانسی

"بوند بوند برسات" جناب سلیمان آصف کا اُردو دوہوں کا مجموعہ ہے۔ دوہوں کی ہندی ادب میں اپنی ایک اہمیت ہے۔ ان میں سماجی، اصلاحی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے اُردو میں دوہے کی روایت ہندی ادب سے ہی آئی ہے۔

سلیمان آصف کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے دوہے کی تکنیک، ساخت اور اصولوں کا پورا خیال رکھا ہے جس سے ان کی فنی گیرائی اور عمیق قوتِ مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے تجربات، نظریات اور احساسات کو دوہے کے قالب میں ڈھالا ہے ؎

کیا منزل کیا فاصلہ کیا پیچیدہ راہ
ذوق سلامت ہے اگر گرد ہیں مہر و ماہ

امید ہے کہ سلیمان آصف کا یہ مجموعہ اُردو میں دوہے کی روایت کو آگے بڑھانے کا وسیلہ بنے گا۔

——— شکیل اشرف

نام کتاب: "ٹیچر کے بغیر" (بچوں کے ڈرامے)
مصنف: محمد خالد عابدی　　قیمت: ۲۰/- رُوپیے
ملنے کا پتہ: مکتبہ عابدیہ، دل آرام ہاؤس۔ ہوا محل روڈ
بھوپال (ایم پی)

"ٹیچر کے بغیر" محمد خالد عابدی کے چھ مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں ایک ریڈیو ڈرامہ، ایک ہندی ڈرامہ بخط اُردو اور چار دیگر ڈرامے شامل ہیں، بنیادی طور پر یہ سب ڈرامے بچوں کے لیے لکھے گئے ہیں اُردو میں بچوں کے لیے ڈرامے کم ہی لکھے گئے ہیں۔ خالد عابدی نے اس جانب توجہ کر کے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ وہ ریڈیو سے منسلک ہیں اس لیے ان کے ان مختصر ڈراموں میں ریڈیو کی تمام خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات اور ان کی ضرورتوں کو سمجھ کر انھیں کے لہجہ اور زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں لگتا ہے کہ ڈرامے مقصدی مکالمے بن کر رہ گئے ہیں۔

"ٹیچر کے بغیر" ان کا ایک اچھا اور مقصدی ڈرامہ ہے جو آج کے ان اساتذہ پر خوبصورت طنز ہے جنھوں نے تعلیم کے مقدس پیشے کو ڈاکٹروں اور انجینیروں کی طرح پیسہ کمانے کا ذریعہ بنالیا ہے مختصر یہ کہ خالد عابدی کے یہ ڈرامے اپنے مقصد میں کامیاب ہیں مگر واضح مقصدیت کبھی کبھی ڈراموں کی روح کو مجروح کر دیتی ہے اگر خالد عابدی ایسے ڈرامے لکھیں جنھیں چھوٹے بچے خود اسٹیج کر سکیں تو یہ اُردو کی بڑی خدمت ہوگی۔

"ٹیچر کے بغیر" ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ زبان بہت سادہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ مختصر ڈرامے بچوں میں بہت مقبول ہوں گے۔

——— تسکین زیدی

نام کتاب: "داداجان نے کہا تھا"
مصنف: روشن تقی　　(ڈراموں کا مجموعہ)
ملنے کا پتہ: نسیم بُک ڈپو، لاٹوش روڈ
لکھنؤ

"داداجان نے کہا تھا" آٹھ منظروں، چھ کرداروں پر مشتمل دو بابی طربیہ ڈرامہ ہے اس میں مرکزی کردار چھکن کا ہے۔ ضمنی کردار حنا، سحر، سیٹھ و تبریز وغیرہ کے ہیں۔ مصنف نے ضمنی کرداروں کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے۔ چھکن، ان کی زوجہ سحر اور

لڑکے تبریز کی باتیں، ان سب کی نوک جھونک نیز مکالمے اس تحریری زاویے سے زیب قرطاس ہیں کہ روایات کی پاسداری برقرار ہے۔ طربیہ ڈرامہ ہونے کی وجہ سے اس میں لطائف و چٹکلے بھی ہیں تاکہ قاری کے ہونٹوں پر شائستہ تبسّم کی ایک جھلک دیکھی جاسکے۔ ڈرامے کا کلیدی جملہ "دادا جان نے کہا تھا" کئی بار دہرایا گیا ہے۔ دراصل تخلیق کار نے اسے آلہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس ڈرامے میں نئے پُرانے اصولوں کی کش مکش، نسلوں کے درمیان نظریاتی اختلافات وغیرہ کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

"بے زبان بیوی" بھی طربیہ ڈرامہ ہے، یہ دو ایکٹ اور دس کرداروں پر مبنی ہے۔ اہم کردار قاضی شہر کا ہے۔ اس ڈرامہ میں زبان پر گرفت زیادہ مضبوط نظر نہیں آتی لیکن مکالموں میں صوتی ہم آہنگی ہے جس سے ایک خاص لطف پیدا ہوگیا ہے۔

روشن تقی کی نظر باریک بیں، مشاہدہ و مطالعہ عمیق ہے اور قلم میں خود اعتمادی پائی جاتی ہے۔ ان کے کردار خالص ہندستانی ہیں۔ بیشتر خطّۂ اودھ سے متعلق ہیں۔ روشن تقی نے لطائف بیان کرتے وقت یہ احتیاط برتی ہے کہ زبان و بیان میں ابتذال نہ آنے پائے یہی ان کی طرزِ تحریر کا امتیاز ہے۔ ان کے یہاں مکالموں میں برجستگی و حاضر جوابی تو ہے لیکن عبارت میں کوئی خاص تہ داری نہیں ہے۔

عابد نظر ——————

نام کتاب: **"سرمایۂ تحسین"** (مرثیہ)
شاعر: بہار حسین آبادی قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: بہار فاؤنڈیشن۔ عظیم آباد پٹنہ

'سرمایۂ تحسین' بہار حسین آبادی کی ان تخلیقات میں سے ایک ہے جسے انھوں نے عام روش سے ہٹ کر جوش ملیح آبادی کی تراشی ہوئی راہ پر چل کر تخلیق کیا ہے۔ جوش کے مسدس موجد و فکر' کی ترتیب کے آئینہ میں 'سرمایۂ تحسین' کے تمہیدی بند انسانی کشمکش اور ذہنی اضطراب پر مشتمل ہیں۔ جستجوئے حق کی جدوجہد اس میں قدم بہ قدم منزل کی جانب قاری کے ذہن کو قریب تر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انداز بیان کی گرمی اور اس کے اثرات کی وسعت شاعر کی قادرالکلامی کا بہترین نمونہ ہے۔

شاعر کی ابتدائی جستجو کا ماحصل اسلام ہے جسے گریز کی منزلوں سے دبے پاؤں گزر کر انھوں نے قاری کے ذہن کو ان بندگانِ خدا کی جانب موڑ دیا ہے جو حق و باطل کی نمایاں تفریق میں سنگ میل ثابت ہوئے ہیں اس میں شاعر نے تخلیق کے فطری بہاؤ کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اور نفس موزوں کے درمیان خلا کا احساس نہیں ہونے دیا ہے، اس میں موضوعاتی تسلسل اور تخیلات کی روانی کا حسین تناسب دکھائی دیتا ہے۔

عام مرثیوں کی طرح سرمایۂ تحسین میں بھی مصائب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن شاعر کے جدید فکری میلان نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ شہدائے کربلا کی قربانیاں صرف رونے رلانے کے لیے نہیں بلکہ انسان کی کردار سازی اور معرفت زندگی نیز سرمدِ عقبیٰ کا بہترین ذریعہ ہیں۔

طباعت اور کتابت کے اعتبار سے بھی کتاب خوبصورت ہے

—————— ماہناز فاطمہ

نام کتاب: **کلیاتِ بیتاب** (شعری مجموعہ)
شاعر: بیتاب بدایونی - مُرتّب: آفتاب بدایونی
قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: دفتر ہماری آواز، شکیل روڈ، بدایوں

"کلیاتِ بیتاب" محمد احمد بیتاب بدایونی مرحوم کا نظموں غزلوں متعدد حمد و نعت اور منقبت پر مشتمل ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے شاعر کی فنکارانہ صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کا بیشتر کلام سرورِ کائناتؐ کی مدح میں ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ؎

نگاہِ لطف ادھر بھی ہو اب خدا کے لیے
کھڑے ہیں دیر سے ہم عرضِ مدعا کے لیے

سبے بہا بیتاب لکھی وصفِ سرورؐ میں غزل
فضل سے اُستاد کے تو بھی سخنور ہو گیا

یہ اعتراف حق بجانب ہوگا کو شاعر کے نعتیہ کلام میں جو ندرت و انفرادیت ملتی ہے وہ کہیں اور کم ہی نظر آتی ہے۔ سادہ اور سلیس الفاظ کے استعمال سے کلام میں نیا رنگ و آہنگ پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔

کتابت اور طباعت اچھی اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

——— فصیح ماہلی

نام کتاب: **مجنوں کی واپسی**
مصنف: منظر مہدی فیض آبادی قیمت/۶۰ روپے
ملنے کا پتہ: نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

زیرِ نظر کتاب "مجنوں کی واپسی" جیسا کہ کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے، منظر مہدی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ منظر مہدی نے طنز و مزاح لکھنے والوں میں تیزی سے اُبھرنے والا نام ہے۔

یہ کتاب ان کی پہلی کاوش ہے۔ ان کا طرزِ تحریر دل چسپ ہے اس کتاب کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قاری اس کا کوئی بھی مضمون پڑھنا شروع کرے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کو ختم کیے بغیر چھوڑ دے۔ قاری کی دل چسپی اس میں شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے۔ مزاح نگار کی تحریر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو خوش کرے اور مزاح کی آڑ میں معاشرے کی خامیوں اور بدعنوانیوں سے ان کو روشناس کرائے۔ جس طرح صحت مند جسم کیلئے غذا ضروری ہے اسی طرح ہنسنا روح کی خوراک ہے۔

کتاب کے کچھ مضامین بے حد دل چسپ ہیں جیسے: "مجنوں کی واپسی"، "دم ڈلی"، "بویا گیہوں کاٹی شیر ہالیں" وغیرہ۔

کتابت اور طباعت معقول ہے۔ قیمت آج کے دور کے لحاظ سے مناسب ہے۔

——— سلمیٰ رضوی

نام کتاب: "قطرہ قطرہ"
مصنف: ڈاکٹر شرف الدین ساحل۔ قیمت/۵۰ روپے
ملنے کا پتہ: رحیم اسٹورس، حیدری روڈ۔ مومن پورہ ناگ پور

"قطرہ قطرہ" ڈاکٹر شرف الدین ساحل کے مقالات اور اداریوں کا مجموعہ ہے۔ ساحل صاحب کا نام اُردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے وہ ایک شاعر، ادیب، صحافی اور نقاد کی حیثیت سے اُردو داں حلقے میں اپنی پہچان و مقام بنا چکے ہیں۔ ساحل صاحب ان لوگوں میں ہیں جو ادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

"قطرہ قطرہ" ساحل صاحب کی ۱۲ویں کتاب ہے۔ اس سے پہلے شعر و شاعری، تنقید و تحقیق وغیرہ پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے متعدد مقالات کو جو انھوں نے مختلف موقعوں پر پڑھے، شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ناگ پور سے شائع ہونے والے اخبار "نیا اُردو سماچار" میں انھوں نے وقتاً فوقتاً جو اداریے لکھے تھے ان کو بھی اس مجموعے میں شامل کیا ہے، اس طرح یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے پہلا حصّہ مضامین کا ہے، دوسرے حصّہ میں اداریے۔

"قطرہ قطرہ" کو پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ قوم و معاشرہ کے سلسلے میں کافی فکرمند رہتے ہیں۔ آپ نے موقع موقع سے اپنے قلم کا استعمال ان کی اصلاح کے لیے کیا ہے اور اپنے مضامین میں معاشرہ اور قوم کے بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

ساحل صاحب کا طرزِ تحریر کافی دل چسپ ہے اور زبان صاف ستھری اور سلیس ہے تاکہ قاری کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں قاری کی دل چسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

——— جمیل عسکری

اودھ آئینۂ ایّام میں

چند تاثرات

برادرم! سلام خلوص

"اودھ آئینۂ ایّام میں" کی ایک جلد موصول ہوئی۔ اس گراں قدر تحفہ کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ 'اودھ نمبر' کے تینوں شمارے کے منتخب مضامین یکجا کر دیئے۔ یہ کتاب ہمیشہ میرے بک شیلف کی زینت رہے گی اور میں برابر اس سے استفادہ کرتا رہوں گا۔

—— مظہر امام۔ دہلی

عزیز محترم سید امجد حسین صاحب

آپ کی مرتبہ کتاب "اودھ آئینۂ ایّام میں" ملی، بہت ہی جی خوش ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے آپ اور پروفیسر گیان چند دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اودھ سے متعلق ایک مفید کتاب وجود میں آئی ہے، جو برسوں پڑھی جائے گی اور یاد رکھی جائے گی۔

خدا کرے نیا دور کے اہم نمبروں کے ساتھ اس طرح کی یادگار کتابوں کا سلسلہ بھی آپ کے ہاتھوں جاری رہے۔ یہی میری دعا ہے۔

—— عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال

مکرّمی امجد صاحب

آپ کی مرتبہ کتاب "اودھ آئینۂ ایّام میں" ملی۔ بے حد شکریہ! اودھ کے بارے میں یہ کتاب دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اودھ کی علمی اور تہذیبی زندگی کے مختلف پہلو بہترین انداز میں سمٹ آئے ہیں۔ اودھ کی ادبی خدمات کا جائزہ بڑی وسعت اور گہرائی سے لینے کی ضرورت ہے۔ نیا دور کے ذریعہ آپ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ ہر سال نیا دور کا سالنامہ یا خاص نمبر مختلف عنوانات سے اگر آپ مرتب کریں تو یہ بھی بہت ہی مفید کام ثابت ہوگا، جیسے 'اودھ میں داستان نگاری'۔ "اودھ میں ناول نگاری" اسی طرح "اودھ میں مرثیہ نگاری"۔ ساری اصناف ادب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور ہر میدان میں اودھ کی جو گراں قدر خدمات رہی ہیں وہ پوری طرح سامنے آ سکتی ہیں۔ اس طرف توجہ ضرور کیجیے۔

اس کتاب کے لیے دلی مبارکباد!

—— یوسف سرمست حیدرآباد

مکرّمی امجد صاحب!

ایک خوبصورت اور نادر تحفے کی صورت "اودھ آئینۂ ایّام میں" موصول ہوئی۔ تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور اس قیمتی کتاب سے نوازا۔ میرے نزدیک آزادی کے بعد شائع ہونے والی یہ اُن قلیل ترین کتابوں میں سے ہے جس کی معنویت ہمیشہ قائم رہے گی۔ محققین کے لیے ایک مستقل حوالہ کہ اودھ میں' اب وہ اودھ کہاں' جو کبھی گہوارۂ علوم و فنون تھا، وسیع المشربی جس کی تاکید تھی اور خلق و اُنس جس کی شناخت۔ محض کتابوں کی راہ سے ہی ہم اُس اودھ سے متعارف ہو سکتے ہیں جس کی ایک عظیم تہذیب اور ایک خیرہ کن تاریخ رہی ہے۔ اودھ کی خدمات کی ایک بے بہا تاریخ ہے۔ آپ نے ہمارے اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک مستند دستاویز مہیّا کر دی ہے۔ یقیناً آپ یہ کام گزشتہ کئی برسوں سے کر رہے ہوں گے۔ جن حضرات نے قلمی تعاون کیا ہے انھوں نے بھی پورا حق ادا کر دیا ہے اور پھر آپ کی ترتیب، آپ کا انتخاب، آپ کی پیش کش ان تمام چیزوں سے آپ کی بصیرت اور آپ کا حُسن نظر پوری طرح عیاں ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

—— (پروفیسر) عتیق اللہ۔ دہلی

جناب امجد حسین صاحب! آداب

"اودھ آئینۂ ایّام میں" موصول ہوا۔ شکریہ۔ آپ نے پیش لفظ میں درست فرمایا کہ پروفیسر گیان چند نے اودھ نمبر دوم کے بعد خواہش ظاہر کی تھی کہ کتابی صورت میں دونوں نمبروں اور ضمیمے کے مضامین شائع کر دیئے جائیں۔ ناچیز نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا خوشی ہے کہ یہ تجویز پروان چڑھی۔ ایک بار پھر شکریہ اور مزید کامیابیوں کے لیے دعا۔

—— پرکاش چندر۔ دہلی

ماہنامہ نیا دور
جلد ۵۱ نمبر ۸
نومبر ۱۹۹۶ء
ایڈیٹر
سید امجد حسین
دفتر ۲۱۳۴۵۸ ، رہائش ۲۸۴۲۸۴

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
غزل	فضا ابن فیضی	۳
یادوں کی رہگزر (۵)	علی جواد زیدی	۴
غزلیں	راجندر بہادر موج	۹
	منصور سبزواری	۹
تدوین میں منشائے مصنف کا تعین	رشید حسن خاں	۱۰
جواہر لال نہرو (نظم)	فاخر جلال پوری	۲۲
توصیف کے حقدار نہرو (نظم)	امام اعظم	۲۲
ہوئے کیوں نہ غرق دریا	رفعت سروش	۲۳
غزل	افتخار احمد	۲۴
غزلیں	نذیر فتح پوری	۲۵
	پیام اعظمی ۔ قاسم شبیر نقوی	۲۵
عصمت آپا کا آخری انٹرویو	فیاض رفعت	۲۶
غزل	صبا لکھنوی	۳۶
گزرا کل (نظم)	ملکہ نسیم	۳۶
بنارسی ساڑی (افسانہ)	سلام بن رزاق	۳۷
نقد و تبصرہ	ایس، اے، رحمٰن ۔ اسحٰق سنبھلی	۴۲
	امیر احمد صدیقی ۔ نفیس احمد ہلوری ۔ ارشد علی	تا
	محمد ارمان ۔ فیروزہ مسعود ۔ ظفر حسین	۴۵
آسمانِ اردو ادب کے ۲ درخشاں ستارے غروب	امجد حسین	۴۶
"اودھ آئینۂ ایام میں" (خطوط)	قارئین	۴۸

اپنی بات

علم کی روشنی ذہن کو منور بھی کرتی ہے اور وسعتِ نظر بھی پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پڑھا لکھا آدمی خود اپنے اندر ایک سکون محسوس کرتا ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ تعلیم یافتہ ذہن اپنے قلب کی کشادگی، وسعتِ نظر، رواداری، باہمی احترام، ایک دوسرے کا دُکھ درد سمجھنے کی وجہ سے اپنے ملک کے لیے بھی قابلِ قدر سرمایہ ہوتا ہے۔

اس مہینے میں "بال دیوس" یا "یومِ اطفال" منایا جاتا ہے، یہ دن آزاد ہندستان کی تاریخ کا اس لیے اہم دن ہے کہ یہ جہدِ آزادی کے عظیم ترین رہنما اور آزاد ہندستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا یومِ پیدائش ہے۔ اس دن ہم پنڈت نہرو کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مستقبل کے سماج کو بنانے والے بچّوں کے دن کے طور پر مناتے ہیں۔ یہ دن ایک طرح سے ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ مستقبل کے ہندستان کو سنوارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بچّوں کو تعلیم یافتہ بھی بنایا جائے اور ان کے ذریعے سے ہم ایک ایسے ہندستان کا نقشہ تیار کر سکیں جس کا ہر قدم ترقی کی طرف بڑھتا ہوا ہو۔ یہ تلخ سچّائی ہے کہ آج بھی ملک میں خواندگی کا اوسط بہت کم ہے صرف حروف شناسی کی حد تک ہی ہمارے دائرہ کار کو محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ وہ تعلیم بھی ملنی چاہیے جو دماغوں میں روشنی پیدا کرتی ہے اور جس کی طرف ابتدائی سطور میں اشارہ کیا گیا تھا۔

بچّوں کی تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "بچّہ مزدوری" ہے جس کے خلاف ہر شہری کو بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ کوشش ہو کہ وہ ہاتھ جو قلم سنبھالنے کے لیے ہیں، ان میں ہل یا پھاوڑا نہ دیا جائے اور اس کی کوشش ہو کہ بچّہ مزدوری بالکل ختم ہو اور یومِ اطفال کے موقع پر ہم میں سے ہر ایک یہ عہد کرے کہ بچّوں کو پنڈت نہرو کے خوابوں اور ان کی آرزوؤں کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ اور اس طرح ہم تاریخ سے کیے گئے اپنے عہد کو پورا کر سکیں گے۔

اسی مہینے میں دیوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ اس کی اساطیری حیثیت اپنی جگہ ـــــ عام ہندستانی ایک ہی بات جانتا ہے کہ یہ تہوار روشنیوں کا تہوار ہے۔ ہر گھر میں دیپ جلتے ہیں، دیے جھلملاتے ہیں، چراغ روشن ہوتے ہیں۔ نئے برتن اپنی جگمگاہٹ کے ساتھ گھروں میں آتے ہیں اور لکشمی دیوی کی مسکراہٹ حاصل کرنے کے لیے ہر ایک کے دل میں تڑپ اور تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ ہمارے اتر پردیش میں یہ تہوار بھی بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ بچّوں کے لیے تو یہ تہوار میٹھے کھلونوں کا ہے مگر اس دن روشنیوں کے جو شہر اُبھرتے ہیں انھیں دیکھنے کے لیے ہر آنکھ بے چین و بے قرار رہتی ہے اور گھر کے نوجوان، بڑے، بزرگ، مرد، عورتیں، بچّوں کے ساتھ روشنی کے سیلاب میں اپنی مسکراہٹوں کے ساتھ اس تہوار کو مناتے ہیں۔

اس موقع پر ہماری یہی دُعا ہے کہ اس جگمگاتے تہوار کی خوشیاں برادرانِ وطن کو مبارک ہوں اور صرف مکانوں کی چھتوں، دیواروں، گلیوں اور شاہراہوں پر ہی روشنی نہ ہو بلکہ ہر آنکھ میں خوشی کے چراغ جل اُٹھیں اور ہر ہونٹ پر مسکراہٹوں کے دیپ روشنی بکھیرتے رہیں۔

ـــــــــــــــ ایڈیٹر

غزل

نہ لکھے تو کوئی حرفِ دگر، تو میرا کیا — تری کتاب نہیں معتبر، تو میرا کیا
ترے دیارِ ہنر میں ہنوز جاری ہے — وہی قدیم نظامِ ہنر، تو میرا کیا
یہاں تو مجھ سے ہے فصلِ دل و نظر سرسبز — ترا شعور نہیں باثمر، تو میرا کیا
میں رنگ بن کے ہوں، پھیلا ہوا مناظر پر — سمٹ گئی تری قوسِ نظر، تو میرا کیا
میں اپنی ذات سے اک انجمن ہوں، اپنی جگہ — تو اپنی ذات سے ہے اک کھنڈر، تو میرا کیا
ہوں پیش لفظِ حقائق، مگر نگاہ تری — نہیں نوشتۂ دیوار پر، تو میرا کیا
ہیں تکیہ گاہ مری کوی و کاخ دربدری — تو رہ کے گھر میں بھی ہے دربدر، تو میرا کیا
میں دشت دشت بھی رہ کر، گھنیری چھاؤں میں ہوں — تو دھوپ میں ہے شجر در شجر، تو میرا کیا
مری شبوں میں تو سورج کی فصل اُگتی ہے — تری سحر بھی نہیں باروَر، تو میرا کیا
ترا وجود بھی، تیرا شناسا نہیں — تو اپنے آپ سے ہے بے خبر، تو میرا کیا
چٹان سا ہوں، میں اپنے وجود میں قائم — بدل گئی تری دنیا اگر، تو میرا کیا
ازل ابد ہیں، مرے ماجرا سے پُر مایہ — ہے زندگی ورقِ مختصر، تو میرا کیا
سفر پہ نکلا ہوں میں اور گردشِ ایام — پڑی ہوئی ہے سرِ رہ گزر، تو میرا کیا
پڑی تھی روح پہ، آشوبِ کائنات کی ضرب — ہوئی شکستہ بدن کی سپر، تو میرا کیا

فضا! ملا انھیں ظرفِ کشادہ تو کوئی
مجھی میں جذب ہوئے بحر و بر تو میرا کیا

فضا ابن فیضی
جمال پورہ، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

علی جواد زیدی
۱۸۶، بی، وشواس کھنڈ، گومتی نگر،
لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

(۵)

"طنز و مزاح" سے متعلق یادوں نے عام رہگزر سے ہٹا کر لکھنؤ کے ایک نئے کوچے میں پہونچادیا تھا۔ وہاں ہم کو "اودھ پنچ" کے رُوحِ رواں شیخ ممتاز حسین عثمانی سے سرسری ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، پچھلی قسط میں اس کے بارے میں کچھ عرض کرچکا ہوں۔ یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس ملاقات کا وسیلہ عثمانی صاحب مرحوم کے جو نوجوان صاحبزادے ہوئے تھے ان کا نام ریاض حیدر تھا جو بلی کالج میں مجھ سے ایک سال جونیر تھے کم سنی ہی میں وفات پائی۔ اس ملاقات میں ایک اور انکشاف ہوا کہ کاتب کو مضمون دیتے وقت اُن کو ایک نظم بھی کتابت کے لیے دی تھی۔ ریاض حیدر مرحوم نے بتایا کہ وہ نظم خود ممتاز حسین عثمانی کی تھی۔ وہ شاعر بھی تھے، اس کا علم مجھے کیا، اوروں کو بھی نہیں تھا۔ شاید ہی ان کے بے حد قریبی اور محدود حلقہ احباب میں بھی کسی کو معلوم رہا ہو۔ ان کا کلام اس دور کے "اودھ پنچ" کی فائلوں میں دبا پڑا ہوگا۔ لیکن اسے کون پرکھے اور کون چھانٹے۔ یہی حال ان کے قسط وار تبصرہ 'نور اللغات' اد بار اللغات' کا ہے۔ "بُوا نصیبن" اور "منطق آرا بیگم" کے طنزیہ و مزاحیہ سیاسی خطوط کے سلسلوں کا بھی ہے۔ ان میں کئی جواہر پارے ہیں۔ دورِ ثانی میں بھی "اودھ پنچ" کا مسلک قوم پرورانہ رہا۔

"اودھ پنچ" میں لکھنے والوں کا دائرہ محدود تھا۔ دو اہم نام ضرور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ظریف مرحوم اور چودھری محمد علی۔ اس حلقے کے مختصر ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ شیخ ممتاز حسین عثمانی میں غضب کی "انا" تھی۔ وہ اپنے سوا دوسروں کو کم ہی اس کا اہل سمجھتے تھے کہ ان کے اخبار میں مستقل طور سے دو ایک کالم لکھے۔ ان کے اخبار کا لہجہ طنزیہ اور مزاحیہ ہونے کے باوجود علمی اعتبار سے بھاری بھرکم تھا، جس کا نباہنا مشکل تھا۔ عالموں میں مزاح نگار اور مزاح نگاروں میں عالم بہت کم تھے۔ صرف مقبول حسین ظریف اور چودھری محمد علی کو یہ عزت حاصل تھی کہ آزادانہ لکھتے تھے لیکن یہ دونوں خود بسیار نویس نہیں تھے۔ چودھری محمد علی آزاد خیال اور ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے۔ جنسی مسائل پر معلومات بہم پہونچانے اور نفسیاتی حقائق کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے میں بے جھجک تھے اس پر ان کے کچھ ہم عصر چیں بر جبیں بھی ہوئے۔ تعلقہ داری کے باوجود غرور چھو بھی نہیں گیا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی جو سن میں ان کے بیٹے سلمان احمد علی سے بھی کچھ چھوٹے رہے ہوں گے جھک کر ملتے تھے۔ موخر الذکر یونیورسٹی میں استاد بھی تھے۔

۱۹۳۵ء میں ممتاز حسین عثمانی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے ریاض حیدر نے "اودھ پنچ" کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ راجہ محمود آباد نے تعاون کا وعدہ کیا۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری اور حکیم آشفتہ نے قلمی معاونت اور ادارت کا کاروبار سنبھالا لیکن بات بنی نہیں۔ ٹوٹی ہوئی کڑی بعد میں احمد جمال پاشا نے اہوار رسالے کی شکل میں جوڑنا چاہی لیکن وہ کہانی ختم ہی ہوگئی۔

ظرافت اور شوخ طبعی ان کے مضامین اور افسانوں میں بڑے رچاؤ سے ملتی ہے۔ "کشکول محمد علی فقیر" اور افسانوں کا مجموعہ "گناہ کا خوف" ان سے یادگار ہیں۔ اچھا کتب خانہ بھی یکجا کرلیا تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ تتر بتر ہوگیا۔

عملی مذاق

بارے کچھ عملی مذاق کا بھی بیان ہوجائے۔ لکھنؤ کی روایتی زندہ دلی ہر زمانے میں شگوفے چھوڑتی رہی تھی۔ اتفاق سے شوکت تھانوی

جیسا شگوفہ باز لکھنؤ کو مل گیا تھا۔ چنانچہ ایک شاعرِ اعظم منطق گولا گنجوی پیدا کر لیے گئے۔ منطق صاحب یا تو سخت ستم ظریف واقع ہوئے تھے یا پھر فطرت نے انھیں "نشۂ لطیف" عطا کرنے میں فیاضی والا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بہر حال وہ شہابِ ثاقب کی طرح کہیں سے ٹوٹ کر لکھنؤ کے اس مزاح پرست حلقے میں آ پڑے جس کی سرپرستی شوکت تھانوی کو حاصل تھی۔ گولا گنج میں آرزو لکھنوی کے ایک شاگرد رہتے تھے پورا نام تو یاد نہیں لیکن ہم سب انھیں آغا صاحب کہتے تھے۔ کسی مقامی کالج میں استاد تھے۔ موسیقی کے رسیا تھے اور طبلہ بہت اچھا بجاتے تھے لیکن صرف اپنے بے حد قریبی حلقے کے باہر اس کا مظاہرہ کیا، ذکر بھی نہ آنے دیتے تھے علی عباس حسینی اس قریبی حلقے میں شامل تھے، اور ان کی وجہ سے میں نے بھی ان کے فن کا مظاہرہ ایک بار دیکھا۔ واقعتہً اچھے طبلہ نواز تھے۔ خوش حال خاندان سے تعلق تھا اس لیے اس فن سے تعلق کو صیغۂ راز میں ہی کامیابی سے رکھے ہوئے تھے۔ شاعر بھی تھے مگر مشاعرہ باز نہیں۔ انھوں نے شوکت تھانوی کی تحریک پر منفقہ طور پر منطق گولا گنجوی کو دریافت کیا۔ بیچارے منطق صاحب شاعر تو کیا موزوں طبع بھی نہیں تھے لیکن مزاج کسی قدر شاعرانہ تھا اور اکثر کچھ گنگناتے رہتے تھے شوکت کی ہدایت کے مطابق دونوں مصرعوں کو تنکوں سے ناپ کر برابر کر لیا کرتے تھے۔ اگر کسی مصرعے میں الفاظ زیادہ ہوتے تو اس مصرعے کی لکھائی گھٹی ہوئی کر دیتے، کم ہوتے تو پھیلا پھیلا کر لکھ دیتے۔ غرض کسی بحر، کسی زمین میں بند نہیں تھے۔ جس زمین کی طرف رُخ کرتے زمیندارانہ شان سے لکھتے چلے جاتے۔ مثلاً ایک بار مصرعِ طرح کچھ اس انداز کا دیا گیا ع

ہم سے کچھ پوچھا تو پھر غنچا مچل ہوجائیگا کہ

"ہوجائے گا کہ" کی ردیف پر استاد منطق بھی چونک پڑے۔ لیکن شوکت تھانوی نے (جو مصرعۂ طرح کے مصنف تھے) سمجھایا کہ یہاں "کہ" کا مفہوم "کہ نہیں" ہے۔ منطق خواستہ و ناخواستہ تیار ہوگئے، اور پھر وہ دھواں دھار غزل لکھ کر لائے کہ اللہ تیری پناہ!

اب شوکت نے انھیں آرزو لکھنوی کی شاگردی اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ تیاریاں دھوم دھام سے ہوئیں۔ منطق صاحب سے قاعدے کے مطابق شاگردی اختیار کرنے کی تقریب میں تقسیم کرنے کے لیے شیرینی بھی خریدوائی اور پھر شوکت، آغا صاحب اور فرقت کاکوروی کے ہجوم میں منطق صاحب آرزو لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آرزو صاحب نے لاکھ فریاد کی لیکن نہ تو منطق صاحب مانے اور نہ شوکت تھانوی نے ماننے دیا۔ آرزو صاحب بے چارے ثقہ بزرگ تھے۔ لیکن ان لوگوں نے کچھ اس طرح اصرار کیا کہ وہ خاموشی پر مجبور ہو گئے۔ یہ مرحلہ طے کر لینے کے بعد شوکت تھانوی نے منطق کو ترقی دے کر استاد بنا دیا اور استاد آرزو کی ایک جعلی سند ان کے حوالے کی گئی، جسے انھوں نے تعویذ کی طرح گلے میں باندھ لیا۔ بس ایک ہی کسر باقی رہ گئی تھی کہ کسی طرح انھیں درباری شاعر بھی بنا دیا جائے۔ مرحوم راجہ صاحب محمود آباد کو کسی طرح اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ منطق کا کچھ وثیقہ مقرر کر دیں۔ جب راجہ صاحب نے ان کو پانچ روپیہ ماہوار وثیقہ دینا منظور کر لیا تو یہ درباری شاعر اور گویا اس ارزانی کے زمانے میں "ملک الشعراء" بھی ہو گئے۔

واقعات کی ان کروٹوں کے بعد استاد منطق گولا گنجوی ہر مشاعرے میں بلائے جانے لگے اور سب کے بعد تمام ہزل گویوں کے بھی بعد پڑھائے جانے لگے۔ واقعہ یہ ہے ان کا کلام "حرفِ آخر" تھا بھی۔ ان کے بعد کسی کی مجالِ لب کشائی کب تھی؟ خوب خوب، لہک لہک کے پڑھتے اور سب سے زیادہ داد پاتے اور پورے مشاعرے کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔!

شوکت و وصل

شوکت تھانوی کے ایک عملی مذاق کی ایک اور مثال پیش کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ ان کی چونچال طبیعت اس طرح کے نشانے تلاش کرتی ہی رہتی تھی۔ ان کے مخصوص رفقاء میں امین سلونوی اور وصل بلگرامی (مدیر مرقع لکھنؤ) شامل تھے۔ وصل بہت ہی رنگین مزاج اور بڑے یار باش قسم کے انسان تھے۔ شعر بھی سلیقے سے کہہ لیتے تھے لیکن امین سلونوی مرحوم کا بیان تھا کہ اگر دوست احباب سے کسی زمین میں کوئی شعر "تحفتہً" مل جاتا تھا تو اسے بھی قبول کر لیتے تھے کہ ع صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے۔

گھنی سی داڑھی، سُرخ و سفید چہرے کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں اس داڑھی کو الگ رکھ دیتے تھے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ ان کے دوستوں میں زیادہ تر بے ریش و بروت قسم کے لوگ تھے۔ ان کے سنجیدہ اور ثقہ حلیے کو دیکھ کر کوئی یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کیا چیز تھے۔ ایک بار وہ چار باغ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر شوکت تھانوی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ کھڑے تھے، اس وقت غالباً یکایک شوکت تھانوی کی نظر ایک انگریز لڑکی پر پڑی جو انھیں حضرات کی طرح ٹرین کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وصل کے سامنے یہ شرارت آمیز تجویز پیش کی گئی کہ اگر وہ اس لڑکی کا منھ چوم لیں تو ان کی خدمت میں فوراً دس روپے پیش کیے جائیں گے۔ یہ سمجھنا وصل بلگرامی کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی کہ وہ دس روپیوں کی لالچ میں پڑ گئے۔ وہ صاحب حیثیت لوگوں میں تھے، لیکن وہ ان لوگوں میں تھے کہ چیلنج قبول کرنے میں جھجک محسوس کرنے کو اپنی حیثیت سے فروتر سمجھتے تھے ؎

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندرمیانِ خاک و خون بینی سرے

اس کا خیال کیے بغیر کہ پلیٹ فارم تقریباً بازار ہے اور وہ شاعر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے متعارف ہیں، کہیں خدانخواستہ کوئی ناگوار صورت پیش آئی تو کیا ہوگا، وہ چیلنج قبول کرنے پر بس آمادہ ہی تو ہو گئے۔ اس سفید فام لڑکی کی طرف بڑھے۔ اس کے گرد دو چار چکر لگائے اور پھر یکایک بجلی کی سی تیزی سے لپکے اور ایک بوسہ اُس لڑکی کے رُخسار پر ثبت کر دیا۔ جب تک اس لڑکی کے ہمراہی اور مجمع کے دوسرے افراد اس عمل کے نشیب و فراز پر غور کر سکیں، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ـــــ

"میری پیاری بچی! ہو بہو یہی شکل، یہی سن تھا اس کا جب وہ اس دُنیا سے سدھاری۔ آج مجھے گویا میری کھوئی دولت مل گئی۔"

لڑکی اور اس کے ساتھ والے وصل بلگرامی کی داڑھی پر ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے مصنوعی خلوص سے ایسا متاثر ہوئے کہ بگڑنا تو درکنار ان کو تسلی دینے لگے۔ جتنی تسکین دی جاتی، ان کے آنسو اور اُبلتے یہ وہاں سے روتے سسکتے اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں واپس آ گئے۔ گاڑی آ چکی تھی، لڑکی سوار ہو چکی تھی، غالباً وہ بھی سوگوار رخصت ہوئی ہوگی۔ وصل نے پورے دس روپے جیت کر جیب میں داخلِ خزانہ کیے۔!

واپس یونیورسٹی

طنز و مزاح کی ڈگر پر دیر تک بھٹکتے رہ گئے۔ ہماری یادیں یونیورسٹی کے محور پر ہی پلٹ کے آنے کے لیے بیتاب تھیں۔ واپسی میں ہم نے راستہ بدل لیا ہے اور ڈالی گنج کے پل سے اُتر کر گومتی ندی کے کنارے کنارے اس سڑک پر چل رہے ہیں جو ندوہ کی طرف سے ہوتی ہوئی یونیورسٹی کو پہنچتی ہے۔ ندوۃ العلماء کا تذکرہ نکل پڑا تو ایک بار پھر اشارہ کر دوں کہ یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے شعبوں کے علاوہ ایک شعبہ علوم مشرقیہ کا بھی ہے جس کے امتحانات الگ ہوتے ہیں۔ عربی و فارسی کلاسیکی زبانوں کی حیثیت سے داخلِ درس تھیں اور اسی طرح پڑھائی جاتی تھیں۔ یہاں بھی کچھ جدید عناصر بڑی آہستہ خرامی سے داخل ہو رہے تھے۔ اس میں مولانا سید علی نقی النقوی عرف نقن صاحب اور مولانا مصطفیٰ علوی صاحب عربی جدید سے واقف تھے، دونوں صاحب تصنیف بھی تھے۔ نقن صاحب نے انیس کے ایک مرثیے کا عربی مسدس میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ مولانا سید عبدالحیٔ الحسینی صاحب نے عربی میں "نزہۃ الخواطر" (تذکرہ علماء صوفیاء) نو جلدوں میں مرتب کی تھی اور ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی المعروف بہ علی میاں صاحب عربی ادب و علوم اسلامیہ میں عالمی سطح پر اہم شخصیت تسلیم کیے جاتے ہیں۔

عام طور سے شہر کے عربی و فارسی مدارس روبہ زوال تھے اور ان کے مقابلے میں انگریزی کالج ترقی پذیر تھے۔ ان کی تعداد بڑھ رہی تھی اور طلبا بھی روز بروز انھیں کالجوں کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ کالجوں میں جوبلی کالج اور کرسچین کالج سب سے اچھے تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے بعد ڈی، اے، وی کالج اور شیعہ کالج کا نام آتا تھا۔ طالبات کے لیے آئی۔ ٹی۔ کالج اور کرامت حسین گرلس کالج تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ملی جلی تعلیم تھی لیکن لڑکیاں نسبتاً بہت کم تھیں

ان کالجوں کا الگ سے ذکر اس لیے ضروری ہوا کہ علم وادب کے مراکز پرانے لکھنؤ کی تنگ اور پُرپیچ گلیوں سے نکل کر ان نئے کالجوں میں سمٹتے آرہے تھے اور نئے ادیب وشاعر وعالم پُرانے استادوں کی صحبتوں کے علاوہ اب ان نئے علمی گہواروں کی کھلی ہوئی فضا سے ابھرنے لگے تھے

کالجوں ہی پر منحصر نہیں تھا۔ کیا شہر اور کیا مضافات، عربی وفارسی کے تعلیمی اداروں میں ابھی حرکت کے آثار باقی تھے۔ وہاں کی ثقافتی فضا پر روایتوں کے سائے کے پہلو بہ پہلو وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کا دبا دبا جذبہ دُور رس نگاہوں سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ آخر حیات اللہ انصاری، کیفی اعظمی، ظ۔ انصاری اور مولانا سید شبیہ الحسن نونہروی کو دیکھ کر اگلے زمانے والے شاید رشک کرتے ہوں کہ ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

گومتی پار ندوۃ العلماء عربی وفارسی مدارس میں نئی اٹھان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہاں نظام درس اور طرز تدریس میں تجدید کے آثار نمایاں ہو چلے تھے لیکن اب بھی مدرسۂ نظامیہ (فرنگی محل) کی ٹوٹی چٹائیوں میں کچھ کشش باقی تھی۔ اس کے علاوہ مدارس ناظمیہ، سلطان المدارس بھی قدیم تھے جہاں درس نظامی ہی کا بول بالا تھا۔ کچھ اور مدرسے بھی تھے لیکن یہاں فہرست گنانا مقصود نہیں۔ ندوۃ العلماء۔ مدرسۃ الواعظین اور سلطان المدارس میں اچھے کتب خانے تھے جن میں کئی نوادر تھے "ندوہ" کا کتب خانہ اب زیادہ منظم ہو گیا ہے اور اس کی توسیع بھی ہو رہی ہے۔ کھجوہ (حال شاستری نگر) کے "کتب خانۂ ناصریہ" میں عربی اور فارسی کے اہم اور نادر مخطوطات تھے۔ یہی حال راجہ صاحب محمود آباد کے ذاتی کتب خانے اور سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ذاتی ذخیرۂ کتب کا تھا۔ موخر الذکر کا بڑا حصّہ اب جموں وکشمیر یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہونچ چکا ہے لیکن اب بھی قیمتی حصّہ ان کے دولت کدہ پر موجود ہے جس سے ان کے لائق صاحبزادے پروفیسر نیر مسعود استفادہ کر رہے ہیں اور ان کی وساطت سے یہ فیض اوروں تک بھی پہونچ رہا ہے۔

فرنگی محل میں بھی بڑا نایاب کتب خانہ تھا، جس کا بیشتر حصہ مولانا جمال میاں اپنے ساتھ پاکستان لے گئے اور بنگلادیش کے لسانی ہنگاموں میں غالباً تلف ہو گیا۔ میرے دوست اور ترقی پسند صحافی وادیب مفتی محمد رضا انصاری مرحوم نے بچے کھچے سرمائے کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ بعض کتابیں غالباً دوسرے کتب خانوں میں محفوظ کرادی گئی ہیں۔ اب بھی لوگوں کے پاس اچھے ذاتی کتب خانے ہیں۔ "دار المبلغین" میں بھی اچھا کتب خانہ ہونا چاہیئے۔ ریاست پیرپور کا کتب خانہ بکھر گیا۔ لور پور بلرام پور وغیرہ پر کیا گزری پتہ نہیں۔ غفراں مآب کے نادر مخطوطات اما مباڑہ کی لائبریری میں حفاظت سے ہیں۔

اودھ کے امراء اور علماء کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ عبداللطیف شوستری نے "تحفۃ العالم" میں لکھا ہے کہ آصف الدولہ کے کتب خانے میں تین لاکھ کتابیں خوش خط لکھی ہوئی انھوں نے خود دیکھی تھیں۔ انتزاع سلطنت کے بعد بھی واجد علی شاہ میٹیا برج میں کتابیں جمع کرتے رہے، کچھ غالباً اما مباڑہ سبطین آباد میں رہ گئی ہیں اور کچھ پرنس انجم قدر کے پاس! آغا ابّو صاحب کے ذخائر کتب کا ایک حصّہ مدرسۂ سلطان المدارس میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جو رہ گیا ہے اس کو دستبرد زمانہ سے کیسے بچایا جائے؟

جدید عربی وفارسی

قدیم عربی مدارس میں سچ یہ ہے کہ بول چال کی عربی کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ صرف کتابی عربی پر زور تھا، اور یہی حال فارسی کا بھی تھا۔ ندوۃ العلماء کی کوششوں سے ہوا بدلنے لگی۔ عربی خطابت اور بول چال کی عربی رائج کرنے میں ندوہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ عربی خطابت کے سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا جواب نہیں۔ میں نے تقریباً سبھی عرب ممالک کا دورہ کیا ہے۔ ہر جگہ ان کا نام عزّت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ بعد میں وہاں سے عربی میں جرائد بھی نکلنے لگے۔ عرب یونیورسٹیوں اور اسلامی ادب سے وابستہ حلقوں میں بھی انھوں نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ چوتھی دہائی کی بات ہے کہ ایک مصری صحافی وارد لکھنؤ ہوئے، انھیں عربی مدارس کی سیر کرانے کا فرض مجھے سونپا گیا۔ ان کے پاس چند گھنٹوں کا وقت تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہی مدرسہ دیکھ سکتے تھے۔ میں نے ندوۃ العلماء سے رابطہ قائم کیا اور ان کے وہاں جانے اور طلباء وا ساتذہ سے

چلنے کا انتظام کیا۔ وہاں جاکر وہ اور خود میں محو حیرت رہ گئے کہ ابتدائی درجات کے طلبا نے عربی میں ان سے بات کی بلکہ ایک مختصر سی خیر مقدمی تقریر بھی کر ڈالی۔

ندوۃ العلماء کے باہر بھی کچھ ایسے حضرات مل جاتے ہیں جنھوں نے دوسرے عربی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن بول چال کی زبان میں مہارت پیدا کرلی ہے مگر طلاب ندوہ کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ چند برس قبل میں ابوظبی گیا تھا تو وہاں مولانا سید ذیشان حیدر جوادی کو دیکھا کہ وہ بے تکلف عربوں سے عربی میں گفتگو کر رہے تھے اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم تو جامعۂ ازہر کے فاضل تھے اور حکومت ہند سے ایک عربی جریدہ نکالتے اور آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ عربی کے سربراہ تھے۔

اکثر ہندستانی سفارت خانوں میں عربی کے ترجمان ندوہ ہی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ فارسی زبان کے ترجمانوں کا کسی بھی یونیورسٹی سے تعلق ہو سکتا ہے۔ جدید فارسی میں عربی ہی کی طرح بہت سے مصطلحات ومحاورات در آئے ہیں جو عام طالب علم کو معلوم نہیں ہوتے۔ اگر ہوش مندی سے نصاب کی تشکیل ہو تو اس دشواری پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ فارسی کی حد تک اس سمت سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی نظر سب سے پہلے گئی اور انھوں نے فارسی جدید کی کتابیں نصاب میں بی۔اے کی سطح ہی سے شامل کردی تھیں افسوس کہ اس سے بھی ہمارے بیشتر عربی مدارس نے سبق نہیں لیا۔ وہی پرانی ڈگر پر چل قدمی ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ آہستہ آہستہ چار و ناچار ان جدتوں کو داخل نصاب کرنے کی طرف ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔ فارسی سے لگاؤ اب بھی وسیع اور گہرا ہے۔ کئی حضرات اسی لکھنؤ میں فارسی زبان وادب پر حاوی ہیں۔ بے حد رواں اور بے تکلف جدید اور خالص تہرانی لہجے میں فارسی بولنے والوں میں مرزا محمد اشفاق شوق لکھنوی اور مولانا سید علی محمد نقوی (علی گڑھ) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ موخرالذکر تہران کے ایک فارسی روزنامے میں کافی دنوں تک فلسفۂ اسلامی پر مستقل کالم لکھتے رہے ہیں۔ تاریخ واسلامیات پر اردو میں بھی بہت ساقیمتی سرمایہ ہے جسے عربی اور فارسی میں منتقل کرنا چاہیے۔ اپنے کو جامعہ کہلانے والے مدارس کی بھی تو کچھ ذمہ داریاں ہیں نا؟

فارسی میں اب بھی کچھ حضرات شاعری کر لیتے ہیں۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں شعبۂ فارسی میں مولوی عبدالقوی فانی فارسی میں قصائد کہتے تھے۔ یہی حال باہر مولوی احمد حسین صاحب کا تھا۔ باقیات الصالحات میں میرے دوست پروفیسر ولی الحق انصاری نے فارسی کا ایک پورا دیوان مرتب کر کے چھاپ دیا ہے۔ میں نے مرحوم مولانا سید محمد داؤد صاحب کمال زنگی پوری کو دیکھا ہے کہ وہ مولانا سید سبط حسن لکھنوی اور مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری کو فارسی میں منظوم خطوط لکھتے تھے۔ فارسی میں ان کی ایک اخلاقی مثنوی بھی ہے۔ مولانا متقن صاحب مرحوم کی وفات پر مولانا نقن صاحب کو انھوں نے تعزیتی خط عربی میں لکھا تھا، یہ سب میری نظروں سے گزر چکے ہیں۔

فارسی شعبہ کے لکھنؤ یونیورسٹی کے موجودہ صدر پروفیسر نیر مسعود بھی جدید فارسی کا بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ چار برس ایران میں قیام اور عرب ممالک کے دوروں کی بدولت مجھے بھی فارسی جدید سے زیادہ اور عربی جدید سے سطحی شناسائی ہو گئی۔ ایران میں فارسی کے نمایاں ادیبوں مثلاً ذبیح اللہ صفا اور پروفیسر پرویز ا ورڈاکٹر نصر سے ملاقات کا شرف ملا تھا۔ اہل افغانستان اپنی فارسی کو دری کہتے ہیں، وہاں ہندستان سے زیادہ فارسی کا رواج ہے۔

ہمارے یہاں عربی میں شاعری کا چلن اب گویا نہیں رہ گیا ہے لیکن میرے عنفوان شباب تک عربی شاعری میں مولانا سید عبدالحی الحسنی صاحب (ناصر الملۃ) مولانا سید ناصر حسین صاحب، (ظہور الملۃ) مولانا سید ظہور الحسن صاحب (نجم الملۃ) مولانا سید نجم الحسن صاحب کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ ہی کے عربی محافل مقاصدہ کے اراکین مولانا سید محمد داؤد کمال زنگی پوری (رام پور میں)، مولانا سید شبیر حسین صاحب جونپوری (فیض آباد میں)، مولانا سید ابن حسن صاحب نونہروی (لکھنؤ میں) اور مولانا سید ظفر الحسن صاحب (بنارس میں) کی مساعی کی بدولت یہ شمع اب سے کچھ دنوں پہلے تک جلتی رہی ہے۔ سلطان المدارس کے دور آخر کے ایک عربی مقاصدے میں سامع کی حیثیت سے مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔

عربی مدارس سیاست سے عموماً دور رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

غزلیں

گردشِ قسمت کا یہ پُر درد منظر دیکھنا
پھول جن ہاتھوں میں تھے اب ان میں پتھر دیکھنا

کیسے بھولوں ان کا یوں با دیدۂ تر دیکھنا
دُور تک رُک رُک کے مُڑ مُڑ کر برابر دیکھنا

دُور سے جذبات کا احساس ممکن ہی نہیں
دل کی حالت دل کے یوں نزدیک آ کر دیکھنا

عرضِ حالِ دل بجا لیکن رہے اس کا خیال
بھول سے الزام آجائے نہ اُن پر دیکھنا

شمع مدھم، لو پریشاں، خامشی افسردگی
بزم سے اُن کے چلے جانے کا منظر دیکھنا

دل ہی دل میں کھلنے لگتے ہیں اُمیدوں کے گلاب
رُوح افزا کس قدر ہے ان کا ہنس کر دیکھنا

مَوج کیا سمجھیں اسے محدود ذہن و فکر سے
ہے کٹھن ساگر کو اک کوزے کے اندر دیکھنا

راجندر بہادر موج
موج مارگ،
فتح گڑھ (یو، پی)

روز اس کارِ مشقّت سے بکھر جاتا ہوں
صبح جی اٹھتا ہوں اور شام کو مر جاتا ہوں

آسماں کا مجھے بننا ہے ستارہ کسی شام
نہ سفر میں ہوں نہ میں لوٹ کے گھر جاتا ہوں

تم سلامت رہو لبّیک جزیروں کو کہو
میں اسی ڈوبتی کشتی میں ٹھہر جاتا ہوں

جیسے اُگ آیا ہوں سبزہ سا کفِ دشت پہ میں
اپنے ہونے کے طلسمات سے ڈر جاتا ہوں

کیسا بزدل ہوں عدو بڑھتا ہوا آئے رجز
میں شکستوں کی طرح خود میں اتر جاتا ہوں

طنز جن کے کریں ہر سینے میں سو سو سوراخ
میں انہی کھوکھلے لہجوں کو بھی بھر جاتا ہوں

مصوّر سبزواری
پوسٹ، نوح، گڑگاؤں ۱۲۲۱۰۰
(ہریانہ)

رشید حسن خاں
۱۶۷ - بازوزئی، شاہجہاں پور

تدوین میں منشائے مصنف کا تعیّن

"یہ تحریر تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اصلاً اس پر گفتگو کی گئی ہے کہ تحقیق اور تدوین کے نقطۂ نظر سے متن کس کی ملکیت ہوتا ہے، مصنف کی یا قاری کی۔ اور یہ کہ ابتدائی سطح پر متن کے کسی بنیادی مفہوم کا تعین کیوں ضروری ہے اور یہ کہ اس سے کثرتِ تعبیر کے عمل کی نفی نہیں ہوتی۔

دوسرے حصہ میں الفاظ کے تعین اور ترتیب پر بحث کی گئی ہے، منشائے مصنف کی بازیافت، جو تدوین کا مقصود ہے۔ اس کے لحاظ سے کن لفظوں کو نہیں بدلا جاسکتا ہے اور کن صورتوں میں املاے الفاظ کو بدلنا ضروری ہے۔ تیسرے حصہ میں اُن اضافوں کی تفصیل لکھی جائے گی، جو خارجِ متن ہوتے ہیں، لیکن متن کی تفہیم کے لحاظ سے ان کا شمول ضروری ہوتا ہے۔ یہاں اس تحریر کا دوسرا حصہ پیش کیا جاتا ہے۔"

—————— ر۔ ح۔ خ

یہ تو درست ہے کہ اصل چیز وہ خیالات ہیں جنھیں مصنف نے پیش کرنا چاہا تھا، مگر الفاظ کے بغیر وہ خیالات معرضِ اظہار میں نہیں آسکتے تھے، اس بنا پر تدوین میں بنیادی اہمیت الفاظ کی ہے، جو واحد وسیلۂ اظہار ہوتے ہیں۔ الفاظ مرتّب صورت میں خیالات کی تصویر کشی کرتے ہیں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی وہی شکل اور وہی ترتیب ہمارے سامنے ہو جس کو مصنف نے ادائے خیال کے لئے اختیار کیا تھا۔ اسی سبب سے تدوین میں اس پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ عبارت میں شامل الفاظ کی ترتیب اور ان الفاظ کی شکل، یعنی املا، منشائے مصنف کے خلاف نہ ہو، عبارت میں وہی الفاظ آئیں جنھیں مصنف نے لکھا تھا اور اسی ترتیب کے ساتھ آئیں جس ترتیب کے ساتھ مصنف کے قلم نے ان کو شاملِ متن کیا تھا۔ لفظ مجموعہ ہوتا ہے حروف کا، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر لفظ میں حرفوں کا تعین اور ان کی ترتیب بھی درست ہو۔ یعنی جس طرح عبارت میں (جو لفظوں کا مجموعہ ہوتی ہے) الفاظ کا تعین اور ان کی ترتیب غلط نہ ہو اسی طرح الفاظ میں (جو حرفوں کا مجموعہ ہوتے ہیں) حروف کا تعین اور ان کی ترتیب نادرست نہ ہو۔

تدوین کا کام کرنے والوں کو اکثر پرانے متنوں میں طرح طرح کی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگر کبھی کوئی مدوّن اس سلسلے کے اپنے تجربات کو لکھے، تب واقعی طور پر معلوم ہو سکے گا کہ کیسی کیسی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور کیسی کیسی شکلیں مبتلائے وہم کرنے اور گمراہ کرنے کے لئے اس کا راستہ دیکھتی ہیں، اس طویل سلسلہ کا ایک بہت پریشان کن مرحلہ ہوتا ہے معتبر اور غیر معتبر کلام کا تعین، یعنی صحتِ انتساب، اسی سلسلہ میں بہت کم اصول اور قاعدے ساتھ دے پاتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اصل چیز ہوتا ہے تجربہ جو قوتِ امتیاز پر جلا کرتا رہتا ہے اور شعور کو روشنی بخشتا رہتا ہے، اور بنیادی چیز ہوتی ہے تحقیق اور تدوین سے مزاجی مناسبت، ان دونوں کی مدد سے اس مشکل مرحلہ کو طے کیا جاسکتا ہے مگر بآسانی نہیں، بہت سی مشکلوں کے ساتھ اور صبر و تحمل کے ساتھ، عجلت پسند طبیعتیں اور زود یقین اشخاص اس مرحلہ کو طے نہیں کرپاتے، علما میں نے یوں ذکر نہیں کیا کہ وہ تو ہی اساسی چیز کم علم آدمی اور کم نظر شخص تحقیق اور تدوین کی گوں کا نہیں ہوتا، اسی طرح جس طرح غیر دیانت دار شخص خواہ کیسا ہی اشتہاری عالم ہو، صاحبِ فضیلت ہو، بہت تام بھام والا ہو، تحقیق اور تدوین کے بیکراں اور بے اماں شہر میں ہمیشہ اجنبی رہے گا،

شور کتنا ہی مچاتا ہے اور جادو کی کرشمے کیسے ہی دکھاتا ہے اسے گا محرم اور نا آشنائے رازِ میرؔ نے ایسے ہی ظاہر فریب اور باطن سیاہ افراد کے لئے کہا ہے ؎

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

اس کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تدوین میں علم سے مراد کیا ہے مرتب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ فارسی جانتا ہو، جاننے سے مراد یہ نہیں کہ اسے تہرانی لہجہ میں فارسی بولنا آتا ہو، مراد یہ ہے کہ کلاسکی فارسی سے اچھی طرح واقف ہو، سعدیؔ، حافظؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، بیدلؔ اور غالبؔ کے ساتھ ساتھ ظہوریؔ اور ابوالفضل کی نثر کو بھی پڑھ سکے اور کما حقہٗ سمجھ سکے، اردو زبان کے ارتقائی مراحل سے واقف ہو، زبان کے قدیم اسالیب اور بیان کی پیچیدگیوں سے بے خبر نہ ہو، قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری، علوم بلاغت عروض اور دبستانی اختلافات سے باخبر ہو، لغت شناسی کا ملکہ رکھتا ہو تلفظ اور املا کے مسائل سے نا آشنا نہ ہو اور مخطوطہ شناسی کے غوامض کا رمز آشنا ہو۔

تدوین کے عمل میں پہلا بڑا مرحلہ ہوتا ہے معتبر کلام کے تعین کا۔ اس کے لئے کلام مصنف کے مختلف معتبر خطی اور مطبوعہ نسخوں کا ان کے متعلقات کا اور مختلف مآخذ کا علم ضروری ہے، اس تعین کے بعد یعنی صحتِ انتساب کے مسائل کو حل کرنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے املا کا۔ آسانی کے لئے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مرتب کو وضاحت اور قطعیت کے ساتھ معلوم ہونا چاہیئے کہ کس لفظ کا صحیح املا کیا ہے۔ صحیح املا کا مطلب یہ ہے کہ تین باتیں معلوم ہوں: لفظ میں کتنے حروف ہیں، ان حرفوں کی ترتیب کیا ہے، ان حرفوں کو کس طرح لکھا جائے گا یعنی جن حرفوں کو ملا کر لکھا جاتا ہے ان کے جوڑ کس طرح لکھیں گے۔ تین مثالوں سے اس کی وضاحت ہوسکے گی، ایک لفظ ہے "معمّا" اس میں چار حروف ہیں، تیسرے حرف پر تشدید ہے، اور آخری حرف الف ہے (جیسے تماشا، تقاضا، تمنا، شوربا کے آخر میں الف ہے) اگر اس کو "معمہ" لکھا جائے گا، تو کہا جائے گا کہ یہ املا درست نہیں (اسی طرح تماشہ، تقاضہ، تمنہ، شوربہ کو بھی صحیح شکلیں نہیں کہا جائے گا) ایک لفظ ہے "صبا" اسے اگر "صبا" لکھا جائے، تو کہا جائے گا کہ یہ غلط املا ہے کیونکہ صاد کا جوڑ درست نہیں، صاد کے بعد ایک شوشہ بھی ہونا چاہئے تھا جو اس کا جز ہے۔ یا جیسے ایک لفظ ہے "کلھاڑی" اسے اگر "کلہاڑی" لکھا جائے گا تو کہا جائے گا یہ صحیح املا نہیں، یوں کہ لام کے بعد دو چشمی ہا (ھ) آنا چاہیئے تھی۔ اسی طرح مثلاً "انھیں" کو "انہیں" لکھا جائے، تب بھی یہی کہا جائے گا۔ یا جیسے ایک لفظ ہے "مہندی" اسے اگر "مہدنی" لکھا جائے تو کہا جائے گا کہ حرفوں کی ترتیب درست نہیں، میم کے بعد نون غنہ آنا چاہیئے تھا (جیسے "منہ" اور "منبہ" میں میم کے بعد نون غنہ آتا ہے اور ہا اس کے بعد آتی ہے) "مہندی" کا پہلا ٹکڑا وہی ہے جو "مینہ" کے مخفف "منہ" میں ہے: منہ - دی = مہندی)۔

۲:۔ کیا کچھ لفظ کسی زمانہ میں (زمانۂ ماضی یا زمانۂ حال میں) کسی طرح کی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں، اگر ایسا ہوا ہے (اور یہ درست ہے کہ متعدد لفظوں کے املا میں بعض تبدیلیاں شامل ہوتی رہی ہیں) تو مرتب کو ان تبدیلیوں کی پوری تفصیل معلوم ہونا چاہیئے، مثلاً فارسی جب دفتری زبان تھی تو بہت سے دیسی لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی لکھی جانے لگی تھی جیسے فارسی عربی لفظوں کے آخر میں لکھی جاتی تھی (اور لکھی جاتی ہے) بعد کو ایسے بہت سے لفظوں کے آخر میں الف لکھا جانے لگا، مگر کچھ لفظوں کی پرانی لکھاوٹ برقرار رہی، اس کی تفصیل سے واقفیت ہونا چاہیئے۔ یا جیسے ایک لفظ ہے "گنبد" اس کا پرانا املا "گنبذ" (ذال کے ساتھ بھی ہے) میر امنؔ کے یہاں یہی املا ملتا ہے (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے باغ و بہار، مرتبہ راقم الحروف ص ۵۶۰-۵۶۱) اب بطور عموم "گنبد" لکھتے ہیں (مگر میر امنؔ کی کتاب میں لازماً گنبذ (مع ذال) لکھا جائے گا)

۳:۔ جس عہد کا متن ہے اس زمانہ میں عمومی طور پر املا کا احوال کیا تھا، رسم کتابت کیا تھی اور وہ کون سے اجزا ہیں جو بعد کو ختم ہوگئے یا ان میں تبدیلی آئی۔ دبستانی اختلافات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، مثلاً دہلی والے "مصالح" لکھتے تھے، لکھنؤ میں "مسالا" نے رواج پایا یہ دبستانی اختلاف ہے، ایسے اختلافات سے بھی واقفیت ہونا چاہیے۔

۴:۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض اہم مصنفین کے کچھ شخصی مختارات بھی ہوتے ہیں جو اُس زمانہ کی یا ہر زمانے کی عمومی روش سے مختلف ہوتے ہیں اور کچھ الفاظ

کے مسلّمہ املا سے مطابقت نہیں رکھتے، مرتّب کو ان سب امور کا علم ہونا چاہیے، یہ بہت اہم اور خاص طور پر قابلِ توجہ مسئلہ ہے، بعض مثالوں سے اس کی بہتر طور پر وضاحت ہو سکے گی۔

مرزا غالبؔ ان گنے چنے مصنّفین میں سے ہیں جنھوں نے املا کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، اُن کے خطوں میں اور کتابوں میں یہ معلومات محفوظ ہے مثلاً ایک اصلاح کے تحت انھوں نے لکھا ہے کہ "تڑپھنا" میں بائے مخلوط لکھنا چاہیئے (دیباچۂ مکاتیبِ غالبؔ مرتّبہ عرشی صاحب، طبع ششم، ص ۲۲۹) وہ "پانو" کو درست اور "پاؤں" کو نادرست مانتے تھے (ایضاً) فارسی میں وجود ذال کے قائل نہیں تھے، اسی لئے "گذشتہ" اور "پذیرائی" جیسے لفظوں کو زے کے ساتھ (گزشتہ، پزیرائی) صحیح مانتے تھے، مرزا صاحب نے اس پر بہت اصرار کیا ہے، بحث کی ہے، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عین کی طرح طوئے بھی فارسی میں نہیں، اس لئے فارسی الاصل الفاظ میں اور بہند الفاظ میں طؔ کی جگہ تؔ لکھنا چاہیئے، مثلاً تشت، تیار۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ لفظ "خورشید" کو واؤ کے بغیر "خرشید" لکھنا چاہیئے، انھوں نے اس پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے، البتہ اس کے مخفف کو "خور" مع واؤ مانتے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ بھی بیان کی ہے جن لفظوں کے آخر میں تے جزوِ لفظ کے طور پر ہو، تو اس تے پر ہمزہ لکھنا ان کی تحریر کے مطابق عقل کو گالی دینا ہے، اضافت کی صورت میں بھی یؔ اور تے پر ہمزہ لکھنے سے منع کیا ہے، وہ جدید ایرانی لہجہ کا مذاق اڑاتے تھے، فارسی کے قدیم لہجہ کو مانتے تھے، جو افغانستان اور ہندستان میں مروّج رہا ہے، جس میں مجہول اور غنہ آوازیں موجود ہیں۔

مرتّبِ متن ان باتوں سے، اور ایسی ہی دوسری باتوں سے متفق ہو یا نہ ہو ہر صورت میں لازم ہوگا کہ کلامِ غالبؔ میں ان کے مختارات کی پابندی کی جائے مرتّب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق یا دوسروں کے فیصلوں کے مطابق کلامِ غالبؔ میں "گذشتہ، پذیرائی، پاؤں، خورشید تڑپنا اور "ذرا" لکھے۔ یا مثلاً "رائے، ہائے، وائے" (مع ہمزہ) لکھے یا "شوخیٔ تحریر اور "خدائے برتر" لکھے۔ یا ان کے فارسی کلام میں "شخصے" (بہ معنی ایک شخص یا کوئی شخص) کو فارسی جدید کی تقلید میں شخصی (مع یائے معروف) لکھے، یا نمایاں، گریاں، جہاں، دوستاں جیسے الفاظ کو نون غنہ کے بجائے مع نون لفظ دار لکھے اور تہرانی لہجہ کی تقلید میں پڑھے بھی اسی طرح، تو اس املا اور اس خوانگی کو نادرست کہا جائے گا، غالبؔ نے ایسی تقلید کو "بہروپیوں اور بھانڈوں" کا کام بتایا ہے، اگر ایسے مقامات پر املا فرمودۂ غالبؔ کے خلاف اختیار کیا جائے گا تو اس کو منشائے مصنّف کی خلاف ورزی کہا جائے گا اور نا قابلِ قبول قرار دیا جائے گا۔

اسی لئے یہ ضروری ہے کہ مرتّب ایسے شخصی مختارات سے واقف ہو۔ مثلاً داغؔ نے ایک خط میں لکھا ہے کہ "پھنسنا" میں نون غنہ موجود نہیں۔

"لفظ پھسنا" بغیر نون کے صحیح ہے، چناں چہ میں نے بھی یہی کہا ہے، رندؔ کے شعر سند میں لکھتا ہوں......" (زبانِ داغؔ ۱۰۵)

اس قول کی بنیاد پر اور اس تاکیدی بیان (چناں چہ میں نے بھی یہی کہا ہے) کے بعد داغؔ کے کلام میں لازماً اس مصدر کو اس کے جملہ مشتقات کو نون غنہ کے بغیر ہی لکھا جائے گا خواہ مرتّب بجائے خود داغؔ کے اس قول سے متفق نہ ہو، یہ تو ہوئی اصولِ تدوین کی بات، مگر اس سلسلہ میں یہی معلوم ہونا کافی نہیں کہ اس لفظ کے متعلق داغؔ کی رائے کیا تھی، یہ بھی ضروری ہے اسی قدر کہ اس مصدر کے متعلق دوسرے اقوال کا بھی علم ہو، یہ بھی معلوم ہو کہ قواعدِ قافیہ کی رو سے ایسے تقفیے کا حکم کیا ہے اس کے بغیر مرتّب اس لفظ کے تحت وہ تشریحی حاشیہ نہیں لکھ سکے گا جس کو لکھنا از بس ضروری ہوگا۔

جلالؔ نے اپنی لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں لکھا ہے کہ "گھانس" مع نون غنہ ہے، "گھانس، پھانس کے وزن پر، سوا کاہ اور گیاہ کے ترجمہ کے، ایک ریشمی کپڑے کا نام ہے کہ اس کا لباس بناتے ہیں۔ اور جو اس لغت کو بعد الف کے نون غنہ کے ساتھ نہیں بولتے یا نہیں لکھتے، مولف ہیچ مدان کے نزدیک ان کی غلطی ہے۔" (سرمایۂ زبان اردو)

اس صراحت کے بعد جلالؔ کے کلام میں لازماً اس لفظ کا یہی املا اختیار کیا جائے گا اور حاشیہ میں اس کی پوری طرح وضاحت کی جائے گی، یہاں مسئلہ یہ نہیں کہ جلالؔ کا یہ قول صحیح ہے یا غلط، مسئلہ صرف یہ ہے کہ یہ ان کا قول ہے اس لئے مرتّب ان کے کلام میں اس کی پابندی پر مجبور ہے، باقی تفصیلات وضاحتی حاشیے میں درج کی جائیں گی، ایسے سارے مقامات پر مفصّل حواشی ضرور لکھے جائیں گے، حواشی لکھنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ مرتّب ایسے الفاظ کے ضروری متعلّقات اور مباحث سے اچھی طرح واقف ہو اگر اس کی واقفیت

صفر کے درجہ میں ہے یا ناتمام ہے. تو اسے ترتیب متن کا حق حاصل نہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیئے کہ نہ جاننے کے مقابلہ میں کم جاننا زیادہ نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف کی واقفیت کا حوال وہ نہیں ہونا چاہیئے جو آج کل اکثر کام کرنے والوں کا ہوتا ہے۔

جن مصنفین کے شخصی مختارات کا علم نہ ہو (اور اکثر مصنفین کا احوال یہی ہے) ان کے کلام میں الفاظ کو صحت املا کے عام ضابطوں کے مطابق لکھا جائے گا، کسی خطی نسخے کے کاتب یا مختلف خطی نسخوں کے نقل کرنے والوں نے جس طرح اپنے قلم سے ان کو لکھا ہے، اس کو سند نہیں مانا جائے گا، ناقل یا کاتب کے اختیار کردہ املا کو بہ طور عموم مصنف سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ (مستثنیات سے یہاں بحث نہیں) ایک سے ایک بڑھ کر کم سواد ناقلوں کے لکھے ہوئے خطی نسخوں سے ہم سب کا سابقہ پڑتا رہتا ہے، پھر علاقائی اثرات کا بھی مسئلہ ہوتا ہے، کاتبوں اور ناقلوں کی املائی نیرنگیوں، کم سوادیوں اور ان کے معمولات کو مصنفین سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ عہد مصنف کے مستعملات اور مباحثِ املا کا علم ضرور ہونا چاہیئے۔

املا کے سلسلہ میں مرتب کبھی کبھی ایک بظاہر پریشان کن صورتِ حال سے دوچار ہو سکتا ہے، اس صورت میں جب کسی مصنف نے اپنے قلم سے کسی ایک لفظ یا بعض الفاظ کو دو طرح لکھا ہو۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً گنج خوبی کا جو خطی نسخہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں ایسی کئی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ خود مرزا غالب کی خطی تحریروں میں متعدد الفاظ میں املا کی ایسی دورنگی ملتی ہے، جو مطبوعہ نسخے مصنف کی نگرانی میں چھپے ہیں (جیسے گلزارِ نسیم کی اشاعتِ اوّل) یا مصنف کی موجودگی میں مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد چھپے ہیں (جیسے فسانۂ عجائب کے بعض اڈیشن) یا جیسے باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل، کہ یہ مصنف کی موجودگی میں سامنے آئی تھی، ایسے مواقع پر مرتب کی وسیع معلومات، قوتِ امتیاز اور صلاحیتِ فہم اس کی مدد کرتی ہے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی اپنی جگہ اس لفظ یا الفاظ کے دونوں املا برقرار رکھنا بہتر ہوتا ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے "عاری"، زچ، تنگ، عاجز کے معنوں میں، اس کی ایک شکل "آری" بھی ملتی ہے انھی معنوں میں (بڑھئی کی آری دوسری چیز ہے) امیر مینائی نے امیر اللغات میں اس پر بحث کی ہے اور "آری" کو صحیح قرار دیا ہے (غالباً) ان کی تقلید میں صاحب نور اللغات نے بھی "آری" کو ان معنوں میں درجِ لغت کیا ہے، اس طرح اس لفظ میں یہ حقیقی اختلافِ املا ہوا اور اس سے ایک بحث بھی وابستہ ہے، مثنویاتِ شوق میں دو الگ الگ مقامات پر یہ دونوں املا ملتے ہیں۔ میں نے دونوں شکلوں کو اپنی اپنی جگہ برقرار رکھا ہے، اسی بنا پر کہ اس لفظ میں یہ اختلافِ املا غیر حقیقی نہیں اور میں قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ مصنف نے کون سا املا اختیار کیا تھا۔ مصنف کی خطی تحریر میرے سامنے نہیں تھی نہ اس کا کوئی قول میرے سامنے تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف ہی نے الگ الگ مقامات پر اسی طرح لکھا ہو (یہ بہ خوبی ممکن ہے اور اس کی مثالیں ملتی ہیں) اِن حواشی میں اسکی وضاحت کر دی ہے، البتہ یہ طریقۂ کار خاص خاص لفظوں ہی کے سلسلے میں اختیار کیا جا سکتا ہے اور کم سے کم لفظ اس ذیل میں آ سکتے ہیں۔ کسی متن میں ایک یا دو یا پھر مستثنا صورتوں میں دو تین لفظ ایسے ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ہوتے ہیں، یہ کہا ہے کہ ہو سکتے ہیں۔ امکان اور واقعے میں جو فرق ہوتا ہے، اسے اُسی کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے مگر ہو سکتا ہے اسی لئے یہ وضاحت کی گئی اور طریقۂ کار کی نشان دہی کی گئی۔

جن لفظوں سے ایسی بحثیں وابستہ نہ ہوں اُن کے متعلق مرتب کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ دو یا زیادہ شکلوں میں سے کسی ایک صورت کو مرجح قرار دے کر پورے متن میں اسی کی پابندی کرے اور حواشی میں وجوہِ ترجیح کی وضاحت کرے مثلاً مرزا غالب کے قلم کی جو تحریریں ہیں، ان میں آئے، جائے جیسے افعال میں کہیں ے پر ہمزہ ہے اور کہیں نہیں، یہ اختلافِ املا ایسا نہیں جس سے کوئی بحث وابستہ ہو یا یہ حقیقی اختلاف ہو۔ آوے، جاوے میں بالاتفاق ے سے پہلے واو ہے، آئے، جائے اسی کی بدلی ہوئی بلکہ یوں کہیئے کہ ترقی یافتہ صورت ہے ان میں ے سے پہلے واو کی جگہ ہمزہ ضرور آئے گا، اس لئے ہر جگہ ایسے افعال کو مع ہمزہ آئے، جائے (وغیرہ) لکھا جائے گا۔ مولانا عرشی نے "املا اور رسمِ خط" کے عنوان کے تحت مقدمۂ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) میں لکھا ہے:

> "بعضے لفظوں کو انھوں نے دو طرح لکھا تھا مثلاً "جائے ہے" اور "جاے ہے"۔ ان جیسی صورتوں میں وہ شکل اختیار کی گئی ہے جو موجودہ بول چال کے بھی مطابق ہے اور اُن کی آخری تحریر کے بھی موافق تھی۔" (دیوانِ غالب

نسخۂ عرشی، طبع اول، ص ۱۱۸)

یا جیسے مرزا صاحب کی تحریروں میں مرکبات کو ملاکر اور الگ الگ لکھنے میں کوئی ایک طریقہ نہیں ملتا (جیسے نکلے گا، نکلیگا وغیرہ) اب بہ طورِ عموم مرکبات کو منفصل لکھا جاتا ہے۔ اس لئے کلامِ غالب میں اگر ایک طریقۂ کتابت اختیار کیا جائے کہ مرکبات کو الگ الگ لکھا جائے، تو یہ درست طریقۂ کار ہوگا۔ یا جیسے جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہے (جیسے: درجہ، مرتبہ) محرّف صورت میں ان کے لکھنے میں غالب کی تحریروں میں کوئی ایک طریقہ نہیں ملتا۔ کہیں اس ہٰ کو ے سے بدل دیا گیا ہے اور کہیں علیٰ حالہٖ رکھا گیا ہے جیسے: درجے میں، درجہ میں (وغیرہ) یہاں بھی مرتب کو ایک طریقۂ کتابت اختیار کرنا چاہئے۔ چوں کہ مرزا صاحب نے محرّف صورت میں ایسے لفظوں کو (تلفظ کے مطابق) ے سے بھی لکھا ہے، اس لئے صحیح طریقہ یہی ہوگا کہ ایسے سبھی لفظوں کو ایک طرح، ے کے ساتھ لکھا جائے، کیوں کہ صحیح طریقۂ نگارش بھی یہی ہے۔

ایک صورت اور ہے۔ کبھی کبھی مصنفین کی تحریروں میں بعض لفظوں کا ایسا املا ملتا ہے جس کو قطعیت کے ساتھ غلط کہا جاسکتا ہے، جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی اور اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں نکلتی مثال کے طور پر مرزا غالب کی تحریروں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مکاتیب غالب کے مرتب مولانا عرشی نے لکھا ہے:

> "میرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے ..... "گھٹائیں" ان کے قلم سے "گھٹائیں" بن گئی ہیں ..... بالکل، بالفعل، باللہ کو "باالفعل"، "باالکل" اور "باالله" تحریر کر دیا ہے ..... "خرّم" کو "خورّم" بہ واو لکھ دیا ہے، حالانکہ اسی کے مرکب "خرّمی" کو بغیر واو لکھا ہے۔" (مقدمۂ مکاتیب غالب، طبع ششم، ص ۲۴۲)

ایسی سب صورتوں میں وہی طریقہ اختیار کیا جائیگا جو عرشی صاحب نے اختیار کیا ہے کہ ایسے لفظوں کا صحیح املا لکھا جائے گا اور حواشی میں وضاحت کی جائے گی۔

ایک مثال اور: مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے "ایزا"، "پرشش"، اور "اللہ واکبر" لکھا ہے، لیکن دوسرے مقامات پر ان لفظوں کا صحیح املا ایذا اور "پرسش" بھی ملتا ہے اس صورت میں ظاہر ہے کہ متن میں صحیح املا کو ترجیح دی جائے گی۔

اس بحث کا ایک پہلو اور ہے۔ نونِ غنہ اور ہائے مخلوط، یہ دونوں آوازیں ایسی ہیں کہ اب سے پہلے ایسے بہت سے لفظوں میں شامل تھیں جن کو آج کل ان آوازوں کے بغیر بولا اور لکھا جاتا ہے، مثلاً میر امّن نے گنجِ خوبی کے مخطوطے میں اپنے قلم سے "کانسہ" لکھا ہے، مرزا غالب نے "سونچنا" لکھا ہے اور جلال "گھانس" کو صحیح اور "گھاس" کو غلط سمجھتے ہیں، یہی احوال جھوٹھ، ہونٹھ، پودھا جیسے لفظوں کا ہے کہ اب ان کو عموماً ھ کے بغیر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اگر کسی مصنف نے اپنے قلم سے ایسے لفظوں کو دونوں طرح لکھا ہے اس صورت میں مرتب اپنی صوابدید اور نتائجِ مطالعہ کے مطابق کسی ایک صورت کو مرجح قرار دے کر، وہی املا پورے متن میں اختیار کرسکتا ہے اور حواشی میں ایسے الفاظ کی نشان دہی کر کے اپنے طریقۂ کار اور وجوہِ ترجیح کو بیان کرے گا، لیکن اگر کسی مصنف کی پیشِ نظر تحریروں میں ایسے الفاظ کا ایک ہی املا ہو تو پھر لازماً اسی املا کو اختیار کیا جائے گا اور اسی کی وضاحت حواشی میں کی جائے گی۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

عرشی صاحب مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں املائے غالب پر بحث کرتے ہوئے جہاں یہ لکھا ہے کہ "میرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے" اور اس کی مثالیں لکھی ہیں، ان مثالوں میں "سونچ" اور "سونچنا" کو بھی شامل کیا ہے۔ مگر استادِ محترم سے یہاں چوک ہوئی "سونچنا" (مع نونِ غنہ) مستعمل صورت ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ "سوچنا" بہ طورِ عموم مستعمل رہا ہے، مگر "سونچنا" غلط نہیں۔ جلال نے اپنی لغت سرمایۂ زبان اردو میں تو صرف اسی صورت کو صحیح مانا ہے انھوں نے لکھا ہے:

> "سونچنا، نونِ غنہ کے ساتھ، اندیشیدن کا ترجمہ ہے (جو) لوگ اس کو بدون نونِ غنہ کے پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، مولف کے نزدیک غلط ہے"۔

بحر لکھنوی (تلمیذ ناسخ) نے اپنے رسالۂ لغات المصادر بحر البیان میں بھی (اس کا حوالہ اس سے پہلے آچکا ہے) اس کو صرف مع نونِ غنہ لکھا ہے، "سونچنا" بواوِ مجہول و نونِ غنہ، خیال کردن و بیاد آوردن"۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مصدر اور اسکے مشتقات مع نونِ غنہ بھی مستعمل رہے ہیں۔ شوق نیموی نے اپنے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے، "سونچ" کو متقدمین نون سے لکھا کرتے تھے۔ ایک آدھ جگہ سونچ کے قافیے میں بھی نظر سے گذرا ہے، مگر اب فی زمانا اکثر

"سوچ" بغیر نون لکھتے ہیں۔

مرزا غالب نے اپنے قلم سے مکتوب بنام نواب کلب علی خاں میں "سونچ" لکھا ہے، جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ اس کے بعد انھوں نے "سوچ" لکھنا شروع کر دیا تھا، یا یہ کہ ان کی خطی تحریروں میں "سوچ" بھی ملے، اس وقت تک لازمی طور پر کلامِ غالب میں ہر جگہ "سونچ" اور "سونچنا" لکھا جائے گا۔ ان کے دیوان کے کاتبوں اور پریس والوں سے یہاں بحث نہیں، غالب کا یہ خط مکاتیبِ غالب مرتبہ عرشی صاحب میں شامل ہے۔ اس خط کا نمبر شمار ۵۳/۹ ہے، اصل خط کا عکس مرقعِ غالب مرتبہ پرتوی چندر میں شامل ہے اس خط پر تاریخ تحریر ۔ ۱۳ ماہ اگست ۱۸۶۵ء درج ہے۔ یعنی یہ خط ان کے آخری زمانہ کا ہے مرنے سے کچھ کم چار سال پہلے کا۔ اب یا تو یہ ثابت کیا جائے کہ اس کے بعد غالب "سوچ" لکھنے لگے تھے، یا یہ ثابت کیا جائے کہ اس سے پہلے "سوچ" بھی لکھتے تھے، اگر ان میں سے کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی تو اس صورت میں کلامِ غالب میں (وہ نظم ہو یا نثر) صرف "سونچ" لکھا جائے گا۔

مالک رام صاحب کے مرتب کیے ہوئے دیوانِ غالب (شائع کردہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، صدی اڈیشن) میں تین مصرعے اس طرح ملتے ہیں،

۱۔ "فائدہ کیا؟ سونچ، آخر تو بھی دانا ہے، اسدؔ" (صدی اڈیشن ص ۴۰)

۲۔ کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے (" ص ۲۱۱)

۳۔ مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے (" ص ۲۴۶)

یہ دورنگی اسی صورت میں قابلِ قبول ہو سکتی ہے جب اس کی وضاحت کی جائے کہ غالب نے اپنے قلم سے اس لفظ کو دونوں طرح (سوچ، سونچ) لکھا ہے اور اس لفظ کے دونوں مستقل املا کو محفوظ رکھنے کے لئے دونوں صورتوں کو اپنی اپنی جگہ برقرار رکھا گیا ہے، اگر ایسی وضاحت نہیں کی جا سکتی، اس صورت میں صرف ایک املا اختیار کرنا ہوگا، وہی املا جسے غالب نے اختیار کیا ہے اور جس کا ثبوت موجود ہے۔

ایک دوسری صورت۔ فسانۂ عجائب کا کوئی نسخہ بخطِ مصنف نہیں ملتا، مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد یہ کتاب کئی بار چھپی ہے، اس کے ایسے سب نسخوں میں (اشاعتِ اوّل میں اور اس کے بعد مصنف کی نظرِ ثانی کے ساتھ چھپے ہوئے چار نسخوں میں) ایک لفظ "پنسوہی" ملتا ہے۔ یہ لفظ دو مقامات پر آیا ہے اور دونوں جگہ اس کا یہی املا ملتا ہے، اردو ہندی لغات میں "پنسوئی" ہے۔ چوں کہ عہدِ مصنف کے سبھی نسخوں میں (بہ شمولِ اشاعتِ اوّل اور مصنف کے آخری بار نظرِ ثانی کیے ہوئے نسخے میں بھی) "پنسوہی" ہے، اس تکرار کی بنا پر یہ مان لینا بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف اس لفظ کو اسی طرح بولتا اور لکھتا ہوگا، اس لئے فسانۂ عجائب مرتبہ راقم الحروف میں اسی املا کو اختیار کیا گیا اور ضمیمۂ تلفظ و املا میں اس کی وضاحت کی گئی۔

میرامن نے مخطوطۂ گنج خوبی میں ہر جگہ "سامھنے" لکھا ہے۔ باغ و بہار (اشاعتِ اوّل، فورٹ ولیم کالج، ۱۸۰۴ء) میں بھی ہر جگہ اس لفظ کا یہی املا ملتا ہے۔ اس سے یہ مسلّم ہو جاتا ہے کہ مصنف اس کو مع ہائے مخلوط لکھتا تھا، اسی بنا پر باغ و بہار مرتبہ راقم الحروف میں ہر جگہ "سامھنے" لکھا گیا ہے اور ضمیمۂ تلفظ و املا میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، اس لفظ کا اب متعارف املا "سامنے" ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے نسخۂ باغ و بہار میں "سامنے" ہی لکھا ہے، لیکن یہ قابلِ قبول نہیں، یوں کہ واضح طور پر یہ املا منشائے مصنف کے خلاف ہے۔

ان چند مثالوں سے املائے الفاظ کے سلسلے میں مختلف مسائل کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہر متن اپنے مسائل ساتھ لے کر آتا ہے۔ علم، مطالعے، تجربے اور ذہنی مناسبت کی مدد سے مرتب مشکلوں کو حل کر سکتا ہے اور صحیح فیصلوں تک پہنچ سکتا ہے۔ کسی بھی تحریر میں ایسے سب مسائل اور قاعدوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس بات کو دہرایا جاتا ہے کہ جن مصنفین کی خطی تحریریں موجود نہیں ان کے کلام کے سلسلہ میں ان کے عہد کے اور ان کے معاصرین کے کلام سے مدد لی جائے گی۔ اسی لئے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ مرتب جس متن کو مرتب کر رہا ہے، وہ اس کی زبان سے خوب واقف ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے اس مصنف کے کلام کے ساتھ ساتھ اس عہد کے دیگر اساتذہ اور اہلِ قلم کی نگارشات کا بھرپور مطالعہ ضروری ہے، اور یہ بھی اسی قدر ضروری ہے کہ قواعدِ زبان و بیان، تذکیر و تانیث اور متروکات وغیرہ کے مسائل سے اچھی طرح واقفیت ہو۔

یہ بات ہم کو مان لینا چاہیے کہ بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں

جن کے متعلق کسی ایک قاعدے کے تحت فیصلے نہیں کیے جاسکتے۔ آدمیوں کی طرح الفاظ کی بھی جدا جدا شخصیتیں ہوتی ہیں اور اسی نسبت سے ان کے مسائل و متعلقات ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم کسی لفظ سے یا اسکے کسی خاص شکل صورت سے واقف نہیں، تو اس کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ وہ قابلِ قبول نہیں۔ اس کا امکان بہر طور رہتا ہے کہ کسی خاص زمانہ یا علاقہ میں وہ اس طرح مستعمل رہا ہو۔ اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ کوئی خاص مصنف کسی لفظ یا الفاظ کو کسی خاص طرح استعمال کرتا رہا ہو اور وہ استعمال عام سے مختلف ہو۔ ایسی مثالیں اکثر قدیم کتابوں میں ملتی ہیں اور ہر بڑے مصنف کے یہاں اس کے شخصی استعمالات ملتے ہیں جن کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اسی لیے الفاظ اور املاے الفاظ کے ردّ و قبول کے سلسلہ میں بہت زیادہ احتیاط اور تامّل کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ یہ اب سے تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔ مثنوی گلزارِ نسیم میں ایک جگہ "جھل خانہ" آیا ہے، جیل خانے کے معنی میں، میں نے غور کیے بغیر اور تامّل سے کام لیے بغیر اور تحقیق کیے بغیر یہ فرض کرلیا کہ یہ غلطیِ کتابت ہے، اسے جیل خانہ بنادیا اور سخت دھوکا کھایا، کیوں کہ "جھل خانہ" واقعی لفظ ہے، جیل خانے کے معنی میں، یہ فسانۂ عجائب میں بھی آیا ہے۔ یہ اڈیشن مکتبۂ جامعہ سے شائع ہوا تھا۔ بعد کی اشاعتوں میں اس کی تصحیح کر دی گئی؛ مگر عجلت پسندی نے ایک بڑی غلطی کا مرتکب تو کرا دیا۔

مقصود یہ ہے کہ ہر لفظ کی اجنبی شکل صورت کو لازماً غلطیِ کتابت یا بجاے خود غلط نہیں سمجھنا چاہیے، اجنبی شکل اور بے معنی لفظ میں بہت فرق ہوتا ہے، اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ پرانے لفظوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جن سے آج ہم یا تو واقف نہیں، یا وہ آج اس طرح مستعمل نہیں۔

متن میں قیاسی تصحیح کا دائرہ کیا ہے، یہ ایک مستقل مقالے کا موضوع ہے۔ یہاں اس کی تفصیلات سے بحث نہیں، البتہ الفاظ اور املاے الفاظ کے سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ قیاس کے دائرے کو اس قدر وسیع نہ کیا جائے کہ وہ مرتّب کے اضافوں کا مجموعہ معلوم ہو۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ کسی متن کے سارے مقامات حل ہو جائیں۔ کوشش شرط ہے، لیکن ہر قیمت پر اس کے حصول کی تمنا غلط ہے، کیوں کہ اس صورت میں مرتّب اپنی پسند کو مصنف سے منسوب کرتا جائے گا اور یہ عمل تحریف کی حدوں میں داخل ہو جائے گا۔ تصحیح، کسی مصنف کے مقصودِ حقیقی کو واضح کرنے کا عمل ہے، اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مرتّب کے مقصود کی آئینہ داری کرنے لگے۔

ہم سبھی اس بات سے واقف ہیں کہ مختلف ناقلوں کے لکھے ہوئے بہت سے خطّی نسخے کتابت کی پیدا کی ہوئی طرح طرح کی غلطیوں سے گراں بار ہوتے ہیں۔ ان میں الفاظ کی صورتیں بھی شامل ہیں۔ قطعیت کے ساتھ اگر یہ معلوم ہو کہ متن مصنّف کا خود نوشت ہے، اسی کے قلم کا لکھا ہوا ہے، تب تو الفاظ اور املاے الفاظ کی غلطیوں کو اس سے منسوب کیا جائے گا۔ اگر اس کا علم نہ ہو، اس صورت میں املائے الفاظ کی اغلاط مصنّف سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ جو تحریر ہمارے سامنے ہے وہ کسی دوسرے معلوم یا نامعلوم ناقل کی ہے، معمول یہی رہے گا کہ جن مصنّفین کے معمولات کا ہم کو علم نہیں، ان کے کلام میں، املاے الفاظ کے سلسلہ میں اس عہد کے معمولات کی پابندی کی جائے گی۔

ضمنی طور پر اسی سلسلہ کی ایک اہم بات کی طرف طلبہ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ کسی مجہول الاحوال یا معلوم الاحوال ناقل کے لکھے ہوئے متن کو بنیاد بنا کر مصنّف کی زبان اور املاے الفاظ پر گفتگو کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ محض بہ طور مثال عرض کروں کہ فضلی کی تصنیف کربل کتھا کا جو واحد خطّی نسخہ علم میں آیا ہے (ذخیرۂ اشپرنگر، برلن۔ اس کے عکس سے میں نے استفادہ کیا ہے) اس کا کاتب مجہول الاحوال ہے، خاصا کم سواد بھی معلوم ہوتا ہے مثلاً اس نے "سات" کو "ثات" اور "ڈھارس" کو "ڈھارث" لکھا ہے (وغیرہ)۔ ایسے کم سواد کاتب کی تحریر پر لسانی جائزے کی بنیاد رکھنا اور مصنّف کی زبان پر گفتگو کرنا اور املا کی ایسی صورتوں کو اس مصنّف کا یا اس کے عہد کی خصوصیت بتانا قطعی طور پر ناقابلِ قبول رہے گا۔ اس نامعلوم اور کم سواد کاتب کی تحریر کی بنیاد پر اب تک کربل کتھا کے جس قدر لسانی جائزے پیش کیے گئے ہیں اور مصنّف کی زبان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور املاے الفاظ کے متعلق جو رائے ظاہر کی گئی ہے اور کتابت کی بنا پر جن جن

لسانی اور املائی خصوصیات کو مصنف سے منسوب کیا گیا ہے، وہ سب ناقابلِ اعتبار قرار دیے جائیں گے۔

املا کی کون سی تبدیلیاں منشائے مصنف کی توثیق کرتی ہیں

املائے الفاظ کی اس بحث کے تحت یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ جب ہم تبدیلی یا تحریف کی بات کرتے ہیں، تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منشائے مصنف سے انحراف کیا گیا ہے، مثلاً کسی عبارت میں کسی لفظ کو بدل دیا گیا تو یہ تبدیلی ہے جسے تحقیق اور تدوین کی زبان میں تحریف کہتے ہیں، اس کو کسی بھی صورت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ تبدیلیوں کی ایک دوسری صورت بھی ہے، تدوین کے نقطۂ نظر سے جن کا عمل میں آنا از بس ضروری ہے، یوں کہ اُن تبدیلیوں کو شاملِ الفاظ کیے بغیر، یعنی املائے الفاظ میں ضروری تبدیلی کیے بغیر اب ہم منشائے مصنف کو صحیح طور پر پیش نہیں کر سکتے اسی بنا پر ایسی املائی تبدیلیوں کو لازماً عمل میں لایا جائے گا۔

میں پہلے ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ مرزا غالب کا معروف مطلع ہے:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں (جو تحقیقی اڈیشن ہے) یہ مطلع اسی طرح ملتا ہے، مگر مرزا غالب نے اپنے قلم سے اسے اس طرح لکھا تھا:

"نکتہ چین ہے غم دل اوسکو سنائی نہ بنی
کیا بنی بات جہان بات بنائی نہ بنی"

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے جو دیوانِ غالب شائع کیا ہے، (اشاعتِ ثانی ۱۹۸۶ء) اس کے گرد پوش کے آخری صفحہ پر مرزا صاحب کی یہ غزل انھی کے قلم کی لکھی ہوئی (عکسی صورت میں) شائع ہوئی ہے۔ یہ مطلع وہیں سے منقول ہے۔ غالب کے زمانہ میں (اور اس کے بہت بعد تک) پرانی روش کے مطابق آخرِ لفظ میں آنے والی یائے معروف اور یائے مجہول کے لکھنے میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا، مثلاً "رکھی" کو "رکھے" بھی لکھا جا سکتا تھا اور "رکھی" بھی۔ ہر صورت میں پڑھا جاتا تھا "رکھی"۔ اسی طرح آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنّہ پر عموماً نقطہ رکھا جاتا تھا، مگر اسے پڑھتے تھے نونِ بے نقطہ، یعنی نونِ غنّہ کی طرح۔ پیش کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ لفظوں میں واو لکھتے تھے جیسے: اوس کو، مگر واو شاملِ تلفظ نہیں ہوتا تھا۔ لفظوں کو جی چاہتا تھا تو ملا کر لکھتے تھے (جیسے: اوسکو) اور جی چاہتا تھا تو الگ الگ لکھ دیتے تھے۔ کتابت اور تلفظ میں آج کی طرح مطابقت لازم نہیں تھی، یوں کہ کتابت کے وہ امتیازات رائج ہی نہیں ہوئے تھے جو آج رائج ہیں۔ آج اگر "رکھے" لکھا جائے تو اسے "رکھی" نہیں پڑھا جائے گا، مگر اس اس زمانے میں ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

چوں کہ اب بطورِ عموم آخرِ لفظ میں واقع یائے معروف و مجہول کے لکھنے میں تلفظ کے لحاظ سے امتیاز کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لئے آج اگر غالب کے منقولہ شعر کو اسی طرح لکھا جائے، جس طرح خود انھوں نے لکھا تھا، تو قراءت صحیح طور پر نہیں ہو سکتی اور شعر کی معنویت چوپٹ ہو جائے گی اور منشائے مصنف سے ہم دور جا پڑیں گے۔ ہاں اگر ہم اس شعر میں "نکتہ چیں" "اس کو" "سنائے نہ بنے" "بنے بات" "جہاں" "بات بنائے نہ بنے" لکھیں گے تب ہم منشائے مصنف کو صحیح طور پر پیش کر سکیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرانی تحریروں میں (وہ خطی ہوں یا مطبوعہ) ایسی املائی تبدیلیاں ضروری ہیں جن کی مدد سے عبارت کی معنویت کو محفوظ رکھا جا سکے اور اس طرح منشائے مصنف کو صحیح طور پر پیش کیا جا سکے۔

اسی غزل کا ایک شعر ہے:

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

مرزا صاحب نے اپنے قلم سے اس شعر کو یوں لکھا ہے:

"بوجہہ وہ سر سے گرا ہی کہ اوٹہائے نہ اوٹہی
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائی نہ بنی" (ایضاً)

اگر اس شعر کو اسی طرح چھاپ دیا جاتا جس طرح مرزا صاحب نے اپنے قلم سے لکھا ہے، تو اسے اصولِ تدوین کی خلاف ورزی کہا جاتا، یوں کہ اُس صورت میں منشائے مصنف صحیح طور معرضِ اظہار میں نہیں آ سکتا تھا، مرزا صاحب نے لکھا ہے "بوجہہ" اس زمانہ کی عام روش کے مطابق، مگر مراد اُن کی "بوجھ" سے ہے۔ اور "اوٹہائے" لکھا ہے، لیکن مراد اُن کی "اٹھائے" ہے۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ ان لفظوں کو اسی طرح لکھا جاتا جس طرح دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں لکھا گیا ہے، اُس طرح نہیں جس طرح خود مرزا صاحب نے

اپنے قلم سے لکھا ہے۔

یائے معروف و مجہول، ہائے ملفوظ و مخلوط، اخفا و اعلانِ نون کے موجودہ امتیازاتِ کتابت کو لازماً ملحوظ رکھا جائے گا۔ ایسے ہی بعض دوسرے امتیازات اور طریقِ کتابت کو بھی شاملِ املا کیا جائے گا اور ان کا واحد مقصد ہوگا منشائے مصنف کو صحیح طور پر پیش کرنا۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ کسی مصنف یا عہد کے امتیازاتِ کتابت اور شخصی مختارات کو ملحوظ رکھنا غیر ضروری ہی نہیں، غیر مناسب بھی ہے، رائج املا اختیار کرنا چاہیے کسی تفریق کے بغیر، اور غضب یہ ہے کہ یہ حضرات استدلال کرتے ہیں اس سے کہ جب مثلاً غالب کے لکھے ہوئے لفظ "ہنی" کو "ہنے" لکھا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے املائے غالب کو بدل دیا، اس لیے ہمیں کلام غالب میں خورشید، گذشتہ اور تڑپنا (وغیرہ) لکھنا چاہیے جس طرح ہم بطور عموم لکھتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے ان حضرات کے اس استدلال پر۔ علمی زبان میں اسے قیاس مع الفارق کہا جائے گا یعنی دو ایسی باتوں کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا جن کا باہم تعلق ہی نہ ہو۔ خورشید اور خرشید بالکل دوسری بحث ہے اور ہنی اور ہنے بالکل دوسری صورت ہے۔ ان کو گڈمڈ کرنا، علمی بحث کو غیر علمی انداز سے روشناس کرانا ہے۔

تلفظ کا تعین

املا کے بعد تلفظ کا مسئلہ سامنے آتا ہے اس کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اگر کسی مصنف نے یہ التزام کیا ہے کہ ایسے خاص خاص لفظوں پر اعراب لگائے جائیں جن کے تلفظ میں کسی وجہ سے (مثلاً عربی، فارسی یا کسی دوسری زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے) غلطی رونما ہو سکتی ہے، تو وہ اعراب نگاری سے کام لے سکتا ہے، مگر اس کی حیثیت اختیاری ہوگی، اسے تدوین کا لازمی حصہ نہیں مانا جائے گا۔ کن لفظوں کے کن حرفوں پر زبر، زیر، پیش، جزم لگائے جائیں، یہ مرتب کی صواب دید پر منحصر ہے۔

دوسرے حصہ میں ایسے لفظ آتے ہیں جن کے تلفظ کا تعین مرتب کے لئے لازم ہوگا، اسے جزوِ تدوین مانا جائے گا۔ ایسے لفظ جن کا تلفظ عہدِ مصنف میں آج کے تلفظ سے مختلف تھا، ایسے لفظ جو اب اجنبی بن چکے ہیں، ایسے لفظ جن میں دبستانی اختلاف ہو، ایسے لفظ جن پر ضبطِ حرکت ضروری ہو معنی کے صحیح طور پر تعیین کے لئے، اس قبیل کے سبھی لفظوں میں اعراب نگاری کو لازم قرار دینا چاہیے ـــــ محض وضاحت کی خاطر میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں جس سے مندرجۂ بالا تعینات میں سے آخری تعین کی وضاحت ہو سکے گی۔ مولانا عرشی نے مقدمۂ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) میں لکھا ہے:

> "میرزا صاحب کے زمانے میں، بلکہ ان کے بہت بعد تک "اُس" اور "اُدھر" وغیرہ الفاظ کو بہ قاعدۂ اعراب بالحروف "اوس" اور "اودھر" لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس کا التزام رکھا تھا۔ میں نے واو گرا کر، اس کی جگہ پیش کا التزام کیا ہے، لہٰذا جس الف کو آپ مضموم نہ پائیں اسے یہ سمجھیں کہ میرزا صاحب نے اسے بے واو کے ہی لکھا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور اپنی طرف سے اسے مضموم قرار دے لیا، تو یہ ان کی منشا و مراد کے خلاف ہو جائے گا، اور آپ شاعر کے کلام کی وہ تاویل کر بیٹھیں گے جو اسے منظور نہیں تھی۔ جیسا کہ اس شعر میں واقع "اِدھر" کو "اُدھر" پڑھ کر، اس کا ایک مطلب بیان کیا جاتا ہے،
>
> منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
> عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
>
> چونکہ میرزا صاحب کی زندگی کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں اس شعر کے اندر "ادھر" بے واو ہے، کسی ایک جگہ بھی "اودھر" بہ واو نہیں ہے، اس لئے اس لفظ کو "اُدھر" پڑھنے والے کا مطلب قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔"
>
> (طبعِ اول، ص ۱۱۸)

یا جیسے "چھپنا" اور اس کے مشتقات کہ عہدِ میر امّن میں فصحائے دہلی "چھِپنا" بہ کسرِ اول بولتے تھے اور بعد کو کسرہ ضمہ سے بدل گیا، غالب کے ایک خط میں "چھُپنا" بہ ضمِ اول کی صراحت موجود ہے۔ اب دلّی والے "چھُپنا" کہتے ہیں، مگر لکھنؤ میں یہ مصدر بہ کسرِ اول مستعمل رہا ہے۔ یا اور ایسی متعدد مثالیں میں نے اپنے ایک مضمون "تدوین اور اعراب نگاری" میں یک جا کر دی ہیں۔ تفصیلات کو وہاں دیکھا جا سکتا ہے (مشمولۂ رسالہ

اکادمی، لکھنؤ، جولائی ۱۹۸۲ء) ایسے جملہ الفاظ میں اعراب نگاری کو جزوِ تدوین سمجھنا چاہیے ۔

دکنی ادب، جسے اُردو کی قدیم شکل کہا گیا ہے، اگر مرتّب کیا جائے اس میں تو بہت سے ایسے الفاظ، بل کہ بیشتر ایسے الفاظ سامنے آئیں گے جن پر اعراب لگانا از بس ضروری ہوگا، شمالی ہند درکنار، اب خود دکن میں لوگ اکثر قدیم الفاظ سے اچھی طرح واقف نہیں، اعراب کے بغیر ایسے لفظوں کو صحیح طور پر پڑھا ہی نہیں جاسکتا، اس لیے مرتّب کے لئے لازم ہوگا کہ وہ ایسے سب لفظوں کو ضبطِ حرکات کے ساتھ درجِ متن کرے۔ اس کے بغیر منشائے مصنّف کی صورت گری نہیں ہوسکے گی۔

علامات

اس بات کو بطور اصول سامنے رکھنا چاہیے کہ جہاں تدوین کا مقصد یہ ہے کہ متن کو منشائے مصنّف کے مطابق پیش کیا جائے، وہیں یہ بات بھی اس میں شامل ہے کہ قاری اس متن کو صحیح طور پر پڑھ سکے۔ متن پڑھنے ہی کے لئے مرتّب کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ سارے اضافے، جو خواندگی میں، یعنی صحیح طور پر خواندگی میں معاون ہوسکتے ہیں۔ ان کے شمول کو مناسب سمجھا جائے گا، یا ضروری۔ اعراب نگاری اسی بنا پر کبھی مناسب، یعنی اختیاری ہوسکتی ہے اور کبھی اس کو لازم قرار دیا جائے گا۔ وہ علامات جن کی مدد سے معروف، مجہول، مخلوط اور غنّہ آوازوں کا تعین کیا جاسکتا ہے، اُن کی حیثیت بھی اعراب جیسی ہوتی ہے، اسی لئے کبھی اُن کا شمول اختیاری ہوسکتا ہے اور کبھی ضروری۔ اعراب کی طرح علامتیں بھی صحیح تلفظ کے تعین میں معاون ہوتی ہیں، اس لئے اُن کا درجہ وہی ہوگا، حیثیت وہی ہوگی جو اعراب سے متعلق ہے۔

بہت سے لفظ ایسے ہوسکتے ہیں جن میں قاری کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہوسکتا ہے کہ اُن میں یؔ یا واؔو کی آواز معروف ہے، مجہول ہے، یا مخلوط۔ مخلوط آواز ہمزہ سے بھی متعلق ہوسکتی ہے۔ قدیم الفاظ غیر مستعمل یا کم مستعمل الفاظ کے تلفظ میں یہ مشکل اکثر سامنے آتی ہے اسی وجہ سے اعراب کے ساتھ ساتھ ایسی علامتوں کو شاملِ متن کرنا ضروری ہے جن کی مدد سے قاری ایسے الفاظ کو صحیح تلفظ پر قادر ہوسکے۔

ایسے کون سے لفظ ہوسکتے ہیں، اس کا تعلق مرتّب کی صواب دید سے ہوتا ہے، اس بات کی تکرار کی جاتی ہے کہ اعراب کی طرح علامات کا شمول بھی اختیاری اور لازمی، دو حصّوں میں منقسم ہوگا۔ جن الفاظ میں مذکورہ آوازوں کا تعین اوسط درجے کے قاری کے لئے مشکل ہوسکتا ہے، اور ایسے الفاظ کے تلفظ میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے، وہاں علامات کا شمول لازمی ہوگا دوسرے مقامات پر مرتّب کی صواب دید کے مطابق اختیاری ہوگا۔ ہاں دکنی ادب کی تدوین میں اعراب کی طرح علامتوں کے شمول کو بھی لازم قرار دیا جائے گا۔ یوں کہ دکنی الفاظ میں آوازوں کا صحیح صحیح تعین طالبِ علم اور عام قاری کے لئے ناممکن کی حد تک مشکل ہوگیا ہے۔

توقیف نگاری (پنکچوئیشن)

رموزِ اوقاف عبارت میں شامل ہوں، تو عبارت کو صحیح طور سے پڑھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہی ان کے شمول کی وجہِ جواز ہے اکثر قدیم مصنّفین کی تحریروں میں ان کا وجود نہیں ملے گا، اس طرح یہ اضافہ ہوگا، یوں کہ اس اضافے سے عبارت کے پڑھنے میں اور مطلب سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے، اور بہت سے مقامات پر قاری غلط خوانی یا غلط فہمی سے محفوظ رہ سکتا ہے، اس لحاظ سے یہ اجزا گویا منشائے مصنّف کی بازیافت میں معاون ہوتے ہیں۔ اس طور پر دیکھا جائے تو ان کی شمولیت ضروری قرار پائے گی۔ دکنی ادب ہو یا شمالی ہند کا ادب ہو، دونوں کا حکم اس لحاظ سے ایک جیسا ہے۔ نوطرزِ مرصّع شمالی ہند کی نثری کتاب ہے، اس کے متن کو صحیح طور پر پڑھنا رموزِ اوقاف کے بغیر مشکل اور مشکل تر ہے، یہی احوال کربل کتھا کا ہے اور یہی حال غالب کے دورِ اوّل کی شاعری کا ہے۔

اردو میں رموزِ اوقاف کا باضابطہ رواج اپنی ابتدائی شکل میں فورٹ ولیم کالج کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ اب گویا یہ طے شدہ ہے کہ متن کو اس سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ کاما، فل اسٹاپ، سیمی کولن، کولن، استفہامیہ، ندائیہ، قوسین اور واوین، اس کے اہم اجزا ہیں۔ یہ سب عبارت خوانی اور عبارت فہمی میں مددگار ہوتے ہیں۔ انھیں بھی منشائے مصنّف کے تعین میں معاون اجزا کے طور پر دیکھنا چاہیے اور اس اعتبار سے ان کے شمول کو بھی تدوین کا ضروری حصّہ ماننا چاہیے۔ مذکورہ اجزائے توقیف نگاری کی تعریف اور عملی استعمال کے لئے قواعدِ اردو (مولوی عبدالحق مرحوم) اور اُردو املا (مولفہ راقم الحروف) کو دیکھنا چاہیے۔ ان کتابوں میں ساری

ضروری تفصیلات ملیں گے۔

(الف) تشدید اور اضافت کے زیر: یہ دونوں بھی ضروری اجزا ہیں۔ تشدید تو جزوِ املاے لفظ ہے۔ جس لفظ میں حرفِ مشدّد ہو، اس کو اگر تشدید کے بغیر لکھا جائے تو اُس لفظ کے املا کو ناتمام املا ماننا چاہیے۔ روزمرّہ کی تحریروں میں عام طور پر تشدید کا التزام نہیں کیا جاتا، حالاں کہ کیا جانا چاہیے، یہ کوئی اضافی حصہ نہیں، یہ تو لفظ کا حقیقی جزو ہے۔ تشدید ایک حرف کے قائم مقامی کرتی ہے، وہ ہم کو بتاتی ہے کہ فلاں حرف دو بار شامل تلفّظ ہے، بہ ہر صورت تدوین میں مشدّد حروف پر تشدید لکھنے کو لازم سمجھنا چاہیے۔

(ب) اب رہا اضافت کا زیر، تو یہ بھی تشدید کی طرح جزوِ لفظ ہوتا ہے اور اس طرح شاملِ املا ہوتا ہے۔ جس طرح ہم تشدید لکھنا ضروری نہیں سمجھتے اُسی طرح اضافت کے زیر بھی پابندی کے ساتھ نہیں لگاتے، حالاں کہ لگانا چاہیے۔ چوں کہ اضافت کا زیر، تشدید کی طرح جزوِ املاے لفظ ہے اس بنا پر تدوین میں اسے ضروری قرار دیا جانا چاہیے۔ اگر مشدّد حرفوں پر تشدید نہ ہو، یا اضافت کے زیر التزام کے ساتھ نہ لگائے گئے ہوں، تو ایسے الفاظ کے املا کو نامکمل ماننا چاہیے۔

اضافت کے زیر کا مسئلہ تشدید کے مقابلہ میں زیادہ توجّہ طلب ہے۔ ایک مثال سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکے گا، مولانا عرشی نے مقدمۂ دیوانِ غالب میں لکھا ہے:

"علامتِ اضافت نہ لگانے سے جس قسم کی غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، اس کی مثال یہ شعر ہے:

دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے ۔۔۔ غمِ آوارگیہاے صبا کیا

اس کے پہلے مصرعہ کے الفاظ "عطر پیراہن" کو بہ کسرۂ را اور بدونِ کسرہ، دو طرح سے پڑھا جاسکتا ہے، مگر میرزا صاحب نے پہلے "بوا ے پیراہن" لکھا تھا، جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ مقصودِ شاعر مرکّب اضافی ہے اور اُس نے "بو" کی جگہ "عطر" اس لئے رکھا ہے کہ اوّل الذکر کی تعمیم دور ہو جائے۔ لہٰذا اگر یہاں علامتِ اضافت نہ لگائی جائے گی، تو ہم مرادِ شاعر سے دور جا پڑیں گے" (ص ۱۱۹)

اسی کتاب میں شامل ایک مضمون "تدوین اور اعراب نگاری" میں اس کی مزید وضاحت دیکھی جاسکتی ہے۔

(ج) تخلّص پر جو متعارف نشان (ـــ) بنایا جاتا ہے، جیسے اختر انصاری، اس اضافہ کو بھی ضروری سمجھنا چاہیے۔ خاص ناموں کو عبارت میں ممتاز رکھنے کے لئے کچھ لوگ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اُن پر خط کھینچ دیتے ہیں، جیسے: میراَمَن، گلستاں، دہلی، قطب مینار یہ مناسب طریقۂ کار ہے۔ اگر اس کی مکمل طور پر پابندی کی جائے، تو اسے محاسنِ تدوین میں شمار کرنا چاہیئے۔ البتہ اسے اختیاری مانا جائے گا، جب کہ تخلّص کے نشان کو ضروری قرار دیا جائے گا۔ ہاں، جو نام مع تخلّص آئے ہوں، اُن میں صرف تخلّص پر نشان بنانا چاہیئے، نام پر خط نہیں کھینچنا چاہیے، جیسے: سکندر علی وجد، معین احسن جذبی، جگت موہن لال رواں ۔۔

□□

حواشی:

[1] قاطع برہان، مشمولہ "قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ" مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۱۴۱۔ [2] ایضاً۔ [3] میر مہدی مجروح کے نام خط میں غالب نے لکھا ہے، "وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی، اس میں "خُر" بہ خاے مضموم "نورِ قاہر" کو کہتے ہیں اور چوں کہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے اس واسطے آفتاب کو "خُر" لکھا اور "شید" کا لفظ بڑھا دیا۔ "شید" بہ شین مکسور و یاے معروف بر وزنِ عید روشنی کو کہتے ہیں..... فقیر "خُر" جہاں بے اضافۂ لفظ "شید" لکھتا ہے، موافق قاعدۂ عقلاے عرب بہ واو معدولہ لکھتا ہے، یعنی "خور"، اور جہاں بہ اضافۂ لفظ "شید" لکھتا ہے وہاں بہ پیروی بزرگانِ پارسی سر بہ سر لفظ "خور" کو بے واو معدولہ لکھتا ہے، یعنی "خرشید" (خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۲۸۸) [4] تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے، "دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو..... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یاے تحتانی تین طرح پر ہے، جزوِ کلمہ، مصرع: ہماے بر سرِ مرغاں ازاں شرف دارد۔ مصرع: اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشاے را، یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یاے تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے، اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ دوسری تحتانی مضاف ہے، صرف اضافت کا کسرہ ہے، ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے: آسیاے چرخ یا آشناے قدیم توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فداے تو شوم۔ رہنماے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔" (ایضاً ص ۲۳) [5] "خورشید" اور ذال کے سلسلہ میں اہلِ علم نے غالب کے اقوال کو درست نہیں مانا ہے۔ ذال کے سلسلہ میں قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مقالات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی صاحب کا مقالہ رسالہ آج کل فروری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا، اور صدیقی صاحب کا مقالہ ان کے مجموعۂ مضامین مقالاتِ صدیقی (جلد اول) میں شامل ہے۔

[6] مرزا غالب نے [illegible]

یادوں کی رہگزر — ص۵ کا بقیہ

مستثنیات سے تھا وہ تحریک آزادی کا اہم ستون رہا ہے۔ سیاست کی حد تک عربی مدارس کے طلبا رفتہ رفتہ جنگ آزادی اور طلبا، کی سیاست سے وابستہ ہو چلے تھے۔ ایک طرف جامعہ ملیہ اور دیوبند کا اثر تھا، اور دوسری طرف اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت و خطابت کا کہ ان کی صفوں میں بھی بے چینی پیدا ہوئی۔

طلبار کے مطالبات کو لے کر سلطان المدارس اور ندوۃ العلما میں اسٹرائک بھی ہوئی۔ اس سلسلے میں میرے چھوٹے بھائی سید علی سجاد سلمہ، کا اور میرے دوست عبداللطیف اعظمی صاحب کا نام لیا جا سکتا ہے کیفی اعظمی نے جو اس زمانے میں عربی کے وسطی درجات کے طالب علم تھے طلبار کی حمایت میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ عربی مدارس کے کئی طلبار سے تحریک کے سلسلے میں روابط رہے ہیں اور ان حضرات نے جنگ آزادی میں حصہ بھی لیا ہے۔ اسی طرح سنسکرت پاٹھ شالاؤں کے طلبار سے تحریک کو برابر مدد ملتی رہی ہے۔ جلسے، جلوس سیمنار سے لے کر سیر زندان تک ان کے حصے میں بھی آئی۔ اب نہ وہ تحریکیں ہیں نہ ان سے وابستگان کی باتیں کرنے والے ؎

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

□□

اردو کے عظیم شاعر فراق گورکھپوری کی ولادت کے سو سال پورے ہونے پر نیا دور انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اپنا خاص نمبر

"فراق: صدی کی آواز"

کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے — ایڈیٹر

(بقیہ حواشی) اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا اسلام"۔ (خطوط غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۱۷۹)۔ یہی بات انھوں نے اپنے رسالۂ تیغ تیز میں لکھی ہے، وہاں نون غنہ زیر بحث ہے۔ معترض کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اسی ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں جہاں "کندیدن" کو غلط بتاتے ہیں اور "ماند" و "خواند" کو بر وزن چاند غلط بتاتے ہیں، اور "مند" و "خند" کو بر وزن تند و کند صحیح فرماتے ہیں...... یہ لہجہ ہے نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبع قواعد کا چاہیئے۔ لہجے کی تقلید بہروپوں اور بھانڈوں کا کام ہے"۔ (قاطع برہان و رسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۲۷۰) اس موضوع پر میں نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جو میرے مجموعۂ مضامین تفہیم میں شامل ہے۔

۵۷ داغ نے رند، ذوق اور میر کے اشعار سنداً لکھے ہیں۔ ذوق کے شعر یہ ہیں:

"ہوں وہ لاغر، جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے ۔۔۔ جوں کباوہ لچکے ہے پائے مگس کے بوجھ سے

نکلے دنیا سے کہاں احمق، اٹھا کر بار حرص ۔۔۔ رہ گیا یہ تو گدھا دلدل میں پھنس کے بوجھ سے

دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں چوتھے مصرع میں "پھنس" (مع نون) چھپا ہوا ہے۔ بہ طور عموم اس مصدر کو مع نون غنہ لکھا جاتا رہا ہے۔ جہاں تک "پھنس" اور "خس" اور "مگس" کے ہم قافیہ ہونے کا تعلق ہے، تو اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے جو خورشید لکھنوی نے اپنی کتاب افادات میں لکھی ہے۔ انھوں نے "پھنس" کو مع نون غنہ مانا ہے اور وضاحت کی ہے کہ قواعد قافیہ کی رو سے اس کا تقفیہ ان الفاظ کے ساتھ جائز ہے جن میں حروف روی سے پہلے نون غنہ نہ ہو۔ مثلاً "پھنس" کا قافیہ "دس" ہو سکتا ہے۔ (افادات، ص ۹۸) لغت نویسوں نے بہ طور عموم اسے مع نون غنہ لکھا ہے (آصفیہ، نور، سرمایۂ زبان اردو) بحر لکھنوی نے بھی اپنے رسالۂ لغات المصادر، بحر البیان میں اسے مع نون غنہ درج کیا ہے (بحر کے اس رسالہ کا خطی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے)
میں نے اپنے مجموعۂ مضامین زبان اور قواعد میں اس کا مکمل متن شامل کر لیا ہے، ان تصریحات کی روشنی میں واضح طور پر داغ کا قول درست نہیں معلوم ہوتا، اس کے باوجود ان دواوین میں اس مصدر کے مشتقات کو نون غنہ کے بغیر ہی لکھا جائے گا۔

۵۸ مخزونۂ کتب خانۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، اس خطی نسخہ کا عکس میرے سامنے ہے۔ یہ مکمل مخطوطہ میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میر امن کی خود نوشت تحریر کا یہ واحد نمونہ ہے۔ باغ و بہار کی تدوین میں املاے الفاظ اور تلفظ کے سلسلے میں اس کو سامنے رکھا گیا ہے۔ میر امن نے بہت سے لفظوں پر اعراب لگائے ہیں۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی طرف سے یہ شائع ہو چکا ہے۔

جواہر لال نہرو

میں نے دیکھا ہے کئی بار تجھے
میری آنکھوں نے گلابوں کو ترے چوما ہے
تیرے جلووں کو نگاہوں میں بسا رکھا ہے
تیرا ماحول پہ اک نرم حسیں سایا ہے

اور محسوس ہوا ہے اکثر
روشنی جیسے مہکتی ہو شبستانوں میں
جیسے کوئی رم آہو ہو بیابانوں میں
سرخئ لب کا تری رقص ہو پیمانوں میں

جیسے اک چیز دگر ہو کوئی
ترا احساس، تری فکر، ترا طرزِ عمل
نغمۂ رزم کبھی اور کبھی روحِ غزل
تو ہے وہ شاہجہاں جس کے کئی تاج محل

جب مورخ کا قلم اُٹھے گا
تجھ کو اس عہد کا خورشیدِ سحر لکھے گا
تیرے کردار کو معراجِ ہُنر لکھے گا
تیرے اوصاف کو اک چیزِ دگر لکھے گا

یہ مری نیک تمنّائیں ہیں
ایسا اک جذبۂ ابنائے وطن ہو جائے
ایکتا اور اہنسا کا چلن ہو جائے
ہر طرف تیرے گلابوں کا چمن ہو جائے

فاخر جلال پوری
جلال پور
ضلع فیض آباد (یو پی)

توصیف کے حقدار نہرو

تھے دانش وَر بڑے فن کار نہرو
نئے بھارت کے تھے معمار نہرو
پیمبر تھے وہ امن و آشتی کے
مجسّم پیار کے مینار نہرو
غریبوں کے لئے جو تھے مسیحا
تو دُکھیاروں کے تھے غم خوار نہرو
تھے سارے ملک کے بچّوں کے چاچا
کہ بچّوں کے لیے تھے پیار نہرو
وطن کے واسطے ہر پل تھا اُن کا
کہ تھے ایثار ہی ایثار نہرو
وہ تھے جمہوریت کی اک نشانی
تھے سیکولرازم کے مینار نہرو
وطن کے واسطے ہر دُکھ اُٹھایا
رہے نہ قید میں بیزار نہرو
وہ باپو کے بڑے ہی معتقد تھے
تھے ہر آواز پر تیّار نہرو
تھے فرقہ واریت کے وہ مخالف
تھے نفرت کے لیے تلوار نہرو
وہ اپنے آپ میں خود انجمن تھے
کہ ہیں توصیف کے حقدار نہرو

ڈاکٹر امام اعظم
اُردو ادبی سرکل
قلعہ گھاٹ
دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴

رفعت سروش
اے۔ ۸۰ سیکٹر ۲۷، نوئیڈا ۲۰۱۳۰۱

ایک فینٹسی

ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا....

وہ ایک پُراسرار عمارت تھی۔ کتھئی رنگ کی سنگین عمارت
عمارت کیا تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کا ایک کچھوا ہے،
جس کا بے ڈول جسم کئی گنا پھیل گیا ہے۔ میں جب بھی اس طرف سے
گزرتا، عجیب عجیب خیالات آتے ـــــ کبھی لگتا یہ بھوتوں کا اڈہ
ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے ممی ہے جو کسی کی غلطی سے ہندستان میں
وجود پا گئی ہے۔ کبھی اس عمارت کے بند شیشے سے گانے بجانے
کی آوازیں آتیں۔ کبھی چیخنے چلانے اور شدومد سے بحث و مباحثہ
کرنے کی۔ سنا تھا کہ اس عمارت میں مُردوں کے کفن بھی موجود ہیں۔
ـــــ تو کیا یہاں مُردے بستے ہیں!! میرا ذہن سوال کرتا، اور
خیالوں کی رَو اس چُھنے اور پتھر کے ڈھیر کو اور بھی پُراسرار
بنا دیتی۔

اور پھر ایسا ہوا کہ اس عمارت کا بھوت سچ مچ مجھ پر چڑھ
گیا۔ میں ہر وقت اس کے خواب دیکھنے لگا۔ سہانے خواب،
ڈراؤنے خواب، سوتے خواب، جاگتے خواب ـــــ
ایک دن اس کے پاس سے گزرتے گزرتے ایسا لگا کسی نے
میرے قدم روک دیے۔ میں جیسے پتھر ہو گیا اور منہ اُٹھالے اس
پر کندہ تحریر کو پڑھنے لگا "عزالستان" ہیں۔ یہ کیسا لفظ ہے۔
'غزلستان' ہوتا تو کچھ بات بھی تھی۔ "عزالستان" کیا یہ کوئی جنگل ہے
نہیں نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ معلوم نہیں صحیح یا غلط ـــ
مجھے ایسا لگا جیسے لکھا ہے ـــ 'قبرستان' ـــ تو کیا یہ مقبرہ ہے
کسی عالی مرتبت کا۔ اور کیا صاحبِ قبر اس کے اندر زندہ ہے جو وقت
بے وقت عجیب عجیب اور کبھی کبھی دحشت انگیز آوازیں نکالتا ہے
ـــــ میں نے جتنا سوچا، سوال اور اُلجھتا گیا۔ اب میرے
قدم خود بخود اس کی طرف اُٹھ گئے۔ ایک مجاور نما سپاہی نے مجھے گھورا
میں نے اسے گھورا ـــــ اس نے مجھے ٹوکا۔ میں نے اُسے
ٹوکا ـــــ تھوڑی دیر میں میں نے اسے مرعوب کر لیا اور اس نے
مجھے شاید نیا زندہ مُردہ سمجھ کر ایک عدد سلام مارا۔ میں فخر سے
اکڑ گیا اور اسی اکڑ میں اندر گھستا چلا گیا۔

اندر پہونچا تو یہ جگہ جیسے طلسم خانہ تھی ـــ ایک بڑے
شیشے کے قبرستان میں ادھورے کفن پہنے سیکڑوں سال پُرانی
لاشیں کھڑی تھیں۔ پڑی تھیں، کسی کا ہنستے ہنستے منھ کھلا رہ گیا تھا
کسی کا ناچتے ناچتے پاؤں ٹیڑھا اور ہاتھ اٹھا ہوا رہ گیا تھا۔ کہیں
جمی جمائی محفل اچانک جم کر رہ گئی تھی۔ کسی کا ہاتھ بڑھا ہوا، کسی کی
گردن جھکی ہوئی، کسی کی تیوری چڑھی ہوئی ـــ غرض جو جس حال میں
تھا منجمد تھا ـــ شیشے کے اس قبرستان میں شریف زادیاں بھی
بے پردہ تھیں۔ اس شیش محل کے ایک کونے میں ایک قبر پر
جھکی ہوئی عورت نما کوئی چیز نظر آئی۔ میں نے سوچا یہ لاش شیشے
کی قبر سے نکل بھاگی۔ مگر خیریت گزری کہ میں نے اسے چھو کر نہیں
دیکھا۔ اس کی آنکھیں متحرک ہوئیں تو میں نے محسوس کیا کہ وہ لاش
نہیں مجاورہ ہے۔ لاشوں کی صحبت نے اسے اس درجۂ کمال
تک پہونچا دیا ہے۔

میں اس قبرستان کے کونے کونے میں گھسی چھپی قبروں کو دیکھتا
بھالتا رہا، ایک عدد دالان اور اس کے پیچھے ایک لمبا چوڑا کمرہ
جس کے بیچوں بیچ ایک بہت لمبی میز پڑی تھی، میری توجہ کا مرکز
بن گیا ـــ اس لیے نہیں کہ میز بہت ہی لمبی چوڑی تھی، بلکہ اس لیے
کہ اس کے چاروں طرف کئی مُردے اونگھ رہے تھے ـــ اور عجیب

پُراسرار اور پُرہیبت منظر تھا۔ ایک مردہ ——— شاید پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف کرم خوردہ کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ پُرانی ——— اتنی پُرانی کہ یہ تحقیق کرنا مشکل تھا کہ یہ کتابیں حضرت نوحؑ کی کشتی سے اُتار کر یہاں لائی گئی تھیں یا حضرت نوح علیہ السلام ان کتابوں کو بے مصرف سمجھ کر یہاں چھوڑ گئے تھے، اور یہ سخت جان طوفان سے لڑتی بھڑتی اس قبرستان میں آکر پناہ گزیں ہوگئی تھیں۔ اوّل تو ان کرم خوردہ کاغذوں کو کتابیں ہی ثابت کرنا مشکل تھا۔ مگر اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ہمارے موصوف مُردے" ان کتابوں سے کچھ ایسا اخذ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس سے زمان و مکان کا فاصلہ مٹ جائے اور ماضی حال، اور حال ماضی بن جائے۔ ہم اس مردے سے مرعوب ہونے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ ایک ارسطوئے وقت کی بیجان آنکھوں نے ہمیں پتھرایا ہوا اشارہ کیا۔ ہم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو اتفاق سے اس کی روح کے قفس عنصری سے پرواز کے وقت کھلی رہ گئی تھیں۔ گویا یہ آنکھیں نگراں تھیں، اور مسلسل جائزہ لیے جارہی تھیں کہ گرد و نواح میں کاروبارِ ممات اطمینان سے چل رہا ہے یا نہیں ۔؟ زوال پذیر حکومتوں اور ہارے ہوئے سیاست دانوں کے ہیولے فضا میں ناچ رہے تھے اور ماحول لمحہ بہ لمحہ زیادہ پراسرار ہوتا جارہا تھا۔

ان اہم مُردوں کے کچھ مصاحب مُردے بھی تھے جو اپنے ممدوحین کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش میں پتھرا گئے تھے۔ مردوں کی یہ گول میز کانفرنس قبرستان کے دستور العمل پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی، مگر اب شاید دستور بھی گول ہوگیا تھا، کیوں کہ مُردے بے عمل ہوگئے تھے۔

اور اس سے پہلے کہ کوئی پراسرار کمند مجھے بھی اس قبرستان کے منجمد ماحول میں گھسیٹے، میں اپنے بچے کھچے حواس بجا کر کے سرپٹ دوڑا۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے محسوس کیا کہ کچھ آوازیں میرا تعاقب کر رہی ہیں، آوازیں جو اس پراسرار قبرستان کے سینے سے بلند ہو رہی تھیں اور فضا کو مکدّر کر رہی تھیں۔ شاید کچھ مُردے جاگ گئے تھے ——— یا کوئی بے زبان زندہ ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور وہ اسے بھی اپنا جیسا بنانے کی سعی ناکام کر رہے تھے۔

میں دوڑے جارہا تھا کہ اچانک ایک ہیولیٰ میرے سامنے آگیا اور میں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ ہیولیٰ میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور بولا:

"مجھے ان ہوس پرستوں سے بچاؤ۔"

میں نے کہا، "کون ہو تم۔؟"

اس نے جواب دیا: ؎

" چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا"

میں سمجھ گیا کہ یہ صاحبِ قبر ہے جو مجاوروں کے قہر و غضب سے تنگ آکر نکل بھاگا ہے۔ میں نے پوچھا،

" تم کیا چاہتے ہو۔؟"

بولا: " سکون کی موت! مجھے اس رُسوائی سے بچاؤ۔"

میں نے اسے دبوچا اور تیزی سے دوڑا اور اسے اس کی مرضی کے مطابق "غرقِ دریا" کر کے سکون کا سانس لیا۔

□□

غزل

افتخار احمر

شامِ سیاہ زلف کی آوارگی کا نام
اور صبحِ زرنگار تری خندگی کا نام

جنّت جسے کہیں وہ کوئی اور شے نہیں
یہ بھی ہے اور اک تری ہمسائگی کا نام

اب بے نیازِ ہوش و خرد ہو چکا ہوں میں
رکھیے کچھ اور اب مری دیوانگی کا نام

ساقی کی چشمِ مست سے اک شے چھلک گئی
پھر لے لیا کسی نے مری تشنگی کا نام

ہر اک صنم کے چہرے سے جھلکے گی داوری
احمرؔ نہ لیجیے گا یہاں بندگی کا نام

غزلیں

یہ کیسی پُھدکتی چنگاری در آئی ہے میرے بستر میں
اک دیپ جلا ہے پلکوں پر اک آگ لگی ہے منظر میں

مانا کہ زمیں کا ذرّہ ہوں لیکن یہ عزائم ہیں میرے
سُورج کی سُنہری کرنوں کو پہنچا کے رہوں گا گھر گھر میں

بس یاد کے چنچل جھونکے کو بیدار ذرا ہو جانے دو
زخموں کے اُجالے بھر دیگا تنہائی کی کالی چادر میں

پرچھائیں اگانے کا کرتب ہر ایک کے بس کی بات نہیں
ہر ایک میں ایسی تاب کہاں لے آئے جو سُورج کو گھر میں

وہ ایک سپاہی دُور کہیں بیٹھا ہے تھکا ماندا سا نذیرؔ
بِسترِ اُسے بھی کر لینا تم شامل اپنے لشکر میں

نذیرؔ فتحپوری

دفتر "اسباق" ۲ نیتا

یہ نہ سمجھو کہ ہمارا نگراں کوئی نہیں
ہم وہاں بھی نہیں تنہا ہیں جہاں کوئی نہیں

اب تو ہر سانس میں آتی ہے اسی کی آواز
پہلے سمجھے تھے "پسِ پردۂ جاں" کوئی نہیں

آج بھی اس درِ دولت پہ گئے تھے لیکن
دی یہ سناٹوں نے آواز یہاں کوئی نہیں

کوئی اسلوب نہیں اشکِ ندامت سے بلیغ
اور خموشی سے حسیں طرزِ بیاں کوئی نہیں

بیٹھے ہیں سایۂ دیوار میں سب اہلِ وفا
زیرِ شمشیر و سرِ نوکِ سناں کوئی نہیں

ڈر رہا ہوں ترے دروازے پہ دستک دیکر
کہیں آئے نہ صدا تیرا یہاں کوئی نہیں

ڈاکٹر پیام اعظمی

تنظیم المکاتب
گولہ گنج لکھنؤ
۲۲۶۰۱۸

دل سے ہے خود دار، بظاہر میں ہوں رندِ ناکام
لاکھ میخانوں کا حاصل مرا ٹوٹا ہوا جام

صبح قسمت میں تمہاری، مری تقدیر میں شام
اس پہ مغرور ہو کیوں؟ یہ ہے مشیت کا نظام

حسن کا زاویۂ فکر بدل جاتا ہے
بے رُخی کو نہ بقا ہے نہ توجّہ کو دوام

بابِ غربت پہ ہو جس طرح فقیروں کا ہجوم
اس طرح خانۂ دل میں ہے اُمیدوں کا قیام

یاد کے دشت میں ماضی کے ہیں پژمردہ پھول
نہ گلستاں کی ہوائیں نہ کوئی ان کا پیام

جس نے احساس یہ بخشا تھا کہ میں شاعر ہوں
یاد ابھی ہے تری نظروں کا وہ اندازِ کلام

جس میں عرفانِ محبّت ہے نہ امکانِ وفا
قاسمؔ اس طرح کا جینا ہے بہرحال حرام

قاسم شبیر نقوی

شبیر منزل۔ نصیر آباد
ضلع رائے بریلی

فیاض رفعت
دور درشن کیندر، ۴۴، اشوک مارگ لکھنؤ

عصمت آپا کا آخری انٹرویو

غالباً ۱۹۹۰ء کی بات ہے، عصمت آپا کو مدھیہ پردیش حکومت کے سب سے بڑے اعزاز "اقبال سمّان" سے سرفراز کیا گیا تھا، جسے قبول کرنے کے لیئے وہ بھوپال تشریف لائی تھیں۔ راقم الحروف ان دنوں معاون ڈائرکٹر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو میں اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہا تھا، ہماری دعوت پر عصمت آپا اسٹوڈیو میں تشریف لائیں اور ان کے ساتھ یہ یادگار انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ اس انٹرویو میں شفیقہ فرحت اور سلطانہ جعفری بھی شریک گفتگو رہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق عصمت آپا کا یہ آخری انٹرویو ہے جو اُن کی زندگی میں ریکارڈ کیا گیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیئے اس صدا بند انٹرویو کو تحریری شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس انٹرویو کے ٹرانس کرپشن کے لیئے محمد خالد عابدی اور منّان خاں بھوپالی کا شکر گزار ہوں۔

——— ف۔ ر

فیاض رفعت: آل انڈیا ریڈیو کی یہ روایت رہی ہے کہ ہمارے ادب میں اور ہمارے فائن آرٹس میں جو بڑی بڑی شخصیتیں ہیں، جب جب موقع آتا ہے تو ہم انھیں اپنے یہاں مدعو کرتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں ... آج ہمارے درمیان عصمت چغتائی اردو افسانے کا ایک بہت بڑا نام، چالیس برسوں سے، جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے .....

عصمت چغتائی: جیسے باقی سب مر گئے .....

فیاض رفعت: .... عصمت آپا کا نام سنتے آئے ہیں، اور بھی نام ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی ہیں، سعادت حسن منٹو ہیں اور کرشن چندر ہیں، ایسا نہیں ہے اور ادب میں تو بڑی گنجائش ہے اور کوئی بھی آدمی حرفِ آخر اس میں نہیں ہوتا ہے۔ تو عصمت آپا سے میری ملاقات ہوئی ہے بمبئی میں گھر پر بھی ہم ان سے ملے ہیں لیکن ان کی عادت ہے، جیسا کہ شاید بڑے لوگوں کی عادت ہوتی ہے، یہ بھول جاتی ہیں، اور ایک موقع یہ بھی آیا تھا کہ راجندر سنگھ بیدی کا آخری انٹرویو ہم نے اور عصمت آپا نے مل کر بمبئی میں لیا تھا۔ آج کی اس تقریب میں ان کے علاوہ، چونکہ ایسا ہے معزز مہمان تو دو ہی ہیں اور باقی ہم لوگ اپنے آپ کو میزبانوں میں شمار کیے لیتے ہیں، ان میں پروفیسر شفیقہ فرحت اور سلطانہ جعفری صاحبہ میری بہت محترم اور سردار جعفری صاحب کے تعلق سے بھی میری بزرگ ہیں — تو عصمت آپا اصل میں اب ہم افسانے پر تو بہت بات کر سکتے ہیں، پچھلے بیس برسوں میں افسانے کا جو منظرنامہ ہے وہ بالکل بدل چکا ہے۔ جب آپ نے افسانے لکھے تو اس وقت عورت مظلوم تھی، استحصال اس کا ہوتا تھا، اسے ایکسپلائٹ کیا جاتا تھا اور وہ چار دیواری کے اندر محصور تھی اور اس کو وہ ساری Facilities نہیں تھیں لیکن آج جو خاتون ہے اور جو عورتیں ہیں، وہ آپ دیکھتے ہیں کہ انجینئر بھی ہیں، ٹیکنالوجی میں بھی ہیں، ہوائی جہاز بھی اڑاتی ہیں، آئی اے ایس کی سروس میں بھی ہیں، ایڈمنسٹریشن میں بھی ہیں، گورنر بھی ہیں اور آپ کی طرح سے قدآور مصنفہ بھی ہیں

تو میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اب اس نئے تناظر میں آپ کے افسانوں کا موضوع کیا ہوتا ہے۔ ؟

عصمت چغتائی ، جو کچھ دیکھتی ہوں لکھ دیتی ہوں۔

فیاض رفعت ؛ یہ تو صاحب ایک STATEMENT ہے جو وضاحت چاہتا ہے۔

عصمت چغتائی ؛ میں نے دل سے (بنا کر) کچھ نہیں لکھا۔ میں نے جھوٹ کچھ نہیں لکھا۔ میں نے جو دیکھا وہ لکھ دیا، اور وہ سننے کے لئے انسان ابھی تیار نہیں ہے، ابھی تک تیار نہیں ہے کیونکہ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے اور مجھے سچ بہت میٹھا لگتا ہے مجھے بہت مار پڑی ہے سچ بولنے پر، جب میں چھوٹی تھی، جب کبھی میں سچ بولتی تھی تو بُرا لگتا تھا گھر والوں کو بجائے کیوں میں نے کہا ٹھیک بات تو کہہ رہی ہوں ۔ کیا کہہ رہی ہوں ۔ مگر لڑکیاں نہیں کہتیں ۔ میں نے کہا کیوں نہیں کہیں گی ۔ میں لڑکی ہوں، اگر آپ مجھے لڑکی نہ سمجھئے، بندریا سمجھ لیجئے، چونٹی سمجھئے، میرا کچھ نہیں بدلتا، مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

فیاض رفعت ؛ یہ... آپ اپنے... سچ کی تھوڑی سی وضاحت کردیں، اور یہ دوسرے یہ کہ کیا آپ ایسا نہیں سمجھتیں کہ سچ اور جھوٹ میں بہت کم فاصلہ رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ جھوٹ اور سچ کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔

عصمت چغتائی : جو لوگ بدل لیتے ہیں جھوٹ کو سچ میں، بس اس کو بدلنے نہیں دیتی ہوں، میں وہ سچ لکھ دیتی ہوں، یہ بُرا لگتا ہے لوگوں کو ...

شفیقہ فرحت: میں یہ کہنا چاہ رہی تھی آپ نے یہ کہا کہ آپ کے سچ کو قبول نہیں کیا گیا، یا نہیں کیا جاتا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آپ کے سچ کو تو قبولیت ملی۔

عصمت چغتائی ؛ اسی سے تو غصہ ہیں لوگ، اسی سے خفا ہوئے کہ اس کو لوگوں نے مان لیا۔

شفیقہ فرحت : ایک ایک لفظ کو اس کے صحیح مانا ہے ۔

سلطانہ جعفری : اصل میں یہ ہے کہ ان کا سچ جن کے لیے سچ تھا ان کو اچھا لگا اور جن کے خلاف پڑتا تھا اُن کو بُرا لگا۔ عورتوں کے حق میں بولیں، عورتوں کی آزادی کے لیے، عورتوں کے حقوق کے لیے، انھیں بہت اچھا لگتا تھا....

عصمت چغتائی ؛ کہ یہ ہماری عورتوں کو بگاڑتی ہیں ۔

سلطانہ جعفری ؛ جو ان کی حق تلفی کرتے ہیں، ان کو بُرا لگتا ہے ۔ وہ مقدمے چلاتے ہیں ان کے اوپر۔

عصمت چغتائی : تو اس کا میں نے یہ جواب دیا تھا کہ میں اسلئے بگاڑتی ہوں کہ یہ سنوار دیں۔ یہ سنوارنے کا کام کر رہے ہیں نا، تو میں بگڑی ہوئی عورتیں ان کے پاس بھیجتی ہوں، جاتے ہیں یہ سنوار دیتے ہیں تو کچھ کام تو ہے ان کو کرنے کے لیے، تو اس کا مطلب یہ کہ میری مدد سے پہنچتی ہیں ان کے پاس بُری لڑکیاں جو یہ سنبھال لیتے ہیں۔

شفیقہ فرحت : آپ کے افسانوں میں جو کردار ہیں وہ ساری کی ساری بُری عورتیں تو نہیں ہیں۔ بہادر با ہمت لڑکیاں ہیں، ان کو آپ نے ....

عصمت چغتائی ؛ نہیں بُری نہیں ہیں، بُرے راستے سے صحیح راستہ انھوں نے اپنا پہچانا ہے، ہمت نہیں تھی ان میں کہ اپنے لیے سچا انصاف لے سکیں ۔ میں نے انھیں انصاف لینا سکھایا ۔

سلطانہ جعفری : تمھارے کرداروں میں زیادہ تر تو متوسط طبقے کی لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ وہ بری عورتیں تھیں کسی لحاظ سے ۔ کچھ افسانے ہیں جو....

عصمت چغتائی ؛ نہیں، جو جوتے کھاتی تھیں، جو پٹتی تھیں ان کے لیے میں نے لکھا ہے، ان پر مجھے غصہ آتا تھا۔

سلطانہ جعفری ؛ نہیں تو، لیکن وہ عورتیں بُری نہیں تھیں، سماج ان کے ساتھ ناانصافی کرتا تھا، ان کو مارتا تھا، بدکرداری کرنے پر انھیں مجبور کرتا تھا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بُری عورتیں تھیں ۔

عصمت چغتائی ؛ نہیں تھیں۔ عورتیں بُری کردی گئی تھیں ۔

عورتیں کچل دی گئی تھیں، بُری نہیں تھیں، وہ بے بس تھیں بے بسی! میرے خیال میں ان کا سر جُھکا دینا، ان کا غلط بات مان لینا یہ جُرم تھا اُن کا۔ اس سے لڑو۔ میں نے کہا کہ نہیں مانو، کیا کرلیں گے تمہارا۔؟

سُلطانہ جعفری: یہ بات تو صحیح ہے کیونکہ جس زمانے میں تم نے لکھنا شروع کیا، اس زمانے میں عورت ظاہر ہے کہ بے حد بند تھی۔ کہنا چاہیے کہ اس کی ہر صلاحیت ڈبیہ میں بند کردی گئی تھی گھر کی چار دیواری میں۔

شفیقہ فرحت: عورت سماجی اعتبار سے کمزور کبھی تھی وہ آج۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہر میدان میں عورت حاوی ہے۔

عصمت چغتائی: قد تو پانچ فٹ سات انچ ½، انچ ہے (میرا) میں کہاں، تو میں تو نہیں تھی نا؟ میں تو اپنے دو بھائیوں سے لمبی نکلتی تھی۔۔۔۔ پہاڑ سی ارے کہاں جارہی ہے یہ؟ ارے دیکھو تو سہی۔۔۔۔ میں نے کہا: ڈبے میں بند کردو مجھے صندوق میں تو میں سر نہ نکال سکوں۔۔۔ اور کیا کر سکتی ہوں۔

فیاض رفعت: جیسا کہ ہم نے آپ سے عرض کیا کہ یہ موضوع کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ State ہوچکا ہے۔ اب تناظر بدلا ہوا ہے Perspective بدلا ہوا ہے۔ عورتیں شاید اتنی مظلوم نہیں رہیں۔

عصمت چغتائی: ایک طبقے کا نہیں بدلا ہوا ہے۔ آپ نے وہ ریلز (Reals) نہیں دیکھیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ اب بھی عورتیں رنڈیاں بن رہی ہیں اور رنڈیوں کی طرح استعمال ہورہی ہیں، ان کے میاں ان کی کمائی کھا رہے ہیں بیٹھ کے۔ انھوں نے شادیاں کرلی ہیں تو اس کا مطلب یہ کہ رنڈی بننا نہیں چھوڑا ہے یہ بتایئے کیا شادی کرنے سے انھوں نے اس کو کچھ عزت دے دی ہے۔؟ نہیں! جو پیسے والی بیوی ہے اس کو اچھی طرح رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کا باپ تگڑا ہے، اس کے بھائی ٹھکائی کریں گے ہماری، تو وہ تو جو تے کے بل پر اس کا حق۔۔۔۔

سُلطانہ جعفری: نہیں تو یہ تو حقیقت ہے کہ اس وقت بھی ایک طبقہ تھا جس کی زندگی پر تم نے روشنی ڈالی اور جس کو تم نے راہ دکھائی، یا کہ ہمت دلائی اور آج بھی وہ طبقہ بڑا ہوگیا میں کہوں گی کیوں کہ اب بہت سارے ایسے لوئر میڈل کلاس کی لڑکیاں پڑھ لکھ کر آگے بڑھی ہیں لیکن جو اکثریت ہے عورتوں کی وہ ابھی تک آتنی ہی پچھلی ہوئی ہے کیوں کہ جب تک ان کو اقتصادی آزادی نہیں ملے گی وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔

عصمت چغتائی: نہیں تو۔۔۔۔ یہ صدیوں سے Matriarchal سوسائٹی سے مرد کے ہاتھ میں طاقت گئی تھی۔ پہلے یہ مردوں کو ایسے ہی پالا کرتی تھیں، عورتیں ایک ایک جتنی شہزادیاں ہوتی تھیں وہ اچھے ہینڈسم لمبے چوڑے خوبصورت لڑکے پالا کرتی تھیں۔ وہ بھی ایک مٹھی بھر شہزادیاں تھیں۔ آپ نے کیتھرائن دی گریٹ (Cathrine the Great) کے بارے میں سُنا ہے، پڑھا ہے۔ اس نے بہت خوبصورت لڑکے چُن کے ان کی رجمنٹ بنائی تھی۔

سُلطانہ جعفری: تو یہ تو اس وقت مثالیں ہیں چند دُنیا بھر میں اگر تم۔۔۔۔

عصمت چغتائی: نہیں تو سنو تو سہی، ایک مثال۔۔۔۔ دماغ کے اوپر اتنے زور سے پڑتی ہے، اس پہ اتنا غصّہ آتا ہے کہ پھر اور جگہ بھی جہاں کم سے زیادہ ظلم ہورہا ہے وہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔

فیاض رفعت: اچھا عصمت آپا! تھوڑا سا اس کا موضوع بدلتے ہیں۔ کیونکہ ہم لوگ ظاہر ہے انفارمل گفتگو کے لیے آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔

عصمت چغتائی: ہاں، ہاں۔۔۔۔

فیاض رفعت: گفتگو ہماری بالکل انفارمل ہے اور ایکسٹمپور بھی ہے، ایک عرض میں یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ ظاہر ہے کہ آدمی کو اپنے Contemporory تو Haunt کرتے

رہتے ہیں اور منٹو کا آپ نے بہت ذکر کیا ہے، آپ
ان کے ساتھ بہت اٹھی بیٹھی ہیں۔ تو منٹو میں اور اپنے
آپ میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں۔؟

عصمت چغتائی: وہ مرد تھا اور میں عورت تھی۔

فیاض رفعت: نہیں کیا وہ بھی Dominant تھے۔ کیا وہ ...

عصمت چغتائی: نہیں وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔

فیاض رفعت: نہیں اپنے افسانوں میں، اپنے فن میں ...... ان کے
افسانوں کی، فن کی بات ...... یا پھر ان کی ذاتیات!

عصمت چغتائی: وہ زیادہ تر کہتا تھا کہ عورتوں کے پاس جاتا تھا،
کچھ نہیں جاتا تھا پھسڈی تھا۔ میں نے اس سے یہ کہہ دیا کہ
"میں یقین نہیں کرتی تم بہت پاکیزہ آدمی ہو۔"
(بولا) "میں نہیں ہوں، میں غنڈہ ہوں۔"
میں نے کہا: "تم جھوٹ بولتے ہو۔"

فیاض رفعت، میری غرض یہ تھی کہ انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں
اس میں بھی عورتوں کی جو اہمیت ہے ان کا استحصال ہے
اس کے خلاف جو آواز اٹھائی ہے ابھی آپ نے بعض
اشارے کیے۔

عصمت چغتائی۔ یہ ہو رہا ہے ملک میں (پہلے بھی ہوتا رہا ہے،
اور اب بھی ہو رہا ہے)

فیاض رفعت، منٹو کا ایک افسانہ "بابو گوپی چند" ہے جیسے یہ ساری
چیزیں ان کے یہاں بھی ہیں۔ جس لڑائی کی طرف آپ نے
اشارہ کیا ہے اس لڑائی میں ایک مرد افسانہ نگار منٹو بھی
رہا ہے آپ کے شانہ بشانہ۔ اس کے متعلق آپ کی
کیا رائے ہے۔؟

عصمت چغتائی: ہاں ..... ہم دونوں کا انداز الگ الگ ہے
(موضوع مشترک ہے، وہی استحصال کے خلاف لڑنا)
بھئی۔ میرے بھائی عظیم بیگ چغتائی کو لے لیجئے
ان کی کچھ شکلیں ملنے لگتی ہیں، کچھ ٹی۔بی کا شکار جو ہوتا ہے
جس میں میں اپنے بھائی کو جب دیکھتی تھی تو مجھے منٹو
کی طرح لگتا تھا۔ جب میں نے منٹو کو دیکھا تو مجھے اپنا
بھائی یاد آیا اور میں نے کہا کہ اس کے اوپر یہ ٹی۔بی سوار
ہے۔ وہ ڈینائی (Deny) کرتا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہے
اور میرے بھائی بھی، یہ کہ تم مجھے ایکسپلائٹ کرنے
کے لیے، بیوقوف بنانے کے لیے ایسا کہتی ہو۔

شفیقہ فرحت: تو کیا اس کا اثر ان کے منٹو کے فن پر تھا۔؟
اس بیماری کا یا Self Defence کا جو attitude تھا،
اس کا اثر آپ نے اُن کے فن پر محسوس کیا۔؟

عصمت چغتائی: میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کو جو بیماری نہیں بھی
ہے وہ بھی محسوس کرتا ہے

سلطانہ جعفری: Sensitive بہت تھے وہ۔

عصمت چغتائی: یہ کہ جو اس پر نہیں بیت رہی ہے، وہ بھی جھیل
لیتا تھا، کیوں کہ وہ جھیل چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ آدمی
اس اسٹیج میں ہے جس میں سے نکل آیا وہ۔

سلطانہ جعفری: میں یہ سمجھتی ہوں کہ منٹو جو تھے وہ سرجن تھے اور
تم جو ہو Paedeatrics میں کام کرتی تھیں، جنرل
پریکٹس نرس! (قہقہہ)

عصمت چغتائی: اسے بہت بخار چڑھا ہوا تھا اس وقت اور
اسے معلوم ہوا کہ میں آئی ہوں تو اُٹھا چلا آیا اور لڑنے
آیا، اور مجھ سے ناراض! میں نے کہا: "میرے بھائی۔"
(بولا) "میں تمھارا بھائی نہیں ہوں۔"
میں نے کہا "بھائی نہیں، بھائی جیسا۔" بدتمیز تو ہے
(قہقہہ)

فیاض رفعت: اچھا آپ تو بہت قدآور افسانہ نگار ہیں،
آپ اپنے ساتھ کچھ اور خواتین کے نام ....

عصمت چغتائی، میں پہلے ہی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ سب نے
کہہ دیا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔

فیاض رفعت، اچھا، اچھا اور اپنی پسندیدہ خواتین کے نام
لیجئے جو ایسی ہی مشہور ہیں، افسانہ نگار ....."

شفیقہ فرحت، افسانہ نگار! آپ کی نظر میں آج آپ کن افسانہ نگاروں کو اہمیت دیتی ہیں جو آج کے دور میں لکھ رہی ہیں۔

فیاض رفعت: ان افسانہ نگاروں کے نام لیجیے نام!

شفیقہ فرحت: جن کو آپ پسند کرتی ہیں۔

عصمت چغتائی: نام لوں گی تو وہ بُرا مان جائیں گی۔ میں کیوں نام لوں (فیاض رفعت کی ہنسی) یاد ہیں مجھے سب کے نام۔۔

فیاض رفعت: کسی کا نام۔؟

عصمت چغتائی: جیلانی... بہت اچھا لکھ رہی ہے، ہم سے آگے ہے، ہمیں خوشی ہے

فیاض رفعت: یہ تو آپ کی رائے ہے۔

عصمت چغتائی: نہیں، رائے نہیں یقین ہے میرا۔ بہت اچھا لکھ رہی ہے اور یعنی متاثر کرتی ہے، مجھے متاثر کرتی ہے، میں مان گئی۔ اب وہ اکڑے وکڑے گی تو اکڑے۔

فیاض رفعت: اچھا پاکستان میں جو خالدہ اصغر ہیں، جمیلہ ہاشمی ہیں اور....

عصمت چغتائی: یہاں بڑی مشکلات ہیں، چھپنے چھپانے کی۔! پاکستان میں تو بہت لوگوں کا ذریعۂ آمدنی ہے۔ لکھنا... اس نے بہت کمایا ہے لکھ کے! اور اس کا شوہر اتنا نیک آدمی ہے، بے چین رہتا ہے کہ میری بیوی ختم کرے اور یہ سو جائے تو اب پڑھوں۔ (ہنسی) ایسے شوہر دیکھے ہیں آپ نے؟

فیاض رفعت: شوہر تو سب ہی نیک ہوتے ہیں صاحب!

(ہنسی)

عصمت چغتائی: (طنزاً) سب ہی نیک ہوتے ہیں۔ اکثر نیک ہوتے ہیں۔

فیاض رفعت: شوہر "بظاہر" سب کے نیک ہوتے ہیں صاحب!

عصمت چغتائی: اتنے پیارے انسان تھے۔ کرشن، بیدی منٹو اور اشک۔ چاروں سے اتنی لڑائی ہوتی تھی۔ بہت لڑائی ہوتی تھی ان سے، میں ہمیشہ ان کی کاٹ کرتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بھائی میرے اپنے ہیں اور چار یہ دس ہو گئے۔ بالکل اتنا ہی میں ان سے لڑتی تھی یہ اتنا ہی مجھ سے چڑتے تھے، جتنا میرے سگے بھائی چڑتے تھے....

شفیقہ فرحت: آپ میرے خیال سے Provoke کر کے لوگوں سے اگلوا لیتی ہیں، سب کچھ لے لیتی ہیں، سب کچھ نکلواتی ہیں اور یہ ....

سُلطانہ جعفری: اور یہ Provocation ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔

عصمت چغتائی: ہاں ہاں۔

شفیقہ فرحت: سماج میں بھی آپ نے یہی کیا، اپنے کرداروں کے ساتھ بھی یہی کیا۔ جب تک آپ کسی کو چڑھا نہ دیں، سوئی نہ بھونک دیں، گہری مت بھونکیے کہ سیپٹک ہو جائے ایسی بھونک دیں کہ وہ بے چین ہو جائے اور بھول جائے کہ مجھے ایک جگہ قائم رہنا ہے۔ ایک جگہ اپنی Dignity میں مرد ہوں آخر کو...... تو وہ بھول جاتا ہے تھوڑی دیر کے لیے وہ مرد ہے، جلی ہوئی باتیں کر دیتا ہے۔

فیاض رفعت: ناول جیسے، ہمارے یہاں لکھا گیا، اس برصغیر میں، تو ظاہر ہے قرۃالعین حیدر کا اپنا ایک بڑا کنٹری بیوشن (Contribution) ہے، لیکن ان کے علاوہ، عبداللہ حسین اور شوکت صدیقی نے جو ناول لکھے ہیں "اداس نسلیں" اور "خدا کی بستی"، یا ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" ہے میں سمجھتا ہوں اس معیار کے ناول ہمارے یہاں ہندستان میں نہیں لکھے گئے۔ اس کی کیا وجہ ہے آپ کی نظر میں؟

عصمت چغتائی: پڑھو بھی نہیں تو بھی کہہ دو کہ یہ اچھے ہیں۔ اچھے لکھنے والے ہیں، ایمان داری سے کہہ دیتے اچھے یہاں بھی ہیں وہاں بھی ہیں!

فیاض رفعت: قرۃالعین حیدر کا جو ناول "آگ کا دریا" ہے" پہلے پاکستان میں ہی چھپا ہے اور وہ شاید پاکستان میں وہیں لکھا بھی گیا تھا۔

عصمت چغتائی: پورا نہیں ہوا تھا۔

فیاض رفعت: نہیں نہیں وہیں چھپ چکا تھا، پورا ہو گیا تھا۔

شیفتہ فرحت: چھپ گیا تھا۔

عصمت چغتائی: تو کیا ہوا؛ ان لوگوں کو تو ذریعۂ آمدنی بھی ہے!

(بات پاکستان میں کیوں الجھی رہے)

فیاض رفعت: برصغیر کا لفظ استعمال کیا، ہندستان کا جو کینوس ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ حیات اللہ انصاری نے ایک ناول لکھا "لہو کے پھول" خواجہ احمد عباس نے ایک ناول لکھا "انقلاب" لیکن اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ شاید اس پائے کے یہ ناول نہیں ہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی چاہتا تھا۔

عصمت چغتائی: میں ڈگریاں نہیں بانٹتی ہوں، مجھے کسی کی چیز بہت زیادہ اچھی لگ جاتی ہے، کوئی ایک پوائنٹ بھی لگ جاتا ہے تو مجھے پوری چیز اچھی لگنے لگتی ہے میں شاید کچھ اپنے دماغ سے....

سلطانہ جعفری: اردو ادب میں میرے خیال سے جتنی افسانہ نگاری ہوئی ہے اور ہو رہی ہے ناول نگاری اتنی نہیں ...

عصمت چغتائی: اس کے لیے ناول چھپوانے کے لیے بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے۔

شفیقہ فرحت: اور پھر ناول وقت بہت چاہتا ہے۔

عصمت چغتائی: وہاں روزنامے اور ہفتہ وار نکلتے ہیں وہ یہ سلسلے وار ناول.....

فیاض رفعت: اچھا آپ کی اپنی رائے کیا ہے خود، آپ نے جو ناول لکھے ہیں، "معصومہ" ہے آپ کا۔ "شہری لڑکی" ہے، "ضدی" ہے۔ ضدی کے بارے میں جو کنٹروورسی ہے (Controversy) کہ وہ آپ کا اوریجنل ناولٹ نہیں تھا، یہ صحیح ہے؟

عصمت چغتائی: میری تو کوئی بھی چیز اوریجنل نہیں ہے، میں نے تو چرائی ہے ہر چیز، ہر ایک کے یہاں سے چرایا ہے

فیاض رفعت: ضدی کہاں سے چرایا ہے؟

عصمت چغتائی: ضدی.... ؛ ارے یاد رہتے ہیں، کوئی چوری یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے؛

(قہقہہ)

فیاض رفعت: اچھا شاہد لطیف صاحب نے تو لکھ کر نہیں دیا آپ کو؟

عصمت چغتائی: نہیں شاہد نے تو .....

شفیقہ فرحت: اس کا تو کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

عصمت چغتائی: شاہد کی کوئی چیز بتا سکتے ہیں آپ۔ اس کی لکھی ہوئی؛ اچھی!؟

فیاض رفعت: اب آپ کے، دیکھئے آپ کے سامنے میں بالکل...

عصمت چغتائی: نہیں نہیں میں چاہتی ہوں، اپنی بات کہو۔

فیاض رفعت: لیکن آپ کے سامنے فکشن میں چراغ بہت کم لوگوں کا جلتا ہے۔

عصمت چغتائی: نہیں یہ دیکھئے.... شاہد نے....

فیاض رفعت: اتنا بڑا قد ہے آپ کا افسانے کی دنیا میں کہ شاہد لطیف چھوٹے پڑ گئے۔

عصمت چغتائی: شاہد دب گئے تھے انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا، میری وجہ سے!

شفیقہ فرحت: ویسے ضدی تو بہت پہلے لکھا گیا تھا....؟

عصمت چغتائی: کیوں کہ مجھے تو زیادہ شہرت یا بدنامی، کچھ بھی کہیے Imported ایک طرح کا تھا، مل گیا۔

فیاض رفعت: اچھا یہ جو ہمارے یہاں اعزاز، اکرام و انعامات ملتے ہیں، ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؛ کیا آپ نے ان کو قبول کیا ہے۔؟

عصمت چغتائی: کیا ہے۔ گورنمنٹ دے رہی ہے اگر کچھ...

فیاض رفعت: یعنی آپ اس سے اگری (Agree) کرتی ہیں کہ ان کا Judgement صحیح ہوتا ہے؟

عصمت چغتائی: نہیں، پیسہ نہیں ملا۔ پیسہ گورنمنٹ نے نہیں دیا "پدم شری" دیا۔

سلطانہ جعفری: اس معاملے میں تو میں یہ کہوں گی کہ ساری دُنیا میں نوبیل پرائز کو ہی لے لیجیے، اتنا مشہور اور اتنا بڑا مانا جاتا ہے، لیکن اختلافات اس کے بارے میں بھی ہیں

عصمت چغتائی: مجھے کوئی شکایت نہیں اپنی گورنمنٹ سے۔ مجھے کئی مرتبہ آفر ہوا کہ میں پاکستان میں .... میں نے کہا میں تو جی نہیں سکتی..... میں تو ہندستان میں اور انڈس کورٹ Indus Court میں جہاں میرا گھر ہے، وہیں زندہ رہ سکتی ہوں، وہ اپنا وطن لگتا ہے! صحیح ہے ایک چیز تو میں جھوٹ کیسے بولوں؟

شفیقہ فرحت: آپ کو تو اعزازات اتنے ملے ہیں، سرکاری بھی، اور سب سے بڑا اعزاز تو آپ کو پڑھنے والوں نے دیا ہے کون سا...... افسانے پر کوئی مضمون ایسا ہو ہی نہیں سکتا جس میں کہ عصمت چغتائی کا ذکر نہ ہو اور وہ مقام عصمت چغتائی کو نہ دیا جائے جو ان کو ملا ہوا ہے تو پڑھنے والوں نے اور نقاد نے کسی نے عصمت کے ساتھ ناانصافی نہیں کی، میرا خیال ہے اور حق ہے وہی مقام عطا کیا گیا ہے عصمت کو جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھیں۔

عصمت چغتائی: ہندستان کسی کے ساتھ کرتا ہی نہیں حق تلفی۔

فیاض رفعت: یہاں میں ذرا سی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے، اس سے آپ اتفاق کریں نہ کریں کہ رائٹر جو ہے وہ ہندستان یا پاکستان کا نہیں ہوتا۔

شفیقہ فرحت: (تائید میں) نہیں ہوتا۔

عصمت چغتائی: زبان کا ہوتا ہے۔ سب سے کمزور زبان تھی۔ اُردو کو کون Attention پے کرے انگلش میں۔

فیاض رفعت: نہیں صاحب اردو کو Attention پے کی جاتی ہے میں خود اُردو کا طالب علم ہوں، ریڈیو میں ہوں اُردو کی وجہ سے۔

عصمت چغتائی: اس زمانے کی اور بات تھی، اُس زمانے میں انگریز تھا جب میں نے لکھنا شروع کیا ہے۔

سلطانہ/شفیقہ (دونوں): ہم سب بیٹھے ہوئے ہیں۔

عصمت چغتائی: اور اُس زمانے میں صرف انگریزی چلتی تھی، اس میں میں نے اُردو چلادی۔

(ہنسی۔ قہقہے)

سلطانہ جعفری: نہیں بھی اُردو کا ادب موجود تھا کوئی یہ تھوڑی ہے کہ تمھارے ساتھ شروع ہوا۔

عصمت چغتائی: (موضوع بدلتے ہوئے): میں نے ان سے پوچھا کاتب صاحب سے پوچھا، وہ بھی گھسیٹ لائے گئے تھے۔

شفیقہ فرحت: اُس مقدمہ میں جو آپ پر چلایا گیا تھا۔؟

عصمت چغتائی: ہاں! کاتب صاحب بولے ابھی میرے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ میں نے کہا کس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔؟ گھر میں پیدا ہوا ہے۔ کسی کے بھی، چوہے کا بھی ہو سکتا ہے، بلّی کا بھی ہو سکتا ہے، کس کا بچہ؟ میرا ہی ہے۔ گھر میں؟ ۔ میری بیوی کے۔ بیوی کو "گھر میں" کہہ دیتے ہیں۔ کہنے لگے میرا اشارہ اپنی بیوی کی طرف ہے۔ میں نے کہا وہ گھر میں رہتی ہیں۔ جی ہاں رہتی ہیں۔ میں نے کہا، آپ کہاں رہتے ہیں؟ کیا سڑک پر سوتے ہیں۔؟

سلطانہ جعفری: یہ تو ایک محاورہ تھا خیر۔

عصمت چغتائی: ارے اُلٹی باتیں کرو تو سٹ پٹا جاتا ہے، بچارا بھولا آدمی۔

فیاض رفعت (ہنستے ہوئے): آپ کے سامنے تو صاحب جو آدمی بھولے نہیں ہیں وہ بھی سٹپٹا جاتے ہیں۔ سُنیے، وہ دہلی میں نیشنل بک ٹرسٹ کا ایک تھا نا اجلاس، وہاں ستیندر سنگھ آپ سے بات کرتے ہوئے کافی خفیف ہونے لگے۔ آپ سے بات کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے، اس لیے میں درخواست کروں گا صاحب آپ ہی لوگ کچھ ان سے گفتگو کریں اور...

سلطانہ جعفری: یہ میں نے آپ سے عرض کیا تاکہ ان کا ہمیشہ پیشہ رہا ہے الٹی بات کرنا۔ مثلاً یہ جو حقیقت ہے اس کو یہ

"ایزمٹ انڈر پریزنٹ" نہیں کرتیں بلکہ آپ کو Provoke
کرنے کے لیے الٹی بات کرتی ہیں کہ ...

عصمت چغتائی: کہ تم بھی مانو.....؟

سلطانہ جعفری: ایک چھوٹی سی مثال، طالب علمی کے زمانے کی ہے
کہ پروانے بہت سارے پڑے ہوئے تھے بلب کے پاس
میں نے کہا: عصمت! بہت پروانے پڑے ہوئے
ہیں۔ کہنے لگیں یہ پروانے تھوڑی ہیں یہ تو مچھر کے بچے
ہیں۔ میں نے کہا مچھر کا بچہ کب ہوتا ہے۔ کہنے لگیں
ہوتا ہے، مچھر کوئی اتنا بڑا تھوڑی پیدا ہوتا ہے۔
اب سوچیے آپ، یہ جانتی تھیں سب کچھ مگر مجھ کو Provoke
کرنے کے لیے۔

(فیاض رفعت کا قہقہہ)

عصمت چغتائی: مچھروں کے بھی تو پر ہوتے ہیں، اور مچھر بھی
جب آتے ہیں ان کے پر گر جاتے ہیں چیونٹیاں بن جاتی ہیں۔

سلطانہ جعفری: بھئی مچھر کا لاروا ہوتا ہے اور وہ جب نکلتا ہے
تو پوری طرح مچھر بن کے اس میں سے نکلتا ہے، بس
اتنا ہی بڑا، جتنا نظر آتا ہے۔

عصمت چغتائی: بھئی میں نے مچھر نہیں پالے کبھی .... میں نے
سوچا کہ شریفوں کی طرح وہ پیدا ہوتے ہوں گے۔

فیاض رفعت: آپ نے ایک کام ضرور کیا ہے، اپنا آپ کا جو
افسانوی ادب ہے اس سے الگ کہ آپ نے مردوں کے
پر بھی خوب کترے ہیں جہاں جہاں موقع آیا ہے تو کوئی
مرد بہت ہی ڈھیٹ تھا اس وقت۔

شفیقہ فرحت: کیا آج نہیں ہے؟ یا آج عورت اتنی
طاقت ور ہو گئی ہے۔

سلطانہ جعفری: ہاں عورت نے بتایا "میں بھی ہوں"۔

شفیقہ فرحت: آج کے زمانے میں عورت اتنی طاقت ور
ہو گئی ہے۔

سلطانہ جعفری: ہاں عورت نے بتایا "میں بھی ہوں"۔

شفیقہ فرحت: آج کے زمانے میں عورت اتنی طاقت ور ہو گئی
ہے کہ مرد اس کے سامنے قدرے کمزور لگنے لگا ہے۔
کیوں کہ آج کے زمانے میں عورت نے اپنا مقام پہچان
لیا ہے۔

عصمت چغتائی: وہ کمانے، لوٹنے کھسوٹنے، اپنے حق سے زیادہ
لینے، اس لوٹ کھسوٹ میں جٹ گیا ہے بچہ!

فیاض رفعت: اچھا اپنے علاوہ بھی آپ کچھ لوگوں کو پڑھتی ہیں؟
ادھر کچھ پڑھا ہے نیا آپ نے؟

عصمت چغتائی: سب کو پڑھا ہے۔

فیاض رفعت: نئے افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔؟

عصمت چغتائی: ہاں برابر پڑھا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا
کیا کہہ رہے ہیں۔

فیاض رفعت: جیسے انتظار حسین ہیں، انور سجاد ہیں، انتظار حسین
تو خیر نئے افسانہ نگار نہیں ہیں....

عصمت چغتائی: جدیدیت کے۔ وہ بورنگ زیادہ ہیں، وہ
ہنساتے رلاتے کم ہیں بلکہ کچھ کہے جا رہے ہیں خوبصورت
خوبصورت جملے جوڑ کے ...

فیاض رفعت: میں بات کر رہا ہوں ڈاکٹر انور سجاد کی، انتظار حسین
کی ...!

عصمت چغتائی: ہاں سب ہی یہی کر رہے ہیں۔

فیاض رفعت: خالدہ اصغر بھی، سریندر پرکاش بھی...

عصمت چغتائی: سب کمانے کے لیے ...... خیر یہ تھوڑی ہے
میں نے بہت دولت کمائی ہے اپنے قلم سے۔

سلطانہ جعفری: نہیں اب جیسے سریندر پرکاش کا آپ نے
نام لیا، ان کا "بجوکا" بہت خوبصورت افسانہ تھا۔

فیاض رفعت: اور ابھی انھیں اس سال ایوارڈ بھی ملا ہے۔
شاید، اکاڈمی نے ان کا احترام کیا ہے۔ ان کے فن کا،
ان کی شخصیت کا۔

عصمت چغتائی: تو ....؟ میں نے کب انکار کیا ہے .....

میں نے ان پر اعتراض کیا کبھی ۔ ؟

فیاض رفعت : وہ تو آپ کو حق ہے ۔ اعتراض ہم کر سکتے ہیں بھلا !

عصمت چغتائی : کیوں ..... مجھے حق نہیں ہے ۔

فیاض رفعت : جو چیز لکھی جاتی ہے پڑھی جاتی ہے That is over for Criticism

عصمت چغتائی : کوئی چیز میں ناپسند کروں۔ This is the real truth and I don't know ۔ میں نے بھی بہت سی سچائیاں لکھی ہیں جو دوسروں نے نہیں پہچانیں ' شاید میں نہیں پہچان رہی ہوں میں کیوں ان کو درست کروں ۔

شفیقہ فرحت : نہیں تو دیکھیے سچائی ہے یا نہیں اس افسانے میں وہ دوسری بات ہے لیکن وہ افسانہ متاثر کر رہا ہے یا نہیں کر رہا ہے ۔ یا ادب میں کوئی اپنا مقام بنا رہا ہے یا نہیں بنا رہا ۔

عصمت چغتائی : بنا رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ متاثر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ، میں کیوں پیمانہ بنوں ۔

شفیقہ فرحت : نہیں دیکھیے آپ تو پارکھ بھی ہیں ' ادب کی تخلیق کار کے ساتھ ساتھ ادب کو سمجھنے والی بھی ہیں ' تو ادب جو تخلیق ہو رہا ہے تو اس کے مقام کو بھی آپ سمجھیں ۔

عصمت چغتائی : کرٹیک بھی ہوں میں ۔

فیاض رفعت : میری غرض یہ تھی کہ اس میں Criticism کا سوال نہیں ' سوال یہ ہے کہ ہمارا عصری لٹریچر جو Contemporary Lit. ہے ظاہر ہے آپ پڑھتی ہیں ' اور اس کے بارے میں آپ کی ایک رائے بھی ہوگی ۔ اس میں ظاہر ہے کچھ لوگ اچھے لگتے ہیں کچھ برے لگتے ہیں اور ضروری نہیں کہ جو لوگ Establish ہوں ان کو ہی ہم پسند کریں ۔

عصمت چغتائی : زیادہ تر برے لکھ رہے ہیں لگتا ہے یقیناً میں پچھڑی رہ گئی ہوں ۔

فیاض رفعت : کیا برائی ہے ان میں ؟ مطلب ان کے Contents میں خرابی ہے Structure میں خرابی ہے ' ان کے اسٹائل میں خرابی ہے ۔

عصمت چغتائی : بتا تو رہی ہوں میں کہ بورنگ .....

شفیقہ فرحت : اس کا مطلب یہ ہوا کہ ..... ان کا انداز بیان اپیل نہیں کرتا اور وہ جو ترسیل کا المیہ جس کو کہتے ہیں کہ لکھنے والے اور قاری کے درمیان ایک رابطہ اور رشتہ قائم نہیں ہو پاتا ، آج کے افسانے میں بری Abstract Art کی طرح ابہام بہت زیادہ ہے ۔

عصمت چغتائی : ابہام اتنا کر دیا کہ کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی .... بھی آ رہی ہوگی کسی کے ' میں کیوں اعتراض کروں ۔

سلطانہ جعفری : بالکل صحیح بات ہے ' بلکہ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ ان کے Contens میں کوئی شعلہ نہیں ہے ' کوئی بات نہیں ہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں ۔

عصمت چغتائی : اب دیکھو یہ تو ادیبہ نہیں ہے ' یہ تو پڑھنے والی ہے ....

سلطانہ جعفری : اور بس الفاظ جملوں کی سجاوٹ اور اس پر بہت زور ہے اور یہ کہ میرا خیال ہے کہ ....

فیاض رفعت (عصمت آپا سے) نہیں صاحب یہ بھی لکھتی پڑھتی ہیں یہ بھی ادیبہ ہیں ۔

سلطانہ جعفری : ان میں کوئی لگن ' کوئی جذبہ ' کوئی احتجاج ' کوئی شعلہ نہیں ہے ، جو کہ ہمیں ان کی تحریروں میں نظر آئے ' اس لیے ان کی افسانہ نگاری جو ہے وہ کچھ پھیکی ہے ۔

شفیقہ فرحت : یعنی یہ بات آپ نے آج کے تمام عصری فن کاروں کے بارے میں کہی ہے یا کسی ایک دو کے بارے میں ؟ اچھا میں ایک نام اگر اجازت ہو تو ' میں ایک نام لوں کہ کیا وہ نام واقعی اہم ہے ۔ مثلاً آج اقبال مجید بہت اچھا لکھ رہے ہیں ۔

عصمت چغتائی : کہاں .... ؟ وہ پاکستانی ہیں یا .... ؟

شفیقہ فرحت : نہیں ' ہندستانی ہیں ، خالص ہندستانی ہیں اور بہت

اچھی چیزیں لکھ رہے ہیں۔

عصمت چغتائی: کون سی کہانی؟ ذرا بتایئے گا مجھے یاد نہیں۔

شفیقہ فرحت: دیکھیے اقبال مجید کے بھی ایک دو افسانے .... آپ کچھ بتایئے (فیاض رفعت سے مخاطب ہوتے ہوئے)

فیاض رفعت: "دو بھیگے ہوئے لوگ" ان کا بہت مشہور افسانہ ہے

شفیقہ فرحت: دو بھیگے ہوئے لوگ تو بہت پرانا افسانہ ہے، 'لباس'، 'پیڑ' سے کی آنی !...

عصمت چغتائی: یہ بتایئے کہ اِس در اصل contents بتایئے انھوں نے کس پائنٹ پر لکھا؟

فیاض رفعت: وہی زندگی کی بے رحمی جو ہے اور جو استحصالی قوتیں ہیں، جو ایک دوسرے کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔

عصمت چغتائی: اچھے خاصے ہیں وہ، رہتے ہیں، ان کا بہت اچھا مکان ہے، ان کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (سب کی ملی جلی ہنسی)
جھوٹ بولتا ہے وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

سلطانہ جعفری: تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ اگر ان کے پاس اچھا مکان ہے تو وہ سچ نہیں بول سکتے۔

فیاض رفعت: آپ کا مکان جیسا ہے (کسی کا نہیں) آپ کے مکان کی قیمت کیا ہے اس وقت معلوم ہے؟ ایک کروڑ روپیہ۔

عصمت چغتائی: نہیں میرا نہیں ہے، میں اپنا ایک کروڑ روپیہ کیوں ڈبوؤں گی؟

فیاض رفعت: ٹالسٹائی کی مثال لیجیے ...

سلطانہ جعفری: ٹالسٹائی کو لیجیے جو ایک نواب کہنا چاہیے اس زمانے کا تھا، کیا اس کی تخلیقات ہیں، کیا اس کی ناولز (NOVELS) ہیں .... اس لیے پیسہ، اس کی جو دولت ہوتی ہے وہ آڑے نہیں آتی اس معاملے میں کہ اس کی تخلیق کیا ہوگی۔

فیاض رفعت: بالکل درست ہے۔

عصمت چغتائی: لیکن وہ زمانہ اور تھا۔

فیاض رفعت: دیکھیے آدمی صاحب ثروت بھی ہو سکتا ہے اور اچھا رائٹر بھی ہو سکتا ہے۔

شفیقہ فرحت: صاحب دل ہے، صاحب نظر ہے (مراد فن کار سے ہے)۔

عصمت چغتائی: احساس محسوس کرنے کی طاقت، اور دوسری چیز، حالات دوسرے تھے۔

فیاض رفعت: بہرحال صاحب یہ گفتگو ایسے میں سمجھتا ہوں ختم نہیں ہوگی اور نہ ہم کسی نتیجے پر پہونچ پائیں گے۔ بہرحال یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ عصمت آپا یہاں تشریف لائیں، اور پروفیسر شفیقہ فرحت ظاہر ہے ہمارے بھوپال ہی میں ہیں، ان کو تو جب چاہیں بلا سکتے ہیں اور... سلطانہ جعفری صاحبہ کے دل سے ہم شکر گزار ہیں کہ وہ یہاں آئیں اور گفتگو زیادہ بہتر اور دلچسپ ہو پائی ورنہ شاید ہماری کوئی بات سنتی بھی نہیں عصمت آپا اور Negate ہی کرتی رہتیں اور اسی میں سارا وقت گزر جاتا۔ بہرحال آپ کو اعزاز مبارک ہو۔

عصمت چغتائی: دیکھیے، میرے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں، کہتے ہیں کہ آپ تصحیح کر دیجیے ہمارے یہاں اور مقدمہ لکھ دیجیے۔ میں نے کہا کہ دیکھیے میں کوئی پولیس مین نہیں ہوں جو مجھے مقدمے لکھنا آتے ہیں۔ میرا مقدمہ آپ کیا کریں گے لے کے۔

فیاض رفعت: چلیے کچھ بھی ہو، آپ بڑی افسانہ نگار ہیں، اس میں کوئی دو رائیں نہیں۔

شفیقہ فرحت: بہت بڑی۔

عصمت چغتائی: ۷۷ برس سے زیادہ کی ہوں۔

فیاض رفعت: افسانہ نگار بڑی عمر سے نہیں ہوتا صاحب۔

سلطانہ جعفری: تم تو رائٹر ہو۔ بڑی کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ تمہاری عمر کیا ہے — شاید اتنی ہی رہے گی، جتنی کہ تھی۔

فیاض رفعت: چالیس سال پہلے بھی آپ کی جو ذہنی عمر تھی، وہ اس سے بھی زیادہ رہی ہوگی۔

عصمت چغتائیؒ: اب تو بہت کم لکھتی ہوں میں، اور میں Provoke بھی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔

فیاض رفعت: بہت دل خوش آپ کی چیزیں ہوتی ہیں، دلخوش کن چلئے صاحب بہت بہت شکریہ۔ اور آپ کو پھر ایسا کوئی اعزاز ملے تو آپ تشریف لائیں اور پھر آپکے ساتھ گفتگو رہے۔

عصمت چغتائیؒ: کیا اعزاز دیا ہے کیا میں تاج محل بنواؤں اپنے لیے، ایک لاکھ روپیہ دے دیا ہے بدتمیز لوگوں نے۔

فیاض رفعت: نہیں نہیں اعتراف کیا ہے۔

عصمت چغتائیؒ: بڑھاپے میں آکے مجھے ذلیل کر رہے ہیں جیسے میں نے ہمیشہ اپنا بوجھ اٹھایا ہے میں نے اپنے باپ کا کبھی پیسہ نہیں لیا۔ میں نے اپنے باپ کی جائداد نہیں لی، حصّہ نہیں لیا۔

سُلطانہ جعفری: یہ تو اعزاز ہے۔

عصمت چغتائیؒ: اعزاز ہے تو پیسہ میں کیوں دے رہے ہو، آ کے سر پر ہاتھ پھیر دو بس۔

فیاض رفعت: تو بھی پیسہ آپ مجھے دے جائیے۔

(سب ہنستے ہیں)

غزل

مرزا محمد رازی صدر الحسنی

[illegible]

خزاں بدوش جو دیکھا حسیں بہاروں کو
گلے لگا لیا پھولوں نے ہنس کے خاروں کو
یہ سُن کے آیا پسینہ خرد شعاروں کو
جنوں پرستوں نے ٹھکرا دیا بہاروں کو
نظر جو چھیڑ گئی سازِ دل کے تاروں کو
قرار مدتوں آیا نہ بےقراروں کو
اسی نظر میں محبت اسی نظر میں فریب
سمجھ سکا نہ زمانہ ترے اشاروں کو
ہمارا ذکر ہی کیا ہے صدا خدا کی قسم
جھکا دیا ہے محبت نے تاجداروں کو

گذرا کل

برستے موسموں میں بھیگتے پیڑوں کی
شاخوں سے لپٹ جانا
اور اکثر خشک پتوں سے
دبے پاؤں کچھ اس طرح گزرنا
جیسے خدشہ ہو
تمھاری نیند کھُلنے کا
اگر ٹوٹی تو خوابوں کے گھروندے
ٹوٹ جائیں گے
یہ سب باتیں دبی ہیں
اب بھی ان گزرے ہوئے
لمحوں کے تکیے میں
مَیں جس پہ رکھ کے سر
کچھ خواب اکثر دیکھتی ہوں
مرے وہ خواب جن کی کرچیاں
اب بھی مری آنکھوں میں چبھتی ہیں
کھلی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتا
اشکوں کا وہ دریا
بندھی ہیں کشتیاں یادوں کی جن میں
اور سمیٹے ہیں کئی طوفان اپنے بادبانوں میں
یہ سب اب تک ہمارے ذہن کے پردے پہ
ایسے رقص کرتے ہیں
کہ جیسے فلم کوئی چل رہی ہو۔

ملکہ نسیم

۲۵۴۲۔ برڑوں کی گلی۔ موتی کٹلہ بازار
جے پور
(راجستھان)

افسانہ

سلام بن رزّاق
۹/۱۱، ایل۔ آئی۔ جی کالونی، کرلا (ویسٹ)
ممبئی ۴۰۰۰۷۰

بنارسی ساڑی

کملا دیوی کو وہ ساڑی بہت عزیز تھی، کیوں کہ وہ ان کے اکلوتے دیور نے خاص طور پر ان ہی کے لئے خریدی تھی۔ انھوں نے اس ساڑی کو اپنے صندوق میں سب کپڑوں کے نیچے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔

کملا دیوی کے شوہر دین دیال نیشنل کالج میں چپراسی تھے۔ انھیں ریٹائر ہوئے چند ہی مہینے ہوئے تھے۔ جس وقت وہ اس گھر کی بہو بن کر آئی تھیں، ان کی عمر چودہ برس کی تھی۔ چودہ برس کی عمر گرہستی کا بوجھ سنبھالنے کے لیے نہیں ہوتی، اور نہ اس عمر میں لڑکیوں کا ناپختہ ذہن ازدواجی زندگی کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس عمر میں تو لڑکیاں پہننے، اوڑھنے اور گھومنے پھرنے کے ارمان پورے کرتی ہیں، بعض تو گڑیا گڈّے کے کھیل ہی میں مگن رہتی ہیں۔ ان کی بہت سی ہمجولیاں ان کی شادی کے وقت اسکول ہی میں پڑھ رہی تھیں۔

چھٹی کلاس پاس ہوتے ہی جب اچانک انھیں گھر میں بٹھا لیا گیا تو وہ بہت روئیں مگر انھیں جلد ہی اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ گھر میں بیٹھنے کے تیسرے روز دین دیال سے ان کی منگنی ہو گئی۔ انھوں نے دین دیال کو نہیں دیکھا مگر دین دیال نے انھیں دیکھ لیا، کیوں کہ منگنی کے روز اپنی ماں کے کہنے پر جب وہ چائے کی پیالی لے کر بیٹھک میں پہونچیں تو ان کے ہاتھوں میں پیالی لرز رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ان کی سہیلیوں نے تو یہاں تک بتایا کہ تھوڑی سی چائے دین دیال کے کپڑوں پر بھی چھلک گئی تھی مگر انھیں کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا غیر مرد تھا جسے انھوں نے کچھ پیش کیا تھا۔

منگنی کے تین مہینے بعد ہی دین دیال سے ان کی شادی ہو گئی اور وہ کملا سے کملا دیوی بن گئیں۔ اس طرح ان کی بیوہ ماں نے اپنے سر پر پڑا ہوا برسوں کا بوجھ اُتار پھینکا۔

ہاں وہ بوجھ ہی تو تھیں۔ اس ملک کے ہر غریب گھرانے کی لڑکی پیدا ہوتے ہی والدین کے لیے بوجھ بن جاتی ہے، جسے وہ جوں توں کر کے چودہ پندرہ برس تک ڈھوتے ہیں، اور پھر موقع ملتے ہی سر سے اتار پھینکتے ہیں۔

جب کملا دیوی نے دین دیال کے گھر میں قدم رکھا تو یہاں نہ بلائیں لینے کو ساس تھی، نہ آرتی اتارنے کو نند۔ تین کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ برآمدے میں بیمار سسُر کی کھاٹ تھی، جو دن بھر اس پر بیٹھے مکھیاں اُڑایا کرتے اور کھانستے رہتے۔ کھاٹ کے چاروں طرف فرش اور دیواروں پر بلغم اور تھوک کے بڑے بڑے چکتے پڑے ہوئے تھے جو خشک ہو جانے کی وجہ سے مرغیوں کی بیٹ کی طرح لگ رہے تھے۔ گھر کی دیواروں پر کھٹملوں کا قبضہ تھا اور چھت پر مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ چوہوں نے فرش کو اس طرح کھود ڈالا تھا جیسے کسی نے سارے گھر میں ہل چلا دیا ہو۔

کملا دیوی دوسرے روز ہی سے اس طرح کام میں جٹ گئیں جیسے انھیں اسی مقصد کے لیے بیاہ کر لایا گیا ہو۔ سب سے پہلے انھوں نے مکان کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ دیواروں اور فرش کو لیپا پوتا۔ برآمدہ صاف کر کے سسر کی کھاٹ پر دھلی ہوئی چادر بچھائی۔ کھاٹ

کے نیچے اگالدان رکھا۔ دیور کو نہلا دھلا کر اسکول بھیجا اور جب شام کو دین دیال کام پر سے لوٹتے تو دروازے میں کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ کیوں کہ یہی ان کی ماں نے انھیں سکھایا تھا۔

دین دیال گھر میں قدم رکھتے ہی ٹھٹکے۔ گھر میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ کملا دیوی نے مسکرا کر گردن جھکالی، جیسے دین دیال کی ایک مسکراہٹ ہی ان کی ساری محنت کا بدل ہو۔

دن گذرتے رہے۔ دین دیال اپنی مختصر سی تنخواہ کملا دیوی کے ہاتھ میں لاکر دے دیتے، اور وہ ایسا ناپ تول کر خرچ کرتیں کہ اس میں سسر کی دوا بھی آتی، دیور کی کتابیں اور اسکول کے یونیفارم کا خرچ بھی نکل آتا اور سال میں ان کے لیے ایک موٹی جھوٹی ساڑی بھی آجاتی۔ کیا ہوا اگر وہ دودھ گھی نہیں کھا سکتے تھے، فاقہ تو نہیں ہوتا تھا۔ ریشم اور سلک کے کپڑے نہیں تھے تو کیا ہوا سال میں ایک سوت کی دھوتی تو مل ہی جاتی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھیں کہ سر پر قرض کا بوجھ تو نہیں۔ کسی کے آگے ہاتھ تو پھیلانا نہیں پڑتا۔ بوڑھا سسر بھی بہو کے سگھڑاپے سے مطمئن تھا۔ دو سال تک کھانستے رہنے اور خون تھوکنے کے بعد بہو کے ہاتھ سے گنگا جل پی کر اس نے اطمینان سے دم توڑا۔ اب کملا دیوی نے اپنی ساری توجہ دیور کو آگے تعلیم دلانے پر صرف کردی۔ ان کے اولاد نہیں ہوئی، مگر انھوں نے کنتل کو ہی اپنا بیٹا سمجھا۔ کنتل کو بھی اپنی بھابی سے ماں کی طرح پیار تھا۔ ان کے حکم کے بغیر وہ پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ دین دیال گھر کے جھمیلوں سے دور ہی رہتے۔ ان کا کام صرف پہلی تاریخ کو تنخواہ لاکر کملا دیوی کے ہاتھ پر رکھ دینا تھا اور بس۔ پھر روزانہ دونوں ہاتھ منھ دھو کر چوکے پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ سامنے آتا، چُپ چاپ کھا کر اُٹھ جاتے۔ نہ انھوں نے کبھی کملا دیوی سے کسی چیز کے پکانے کی فرمائش کی، نہ کبھی سالن یا کھچڑی میں نمک مرچ زیادہ ہو جانے پر ڈانٹا۔ وہ خاموش طبع تھے۔ وہ کالج میں چپراسی تھے، پرنسپل سے طلبا تک کے احکام پر عمل کرنا ان کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ دوسروں کا حکم بجالانا انھیں معلوم تھا، مگر دوسروں کو حکم کس طرح دیا جاتا ہے، وہ نہیں جانتے تھے ویسے بھی کملا دیوی کے سامنے ان کی شخصیت کچھ دبی دبی سی تھی۔ وہ کملا دیوی سے قد میں ایک مٹھی چھوٹے تھے اور ان کا رنگ سانولا اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ کملا دیوی کا رنگ گندمی تھا اور نقوش بڑے تیکھے تھے، مضبوط ہاتھ پاؤں اور کسا کسا بدن۔ وہ ایک محنتی مرہٹہ عورت کی سچّی تصویر تھیں۔ انھیں دین دیال سے بڑی محبت تھی۔ وہ وفا شعار بیوی کی طرح ان کی خدمت کرتیں۔ مگر دین دیال اپنی مٹھی بھر شخصیت کی وجہ سے کملا دیوی کے سامنے دبے دبے سے رہتے۔

کملا دیوی کا دیور کنتل اب کالج کے آخری سال میں تھا۔

کملا دیوی رات دن اس کی کامیابی کے لیے دُعائیں کرتی رہتیں۔ کنتل بھی خوب محنت کرتا تھا۔ بالآخر امتحان کے بعد نتیجہ بھی نکل آیا۔ کنتل فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہو گیا اور اسے فوراً ہی نیشنل کالج میں لیکچرر کا چانس بھی مل گیا۔ دین دیال کو ریٹائر ہونے میں صرف ڈیڑھ سال باقی تھا۔ کنتل نے انھیں سمجھایا کہ اب وہ استعفیٰ دے دیں۔ جس کالج میں بڑا بھائی ایک عرصے سے چپراسی گیری کر رہا ہو، وہیں چھوٹا بھائی لیکچرار کی حیثیت سے کام کرے، یہ کنتل کو اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ مگر دین دیال نہیں مانے۔ دین دیال کی کالج میں سبھی عزّت کرتے تھے۔ اب ان کا چھوٹا بھائی اسی کالج میں لیکچرار بھی تھا، اسی لیے اسٹاف ان کی اور بھی عزّت کرنے لگا۔

کنتل کو جب پہلی تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلے مارکیٹ کا رُخ کیا اور ڈھائی سو روپئے کی ایک بنارسی ساڑی خریدی.... ایک مرتبہ وہ کملا دیوی کے ساتھ اسی مارکیٹ سے اپنے یونیفارم کے لیے کپڑا خرید رہا تھا تو شوکیس میں ایک قیمتی ساری دیکھ کر وہ ٹھٹکا، اور اپنی بھابی کی طرف مڑ کر بولا:

"بھابی! آپ اس ساڑی میں کیسی لگیں گی۔؟"

پتہ نہیں اس کا یہ جملہ کملا دیوی کے احساس کے کس تار کو چھیڑ گیا کہ ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ کنتل ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب وہ گھر لوٹ آئے تو کملا دیوی اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر گر گئیں اور

سسکیاں بھرنے لگیں۔ کنتل دبے پاؤں ان کے کمرے میں چلا گیا، اور چپ چاپ ان کے پاس کھڑا ان کی سسکیاں سنتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا:

"بھابی! مجھے معاف کر دیجئے۔ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔"

کملا دیوی چونکیں۔ سرخ سرخ آنکھوں سے کنتل کی طرف دیکھا اور پھر اسے کھینچ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ کنتل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ کملا دیوی نے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں، پھر کنتل کے آنسو بھی اپنے میلے آنچل سے پونچھتے ہوئے بولیں: "ارے پگلے! تو کیوں رو رہا ہے؟ میرے سر میں تو درد ہو رہا تھا۔"

پھر اسے پیار کرتے ہوئے خود ہی بولیں، "میرا دیور بھیا! ارے جب تو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا نا، تو پھر میرے لیے کس چیز کی کمی رہے گی۔ ویسی ویسی ہزار ساڑیاں تجھ پر قربان۔ چل اٹھ کر کھانا کھا لے، تیرے اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔"

کنتل اس واقعے کو نہیں بھول سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکی بھابی نے اس کو آدمی بنانے کے لیے روکھا سوکھا کھایا ہے، موٹا جھوٹا پہنا ہے۔ اگر اس کی ماں بھی ہوتی تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتی۔ اس نے بنارسی ساڑی کا پیکٹ لیا۔ کچھ مٹھائی خریدی اور ٹیکسی سے سیدھا گھر پہنچا۔ پہلے بھابی کے پاؤں چھوئے پھر بھیا کے پاؤں چھوئے اور ساڑی کا پیکٹ بھابی کی گود میں ڈال کر باقی ڈیڑھ سو روپئے پیکٹ میں رکھ دیئے۔ کملا دیوی نے پیکٹ کھولا۔ ساڑی کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمکنے لگیں، چہرہ تمتما گیا، مگر فوراً خوشی پر قابو پا کر بولیں:

"ارے کنتل! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ اب اس عمر میں کیا میں بنارسی ساڑی پہنوں گی؟" پھر خود ہی ہنسیں اور بولیں "اچھا! اب سمجھی۔ یہ ساڑی تم اپنی ہونے والی دلہن کے لیے لائے ہو!"

کنتل پہلے جھینپا، پھر جلدی سے بولا: "بھابی! یہ میرے من کی سب سے بڑی کامنا ہے کہ آپ کل یہ ساڑی پہن کر وٹھوبا کے مندر میں جائیں۔ میں یہ ساڑی کسی دلہن وُلہن کے لیے نہیں لایا ہوں۔ یہ تو میں نے اپنی پیاری بھابی کے لیے خریدی ہے۔ اگر آپ کل اسے پہن کر پوجا کے لیے نہیں جائیں گی تو میں کبھی آپ سے نہیں بولوں گا۔ بھیا! آپ بھی سمجھا دیجئے بھابی کو۔" کنتل یہ کہتا ہوا کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دین دیال کرسی پر بیٹھے بیڑی پیتے مسکرا رہے تھے۔ کملا دیوی نے انہیں ساڑی دکھائی تو بولے: "اچھی ہے پہن لو۔"

کملا دیوی نے اس ساڑی کو صرف دو مرتبہ پہنا۔ وٹھوبا کے کیرتن میں اور کنتل کی منگنی میں۔ پھر اسے اس طرح تہہ کر کے صندوق میں رکھ دیا جیسے نو عمر لڑکیاں اپنی گڑیوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں۔

کنتل کے لیکچرار مقرر ہونے کے ڈیڑھ سال بعد دین دیال کو پنشن مل گئی۔ ان کے فنڈ کا ساڑھے چار ہزار روپیہ بھی مل گیا۔ کملا دیوی نے اس عرصہ میں کنتل کی تنخواہ سے بچا کر تین ہزار روپئے جمع کر لیے تھے۔ آخر ایک گریجویٹ اور خوبصورت لڑکی، جو ایک مقامی ہائی اسکول میں استانی تھی، کنتل کے لیے پسند کر لی گئی۔ کنتل کو بھی لڑکی پسند آ گئی اور جلد ہی شادی طے پا گئی۔

کملا دیوی بے حد خوش تھیں۔ شاید ایک ماں کو بھی اپنے بیٹے کے لیے دلہن بیاہ کر لانے میں اتنی خوشی نہ ہوتی۔ شادی کا سارا انتظام انھوں نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ سب ان کے سگھڑاپے اور انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کرنے لگے۔ آخر شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے اور کملا دیوی دلہن کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے آئیں۔

شادی کے تیسرے دن شام کو کملا دیوی دلہن کو لے کر ہنومان مندر کیرتن کے لیے جانے والی تھیں۔ انھوں نے اپنے صندوق سے وہ بنارسی ساڑی نکالی اور اسے ہینگر میں لگا کر دیوار پر ٹانگ دیا۔

اتنے میں دُلہن کمرے میں داخل ہوئی۔ کملا دیوی فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے اپنی چارپائی پر بٹھایا۔ دلہن نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کی نظریں بنارسی ساڑی پر جاکر رک گئیں۔

"او مائی گاڈ! کتنی خوب صورت ساڑی ہے۔" وہ جھپٹ کر ساڑی کے قریب پہونچی۔ کملا دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا:

"تمھارے دولہا نے ہی خریدی تھی اپنی پہلی تنخواہ پر۔"

دلہن نے ساڑی ہینگر سے اتار لی اور اپنی کمر سے لگا کر بولی:

"بہت اچھی ساڑی ہے۔ آج میں اسے کیرتن میں پہن کر چلوں گی۔ اِن سے کہکر آپ کے لیے دوسری ساری منگوا دوں گی۔"

کملا دیوی اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔ کچھ دیر تک تو ان کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ پھر وہ سنبھل کر بولیں:

"نہیں دلہن یہ ساڑی تو پُرانے فیشن کی ہے۔ تم نئی ساڑی منگوالینا، اس سے اچھی اور قیمتی۔"

"نہیں۔ مجھے تو یہی پسند ہے۔ اس میں سے ایک پیس نکال کر اس کا بلاؤز بناؤں گی۔"

"دُلہن ضد نہ کرو۔ اس ساڑی کو پھاڑنے سے کیا فائدہ۔ تم نئی ساڑی منگوالو۔" کملا دیوی نے اس کے ہاتھ سے ساڑی لے لی۔

دلہن کو اپنے ہاتھ سے اس طرح ساڑی کا لے لیا جانا بُرا لگا اور وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کملا دیوی دُلہن کے چلے جانے کے بعد کتنی ہی دیر گم سم کھڑی رہ گئیں۔ پھر انھوں نے ساڑی کو دوبارہ ہینگر میں لگا دیا اور چارپائی پر بیٹھ کر سوچوں میں گُم ہو گئیں۔

دوپہر کو کنتل باہر سے آگیا۔ کملا دیوی رسوئی میں گئیں۔ انھوں نے دین دیال کے آگے کھانا پروسا اور الگ الگ دو تھالیوں میں کھانا لگا کر دُلہن کے کمرے کی طرف چلیں۔

دروازہ بند تھا۔ اندر سے سسکیوں کے درمیان دُلہن کی آواز آرہی تھی۔ وہ دروازے پر ٹھٹک گئیں۔

"میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کی بھابی نے ایک معمولی ساڑی کے لیے میری بے عزتی کی ہے۔ میں وہی ساڑی پہن کر کیرتن میں جاؤں گی ورنہ مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔"

کنتل کہہ رہا تھا، "مگر پاروتی! اس ساڑی میں کیا رکھا ہے؟ میں تمھیں آج ہی اس سے زیادہ قیمتی اور خوبصورت ساڑی دلا دوں گا۔ لو اب اٹھو، ورنہ بھائی اور بھابی کیا سوچیں گے۔"

"کیا سوچیں گے، سوچنے دو انھیں جو سوچنا ہے۔ آپ کو ہماری پسند کا ذرا بھی خیال نہیں۔ بھائی اور بھابی کا خیال ہے ...."

کملا دیوی کے ہاتھوں کی تھالیاں کانپنے لگیں۔ وہ اس سے زیادہ نہ سُن سکیں اور جلدی سے لوٹ آئیں۔

رسوئی میں چوکلے پر بیٹھے دین دیال گردن جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔ کملا دیوی نے پروسی ہوئی تھالیاں فرش پر رکھ دیں اور سر گھٹنوں میں دے کر چولھے کے پاس بیٹھ گئیں۔ دین دیال نے صرف ایک نظر اٹھا کر انھیں دیکھا اور پھر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں کنتل اندر آگیا۔ اس نے اب تک کپڑے نہیں اتارے تھے۔ دیور اور بھابی کی نظریں چار ہوئیں۔ دیور کی نظریں لڑکھڑا گئیں، جیسے اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔

کنتل نے گردن جُھکا کر کہا۔ "بھابی! وہ پرانی ساڑی پاروتی کو دے دیجئے نا۔ اسے وہ پسند آگئی ہے۔ میں آپ کو آج شام اس سے اچھی اور قیمتی ساڑی لا دوں گا۔"

کملا دیوی سر سے پیر تک کانپ گئیں۔ غم اور غصّے سے ان کا سارا بدن لرزنے لگا۔ آنسو دل کو پارہ پارہ کرتے آنکھوں کی طرف بڑھے مگر ضبط کی وہ قوت جو ان کی فطرت کا خاصہ تھی اور جسے زندگی بھر انھوں نے ایک اصول کی طرح برتا تھا، آڑے وقت کام آئی، اور انھوں نے مسکراتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"کنتل! اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے؟ وہ تمھاری دی ہوئی چیز تھی۔ نہ وہ مجھے جہیز میں ملی تھی نہ میرے شوہر نے اُسے خریدا تھا۔ تمھاری چیز ہے تم لے لو۔ اور ویسے بھی اب کیا میری عمر وہ ساڑی پہننے کی ہے۔؟"

کنتل سمجھ گیا کہ بھابی بُرا مان گئی ہیں۔ مگر اس وقت اس کے سامنے مسئلہ اپنی نئی نویلی دُلہن کی ناراضگی دُور کرنے کا تھا۔ اسلئے وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھابی! آپ بُرا نہ مانیے، میں آپ کے لیے

اس سے اچھی ساڑی لا دوں گا۔"

کملا دیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کنتل اُلٹے پاؤں باہر چلا گیا۔ مگر دین دیال اپنا لقمہ ہاتھ میں لیے کملا دیوی کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ جو اَب گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے پیر کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھیں۔ کملا دیوی کے آخری جملے ان کی انا پر تازیانے کی طرح پڑے تھے ــ " نہ وہ مجھے جہیز میں ملی تھی، نہ میرے شوہر نے اسے خریدا تھا۔ تمھاری چیز ہے تم لے لو۔" دین دیال نے ان جملوں میں دبی کراہوں کو صاف سُن لیا تھا۔ اُن میں چھپی ہوئی حسرت ان کے وجود کو لرزا گئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک اس صبر و رضا کی پُتلی کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنے ہاتھ کا لقمہ تھالی میں رکھ دیا اور نہایت ہی نرم اور پیار بھرے لہجے میں پکارا ــ

"کما"!

کملا دیوی چونکیں۔ انھوں نے حیرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ان کے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ پیار میں ڈوبی ہوئی پکار ان کے شوہر دین دیال کی ہوسکتی ہے۔ ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں ضبط کی شدت سے سرخ سرخ ڈورے آگئے تھے۔ دین دیال نے پھر کہا ــ

"کما! تم کھانا کھالو۔ آج ہم بازار چلیں گے۔ تم وہاں سے ایک اچھی سی ساڑی بھی لے لینا۔" اتنا کہہ کر دین دیال چوکے سے اُٹھ گئے۔

کملا دیوی اب بھی حیرت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ کیسے یقین کر لیتیں کہ یہ ان کے شوہر دین دیال ہی تھے جنھوں نے چوبیس برس بعد آج انھیں ان کے نام سے پکارا تھا، جنھوں نے شادی کے بعد آج پہلی مرتبہ ساتھ میں بازار چلنے کی فرمائش کی تھی۔ صرف یہی نہیں ایک ساڑی بھی خرید دینے کا وعدہ کیا تھا۔

کملا دیوی کا رواں رواں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ وہ آنسو جنھیں وہ چوبیس برس سے ایک مقدس فریضہ سمجھ کر پیتی آئی تھیں اچانک اپنی ساری بندشوں کو توڑ کر بہہ نکلے اور کملا دیوی کھانا پینا چھوڑ کر باورچی خانے سے سیدھے اپنے کمرے کی طرف بھاگیں اور جاتے ہی دین دیال کے سینے پر سر رکھ کر زور زور سے سسکنے لگیں۔ دین دیال پیار اور محبت سے ان کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ ان کا ہاتھ بھی فرطِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد دین دیال کمرے سے باہر نکلے سفید کھدر کی دھوتی، بدن پر نیلا کوٹ، ہاتھ میں چھڑی، سر پر ٹوپی اور آنکھوں پر عینک۔ اسی وقت کنتل بھی اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے حیرت سے اپنے چپراسی بھائی کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ دین دیال کے پیچھے ہی کملا دیوی کالے بارڈر کی سفید ساڑی پہنے شرماتی ہوئی باہر نکلیں۔

دین دیال نے کنتل کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا:
"کنتل! ہم لوگ ذرا شاپنگ کے لیے بازار جا رہے ہیں ــ شام کو کھانے پر انتظار نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے آج شام کا کھانا ہم کسی ہوٹل میں کھالیں۔ وہاں سے ہم کوئی فلم دیکھنے چلے جائیں گے۔"

کنتل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہکا بکا انھیں دیکھتا رہا۔ دُلہن بھی کنتل کے پیچھے کھڑی انھیں دیکھ رہی تھی۔ کملا دیوی سر کو آنچل سے ڈھانپے دین دیال کے برابر آگئیں۔ دین دیال نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دونوں آگے بڑھ گئے۔

آج دین دیال کو نہ اپنی پست قامتی کا خیال تھا، نہ چیچک رو ہونے کا ملال۔ وہ کملا دیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بڑی شان سے چھڑی ہلاتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ آج انھیں اپنی کھوئی ہوئی شخصیت واپس مل گئی تھی۔

□□

تصحیح

نیا دور بابت اگست ۱۹۹۶ء میں میرا ایک مضمون "کچھ داغ کچھ غالب" شائع ہوا ہے اس میں یہ شعر " داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ......" داغ کے نام منسوب ہوگیا ہے۔ یہ شعر داغ کا نہیں ہے۔ غلطی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اس سہو کیلئے مدیر نیا دور نے متوجہ کیا تھا، میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ ــــــ عابد پیشاوری

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "مقناطیسی علاج"
مصنف: ڈاکٹر ہیرا لال بنسل اور ڈاکٹر لکھو ناتھ شرن بنسل
قیمت: ۵۵/- روپے
ملنے کا پتہ: بی۔ جین پبلشرز۔ نئی دھلی۔ ۵۵

زندگی اور علاج معالجے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جینا بڑا جوکھم کا کام ہے اور ہر آدمی آئے دن کسی نہ کسی تکلیف کا شکار بنتا رہتا ہے۔ کبھی وائرل فیور ہے تو کبھی عام بخار۔ کسی کو پتھری کا مرض ہے کوئی شوگر کا مریض ہے۔ نزلہ زکام کھانسی تو سب کے ہی روزمرہ میں شامل ہیں۔ کبھی سر میں درد ہے تو کبھی دانت کے درد نے پریشان کر رکھا ہے۔ کبھی پٹھے اکڑ جاتے ہیں تو کبھی بلڈ پریشر بڑھ جاتا۔ ایگزیما، بے خوابی، اسپونڈیلائٹس اور قبض آدمی کی پریشانی کا سبب بنتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں دنیا میں بیماریاں اتنی عام ہیں وہیں انسانی تحقیق نے نئے نئے طریقۂ علاج بھی دریافت کیے ہیں۔ یونانی، آیورویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک مشہور طبی علاج ہیں تو اور بھی کئی طریقے مختلف امراض پر قابو پانے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان میں ایکوپنکچر، ایکوپریشر اور مقناطیسی علاج خاص ہیں۔ زیر نظر کتاب مقناطیسی علاج سے متعلق ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مقناطیس کے ذریعہ کن کن امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں یقیناً یہ ایک نیا طریقہ علاج ہے لیکن اس کی افادیت کے پیش نظر اسے اپنایا جا رہا ہے خاص طور پر ہومیوپیتھک ڈاکٹر اس پر خاص توجہ دے رہے ہیں۔ ماہرین کی رائے ہے کہ طاقتور مقناطیسی حلقہ میں کینسر نہیں رہ سکتا۔ پٹھوں کی سوجن اور درد اور گردے کی پتھری کا علاج مقناطیس اور مقناطیسی پانی سے کیا جا سکتا ہے۔ "مقناطیسی علاج" شاید اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جس میں مختلف امراض کے تعلق سے علاج کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مقناطیسی علاج کی تاریخ اور اصولوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب آٹھ حصوں میں اکیس ابواب پر مبنی ہے۔ پہلے حصہ میں تین باب ہیں جن میں مقناطیسی کشش اور اس کے ذریعہ علاج کے بارے میں بتلایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے جن میں انسانوں اور دوسرے ذی روحوں پر مقناطیسی کشش کے اثر کے بارے میں بتایا گیا ہے اور انسانی جسم میں خون کا کیا کردار ہے اس کے بارے میں بتلایا گیا ہے اور انسان کے جسم میں مقناطیسی حلقہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تیسرے حصہ میں دو باب ہیں جن میں مقناطیس کے معینہ اثرات کے پیش نظر مقناطیسی اشیاء کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ دو ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں مقناطیس لگانے کے طریقے بتائے گئے ہیں اور مقناطیسی پانی کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ پانچواں حصہ بارھویں تیرھویں ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں مقناطیسی علاج کے فوائد بتائے گئے ہیں اور انسداد امراض کے لئے مقناطیسی علاج کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹے حصے میں چودھواں اور پندرھواں باب شامل ہیں اور ان میں مقناطیسی علاج کے تعلق سے ہندوستانی ڈاکٹروں کے تجربات اور غیر ممالک سے دستیاب تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ساتویں حصہ میں سولہ، سترہ، اٹھارہ اور انیسواں باب شامل ہیں اور ان میں مقناطیسی علاج کا مختلف طریقہ علاج جیسے ہومیوپیتھی، ایکوپنکچر، ایکوپریشر، قدرتی علاج وغیرہ سے مقابلہ کر کے مقناطیسی علاج کی حدود کا تعین کیا گیا ہے۔ آٹھواں حصہ بیسویں اور اکیسویں باب پر مشتمل ہے اور ان میں مقناطیسوں کی دستیابی کے طریقے اور اصطلاحات ہیں۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں دوا کے بغیر تقریباً ۱۵۰ عام امراض کا مقناطیس کے ذریعہ علاج بتایا گیا ہے جن میں جوڑوں کی سوجن، بلڈ پریشر، کمر درد، گردن کا اسپانڈیلائٹس، ایگزیما، سر درد، بے خوابی، جسم میں اکڑن، دانت کا درد جیسے تکلیف دہ امراض بھی شامل ہیں۔ کتاب کے مترجم پریم پال اشک ہیں جنہوں نے انگریزی کی اس کتاب کا ترجمہ سادہ اور آسان زبان میں کیا ہے تاکہ ہر اردو قاری اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑا کام ہے جس کے لئے مصنفین اور ناشر قابل مبارکباد ہیں۔

——— ایس۔ اے۔ رحمٰن

نام کتاب: "تامل ناڈو کے صاحب تصنیف علماء"
مصنف: علیم صبا نویدی   قیمت: ۱۰۰/- روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دھلی

علیم صبا نویدی کا اردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ وہ جنوبی ہند

کے اُردو ادیبوں شاعروں اور عالموں کا ملک گیر پیمانے پر تعارف کراتے رہتے ہیں اس کتاب سے پہلے انہوں نے مولانا باقر آگاہ ویلوری اور مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نیز جنوب کا شعر و ادب لکھ کر جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔

آپ کی ۲۱ تصنیفات اب تک شائع ہو چکی ہیں جن میں نثر و نظم، افسانہ، تاریخ، تنقید اور اُردو کے مسائل پر کتابیں شامل ہیں۔ لیکن آپ نے بہت بڑا کام جنوبی ہند کے ان ہندو مسلم مصنفوں اور عالموں کو تمام اُردو دنیا خاص کر شمالی ہند سے متعارف کرا کر انجام دیا ہے جو اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔

تامل ناڈو کے علاقہ سے تعلق رکھنے والے اہل علم و دانش کی علمی، ادبی، مذہبی و ملی خدمات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ تامل ناڈو کا علاقہ صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں کے باکمال اصحاب قلم نے اپنی عربی، فارسی، اُردو اور تمل تصانیف کے ذریعہ جہالت کی تاریکی دور کرنے اور علم و حکمت کی روشنی پھیلانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ لائق صد تحسین ہیں۔ بقول مصنف "تامل ناڈو کی سرزمین جہاں اپنی باغ و بہار، آب و ہوا، مختلف تہذیب و تمدن اور دراوڑین کلچر کی دل فریب و دل کش نقاشی و سنگتراشی کے لئے مشہور ہے وہیں صوفیوں، سنتوں، علماء اور اولیاءاللہ کے لئے ساری دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔"

بقول ڈاکٹر راہی فدائی پروفیسر جامعۃ الثنانیہ کڈپہ (آندھرا پردیش) ہندوستان میں عرب تہذیب اور مذہب اسلام سب سے پہلے اسی علاقہ تامل ناڈو کے ساحلی علاقوں مالابار وغیرہ میں آیا اور وہیں سے اس کی روشنی نہ صرف جنوبی ہند بلکہ پورے برصغیر میں پھیلی۔ تامل ناڈو نے بڑے بڑے علماء، فلسفی اور ادیب پیدا کئے مگر بدقسمتی سے حالات کی تاریکی نے ان کو دبیز پردوں میں چھپا لیا اور شمال ان کے فیوض سے پوری طرح واقف نہ ہو سکا۔ علیم صبا نویدی نے اس گرد و غبار کو ہٹا کر ان کی روشنی سے عوام خاص کر اُردو عوام کو منور کرنے کا عزم کیا ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

تامل ناڈو کے صاحب تصنیف علماء میں مسلم عالم ہیں، صوفی ہیں، شاعر و ادیب ہیں جنہوں نے اُردو زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر بہت لکھا ہے۔

مصنف نے مسلم عالموں کے ساتھ ہندو عالموں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں منشی جسونت رائے، لالہ لچھمن لال خرد اور رتن لال مست مصنف عمدۃ التواریخ شامل ہیں۔ لالہ لچھمن لال خرد کی لکھی ہوئی فارسی زبان میں تاریخ آج بھی مسجد والاجاہ کے گنبد پر لکھی ہوئی ہے جو آپ نے نواب والاجاہ آف ارکاٹ کے حکم پر مسجد والاجاہ کے سنگ بنیاد رکھے جانے پر کہی تھی۔ یہ کتاب بہت ہی قابل قدر اور معلوماتی ہے جو جنوب و شمال کے درمیان رابطے کا کام دے سکتی ہے۔

—————— اِسحاق سنبھلی

نام کتاب: "مشاہیر ادب کے خطوط: بنام علیم صبا نویدی"
مرتب: ڈاکٹر محمد علی اثر - قیمت: اسّی روپے
ملنے کا پتہ: اسٹار پبلی کیشنز، آصف علی روڈ، نئی دہلی

مشاہیر ادب کے خطوط بنام علیم صبا نویدی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو ہمارے ممتاز ادیبوں، ناقدوں، محققوں اور شاعروں نے وقتاً فوقتاً علیم صبا نویدی کو تحریر کئے ہیں۔ ان خطوط کو ڈاکٹر محمد علی اثر صاحب نے بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں تعارف اور تبصرہ ڈاکٹر معین الدین عقیل وزیٹنگ پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز، جاپان اور ایک مبسوط مقدمہ ڈاکٹر محمد علی اثر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں اُردو کے مکتوباتی ادب کا سیر حاصل تجزیہ کیا گیا ہے۔ مکتوب نگاری ہمارے ادب کی ایک اہم صنف ہے جس کی افادیت اور اہمیت کسی اور صنف ادب سے کم نہیں ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب دیگر اصناف ادب سے تقابل کرتے ہوئے اس کی اہمیت یوں واضح کرتے ہیں۔ "ادب میں کئی دلکشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار ادائیں ہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوں میں جو جادو ہے وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ ناول ہو، ڈرامہ ہو یا کوئی مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔"

موجودہ دور میں مکتوب نگاری کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر بہت سے ادیب اور محقق ہمارے مشاہیر کے خطوط کو مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں لیکن زیر نظر کتاب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں جن مشاہیر ادب کے خطوط شامل ہیں ان کے مختصر حالات زندگی، شخصیت، ادب میں ان کا مرتبہ اور ان کی گرانقدر تصانیف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اس مجموعہ کی افادیت

اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ان مشاہیر میں ایسے بلند پایہ ادیب، شاعر، نقاد اور محقق شامل ہیں جنہوں نے اپنی بیش بہا تخلیقات اور ادبی کارناموں سے ہمارے ادبی خزانے کو مالا مال کر دیا ہے جن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، مالک رام، قاضی عبدالودود، فکر تونسوی، احمد جمال پاشا، حرمت الاکرام، شاذ تمکنت وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان اکابرین ادب کے خطوط علیم صبا نویدی کی ادبی و علمی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ ان گرانقدر خطوط کی تعداد تقریباً ۸۵ ہے۔

امید ہے کہ "مشاہیر ادب کے خطوط بنام علیم صبا نویدی" کی ہمارے ادبی اور علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔ کتاب کی طباعت، اشاعت اور گٹ اپ بہترین اور دیدہ زیب ہے۔

امیر احمد صدیقی

نام کتاب: "ذہنِ رسا" (مرثیہ)
شاعر: بہار حسین آبادی قیمت: دس روپئے
ملنے کا پتہ: بہار فاؤنڈیشن، عظیم آباد، پٹنہ

ذہن رسا، بہار حسین آبادی کا ایک طویل مرثیہ ہے۔ ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے اسے مروج مرثیہ سے مختلف نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ایک سو ساٹھ بند کے اس تخلیقی پیکر کی روح روایتی حدود سے آگے بڑھ کر جدید نہج کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔ اس میں قدیم و جدید مرثیہ گوئی کا حسین امتزاج ہے۔

اس مرثیہ کے پس منظر میں بہار حسین آبادی شاعر کے علاوہ ناصح اور مصلح بھی نظر آتے ہیں۔ جو زندگی کا فلسفہ، معاشرتی اقدار اور اخلاقی ضابطہ حیات کا درس دیتے ہیں۔ اس مرثیہ کے تخلیقی عمل کی فضا میں عرب و عجم نہیں بلکہ ہندوستان کی مہک محسوس ہوتی ہے اور یہی اس مرثیہ کی انفرادی خوبی ہے۔ "ذہن رسا" میں شہدائے کربلا کے اعلا اوصاف کا ذکر بالکل روایتی انداز میں کرنے کے ساتھ مصائب بھی اجمالی طور پر ہی سہی مگر مرثیے کا حق ادا کرتے ہوئے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ دونوں ہی حصے فکر و فن کا اعلا نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ شاعر کی ذہنی اور فکری سطح نیز تخیل کی پرواز نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ اس میں جذبات و خیالات کی ہم آہنگی بھی ہے اور مکالمے کا ڈرامائی رنگ بھی۔ حسنِ بیان بھی ہے اور دیرینہ روایت و روش سے ہٹ کر نئی راہ کی تشکیل کی جد و جہد بھی ہے۔

"ذہن رسا" صرف آہ اور واہ کے لیے محدود نہ ہو کر تزکیہ نفس، حسنِ اخلاق، خوبیٔ کردار، معرفتِ حیات کا ذریعہ محسوس ہوتا ہے۔ اس میں شاعر نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو قربانی، ایثار، اعلا اوصاف اور اخلاقی اقدار کی جانب بڑھنے کے لئے شہدائے کربلا کے نقش قدم کو مشعلِ راہ بنانا چاہئے۔ صرف گریہ و زاری تک ہی محدود نہیں رہ جانا چاہئے۔

نفیس احمد ہنوری

نام کتاب (مجلّہ): بحضورِ رسالت مآبؐ
شاعر: رباب رشیدی زیر اہتمام: ارباب فکر فورم
ملنے کا پتہ: ۱۲۶ - نازی حنانہ، لکھنؤ - ۱۸

ارباب فکر فورم گاہے گاہے اہم موضوعات پر مجلّے شائع کرتا رہتا ہے جو علمی اور ادبی سطح پر ہر طرح معیاری کہے جانے کے مستحق ہیں۔ زیر نظر مجلّہ جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ کے مبارک و مسعود موقع پر شائع کیا گیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی شاعر کا کلام سلیقے کے ساتھ تمام صفحات پر منور ہے۔ نعت گوئی آسان کام نہیں بلکہ یہ ذوق بڑی احتیاط و احترام کا متقاضی ہے۔ جناب رباب رشیدی کی نعتیں اور رباعیاں نہ صرف یہ کہ تاثیر کا جوہر لئے ہوئے ہیں بلکہ ان سے شاعر کی آنحضور صلعم سے شیفتگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کتابت و طباعت اچھی اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ چند شعر نمونے کے طور پر حاضر ہیں۔

اللہ جانتا ہے کہ ہر مسئلے کا حل
میرے نبیؐ کی زلفِ معنبر کے خم میں ہے

بچوں کو لوگ یہ بھی پڑھائیں نصاب میں
دونوں جہاں ہیں ذکرِ رسالت مآب میں

کوئی محروم ہو خلقِ نبیؐ سے ہو نہیں سکتا
اندھیرا چھوڑ دے یہ روشنی سے ہو نہیں سکتا

ڈاکٹر ارشد علی

نام کتاب : "حدیثی اصول"
مؤلف : شاہ وجیہ الدین احمد خاں قادری قیمت : ۱۵/ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبۂ وزیریہ ، انگوری باغ ۔ رام پور
یو ۔ پی

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اصول حدیث پر لکھا گیا ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے اس کے مؤلف برصغیر ہند و پاک کے مشہور محدث حضرت علامہ وجیہ الدین احمد خاں قادریؒ صاحب ہیں۔

اُردو میں یوں تو متعدد کتابیں اصول حدیث پر لکھی گئیں لیکن ان میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں سلیس اور سادہ زبان میں معروضی طور پر اصول حدیث کے بنیادی عناصر کا ذکر ہو اور ہر طبقہ کے لئے یکساں طور پر مفید ہو علامہ قادری نے اس کتاب کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے بعض حصے بے حد اہم ہیں اصول حدیث کی معتبر کتابوں مقدمۂ ابن صلاحؒ اور ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب "شرح نخبۃ الفکر" کے مضامین کا نچوڑ تو ہے ہی ساتھ ہی حدیث کے درسی مباحث اور محدثین کے اختلافات و آرا کا بھی ذکر ہے۔ آخر میں اصطلاحات اصولِ حدیث کا نہایت اختصار کے ساتھ جو ضمیمہ ہے اس سے کتاب کی افادیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے یقیناً یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔

اس کتاب کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ الٰہ آباد بورڈ کے عالم کے نصاب میں شامل ہے۔

——— محمدؔ ارمان

نام کتاب : "دریچے"
مصنف : ڈاکٹر نسرین ترنم قیمت ۵۰/ روپے
ملنے کا پتہ : فلم سنٹر ، شاہ کی املی ۔ پٹنہ
(بہار)

ڈاکٹر نسرین ترنم کے افسانوی مجموعہ "دریچے" کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے معاشرتی تجربے کی بنیاد پر انسانی زندگی کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے کردار سماج کے عام آدمی ہیں۔ جن سے ہم واقف ہیں۔

مجموعے میں شامل تمام تر کہانیاں سماجی اور گھریلو زندگی کی ان برائیوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو معاشرے کو کھوکھلا بناتی ہیں۔ اور افسانہ نگار ایک ناصح اور صلاح کار کی طرح ان کا تجزیہ کرتا رہتا ہے۔

نسرین ترنم کو ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے اگر ان کے قدم صحیح راستے پر پڑ گئے تو شاید ہمیں ان سے اچھی کہانیاں مل جائیں ورنہ تو ان کی کہانیوں میں جاسوسی ناولوں کی طرح انکشافات کی سی کیفیت پائی جاتی ہے مثلاً افسانہ نقاب میں راحیل اپنی پڑوسن کو شریف خاتون نہیں سمجھتی ہے کیونکہ ہر ہفتے اس سے ایک شخص ملنے آتا ہے اور گھر میں خوب شور شرابہ ہوتا ہے مگر جب ایک روز اسی گھر سے رونے دھونے کی آواز آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص جو کہ ہر ہفتہ آتا تھا کوئی اور نہیں بلکہ اس عورت کی جوان لڑکیوں کا بیمار باپ تھا اور اسپتال سے اسے محض ہفتہ میں ایک روز چھٹی ملتی تھی۔

نسرین ترنم کی بیشتر کہانیوں کی بُنت کچھ اسی طرح کی ہے۔ آج جب کہ نئی نسل کے سامنے نئی حقیقتوں کا ادراک' نیا نظریۂ حیات ہے اور الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے اثرات ماحول میں پروان چڑھ رہے ہیں ہم نئے لکھنے والوں سے امید کرتے ہیں کہ وہ افسانوں کو بھی نئی جہتوں سے روشناس کریں نہ کہ لکیر کے فقیر بنے بیٹھے رہیں یہی امید ہمیں نسرین ترنم سے بھی ہے۔

——— فیروزہ مسعود

نام کتاب : "ناگ پور کا مسلم معاشرہ"
مصنف : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل قیمت ۷۵/ روپے
ملنے کا پتہ : صالحہ بک ٹریڈرس ' نزد جامع مسجد مومن پورہ ناگپور

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ معروف ادیب و شاعر اور محقق ہیں ان کے تین شعری مجموعے بھی شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ تنقید و تحقیق سے متعلق تقریباً چودہ کتابیں ایسی ہیں جنہیں ادبی دنیا میں تحسین و امتیاز کی نظر سے دیکھا اور سراہا گیا ہے۔ ساحلؔ صاحب اُردو کے ان لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کے قلم کی روشنائی خشک نہیں ہوئی ہے ان کی ذات سے دانشوروں' ادیبوں اور شاعروں کو بڑی توقعات ہیں۔

زیر نظر کتاب "ناگپور کا مسلم معاشرہ" ان کی اعلا تحقیق کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کتاب میں بھونسلہ عہد ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کے مسلم معاشرے

(باقی ص ۴۹ پر)

آسمانِ اُردو ادب کے

دو درخشاں تارے غروب

رام لعل

اُردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار اور درجنوں کتابوں کے مصنف رام لعل کا ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو تقریباً ۷۴ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انتقال سے تھوڑی دیر پہلے تک وہ ہشاش بشاش تھے۔ ویسے تو انھیں گزشتہ کئی برسوں سے کینسر تھا لیکن ان کا انتقال حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ہوا۔

رام لعل کی پیدائش ۳؍ مارچ ۱۹۲۳ء کو میانوالی (مغربی پنجاب) میں ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم مقامی راجہ رام موہن رائے ہندو ہائی اسکول میں ہوئی تھی۔ ان کے والد لچھمن داس چھابڑا خود بھی ایک تعلیم یافتہ انسان تھے جو انگریزی کے علاوہ اُردو میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔

آزادی کے بعد ہونے والے فسادات کے نتیجے میں انھیں ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ انبالہ اور دہلی میں تھوڑے تھوڑے عرصے تک قیام کرنے کے بعد وہ بنارس پہونچے، وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد لکھنؤ آگئے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ وہ ایک ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، انشائیہ نویس اور سفرناموں کے خالق ہونے کے ساتھ اُردو کی بقا اور اسے اس کا جائز مقام دلانے کے لیے وہ زندگی بھر سرگرم رہے۔ اس سلسلے میں ان کی منعقد کردہ غیر مسلم اُردو مصنفین کی دو کانفرنسیں ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی۔ یہ کانفرنسیں منعقد کرکے انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ اس ملک میں رہنے بسنے والے سبھی لوگوں کی زبان ہے خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب اور فرقے سے کیوں نہ ہو۔

رام لعل کا ادبی سفر اس وقت شروع ہوگیا تھا جب وہ لاہور میں مقیم تھے اور مرتے دم تک یہ سفر جاری رہا۔ برصغیر ہند و پاک اور دنیا کے دوسرے ممالک سے شائع ہونے والے جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے سیکڑوں افسانوں، متعدد ناولوں اور سفرناموں کو یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی کئی کتابیں پاکستان اور سویڈن سے بھی شائع ہوئیں۔ ان کی کہانیاں اُردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، آسامی، کنڑ، تامل، تیلگو، گجراتی، ملیالم، مراٹھی اور پنجابی زبانوں میں بھی خاصی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔

رام لعل کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ اتر پردیش، یوپی اُردو اکادمی، بہار اُردو اکادمی، بھاشا و بھاگ پنجاب اور میر اکادمی لکھنؤ نے اپنے گرانقدر انعامات سے نوازا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں حکومتِ پنجاب کے محکمۂ السنہ نے شرومنی اُردو ساہتیہ کار ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے غالب مودی ایوارڈ سے نوازا۔ رام لعل کئی اُردو تنظیموں اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں سے بھی وابستہ رہے، وہ انجمن ترقی اُردو ہند کی مرکزی کونسل کے رکن رہے۔ یوپی اُردو اکادمی کے وائس چیرمین اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیرمین بھی رہے۔

نیا دور کو ان کا قلمی تعاون بہت شروع سے ہی حاصل تھا جو ان کی آخری سانس تک برقرار رہا۔ انھوں نے نیا دور کے 'فراق نمبر' اور 'طنز و مزاح نمبر' کے لیے 'کچھ نہ کچھ' ضرور عنایت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

رام لعل کے انتقال سے اُردو ادب میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ادارہ نیا دور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دُعاگو ہے کہ خدا ان کی آتما کو سکون دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

وجاہت علی سندیلوی

اُردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار وجاہت علی سندیلوی بھی ۹ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ہم سے جُدا ہو گئے۔ وجاہت صاحب ایک خوش فکر شاعر صحافی، انشا پرداز، سماجی کارکن اور سیاست داں بھی تھے۔ وہ یکم مارچ ۱۹۱۶ء کو قصبہ سندیلہ میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اُردو اور عربی میں ہوئی۔ بعد ازاں ایک مقامی انگریزی اسکول سے آٹھواں درجہ پاس کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کیا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

وجاہت صاحب طالب علمی کے زمانے ہی میں معلومات عامّہ مضمون نویسی اور دیگر مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ سیاسیات نفسیات، سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ کے موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ دوستوں سے علمی و ادبی گفتگو بلکہ بحث و مباحثہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

صحافت سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ ریاستی کانگرس کے ۱۵ روزہ خبر نامے کے ایڈیٹر رہنے کے علاوہ روزنامہ قومی آواز کے ادارتی عملے میں بھی شامل رہے، جہاں وہ اس کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ ملکی، ملّی اور سیاسی مسائل پر ان کے مضامین ملک کے متعدد اخباروں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر ان کے مضامین بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے ہی تھا۔ کالج کی میگزین سے لکھنے کی ابتدا کرنے والے وجاہت صاحب کے مضامین، افسانے، غزلیں اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین ملک کے معتدد رسائل میں شائع ہوئے وجاہت صاحب کی مختلف موضوعات پر تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، بچوں کے لیے آسان اُردو قاعدوں کے علاوہ متعدد کہانیاں نظمیں اور ناولٹ بھی لکھے جو خاصے مقبول ہوئے۔ نیا دور کے لئے وہ کچھ نہ کچھ برابر تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایک غزل اور ایک مضمون بھی ارسال کیا تھا۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں خصوصی انعام پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ میر اکادمی لکھنؤ اور انجمن ترقی اُردو نے انھیں افتخار سندیلہ کی توصیفی سند سے نوازا تھا

ان کے انتقال سے اُردو دنیا کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی مشکل ہے۔ ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دُعائے مغفرت اور پس ماندگان سے تعزیت کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

نقد و تبصرہ ——— صفحہ ۴۵ کا بقیہ

کی تصویر کشی کی گئی ہے اور مسلمانوں کے تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، سیاسی، اصلاحی، علمی اور انتظامی امور پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

ناگپور کے امراء، رجواڑے، علماء، فقراء، اطباء کے علاوہ مسلم جاگیریں، مقابر، مساجد وغیرہ اور ناگپور کی مکمل تاریخ پر بھی ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ ناگپور کی تہذیب و تاریخ سمجھنے کے لیے ضروری ہے بلکہ ہندستان میں مسلمانوں کے عروج و آمد کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

زبان انتہائی سادہ، جامع اور برجستہ استعمال کی گئی ہے جس کے سبب تحقیق کی خشکی تحریر پر حاوی نہیں ہونے پائی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی بلکہ ہر لائبریری میں اس کتاب کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔

——— ظفر حسین

مشہور صحافی تبکیل الرحمٰن شمسی بھی ۱۸ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ایک مختصر علالت کے بعد دہلی میں انتقال کر گئے۔ وہ "رُوداد چمن" پہلی بھیت کے ایڈیٹر تھے اور صحافتی حلقے میں کافی مقبول تھے مرحوم نہایت خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے۔ وہ اُردو، ہندی دونوں ہی زبانوں کے صحافی تھے۔ ادارہ نیا دور انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کے تئیں اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ——— ایڈیٹر

"اودھ آئینہ ایام میں"

تاثرات کے آئینے میں

جناب سید امجد حسین صاحب !

نیا دور (اودھ انک، ہندی) ملا۔ بہت بہت شکریہ لکھنؤ پر اتنا لاجواب لٹریچر ایک جگہ ملنا دشوار ہے۔ میری مبارکباد قبول کریں۔

——— شیو لال شکل۔ لکھنؤ

عزیز گرامی امجد حسین صاحب !

نوازش نامہ مع "اودھ آئینۂ ایام میں" باصرہ نواز ہوا۔ واقعی آنکھیں روشن ہوگئیں اور احساسِ جمال کو فرحت ملی۔ آپ حضرات نے اپنی محنت، لگن اور شوقِ بے پایاں سے ایک یادگار کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ نے خصوصی طور پر اودھ نمبر کے دونوں حصوں اور اس کے بعد کے شماروں کو اس انداز سے شیرازہ بند کیا ہے کہ کتاب مختلف عنوانات اور مختلف اصحاب کے مضامین کا مجموعہ ہونے کے باوجود کثرت میں وحدت کا تاثر رکھتی ہے۔ مضامین بھی جغادری اہلِ علم کے ہیں۔ اس سے اس کی وقعت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اوپر سے آپ حضرات نے اسے ایسا خوبصورت گٹ اپ عطا کیا ہے کہ واہ واہ کہتے ہی بنتی ہے۔

بہرحال آئینۂ ایام میں پورا اودھ اپنی مختلف جہات و اطراف سمیت سمٹ آیا ہے۔ تاریخ، تہذیب، علم و ادب اور وہاں کی علمی و ادبی فضا کی بھینی بھینی خوشبو اس کے اوراق میں بسی ہوئی ہے۔ آپ نے واقعی تاریخی دستاویز ہمارے ہاتھوں میں تھمادی ہے اور ویسے بھی آپ کے ہاتھوں نیا دور اپنے دورِ عروج سے گزر رہا ہے اور صحیح معنوں میں اس کا 'نیا دور' ہے۔ مئی کا شمارہ بھی ملا۔ شکرگزار ہوں مگر بھائی اس کو خاص خاص موقعوں ہی پر نہ بھیجئے۔ اب تو مستقل دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

——— منظر اعظمی۔ دہلی

گرامی قدر تسلیم !

گرانقدر کتاب "اودھ آئینہ ایام میں" موصول ہوئی۔ اس عنایت کے لیے کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ کتاب رسمی تعریف و تحسین سے بالاتر ہے اور حقیقی تحسین کے لیے الفاظ کی تنگ دامنی کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کے مشتملات اودھ کے ماضی کی تاریخ و تہذیب کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور ایسی جھلک پیش کرتے ہیں کہ چار صدیوں پر پھیلی ہوئی مدت میں اودھ کے حکمرانوں کے انداز حکمرانی، ان کے عہد میں علوم و فنون کے فروغ اور سرپرستی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی و رُوحانی مراکز کی عظمت، ادب و شاعری کی گرم بازاری، فن تعمیر کے کمالات کی پوری تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اگرچہ الگ الگ اربابِ قلم نے مختلف عنوانات پر علم و دانش کے گوہر بکھیرے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ اپنے موضوع پر ایک مکمل دستاویزی کتاب کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ جسے ہم اودھ کے متعلق نادر معلومات کا خزانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو باتیں کتاب میں یکجا فراہم کردی گئی ہیں۔ ایک ریسرچ اسکالر کو اس کے لیے برسوں تک سیکڑوں کتب خانوں اور نوادرات کے مرکزوں کی خاک چھاننی پڑتی۔ ظاہر ہے کہ بلند پایہ محققین و ماہرین سے اتنے جامع و مبسوط مقالات لکھوالینا بھی آپ ہی کے بس کا کام تھا، اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ رہا کتاب کا صوری حسن نفاست اور دیدہ زیبی، تو یہ محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش کی اردو نوازی، مالی فیاضی و خوش فراقی کا روشن ثبوت ہے۔ ملک کی کسی ریاست کا محکمۂ اطلاعات اردو رسالہ نیا دور اور اردو مطبوعات کے بلند پایہ معیار میں اتر پردیش سے آگے نہیں جاسکا۔ اس پر اس ریاست کے اردو نواز فخر کرسکتے ہیں۔

——— تاج الدین اشعر، وارانسی

برادرم امجد حسین صاحب !

"اودھ آئینہ ایام میں" کے ساتھ آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میں اس کتاب کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔ تمام مضامین بہت محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہیں اور اسی کے ساتھ کتاب نہایت دلچسپ اور گرفت میں لینے والی ہے۔ اتنے اچھے پبلیکیشن کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔ ——— قمر الحسن نئی دہلی

نیا دور

جلد ۵۱ | نمبر ۹

دسمبر ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین

جوائنٹ ایڈیٹر
نجیب انصاری

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
غزل	وحید اختر	۳
یادوں کی رہ گزر (۶)	علی جواد زیدی	۴
نرگسیت (نظم)	عابد پیشاوری	۱۲
غزل	کرشن موہن	۱۳
روحِ تنہائی (نظم)	رام پرکاش راہی	۱۳
رام لعل میری نظر میں	گیان چند	۱۴
غزلیں	شاعر فتحپوری	۲۸
	اسد رضا ۔ شکیب رضوی	۲۸
عالم لکھنوی : شخصیت اور فن	سکندر آغا	۲۹
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر (قطعات)	رباب رشیدی	۳۳
مکالماتی نظمیں	رزاق افسر	۳۴
احساس (نظم)	ندرت نواز	۳۴
بے یقینی (افسانہ)	اقبال مجید	۳۵
غزلیں	مظفر سلطان ترابی	۳۹
	نسیم واسطی ۔ سلیمان صدیقی	۳۹
	احسن رضوی	۳۹
بھارت چھوڑو تحریک	شاہدہ صدیقی	۴۰
قطعہ	اختر عمر اختر	۴۳
غزل	جمیل دوشی	۴۳
نقد و تبصرہ	وقار ناصری ۔ احمد ابراہیم علوی	۴۴
	محمد علی ۔ محمد سبطین ۔ سہیل احمد ۔	تا
	ناظر صدیقی ۔ کیفی سنبھلی	۴۷
صفیر قارئین (خطوط)		۴۸

اپنی بات

دُنیا کا دستور یہ ہے کہ جانے والے کو ہنسی خوشی وداع کرتے ہیں، ۱۹۹۶ء بھی رُخصت ہو رہا ہے، اس لیے اس کو ۳۱ر دسمبر کی رات ۱۲ بجے آخری سلام کرتے ہوئے یہ کہنا ہی پڑے گا کہ یہ عجیب و غریب سال رہا ہے۔ یہ سال عالمی سطح پر بھی غیر معمولی تبدیلیوں کا حامل کہا جائے گا۔ اب یہ تبدیلیاں خوش گوار ہوں یا ناخوش گوار! یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس سال بھی ہمارا جمہوری ملک اپنی روایات کے مطابق شاہراہ ترقی پر گامزن رہا۔ راستے میں رکاوٹیں، دشواریاں، نت نئے فتنے ابھرے لیکن ہمیشہ کی طرح عظیم ہندستان کی عظیم رُوح نے ان سب پر قابو پالیا۔

اُردو والوں کے لیے یہ سال ایک طرح سے خزاں کا سال رہا۔ ادب کے کیسے کیسے شگفتہ پھول مُرجھا گئے اور ہم سے رخصت ہوگئے ان میں رام لعل، دلیپ سنگھ، وجاہت علی سندیلوی، اوپیندرناتھ اشک، شکیل الرحمٰن شمسی، قاضی جلیل عباسی عرفان لکھنوی، سلیم عمر اور اسی طرح کے بہت سے نام یاد آرہے ہیں۔ ان سب کے ساتھ تصویر اُبھرتی ہے امرت رائے کی، جو بہت بڑے باپ کے بیٹے تھے اور جن کی بے پناہ شفقت راقم الحروف کو حاصل تھی — یہ ایسے لوگ تھے جو صحیح معنوں میں دشت کی ویرانی کو لالہ زار میں بدل دیتے تھے اور جنھوں نے ہر شب میں چراغ روشن کرنے کا حوصلہ بخشا تھا — ادارۂ نیا دور ان تمام عظیم بزرگوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دُعا کرتا ہے کہ قحط الرّجال کے اس دَور میں اُردو کے موجودہ عظیم دانش وَروں پر آنے والا سال اپنی برکتیں نازل کرے اور وہ صدیوں تک اپنے قلم سے اُردو کے چمن کی آبیاری کرتے رہیں۔ (آمین)

بس! کچھ لمحے اور کچھ روز — اس کے بعد ہم نئے سال میں داخل ہوں گے۔

ہر گزرتے ہوئے سال کے ساتھ آنے والی صدی کی آہٹ سنتے ہوئے ایک چیلنج کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم اس صدی میں اپنے کو کس طرح ڈھالیں گے کہ دُنیا خوبصورت ہو سکے اور اسے بہتر سے بہتر بنایا جاسکے۔

— سال کے خاتمے پر اپنی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک طرح کے اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ اس سال بھی ہم نے اپنی بساط کے مطابق کچھ تحفے پیش کیے ان میں "اودھ آئینۂ ایّام میں" اور اودھ نمبر کا ہندی اڈیشن اہم ترین ثابت ہوا، خصوصاً "اودھ آئینۂ ایّام میں" کا جس زبردست طریقے سے خیر مقدم کیا گیا وہ بے حد متاثر کُن تھا۔ اور اب — جس وقت آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے اسی سے متصل "فراق: صدی کی آواز" آپ کے ہاتھوں میں ہوگا — یہ نمبر فراق صدی کے موقع پر، اُن کے لیے ادارۂ نیا دور کی طرف سے خراجِ عقیدت ہے۔

یوں تو نیا دور دوبار فراق نمبر پیش کر چکا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ "فراق: صدی کی آواز" صرف کتب خانوں، لائبریریوں کی الماریوں کی زینت نہیں بنے گا بلکہ آپ صدی کی آواز کو انشاء اللہ صدیوں تک اپنے ذہنوں اور حافظوں میں محفوظ رکھیں گے۔

——— ایڈیٹر

مجھے خود ہے خبر یہ برہنہ سر کبھی ہو گا نیزے کی نوک پر
مری بے کلہی سے ہے گلہ شہ کج کلاہ کو بے سبب

مجھے وصل کی نہ تھی آرزو، رہی اپنی ہمیشہ ہی جستجو
میرے اس کے بیچ میں رکھ گیا کوئی شہر پناہ کو بے سبب

میں کبھی وہ راہ نہیں چلا کہ جس پہ ہوں اوروں کے نقشِ پا
مرے دامن و جیب سے دشمنی ہے غبارِ راہ کو بے سبب

مجھے دینا ہے اپنا حساب خود، مجھے سہنا ہے اپنا عذاب خود
وہ یقیں کے دانوں پہ گنتے ہیں مرے ہر گناہ کو بے سبب

میں تھا ایسا کون بروں بیں، رہا عمر تمام دروں بیں
کیا قید افق کے حصار میں مری حد نگاہ کو بے سبب

ہے یہ کیا ہجوم خوں طلباں، میں ہوں خود ہی شہیدِ غم جہاں
مجھے نرغے میں لینا فضول تھا، کیا جمع سپاہ کو بے سبب

میں رہا رہینِ سکوتِ غم نہ کسی سے شکوہ نہ عرضِ ستم
ملاطعنۂ درد و فغاں کیوں مرے نالہ و آہ کو بے سبب

مرے مدِ نظر جو رہا اسے کبھی مری نگہ سے بھی دیکھتے
وہ جو خود فریب سمجھتے ہیں مری ہی نگاہ کو بے سبب

مری مملکت بھی ہے کاغذی مرا پیرہن بھی ہے کاغذی
وہ قلم کے سامنے لائے ہیں قلم و سپاہ کو بے سبب

□□

پروفیسر وحید اختر
۱۲۰۰/۴۴، اے سر سید نگر
علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

علی جواد زیدی
۱۸۶/۳ وشواس کھنڈ ۔ گومتی نگر لکھنؤ

یادوں کی رہگزر (۶)

یونیورسٹی سے جوارِ زنداں تک

یونیورسٹی کی باتیں کرتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس داستان کو کہاں ختم کروں ؟ داستان کو سمیٹنا تو پڑے گا ہی، لیکن خاتمے سے پہلے یہاں کی ایک روایت کا ذکر ضروری ہے جو ماضی کی ہر روایت کی طرح مٹ چکی ہے، پھر بھی قابل ذکر ہے۔ یونیورسٹی یونین کے الکشن میں اکثر امیدواروں کے مذہب کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور پھر عارضی ہی سہی، ناخوش گواری پیدا ہو جاتی تھی۔ کبھی صوبائی اور علاقائی سوال بھی ابھر آتے۔ عام سیاسی فضا کے اچھے بُرے اثرات سے بالکل بچے رہنا بے حد دُشوار ہو جاتا ہے۔ مسز سروجنی نایڈو کے مشورے سے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ سال میں دو سشن ہوں گے۔ ایک سشن میں ہندو صدر ہوگا، اور دوسرے میں مسلمان۔ جب ہندو یا مسلمان صدر ہوگا تو نائب صدر علی الترتیب مسلمان یا ہندو ہوں گے۔ تین الکشن ایسے ہوئے جن میں ضمنی سوال بھی اُبھرے۔ شفیق نقوی اور انور جمال قدوائی کا یونیورسٹی سے اس لیے اخراج ہوا تھا کہ شہنشاہ جارج پنجم کی وفات پر یونیورسٹی میں ریزولیوشن پاس کیا گیا تھا۔ انھوں نے اسی کو بنیاد بنا کر سکلت والا کی وفات پر یونین میں بھی ایسی ہی تجویز رکھنے کی جرأت کی۔ یہ دونوں اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کی سزا کے طور پر ان کو یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ اس مدّت کے خاتمے پر دوستوں نے شفیق نقوی کو امیدوار صدارت بنایا۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ نقوی مذہب کو نہیں مانتے وہ تو مسلمان ہی نہیں ہیں۔ ٹیڑھی کھیر تھی ۔ یا تو نقوی انتخابی ہم سے باہر نکل آئیں یا اپنا مسلمان ہونا تسلیم کریں۔ انھوں نے تحریری طور پر لکھ کر دیا (اصل الفاظ مجھے یاد نہیں لیکن مفہوم یہ تھا) کہ میں مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہوں، اسی ماحول کا پروردہ ہوں، لیکن میں کسی Established Church منظم ٹکے بندھے عقائد کے نظام) سے وابستہ نہیں ہوں۔ رٹرننگ افسر نے ان کی بات مان لی ۔ وہ اُمیدوار بنے اور کامیاب ہوئے۔

دوسرے الکشن میں تزئین حبیب اللہ امیدوار صدارت ہوئیں۔ ذہین تھیں، اچھی مقرر تھیں اور میری ہم جماعت تھیں۔ اس میں منشی بلرام سنگھ نے یہ نکتہ اٹھایا کہ وہ وائس چانسلر شیخ حبیب اللہ تعلقہ دار کی صاحبزادی ہیں۔ طلبا کی تحریکوں میں ہمارا ساتھ نہ دے سکیں گی اور انھوں نے چودھری احسن سعید کو امیدوار بنا دیا میں نے بھی بلرام سنگھ کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ وائس چانسلر اور طلبا کے ٹکراؤ کی صورت میں بیٹی کا باپ کی مخالفت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اب اس کو کیا جائے کہ مدعی ہی سُست نکلا، گواہ کی چُستی کیا کام آتی ؟ احسن سے تزئین کی دُور کی قرابت نکل آئی اور اُن پر اتنا خاندانی دباؤ پڑا کہ انھوں نے ہم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر چُپکے سے نامزدگی واپس لے لی۔ قرابت اصول پر حاوی رہی اور تزئین بلا مقابلہ منتخب ہو گئیں۔

تیسرا یادگار الیکشن ڈی، پی، در (دُرگا پرشاد در) کا تھا۔ وہ کشمیر سے تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے تھے۔ اس زمانے میں یہاں یہ سہولت حاصل تھی کہ قانون اور کسی دوسرے مضمون میں ایم اے کے امتحانات ساتھ دیے جا سکتے تھے۔ تدریس میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی کیوں کہ قانون شام کو پڑھایا جاتا تھا اور دوسرے مضامین دن میں اس طرح طالب علم کے دو تعلیمی سال بچ جاتے تھے لیکن اس پر پڑھائی کا بوجھ بہت پڑتا تھا۔ اب یہ سہولت ختم ہو گئی ہے۔ قانون کی مدّتِ تعلیم

بھی بڑھا دی گئی ہے۔ اس لیے بھی اب یہ ناممکن ہوگیا ہے۔ جس زمانے کی بات ہو رہی ہے اس زمانے میں یہ سہولت حاصل تھی اور پنجاب و کشمیر سے خاصی تعداد میں طلبا یہاں آجاتے تھے۔ ڈر کے مخالف مقامی اور بیرونی کا سوال اٹھایا لیکن ڈر صدر منتخب کر لیے گئے۔ دراز قد، دل کش شکل و شمائل، اس پر حسنِ خطابت۔ سبھی ان کے گرویدہ ہو رہے تھے۔ لڑکیاں تو اُن پر جیسے جان چھڑکتی تھیں۔ وہ ہر حلقے میں مقبول تھے۔ ان کے ناتواں مدِ مقابل نے خوب مقابلہ کیا لیکن ڈر کامیاب ہو کر رہے۔ میں نے ان الکشنوں میں دل کھول کر حصّہ لیا اور بہت طلبا سے اس دوران جو ملاقاتیں ہوئیں وہ پائدار دوستیوں میں بدل گئیں۔

انھیں الکشنوں کا ایک شاخسانہ سکریٹری کے منصب کے لیے میری ناکام اُمیدواری بھی تھی۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں حلقۂ انتخاب مسلسل سیّال کیفیت میں رہتا ہے۔ ہر سال ہر درجے اور ہر شعبے میں نئے طلبا آتے اور پُرانے جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے کنویسنگ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس زمانے میں پوسٹر بازی اور نعرہ بازی وغیرہ کی وبا عام نہیں ہوئی تھی۔ انفرادی رابطے کی بڑی اہمیت تھی۔ ہر طالب علم سے ملنا پڑتا۔ ٹھیک اسی زمانے میں "طیور کی زبانی" یہ خبر اُڑتی ہوئی" آئی کہ سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی پاداش میں میری گرفتاری ہونے والی ہے۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں کے مشورے پر مجھے کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جانا پڑا۔ خبر غلط نکلی اور میں تین چار دن کے بعد واپس آگیا۔ لیکن یہ جبری غیر حاضری اس نازک مرحلے پر تیرہ ووٹوں سے شکست کا سبب بنی۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ؎ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ایک دل چسپ بات یہ ہوئی کہ مرحوم انور جمال قدوائی نے "نیشنل ہرالڈ" میں کچھ اس نوعیت کا مراسلہ شائع کرایا کہ پلّہ تو زیدی کا بھی بھاری تھا لیکن لڑکیوں نے مجموعی طور پر سردار کو ووٹ دیے کیونکہ وہ زیادہ خوبصورت تھے۔ یہ مراسلہ پڑھ کر کم از کم دو لڑکیوں نے تو مجھ سے کہا کہ "یہ تو غلط ہے۔ ہمارا خیال تو اس کے برعکس ہے" مجھے اپنی صورت کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے لیکن جب بات اخبار تک آگئی تو اس کا ذکر نہ کرنا یادداشت کے ساتھ ناانصافی کے مرادف ہوتا۔ لڑکیوں کے اجتماعی فیصلے اور نیت کی اطلاع جمال بھائی کو بھی ملی ہوگی وہ میرے اور سردار کے مشترک دوست تھے آخر تک بڑے بڑے عہدوں تک پہونچنے کے بعد بھی یہ دوستی نبھائی اس مراسلے کو میں نے دوستانہ تفریح سے زیادہ اہمیت نہ دی۔

متحدہ محاذ میں شگاف

۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر جو پابندی عائد تھی وہ ہٹالی گئی اور متحدہ محاذ کی پالیسی بھی ختم ہو گئی۔ طلبا کی صفوں پر بھی اس کا سایہ پڑنے لگا۔ اب الکشن باقاعدہ جماعتی لائنوں پر لڑا جانے لگا۔ اشتمالی منظم تھے لیکن دوسرے خیالات کے طلبا جن میں سوشلسٹ پارٹی بھی شامل تھی، ایک متحدہ محاذ بنائے رکھنے کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طلبا کی حد تک متحدہ محاذ بنائے رکھنا بہتر ہوگا۔ لیکن مدراس کانفرنس میں دراڑ پڑ گئی۔ اس لیے الکشن اگرچہ اب بھی یونیورسٹی میں سروجنی نائیڈو فارمولے کے ماتحت ہوتے رہے لیکن اشتمالی اور قوم پرور اشتراکی خط بھی اُجاگر ہونے لگا تھا۔ اس میں کانگرسی اشتراکیوں اور قوم پروروں کا پلّہ بھاری رہا اور کئی برس تک انھیں کے امیدوار منتخب ہوتے رہے۔ کمیونسٹ خیالات کے خواجہ جمیل الدین کے انتخاب کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا۔ اب صورت بالکل ہی بدل گئی ہے۔ نائیڈو فارمولا تو بھلا ہی دیا گیا۔ الکشنوں کی وہ سنجیدہ فضا جس میں میں اور سردار ساتھ ساتھ کنویسنگ کرتے تھے خواب کی بات معلوم ہونے لگی ہے۔ بڑی رقوم خرچ ہوتی ہیں اور جسمانی زور آزمائی کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ طلبا کی ایک شاخ ہر پارٹی نے الگ بنالی ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی متحدہ آواز اٹھے یا اقدام کیا جائے۔ نوجوانی کے بہت سے ٹوٹے ہوئے خوابوں میں ایک یہ بھی ہے۔

"ہندُستان"

صحافتی محاذ پر ہفتہ وار "ہندستان" حیات اللہ انصاری کی ادارت میں نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ اس میں نوجوان ادیبوں نے دل کھول کر حصّہ لیا۔ بیشتر لکھنے والے ترقی پسند خیالات کے تھے۔ مجاز، سردار جعفری، جذبی، سبطِ حسن، سلام مچھلی شہری،

رضا انصاری، راقم الحروف، عتیق صدیقی اور عشرت علی صدیقی وغیرہ سبھی اس میں لکھتے رہے۔ بعد میں جب سبط حسن نے ہفتہ وار پرچم نکالا اور آخر کار "نیا ادب" سامنے آیا تو یہ گروہ قلمی معاونت کے لیے آمادہ تھا۔ کیفی اعظمی پر "ہندستان" میں تبصرہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر کا یہ نقرہ مدتوں متضاد خیالات رکھنے والے حلقوں میں گردش کرتا رہا کہ

" گلزارِ ادب میں نیا پھول کھلا ہے، سرخ پھول !"

یعنی کیفی اعظمی کو کلی سے کھل کر پھول بننے کی زحمت اٹھانا نہیں پڑی ! یہ معترضین کی جملہ بازی تھی۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ وہ پھول معترضین کی نظر بد کے باوجود آج بھی کھلا ہوا ہے۔ "نیا ادب" کے اثرات زیادہ دوررس اور دیرپا رہے لیکن "ہندستان" کی پیش روی بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

اسٹوڈنٹس فیڈریشن

حاشیائی طور پر آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کچھ ذکر قسط نمبر ۲ (اگست ۱۹۹۶ء) میں آپ پڑھ چکے ہوں گے۔ حتی الوسع صیغۂ واحد متکلم میں گفتگو سے گریز کرتا ہوں، کیوں کہ یادیں بالکل شخصی ہوں تو دوسروں کی سمع خراشی کیوں کی جائے، ہمارے لیے تو وہ فضا اہم ہے جس کی بازآفرینی یادوں کا مقصد اصل ہے۔ پھر بھی عام انسان کی طرح، راقم بھی اپنے وجود سے کہاں تک کترا سکتا ہے۔ یہاں آپ کی اجازت سے چند جملوں میں طلباء کے فیڈریشن سے ذاتی روابط کے بارے میں بھی کچھ کہوں گا۔ میں طلباء کے اس کل ہند ادارے کے بنیادی اراکین میں ہوں اور ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۴ء اس سے عملی طور سے وابستہ رہا۔ ابھی بی اے ہی میں تھا کہ لکھنؤ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا متفقہ طور پر جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوا۔ یہ آخری متفقہ انتخاب ثابت ہوا۔ دوبارہ ناگ پور کے اجلاس میں انتخاب ہونے والا تھا، لیکن مدراس کے بعد یہاں پھر ادارے میں ایسی پھوٹ پڑی کہ دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ دونوں اپنے کو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کہتے رہے، لیکن اس حصۂ داستان کو ناگ پور کانفرنس کے واقعات کے بیان پر منحصر کرتا ہوں۔ یہی وہ شہر ہے جہاں سامراجیوں نے میرے شوق بلند کو قید خانے کی چار دیواری میں بند کرنا چاہا تھا۔

طلباء کی تحریک کی پوری کہانی سنانے کے سلسلے میں ع
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

طلباء تمام قومی تحریکوں میں دل کھول کر اور پورے جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ بوڑھوں کا تجربہ اور نوجوانوں کا جوشِ عمل جب تک یکجا نہ ہوتے قومی تحریک دبی دبی سی رہتی۔ وہ انقلابیوں کا غیر منظم ابال ہو، یا تقسیم بنگالہ ہو یا پھر گجرات کے کسانوں کی تحریک ہو یا ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک ہو یا ۱۹۳۱ء کی گاندھیائی تحریک ہو، پھر ٹریڈ یونین کی تحریکیں ہر جگہ طلباء اور نوجوان پیش پیش تھے۔ ادب و شعر و ثقافت میں بھی انھوں نے رہبرانہ کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۶ء تک طلباء نے جو کچھ کیا وہ جذباتی ہم آہنگی کی بنا پر کیا، وہ منظم نہیں تھے۔ ۱۹۳۶ء کی پہلی کل ہند طلباء کانفرنس نے انھیں ہندگیر پیمانے پر منظم کیا اور اگلے سال لاہور کے بریڈلا ہال میں سرت چندر بوس کی صدارت میں جو اجلاس ہوا اس نے تحریک کو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا نام دیا اور اسی منزل سے میں اس تحریک سے فکری اور عملی طور پر وابستہ ہو گیا۔ ادھر ترقی پسند مصنفین کانفرنس نے ادیبوں اور شاعروں کو یکجا کر دیا۔ اگرچہ اس میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی بھی نمائندگی تھی لیکن اردو والے ہمیشہ زیادہ فعال رہے۔ شروع میں انتظامی سطح پر اشتراکی عناصر سجاد ظہیر (بنّے بھائی) کی قیادت میں چلتے رہے لیکن اس کی ابتدا ایک مشترکہ ترقی پسندانہ پلیٹ فارم کی حیثیت سے ہوئی جیسا کہ پہلی ہی کانفرنس سے پریم چند، حسرت موہانی، نیاز فتحپوری اور قاضی عبدالغفار جیسے ناموں کی وابستگی سے ظاہر تھا، لیکن تنظیم کمیونسٹوں کے ہاتھ میں رہی۔ پھر بھی ایک لچک تھی اور حیات اللہ انصاری اور ساغر نظامی وغیرہ بھی اس میں حصہ لیتے رہے۔ میں بھی وابستہ تھا لیکن تنظیم کے چلانے میں دفتری نظام جو حکمت عملی یا فکری خطوط متعین کرتا تھا اس پر سوچ ہی نہیں جائزہ و نقد کے دروازے بند نہیں ہونے دیتا تھا۔ بھیمڑی کانفرنس نے "جو ہمارے ساتھ سو فیصد نہیں وہ ہمارے خلاف ہے" کی پالیسی اپنا کر تحریک کو نقصان پہونچایا جس کا احساس منتظمین کو بعد میں ہوا لیکن "بعد از خرابی بسیار" یہی حال طلباء کی تنظیم کا بھی ناگ پور اجلاس کے افتراق کے بعد ہوا۔ میرے خیال میں مختلف ہم خیال یا مشترک خیال کے عناصر کو یکجا رہنا چاہیے تھا

لیکن اب میں حافظ کا یہ مصرعہ پڑھ کر تسکین دے لیتا ہوں کہ

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

(اے حافظ! تم گوشہ نشین درویش ہو، شور مچانے سے فائدہ!)

چلتے چلاتے ایک وضاحت ضروری ہے کہ بہت سے حضرات ۱۹۳۶ء کو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسی کانفرنس کی بدولت ایک مستقل تنظیم بنانے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن ۱۹۳۷ء میں لاہور کے اجلاس میں ہی طلبا کی باقاعدہ تنظیم کا وجود ہوا۔ اس کا ایک دستور العمل بنا اور وہی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا نقطۂ آغاز ہے۔ اسکے جشن طلائی کے موقع پر میں نے انگریزی میں ایک کتابچہ شائع کر کے اس مسئلے کو واضح کر دیا تھا کہ یہ جشن پہلی آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا ہے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا نہیں۔ لاہور کے بعد مختلف شہروں میں سالانہ اجلاس ہوتے رہے۔

دلّی میں جو سالانہ کانفرنس ہوئی وہ دارالسلطنت کی مرکزیت کی وجہ سے بہت کامیاب رہی۔ کافی طلبا شریک ہوئے لکھنؤ اور یوپی کے دوسرے شہروں کے طالب علم بھی اچھی تعداد میں شریک تھے۔ لکھنؤ سے جانے والے طلبا کے ساتھ طالبات بھی تھیں۔ انھیں ہم سفروں میں سلطانہ منہاج بھی تھیں، وہ اس وقت طلبا کی تحریک میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لے رہی تھیں۔ ان میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا، ذہانت تھی اور جرأت فکر و عمل بھی تھی۔ وہاں ایک ہی ہوٹل میں قیام رہا اور انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ اختلاف ماحول بیچ میں کوئی دیوار کھڑی کر سکتا ہے۔ ان کی زندہ دلی، اور ذہانت، سنجیدگی اور آزادہ روی ایک عطر مجموعہ بن گئی تھی۔ بعد میں پہلی کل ہند طالبات کانفرنس لکھنؤ میں انھیں کو صدر مجلس استقبالیہ چنا گیا۔ حق حقدار کو پہونچا۔

ہوٹل کے جس کمرے میں ہم مقیم تھے وہ کبھی بند نہ رہتا تھا ہم وہاں رہیں یا نہ رہیں بعض بے تکلف اصحاب وہاں آکر چائے نوش فرماتے اور چلے جاتے ہمیں خبر بھی نہ ہوتی۔ کانفرنس کے خاتمے پر ہم نے منیجر سے حساب کتاب دیکھنا چاہا تو معلوم ہوا کہ بل ہمارے گمان اور اس لیے ہماری استطاعت سے زیادہ کا ہو چکا۔ مجبوراً روانگی روکنا پڑی اور گھر سے تار کے ذریعے دو ایک دوستوں نے روپئے منگوا کر ہوٹل کا حساب چکایا۔ لیکن کسی کو کوئی ملال نہ تھا۔ حساب دوستاں تو ہمیشہ دل میں ہوا کرتا ہے۔ اس کی خبر بھی دو تین دوستوں کے علاوہ کسی اور کو نہ ہونے پائی۔

اگر ناگ پور سشن میرے لیے اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہیں جنگ مخالف سرگرمیوں کے جرم میں میری گرفتاری ہوئی تو پٹنہ سشن اس لیے اہم ہے کہ وہیں مجھے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ موقع سے تفصیلات کا بیان ہوتا چلے گا۔ یہاں رابطۂ تاریخی کے ان طویل جملہ ہائے معترضہ کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم

۱۹۳۹ء ہی میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ہندستان کو خواہی نخواہی برطانوی سامراج نے جنگ میں جبراً شامل کر دیا۔ یہ جنگ سامراجی بغاوت کی خاطر چھڑی تھی۔ جرمنی، اٹلی اور بعد میں جاپان ایک طرف تھے اور برطانیہ، امریکا اور چین دوسری طرف۔ روس اور جرمنی کے درمیان معاہدہ ہو چکا تھا اور وہ شروع میں کسی کی طرف سے شامل نہیں تھے اور تمام ترقی پسند عناصر کا ایک ہی نعرہ تھا کہ یہ جنگ سامراجی ہے اور اس میں مدد دینا یا ہندستانیوں کو فوج میں بھرتی نہ ہونا چاہیے — ایم۔ این۔ رائے اس کو فسطائیت دشمن جنگ قرار دیتے تھے۔ ہندستان کا رویہ صاف تھا کہ جمہوری طاقتوں کے مقابلے میں نازی اور فسطائی طاقتوں کا ساتھ دینے کا سوال تبھی اٹھ سکتا ہے جب ہندستان کی آزادی کا واضح اعلان کر دیا جائے۔ لیکن برطانوی ارباب اقتدار جنبش کرنے کو تیار نہیں تھے۔ چرچل وزیر اعظم انگلستان کا وہ جملہ مشہور ہے کہ "میں برطانیہ کا وزیر اعظم اس لیے نہیں بنا ہوں کہ برطانوی شہنشاہیت کے خاتمے (کے جلسے) کی صدارت کروں"۔ یہ اور بات ہے کہ تاریخ میں ان کا نام اسی سرخی کے تحت لکھا جانے والا تھا۔ برطانوی اقتدار ہندستان کی محدود طاقتوں والے صوبوں کی حکومتوں پر یہی زور ڈالتا رہتا تھا کہ وہ برطانیہ کے فوجی منصوبوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں لیکن چونکہ مستقبل کے بارے میں ان کے ارادے ہمت شکن تھے اس لیے قومی سیاست اس پر آمادہ نہ ہوئی اور کانگرسی حکومتوں نے متفقہ طور پر استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب حکومتوں کا ہی نہیں بلکہ ہم جیسے افراد

کو بھی مستقبل میں مجاہدانہ طرزِ عمل کا اشارہ ملنے لگا تھا۔ مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا اور پہلے ستیہ گرہی ونوبا بھاوے مقرر ہوئے۔ پھر وزراء اور پارلیمنٹری سکریٹریوں وغیرہ کی نوبت آئی۔ طلباء اس خاص تحریک سے الگ رہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دو سابقی بعض مخصوص حالات میں اس میں بھی شامل ہو گئے۔ اب جہادِ آزادی میں نیا موڑ آ گیا تھا اور عام طلباء انفرادی ستیہ گرہ سے بالکل متاثر نہیں ہوئے بلکہ پہلے کی طرح سرگرمی سے جنگ مخالف تحریکوں میں شریک ہوتے رہے۔ جلسے، جلوس، گرفتاریوں پر عملی احتجاج وغیرہ میں بڑی شدت آ گئی اور ۱۹۳۱ء کی عوامی جدوجہدِ آزادی کی سی فضا واپس آنے لگی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی اسکول کالج یا سبھی تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہو جاتی، کالجوں کے اندر، سڑک کے کونوں پر، چھوٹے بڑے میدانوں اور پارکوں میں جلسے ہوتے۔ مشاعروں میں نظمیں پڑھی جاتیں۔ انھیں میں سردار جعفری کی جنگی بھرتی کی مخالف نظم بھی تھی، جس کا ایک شعر نعرہ بند شاعری کی مثال کے طور پر اکثر مخالفین ترقی پسندی نے پیش کیا ہے ؎

سڑک کے اُس کنارے اک یہ لکڑی کے تختے پر
جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے یہ بھرتی کا دفتر ہے

سردار جعفری نے اس دور میں کئی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں، لیکن مخالفین کی قوتِ حافظہ ایسی نظموں کو بھول جاتی ہے اور انھیں "لے دے کے ساری داستان میں یاد ہے آتنا"[1]

یہی زمانہ فرقہ وارانہ فسادات اور منافرت کی شعلہ فشانی کا تھا۔ جنوب میں تو اثر کم تھا لیکن سارا شمالی ہند اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ منافرت کی اس وبا کے خلاف کانگریس اور دوسری قومی پارٹیوں نے جو کچھ کیا وہ تو کتابوں میں کسی قدر محفوظ رہ گیا ہے لیکن طلباء کی تحریک نے جو زبردست حصّہ لیا اس کا ذکر کم آیا ہے۔ اسی زمانے کی میری ایک للکار تھی

؎ یہ کون کھڑا سناٹے میں مذہب مذہب چلّاتا ہے

یہاں مذہب سے نفسِ مذہب مراد نہیں تھا بلکہ فرقہ پرستوں کے ایسے نعرے تھے کہ مذہب خطرے میں ہے" — "دھرم سنکٹ میں ہے" —— دراصل خطرے میں فرقہ پرستوں کے ذاتی مفاد تھے۔ ابھی محترمی ڈاکٹر مختار الدین احمد نے پچھلی قسطوں کے مطالعہ کے بعد اپنی ڈائری سے ۱۹۴۱ء کا ایک اندراج زیراکس عنایت فرمایا، اس میں اس اجلاس پٹنہ میں میری اس نظم کا یہ مصرعہ نقل کرتے ہوئے اُس وقت کا یہ تاثر کہ نظم مذہب کے خلاف ہے، مجھے بھیجا تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ایک ابتدائی بند نذرِ ناظرین کر دوں جس سے یہ واضح ہو سکے کہ نظم کا نشانہ فرقہ پرست تھے اور یہ بھی کہ اس کا لہجہ کیا تھا ؎

ایسی بھی ہزاروں صبحیں ہیں جو رات سے بڑھ کر کالی ہیں
جو نورِ خوشی سے عاری ہیں، مہندی کی مہک سے خالی ہیں
اور ان صبحوں کے آنگن میں افلاس ہی اُگتا رہتا ہے
بھوکے انساں کے خوابوں کے سارے آرام خیالی ہیں
ہر بجلی ان کی تاک میں ہے، ہر شعلہ اِن کا بھوکا ہے
کانٹوں سے یہ زخمی ہیں لیکن گلزارِ جہاں کے مالی ہیں
ان زخموں کے پردے سے کوئی 'مذہب' مذہب چلّاتا ہے

(ورق ورق زنجیر)

سبز زنداں!

۱۹۳۹ء واقعات و حوادث سے بھرا ہوا سال تھا، لیکن میں یادوں کو واقعات کی کھتونی[2] نہیں بنانا چاہتا، اور سیدھے ۱۹۴۰ء کے وسط میں آپ کو لے چلنا چاہتا ہوں۔ میں ایل ایل بی کے آخری سال میں پڑھ رہا تھا۔ امتحان کو مشکل سے پانچ مہینے باقی رہ گئے تھے کہ یکایک ایک واقعہ پیش آ گیا جس نے حالات کی رو بدل دی۔ یونیورسٹی میں قانون کے شعبے کے صدر ڈاکٹر آر. یو. سنگھ تھے، امریکا سے ڈگری پائے ہوئے۔ آنربان کے پروفیسر تھے اور یو پی لیجس لیٹو کونسل میں تعلقداروں اور زمینداروں کے نمائندے تھے۔ انھوں نے اپنی پسند کی ایک سوسائٹی قائم کرنا چاہی۔ قانون کے طلبا، عموماً قانون شکنی سے گریز کرتے ہیں اور سنگھ صاحب سوسائٹی کا جو ڈھانچہ بنا لائے تھے وہ رسمی طور سے پاس بھی ہو جاتا، لیکن مجھے یہ بالکل غیر جمہوری رویّہ معلوم ہوا کہ لا سوسائٹی کا دستور العمل یوں اوپر سے لادا جائے۔ میں نے جلسے میں کہا کہ دستور العمل کی ہر دفعہ پر طلبا کی رائے لی جانا چاہیے۔ جب چھان بین کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو طلباء کے حقوق نمائندگی کے تحفظ کی بات اٹھی، جو آر. یو. سنگھ کو ناگوار گزری۔ اب انھوں نے مجھے

کلاس میں طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کیا۔ عام دستور یہ تھا کہ اگر کوئی طالب علم ذرا دیر سے آتا تو کلاس ختم ہونے پر وہ حاضری بنوالیا کرتا تھا، یہ رعایت سب کو حاصل تھی۔ لیکن اب مجھ پر یہ نوازش شروع ہوئی کہ اگر میں لمحہ بھر بھی دیر سے پہنچتا تو مجھے غیر حاضر بنا دیا جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ مسئلہ انفرادی سے اجتماعی بنا لیا گیا۔ کئی طلباء جان بوجھ کر دیر سے آنے لگے۔ اس طرح صدر شعبہ مسٹر سنگھ کے تخیلِ اقتدار کو مزید دھکا لگا۔ انھوں نے دوسری تجویز نکالی اور سوسائٹی کی دستور سازی سے توجہ ہٹا کر ایک موٹ کورٹ کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ اس کے افتتاح کے لیے سر مارس گائیر کو مدعو کیا، جو ہندستانی سپریم کورٹ کے چیف جج تھے اور باعتبارِ عہدہ دلّی یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے۔ وہاں دو طلباء مقیم الدین فاروقی اور یگیہ دت شرما کا نام ان کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ اب طلباء نے نہایت سرعت کے ساتھ اور جوابی حملے کے طور پر یہ طے کیا کہ چانسلر دلّی یونیورسٹی سر مارس گائر کے خلاف مظاہرہ کیا جائے۔ آر. یو. سنگھ اور ان کے حامیوں کو ہماری تیاریوں کی سُن گُن بھی نہ لگنے پائی۔ اگرچہ فاروقی اور شرما دونوں کمیونسٹ خیال کے تھے اور مقامی بھی نہ تھے لیکن ابھی تک متحدہ محاذ کا زمانہ تھا۔ ہر مکتبۂ خیال کے طلباء نے مِل جُل کر شان دار اور پُرامن مظاہرہ کیا۔ اتحادِ خیال و عمل اتنا زبردست تھا کہ کسی کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ ان دونوں مجاہدینِ آزادی کا سیاسی نظریہ کیا تھا؟ کسی کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ گزرا کہ یہ دلّی کا معاملہ ہے ہم اس میں کیوں اُلجھیں؟ سب کی نگاہوں میں یہ طلباء کا معاملہ تھا اور بس! مشترکہ محاذ کی پالیسی کی یہ شان دار جیت تھی۔

یہ مظاہرہ پُرامن تھا۔ لیکن ایسے مواقع پر ایسے بھی کچھ عناصر نکل آتے ہیں جو اشتعال انگیزی کر کے متشدّدانہ شکل پیدا کر دیا کرتے ہیں اس کی آڑ میں حکومت خواہ مخواہ سرکاری تشدّد کا بہانہ ڈھونڈھ لیا کرتی تھی۔ اس موقع پر پولیس والوں یا ان کے ایجنٹوں نے کچھ پتھر اس وقت پھینکے جب سر مارس گائیر یونیورسٹی کی طرف آرہے تھے۔ یونیورسٹی حکام گائیر کے گرد گھیرا ڈال کر انھیں قریب ترین کمرے کی طرف لے گئے، جہاں شعبۂ سیاست کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس پناہ گاہ کے دروازوں میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ کچھ پتھر اس پر بھی لگے۔ میں، سردار جعفری اور چیتن سنگھ گریوال مظاہرین کی صف میں پہلے سے موجود تھے۔ اس متشدّدانہ موڑ کو روکنے کے لیے ہم آگے بڑھے اور اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ مظاہرہ ہر حال میں پُرامن رہنا چاہیے۔ ویسے بھی گائیر یونیورسٹی کے مہمان تھے۔ ان کے خلاف سیاسی مظاہرہ تو ٹھیک تھا لیکن متشددانہ رویّہ غلط ہوگا۔ بڑی مشکل سے برہم ہجوم اس پر راضی ہوا کہ موٹ کورٹ کا باضابطہ افتتاح کیے بغیر ہی سر مارس گائیر کو بخیر و عافیت واپس جانے دیا جائے۔

یہ واقعہ معمولی نہیں تھا۔ برطانوی ہند کی سپریم کورٹ کا چیف جج نائٹ ہوڈ سے آراستہ سامراجی اقتدار کی اہم ترین علامتوں میں سے تھا، اسے یوں جانا پڑا۔ آر. یو. سنگھ نے ان سے تقریر بغرض اشاعت حاصل کر کے یہ تاثر دینا چاہا کہ جیسے سب خیریت ہے اور "باقی خیریت مطلوب ہے" لیکن ان کے والیانِ نعمت سخت برافروختہ تھے کہ طلبا کے خلاف کارروائی ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن کیا ہو؟ سب سے آسان نسخہ یہ سمجھا گیا کہ مارس گائیر کے اس "استقبال" کی پاداش میں سربرآوردہ طلباء کو گرفتار کر لیا جائے۔ جن تین طلباء کے نام وارنٹ جاری ہوئے وہ تھے علی جواد زیدی، قاضی جلیل عباسی اور علی سردار جعفری! اصل پرخاش تو مجھ سے تھی کیونکہ آر. یو. سنگھ مجھ سے ناراض تھے اور ان کے خیال میں میری ہی قیادت میں یہ ساری ہنگامہ آرائی ہوئی تھی اور ان کا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ پروفیسر سنگھ کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے میں نے شہر کی قیام گاہ ترک کر دی تھی اور اپنے ماموں زاد بھائی سید خورشید احمد جو بعد میں مدیر نیا دور ہوئے، کے ساتھ ہیوٹ ہوسٹل میں رہنے لگا تھا۔ وہاں بھی مستقل قیام ناممکن تھا۔ چھپ چھپ کے اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا اور ضلعوں اور شہروں میں خفیہ طور سے جا کر تنظیمی کام کرتا۔ جب گرفتاری کا سوال اٹھا تو ہوسٹل میں مقید ہو کر رہ گیا۔ طبیعت اُلجھنے لگی۔ ایک روز ہم لوگوں نے طے کیا کہ اس سے بہتر ہے کہ ہم باہر ہی آجائیں اور گرفتاری دے دیں۔ چنانچہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالعلیم کی قیادت میں ہم لوگ نکل پڑے خبر پھیل گئی اور یونیورسٹی سے گنگا پرشاد ورما ہال تک پہنچتے پہنچتے چھ سات سو طلباء جمع ہو گئے۔ کچھ بن چلے

تو پھولوں کے ہار خرید لائے اور ہم تینوں کو پہنا دیئے۔ زوردار تقریریں ہوئیں لیکن حکومت خوف زدہ ہو گئی اور ہم کو گرفتار نہیں کیا۔ سننے میں آیا کہ اعلیٰ سطح پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ تعطیلات سرما تک گرفتاریاں ملتوی کر دی جائیں۔ یہ خبر بھی غلط نکلی کیوں کہ چند دنوں کے بعد چھٹیوں کے پہلے عباسی اور جعفری کو، جو شہر میں رہتے تھے، گرفتار کر لیا گیا۔ میں ہوسٹل میں رہنے کی وجہ سے گرفت میں نہ آسکا لیکن انڈر گراؤنڈ رہتے ہوئے بھی کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ قطعی تھا۔ تنظیمی طلبا برابر آ کر کہتے رہے کہ پولیس والوں نے ہوسٹل کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا ہے اور میں باہر نکلتے ہی گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ اس لذت کو کبھی نہیں بھول سکتا جو اس کش مکش کے عالم میں محسوس ہوتی رہی۔ اب میں ہوسٹلوں میں کمرے اور کبھی ہوسٹل بدلنے لگا۔ اس زمانے میں خورشید بھائی کو لوگ بہت پریشان کرتے اور صبح و شام میرا پتہ پوچھتے رہتے۔ ایک اور رفیق حبیب احمد صاحب (جو روس میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال ہوا) کو بھی اسی طرح پریشان کرتے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ یہ لوگ جاسوسی کرنے آتے تھے اور نوبت یہاں تک پہونچی تھی کہ بعض جان پہچان والوں پر بھی جاسوس ہونے کا شبہ کیا جانے لگا تھا۔

بس بیچ سے رشتہ ٹوٹ گیا!

آرزو لکھنوی کے ایک مشہور شعر کا یہ ٹکڑا بے اختیار یاد آرہا ہے۔ پورا شعر صورت حال پر منطبق نہیں ہوتا، اس لیے نقل سے گریز کرتا ہوں۔ ہوا یوں کہ گرفتاری کی یہ افواہ کسی طرح میری بے حد محبت و شفقت کرنے والی ماں تک پہونچ گئی اور وہ بے چین ہو کر محمد آباد گہنہ (اعظم گڑھ) سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئیں اور سیدھے میرے چچا (خان بہادر) عبدالحسن صاحب مرحوم کے دولت کدے پر تشریف لے گئیں۔ وہ اس وقت یو۔پی حکومت میں چیف سکریٹری کی شاخ میں انڈر سکریٹری ہوم تھے۔ وہاں وہ اس غرض سے تشریف لے گئی تھیں کہ کسی طرح اس گرفتاری کو رکوائیں۔

بیوگی کی طویل اور پُر مشکلات عمر گزارنے کے بعد اب ان کے گھر میں خوشی کی پہلی تقریب ہونے جا رہی تھی۔ انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ فوراً میری شادی کر دیں گی۔ لڑکی میری ایک عزیزہ تھی اور رسم کے مطابق اسے گوشہ نشین بھی کرا دیا گیا تھا کیوں کہ اس کے مائکے میں شادی کے سلسلے کے انتظامات شروع ہو چکے تھے اور بعض قریبی اعزّا بھی کاموں کے سلسلے میں ہاتھ بٹانے کے لیے آ گئے تھے۔ ان حالات میں اماں گھبرا گئی تھیں۔ رشتہ والد مرحوم نے طے کیا تھا اور عزیزہ کی مرحوم ماں کے اصرار پر طے کیا گیا تھا۔ (میں نام اور جگہ وغیرہ کی تفصیلات شریفانہ مصلحت کی بنا پر نہیں دے رہا ہوں)۔ والدہ مرحومہ کی نظر میں یہ رشتہ ایک وصیت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اگرچہ میرے مرحوم والد نے اس طرح کی کوئی وصیت نہیں کی تھی۔ غرض وہ گھبرائی ہوئی تشریف لائیں اور خورشید بھائی کی وساطت سے مجھے بلوا بھیجا۔ میں روپوشی کی حالت میں تھا پھر بھی مرحومہ کی پریشانی اور حکم طلب کی تعمیل کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بڑی کوششوں سے، کئی جگہوں سے ہوتا ہوا، چھپتا چھپاتا وہاں پہونچا۔ مجھے دیکھتے ہی بے اختیار رونے لگیں اور بتایا کہ میں نے تمھارے چچا صاحب سے گفتگو کر لی ہے۔ شادی رک نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی سبیل ایسی نکالنی ہوگی کہ تمھیں اس گرفتاری سے بچا کر شادی کرا دی جائے۔ پھر تم جو چاہو کرو۔ اس وقت خاندان کی عزت اور زبان کی لاج کا معاملہ ہے۔ میں بھی ان کے گریۂ بے اختیار پر آبدیدہ ہو گیا۔

اتنے میں چچا صاحب کے حضور میں میری پیشی ہوئی۔ انھوں نے سمجھاتے ہوئے بزرگانہ مشفقانہ انداز میں مجھ سے کہا کہ یہ تمھارا قانون کا آخری سال ہے۔ چار پانچ مہینے امتحان کو اور رہ گئے ہیں۔ یہ وقفہ خاموشی سے طلب علم میں لگ کر گزار دو، امتحان میں شامل ہو جاؤ۔ شادی بھی ہو جائے۔ پھر تم آزاد ہو، جو چاہے کرو۔

میں سر جھکائے سنتا رہا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اب تو وارنٹ جاری ہو گئے ہیں اور جیل جانا ضروری ہے۔ ایسے حال میں شادی کا منصوبہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کب گرفتار ہو جاؤں۔ اس لیے فی الحال شادی ملتوی کر دی جائے۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد شادی کر لی جائے گی۔ والدہ صاحبہ نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ لڑکی گوشہ نشین ہو چکی ہے اور اتنی مدت تک اسے بٹھلائے رکھا نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا کہ لیکن کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ چچا مرحوم نے شفقت سے

اس مرحلے پر یہ تجویز رکھی کہ "میں جانتا ہوں کہ تم کسی قیمت پر معافی مانگنے پر رضامند نہ ہو گے۔ اپنے ہی گھر میں بنّے (سجاد ظہیر) اور منّے (حسین ظہیر) کو دیکھ چکا ہوں۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے ذاتی طور پر یقین دلا دو کہ امتحان تک صرف تعلیم پر توجہ دو گے اور عملی سیاست سے کنارہ کش رہو گے۔ آگے کے مسائل میں دیکھ لوں گا۔"

والدہ صاحبہ نے میری طرف پرامید نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحہ کیلئے میں سوچ میں پڑ گیا۔ ماں کی خواہش پر ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے، کیونکہ انھوں نے مجھے بڑی منتوں، مُرادوں اور بڑی محنتوں سے پالا تھا اور پڑھا لکھا کر کسی قابل بنایا تھا لیکن آج میں ان کی ایک معمولی سی خواہش کی تکمیل میں پس و پیش کر رہا ہوں۔ اسی طرح عبدالحسن صاحب مرحوم بزرگ تھے، حکومت میں ذمہ دار عہدے پر فائز اور خطاب یافتہ تھے، مجھ سے محبت کرتے تھے، میں نے عرض کیا اور دست بستہ عرض کیا کہ میں آپ کی اس بے کراں نوازش کے لیے بے حد احسان مند ہوں۔ آپ کی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا، لیکن آپ سے یہ وعدہ کرنا خود حکومت سے وعدہ کرنے کے مرادف ہوگا کیوں کہ اسی وعدے کو بنیاد بنا کر آپ مجھے گرفتاری سے بچائیں گے۔ اسے میرا ضمیر بھی گوارا نہیں کرے گا اور عام نگاہوں میں میری سبکی بھی ہو گی۔ میں دست بستہ معافی خواہ ہوں آپ سے بھی اور والدہ صاحبہ سے بھی۔ اُمید ہے کہ آپ لوگ مجھے معاف کریں گے

یہ جواب خاندانی روایات سے انحراف تھا، ان کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن انھوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ "میں تمھارے جذبات کو سمجھتا ہوں، لیکن اپنی ماں کو سمجھا دو۔" میں کیا سمجھاتا۔ بس ان سے لپٹ کر رونے لگا۔ ہم دونوں خوب روئے۔ پھر شفقتِ مادری غالب آ گئی۔ انھوں نے کہا:-

"میں سب کچھ برداشت کر لوں گی۔ جاؤ، خدا حافظ!"

میں قیام گاہ پر واپس آ گیا۔ رات بھر ایک ذہنی الجھن میں مبتلا رہا۔ خورشید بھائی نے تسلیاں دیں۔ اور پھر میں سو گیا۔ والدہ صاحبہ نے واپس جا کر لڑکی والوں کو سب حالات بتا دیئے اور آخر کار وہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ والدہ صاحبہ کو دوہرا رنج ہوا۔ ایک تو یہ کہ میں جیل چلا ہی جاؤں گا اور دوسرا یہ کہ رشتہ شادی بھی ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اسے بھی مرضیِ رب سمجھ کر انھوں نے اسی طرح صبر کر لیا جس طرح برسوں پہلے والد مرحوم کی ابدی جُدائی پر صبر کر لیا تھا۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ میں نے یہ سب وطن کی آزادی کے لیے کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اسے صبر و استقامت سے قبول کریں گی اور میری بے بسی کے پیشِ نظر میرے اس قصور کو معاف بھی کر دیں گی۔

میں ایک سسرال کے عوض دوسری سسرال چلا گیا۔ جیل — اُس زمانے میں مجاہدینِ آزادی جیل کو "سسرال" کہا کرتے تھے!

بیچ سے رشتے کے ٹوٹنے کے جذباتی اثرات کو دُور دُور تک محسوس کیا گیا۔ جن حالات میں یہ رشتہ ٹوٹا تھا وہ ذاتی ضرور تھے، لیکن میرے تمام اعزا، اور احباب بالخصوص بزرگ تر اصحاب بھی متاثر ہوئے انھیں میں مشہور افسانہ نویس علی عباس حسینی بھی تھے، وہ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود پکے وطن پرست بھی تھے اور اس کے لیے ایک بار انھیں سرکاری ناراضگی کا نشانہ بھی بننا پڑا تھا، مجھ پر بہت مہربان رہتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ خطرات کی پروا کیے بغیر انھوں نے ایک خط جیل میں خفیہ طور سے بھجوایا۔ خط خاصا طویل تھا۔ اس کے وصول ہونے پر میں نے ایک نظم "حسینی کے جواب میں" لکھی جو بعد میں رسائل میں شائع ہوئی۔ خط خاصا طویل تھا، نظم بھی طویل ہو گئی۔ چند شعر ان موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا حسینی نے خط میں ذکر کیا تھا ابتدائی دو تین اشعار کے بعد نظم یوں آگے بڑھی تھی ؎

اے دلی ہمراز! لیکن کیا ہیں زنداں کی بلائیں
چند سطریں جب حسینی کے قلم کی مسکرائیں
وہ قلم جو صفحۂ کاغذ پہ بکھراتا ہے نور
معتدل جس کی روانی، دوررس جس کا شعور
آج بھی جس نے لکھا ہے نامۂ ہمّت فروز
جسکے اک اک لفظ میں ہے سازِ ہمدردی کا سوز
جس کی لفظوں میں عنصر دردِ ذوقِ تخلیق پسر
جس میں نومولود بچے کی ولادت کی خبر
جس میں اک سرلاکھ نودے کے فسانے بیقرار
جس کی نازک نثر پر گھر کی پریشانی کا بار

جس میں شکوہ جا بجا ہے مہری ایّام کا
جس میں کچھ چرچا وطن والوں کے ذوقِ خام کا
زندگی کی کشمکش جس آئینے میں ضوفگن
جس کے اک گوشے میں شرمائی ہوئی میری دُلہن .....

آخری مصرعے میں جیتی کے خط کے اُس حصّے کی طرف اشارہ ہے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "ایک رشتہ ٹوٹ گیا تو کیا ہوا جیل سے چھوٹتے ہی تمھاری شادی ہوگی۔ بہت سی دُلہنیں تمھارے انتظار میں ہیں۔ میں تمھارے لیے بہت اچھی سی دُلہن ڈھونڈھ دوں گا۔" میں شادی رچانے سے زیادہ نئی دُنیا بنانے کی سوچ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس دُلہن کی ایک خیالی تصویر بھی بنا کر انھیں بھیج دی تھی

وہ دُلہن جو ڈھل رہی ہے گوشۂ افکار میں
وہ دُلہن جو پل رہی ہے اک جہانِ تار میں
جو کسی کی منتظر ہے جذبۂ اُلفت لیے
پھول برسانے کی خوابیدہ صلاحیت لیے
جو رواج و رسم سے دَب کر مری ہو جائیگی
آتے آتے خانۂ و اطفال میں کھو جائے گی
جو کسی بارے میں کوئی رائے دے سکتی نہیں
دوست آجائیں تو ان کو چائے دے سکتی نہیں

حقیقت میں قدرت نے مجھے نعم البدل دیا اور یہ تمام خطرات بے اصل ثابت ہوئے۔ شادی ہوئی اور ابھی کچھ دنوں پہلے میرے بچوں نے شادی کی ۵۳ ویں سالگرہ خوشی اور خرمی سے منائی۔

وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ
(وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے)

(باقی)

استدراک:

(۱) اگست ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں (صفحہ ۱۴ کالم ۱) "یادوں کی رہ گزر" کے زیرِ عنوان سلطان المدارس کے طلباء کی اسٹرائک (اگست ۱۹۳۹ء) کے سلسلے میں اپنے بھائی سید علی سجاد سلّمہ کے مدرسے سے اخراج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں میں نے لکھا تھا کہ چودھری سید سبط محمد نقوی صاحب اور کیفی اعظمی بھی اسٹرائک میں تھے۔ چودھری صاحب نے یاد دلایا ہے کہ وہ مدرسے میں اس وقت داخل ہوئے جب اسٹرائک کے بعد مدرسہ کھلا۔ اگرچہ اخراج کے بعد بھی میرے بھائی نے احتجاجاً دارالاقامہ کا قیام ترک نہیں کیا تھا اور چودھری صاحب سے ان کے تعلقات اسی وقت سے اب تک بفضلہ استوار ہیں، لیکن وہ اسٹرائک میں شامل نہیں تھے۔ ناظرین اس تسامح سے درگزر کریں۔

(۲) داستانِ امین آباد کا تعلق ماضی سے تھا۔ اس شمارے میں وہاں اُردو کتب فروشوں کا بھی ذکر آ گیا اور اس ضمن میں ادارۂ فروغ اُردو کا بھی تذکرہ ہے۔ صیغۂ ماضی کے استعمال سے میرے ایک دوست کو شبہ ہوا۔ ادارہ بحمدہٖ اب بھی موجود ہے اور اس کے مالک مولوی شمس کاکوروی اب بھی اس کی سرپرستی کر رہے ہیں اب بھی مذہبی کتابوں کا دل کش مرکز ہے۔ (ش۔ز)

□□

حواشی:

۱ علامہ شبلی نعمانی کی اورنگ زیب سے متعلق نظم کا مصرعہ۔

۲ وہ رجسٹر جو پٹواری ہر گاؤں سے متعلق مرتب کرتا تھا اور اس میں کاشت کاروں کے نام اور آراضی، کھیت، لگان وغیرہ کی تفصیل درج ہوتی تھی۔

۳ والد مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی۔

نارسیسی
چشمۂ شفاف کے آئینے میں
دیکھ کر خود اپنا عکس
اس پہ شیدا ہو گیا، اور مر گیا
اور میں حیران ہوں یہ اہلِ جہاں
مبتلائے دامِ مکرِ آئینہ
رات دن اپنے فسوں میں قید ہیں
اس قدر شیدا ہیں اپنے نام پر
پھر بھی مر جاتے نہیں !!

□□

غزل

دل میں غالب کی طرح سوزِ فراواں دیکھا
درد کے حد سے گزرنے ہی میں درماں دیکھا

موت کے سامنے لاچار و پریشاں دیکھا
منعمِ شہر کو بھی بے سروساماں دیکھا

اپنے افکار میں ہندو نہ مسلماں دیکھا
ہم نے ہر رنگ میں انساں کو نمایاں دیکھا

شاہدِ شوخ کے پندار کو لرزاں دیکھا
بعدِ مدّت اسے دلگیر و پشیماں دیکھا

دل کے آئینے میں خاصانِ وطن نے اکثر
غمِ دوراں کو بطورِ غمِ جاناں دیکھا

رات کے پچھلے پہر آنکھ بھر آئی میں نے
دلِ تیرہ میں تری یاد کو رخشاں دیکھا

سوزِ پیری میں وہی مرثیہ خواں لگتی ہے
جس تمنّا کو جوانی میں غزلخواں دیکھا

دلِ بے تاب نے دُنیا کو دنی مان لیا
جب نہ انساں کو تری شان کے شایاں دیکھا

اس کے جوہر کی ذرا قدر نہ کی دُنیا نے
کرشن موہن کو رہینِ غم و حرماں دیکھا

کرشن موہن
۱۵۸ - پشپانجلی - دھلی
۱۱۰۰۹۲

روحِ تنہائی

یہ چاندنی، یہ ستاروں کے اَن گِنت چہرے
دُھلی دُھلی سی فضا میں بکھیرتے مُسکان
رُکی رُکی سی ہے ہستی کی نبضِ آوارہ
حریمِ خواب میں کھوئے ہوئے ہیں اہلِ زمیں
محیطِ بزمِ سکوں ہے اٹوٹ سناٹا

یہ کیا مقام ہے دورانِ شب کے دامن میں
یہ اہتمام ہے فطرت کا کس لیے آخر؟

تمام روز حوادث نے دل کو تڑپایا
بساطِ غم میں کئی دھڑکنوں کو اُکسایا

مگر فضا کے تعاون کی بے رُخی معلوم
تمام روز تھے پل پل ہزار ہنگامے
تمام روز رہی آنکھ دیکھ کر خاموش
دبے دبے سے رہے شور و غل میں محسوسات
گُھٹی گُھٹی سی رہی دھڑکنوں کی موسیقی

خوشا! یہ وقت جو بے وقعتوں کے دامن سے
بہار و کیف کا عنوان بن کے اُبھرا ہے
بہار و کیف کے اس پُر اثر ہنڈولے میں
یہ کائنات تھمی ہے تو میں اکیلے میں
سکوں کے فیض سے سنتا ہوں اپنے کانوں سے

دھڑکتی دھڑکنوں کے تموج میں دُکھ بھرے نغمے
جنھیں سمو کے میں کاغذ کے موک تاروں میں
سرودِ سازِ جوانی کا نام دیتا ہوں
شعورِ غم کو تشفّی کے جام دیتا ہوں!

رام پرکاش راہی
۱۹۸، اے جی سی آر انکلیو - نئی دہلی
۱۱۰۰۹۲

پروفیسر گیان چند
۲۵/۹، اندرانگر، لکھنؤ

رام لعل میری نظر میں

کسی کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو ہم اس کے اقارب سے اظہار افسوس کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ نزدیکی رشتے داروں اور جگری دوستوں کے علاوہ کسی اور کی موت پر کوئی گہرا صدمہ نہیں ہوتا۔ لیکن رام لعل کے انتقال پر مجھے واقعی دلی افسوس ہوا، وہ اور میں لکھنؤ کی نئی بستی اندرانگر میں رہتے تھے۔ مکانی اعتبار سے اہلِ اردو میں میں ان کا سب سے قریبی ہم سایہ تھا۔ وہ بزم آرا شخص تھے، اس لیے انھیں ذاتی ملاقاتوں، ٹیلیفون، خطوں، اخباروں اور رسالوں کے ذریعے اردو دنیا کی جتنی آگہی رہتی تھی، مجھے نہیں۔ میں ان سے اکثر ملتا رہتا تھا، اور ان سے دنیا جہان کی خبریں حاصل کر لیتا تھا۔ جو اہلِ اردو میرے مستقر سے واقف نہیں وہ رام لعل کی معرفت ہی مجھ سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ میرا فون خراب ہو جاتا تو شہر کے اہل معاملہ انھیں کے ذریعہ مجھ تک پیغام پہونچاتے تھے۔ ان کے سدھارنے کے بعد کوئی اردو ادیب ایسا نہیں جو میرے لیے پیدل فاصلے کی حدود میں رہتا ہو۔

اب میں ادبی صحبت کے لیے کس کے پاس جاؤں؛ کس سے اردو ادب کے بارے میں تبادلہ خیال کروں؟ میری پوری تشفی رام لعل سے بھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ تخلیق کار تھے، محقق و نقاد نہیں۔ جدید افسانے اور کسی حد تک جدید ادب کے علاوہ اس سے پہلے کے اردو ادب کے بارے میں وہ معصوم تھے۔ ان کے خاکوں اور تنقیدی مضامین کے مجموعے "دریچوں میں رکھے چراغ" (اختصار میں 'دریچوں') میں آخری مضمون "عطا حسین عطا" ۸۶-۱۹۸۵ء کی تحریر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رام لعل تاریخِ ادب سے کتنے بے خبر تھے۔ میں نے اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تسامحات کی نشان دہی کی۔ وہ ولی اقبال اور ریاض کو اودھ تاریخ کے دور میں رکھتے ہیں (دریچوں ص ۲۲۹) نظیر اکبرآبادی کو بھی اسی دور سے متعلق کرتے ہیں (ایضاً ص ۲۳۰)۔ یہ ان کی عالی ظرفی ہے کہ انھوں نے میرے تبصرے کو تمام و کمال "رام لعل شخصیت اور بساطِ فکر و فن"[۱] (اختصار میں 'بساط') میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ میرے کہنے کی مراد یہ ہے کہ میں قدیم ادب کا آدمی ہوں اور یہ رام لعل کا میدان اختصاص نہ تھا۔ پھر بھی ان کا قرب غنیمت تھا۔ میں ان سے ادب کے ہلکے پھلکے مطالب کے بارے میں کچھ کہہ سن سکتا تھا۔

رام لعل مجھ سے چھ ماہ بڑے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۳ مارچ ۱۹۲۳ء مانی جاتی ہے۔ سال صحیح ہے، ماہ و سال تخمینی۔ ان کے چچا انھیں اسکول میں داخل کرانے گئے تو انھوں نے اندازے سے یہ تاریخ لکھا دی حالاں کہ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی روایت کے مطابق وہ پھاگن (فروری) میں پیدا ہوئے تھے[۲]۔ ان کا انتقال ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ہوا۔ وہ مئی ۱۹۹۲ء سے بیمار تھے، جب انھیں گردے کے سرطان کا پتہ چلا۔ ہومیوپیتھی کے ذریعے اس میں حیرت ناک شفا ہوئی۔ انھیں دوسرا عارضہ دل کا تھا۔ بشیشر پردیپ لکھتے ہیں؛

" رام لعل نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ
وہ ایسی موت چاہتے ہیں جس میں دل ایک دم دھڑکنا
بند ہو جائے تا کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔"[۳]

انھیں اپنی مراد مل گئی۔ ۱۶ اکتوبر کی صبح انھوں نے اٹھ کر اپنے کمرے اور وہاں سے پھاٹک تک کے راستے کو جھاڑو سے صاف کیا۔ اس کے بعد بستر پر لیٹ گئے اور دم کے دم میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ وہ تو سبک روی سے چلے گئے، اہل خانہ اشک باری کریں تو کریں۔ ان کی علالت کے دوران ان کے قدیمی دوست اچھن میاں نے

جو خدمت کی' وہ داد سے بالاتر ہے۔ ایک فون پر وہ اپنی کار لے کر حاضر ہو جاتے تھے یہ ساری خدمت بے لوث تھی۔ اچھن میاں اُردو کے ادیب نہیں کہ رام لعل سے کچھ فائدہ اٹھا سکتے۔ ان کے علاوہ بشیشر پردیپ، ظہیر النبی ایڈوکیٹ اور اطہر نبی بھی رام لعل کے معتبر ترین دوست اور مستقل مددگار تھے۔ ان کی کوئی مدد نہ کرنے والے احباب میں سرِفہرست میرا نام تھا!

اس تحریر میں میری کوشش ہوگی کہ میں رام لعل کی وہ مکمل تصویر پیش کردوں جو میں نے دیکھی ہے۔ زندہ شخص ہو کہ مُردہ، میں اس کی یک رخی تصویر کا قائل نہیں۔ مجھے وہ شخص زیادہ زندگی بیز دکھائی دیتا ہے، جس میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوں۔ میں نے منٹو کے اس صالح مشورے کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے:

"میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔" ؎

رام لعل تو خود ہی کافی بناؤ سنگار کر لیتے تھے، میں اس پر کیا اضافہ کروں گا جلسوں اور تقریبات کا ذکر ہے وہ سردیوں میں محلے کے بازار میں بھی جاتے تھے تو سوٹ اور ٹائی سے پیراستہ ہوئے بغیر نہیں۔ ان کی موت سے چند روز قبل اچھن میاں دوبئی وغیرہ جانے والے تھے۔ انھوں نے سب سے پوچھ کر انھیں کے ہاتھ سے لکھوالیا کہ ان کے لیے کیا تحفہ لائیں۔ رام لعل نے لکھ کر دیا کہ ان کے لیے براؤن رنگ کی ٹائی لادیں ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز لکھنؤ میں بہتر طریقے سے مل سکتی ہے اسے پردیس سے کیوں درآمد کیا جائے۔ یہ عمر، یہ موذی بیماری، یہ بدن کی کاہیدگی، وسائل کی یہ تنگی کہ حکومت اور دوستوں سے مالی تعاون لیا جائے، اس پر بھی ٹائی کی لالسا۔ اس عمر میں ٹائی صرف بڑے آدمیوں کو زیب دیتی ہے، ہم جیسے متوسط طبقے والوں کو نہیں، جو دن میں چکی پر آٹا پسوانے جائیں، موچی کے سامنے کھڑے ہو کر پاپوش گنٹھوائیں، شام کو جھولا لے کر سبزی منڈی سے لد پھند کر آئیں۔ اس کے بعد محلّے میں ٹائی کے ساتھ چھیلا بن کر گھومیں تو کون مرعوب ہوگا۔

حُسنِ نسوانی

کیا رام لعل خود کو ہیرو سمجھتے تھے۔ ان کی تحریروں اور ان سے متعلق تحریروں میں عورتوں کی وہ ریل پیل ہے کہ یہ بجائے خود ایک مکمل مضمون کا موضوع ہے، چونکہ حکایت لذیذ ہے اس لیے میں اسے درازتر بیان کروں گا۔

ہر مرد فطرتاً حُسنِ نسوانی سے متاثر ہوتا ہے لیکن تخلیقی فن کار کے اعصاب پر عورت کچھ زیادہ ہی سوار رہتی ہے۔ رام لعل جہاں کسی خاتون کو دیکھتے ہیں، سب سے پہلے اس کے حسن کو ناپتے ہیں۔ میں ۱۹۸۸ء میں امریکہ جاتے ہوئے ایک دن کو جاپان میں ٹھہرا۔ وہاں کے اُردو کے ایک جاپانی استاد اور ایم۔اے کی ایک طالبہ مجھے گھمانے کے لیے آئے۔ ایک بُودھ مندر کے سامنے پروفیسر صاحب نے میرا، میری اہلیہ اور اس طالبہ کا فوٹو لیا۔ اتفاق سے وہ طالبہ حسین تھی۔ کئی سال بعد لکھنؤ میں رام لعل کو وہ فوٹو دکھایا۔ وہ چھوٹتے ہی بولے:

"اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہوگی۔"

مجھے یہ تبصرہ اچھا نہیں لگا۔ میں اس لڑکی سے معاشقہ کرنے تو گیا نہیں تھا۔ وہ ایم۔اے کی نوجوان طالبہ تھی۔ میں سن رسیدہ پروفیسر۔ ۱۹۹۱ء میں تین دن ٹوکیو میں رہا۔ تب وہ لڑکی ریسرچ کر رہی تھی۔ اسے اور ایک اور ریسرچ اسکالر لڑکی کو ہماری میزبانی پر مامور کر دیا گیا۔ دوسری لڑکی حسین نہ تھی لیکن میرے لیے دونوں برابر تھیں۔ میں ان کے ظاہر کو پرکھنے کے لیے تو گیا نہ تھا۔ یہ فریضہ رام لعل کو مبارک ہو۔

خود ان کے مطابق ان کے ایک دوست نے کہا "عورت تمہاری کمزوری ہے"۔ یہ بات ۱۹۵۳ء کی ہے، جب رام لعل جوان تھے لیکن وہ بچپن سے اس کمزوری کے شکار رہے۔

شہنشاہ مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے پندرھویں سال کے بارے میں کہا، "ہر خوبصورت لڑکی سے محبت کرنا چاہتا تھا۔ یہ کمزوری میرے اندر ابھی تک موجود ہے.... ؎

ہائی اسکول کرکے لاہور گئے تو بقول خود "وہاں بھی میری حیثیت ایک ہیرو کی سی تھی"۔

ان کی یہ حرکتیں ادھیڑ عمر میں بھی جاری رہیں۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۸۱ء کے ایک خط میں عصمت چغتائی کو یاد دلاتے ہیں:

"آپ نے کہا تھا کہ میرے سامنے کوئی عشق کرتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے..... مجھے یاد ہے میں نے دو تین سال پہلے شراب کے نشے میں آپ کی موجودگی میں ایک لڑکی کا بوسہ لے لیا تھا جس پر آپ نے ہنستے ہوئے کہا تھا اے تم لوگ اپنی بیویوں سے نہیں ڈرتے ہو"۔

(دریچوں ص ۱۳۲)

مجھے یاد ہے کہ رام لعل نے کہیں لکھا ہے کہ وہ کسی کانفرنس میں کام سے پنڈال کے باہر نکلے تو ایک والنٹیر لڑکی کو دیکھ کر اس کا بوسہ لے لیا۔ میں رام لعل کے تہوّر پر حیران ہوں لیکن اسے سراہ نہیں سکتا۔ یہ بات کہاں پڑھی تھی، یاد نہیں۔

'باقی سوالات' کی تمہید میں صبیحہ انور ان سے پوچھتی ہیں کہ:

"حسین عورتیں اور لڑکیاں بڑی جلدی آپ کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں یہ دلچسپی کہاں تک پہونچتی ہے؟"

اس پر رام لعل نے ایک عجیب تاویل پیش کی کہ عام طور پر چھوٹے قد کے خاص طور پر ایسے لوگوں کے جن کے گرد گلیمر (Glamour) کا ہالہ بنا ہوتا ہے، عورتیں زیادہ جمع ہو جاتی ہیں ..... چھوٹے قد والوں کو عورتیں عام طور پر بے ضرر یعنی Non aggressive نیچر کا سمجھتی ہیں اس لیے انھیں ایسے مردوں کے قریب جانے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔ یوں بھی دنیا میں زیادہ تر بڑے آدمی چھوٹے قد کے ہوئے ہیں جیسے نپولین، کرشن چندر وغیرہ۔ (ایضاً ص ۲۳-۲۱)

تیسرے بڑے آدمی وہ خود ہو گئے، جن میں ان کے خیال کے مطابق گلیمر بھی ہے اور وہ چھوٹے قد کے بھی ہیں، اس لیے انھیں عورتوں کو شکار کرنے کا حق ہے۔ مغرب میں جا کر رام لعل کو جنسی بھوک کا احساس زیادہ ہوا۔ ناروے کی عورتوں کے لیے کہتے ہیں:

"عورتیں آپ کے اندر زندہ رہنے کی آرزو کو تیز کر دیتی ہیں"۔

(بساط ص ۱۰۴)

خورشید ملک ان کے سفرِ ناروے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہاں کے رنگین ماحول کو دیکھ کر انھوں نے بارہا افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اپنی جوانی کے ایام میں وہاں کیوں نہ گئے۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے اور ہاتھی لاکھ گھٹے سوا لاکھ ٹکے کا۔ ان دونوں کا رام لعل کے اوپر پورا پورا اطلاق ہوتا ہے یعنی جوانی کے ایام ان کے لیے قصۂ پارینہ نہیں بنے تھے۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر اب بھی ان کے اندر جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے"۔ (بساط ص ۲۴۰)

آگے چل کر مضمون نگار اطلاع دیتے ہیں کہ پولینڈ کی ایک جرنلسٹ نے انھیں اپنی قیام گاہ پر ڈنر کے لیے بلایا۔ اس نے بتایا کہ وہ طلاق شدہ ہے لیکن اب اسے دوستوں سے کبھی کبھی سیکس مل جاتا ہے۔ ڈنر کرنے کے بعد ڈانس کرنے لگی اور ڈانس کرتے کرتے لڑکھڑا کر رام لعل کی گود میں گر پڑی۔ (اس کے آگے کی تفصیل رام لعل نے قصداً سنسر کر دی ہے)۔ (ایضاً ص ۲۴۱)

رام لعل لکھتے ہیں کہ وہ ناروے کے ڈانس کلبوں میں گئے۔ ان کے ساتھ شرابیں پیں، طوائفوں سے ملا۔ (سوالات ص ۲۲۴)

ماسکو کے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ تالستائی کی مورتی کے پاس ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کھڑی انھیں دیکھ رہی تھی۔ اچانک ان کی طرف بڑھ آئی۔ رام لعل نے اس کے حسن کا بیان ادب لطیف کے شاہکار کے طور پر کیا ہے:

"اس کے بڑی خوبصورتی سے ترشے ہوئے سنہری بال اس کے چہرے پر چھلکے پڑتے تھے جنھیں وہ بڑی ادا سے سر جھٹک کر پیچھے ہٹا دیتی تھی ..... اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ کی طرف اشارہ کیا تو اس کا مدعا سمجھ گیا۔ اسے میں نے ایک سگریٹ پیش کر دی اور لائٹر سے سلگا بھی دیا۔ وہ ناک اور منھ سے دھواں چھوڑ کر پھر

مسکرائی ... میرا جی چاہتا تھا وہ میرے پاس اسی طرح کھڑی رہے اور مسکراتی رہے اور میں اس کی طرف دیکھتا رہوں۔ میں نے ماسکو میں جتنی خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں دیکھی تھیں ان میں بلاشبہ وہ سب سے دل کش تھی۔"

کرشن چندر کی یاد آتی ہے۔ رام لعل ستیش بترا پر اپنے خاکے میں لکھتے ہیں کہ یورپ سے ایک لڑکی ہندستان آئی اور دہلی میں قیام کیا۔ وہ یورپ میں ان کے ساتھ گھومتی تھی اس لیے رام لعل اس سے ملنے کے لیے لکھنؤ سے دہلی گئے۔ اسے ستیش بترا سے ملانے کے لیے کناٹ پلیس کے ایک ریستوراں میں بلایا۔ بترا رام لعل کے بھی گرو نکلے۔ اس لڑکی کو رام لعل سے الگ کر کے اپنے ساتھ لے اڑے۔

('دریچوں' ص ۲۵۷)

ایں خانہ تمام آفتاب است۔ لیکن رام لعل کی حسن پرستی محض مغربی حسیناؤں تک محدود نہیں۔ وہ اہلِ ہند کو بھی نوازتے ہیں، جس طرح شبلی اور اقبال عطیہ فیضی کے دیوانے تھے، اسی طرح رام لعل قرۃ العین حیدر پر دل باختہ معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی ڈائری میں ۱۵ر مارچ ۱۹۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"عینی اب پینتالیس کے قریب ہے لیکن ابھی تک چارمنگ۔ ان عورتوں میں سے ہے جو عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اور دل کش ہوتی جاتی ہیں۔ باتوں میں بے پناہ فرہنگ اور چیرفل: ابھی تک اَن میریڈ۔ اس کے اندر انیس بیس سال کی ایک شوخ لڑکی (آئی ٹی کالج والی) بھی ابھی تک زندہ ہے ..... دل چسپ، تعلیم یافتہ، ڈیلائٹ فل اور بے حد چارمنگ خاتون کے بارے میں کیا لکھوں؟"

(شب و روز ص ۱۵۱)

لیکن اس عنقا کا آشیانہ رام لعل کے لیے زیادہ بلند تھا۔ ان کی نظر خاصات تک محدود نہیں، وہ ان سے نیچے اتر کر بھی گھور سکتے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۷۸ء کو لکھتے ہیں:

"وہ پہلی ہی نظر میں مجھے دل کشی کا ایک مینار نظر آئی۔ میری ایک تعلیم یافتہ دوست کی چھوٹی بہن ہے ... اس کی نگاہوں سے محسوس ہوا کہ وہ میری دوستی کی بھی خواہش مند ہے .... اپنے سے چھوٹی عمر کی لڑکی کو دوستی کی خواہش مند دیکھ کر عجیب سا لگا۔ حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی محسوس ہوا۔ اخلاقی جرم کا احساس زیادہ حاوی ہے۔"

(شب و روز ص ۲۱-۳۲۰)

۱۹۸۲ء میں قتیل شفائی پر مضمون میں لکھتے ہیں:

"لڑکیاں واقعی خوبصورت ہوں تو انھیں شریفانہ انداز سے چھیڑنا بھی چاہیے کیونکہ اس سے لڑکیاں واقعی خوش ہوتی ہیں"۔

('دریچوں' ص ۲۹۹)

معلوم ہوتا ہے رام لعل فلوں پائی۔ وی کے پڑھنے سے بہک گئے ہیں۔ شریفانہ انداز سے چھیڑنا کیا ہوتا ہے۔ اگر لڑکیوں کو واقعی چھیڑا جائے تو وہ شرافت دکھائیں اور آپ کو انکل یا دادا کہہ دیں تو آپ اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ اگر طرار ہوئیں تو کفش کاری پر بھی اتر سکتی ہیں۔

رام لعل کو کوئی عورت یا لڑکی دکھائی دے، اس کے خارج کا ضرور بیان کرتے ہیں۔ ہر خاتون کی طرف توجہ کرنے کا کوئی گوشہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ۱۵ر فروری ۱۹۶۲ء کو ان کا معیار اس سطح پر اتر آیا تھا:

"اس لڑکی میں کوئی کشش نہیں تھی، پھر بھی وہ مجھے متاثر کر رہی تھی۔ میری توجہ کھینچتی تھی۔ اس کی ناک، آنکھیں، دانت، ہونٹ، چہرے کی ساخت سب معمولی۔ بہت دیر تک سوچتے سوچتے اچانک احساس ہوا، اس کی مسکراہٹ میں ہی ایک خاص کشش ہے اور اس کے روکھے سوکھے بے ترتیبی سے سمیٹے ہوئے بالوں میں بھی ایک خاص حسن ہے۔"

(شب و روز ص ۵۲)

'باقی سوالات' کی مرتب صبیحہ انور نے رام لعل سے ایسا سوال کیا، جس میں جواز یہ جواب شامل تھا:

"آپ کے افسانے، سفرنامے اور یادداشتیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ آپ حسین عورتوں سے زیادہ ذہین عورتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔"

(سوالات ص ۴۳)

میں مانتا ہوں کہ رام لعل عورت میں حُسن اور ذہانت کے امتزاج کو ترجیح دیتے تھے لیکن متعدد موقعوں پر وہ ان خواتین پر ڈھیتے دکھائی دیتے ہیں جن کی ذہانت کے بارے میں انھیں کوئی شہادت نہ ملی تھی۔

۹ر اپریل ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اپنا عجیب نفسیاتی تجزیہ کیا ہے :

"عشق کی کوئی نامعلوم سی کشش مجھے ہمیشہ اپنی اُور
کھینچتی رہی۔ جو لڑکیاں مہربان نظر آئیں ان سے دُور دُور
بھاگا۔ جو میری اپروچ سے باہر تھیں ان کی طرف ہمیشہ
راغب رہا۔" (شب و روز ص ۲۹۵)

معلوم ہوتا ہے ساڑھے تین سو سال پہلے 'سب رس' کے مصنف مُلّا وجہی نے آنے والے رام لعل کو ذہن میں رکھ کر یہ مشاہدہ پیش کیا ہوگا :

"بعضے مرداں جو کوئی عورت منگتی اُسے خوار کرتے
جو کوئی نیں منگتی اسے پیار کرتے...... جو منگتی نیں وہ
بہت بھاتی۔ اس کی گالی کھانے ہوس آتی۔ اس کے پاؤں
پڑتے جاتے۔"

'باقی سوالات' میں شہنشاہ مرزا کا انٹرویو سب سے زیادہ جرأت مندانہ ہے۔ وہ سوال داغتے ہیں :

"آپ کے بعض افسانوں مثلاً 'اندھیرے میں کھوئی صلیب'
اور 'تم' وغیرہ کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ
ازدواجی رشتوں کے سلسلے میں بہت زیادہ غیر مطمئن ہیں،
کیا اس کا تعلق براہ راست آپ کی ازدواجی زندگی سے ہے؟"

رام لعل جواب دیتے ہیں :

"آپ نے میرے افسانوں کو پڑھ کر یہ تاثر کیسے قائم
کرلیا کہ میری ازدواجی زندگی غیر مطمئن ہے؟ میں اپنی ازدواجی
زندگی سے اس حد تک یقیناً مطمئن ہوں کہ یہ کبھی کرائسس سے
دوچار نہیں ہوئی ہے۔" (ص ۱۴۱)

لیکن آگے چل کر کسی ناآسودگی کا ذکر کرتے ہیں،

"میری ذاتی زندگی کے کئی ناآسودہ لمحے جن کی کوئی ایک
شکل ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ بے شمار ہیں میری 'ڈے
ڈریمنگ' اور میرے ایسے افسانوں کے لیے اساس
بنتے رہتے ہیں۔" (ص ۱۴۳)

لیکن ایک جگہ اپنی ڈائری میں کھل جاتے ہیں۔ ۲ر جنوری ۱۹۷۰ء کو لکھتے ہیں :-

She was a stone, a woman
who can make any subject
dull.

یہ فقرہ پڑھ کر مجھے اپنی بیوی یاد آگئی۔ لیکن وہ ہر وقت ایسی نہیں ہوتی۔ خاص خاص لمحوں میں ایسا رویّہ اختیار کرلیتی ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ کسی خوش گوار یا سنجیدہ موضوع پر بات کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" (ص ۲۳)

رام لعل اپنے کھلنڈرے پن کے تعلق سے بات واضح کر دیتے ہیں :

"کسی بھی کامیاب ادیب یا شاعر کے گرد گلیمر یا شہرت
کا ایک ہالہ سا بن جاتا ہے جس کی وجہ سے بعض عورتیں
(زیادہ تر ناآسودہ) اس کے قریب ہونا چاہتی ہیں۔ وہ ادب سے
کچھ نہ کچھ دل چسپی تو یقیناً رکھتی ہیں۔
میں نے اب تک احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔
ایک فاصلہ ہمیشہ قائم رکھا ہے اس لیے کہ میری بیوی مجھ سے
ان کی نسبت زیادہ محبت کرتی ہے۔ میں اس کے اعتماد کو
ٹھیس پہونچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

(۲۱ر جنوری ۱۹۸۲ء ص ۳۷۱)

کھلنڈراپن محض رام لعل کی لغزش نہیں، یہ گناہ ہر شہر میں ہوتا ہے ۱۴ر اپریل ۱۹۸۳ء میں لکھنؤ کی ایک صحبت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"رات کو ایک بڑے پولیس افسر کے گھر پر احمد فراز
اور میں مدعو تھے۔ شراب، شاعر اور خوبصورت عورتوں
کو یکجا نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ کوئی بدمزگی ہرگز نہیں
ہوئی، پھر سوچتا ہوں خوبصورت عورت توجہ کا مرکز کیوں نہ
بنے؟" (شب و روز ص ۲۹۶)

میں مندرجہ بالا قول میں شاعر کے ساتھ افسانہ نگار پر بھی اختتام کروں گا۔ رام لعل بچا کر لکھ گئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوئی ہوگی۔ جون ۱۹۸۳ء میں بزم ادب نیویارک کے صدر ڈاکٹر سیٹھی

کے یہاں مقیم تھا جہاں مجھے نوازنے کے لیے ایک ادبی محفل آراستہ کی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ سابق میں احمد فراز اسی بزم میں سیٹھی کے گھر مدعو تھے۔ انھوں نے شراب کے نشے میں سیٹھی کے ایک ہندو دوست کی اہلیہ کو اس طرح چھیڑا کہ بزم اکھڑ گئی، چادریں پھٹ گئیں اور نیم شب میں احمد فراز کو دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ سیٹھی بہت روئے احمد فراز اچھے شاعر ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے جلوے میں الّو ہو جاتے ہیں۔

حسن پرستی کے ساتھ ساتھ رام لعل کی داستانِ حیات فروغِ مے سے بھی جی بھر کر فروزاں ہوتی ہے۔ ان کی ڈائری شب و روز نیز سجّاد ظہیر اور کرشن چندر کے خاکوں میں دیکھیے، جا بجا بلانوشی کے جلوے ہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کرشن چندر، ساحر، رام لعل وغیرہ ترقی پسندوں کی ٹولی ہر دم شراب کی تلاش میں بولائے ہوئے پھرتی تھی۔

شہرت طلبی

رام لعل کے کسی دوست نے عورت کو ان کی کمزوری قرار دیا ہے۔ میری نظر میں ان کی ایک اور کمزوری تھی خود اشتہاری، خود نمائی اور شہرت طلبی۔ دو تین سال پہلے کی بات ہے کہ میں اور اوپیندر ناتھ اشک رام لعل کے گھر گئے۔ رام لعل نے فخریہ کہا کہ ٹی وی پر ان کی ڈاکومنٹری دو قسطوں میں دو دن دکھانے کے لیے بنائی گئی جب کہ دوسروں کی صرف ایک قسط میں تمام ہو جاتی ہے۔ اس پر اشک ننگی تلوار بن کر رام لعل پر برس پڑے۔ راست حملہ کرتے ہوئے بولے :

"تم پبلسٹی کے بھوکے ہو، ٹی وی والوں کے پیچھے لگے رہتے ہو۔ میں ان کی پروا نہیں کرتا۔ انھوں نے کئی سال پہلے میرے گھر آکر میری ڈاکومنٹری بنائی۔"

میں گھبرایا کہ بات چیت میں تلخی نہ آجائے لیکن اشک جتنے منہ پھٹ تھے، رام لعل اتنے ہی حلیم۔ انھوں نے کوئی مناظرہ نہ کیا۔ اعتراض کو خندہ پیشانی سے پی گئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی نظم "شہر آشوب" میں لکھا ہے ؎

طوافِ ریڈیو اسٹیشن ان کی خفیہ نماز
یہ سگ پرست ہیں سجدہ کھلا ادا نہ کریں

ملے جو ٹی وی پہ موقع تو سو سماد کی طرح
چپک ہی جائیں، نکلنے کا ڈھب ذرا نہ کریں

لیکن رام لعل ٹی۔ وی میں بڑی شان اور تمکنت سے جاتے تھے وہ ڈائرکٹر سے برابر کی سطح پر تعلقات رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے لکھنؤ کے اہلِ اردو میں وہی سب سے زیادہ ٹی۔ وی کے پردے پر نظر آتے تھے۔ وہ مجلسی شخص تھے، لکھنؤ کے جملہ ادیبوں سے ہندی اور پنجابی سمیت یاد اللہ رکھتے تھے۔ اعلیٰ سرکاری افسروں سے شناسائی کی صورت نکال لیتے تھے۔ گورنر اور وزیر اعلا سے ملنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع تلاش کرتے تھے۔ کسی کتاب کی رسم اجرا ہو، اردو کا کسی قسم کا مطالبہ ہو، وہ پیش پیش رہ کر راج بھون میں پہنچ جاتے اُردو اکیڈمی کی نئی عمارت میں پنجابی اکیڈمی کو چند کمرے دینے کی خبر اڑی تو وہ مدعی سست گواہ چست کے مصداق اکیڈمی کے چیئرمین سے پہلے ہی گورنر سے ملنے چلے گئے۔

ان کے مقابلے میں میں اس خصوص میں کتنا کوتاہ قدم ہوں۔ ستیہ نرائن ریڈی جب یو۔پی کے نئے گورنر بن کر آئے تو کسی کتاب کی رسم اجرا میں مجھے راج بھون میں جا کر بولنا پڑا۔ بعد میں میں نے گورنر صاحب کو بتایا کہ میں دس سال حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکا ہوں اس پر ریڈی صاحب نے کہا کہ "کبھی آکر مجھ سے ملیے۔" میں نہ گیا کیوں اس طوالت میں پڑتا۔ بعد میں بھی کتنی ہی تقریبات میں راج بھون جانے سے پہلو تہی کی۔

خود کو سامنے لانے کے لیے رام لعل نے ایک عجیب اشغلہ چھوڑا کہ لکھنؤ کی نئی کالونیوں میں ایک نئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اخباروں میں دے دیا کہ اس سلسلے میں ان کے گھر ایک میٹنگ ہوئی جس کے حاضرین میں میرا نام بھی شامل کر دیا تھا، حالاں کہ مجھے اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر میرا نام کہیں نہ دیا کریں۔ میری رائے میں جنرل یونیورسٹی کا مطالبہ غیر دانشمندانہ تھا۔ ریاستی یونیورسٹیوں کا لکھنؤ یونیورسٹی سمیت، حال زار اور بد نظمی دیکھیے ان میں کسی اور کارگہِ جہالت کے اضافے سے کوئی فائدہ نہیں البتہ کر سنٹرل یونیورسٹی جیسی بلند معیار کی درس گاہ البتہ مفید ہے۔ رام لعل نے

اپنی مانگ پر کچھ دنوں تک کافی غوغا کیا، بعد میں چپکے ہو گئے۔

وہ کئی انجمنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی بزموں کی تاسیس کی۔ کئی انجمنوں میں عہدے دار کوئی بھی ہوں، رُوحِ رواں رام لعل ہی تھے۔ اپنی بیماری اور ناتوانی کے ایّام میں بھی وہ انجمنوں میں شرکت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ گنواتے تھے۔ ایک بار رات کو کسی بزم سے آ رہے تھے۔ کسی سواری یا رفیق کی اعانت نہ ملی۔ مہانگر میں ایک ٹمپو چھوڑ کر دوسرا ٹمپو بدلا۔ اندھیرے میں پاؤں کسی نالی یا گڑھے میں گر پڑا۔ کئی دن تک تکلیف رہی۔ ایک دفعہ دیویٰ شریف کے میلے میں رات بھر قوالی سُنا کیے۔ بعد میں کئی دن طبیعت مضمحل رہی۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اب آپ کی صحت ایسی نہیں ہے کہ جلسے جلوسوں میں بھاگتے پھریں۔ میرا ایک شعر ہے ؎

کس واسطے زمین کا گز بن گئے ہیں آپ
اپنی کمر پہ کچھ تو ترس کھائیے جناب

انھیں ادبی یا سماجی تقریبات میں شرکت سے اسی وقت طمانیت ملتی تھی جب انھیں ڈائس پر بٹھایا جائے اور ان کی تقریر کرائی جائے۔ ایک سال پہلے اطہر نبی صاحب نے کلارک اودھ ہوٹل میں ایک سیمینار کرایا تھا جس میں تین ریاستوں کے گورنر، شبانہ اعظمی، جاوید اختر وغیرہ موجود تھے۔ رام لعل کو نہ اسٹیج پر بٹھایا گیا نہ بولنے کو کہا گیا۔ تین تین گورنروں کے ہوتے رام لعل کی تقریر کے لیے کہاں سے وقت نکالا جاتا۔ بڑے برداشتہ خاطر لوٹے۔ مجھ سے اپنے ملال کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نریش ان کے شوقِ گفتار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> کبھی کبھی رام لعل بہت بور کرتے ہیں، انھیں
> Audience Mania ہو جاتا ہے۔ تب وہ گھنٹوں
> لگاتار بولتے رہتے ہیں، کوئی بھی موضوع ہو — ادب،
> سیاست، بین الاقوامی مسائل، تاریخ، جغرافیہ
> کچھ بھی۔ ؎

وہ بیرونی ممالک میں جاتے ہیں تو وہاں بھی اپنی توانائی کا ثبوت دیتے ہیں رابطۂ عامّہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ ۱۹۸۴ء میں دوسری بار ناروے وغیرہ گئے۔ ایک بار سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں سیر کے لیے گئے وہاں ۱۵ر اگست کو یو۔ این۔ او آفس میں جا کر ہندستانی سفیر سے نیز پاکستان کے شعبۂ اقتصادیات کے انچارج سے ملے۔ (شب و روز ص ۲۱۳)

۷ر ستمبر کو اوسلو ناروے میں ۲ بجے لیبر آرگنائزیشن کے دفتر میں اس کے سکریٹری سے ملے، ۴ بجے ہندستانی سفیر سے ملے۔ اگلے سال، ۷ر ستمبر ۱۹۸۵ء کو ناروے میں سفیرِ ہندستان سے ملے اور ہندستان کی موجودہ صورتِ حال پر گفتگو رہی۔ (ص ۲۵۰)

مثل ہے: قاضی جی قاضی جی کیوں دُبلے۔ شہر کا اندیشہ" بڑی توانائی تھی ہمارے رام لعل میں! ان کی بھاگ دوڑ یورپ کے ادیبوں تک محدود نہ تھی، وہ سفیروں اور لیبر کے ادارے والوں سے کسی ملکی نمائندے کی طرح مشترکہ مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اس سے ان کا اشتہار ہوتا تھا وہ دوسری بات ہے۔

مدیرِ لمحے لمحے کی کتاب "رام لعل: بساطِ فکر و فن" کے مطابق رام لعل پر دو یونیورسٹیوں میں پی ایچ۔ ڈی ہو چکی ہے اور دو میں ایم فِل ایم فِل کی ڈگری میں ایک نام جموں یونیورسٹی کا ہے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں جموں یونیورسٹی میں تھا، اس وقت وہاں ایم فِل کی ڈگری نہ تھی۔ ایم اے میں ایک پرچے کے متبادل مقالہ لکھنا بھی شامل تھا۔ میں نے رام لعل کے افسانوں پر ایم اے کا مقالہ لکھایا، ایم فِل کا نہیں۔ رام لعل بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ ان پر کتنے پی ایچ ڈی ہو چکے ہیں اور کتنی مزید یونیورسٹیوں میں کام ہو رہا ہے۔ رام لعل شاید خود پر پی ایچ ڈی کرنے والوں کے انبوہ کو اعزاز سمجھتے تھے حالاں کہ آج جب ہر کہ و مہ پر پی ایچ ڈی ہو رہی ہے، یہ کوئی اعزاز نہیں رہا۔ ان کے گھر پر پی ایچ ڈی کرنے والی لڑکیاں آتی تھیں اور وہ انھیں مقالہ لکھایا کرتے تھے۔

میں کسی اسکالر کو مقالہ لکھانا مناسب نہیں سمجھتا۔ مجھ پر دو پی ایچ ڈی ہوئی ہیں، عثمانیہ اور بنارس میں۔ مجھے جیسے ہی ان کے رجسٹریشن کا علم ہوا میں نے دونوں یونیورسٹیوں کے صدور شعبہ کو لکھا کہ مجھ پر ریسرچ نہ کرائی جائے کیونکہ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ میرا التماس منظور نہ ہوا۔ میں نے دونوں اسکالروں کو سوانح اور اپنی تصانیف کی تفصیل بتانے کے علاوہ کوئی مدد نہ کی۔ آج تک ان کا خاکہ

نہیں دیکھا۔ انھیں ڈگری ملے ہوئے کئی سال ہوگئے ہیں لیکن میں نے آج تک ان کے مقالے نہیں دیکھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے کسی استاد نے مجھ پر کام کرانے کی خواہش کی۔ میں نے انھیں روک دیا اور یہ کہہ دیا کہ اگر کوئی کام کرے گا تو مجھ سے کسی امداد کی توقع نہ رکھے۔

رام لعل کے پاس ایک نہیں کئی ریسرچ اسکالر لڑکیاں اپنی مقالہ نویسی میں مدد لینے آتی تھیں، صرف وہی نہیں جن کا موضوع رام لعل ہوں بلکہ دوسرے موضوعات والیاں بھی۔ رام لعل ان پر کیوں اتنا وقت صرف کرتے تھے؟ ان کی بیماری کے دنوں میں ایک مقامی اخبار میں نکلا تھا کہ وہ سرمائے کی تنگی کی وجہ سے اپنی کتابیں بیچ کر اور ٹیوشن کر کے گزارا کر رہے ہیں۔ کتابیں بیچنے کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی کچھ کتابیں اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے خریدی تھیں۔ ٹیوشن کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے کیا تحقیقی مقالہ لکھانا ہی ان کا ٹیوشن تھا؟ میری دانست میں رام لعل نئے افسانے کے علاوہ اُردو ادب پر کوئی نظر نہیں رکھتے تھے۔ میں حیران ہوں کہ وہ پی ایچ ڈی کے مقالوں میں کیا مدد کرتے ہوں گے۔

فعّالیت

میں نے رام لعل کی توانائی کا ذکر کیا۔ اس کے مثبت نتائج بے شمار تھے۔ وہ انجمن ساز تھے، مُردہ انجمنوں میں جان ڈال دیتے تھے۔ طرح طرح کے سیمینار کرانے کے ماہر تھے۔ فخرالدین علی احمد یادگار کمیٹی ان کے دورِ صدارت میں جتنی فعّال رہی۔ شاید کسی اور دور میں اتنی رہی ہو۔ انھوں نے اس کے تحت کئی شاندار سیمینار کرائے۔ ڈاکٹر نریش لکھتے ہیں:

> رام لعل کی ایک کمزوری یہ ہے کہ انھیں Brain waves بہت آتی ہیں۔ بیٹھے ہیں، بات کر رہے ہیں دفعتاً خیال آتا ہے کہ ایک سیمینار ہو جائے۔ اس سیمینار کا موضوع کیا ہونا چاہیے، اس میں شرکت کے لیے کس کس کو دعوت دی جائے، کتنا خرچ ہوگا۔ فوراً کاغذ قلم لے کر اس کا تخمینہ لگانے لگتے ہیں۔ پھر رائٹنگ پیڈ اُٹھایا اور لوگوں کو خط لکھنے شروع کر دیئے ...... وقت نکلا، اُبال ٹھنڈا پڑا، اور رام لعل نارمل ہو گئے۔"[۹]

فخرالدین کمیٹی کی صدارت سے پہلے رام لعل نے چار سیمینار کرائے ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ چھوٹی دہائی میں انھوں نے لکھنؤ میں جدیدیت پر ایک سیمینار کرایا، پھر جدید فکشن پر ایک اور سیمینار کرایا۔

(سوالات ص ۸۰)

لیکن ان کا سب سے بڑا شاہکار دُو آل انڈیا غیر مسلم مصنفین اُردو کانفرنسوں کا انعقاد ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "۱۹۵۶ء میں بھوپال میں پروفیسر گیان چند جین نے میرے سامنے اس قسم کی کانفرنس کا خاکہ رکھا تھا۔"

(شب و روز ص ۲۷۹)

یہ خیال نومبر ۱۹۷۳ء میں روبہ عمل آسکا۔ تنہا رام لعل نے جیسی عظیم الشان کانفرنس کرائی وہ بایدوشاید۔ بمبئی میں بعض ادیب "نان مسلم" کے تصور کے خلاف تھے۔ رام لعل نے وہاں جا کر انھیں رام کیا۔ اس کانفرنس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ اس میں فراق بھی شریک ہوئے۔ دوسری کانفرنس نومبر ۱۹۸۰ء میں ہوئی۔ میں اس میں شریک نہیں ہوا۔ نان مسلم کانفرنس سے میری مُراد یہ تھی کہ اس میں صرف غیر مسلم ادیب ڈائس پر بیٹھیں اور تقریر و مباحثہ کریں۔ سامعین میں مسلمانوں کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن پہلی کانفرنس میں بڑے بڑے مسلم ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تقریریں کیں، پھر وہ غیر مسلم کانفرنس کس طرح رہی۔ یہ اُردو کی حمایت میں دوسری کانفرنسوں کی طرح ہی تھی۔ اس لیے میں نے دوسری کانفرنس میں حیدر آباد سے آنا ضروری نہ سمجھا۔ دوسری کانفرنس کے کئی اجلاسوں کی صدارت مسلم ادیبوں نے کی۔ بہر حال ان کانفرنسوں کے انعقاد سے رام لعل کی فعّالیت، تنظیمی صلاحیت اور بے پناہ اُردو دوستی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے۔ کانفرنس کا اثر دُور رس ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندی کے اخباروں اور بعض ادیبوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔

اُردو تحریک

رام لعل کی اُردو دوستی اور سیکولرازم ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ وہ ہندستان سے زیادہ پاکستان میں مقبول

ہیں۔ ہیرالڈ کراچی اپریل ۱۹۸۰ء میں محمد عسکری صدیقی نے رام لعل کا
ایک انٹرویو درج کرنے سے پہلے ان کے تعارف میں لکھا:

"رام لعل صاحب مسلم تہذیب سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ان کی زبان سے اللہ، خدا، انشاء اللہ اور ماشاءاللہ جیسے الفاظ بے اختیار نکل جاتے ہیں۔ وہ اُردو اور اس کے اسکرپٹ کے لیے ایک مجاہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ رام لعل کے لیے اُردو ایک طرزِ حیات ہے۔"

(باقی سوالات ص ۱۱۸)

رام لعل نے اُردو کی خاطر ۱۵ر جون ۱۹۸۵ء کو یو۔پی اُردو اکادمی کے نائب چیرمین اور رکن منتظمہ کے عہدوں سے استعفا دیا۔ انھوں نے اُردو رابطہ کمیٹی کی تشکیل کی اور اس کے لیے یو۔پی بھر کا دورہ کیا۔ یکم جنوری ۱۹۸۹ء کو لکھنؤ میں اُردو رابطہ کمیٹی تحریک میں بھوک ہڑتال پر بیٹھے، دھرنا دیا اور گرفتاری دی۔ شام کو پانچ بجے انھیں رہا کر دیا گیا۔ اُردو کے کاز کے علاوہ فسادات کے دوران رام لعل نے دوسرے رفقا کے ساتھ مسلم محلوں میں جا کر فساد کے شکار افراد سے ہمدردی جتائی اور امن کی بحالی میں مدد دی۔

لیکن رام لعل پاکستان یا نادرے میں پاکستانی نژاد ادیبوں کی صحبتوں میں اُردو کے سلسلے میں اپنے ملک کی جو مذمت کرتے ہیں۔ مجھے اس سے خوشی نہیں ہوتی۔ سوال کرنے والا ہندستان پر الزام لگا کر جو انتہا پسندانہ بات کہتا ہے، اس کی تردید کرنا تو درکنار، رام لعل اس کی تائید کرتے ہیں۔ اپنے وطن میں جو کچھ شکوہ شکایت کیا جائے وہ برحق ہے لیکن اغیار کی محفلوں میں اپنے ملک کو برا بھلا کہنا کوئی خوش مذاقی نہیں۔ مثال کے طور پر نادرے کے سید مجاہد علی کو دیے گئے انٹرویو کے کچھ حصے:

۱۔ رام لعل نے کہا: اگرچہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے ہندستان کی سولہ زبانوں میں اُردو کا نام بھی شامل کیا گیا ہے....

(سوالات ص ۱۹۰)

رام لعل کو معلوم نہیں کہ فہرست میں اُردو کا نام نہیں تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنے قلم سے اس میں تیرھویں نمبر پر اُردو کا نام شامل کر دیا۔ اس پر ڈرافٹنگ کمیٹی کے ایک ممبر نے پوچھا کہ اُردو کس کی زبان ہے؟ اس پر پنڈت جی نے کہا، میری، میری ماں کی، میری نانی کی۔ بلکہ کوئی پنڈت جی پر الزام نہیں لگا سکتا کہ تقسیم ملک کے فوراً بعد انھوں نے مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے یہ چال چلی۔

(۲) رام لعل نے بتایا کہ ہندستان میں اُردو کو تقسیم ہندستان کی زبان کے طور پر متعارف کروا کے اس کے خلاف نفرت پیدا کی جاتی ہے۔" (سوالات ص ۱۹۱)

میرے علم کی حد تک کسی ذمے دار ہندوستانی نے ایسا نہیں کہا۔ مولوی عبدالحق نے ضرور کہا تھا۔

(۳) سوال: کیا ہندستان میں اُردو کے سلسلے میں قتل کا یہ عمل شروع ہو چکا ہے؟

جواب: ایک طبقے کی نیت تو یہی ہے۔ (ایضاً ص ۱۹۳)

رام لعل نے انگلینڈ کے محمود نیازی کے انٹرویو میں ہندستان میں اُردو کے فروغ کو تفصیل سے بیان کیا۔ (ص ۱۷۰-۱۶۹)

—— نادرے میں ایسا کیوں نہیں کیا۔ میں امید کرتا تھا کہ حکومت ہند نے اُردو کے سلسلے میں جو ترقی اُردو بورڈ اور اکادمیاں بنائیں، اُردو کی اعلیٰ تعلیم میں جو غیر معمولی توسیع ہوئی، رام لعل اس کا بھی ذکر کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ صرف منفی پہلو پیش کرنا اُردو کی مجاہدی نہیں۔

اس موقع پر اہلِ اُردو کو ایک دامِ تزویر سے خبردار کر دینا چاہتا ہوں، جس کا روئے سخن رام لعل کی طرف نہیں۔ میں نے کئی بڑے سیاسی لیڈروں اور ہندی کے ادیبوں کو دیکھا ہے کہ وہ اردو کے جلسوں میں بڑے جوش سے اُردو کے حق میں تقریر کرتے ہیں، مجھے ان کے خلوص میں شبہ ہے۔ اسی طرح اُردو کے بعض چھوٹے بڑے ہندو ادیب بھی اُردو کے حق میں مجاہد بن کر سامعین یا قارئین سے خراجِ داد وصول کرتے ہیں۔ میں مسلمان اہلِ اُردو کو متنبہ کرتا ہوں کہ ان کی تقریروں اور ذات کو اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لیں کہ یہ واقعی ان کا ایمان ہے کہ وہ سستی داد حاصل کرنے کے لیے زبانی طور پر اُردو کے لیے اپنا خون دینے کو آمادہ ہیں۔ جن ہندو ادیبوں کو اُردو لکھنے پر اور مسلم طرزِ حیات میں سرشار کہا جاتا ہے ان کے گھرانوں میں جا کر

دیکھئے تو دوسرے چند دگھرانوں کی طرح وہاں بھی ہندو طرز ماند و بود اور ہندی کا ماحول ہوگا۔ اگر اُردو کا وہ ادیب دل سے اُردو کا اتنا شیفتہ ہوتا تو اس کے گھرانے میں بھی اُردو کے کچھ اثرات سرایت کر جاتے۔ اقبال کے مصرع کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ پیش کرتا ہوں گ

کذبِ عیّار ہے سَو بھیس بنالیتا ہے

ترقی پسندی اور جدیدیت

تقسیم ملک سے پہلے ریلوے ورک شاپ کی نوکری میں رام لعل کیونسٹوں سے بہت قریب رہے۔ ادب کے میدان میں آنے پر بھی ترقی پسندوں کا ساتھ رہا۔ جب ہندستان میں آئے تو ترقی پسندوں کا دور دورہ تھا۔ رام لعل کے، تمام بڑے ترقی پسند ادیبوں، بالخصوص افسانہ نگاروں سے قریبی تعلقات رہے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وابستہ ہو گئے۔ اس کے باوجود اپنی تحریروں میں وہ خالی ترقی پسند نہیں ان کی ترقی پسندی کا منتہیٰ ان کا مجموعہ "انقلاب آنے تک" (۱۹۴۹ء) ہے چند اقوال ملاحظہ ہوں:

(۱) احمد جمال پاشا: "یوں رام لعل ترقی پسند ہیں، مگر جنگجو قسم کے ہرگز نہیں۔" (فن اور شخصیت ص ۱۴۴)

(۲) وارث علوی: "رام لعل کے افسانوں پر کرشن چندر اور احمد عباس کا بالکل اثر نہیں ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا افسانہ ترقی پسند افسانہ کی مانند نظریاتی تاویل و تصدیق کی طرف پیش قدمی نہیں کرتا۔" (ایضاً ص ۱۱)

رام لعل نے خود کرشن چندر سے کہا تھا:

"میں نے اپنے آپ کو آپ سے شعوری طور پر توڑنے کی کوشش شروع کر دی۔" (دریچوں ص ۱۱۲)

(۳) رام لعل: "میں ۱۹۴۷ء کے بعد مارکسی بن چکا تھا مگر میں اپنے افسانوں کے ذریعے ان کی پروپیگنڈا مہم میں شریک نہیں ہوا۔" (سوالات۔ ص ۳۰)

(۴) رام لعل: "لٹریری سطح پر میں نے کہیں پروپیگنڈہ نہیں کیا، چاہے میں دل سے سوشلسٹ ہوں..... میں نے خود ایسے لوگوں کو Condemn کیا جنھوں نے مجھ سے کہا کہ ارے بھئی اس کہانی میں تھوڑی سی سُرخی ڈال دو تو یہ کہانی ترقی پسند ہو جائے گی۔" (سوالات ص ۶۸)

(۵) رام لعل: "میری دو ایک کہانیاں پرکاش پنڈت نے واپس کی تھیں جو شاہراہ کے ایڈیٹر تھے، وہ غالباً یہ چاہتے تھے کہ میری کہانی کو ایک سیاسی پروپیگنڈہ ہونا چاہیے" (ایضاً ص ۶۹)

(۶) رام لعل: "ترقی پسندی میرا ذاتی نظریہ ہے اور ان کیونسٹوں سے بھی خاصا مختلف ہے جو ترقی پسند ادب کو مینی فسٹو کا تابع سمجھتے ہیں۔ میرا افسانہ میرے ذاتی احساسات کا آئینہ دار ہے۔" (ایضاً ص ۱۵۴)

(۷) ہندی کے ناگیندر سے رام لعل نے بتایا کہ انھوں نے ترقی پسندوں سے حقیقت پسندی سیکھی۔ (ایضاً ص ۲۰۰-۱۹۹)

بعد میں رام لعل جدیدیت کی تحریک کی طرف بھی مائل ہوئے۔ انھوں نے جدیدیت اور جدید فکشن پر سیمینار بھی کرائے۔ ایمرجنسی کے زمانے میں یش پال کپور کے نیشنل فورم آف رائٹرس یوپی شاخ کے جنرل سکریٹری ہوئے۔ اپنی ڈائری میں ۱۹ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کو لکھتے ہیں،

"ترقی پسند نقاد سیاسی زیادہ تھا تخلیقی کم ... جدیدیت غلط رجحان نہیں ہے۔ یہ تخلیق کے افادی پہلو ہی پر زیادہ زور دیتا ہے لیکن اس میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اینٹی پروگریسو ہیں۔" (ص ۱۰۹)

۲۶ر فروری ۱۹۷۰ء کو کلکتے میں کچھ لوگوں نے ان سے نئے افسانے اور جدیدیت پر گفتگو کی، کہتے ہیں:

"میں خود کو اس جدیدیت کا نمائندہ ہرگز نہیں سمجھتا جو ادب کے نئے امیدواروں کے ذہن میں ہے۔" (ایضاً ص ۲۲۵)

وہ علامتی اور تجریدی افسانے کے خلاف ہیں، کہتے ہیں:-

۱۔ "ابھی تک کوئی بڑی علامتی کہانی نہیں لکھی گئی، جب کہ حقیقت نگاری کی تحریک کے زمانے میں جلد ہی بڑی بڑی کہانیاں سامنے آگئی تھیں۔" (سوالات ص ۳۵)

۲۔ خود رام لعل کے مطابق ان کے مجموعے چراغوں کا سفر کے دوسرے

حقے میں کچھ تجریدی افسانے ہیں لیکن وہ ان سے مطمئن نہیں۔
(ایضاً ص ۸۱)

۳۔ جدید افسانہ اپنے علامتی اور تجریدی پیکر میں پڑھنے میں تو اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس کے الفاظ کے پیچھے فلسفیانہ خیالات کی چمک محسوس ہوتی ہے..... لیکن زیادہ تر الفاظ محض گورکھ دھندا ہیں جو پڑھنے والے کو بڑے ادب کا فریب دینے کے لیے لکھے جاتے ہیں انھیں Naive اور آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔
(ایضاً ص ۱۵۵)

رام لعل کی تخلیقات پر نظر کی جائے تو انھیں ترقی پسند یا جدیدیت پسند کے بجائے حقیقت پسند کہنا موزوں ترین ہوگا۔ ان کے بہی خواہوں اور بدخواہوں میں ترقی پسند اور جدیدیے دونوں شامل ہیں۔

زبان

شہنشاہ مرزا نے بڑی جسارت کے ساتھ رام لعل سے پوچھا:
"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہمیشہ بہت خراب زبان استعمال کرتے ہیں نیز یہ کہ آپ اپنے اندر کی پنجابیت سے آج تک دامن نہیں چھڑا سکے ہیں۔"

اس پر رام لعل نے جواب دیا کہ اگر معترضین بزعم خود اہلِ زبان ہونے کے دعوے دار ہیں تو میں ان کی رائے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اہلِ زبان کے پاس افسانے کی زبان ہی نہیں ہے۔
(سوالات ص ۴۴-۱۴۳)

میں شہنشاہ مرزا کے اس اعتراض کو اہلِ لکھنؤ کی تعریض قرار دوں گا۔ رام لعل شاذ کہیں کہیں جنس کی غلطی کر جاتے ہیں لیکن ان کے افسانوں کی زبان سے ناآسودگی کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے حیرت ہے کہ رام لعل نے جب ۱۹۳۵ء کے آس پاس پریم چند کو پڑھا تو ان کی زبان انھیں خاصی بوجھل اور بناوٹی لگی تھی۔

افسانہ نگاری میں رام لعل کا مرتبہ

افسانہ نگاری میں رام لعل کا کیا مقام ہے، اس کے بارے میں دونوں قسم کی انتہائی رائیں ملتی ہیں، کچھ ان پر تنقید کرتے ہیں تو کچھ بہت سراہتے ہیں، ان پر سب سے مفصل مضمون وارث علوی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ ان کی اچھی کہانیاں پڑھتے وقت بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ یہ ایک آنچ کی کسر ان کی کہانی کو افسانہ نہیں بنا پاتی۔
(فن اور شخصیت ص ۱۲)

۲۔ نئی دھرتی پرانے گیت کی لگ بھگ تمام کہانیاں عیوب کا شکار ہیں۔
(ایضاً ص ۱۴)

۳۔ دُنیا کی کوئی طاقت رام لعل کو خراب افسانے لکھنے سے روک نہیں سکتی اور میرے قلم میں تو یہ طاقت بالکل نہیں۔ ان کے یہاں خوب بہت ہی خوب ہے اور پست بہت ہی پست۔ (ایضاً ص ۳۹)

دوسری طرف عابد سہیل کہتے ہیں کہ رام لعل کو کہانی کہنے کے فن پر بلا کی قدرت حاصل ہے۔
(ایضاً ص ۶۷)

اور شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون اکتوبر ۱۹۹۶ء میں ان کی وفیات میں لکھا: "رام لعل بڑے افسانہ نگار ہی نہیں تھے، بڑے آدمی بھی تھے۔"
(ص ۶۴)

احمد جمال پاشا نے اُن پر ایک مضمون میں لکھا:

"افسانہ نگاروں کی قوم بڑی کافر ہوتی ہے۔ وہ آپ کو نہ صرف دُنیا کا ایسا اہم ترین آفاقی افسانہ نگار سمجھتی ہے جسے بدنصیب قوم ابھی تک پہچان نہ سکی ہے اور ساتھ ہی اپنے معاصر یا ہم سفر افسانہ نگار کو سرے سے افسانہ نگار ہی نہیں مانتی۔"
(فن اور شخصیت ص ۴۶-۱۴۵)

یہ بات افسانہ نگاروں ہی سے مخصوص نہیں ہے، شاعروں میں اور شدت سے ملتی ہے۔ دو سال پہلے اوپیندر ناتھ اشک نے مجھ سے کہا تھا کہ رام لعل اُلٹا بھی لٹک جائے تو بھی اسے افسانہ لکھنا نہیں آئیگا۔ رام لعل نے مجھ سے رتن سنگھ کے بارے میں کہا کہ وہ افسانے کو تو نہیں بنا سکتا، ہاں مختصر افسانچے جو لکھ رہا ہے وہ ٹھیک ہیں۔

میری رائے میں اشک اور وارث علوی کا رام لعل کو اتنا گھٹانا بھی صحیح نہیں ہے اور فاروقی کا انھیں بڑا (عظیم) افسانہ نگار کہنا بھی وہ مبالغہ ہے جو وفیات کی جذباتیت ہے۔ صحیح ترین درجہ بندی

رام لعل کے پرانے دوست آغا سہیل نے کی ہے:

" رام لعل کرشن چندر یا بیدی کے پائے کا افسانہ نگار نہیں ہے اور نہ اسے اس بات کا ادعا ہے مگر وہ ان دونوں افسانہ نگاروں سے ایک زینہ نیچے کا افسانہ نگار ضرور ہے۔"

(فن اور شخصیت ص ۱۴۹)

معاصرانہ چشمکیں

سید احمد قادری کے لیے ہوئے انٹرویو میں رام لعل نے معاصر افسانہ نگاروں کی جن چشمکوں کا بیان کیا ہے انھیں پڑھ کر ہنسی آتی ہے قدر سے افسوس بھی ہوتا ہے۔ میں ان کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

۱. بلراج مین را نے ایک بار دہلی کے کافی ہاؤس میں کئی لوگوں کے سامنے سویرا میں چھپا ہوا کرشن چندر کا کوئی افسانہ ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور کہا کہ میرے نزدیک کرشن چندر کی یہی اہمیت ہے۔

ایک بار راجندر سنگھ بیدی، مین را وغیرہ سے ملنے کے لیے کافی ہاؤس پہونچے لیکن ریلنگ کے پاس کھڑے ہوکر انتظار کرتے رہے کہ کوئی انھیں احترام کے ساتھ اندر لے جائے لیکن ان لوگوں نے بالکل پروا نہ کی۔

۲. ایک دن نئی دہلی میں زبیر رضوی نے رام لعل کو نیا افسانہ سنانے کے لیے مدعو کیا۔ بقول مین را، انھیں اور اردو ہندی کے کچھ ادیبوں کو خاص طور پر یہ کہہ کر بلایا کہ آج رام لعل کی خبر لی جائے۔ لیکن جب رام لعل نے اپنا افسانہ ہیڈلیس بڈھا پڑھا تو سب تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ رام لعل زبیر رضوی کی شادی میں امروہے گئے تھے۔

۳. مین را انور عظیم کو ساتھ لے کر لکھنؤ آئے۔ رام لعل کے گھر سامان رکھا اور کچھ دیر بعد شہر چلے گئے۔ رات کو جب وہ دہلی واپس جانے لگے تو معلوم ہوا کہ انھوں نے عابد سہیل کے گھر پر ایک خفیہ میٹنگ رکھی تھی جس میں افسانے سنائے گئے، بحث کی گئی، لیکن رام لعل کو مدعو نہیں کیا گیا۔

۴. رتن سنگھ جب ریلوے کو چھوڑ کر ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہوگئے تو انھوں نے ایک شام افسانہ منعقد کی۔ قاضی عبدالستار اور مین را وغیرہ کے علاوہ کچھ مقامی ادیبوں کو بھی مدعو کیا تھا لیکن رام لعل کو بطور سامع بھی نہ بلایا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ باہر سے آنے والے رام لعل ہی کے گھر مقیم تھے۔

۵. ایک بات رام لعل نے نہیں کہی، میں اپنے طور پر کہہ رہا ہوں رام لعل رتن سنگھ کے افسانوں کے قائل نہیں ہیں۔ جب رام لعل کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تو رتن سنگھ نے مجھ سے کہا کہ یہ ایوارڈ ان کے ادبی کارناموں کی وجہ سے نہیں ملا۔ یہ ایک مرسی ایوارڈ Mercy award ہے یعنی ان کی موذی بیماری کو دیکھتے ہوئے ترحم کے طور پر دیا گیا ہے۔

اس ایوارڈ کے تعلق سے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اتنا بڑا ایوارڈ ملنے پر بھی اہل لکھنؤ نے رام لعل کی تہنیت میں کوئی تقریب نہیں کی، اس کا انھیں بھی ملال تھا، مجھے بھی ہے۔ رام لعل شکایت کرتے تھے کہ اہل لکھنؤ اب بھی انھیں باہر والا سمجھتے ہیں۔ دراصل حیات اللہ انصاری صاحب نے تہنیتی جلسے کی ذمہ داری لی، مجھ سے اور کچھ دوسرے لوگوں سے مضمون لکھنے کو کہا۔ وہ اس جلسے کی صدارت کے لیے دہلی سے وزیر شیلا کول کو بلانا چاہتے تھے۔ کوئی تاریخ طے نہ ہوسکی۔ جب بات زیادہ پرانی ہوگئی تو وہ خاموش ہوگئے۔ جون ۱۹۹۴ء میں حیات اللہ صاحب کی بیگم سلطانہ حیات کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تقریب کا کیا سوال تھا۔ جب وزیروں کے چکر میں پڑا جائے تو تقریب اسی طرح کھٹائی میں پڑتی ہے۔

بکھرے مشاہدات

بات بہت بڑھ گئی ہے۔ اب میں ان سے متعلق کتابوں سے چند شہادات درج کرتا ہوں:

الف: فن اور شخصیت مرتبہ نریندر ناتھ سوز

(۱) ناروے کے سعید انجم لکھتے ہیں کہ رام لعل نے اپنے سفرنامے 'خواب خواب سفر' میں لکھا ہے کہ کبھی ایک سادھو نے ان کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تو دیس بدیس پھرے گا، نام بہت کمائے گا اور کچھ ناکام پریم کرے گا۔ تیرے ہاتھ

میں ڈیڑھ بیوی کی دیکھا ہے یعنی ایک بچی بیوی کی اور ایک
ادھوری بیوی کی۔ یعنی کوئی لڑکی تیری زندگی پر گہری چھاپ چھوڑے
گی۔ تو اُسے ہمیشہ یاد رکھے گا۔ (ص ۱۲۲-۱۲۳)

— مجھے ان کی سوانح میں کسی ایسے مستقل عشق کا پتہ
نہیں چلا۔

۲. انھوں نے ناروے کے اسکولوں کے پاکستانی بچوں کے لیے
اُردو میں چار لیکچر دینے کا پروگرام بنایا لیکن پاکستانی
اساتذہ نے اسے مسترد کر دیا کہ وہ نہیں چاہتے کہ ایک
ہندستانی ادیب پاکستانی بچوں کے سامنے کچھ کہے۔
(ص ۱۲۹)

ب۔ باقی سوالات

۱. لکھنؤ ہمیشہ سے پُرانے خیالات کا ایک شہر رہا ہے۔ یہ بہت ہی
قدامت پسند شہر ہے جس کو اب مُردہ شہر بھی کہتے ہیں، ایک
زوال پذیر شہر۔ (ص ۸۲)

۲. ہمارا خاندان بہت ہی غریب تھا میرے دادا ایک معمولی مزدور
تھے جن کے چھ بھائی تھے، وہ بھی اس قدر غریب تھے کہ ان
میں سے کسی ایک کی بھی شادی نہ ہو سکی۔ (ص ۹۲)

۳. بارہ تیرہ سال کی عمر میں اسکول کی ایک کاپی میں ایک پورا
جاسوسی ناول لکھ لیا تھا۔ ان کے والد نے اسے دیکھا تو پھاڑ
ڈالا تھا۔ (ص ۹۵)

۴. "لکھنؤ میں پنجاب کی مخصوص تہذیب کی تو میں ہمیشہ ایک کمی
محسوس کرتا رہا ہوں۔" (ص ۱۳۲)

۵. میں ایک مکمل ناول لکھنے کے لیے بہت بے چین ہوں اور
چاہتا ہوں کہ ایک طویل ڈرامہ بھی ضرور لکھوں۔ اگر موقع ملے تو
اپنی پوری زندگی کے بارے میں بھی ..... ایک چھوٹی سی کتاب
لکھوں۔ (ص ۱۴۶)

۶. لکھنؤ پہونچتے ہی یہ احساس ہوا جیسے میرا لاہور مجھے واپس
مل گیا ہے۔ وہی اُردو ادب کے چرچے، باغات، فراخدلی
اور مہمان نواز لوگ۔ (ص ۱۹۵)

۷. ناگیندر سے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ میرے نزدیک ادبی سطح پر
اُردو ہندی کا رشتہ قطعی طور پر الگ نہیں ہے۔ زبان کے
معاملے میں بھی اُردو اور ہندی میں خاص فرق نظر نہیں آتا۔
(ص ۱۹۹)

— میری رائے میں اُردو اور ہندی کے ادب میں بہت تفاوت
ہے۔ رام لعل کے ذہن میں صرف جدید ادب رہا ہوگا۔ قدیم
اور متوسط زمانے کے ادب کو سامنے نہیں رکھا۔

۸. (ناروے میں) احساس کمتری یا وطن کے لیے بے پناہ اداسی
میں مبتلا مجھے بھارتی اور پاکستانی بھی ملے جو اپنے ملک میں بے روزگاری
کے مسائل سے بھاگ کر روزی کی تلاش میں ہزاروں میل دُور جا کر
رہ رہے ہیں، انھیں وہاں چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔
(ص ۲۲۴)

ج۔ رام لعل کے شب و روز

۱. رانی کیتکی کی کہانی کو ہندی اور اُردو دونوں نے اپنی اپنی زبان
کی پہلی کہانی قرار دے رکھا ہے۔ (ص ۱۱۴)

— اُردو کی حد تک یہ صحیح نہیں۔ یہ کہانی نہیں، داستان ہے۔

۲. لکھتے ہیں کہ تہذیب سے بھاگ کر گاؤں کی تلاش میں جانا آدمی کی
جوانی کی طرف مراجعت ہے۔ گھروں میں پیڑ پودے لگانا، ڈرائنگ
روم میں بانسوں و بیدوں کی کرسیاں ڈالنا، پکنک کو جانا، یہ سب
جنگل کی طرف لوٹ جانے کی خواہش کا ایک لاشعوری اظہار ہے۔
(ص ۱۳۰)

۳. ہمارے بعض ترقی پسند رہنما اپنی ذاتی زندگی میں بے حد کٹر قسم کے
مذہبی بنے ہوئے ہیں۔ اب تو وہ کھلم کھلا مذہبی مجلسوں میں شریک
ہوتے ہیں۔ (ص ۱۴۱)

۴. ۱۳ر جنوری ۱۹۶۸ء کو ۲ روز زبیر رضوی کی شادی میں امروہہ
رہے۔ (ص ۱۴۲)

۵. خواجہ احمد عباس نے بلٹز میں رام لعل کے خلاف ایک صفحہ
لکھا۔ سردار جعفری نے احمد عباس سے کہا: اپنے سے چھوٹوں
کے خلاف نہیں لکھنا چاہیے۔ (ص ۱۵۰)

—— سردار جعفری کی یہ صائب رائے گرہ میں باندھ لینے کے لائق ہے۔

۶۔ ایک گاڑی سے دربھنگہ پہنچے۔ ایک بجے رات تک کرسی پر بیٹھے ایک کہانی لکھتے رہے۔ (ص ۱۸۴)

۷۔ برکاش پنڈت سے جاں نثار اختر نے رام لعل کا پتہ دریافت کیا کہ ان کی کسی کہانی پر فلم بنانا چاہتے ہیں۔ پنڈت نے انھیں لکھ کر دیا کہ رام لعل کا پتہ معلوم نہیں۔ رام لعل: "کبھی کبھی آدمی مکاری میں بھی لاعلمی اختیار کر لیتا ہے۔" (ص ۱۸۶)

۸۔ ۲۳ رفروری ۱۹۷۰ء کو شمس الرحمٰن فاروقی نے ان سے ملاقات میں زبانی ایک افسانہ سنایا۔ ان کا خیال ہے کہ اب فاروقی افسانہ نگاری بھی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ (ص ۲۲۴)

۹۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک بار کہا تھا کہ فراق نظم کا شاعر ہے بھرتی کے اشعار شاید اسی نظم کے مزاج کی وجہ سے آجاتے ہیں۔ (ص ۳۰۰)

—— میری رائے میں فراق کو نظم کا شاعر کہنا غلط ہے۔

۱۰۔ ۷ رمارچ ۱۹۷۸ء کو لکھتے ہیں کہ ناروے سے ہرچرن چاولہ نے ہوائی جہاز کا واپسی کا ٹکٹ بھجوایا ہے۔ (ص ۳۲۶)

—— مجھے فرید آباد کے ایک اردو دوست گوپال کرشن نے لکھا تھا کہ رام لعل نے چاولہ سے بار بار اپنے ناروے بلانے کا تقاضا کیا۔ لکھا: "اچاریہ جی رنیش! کیا میں مغرب دیکھے بغیر ہی مر جاؤں گا۔؟" اس نے عاجز آکر اپنی جیب سے ٹکٹ بھیج دیا۔ لیکن رام لعل وہاں جاکر پاکستانی نژاد لوگوں کے ساتھ ہو گئے —— اس کا چاولہ کو بہت قلق ہوا۔

باقی سوالات میں ہندی کے رگھونش دیال سامنت کے انٹرویو میں رام لعل کہتے ہیں کہ اوسلو میں بعض تنگ نظر پاکستانیوں کو معلوم ہوا کہ رام لعل کو ریڈیو پر ایک پروگرام دیا جا رہا ہے تو انھوں نے وہاں کی حکومت کو دھمکی دی کہ اگر ایسا ہوا تو وہ ریڈیو اسٹیشن پھونک دیں گے۔ ۔۔۔۔ یہ غلط فہمی دراصل میرے برخود غلط ہندستانی دوست کی پیدا کی ہوئی تھی۔ (ص ۲۲۱)

—— یہ ہندستانی دوست وہی چاولہ ہوں گے جنھوں نے رام لعل کو ٹکٹ بھیجا تھا۔

۱۱۔ رام لعل کے ایک دوست نخاس لکھنؤ میں رہتے تھے، وہاں ایک قدیم لائبریری والے مظہر عالم نے ۱۹۸۲ء میں رام لعل کو بتایا کہ اسی مکان میں تو امراؤ جان آدا رہا کرتی تھی۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس کے پاس مرزا ہادی رسوا کے بارے میں ایک کتاب موجود ہے جس کا نام ہے "کچا چٹھا"۔۔۔ یہ کتاب امراؤ جان آدا نے لکھوائی تھی اور ہردوئی میں چھپی تھی۔ یہ ایک سو سے زائد ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ (ص ۲۶۹-۲۶۸)

—— میرے لیے بالکل انوکھی غیر معمولی بات ہے۔

آخر میں اس دراز گوئی کو سمیٹتے ہوئے اس اعتراف پر ختم کرتا ہوں کہ میں نے رام لعل کو ایک بے حد شریف انسان پایا۔ ان کے نقاد وارث علوی لکھتے ہیں:

"نُنا بری سے وہ کوسوں دور ہیں۔ ان کی فنکارانہ شخصیت کی سادگی اور انکسار پریم چند کی یاد دلاتی ہے۔"
(فن اور شخصیت ص ۱۰)

احمد جمال پاشا لکھتے ہیں:

"غالباً وہ تعریف سے زیادہ اپنی تنقید خندہ پیشانی سے قبول کرتے اور غور سے سنتے ہیں اور اگر کوئی ان کی عیب جوئی اور غیبت پر اتر آئے تو ان کی شانِ بے نیازی دیکھنے والی ہوتی ہے۔" (ایضاً ص ۱۴۴)

وہ گفتار میں نرم گو تھے۔ شاذ ہی کسی کے بارے میں کوئی معترضانہ کلمہ کہا ہو۔ حتی الامکان ہر شخص کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ میرے مخلص بہی خواہ تھے۔ میں جب بھی ان سے ملا ایک فرحت اور طمانیت کا احساس ہوا۔ میں رام لعل افسانہ نگار سے زیادہ رام لعل انسان کی کمی محسوس کرتا ہوں ؎

رام لعل! ایسی بھی تھی کیا جلدی؟
میں بھی آتا ہوں، انتظار کرو

([illegible])

ہم اگر عشق میں شائستۂ غم ہوجاتے
یہ حقیقت ہے سزاوارِ کرم ہوجاتے

بے رُخی کا ہے سلیقہ نہ محبت کا شعور
کیسے مانوس ہر انسان سے ہم ہوجاتے

یہ غنیمت ہے کہ صحرائے جنوں باقی ہے
ورنہ دیوانے خردمندوں میں ضم ہوجاتے

اک محبت کی نظر بھی جو اِدھر ہو جاتی
عمر بھر کے لئے ممنونِ کرم ہوجاتے

رہبری کرتا اگر جذبۂ آشفتہ سری
فاصلے منزلِ جاناں ترے کم ہوجاتے

دیکھتے رشک کی نظروں سے زمانے والے
واقفِ قدرِ درِ یار جو ہم ہوجاتے

کام آتی نہ اگر دیدہ وری اے شاعر
جانے کتنوں ہی کے سر آج قلم ہوجاتے

شاعر فتحپوری
۸۸/۸۹، بجر اکادمی، چمن گنج
کانپور

دوستی دو رُخی، دشمنی دو رُخی
ہے مرے شہر میں زندگی دو رُخی

مُدعا کس طرح پھر سمجھتا کوئی
آپ نے جب بھی کی بات، کی دو رُخی

قہقہے لب پہ ہیں دل میں طوفانِ غم
آجکل ہے ہماری خوشی دو رُخی

بحرِ دولت میں جتنا بھی ڈوبا کئے
اتنی ہی ہو گئی تشنگی دو رُخی

اس کے الفاظ کچھ اور مفہوم کچھ
ہے اسد آپ کی شاعری دو رُخی

اسد رضا
اے-۱۱/۴۴، حوض رانی، مالویہ نگر
نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۷

اس حادثے کا تھا مجھ کو گمان پہلے ہی
بجھا بجھا سا لگے تھا نشان پہلے ہی

ہر اک کو اس کی گواہی سے تقویت تھی مگر
بدل چکا تھا وہ اپنا بیان پہلے ہی

مرا یہ بڑھتی ہوئی مشعلیں کریں گی کیا
ہوائیں لے گئیں وہ سائبان پہلے ہی

یہ امتحان کوئی مرحلہ نہیں ہے مجھے
میں ناپ آیا ہوں ہر آسمان پہلے ہی

شکیب آج نہیں ہے تو فرق کیا یارو
کہ بے مکین سا تھا اس کا مکان پہلے ہی

شکیب رضوی
کرائسٹ چرچ انٹر کالج،
کانپور

غزلیں

ڈاکٹر سید سکندر آغا
۱/۱۱-۱۶۶، بھیرو بخی روڈ۔ گولہ گنج لکھنؤ

عالم لکھنوی : شخصیت اور فن ایک جائزہ

سرزمین لکھنؤ، فخرِ اودھ، گہوارۂ علم و ادب، مرکزِ تمدن درسگاہِ اخلاق و شرافت، حکماء و ادباء و شعراء کا مسکن بڑی تاب و توانائی کے ساتھ افقِ ہند پر ابھرا اور عرصہ تک اپنی شان و شوکت کو برقرار رکھا یہاں علم و حکمت، فن و فنکار، منازلِ اوج و عروج طے کرکے معراجِ کمال کو پہنچے۔ ان فنکاروں میں فصیحؔ اپنی فصاحت، دبیرؔ اپنے کلام کی دل آویزی ضمیرؔ اپنے اظہارِ بیان، آتشؔ و ناسخؔ اصلاحِ زبان و شگفتگیٔ کلام، میر انیسؔ اپنی سادگیٔ بیان، لطفِ زبان اور مرزا دبیرؔ اپنی شوکتِ الفاظ اور مضامین کی آمد کے لیے مقبولِ خاص و عام ہوئے۔

خانوادۂ عالمؔ لکھنوی بھی اپنی گوناگوں فضیلت و عظمت، تبحّرِ علمی، نجابت و شرافت کا حامل رہا۔ اس کا سلسلہ حضرت مالک اشتر تک پہنچتا ہے۔

عالمؔ لکھنوی کا پورا نام مرزا الطاف حسین تھا لیکن آپ نے معاصر شعراء احباب و اعزّہ میں اپنے تخلص کی وجہ سے ہر دل عزیز ہو کر جانے پہچانے گئے۔ آپ کے پدر بزرگوار مرزا محمد مہدی المعروف بہ آغا مرزا صاحب بن مولانا مرزا مہر علی بن مولانا اسمٰعیل بن مولانا مرزا عون بن مولانا مرزا نور، بن مولانا مرزا شمس بن مولانا مرزا طاہر اصفہانی تھے۔

مرزا شمس اپنی حالات کی بنا پر اصفہان سے ہجرت کرکے تبدیل آب و ہوا کے لیے کشمیر تشریف لائے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے بزرگوں میں مرزا اسمٰعیل اپنے عہد کے جیّد عالم ماہر علوم معقولیہ، منقولیہ، اصولیہ و فروعیہ نے کافی شہرت حاصل کی تھی جس سے تاجدار اودھ غازی الدین حیدر متاثر ہوئے اور انھیں نواب معتمد الدولہ آغا میر کے ذریعہ طلب فرمایا۔

مرزا اسمٰعیل اپنے فرزند مولانا مرزا علی مہر، برادر عزیز مرزا ہادی اور بھتیجے مرزا جعفر علی فصیحؔ کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے۔ بادشاہ نے عزت و توقیر سے نوازا۔ اشراف کی بستی مفتی گنج میں مکان کے لیے آراضی اور تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ بہ الطاف و کرم عطا فرمایا۔ مرزا اسمٰعیل کے انتقال کے بعد بھی یہ وظیفہ ان کے جانشین مرزا علی مہر کو ملتا رہا۔

اس شان و شوکت، تزک و احتشام اور آن بان کے ساتھ عالمؔ لکھنوی کے بزرگوں نے لکھنؤ میں ورود کیا اور اس تہذیبی بہارستان کو سینہ سے لگا کر یہیں کے ہو گئے۔

۱۲ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ بروز جمعہ ساعتِ مسعود میں عالمؔ لکھنوی کا تولّد اسی آبائی مکان میں ہوا۔

زندگی کے ابتدائی منازل طے کرتے ہی تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ اس عہد کے نامی گرامی ماہرین منطق اور علمائے دین کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان سے درسیات معقولیہ و منقولیہ پڑھے۔ یہ اساتذہ شمس العلماء بحر العلوم جناب مولوی سید محمد حسین المعروف بہ علّن صاحب قبلہ مجتہد، حضرت باقر العلوم سید باقر صاحب قبلہ مجتہد، ناصر الملت جناب سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد، جناب مولوی سید ابو الحسن صاحب عرف بچھن صاحب قبلہ مجتہد (شمس العلماء) جناب مولوی محمد نعیم صاحب قبلہ مجتہد فرنگی محلی، جناب مولوی عین القضاۃ صاحب قبلہ، جناب مولوی سید رضا حسین صاحب منطقی نبیسؤ پرنسپل صاحب ہے۔

عالمؔ لکھنوی نے درسیات طب، مشہور و معروف حکیم محمد علی عرف منے آغا صاحب فاضل سے پڑھے۔

شعر و شاعری کا شوق عالمؔ کو بچپن سے تھا۔ دس برس کے سن سے شعر کہنے لگے۔ اور پہلا شعر ؎

حال بے رحمیٔ قاتل جو ہے سننا منظور زخم ہیں کان لگائے ہوئے سوفار کے پاس

بڑی معنویت کا پیش کیا۔ گھریلو علمی ماحول جہاں ایک طرف دادا مرزا مہر علی

اور دوسری طرف چچا جناب ناقذ (جن کا سلسلۂ تلمذ شیخ ناسخ تک پہنچتا ہے) اپنی محبّت اور شفقت کی نظروں سے جو درس دے رہے تھے عالم کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ ادبی فضا نے ان کی طبع رواں کو مہمیز لگائی' مبدأ فیاض نے قوت پرواز عطا کی۔

باپ اور چچا' رجحان نطری سے متاثر ہوئے۔ نواب باقر علی خاں مشتاق لکھنوی کی خدمت میں شاگرد کی حیثیت سے پیش کیا۔ انھوں نے تین غزلیں اور ایک قصیدہ معمولی اصلاح کے بعد یہ کہہ کر واپس کیا کہ اُن کا کلام کسی اصلاح کا طالب نہیں۔ بس پھر کیا تھا عالم کچھ ہی عرصہ میں فلک شاعری میں ایک درخشندہ ستارے کی طرح ضوفگن ہو کر ضیا پاشی کرنے لگے۔ اپنے خاندان کی علمی برتری اور جلالت پر نازاں ہیں۔ فخریہ انداز میں فرماتے ہیں۔

وہ منیر اور جو تھے ناقذ شیریں گفتار وہ پھوپھا اور یہ چچا تھے ہے سبھی کو اقرار
مدح گوئی میں ہوئے سب ہی مثال حمّار قلم فکر کو تولا تو ہوئے سب مختار

زلفِ مضموں کو طبیعت مری سلجھاتی ہے
شاعری میرے بزرگوں سے چلی آتی ہے

بائیس[۲۲] سال کی عمر (۱۳۲۰ھ) میں عالم فارغ التحصیل ہوئے۔ اردو فارسی اور عربی میں اچھی لیاقت حاصل کی۔ دن رات کی جدو جہد اور کوشش سے ترقی اور کامرانی کی راہیں کھلیں اور ایک وقت وہ آیا کہ عالم ان تینوں زبانوں کے عالم کہلائے۔

خاندانِ عالم کے بزرگ اگر ایک طرف علم دین کے لازوال خزانوں کے مالک تھے تو دوسری طرف مالی حیثیت سے بھی خوش حال تھے۔ عالم کے والد ماجد کے پاس بذاتِ خود کئی مکانات اور باغات تھے جن سے معقول آمدنی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد عالم اس جائداد کے وارث قرار پائے اس کے علاوہ شیش محل کے نواب باقر علی خاں کے وہ منشیِ خاص تھے۔ اُن کی املاک کی دیکھ بھال' تحصیل وصول عالم کے سپرد تھی۔ نواب صاحب علم دوست، اَدب نواز تھے۔ وہ خود شاعر اور عالم کے قدرداں تھے جو مشاعرے وہ منعقد کرتے۔ عالم ان کی صدارت کرتے تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نواب صاحب نے اُن کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو نواب صاحب کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک عالم کو ملتا رہا۔ اس طرح سکھ اور چین کے ساتھ ایام زندگی گذرنے لگے۔

۱۹ رشعبان المعظم ۱۳۱۷ھ کو عالم کا عقد مولانا مرزا محمد علی صاحب نجوم السماء کی صاحبزادی آمنہ بیگم سے ہوا جو مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی ہمشیرہ تھیں۔ آمنہ بیگم کے مبارک قدم آتے ہی عالم کی زندگی میں نئے باب کا اِضافہ ہوا۔ آمنہ بیگم نے گھریلو ذمہ داریاں سنبھال کر بڑی حد تک عالم کو ادبی مشاغل میں مصروف رہنے کے لیے آزاد کر دیا۔

عالم کے فرزند اول کی ولادت ۱۲ رجب ۱۳۱۸ھ کو ہوئی۔ ماموں (عزیز لکھنوی) بہت خوش ہوئے۔

دوسرے صاحبزادے ماہ محرم ۱۳۲۰ھ میں پیدا ہوئے ان کا تاریخی نام ظہیر الدین علی تھا۔ بعد میں انھوں نے مشرب تخلص اختیار کیا۔ عالم کے پانچ بیٹے ہوئے جن میں سے چار کا داغ مفارقت انھوں نے برداشت کیا۔

مشرب لکھنوی نے اپنی ساری عمر لکھنؤ سے باہر رہ کر گذاری، آخر عمر میں واپس آئے اور ۱۹۷۰ء میں عالم بقا کو سدھارے۔

عالم کا کاروانِ حیات اَب اس منزل کی طرف پیش قدمی کر چکا تھا جہاں ہر موسم موسم بہار، گلشن امید خندہ زن، کائنات کا ذرّہ ذرّہ لباس عروس میں نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لکھنؤ اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ عالم کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ اس وقت پرانی تہذیب و شرافت کے مداح، سچائی اور ایمانداری کے پرستار، انسانیت اور اخلاق کے جوہری موجود تھے۔ زندگی سادہ اور پرکیف تھی۔ اردو شاعری عالم شباب سے گذر کر پیری کی طرف مائل تھی۔ آتش و ناسخ' انیس و دبیر کے معرکے ختم ہو چکے تھے۔ سلاطینِ اَودھ کی اَدب نوازی برقرار رکھنے کے لیے شہر میں برابر رؤسا' امرا کی ڈیوڑھیوں اور محل سراؤں میں کم و بیش اسی معیار پر مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ فضا میں شاعری بکھری ہوئی ہے۔ اَب یہ کیسے ممکن تھا کہ عالم اپنے گرد و پیش سے متاثر نہ ہوں۔ قدما کی تقلید اور معاصرین کی ہمنوائی میں ان کی شاعری کا آغاز بھی غزل گوئی سے ہوا وہ ہمہ تن اپنی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ دن رات شعر کہنا، مشاعروں میں شرکت کرنا ان کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا۔

عالم نے کثیر تعداد میں غزلیں کہیں جو اگر محفوظ ہوتیں تو کئی دیوان تیار ہوتے۔

اس وقت لکھنؤ کے بساطِ شاعری پر عالم کے معاصرین صفی، ثاقب،

آرزو، حسرت موہانی، یگانہ چنگیزی، چکبست، عزیز، بیخود موہانی، اثر لکھنوی اور جوش ملیح آبادی درخشندہ ستاروں کی طرح شعر و سخن کی محفلوں کو پُر نور اور ضیاء بار کر رہے تھے۔ اُن سب کا اپنا مخصوص رنگ تھا مگر عالم نے کسی کی پیروی نہ کی وہ عزیز لکھنوی کے اس خیال سے متفق تھے۔

تقلید کیوں خیال و زباں میں کسی کی ہو　　　اپنے خیال اپنے مقالوں کو دیکھئے

انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑے سلیقہ سے سادہ اور سبک الفاظ میں اس انداز سے کی۔

کس کو دکھلاؤں میں اے فصل چمن زورِ جنوں
چاک کرتا تھا جسے میں وہ گریباں نہ رہا

اتنا بتا دے اس کے اٹھانے سے فائدہ　　　تصویر بن کے جو تری محفل میں رہ گیا

یہ کہہ کے اٹھ گئے بالیں سے میری چارہ گر آخر
مناسب تھا کہ اس بیمار کو اب قبلہ رو کرتے

عالم کی یہ بالغ نظری تھی کہ انھوں نے بہت جلد یہ سمجھ لیا کہ اُن کے معاصرین صنفِ غزل میں لکھنوی شاعری کی جن روایات کو اپنائے ہوئے ہیں ان میں تبدیلی کرنا یا اپنی ڈگر علیحدہ بنا کر چلنا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے انھوں نے اپنے فکر و فن کے سہارے جب ان ہی خیالات کو بہ انداز نو پیش کیا تو اُن کی کیفیت اس گلدستہ کے مانند تھی جس میں پھول تو وہی تھے لیکن ان کی نفاست اور مہک کی لطافت نے عام فضا کو مسحور کر دیا اور عالم سب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ؎

زلف لہرانے لگی عارضِ روشن کے قریب　　　مجھ کو جس وقت خیالِ سحر و شام آیا
چودھواں سال اسے دیتا ہے مژدہ عالم　　　کہ مبارک ہو کہ اب تو مہِ کامل ہوگا
تو وہ ہے حسن میں یکتا کہ تجسس میں ترے　　　آسماں لے کے چراغِ مہِ تاباں نکلا

عالم کی شاعری پر نکھار آتے ہی ان کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوا لکھنؤ سے باہر منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی ان کو مدعو کیا گیا۔

خیر آباد ضلع سیتاپور میں منعقد ہونے والی سالانہ نمائش میں ہر سال ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوتا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بیڈلے صاحب ڈپٹی کمشنر سیتاپور مقرر ہوئے انھوں نے اس مشاعرے میں عالم کو مدعو کیا اور نمائش کی عکاسی نظم کرنے کا حکم دیا۔ عالم نے جو نظم وہاں پیش کی پسند کی گئی بیڈلے صاحب نے خوش ہو کر ان کو ایک میڈل ۱۱ر اپریل ۱۹۱۵ء کو عطا فرمایا۔

اسی طرح ۱۹۲۲ء میں جبکہ عالم گورکھپور میں حاجی سید سبحان اللہ خاں صاحب کے مہمان تھے، مولوی انور علی بیرسٹرایٹ لا کی توجہ اور شوق سے وہاں ایک مشاعرہ ۲۱ر نومبر ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوا جس کے بارے میں عالم کا بیان ہے:۔

"…… ہندوستان کے تمام نامی گرامی شعراء بلائے گئے تھے اور میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں …. انگریزی اور اردو اخباروں کے اڈیٹر اور مضمون نگار بھی موجود تھے دوسرے روز پڑھنے کی نوبت آئی اور ایک انگریز نے جو اخبار آئی ٹی، ٹی کا مضمون نگار تھا اور دس برس مصر میں رہ کر عربی زبان اچھی طرح حاصل کی تھی نیز اردو بھی غنیمت بولتا تھا اس نے مجھے لسان الزمن کہہ کر پکارا اور ایک آرٹیکل میرے متعلق اپنے اخبار آئی ٹی، ٹی میں شائع کیا…… اس آرٹیکل کا خلاصہ یہ تھا۔

"مولانا لسان الزمن کہے جانے کے مستحق ہیں جس کی تائید طلباء علی گڑھ نے کی اور وہ مضمون اخبار ہمدم میں نکلا۔" [۱]

عالم کا مجموعۂ غزلیات "حسن و عشق" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ۱۹۲۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔

عالم بہت جلد وادیٔ غزل سے باہر آ گئے کیونکہ ان کی نگاہیں حسنِ حقیقی تلاش کر چکی تھیں۔ اب حسن مجازی اُن کے لیے بے کیف تھا۔ ان کا ساغرِ دل بادۂ عرفاں سے لبریز تھا۔ وہ جب گویا ہوئے تو یہ کہتے نظر آئے ؎

اے قلم تحریر کر حمدِ خدا　　　جس نے یہ سارا جہاں پیدا کیا
تاج بخشا قیصر و فغفور کو　　　بادشاہی کی عطا تیمور کو
ذرہ و خورشید کرتے ہیں عیاں　　　صنعِ صانعِ زمین و آسماں
واعظا کیا پوچھتا ہے کُنہِ ذات　　　اس کی ذاتِ پاک ہے عینِ صفات [۲]

اُن کی نظر میں دنیا فانی ہے۔ یہاں کی ہنگامہ آرائیاں مسئلہ حیات و ممات ہے۔ وہ اس کا حل تلاش کرتے ہیں مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ ایک کیفیت بیان کرنے کے بعد سوالات کرتے ہیں۔ ؎

کارواں در کارواں آتے ہیں یہاں وجود　　　قافلہ در قافلہ جاتے ہیں ہو کر بے نمود
کیا فنا کے بعد بھی ہے زندگانی کا سُراغ　　　ہستیٔ فانی کا کیا بجھ بجھ کے جلتا ہے چراغ [۳]

نیستی سے ہستیٔ فانی ہوئی ہے رونما
قادرِ مطلق کی قدرت پر ہے یا اس کی بنا
معجزہ نیچر کا یہ دنیائے محسوسات ہے
یا کسی صنّاع کی صنعت یہ موجودات ہے
کس حسیں کے جلوۂ دلکش کا گہوارہ ہے یہ
یا کرشمہ سازیٔ فطرت کا نظّارہ ہے یہ [۴]

جذبۂ حبِّ اہلبیت علیہم السّلام حاکم کے سینہ میں شروع سے موجزن تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے خیالات پختہ ہوئے یہ جذبہ بھی پختہ ہو گیا ایک غوّاص کی طرح قلزم تفکّر میں جب وہ ڈوب کر ابھرے تو نادر گہر ہائے عقیدت اربابِ فہم و ذکا کے سامنے پیش کر کے خراج داد و تحسین حاصل کیا۔

اُن کا پہلا مجموعۂ قصائد "فردوسِ ولا" (لسان الزمن) جس کو خود انھوں نے ترتیب دیا تھا نومبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔

اس مجموعہ میں محبوبِ خدا، فخرِ انبیاء، ختم المرسلین، رحمۃ للعالمین محمد مصطفےٰ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے حاکم فرماتے ہیں۔

اے زہے توقیرِ ختم المرسلیں	بادشاہِ اوّلیں و آخریں
آستاں پر کرتے ہیں قدسی سجود	گردِ جولاں گاہ ہے چرخِ کبود
ہم ہیں ذرّہ اور وہ ہیں آفتاب	ہم سب اک قطرہ ہیں اور وہ ہیں سحاب
ہے مطیع اُن کی قدر تابع قضا	ہے لقب عالم میں محبوبِ خدا
ہیں یہ سابق کل موجودات پر	گو مؤخّر ہیں مقدّم ہیں مگر [۵]

حاکم کا دوسرا مجموعہ قصائد مسمّٰی بہ "نغماتِ طوبیٰ" ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ فردوسِ ولا، کی طرح اس میں بھی ائمہ معصومینؑ کی شان میں تیس قصائد، آٹھ سلام، قطعات، رباعیات، صنعت توشیح میں، عہد شکنی کی مذمّت بزبانِ فارسی و عربی، مسودات رقعہائے شادی، مسودات رقعہائے مجالس (نثر) بزبان فارسی، پیش کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حاکم کی فارسی دانی و زبانِ عربی پر ان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نغماتِ طوبیٰ کے چند نمونے قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں۔

ذَمُّ نَقضِ العَھدِ
عہد شکنی کی مذمّت

دلم را نمودہ خستۂ شمشیرِ چشمہا
عَفَرتُ قَرِیبَ المَرگ مِن ذَالِکَ الزَخمِ

اس کی نگاہوں کی شمشیر نے میرے دل کو زخمی کر دیا ہے۔ اس لیے میں اس زخم سے قریبُ المرگ ہو گیا ہوں۔

اَرُومُ وَفَاءَ العَھدِ مِنھَا مِنَ الصِّبَا
چہ باشد وَفَا بِالعَھدِ مِن جُملَۃِ الحَزمِ

میں عہدِ طفلی سے اس سے دعدۂ وفا کرنے کی امّید لگائے ہوں کیونکہ وعدہ وفا کرنا ذہانت و عقل کی بات ہے۔

بَنُو اَمرَھُم بَر نَقضِ عَھدٍ وَ ذِمَّۃٍ
دو باکے نمی دارند فی الغَدرِ وَالظُّلمِ

انھوں نے اپنے معاملات کی بنیاد عہد شکنی اور غیر ذمّہ داری پر رکھی ہے اور بے وفائی اور ظلم و ستم کرنے میں انھیں کوئی خوف نہیں معلوم ہوتا۔

تَاَسِّی بِنَقضِ العَھدِ ہرگز نمی سزد | چو امر وَفَا بِالعَھدِ امرے بود حتمی

عہد شکنی کی تاسّی کرنا سزاوار نہیں ہے کیونکہ ایفائے عہد کا حکم حتمی ہے

وایں رامن شحنۃٌ مِن نَصِیحَۃٍ | ز حلوا بود بہتر لَدَی کُلِّ ذِی فَھمٍ

اور یہ نصیحت جو میں نے آراستہ کی ہے، یہ صاحبِ فہم کے حلوے سے بہتر ہے [۶]

حاکم کو قطعاتِ تاریخ وفات نظم کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ اپنے استاد نواب باقر علی خاں مشتاق لکھنوی کی رحلت کی خبر سن کر آبدیدہ ہوئے دل رنج و غم کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں ؎

جس کا نہ خیال خواب میں بھی آیا	ہم لوگوں پہ اس چرخ نے وہ ظلم کیا
یعنی کہ شہِ سخن جناب مشتاق	دنیا سے گئے ہیں سوئے فردوسِ علا

بجتا تھا ہمیشہ روز و شب شام و سحر
عالم میں سوائے اُن کے کس کا ڈنکا
لگتی ہے جگر پہ چوٹ جب آتا ہے یاد
اُن کا وہ غزل مشاعروں میں پڑھنا
لاہور میں تھا انھوں نے جب کی رحلت
آ کر جو سنا لہو کے آنسو رو دیا
رحلت کا ہے سنہ یہ نوحہ میرا حاکم
استاد کا سایہ ہائے سر سے اٹھا چلے
۱۴۲۲ھ

عالمؔ کے عہد میں ہندوستان کے ہر گوشہ میں اور لکھنؤ میں بالخصوص ماہِ محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی پورا معاشرہ غمِ امام حسین میں غمگین نظر آتا۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ بڑی خوش اعتقادی کے ساتھ عزاداری کرتے تھے۔ شعرا صنفِ غزل میں طبع آزمائی ترک کر کے رباعی، سلام اور مرثیہ کی طرف متوجہ ہوتے اپنے جذباتِ عالیہ کی ترجمانی جب پیش کرتے تو سامعین اشکبار ہوتے تھے۔

اس وقت لکھنؤ میں میدانِ مرثیہ گوئی میں عالمؔ کے معاصر ممتاز مرثیہ نگار خانوادہ انیسؔ کے میر علی محمد عارفؔ، دولھا صاحب عروجؔ، خانوادۂ دبیرؔ کے مرزا محمد جعفر اوجؔ اور ان کے صاحبزادے مرزا محمد طاہر رفیعؔ جانشین عشقؔ و تعشقؔ، مودبؔ لکھنوی، ان کے بیٹے مہذبؔ لکھنوی اور پیارے صاحب رشیدؔ اپنی فکر و فن کے مظاہرے بہ انداز نو ودگر کر رہے تھے۔

عالمؔ بھی اس راہ میں عرصۂ دراز سے بادیہ پیمائی کر رہے تھے۔ اُن کے فکری رجحان، بلند آہنگی، نازک خیالی اور سخن سنجی کے جوہر پختہ ہو گئے تھے۔

عالمؔ کی رباعیات مذہبی بھی ہیں اور ذاتی بھی، کبھی وہ بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہیں۔ ؎

یارب ہے ترے سپرد ہر کام مرا　　بہتر آغاز سے ہو انجام مرا
تسخیر مری زباں کی ہو ہفت اقلیم　　ہو نقش نگیں شش جہت نام مرا

اور کبھی دنیا کے رنج و غم سے پریشان ہو کر شکوہ کرتے ہیں ؎

گھیرے ہیں ہر اک سمت سے آلام مجھے　　دیتے ہیں سدا رنج یہ خود کام مجھے
پوچھے تو کوئی یہ حاسدوں سے عالمؔ　　کیا ان کو ملے گا کر کے بدنام مجھے[8]

جذبۂ ایمانی، جوش و خلوص کے تحت انھوں نے مراثی بھی نظم کیے تھے جو ضائع ہو گئے۔ ان کو شدید صدمہ پہنچا جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں

"....... چنانچہ پچھتر مرثیہ بھی جو حالاتِ امام حسینؑ وغیرہ میں نظم تھے اور میں نے بہت جانکاہی سے نظم کئے تھے وہ بھی غائب کر دئے۔ دس مرثیہ جن میں دو نامکمل ہیں اور آٹھ کامل ہیں، بعد تلاش بسیار دستیاب ہوئے لیکن افسوس کہ انھیں اس مجموعہ میں شامل نہیں کر سکتا......"[9]

عالمؔ کی زندگی کے آخری ایام پریشان حالی، کشمکش، ذہنی بے چینی اور مختلف قسم کی تکالیف میں بسر ہوئے جس کا شکوہ انھوں نے جا بجا مختلف انداز میں کیا ہے۔

عالمؔ مجھے بھی شعر و سخن سے کبھی تھا ذوق　　اب تختۂ مشق ہوں ستم روزگار کا
کبھی سرور کے معدن تھے ہم زمانے میں　　اور آج جملہ مصائب کے ہو گئے مخزن
یہ کجروی تو ذرا دیکھے کوئی گردوں کی　　کہ بچپنے کے بھی احباب ہو گئے دشمن
پڑھایا تھا جنھیں بے فکر میں نے مدت تک　　سمجھ رہے ہیں وہی لوگ اب مجھے کودن

وہ تقریباً ۱۲ برس تک بینائی سے محروم رہے جس کا اظہار درد انگیز لہجہ میں اس طرح کرتے ہیں:

"اب میرا وقت یہ ہے کہ مجھے اپنی زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ایسے عالم میں ہوں کہ سیاہ و سفید میں امتیاز نہیں، رات دن یکساں معلوم ہوتے ہیں، بغیر کسی کی مدد کے ایک قدم بھی اٹھانے پر قادر نہیں ہوں۔ دس برس آنکھوں کا علاج کیا مگر ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہر وقت موت کا انتظار ہے......"[10]

بالآخر یہ آفتابِ علم و عمل ۲۰ مارچ ۱۹۵۲ء کو غروب ہو گیا۔ دنیائے ادب میں اندھیرا چھا گیا۔ ان کے جسد خاکی کو امام باڑہ سید تقی صاحب (مرحوم) اندرون مسجد

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

جو پاس تھا وہ ذوقِ نظر چھوڑ گئے
دستور بہ عنوانِ سحر چھوڑ گئے
بابا صاحب جہاں سے جاتے جاتے
منزل کے لیے زادِ سفر چھوڑ گئے

افکار میں اک رنگِ ہنر رکھتے تھے
لفظوں میں عجب جذب و اثر رکھتے تھے
تاریخ کے اسرار سمجھنے والے
مستقبل و ماضی کی خبر رکھتے تھے

رباب رشیدی
۱۲۶۔ تازی خانہ لکھنؤ - ۱۸

مکالماتی نظمیں

(۱)

پورنیما! تم یہاں
کیوں؟
یہاں تو ..... !
ہاں مجھے پتہ ہے
یہ سب تم کو
مجھے چھوڑ کر بھاگنے سے پہلے
سوچنا چاہیے تھا"

(۲)

مالتی! تم اسٹیج پر؟!
ہاں!
تم رقاصہ کب سے بن گئیں؟
جس دن ایک رقاصہ کی خاطر
تم نے میرا ہاتھ چھوڑا تھا

(۳)

زیبا! اس قدر ناراضگی
میں ناراض ہوں تو کیا ہوا؟
ماں باپ کی مرضی سے شادی
ڈھیر سارا مال و سونا جہیز میں
تمہارے ماں باپ تو خوش ہیں نا؟

(۴)

صاحب عالم!
کیا کہنے آئے ہو
انارکلی تو دیوار میں چن دی گئی
اور آپ محل میں ا.....!
نہیں ثریا نہیں
ذرا سنو تو سہی
نہیں، مجھے خود کو
دیوار میں چنوانا نہیں ہے

(۵)

مرلی! تم مل مزدور ہو تو کیا ہوا؟
آدمی تو ہو،
میں مل مالک کی بیٹی
ریکھا ہوں تو کیا ہوا
میں بھی آدمی ہوں
پھر یہ فرق کیسا؟
یہ راز اپنے دھنا ہی پتا جی سے
فون پر پوچھ لینا

(۶)

آؤ نیلو
یہاں سے بھاگ چلیں
کہاں؟
جہاں قسمت لے جائے۔
اکمل! اگر قسمت نام کی
کوئی چیز ہمارے پاس ہوتی
تو رونا کس بات کا؟

رزاق افسر
۳۹۱۳ - بزم اردو - حیدر علی روڈ
لشکر محلہ - میسور ۵۷۰۰۰۱

احساس

ہاں سنو! میں نے کہا تھا کہ الجھنا سیکھو
پیار کے بیتے ہوئے لمحوں کی یادوں سے نہیں
اپنی ناکام سی بے فیض مرادوں سے نہیں
بلکہ اس دور سے جس دور میں تم آئی ہو
تم سمجھ کر جسے اب تک نہ سمجھ پائی ہو
جس میں ہر موڑ پر ہر راہ پہ تا حد نظر
غم کے احساس کا سناٹا ہے کچھ اور نہیں
بھوک اور پیاس کا سناٹا ہے کچھ اور نہیں
نفرتیں سینوں میں پلتی ہیں ہر اک شام و سحر
سازشیں زہر اگلتی ہیں ہر اک شام و سحر
زندگی ہی کے لیے زندگی خود روتی ہے
اپنے ہونے سے نہ ہونے پہ فدا ہوتی ہے
دیکھو یہ دور تمہارا ہے تم اس دور کی ہو
تم کو اس رشتے کے آداب نبھانے ہوں گے
آج تک تم نے جو دیکھے ہیں کسی کے غم میں
وہ سبھی خواب تمہیں دل سے بھلانے ہوں گے
ایسے بے فیض خیالوں سے چمٹنے کے بجائے
اپنے اس دور کی باہوں سے لپٹنا جانو!
بڑھ کے اس وقت کی آنکھوں سے یہ آنسو پونچھو
آج کی فکر کے شعلوں میں جھلسنا جانو

کیا مری بات پہ کچھ غور کیا بھی تم نے؟
ہاں تو کیا عرض کیا ہے ابھی میں نے تم سے

ندرت نواز
بگھ اسٹریٹ
امروہہ

افسانہ

اقبال مجید

۴۷ - شملہ ہلس روڈ، کول کالونی
بھوپال (ایم پی)

بے یقینی

مجھے جہاں اُٹھنے بیٹھنے کی تعلیم اور گفتگو کا سلیقہ اس بزرگ نے سکھایا ہے مجھے یہ بات بھی اسی نے بتائی کہ خوف آدمی کو یقین سے دُور اور گمان سے قریب لاتا ہے۔ اس لیے جس دن آپ آدمی سے ڈرنے لگیں، سمجھ لیں کہ آپ اپنے اندر پلنے والے کسی خوف سے ڈر رہے ہیں۔ ان بزرگ کا خیال ہے آدمی کا آدمی سے ڈرنا ایک ایسی منحوسیت اور بدشگونی ہے جس کے لیے متفکر ہو کر ہر انسان کو اس کے تدارک کے بارے میں کم سے کم سوچتے ضرور رہنا چاہیے۔

لیکن میری مشکل یہ تھی یا یوں کہوں کہ اکثر لوگوں کی شکل میں نے یہ دیکھی ہے کہ وہ خوف کے تدارک کے بارے میں سوچتے بھی رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ لگاتار خوف زدہ بھی رہا کرتے ہیں۔ یعنی نہ خوف زدہ ہونا چھوٹتے ہیں اور نہ خوف کے تدارک کے بارے میں سوچنا ہی ان سے چھوٹتا ہے اور اس طرح اس مسلسل عذاب کو جھیلتے رہنا ان کا مقدّر بن جاتا ہے۔
اُس رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا ——

مشکل سے رات کے دس بجے ہوں گے۔ موسم ابھی بہت سرد تو نہیں ہوا تھا لیکن سڑکوں پر کھُلی ہوا میں نمی موجود تھی۔ جس سڑک سے میں اسکوٹر لیے گزر رہا تھا اس کے دونوں طرف کی دُکانیں تقریباً ایک گھنٹہ قبل بند ہو چکی تھیں اور دکان دار اب تک اپنے گھروں کو پہونچ چکے تھے۔ دکانوں کے درمیان سے پھوٹنے والی گلیاں یا پتلے راستے سنسان ہو چکے تھے۔ ڈامر کی چوڑی سڑک کے چوراہوں پر ٹرافک سگنل بھی بند ہو چکے تھے اور بس ایک زرد روشنی بار بار جل۔بجھ کر آنے جانے والوں کو کراسنگ کی آگاہی دے رہی تھی۔

اگرچہ کوئی غیر معمولی واقعہ میری دانست میں شہر میں نہیں ہوا تھا لیکن واقعوں کو ہوتے اب دیر بھی کتنی لگا کرتی تھی یا لیکن کسی ہنگامے کی صورت میں یہ کیفیت نہ ہوتی، ضرور پولیس کی گاڑیاں بھی بھاگتی دوڑتی دکھائی دیتیں۔!

میں نے ذہن پر زبردست زور دیا کہ سنّاٹے کا سبب کیا ہو سکتا ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تب ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر کوئی چیز دھیرے دھیرے رینگ رہی ہے۔ میں اس رینگن کو پہچانتا تھا اور کئی بار اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ ایسا ہونے پر تھوڑی دیر کے بعد میری آنکھیں پھیل جایا کرتی تھیں اور اندر کے کان گھوڑے کے کانوں کی طرح کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور تھوڑی دیر بعد چہرہ فق ہونے لگتا تھا۔ اگر یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم رہتی تو پھر میرے ساتھ ایک بات اور ہوتی تھی اور وہ تھا ہونٹوں کا بار بار سوکھنا اور دل کا قدرے اونچی آواز میں تیز تیز دھڑکنا۔ میری تشویش دراصل یہ تھی کہ خوف کی ایسی رینگن کے بعد اور جو علامتیں میں نے بیان کیں، ان کے عیاں ہونے کے بعد مجھے ایکا ایک مرگی کا دورہ پڑ جانے کا خطرہ بہت بڑھ جایا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں اسکوٹر چلانا میرے لیے بہت خطرناک تھا کیونکہ دورے کے جھٹکے بس اچانک ہی پڑنا شروع ہو جاتے تھے۔ دراصل سڑک کے سنّاٹے کو محسوس کر کے جو سب سے پہلا خیال دل میں خوف کا پیدا ہوا وہ رہزنی کے واقعات کو لے کر تھا جو آئے دن اخباروں میں چھپتے ہی رہتے تھے۔ فلاں کا اسکوٹر چھین کر لیٹرے بھاگ گئے، فلاں کا یہ ہوا، فلاں کا وہ۔ مجھے لگا کہ یقیناً ایسا راستہ اور ایسی ہی رات اس طرح کے کاموں کے لیے انتہائی مناسب رہتی ہوگی — میں نے ابھی پانچ مہینے قبل ہی نیا اسکوٹر خریدا تھا۔ خریدا کیا تھا دکان سے اٹھایا تھا۔ کیوں کہ اب آسائش کی زیادہ تر چیزیں لوگ یک مشت پیسہ دے کر نہ تو خریدتے ہیں

اور نہ تاجر کو ہی اس نقد پیسہ لے کر فروخت کرنے میں کوئی خوشی ہوتی ہے۔ لہٰذا قسطوں پر اُدھار یہ چیزیں دکان سے اٹھائی جاتی ہیں، کیوں کہ آپ کی ضرورتوں کو فائننس کرنے کی ذمہ داری اب آپ پر نہیں بینکوں اور کمپنیوں پر ہے۔ اس لیے اس اسکوٹر کے بارے میں ہر دم مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خدانخواستہ یہ چوری ہو گیا تو میں جس صورت حال سے گزروں گا وہ کس قدر اندوہناک ہوگی۔ یعنی میں قسطیں بھی ادا کر رہا ہوں گا ایک خیالی اسکوٹر کی اور پیدل بھی چل رہا ہوں گا۔ پھر پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ اپنے اسکوٹر کی رفتار دھیمی کر دی مگر رفتار دھیمی کرنا تھی کہ ایک خدشے نے بہت تیزی سے دماغ پر کھٹ کھٹایا۔ دھیمی رفتار سے اسکوٹر چلانے والوں کو راہ زن آسانی سے قابو میں کر لیتے ہیں۔ لہٰذا میں نے پھر اسکوٹر کی رفتار تیز کر دی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی میری منزل دُور ہے پندرہ بیس منٹ سے پہلے میں اپنی جگہ تک نہیں پہونچ سکوں گا۔

گاڑی کو تیز رفتار بھاگتے دیکھا تو سوچا اگر مجھے مرگی کا دورہ پڑ گیا تو میں اپنی تیز اسکوٹر سنبھالنے سے رہا۔ تیز رفتاری سے گرنے یا ٹکرانے میں مہلک چوٹ بھی لگ سکتی ہے کیونکہ سر پر ہیلمٹ بھی نہیں تھا۔ میں کوئی فیصلہ کرنے کو تھا کہ مجھے کچھ دُور پر اپنی داہنی طرف کی ایک گلی کے دہانے سے نکل کر دو لوگ سڑک پر آتے دکھائی دیئے۔ میرے اندر کوئی شے بہت تیزی سے رینگی اور میرے ہونٹ سوکھنے لگے۔ ابھی میں ان لوگوں سے خاصے فاصلے پر ہی تھا کہ ان میں سے ایک نے مجھے ہاتھ اٹھا کر اور رُکیے رُکیے کی صدا لگا کر روکنا چاہا۔ میں نے دانت بھینچ کر گاڑی اور بھی تیز کر دی۔ لیکن میرا دل اندر سے بلّیوں اچھل رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ آدمی ایک دم سے میرے اوپر چھلانگ لگائے گا، میں اسکوٹر سے زمین پر گروں گا، میرے سر اور ماتھے سے خون بہے گا اور میں اسی حالت میں بے ہوش ہو جاؤں گا اور وہ دونوں میرے اسکوٹر پر بیٹھ کر دیکھتے ہی دیکھتے فرار ہو جائیں گے۔ پھر پتہ نہیں کوئی مجھے اسپتال پہونچائے گا بھی یا نہیں۔ یا میں خون کے ضائع ہو جانے کے سبب صبح تک دم توڑ دوں گا اور تب میرے گھر نہ پہونچنے پر کہرام مچ چکا ہوگا۔

اسکوٹر کی رفتار تیز ہو جانے کے باوجود مجھے روکنے اور پکارنے والے نے امید نہ چھوڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے ہی نکل رہا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ پھر اُچھالتے اور آواز لگاتے سُنا:

"بھائی صاحب — : سُنیئے تو بھائی صاحب ....."

لیکن میں خاصی تیزی سے نکل چکا تھا، اور اپنے پیچھے بھی اس کی آوازیں سُن رہا تھا۔ کافی دُور تک میں ویسے ہی بس چلتا چلا گیا مجھے خوشی ہوئی کہ میں اس راہزن کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ ورنہ اس وقت اس راستے پر اگر وہ لوگ مجھے دبوچ لیتے تو وہاں میری چیخ و پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو بھی وہ میری مدد کو ہرگز نہ آتا — لوگوں نے شاید اس قدر خوف جھیلا ہے یا وہ اتنی بار خوفزدہ کیے جاتے رہے ہیں یا ہوتے رہے ہیں کہ انھوں نے اب دوسروں کی مدد کو پہنچنا بند کر دیا ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ انھوں نے دوسروں کی مدد کرنے والوں کے افسوس ناک انجام کی اتنی بہت سی کہانیاں سُنی ہوئی ہیں کہ دوسرے کی مدد کرنے کا خطرہ اب کوئی اٹھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ اچھا ہی ہوا کہ مجھے کسی کو مدد کے لیے پکارنا نہیں پڑا۔

دوسرے دن کالج میں کلاس روم سے جب اسٹاف روم میں پہنچا تو وہاں کسی ٹیچر نے میرا تعارف اپنے کسی دوست سے کرایا جن کا بیٹا وہاں داخلہ لے رہا تھا اور جس کی فیس جمع کرنے وہ آئے تھے۔ ابھی تعارف مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ صاحب چونکے اور بولے۔

"رات آپ ہی تو اسکوٹر سے جا رہے تھے، جب میں نے آپ کو پکار کر روکنا چاہا تھا۔"

میں اس غیر متوقع حوالے پر چونک پڑا اور ان صاحب کو گھور کر دیکھنے لگا۔

"جی ہاں۔ میری یادداشت اگر غلط نہیں ہے تو وہ آپ ہی تھے"

وہ پورے اعتماد سے پھر بولے۔

مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

"جی ہاں۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے کہ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہ میں ہی تھا۔" وہ جلدی سے بولے۔ "میری والدہ دل کی مریضہ ہیں، ڈاکٹر انہیں اس وقت زندگی بچانے والا ایک انجکشن فوری طور پر دینا چاہ رہا تھا۔ میری اسکوٹر خراب تھی۔ پڑوس والوں کے لئے میں

اجنبی ہوں کیوں کہ ایک ہی روز پہلے اس مکان کو کرائے پر لیا ہے کراچی ٹرانسفر پر آیا ہوں، سوچا کسی کی لفٹ لے کر چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس کو تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد مجھ میں بہر حال یہ بے یقینی قائم رہی کہ والدہ کی بیماری کی جو کہانی اس نے سنائی تھی وہ بالکل بے بنیاد تھی۔ میرے اندر کے شدید خوف نے میری رہبری کرتے ہوئے یہ یقین بھی میرے اندر پختہ کرا دیا کہ ہو نہ ہو، دن میں شرافت کی زندگی گزارنے والا اور بہ ظاہر کوئی باعزت ملازمت کرنے والا وہ اجنبی رات کے سناٹے میں رہزنی کے کام بھی کرتا ہوگا۔ کیوں کہ ملاقات کے وقت جو لباس وہ پہنے تھا اور اس کے پیروں میں جو جوتے تھے اور گلے میں جو موٹی سی سونے کی زنجیر تھی وہ سب متوسط نوکری پیشہ والے کے پاس آج کل ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لیے یقیناً وہ آدمی راتوں کو ایسی لوٹ مار ہی کرتا ہوگا، اور والدہ کی بیماری اور انجکشن کی کہانی گڑھ لی ہوگی۔

جب مجھے روایت کرنے والے بزرگ نے یہ بتایا تھا کہ آدمی کا آدمی سے ڈرنا بہت بڑی منحوسیت اور بدشگونی کی نشانی ہے، تو یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اس سنسان رات کے واقعے اور پھر اس آدمی سے اسٹاف روم میں ملاقات کے سانحے کے بعد ایک دن مجھے لگا کہ یہی صورت کل میرے ساتھ بھی ہو سکتی ہے، یعنی وہ آدمی اسکوٹر پر ہو اور میں اسے پکار کر روکنا چاہ رہا ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم آدمی سے راہزن میں منقلب ہو چکے ہیں۔ یعنی ہمارے اندر کا خوف ہمارے ہم جنسوں کو جس شکل اور ہیبت میں چاہے تبدیل کر سکتا ہے اور ہم اس واہمے کو اپنے کندھوں پر لادے لادے حقیقتوں کو شرمسار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح اگر دس میں سے دو لوگ بھی ایک دوسرے سے خائف ہیں تو وہ اپنے اس خوف کے سبب باقی لوگوں کو بھی انسان کے علاوہ کچھ اور سمجھنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ یعنی کسی کو کتا کسی کو سؤر اور کسی کو بھیڑیا مان سکتے ہیں۔ اس لیے یقیناً یہ بڑی منحوسیت کی بات ہوگی کہ میں اپنے پڑوسی کو، جو مجھے اٹھتے بیٹھتے انسان سمجھ رہا ہے یا انسان جیسا سمجھ رہا ہے، اپنے خوف کے سبب اسے انسان کے بجائے کتا سمجھتا رہوں اور اسے دھتکاروں، کبھی لات ماروں اور جب وہ میرے اس برتاؤ پر مزاحمت کرتے ہوئے انسانیت کے اندر رہ کر اپنی شکایت کا اظہار کرے تو بھی میں یہی یقین کرتا رہوں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ جھوٹ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ آدمی نہیں بلکہ کتا ہے۔

پھر یہ ہوا کہ ویسی ہی ایک اور سنسان رات آئی، میں ایک بار پھر سڑک پر اپنے اسکوٹر کے ساتھ جا رہا تھا کہ یکایک اسکوٹر کا انجن بند ہو گیا۔ میں اسکوٹر سے اترا، جلدی جلدی پیر مار کر انجن پھر چلایا لیکن دس قدم چلنے کے بعد انجن پھر بند ہو گیا۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ سڑک پر واقعی کتے لوٹ رہے تھے۔ میرے بدن میں وہی رینگن شروع ہو گئی۔ اندر کے کان گھوڑے کے کانوں کی طرح کھڑے ہونے لگے اور آنکھیں پھیلنے لگیں۔ تب ہی یہ انکشاف ہوا کہ اسکوٹر میں پٹرول ختم ہو چکا تھا اور اس جگہ سے پٹرول پمپ تقریباً ڈھائی کلومیٹر تو ہوگا ہی۔ میں نے پیدل گاڑی کھینچنے کی کوشش کی کیونکہ وہ ایسا علاقہ تھا جہاں میں کسی جگہ گاڑی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اب دماغ نے ذرا تیزی کے ساتھ چلنا بھی شروع کر دیا تھا۔ رات میں خاص طور پر گاڑی میں پٹرول کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ گاڑی کھینچتے کھینچتے ذرا دیر میں ہی ہاتھ پیر شل ہو جائیں گے، ایسی صورت میں کوئی بھی دو دھپ مار کر گاڑی چھین کر بھاگ سکتا ہے۔

میں گاڑی کھینچتا ہوا جا ہی رہا تھا کہ مجھے ایک تانگہ پیچھے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس میں صرف تانگے والا ہی تھا۔ میں نے اس سے اسکوٹر لاد کر پٹرول پمپ تک پہونچانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ویسے تانگے والا خاصا ضعیف بھی تھا اور لاغر بھی۔ میں پھر اسکوٹر گھسیٹنے لگا۔ دو ایک اسکوٹر سوار بھی گزرے۔ انھوں نے مجھے اسکوٹر کھینچتے ہوئے دیکھا بھی۔ میں نے بھی انھیں پکار کر روکنا چاہا کہ ذرا سا پٹرول مل جائے تو میں پٹرول پمپ تک پہونچ جاؤں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ کیوں رکتے۔ کیونکہ میرے بارے میں وہ بھی پہلے ہی کوئی یقین کر چکے ہوں گے۔ اور میں ان کو اس کے مطابق انسان نہ دکھائی دے کر شاید تیندوا دکھائی دینے لگا ہوں — یا کچھ اور —

تب ہی اپنے سامنے کی طرف سے مجھے ایک اسکوٹر آتا دکھائی دیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ میرے قریب پہونچ کر دھیما ہونے لگا۔

اسکوٹر سوار ہلمٹ پہنے تھا۔ میرے پاس آکر اس نے اسکوٹر روک دیا اور بولا۔

"کیا پرابلم ہے ۔۔۔ ؟" اس کے سوال کرنے پر اس کی آواز سے اس کی صنف کا پتہ چلا۔ وہ کوئی عورت تھی ۔ یہ جان کر کہ وہ کوئی خاتون ہے میری فکر میں کچھ کمی آئی ۔ میں ہانپتے ہوئے بولا۔

"پٹرول ختم ہوگیا۔"

"ٹھہریئے ۔ میں دیتی ہوں۔"

اس خاتون نے اپنی گاڑی جو اب صاف طور پر نظر آرہی تھی اور جو اسکوٹر نہ ہوکر موپیڈ تھی، اطمینان سے میری گاڑی کے قریب ہی کھڑی کردی اور اس کے ایسا کرتے ہی میری فکر جو ابھی ایک لمحہ پہلے کم ہوئی تھی ایک دم سے پھر بڑھ گئی اور ایک طرح کی تشویش سر اٹھانے لگی کہ خاتون ہوکر اس سنسان راستے میں اور اتنی رات میں آخر اس نے اپنی گاڑی کیوں روکی اور ایک اجنبی سے کہ جس کو اس نے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں، گاڑی سے اتر کر کیوں مخاطب ہوئی۔ تب ہی وہ بولی ۔۔۔

" ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری گاڑی کا پٹرول بھی ختم ہوگیا تھا میں بھی اسے کھینچ کر لارہی تھی کہ کسی اسکوٹر والے نے رُک کر میری مدد کی اور کوئی آدھا لیٹر پٹرول اس نے میری گاڑی میں ڈال دیا۔ اس میں سے آدھا آپ لے لیں۔"

میری ڈکی میں تیل کی پیمائش والا پلاسٹک کا بیکر پڑا تھا۔ وہ اس کو نکال کر دیا اور بڑی تیکھی نظروں سے سوال کیا۔

"آپ اتنی رات کو اکیلی کہاں جارہی ہیں" ؟

" میں ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں نرس ہوں، ڈیوٹی ختم کرکے گھر جارہی ہوں۔ کسی نے میری گاڑی کا پٹرول لگتا ہے چرالیا۔"

مجھے پٹرول مہیا کرکے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مجھے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ مگر جس ساعت مجھے یہ کام کرنا چاہیے تھا، اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت دراصل کوئی آوارہ عورت ہے جو ایسے وقت میں اپنے شکار کی تلاش میں نکلی تھی۔ وہ تو میں ہی ایسی تیوریاں چڑھائے رہا ورنہ وہ جلد ہی مجھے پٹانے کے لیے اپنا داؤں ضرور چلاتی۔ بہانہ اتنا اچھا بنایا کہ شریف آدمی کچھ اور سمجھ ہی نہ سکے۔ میں نے اسکوٹر کا انجن اسٹارٹ کیا اور سیدھا پٹرول پمپ پر جاکر رُکا۔

اُس رات کو گزرے ہوئے عرصہ ہوچکا ہے۔ میں اپنے دل میں اکثر یہ سوال کرتا رہتا ہوں کہ اس عورت نے ذرا دیر ٹھہر کر اپنے مانگے کے پٹرول سے آدھا پٹرول خاص طور پر نکال کر دینے کے بعد مجھے تقریباً دو کلومیٹر اسکوٹر کو کھینچ کر لے جانے اور اس محنت سے ہلکان ہونے سے کیا بچا نہیں لیا تھا، تو مجھے میرے اندر سے جواب یہ ملتا ہے کہ میاں تم خوش قسمت تھے کہ عورت تم پر اپنے ڈورے ڈالنے میں کامیاب نہ ہوسکی ورنہ اگر وہ تم کو اپنے جنگل میں پھنسا لیتی تو وہ پہلے تمہارا پرس خالی کراتی اس کے بعد تم کو کوئی مہلک بیماری پکڑاکر اپنی خواب گاہ سے دھکے دے کر نکال دیتی باہر ۔۔۔ پھر تم کھٹیا پکڑ لیتے اور آہستہ آہستہ گھل گھل کر اسپتال کے کسی وارڈ میں مر جاتے ۔

میرے بزرگ ہادی نے جس دن آخری بار مجھ سے خوف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اس روز ان کے سامنے ملک کے مختلف روزناموں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ ان اخباروں کو اچھال اچھال کر بھرے گلے سے کہہ رہے تھے :

" سیکڑوں ٹن خوف روزانہ ان اخباروں میں چھپتا ہے ۔۔۔ اور بے یقینی کے بے حساب جنگل دفتروں، گھروں، سڑکوں اور جلسہ گاہوں میں اگا ملتا ہے۔ آدمی کا آدمی پر یقین چھن جاتا ہے اور سب اپنے اپنے بچاؤ میں اپنی اپنی بے یقینی کی چھتوں کے نیچے سر چھپانے کو دوڑ پڑتے ہیں دیکھو تم کبھی نہ ڈرنا۔ اور اگر ڈرنا تو اس خوف کے تدارک کے بارے میں سب سے پہلے سوچنا۔"

وہ بزرگ ہادی اب بہت دنوں سے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے لوگوں کو ہدایت دینے کہیں اور نکل گیا ہو یا کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہو یا پھر گوشہ نشینی اختیار کرچکا ہو۔ اگر وہ مل جاتا تو میں اسے بتا دیتا کہ ان دنوں میں پھر بہت ڈر رہا ہوں بلکہ روز ہی کئی بار ڈرتا رہتا ہوں ۔ اور یہ بھی سوچتا رہتا ہوں کہ خوف کا تدارک ہونا چاہیے کہ بقول میرے ہادی یہ بہت ضروری کام ہے ۔۔۔ پس میں ڈرتا بھی رہتا ہوں اور ڈر کے تدارک کے بارے میں سوچتا بھی رہتا ہوں ۔

□□

غزل

جلانے کو تو اک شعلہ بہت ہے
نشیمن اب مگر اونچا بہت ہے
میں اب کھو جاؤں گا گمنامیوں میں
کہ میرے نام کا چرچا بہت ہے
ادھر سب خیریت ہے میرے گھر میں
پڑوسی سوچ کر جلتا بہت ہے
تم اس کے سامنے آئینہ رکھ دو
اسے سچائی کا دعوا بہت ہے
ترابی آج بھی دنیا میں ہر سو
لہو پانی سے بھی سستا بہت ہے

مظفر سلطان حسن ترابی
گورنمنٹ انٹر کالج،
مراد آباد ۲۴۴۰۰۱

جو ہماری زندگی میں آ کے کانٹے بو گئے
بھیڑ میں دنیا کی جانے اب کہاں وہ کھو گئے
پیڑ کا سایہ ملا، یا دھوپ سے تپتی زمیں
جس جگہ بھی ہم کو نیند آئی وہیں ہم سو گئے
گاؤں کی دلکش فضائیں اب نہیں مل پائینگی
شہر کی اس بھیڑ میں آ کر کہاں ہم کھو گئے
ہم تو بس چشم محبت کے سدا شیدا رہے
جس سے ہم نے پیار پایا ہم اسی کے ہو گئے
اے سلیماں اس لیے ہر پھول سی دلکش حیات
کوئی اب اپنا ہوا ہم بھی کسی کے ہو گئے

سلیمان صدیقی
"آشیانہ" سی-۲۱۱، راجہ جی پورم
لکھنؤ- ۲۲۶۰۱۷

بات کہنے کی کیا نہیں ہوتی
جو زباں سے ادا نہیں ہوتی
دل کا شیشہ بھی کیسا شیشہ ہے
ٹوٹتا ہے صدا نہیں ہوتی
اس کی عزت کوئی نہیں کرتا
جس میں شرم و حیا نہیں ہوتی
آئینہ رکھ کے روبرو دیکھو
آئینے سے خطا نہیں ہوتی
اے نسیم اپنے دل کو سمجھاؤ
اچھی صورت بلا نہیں ہوتی

نسیم واسطی
واسطی ہاؤس ۔ مفتی محلہ
جونپور

فرازِ عرش پہ پہنچا صدا تحریک کی اپنی
صلیب و دار تک محدود مت کر زندگی اپنی
جنوں کی راہ سے برگشتگی تذلیل الفت ہے
اسی کی نذر کر دے سارے غم ساری خوشی اپنی
میں ایسے کھا رہا ہوں ٹھوکریں تیرے تجسس میں
کہ جیسے راہ کوئی بھول جائے اجنبی اپنی
ہے کچھ ایسی ہی مجبوری جو آیا ہوں یہاں ورنہ
ترے دریا کو ٹھوکر مار دیتی تشنگی اپنی
سحر ہوتے اتر جائیں گے چہرے آسمانوں کے
لیے پھرتا ہے گا چاند کب تک چاندنی اپنی

احسن رضوی جونپوری
شعبۂ اردو ۔ لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

شاہدہ صدیقی
بی-۱۵۰/۱، آر ڈی ایس او، لکھنؤ

بھارت چھوڑو تحریک

ہندستان ایک وسیع و عریض ملک ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال بھی۔ یہی وجہ رہی کہ ہندستان بیرونی لوگوں کی دلچسپی کا مرکز رہا اس لیے یہاں آریہ بھی آئے، ایرانی بھی، کشان بھی، یونان بھی، ہُن بھی پھر سلسلہ شروع ہوا ترکوں کا، افغانوں کا اور منگولوں کے آنے کا۔

آگے چل کر یورپ میں ہوئے صنعتی انقلاب نے پرتگال، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس کے باشندوں کو بھی اس ملک کی طرف راغب کیا۔

یوروپین یوں تو ہندستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے لیکن یہاں کے کمزور حکمرانوں اور سیاسی انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ یہاں کے اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگے اور اس طرح تاجر تاجدار بننے کی کوشش میں لگ گئے۔

ہندستان میں یوروپین افراد کی آمد کا سلسلہ ویسے تو پندرہویں صدی کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا کیونکہ اکبر کے زمانے میں ہی انگریزوں نے یہاں نیل کی کھیتی کرنے کی اجازت حاصل کرنی چاہی تھی۔ دور اندیش بادشاہ اکبر نے اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اجازت دینے سے انکار کر دیا مگر آگے چل کر ۱۶۰۰ء میں سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈال ہی دی گئی۔

اسی طرح جہانگیر کے دربار میں سر ٹامس رو اور پھر کیپٹن ہاکنس سفیر کی حیثیت سے رہنے لگے۔ اورنگ زیب نے یوروپین افراد کو ہندستان سے نکال دیا لیکن انگریزوں نے اورنگ زیب کے بعد بنگال کے نواب سراج الدولہ کی نااہلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ پھر بکسر کی لڑائی جیت کر ۱۷۶۴ء میں بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر کے کلائیو نے وہاں پر دوہری حکومت قائم کی اور وہاں اپنی معاشی حیثیت کو مستحکم کیا۔

ہندستان کے سیاسی حالات میں اس طرح کی انگریزوں کی دخل اندازی کو یہاں کے دلیر اور جانباز ٹیپو سلطان جیسے محبّان وطن برداشت نہ کر سکے اور یہاں موجود انگریزوں کو ہندستان سے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے لیکن کچھ غدّار ساتھیوں کی وجہ سے وہ اپنی قربانی دے کر بھی انھیں یہاں سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

سلطان ٹیپو کی شروع کی ہوئی اس تحریک آزادی نے زور پکڑا اور پہلی جنگ آزادی میں متعدد جاں فروشوں نے بھی ٹیپو سلطان کی طرح ہی اپنی جانیں نثار کیں لیکن افسوس کہ وہ اس کے باوجود اپنے مقصد کو نہ پہنچ سکے۔

انگریزوں کی آمد سے ہی انھیں یہاں سے نکالنے کی کوششیں شروع ہو گئیں اور یہ کوششیں مسلسل جاری رہیں کیونکہ امن پسند ہندستانی بھی آخر کب تک خاموش تماشائی بنے رہتے۔ اس لیے متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے۔ ضروری نہیں کہ کامیابی پہلی مرتبہ میں ہی حاصل ہو جائے اس لیے ۱۸۵۷ء کی ناکامی سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے پھر متحد ہو کر ایک نئے جوش، نئے ولولے، نئے عزم کے ساتھ ملک کو آزاد کرانے کی جدّوجہد میں لگ گئے۔

دوسری طرف انگریزوں نے ہندستانیوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اور انھیں سرکاری سہولتیں دینے کے لیے ۱۹۳۵ء میں ایک ایکٹ پاس کیا۔ جس کے مطابق ۱۹۳۷ء میں انتخابات ہوئے اور کانگریس کو ۱۱ میں سے ۸ صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور کانگریس نے وہاں اپنی وزارت قائم کر لی۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء شروع ہونے

پھر وائسرائے لارڈ لنلتھگو (Lord Linlithgo) نے ہندستان کی سیاسی پارٹیوں سے پوچھے بغیر ہی اعلان کردیا کہ ہندستان بھی اس جنگ میں شامل ہے۔ اس اعلان سے کانگریسیوں میں بے چینی پھیل گئی۔ سبھی کانگریسیوں نے اپنی اپنی وزارت سے استعفے دے دئے جس سے بھارت کے جمہوری عمل میں رکاوٹ آئی جسے ختم کرنے کے لیے اگست ۱۹۴۰ء میں وائسرائے نے اعلان جاری کیا جو اگست آفر (August offer) کے نام سے مشہور ہے جس کی مخالفت کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ہندستان کو اپنی خواہشوں کا غلام سمجھتی ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ "اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستان میں جمہوریت قائم نہیں ہوسکتی کیونکہ انگریز اس کے مخالف ہیں۔ روٹی مانگنے پر کانگریس کو پتھر ملا"۔ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کا خیال تھا کہ انگریزوں کی قدیم و جدید پالیسی میں کوئی فرق نہیں ہے"۔

ان حالات میں دونوں پارٹیوں میں سمجھوتہ ہونا ممکن نہ تھا کیوں کہ کانگریس کی مانگوں اور سرکاری پیش کش میں کافی فرق تھا۔ چرچل کسی بھی حالت میں انگلینڈ کے مقبوضہ علاقوں سے اپنا قبضہ چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ دوسرا سے ہندستانی لیڈروں پر اعتماد بھی نہیں تھا۔ وہ فرقہ وارانہ خیالات کو ہوا دے کر کانگریس کی مانگوں کو ٹھکرانے کا حامی تھا۔ اس لیے اس نے کانگریس کی پیش کش کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔

۱۹۴۲ء میں کرپس مشن کی ناکامی کے بعد ہندستان کے سبھی قومی لیڈروں کو احساس ہوگیا کہ انگریز ہندستان کو آزاد کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب India wins Freedom میں لکھا ہے کہ ہندستان اور کرپس کے بیچ جو لمبی بات چیت چلی وہ دنیا کو یہ دکھانے کے لیے تھی کہ کانگریس ہندستان کی سچی رہنما پارٹی نہیں ہے بلکہ ہندستان میں نفاق کی اصل وجہ وہی ہے۔ اس لیے انگریز اسے اقتدار دینے کے حق میں نہیں ہیں۔

انگریزوں نے ہندستان کے مسائل سلجھانے کی کوششیں صرف دکھانے کے لیے کیں یہاں تک کہ مشن کی ناکامی کی ذمہ داری بھی ہندستانیوں پر ہی تھوپنے کی کوشش کی جس سے سارے ہندستان میں بے چینی پھیل گئی۔

دوسری طرف جاپان بڑی تیزی سے ہندستان کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے بارے میں کانگریس کا خیال تھا کہ بھارت پر جاپانی حملہ کے ذمہ دار انگریز ہیں۔ اگر وہ یہاں قابض نہ ہوتے تو جاپان کبھی حملہ نہ کرتا۔

جاپانی حملے کی مخالفت میں کانگریس ایک تنظیم قائم کرنا چاہتی تھی لیکن برٹش سرکار نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندستان کے مفاد، انگریزوں کی حفاظت اور امن عالم کا تقاضا ہے کہ انگریز ہندستان پر اپنے قبضے سے دستبردار ہوجائیں

ڈاکٹر امبا پرشاد کے خیال میں گاندھی جی کو کامل یقین تھا کہ انگریز جاپان سے بھارت کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ یہ یقین اس وقت اور مستحکم ہوگیا جب انگریزوں نے جاپانیوں کے لیے ملایا، سنگاپور اور برما خالی کر دیے۔

گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں "بھارت چھوڑو" خیال کو جنم دیا اور ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو واردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے "بھارت چھوڑو تحریک" کی قرارداد پاس کی۔ ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس اعلا کمان (مہا سمیتی) کی بیٹھک بمبئی میں ہوئی۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے گاندھی جی نے اپنی تاریخی تجویز پیش کی اور نعرہ دیا،

"بھارت چھوڑو" (Quit India)

اور انگریزوں کو بھارت چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے ترک موالات (Non Co-operation) شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

گاندھی جی نے کہا کہ ہم نے کانگریس کو داؤں پر لگادیا ہے یا تو وہ کامیاب ہوگی، ورنہ ختم ہوجائے گی۔ آزادی کے لیے یہ ہماری آخری جد وجہد ہوگی۔ اس لیے قومی سطح پر انقلاب کی تیاریاں ہونے لگیں جسے شروع کرنے سے پہلے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس انقلاب کے بارے میں بابو راجندر پرشاد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس بار ہمیں گولیوں اور توپوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ نہرو جی نے اس تحریک کے بارے میں کہا کہ ہم آگ سے کھیلنے جا رہے ہیں۔

کانگریسیوں کی اس تحریک سے گورنمنٹ کو بڑی تشویش ہوئی اس لیے ۹ اگست کو صبح ہی سرکار نے اسے غیر قانونی قرار دے دیا اور سبھی ریکارڈ سیل کر کے دفتر کو بند کر دیا۔ کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کو قید کر لیا۔ مہاتما گاندھی کو پونا کے آغا خاں پیلس میں نظر بند کر دیا۔ باقی لیڈروں کو احمد نگر قلعہ میں بھیج دیا۔ اس کے علاوہ ہزاروں کانگریسیوں کو جیل میں ڈال دیا۔ سارے ہندستان میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسا کر کے گورنمنٹ نے بغاوت کی آگ کو مزید ہوا دی کیونکہ لیڈروں کی گرفتاری سے عوام میں انتشار پیدا ہو گیا۔

بھارت چھوڑو کا نعرہ ہر گلی، کوچہ ہر شہر یعنی پورے ملک میں گونجنے لگا نتیجتاً جگہ جگہ ہڑتالیں، میٹنگیں ہونے لگیں، جلوس نکالے جانے لگے۔ اسکول، کالج، کارخانے بند ہو گئے۔ طلبا نے اس تحریک کو اور جلا بخشی۔ خواتین نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مزدور بھی اس تحریک میں پہلی بار شامل ہوئے۔

اس جوشیلی تحریک کو دبانے کے لیے سرکار نے لاٹھی چارج کیا پولیس اور فوج نے گولیاں چلائیں جس میں ایک ہزار کے قریب لوگ مارے گئے۔ ۱۶۰۰ کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے جس سے عوام اور مشتعل ہو گئے اور تشدّد کی طرف مائل ہوئے۔

اتر پردیش کے بلیا اور مہاراشٹر کے ستارا ضلع میں اس تحریک نے بہت زور پکڑا۔ اتر پردیش میں تو ایک بڑے حصّے کو آزاد قرار دے کر ایک عارضی سرکار بھی قائم کر لی گئی۔

تشدّد کے زیر اثر سرکاری عمارتیں جیسے تھانے، ڈاکخانے، ریلوے اسٹیشن وغیرہ جلا دیے گئے۔ ٹیلی فون، ٹیلی گراف کے تار کاٹ دئے گئے۔ سب سے زیادہ نقصان اودھ ترہٹ ریلوے کو پہنچا (یہ ریلوے لائن اتر پردیش سے آسام تک جاتی تھی)

ان تخریبی کاموں کو روکنے کے لیے برٹش سرکار نے بڑی بے رحمی کے اقدامات اٹھائے، عوام کو کچلنے کے لیے تین ماہ تک یہ کوششیں جاری رہیں کر بڑی مشکل سے انھوں نے اس انقلاب پر قابو پایا۔

اگست ۱۹۴۲ء کی اس تحریک کے بارے میں ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا کہنا ہے کہ یہ تحریک گورنمنٹ کے بے رحم اور سفاکانہ ظلم

حکومت کے خلاف عوام کی ایک ایسی بغاوت تھی جس کی مثال فرانس کے بیسٹیل کے زوال یا روس کے اکتوبر انقلاب سے دی جا سکتی ہے اس میں تشدّد یا عدم تشدّد کا سنگم تھا جسے انگریز حکومت کے خلاف نفرت نے اور بڑھاوا دیا۔

سوشلسٹ پارٹی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا، شریمتی ارونا آصف علی نے انگریزی حکومت کو اکھاڑنے کے لیے خفیہ طریقے سے منصوبے بنائے۔ جے پرکاش نرائن ہزاری باغ جیل سے فرار ہو گئے۔ جنھیں بعد میں لاہور کے قریب گرفتار کر لیا گیا جنھیں جیل میں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔

اس تحریک کے دوران ہونے والی تشدّد آمیز کارروائی کے لیے برٹش سرکار نے گاندھی جی اور کانگریس کو اس کا ذمّہ دار ٹھہرایا گاندھی جی کو ایسی تخریبی کارروائیوں نے بہت دکھ پہنچایا۔ انھوں نے پونہ جیل میں ۲۱ دن کا برت رکھنے کا ارادہ کیا جسے انھوں نے ۱۰ فروری ۱۹۴۳ء کو شروع کیا۔ ۱۳ دن بعد ان کی حالت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ۲۴ گھنٹے کے اندر انھیں رہا کرنے کی صلاح دی۔ اس کے لیے وائسرائے نے Executive council کی میٹنگ بلائی جس کے زیادہ تر ممبر گاندھی جی کی رہائی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے ملک کے سکون کے درہم برہم ہونے کا خطرہ ہے لیکن گورنمنٹ گاندھی جی کو اس شرط پر رہا کرنے کو تیار تھی کہ وہ "بھارت چھوڑو" تحریک واپس لے لیں اور اپنی غلطی مان لیں۔ گاندھی جی کے لیے یہ امتحان کی گھڑی تھی کیونکہ ایسا کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

لارڈ لن لتھ گو کے واپس چلے جانے کے بعد لارڈ واویل بھارت کے وائسرائے بنے۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں جب گاندھی جی کی حالت بہت خراب ہو گئی تو ۶ مئی ۱۹۴۴ء کو لارڈ واویل نے انھیں رہا کر دیا۔

"بھارت چھوڑو" تحریک نے عوام میں بہت جوش بھر دیا تھا کیونکہ یہ تحریک ہندستان کو آزاد کرانے کی عوام کی آخری کوشش تھی جسے انگریزی حکومت نے کچلنے کی پوری کوشش کی

اس تحریک کی ناکامی کے لیے [illegible]

۱. تحریک کے رہنماؤں کی گرفتاریاں۔
۲. انگریزی سرکار کا زیادہ طاقتور ہونا۔
۳. ہندستانی سرکاری افسروں کی برٹش حکومت کے لیے وفاداری
۴. دوسری طرف برٹش سرکار کے پاس انقلابیوں کو کچلنے کی تمام سہولیات مہیا تھیں۔ جیسے ان کے پاس پولیس اور فوج کی وفاداری تھی۔ جاسوسوں کی انقلابیوں پر کڑی نظریں تھیں۔

تحریک کے رہنماؤں کی گرفتاری کی وجہ سے عوام کو راہ بتانے والا اور اس آندولن کو آگے بڑھانے والا کوئی نہیں رہا۔

یہاں تک کہ وہ کتابیں بھی ضبط کرلی گئیں جس میں اس تحریک سے متعلق ۱۲ تحریریں لکھی تھیں۔

گاندھی جی کا مقصد (اس آندولن کے ذریعہ) برٹش حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا تاکہ وہ بات چیت پر آمادہ ہوجائے۔ گاندھی جی نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ برٹش حکومت انھیں گرفتار کرے گی۔

۱۹۴۲ء کا یہ آندولن بہت اہم تھا جس میں سرکار کو کئی بار سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔ پھر بھی اس ملک کے لیڈروں نے انقلاب کی مشعل کو روشن کیے رکھا۔ غرضکہ اس تحریک نے ۱۹۴۷ء کے آزاد ہندستان کا پس منظر تیار کیا۔

اس تحریک نے ساری دنیا میں انگریزوں کی دوغلی پالیسی واضح کردی روز ویلٹ اور چیانگ کائی شیک نے ہندستان کی آزادی کی حمایت کی۔ غرضکہ "بھارت چھوڑو" تحریک ایک بہت ہی اہم تحریک تھی

ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے مطابق اس انقلاب کی آگ میں سامراجیت جل گئی۔ اس تحریک کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے برٹش حکومت کو اعتراف ہوگیا کہ ہندستان زیادہ دیر تک اپنی غلامی میں نہیں رکھا جاسکتا۔

اس لیے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ دن آہی گیا جس کا انتظار ہر ہندستانی کو تھا۔ □□

رام لعل میری نظر میں —— صفحہ ۲۷ کا بقیہ

حواشی: ۱؎ دریچوں میں رکھے چراغ (از رام لعل) لکھنؤ ۱۹۹۱ء

۲؎ رام لعل: شخصیت اور بساطِ فکر و فن (از خان فہیم ایڈیٹر لمحے لمحے) بدایوں ۱۹۹۴ء

۳؎ کوچۂ قاتل (خود نوشت سوانح حیات حصّہ اول از رام لعل) لکھنؤ ۱۹۹۴ء ص ۲۶

۴؎ میرا برسوں پرانا ساتھی: از بشیشر پردیپ۔ مشمولہ ہفتہ وار جدید مرکز لکھنؤ (۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء) ص ۱۰

۵؎ رام لعل کے شب و روز۔ مرتب ہما جمال رضوی۔ لکھنؤ ۱۹۹۶ء۔ ص ۴۴

۶؎ باقی سوالات۔ مرتب صبیحہ انور۔ لکھنؤ ۱۹۹۰ء ص ۱۴۸ (اختصار میں سوالات)

۷؎ ماسکو یاترا۔ از رام لعل۔ لکھنؤ ۱۹۹۰ء ص ۵۴

۸؎ رام لعل: فن اور شخصیت۔ مرتب نریندر ناتھ سوز۔ سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۱۹۸۵ء۔ ص ۱۵۴ ۹؎ ایضاً ص ۱۵۵

۱۰؎ M. Satyanaraina, The Place and Position of a Link Language in the Multilingual set-up of India. (M.G.M. Research Centre, Bombay, 1977)

جل رہے ہیں جس میں کل اس دھوپ پر چھائے تھے ہم
آج سائے کو ترستے ہیں کبھی سائے تھے ہم
پتھرو! تم مل گئے رہ ہم کو، تمہارا شکریہ!
تم نہ تھے تو اپنی پرچھائیں سے ٹکرائے تھے ہم
یاد یہ تصویر تو لائی کہاں سے، یہ بتا!
یہ تو ماضی کے سمندر میں بہا آئے تھے ہم
ایک دن یہ ہے کہ ہر رائے مخالف ہے جمیل
ایک وہ بھی وقت تھا ہر شخص کی رائے تھے ہم

جمیل دوشی

۱۰ ایس ڈی کارک وبھاگ پھولبیلہ لکھنؤ

قطعہ

بادۂ عشق تپنے لگا ہے
دل انھیں یاد کرنے لگا ہے
رنگِ افواہ اترنے لگا ہے
چار جانب ہے اغیار عمرؔ جی!

اختر عمر اختر
۱۴۸/۳۳۵ - محمود نگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "اُردو نقاد کی حیثیت سے فراق کا تنقیدی جائزہ"
مصنف: ڈاکٹر مہتاب عالم قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ
(۱) نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ۔ امین آباد لکھنؤ
(۲) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی

فراق کی شاعری پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان کی تنقیدی تحریروں پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ویسے بھی فراق کی شاعرانہ عظمت نے ان کی تنقید کو دبا رکھا ہے۔ چند ایک کے سوا کسی نے ان کے تنقیدی مضامین کے بارے میں وہ رویہ بھی نہیں اختیار کیا جس سے فراق کا بحیثیت تنقید نگار تجزیہ کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر مہتاب عالم نے اپنے تحقیقی مقالہ میں فراق کی تنقید کو موضوع بنا کر ان رجحانات کا جائزہ لیا ہے جو فراق کی تنقید اور ان کی نقادانہ صلاحیتوں کا معیار ہیں۔

اردو تنقید کے ارتقا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ تنقید تک آتے آتے اس میں کیا کیا رد و قبول کے ادوار گزرے ہیں۔ فراق کے عہد میں تنقید کے معیار وہ نہیں تھے جو آج ہیں، لیکن فراق نے اپنے عہد میں جس طرح کی تنقید کی ہے اس سے ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے علاوہ یہ بات بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اگر وہ تنقید پر کچھ اور توجہ دیتے تو ایک منفرد و ممتاز تنقید نگار بھی ہو سکتے تھے۔ فراق نے جس طرح مختلف زبانوں کے ادب سے واقفیت کی بنا پر اپنی شاعری میں آفاقیت کے رنگ بھرے ہیں وہ ان کی تنقید میں بھی نمایاں ہیں۔ خاص کر انگریزی ادب کے اثرات سے ان کی شاعری اور تنقید میں تہذیب نظر اور زندگی کے خوش گوار پہلو ایک حسین امتزاج کے ساتھ اُبھر کر ان کے ذہنی رویوں کی شناخت کرتے نظر آتے ہیں۔ فراق چاہے اپنے معاصرین سے ادبی معرکے ہوں یا مصحفی، حالی اور داغ کی شاعری پر ناقدانہ نظر۔ وہ ہر جگہ کچھ ایسے نہاں خانوں کو تلاش کر لیتے ہیں جو دوسروں کی نظر سے اوجھل نہ ہوتے ہوئے بھی اوجھل تھے۔

ڈاکٹر مہتاب عالم نے فراق کے عہد اور اس کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے تنقیدی کارناموں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے فراق نے تنقید کو جو کچھ دیا ہے اس کا تجزیہ کر کے ڈاکٹر مہتاب عالم تنقید کے اس باب کو روبرو لے آئے ہیں جسے پڑھنے والوں نے اکثر پڑھ کے چھوڑ دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ تنقید اسے کس طرح قبول کرتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر مہتاب عالم نے جس طرح اس پر توجہ دی اور فراق کی تنقید کو موضوع بنایا وہ لائق ستائش ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پڑھ کر فراق کے تنقیدی شعور سے ضرور لطف اندوز ہوں گے کیوں کہ یہ تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ ایک شاعر کے خود اپنے تنقیدی تاثرات کی شناخت ہے۔

——— وقار ناصری

نام کتاب: "بالمشافہ"
مصنف: معصوم مرادآبادی قیمت: ۶۰/- روپے
ملنے کا پتہ: خبردار پبلی کیشنز۔ ۱۶۱۴ اے مٹیا محل جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

معصوم مرادآبادی ایک ہونہار صحافی ہیں اور اُردو کے اُبھرتے ہوئے صحافیوں میں انھوں نے اپنا مقام بنا لیا ہے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کے آغاز میں کئی کثیر الاشاعت ہفتہ وار اخبارات میں مختلف نوعیت کی خدمات انجام دی ہیں اسی دوران انھوں نے ملک کی مقتدر شخصیتوں سے انٹرویو لیے ان میں ادیب و شاعر، سیاست داں اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں اہم مقام رکھنے والے شامل تھے۔ اب ان میں سے بعض انٹرویو منتخب کر کے انھوں نے اس کو "بالمشافہ" کی صورت میں پیش کیا ہے۔

"بالمشافہ" میں بیس ممتاز شخصیتوں سے لیے گئے انٹرویو شامل ہیں، ان میں اختر الایمان، کیفی بھوپالی، حبیب جالب، علی سردار جعفری، جوگندر پال، احمد فراز اور بیکل اتساہی سے لیے گئے انٹرویو خصوصیت سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ بھیشم ساہنی، سدھیر در، بھگوان گڈوانی سے لیے گئے انٹرویو بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔

ان انٹرویوز کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے زیادہ تر خاموش رہ کر انٹرویو دینے والے کو زیادہ سے زیادہ اظہارِ خیال کا موقع دے کر قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ معصوم صاحب نے بڑی صاف، شستہ اور سبک رَواں زبان استعمال کی ہے۔

بحیثیت مجموعی "بالمشافہ" ایک اچھی اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور کتابت و طباعت بڑی نفیس ہے۔ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ خرید کر پڑھی جائے۔ چونکہ اُردو میں اس قسم کی کتب کی بڑی کمی اور ضرورت ہے، اس لیے اس کاوش کو خصوصیت سے سراہا جانا چاہیے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "لفظوں کے سائے تلے"
مصنف: نذیر فتح پوری   قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: دفتر اسباق ۱۲/۳، نیا پارک، ایروڑا
پونہ - ۴۱۱۰۰۶

نذیر فتح پوری ایک اچھے ادیب، شاعر، ناقد اور صحافی ہیں وہ سہ ماہی "اسباق" کے ایڈیٹر ہیں۔ اب تک ان کے چار شعری مجموعے اور دو ناول منظرِ عام پر آچکے ہیں اور کئی کتابیں طباعت کی منزل میں ہیں جن میں ناول، نظموں، غزلوں، دوہوں کے مجموعے اور تنقیدی کتابیں شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "لفظوں کے سائے تلے" نذیر فتح پوری کے مضامین کا مجموعہ ہے اس میں دس مضامین اور ایک نثری نظم "دوسری کربلا" شامل ہے۔ اس کتاب میں شامل کئی مضامین ادبی، تاریخی اور سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔ "ٹونک کا سفر" ایک ایسا مضمون ہے جس میں ٹونک کے متعدد ادیبوں اور شاعروں (جن سے نذیر فتح پوری نے ملاقاتیں کیں) کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر موجود ہے۔ "پونہ کے شاعروں کے مشہور شعر" بھی اسی نوعیت کا مضمون ہے جس میں شعراء کے تعارف کے ساتھ ہی ان کے وہ اشعار درج ہیں جو زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ "عصمت چغتائی سے ملاقات" نامی مضمون اسلیے اہم ہے کیونکہ عصمت آپا اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مرنے سے دو سال پہلے ان کی جو ذہنی حالت ہو چکی تھی اس کی ایک جھلک اس مضمون میں ملتی ہے۔ دیگر مضامین میں "شعورِ غمِ حسینؑ اور کالی داس گپتا رضا" "پاکستان کے ترانے کے خالق۔ جگن ناتھ آزاد، کھنکتے لہجے کا شاعر، رشید اعجاز، روشن جزیروں کا مسافر۔ انور مینائی اور اُردو افسانہ۔ منظر اور پس منظر وغیرہ مضامین بھی کافی معلوماتی ہیں۔ بہترین کاغذ پر چھپی اس مجلد کتاب کی کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے۔

——— محمد علی

نام کتاب: "متاعِ ہنر" (شعری مجموعہ)
شاعر: محمود سروش   قیمت: ۱۲۰/۰۰ پیسے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ اُردو بازار، جامع مسجد
دہلی

"متاعِ ہنر" محمود سروش کی غزلوں کا مجموعہ ہے وہ الہ آباد کے مردم خیز قصبہ کراری کے رہنے والے تھے لیکن گزشتہ ساٹھ برس سے بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ وہ ایک عالم کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے ان کی شناخت شاعر کی حیثیت سے اتنی نہ ہو سکی۔ حالاں کہ وہ علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد رہتے اور ان کی شعری شخصیت فنی اعتبار سے بھی مستند تھی۔ "متاعِ ہنر" کے دیباچے میں نوائے سروش کے عنوان سے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"..... پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ یہ کسی کہنہ مشق پیشہ ور شاعر کا کلام نہیں ہے بلکہ خوش فکر اور خوش مزاج انسان کی کاوش ہے جو اُردو ادب اور تہذیب کے گہوارہ میں پرورش پاکر آج کے عہدِ نا پُرساں میں اپنی آواز بلند کر رہا ہے

نیا دور
تاثرات کے آئینے میں

محب مکرم ! آداب

ستمبر ۱۹۹۶ء کا شمارہ ملا، ممنون ہوں بلکہ تہِ دل سے ممنون ہوں کیونکہ نیا دور آپ مجھے باقاعدگی سے بھیج رہے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

میں بھی اسے اول سے آخر تک پڑھتا ہوں اور پھر بعض طلباء کو پڑھنے کے لیے دے دیتا ہوں، اگر آخر میں مجھ تک واپس آجائے تو سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔

زیرِ نظر شمارہ (ستمبر ۱۹۹۶ء) میں علی سردار جعفری کا سجع قادر الکلامی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ آج کل نئے شاعروں کا رجحان طبع شاعری کے ان محاسن کی طرف نہیں ہے بلکہ اب تو اکثر اردو دان لفظ "سجع" کے معنی سے بھی واقف نہیں ہیں۔

سجع کے ساتھ سردار جعفری کے ترجمے بھی نہایت معیاری دلکش اور نہایت خوبصورت شاعری کے نمونے ہیں۔

بیکل اتساہی اور گہر خیر آبادی کے دوہے ہندو پاکستان میں اکثر دوہے لکھنے والے شعراء کے لیے رہنمایانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ بیکل اور گہر ان دونوں حضرات کے دوہے صحیح وزن میں ہیں۔ اکثر و بیشتر شعراء کے دوہے جو بالعموم رسائل میں نظر آتے ہیں مطلعے ہوتے ہیں (دوہے کی بحر کے حدود سے باہر) اور ان پر عنوان "دوہے" کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ گہر صاحب نے ایک مصرعے میں ذرا سی آزادی لے بھی لی ہے لیکن بیکل صاحب نے Rules of the game کی پوری پابندی کی ہے۔

کالی داس گپتا رضا، علی جواد زیدی اور ظفر حیدری کے مضامین حاصلِ مطالعہ ہیں۔ ظفر حیدری صاحب تو "ادیب" کی فائلوں میں سے ایک گوہرِ نایاب ڈھونڈ کے لے آئے ہیں۔ اردو دنیا پر انھوں نے بڑا احسان کیا ہے۔ "ادیب" میں لکھنے والی مشہور و معروف ہستیوں میں وہ چار نام نظر انداز کر گئے ہیں اور وہ ہیں: ابوالنصر آہ (مولانا آزاد کے بھائی)، صادق از کشمیر (وہ اسی نام سے چھپتے رہے ہیں)، برج نرائن چکبست اور تلوک چند محروم ۔۔۔ لیکن یہ ایک فروعی سی بات ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ان کی نگاہ ایک گم شدہ ہیرے پر پڑی اور وہ اسے ڈھونڈ کے نیا دور کے قارئین کے سامنے لے آئے۔

فراق صاحب نے شاید کہیں لکھا ہے یا میرے ساتھ بات چیت کے دوران یہ بات کہی تھی کہ منشی پریم چند کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔۔۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان (منشی پریم چند) کے مذکورہ مضمون "اردو زبان اور ناول" میں مجھے یہ جملہ نظر آیا ہے کہ "ناول نویس کا رتبہ ہر ایک زبان کے ادب میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے"۔

۔۔۔۔۔۔ جگن ناتھ آزاد، جموں

مکرمی امجد حسین صاحب !

ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ کے یکے بعد دیگرے پے در پے نکلنے والے شاندار و یادگار خاص نمبر آپ کی کامیاب ادارت کے جیتے جاگتے دستاویزی ثبوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے دورِ ادارت میں نیا دور کے خصوصی شمارے آپ کی جس بے پناہ محنت اور ادارتی صلاحیت کے مظہر ہیں اس پر داد نہ دینا بے دادی ہوگی۔ اپنی کامیابیوں پر میری جانب سے مبارک باد قبول کیجیے

ع آفریں باد برایں ہمتِ مردانہ تو

نیا دور اگست ۱۹۹۶ء اپنے دامن میں ایسی متعدد چیزوں کا حامل ہے جو "دامنِ دل" کھینچنے کی صلاحیت سے خالی نہیں ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

علی جواد زیدی، م۔م۔ راجندر کے خود نوشت حالات، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عابد پشاوری اور پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے دلچسپ معلومات افزا مقالات، عمر انصاری و فیاض رفعت کی منظومات، کاظم جرولی، سید وشان معراج، یاد دہلوی اور مظفر سلطان حسن ترابی کی غزلیات، پروفیسر محمد زماں آزردہ اور رتن سنگھ کی مزاحیہ اور افسانوی نگارشات نیا دور اگست ۱۹۹۶ء کے یہ تمام مشتملات قابلِ ذکر ہیں۔

۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کاظم علیخاں
لکھنؤ

جلد ۵۱ نمبر ۱۰

عنوانات

عنوان	مصنف	صفحہ
اپنی بات	ایڈیٹر	۲
ملاقاتیں (نظم)	باقر مہدی	۳
میرا عہد رفتہ (خود نوشت)	پروفیسر حامدی کشمیری	۴
تلاش (نظم)	پروفیسر زاہدہ زیدی	۹
یادوں کی رہ گزر (۷)	علی جواد زیدی	۱۰
غزل	وجاہت علی سندیلوی	۱۹
اپندر ناتھ اشک: کچھ یادیں	پروفیسر گیان چند	۲۰
اک مرد خلیق تھے شجاعت صاحب (قطعات)	رباب رشیدی	۲۶
غزلیں	بیکل اتساہی	۲۷
	شبنم نقوی	۲۷
بازو کا درد (افسانہ)	م.ک. مہتاب	۲۸
غزل	صدا لکھنوی	۳۰
اولاد نرینہ (انشائیہ)	ڈاکٹر عطیہ خان	۳۱
نئی سحر کا استقبال (نظم)	مہدی پرتاپ گڑھی	۳۳
خواب میں سفر کرنا (نظم)	خورشید افسر بسوانی	۳۳
یادوں کا سفرنامہ	لیق اختر فیض آبادی	۳۴
قومی یک جہتی کا ایک لاثانی مرکز: مکن پور	سدھا تیواری	۴۰
قطعہ (۲۶ جنوری)	بیخود نگرامی	۴۲
غزلیں	شاجہاں بانو یاد ۔ راحت کاظمی	۴۳
	غفران سحر ۔ نقش رومانی	۴۳
	خورشید ملوری	۴۳
نقد و تبصرہ:	ڈاکٹر سلمان عباسی ۔ عارف ایوبی	۴۴
	واصف اعظمی ۔ فیصل کلیم ۔ اسحاق سنبھلی	تا
	علی اکبر ۔ اے مجید ۔ سید ظفر الحسن	۴۷
اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان	امجد حسین	۴۸

اپنی بات

قارئین نیا دور کو نیا سال مبارک ہو!

خدا سے دعا ہے کہ یہ سال سب کے لیے برکتوں، نعمتوں اور رحمتوں کے خزانے لے کر آئے اور ملک کی ترقی اور خوشحالی میں اضافہ ہو، کھیتوں کو شادابی ملے، دریاؤں کو روانی ملے، باغوں میں پھول مہکیں اور فطرت کے ان حسین مناظر کے ساتھ ہم ایک اچھے انسان بنیں۔ اور ہمارا ہر لمحہ وطن کو سنوارنے میں صرف ہو (آمین)

سنہ ۱۹۹۷ء کا سال ہمارے لیے بہت اہم ہے اس لیے کہ اس سال ۱۵ اگست کو ہم اپنی آزادی کی نصف صدی کی تکمیل کریں گے اس اعتبار سے یہ سال جائزہ لینے کا سال ہوگا کہ ہم نے ان پچاس برسوں میں کیا حاصل کیا ہے اور ابھی کتنے گوشے ایسے رہ گئے ہیں جنہیں اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ صرف معاشی اور اقتصادی ترقی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اخلاقی اعتبار سے اور جمالیاتی اعتبار سے ہم کس منزل تک پہونچے ہیں اور ادب کی دنیا ان پچاس برسوں میں کن تغیرات اور کن تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ہے۔ کتنے نئے رجحانات سامنے آئے ہیں، کتنے اسالیب ترک کر دیئے گئے ہیں اور یہ کہ ہمارا آج کا ادب کس حد تک ہماری سماجیات سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے یہ درست ہے کہ دانشوری کے لیے اعلا ترین ذہنی ترقی کی لطافت بہت اہم ہوتی ہے مگر یہ بھی درست ہے کہ زندگی کو گیہوں اور روٹی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تلخ حقائق بھی ادب کا جز ہوتے ہیں جنہیں عام طور سے اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ ان پچاس برسوں میں اردو زبان و ادب کا کارواں ٹھہرا تو نہیں بلکہ رواں دواں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی دم لینے کے لیے رکنا پڑتا ہے اور راستے کے سنگ گراں ہٹانے کے لیے بھی رفتار پر اثر پڑتا ہے۔

ہمارے ملک میں نئے سال کا آغاز خوشیوں اور مسرتوں کی پھوار لے کر آتا ہے۔ ۲۶ جنوری کو ہم سب مل کر یوم جمہوریہ مناتے ہیں اور ہندستانی جمہوریت کے معماروں کو یاد کرتے ہیں جنھوں نے ایک مثالی آئین و دستور بنا کر جمہوری نظام کی برکتوں سے ہمیں مالامال کیا۔ اس طویل عرصے میں ہندستانی جمہوریت بڑی آزمائشوں سے گزری ہے لیکن ہر امتحان میں وہ ثابت قدم رہی اور اقوام عالم کو ہمیشہ کی طرح راستہ بتاتی رہی۔ اقبال نے کہا تھا ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

آج دورِ زماں ہماری راہ پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہندستانی طرز کی جمہوریت نو آزاد ممالک میں عام ہوتی جارہی ہے ایسے خوشگوار موقع پر آپ سب کو یوم جمہوریہ کی مبارک باد دیتے ہوئے یہ دعا ہے کہ مستقبل میں بھی ہم سب شاندار طریقے سے ہونٹوں پر تبسم اور پیشانی پر دمک کے ساتھ یوم جمہوریہ مناتے رہیں۔

آمین!

ـــــــــــ ایڈیٹر

ملاقاتیں

ہر ایک بار یہ احساس کیوں ہوا مجھ کو ؟
کبھی تو مِل کے بھی۔ مجھ سے نہیں مِلا لیکن
سُناتا رہتا ہے اپنے ہی کارناموں کو
مجھے قصیدوں کا اُن پر گمان ہوتا ہے!

وہ کون شہر ہے اپنے شکستہ حالوں کا
جو تیری زد سے نکل کر کبھی بچا ہوگا !
ہر اِک جگہ وہی قصّے، وہی انوکھی بات
تو اپنے ہاتھوں کے اصلی چمکتے ہیروں سے
نظر کو خیرہ کرے، دِل کو چاک چاک کرے
مگر لہو کی کوئی بوند بھی نہیں گرتی۔!

عجب تماشا ہے، شہرت کا اور زمانے کا
ہر ایک شہر پہ چھایا ہوا ہے جیسے فسوں
میں ایک بوڑھا سا بدنام شخص ہوں لیکن
مجھی پہ چشمِ عنایت ہے کیوں۔ ؟
بتا مجھ کو ــــ ؟
خطا یہ ہے کہ نشانہ نہیں بنا تیرا ؟

یہ کوئی جرم نہیں اِس کی کیا سزا ہوگی ؟
میں ایک گوشے میں چھپ کر اسیر ہوں جیسے
کِسی سے مجھ کو گِلہ ہے نہ دوستی ہے کوئی؟

مجھے سکون سے پڑھنے کی آرزو ہے فقط
نہ مجھ سے مِل کہ کبھی مجھ سے تو مِلا ہی نہیں۔!
□□

باقر مہدی
ای-۱/۱، زوی درشن
کارٹر روڈ، باندرہ
ممبئی

خود نوشت

پروفیسر حامدی کشمیری
مسعود منزل، شالیمار
سری نگر (کشمیر)

میرا عہدِ رفتہ

میں ۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو اپنے آبائی مکان واقع بھوری کدل، بازار مسجد سری نگر میں عیدالاضحٰے کے دن پیدا ہوا۔ میرے والد بزرگوار خواجہ محمد صدیق کے والد خواجہ محمد خضر بٹ تھے۔ ان کے والد کا نام خواجہ عبدالرحیم تھا۔ خواجہ عبدالرحیم صوفی منش تھے اور رشیوں کی سی زندگی گزارتے تھے وہ رُوحانی کشف و کمالات کی وجہ سے شہر کے پائیں علاقے میں "رحیم صاب" کے نام سے مشہور تھے، ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے خضر محمد پیدا ہوئے تھے اور دوسری بیوی سے محمد اسماعیل۔ خواجہ خضر محمد ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شادی گوڑگڈی محلہ، زینہ کدل سری نگر کے ایک متمول گھرانے میں محمد صدیق کی بیٹی مختہ بیگم سے ہوئی تھی۔ خضر محمد بھی اپنے والد کی طرح قلندرانہ مزاج کے مالک تھے۔ ان کے بڑے بیٹے خواجہ محمد صدیق نے اپنے آبائی پیشے درزی کے کام کو اپنایا، اس کام کے بعد وہ تجارت بھی کرتے رہے۔ ان کی شادی ۱۹۲۸ء میں خانقاہ سوختہ سری نگر کے ایک آسودہ حال گھرانے میں خورشید بیگم سے ہوئی اور ان کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں اور میں ان میں عمر میں سب سے بڑا ہوں۔

میرے والد اپنے باپ دادا کی طرح صوفی منش تھے۔ وہ محلہ بھوری کدل بازار مسجد، جس کے وہ متولی بھی تھے، میں اذان دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ریاست کے حکمراں مہاراجہ ہری سنگھ نے جبری پرائمری تعلیم رائج کی۔ اس سے قبل ہی میرے چچا خواجہ غلام نبی نے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ ان کا یہ معمول تھا کہ وہ نمازِ فجر کے بعد خوش الحانی سے تلاوتِ کلام پاک کرتے اور سبھی افرادِ خاندان ہمہ تن گوش ہوتے۔ اس کے علاوہ وہ سردیوں کی برف پوش راتوں میں مختلف جنگ نامے، گلریز، الف لیلہ، طلسم ہوش رُبا، چار درویش اور روضۃ الشہدا دلنشین لے میں سناتے اور دوسرے افرادِ خانہ کے ساتھ میں بھی پوری محویت کے ساتھ سنتا رہتا۔

والد صاحب آئے دن گھر میں کسی نہ کسی نامی مجذوب یا قلندر کی آمد پر موسیقی کی محفلیں منعقد کرواتے، جو کئی کئی روز تک جاری رہتیں اور مریدوں اور حاجت مندوں کا گھر میں تانتا بندھا رہتا۔

میری والدہ اس بڑے مشترکہ کنبے، جس میں میرے دو چچا اور ان کے اہل و عیال بھی شامل تھے، کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھاتی تھیں وہ بہت زیرک اور معاملہ فہم تھیں۔ خدا ترسی، انسان دوستی اور امن پسندی ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ میری پیدائش سے قبل ان کے دو بیٹے خدا کو پیارے ہو چکے تھے، اس لیے وہ غمزدہ رہا کرتی تھیں اور فرصت کے اوقات میں چرخہ کاتتے ہوئے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ شیخ العالم، رسول میر اور حبہ خاتون کے اشعار گنگنایا کرتیں، اور میں اُداس ہو جاتا۔

چار سال کی عمر میں مجھے کلاشپورہ میں قرآنی درس گاہ میں داخل کیا گیا۔ پیر اسد اللہ شاہ ایک کشادہ کمرے میں متعلمین کو بٹھاتے تھے سامنے لکڑی کے لمبے لمبے ڈیسک تھے جن پر قرآن شریف کے سیپارے رکھے ہوتے۔ پیر صاحب دو دو چار چار بچوں کو اپنے پاس بلاتے اور بلند لہجے میں درس دیتے۔ وہاں کئی پارے پڑھنے کے بعد میرے چچا خواجہ غلام نبی مجھے اپنے ساتھ بھوری کدل کے گورنمنٹ پرائمری اسکول لے گئے داخلہ کرانے کے لیے۔ مجھے یاد ہے کہ پنڈت ماسٹر جی نے میرا داخلہ فارم پر کرتے وقت جب چچا جان سے میری

تاریخِ پیدائش پوچھ لی، تو پھر انھوں نے بیزاری سے داخلہ نہ دینے کا اظہار کیا اور کہا کہ بچّے کو اگلے سال داخلے کے لیے لایا جائے۔ چچا جان نے ان سے پھر بات کی، اور ماسٹر جی میرا داخلہ کرنے پر راضی ہو گئے۔ ظاہر ہے میری عمر ایک سال زائد لکھوائی گئی۔

بہوری کدل پرائمری اسکول سے میں نے پرائمری پاس کیا اور سری پرتاپ مڈل اسکول، شمس واری میں چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا۔ ساتویں جماعت اوّل درجے میں پاس کرنے کے بعد میری توجہ چچا جان غلام احمد کے وُوڈ کارونگ کے کارخانے، جو شمس واری کے بازار میں واقع تھا، کی جانب کھنچ گئی۔ یہ ایک بڑا کارخانہ تھا اور اس میں کئی شاگرد کام کرتے تھے۔ میں اسکول سے واپسی پر وہاں اخروٹ کی لکڑی کی مختلف اشیاء مثلاً ڈیکوریشن کی چیزیں ٹیبل اور سنگار بکس بنانے لگا۔ کارخانے سے شام کو گھر آکر میں رات گئے تک یہ کام کرتا رہا۔ چچا جان کا کام دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے چمک اُٹھا تھا۔ انھوں نے میری کمائی الگ کھاتے میں جمع کروائی۔ اور میرے لیے سُوٹ اور بائیسکل لانے کا وعدہ کیا۔ میں نے عملاً اسکول جانا بند کیا۔ اسی اثنا میں میرے ایک ہم جماعت غلام حسن وانٹ نے مجھے اطلاع دی کہ ساتویں جماعت میں فرسٹ آنے پر میرے حق میں میرٹ اسکالرشپ منظور ہوا ہے اور ماسٹر جی نے وہ اسکالرشپ وصول کرنے کو کہا ہے۔ میں اگلے روز اسکول گیا تو طلباء کو آزادی اور خوشی سے کھیلتے دیکھ کر میرے دل میں اچانک یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں دوبارہ اسکول جاؤں۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے کارخانے کے بجائے اسکول کا رُخ کیا۔

۱۹۴۵ء میں، میں نے ایس۔پی ہائی اسکول، جو مڈل اسکول کے ملحق ہی واقع تھا، میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہمارا ہائی اسکول کا امتحان ہونے والا تھا تو ہند و پاک تنازعے نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور زندگی کے معمولات متاثر ہوئے۔ ہمارے امتحانات بھی ملتوی ہو گئے۔

اس زمانے میں میری طبیعت دو چیزوں کی طرف راغب رہی (۱) صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور (۲) شعر گوئی۔ میرا اکثر وقت محلے کی مسجد میں گزرتا تھا اور امام مسجد مبارک شاہ مرحوم، جو حافظ کلام پاک تھے، سے ہمارے گھریلو مراسم تھے، میں ان سے کلام مجید کی تعلیم بھی پاتا رہا اور ساتھ ہی مسجد میں اذان بھی دیتا رہا۔ میں نے شروع میں کشمیری میں نعتیں لکھیں۔ میری بعض نعتیں امام صاحب ایام مقدسہ میں پڑھتے تھے۔ وہ مجھے ازراہِ شفقت اپنے ایک شناسا بزرگ اور شاعر سید افضل شاہ کے پاس لے گئے اور کچھ مدت کے لیے میں ان سے اپنی نعتوں پر اصلاح لیتا رہا۔ اس سے قبل میں خانیار میں مشہور کشمیری شاعر حسن ڈرائیور کے پاس جاتا رہا۔ انھیں میری کم عمری کی بنا پر میرے شاعر ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شاعر کے لیے مرشد کامل کی رہنمائی میں راہِ سلوک پر چلنا ضروری ہے اور اس کے لیے وظائف لازمی ہیں۔ میں کچھ مدّت تک ان کے تجویز کردہ وظائف کا ورد کرتا رہا۔ میں نے کشمیری میں کچھ وژن بھی لکھے۔

نویں جماعت میں، میں نے اُردو میں بعض اشعار لکھے، جن کی اصلاح اُردو کے استاد منشی محمد صادق نے کمال توجہ اور شفقت سے کی۔ یہ اشعار لکھنے کے دو محرک تھے ایک یہ کہ اسکول لائبریری میں، میں نے بچوں کے رسائل میں جلی حروف میں نظمیں پڑھی تھیں اور مجھے بھی نظمیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا، دوسرے استاد محترم منشی محمد صادق اسکول میں کسی بڑی شخصیت مثلاً انسپکٹر آف اسکولز کی آمد پر مجھ سے تہنیت کی کوئی نظم لکھواتے تھے اور اس کی اصلاح کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ہمارے میٹرک کے امتحانات ہوئے اور میں فرسٹ ڈویژن میں امتیاز کے ساتھ پاس ہوا، اور اسی سال سری نگر کے ایس۔پی۔ کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخل ہوا ۱۹۵۲ء میں میں نے ڈگری کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی فارسی آنرز کی ڈگری بھی لی۔ بی۔اے میں فارسی میں فرسٹ آنے پر مجھے گولڈ میڈل دیا گیا۔ کالج کی علمی و ادبی فضا میں، اور خاص کر کالج کی لائبریری میں بعض اُردو رسائل کو دیکھ کر میرے دل میں اردو میں شعر کہنے کی خواہش مچل اٹھی۔ کالج میگزین پرتاپ کے علاوہ بزم ادب کی نشستیں اور اردو کی ادبی کتابیں میرے ذوقِ شعری کو مہمیز کرتی رہیں۔ میں بزم ادب کی میٹنگوں میں باقاعدگی سے غزلیں

اور نظمیں پڑھتا رہا اور انگریزی کے استاد ڈی. این. بھان، تاریخ کے استاد فدا محمد حسنین اور اردو کے استاد امین کامل میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

میں بزم ادب کا رکن بھی رہا اور سکریٹری بھی اور لگاتار کالج میگزین کا مدیر بھی رہا۔ اسی زمانے میں افسانہ نگاری کی جانب میری توجہ مبذول ہوگئی اور میرا پہلا افسانہ بعنوان "ٹھوکر" ۱۹۵۰ء میں "شعاعیں" دہلی میں توصیفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا، اس کے بعد میں لگاتار افسانے لکھتا رہا۔ اور میرے افسانے شاعر، بیسویں صدی، آجکل، راہی، شعاعیں اور" نقش میں چھپتے رہے۔ اسی زمانے میں مشہور صحافی اور شاعر مکھن لال محو کی وساطت سے مجھے جناب شہ زور کشمیری سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ کچھ دنوں تک میری شاعری کی اصلاح کرنے کے بعد اچانک ایک دن انھوں نے مجھے سیماب اکبرآبادی کا ایک مصرع ڈکٹیٹ کروایا اور اس پر اسی وقت غزل لکھنے کو کہا، میں نے ہمّت کر کے تین شعر لکھ دیئے۔ ایک مصرع مجھے اب بھی یاد ہے

ع ناخدا کیا ہے کہ امیدِ خدا رکھتا ہوں میں

موصوف کو میرے اشعار پسند آئے اور انھوں نے مجھے حلقۂ تلامذہ میں شامل کیا۔ میری پہلی غزل ۱۹۴۹ء میں ہفت روزہ وکیل سری نگر میں شائع ہوئی۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

جو رہروِ آشنائے جذب کامل ہو نہیں سکتے
کبھی وہ فائزِ دامانِ منزل ہو نہیں سکتے

۱۹۵۰ء میں شاعر کا مشاعرہ نمبر شائع ہوا، اس میں مصرع طرح ——

ع "انھیں اندھیروں سے بزم گیتی کو ایک دن روشنی ملے گی"

پر میری لکھی گئی غزل مع تصویر شائع ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ "ورس تمنّا" شائع ہوا۔ اس کے بعد درج ذیل مجموعے اشاعت پذیر ہوئے:

نایافت (۱۹۷۸ء)، لاحرف (۱۹۸۴ء)، شاخِ زعفران ۱۹۹۲ء ساتھ ہی میرے یہ افسانوی مجموعے شائع ہوئے: وادی کے پھول (۱۹۵۷ء)، سراب (۱۹۵۹ء)، برف میں آگ (۱۹۶۱ء)، افسانوں کے علاوہ میں نے ذیل کے ناول شائع کیے:

بہاروں میں شعلے (۱۹۵۶ء)، پگھلتے خواب (۱۹۵۷ء)، اجنبی راستے (۱۹۵۸ء)، بلندیوں کے خواب (۱۹۶۱ء)، پرچھائیوں کا شہر شاعر کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا۔

۱۹۵۲ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی نے پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا آغاز کیا۔ میں نے انگریزی میں ایم۔اے کے لیے داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۴ء میں ایم۔اے پاس کر لیا۔ رزلٹ نکلنے کے تیسرے دن میں نے ڈاکٹر ایم ایس وانٹ کی جگہ، جو مزید تعلیم کے لیے امریکہ گئے تھے۔ عارضی لیکچرر کی حیثیت سے ایس. پی. کالج میں جوائن کیا، ہوا یہ تھا کہ شعبۂ انگریزی کے صدر پروفیسر ایس. ایل. پنڈتا اور پرنسپل جیالال کول نے ایم۔اے کے رزلٹ نکلنے کے دوسرے ہی دن محکمۂ تعلیم کے منسٹر خواجہ غلام محمد صادق سے میری تقرری کی رضامندی حاصل کر لی تھی۔

۱۹۵۹ء میں ریاستی کلچرل اکادمی میں، میرا تقرر اسسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ہوا۔ اکادمی کے سکریٹری اور معروف شاعر و نقاد علی جواد زیدی، جو میرے ادبی کام سے خوش تھے، کی ایما پر اکادمی کی موثر کارکردگی کو یقینی بنانے کے لیے ریاست کے تینوں خطوں سے تین آدمیوں یعنی پروفیسر نیلمبر شرمادیو (جموں)، اکبر لداخی (لداخ) اور مجھ کو (کشمیر) اکادمی میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے اکادمی میں ایک سال کام کیا، مگر اکادمی کا ماحول میرے لیے سازگار ثابت نہ ہوا۔ میری طبیعت دس سے پانچ بجے تک دفتر میں رہنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں سردیوں میں برف باری کی وجہ سے بارہ بجے دفتر پہونچا۔ چپراسی نے بتایا کہ جموں سے سکریٹری صاحب کا فون تھا جو صبح ٹھیک ۱۰ بجے آیا تھا۔ میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چند روز کے بعد میرے نام explanation کا خط آیا۔ خط پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے فی البدیہہ اس کا جواب دیا، اور لکھا کہ "میں دس بجے آنے سے معذور ہوں اور اپنی مرضی سے آفس آؤں گا، اگر آپ اس کو قبول نہیں کرتے تو مجھے واپس کالج ٹرانسفر کر دیا جائے۔" اگلے مہینے کسی ادبی تقریب کے سلسلے میں میرا جموں جانا ہوا۔ وہاں زیدی صاحب نے دراز سے میرا خط نکال کر مجھے دکھایا، اور مشفقانہ لہجے میں مجھے سمجھایا کہ اس تندمزاجی سے دفتری

خطوط کا جواب دینا مناسب نہیں۔ بہرحال میں نے محسوس کیا کہ میں تدریسی ماحول میں ہی خوش رہ سکتا ہوں، اس لیے میں نے واپس کالج جانے کی جدوجہد شروع کی۔ اسی اثنا میں کشمیر یونیورسٹی جو حضرت بل سے متصل ایک وسیع و شاداب کیمپس میں عمل آرا ہوگئی تھی، کے شعبۂ اُردو کے سربراہ سید محی الدین قادری زورؔ، جو اُردو کے مشہور محقق تھے سے میری ملاقات ٹیگور ہال میں اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ موسیقی کی ایک محفل میں ہوئی۔ زورؔ صاحب سے میرے پُرانے مخلصانہ مراسم تھے (۱۹۵۹ء میں جبکہ میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش حیدرآباد میں انگریزی میں ایک تربیتی کورس مکمل کر رہا تھا، اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے ازراہ قدردانی مجھے ادارہ ادبیاتِ اُردو میں، جس کے وہ بانی اور صدر تھے، ادیبوں کے جلسے میں بُلایا تھا اور میرے ادبی کام کی ستائش کی تھی)۔ زورؔ صاحب نے غیر متوقع طور پر مجھے یہ مژدہ سُنایا کہ شعبۂ اُردو میں ڈاکٹر شریف احمد کی دہلی یونیورسٹی میں تقرری کے بعد جگہ خالی ہوئی ہے اور وہ مجھے وہاں بحیثیت لکچرر لینا چاہتے ہیں، چنانچہ چند ہی روز کے بعد شعبۂ اُردو میں میرا بحیثیت لکچرر تقرر ہوا اور میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ اس سے قبل ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے،کے، فیضی مجھے شعبۂ اُردو میں لینا چاہتے تھے کیوں کہ ان کی بیگم اور وہ مجھے بحیثیت ادیب کے جانتے تھے اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن (صدر شعبۂ اُردو) بھی میری تقرری کے حق میں تھے۔ فیضی صاحب نے ریاست کے ناظم تعلیمات جی، اے، مختار صاحب کو لکھا کہ وہ مجھے کالج کے شعبۂ انگریزی سے spare کردیں تاکہ شعبۂ اُردو میں میرا تقرر عمل میں لایا جائے، میں خوش ہوگیا۔ مگر میرے کان میں یہ بھنک پڑی تھی کہ مقامی ہائی اسکول کے ایک اُستاد سید اسداللہ کاملؔ صاحب بھی یونیورسٹی میں تقرری کے لیے کوشاں ہیں۔ میں مطمئن تھا کہ ناظم تعلیمات مجھے ضرور ریلیو relieve کریں گے۔ پندرہ بیس دن کے بعد جب میں رجسٹرار یونیورسٹی پروفیسر غلام محمد زرگر سے ملا تو انھوں نے مجھے یہ دل ہلا دینے والی اطلاع دی کہ ناظم تعلیمات نے یہ لکھ کر کہ حامدی صاحب انگریزی کے ایک اچھے اُستاد ہیں، اس لیے محکمہ ان کی سروسز کو یونیورسٹی میں منتقل نہیں کرسکتا۔

میں مایوسی کے عالم میں فیضی صاحب سے ملا، مگر انھوں نے اظہارِ تاسّف پر ہی اکتفا کیا۔ رجسٹرار صاحب نے مجھے کہا تھا:

"This is bitter pill, and you have to swallow it."

بعد میں ایک مقامی کیفے ٹیریا میں کاملؔ صاحب نے، جن سے میری پرانی شناسائی تھی، شکیل صاحب، شریف صاحب اور مجھے بتایا کہ وہ وی۔ سی کے خط کے فوراً بعد جہاز سے جموں گئے اور وہاں ناظم تعلیمات کو آئینے میں اُتارا۔ انھوں نے ناظم تعلیمات کو یہ دلیل دی تھی کہ حامدی صاحب پہلے ہی لیکچرر کے عہدے پر فائز ہیں، جبکہ وہ خود لوور گریڈ میں ایک معمولی ٹیچر ہیں، اس لیے اس جگہ پر ان کا زیادہ حق ہے۔ انھوں نے ان سفارشی ذرائع کا بھی ذکر کیا جو موصوف کو رام کرنے کیلئے انھوں نے استعمال کیے تھے۔

بہرحال، شعبۂ اُردو سے وابستہ ہونے کے بعد مجھے یونیورسٹی لائبریری سے استفادے کا بھرپور موقع ملا۔ میں نے پروفیسر عبدالقادر سروری، جو زورؔ صاحب کے اچانک انتقال کے بعد صدر شعبہ بن گئے تھے، کی نگرانی میں ریسرچ کرنے کا عزم کیا، اور ۱۹۶۶ء میں مجھے پی ایچ، ڈی کی ڈگری ملی۔ میں شعبۂ اُردو کا پہلا اسکالر تھا، جسے یہ ڈگری دی گئی تھی۔

۱۹۶۲ء میں ریاست میں غالبؔ صدی تقریبات کے سلسلے میں سروری صاحب کی فرمائش پر میں نے "غالبؔ کے تخلیقی سرچشمے" لکھی، جو انھوں نے غالب کمیٹی کے زیر اہتمام شائع کی، اس کے بعد میں لگاتار تنقیدیں لکھتا رہا، اور میری درج ذیل کتابیں منظر عام پر آئیں:

۱. دلسوز کشمیری ۲. غالبؔ کے تخلیقی سرچشمے
۳. مقبول کرالہ واری ۴. جدید اُردو نظم اور یوروپی اثرات
۵. اقبالؔ اور غالبؔ ۶. نئی حسیت اور عصری اُردو شاعری
۷. ناصرؔ کاظمی کی شاعری ۸. کارگہِ شیشہ گری (میرؔ کا مطالعہ)
۹. حرفِ راز (اقبالؔ کا مطالعہ) ۱۰. انتخاب غزلیات میرؔ
۱۱. تفہیم و تنقید ۱۲. امکانات
۱۳. انتخاب کلام میرؔ ۱۴. جدید شعری منظر نامہ

۱۵۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب ۱۶۔ معاصر تنقید
۱۷۔ جدید کشمیری شاعری ۱۸۔ آئینۂ ادراک۔

۱۹۸۰ء کا ایک واقعہ میں بھول نہیں سکتا، جب میں شعبۂ اُردو کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، دسمبر کا مہینہ تھا اچانک صبح ۹ بجے میرے دو طلبا نے مجھے یہ تکلیف دہ اطلاع دی کہ شعبہ کے سابق صدر پروفیسر شکیل الرحمٰن بہار کی یونیورسٹی سے وائس چانسلر کے عہدے سے ہٹا دیئے گئے، اور وہ نامُراد واپس آ گئے ہیں۔ چونکہ شعبے میں پروفیسر کی ایک ہی جگہ تھی، جس پر میرا تقرر ہوا تھا، اس لیے شکیل صاحب کے جوائن کرنے پر مجھے تنزلی کے مسئلے کا سامنا تھا شعبے کی صدارت جانے کا مجھے کوئی ملال نہ تھا، لیکن دو سال تک پروفیسر رہنے کے بعد دوبارہ ریڈر ہونا میرے لیے حد درجہ اذیت ناک تھا۔ میں شعبے میں پہونچا تو وہاں کی پوری فضا بدلی ہوئی تھی جو رفقا رکل تک میری رفاقت کا دم بھرتے تھے، وہ سب یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں شکیل صاحب کا طواف کر رہے تھے اور مجھ سے قطعی لاتعلق ہو گئے تھے، اس ناقابلِ تصوّر صورت حال سے دوچار ہو کر میں انتہائی مایوسی میں وائس چانسلر پروفیسر رئیس احمد سے ملا، اور ان کے یہ الفاظ میرے لیے گلبانگ تسلی بن گئے کہ ۲۳ دسمبر کو سنٹرل کونسل کی میٹنگ میں وہ میرے لیے پروفیسر شپ create کروائیں گے، اور جب تک اس کا آرڈر نہیں نکلتا، میں اپنی جگہ پر کام کرتا رہوں گا۔ پروفیسر رئیس احمد نے وہی کیا، جو انھوں نے کہا تھا۔ اور انسانی اقدار میں میرے یقین کو نہ صرف بحال کیا، بلکہ مستحکم بھی کیا۔

جنوری ۱۹۸۶ء میں، میں اپنی بیگم معصومہ مریم کے ساتھ ملک کے ادیبوں کے اعلیٰ سطحی وفد، جس کی سربراہی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کر رہے تھے، کے ہمراہ ادارۂ ادبیاتِ پاکستان کی دعوت پر پاکستان گیا اور وہاں کے مختلف شہروں میں ادبی جلسوں اور سمیناروں میں شرکت کی۔ وفد میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علاوہ پروفیسر مسعود حسین خاں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بھی تھیں۔ اس دورے کی روداد" انجمن آرزو" کے سفرنامے میں چھپ چکی ہے۔

۱۹۶۳ء میں میری پسند کے مطابق میری شادی سری نگر کے ایک معروف اور متمول گھرانے میں خواجہ غلام قادر لون کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ شادی بعض خاندانی اختلافات کی وجہ سے تقریباً دس سال کے صبر آزما انتظار کے بعد ہو گئی۔ میری بیوی معصومہ مریم ایم اے، بی ایڈ ہیں۔ وہ دو سال قبل زنانہ کالج سری نگر سے اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی ہیں اور اب کشمیر میں اُردو زبان وادب کی تاریخ لکھ رہی ہیں۔ میرے بیٹے مسعود عالمگیر (کمپیوٹر انجینئر) کی شادی معروف ڈاکٹر جی ایم حاجنی کی بیٹی عالیہ سے ہوئی ہے، اور بیٹی ڈاکٹر صبا کی شادی سید محمد یٰسین (سابق ڈپٹی کمشنر) کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سہیل سے ہوئی ہے، فیضان اس کا بیٹا ہے۔

۱۹۹۰ء میں، میں کشمیر یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر ہوا اور تین سال تک انتہائی ابنارمل حالات کے باوجود، میں یونیورسٹی کی تعمیر وترقی اور اکاڈمک کاموں کو فروغ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۹۹۳ء میں خرابیِ صحت کی بنا پر وائس چانسلر شپ سے مستعفی ہوا اور جب سے ہمہ وقتی طور پر تصنیفی اور تخلیقی کاموں میں مصروف ہوں۔

میں زندگی کو کائناتی تناظر میں دیکھتا ہوں۔ ایک ہمہ گیر کائناتی عمل کے نتیجے میں زندگی کا ظہور ہوا ہے اور کائناتی اصول و قوانین کے تحت خود کائنات بھی اور زندگی بھی آغاز وانجام کی پابند ہے یوں تو کائنات ایک بیکراں دریائے رواں ہے، شکلیں بدلتا ہوا، اور نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہوا۔ اسی کائناتی نظام کا ایک حصّہ دیگر مخلوقات کی طرح انسان بھی ہے، جو اُن سے جینے مرنے کی آگہی سے ممیز ہوتا ہے اور اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے، انسان سعی وجستجو سے لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ معاشرتی سطح پر انسان لوگوں کی زیادتیوں کا شکار ہوتا ہے اور فریب شکستگی اور بیچارگی کو محسوس کرتا ہے۔ کائنات کا راز سربستہ بھی انسان کو نقش فریادی بننے پر مجبور کرتا ہے۔

میری رہائش گاہ شہر کے ہنگاموں سے دور شالیمار کی سرسبز وشاداب پہاڑی کی آغوش میں ہے اور یہاں بفضلہٖ تعالیٰ مجھے

لکھنے پڑھنے کا بہت ہی سازگار ماحول نصیب ہوا ہے۔ میں نے سال گزشتہ کشمیر کے مشہور صوفی شاعر حضرت شیخ العالم کی حیات اور شاعری پر ایک مبسوط تنقیدی کتاب لکھی ہے جو کمپیوٹر کے ذریعہ زیرِ اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ میں اردو نظم اور افسانے پر بھی تجزیاتی اور تنقیدی کام کر رہا ہوں۔ میں گھر سے بہت کم باہر نکلتا ہوں۔ مشاعروں میں شرکت کرنا میرے مزاج کے منافی ہے، البتہ ملکی سطح پر ادبی سیمیناروں میں شرکت کرتا رہتا ہوں۔

میں ذیل کے اداروں سے منسلک رہا ہوں:

۱۔ کشمیر یونیورسٹی سنٹرل کونسل
۲۔ اردو کشمیری ڈکشنری بورڈ، کلچرل اکادمی
۳۔ ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی
۴۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی (اُردو بورڈ) نئی دہلی
۵۔ اُردو مشاورتی کمیٹی ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
۶۔ جنرل کونسل، ساہتیہ اکادمی
۷۔ کونسل فار پروموشن آف اردو، نئی دہلی۔

میں شعبۂ اُردو کے تحقیقی جریدے "بازیافت" کا مدیر رہنے کے علاوہ "شیرازہ" سری نگر اور "تعمیر" سری نگر کا مدیرِ اعزازی رہ چکا ہوں۔

□□

اُردو کے معروف شاعر راز الٰہ آبادی کا ۲۸ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو الٰہ آباد میں ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

راز الٰہ آبادی کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اُن میں خاص طور پر "منزلیں" اور "دھڑکنیں" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

ادارۂ نیا دور انھیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

نارسی

پروفیسر زاہدہ زیدی

آبشار، ۴۔ ایچ آئی جی فلیٹ، سرسید نگر۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

وہ کیسی ساعت تھی اے خدا
کہ ہم سے صحرانورد، آتش بجاں
عدم سے دارِ محن میں آئے
جب آنکھ کھولی تو آسمان و زمین
اپنے محور سے ہٹ چکے تھے
کبھی وہ اپنی جگہ نہ پائے
ہمیں نے اپنی خرد کی مستی میں آسمانوں پہ ڈور ڈالی
ہمیں نے اپنے لہو کی سُرخی سے تپتے صحرا میں گل کھلائے
ہزار صدیوں کے فاصلے طے کیے
تخیل کی بجلیوں نے
کئی زمانے ہمارے قدموں تلے بچھائے
کبھی تو کائناتِ حسیں کے جلووں میں کھو گئے ہم
کبھی کثافتوں کے دریا سے اشک بار آئے
کبھی جو ماضی میں غوطہ زن ہوئے
——— تو اس حیات کے لئے
ہزاروں انمول گوہرِ تابدار لائے
ہمیں تھے جو لاشعور کی مہیب تاریکیوں میں اترے
ہمیں نے تاریکیوں میں لفظوں کے ننھے ننھے دیئے جلائے
ہمیں نے یکسانیت میں اکثر تضاد ڈھونڈے
ہمیں تضادات کو پھر آہنگِ نو کی محفل میں کھینچ لائے
تلاشِ حق میں ہمیں نے یارب ——
کوہ و صحرا کی خاک چھانی
متاعِ سوزِ جگر لٹائی
خود اپنے سینے پہ زخم کھائے

———

مگر یہ بے نام سی خلش
یہ درد کی لہر، یہ اضطرابِ پیہم
کہ بڑھتے جاتے ہیں جس کے آتش خرام سائے
یہ کیا ہے —کیوں ہے —کیا اس کی انتہا ہے
کبھی تو کوئی مجھے بتائے۔

□□

علی جواد زیدی
۳/۱۸۹ وشواس کھنڈ، گومتی نگر
لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

(۷)

سیرِ زنداں (۲)

سیرِ زنداں کے تفصیلات میری زندگی میں اہم ضرور ہیں، لیکن اگر انھیں میں الجھ کر رہ گیا تو وہ منظر نامہ حاشیائی بن کر رہ جائے گا جو قید و بند کی صعوبتوں، محرومیوں اور جدائیوں کا سبب بنا۔ میں نے ارادی کوشش کی ہے کہ گوشے گوشے میں جو واحد متکلم اظہار کے لیے بیتاب اور ہر سرگزشت حیات کا غالب عنصر ہوتا ہے اس پر ضبط و پسپائی کی پابندیاں لگاتا رہوں۔ پھر بھی خود نوشت آپ بیتی ہی ہے۔ ہر آپ بیتی میں "جگ بیتی" کا بھی بڑا عنصر ہوتا ہے، اس کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے اس گرفتاری کے سیاسی پس منظر کا ذکر اہم ہے جس نے در زنداں تک پہونچایا۔

پس منظر

سرسری ذکر پچھلی قسط میں آچکا ہے۔ دلی یونیورسٹی کے ۲ رفیق طالب علموں۔ مقیم الدین فاروقی اور یگیہ دت شرما کا دلی یونیورسٹی سے اخراج ذاتی مسئلہ نہیں تھا۔ طلبا کی سیاسی زندگی میں آنے والے طوفان کی ایک علامت تھا، اسے ہم لوگوں نے محسوس کیا اور شدت سے محسوس کیا۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

سر ماریس گائر کے خلاف احتجاج ان کی ذات کے خلاف نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی کے تدریسی نظام اور وہاں کے ارباب حل و عقد کا طلبا کی آزادیٔ فکر و اظہار کو محسوس نہ کرنے اور آزادی کی تحریک سے دلچسپی کو ناقابل معافی جرم سمجھنے کے خلاف احتجاج تھا۔ اس احتجاج کا مقصد ان کے خوابیدہ ضمیر کو جگانا تھا اور یہ آگاہی بھی دینا تھا کہ آزادی پر ایسے حملوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ اجلاس جو دسمبر ۱۹۴۰ء میں ناگپور میں ہونا قرار پایا تھا، اس میں طلبا کے عزائم کا اعلان کرنا تھا اور کل ہند پیمانے پر اس کے لیے حکمت عملی طے کرنا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی اس میں پیش رفت دلی یا کسی اور بڑے شہر میں نہ ہوئی اور اسی شہر لکھنؤ میں بڑے شاندار طور پر ہوئی۔ حکومت کی مشینری بھی سرعت سے اسی لیے حرکت میں آئی کہ اس تحریکِ احتجاج کو پھیلنے سے روکنے کے لیے سزا دینا ضروری تھا۔ کل ہند طلبا کی تحریک کے تین نمایاں کارکنوں کی گرفتاری ضروری سمجھی گئی۔ ناگپور کانفرنس میں ہماری موجودگی کو ناممکن بنا دینا تھا۔ میرے ساتھیوں نے اسی لیے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ہر قیمت پر روپوش ہو کر خود کو گرفتاری سے بچا لینا چاہیے۔ یہ کام مشکل تھا۔ بظاہر میرا قیام ہیوٹ ہوسٹل میں تھا، لیکن مختلف تدابیر سے میں ملیح آباد اور اناؤ وغیرہ بھی ہو آیا جہاں غیر سیاسی ہمدردوں نے مجھے سہارا دیا اور ایک خطرہ مول لیا۔ یہ بھی ان کا جہادِ آزادی تھا۔ لیکن آج ایسے خاموش مجاہدین کو کون یاد کرتا ہے۔ ان تفصیلات سے گریز کروں گا، لیکن اتنا لکھنا ضروری ہے کہ میرے دوست صدیق احمد صدیقی کی محبتوں اور رفاقتوں نے بڑا ساتھ دیا۔ بعد میں وہ اناؤ میں وکالت کرنے لگے تھے، اور وہیں انھوں نے جان جاں آفریں کو سپرد کر دی۔ اِنّا لِلّٰہ!

اس طرح بچتے بچاتے روپوشی کی منزل تمام ہوئی اور اب کانفرنس کا وقت بالکل قریب آگیا۔ ہوسٹلوں کو خفیہ پولیس نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ میرا باہر نکلنا اور گرفتاری سے بچنا محال تھا۔ ساتھیوں نے باہم مشورہ کر کے ایک راہ نکال ہی لی۔

نہایت رازداری سے یہ تدبیر سوچی گئی کہ جب طلبا کے قافلے

اجلاس ناگ پور کے لیے جانے لگیں تو ایک دن پہلے اخباروں میں یہ خبر شائع کرادی جائے کہ لکھنؤ کے مندوبین کا ایک وفد میری قیادت میں ناگ پور کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس خبر کے شائع ہوتے ہی پولیس حلقوں میں خاصی ہلچل مچ گئی کہ ان کی شدید نگرانی کا گھیرا توڑ کر کوئی کیسے نکل گیا؟ بعد میں سُنا گیا کہ کچھ تادیبی کارروائیاں بھی کی گئیں۔

اس رات کو ہم نے چولے بدلے۔ رات کے سناٹے میں، ایک چھوٹی سی بے بی آسٹن کہیں سے لائی گئی اور میں بلرام سنگھ کے ہمراہ وہاں سے نکل آیا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ہم کان پور ٹھیک اس وقت پہنچے جب گاڑی رینگنے لگی تھی۔ طلبا کا ایک اور وفد اسی ٹرین سے جا رہا تھا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جھنڈے لیے اور نعرے لگاتا ہوا۔ ہم دونوں احتیاط کے طور پر الگ الگ بیٹھے، دیہاتیوں کی طرح کمبل لپیٹے ہوئے۔ جب ٹرین کان پور کو بھی پار کر گئی تو ہم دونوں ایک ڈبے میں آگئے۔ رائے یہ قرار پائی کہ ناگ پور پولیس کو اطلاع ہو گئی ہوگی، اس لیے جو طلبا کا دوسرا وفد اسی ٹرین سے جا رہا تھا اس میں بلرام سنگھ بھی شامل ہوکر "کامریڈ زیدی زندہ باد" کے نعرے لگانے لگیں گے۔ اس طرح توجہ میری طرف سے ہٹی رہے گی اور میں وہاں کے ایک اچھے ہوٹل میں، جس کا نام غالباً امپیریل ہوٹل تھا، ایک اور رفیق کے ساتھ ٹھہر جاؤں گا۔ یہ رفیق دو دن پہلے ہی ناگ پور پہونچ کر کمرے ریزرو کرا چکا ہوگا، وہ اسٹیشن سے مجھے اپنے ہمراہ لے جائے گا۔ ساری کارروائی بڑی رازداری سے انجام پائی۔ وہاں معلوم ہوا کہ مقامی پولیس میری تلاش میں ہے۔ لکھنؤ سے وارنٹ آچکا ہے۔ ایک دن اور خاموشی سے گزارنا تھا۔

رات کو مجلس انتظامیہ کی نشست تھی، اس میں بھی شرکت ضروری تھی، چنانچہ میں وہاں تھوڑی دیر کے لیے پہنچا۔ ایک اختلافی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد میں وہاں سے بہت آہستگی سے اٹھا اور اپنی جائے قیام پر پہنچا۔ دوسرے دن کھلا اجلاس تھا۔ دل سینے میں خوشی اور جوش سے اچھل رہا تھا۔ آج قربانی پیش کرنے کا دن تھا۔ یہ بڑے فخر کا مقام تھا کہ مجھ جیسی گمنام ہستی کو ملک کی خدمت کا ایسا بیش بہا موقع مل رہا تھا۔ لیکن یہ خطرہ بھی ستا رہا تھا کہ جس لمحے کے لیے یہ ساز دارایاں اور جتن کیے گئے تھے اس لمحے سے پہلے کہیں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ یقیناً ناگ پور میں خفیہ پولیس کے کچھ ایسے لوگ بھی پہنچ چکے ہوں گے جو مجھے پہچانتے ہوں۔ ان سے اپنے کو بچا کے رکھنا تھا۔

رات کی مجلس انتظامیہ میں جو اختلافی مسئلہ رونما ہوگیا تھا اس کے نتیجے میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ پارٹی والا کی قیادت والے گروہ نے کانفرنس کے پنڈال پر قبضہ کرلیا تھا۔ اور دوسری جماعتوں اور طبقوں کے مندوبین کو داخل نہیں ہونے دیا جا رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ ایم، ایل، شاہ جنرل سکریٹری کے دستخطوں سے جاری کیے ہوئے مندوبوں کے کارڈ بھی تسلیم نہیں کیے جا رہے تھے۔ ان تمام جماعتوں کے طلباء بے حد برہم تھے لیکن ہال پر مخالفین نے پہلے ہی قبضہ کرلیا تھا۔ خیر، یہ سب مل کر ناگ پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے پاس گئے اور ان سے صورتِ حال بیان کر کے یونیورسٹی کے ہال میں اجلاس کرنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ بدیر سہی، لیکن کانفرنس اسی دن اور اسی شہر میں منعقد ہوئی اور اب میں کھل کر باہر آگیا کھلے اجلاس میں تالیوں کی گونج میں میری تقریر سُنی گئی۔ میں نے بتایا کہ کس طرح حالات کی مجبوری میں شاید میں دوسرے اجلاس میں شریک نہ ہوسکوں۔ اس کے بعد میں اپنے ہوٹل میں واپس آگیا اور اطمینان سے کھانا کھایا اور اپنا سامان سمیٹ کر بیٹھا کہ کسی لمحے بھی پولیس پہونچتی ہوگی۔ میں نے اپنی تقریر میں جنگ سے پیدا ہونے والی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستانی سیاست کے کردار اور طلبا کی راہ عمل پر روشنی ڈالی اور مقررین نے بھی لائحہ عمل تیار کرنے میں مدد کی — راہ صاف تھی کہ ہندوستان جنگی کوششوں میں صرف اسی صورت میں دل کھول کر حصہ لے سکتا تھا جب ہندوستان کی آزادی کا واضح وعدہ کرلیا جائے ایسے وعدے کا امکان نہیں تھا، لیکن طلبا کو جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔

سورج ڈوب ہی رہا تھا کہ ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی قیادت میں پولیس کی جماعت گرفتاری کے لیے آپہونچی۔ سارے ہوٹل میں ہلچل مچ گئی۔ اتنے میں ناگ پور کے ایک بیرسٹر شریف صاحب کے جونیئر ایڈوکیٹ مجھے لینے کے لیے آگئے کہ اس رات شریف صاحب نے مجھے، انصار ہروانی (افسوس کہ وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے) بلرام سنگھ، ایم۔ ایل۔ شاہ اور صدیق احمد صدیقی کو کھانے کی دعوت

دی تھی۔ اگر میں فوراً گرفتار ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ ساری دعوت درہم برہم ہو جاتی۔ میں نے ان کے جونیئر ایڈوکیٹ صاحب سے صورت حال بتا دی اور معذرت چاہی۔ شریف صاحب ناگ پور کی بے حد نمایاں ہستیوں میں تھے۔ ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ وہ سی پی کی پہلی کانگرسی وزارت میں کابینہ کے وزیر رہ چکے تھے۔ سارے شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ایڈوکیٹ صاحب نے ڈپٹی ایس پی سے صورت حال بتائی اور پھر شریف صاحب سے بات بھی کرا دی۔ ڈی ایس پی اس پر آمادہ ہو گئے کہ وہ مجھے شریف صاحب کی ذمہ داری پر دعوت میں جانے دیں شریف صاحب کانگرسی تھے، وہ بھی اس قربانی کی لذت میں شریک ہو گئے۔ دعوت بڑے پیمانے پر تھی اور دستر خوان الوانِ نعمت سے آراستہ تھا۔ کھانے کے بعد شریف صاحب نے اور دوسرے سامعین نے اصرار کیا کہ میں کچھ نظمیں بھی سناؤں۔ نشست نے طول کھینچا اور جو پولیس پارٹی ہوٹل میں ہماری آمد کی منتظر تھی وہ متوحش ہوئی کہ کہیں اسے چرکا تو نہیں ہوا۔ وہ لوگ شریف کے دولت کدے سے کچھ دور جیپ کھڑی کر کے دریافت حال کے لیے اندر آئے اور محفل شعر خوانی گرم دیکھ کر مطمئن ہوئے۔ آدھی رات ہونے کو آئی تھی۔ ضابطے سے وارنٹ ہم پر تعمیل ہو چکا تھا اب مجھے جلد از جلد جیل میں داخل ہونا چاہیے تھا۔ بستر وغیرہ پہلے ہی حوالۂ پولیس ہو چکا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ خوب ہنس ہنس کے گلے ملے اور "کامریڈ زیدی زندہ باد!" کے شریفانہ نعروں میں وہاں سے تھانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہمارے کسی ساتھی کو پولیس والوں نے ساتھ نہ آنے دیا۔ رات کے سناٹے میں بھی پولیس اسٹیشن کے قریب ایک دوکان دار کو غالباً میرے کھدر کے کرتے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ سیاسی قیدی آیا ہے۔ وہ ہاتھ پر مٹھائی کا ایک دونا اور ایک ہار لے کر تھانے پہونچ گیا اس کے چہرے پر ایک قومی مجاہد کی سی بشاشت تھی۔ ابھی وہ مجھ سے کچھ دور ہی تھا کہ ایک بہت جی حضوری قسم کے تھانے دار نے اس پر جھپٹا مار کے مٹھائی چھین کر وہ دونا زمین پر پھینک دیا اور دوسرے نے اس کو ایک چانٹا مارا۔ اس کے منھ سے مہاتما گاندھی کی جے کا ہلکا سا نعرہ نکلا۔ میں نے تھانیدار کی توبیخ کی کہ اسے ہاتھ اٹھانے کی اجازت کس قانون سے دی؟ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ میں نے ناخوشی کے کچھ اور جملے کہے، وہ سب پی گیا۔ لیکن اس کا وہ چانٹا اور دوکاندار کا خلوص و عقیدت آج تک میری روح میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔

اسی آدھی رات کو بعض ضروری کاغذات پر مجسٹریٹ کے دستخط بھی کرانا تھے، اس لیے وہ سیدھے مجسٹریٹ کے گھر کی طرف گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ مجسٹریٹ استراحت فرما رہے تھے۔ دھوتی کرتا پہنے باہر آئے۔ اردلی ٹمٹماتی ہوئی لالٹین لیے آگے آگے تھا۔ کاغذات پر دستخط ہوئے۔ کچھ رات کا وقت، کچھ میری نوجوانی اور طالب علمی، کچھ اپنی بے بسی سب نے مل جل کر اس کے چہرے پر ایک الجھن اور گھبراہٹ کا تاثر بکھیر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ میرے تصور ہی کی کارفرمائی رہی ہو! خیر ہم وہاں سے سیدھے ناگ پور سنٹرل جیل پہونچے۔ جیل والوں نے پہلے تو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ ساری بیرکیں بند ہو چکی ہیں۔ انھیں ہم کہاں رکھیں گے؟ پھر رجسٹر وغیرہ دیکھ کر بتایا کہ قیدِ تنہائی کی ایک کوٹھری فی الحال خالی ہے رات بھر اسی میں رکھیں گے، کل صبح کو پھر دیکھا جائے گا۔

مُفت کی قیدِ تنہائی!

قیدِ تنہائی تو انتہائی خطرناک مجرموں کے لیے مخصوص ہوتی ہے یا پھر جیل قواعد کی کھلی خلاف ورزی کی سزا میں۔ یہاں قیدِ تنہائی کا تجربہ مفت ہاتھ آ گیا۔ بُرا کیا تھا؛ وہیں زمین پر بستر لگا دیا گیا۔ چھوٹی سی کوٹھری تھی، ایک کونے میں مٹی کے برتن میں پینے کا پانی، دوسرے کونے میں رفع حاجت کے لیے پانی وغیرہ۔ یہ پہلا تجربہ تھا۔ چلیے یوں بھی سہی!

ع آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

میں اس زمانے میں بلا کا سگریٹ نوش تھا۔ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا تھا میں 555 کا پچاس سگریٹوں کا ڈبہ اپنے ساتھ لایا تھا، لیکن جیل والوں نے دیا سلائی چھین لی، کیونکہ قیدی کے پاس تحفظ کے خیال سے دیا سلائی نہیں رہنے دی جاتی۔ کہیں وہ آگ نہ لگا دے۔! جیل والوں کو کیا خبر کہ ہم کو کیسی آگ جلائے جا رہی تھی! میرے احتجاج کرنے پر جیل والوں نے یہ رعایت دی کہ رات میں جو پہرے دار رہیں گے، ان کے پاس لالٹین رہتی ہے اور انھیں ہدایت ہوگی کہ آپ جب کہیں گے تو وہ اپنی لالٹین سے سگریٹ سلگانے کا سامان کر دیں گے۔ چنانچہ اس رات میں نے پہرے دار کو کئی بار سگریٹ جلانے کی زحمت دی۔ بالآخر وہ خود بھی ایک سگریٹ کا طالب ہوا!

اس نے رات بھر جو خدمت کی تھی اس کے پیش نظر وہ ایک سے زیادہ سگریٹ کا مستحق تھا۔ میں نے اسے دو دے دیں۔ ویسے وقت ذہن نے سمجھایا کہ یہ جگہ سخاوت کرنے کی نہیں ہے۔ سگریٹیں ختم ہو جائیں گی تو ملیں گی کہاں! لیکن انسانی ہمدردی کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں؛

قیدِ تنہائی کی یہ کوٹھریاں پھانسی کی سزا پانے والے قیدیوں کے لیے مخصوص تھیں۔ انھیں سگریٹ وغیرہ کہاں ملتی؟ انھوں نے جو مجھ پر پہرے دار کی نوازش دیکھی تو اسے گالیاں دینے لگے:

"سالے! یہ تیرا کون لگتا ہے۔ اس کو سگریٹ پلاتا ہے تو ہمیں بھی پلا۔"

پہرے دار پھر منت سماجت کر کے اس کے لیے بھی ایک سگریٹ لے گیا۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ "بھائی اس سے زیادہ سخاوت ممکن نہیں ہے کیوں کہ سگرٹوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

رات تو جیسے تیسے کاٹی۔ دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیشی ہوئی۔ ان کا نام ملک تھا۔ وہ میرے بارے میں اخبار میں خبر پڑھ چکے تھے۔ نرمی سے کہنے لگے کہ آپ کے بارے میں ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے جس سے ہم یہ طے کر سکیں کہ آپ کے ساتھ کس کلاس کے قیدی کا سلوک کیا جائے۔ ویسے آپ ایک سیاسی ادارے میں ذمہ دار عہدے پر ہیں لیکن یہ دوسرے صوبے کا معاملہ ہے۔ کیا آپ کو یہاں کوئی ذاتی طور سے یعنی آپ کے صوبے کے پس منظر میں جاننے والا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ یہ زحمت کیوں کریں۔ ہر کلاس یکساں ہے۔ سیاسی قیدی کی ایک ہی سطح ہے کہ وہ قیدی ہے۔ مجھے سی کلاس میں رکھ دیجیے۔" کہنے لگے: "میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کا کوئی جاننے والا ہو تو بتائیں۔"

میں نے کہا، "پھر آپ کی شرط یہ ہوگی کہ وہ بھی آپ کو جانتا ہو۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ یکایک بول اٹھے:

"کیا آپ یہاں کے ڈائرکٹر آف انفارمیشن مسٹر جوالا سنگھ کو جانتے ہیں۔ وہ بھی تو لکھنؤ ہی سے آئے ہیں۔؟"

میں نے اثبات میں جواب دینے میں پس و پیش کیا کہ کہیں وہ عزیز صحافی دوست میرے جواب سے کسی مشکل میں نہ گرفتار ہو جائے۔ پھر ملک صاحب (سپرنٹنڈنٹ) نے خود ہی ٹیلیفون اٹھا کے جوالا سنگھ سے بات کرنے کے بعد یہ احکام دیے کہ مجھ سے فی الحال اسپیشل کلاس کے قیدی کا برتاؤ کیا جائے۔ جوالا سنگھ اے پی آئی اور بعد میں نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ رہے، وہ "ناگپور ٹائمز" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وہاں بلائے گئے تھے پھر حکومت نے انھیں ڈائرکٹر مقرر کر دیا۔ اب کانگریسی حکومتوں کے مستعفی ہو جانے کے بعد اس صورت حال کو نہ انھیں نگلتے بنتا تھا نہ اگلتے بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ رفیع احمد قدوائی سے بہت قریب اور ان کے وفادار دوست تھے۔ افسوس کہ وہ اب ہم میں نہیں۔ مجھ سے اس زمانے میں بھی دوستانہ تھا۔ طالب علموں کی تحریک سے متعلق خبروں کی اشاعت میں خاص دل چسپی لیتے تھے۔

جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسلمان تھے۔ نام ٹھیک سے یاد نہیں رہ گیا۔ غالباً خورشید تھا۔ وہ میرے کھدر کے کپڑوں کو دیکھ کر ہی چیں بہ جبیں ہو گئے تھے لیکن اب میں اسپیشل کلاس کے قیدی جیسے برتاؤ کا مستحق ہو گیا تھا۔ وہ خود ایک سایہ دار درخت کے نیچے کرسی پر تشریف فرما ہوئے دوسری چھوٹی سی کرسی میرے لیے لائی گئی۔ پھر میرے لیے چائے آئی کیوں کہ جب میں گیا تھا تو مجھے چائے نہیں ملی تھی۔ خود بھی شریک ہوئے اور باتوں باتوں میں مجھ سے خاکسار تحریک کے بارے میں گفتگو چھیڑ دی میرے انکشاف پر کہ میں علامہ مشرقی کا 'تذکرہ' پڑھ چکا ہوں، وہ اور بھی قربت محسوس کرنے لگے اور بولے:

"آپ جیسے نوجوانوں کی تو ملت کو ضرورت ہے۔"

میں نے کسی قدر تیز کلامی سے جواب دیا: "لیکن ملت کو خاکسار تحریک کی ضرورت نہیں"!

وہ متنغّض ہو گئے اور اس کے بعد میں جتنے دنوں تک جیل میں رہا، ان سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے کھانا وغیرہ تو اسپیشل ملنے لگا لیکن کال کوٹھری سے باہر نکالا نہیں گیا سبب یہ بتایا گیا کہ دو ہی ایک دن میں مجھے لکھنؤ منتقل ہونا تھا، کسی اور بیرک میں بھیجنا طول امل ہوگا۔

اس زمانے میں ونوبا بھاوے انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں قید تھے اور ان کے ساتھ سردار پٹیل بھی تھے۔ پہرے داروں نے بتایا کہ وہ دونوں کچھ دور پر ٹہلنے نکلتے ہیں، لیکن اس قیدی کے لیے جو کال کوٹھری

کے تنہا علاقے میں کسی دوسری طرف سے آنا جانا ممکن نہ تھا۔ ان حضرات سے ملنے کی خواہش رکھنے کے باوجود میں خورشید صاحب سے یہ درخواست نہ کر سکا، کیونکہ پچھلے تجربے کے بعد جو جواب ملتا وہ پہلے ہی سے معلوم تھا۔

لکھنؤ کی واپسی

ہفتہ دس دن کے اندر ناگپور سے منتقلی کے احکامات صادر ہو گئے، اور مجھے اس زمانے کے سکنڈ کلاس میں ایک پولیس سب انسپکٹر اور دو ہیڈ کانسٹبلوں کی نگرانی میں ناگپور سے لکھنؤ لے جایا گیا۔ ناگ پور اسٹیشن پر دیکھا کہ جوالا سنگھ موجود تھے۔ انھوں نے مجھے رخصت کیا اور مٹھائیوں کا مختصر سا تحفہ اور اپنے گھر پہنچانے کے لئے ایک مختصر سا پارسل دیا۔ انسپکٹر سے کہہ دیا کہ جیل لے جاتے وقت ان کے گھر کے راستے سے لے جائیں تاکہ ان کا تحفہ پہنچ جائے۔ ان کی اس جرأت اور دوستانہ رویّے کا مجھ پر بڑا اثر پڑا۔

انسپکٹر کا نام غالباً ڈکشت تھا۔ انھوں نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی کہ اسٹیشن سے کچھ لینا چاہوں تو گاڑی سے اتر کر لے سکتا ہوں۔ ایک بار تو وہ ڈبّے سے اتر کر میرے ساتھ گئے بھی نہیں اور میں ریلوے بک اسٹال پر ایسا محو ہوا کہ گاڑی چل پڑی۔ دوڑ کر میں ڈبّے میں سوار ہوا تو اسی لمحے وہ گھبراہٹ میں گاڑی سے نیچے پھاند پڑے، لیکن مجھے ڈبّے میں دیکھ کر پھر بڑی مشکل سے سوار ہو پائے۔ میرے قریب آکر بولے:

"مجھے یقین تھا کہ آپ بھاگنے والوں میں نہیں ہیں۔ پھر بھی میں گھبرا گیا تھا۔"

میں جواب میں مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

سفر تمام ہونے پر پہلے تو جوالا سنگھ کے گھر ان کا تحفہ پہنچایا گیا جو انسپکٹر خود لے کر گیا۔ یہ لکھنؤ، میرا شہر تھا مجھے کسی آزاد شخص سے ملنے کی اجازت دینا اب انسپکٹر کو خطرے سے خالی نظر نہ آیا۔ تحفہ پانے والوں نے برآمدے میں آکر مجھے دور سے نمسکار کیا اور میں نے جواب سلام دیا۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔

حضرت گنج تھانے پہنچا تو دیکھا کہ کچھ طالب علم دوست نہ معلوم کیسے خبر سونگھ کر پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ ان میں بلرام سنگھ اور پچا صدیقی کے علاوہ خورشید بھائی بھی تھے۔ وہاں فوراً پوری کچوری اور مٹھائیوں کا انتظام ہوا جو ہم نے مل بانٹ کے کھائیں اور ضروری کاغذی کارروائی کرنے کے بعد ڈکشت اور ان کے ساتھی رخصت ہوئے اور مجھے حضرت گنج کے انسپکٹر اور ڈی ایس پی اپنی نگرانی میں ڈسٹرکٹ جیل پہنچا آئے۔ یہیں دو چار دن کے بعد مقدمے کی سماعت ہونے والی تھی۔

لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ قاضی جلیل عباسی پہلے سے موجود ہیں وہ بعد میں پارلی منٹ کے ممبر، دوبار یو پی اسمبلی کے ممبر بلکہ ایکبار ڈپٹی منسٹر بھی ہوئے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سید حسین ظہیر بھی تھے یہ سر وزیر حسن کے صاحبزادے اور بنّے بھائی (سجّاد ظہیر) کے سنجھلے بھائی تھے۔ بڑے اور منجھلے بھائی علی الترتیب سید علی ظہیر بار ایٹ لا (سابق وزیر و سفیر ہند اور وزیر انصاف حکومت اتر پردیش) اور سید حسن ظہیر آئی سی ایس تھے۔ حسن ظہیر جرمنی کے تعلیم یافتہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ کیمسٹری میں ریڈر تھے۔ یو پی کی پہلی کانگریسی وزارت میں پارلی منٹری سکریٹری تھے۔ اب تمام وزارت کے ساتھ مستعفی ہو کر انفرادی ستیہ گرہ تحریک کے ماتحت سزا بھگت رہے تھے۔ کیسے کیسے ناز و نعم کی گودوں کے پالے، ہنسی خوشی سے قید کی سختیاں جھیل رہے تھے اور وہاں کی زندگی کے شدائد برداشت کر رہے تھے قاضی جلیل عباسی تحریک طلباء کے ساتھی اور یونیورسٹی میں مدرس رہنے کے علاوہ قاضی عدیل عباسی مرحوم کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے بھی قریبی دوست تھے۔ ڈاکٹر حسین ظہیر کو ترقی پسند خیالات سے گہری دلچسپی تھی اور حضرت گنج کے علاقے میں اپنا ایک فلیٹ "نیا ادب" اور "پرچم" کے دفتر کے لیے ابتدائی دنوں میں دے دیا تھا۔ ملک راج آنند سے خاص علاقہ تھا۔ وہ جب بھی لکھنؤ آتے تو انھیں کے یہاں مقیم ہوتے۔ ملک راج آنند اور راجہ راؤ انگریزی زبان کے مشہور ادیبوں سے وہیں میری اولین ملاقات ہوئی۔ ان کی اہلیہ بھی مشہور ادیبوں اور شاعروں کی ضیافت میں دلچسپی لیتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ انھیں کی توجہات سے متاثر ہو کر مجاز نے نظم

"مادام" لکھی تھی۔ واللہ اعلم!

سچ پوچھیے تو اس جیل میں مجھے سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ٹھاکر چندر سنگھ گڑھوالی کی نظر آئی۔ انھوں نے نہتّوں کے پٹھانوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا اور اب قید کی صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی سے جھیل رہے تھے۔ تندرست و توانا، ہنس مکھ، دلیر اور مست مولا قسم کے انسان تھے۔ کئی سال جیل کاٹ چکے تھے، ابھی کئی سال اور جیل میں رہنا تھا۔ ان کی بہادری، دلیری اور ہمّت و جواں مردی سے دل و جان ہی نہیں گرویدہ ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی باتیں سنتا رہوں اور ان کی فرمائش پر اپنی ہلکی پھلکی قومی نظمیں انھیں سنا کر پر خلوص داد حاصل کرتا رہوں۔ افسوس اسی کا تھا کہ وہ بہت جلد بچھڑ جانے والے تھے۔

مقدمے کی کارروائی لکھنؤ میں ہی ہونے والی تھی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگنے والا تھا۔ مقدمہ کے فیصلے کے بعد گمان یہ تھا کہ کسی اور جیل میں بھیج دیا جائے گا۔ میرے مقدمے میں اس لیے دیر ہوئی کہ میں ناگ پور چلا گیا تھا۔ دو چار دن پہلے سردار کا مقدمہ پیش ہوا تھا، پھر قاضی جلیل عباسی کا۔ سزا یابی کے بعد انھیں بنارس سنٹرل جیل بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے بھی وہاں یا کسی اور جیل میں سزا کاٹنی ہوگی۔ خیر اسی ڈسٹرکٹ جیل میں پیپری ڈیہہ کے سیاسی ڈکیتی کیس کے دہشت پسند نوجوان بھی مقید تھے۔ ہشاش بشاش تھے اور قوی ارادوں کے مالک۔ وہ دہشت پسندی کو آزادی کا واحد راستہ سمجھتے تھے اور دوسرے سیاسی افکار کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس دو روزہ ملاقات کے بعد ان سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کا بس ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے یعنی میرے مقدمے کی کارروائی اور باقاعدہ سزا۔ ابھی تک جو سزا بھگت رہا تھا وہ بحیثیت ملزم کے تھی، اس فیصلے کے بعد میں باقاعدہ سیاسی مجرم بن جانے والا تھا۔ یہ جرم تو وہ ہے جو میں نے بصد شوق کیا تھا اور آج بھی اس پر ناز ہے کہ نازک ذاتی حالات کے باوجود میرے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائی۔ میں نے پہلے سے ایک بیان قلم بند کیا تھا اس میں جنگ کی سامراجی نوعیت، ہندستان پر سامراجی استحصال اور جد و جہد آزادی کی صداقت کا اعتراف تھا۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ استغاثے کا یہ بیان کہ میں کسی خاص تاریخ کو کسی خاص جگہ تقریر کر رہا تھا، غلط ہے کیوں کہ اس وقت میں کسی اور جگہ موجود تھا اور استغاثے نے دراصل سرمارس گائیر والے واقعے کے انتقام کے طور پر یہ جھوٹا مقدمہ درج کرایا ہے۔ حقیقت کہنے کی جرأت بھی استغاثے میں نہیں ہے۔ میں ہندستان میں برطانوی عدالتوں کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے میں دفاع میں کوئی حصّہ نہ لوں گا۔ مجسٹریٹ میرے چچا خان بہادر سید عبدالحسن صاحب مرحوم کے رفیق تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ مقدمے کو جھوٹا سمجھتے ہیں تو پھر دفاع کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا کہ "صرف اس لیے کہ میں عدالت کو تسلیم نہیں کرتا۔"

اچانک کسی نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ مڑ کر دیکھا تو مشہور سوشلسٹ دانشور اور لیڈر اچاریہ نریندر دیو تھے۔ میرے مڑنے پر انھوں نے "شاباش" کہا، اور میں نے عقیدت سے سلام کیا۔ اچاریہ جی فارسی، اردو، سنسکرت، ہندی، انگریزی کئی زبانوں کے ادب سے واقف تھے بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ میں ان کی اس عزّت افزائی اور کرم فرمائی پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔ اتنے میں مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ بھی کہیں سے آگئے اور کورٹ سے مخاطب ہو کر بولے:

"ان کو اے کلاس ملنا چاہیے۔"

عدالت نے پوچھا، "آپ کس حیثیت سے بول رہے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا کہ "میں ایڈوکیٹ ہوں۔"

مجسٹریٹ نے کہا، "وکالت نامہ کہاں ہے؟"

انھوں نے کہا، "میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے صرف میمو پر عدالت سے مخاطب ہو سکتا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ میں دفاع سے انکار کر چکا تھا، مرزا صاحب کے دفاع کا کوئی جواز یا مقام نہیں تھا لیکن ان کی محبت کا اظہار ضرور تھا۔

مرزا جعفر حسین صاحب جوش ملیح آبادی کے خاص دوستوں میں تھے اور ان کی شام کی مخصوص محفلوں میں میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتے اور خود بھی شریکِ بزم رہتے تھے۔ اچھی نثر لکھ لیتے تھے

اُس زمانے میں ایک انگریزی ہفت روزہ "مون لائٹ" کے مدیر بھی تھے۔ اس اخبار سے میں بھی کچھ دنوں وابستہ رہ چکا تھا۔ وہ اودھ بولس کے حلقے میں بھی جانی پہچانی شخصیت تھے اور سیاست میں بھی دلچسپی لیتے تھے بلکہ نیشنلسٹ پولیٹکل کانفرنس کے جنرل سکریٹری تھے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد تک سے شناسائی تھی۔ افسوس کہ ابھی چند دنوں پہلے بڑی تکلیف اور تقریباً کس مپرسی کے عالم میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اپنی عیش پسندی اور مہمان نوازی کی بدولت تنگ دستی میں مبتلا ہوجایا کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنی رفتار کبھی نہیں بدلی۔

میں نے اپنے عدالتی بیان کی ایک اور نقل تیار کرائی تھی۔ عدالت میں دلاور حسین صاحب "نیشنل ہیرالڈ" کے نمائندہ خصوصی موجود تھے۔ میں نے چپکے سے اُن کے حوالے کردی۔ ظاہر ہے کہ اتنا طویل بیان وہ شائع تو نہیں کرسکتے تھے پھر بھی خیال ہوا کہ سزایابی کی خبر کے ساتھ شاید چند جملوں کا اضافہ کرسکیں لیکن میں بھول گیا تھا کہ ڈیفنس آف انڈیا رولس راستے میں حائل ہے۔

عدالت نے چھ ماہ قید سادہ کی سزا سنائی اور بی کلاس دے دیا۔ مرزا صاحب خوش کہ یہ ان کی وکالت کا نتیجہ تھا۔ "قید سادہ" اور "قید بامشقت" کا فرق تو لفظوں ہی سے ظاہر ہے لیکن مشقت کے عوض سزا میں کچھ دنوں کی چھوٹ مل جایا کرتی تھی۔ سیاسی قیدیوں سے اُس زمانے میں مشقت نہیں لی جاتی تھی بلکہ ان کا یہ کام بھی دوسرے قیدیوں سے کرالیا جاتا تھا، سزا میں چھوٹ مفت مل جایا کرتی تھی۔ کانگرسی حکومت نے جیل کے قوانین میں کافی نرمی کردی تھی اور قیدیوں سے تقریباً عام انسانوں جیسا سلوک کیا جانے لگا تھا۔ عام قیدیوں اور سیاسی قیدیوں میں برطانوی حکومت فرق کرنے لگی تھی۔ خود جیل کے حکام یہ سوچتے تھے کہ معلوم نہیں کون ان میں سے کل وزیر ہوجائے، اس لیے حفظ ما تقدم کے طور پر، مگر انھیں حدود کے اندر کہ سامراجی نظام جواب طلبی نہ کرے، وہ سیاسی قیدیوں سے نسبتاً اچھا سلوک کرنے لگے تھے۔ غرض کہ اگر قید بامشقت کی سزا ہوتی تو اسے شاید ہی کوئی برا مانتا کیوں کہ اس سے سزا میں چھوٹ مل جاتی اور جیل کی پابند زندگی کا خاتمہ جلد ہوجاتا۔ اب وہ مولانا حسرت موہانی کا دور نہ رہا تھا جب ان جیسے عظیم رہنما اور ہر دلعزیز شاعر کو بھی واقعۃً چکی پیسنا پڑتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی جبیں پر شکن نہیں پڑتی تھی

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی!

قید سادہ میں کوئی چھوٹ ملنے والی نہیں تھی، مجھے پوری مدت قید میں گزارنا پڑی تعلیم کا ایک سال الگ برباد ہوا۔ ہمیں یہ زمانہ آج بھی یاد آتا ہے تو سر فخر سے اونچا ہوجاتا ہے۔ قربانی کی خوشی دائمی ہوتی ہے۔

بنارس سنٹرل جیل

سزایابی کے تقریباً دو ہفتے بعد ہی میرا تبادلہ بنارس سنٹرل جیل ہوگیا۔ ابھی تک والدہ مرحومہ کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ میں ناگ پور میں گرفتاری کے بعد کہاں ہوں۔ انھوں نے کتنی ہی راتیں جاگ کر کاٹی ہوں گی، "نہ جانے میرا بیٹا کیسے سوتا ہوگا اور کیا کھاتا ہوگا"۔ میرے سرکار پرست عزیز تسلّی تو کیا دیتے، نشتر ہی چبھوتے رہتے:

"آپ کی پرورش و پرداخت، محنت و محبت کا کیا خوب صلہ دیا ہے اس نے۔!!"

میں بھی بے چین رہتا تھا۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد مرحومہ نے جس طرح لاڈ و پیار سے مجھے پالا اور پڑھایا تھا، وہ محبت کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے، لیکن میں کیا کرسکتا تھا؛ قصور میری آزادہ روی کا نہیں بلکہ ملک کی غلامی کا تھا۔ میں نے بنارس پہونچتے ہی خط بھیجا اور تفصیل سے حالات لکھ کر انھیں اطمینان دلایا کہ سوائے اسکے کہ میں قدم بوسی سے محروم ہوں، مجھے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اس خط کے پہونچنے کے بعد اماں مرحومہ خوش بھی ہوئیں اور بہت سادہ ئیں بھی ـــ" اس نے میرا دل بہلانے کے لیے یہ سب لکھ بھیجا ہے"۔ انھوں نے میرے ماموں جان سید محمد رسا سے کہا۔ تین بھائیوں میں والدہ اکیلی بہن تھیں۔ بڑے ماموں کا انتقال ہوچکا تھا لیکن منجھلے ماموں رسا اور چھوٹے ماموں ابوذر صاحب بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی دل دہی کے لیے دونوں اس پر رضامند ہوگئے کہ وہ جیل جاکر مجھ سے ملیں گے اور مجھے دیکھ کے پوری خیریت اور حالات سے مطلع کریں گے یہ بہت ہی اہم فیصلہ تھا۔ علاقے کے سب سے بڑے زمیندار، جن کی باون گانوں میں زمینیں تھیں، اور جو سارے ضلع میں عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، ان کا اپنی جگہ سے جنبش کرنا ہی

بڑی بات تھی، چہ جائیکہ جیل جاکر کسی قیدی سے ملاقات کرنا۔ لیکن وہ لوگ ہمت کرکے آئے۔ جس وقت میں اپنی بیرک سے ملاقاتیوں کے کمرے کی طرف لایا جا رہا تھا تو جیل کے پھاٹک کی سلاخوں کے پیچھے سے ہمارا آمنا سامنا ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ وفورِ محبت میں ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جسے انھوں نے اپنے رومالوں میں سمیٹ لیا۔ کیا نیک ہستیاں تھیں۔ کیا محبت کرنے والے لوگ تھے!

ملاقات کے وقت جیل کے قواعد کے مطابق قیدیوں کے جسم چھونے کی اجازت نہیں تھی لیکن آتے ہی انھوں نے گلے لگا لیا۔ ڈپٹی جیلر ایک لمحے کے لیے دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولا کہ قیدی کے جسم کو چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ خیر۔ کمرے میں پہونچ کر دونوں ماموؤں نے اپنی اپنی جیبوں سے ۵۵۵ سگریٹ کے دو دو ڈبے نکالے۔ انھیں معلوم تھا کہ میں بلا کا سگریٹ نوش ہوں اور جیل میں شاید سگریٹ نہ ملتی ہو۔ اس عنایت خاص کا میرے دل پر خاص اثر ہوا کیوں کہ اس وقت تک میں ان حضرات کے سامنے احتراماً سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے چپکے سے میری جیب میں کچھ کھنکتے سکے ڈال دیئے پھر کہنے لگے:

"ہم لوگ تمھاری اس قربانی سے، جو تم نے ملک اور قوم کے لیے کی ہیں، بہت خوش ہیں۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔ چھ مہینے کی مدت تو چٹکیاں بجاتے کٹ جائے گی۔"

میں نے کہا کہ مجھے یقین تھا کہ آپ کی قوم پروری، میری اس جرأت کو ناپسند نہ کرے گی۔ صرف والدۂ ماجدہ کی پریشانی کا خیال ہے۔ انھیں یقین دلا دیجیے کہ یہاں بہت سے سیاسی کام کرنے والے ساتھ ہیں، جیل ہی میں اسپتال ہے۔ کھانا بہت اچھا ملتا ہے۔ کام کرنے کے لیے عام قیدی ملے ہوئے ہیں۔ بس قید و بند ہے، ورنہ ہم ہر طرح خوش ہیں"۔

غرض وہ لوگ اُٹھے تو پھر ان کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ میں اس روز اپنے کمرے میں لیٹا ہوا صرف والدہ ماجدہ کی عظیم قربانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے آگے خود میری حقیر قربانی ماند پڑ گئی تھی۔ میں نے سنا کہ گھر پر کچھ لوگوں نے جن میں قاضی سید محمد حسین صاحب مرحوم پیش پیش تھے، میری گرفتاری کے بارے میں والدہ ماجدہ سے خاندان کی عزت خاک میں ملانے کی دل خراش باتیں کی تھیں۔ اسی سے متاثر ہو کر میں نے حسب ذیل نظم لکھی:—

ماں سے

پائندہ باد! رسم و رہِ مہرِ مادری
تجھ سے جہاں میں روحِ خوشی کو دوام ہے

میں تیری شفقتوں کی تمنا میں رات دن
تجھ کو مرے خیال سے ہر وقت کام ہے

تجھ کو ملال میری اسیری کا روز و شب
مجھ کو ترے ملال کا غم صبح و شام ہے

ہر چند میری قید گوارا نہیں تجھے
پھر بھی مری خوشی کا بڑا اہتمام ہے

میرے عزیز لاکھ بُرائی کریں مری
تو دل میں خوش کہ تیرا پسر نیک نام ہے

میں جانتا ہوں تو یہ کبھی چاہتی نہ تھی
کوئی ترے پسر کو کہے، سُست گام ہے

مجھ کو بھی قید و بند سے اُلفت نہیں مگر
ظلم و ستم کی مجھ پہ اطاعت حرام ہے

تو جانتی ہے قلبِ حقیقت شناس کو
تو واقفِ فسانۂ زندانِ شام ہے

مجبور تھا کہ تیری جُدائی کا غم سہوں
گو فرض تیرے حکم کا بھی احترام ہے

شاید تجھے بھی ہجرِ پسر یہ بتا سکے
زندان و دار ہند میں اک رسمِ عام ہے

جس نامُراد ملک میں کی پرورش مری
صدیوں سے وہ حقیر و فقیر و غلام ہے

(بنارس سنٹرل جیل)

بنارس سنٹرل جیل میں اے اور بی کلاس قیدیوں کا بڑا اجتماع تھا۔ غالباً سوا سو ڈیڑھ سو کے قریب ہوں گے۔ یہ سب ان بارکوں میں رکھے گئے تھے جہاں جنگ برما کے قیدی پہلے رکھے جا چکے تھے۔ ان کی پچھلی دیوار میں روشنی کی کرن آنے کے لیے ایک سوراخ تھا۔ اس میں بھی موٹی موٹی سلاخیں

پیوست تھیں۔ آگے لوہے کے دروازے تھے، ان میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، جو قیدیوں کو کھانا دینے کے لیے کھلتی تھی اور پھر بند ہو جایا کرتی تھی اگرچہ ڈوریہ تھے آمنے سامنے۔ لیکن پہلے زمانے میں آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع شاید ہی ملتا ہو۔ اب حالات بدل گئے تھے۔ لوہے کا یہ دروازہ اب بند نہیں رہتا تھا، صرف بیرک کے دونوں سروں کی سلاخیں رات کو مقفل ہو جاتیں۔ دن میں وہ بھی کھل جاتیں اور ایک دوسرے سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

یوں تو سبھی سیاسی قیدی تھے، لیکن ان میں طرح طرح کے افراد یکجا تھے۔ کمیونسٹوں میں علی سردار جعفری اور جیتن سنگھ، سوشلسٹوں میں راجہ رام شاستری، دامودر سروپ سیٹھ، ہری ہر ناتھ شاستری وغیرہ انقلاب پسندوں میں من متھ ناتھ گپتا اور راج بہادر سنگھ۔ آزاد خیال کانگریسیوں میں پروفیسر شبن لال سکسینہ۔ راجاؤں میں راجہ پڈرونہ۔ کانگرس کے عہدے داروں میں موہن لال سکسینہ، سلیمان انصاری (سابق پارلیمنٹری سکریٹری) ونکٹیش نرائن تیواری (سابق پارلیمنٹری سکریٹری) اور ٹھاکر ہرگوبند سنگھ جو بعد میں یوپی کے وزیر ہوئے۔ طالب علموں کی تحریک سے وابستگی رکھنے والوں میں ان دو کمیونسٹ دوستوں کے علاوہ جن کے نام اوپر آئے ہیں، انصار ہروانی سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور قاضی جلیل عباسی بھی تھے۔ بعد میں راج نرائن، مشہور سوشلسٹ لیڈر بلرام سنگھ سریواستوا اور سید محمد جعفر طالب علم لیڈر بھی آگئے تھے۔ خالص گاندھی وادیوں میں بابا رگھو داس پوت دار اور کیڈیا جی تھے۔ غرض کہاں تک نام شماری کی جائے، اچھا جمگھٹ تھا، بڑا متنوع مجمع تھا۔ ان میں قدرِ مشترک صرف جذبۂ آزادی تھا، ورنہ ان کے ذوق جداگانہ اور ان کی پسندیں الگ تھیں۔ ان کی سزائیں بھی مختلف تھیں۔ کچھ کو قید بامشقت کی سزا ملی تھی، کچھ کو سادہ قید۔ کچھ لمبی مدت کے قیدی تھے۔ جیسے من متھ گپت جن کو کاکوری ڈکیتی کیس کے سلسلے میں سب سے لمبی مدت کی سزا ملی تھی یہ ہندی کے ادیب تھے۔ کچھ مختصر مدت کے لیے سزایاب ہوئے تھے۔ یہ زمانہ انفرادی ستیہ گرہ کا تھا۔ لوگ کلکٹر کو خط لکھ کر مطلع کر دیتے تھے کہ فلاں تاریخ و وقت کو کس مقام پر جنگ کے خلاف نعرے لگا کے اس سلسلے میں عائد پابندیوں کی خلاف ورزی کریں گے۔ وہاں پولیس پہلے سے موجود رہتی۔ پولیس کو دیکھ کر ایک مختصر سا مجمع بھی ادھر لے کر پہونچ جاتا۔ وہ لوگ نعرے لگاتے اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے جاتے۔ ستیہ گرہیوں کی یہ فہرست خود گاندھی جی کی نگرانی میں شہر، ضلع کانگریس کمیٹیاں مرتب کرتیں اور جس ترتیب سے ان کے نام گاندھی جی منظور کرتے اسی ترتیب سے وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیتے۔

ایک دن ایک نوجوان طالب علم آیا، اسے دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ اس کے پہلے اسے طالب علموں کی تحریک میں کبھی دیکھا نہ تھا۔ پھر عمر اتنی کم تھی کہ گاندھی جی کی فہرست میں آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہم کو اس نے بتایا کہ ایک روز جوش میں آکر اس نے ضلع مجسٹریٹ کو خط لکھ دیا اور تاریخ وقت متعینہ پر اور ہار خرید کر خود ہی پہن کر مقررہ جگہ پہونچ گیا اور اب یہاں آپ لوگوں کی صحبت میں ہوں۔ اس کے جوش سے دل خوش ہوا لیکن بعض دوستوں نے اس شبہ کا بھی اظہار کیا کہ کہیں کوئی مخبر تو نہیں ہے، ہم اس سے برابر ملتے جلتے رہے اور اسے دلوں میں چھپے شکوک کا علم نہیں ہونے دیا۔ یکایک اسی یونیورسٹی کا اس کا ہم جماعت آگیا اس نے بتایا کہ یہ غریب زندانِ عشق ہے۔ یونیورسٹی میں اس کا نام کاٹے جانے کی افواہ تھی۔ اس نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور سرکاری مہمان خانے پہنچ گیا۔ اس حکمت عملی سے حکم اخراج واپس لے لینا پڑا اور ان کو وصالِ صنم نہ سہی تو جدوجہد آزادی کی محبوبہ کے درشن دور ہی سے ہو گئے لیکن یہ بیان مجھے ذاتی پرخاش کا نتیجہ معلوم ہوا۔ سچائی کا علم خدا ہی کو ہے۔

ان کی ذات سے ایک اور واقعہ وابستہ تھا۔ میں نے جیل میں ایک ادبی اور ثقافتی ڈائری لکھنا شروع کی تھی۔ جو نئی کتاب پڑھتا، آپس میں جو گفتگوئیں ہوتیں یا اخبارات میں جو مباحث ابھرتے ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا، خود سے کوئی بات ذہن میں آتی تو وہ بھی لکھ لیتا۔ یہ ڈائری ایک موٹی سی کاپی پر لکھی تھی جو جیل میں خفیہ طریقے سے منگائی تھی۔ ضوابط کی رو سے جیل سے رہا ہونے کے وقت سپرنٹنڈنٹ تمام کتابوں اور کاغذات کا معائنہ کرتا تھا کہ کہیں یہ بے ضابطہ تو نہیں منگائی گئی ہے۔ اب رہائی کا دن قریب آگیا۔ اتفاق سے اسی دن ان حضرت کی رہائی بھی تھی۔ میرے پاس کتابیں اور کاغذات بہت تھے۔ یہ ایک مستقل تصنیف تھی، اس لیے اس کو تکیہ کھول کر روئی کی تہ میں چھپا کر سی دیا اور ہم دونوں نے اپنے تکیے

(باقی صـ ۶۲ پر)

غزل

عشق ہے شیوہ مرا، دلدار کی حاجت نہیں
ہے تصور میں صنم، دیدار کی حاجت نہیں

غم پہ اپنے ناز ہے، غمخوار کی حاجت نہیں
اب مسیحائی تری، بیمار کی حاجت نہیں

آسماں سے ہے رشک کرتا کج کلاہی پر مری
آپ کی بخشی ہوئی دستار کی حاجت نہیں

دیکھتا ہوں میں زلیخا کی نظر سے اپنا فن
یہ وہ یوسف ہے جسے بازار کی حاجت نہیں

لالۂ صحرا کو حاصل وسعتیں کہسار کی
اب اسے صف بندیٔ گلزار کی حاجت نہیں

عمر بھر سورج سے آنکھیں وہ ملا کر ہے چلا
راہرو کو سایۂ دیوار کی حاجت نہیں

حق کی پیمائی کو دیکھے، تابِ گویائی نہ ہو
مجھ کو ایسے دیدۂ بیدار کی حاجت نہیں

یاد جب وعدہ دلایا شرم سے آنکھیں جھکیں
اب مجھے منہ سے کسی اقرار کی حاجت نہیں

میرے نغموں میں بہاروں کی نشاط جاں فزا
میں وہ بلبل ہوں جسے گلزار کی حاجت نہیں

—— وجاہت علی سندیلوی مرحوم

وجاہت علی سندیلوی (مرحوم) نے یہ غزل اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل ارسال کی تھی جو افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی تھی۔ اب تبرکاً شائع کی جا رہی ہے۔
—— ایڈیٹر

پروفیسر گیان چند
اندرا نگر۔ لکھنؤ

اُپیندر ناتھ اشک : کچھ یادیں

اُپیندر ناتھ اشک کرشن چندر بیدی اور منٹو کے گروہ کے افسانہ نگار تھے جو اُن سب سے پہلے افسانہ نویسی کی دنیا میں آئے اور سب کے بعد تک ہمارے درمیان زندہ رہے۔ حیات اللہ انصاری عمر میں ان سے قدرے بڑے ہیں لیکن اب انھوں نے تخلیق ادب سے کنارہ کشی کر لی ہے جبکہ اشک آخر عمر تک یہاں تک کہ اسپتال میں مرض الموت میں بھی اپنے ایک ڈرامے کو آخری شکل دے گئے۔

اشک مجھ سے تقریباً ۱۳ سال بڑے تھے ۱۹۲۶ء میں جب انھوں نے اپنا پہلا بچکانہ افسانہ لکھا تھا۔ میں نے الف ب سے آشنائی نہ کی تھی۔ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں ان کا ناول ستاروں کے کھیل پڑھا تھا۔ تنقیدوں میں ان کے افسانوں کا ذکر دیکھا تھا پہلی مرتبہ بھوپال میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا جب میں نے انھیں حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو میں ایک لکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ مجھے کچھ ایسی دھندلی سی یاد ہے کہ وہ نیکر پہن کر تقریب میں آئے تھے راجندر سنگھ بیدی نے رسالہ الفاظ علی گڑھ کے گوشۂ اشک (مارچ تا جون ۱۹۸۲ء) میں اپنے مضمون ترک عفو و زن میں اشک کی بھانت بھانت کی پوشاکوں اور تصویروں کا البم دکھایا ہے۔ ادبی تقریب میں نیکر پہن کر آنا انھیں سے ممکن تھا۔ اس کے بعد وہ ہندی دنیا کے ہو گئے اور میرا ان سے کوئی رابطہ نہ رہا۔

میں اکتوبر ۱۹۷۶ء سے مارچ ۱۹۷۹ء تک الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر رہا۔ ان دنوں اشک الٰہ آباد ہی میں مقیم تھے لیکن میں ان سے نہ ملا۔ سوچتا تھا کہ یہ اردو سے بے وفائی کر کے محض ہندی کے ادیب ہو گئے ہیں۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ میرے قیام کے آخری دنوں میں وہ اردو کے کسی استاد کے ساتھ یونیورسٹی روڈ پر مل گئے جہاں سے یونیورسٹی میں میرے کمرے میں آ گئے۔ یہ گویا ان سے تجدید ملاقات ہوئی

میرے حیدر آباد پہنچنے پر ان سے مراسلت شروع ہو گئی۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں انھوں نے اپنی کئی اُردو اور ہندی کتابیں مجھے بھیجیں۔ وہ اپنے ہندی ڈرامے 'انجو دیدی' کو اُردو میں 'انجو باجی' کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ میرے پاس اُردو کا مسودہ دیکھنے کو بھیجا ساتھ ہی مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ڈرامے کو بہ نظر غائر پڑھا اور اس کے بعض بیانات کو غیر فطری جان کر انھیں چٹھی لکھی۔ اس موضوع پر کئی خطوط کا تبادلہ ہوا۔ انھوں نے اپنا نقطۂ نظر آئینہ کر دیا۔ میرے اعتراضوں پر یہ کہہ کر میرا منہ بند کر دیا۔

" انجم باجی کی انجم اور کوئی نہیں میری تیسری بیوی کوشلیا ہے۔ شادی کے بعد وہ بہت پریشان کرتی تھی۔" (انجو باجی کا مقدمہ ص ۳۹)

اشک لاابالی تھے۔ کوشلیا سگھڑ تھیں۔ میں اپنے مقدمے کے جستہ جستہ حصے بازخوانی کے لیے نقل کرتا ہوں:

اشک نے اپنی گھریلو زندگی کو تو لے اور 'انجو باجی' کے علاوہ ایک مکمل ہندی کتاب۔ شکایتیں اور شکایتیں۔ میں پیش کیا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ مضامین افسانہ نہیں حقیقت ہیں لیکن ان میں افسانے سے زیادہ دلچسپی ہے ان سے اندازہ ہوا کہ ان کی اہلیہ محترمہ صفائی سلیقے کا بس اتنا ہی خیال رکھتی ہیں جتنا کہ ایک سگھڑ خانہ دار کو چاہئے۔۔۔۔ وہ گھر کی آرائش چاہتی ہیں شخصی فیشن کی دلدادہ نہیں ہیں۔۔ بھرے چاہیں گھر کو صاف ستھرا رکھے اور گھر والوں کی زندگی کو کسی حد تک باضابطہ بنانے کی کوشش کرے تو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف اشک صاحب کا مزاج دیکھئے انھیں کا اعتراف چند ہندی الفاظ کے اردو ترجمے کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

عام ہندی پکچر دیکھنا مجھے ایکدم ناپسند ہے ایسی بات نہیں، پر شرط یہی ہے کہ دو چار یار باش لوگ ساتھ ہوں۔ ایکٹروں کی حماقتوں پر آوازے کسے جائیں۔ دسّی روپے آنے والوں کی طرح۔ ہائے ہائے مار ڈالا

اسے ظالم، ایک نظر ادھر بھی۔ اور ایسے آوازے لگائے جائیں بے تکے گانوں کی تھال پر تھاپ دی جائے سیٹیاں بجائی جائیں۔ لوگ ہنسیں ہم روئیں اور لوگ روئیں تو ہم ہنسیں اور یوں پیسے وصول کرکے گھر آئیں

(حکایتیں اور شکایتیں ص ۹۴)

لاحول ولا قوۃ! کیا عامیانہ مذاق ہے، ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں یہ تیس ہزاری میں رہتے تھے۔ پاس ہی کرشن چندر اور ان کے بھائی مہندر ناتھ رہتے تھے۔ مہندر کے ساتھ اس خلعت شاہی میں ملبوس ہوکر گھومنے جاتے تھے۔

"اور میں ویسے ہی ننگے بدن، ننگے پیر صرف تہمد پہنے مہندر کے ساتھ چلا گیا۔"

شاباش میرے عوامی فنکار (لاہور میں تو یہ اور راجندر سنگھ بیدی محض جانگیا پہن کر ملا کرتے تھے۔ ایسے اُن گھڑ کو بیوی سدھائے سکھائے تو سنکی کہہ کر اس پر ڈرامے لکھے جائیں۔

مندرجہ بالا کتاب میں کوشلیا جی اپنے مضمون بے تکلفی کی ابتدا اس جملے سے کرتی ہیں۔

"اشک جی مانیں یا نہ مانیں پر آدمی یہ سنکی ہیں" (ص ۵۳)

کتاب پڑھ کر ہم بھی کوشلیا جی سے اتفاق کرنے پر مجبور ہیں۔"

(انجو باجی ص ۴۲ - ۴۰)

میں نے ستمبر ۱۹۸۲ میں انجو باجی پر مقدمہ لکھ کر بھیج دیا۔ اردو نسخے کی زبان میں دو لفظوں کے سوا اور کوئی ترمیم نہ کی۔ انجو دیدی میں تمام کردار ہندو ہیں۔ اردو نسخے میں مسلمان، ہندی میں چائے کے سلسلے میں دو الفاظ پیالہ اور چمچ آئے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں ان دونوں کو ہندو پیالہ، چمچا اور مسلمان پیالی، چمچہ کہتے ہیں چونکہ اردو میں مسلمان کرداروں کی زبان سے ان کا ذکر ہوا اس لیے میں نے اشک صاحب کو لکھا کہ انھیں ہر جگہ پیالی اور چمچہ لکھا جائے۔ انھوں نے میری ترمیم مان تو لی لیکن اس پر مکمل عمل نہ کر سکے۔ چمچ کا لفظ شاید ایک ہی جگہ آیا ہے اسے بدل کر چمچہ کر دیا ہے۔ (ص ۴۲) لیکن اسی صفحہ پر پیالہ اور پیالی کے سلسلے میں یہ خیال نہیں رکھا نتیجہ یہ ہے کہ ص ۴۲ ہی پر دو جگہ پیالی اور دو جگہ پیالہ ہے۔ ص ۴۴ اور ۴۱ پر بھی پیالہ ہی نظر آتا ہے۔ گویا مصنف ترمیم کے قائل ہوتے ہوئے بھی اپنے روزمرہ کو نہ چھوڑ سکے۔

رسالہ آج کل دسمبر ۱۹۹۵ء کے اشک نمبر میں کوشلیا اشک کا ایک بے نظیر مضمون "اشک، میرے ہم سفر" چھپا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اشک فطرتاً جھگڑالو مزاج ہونے کے علاوہ بھٹر بھٹریے بھی ہیں۔ ان کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد بڑے بھائی نے ان کی سگائی طے کر دی لیکن اشک کو وہ رشتہ پسند نہ تھا۔ وہ ایک گریجویٹ خاتون کوشلیا سے معاشقے کی پینگیں بڑھا رہے تھے اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں کوشلیا کو لاہور بلایا اور ان سے یکایک کہا۔

"ساڑھی پسند کر لو اور بلاؤز سلنے کے لیے دے دو آج ہی ہم شادی کریں گے۔"

کوشلیا شادی کو تیار تھیں لیکن چوری چھپے سے اس عقد مناکحت کے لیے نہیں۔ انکار کر دیا۔ بھائی کے آنے پر اشک نے ان کے سامنے زبان نہ کھولی۔ ان کی بات رکھنے کے لیے سگائی والی لڑکی سے شادی کر لی لیکن چند ماہ میں اس بیوی سے بیزار ہو گئے۔ اسے اور نوکری کو چھوڑ کر دہلی فرار ہو گئے وہیں ریڈیو میں نوکری کر لی۔ وہاں کوشلیا جی کو بلایا اور پہلے کی طرح بغیر کسی تیاری کے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے چند دوستوں کی موجودگی میں شادی رچالی۔ کرشن چندر نے کوشلیا کا بھائی بن کر رسوم ادا کیں۔ ایسی پھٹا پھٹ رازداری کی شادیاں فلموں میں دیکھنے کو ملتی ہیں واقعی زندگی میں اشک جی جیسے بھٹر بھٹریے سے ہی ممکن تھا۔

میں اہلیہ کے ساتھ ۱۹۸۳ء میں براہ لندن امریکہ گیا۔ اشک جی کا چھوٹا لڑکا نیلابھ بی بی سی ہندی سروس میں ملازم تھا۔ ان دنوں اشک جی بھی اس کے پاس لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بی بی سی کے دفتر میں رضا علی عابدی ملے۔ مجھے نیلابھ سے ملایا۔ ان کے چہرے پر جھاڑ جھنکاڑ کے بلے بال اور خود رو غیر مقطع داڑھی پھیلی ہوئی تھی۔ نیلابھ بولے، آپ سوچتے ہوں گے کوئی حشیش بیچنے والا ہے۔ میں نے بھی دل میں سوچا کسی ہپّی سے دوچار ہوں۔ رات کو نیلابھ کے گھر پر کھانے کے لیے گیا۔ وہاں اشک جی سے مفصل ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا اردو کلام بھی سنایا۔ اسی دن کے بعد سے میں روز بروز اشک جی سے نزدیک ہوتا گیا۔ ان سے مسلسل مراسلت ہونے لگی۔

انھوں نے ۱۹۳۹ء میں اپنا ضخیم ناول "گرتی دیواریں" شروع کیا۔ ہندی میں اس کے کئی حصوں کو آزاد ناول کے طور پر شائع کیا گیا۔ اس کے پہلے حصے کا نام گرتی دیواریں ہی رکھا گیا۔ یہ اصلاً اردو میں لکھا گیا۔ پہلی جلد کا نقش اول ۱۹۳۹ء میں اور نقش ثانی ۱۹۴۴ء میں مکمل ہوا۔ اردو میں ناشر نہ مل سکا اس کا ہندی ترجمہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اور وہ روپ کہیں جاکر ۸۴ - ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ اشک کا سوانحی ناول ہے جس کی آخری جلد پہلی بیوی کے انتقال دسمبر ۱۹۳۶ پر ختم ہوئی تھی۔ انھوں نے ناول کا اتنا طولانی منصوبہ بنایا کہ کئی ہزار صفحے لکھنے کے باوجود ۱۹۹۶ء کے اوائل میں اسے نامکمل چھوڑ گئے۔ اس کی پہلی جلد گرتی دیواریں بجائے خود ایک مکمل کتاب ہے۔ میں نے اس پر ایک مفصل تبصرہ "گرتی دیواریں ایک عظیم ناول" کے عنوان سے لکھ کر اکادمی سے ستمبر اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع کرایا۔ یہ تبصرہ میرے مجموعے "مقدمے اور تبصرے" میں بھی شامل ہے۔ تبصرہ لکھنے کے لیے میں نے اس ناول کے تین چار بیانات کو غیر فطری بتا کر اشک جی سے تبادلۂ خیالات کیا۔ انھوں نے جملہ واقعات کو اپنی زندگی کے واقعی تجربات کہہ کر میرے اعتراضات کی تردید کر دی۔

اقبال سمان بھوپال کی پہلی نشست میں میں نے اشک کا نام پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس نے تائید کی لیکن دوسرے ارکان نہ مانے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ وہ گرتی دیواریں کو عظیم ناول نہیں مانتے۔ میری رائے میں اس میں پنجاب کے متوسط ہندو طبقے کی زندگی کی جزئیات کو اس طرح فدنمایا ہے کہ پریم چند بھی اس سے زیادہ نہ کر سکتے تھے۔ یہ اشک کا سوانحی ناول ہے۔ ان کی زندگی سیاکوں سے بھرپور اتنی ڈرامائی گذری ہے کہ اس کی روداد خود بخود ایک ناول بن جاتی ہے اس لیے اردو کے سوانحی ناولوں میں یہ سب سے زیادہ دلچسپ ہو۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ مصنف اپنی سوانح بیان کر رہا ہے۔

اس سیریز کا دوسرا ناول "شہر میں گھومتا آئینہ" ہے یہ اردو میں شائع نہ ہو سکا لیکن تیسرا حصہ "ایک ننھی قندیل" آ گیا ہے۔ اشک کے بڑے لڑکے اینش کی رائے میں یہ حصہ پہلے حصے سے بہتر ہے لیکن میں ایسا محسوس نہیں کرتا۔ اس میں اشک نے نہایت شرح و بسط سے اپنی صحافیانہ ملازمتوں کی داستان سنائی ہے جس سے پنجاب کی قبل تقسیم کے اردو اخبارات کا اجمالی آئینہ ہو جاتا ہے لیکن میری رائے میں اس کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے قطع نظر یہ بھی اعلیٰ درجے کا ناول جس میں کہیں دلچسپی کی کمی واقع نہیں ہوتی اس کے پلاٹ میں ضمناً انھوں نے دو امراض کے تیر بہدف نسخے لکھ دیے ہیں۔ ایک کنٹھ مالا (خنازیر) کا، دوسرا ابلتے گھی سے جل جانے کا جو ہر قسم کے جل جانے میں مفید ہونا چاہئے۔ فلاح عام کے خیال سے میں آخر الذکر کو مصنف کے الفاظ میں درج کیے دیتا ہوں۔

ایک سیر میٹھا تیل لے کر آگ پر چڑھا دیا جاتا ہے پھر جب وہ گرم ہو جاتا تو اس میں ایک چھٹانک لونگ ڈال دیے جاتے۔ لونگ جل جانے تو جھرنے سے انھیں الگ کر لیا جاتا اور اس میں ایک پاؤ چھتے کا موم ڈال دیا جاتا۔ موم گھل جاتا تو تیل نیچے اتار لیا جاتا اور اس میں آدھ پاؤ بہترین سندور ڈال کر اس وقت تک گھونٹا جاتا جب تک وہ ٹھنڈا ہو کر گاڑھا مرہم نہ بن جاتا۔ (ص ۲۷۲)

اس مرہم کو بار بار لگانے سے تین چار مہینوں میں کھال اتنی صاف ہو جاتی ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ مریض ابلتے گھی کے کڑھاؤ میں گر کر جلا تھا ان نسخوں کی بدولت یہ ناول صحیح معنی میں افادی ادب ہو جاتا ہے۔

اشک نے عمر عزیز کے ۵۷ سال گرتی دیواریں سیریز کی تصنیف پر لگا دیے۔ اس کا چھٹا حصہ لکھنے کے لیے وہ لاہور کی دھندلائی یادوں کو تازہ کرنا چاہتے تھے انھیں ۱۹۸۰ء میں پاکستان کا ویزا ملا۔ پاکستان سے واپسی پر ۱۹۸۱ء میں اس سیریز کے چھٹے ناول "پلٹتی دھارا" کو شروع کیا اور ۱۹۸۹ء میں مکمل کیا۔ نظرِ ثانی میں انھیں ایسا لگا کہ اس میں بعض جزئیات غلط ہیں۔ اس کی تصدیق کے لیے وہ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں دوبارہ پاکستان گئے اور واپس آ کر مسودے میں بہت قطع و برید کر کے بیضہ تیار کیا۔ حقیقت سے اس وفاداری کی خاطر وہ ضعیفی میں ہماچل چلے گئے اور وہاں پہاڑوں اور جنگلوں کے ان مقامات کو از سر نو دیکھا جن کا ناول میں ذکر کرنا تھا۔ صحت کی یہ پرستش قابل تقلید ہے۔

انھیں اس ناول کا خاتمہ اپنی پہلی بیوی کی موت ۱۹۳۶ء پر کرنا تھا۔ میں مارچ ۱۹۹۵ء میں الہ آباد گیا تو انھوں نے خاتمے کا ذکر کیا۔ افسوس کہ میں نے توجہ سے نہیں سنا۔ ان میں اور مجھ میں بزرگی و خوردی کا رشتہ تھا۔ انھوں نے پردہ داری کے ساتھ ناول کے ہیرو چیتن اور اس کی پہلی بیوی کے آخری

معاملے کا ذکر کیا کہ متقبل قریب الرگ بیوی ایک بار بیر و کے ساتھ جذبے میں تحریک پاگئی جس کا نتیجہ خلوت صحیحہ پر ہوا۔ دونوں کو اس کار میں مکمل طمانیت کا احساس ہوا۔ چند روز بعد مرض الموت زدہ شریک زندگی جان سے جاتی رہی۔ معلوم نہیں اشک اس حصے کو لکھ چکے تھے کہ لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے شاید یہی اس داستانِ بزرگ کا انجام تھا۔

اشک پنجابی تھے۔ تقسیم کے بعد زیادہ تر ہندی میں لکھنے لگے وہ اردو کو اہلِ یوپی کی جاگیر سمجھ کر اپنی تحریروں کی اُردو پر شافی اعتماد نہ رکھتے تھے اپنے مرتبے کے باوجود اپنی بعض تحریروں کو مجھ کم سواد کی نظروں سے گذارنے لگے۔ تاکہ اس میں زبان کی کوئی غلطی ہو تو میں اسے درست کردوں۔ ان کی کتاب میری افسانہ نویسی کے چالیس برس ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ کئی سال پہلے انھوں نے اس کا مسودہ میرے پاس بھیجا کہ میں اس کی زبان کو دیکھ لوں شاید وہ اسے اپنی کہانیوں کے کسی انتخاب کے ساتھ مقدمے کے طور پر شامل کرنا چاہتے تھے۔ اصلاً عنوان میں غالباً ۲۵ برس تھا جسے انھوں نے بعد میں ۴۰ برس بنا دیا۔ میرے مشورے پر اس مقدمے کو علیحدہ کتاب کی شکل دے دی اشک کے ناولوں اور افسانوں کی زبان کافی رواں بامحاورہ اور بعض اوقات شاعرانہ ہوتی ہے لیکن میں اس سوانحی تحریر کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ اسکی زبان و بیان نہایت ناقص صنام کارانہ تھے۔ نثر میں بھی ایک آہنگ ہوتا ہے جو اس تحریر میں مفقود تھا۔ کئی سطروں کے لمبے اور اُلجھے ہوئے جملے تھے میں نے پورے نسخے کی بیشتر سطور کو اصلاح دے کر دوبارہ لکھا، پیچیدہ جملوں کو کئی چھوٹے جملوں میں تقسیم کیا اور انھیں بھیج دیا۔ میرا خیال ہے کہ مسودہ اتنا طویل نہ تھا جتنا اب ہے یعنی اس کا آخری حصّہ میرا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اگر ان کے یہاں میرا درست کردہ مسودہ محفوظ ہو تو معلوم ہو کہ انھوں نے کس حد تک میری تصیحات کو برقرار رکھا۔

اب میں اشک صاحب کی اُدبی زندگی کے ایک دوسرے رخ شاعری کو لیتا ہوں۔ میرے بارے میں انھیں دو خوش فہمیاں تھیں۔ ایک تو میں یوپی کا رہنے والا اردو کا پروفیسر ہوں اس لیے زبان کی صحت اور نزاکت پر عبور رکھتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں ماہر عروض ہوں۔ یاد نہیں کہ وہ کس طرح اپنی غزلیں مجھے اصلاح کے لیے بھیجنے لگے۔ میں نے بہت معذرت کی کہ بطور شاعر میں معزول ہوں۔ کسی دوسرے کے کلام کو کیا سنوار سکتا ہوں لیکن وہ نہ مانے کہنے لگے کہ یہ آپ دیکھ لیا کیجیے کہ میرے اشعار میں وزن اور زبان کی کوئی غلطی تو نہیں۔ آپ انھیں درست کردیں، میرے لیے اتنا کافی ہے۔ ان نہ مان تو میرا استاد کا یہ سلسلہ برسوں تک چلا ہے وہ تھوک میں غزلیں بھیجتے تھے۔ ایک بار دس غزلیں بھیج دیں۔ میرے نزدیک وہ قدیم رنگ کی روایتی غزلیں ہوتی تھیں۔ میں ان میں وزن اور زبان کی خامیاں دور کر دیتا تھا خیال میں ترمیم نہ کرتا تھا۔

وہ سامنے بیٹھے ہوتے تھے تو میں اپنی اصلاح کی وجوہ لکھ دیتا خطوں میں زیادہ تفصیل ممکن نہ تھی۔ ہر غزل کی اصلاح کے بعد کئی خطوں میں بحثا بحثی چلتی۔ بڑے احترام کے ساتھ جھگڑے ہوتے میں اُن کے بہت سے اجنبی یا خالص ہندی الفاظ کو نکال دیتا تو وہ احتجاج کرتے کہ زبان کی لفظیات کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ میں نے ان کا نقطۂ نظر مان لیا اور بعد میں ان اجنبی الفاظ کو برقرار رکھنے کی اجازت دے دی جو ہندی میں رائج ہیں اردو میں اجنبی ہیں۔ کبھی کبھی ان سے بحثوں میں میں بھی کچھ سیکھتا تھا۔ ایک بار انھوں نے ثابت بمعنی سالم استعمال کیا۔ میں نے لکھا کہ بول چال میں میں بھی ثابت بہ معنی سالم استعمال کرتا ہوں مثلاً ثابت اُرد لیکن ثابت کے یہ معنی صحیح نہیں۔ انھوں نے جواب میں جذبی کا مصرع لکھا: جب کشتی ثابت و سالم تھی ... اور کہا کہ وہ بھی تو آپ کی طرح یوپی کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے غلط تو استعمال نہ کیا ہوگا۔ میں نے فرہنگِ آصفیہ نکال کر دیکھی تو ثابت کے معنی میں پورا، سارا، کامل موجود پایا۔

میں نے انھیں لکھا کہ اصلاح میں اس وقت آسانی ہوتی جب آپ اور میں ایک شہر میں موجود ہوتے اور دوبدو وجہ اصلاح بیان کی جا سکتی الٰہ آباد میں شمس الرحمان فاروقی اور عقیل رضوی جیسے عالم اور ماہر عروض موجود ہیں۔ آپ انھیں کیوں نہ دکھا یا کیجیے،، اس پر انھوں نے ان حضرات سے اپنی بے اطمینانی کی وجوہ لکھیں۔ بعد میں اشک نے مجھے بتایا کہ انھوں نے ایک غزل ڈاکٹر عقیل کو ایک ترمیم کو اور چند غزلیں شمس الرحمان فاروقی کو دکھائی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے شمس الرحمان فاروقی ملے۔ کہنے لگے کہ ایک دفعہ اشک صاحب نے ان سے کہا کہ وہ کسی سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ فاروقی نے کہا میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ ملاقات ہوئی تو اشک صاحب نے غزلوں کا ایک پلندہ ان کے سامنے رکھ دیا کہ

اصلاح کر دیں تو وہ بہت احسان مند ہوں گے۔ معلوم نہیں فاروقی صاحب اس مرحلے سے کیوں کر گذرے ہوں گے۔ کہتے تھے کہ آپ نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا۔

میں ان کی غزلوں کے خیال سے پریشان تھا۔ ظاہر زادہ بہت روایتی انداز سے مبتدیانہ شعر کہتے تھے۔ ایک بار اشعار میں تصوّف کے مضامین تک ڈال دیے میں نے جسارت کر کے لکھا کہ آپ بیسویں صدی میں اٹھارہویں صدی کی شاعری کر رہے ہیں اس پر انھوں نے انکشاف کیا کہ وہ اشعار دو صورتوں میں کہتے ہیں ایک تو جب وہ ناول لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں تو تکان دور کرنے کے لیے شعر کہتے ہیں دوسرے یہ کہ جب بیماری میں بہت تکلیف ہوتی ہے تو درد کو بھلانے کے لیے غزل کہنے لگتے ہیں۔ کہتے تھے کہ بیمار جسم کے باوجود ان کا ذہن بہت فعّال ہے اس لیے شعر کہنا ان کی مجبوری ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جن شعروں کو میں روایتی کہتا ہوں ان میں ہر ایک کے پیچھے ان کا کوئی ذاتی تجربہ چھپا ہوتا ہے۔ وہ کئی نادیدہ قدر دانوں کا ذکر کرتے تھے جو ان کی شاعری کے دیوانے ہیں۔ غرض کہ اکثر سخن وروں کا یہ گمان تھا کہ وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔

ایک بار آج کل میں ان کی تین غزلیں ایک صفحے پر شائع ہوئیں۔ اچھی خاصی تھیں۔ میں شاعری میں ان کے مبلغ علم سے واقف تھا مجھے یقین ہو گیا کہ کسی کی درست کی ہوئی ہیں۔ ان کے پاس رسالہ آج کل نہیں آتا۔ ادارے نے وہ شمارہ بھی نہیں بھیجا جس میں ان کی تین تین غزلیں تھیں۔ میں نے ان کے پہلے مصرعے کو لکھ کر ان سے پوچھا کہ یہ کس کی بنائی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ ہی کی۔ سچ یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ واضح کر دوں کہ میں ان کے کلام میں صرف زبان اور وزن کی اصلاح کرتا تھا۔ خیال تو بہت کم بدلتا تھا۔ بعض اوقات وہ قافیے میں ایسا لفظ لے آتے جو اس وزن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسے موقعوں پر قافیہ اور پورا مصرعہ بدلنے میں بڑی سر مغزی کرنی پڑتی تھی۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ میں نے ان کی کسی نثری نظم کی اصلاح نہیں کی۔ آج کل ہندی کی بیشتر شاعری وزن سے آزاد منثور ہوتی ہے۔ اشک نے اردو میں بھی ہندی کی طرح نثری نظمیں لکھی ہیں۔ انھیں میری نظر سے گذارنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے اور ان کے بیچ اصلاحِ سخن کی داستان دو حصّوں میں ملتی ہے۔ ان کے خطوط میرے نام اور میرے خطوط ان کے نام۔ انھوں نے مجھے جو کچھ بھیجا وہ سب میں نے انجمن ترقی اردو میں بھیج دیا ہے۔ کوئی اس کا مطالعہ کرے تو ان کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ جان سکے گا اس سلسلے میں دوسرا نصف ان کے نام میرے خطوط میں بند ہے۔ اگر یہ ان کے یہاں محفوظ ہوں تو اُن کی شاعری کے بارے میں دلچسپ معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں۔

ان سے اپنی آخری دو ملاقاتوں کا بیان کرتا ہوں غالباً ۱۹۹۳ء میں رام لعل نے فخر الدین میموریل کمیٹی کی جانب سے منٹو سیمینار کرایا جس میں شرکت کے لیے اشک لکھنؤ آئے میں نے انھیں رام لعل کو اور ہندی کے ناول نگار شری لال شکلا کو اپنے یہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ شری لال الٰہ آباد یونیورسٹی کے پی سی بنرجی ہوسٹل میں میرے کمرے سے ایک کمرہ چھوڑ کر رہتے تھے۔ مجھ سے کئی سال جونیر تھے۔ ان سے میرے قدیمی مراسم چلے آتے ہیں۔ میں نے دن میں سیمینار میں اشک صاحب کو بتایا کہ کھانے پر شری لال اور رام لعل کو بھی بلایا ہے اشک نے کہا کہ وہ شری لال کے گھر جا کر انھیں لیتے ہوئے آئیں گے۔ میں نے کہا کہ شام کو شری لال کے شغل کا وقت ہوتا ہے۔ اشک جی نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہم بھی پی لیں گے۔ میں نے سب کو ساڑھے سات یا آٹھ بجے آنے کا وقت دیا تھا۔ یہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد تک بھی نہ آئے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی جھلاہٹ بھی تھی میں نے امید چھوڑ دی تھی کہ دس بجے کے قریب اشک، شری لال اور ان کی بیوی آ گئیں، رام لعل کو بھی بلا لیا گیا۔

بعد میں شری لال نے بتایا کہ اشک جی نے اصرار کر کے بہت پی لی تھی میرے یہاں چلتے وقت بھی وہ کسی قدر سرور معلوم ہوتے تھے۔ اس کے اثر سے باتیں دلچسپ کرتے رہے۔ کہنے لگے کہ ان کے والد باہر سے ایک پیگ پی کر آتے تھے تو آواز دیتے تھے کہ اُپندر، دو پیگ یا تین پیگ پی کر آتے تھے تو جس جس نام سے پکارتے تھے، اشک جی نے تینوں کی نقل اس مزاحیہ انداز میں اتاری کہ سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اسی نشست میں وہ افسانہ نگاری کے معاملے میں رام لعل سے الجھتے رہے اور انھیں سخت باتیں کہہ گئے لیکن وہ اُن کے احترام میں سب کچھ برداشت کر گئے۔

ان سے میری آخری ملاقات مارچ ۱۹۹۵ء میں ہوئی ڈاکٹر جعفر رضا

کا شکر گزار ہوں کہ اکبر الہ آبادی سیمینار کے سلسلے میں ۱۶ سال بعد مجھے الٰہ آباد جانے کا موقع ملا۔ سیمینار کے دوسرے دن اشک جی کے یہاں کھانے پر گیا۔ ان کا مکان دیکھا، کوشلیا جی سے ملاقات ہوئی اشک جی نے وہیں کئی غزلوں کی اصلاح کرائی۔ ان کا مطالعہ اور تصنیف کا کمرہ دیکھا۔ اس میں لکھنے کے تین قسم کے انتظام تھے۔ ایک تو معمول کی میز کرسی تھی۔ دوسرا یہ کہ پلنگ کے وسط میں ایک نیچی چوکی یا ڈیسک رکھا تھا کہ جی چاہے تو پلنگ پر بیٹھ سکیں تیسرے یہ کہ ایک پانچ فٹ اونچا ڈیسک تھا جس کے سامنے کھڑے ہو کر لکھ سکتے تھے چونکہ وہ بدن کے درد کے مریض تھے اس لیے تحریروں کے مختلف قسم کے ڈیسک بنوا رکھے تھے تاکہ حسب ضرورت استعمال کر سکیں۔

اشک صاحب کا یہ مکان باغ و بہار ہے معلوم نہیں اسکی چمن بندی کا کیا انتظام تھا مکان کے سلسلے میں ہمیشہ بعض بد معاش پڑوسیوں سے صف آرا رہے اشک انھیں مافیا کہا کرتے تھے اور ان سے پریشان رہتے تھے۔ ان سے فوجداری تک کی نوبت آئی۔ مقدمہ بازی ہوئی، اشک صاحب اور ان کا بیٹا امیش آخری چند برسوں میں معاشی تنگ دستی کی شکایت کرتے رہے یہ بھی کہتے تھے کہ ان پر تین ساڑھے تین لاکھ کا قرضہ ہے۔ میں نے انھیں رائے دی کہ بنگلے کا ایک قطعہ زمین فروخت کرکے قرضہ چکا دیا جائے وہ اس کے لیے تیار نہ تھے ان کی وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ کسی تنگ دست کا مکان ہے۔

چونکہ وہ ہمیشہ سب سے چومکھی لڑتے رہے اس لیے ہندی والوں نے انھیں کوئی انعام نہیں دیا۔ اردو میں بھی آخر کے دو تین برسوں سے پہلے انھیں کسی انعام سے نہیں نوازا گیا جب یوپی اردو اکادمی نے انھیں مجموعی خدمات کا دس ہزار کا انعام دیا تو وہ خوش ہوئے کہ آخر اردو والوں نے انھیں اردو کا ادیب تو مانا۔ میں بھوپال کے اقبال سمان کی پہلی جیوری کا رکن تھا۔ میں نے ان کا نام پیش کیا خواجہ احمد عباس نے دبے الفاظ میں تائید کی۔ دوسرا کوئی اس کے لیے تیار نہ ہوا اب کی بار دسمبر ۱۹۹۵ء میں مجھے بھوپال سے کسی نے لکھا کہ میں اس جیوری کا رکن مقرر کیا گیا ہوں اور اسکی میٹنگ دہلی میں ۸ جنوری ۱۹۹۶ء کو ہوگی میرے پاس کوئی اطلاع نہ آئی میٹنگ کے بہت دنوں بعد مجھے باقاعدہ سرکاری دعوت نامہ ملا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری عدم شرکت کے باوجود آخری لمحے میں اشک کو اس گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا معلوم نہیں کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں اس کی اطلاع پا سکے یا نہیں۔

وہ اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں بیمار رہے ہیں ۱۹۴۶ء میں دق ہو گئی تقریباً ڈیڑھ سال پنج گنی کے سینی ٹوریم میں رہے بعد میں دمہ بھی ہو گیا جو آخری وقت تک ان کا شریک رہا۔ اس پر مستزاد ارتھرائٹس یعنی جوڑوں کا درد، ایسا بیمار بدن، ایسی بر سر پیکار شخصیت، ایسا فعال و مضطرب دماغ! وہ جس طرح اپنے ادبی حریفوں سے لڑتے رہے اس طرح گوناگوں امراض کے سامنے بھی سپر انداختہ نہ ہوئے۔ ان سب کے باوجود ۸۵ سال سے زیادہ جیے۔ میں اپنی بے ربط تحریر کو ان کے لڑکے امیش کے ۱۹ فروری ۱۹۹۶ کے ایک خط کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں جس میں اقبال سمان کا بھی ذکر ہے۔

"صحت تو ان کی پچھلے سال سے ہی گرنے لگی تھی پچھلے کئی مہینوں میں چوٹ پر چوٹیں کھاتے رہے۔ دو بار تو مہینہ مہینہ بھر بستر میں پڑے رہے اور خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ علاج چل رہا تھا کہ تیسری بار جب وہ گرے تو کولہے کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی اور ہم انھیں اسپتال لے گئے ڈیڑھ دو ماہ کے علاج کے بعد ہڈی تو لگ بھگ جڑ گئی تھی لیکن کئی طرح کی دوسری کامپلیکیشنز بڑھتی گئیں۔ ایک کا علاج کرتے تو فوراً کوئی دوسری infection یا (Complications) شروع ہو جاتی

جس طرح وہ عمر بھر سماجی برائیوں، بے انصافیوں اور ظلم کے خلاف لڑتے رہے اسی طرح اپنے آخری دنوں میں موت کے ساتھ بھی سنگھرش کرتے رہے وہ ایک بہادر انسان تھے اور اسی بہادری کے ساتھ موت سے بھی لڑے ڈاکٹروں کی ساری کوششیں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی (کذا) دوائیں، دعائیں، ہم سب کی خدمت گزاری ساری کوششیں بیکار چلی گئیں۔ اصل میں موت سے لڑتے لڑتے وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے، اتنے تھک گئے تھے کہ ۱۹ جنوری کی شام سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی طوفان کے تھپیڑوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک بڑے جہاز کی طرح وہ Sink کر گئے سطح پر رہ گئے جھنڈے جھنڈیاں، بلبوں کی جھالریں جو ہم سب کو دکھ کے بے کنار ساگر میں اکیلا اور اداس چھوڑ گئے۔

افرا تفری کے اس عالم میں اقبال ایوارڈ کی خبر نیم بے ہوشی کی حالت میں ہم سے سنی اور ایک نیم تبسم ان کے ہونٹوں پر پھیل گیا اور اس کے ایک یا دو روز کے بعد وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اس ۱۲ فروری کو میری ماں، نیلابھ اور میرا بیٹا شو بتا بھ بھوپال گئے جہاں انھوں نے یہ ایوارڈ

قبول کیا۔ اور وہیں اس بات کا اعلان بھی کیا کہ ایوارڈ کی اس رقم سے اشک جی کی یاد میں ایک ٹرسٹ شروع کیا جائے گا جو باقاعدہ ان کی تخلیقات کی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے گا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ وہ گرتی دیواریں کو ختم کرنے کی اپنی دیرینہ خواہش پوری نہ کر سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ (کذا) اپنی بیماری کے دوران انھوں نے ایک نیا ڈرامہ پورا کیا جو لکھ تو وہ کوئی ۲۰-۱۵ برس پہلے ہی چکے تھے پر جو ان کے من کے مطابق نہیں بن پایا تھا لیکن اس بیماری میں انھوں نے ایک بار پھر اسے اٹھایا اور اسے پورا کر کے ہی دم لیا۔ پر بیماری نے انھیں اسے ریوائز کرنے کی مہلت نہیں دی، تو بھی اسے پورا کر کے پاپا بہت خوش ہوئے:

□□

یادوں کی رہگزر ۔۔۔۔ صفحہ ۱۸ کا بقیہ

بدل لیے کہ باہر آکر میں اپنا ٹیکہ لے لوں گا۔ وہ مجھ سے دس پانچ منٹ پہلے جیل کے باہر نکلے اور جب تک میں باہر آؤں وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ سواری پر بیٹھ کر چل دیئے۔ اس طویل عرصے میں انھیں بہت ڈھونڈا ان کا بہت سراغ لگایا، لیکن پھر کہیں پتہ نہ چلا۔ اس ڈائری کے ضائع ہونے کا دکھ آج تک ہے۔ (باقی آئندہ)

حواشی:

۱ے سی، پی (سنٹرل پراونسز) کا دارالحکومت ناگپور تھا، اب یہ حصہ مہاراشٹر میں شامل ہو گیا ہے اور ودربھ کہلاتا ہے۔

۲ے مشہور خبر رساں ایجنسی اے، پی، آئی (ایسوشی ایٹیڈ پریس آف انڈیا) موجودہ P.T.I (پریس ٹرسٹ آف انڈیا) کا پرانا نام ہے۔

۳ے اس زمانے میں ریلگاڑیوں میں کئی کلاس ہوا کرتے تھے، عام طور پر فرسٹ، سکنڈ، انٹر اور تھرڈ کلاس۔ اب تھرڈ اور انٹر ختم کر دیے گئے ہیں۔ سکنڈ اور فرسٹ کے علاوہ اے سی۔ ٹو ٹائر، تھری ٹائر، وغیرہ کلاس بن گئے ہیں۔ سیلون پہلے دہ آئی پی افسران یا راجگان کے لیے تھا، اس کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

۴ے یہ قسط لکھ چکا تھا کہ یہ اندوہناک خبر ملی کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ دیا۔ ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانا ہے۔

۵ے افسوس کہ یہ سب ملکِ عدم کے راہی ہوئے (اناللہ!)

اک مردِ خلیق تھے شجاعت صاحب

سرگرم سفر، نرم طبیعت والے
خوش فکر و نظر، علم کی دولت والے
مجموعۂ اوصاف شجاعت صاحب
سرتاپا محبت ہی محبت والے

اخلاق و انکسار والی ہستی
ہر طرح سے اعتبار والی ہستی
لاریب کہ ڈاکٹر شجاعت کی تھی
ہم سب کے لئے وقار والی ہستی

یوں ہی تو نہ تھا قلب تپاں سینے میں
تعمیر کا جذبہ تھا نہاں سینے میں
اللہ نے بخشی تھی انھیں چشم تر
احساس کا روشن تھا جہاں سینے میں

کیا ایسے کھرے لوگ بھی مل پائینگے
ہر بزم سے افسردہ چلے آئیں گے
سب ٹوٹتے جاتے ہیں پرانے سانچے
لائیں گے تو ان جیسا کہاں لائیں گے

اردو کے لیے ان کا سبھی کچھ تھا نثار
گر جان بھی جائے تو نہ تھا اس میں بھی عار
فردوس انہیں کی ہے کہ جو رکھتے ہیں
پاکیزہ شعار اور روشن کردار

ربابہ رشیدی

۱۲۶ - تازی خانہ، لکھنؤ ۱۸

غزلیں

بادل جب برسا کرتے ہیں شام ڈھلے
بھیگے تن سلگا کرتے ہیں شام ڈھلے

پگلی یادوں کے گلدستے کاغذ کے
پھر بھی یہ مہکا کرتے ہیں شام ڈھلے

میری غزلیں پڑھ کر وہ تنہائی میں
جانے کیا سوچا کرتے ہیں شام ڈھلے

پہلے تو کھل کر ملتے تھے ہر اک سے
اب تو وہ پردہ کرتے ہیں شام ڈھلے

دنیا کی مستی جب مرجھا جاتی ہے
میخانے لہکا کرتے ہیں شام ڈھلے

دیپک راگ کی پریاں اترا کرتی ہیں
پردے جب سرکا کرتے ہیں شام ڈھلے

دن کے ہنگاموں سے جیت کے آئے جو
بازی وہ ہارا کرتے ہیں شام ڈھلے

کیا بیکل کو عہدِ جوانی یاد آیا ؟
چھپ چھپ کر رویا کرتے ہیں شام ڈھلے

بیکل اُتساہی
سول لائن - بلرام پور
گونڈہ - ۲۷۱۲۰۱

آج بھی وہ اسی سبھاؤ کا ہے
وہی انداز رکھ رکھاؤ کا ہے

اس کو بھولیں تو کس طرح بھولیں
اس سے رشتہ عجب لگاؤ کا ہے

زندگی کیا ہے کیا بتائیں تمہیں
ہاتھ سے روکنا بہاؤ کا ہے

جی میں آتا ہے بات کرتے جائیں
اس کا لہجہ بھی کیا رچاؤ کا ہے

جو دہکتا ہے میرے سینے میں
یہ تو شعلہ اسی الاؤ کا ہے

زندگی سے نظر ملا کے چلو
راستہ اک یہی بچاؤ کا ہے

منزلیں دور بھی نہیں شبنم
اصل میں مسئلہ گھماؤ کا ہے

شبنم نقوی
۱۸۷۔ بہت گنج
الہ آباد

افسانہ

م. ک. مہتاب
اے ۲/۸، پچھم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

بازو کا درد

یہ کہانی مجھے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے ایک افسر نے سنائی تھی جب میں اس سے ملنے گیا تو اس کے پاس درمیانہ قد کا سفید بالوں والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس نے کچی ٹسر کا نہایت عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس عمدہ کوٹ میں اس کا لٹک رہا فالج زدہ سا ایک بازو نہایت بدزیب بلکہ مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ بات چیت بھی وہ زیادہ اچھی نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کے انگریزی الفاظ کے تلفظ پہ ہنسی آتی تھی۔

اس شخص کے چلے جانے کے بعد میں نے بھٹناگر سے پوچھا کہ یہ مضحکہ خیز شخصیت کون تھی پھر آپ اس سے دفتر کے وقت میں یہ پیار محبت کا کیا قصہ چھیڑ بیٹھے تھے۔ بھٹناگر کہنے لگا۔

"خواہ آپ کو اس شخص کی صورت مضحکہ خیز دکھائی دی ہو یا آپ
کو اس عشق کی داستان میں کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن اس کا
ہمارے بینک کے کاروبار سے قریبی تعلق تھا اس لئے یہاں
یہ بات نامناسب نہیں تھی۔"

بھٹناگر نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مجھے سگریٹ پیش کر کے بولا سریندر تم جس شخص کی بھونڈی شکل اور زبان کے تلفظ کا مذاق اڑا رہے ہو وہ ہمارے چند امیر گاہکوں میں سے ایک ہے۔ اس کا چمڑے کی برآمد کا بہت بڑا کاروبار ہے ٹھیک ہے کہ وہ معمولی پڑھا لکھا ہے لیکن تمہارے جیسے کتنے ہی پڑھے لکھے افراد اس کے اداروں میں کام کرتے ہیں۔ اس کا کاروبار غیر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ دیکھنے میں سیدھا ہے لیکن کاروبار میں پختہ کار ہے۔ ہمیں بھی چکرا چکا ہے۔

"اور یہ لٹکتا ہوا بازو۔۔؟ میں زور سے ہنسا۔"

ہاں۔ ہاں۔ بہت بھونڈا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کی بھی ایک داستان ہے۔ کیا سنو گے؟

بھٹناگر نے چائے کی پیالی اٹھائی اور کہنے لگا۔

شہر سے پچاس کوس دور ایک گاؤں باغ بوٹے شاہ ہے۔ یہ دلتوں کی بستی ہے۔ یہ شخص جس کا نام کالی چرن ہے وہاں کا رہنے والا ہے۔ باغ بوٹے شاہ کے قریب ہی ایک گاؤں باغ بسنت سنگھ ہے۔ یہ جاٹوں کا گاؤں ہے۔ باغ بوٹے شاہ کے دلت اپنے گاؤں میں کام کرنے کے علاوہ باغ بسنت سنگھ کے زمینداروں کے کنبوں اور گھروں میں بھی کام کرتے ہیں۔ کالی چرن کا باپ بھی چمڑا رنگنے کا کام کرتا تھا۔ لیکن کالی کو اس کام میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ محنت زیادہ اور آمدنی کم ہوتی تھی۔ وہ ایک صحت مند جوان تھا بھیگتی میں پھڑکتے پٹھے، بولتی آنکھیں سرخ رنگ۔ وہ کچھ اور کرنا چاہتا تھا لیکن والد کی چادر اتنی تنگ تھی کہ کہیں پاؤں پھیلانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس پر دلت ہونے کا سماجی دھبہ۔ وہ باغ بسنت سنگھ کے ایک زمیندار کے ہاں تانگہ چلانے لگا۔ اُن کی سواریاں اور سامان شہر لے جاتا۔ اور وہاں سے بیج کھاد وغیرہ گاؤں لاتا۔ رات کو گھر لوٹ کر مٹی کے تیل کے دھواں چھوڑنے والے چراغوں کی روشنی میں باپ کے ساتھ چمڑا صاف کرتا۔

آہستہ آہستہ کالی سوداگر سنگھ کے ہاں دیر تک رکنے لگا۔ اس کا سبب تھا سوداگر سنگھ کی لڑکی بلونت جسے سب پیار سے بلّو کے نام سے پکارتے تھے بلّو بسا اوقات کالی کے ساتھ شہر بھی جاتی۔ وہ اگر شہر میں کچھ کھانے پینے کے لئے رکتی تو کالی کو بھی یہ چیزیں خرید دیتی۔ کبھی کوئی کپڑا خرید دیتی کالی بلونت سے کہتا کہ وہ اس کی دی ہوئی چیزیں نہیں کھا سکتا۔ اس کا دیا ہوا صافہ کرتا نہیں پہن سکتا۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ وہ دلت ہے لوگ۔ اس کا کچھ بھی مطلب نکال سکتے ہیں اور اگر کسی کے کان میں بلونت کی ان نوازشات کی بھنک بھی پڑ گئی تو بلونت کا تانگے پر شہر جانا بند کر دیا جائے گا۔ لیکن بلونت اُسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتی۔

کون کہتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ کسی کے باپ سے پیسے لے کر تمہیں مٹھائی نہیں لے دیتی۔ کیا ایک انسان دوسرے انسان کو ہمدردی کے ناطے کچھ کھلا

نہیں سکتا۔۔؟ اگر دلت اور جاٹ الگ الگ مٹی سے بنائے جاتے ہیں تو بابا نانک نے کیوں کہا تھا کہ ایک نور سے سب جگ اُپجیا؟

کالی بلونت کی دلیلوں سے لاجواب ہوکر کہتا۔

”بلو تم پڑھے لکھے لوگوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ جاٹ جاٹ ہوتے ہیں اور دلت دلت۔ تم دھرتی کے مالک اور ہم گندے پانی کے کیڑے۔ یہ کہتے کہتے اس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ لگام ڈھیلی پڑ جاتی۔ بلو اُس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتی۔“ بس بس دیکھو گھوڑا بے قابو ہو رہا ہے۔ لگام مجھے دے دو۔ جنگل کی سنسان سڑک پر تانگہ دوڑاتے ہوئے کتنا لطف آتا۔ اور کئی بار وہ اکٹھے باگ تھام لیتے۔

کالی کے چمڑے کی بدبو جب سوداگر سنگھ کے گھر تک پہنچنے لگی تو کالی کو کام سے ہٹا دیا گیا۔ بلو نے کالی کو ایک ٹرک والے کے پاس کلینر کی نوکری دے دی۔ کالی کئی کئی روز گاؤں سے باہر رہنے لگا۔ فاصلہ بڑھ جائے تو الفت کی چنگاریاں شعلے بن جاتی ہیں۔ بلو بے چین سی رہنے لگی۔ ایک روز رام سنگھ کا ٹرک گاؤں آیا ہوا تھا تو بلو نے رام سنگھ کے ہاتھ کالی کو کسی کام سے بلا بھیجا۔ رام سنگھ پیار کا یہ پیغام ہضم نہیں کر سکا۔ باغ بسنت سنگھ کے جاٹوں میں کہرام مچ گیا۔

ایک گندی نالی کو گنگا کا راستہ کاٹنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ فیصلہ ہوا کہ پیشتر ازیں کہ کوئی دلت ایسی حرکت کرے باغ بوٹے شاہ کی بستی اجاڑ دی جائے۔ جلا دی جائے۔ ابھی یہ فیصلہ ہو ہی رہا تھا کہ کالی بلونت سے ملنے اُدھر سے جاتا دکھائی دیا۔ کچھ نوجوانوں نے بھاگ کر کالی کو دبوچ لیا۔ کالی ہاتھ جوڑتا رہا اور لاٹھیاں برستی رہیں۔ جاٹوں نے اس جوان کو مردہ سمجھ کر اٹھا کر قریب کے ایک کھیت میں پھینک دیا۔ کالی کو ختم کرنے کے بعد غصے کا طوفان اتر گیا اور مجمع کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

رات ہوئی تو کوئی شخص کالی کی نعش گدھے پر لاد کر باغ بوٹے شاہ پھینک آیا۔ بدقسمتی سے کالی ابھی زندہ تھا۔ بستی کے لوگ اُسے چمڑا رنگنے کے ایک شعبہ میں لے آئے۔ کالی کے جسم پر لیپ کیا جا رہا تھا۔ ارد گرد کتنے ہی مرد عورتیں بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ لیکن کسی میں جرأت نہیں تھی کہ پولیس کو خبر کرتا یا باغ بسنت سنگھ جا کر تھانے میں رپٹ درج کراتا۔ صدیوں کی غلامی سے دبے ہوئے لوگ کالی کو ہی قصوروار ٹھہرا رہے تھے کہ اس نے ایسی جرأت کیوں کی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ بلا ٹلی ورنہ جاٹ تو باغ بوٹے شاہ کی پوری بستی کو ہی جلا دیتے۔

کالی کو چپکے سے شہر لے جا کر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ علاج کے دوران کالی کے قریب پڑے ایک اور زخمی نے اس کا احساس کمتری دور کرنے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ چھوت چھات تو غریبی اور امیری کا دوسرا نام ہے۔ یہ امتیاز غریبوں کو دبائے رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ کوئی برہمن جوتہ ساز کارخانہ لگا کر دلت نہیں بن جاتا لیکن جوتہ گانٹھنے والا ایک دلت دلت ہی رہتا ہے کیوں کہ وہ غریب ہے۔ کالی کو اپنا آبائی پیشہ چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ کام کوئی بھی بُرا نہیں ہوتا بشرطیکہ اُسے ڈھنگ سے کیا جائے اور وہ منافع بخش ہو۔ اگر دوسرے ملکوں کے جوتا بنانے والے سماج کے اعلیٰ ترین طبقہ میں شمار ہوتے ہیں تو ہمارے ملک میں وہ کیوں دبے ہوئے ہیں۔

اُسی شخص کے مشورہ پر جو کہ ایک سرکاری افسر تھا کالی نے چمڑا رنگنے والوں کی ایک کوآپریٹو انجمن بنائی۔ آہستہ آہستہ باغ بوٹے شاہ میں ایسی کئی انجمنیں وجود میں آگئیں۔ چمڑے کی مانگ بڑھی تو قیمت اور منافع بھی بڑھا۔ کاروباری طریقوں میں تبدیلی آئی۔ چھوٹی صنعتوں کی مدد کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ان کی مدد کے لئے آگے بڑھے۔ پھر اسٹیٹ بینک نے باغ بوٹے شاہ کو اپنا لیا۔ اپنا سرمایہ گاؤں میں لگایا۔ کاریگروں کو نئے اوزار ملے۔ کارخانے والوں کو فنی تربیت۔ بجلی آئی تو کام مشینوں پر ہونے لگا۔ پیداوار کئی گنا بڑھ گئی۔ کچی کھالوں کی بجائے تیار چمڑا باہر بھیجا جانے لگا۔ کچے کوٹھے پختہ عمارتوں میں تبدیل ہو گئے۔ درمیانہ داروں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ کلکتہ اور کانپور کے تاجر سیدھے باغ بوٹے شاہ آنے لگے۔

اور جب نئی پود کے نوجوان مال کی خرید و فروخت کے لئے دساور جانے لگے تو باغ بوٹے شاہ کی کایا ہی پلٹ گئی۔ لاکھوں روپیہ بطور قرض ملنے لگا۔ وقت کی کروٹ کے ساتھ کالی چرن کی کمپنی کالی چرن اینڈ سنز کے نام سے مشہور ہو گئی۔ کالی چرن کے ایک بیٹے نے شہر کے پالی ٹیکنک سے تربیت پائی اور اس کے بعد اعلیٰ تربیت کے لئے سویڈن چلا گیا۔ تین برس بعد جب وہ سویڈن سے لوٹا تو ہربنس کے ساتھ ایک سویڈش لڑکی بھی تھی۔ اب اُن کے لئے گاؤں میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے شہر میں ایک عمدہ مکان خریدا اور جدید طرز زندگی اختیار کر کے رہنے لگے۔ پھر کسی کو اُن کا بازو کچلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

بھٹناگر کہہ رہا تھا۔ ”ہم خوش ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے بینک کی بدولت ہوا ہے۔ لیکن کہانی یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتی سریندر بابو۔ کیا ایک پیالہ چائے کا اور چلے گا؟“ بھٹناگر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا اور کہنے لگا۔

کچھ روز پہلے ایک سردار جی میرے پاس آئے وہ قریبی ضلع کے ایک درمیانہ

درجہ کے کسان تھے۔ ہمارے بینک نے انہیں ٹریکٹر خریدنے کے لئے قرض دیا تھا ان کے لڑکے کی یونیورسٹی تعلیم کے لئے بھی ہم نے مدد دی تھی۔ سردار سجن سنگھ کو ایک مسئلہ پیش تھا جسے حل کرنے میں میری مدد چاہتے تھے۔ ان کا لڑکا درشن جو مقامی کالج میں ملازم ہے اُسی کالج کی ایک طالبہ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ یہ دلچسپی بڑھتے بڑھتے عشق اور پھر جنون کی حد کو چھونے لگی تھی۔ لڑکی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے گھر جا چکی ہے لیکن درشن کو ضد ہے کہ اگر وہ شادی کرے گا تو اُسی لڑکی سے کرے گا۔

میں نے درشن کو بلا کر دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ز ملاسرز کالی چرن اینڈ سنز کے ایک ڈائرکٹر بر جنس کی لڑکی ہے اس کی والدہ غیر ملکی ہے۔ میں نے درشن کو کالی چرن کی کاروباری نوعیت اور ذات برادری کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ لیکن درشن کا کہنا تھا کہ ذات پات سب ڈھکوسلہ ہے۔ لڑکی کے والدین اس لئے رضامند نہیں کہ وہ بہت بڑے تاجر اور ہم معمولی کسان ہیں۔ لڑکی کے بھائی اس کی شادی غیر ملک میں ہی کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کالی چرن کو بلا کر اس تجویز پر غور کرنے کے لئے کہا تو اس نے یہ کہہ کر تجویز رد کر دی کہ شہر کی تعلیم یافتہ لڑکی دیہات کی زندگی پسند نہیں کرے گی۔

کچھ روز بعد جب سجن سنگھ پھر بینک آیا تو میں نے اسے کالی چرن کی نارضامندی سے آگاہ کر دیا۔ لیکن سجن سنگھ کی بیوی جو اس کے ساتھ آئی تھی بضد تھی۔ اُسے اپنے اکلوتے بیٹے کی جان عزیز تھی۔ اُسے کسی جہیز یا دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن کالی چرن کے لڑکوں کی دلیل کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے سجن سنگھ کی بیوی کو بتایا کہ لڑکی سویڈن جا کر مزید تعلیم حاصل کرے گی اور شاید شادی بھی وہیں کرے گی۔

وہ میاں بیوی میری بات سے مایوس ہو گئے۔ پھر سجن سنگھ کی بیوی کہنے لگی۔

"میں لڑکے کی ماں ہوں۔ آپ ایک بار میرے لئے پھر کوشش کیجئے۔ آپ لڑکی کے دادا سے کہیں کہ لڑکے کی ماں بلونت یہ دکھاوا لے کر آئی تھی۔"

میں نے کالی چرن سے فون پر بات کی۔ وہ بہت مصروف تھا پہلے تو بات سننے کے لئے ہی تیار نہیں تھا پھر پوری بات سن کر کہنے لگا کہ اچھا وہ کسی روز بینک آکر بات کرے گا۔

چنانچہ آج کالی چرن آیا تھا۔ بالکل بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ تھکا سا

گویا کئی روز سیانہ ہو۔ ایک ٹوٹا ہوا آدمی۔

وہ مجھے بتا رہا تھا کہ وہ میری پوری بات سن کر پوری نیند سو نہیں سکا۔ اسے یوں دکھائی دیتا تھا گویا اس کا یہ لٹک رہا بازو پھر درست اور توانا ہو گیا۔ کسی جاٹ کی گردن اس کی گرفت میں آگئی ہو۔ جیسے گاؤں کے سب جاٹ مل کر پھر اُس کے جسم پر لاٹھیاں برسا رہے ہوں میرا ذہن کہتا تھا۔ کالی آج اُن لاٹھیوں کا بدلہ لینے کا موقع ہے۔ میں دو دن سے بدلے کی اسی آگ میں جل رہا ہوں۔ لیکن آگ سب کمزوروں کو بھی تو جلا دیتی ہے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ اگر میں چھوت چھات کو ظلم سمجھتا تھا تو آج میں یہ ظلم کیوں کر رہا ہوں؟ ذات امیری اور غریبی کا دوسرا نام ہے۔ میں اب اپنی دولت کی دیوار لڑکی کے راستے میں کیوں کھڑی کر رہا ہوں؟ بلونت نے مجھے ذلت نہیں سمجھا تھا تو میں اپنے کو بڑا کارخانہ دار کیوں خیال کروں۔

بھٹناگر صاحب! اگر بلونت اب آپ کے پاس آئے تو اسے کہہ دیجئے کہ کالی کو نہ پہلے اعتراض تھا اور نہ اب ہے۔"

غزل

وہ بال جو بکھرا کے لبِ بام نہ آئے
شام آئے مگر اتنی حسیں شام نہ آئے
اے مے کشو! گردش میں کوئی جام نہ آئے
جب تک نگہِ ناز کا پیغام نہ آئے
ہے میری توجہ ابھی طوفان کی جانب
ساحل کی طرف سے کوئی پیغام نہ آئے
کل رات جو گذرا ہے وہ ہنگام نہ آئے
ہر صبح یہ کہتا ہوں کہ اب شام نہ آئے
یوں عشق کی راہوں سے گذر جوشِ جنوں میں
دامن پہ مگر بھولے سے الزام نہ آئے

مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی
گولہ گنج۔ لکھنؤ

انشائیہ

ڈاکٹر عطیہ خان

اَولادِ نرینہ

ہماری امریکن دوست ایلیسن ایک دن جب ہم سے ملنے آئیں تو ہم ان کی جگمگاتی ہوئی نئی مرسڈیز دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ چند مہینے پہلے تک تو ان کے پاس بھی ہماری ہی جیسی ایک گھٹیا قسم کی کار تھی۔

ہم لوگ جب ہندستان سے لندن آئے تو اس سے چند مہینے قبل ہی وہ لوگ امریکہ سے آئے تھے۔ جس پرانی بلڈنگ میں ایک فلیٹ ہم نے کرایہ پر لیا تھا اس میں سامنے والے فلیٹ میں ایلیسن کرایے پر رہتی تھیں باقی سب فلیٹوں میں بوڑھے انگریز مرد اور عورتیں رہتے تھے جنھوں نے غالباً اپنی زندگیاں اسی بلڈنگ میں گزاری تھیں۔ ہم دو غیر ملکی خاندان اس بلڈنگ میں آکر رہنے لگے تو اس بلڈنگ کے دوسرے فلیٹوں میں رہنے والے انگریز ہم لوگوں کو بڑی حقارت اور نفرت سے دیکھتے اور ہم لوگوں کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے عمر اور حالات کی یکسانیت کی وجہ سے ہماری ایلیسن سے گہری دوستی ہو گئی اور یہ دوستی اس وقت بھی قائم رہی جب ہم لوگ اپنے اپنے مکان خرید کر مختلف سمتوں میں جا بسے۔

ہمیں اپنی مرسڈیز کی طرف متوجہ دیکھ کر ایلیسن نے ہمیں بتایا کہ ان کے اکلوتے ماموں کی کوئی اولاد نہیں تھی اور ان کی بیوی بھی چند سال پہلے مر چکی تھیں۔ چند ماہ قبل ان کے ماموں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور وہ اپنی وصیت میں اپنا سارا سرمایہ ایلیسن اور ان کی بہن کے نام چھوڑ گئے۔ ایلیسن کے حصہ میں ڈیڑھ لاکھ پونڈ آئے تو انھوں نے یہ نئی مرسڈیز خرید کر اپنی دیرینہ خواہش پوری کی۔ ہم خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے تو انھیں خیال آیا کہ اچانک ان کی اور ہماری حیثیت میں جو ڈیڑھ لاکھ پونڈ کا فرق آگیا ہے اس سے شاید ہمارے اندر کچھ احساس کمتری پیدا ہو جائے۔ تسلی دینے کے لئے بولیں۔

"ہوسکتا ہے کسی دن تمہارے بھی کوئی انکل اسی طرح وصیت میں تمہارے لئے دولت چھوڑ جائیں۔"

"اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے انکل کے پاس ہمیشہ دولت کم ہوتی ہے اور بچے زیادہ" ہماری یہ بات سن کر وہ اس طرح ہنسیں جیسے ہم نے انھیں کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

ایلیسن سے بیس سال پرانی دوستی سے ایک بات ہمارے ذہن میں واضح ہو چکی ہے کہ مشرق اور مغرب کے لوگ آپس میں دوستی تو کر سکتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہم انھیں یہ کیسے سمجھاتے کہ ہمارے یہاں شادی کرنا اور وارث یعنی لڑکے پیدا کرنا سب سے زیادہ ضروری کام سمجھا جاتا ہے۔ خواہ ورثہ میں چھوڑنے کے لئے کچھ ہو یا نہ ہو۔ ہر شخص اپنا نام اور خاندان چلانے کے لئے زیادہ سے زیادہ لڑکے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ ان میں اکثر حضرات تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا خاندان نہ ہی چلے تو اس میں سماج کی بہتری ہے۔

ایک بار ہم اپنی ایک دوست کے گھر بیٹھے تھے کہ ایک بوڑھی سوکھی عورت ایک مریل سے بچے کو گود میں لٹکائے ہوئے آئی کہ جاڑا گزارنے کے لئے کچھ کپڑے اسے مل جائیں۔ اس کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ پیچھے جو ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں یہ وہیں رہتی ہے۔ اس کا بیٹا رکشا چلاتا ہے۔ اس کی چھ بیٹیاں ہیں ہر بار جب بیٹی پیدا ہوتی تو یہ بڑھیا اور اس کا بیٹا بہو سے ناراض ہوتے اور اسے مارتے پیٹتے۔ دو وقت کھانا بھی اسے نصیب نہ ہوتا بیچاری سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اور اس لڑکے کی پیدائش میں ختم ہو گئی لیکن بڑھیا خوش ہے کہ اس پوتے سے خاندان کا نام چلتا رہے گا۔ یہ اس طبقے میں اولادِ نرینہ کی خواہش کی مثال ہے جہاں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی' اور ہندوستان میں اس طرح کے بے شمار لوگ نظر آتے ہیں جنھیں دیکھ کر دلاور فگار کا یہ شعر بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

جنھیں روٹی نہیں ملتی وہ دس بچوں کے والد ہیں یہ غربت اور یہ جوشِ جوانی دیکھتے جاؤ

پڑھے لکھے متوسط طبقے میں بھی اولاد نرینہ کی خواہش اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔ لوگ دولت پیدا کرنے کی کوشش کم اور وارث پیدا کرنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں۔ اگر دو چار لڑکیاں پیدا کر کے بیوی نے فل اسٹاپ لگا دیا تو بیٹا پیدا کرنے کے لئے دوسری شادی سے بھی نہیں چوکتے۔

ایک بار ایک بزرگ خاتون سے ملاقات ہوئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان کی بہو اسپتال میں تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ہسٹریکٹمی ضروری ہے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ ہم نے ان خاتون کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا کہ انھیں اپنی بہو سے کتنی محبت ہے کہ اس کے آپریشن کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ فکر کی بات نہیں، بہو جلد ٹھیک ہو کر گھر آجائے گی۔

"بہو تو ٹھیک ہو جائے گی مگر بچہ تو اب نہیں ہو سکے گا۔"

"تو کیا ہوا ماشاء اللہ تین خوبصورت بیٹیاں تو موجود ہیں۔" ہم نے پاس بیٹھی ہوئی ان کی تینوں پوتیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اولاد نرینہ تو نہیں ہے۔" انھوں نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔ بیٹے کو اتنا سمجھایا کہ آپریشن نہ کراؤ لیکن آج کل کے لڑکے ایسے سرپھرے ہوتے ہیں کہ بیویوں کے پیچھے خاندان کا بھی خیال نہیں کرتے۔" جب ان کی بات پوری طرح سمجھ میں آئی تو ہماری روح کانپ گئی۔ اولاد نرینہ کے لئے یہ بزرگ اپنی بہو کو موت کے گھاٹ اتار کر بیٹے کی دوسری شادی کروانا چاہتی تھیں۔

ہمارے یہاں اپنا نام چلانے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ صاحبِ حیثیت ہو یا نہ ہو، صاحبِ علم ہو یا نہ ہو، صاحبِ عقل ہو یا نہ ہو صاحبِ اولاد ضرور بننا چاہتا ہے۔ اور صرف صاحبِ اولاد ہی ہونا کافی نہیں، صاحبِ اولادِ نرینہ ہونا ضروری ہے۔ اور اسی کوشش میں اکثر لڑکیوں کی قطار لگ جاتی ہے جن کو سر کا بوجھ سمجھ کر کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ساتھ شادی کر دی جاتی ہے۔

ہر بار جب ہم ہندوستان جاتے ہیں تو ہمیں اپنے محلے کی گلیوں میں دبلے سوکھے، ننگے دھڑنگے، نالیوں پر بیٹھے حوائجِ ضروری سے فارغ ہوتے ہوئے بچوں کی تعداد میں اضافہ نظر آتا ہے۔ ہماری بھتیجی جو خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے میں ڈاکٹر ہے ہم نے اس سے کہا۔

"دیکھو یہ محلے کی غریب عورتیں ہندوستان کے ننگے بھوکے لوگوں کی تعداد بڑھانے کے لئے جان دیئے دیتی ہیں، تم ان کے لئے کچھ نہیں کرتیں؟"

"میں ان کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ انھیں میرے پاس آنے کے لئے تیار کر لیجئے۔" اس نے چڑھ کر جواب دیا۔ "مجھے وہ بڑی حقارت سے دیکھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں سرکار کی ایجنٹ ہوں اور ان کے خاندان کا نام مٹانا چاہتی ہوں۔"

ہندوستان کی آبادی دن دونی رات چوگنی ہونے کی وجہ ہر امیر و غریب کی یہی خواہش ہے کہ اس کا نام چلانے کے لئے دو چار بیٹے ضرور پیدا ہوں۔ دولت مند لوگوں کے لئے تو اولاد نرینہ کا ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ دولت لڑکیوں کے ذریعے خاندان سے باہر نہ جا سکے۔ ہندوستان تقسیم ہونے سے پہلے پورے ملک کی آبادی صرف چالیس کروڑ تھی۔ اب تقسیم شدہ ہندوستان کی آبادی نوے کروڑ سے زیادہ ہے۔ ہندوستان کے مشرق و مغرب میں جو کم عمر ممالک ہیں وہاں بھی اولاد نرینہ کی اتنی ہی اہمیت ہے۔ بنگلہ دیش کی آبادی تو سرحدوں سے ابل کر باہر آنے لگی ہے لیکن بیٹوں کے بغیر وہ نہیں رہ سکتے۔

اولاد نرینہ کی خواہش مشرق کے مسکینوں کو مغرب میں آکر آباد ہونے کے بعد بھی کم نہیں ہوتی۔ خواہ ورثہ میں چھوڑنے کے لئے کونسل سے ملا ہوا فلیٹ، سوشل سیکورٹی اور بے روزگاری کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

ہمارے ایک انگریز پڑوسی نے ہم سے شکایت کی کہ ان کی بیٹی کے بچہ ہونے والا ہے اور جب ان سے اپنے ہونے والے بچے کی جنس معلوم کرنی چاہی تو پتہ چلا کہ اسپتال کی پالیسی بدل گئی ہے اور ہماری قوم کی وجہ سے وہ اس سہولت سے محروم ہو گئے ہیں کہ پہلے سے جنس معلوم کر کے بچے کے کمرے میں اگر لڑکا ہونے والا ہے تو نیلا کاغذ اور اگر لڑکی ہونے والی ہے تو گلابی کاغذ لگا کر کمرہ سجائیں اور پہلے سے بچے کے لئے نیلے یا گلابی کپڑے خرید سکیں، کیونکہ ہماری قوم کے لوگوں کو جب پتہ چلتا ہے کہ ان کی ہونے والی اولاد نرینہ نہیں ہے تو وہ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری دوست ایلیسن یہ سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ اولاد نرینہ یعنی وارث حاصل کرنے کے لئے ہمارے ملک کے لوگ کیا کیا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس حالت میں ہماری غریب بھانجیاں بھتیجیاں بیٹھے بٹھائے رئیس بن جانے کے خواب کیسے دیکھ سکتی ہیں۔

□□

نئی سحر کا استقبال

گذرے سال کے ملبے سے پھر ہوا نیا خورشید طلوع
بندلوں کے دروازے پر کرنیں دستک دیتی ہیں
السائے ذہنوں پر کیسا سحر کیا صبحِ نو نے
تتلیاں کھلتی کلیوں کے عارض کا بوسہ لیتی ہیں

سورج سونا بانٹ رہا ہے، ہر گھر میں ہر آنگن میں
اذہانِ انساں میں کچھ منصوبے پھر سے جاگے ہیں
سرگوشی کرتی ہیں ہوائیں، کان میں اِک اِک غنچے کے
پھول یہ منظر دیکھ کے حیراں، خار کے لب پر نغمے ہیں

رات کا جادو ختم ہوا، جاگ اٹھی عروسِ صبحِ طرب
ساری اذیت گزرے پل کی سرشاری میں بدل گئی
عزمِ بشر کے آگے کیسی معذوری کیا مجبوری
جس نے ہمت کی اس کی کشتی گرداب سے نکل گئی

آؤ جلوسِ صبحِ نو کے ساتھ بڑھائیں اپنے قدم
گزرے لمحوں کے ماتم سے کچھ حاصل ہونے سے رہا
جب بھی ہم کرلیں گے اپنے اخلاق و کردار بلند
در کھل جائے گا ساری دنیا میں امن و راحت کا

راہ ہماری دیکھ رہا ہے خوش آئند سا مستقبل
آؤ کریں ہم سب مل جل کر نئی سحر کا استقبال
اپنی قوتِ بازو پر ہم کرکے بھروسہ نکل پڑیں
ہونے نہ دیں ہم راہ میں حائل اپنی محرومی کا ملال

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸۔ اسکول وارڈ
پرتاپ گڑھ ۲۳۰۰۰۱

خواب میں سفر کرنا

نیند ہو کہ بیداری
نام دو الگ
لیکن
کام ایک جیسا ہے
نیند جب بھی آتی ہے
خواب ساتھ لاتی ہے
خواب میں کبھی اڑنا
تیرنا، کبھی گرنا

کیاریوں میں پھولوں کی
شوخیاں کسی کے ساتھ
اور کبھی سرِ دربار
سر پہ تاج رکھ لینا
اور غنیم کی صف سے
فوج کا بگل سن کر
حکمِ جنگ بھی دینا
یا کبھی سفر کے بیچ
اپنے جسمِ لاغر کو
راہ میں پٹک دینا
بھوک سے بلکتے جسم کا زمین پر گرنا
سن کے گرنے کی آواز
پٹ سے آنکھ کھل جانا

ایک پیٹ کی خاطر
سارا دن سفر کرنا
سب کی ہاں میں ہاں کرنا
عرش کی بلندی تک آنکھیں کھول کر اڑنا
اور پھر خیالوں کا شہر خود جلا دینا
روز اِک نئی اسکیم
روز اک نیا ساتھی
خواب میں سفر کرنا
یہ بھی زندگی کیا ہے

□□

خورشید افسر بسوانی
بسواں، ضلع سیتاپور

لئیق اختر فیض آبادی
اماباڑہ۔ فیض آباد

یادوں کا سفرنامہ

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے ۔۔۔
یادیں شیریں بھی ہوتی ہیں، تلخ بھی ہوتی ہیں اور کھٹ میٹھی بھی۔ خوش گوار یادیں حال کو سنوارتی ہیں مستقبل کو نکھارتی ہیں ۔ بزرگوں کی یادیں، رفقاء کی یادیں، مخالفین کی یادیں ۔۔۔ ہر یاد کی اپنی ایک الگ ادا ہوتی ہے، اپنا کیف ہوتا ہے، اپنی کسک ہوتی ہے ۔ یادیں ہنساتی بھی ہیں رلاتی بھی ہیں، تڑپاتی بھی ہیں ۔ ایک یاد آج بھی نقش کالحجر ہے، یہ یاد جب آتی ہے تو دل کی الجھن اور بڑھ جاتی ہے ۔

آج سے تیس سال قبل میں لکھنؤ سے دلی جا رہا تھا، اس زمانے میں ٹرینوں میں اتنی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی، لوگ آرام سے سفر کرتے تھے ۔ نہ لیٹ لطیف ٹرینیں چلتی تھیں نہ ریزرویشن کا جھنجھٹ ہوتا تھا۔ میں جس کمپارٹمنٹ میں بیٹھا اس میں سامنے والی سیٹ پر ایک ستر بہتر سال کے سن سفید بزرگ پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے کھڑکی کے قریب سیاہ برقعہ میں ایک خاتون بھی بیٹھی تھیں ۔ برقعہ نہ تھا بلکہ چھولداری تھی، چہرہ اس چھولداری کی قید میں تھا۔ اس چھولداری کی قید و بند سے بس مہندی رچے ہاتھ، مخروطی انگلیاں، دو نگ دار نازک نازک سی سونے کی انگوٹھیاں، گوری گوری کلائیوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں آزاد تھیں ۔ بڑے میاں کا رخ میری طرف تھا لیکن اس برقعہ پوش کی پشت میری طرف تھی ۔ جب وہ خاتون پہلو بدل کر کھڑکی کی طرف رخ کر کے باہر دیکھنا چاہتی تو بڑے میاں اسے جھڑک دیتے ۔

دو اسٹیشن گزرنے کے بعد بڑے میاں نے مجھ سے پوچھا:

"کیوں جی تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے عرض کیا، "دلی"۔

کچھ دیر کے بعد میں نے سوال کیا، "قبلہ! آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں ۔؟"

"مراد آباد"۔ بڑے میاں نے منہ بنا کے جواب دیا۔

بڑے میاں کے روکھے تیور اور کھرے لب و لہجہ کو دیکھ کر میں نے گفتگو کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا ۔۔۔ رات گزرتی رہی سفر تمام ہوتا رہا ۔۔۔ میں نے تو دو چار جھپکیاں بھی لے لیں لیکن وہ بندۂ خدا مستقل جاگتا رہا ۔ مراد آباد کے اسٹیشن پر ٹرین رکی ۔ بڑے میاں نے سامان سنبھالا، خاتون کو اپنے حصار میں لے کر جیسے ہی آگے بڑھے ۔ کوئی شے میرے قدموں کے پاس آ کے گری ۔ میں نے جھک کے اٹھایا ۔ بڑے میاں جب ٹرین سے اتر گئے اور ٹرین روانہ ہو گئی تو میں نے اس بھیگے رومال کو کھولا ۔ رومال میں ایک انگوٹھی اور ایک شہانی چوڑی تھی ۔۔۔ تینتیس سال سے پریشان ہوں کہ برقعہ پوش خاتون نے رومال میری طرف کیوں پھینکا اور اپنی مخروطی انگلی کی انگوٹھی اور نازک کلائی کی چوڑی اس بھیگے رومال میں کیوں باندھی، کیا وہ رومال آنسوؤں سے تر تھا؟ وہ سفر جب یاد آتا ہے اور رومال، انگوٹھی، چوڑی جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، دیکھتا ہوں تو سخت ذہنی الجھن میں پڑ جاتا ہوں ۔

کئی بار مراد آباد گیا، مراد آباد کی سڑکوں، گلیوں، کوچوں میں گھوما، کہ شاید وہ بڑے میاں کہیں مل جائیں تو ان کے جھریوں بھرے ہاتھوں پر سفر کی یہ تینوں نشانیاں رکھ دوں ۔ لیکن وہ بڑے میاں مجھے کہیں نظر نہ آئے ۔ بڑے میاں کا روکھا چہرہ، تیکھے تیور، رہ رہ کر خاموش برقعہ پوش خاتون کو گھڑکنا جب یاد آتا ہے تو ایک عجیب سی الجھن ہونے لگتی ہے ۔ کہاں سے لاؤں وہ مہندی رچے ہاتھ جن پر یہ رومال رکھ دوں؟ کہاں تلاش کروں اس مخروطی

مجروحی انگلی کو جسے میں یہ انگوٹھی پہناؤں۔؟

وہ رات تھی ایک بھری برسات کی۔ ٹرین اس اندھیری اور بھیگتی ہوئی رات میں رواں دواں تھی۔ میں بے خبر نیند کی آغوش میں مدہوش تھا۔ اٹھتی جوانی کا نیند سے بڑے غضب کا یارانہ ہوتا ہے۔ کم بخت نہ جھلنگا پلنگ دیکھتی ہے نہ بانده کا کھرا پن! اسے تو بس نیند کی گداز گود چاہیے۔ اکبارگی کسی کی پُرسوز آواز نے مجھے جھنجھوڑ کے جگا دیا۔ ہائے کیا لحن اور کیا آواز تھی، اوپر والی سیٹ پر کوئی گا رہا تھا ؎

کچھ بھی ہو برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا، اک دل فگار رویا
مدت کے بعد دونوں بچھڑے ہوئے ملے ہیں
دل سے لپٹ لپٹ کے غم بار بار رویا

میں نے اٹھ کر دیکھا، اوپر والی سیٹ پر ایک سبز پوش، دراز زلف سرخ و سفید چہرے والے ادھیڑ عمر کے ایک صاحب لیٹے لیٹے یہ اشعار مترنم آواز میں گا رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا:

"حضرت! یہ کس کے اشعار ہیں؟"

کچھ دیر تک وہ چپ رہے، پھر فرمایا:

"جا بچے آرام کر۔ کس کے شعر ہیں؟ تیرا اس سے کیا لینا دینا۔؟"

یہ چار مصرعے جب یاد آتے ہیں تو وہ درد بھری آواز، وہ پرنور چہرہ، وہ سبز لباس اور وہ چشم اشکبار بھی یاد آجاتی ہے۔

بوٹا سا قد، سرخ و سفید چہرہ، نرم مزاج، شیریں زبان، مونسِ بے کساں، خیر خواہ غریباں۔ ایسے تھے ایک بزرگ، نہ ہائی اسکول نہ انٹر، نہ بی اے۔ نہ مولوی، نہ عالم نہ فاضل۔ لیکن علوم کا بحرِ زخار۔ عربی، فارسی، انگریزی پر عبور، جس بزم میں پہونچ جاتے سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے، جس محفل میں جا نکلتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ صفِ امراء میں پہونچ جاتے تو سطوتِ شاہانہ پاسِ ادب سے جھک جھک کے سلام پیش کرنے لگتی۔ حکام ضلع سرمۂ بصیرت سمجھ کے آنکھوں میں لگاتے۔ چھوٹی سی زمینداری مگر اخراجات راجوں مہاراجوں جیسے۔ جس کی سفارش کر دیتے وہ پھل پھول جاتا۔ کبھی پان بہت کھاتے تھے مہوبے سے پان کی ڈھولیاں آتیں۔ کتھا کیوڑہ میں پکایا جاتا، چونا خالص دودھ میں بھگویا جاتا۔ چاندی کے پاندان میں پانوں کے اوپر بیلے کی نوخیز کلیاں پڑی رہتیں، خانہ ساز قوام میں کشمیری زعفران ملائی جاتی یہ سارے اہتمام ان کی بیگم صاحبہ کرتیں، وہی گلوریاں بناتیں، وہی چاندی کے ورق سے گلوریوں کو دلہن کی طرح سجاتیں۔ بیگم کے ہاتھ کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کا پان نہ کھاتے۔ جس دن بیگم کا انتقال ہوا، پان کی چاہت سے منھ موڑ لیا۔ پاندان کو قبر میں نہیں، مال خانے کے ایک گوشے میں خدا حافظ فی امان اللہ کہہ کے رکھ دیا۔ ایک دن ان کی منھ لگی سالی صاحبہ نے خاصدان میں گلوریاں رکھ کے جب ان کی خدمت میں پیش کیا تو ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور پھر یہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے ؎

قفس پہ برگ گل رکھنے سے اے صیاد کیا حاصل
دلانا پھر وہ اگلی صحبتوں کی یاد کیا حاصل

کسی نے ان سے دریافت کیا:

"قبلہ! آج تک نہ تو کسی نے آپ کو پان کی پیک اگالدان میں تھوکتے دیکھا نہ پان کا اگال تھوکتے دیکھا۔ آپ اتنے احترام اور لوازمات کے ساتھ پان کیوں نوش فرماتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا تھا: "حضرت خاتم الانبیاء کے اسم احمدؐ سے پان کے عدد ملتے ہیں۔"

خاندان کے دروازے راتوں میں پاٹوں پاٹ کھلے رہتے تھے نہ چوری کا ڈر تھا نہ چکاری کا۔ حفاظتِ جان و مال کے لیے اور دافع بلیات لکھی ہوئی دعائیں اور آیاتِ قرآنی گھر کے ہر دروازے پر چسپاں رہتی تھیں بزرگ محترم نصف شب کے بعد ہاتھ میں لالٹین لے کر گھر گھر جاتے اور ہر پلنگ کا معائنہ کرتے کہ سب محو خواب ہیں یا ان میں سے کوئی بے خوابی میں رات گزار رہا ہے۔ جاگنے والے سے اس کے جاگنے کا سبب پوچھتے تھے۔ اگر انھیں پتہ چل جاتا کہ فلاں جگہ آج چولھا

نہیں جلا تو وہ بیتاب ہوجاتے اور جب تک اس کے یہاں چولہے میں آگ نہ روشن کر لیتے اور دو چار وقت کے غلّے پانی کا انتظام نہ کر لیتے ایک نوالہ بھی اپنے منھ میں نہ ڈالتے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب ہر ایک سے میٹھے بول بولتے۔ تلخ زبانی، بدمزاجی، بدخلقی کو حرام سمجھتے تھے۔ ایک رجسٹر پر خاندان کے بچّوں اور جوانوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ حکم یہ دے رکھا تھا کہ مسجد میں پانچوں وقت نماز باجماعت پڑھ کے اپنے اپنے گھر جانے سے پہلے ہمارے یہاں آکر اس رجسٹر پر دستخط کر دیا کرو۔ ماہ بہ ماہ اس رجسٹر کو ملاحظہ فرماتے۔ جس کی نماز میں حاضری کے دستخط پورے مہینے ہوتے تو اسے کچھ نہ کچھ انعام ضرور دیتے — یہ باتیں ہیں آج سے چالیس پینتالیس سال قبل کی، جب ہر گھر سے نماز فجر کے بعد تلاوت کلام پاک اور وظائف پڑھنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ واحسرتا اب بجلی کی روشنی سے جگمگاتے انھیں گھروں سے دن رات ٹی، وی کی آوازیں آیا کرتی ہیں۔ مسجد میں اذان ہو رہی ہے اُدھر ٹی، وی پر پروگرام دیکھے جا رہے ہیں۔ بزرگ گئے تو شرعی احکام کا احترام بھی چلا گیا۔ مکان وہی ہیں لیکن اب مکینوں کے دلوں میں نہ وہ قلبی خلوص ہے نہ وہ دلی محبّت ہے نہ وہ مخلصانہ ذہنی لگاؤ ہے۔ ہر مکین اپنی ذات کے کنوئیں میں بیٹھ کے موج اُڑا رہا ہے — دل مجھ سے پوچھتا ہے اور میں خالقِ کائنات سے پوچھتا ہوں

ع وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

لکھنؤ میں، جب میں زیرِ تعلیم تھا، رگوں میں بجائے خون کے شوخیاں دوڑا کرتی تھیں، ہر وقت نت نئی شرارتیں سوجھا کرتیں — ایک دن ثریا نظر کے فرضی نام سے فراقؔ گورکھپوری صاحب کے نام ایک بے ربط سا محبّت نامہ بھیج دیا۔ سات آٹھ دن کے بعد الہ آباد سے فراقؔ صاحب کا جواب آیا، خط و کتابت کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ ایک دن ان کا خط آیا، لکھا تھا: "میں فلاں تاریخ کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے مشاعرہ میں آرہا ہوں، تم مجھ سے ہیوٹ روڈ پر میرے بھائی کے مکان پر ملو"

[illegible] گیا تو نہیں البتہ ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو نمبر ایک کے ہال میں مشاعرہ میں شریک ہوا، جب مشاعرہ ختم ہوگیا تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ فراقؔ صاحب سے ملا اور ان سے عرض کیا

"اسی خاکسار کا فرضی نام ثریا نظر ہے"۔

فراقؔ صاحب کا پارہ گرم ہوگیا، آنکھوں کے دیدے گھما کر مجھے گھورتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد بولے:

"ابے اتنا بڑا فراڈ، بھاگ یہاں سے ورنہ مارے جوتوں کے فرش کر دوں گا"

ہم لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ دوسرے دن باردوخانہ پہونچ کر اپنے مُربّی اور محسن پروفیسر احتشام حسین مرحوم کو من و عن تمام داستان سُنا دی۔ انھوں نے مسکرا کر فرمایا،

"تم بہت نالائق ہوتے جا رہے ہو۔ اب تم بزرگوں سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ آج شام کو فراقؔ صاحب میرے یہاں آرہے ہیں تم ان سے اپنی گستاخی کی معافی مانگ لینا اور ان کے خطوط اُن کو واپس کر دینا"

شام سے پہلے ہی میں پہنچ گیا۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے چھوٹے بھائی سید اقتدار حسین عرف جنّا میرے لنگوٹیا یار تھے۔ ان کے ساتھ مل کر شعری نشست کا انتظام کرنے لگا۔ بی بی سی والے آل حسن بھائی بھی اتفاق سے وہیں ان دنوں قیام پذیر تھے۔ لوگ یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ کامریڈ سبط حسن، اسرار الحق مجازؔ، مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ، مفتی محمد رضا انصاری، فضل نقوی، علی عباس حسینی، اعظم حسین اعظم، شمیم کرہانی وغیرہ اور بعد میں تانگے پر فراقؔ گورکھپوری — مجھے دیکھتے ہی ان کا موڈ خراب ہوگیا۔ احتشام بھائی مرحوم سے گرج کے اور دیدے نکال کے انھوں نے کہا۔

"نان سنس! نکالو اس لفنگے بہروپیے کو یہاں سے"۔

احتشام بھائی نے کہا: "فراقؔ صاحب! یہ میرے نالائق عزیز ہیں یہ معافی مانگنے اور آپ کے خطوط واپس کرنے آئے ہیں۔ اپنی احمقانہ شرارت پر بہت پشیمان ہیں، خدا کے لیے انھیں معاف کر دیجیے"

فراقؔ صاحب نے [illegible] میں داخل ہوگئے [illegible] کرے

کیا فائدہ۔ بس ایک خط کا ایک شعر ملاحظہ فرما لیجئے ؎

میں تیرے حُسن کا طالب ہوں حُسن بخش مجھے
اُمّیدوار نہ کرنا کہ بے وقوف نہیں

اس واقعہ کے بعد فراق صاحب سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ بزرگانہ شفقت و محبّت سے ملتے رہے۔ ایک بار وہ شدید بیمار پڑے اتفاق سے ایک شادی میں مجھے الٰہ آباد جانا پڑا۔ میرے ساتھ کہنہ مشق شاعر جناب نجم ردولوی اور میرے بھتیجے سید علی اطہر عابدی بھی تھے۔ برات کی رخصتی سے قبل ہم تینوں بینک روڈ پر واقع فراق صاحب کے مکان پر ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ بستر پر ایک انگوچھا باندھے آرام فرما رہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، خیریت دریافت کی، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فراق صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سُنایا:

"ایک رات میں الٰہ آباد سے دلّی جا رہا تھا۔ وہ رات بڑی سرد تھی، میرے کمپارٹمنٹ میں دیگر مسافروں میں ایک نوجوان مسافر بھی تھا، کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے، باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، وہ نوجوان کھڑکی کی طرف منھ کیے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ اس کی حالتِ زار پر بے ساختہ ایک مصرع زبان پر آ گیا ؏

آج آنکھوں میں کاٹ دے شبِ ہجر

کئی بار کوشش کی، دماغ سوزی کی کہ اس مصرع پر مصرع لگ جائے لیکن مصرع نہ لگنا تھا نہ لگا۔ کچھ عرصہ بعد جوش ملیح آبادی ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے الٰہ آباد جب آئے تو میرے یہاں بھی آئے۔ باتوں باتوں میں اس مصرع کی وجہ تخلیق کی بات بھی آ گئی۔ جوش صاحب تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر اعجاز اور پروفیسر ضامن سے ملنے کے لیے جب جانے لگے تو اپنی پٹھانی آن بان کے ساتھ انھوں نے کہا:

"دیکھو میاں فراق! شام تک اس مصرع پہ مصرع لگ جانا چاہیئے ورنہ میری چھڑی ہوگی اور تمھارا سر۔"

[illegible] میں الجھن میں پڑ گیا۔ جوش کا کیا بھروسہ [illegible] جوش کے آنے سے پہلے ہی مصرع

موزوں ہو گیا"۔

میں نے عرض کیا: "اگر زحمت نہ ہو تو ہمیں بھی سنا دیجئے۔"

فراق صاحب نے اپنے بے سُرے ترنّم میں دونوں مصرعے سنائے

آج آنکھوں میں کاٹ دے شبِ ہجر
زندگانی پڑی ہے سو رہنا

فراق صاحب تو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے لیکن اپنی فنا نہ ہونے والی شاعری اور یادیں چھوڑ گئے۔

مردم خیز قصبہ کا یہ کھنڈر کبھی ایک شان دار حویلی تھا۔ یہ شکستہ زنگ آلود، صورت بیں حالت میں صدری پھاٹک کی رہ نشین پر صبح و شام شہنائیاں بجتی رہتی تھیں، پھاٹک کے اندر ایک کشادہ سبزہ زار تھا سبزہ زار کے تین طرف خوشبودار پھولوں کی قطاریں کھڑی رہتی تھیں، سامنے بارہ در کا ایک نقش و نگار سے آراستہ ہال تھا۔ اس ہال میں چاندی کے بڑے تخت پر ایرانی گداز قالین بچھی رہتی تھی، تین گاؤ تکیہ پر زربفت کا غلاف چڑھا رہتا تھا۔ ہر در پر باادب ملازم سر پر طرہ دار پگڑی، سُرخ شیروانی، کمر میں منقش چپراس باندھے بڑے سرکار کے چشم و ابرو کے اشارے پر تعمیل حکم کے لیے کھڑے رہتے۔ روزانہ بعد نماز فجر اس بارہ در کے ہال میں غربا، مساکین اور حاجت مندوں کا اژدہام رہتا۔ رئیس ابن رئیس ابن رئیس کا حکم تھا کہ ان میں سے کسی کو کبھی سائل نہ کہنا۔ یہ کریہہ لفظ سُن کے غیرت کی آغوش میں پلے ہوئے شیشے کی طرح چور چور ہو جائیں گے۔ ہمیشہ حاجت مندوں کی حاجت پر نظر رکھنا، ان کے مذہب پر نہیں۔

خواتین اندرون حویلی داخل ہو کے اپنی اپنی عرضیاں پیش کرتیں۔ ان کے علاقے کے یتیموں، بیواؤں، مسکینوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ محرم راز فرستادے ہر ماہ پابندی سے بند لفافوں میں مہینے کی پہلی تاریخ کو پہونچا دیا کرتے تھے۔ رقم کا علم یا دینے والے کو ہوتا تھا یا لینے والے کو۔ لاولد تھے، لے پالک کسی کو بنایا نہیں خاتمۂ زمینداری کے بعد عروج مہر کو دوپہر نے ڈسنا شروع کر دیا۔ مالگذاری کیا ختم ہوئی کہ خیر و خیرات اور عطا و بخشش کی دیوانوں میں

لونی لگنے لگی۔ سخاوت کا دریا سوکھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھیت اور باغات بکے، پھر باری آئی گھر کے اثاثوں کی ۔ آخرش بڑے سرکار اور ان کی چہیتی بیگم جانی صاحبہ کو دق کا موذی مرض چاٹ گیا۔ دھیرے دھیرے حویلی کھنڈر بن گئی ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

جب میں تقریباً دس گیارہ سال کا تھا تو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے "بچوں کے پروگرام" میں ہر ہفتہ حصّہ لیا کرتا تھا۔ بچوں کے چاچا کا رول ادا کرتے تھے شوکت تھانوی۔ آپا کا کردار پیش کیا کرتی تھیں آل رضا صاحب ایڈوکیٹ کے بھائی عباس رضا صاحب کی بیگم سعیدہ صاحبہ۔ طلعت محمود، عرش منیر اور گوہر سلطان بھی لکھنؤ ریڈیو سے وابستہ تھیں۔ حفیظ جاوید ڈائرکٹر تھے، عشرت رحمانی پروڈیوسر تھے، آل حسن بھائی اور یعقوب صاحب خبریں سناتے تھے۔ آل حسن بھائی اپنے مخصوص انداز میں جب خبروں کی ابتدا۔ "یہ لکھنؤ ہے"۔ کہتے تھے تو بہت اچھا لگتا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے سالانہ مشاعرے اپنی مثال آپ ہوتے تھے۔ انھیں مشاعروں میں میں نے مخدوم محی الدین سے ان کی نظم "اسٹالن" سنی۔ انھیں مشاعروں میں احسان بن دانش کی مشہور نظم "بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنھیں دہراتی ہے"۔ ادیب سہارن پوری سے ان کی ایک غزل کا یہ شعر سنا ؎

جو شرق و غرب میں اٹھے تھے انقلاب ادیب
وہ اب کے بھی مرے ہندستاں کو بھول گئے

انھیں مشاعروں میں مشاعرہ کے "دولھامیاں" (بقول شوکت تھانوی) آل رضا صاحب ایڈوکیٹ کا یہ شعر سنا ؎

اپنا لیا کبھی کبھی بیگانہ بن گئے
یہ دھوپ چھاؤں وقت ضرورت بھی خوب ہے

انھیں مشاعروں میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، ساغر نظامی، روش صدیقی، سلام مچھلی شہری، نشتر بارہ بنکوی، مجاز ردولوی اور بہزاد لکھنوی وغیرہ کو سنا۔ اسی زمانے میں میں نے آغا میرزا لوٹرھی کے ایک بالاخانے پر جہاں اس وقت مشہور ایڈوکیٹ، شاعر، ادیب پرور جناب وصی احمد نگر

رہا کرتے تھے۔ حضرت آرزو لکھنوی کو پہلی اور آخری بار ایک شعری نشست میں بہت قریب سے دیکھا اور سنا بھی۔ وہ کلکتہ سے تشریف لائے تھے۔ نگر صاحب حضرت آرزو کے شاگرد رشید تھے، اپنے استاد معظم کی تشریف آوری کے سلسلے میں اس شعری نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس نشست میں حضرت آرزو نے اپنی کئی غزلیں سنائی تھیں۔ سر پر سیاہ ایرانی ٹوپی، ڈھیلی ڈھالی شیروانی والے آرزو صاحب کے دو تین شعر مجھے آج بھی یاد ہیں ؎

معصوم نظر کا بھولا پن للچا کے لبھانا کیا جانے
جو آپ نشانہ بنتا ہو وہ تیر چلانا کیا جانے

دی ہے راحت کے بہانے مجھے ایذا کیا کیا
چٹکیاں لیتے رہے پھانس نکالی نہ گئی

شام اودھ کا جیتا جاگتا رُدولی۔ فیض آباد سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور۔ تہذیب و شرافت، اخلاق، اخلاص، محبت، وضعداری، مہمان نوازی، دریادلی کا سرچشمہ۔ شہرہ آفاق شخصیتوں کے اعلا اقدار کی خوشبو سے معطر رُدولی۔ چودھری ارشاد حسین مرحوم، چودھری محمد علی مرحوم، شاہ وسیم مرحوم، شاہ آفاق مرحوم، حضرت رزم ردولوی مرحوم۔ ان میں سے ہر ایک نفاست و شائستگی کا مُرقع، گہرباری و گہرریزی کا مجسمہ۔ ان سب کی خدمت میں جو بھی شرفِ باریابی پاجاتا، آئینۂ حیرت بن جاتا۔ زاہد و عابد، متقی و پاکباز منکسر المزاج چودھری ارشاد حسین مرحوم نے جو مسجد اور عزاخانہ تعمیر کرایا ہے وہ آج بھی نوادرات میں شمار ہوتا ہے۔ خالی ہاتھ لوگ جاتے تھے، دامنِ مُراد بھر لاتے تھے۔ چودھری محمد علی مرحوم۔ بے مثال ادیب، لاجواب انشاپرداز، بے نظیر بذلہ سنج۔ باتیں ایسی چٹکیلی حکام رس، شاہ خرچ، زندہ دل، بلا کا بانکپن۔ جناب رزم ردولوی مرحوم استاد الاساتذہ، سخن فہم ان کے کلام کے دیوانے۔ جامہ زیبی غضب کی۔ شاہ آفاق مرحوم، درگاہ شریف کے سجادہ نشین، مرکز عقیدت و احترام۔ شاہ وسیم مرحوم ہر ایک کے حسب و نسب سے واقف۔ ہر ایک کے پرسانِ حال۔ آیئے اب [illegible] زدولی

کی مٹی نے پروان چڑھایا۔ اب بمبئی میں ہیں اور اپنے کسب کمال سے عزیز جہاں ہیں "سے کالی غزلیں" اور "گوری نظمیں" کہتے ہیں اور سرآنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں ۔ مجاہد آزادی برادر مکرم اویس قرنی صاحب مدظلۂ ۔۔۔ کھدر ان کا اوڑھنا بچھونا، صاف گوئی ان کی فطرت، نہ آج تک وضع بدلی نہ پارٹی۔ اپنے اصول ونظریات کا کوہ ہمالہ۔ شخصیت چاہے کتنی بڑی ہو یہ مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں، دین پر بھی نثار ہوتے ہیں اور سیاست پر بھی فدا رہتے ہیں۔ فقرے سے بخوبی واقف ہیں اس لیے دین میں سیاست کو اور سیاست میں دین کو مدغم نہیں کرتے۔ شاداب ردولوی اور پروانہ ردولوی اب دہلوی بن چکے ہیں دونوں ہمہ صفت موصوف ہیں۔ مملکت ادب کے تاجور ہیں، نکتہ رس اور نکتہ سنج ہیں، جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں وہ موضوع فخر سے سربلند کرنے لگتا ہے۔ "دلی جو اک شہر ہے عالم میں انتخاب" اسی شہر میں ان دونوں کے قلم کی حکمرانی ہے۔

بارے اب کچھ بیان اقبال ردولوی کا بھی ہو جائے۔ میرے رفیق دیرینہ ہیں، گوشہ نشین ہیں، بے پناہ شاعر ہیں، باذوق ہیں، دوسروں کے اشعار سنانے میں سخی ہیں، اپنے شعر سنانے میں بخیل ہیں۔ خلوت نشینی اور دنیا جہاں کی کتابوں کا عمیق مطالعہ بس یہی دو شوق ہیں۔

ٹھاکر رام پال سنگھ ۔۔۔ یہ کس کا نام زبان پر آیا کہ نطق بیساختہ زبان کے بوسے لینے لگا۔ تہذیبی قدریں اور خاندانی روایات کا مجسمہ ہمیشہ سر پر شاہانہ فگن رہتا۔ بڑی بڑی گھنی ایسی مونچھیں، غلافی آنکھیں گٹھیلا بدن، چوڑی کلائیاں، انگلیوں میں ہیرے، نیلم اور الماس کی انگوٹھیاں، ململ کا کڑھا ہوا کرتا، ڈھاکہ کی الکالی دھوتی، سیاہ وارنش کا پمپ، ہاتھی دانت کی چھڑی، جس پر [illegible] کا دستہ۔ شہر کی عالی شان کوٹھی میں کم اور دیہات کی چھاؤنی میں زیادہ رہتے۔ ہندو کہتے تھے مہاراج ہندو ہیں، مسلمان انھیں کہتے کہ مسلمان ہیں۔ کردار گنگا جمنا کی طرح پوتر۔ ایک سو دس [illegible] ہوئے قلمی [illegible] جہاں جہاں [illegible]

تمام اخراجات اپنے جیب خاص سے کرتے۔ جب ارادۂ سفر کرتے تو پیر محبوب حسن سے امام ضامن اپنے بازو پر ضرور بندھواتے ۔۔۔ اپنے ہم عصروں کے یہاں لیکن غریب غربا کے یہاں جب بھی کوئی تقریب مسرت ہوتی تو ضرور شرکت کرتے۔ اگر کوئی غریب مسلمان مرجاتا تو اس کی تجہیز وتکفین اور مرنے والا اگر ہندو ہوتا تو اس کے کریاکرم کے تمام انتظامات اپنے پاس سے کرتے۔ پسماندگان کو گلے سے لگا کے زبانی نہیں عملی ڈھارس بندھاتے۔ دلتوں کی خستہ حالی پر آنسو بہانے والے آج بہت ہیں لیکن آج سے ساٹھ سال قبل ایک اعلیٰ خاندان، صاحب حیثیت ٹھاکر نے دنیا کو دکھا دیا تھا کہ رنگ ونسل، چھوٹے بڑے میں تفریق کی کھائی کھودنا سب سے بڑا پاپ ہے ۔۔۔ وہ اکثر علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تعلقے کی ایک بیوہ مسلم خاتون کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی، قریبی گاؤں سے برات آئی تھی۔ نکاح سے پہلے نہ جانے کس بات پر اجڈ دولھا بھڑک گیا۔ لگا اکڑ ہو کے ہنہنانے۔ گاؤں والوں نے لاکھ سمجھایا، منت سماجت کی، ہاتھ پاؤں جوڑے کہ یتیم بچی ہے ۔۔۔ لاوارث بچی ہے ۔۔۔ لیکن دولھا اور اس کے نوجوان ساتھی کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے تھے۔ رات گئے گاؤں کے ایک نوجوان نے یہ خبر ٹھاکر رام پال سنگھ تک پہونچا دی۔ اس رات دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نرم رفتار دریا میں طغیانی کیسے آتی ہے۔ بادصبا آندھی کا روپ کیونکر دھار لیتی ہے۔ موم فولاد کیسے بن جاتا ہے حکم ہوا: "شکرم تیار کرو۔"

سائیس نے شکرم میں ابلقی گھوڑوں کی جوڑی جوتی۔ برق رفتار شکرم گاؤں میں داخل ہوئی۔ تمتمایا ہوا چہرہ، تیوریاں چڑھی ہوئی ۔۔۔ کھلے میدان میں براتی بیٹھے ہوئے تھے۔ ماحول کشیدہ تھا۔ ٹھاکر رام پال [illegible]

"کہاں ہے [illegible] کا بدذات باپ؟ حاضر کرو [illegible] ہے، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا [illegible] سے [illegible]"

سدھا تیواری
نواب گنج۔ کانپور

قومی یکجہتی کا ایک لاثانی مرکز: مکن پور

صوفیوں سنتوں اور فقیروں کو کسی مخصوص ذات، مذہب اور فرقے کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا پیغام تو نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے ہوتا ہے اور رواداری کو فروغ دیتا ہے۔ ان کے خیالات قومی یکجہتی، پیار محبت اور بھائی چارے کے جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ ان کے قدم جہاں پڑتے ہیں یا جس جگہ سے ان کی یادیں وابستہ ہو جاتی ہیں وہ مقام ایک زیارت گاہ بن جاتا ہے اور اس شخصیت کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عوام کے دلوں میں بس جاتا ہے۔ جس طرح اجمیر شریف اور دیوی شریف کے نام ہر کسی کی زبان پر رہتے ہیں اسی طرح ضلع اکبر پور (کانپور دیہات) کی بلہور تحصیل میں ایسن ندی کے کنارے آباد قصبہ مکن پور بھی اپنی پہچان رکھتا ہے۔

قصبہ مکن پور کی بنیاد حضرت سید بدیع الدین زندہ شاہ مدار رحمت اللہ علیہ کے تشریف لانے کے بعد پڑی۔ تاریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سرکار قطب مدار کے آنے کے بعد ہی قصبہ مکن پور آباد ہوا۔ حضرت زندہ شاہ مدار کے قیام پذیر ہونے اور ان کے خلفاء کے وہاں آباد ہونے کے بعد ان کے عقیدت مندوں کی آمد و رفت سے ہی غیر آباد قصبہ مکن پور دھیرے دھیرے ایک بستی میں تبدیل ہو گیا۔

تاریخی حوالوں کے مطابق ملک شام کے رہنے والے مشہور و ممتاز صوفی سید بدیع الدین زندہ شاہ ۱۴۱۲ء میں مکن پور آئے اور یہاں قدرتی مناظر سے متاثر ہو کر اسی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ حضرت مدار شاہ نے مکن پور میں ۲۰ سال ۶ مہینے اور ۴ دن گذارے اور قرب و جوار کے رہنے والوں کو پیار محبت، بھائی چارے اور قومی یکجہتی کا پیغام دیا۔

حضرت مدار شاہ نے ۵۵۵ سال سے زیادہ کی عمر پوری کرنے کے بعد ۱۷ جمادی الاول ۸۳۸ھ (مطابق ۱۴۳۵ء) کو اس دنیا کو خیرباد کہا۔

مکن پور کی درگاہ شریف پر ایک نظر

درگاہ شریف میں جو بھی سلطان، بادشاہ یا ان کے نمائندے آئے، انہوں نے کچھ نہ کچھ نذریں پیش کیں یا عمارتیں بنوائیں۔ ابراہیم شرقی جونپوری کے معتمد خاص محمد نظام مداری نے درگاہ شریف میں روضۂ منورہ، جمعیتہ خانہ اور دروازے کی تعمیر کرائی۔ صدر دروازے پر محمد نظام مداری کا نام اور عہد درج ہے۔ صدر دروازے کے بعد دوسرا دروازہ دارالامان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس پر بھی ایک عبارت تحریر ہے۔ ان عمارتوں کی تعمیر ۸۳۸ھ اور ۸۷۴ھ کے درمیان ہوئی۔ جلال الدین اکبر نے درگاہ شریف میں حاضر ہو کر اس وقت کے سجادہ نشینوں کے نام فرمان لکھے اور ۵۵۵ بیگہ آراضی نذر کی اور مزار شریف پر چادر چڑھائی۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے دور حکومت میں یہاں ایک پُل تعمیر کرایا تھا جو اب ٹوٹ چکا ہے۔ شاہجہاں نے اپنے دور میں یہاں ایک دالان اور اس سے ملحق حجرا تعمیر کرایا تھا۔ عالمگیر اورنگ زیب نے درگاہ شریف آکر دالان خانہ اور جامع مسجد بنوائی تھی۔

روضہ شریف

روضہ شریف اور اس کی چہار دیواری کی تعمیر کا آغاز ۱۴۳۵ء میں ہوا اور ۱۴۳۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ان کی تعمیر ابراہیم شرقی جونپوری کی جانب سے محمد نظام مداری نے کرائی تھی۔

جمعیتہ خانہ

اس کی تعمیر بھی روضہ شریف کے ساتھ ہوئی تھی۔ روضہ شریف کے جنوب میں ایک دالان اور دو کمرے ہیں، جن میں مزار شریف پر چڑھائی جانے والی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔

دارالامان

روضہ شریف کے مغرب میں واقع دروازہ دارالامان کے نام سے مشہور ہے۔ اس دروازے کی تعمیر جمعیتہ خانہ اور روضہ شریف کی تعمیر کے بعد ہوئی۔

صدر دروازہ

یہ روضہ شریف کے مغرب میں واقع ہے۔ دمال خانے سے چل کر درگاہ شریف میں داخل ہونے کے لئے اسی پھاٹک سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ صدر دروازے پر محمد نظام مداری کا نام اور تعمیر کا وقت بھی درج ہے۔

دالانِ شاہجہانی

صدر دروازے کے شمال میں یہ دالان بنا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر شاہجہاں نے کرائی تھی۔ اس دالان میں تعمیر کی تاریخ درج ہے۔

قاضی مطہر والا دالان

یہ عمارت صدر دروازے کے جنوب میں واقع ہے۔ پہلا دالان ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور دوسرا دالان قاضی مطہر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

آئینے والا دالان

یہ دالان جمعیتہ خانے کے شرق میں واقع ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ دیتیا کی رانی نے ایک منت مانی تھی جس کے پوری ہونے پر اس دالان کی تعمیر یادگار کے طور پر کرائی تھی۔

شمالی دروازہ

یہ دروازہ جمعیتہ خانے اور آئینے والا دالان کے درمیان میں واقع ہے۔ اس پر شہنشاہ جہانگیر کا نام درج ہے۔

قرآن خوانی والا دالان

یہ دالان دارالامان کے شمال کی جانب بنا ہوا ہے۔ پہلے یہ دالان تین در کا تھا جس میں قرآن خوانی ہوتی تھی۔ اس کی تعمیر مکن پور کے باشندے پتولال کھتری نے کرائی۔ بعد میں درگاہ شریف کی جانب سے اس کی توسیع کرائی گئی۔

دمال خانہ

صدر دروازے کے مغرب میں کئی عمارتیں ہیں۔ اس علاقہ کے جنوب میں شاہ نشیں کا دالان اور شمال میں کنواں اور ایک دوسرا دالان واقع ہیں۔ مشرق میں ایک پیش طاق ہے۔ مغرب میں نقار خانہ اور جامع مسجد عالمگیری ہے۔ شمال اور جنوب میں دو بڑے بڑے پھاٹک ہیں۔ ان عمارتوں کی تعمیر اورنگ زیب نے مسجد کے ساتھ ہی کرائی تھی۔

نقّار خانہ

یہ دمال خانے اور مسجد کے درمیان میں واقع ہے۔ اسے بارہ دری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۲۱۱ھ میں راجہ بھاگمل کے بھانجے الماس علی خاں نے کرائی۔

جامع مسجد

درگاہ شریف کے مغرب میں ایک مسجد ہے جسے جامع مسجد کہا جاتا ہے۔ شمال کی جانب ایک پختہ کنواں بھی ہے جو شاہی کنویں کے طور پر مشہور ہے۔

مدار صاحب کا عرس

حضرت سید بدیع الدین قطب المدار کا عرس جمادی الاول کی ۱۷ تاریخ کو ہوتا ہے۔ عرس کا پروگرام ۱۱ جمادی الاول سے شروع ہو کر ۱۸ جمادی الاول کو اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ۱۱ تاریخ سے روزانہ میلاد شریف ہوتا ہے جس میں رسول خدا اور اولیاء اللہ کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ۱۷ویں کو رات بھر مدار صاحب کی شان میں تقریریں ہوتی ہیں اور منظوم خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پروگرام صبح کے وقت سلام، فاتحہ اور دُعا کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

درگاہ شریف کے اصول وضوابط

مدار صاحب کی درگاہ میں مذہبی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں ہونے پاتی۔ روضہ شریف کے اندر عورت کے جانے اور روشنی وغیرہ کرنے پر پابندی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں قوالی یا گانا بجانا بھی نہیں ہوتا ہے۔ سال میں تین مرتبہ مزار شریف کا غسل ہوتا ہے اور ہر مہینے غلاف پوشی ہوتی ہے۔ یہ کام کچھ مخصوص افراد روزہ رکھ کر انجام دیتے ہیں۔ درگاہ شریف کے دروازے روزانہ صبح ۴ بجے کھلتے ہیں اور مغرب کے وقت بند ہو جاتے ہیں۔

درگاہ شریف میں روشنی نہیں کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عرس یا میلے کے موقع پر بھی درگاہ شریف میں لائٹنگ نہیں ہوتی ہے ایسے موقعوں پر درگاہ شریف کے باہر لائٹنگ کی جاتی ہے۔

مدار صاحب کی یاد میں ہر سال مکن پور میں بسنت پنچمی سے ایک ہفتہ قبل ایک عظیم الشان میلہ لگتا ہے میلے کے افتتاح کے روز میلہ کمیٹی کی جانب سے درگاہ شریف میں چادر چڑھائی جاتی ہے جس میں میلہ افسر میلہ کمیٹی کے اراکین اور تحصیل کے ملازمین شامل ہوتے ہیں۔ یہ جلوس تحصیل سے چادر لے کر نکلتا ہے اور درگاہ شریف پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چادر چاند کی ۲۹ ویں تاریخ کو روضہ شریف کے کھلنے پر مزار شریف پر چڑھائی جاتی ہے۔ ۲۹ تاریخ تک یہ چادر سنبھال کر رکھی جاتی ہے۔ اس جلوس میں بلاتفریق مذہب و ملت سبھی لوگ شامل ہوتے ہیں۔

بسنت پنچمی کے موقع پر لگنے والا یہ میلہ شمالی ہند کا ایک اہم میلہ ہے۔ "میلہ مکن پور" کے نام سے مشہور یہ میلہ بہت بڑے علاقے میں لگتا ہے۔ اس میلے میں مختلف قسم کے جانوروں کے بازار بھی لگائے جاتے ہیں۔ میلے میں فروخت کے لئے دور دور سے اونٹ، بیل، بھینس وغیرہ لائے جاتے ہیں۔ ان سبھی جانوروں کے لئے الگ الگ بازار لگائے جاتے ہیں۔

میلے میں دیگر اشیاء کا بھی بازار لگتا ہے جس میں چوڑی، صندوق، کپڑے، قالین، دری، سرمہ، برتن، چورا گٹہ، لوہے سے بنے سامان، سونے چاندی کے زیورات، جانوروں کی زیبائش کا سامان وغیرہ فروخت ہوتا ہے۔ ان دکانوں سے میلے میں کافی رونق رہتی ہے۔ میلے میں عوام کی تفریح کے لئے کھیل تماشے، سرکس وغیرہ کا بھی بندوبست رہتا ہے۔ میلے میں نمائش بھی لگائی جاتی ہے جس میں کھادی بورڈ، دیہی صنعت، ہینڈلوم، زراعت وغیرہ محکموں کے پنڈال لگائے جاتے ہیں۔ میلے کے ثقافتی پنڈال میں میلہ کمیٹی کی جانب سے کوی سمیلن، قوالی اور مشاعرہ وغیرہ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

مکن پور شریف کانپور۔ فرخ آباد کی چھوٹی ریلوے لائن پر کانپور سے ۹۰ کیلومیٹر پر واقع "اروَل مکن پور" ریلوے اسٹیشن کے جنوب میں ۱۱ کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ ٹرین کے علاوہ سڑک کے راستے سے بھی اروَل مکن پور جایا جا سکتا ہے۔

مکن پور شریف نہ صرف ہماری عقیدت کا ایک مرکز ہے بلکہ یہ ہمارا ثقافتی ورثہ بھی ہے۔ مدار صاحب کے ارادتمندوں میں سبھی مذاہب اور ذاتوں کے لوگ شامل ہیں درحقیقت مکن پور شریف قومی یکجہتی کا ایک لاثانی مرکز ہے۔

□□

یادوں کا سفر نامہ ۔۔۔۔ ص۲۹ کا بقیہ

دلہن کریم اللہ مرحوم کی نہیں ہماری بیٹی ہے۔"

ہر طرف سانپ سونگھ گیا۔ خوف زدہ ہو کے دولہا اور اس کے باپ نے ٹھاکر صاحب کا پاؤں پکڑ لیا۔ نکاح ہوا۔ براتیوں نے کھانا کھایا۔ صبح ۹ بجے جب دلہن سسرال جانے کے لیے اپنے بوسیدہ سے مکان سے باہر آئی تو ٹھاکر رام پال سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا:

" ہمارے ہوتے بیٹا تجھے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

بیل گاڑی کے بجائے ٹھاکر صاحب کے حکم سے دلہن اور دولہا شکرم پر بیٹھ کر رخصت ہوئے۔

جب ٹھاکر رام پال سنگھ کا انتقال ہوا تو اسی لڑکی نے سسرال سے آکر ٹھاکر رام پال سنگھ کی بیوی سے لپٹ کے اور رو رو کے کہا تھا:

"آپ دودھوا ہو گئیں ہم سب یتیم ہو گئے۔"

جب ٹھاکر صاحب کی ارتھی اٹھی تو ہزاروں مرد و زن، بوڑھے جوان اور بچے بلک بلک کے کہہ رہے تھے:

"مالک! ہم سب کو چھوڑ کے کہاں جا رہے ہو؟"

□□

قطعہ

آئینہ نقش ہائے گلاب ہے چھبیس جنوری
ہر زاویہ سے آفتاب ہے چھبیس جنوری
صدیوں کی گود میں پالا گیا ہے جب
تب جا کے وہ روز لاجواب ہے چھبیس جنوری

انور جمال بیخود بگرامی
قطب پور ... [illegible]

غزلیں

پردۂ شب سے جو تاروں کا سفر ہوتا ہے
غم کے ماروں کا وہ ہنگامِ سحر ہوتا ہے
کیا سیاست ہے کہ وہ شوخ جدھر ہوتا ہے
وقت کے ساتھ زمانہ بھی اُدھر ہوتا ہے
عمرِ جاوید ہی سمجھے ترے قدموں کی قسم
جو زمانہ ترے کوچے میں بسر ہوتا ہے
مست نظروں کے جدھر جام چھلک جاتے ہیں
رقص کرتا ہوا مے خانہ اُدھر ہوتا ہے
دن جھمیلوں میں گزر جاتا ہے یوں تو راحت
رات کٹتی ہے تو اک معرکہ سر ہوتا ہے

راحت کاظمی

۱۸ - جوہری محلہ، چوک
لکھنؤ - ۳

نظر اُٹھا کے یہ دل جگمگا دیا تم نے
حقیر ذرّہ تھا سورج بنا دیا تم نے
مرے لبوں پہ نہ آئی ہنسی کی لہر کبھی
نظر ملا کے مجھے کیا بنا دیا تم نے
ہوائے تند کے جھونکوں کا کچھ اثر ہی نہیں
چراغ دل میں یہ کیسا جلا دیا تم نے
جفا و جور سہی یہ عطا بھی کیا کم ہے
نوازشوں سے مرا سر جھکا دیا تم نے
زمیں سے اٹھ نہ سکا وہ مثالِ نقشِ قدم
جسے بھی اپنی نظر سے گرا دیا تم نے

نقش رومانی

'نشان منزل'
۳۲۔ گلی شاہ چھڑا
لکھنؤ

اندھیرے سے باہر نکلنا تو ہے
نہ ہو راستہ پھر بھی چلنا تو ہے
کوئی خاص موسم مقرر نہیں
کسی روز ہم کو پگھلنا تو ہے
یہ غم چند سانسوں کا ہے ہمسفر
مگر اس کے ہمراہ چلنا تو ہے
ہمیں ایک سورج کی ہے جستجو
ہمارے مقدر میں جلنا تو ہے
یہ پودے ہیں یادؔ ان پہ محنت کرو
انھیں پھولنا اور پھلنا تو ہے

شاہجہاں بانو یادؔ دہلوی

'سحر منزل'
گولہ گنج۔ لکھنؤ

کیا رکھے زمانے سے امید بھلا کوئی
اِس دور میں کب کس سے کرتا ہے وفا کوئی
اے بادِ صبا ہم ہیں دیوانے گھٹاؤں کے
اس زلف کے لہرانے کا قصہ نہ سنا کوئی
اِس طرح تری یادیں روشن ہیں مرے دل میں
جیسے کہ اندھیرے میں جلتا ہے دیا کوئی
دیکھی نہ گئی مجھ سے رنگینی بہاروں کی
ہر زخم مہک اُٹھا جب پھول کھلا کوئی
آنکھوں میں سحرؔ آنسو بھر آئے نہ جانے کیوں
پردیس میں جب اپنا ہمدرد ملا کوئی

غفران سحرؔ

پکنک اسپاٹ روڈ، خرم نگر
لکھنؤ

تم کو آئینہ جو مِل جائے تو ایسا کرنا
اپنی صورت کو بڑے غور سے دیکھا کرنا
بے وفا حُسن اگر ہوتا ہے ہو جانے دو
عشق کو تم سرِ بازار نہ رُسوا کرنا
تم مسیحا ہو مرے میں ہوں تمھارا بیمار
دردِ دل تم نے دیا ہے تمھیں اچھا کرنا
اے چراغِ شبِ غم اے مری اُمید کے چاند
میری دُنیا میں اندھیرا ہے اُجالا کرنا
اس سے بڑھ کر نہیں توہینِ محبت خورشیدؔ
اپنی محرومی و ناکامی کا چرچا کرنا

خورشید بلوری

معرفت انجم رضوی
آر ایس ۱۰۳ [illegible] کالونی
لکھنؤ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "تاریخ"
مصنف : اختر پیامی   قیمت : ۲۵/ روپیے
ملنے کا پتہ : اردو مرکز عظیم آباد ۔ پٹنہ

ماضی کے دھندلکوں سے کبھی کبھی ایسی "زرتار" اور "زرفام" شعاعیں برآمد ہوتی ہیں جو انسانی ذہن و فکر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ماضی کے خواب یوں تو دور کے ڈھول کی طرح بہت سہانے اور رجاں فزا ہوتے ہیں لیکن اکثر اپنے پیچھے جو تلخ اور ناقابل تلافی نتائج چھوڑ جاتے ہیں وہ ان "سدا بہار" زخموں کی طرح ہوتے ہیں جن کا اندمال زمانہ سحال اور مستقبل کی دسترس سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں ان زخموں کو بھرنے میں لیکن زخموں کے بھر جانے کے باوجود ان کے انمٹ نشانات سے "تاریخ" ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔

اردو کے خوش گو اور مدبر شاعر اختر پیامی نے بھی ایسے ہی دل سوز اور جاں گداز ماحول کو اپنی چابکی ہی کی گرفت میں لے کر زبان خامہ کی نذر کر دیا ہے جو نصف صدی سے نہ صرف برصغیر بلکہ ساری حساس دنیا کے لئے ایک لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہمارے ملک کی تقسیم کا المیہ ہے جو پچاس سال گزر جانے کے بعد آج بھی بالکل ہرے بھرے زخم کی طرح روئے انسانیت کی پیشانی پر چمک رہا ہے اور اگر ماحول و معاشرے کی انتھک کوششوں اور کاوشوں نے اسے مندمل بھی کر دیا تو یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک "بدنما داغ" کی شکل اختیار کرے گا۔

اختر پیامی نے اس دردناک المیہ کو محفوظ کیا ہے ایک تمثیلی نظم "تاریخ" کی صورت میں۔ دراصل انھوں نے اپنی اس طویل تمثیلی نظم کو کئی منظر ناموں میں تقسیم کر کے تقسیم کے کرب کو بھی کئی حصوں میں بانٹنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش کی ہے۔ اس کے کرداروں ۔ خدا، آدم، حوا، جبرئیل، ابلیس، کھیت، کارخانہ، بجلی اور زندگی ۔ نے آپس میں تقسیم ہو کر زیر نظر تمثیلی نظم کو ایک دوامی حیثیت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ قدیم اور جدید کا اختلاط ہمیشہ دوامی قدروں کا "جنم داتا" ہوتا ہے۔ اختر پیامی نے بھی اس کلیہ کا پورے جذب و شوق کے ساتھ احترام کیا ہے۔ اور حسن و خوبی کے ساتھ ان خیالات و احساسات کو شعوری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

تمثیلی نظموں کی روایت اردو شاعری میں نئی نہیں ہے۔ گراں قدر بیش بہا مثنویوں کا وجود۔ میر انیس اور اقبال کی تخلیقات نیز دور جدید میں لکھنؤ، حیدرآباد اور اب عظیم آباد سے شائع ہونے والی تمثیلی نظمیں میرے کلمات کی تائید کرتی ہیں۔ سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" اور ساحر لدھیانوی کی نظم "پرچھائیاں" بے شک بیسویں صدی کے اردو کے شعری ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس تسلسل کو اختر پیامی نے برقرار رکھ کر اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

"تاریخ" مجموعی حیثیت سے ہمارے ملک کی تقسیم کی ایک جامع، مکمل اور مبسوط تاریخ ہے جسے ایک نظم کی صورت میں "قید" کر کے اختر پیامی نے کوزے میں سمندر بند کرنے کی دیرینہ روایت کو تازہ کر دیا ہے۔

خوبصورت کتابت و طباعت۔ دلکش اور جاذب سرورق۔ عمدہ اور نفیس کاغذ۔ نیز بہترین پیپر بیک جلد نے اردو مرکز عظیم آباد۔ پٹنہ کی خوش سلیقگی اور شوکت تزئین پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

ڈاکٹر سلمان عباسی

نام کتاب : "خطبات و مضامین"
(مضامین اور تقاریر)
مصنف : جسٹس مرتضیٰ حسین ۔ قیمت : ساٹھ روپیے
ملنے کا پتہ : "المرتضیٰ" بدری ناتھ روڈ، گولہ گنج لکھنؤ

جسٹس مرتضیٰ حسین معروف سماجی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ قلم کار بھی ہیں۔ سخت تعجب ہوتا ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ تصنیف و تالیف کا کام پوری باقاعدگی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ ان کا توانائی سے بھرپور لہجہ اور قلم دونوں ہی آج بھی انتہائی فعال ہیں۔ "خطبات و مضامین" کے نام سے شائع ہونے والی تازہ کتاب ان کی

پانچویں قلمی کاوش ہے۔ اس میں مختلف ادبی تقریبات کے موقعوں پر دئے جانے والے چھ خطبات کے ساتھ ایک انٹرویو اور پندرہ مختلف مضامین شامل ہیں، جو اپنے موضوع اور طرز تحریر کی بنا پر کافی پرتاثیر اور کارآمد ہیں۔ خاص طور سے اُردو زبان کے حوالے سے دیا جانے والا انٹرویو اپنی دل چسپ قانونی بحث کی بنا پر کافی متاثر کرتا ہے۔ نیز اس انٹرویو میں اردو کی آئینی حیثیت کو بھی انتہائی موثر طور پر پیش کیا گیا۔

اس مجموعے میں شامل مضامین، ادبی اور نیم ادبی نوعیت کے ہیں، جو جسٹس مرتضیٰ حسین کے مخصوص لب و لہجہ اور طرز نگارش کی بنا پر قارئین کے لئے باعث کشش ہیں۔ امید ہے حسب سابق ان کی اس تصنیف کی بھی اردو داں طبقے میں پذیرائی کی جائے گی۔

——— عارفؔ ایوبی

نام کتاب: "گلستاں کی کہانیاں"
مُصنّف: عادل اسیر دہلوی   قیمت: -/۱۵ روپئے
ملنے کا پتہ: سُورج پرکاشن، چتلی قبر
دھلی

دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو میں بچوں کے ادب کی کمی ہر زمانے میں محسوس کی گئی۔ یہ بات بالکل درست اور حق بجانب ہے کہ بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہر ایک پر عائد ہوتی ہے کیونکہ ملک و قوم کی ترقی اور عظمت کا انحصار بچوں ہی پر ہوتا ہے۔ اردو میں ادب اطفال کی کمی پوری کرنے کی سمت میں جن اہل قلم حضرات نے سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے ان میں جناب عادل اسیر دہلوی کا نام بھی نمایاں ہے۔ زیر نظر کتاب "گلستاں کی کہانیاں" اسی کوشش اور توجہ کا ایک حصہ ہے۔ چالیس چھوٹی موٹی کہانیوں اور حکایات پر مشتمل یہ کتاب کوزے میں دریا کی مانند ہے کیونکہ اس کتاب سے بچوں کو بیک وقت نیکی، رحم دلی، خدا ترسی، سچائی، دیانت داری، اعلیٰ ظرفی، غریب پروری اور رواداری کا درس ملتا ہے۔ ویسے تو تمام کہانیاں اور حکایات بچوں کے لئے دلچسپی اور کشش رکھتی ہیں لیکن بعض کہانیاں ایسی ہیں جو بچوں کے ذہنوں پر اچھا نقش چھوڑ جائیں گی۔ مثلاً ظلم کا انجام، رحم دل بادشاہ، نیکی وقت پر کام آتی ہے، غریبوں کی آہ، کم ظرف شاگرد، برا چاہنے والوں کے ساتھ بھی بھلائی کرو، اللہ کے نیک بندے، حکیم لقمان کی نصیحت اور لالچ کا دروازہ، چھوٹی موٹی کہانیوں اور حکایات کے ذریعہ بچوں کی ذہنی تربیت کی یہ کوشش لائق تحسین ہے اور اس کے لئے کتاب کے مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

——— واصِف اعظمی

نام جریدہ: "امکان" (دلت سوانح پر خصوصی اشاعت)
مُرتّبین: ڈاکٹر: ارتکاز افضل - ڈاکٹر رام پنڈت
قیمت: دس رُوپئے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مراٹھی میں دلت ادب نے لازوال اضافہ کیا ہے۔ انگریزی ادب میں بلیک لٹریچر کی جو اہمیت ہے۔ وہی مراٹھی میں دلت ادب کی ہے۔ خصوصیت سے شاعری اور سوانح نے تو جو مقبولیت حاصل کی ہے اور تاثیر کا جادو جگایا ہے۔ اس کی مثال آسانی سے نہیں ملے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ سوانح زندگی میں ایک ہی بار لکھی جاتی ہے۔ وہ بھی پختگی کی منزلوں میں پہنچنے کے بعد۔ لیکن سوانح میں جس وضاحت کے ساتھ گرد و پیش اور سماجی ماحول کی عکاسی ہوتی ہے وہ ادب کی دوسری اصناف میں ممکن نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ چاہے سوانح یا آپ بیتی ادب کا عظیم شہ پارہ قرار نہ پائے مگر دُکھ سُکھ کی دھوپ چھاؤں کا اس سے بہتر اظہار بیان نہیں ہوسکتا۔ دلت سوانح نگار جب اپنی رُوداد زندگی بیان کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ سماجی بے انصافیوں اور معاشرہ کی ناہمواریوں کو سامنے لانا چاہتے ہیں اور اپنی نسلوں کے لئے مساوات پر مبنی ایک روشن خیال سماج کی تعمیر و تشکیل کے خواہاں ہیں۔ یہی جذبہ ان کی فکر پر حاوی ہے۔

امکان نے دلت سوانح پر ایک سو پچاس صفحات کا یہ خصوصی شمارہ نکال کر اردو والوں پر احسان کیا ہے۔ ڈاکٹر امبیدکر کی "میری زندگی" سے لے کر شنکر راؤ کھرات کی "جلتی شمعیں" تک بارہ بڑے تخلیق کاروں کے کامیاب اور سلیس و آسان بامحاورہ اردو زبان میں ترجمے اس خصوصی شمارہ کو یادگار بنانے کی بامقصد کوشش ہے۔

——— فیصل کلیم

نام کتاب: **معلم العربیۃ**
مصنف: ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم — قیمت ۲۵/ روپیے
ملنے کا پتہ: رضوی کتاب گھر۔ ۴۲۳ مٹیا محل
جامع مسجد، دہلی-۶

یونانی طب کی فن شناسی کے لئے عربی سے واقفیت بلکہ اس میں مہارت بھی ضروری ہے کیونکہ علم طب کی اہم کتابیں اب بھی عربی میں ہی ہیں۔ ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف طب کے طلبہ اور طالبات پر احسان کیا ہے بلکہ فن طب کی بھی خدمت انجام دی ہے۔ بقول ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم۔

"۱۹۹۰ء میں جب میں ہمدرد یونیورسٹی دہلی سے وابستہ ہوا تو ایک سال گزرتے ہی شعبہ اسلامیات کی ذمہ داری کے ساتھ ہمدرد طبی کالج میں وقتی طور پر عربی پڑھانے کی ذمہ داری بھی میرے سپرد کی گئی۔ طلبہ کے نصاب میں داخل عربی کتابوں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ ان کتابوں کا سنٹرل کونسل آف یونانی میڈیسن نئی دہلی سے دور دور کا واسطہ بھی نہیں تھا وہ کتابیں طب کے طلبہ کے لئے غیر مفید تھیں جس کے سبب انہیں عربی کے اصطلاحات کو سمجھنے میں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔
پریشانی کیوں نہ ہوتی کتاب کو سمجھنے کے لئے فرہنگ یا اصطلاحات کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے بقول مصنف میں نے ایک ایسی کتاب مرتب کرنے کا قصد کیا جو نصابی کتابوں کی اصطلاحات کے ساتھ عربی طبی اصطلاحات میں ہو۔"

کتاب معلم العربیہ دو حصوں اور ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے جا بجا عربی اصطلاحات کے مفید و معلوماتی نوٹ بھی دیئے گئے ہیں غرضیکہ کتاب کو ہر طرح طب کے طلبہ کے لئے مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد سابق صدر شعبہ عربی و ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر انجم کو طبی کتابوں سے خاص شغف رہا ہے یوپی بورڈ کے ایک امتحان میں انہوں نے طب کا کچھ مطالعہ بھی کیا ہے۔ اور ایک عرصہ تک ہمدرد طبی کالج جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں سنٹرل کونسل آف یونانی میڈیسن کے نصاب کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے طلبہ کو عربی تعلیم بھی دی ہے۔

اس کونسل کے نصاب کے مطابق عربی زبان میں ایسی کوئی کتاب نہ تھی جسے شامل درس کرکے طالب علموں کو عربی زبان و اصطلاحات کی تعلیم دی جاتی۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے زیر نظر کتاب ایک سال کی مسلسل کاوش کے بعد تیار کی ہے جو وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

کتاب میں معلموں کے لئے ہدایات اور مفید مشورے بھی ہیں۔ طلبہ کے لئے دلچسپ سوال و جواب بھی ہیں۔ غرضیکہ کتاب ہر طرح مفید اور لائق تحسین ہے۔

اگر آل انڈیا یونانی کونسل آف میڈیسن اس کو نصاب میں شامل کردے تو طلبہ کو غیر معمولی فائدہ پہونچے گا۔ ویسے بھی کتاب کی زبان اور طرز بیان سہل ہونے کی وجہ سے طب یونانی کے طلبہ اس سے بہت فائدہ اٹھا سکیں گے۔

امید ہے ڈاکٹر انجم کا قلم اردو میں اس طرح کی کتابیں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھے گا جو اس دور میں فن طب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

—— اِسْحَاق سَنبھلی

نام کتاب: "**آئینۂ سیما**" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل۔ قیمت ۵/ روپے
ملنے کا پتہ: رحیم اسٹورس، جیدری روڈ۔ موممن پورہ
ناگ پور (یوپی)

"آئینۂ سیما" شرف الدین ساحل صاحب کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کے تین مجموعہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس میں دست کوہکن، شرار جستہ، حرا کی روشنی (نعتیہ شاعری کا مجموعہ) شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیق اور تنقید کے مجموعہ بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی ایک تحقیقی کتاب جو کہ ناگپور کے مسلم معاشرے کے موضوع سے شائع ہوئی کافی مقبول ہوئی۔ شرف الدین صاحب ایک اچھے محقق ہیں۔ وہ ماضی کو کرید کر مستقبل پر اطلاق کرنے کا فن جانتے ہیں۔

آئینۂ سیما میں ساحل صاحب نے صرف اسلام پسندی کی تعریف ہی نہیں بلکہ انسانیت پرستی کی تصویر بھی پیش کی ہے۔

شروع میں اس مجموعے [illegible]

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

تو میری سوچ کے پودے کو اک شجر کر دے
دُعا یہ ہے مرے لہجے کو معتبر کر دے

اس کے بعد اس مجموعے میں حمد پر بہت ساری نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کتابت اور چھپائی بہت عمدہ ہے مجھے پوری امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعے کی بہت پذیرائی ہوگی۔

——— علی اکبر

نام کتاب: "روضۃ الاولیاء"
مؤلف: علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ مترجم: پروفیسر نثار احمد فاروقی
قیمت: باون روپیے
ملنے کا پتہ: مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ۔ سنگنج (رامپور) (یو۔پی)

زیر تبصرہ کتاب "روضۃ الاولیاء" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مہاراشٹر کے دس ممتاز اولیاء کے متعلق فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کے مؤلف مشہور مؤرخ، اپنے وقت کے بلند پایہ عالم محقق بالخصوص "مآثر الکرام" جیسی عظیم کتاب کے مصنف علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی ہیں۔ اور اس کا ترجمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کیا ہے جو اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔

قومی یکجہتی اور امن و شانتی کا درس دینے والے صوفی سنتوں سے متعلق دوسری زبانوں میں موجود ذخائر سے اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ نئی نسل کو روشناس کرانے کا جو بیڑہ پروفیسر صاحب نے اٹھایا ہے وہ بے حد اہم اور قابل تعریف ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاء کے حالات پر مبنی کتاب "قوام العقائد" کا ترجمہ منظر عام پر آیا اور مقبول عام ہوا۔

مولانا برہان الدین ہانسوی اور خواجہ گیسو دراز بندہ نواز جیسے بلند مقام صوفیوں کے حالات سے مزین یہ کتاب مقدمے اور حواشی کی وجہ سے اپنا علمی مقام اور زیادہ بڑھا لیتی ہے۔

یہ کتاب ترجمہ [illegible] ایک سو [illegible] صفحات پر مشتمل ہے جس کی کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ البتہ اگر اس کتاب کو اس طرح پیش کیا جاتا کہ ہر ایک [illegible] مولانا برہان الدین کا تذکرہ جہاں [illegible] اور بہتر ہوتا۔

مقدمے میں صاحب کتاب کی ولادت کا سن [illegible] چھپ گیا ہے جب کہ اصل سن [illegible] ہے۔

——— اے۔ مجید

نام کتاب "اُردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے"
مصنف: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط قیمت: ۴۰/ روپیے
ملنے کا پتہ: "کاشانہ" کل گاؤں۔ ضلع دیوت مل
۴۴۵۲۰۳

"اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے" ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی ۱۳ سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ قدیم مہاراشٹر میں ہندو، مسلمانوں کے درمیان رواداری اور جذباتی ہم آہنگی کی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جس سے اتحاد و اتفاق، آپسی میل جول اور اشتراک و ارتباط باہمی کی بدولت یہاں کا ہندو مسلم کلچر ایک دوسرے سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اور ایک دوسرے کو متاثر کرتا رہا۔ مہاراشٹر کے ہندو اور مسلمان صوفی سنتوں نے ظاہری رنگ ڈھنگ کو صاف و شفاف کرنے کے ساتھ ساتھ باطن کو بھی مجلّی کرنے میں کافی محنت کی اور کامیاب ہوئے۔ وہ ہر مکتب فکر کے ماننے والوں کے نفس کا تزکیہ کرتے رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ظاہری اعتبار سے تو ہر آدمی کا مذہب الگ الگ ہو سکتا ہے باطن میں البتہ اس کی ایک ہی روح ہے۔ لہٰذا روح کے تصفیہ پر انہوں نے بڑا زور دیا۔ مصنف نے اس کتاب کو شائع کرکے قومی یکجہتی کو تقویت پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر نشیط نے اس کتاب میں مختلف عنوانات قائم کرکے اس کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے، مراٹھی کے مسلم شعراء کی اردو کاوش، اردو مراٹھی، ثقافتی ہم آہنگی وغیرہ۔

اس کتاب کی کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے سرورق بھی جاذب نظر ہے۔

——— سید ظفر الحسن

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا لازمی ہیں ——— ایڈیٹر

اُردو اَدب کا ناقابلِ تلافی نقصان

منظر سلیم، وحید اختر اور شجاعت علی سندیلوی بھی رخصت ہوئے

■ اُردو کے مشہور افسانہ نگار، اچھے شاعر، سوانح نگار اور قومی آواز کے سابق چیف رپورٹر منظر سلیم کا ۲ دسمبر ۱۹۹۶ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک مخلص، وضع دار اور شریف انسان تھے۔ منظر سلیم ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ سلطان پور ضلع میں پیدا ہوئے تھے۔ شاعری میں انھوں نے غزلیں اور نظمیں دونوں ہی لکھیں مگر خاص طور پر ان کی نظمیں کافی مشہور ہوئیں۔

منظر صاحب کے انتقال سے اُردو زبان و اُدب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

■ ممتاز شاعر اور ناقد پروفیسر وحید اختر بھی ۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ء کو ہم سے جدا ہوگئے۔ ملک محمد جائسی کے مردم خیز افق کا یہ تارا اورنگ آباد میں طلوع ہوا اور حیدرآباد اور علی گڑھ کی فضا کو جگمگا کر اچانک ڈوب گیا۔ تقریباً چالیس برس پر پھیلے ہوئے ادبی سفر میں وحید اختر نے فکر و فن پر جو نقوش چھوڑے ہیں وہ کبھی ماند نہیں پڑیں گے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فلسفہ کے صدر شعبہ تھے اور یہ علمی پس منظر ان کے رنگ و آہنگ کی گہری اور تازہ فکر کی شکل میں نمایاں ہوا۔ ان کے یہاں جدّت طرازی اور حسنِ آفرینی، کلاسیکیت اور ترقی پسندی، تجربہ کاری اور عصری آگہی کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ اور یہ عناصر ان کی غزلوں اور نظموں ہی میں نہیں ان کی جدید ترین رثائی تخلیقوں میں بھی نمایاں ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں۔ پتھروں کا مغنی، شب کا رزمیہ۔ زنجیر کا نغمہ، اور کربلا سے کربلا تک۔ اور تنقید میں: فلسفہ اور ادبی تنقید، خواجہ میر دردؔ، تصوّف اور شاعری طبع ہو چکے ہیں۔ وہ کافی عرصے گردے کی بیماری کا علاج کرا رہے تھے۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

■ اُردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ انھیں چند روز قبل ایک مقامی اسپتال میں داخل کیا گیا تھا جہاں انھوں نے ۲۲ دسمبر کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ شجاعت صاحب اُردو کے ایک زبردست شیدائی اور مجاہد تھے اور اُردو زبان کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ خواہ طلباء کی تعلیمی رہنمائی ہو یا اُردو کی حمایت میں ہونے والی سرگرمیاں۔ شجاعت صاحب ہر وقت اُردو کی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔

شجاعت صاحب اودھ کے مردم خیز قصبے سندیلہ کے رہنے والے تھے۔ یکم ستمبر ۱۹۱۹ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ آگرہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے حالیؔ بحیثیت شاعر کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ درجن ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۹۷۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی تدریسی خدمات جاری رہیں۔ ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

سید امجد حسین

جلد ۵۱ نمبر ۱۱

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
غزل	ندا فاضلی	۳
یادوں کی رہ گزر (۸)	علی جواد زیدی	۴
قطعات	عمر انصاری	۸
میں ہوں اپنی شکست کی آواز (خود نوشت)	کنور سین	۹
یادوں کے گلاب (نظم)	سلمان عباسی	۱۰
جشنِ انجام (نظم)	مہاراج کومل	۱۱
محبت کا زمانہ (نظم)	وارث کرمانی	۱۱
اقبال کے مشاعرے	اکبر حیدری کشمیری	۱۲
عید مبارک (قطعہ)	حامد مینائی	۱۸
غزل	مظفر حنفی	۱۹
نذرِ لکھنؤ (نظم)	حسین مشیر علوی	۱۹
سنگم سے بیدر تک	مجاور حسین رضوی	۲۰
غزلیں	محبوب پاشا	۲۳
	احسان نانپاروی۔ ظفر امام	۲۳
احتشام حسین کا رویہ: جدید نسل کے ساتھ	مظہر امام	۲۴
قطعہ	افتخار عابد شفق	۳۲
غزلیں	سیلانی سیوتے۔ توقیر جمال	۳۳
	ساجد خیرآبادی۔ زاہد لکھنوی۔ عبدالقیوم فرقت	۳۳
ہندی کہانی۔ ایک صدی کا سفر	شکیل صدیقی	۳۴
شوپور کی کنجنی (افسانہ)	نسیم بن آسی	۳۸
نقد و تبصرہ	سلمان علی خاں۔ احمد ابراہیم علوی	۴۳
	عرفان عباسی۔ اختر مہدی۔ پیام اعظمی	تا
	شکیب رضوی۔ خلیل اللہ خاں۔ جاوید حمیدی۔ شیبا افتخار	۴۶
ہم پر سے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ	شہانہ سلمان	۴۷
غزل	خالد عبادی	۴۸

اپنی بات

نیا دور کے قارئین کو عید مبارک!

یہ عید بہت ساری جگہوں پر خصوصاً دکن میں رمضان کی عید کہلاتی ہے۔ رمضان کا سابقہ اسے دوسری عیدوں سے الگ کرتا ہے اس لیے کہ وہاں ہر خوشی اور مسرت کے تہوار کو عید کہتے ہیں، لیکن شمال میں عید سے مُراد صرف یہی پُرمسرت تہوار ہے جو رمضان کے روزوں کی تکمیل کے بعد منایا جاتا ہے اس تہوار کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مذہبی جلوہ رکھتے ہوئے بھی ہر خاص وعام کے لیے یکساں کشش رکھتا ہے اور تقریباً سارے ہندستانی بڑے ذوق وشوق سے اسے مناتے ہیں اور اپنے مُسلم بھائیوں کے ساتھ اس خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔

امسال عید کی مسرّت اس لیے بھی دوگنی ہے کہ عید اور بسنت پنچمی کے تہوار ایک ساتھ پڑ رہے ہیں۔ ایک ہی دن دَو پُرمسرت تہواروں کا منایا جانا فالِ نیک ہے اور ہماری اس ہندستانی تہذیبی روایت کا مظہر ہے جہاں

"گنگا سے ہمکنار ہیں موجیں فرات کی"

بسنت کا تہوار اُردو شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے بھی بسنت پر بڑے خوبصورت اشعار کہے ہیں اور شاکر ناجی کی مثنوی اس سلسلے میں سب سے مشہور ہے۔ بسنت کا تہوار ایک طرف تو سخت کڑکڑاتی سردی کو الوداع کہتا ہے دوسری طرف فضا میں خوش گوار خنکی، اور سوکھے ہوئے درختوں میں نئی کونپلوں، شگوفوں اور پھولوں کا پیغام لے کر آتا ہے اس لیے اس کا خیر مقدم بھی سب کرتے ہیں۔ قارئین کو بسنت کی بھی مبارکباد!

یہ دونوں خوشیاں ومسرتیں ہماری تہذیبی یگانگت کی مظہر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہیے کہ زندگی حصولِ مسرّت کا نام ہے اور خوشیاں ومسرتیں فکری اختلاف کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کا نام ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب سوسائٹی میں ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اندر باہمی احترام کا جذبہ ہو۔ یہ جذبہ جب پیدا ہوتا ہے تو صرف نفرت اور تعصب کی دیواریں ہی نہیں ٹوٹتیں بلکہ تشدد، قتل وغارت گری اور خوں ریزی کا راستہ بھی بند ہوجاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ آج ساری دُنیا کو صرف یہی "گرونتر" درکار ہے اگر اخلاقیات کے اس اہم نکتے کو ذہن نشین کرلیا جائے تو سماج سے بدعنوانیوں کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔

ہمارے دیش کی سُنہری روایات باہمی احترام کے اسی اخلاقی فلسفے پر رہی ہیں۔ اقوامِ عالم ہماری طرف پُرامید نظروں سے دیکھتی ہیں۔ اور اس لیے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اس اعلیٰ اخلاقی اصول کی پاسداری بھی کریں اور اس پیغام کی اشاعت بھی کریں۔

ہماری جستجو خوب سے خوب تر کی تلاش رہی ہے اور رہے گی۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ جس طرح ماضی میں نیا دور کے خصوصی نمبروں کی پیش کش کے سلسلے میں روایت سازی کا احساس ہوا ہے وہ انشاءاللہ برقرار رہے گا اور آنے والے نمبر بھی اُردو صحافت میں تحفۂ بے مثال ثابت ہوں گے۔ بس آپ کی دُعائیں اور تائید ایزدی چاہیے۔ کہ یہی ہمارا اثاثہ اور سرمایہ ہے۔

ایڈیٹر

غزل

ندا فاضلی

۱۰۴- امر اپارٹمنٹ
'کھار'
ڈنڈا روڈ - ممبئی
۴۰۰۰۵۴

آتی جاتی ہر محبت ہے چلو یوں ہی سہی
جب تلک ہے، خوبصورت ہے چلو یوں ہی سہی

ہم کہاں کے دیوتا ہیں، بے وفا وہ ہیں تو کیا
گھر میں کوئی گھر کی زینت ہے چلو یوں ہی سہی

وہ نہیں تو کوئی تو ہوگا کہیں اس کی طرح
جسم میں جب تک حرارت ہے چلو یوں ہی سہی

بھول تھی اپنی فرشتہ آدمی میں ڈھونڈنا
آدمی میں آدمیت ہے چلو یوں ہی سہی

میلے ہو جاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے، چلو یوں ہی سہی

جیسی ہونی چاہیے تھی ویسی تو دنیا نہیں
دنیا داری بھی ضرورت ہے چلو یوں ہی سہی

علی جواد زیدی
۱۲۸۲ وشواس کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

(۸)

جیل کے شب و روز

یوں تو جیل کی زندگی کے تجربات بے حد متنوع رہے ہیں اور ان کی یادیں آج بھی میرے لیے دل کش ہیں لیکن ان سب کو سمیٹنا نہ تو ممکن ہے نہ میرا مقصود۔ اگر میں ان میں پھنس گیا تو آگے بڑھنا ناممکن ہو جائے گا۔ طلبا کی تحریک کے ساتھیوں میں قاضی جلیل عباسی اور علی سردار جعفری (جو بعد میں صرف سردار جعفری رہ گئے) کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ دونوں ہی میرے وارڈ میں تھے بلکہ قاضی اور میں تو ایک ہی کمرے میں مقیم تھے قاضی ہم جماعت اور ہم درس تھے اور طلبا کی سیاست میں بھی ہم دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ میں قاضی کے بڑے بھائی قاضی عدیل عباسی مرحوم کے نیاز مندوں میں تھا۔ ان کے علاوہ ایک اور بڑے بھائی مجیب اللہ صاحب مرحوم سے بھی واقف تھا اور عزیزوں سے بھی ملاقاتیں تھیں، اس لیے قاضی جلیل عباسی سے تعلقات زیادہ گہرے اور گھر کے فرد جیسے ہو گئے تھے۔ ایک بار ان کی طبیعت کچھ بے لطف ہوئی تو میں نے اس کا ذکر والدہ صاحبہ مرحومہ کے خط میں کر دیا۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ "تم ان کی تیمارداری میں کوتاہی نہ کرنا ورنہ میں تم کو کبھی معاف نہ کروں گی۔" میں ان کی مادرانہ شفقت کی وسعت سے حیران رہ گیا۔ قید و بند کی مصیبت کے ساتھی قریبی عزیزوں ہی کی طرح عزیز ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ کبھی قاضی کو دیکھا تھا، نہ ان سے واقف تھیں لیکن ان کی شفقت کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ میرے زندانی ساتھی ہیں۔ یہ خط قاضی نے بھی دیکھا اور بے حد متاثر ہوئے اور مجھ سے شکریہ ادا کرنے لگے۔ مجھے مجاز ردولوی کا یہ جملہ یاد آگیا کہ "اگر ماؤں کی کوئی کانفرنس ہو تو اس میں ہر تجویز متفقہ طور پر پاس ہو جائے گی۔" افسوس کہ میں یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ یہ اطلاع ملی کہ قاضی جلیل اس دنیا میں نہیں رہے واقعتاً بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہاں جیل میں صرف کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے جیل سے رہائی کے بعد ہم طویل مدت تک ساتھ رہے ہیں اور دوستی کو نبھایا ہے۔

قاضی جلیل عباسی

وہ ان چند نفوس میں تھے جن کی دوستی استوار اور ناقابل شکست تھی۔ وہ سردار جعفری کو مجھ سے زیادہ اور بہت پہلے سے جانتے تھے۔ دونوں علیگ تھے، لیکن یونیورسٹی انتخابات میں اور طلبا کی سیاست میں انھوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ اگر اختلاف ہوا تو بحثیں کیں، دلائل دیئے لیکن فیصلہ کرتے وقت دوستی کی پاسداری کرتے رہے۔ کوشش یہی رہتی تھی کہ ہم ایک ہی راہ پر چلیں۔ ہم آزاد خیال بھی تھے، اختلاف رائے بھی ہو جاتا تھا مگر ٹکراؤ کی صورت کبھی پیش نہ آئی۔ باتیں دل چسپ اور بلند آواز میں کرتے تھے اور تفصیلی گفتگو کے قائل تھے، شروع ہو جاتے تو جلد بات ختم نہ ہوتی لیکن دراز گفتاری کا احساس بھی تھا اس سلسلے میں وہ اپنے بڑے بھائی مجیب اللہ صاحب کے ایک واقعے کا ذکر بزرگ داشت کا خیال رکھتے ہوئے کیا کرتے تھے۔ وہ علی گڑھ میں تھے کہ ان کے پاس تار پہونچا کہ والدہ صاحبہ کی طبیعت بے لطف ہے۔ وہ فوراً علی گڑھ سے روانہ ہو گئے۔ دو دن کے بعد ان کے جگری دوست اور طلبا کی سیاست سے وابستہ صدیق احمد صدیقی (جن کو عرف عام میں چچا صدیق کہا جاتا تھا) بھی بستی کے لیے روانہ ہو گئے کہ جا کر اماں کی خیریت معلوم کریں۔ وہاں پہونچے اور سامان اتروا کر کمرے میں رکھا ہی تھا کہ مجیب اللہ صاحب آ گئے۔ ان سے پوچھا کہ اماں کیسی ہیں؟

انھوں نے کہا، جب اماں بیادا سے چلی تھیں تو بالکل ٹھیک تھیں۔ موصوف تفصیلات بتاتے چلے جارہے ہیں اور صدیقی سنتے چلے جارہے ہیں لیکن اماں جان ابھی تک بستی پہونچی ہی نہیں ہیں۔ چچا صدیق بول اُٹھے،

"گستاخی معاف، یہ تو بتا دیجیے کہ اس وقت مزاج کیسا ہے؟"

بس برہم ہو گئے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ "جب آپ سُننا ہی نہیں چاہتے تو بتانے سے فائدہ۔؟" اتنے میں "قاضی جلیل آگئے۔ ان سے صدیقی نے وہی ابتدائی سوال دہرادیا تو انھوں نے اطمینان دلایا کہ "اب بہتر ہیں۔" چچا صدیق گھبرا گئے تھے کہ شاید مجیب اللہ بھائی خفا نہ ہو گئے ہوں لیکن قاضی نے انھیں تسکین دی۔ اتنے میں مجیب اللہ صاحب آگئے۔ صدیقی اب سنبھل چکے تھے انھوں نے باقی حالات پوچھنا چاہے اور بقیہ تفصیل انھوں نے صبر و سکون سے سنی۔ لیکن انھوں نے اب یہ معمول بنا لیا کہ جب قاضی تفصیلات میں جانا چاہتے تو وہ کہہ دیتے کہ "جب اماں بیادا سے چلیں!" فوراً وقتی بریک سا لگ جاتا۔ بھائی مجیب اللہ مرحوم بھی مستثنیات میں نہیں تھے۔ دیہاتوں اور قصبوں میں باتوں کے لیے وقت کافی ملتا تھا اور اکثر لوگ جزئیات کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔ اب وقت بدل گیا ہے اور شہر قصبے اور دیہات کہیں بھی فرصت کے وہ اوقات اس حد تک میسر نہیں رہ گئے ہیں۔

انداز گفتگو میں اور لہجے میں، دوست داری میں، بزرگ داشت میں قاضی جلیل اپنے برادر بزرگ قاضی عدیل عباسی مرحوم سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ سیاست میں جوش و ولولہ تو انھیں جیسا تھا لیکن جو فقیر منشی خلافت کے دَورِ اوّل کے مجاہدینِ آزادی میں تھی اس میں ان کو اس لیے کم حصہ ملا کہ ان کے بھائی نے انھیں ہمیشہ ناز و نعم سے رکھا اور تعلیم کے زمانے میں بھی انھیں کسی قسم کی مالی مشکل یا کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ قاضی نے بھی "ڈائری لکھنا" شروع کی تھی لیکن یہ قدغن سے بچا کر باہر لے آئے اور اسی ڈائری کو بنیاد بناکر "وہ بھی کیا دن تھے" کے عنوان سے دل چسپ انداز میں انھوں نے بھی یادوں کو سمیٹ لیا ہے۔ سچ مچ جدوجہد کے یہ دن بھلائے نہیں جا سکتے۔ : اس لذت کو پوری طرح ابلاغ و ترسیل کی گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں قریب گیا تسلی دینا چاہی تو اور پھوٹ پڑے۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، کچھ لطیفے اور چٹکلے بھی سُنائے۔ خیر وہ موج گزر گئی۔ دوسرے دن پھر دیکھا کہ ملول ہیں۔ میں نے باتوں میں مشغول کرنا چاہا تو بولے "میرا دل بھر آتا ہے۔" میں نے کہا:

"پیارے! اس وقت سے ڈرو جب میرا دل بھی بھر آئے گا۔"

بالآخر رک رک کر بولے۔ "میں چاہتا ہوں کہ دو ایک روز کے لیے علی سردار جعفری کو یہاں بُلالاؤ اور تم ان کے کمرے میں چلے جاؤ۔"

میں نے سمجھایا کہ "یہ تو جیل کے قواعد کے خلاف ہے۔ لیکن تم چاہو تو بلالو، میں وہاں چلا جاؤں گا۔"

ارشاد ہوا: "نہیں تمھیں اصرار کرو۔"

میں اس پر بھی راضی ہو گیا۔ پہلے تو سردار جز بز کہ "میں ایسا کیوں کروں؟ یہ خلاف ورزی قواعد ہے۔ پھر میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھے اپنے ساتھی سے اپنے جانے اور تمھارے آنے کے لیے پوچھنا پڑے گا۔" میں نے بتایا کہ بظاہر قاضی نفسیاتی دباؤ کا احساس کر رہے ہیں۔ غرض تمام مراحل طے ہو گئے۔ تیسرے دن شام کو وہ کہنے لگے کہ "بھئی زیدی، بس بہت ہو چکا اب میں وہاں نہیں رہوں گا۔ تم اپنے کمرے میں واپس جاؤ۔"

میں نے کہا "پہلے تم آؤ، نہیں تو قاضی نہیں مانیں گے۔" خیر، وہ اپنے کمرے میں واپس ہی چلے آئے اور مجھے جانا پڑا۔ دراصل قاضی جس ماحول کے عادی تھے وہ بہت ہی سمٹا ہوا ماحول تھا۔ گھر والے اور علی گڑھ۔ لکھنؤ نسبتاً نیا تھا۔ جیل کی رفاقت اختیاری نہیں مجبوری کی تھی۔ لیکن دنیا بدل گئی اور وہ کبھی اس عالم گم شدگی میں واپس نہیں گئے۔!

پھر وہ کچھ بیمار ہوئے، جیل کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ وہاں اصرار کیا کہ تم بھی آجاؤ۔ اتفاق سے جیل کے ڈاکٹر ترقی پسند شاعر مسعود اختر جمال کے دوست تھے۔ قاضی نے ان سے کہہ سُن کے مجھے بھی جیل اسپتال میں داخل کرالیا۔ وہاں میں نے کچھ نظمیں لکھیں اور جو وقت بچتا ہم دونوں ایک دوسرے کو بور کرتے رہتے۔

جیل میں ہم لوگوں کے علاوہ پڑھنے لکھنے سے دل چسپی رکھنے والے سوشلسٹ اور کمیونسٹ قیدی بھی تھے۔ وہ چوری چھپے ایسی کتابیں بھی منگوا لیتے تھے جن کا داخلہ ملک میں ممنوع تھا اور ایسے جرائد بھی جو جیل کے حدود میں نہیں آسکتے تھے۔ بعد میں یہ جرائد باورچی خانے کے کام کرنے والوں

کسے خبر تھی کہ یہ اس کی تاک میں ہوگا
ابھی تو نامۂ شوق اس کا ڈاک میں ہوگا

اس نے اپنی زندگی کی جو کہانی سنائی تھی مختصراً وہ بھی سُنیے :

ہے ایک گوشے میں ناچار قیدیوں کا ہجوم
غم و طرب کا جسے فرق بھی نہیں معلوم

....

اسی ہجوم میں وہ جیل کا شکار بھی تھا
کہ جس پہ موت کو تھوڑا سا اعتبار بھی تھا
مرض کے سخت شکنجوں میں چھوڑ رکھا تھا
حیات و موت کے پنجوں میں چھوڑ رکھا تھا
لگا تھا اس کا لہو غم کے تازیانے میں
بنا ہوا تھا چلیپا خوشی کے خانے میں
گھٹا ہوا تھا دھواں صحنِ زندگانی میں
ہزار درد کے پہلو تھے اس کہانی میں
عجب حیات تھی شیشے میں جو اُتر نہ سکی
کھلی سڑک سے کسی دن خوشی گزر نہ سکی
امید خواب میں جلوے دکھا کے لوٹ گئی
لبوں پہ آئی ہنسی بھی تو آ کے لوٹ گئی

اور پھر موت کتنی آسانی سے آگئی ۔

جو اس کے ساتھ کے قیدی تھے چھیڑ کرنے لگے
سترتوں کے دبے زمزمے اُبھرنے لگے
مذاق میں کسی ساتھی نے ہاتھ مار دیا
مرض نے موت کے در پر یہ قرض اُتار دیا
کسی سے اور تو کچھ ہو سکا نہ ہلچل میں
لپیٹ دی گئی قیدی کی لاش کمبل میں

ان چند بھیانک لمحوں میں سیاست داں اور دانشور کیا کر سکتے تھے ۔ ؟
جرم و سزا کے بعد حیات و موت کے فلسفے پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی ۔

حیات و موت کا ہر فلسفہ سلجھنے لگا
کسی خیال سے سینوں میں دم الجھنے لگا

ہر ایک آنکھ میں اندازِ سوگواری تھا
ہر ایک سمت خزاں کا سکوت طاری تھا
جو اور شکل نہ تھی کوئی غم بھلانے کی
تو فکر ہونے لگی چائے ہی بنانے کی

"دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است"

(باقی)

موت کا دیوتا

قطعات

ہر طرف رحمتِ باری کی گھٹا چھائی ہے
مژدہ اے اہلِ جنوں تم کو کہ عید آئی ہے
دوستو آؤ گلے مِل لو، کہ ہے عید کا دن
آج کے دن تو نہ ملنے ہی میں رُسوائی ہے

لائے کہاں سے ڈھونڈ کے کوئی مثالِ عید
بن کر بہار آتا ہے دل میں خیالِ عید
رُوٹھے ہوؤں کو بھی تو ملا دیتا ہے گلے
لاتا ہے کیا پیامِ محبّت ہلالِ عید

جب بھی آتا ہے نئے خواب جگا جاتا ہے
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو جلا جاتا ہے
تم سے اچھا تو یہی دوستو ہے عید کا چاند
سال پیچھے ہی صُورت تو دکھا جاتا ہے

زہے نصیب، کہ پھر آگیا پیامِ عید
پھر ایک قطعہ لکھوائے عمر بنامِ عید
جو تم سے خورد ہیں ان کو دُعائیں لکھ بھیجو
ادب سے بھیجو بزرگوں کو پھر سلامِ عید

عمر انصاری

خود نوشت

کنور سین
ای ۴۲، ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی
۱۱۰۰۰۸



میں ہوں اپنی شکست کی آواز

میاں کنور سین ولد لالہ ڈلیا رام ساکن نواں شہر دوآبہ (پنجاب) ۱۵ر فروری ۱۹۲۹ء کو اپنے ننہال ہوشیار پور میں پیدا ہوا اور شوق آوارگی اور ستم ظریفیٔ حالات اور گردش روزگار کے تابع نئی دہلی میں آبسا۔

پیدائش سے ہی نحیف و نزار اور بیمار تھا اس لیے باوجود بہترین خوراک، صاف ستھرے، خوش گوار ماحول اور خاص پرورش کے، جسمانی طور پر بس ایسا ہی رہا۔ حالاں کہ ورزش کا شوق آج بھی ہے اور اسی کے طفیل کشتی لڑنا، گھوڑسواری کرنا اور تیراکی میں مست رہنا میرے خاص مشاغل رہے اور ان کے ساتھ ساتھ سیر سپاٹے سے بھی رغبت رہی، لیکن جسم میں وہ توانائی کبھی نہیں آئی جس پر میں رشک کر سکوں۔ آج بھی بلغمی مزاج سے تنگ اور عاجز رہتا ہوں گو سانس کی تکلیف سے یکسر آزاد ہوں اور اس آزادی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

نواں شہر ایک قصبہ ہے اور ہوشیار پور ایک شہر اس لیے میں نے دیہاتی اور شہری دونوں زندگیوں کو خوب بھوگا ہے۔ صبح اٹھنا، سیر کو جانا اپنی زمینوں میں اگی ترکاری اور پھل کھانا۔ آم کے پیڑ سے لٹکتے آم کو خود توڑ کر خود چوسنا اور اوس میں بھیگے گنے کو جڑ سے اکھاڑ کر اس کے چھلکے کو دانتوں سے پکڑ کر ادھیڑنا مجھے بہت بھاتا تھا اور دوسری چیز جس کا مشتاق تھا وہ تھی تیراکی! وسیع تالاب میں صبح سویرے کود پڑنا اور دوپہر تک لگاتار تیرتے چلے جانا اور کنارے کھڑے تماشہ دیکھنے والوں کو حیران کر دینا میرا چھٹی کے دن کا خاص پروگرام ہوتا تھا اور میں اپنی اس کامیابی پر اِتراتا بھی رہتا تھا۔

اُدھر ننھال یعنی ہوشیار پور میں نانی کے سایۂ عاطفت کا مزہ لوٹنا۔ پستہ، بادام، اخروٹ، چلغوزے کھانا، دودھ، دہی ڈکارنا اور مٹھائیوں سے دل بہلانا بھی مجھے نصیب رہا۔

والدین اور ننہال خاصے امیر تھے۔ ننہال کی امارت کا تو ٹھکانا نہیں تھا اس وقت جب گنے چنے لوگوں کے پاس موٹر کار ہوتی تھی، میرے ایک ماموں ہر شام دوکان بڑھا کر کار میں لاہور عیاشی کرنے جاتے تھے۔ آج بھی ننہال میں وہی ٹھاٹھ باٹ ہیں۔ نوکر امورِ خانہ داری انجام دیتے ہیں اور عورتیں گپ شپ، ٹیپ اور قمار بازی سے دل بہلاتی ہیں۔ اسی ماحول نے مجھے خاصا بگاڑ دیا اور میں شراب نوشی اور قمار بازی میں بھی خوب ڈوبا رہا لیکن خوش قسمتی یہ رہی کہ میں اپنی تعلیم سے کبھی غافل نہیں رہا اور پالی ٹیکس اور انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے ساتھ ساتھ ہندستانی شاستریہ سنگیت میں سنگیت پربھاکر اور سنگیت شرومنی کیا۔

والد بھی بڑے زمیندار اور خاصے بڑے کاروبار کے مالک تھے۔ وقت تھا کہ میں ہندستان کے کسی بھی شہر میں ہوں بس آوارگی کا شکار ہوا پڑا۔ بذریعہ ٹیلی گرافک منی آرڈر روپیہ منگواتا اور کھلے دل سے خرچ کرتا۔ پھر وہ وقت آیا جب والد کو بیوپار میں زبردست گھاٹا ہوا۔ زمین، جائداد اور نقدی اس گھاٹے کی نذر ہو گئے اور میرے سر پر اچانک ہی اپنے گیارہ بھائی بہنوں کا بوجھ آپڑا۔ اسی بوجھ نے مجھے خوابِ عیش سے بیدار کر کے ملازمت کرنے کے لیے تیار کیا۔ اُدھر والد نے ہمت ہاری نہ میں نے جی چھوڑا اور میری اور میرے چھوٹے بھائیوں کی اعلا تعلیم ہمارے آڑے آئی اور خاندانی اثر و رسوخ نے بھی ہماری مدد فرمائی اور ہم پھر سے زندگی میں جم گئے۔ گو پہلے جیسی فراوانی اور خوش حالی تو نصیب نہیں ہوئی لیکن عزت دار زندگی بسر کرنے کے قابل ضرور ہو گئے، اور میں تو اپنی فضول خرچی اور عیاشی کو بھی دوبارہ اپنی زندگی کا معمول بنانے کے لائق ہو گیا۔ شاید اسی گوشۂ زندگی نے مجھے قدرے لڑاکو اور آزاد طبع اور نڈر بھی بنا دیا۔

طبیعت شروع سے ہی ادب اور آرٹ کی طرف مائل رہی۔ فطرت کے مناظر خاص کر ڈھلتے سورج کی بادلوں میں پھیلی سرخی مجھے از حد متاثر کرتی رہی اور اس کا نظارہ کرنے کے لیے ہماری اونچی حویلی کی چھت میرے کام آتی رہی۔ اسی چھت پر لیٹے لیٹے چاندنی میں شرابور ہونا بھی مجھے بہت بھلا لگتا اور میں چاندنی رات میں پتنگ اڑا کر اس کی ڈور اپنی چارپائی کے پائے سے باندھ کر سو جاتا۔ صبح جاگتا تو پتنگ کو کسی دور کے مکان کی چھت پر گرا ہوا پاتا اور زندگی کے عروج و زوال کی داستان کا ہلکا سا عکس میرے نادان ذہن میں ابھرنے لگتا۔

اسکول ہی میں میں پریم چند، یگانہ، سرت چندر اور دیگر تخلیق کاروں سے گفتگو کرنے لگا اور ان کی تخلیقات میرے دل و دماغ پر اپنی چھاپ چھوڑنے لگیں۔ کالج میں تو میں دنیا بھر کے شاعروں، کہانی کاروں اور مصوروں کے ساتھ ساتھ ہندستانی سنگیت کے استادوں سے بات کرنے لگا۔ فلمی گانوں سے شروع ہو کر راگ راگنیوں کے ساتھ معانقہ کرنے میں مست اور شکسپیر، ہیمنگوے، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، چیخوف، موپاساں، بالزاک، میر، غالب، کالیداس، سعدی، خیام اور پتہ نہیں کس کس کے آستانے پر سجدہ کرتے ہوئے اپنے اندر کے تخلیق کار کی تعلیم کا بندوبست کرنے لگا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کب میں نے ہندستانی شاستریہ سنگیت کے سروں کو سر کرتے ہوئے اپنی تان نکالی اور جب صحت نے ساتھ نہیں دیا تو اپنے تشخص کے اظہار کے لیے قلم کو آلۂ کار بنا کر افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ ادھر میں آرٹ گیلریوں میں جا کر جدید مصوروں کے شاہکاروں کا مطالعہ کر کے اپنے ذہن کو کشادہ کرنے لگا اور بقول اپنے شاعر دوست باقیؔ ؎

آنکھ کھلتی جائے گی منظر بدلتا جائے گا

زندگی کے تنوع اور اس کی گوناں گونی پر فریفتہ ہوتا چلا گیا۔ اسی فریفتگی نے مجھے اپنی شناخت کی تلاش میں روانہ کر دیا اور میں نے افسانہ لکھ کر زندگی کی کثافتوں اور لطافتوں کے منظر نامے کو اجاگر کر کے اپنے ہونے کی گواہی تخلیق کرنی شروع کر دی۔ اسی شناخت نے مجھے زبان کے تخلیقی اور کاٹ دار استعمال کی طرف راغب اور متوجہ کیا اور موضوع کے تنوع کی اہمیت کا احساس کرا دیا۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کروٹ کروٹ مجھے افسانہ لکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور مجھے بتاتی ہے کہ عمومیت سے گریز اور خصوصیت سے محبت ہی معراج آرزو ہے۔ لیکن میں شرابی، جواری، بدقماش اور سفلہ کردار اپنے اندر کے تساہل کا شکار، اپنا سر پیٹتا رہ جاتا ہوں اور چیخ چیخ کر کہتا ہوں ؎

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

□□

یادوں کے گلاب

مولانا ابوالکلام آزاد کی ۳۹ ویں برسی ۲۲ فروری ۱۹۹۷ء کے موقع پر

ہر بشر محوِ غم دوش ہوا تیرے بعد
"شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا تیرے بعد"

ذہنِ انساں ہمہ تن گوش ہوا تیرے بعد
ہوش جس کو تھا وہ مدہوش ہوا تیرے بعد

سونا سونا سا محبت کا جہاں ہے اے دوست
غم سے انسان ہم آغوش ہوا تیرے بعد

ذرہ ذرہ میں ہے آتش کدۂ آہ و بکا
کوئی گوشہ نہ فراموش ہوا تیرے بعد

کل جسے جام اٹھانے کا سلیقہ بھی نہ تھا
وہی مے خوار بلانوش ہوا تیرے بعد

بحرِ تدبیر میں طوفاں ہے، نہ موجیں نہ حباب
سیلِ افکار بھی خاموش ہوا تیرے بعد

تیری فرقت میں، تری یاد میں تیرے غم میں
تیرا سلمان نوا کوش ہوا تیرے بعد

(ڈاکٹر) سلمان عباسی
ای-۳۳/۴، پیپر مل کالونی،
نشاط گنج، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۶

جشنِ انجام

موت تو موت ہے
فطری، حادثاتی
کسی رہ گزر پر
یا گھر میں
یا اس جنگ میں
جو کبھی عام انسان کے
فیصلے کی حدوں میں نہ تھی

جب وہ رخصت ہوا
صرفِ خاکِ مقدر ہوا

وہ جو کل جوشِ پرواز میں
وسعتوں میں گیا
وہ فقط اک پرندہ تھا
اور جشنِ انجام تھا
نیلگوں روشنی، پُرفسوں نغمگی
رقص وارفتگی میں کہیں کھو گیا
جاوداں ہو گیا۔

□□

بلراج کومل
ای - ۱۳۹، کالکاجی
نئی دہلی
۱۱۰۰۱۹

محبّت کا زمانہ

(اس نظم میں بیشتر جگہ مرزا غالب نے اصلاح فرمائی ہے۔ ——— وارث)

پروفیسر وارث کرمانی
دیوی شریف
بارہ بنکی

وہ محبّت کا زمانہ اَب کہاں
سوچنے سے جگمگا اٹھتی ہے پوری زندگی
پھول کھلتے تھے نظر میں گلستاں در گلستاں
مشک آتا تھا ختن سے کارواں در کارواں
وہ محبّت کا زمانہ اب کہاں
دین کی دولت ہو یا اس دہر کا مال و متاع
سب ترے قدموں پہ لاکر ڈال دینے کا جنوں
وہ کسی قیمت پہ بھی تجھ تک پہونچنے کا جنوں
لوگ کہتے ہیں کہ یہ دیوانگی اچھی نہیں
میں یہ کہتا تھا کہ میرے بس میں اب کچھ بھی نہیں
"نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں"
وہ کہ جس کی سانس کی جنبش سے لہرانے لگے باغِ عدن
وہ بہارِ بسترِ دلدادگاں[1]
وہ نیاز و ناز وہ قول و قسم
کیوں تجھے وعدہ خلافی کا ہے غم
تو نے ہی مجھ سے وہ الفت اور فراغت چھین لی
اب تو میں ہوں اور ناکردہ گناہوں کا عذاب
کوئے جاناں کی ملامت سنگِ طفلاں کا عذاب
خلق کہتی ہے کہ اس شوریدہ سر کو دیکھنا
"سینۂ شمشیر کے باہر ہے دم شمشیر کا"
تیرا کاجل عشق کا بازار کالا کر گیا
کتنے یوسف کوڑیوں میں بک رہے ہیں رات دن
آدمی پھرتے ہیں پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے
اس فضا میں تو نہ ہو جائے دریدہ پیرہن
دیکھ یوں پاگل نہ بن
اب اندھیرے سے اُجالے میں نہ آ رشکِ چمن
اب فسانے سے حقیقت پھر نہ بن اے جانِ من

□□

[1] بہار بستر کی اصلاح مرزا غالب کی ہے، 'دلدادگاں' کا اضافہ میرا ہے۔ دیکھئے مثنوی چراغ دیر کا یہ مصرعہ : "بہار بستر و نوروز آغوش"

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری
۱۴۱- نیا گاؤں، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

اقبالؔ کے مشاعرے

جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب کا ایک مراسلہ دہلی اردو اکادمی کے رسالہ "ایوان اردو" میں نومبر ۱۹۹۴ء میں زیرِ عنوان "اقبال کے مشاعرے" مختصر مضمون کی صورت میں نظر سے گزرا۔ موصوف نے لکھا ہو کہ طالب علمی کے زمانے کے علاوہ اقبال نے صرف دو مشاعروں میں اپنا کلام سنایا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

" اقبالؔ کے سوانح حیات میں ان کے زمانۂ طالب علمی کے علاوہ صرف دو مشاعرے ملتے ہیں اور وہ بریڈلا ہال لاہور کے جنگی مشاعرے ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے منعقد ہوئے۔ پہلا مشاعرہ ۱۱ر نومبر کو منعقد ہوا اور دوسرا ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو۔ پہلے مشاعرے میں اقبالؔ نے "پنجاب کا جواب" کے عنوان سے نو بند پر مشتمل ایک مسدس پڑھا جو اس بند سے شروع ہوتا ہے ؎

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند
ہنگامۂ دعا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

۱۵ر دسمبر کے مشاعرے میں اقبالؔ نے ایک تو وہی نظم پڑھی جو بانگ درا میں "شعاع آفتاب" کے عنوان سے شامل ہوا اور دوسری فارسی کی نظم جو اُن کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہو۔ شعاع آفتاب کے ساتویں شعر کا پہلا مصرعہ بانگ درا میں یوں چھپا ہو۔

؎ برق آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں

ابتدائی صورت میں یوں تھا۔ ؎

"میں کوئی بجلی نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں"

شعاع آفتاب یکم فروری کے اخبار "حق" لاہور میں شائع ہوئی۔ آخری شعر یہ تھا ؎

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا
جاگ اٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

جس فارسی نظم کا میں نے ذکر کیا ہو، وہ ایک مختصر سا قطعہ ہو جو نیچے درج کیا جا رہا ہو ؎

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد
روس را سرمایۂ جمعیت ملت ربود
تہراد کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستاں سپرد
جرمنی را چشم حیران و دل بیتاب داد
تا برانگیزد نوائے حریت از ساز دہر
صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد
بزکسے در خورد فطرت از جناب او برد
ہر یا چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

میں نے یہ نظم پہلی بار ماہنامہ "زمانہ" کانپور کی فائلوں میں

دیکھی تھی۔ والدِ محترم کو حفظ تھی۔ اس لیے مجھے بھی حفظ ہو گئی
ماہنامہ "زمانہ" کے مذکورہ شمارے کا سال یا مہینہ تو مجھے
یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ کرنل بھولا ناتھ نے جو خود فارسی کے
شاعر تھے اس نظم کے قریب قریب ہر مصرعے پر اعتراض
کیا تھا۔" (جگن ناتھ آزاد)

ہم پروفیسر آزاد صاحب کے حافظے کی داد دیتے ہیں۔ اگر وہ ان دونوں نظموں (شعاعِ آفتاب اور فارسی قطعہ) کے حوالے بھی دیتے تو گرفت کی زد میں نہ آتے۔ ہماری رائے میں اقبال کا قطعۂ فارسی زمانہ کانپور کے علاوہ غلام رسول مہر کی سرودِ رفتہ (صفحہ ۱۹۹) پروفیسر رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ (۴۲۰) محمد عبد اللہ قریشی کی باقیات اقبال (۲۳۷) اور ذکرِ اقبال عبد المجید سالک وغیرہ میں بھی موجود ہے آزاد نے ان کتابوں سے ضرور استفادہ کیا ہے اور انھوں نے اپنی کتاب "اقبال اور کشمیر" میں دیے ہیں۔ نظم "پنجاب کا جواب" پہلی مرتبہ مسدس کی صورت میں زمانہ کانپور صفحہ ۲۱۹ میں زیرِ عنوان "جنگ اور اہلِ ہند" (حسبِ ارشاد لفٹنٹ گورنر پنجاب جنگی کانفرنس میں پڑھی گئی) شائع ہوئی۔ یہ "وکیل" امرتسر اور ستارۂ صبح کے اخباروں میں بھی ۱۱ر مئی ۱۹۱۸ء کو چھپی تھی۔ محمد عبد اللہ قریشی صاحب نے اسے باقیاتِ اقبال صفحہ ۲۱۶ (طبع سوم) میں "پنجاب کا جواب" کے عنوان سے شامل کیا۔ وہ نظم کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"یہ نظم پہلی جنگِ عظیم کے دوران سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر لکھی اور ۱۹۱۸ء کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی جو تنظیمات کے سلسلے میں ہوا تھا۔"

نظم میں انگریزوں کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ آخری دو بند درج کیے جاتے ہیں:

اخلاص بے غرض ہے صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے اطاعت بھی بے غرض
عہدِ وفا و مہر و محبت بھی بے غرض
تختِ شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض
لیکن خیال فطرتِ انساں ضرور ہے
ہندوستاں پہ لطفِ نمایاں ضرور ہے

جب تک چمن کی جلوۂ گل پر اساس ہے
جب تک فروغِ لالۂ احمر لباس ہے
جب تک نسیمِ صبح عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرۂ شبنم کی پیاس ہے
قائم رہے حکومتِ آئیں اسی طرح
دیتا رہے چکورسے شاہیں اسی طرح

آزاد نے اپنے مراسلے میں اقبال کے فارسی قطعہ کے ساتھ "شعاعِ آفتاب" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا حوالہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے محمد عبد اللہ قریشی صاحب کی باقیاتِ اقبال میں بھی ملتا ہے۔ موصوف قطعہ کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ اس کے بعد فتح کا جشن منایا گیا۔ لاہور میں اس جشن کے موقع پر ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو ایک زبردست مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر اقبال نے یہ اشعار سنائے۔ "شعاعِ آفتاب" کے عنوان سے جو نظم بانگِ درا میں موجود ہے وہ اسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی"؎

اس کے بعد قریشی صاحب "شعاعِ آفتاب" کے تحت نظم کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"یہ نظم سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر ۱۵ر دسمبر کو ایک سرکاری مشاعرے میں پڑھی گئی جو پہلی جنگ یورپ میں اتحادیوں کی فتح کے موقع پر منعقد ہوا۔ یکم فروری ۱۹۱۹ء کے "حق" اخبار میں شائع ہوئی۔ نظرِ ثانی میں ساتویں شعر کا ایک مصرعہ بدلا گیا اور مندرجہ ذیل آخری شعر حذف کر کے نیا شعر لکھا گیا۔

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا
جاگ اٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا"؎

ہماری اطلاع کے مطابق جب شہنشاہ ہندوستان کا جشنِ تاجپوشی ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوا تھا تو دہلی میں جشن کے سلسلے میں ایک عظیم الشان

مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اقبال سرکاری طور پر اس کے ثالث رواں تھے اور جو مدحیہ قصیدے بادشاہ کی شان میں پڑھے گئے تھے ان کا انتخاب اقبال کے ذمہ ہی رکھا گیا تھا۔ اقبال نے بھی مشاعرے میں کوئی قصیدہ سنایا ہوگا جو اب نہیں مل رہا ہے۔ ہماری نظر سے ایک ضخیم یادگاری کتاب گزری ہے۔ اس میں ان لوگوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جو بادشاہ کی تاجپوشی کے موقع پر دلی میں موجود تھے۔ کتاب میں شاہی مشاعرے کے بارے میں لکھا ہے:

"دربار تاج پوشی کے موقع پر ہز آنر سر لوئی ڈین بہادر نے جو شاہی میلہ قائم کیا تھا اس میں ایک مشاعرہ بھی تاج پوشی کی نظموں کا انتخاب کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ چنانچہ آپ (اقبال) کو اس مجلس مشاعرہ کا سرکاری طور پر پریزیڈنٹ بنایا گیا اور آپ نے سب نظموں میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی نظم کو اول قرار دیا جو اس کتاب میں کسی دوسری جگہ پر درج کی گئی۔" [۱۳]

بہت ممکن ہے کہ اقبال نے شاہی مشاعرے میں وہی قصیدہ پڑھا ہو جس کا عنوان "ہمارا تاجدار" تھا۔ اس کے چند اشعار "زمانہ" کانپور بابت دربار شاہی نمبر دسمبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئے تھے۔ اشعار کی ابتدا میں ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی ہے۔

"بیادگار شاہی دربار تاج پوشی ہز امپیریل میجسٹی جارج پنجم بمقام دہلی"

ہوئے اوج سعادت ہو آشکار اپنا
کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا
اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں کی
اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا
اسی سے عہد وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کے خاک قدم پر ہے دل نثار اپنا

جنگ عظیم سے قبل 'بزم اردو' کا ایک مشاعرہ محمڈن ہال لاہور میں ۱۱ر اپریل کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں اقبال نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے:

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اس غزل پر اودھ پنچ لکھنؤ نے تنقید کی تھی۔ تنقید کی ابتدا میں پنچ میں لکھنؤ کے ایک علم دوست اور رئیس اعظم حامد علی خان بیرسٹر ایٹ لاء کے مشاعرے کا بھی ذکر کیا گیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حامد علی خان کا انتقال ۱۹۱۵ء میں ہوا اور غالباً مشاعرہ اس سے پہلے منعقد ہوا ہوگا۔ پنچ کی اس تنقید کا ذکر تاجور نجیب آبادی نے بھی شذرات کے تحت کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"لکھنؤ کا مشہور اخبار اودھ پنچ جس کی چشم کم بین ملک میں کسی کو سرسبز دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی۔ حالی جیسی شخصیتوں کو اپنے زعم میں پامال رسوائی کر دیا ہے۔۔۔۔ اب سے کچھ پہلے ڈاکٹر صاحب کی مشہور نظم "نالہ ہے بلبل شوریدہ۔۔" پر تنقید کی گئی کہ نالہ کو خام آج تک کسی نے نہیں باندھا۔۔۔۔

حضرت پھٹکار الملک (تنقید نگار کا نام ہے)" [۱۴]

اودھ پنچ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ادارہ پر اپنے شماروں کو ضمیموں کے طور پر دوبارہ شائع کرتا تھا۔ اس وقت راقم کے پیش نظر "ضمیمہ سلسلہ منتخبات دور ثانی جلد ۱۶ نمبر ۲۴ مطبوعہ ۲۳ر جولائی ۱۹۳۱ء" کا شمارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ غزل اقبال نے لاہور کے ایک بڑے اجتماع کے سامنے پڑھی تھی۔ یہ غزل "کلام اقبال" کے عنوان سے الشعر میں "زمانہ" کانپور بابت اگست ۱۹۱۷ء میں صفحہ ۷۷ میں چھپی تھی۔ اودھ پنچ کے زیر نظر شمارے میں ص ۳۶ میں اقبال کی ایک اور نظم "جگنو" پر تنقید کی گئی ہے۔ تنقید کے آخر میں 'بزم اردو' لاہور کے مشاعرے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اودھ پنچ کا ناقد "فطرت ادبار" اقبال کی غزل (نالہ ہے بلبل شوریدہ۔۔۔) پر تنقید لکھنے سے قبل اقبال سے مخاطب ہو کر لکھتا ہے:

"۱۱ر اپریل کو بزم اردو کا مشاعرہ پھر محمڈن ہال لاہور میں برپا ہوا۔ اور آپ کا یہ نیاز مند سیر دیکھنے کے لیے ایک کونے میں جا کر بیٹھ رہا۔ بہت کثرت سے شائقین سخن جمع تھے۔ حق یہ ہے کہ لاہور اردو کے لیے جو کوشش کر رہا ہے وہ ان لوگوں سے سرزد نہیں ہوتیں جو اردو کو خالص اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ یاد بخیر۔ ہمارے لکھنؤ میں

استنے بڑے مشاعرے نہیں دیکھے جاتے۔ حامد علی خان بہادر بیرسٹرایٹ لا کے مشاعرہ میں سال گزشتہ جس قدر مجمع تھا اتنا ہی مجمع اس مشاعرے میں ہر بار ہوتا ہے ہر ایک شاعر کا کلام نہایت ذوق کے ساتھ سُنا گیا مگر جو لطف پروفیسر اقبال صاحب کے غیر طرحی کلام میں ملا وہ کسی کے کلام میں نہیں ملا۔ پروفیسر موصوف غالبؔ مرحوم کے رنگ سخن طرازی پر پانی پھیرنے میں بہت مشاق ہیں۔ حالاں کہ یہ رنگ کچھ ایسا نازک ہے کہ ذرا سی غفلت میں اڑ جاتا ہے خود غالبؔ مرحوم اپنے ایجاد کردہ طرز کو جسے انھوں نے بیدل سے لیا تھا اردو دیوان میں بہت جگہ نباہ نہ سکے۔ کہنے کو تو بہت زور کی بات اور اونچی بات کہی، مگر سمجھ سے بالاتر اور مطلب کے سلسلے سے بعض کڑیاں ندارد ہونے کے باعث لطف خاک میں مل گیا۔"

اس کے بعد پوری غزل پر تنقید ملتی ہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس مشاعرے کا ذکر غالباً یاسؔ یگانہ چنگیزی نے بھی اپنی کتاب "آیات وجدانی" میں کیا ہے۔ مشاعرہ سر شیخ عبدالقادر کی صدارت میں ہوا تھا۔ چوں کہ کتاب سامنے نہیں ہے اس لیے مزید وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اقبالؔ کے ایک اور مشاعرے کا ذکر جناب غلام رسول مہرؔ نے اپنے ایک مضمون "ایک فرشی مشاعرے کی یاد" مطبوعہ ہفت روزہ لاہور ۱۹۶۲ء میں آغا شاعر قزلباش کی تحت اللفظ خوانی کے بارے میں کیا ہے۔ مشاعرہ برکت محمڈن ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ مشاعرے کی صدارت لاہور کے مقتدر رئیس راجہ نریندر ناتھ سابق کمشنر لاہور نے کی تھی۔ مہرؔ لکھتے ہیں کہ:

"اس مشاعرے میں ایسے شعرا بھی تھے جو واقعی آسمان شعر کے درخشندہ ستارے تھے۔ مثلاً اُستاد داغؔ کے نامور شاعر آغا شاعر قزلباش اور ان کے ہندو شاگرد پنڈت راج نرائن ارمانؔ دہلوی وغیرہ تشریف فرما تھے پھر علامہ اقبالؔ بھی تشریف لائے۔ یہ علامہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ اس محفل میں انھوں نے اپنی غزل تحت اللفظ میں سنائی۔ آغا صاحب نے اقبالؔ کے اشعار کی دل کی گہرائیوں سے داد دی۔" [۵]

اقبال کی یورپ کی واپسی کے بعد لاہور میں بزم اردو قائم کی گئی تھی۔ شیخ عبدالقادر وغیرہ کے علاوہ اقبال بھی اس بزم کے ممبر تھے۔ وکیل امرتسر کی ۹ر جنوری ۱۹۱۰ء میں جلسے میں اقبال نے بھی شرکت کر کے تقریر کی تھی ان ہی ایام میں بزم اردو لاہور کے اہتمام سے ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ اس میں اقبال نے ذیل کے اشعار پڑھے تھے۔

بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور
جو اس چمن سرا میں بلند آشیاں رہے
موقوف آرزو سے ہے توانائی حیات
پیری شباب ہے جو تمنا جواں رہے
کچھ اور شے نہیں ہے وہی زندگی ہے موت
جس زندگی میں کاوش سود و زیاں رہے

(مشاعرہ بزم اردو لاہور۔ بحوالہ باقیات اقبال ص۱۰۶)

جب اقبالؔ کا متذکرہ بالا فارسی قطعہ زمانہ کانپور (جو اس وقت میرے پیش نظر ہے) میں جنوری ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا اور پنجاب کے بھولا ناتھ لفٹننٹ کرنل کی نظر سے گزرا تو انھوں نے ایڈیٹر زمانہ کو ایک مراسلہ لکھا جس میں "قطعہ" پر اعتراضات وارد کیے گئے تھے یہ خط زمانہ کانپور میں صفحہ ۱۲۴ بابت فروری ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ ذیل میں خط اور اعتراضات درج کیے جاتے ہیں۔

"جناب ایڈیٹر صاحب! جنوری کے زمانہ میں 'کلام اقبال' کے عنوان سے چند فارسی اشعار درج تھے جو میری نظر سے گزرے۔ ڈاکٹر اقبال کی اردو شاعری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا بلکہ باوجود اہل زبان نہ ہونے کے آپ کی شستہ زبان اور جدت خیالات پر ہم اہلِ پنجاب جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔ بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست اپنے

سمند خوش خرام کا جولاں اردو کے میدان ہی میں محدود رکھتے فارسی کی زمین سنگلاخ پر آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان پانچ شعروں میں عروض اور محاورہ کئی جگہ سقیم ہے۔ مثلاً

۱۔ صورت بند محاورہ نہیں۔ صورت گر یا صورت آرا کہتے ہیں۔ بند کے ساتھ نقش بند ہوا کرتا ہے۔

۲۔ بافرانس سے مراد آپ کی فرانس را کی ہے یا فرانس کے معنی فرانس را کے ہو سکتے ہیں۔ با کے معنی ہمراہ یا بمعہ کے ہوا کرتے ہیں۔

۳۔ ایرانی فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں۔ فرانس نہیں کہتے اور تقطیع میں 'ف' متحرک پڑتی ہے جو صحیح نہیں۔

۴۔ فکر رنگین نہیں ہوتی۔ طبع رنگیں محاورہ ہے۔

۵۔ دل گرم نہیں ہوتا۔ دل نرم، دل شاد و خرم اور سرد دل البتہ مستعمل ہے۔

۶۔ چشم حیراں کی جگہ پر سرگراں یعنی نخوت و تکبر زیادہ موزوں ہے۔

۷۔ نوا کی بجائے صدا ہونا چاہئے۔ ساز میں صدا نکلتی ہے نہ نوا۔

۸۔ امریکہ کی تقطیع میں امریک آتا ہے۔

۹۔ میں شاعر نہیں۔ البتہ شعر پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں۔ اس لیے جو ذہن میں ہے بے تکلف عرض کیا۔

کرنل بھولا ناتھ کے اعتراضوں کا طویل جواب "الہلال" کے سابق ایڈیٹر خواجہ عبدالواجد ندوی نے لکھا۔ جو "زمانہ" کانپور بابت مارچ ۱۹۱۹ء (صفحہ ۱۷۲-۱۸۰) میں "مباحثہ ڈاکٹر اقبال و کرنل بھولا ناتھ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ندوی صاحب نے اقبال کے دفاع میں لکھا تھا۔ چوں کہ زمانہ کے پرانے شمارے کمیاب ہیں اس لیے ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"مباحثہ ڈاکٹر اقبال و کرنیل بھولا ناتھ"

آپ کے رسالے کے فروری نمبر میں لیفٹنٹ کرنل بھولا ناتھ صاحب کی مراسلت میری نظر سے گزری۔ غلطی ہر فرد بشر سے ممکن ہے۔ اس باب میں متقدمین، متاخرین، اہل زبان، غیر اہل زبان، فارسی گو اور ریختہ گو سب ایک سطح پر ہیں۔ اس انسانی کمزوری کا علاج صحیح اور بے لاگ تنقید ہے۔ صحیح تنقید ہی وہ آئینہ ہے جس میں شاہد سخن کا ایک ایک خط و خال صاف صاف نظر آتا ہے۔ عام ناظرین پڑھتے ہیں، نازک اور دلفریب اداؤں سے واقف ہوتے ہیں اور کمال فن کی داد دیتے ہیں۔ خود شاعر دیکھتا ہے تو اسے اپنے جوہر کمال کے پہلو بہ پہلو اپنے نقائص بھی بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اپنے جوہر کو اور چمکاتا ہے اور نقائص کی اصلاح کرتا ہے۔ عہد معینہ میں ایران کے شعراء نے ہندستان میں آ کے جو ترقی کی وہ ان کو خود ایران میں حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے سلاطین و امرا فیاض و فن پرور ہونے کے ساتھ خود اہل نظر اور جوہر شناس بھی ہوتے تھے۔ اپنی صحیح نکتہ چینیوں سے ذی استعداد شعرا کے جوہر چمکاتے اور ان کی خامیاں دور کرتے تھے عرفی، نظیری، صائب، کلیم، فارسی شاعری، خصوصاً غزل گوئی کے مہر و ماہ ہیں۔ لیکن ان کے اس کمال سخن نے مغلیہ سلاطین و امرا کے دامن تنقید میں پرورش پائی تھی۔

لیکن آج بدقسمتی سے حالت برعکس ہے۔ سلاطین امرا جمہور سب سے مذاق سلیم رخصت ہو چکا ہے اگر کوئی شاعر شہرت کے منظر عام پر آچکا ہے تو اس کا ادنیٰ و اعلیٰ رطب و یابس ہر قسم کا کلام یکساں ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اگر کوئی خوش گوار شاعر بدقسمتی سے گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے تو اس کے عمدہ سے عمدہ اشعار کی داد دینے والا نہیں ملتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال شہرت کی حد سے نکل کر "ترجمانِ قوم" کے درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کے کلام کی حرف گیری ناگوار معلوم ہو۔ لیکن اگر پہلے ان کے کلام کی آزاد تنقید ضروری تھی تو اب بھی ازبس ضروری ہے۔ کیوں کہ کامل سے کامل استاد بھی لغزش و خطا سے معلوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ درحقیقت کسی شے کا "انسانی" ہونا ہی اس کے "بے عیب" نہ ہونے کی دلیل ہے۔ کرنل بھولا ناتھ صاحب اقبال کی ایک فارسی نظم میں بعض فروگزاشتیں دکھا

چاہتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی اردو شاعری میں اس قسم کی کمزوریاں آشکار نظر آتی ہیں۔ "ترانہ" اور "شکوہ" ان کی شاعری کا واسطۃ العقد ہیں۔ لیکن کیا ان کا دامن شہرت اغلاط کے دامن سے پاک ہے؟

مگر یہ لغزشیں ان کے ماہتاب کمال کے داغ ہیں چاند میں داغوں کی وجہ سے اس کے جمال جہاں آرا سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کی شعر مجسم طبیعت سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور اردو اور فارسی دونوں میں ہوتی ہیں۔ مگر ان غلطیوں کی وجہ سے میں کرنل بھولاناتھ صاحب کا ہم آہنگ ہوکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ بہت اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست (اقبال) اپنے سمند خوش خرام کا جولاں اردو ہی کے میدان میں محدود رکھتے۔ فارسی کی زمین سنگلاخ میں آپ کا اسپ تازی ناخوں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ طبع اقبال کے "سمند خوش خرام" نے اپنی خوش خرامی سے دونوں میدانوں کو محشرستان خیال بنا دیا ہے۔ رموز بے خودی اور اسرار خودی اس کے شاہد عادل ہیں۔ غالباً اسرار خودی کے بارے میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ پروفیسر نکلسن لیکچرر کیمبرج یونیورسٹی اس کا ترجمہ انگریزی میں کر رہے ہیں اور یہ تو میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک صحبت میں اسرار خودی پڑھی جا رہی تھی پروفیسر محمد کاظم شیرازی (جو خاص ایرانی ہیں اور مغربی زبانوں میں سے انگریزی اور فرانسیسی سے واقف ہیں) موجود تھے۔ اشعار سن کر جھومتے تھے اور کہتے تھے کہ "کاش یہ شاعر ایران میں پیدا ہوا ہوتا۔"

جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ ندوی صاحب کا یہ مقالہ بہت طویل ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں ضروری تحریریں مصنف کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

ا۔ "اقبال کے پہلے شعر کے مصرعہ اول پر کرنل صاحب نے چند اعتراض فرمائے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ "صورت بند" محاورہ نہیں۔۔۔۔ بند کے ساتھ "نقش بند" ہوا کرتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ نقش بند کی طرح صورت بند بھی محاورہ ہے۔ لغت کی سند اول اور مستند کتابوں کی تصریح موجود ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں

منظرے بوبس کشیدہ بلند
چشم بند ہزار صورت بند

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "با فرانس" بمعنی "فرانس را" کے صحیح نہیں۔ یہ اعتراض پڑھ کے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ "با" "کا" "را" کے معنی میں آنا اس قدر مشہور و معروف بات ہے کہ لغت و قواعد کی مشہور و مستند بلکہ معمولی ادنیٰ کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ یہ مصرعہ سنداً عرض ہے۔

ع سنجاب دہ زمیغ با کوہ

(۳) تیسرا اعتراض لفظ فرانس پر ہے۔ اس اعتراض کے دو جزو ہیں۔ جزو اول کا تعلق لفظ سے ہے اور جزو دوم کا تعلق وزن سے ہے۔ اعتراض کے جزو اول سے تفریس اسما کی ایک اصولی بحث پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔ اب لفظ فرانس کو لیجیے۔ انگریزی میں تو اس کا تلفظ فرانسے اور فراں کے بین بین ہوتا ہے جو غیر فرانسیسی کلام و زبان سے بغیر مشق کے بمشکل ادا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ایرانی فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو یہ نام تفریس ہے اور نہ مستقل نام بلکہ درحقیقت اختلاف تلفظ کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مغربی نام فارسی زبان میں استعمال کیے جائیں تو ان کو مفرس بنا لینا چاہیے یا اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنا چاہیے اور اگر مفرس بنایا جائے تو کس قاعدہ سے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی اصول اب تک طے نہیں ہوا ہے۔ ایرانی ارباب قلم عام قدرتی طریقہ کے پابند ہیں جس نے جو لفظ جس طرح سنا ہے اسی طرح استعمال کرتا ہے۔ بمبئی، کلکتہ، حیدرآباد سے جو فارسی اخبارات نکلتے ہیں ان میں مغربی ناموں کا تلفظ اسی قاعدے سے ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی اس عام قدرتی قاعدہ کے پابند ہیں۔ کرنل صاحب اس روش کو قابل اعتراض مانتے ہیں۔ یہ درحقیقت محاورہ اور زبان کی غلطی نہیں بلکہ اختلاف رائے ہے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ

کرنل صاحب جس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے خود اسی پر عمل کرتے ہیں۔ ایرانی اگر فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو جرمنی کو المانیہ، اٹلی کو اطالیا، جاپان کو ژاپوں کہتے ہیں۔ مگر کرنل صاحب نے اپنی اصلاح میں ان ناموں کا وہی تلفظ کیا ہے جو ہندستان میں رائج ہے۔

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے متعلق کرنل صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ فکر رنگیں اور دل گرم محاورہ نہیں۔ اس وقت کوئی شعر یاد نہیں آتا۔ تاہم کرنل صاحب اتنا ضرور تسلیم کریں گے کہ خیال رنگین اور رنگیں خیال و نیز گرم دل بمعنی عاشق سوختہ آتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی فکر رنگیں اور دل گرم بمعنی سوختہ عشق غلط ہوگا۔ مگر بہتر یہ ہے کہ اعتراض سند کے ملنے تک ملتوی رکھا جائے۔

اقبال کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں کرنل صاحب "چشم حیران" کے بدلے "سرگراں" زیادہ موزوں خیال فرماتے ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے تو دلِ بیتاب" کے لیے چشم حیراں ہی زیادہ موزوں ہے جب بھی سرگراں چنداں مناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ سرگراں کے معنی بقول کرنل صاحب متکبر اور مغرور ہوں گے اور آگے داد ہے۔ اس لیے سرگرانی ہونا چاہیے۔

(۴) چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ پر یہ اعتراض ہے کہ "ساز سے صدا نکلتی ہے نہ کہ نوا" اس لیے نوا کے بجائے صدا ہونا چاہیے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نوا مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں اور نغمہ کو بھی۔ موسیقی کے بارہ مقاموں میں سے ایک مقام کا نام بھی ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں؛

ع شدزن مطرب بنوا گستری

حضرت نظامی گنجوی فرماتے ہیں۔

ع برزخمہ چوں نے نوا سازم

کیا اب بھی "سازدہی" سے "نوائے حریت" کا لکھنا خلاف محاورہ ہے؟۔

۱۔ پہلے شعر کا مصرعہ اوّل صاف بے عیب اور چست ہے البتہ ابتدا یا استفہام کی وجہ سے جو بلاغت کہ مصرعے میں پیدا ہوگئی تھی وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ دوسرے مصرعے میں "دلشاد" نے مفہوم بدل دیا اقبال نے فرانس کی عشق پرستی بیان کی تھی کرنل صاحب اس کی زندہ دلی اور خوش باشی بیان فرماتے۔

۲۔ دوسرے شعر میں مصرعہ ثانی غور طلب ہے۔ سرگراں کے متعلق اعتراضات کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں۔ لفظ 'داد' دو جگہ آیا ہے۔ ایک بالکل فضول اور حشو ہے۔"

حواشی :

۱۔ یہاں آزاد کو تسامح ہوا ہے۔ دوسری کے بجائے پہلی ہونی چاہیے (ا۔ح)

۲۔ باقیات اقبال صفحہ ۲۳۷،

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۷۴۔

۴۔ یادگار دربار ۱۹۱۱ء صفحہ ۵۰۷۔۵۰۸ مرتبہ دین محمد۔

۵۔ یہ اشعار مخزن لاہور بابت جنوری ۱۹۱۲ء میں بھی چھپے تھے۔

۶۔ مخزن بابت جون ۱۹۱۶ء۔

۷۔ مزید تفصیلات کے لیے راقم کا مضمون "افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی" مطبوعہ "بازیافت" مشا شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر بابت دسمبر ۱۹۸۵ء ملاحظہ ہو۔ (ا۔ح)

غزل

جب سے دن بھر دل تھامے تو بیٹھا رہتا ہے
میری چھاتی پر بھی . بچھو بیٹھا رہتا ہے

تھرکا کرتی ہے ہونٹوں پر چنچل تتلی سی
ان آنکھوں میں جھلمل جگنو بیٹھا رہتا ہے

جی ڈرتا ہے اس کا مکھڑا دیکھ نہ آیا ہو
کس کی دھن میں گم صم سادھو بیٹھا رہتا ہے

کیسے اُن کو پرچہ پھینکوں، کیسے بات کروں
بالکنی میں بوڑھا بابو بیٹھا رہتا ہے

آنکھوں سے بہہ جانے دینا، پینا ٹھیک نہیں
موتی جیسا تہہ میں آنسو بیٹھا رہتا ہے

مستولوں پر تیز ہوائیں سازش کرتی ہیں
لمبے ہاتھ سمیٹے بچھو بیٹھا رہتا ہے

دشمن بن کر لکھتا ہوں میں خود اپنے اعمال
لاکھ فرشتہ آزو بازو بیٹھا رہتا ہے

پروفیسر مظفر حنفی
اے/۲، یونیورسٹی پروفیسرس کوارٹرس،
کنکر گاچھی . کلکتہ ۵۴...۷

نذرِ لکھنؤ

میرے اجداد کا ورثہ، مری تہذیب سخن
لکھنؤ میرا وطن "میرے غزالوں کا وطن"

رشکِ بت خانۂ چیں، غیرتِ گلزارِ ارم
کہکشاں زار سے کھنچ آئے ہوں جیسے کہ نجوم
اپنے ہی جلووں سے ہر راہ ہے اترائی ہوئی
جیسے چوتھی کی دلہن آتی ہے شرمائی ہوئی
اس کی گلیوں میں ہے مہتاب کی رفعت پنہاں
اس کے بازاروں میں خورشید فصاحت کا طلوع
حاصلِ سجدۂ محراب خدا خانہ ہے
اس کا ہر ذرہ اجنتا کا پری خانہ ہے
سان پر آتی ہے اعجاز بیانی جس سے
نطقِ شمشیر کو ملتی ہے روانی اس سے
ذکر جس شوخ کا یارانِ طرحدار میں ہے
ایسا یوسف بھی اسی مصر کے بازار میں ہے
لطف بر دوشِ گلستاں بکنار آیا ہوں
ہدیۂ شوق بھی دیدۂ تر لایا ہوں

وائے مظلومیٔ تسلیم کہ جانا ہے مجھے
غمزدہ ساقیِ مخمور سلامت باللہ
میکدہ تیرا ہے ذوقِ نظر سے معمور
یونہی گردش میں رہے ساغرِ صہبائے کہن

"صرف اعدا اثرِ آتش دودِ دوزخ
وقفِ احبابِ گل سنبل فردوسِ بریں" (غالب)

حسین مشیر علوی
معرفت احمد ابراہیم علوی - ۳ ہلیوز اسکوائر لکھنؤ

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
۳۳۳ د، حسن منزل۔ اتر سوئیا۔ الہ آباد

سنگم سے بیدر تک

میں اجنبی ہوں اور جب کوئی اجنبی کسی شہر میں پہونچتا ہے تو اسے غالب یاد آتے ہیں۔ وہ شعر پڑھتا ہے ؎

بیا مبر ریہ گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

لیکن میں یہ شعر کیسے پڑھ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ خطۂ ارض تو زباں دانوں کا ہی کا شہر تھا۔ میں نے اس شہر کی خوشبو پہلی بار اپنے وجود میں محسوس کی ہے۔ پہلی بار بیدر کے درودیوار دیکھے ہیں۔ پہلی بار یہ بہت سے چہرے جو اب شناسا لگتے ہیں مگر جن کی پہلی جھلک میں اجنبیت کا احساس تھا۔ ان چہروں کو دیکھا ہے۔

لیکن پھر بھی مجھے یہ احساس ہے کہ میں آپ کے لیے اجنبی ہو سکتا ہوں لیکن بیدر میرے لیے اجنبی نہیں ہے برسوں پہلے گنگا جمنا کے سنگم پر الہ آباد میں ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی تاریخ کی کتابوں میں اسی بیدر کا تھوڑا سا ذکر پڑھا تھا ـــــ اور اب اس وقت ایسے لگ رہا ہے جیسے میں کتابوں کی ایک دُنیا میں پہونچ گیا ہوں جہاں ہر صفحے پر رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے تصویریں متحرک ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ آنکھوں میں صدیوں کا خمار ہے ـــ یہ تصویریں کہانیاں سنا رہی ہیں۔ ایسی کہانیاں جن میں سچائی کا رنگ ہے ـــ اور پھر ان تصویروں کے پس منظر میں بہت سے چہرے رقصاں ہیں۔

تقریباً پونے چھ سو برس پہلے کی دُنیا نظروں کے سامنے گھوم رہی ہے اب یہ لگتا ہے کہ ہارون خاں شیروانی، غلام یزدانی، ابوالقاسم فرشتہ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا کے سبرامنیم مجھے بیدر کے بارے میں دوبارہ بتا رہے ہیں کہ دیکھو ـــ یہاں کی آب و ہوا بہت معتدل و خوش گوار ہے، فرحت بخش ہے، جب بھی دیکھو گے شاخ ثمردار سجدۂ شکر ادا کرتی نظر آئے گی۔ یہ وہی بیدر تو ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

ز ہر سو چشمۂ چو آبِ حیواں — چراغِ لالہ ہر جانب فروزاں
بنفشہ رستہ و سبزہ دمیدہ — نسیمِ صبح جیبِ گُل دریدہ

ـــــــ تاریخ فرشتہ

یہی تو وہ جگہ ہے جس کی وسعت اور سرسبزی کو آسمان آسا اور لطافت و صفائی کو آسمان منظر اور نشو و نما میں بہشت بریں کہنے والا احمد شاہ بہمنی لومڑی اور کتوں کی دل چسپ لڑائی میں اپنے کتوں کی شکست سے خوش ہوا۔ مورخ انسان ہے مگر فرشتہ کہا جاتا ہے اور فرشتہ یہاں کی خاک کو خاک سنگرفی کہتا ہے اور یہی مورخ اور تخلیق کار میں فرق ہے۔ وہ خاکِ سنگرفی کہہ کر چپ ہو رہا اور تخلیق کار یہ سوچتا رہ گیا کہ یہ کس کے خون کی سُرخی تھی کہیں محمود گاواں سے پہلے اس کا رنگ مٹیالا تو نہ تھا اور بعد میں سنگرفی ہو گیا۔ یا پھر یہ شفق کی سرخی ہے جسے زمین نے اپنے اندر سمو کر آسمان کی ہمسری کا دعویٰ کیا ہے یا کسی بادشاہ کی علم و فضل کے میدان میں سرخروئی ہے کہ اس نے زمین کو اپنے علم سے لالہ زار بنا دیا اور اہلِ زمین نے اسے شاہ کے ساتھ ولی بھی کہا۔ چشمِ تصور دیکھ رہی ہے ایرانیوں کے غول کے غول چلے آ رہے ہیں۔ مدرسے آباد ہیں، صرف و نحو کے مصنف قاضی شہاب الدین عمر ایک طرف مصروفِ درس ہیں تو دوسری طرف مولانا شمس الدین کرمانی کے کشف و کرامات کا چرچا ہے ـ حبیب اللہ جنیدی، احمد شاہ کا پیغام لے کر مولانا کرمانی کے حضور میں باریاب ہو رہے ہیں کہ انھیں حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا جائے۔ شہر آباد ہو رہا ہے ـ میر دیکھتے تو یہ کبھی نہ کہتے ؏

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی

یہاں تو ہر صناع، ہر فن کار سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ وہ دیکھیے شکر اللہ قزوینی چلے آرہے ہیں ـــ کیوں صاحب! آپ یہاں کیوں چلے آئے ـــ؟ اس لیے آیا کہ ہمارے ہی نقش کو دیکھ کر کئی سو برس بعد کوئی شاعر کہے گا ؎

ہے مگر اس نقش کو رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

میری نقاشی ناتمام نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں میرا خونِ جگر ہے۔ جاؤ۔ عمارتوں کو دیکھو ـــ اور پھر ـــ یہ کون صاحب ہیں ـــ ارے یہ تو ملا شرف الدین ہیں۔ انھوں نے خطاطی اور خوش نویسی میں کمال پیدا کیا۔ خط نسخ، خطِ کوفی، خط ثلث میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں نے اب تک نہیں دیکھا۔ لیکن کوئی مقبرہ ہے جس کی گنبد نہیں ہے۔ کسی شیرازی کی لکھی ہوئی خط ثلث میں تحریر، اب فنِ خوش نویسی کی زیارت گاہ بن گئی ہے اور یہی بیدر ہے جہاں بادشاہ کی قدر بھی تھی ـــ مگر کیسی قدر ـــ اس لیے نہیں کہ وہ بادشاہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اچھا آدمی تھا ـــ یہاں فن کار کی بھی قدر ہے۔ عمارتیں بنتی ہیں ـــ تو اس پر بنوانے والے کے ساتھ بنانے والے کا نام بھی درج کیا جاتا ہے۔ یہاں کوئی ایسا گنبد ہے جس میں رنگوں کا تناسب ان کا انتخاب، خطِ طغرا، سنہرے سفید، ہلکے گہرے سبز رنگ اور ان سب رنگوں کے ساتھ شکر اللہ قزوینی کا قول ہے یا یہ اعلان ہے کہ "فن کار بادشاہوں سے کمتر نہیں ہوتا۔" ریشمی محلوں سے جھانکتی ہوئی تصویریں تیزی سے گزر رہی ہیں۔ کوئی چپکے سے کان میں کہتا ہے تم مدرس ہو، مدرسہ تو دیکھ لو اور مدرسہ دیکھتے ہی خیال آتا ہے جیسے لکھا ہوا ہے:

"ایں عمارت تا قیامت پائیدار"

اس فقرے سے تھوڑی سی تکبر کی بو آرہی ہے ایسا لگتا ہے جیسے لکھنے والے نے دعا نہیں کی ہے دعویٰ کیا ہے آسمان سے بجلیاں گر رہی ہیں حرف تکبر مٹ گیا، مگر مشیت نے بھی اس کا خیال رکھا کہ مرکزِ درس تاریخ کی یاد دلاتا ہے کہ کبھی یہاں تین ہزار قلمی کتابیں تھیں اور سولھویں صدی تک یہ مدرسہ آباد تھا۔

ذرا ٹھہریے میر صاحب! آپ کا نام تو مجاور حسین ہے۔ دیکھیے یہی تو وہ جگہ ہے جہاں شیخ آذری نے پہلا مرثیہ لکھا تھا۔ کون شیخ آذری وہی نا جن کے بارے میں ایک بزرگ نے سرکارِ دو عالم کو خواب میں دیکھا کہ آذری کی بیت کے صلے میں اس کی زیارت کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں ؎

سوراخ می شود دلِ ما چوں گلِ حسین
ہر جا کہ ذکرِ واقعۂ کربلا بود

عبدالرزاق کا سفرنامہ بھی بتاتا ہے کہ محرم بیدر کی ایک خصوصیت تھی اور صدائے یا حسینؑ اس طرح گونجتی تھی کہ لوگوں نے یزید اور حسین کو بدی اور نیکی، شر اور خیر کی علامت بنا دیا اور سماجیات کے محققین کو ہندستان میں عزاداری کے نقطۂ آغاز کے لیے عہدِ تیمور کے بجائے دکن کی طرف دیکھنا پڑا کہ اس کا فروغ بیدر کا رہینِ منت ہے۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس فضا میں جہاں علم و فضل دانش و آگہی، عرفان و بصیرت کے چرچے تھے، مذہبی رنگ تھا وہیں اس فضا میں یک رنگی نہ کبھی رنگا رنگی تھی شعر و نغمہ گونجتا تھا ایسا نغمہ جو اُردو کی ادبی تاریخ کی پہلی مستند اور باضابطہ شعری تخلیق میں ڈھل گیا ہے۔ کراچی کے کنارے کا سمندر ہو یا دریائے سندھ اور راوی چناب کی لہریں یا پھر گنگا جمنا اور نربدا، کرشنا اور کاویری کون ہے جس نے فخر دین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے نغمے کی گونج نہیں سنی وہ منظوم داستان مثنوی اور داستان دونوں کا نقشِ اوّل ہے

اور کراچی میں بیٹھے ہوئے جمیل جالبی سے لے کر حیدر آباد اور گلبرگہ کے گیان چند اور گوپی چند نارنگ جیسا محققِ اُردو فخر دین نظامی کے بارے میں لکھتا رہتا ہے، ذکر کرتا رہتا ہے ادبی تاریخ کے خدوخال کو ابھارنے والا یہ شخص بیدر کی پندرھویں صدی کی اس تہذیب کی روایات کا امین ہے ان توہمات اور معتقدات کا امین ہے جو مشترکہ کلچر کو سنوارنے میں مدد دے رہے تھے۔ زمانہ بدلتا ہے، حالات بدلتے رہتے ہیں تو ادیب و شاعر ہجرت کرتے ہیں۔ آج دیکھیے جوش اور حفیظ ہندستان سے پاکستان گئے لیکن یادِ وطن نے ہمیشہ باندھے رکھا وہ اپنے کو ملیح آبادی اور جالندھری لکھتے رہے۔ قطب الدین قادری فیروز بھی بیدر

سے گولکنڈہ گئے، لیکن ہمیشہ اپنے کو فیروز بیدری کہتے رہے۔ وہی فیروز بیدری جس کا کلام اب دستیاب بھی ہو چکا ہے اور جو ہماری شعری تاریخ کی شہرۂ آفاق ہستی ہے اور جس کا ایک مصرعہ زبان زد خاص و عام ہے:

تو دکنی ہے پیارے تو دکنی اچ بول

مگر آج اس کا مصرعہ لوگ بھول گئے۔ ہندستانی ہیں مگر انگریزی بولتے ہیں کتنے ہی برس پہلے اس نے ایک مصرعہ میں لسانیات کا بنیادی اصول سمجھایا تھا کہ بول چال اور رابطہ کی زبان کی جڑیں تہذیبی سرزمین میں پیوست ہوتی ہیں مگر وہ فیروز بیدری تھا اس کا نام گریرسن یا جان بیمز یا ہورنلے نہیں تھا اس لیے ماہرین لسانیات نے اس کے ایک مصرعے کی شرح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ماضی کی اس رات میں کتنی پرچھائیاں دکھائی دے رہی ہیں کیسی کیسی آوازیں آ رہی ہیں کبھی کوئی سرگوشی کرتا ہے نل دمینتی کا قصہ سنا ہے ہاں ہاں کیوں نہیں کشمیر سے کنیا کماری تک کون ہے جو نہیں جانتا اور نہیں جانتا تو سن لو دمینتی بیدر کی تھی قصے اور افسانے تو مرجاتے ہیں ہاں یقیناً مرجاتے ہیں وہ قصے جو لمحات کی پیداوار ہوتے ہیں لیکن وہ قصہ جو لمحات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا وہ عوام کے اجتماعی حافظے کا جزو بن جاتا ہے وہ لمحہ صدیوں میں پھیل جاتا ہے اسی لیے دمینتی زندہ ہے مگر پری چہرہ جو علاءالدین کی محبوبہ تھی صرف تھوڑے سے حلقہ میں یاد رکھی جاتی ہے اس لیے کہ وہ لمحات کی پیداوار تھی، وہ کارواں جو ماضی سے حال کی طرف آ رہا تھا وہ ریشمی پردے پڑی ہوئی محملوں سے نظر آنے والے واقعات کے چہرے اچانک نظر نہیں آ رہے ہیں جیسے یہ سب فضا میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں، کتنے لوگ ہیں ابوالقاسم فرشتہ، عبدالجبار ملکاپوری ہارون خان شیروانی عبدالمجید صدیقی ان لوگوں سے پوچھتے ہیں اس کا نام بیدر کیوں پڑا۔ تو کوئی یہ کہتا ہے کہ یہاں کوئی راجا تھا جس کا نام بیدر تھا جو سکندر اعظم کا ہمعصر تھا۔ کوئی یہ بتاتا ہے کہ اس ریاست کا قدیم دارالسلطنت بیدر تھا، بیدر بھا کا ذکر تلگو ادب میں بھی ہے۔ بیدر بھا مہاراشٹر کے ودربھا سے مختلف ہے یا موجودہ ودربھا کا تعلق بھی بیدر سے رہا ہے۔؟ بہر حال یہیں کے راجا بھیم کی لڑکی دمینتی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس لیے کہ فارسی میں یائے مجہول نہیں بولتے۔ مثلاً بے در بھی کہنا ہوگا تو بی در ہی کہیں گے۔ اگر کوئی حصار، مکان یا علاقہ کو توڑ دے تو اس کے لیے بے در ہی زیادہ مناسب ہوگا۔

لیکن نام جو کچھ بھی ہو تاریخ کا کارواں ایک جگہ آکر ٹھہر جاتا ہے بہمنی سلطنت کے بعد بریدشاہی میں صرف ایک قابل ذکر حکمراں۔ مگر تاریخ حکمرانوں سے نہیں بنتی، عوام سے بنتی ہے، صاحب علم و فضل ہے اس لیے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے محمود گاواں کی شہادت کے سو سال بعد اس سورج کو گہن لگ گیا اور شیر کی دہاڑ اور للکار، فرہاد کی لے میں بدل گئی۔ وقت کا سیل رواں سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اب صرف ماضی کے مزار میں دیبا و حریر کے سے ریشمی واقعات دفن ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب تو بے جان عمارتوں کی لاش ہے جسے وقت اپنے کاندھے پر اٹھائے گھوم رہا ہے۔

لیکن نہیں وہ فن کار آج بھی زندہ ہیں جنھوں نے تاریخ کے صفحات کو اپنے خون جگر کی سرخی دے کر عنوان حیات بنایا۔ تہذیب کے وہ بنیادی اصول زندہ ہیں جنھوں نے ایک سنہری تہذیب کو سنوارا تمدن اور اعلیٰ کلچر کا نمونہ پیش کیا، وہ فن زندہ ہے جو بیدری آرٹ کے نام سے اب ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہ ظلمت شب میں ستاروں کے قافلے کی طرح نظر آنے والا آرٹ آج بھی علامتی انداز میں یہ بتاتا ہے کہ سیاہی نہ ہو تو اجالے کی قدر نہیں ہو سکتی اور خیر ہمیشہ شر کے پس منظر میں ابھرتا ہے۔ وہ جمالیاتی ذوق آج بھی زندہ ہے جو فضا کی تخلیق کرتا ہے، ماحول بناتا ہے۔ میں چہروں کو دیکھ رہا ہوں ——

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بادل برسے ہوئے سہی، لیکن ان میں بجلیاں ابھی خوابیدہ ہیں۔

—— چشم غزال آج بھی موجود ہے

—— بوئے شیراز آج بھی پھیلی ہوئی ہے

—— آتش کدۂ عشق کے شعلے راکھ نہیں ہوئے، منتظر ہیں شاید وقت آنے والا ہے ——

—— کہ یہ خاک جس سے غواص معانی اٹھے تھے، جس کا ہر خذف ریزہ دُرِ تابناک تھا، وہ خاک ایک بار پھر لعل و جواہر اگلے گی۔

□□

غزلیں

آپ کی تمنا میں، ہم نے اور کیا دیکھا
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا دیکھا

بے خودی میں ہم ایسے راستے پہ آ نکلے
جس کسی کو بھی دیکھا، خود کو ڈھونڈتا دیکھا

مے کشوں کو سمجھانے رات دن وہ آتے تھے
میکدے میں ناصح کو، ہم نے بارہا دیکھا

اک زمانہ یاد آیا، اک کہانی یاد آئی
آنکھ بھی کہ بھر آئی جب بھی آئینہ دیکھا

کاش اتنی عجلت میں گھر نہ چھوڑ کر آتے
ہم نے ایسی ہجرت کا حشر جو ہوا دیکھا

خواب چاند جیسا تھا روز صبح کو ہم نے
وقت کے سمندر میں اس کو ڈوبتا دیکھا

پروفیسر محبوب پاشا
امیر محل، مدراس ۶۰۰۰۱۴

کوئی تحفہ کوئی ہدیہ کوئی سوغات نہیں
اک تبسم کے سوا کوئی مدارات نہیں

وہ تبسم کہ جراحت ہے نگاہ و دل کی
مرکزِ شوق نہیں چشمِ عنایات نہیں

لکھ رہا ہوں میں شفق زارِ تمنا لیکن
اشکِ رنگیں کے سوا اور کوئی بات نہیں

دشتِ انساں میں ہر اک چہرے کو پڑھتا ہوں میں
حرفِ احساس ہے یہ سحرِ خیالات نہیں

میرا ہر شعر ہے تخلیقِ تمنا کا لہو
شیوۂ فن کوئی اظہارِ کمالات نہیں

احسان نانپاروی
بابا کا پُروا (آدرش نگر)
کھدرا لکھنؤ

ہزاروں ٹوٹتے رشتے ہمارے گھر میں بستے ہیں
مگر ہم بھی انہی رشتوں بھرے کھنڈر میں رہتے ہیں

اُڑانوں کی مصیبت سے بچے رہنے کی نیت میں
مصیبت جھیلتے ہیں اپنے ہی شہپر میں رہتے ہیں

ہم اپنی خواہشوں میں اک نئی تہذیب دینے کو
کبھی سرسبز وادی میں کبھی بنجر میں رہتے ہیں

مسافر کے لیے تو مشکلیں اردھانگنی جیسی
سفر بھی تو ہمارے حوصلوں کے ڈر میں رہتے ہیں

اسی دنیا میں ساری سوچ کی تصحیح کرنی ہے
یہی احساس ہے کہ ہم تماشا گھر میں رہتے ہیں

ظفر امام
قاری منزل، بیتیا
۸۴۵۴۳۸

مظہر امام

۱۴۶-بی، پاکٹ اے، میور وہار، فیز ۲، دہلی ۱۱۰۰۹۱

احتشام حسین کا رویہ جدید نسل کے ساتھ

اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے مارچ ۵۶ء میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک کنونشن سجاد ظہیر کی دعوت پر "کل ہند اردو ادبی کانفرنس" کے نام سے مئو ناتھ بھنجن (اعظم گڑھ) میں منعقد ہوا تھا۔ سجاد ظہیر نئے نئے پاکستان کی جیل سے چھوٹ کر ہندستان میں مستقل قیام کے ارادے سے آئے تھے۔ اس کانفرنس کی ایک روداد میں نے ڈائری کی صورت میں لکھی تھی، جو کلکتہ کے "آبشار" اور گیا کے "سہیل" میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس میں ایک جگہ لکھا تھا۔

"ناشتے کے بعد کمرے سے نکلا تو باہر دالان میں ایک چارپائی پر احتشام حسین تنہا بیٹھے تھے۔ دوسری چارپائی پر مسعود اختر جمال، پرویز شاہدی اور سلیمان اریب تھے۔ شاہد صدیقی کھڑے تھے۔ اتنے میں فراق صاحب بھی آگئے۔ میں احتشام صاحب کی چارپائی پر بیٹھ گیا..... احتشام صاحب خود ہی میری طرف مخاطب ہوئے اور بہار کے نئے لکھنے والوں کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، منظر شہاب، غلام سرور، اسد ثنائی، وحید الحسن وغیرہ کے متعلق۔ جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کیا۔ ان دونوں شاعروں کے مجموعوں کی بابت بھی گفتگو ہوئی۔۔۔

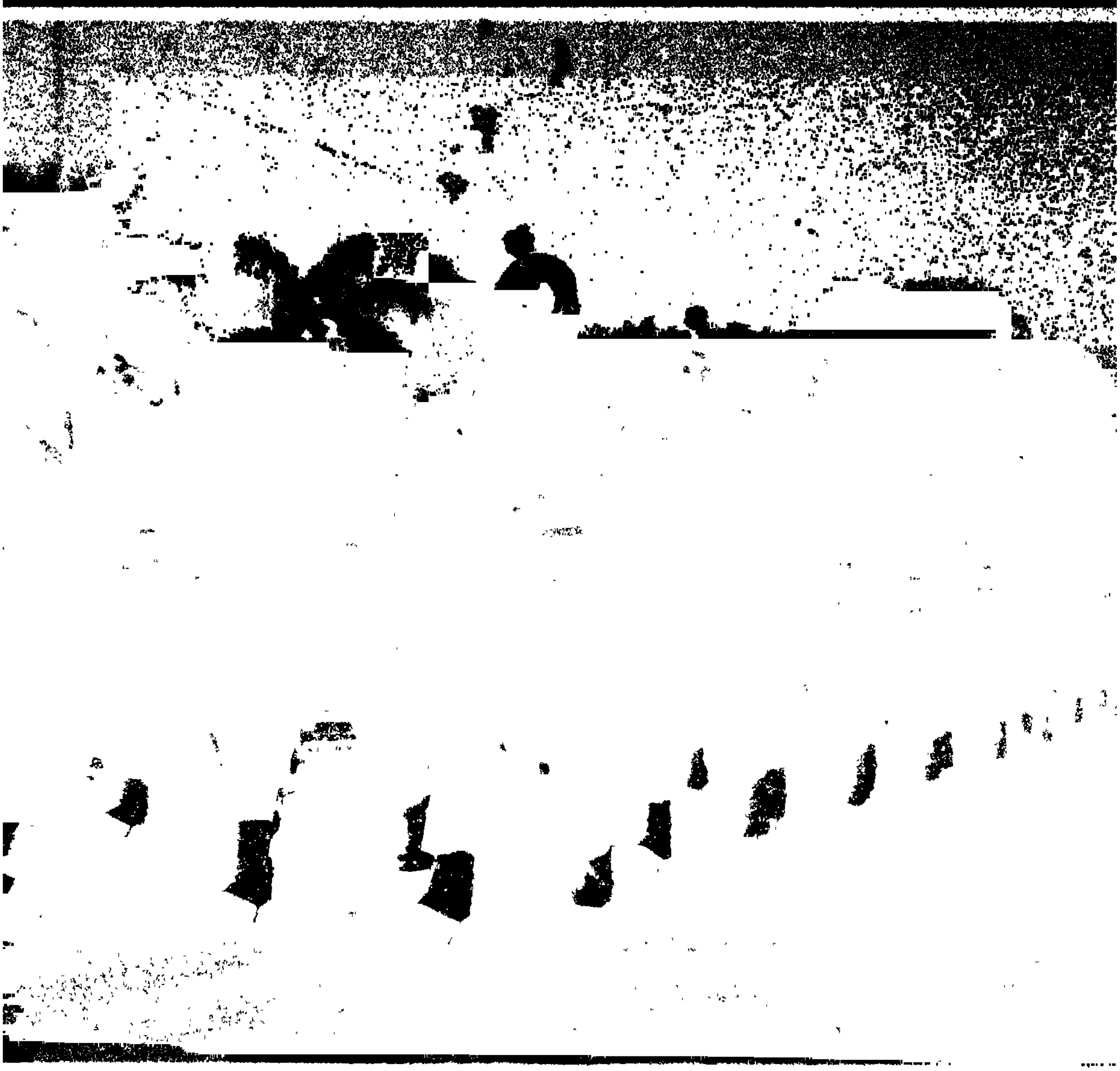
احتشام صاحب کی شخصیت بڑی پرکشش ہے۔ اُن کی باتیں بھی مسحور کن ہوتی ہیں۔ وہ بلاشبہ اس دور میں اُردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں، لیکن نقادوں کی انانیت اور آمریت ان میں نہیں پائی جاتی۔ وہ ہر نئے لکھنے والے کی تحریروں پر گہری نظر رکھتے ہیں، اگر کسی میں کچھ بھی صلاحیت نظر آتی ہے تو اس کی ہمت افزائی کرنے اور ہمدردانہ مشورہ دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اُن سے مل کر ان کی عظمت کا ہی نہیں بلکہ اپنی بڑائی کا بھی احساس ہوتا ہے۔"

میں اس مضمون کی ابتدا میں ہی اپنی ایک سابقہ تحریر سے اقتباس دے کر کچھ خوش نہیں ہوں، لیکن یہ اقتباس بے مقصد نہیں ہے۔ میری عمر اس وقت چھبیس سال تھی۔ نئے شاعروں میں ابھی میرا مقام متعین نہیں ہوا تھا۔ اس لئے احتشام صاحب کی بابت میرے تاثر کو ایک ایسے نوجوان شاعر کا رد عمل سمجھنا چاہیئے جو ادب کے ایوان میں بڑی حد تک نووارد تھا، اور جسے ابھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ پرانے اور مستند ناقدین اس کی کس حد تک ہمت افزائی اور پذیرائی کریں گے۔ یہ وہ دور تھا جب برگزیدہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا طلسم باقی تھا۔ اور بعد تر نسل اُن سے اس لیے بھی برگشتہ تھی کہ وہ اپنی صفوں میں انھیں مناسب جگہ دینے کے لیے ہنوز تیار نہیں تھے۔ ناموں کی ایک مخصوص فہرست تھی جسے ناقدین موقع بے موقع اپنے علم کے مظاہرے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ اور ان سے قربت نہ رکھنے والوں پر شاذ ہی اُن کی نظر جاتی تھی۔ نیاز فتح پوری کے بعد شاید احتشام حسین پہلے اہم ناقد ہیں، جنھوں نے جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ان کے اپنے صوبے سے باہر روشناس کرانے کی کوشش کی۔ احتشام حسین بھی نئی نسل کے اس اعتراض سے محفوظ نہیں تھے کہ ان کے یہاں ایک بنی بنائی فہرست ہے۔ ممکن ہے یہ "سکہ بند" فہرست ۵۴ء، ۵۵ء تک چلتی رہی ہو، لیکن احتشام صاحب نے خود اس حصار کو توڑا اور ان لکھنے والوں پر بھی حسب توفیق توجہ کی جن سے اب تک اُن کی تنقیدی کاوشیں متعارف نہیں تھیں۔ احتشام صاحب سے اپنی پہلی ملاقات میں جو تاثر میں نے قبول کیا، اسے کسی تکلف کے بغیر میں نے ظاہر کر دیا ہے۔ ممکن ہے اب میں انھیں اُردو کا سب سے بڑا نقاد نہ مانوں، لیکن وہ ہمارے اہم ترین ناقدوں میں ہیں، اس کی بابت شاید دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ احتشام حسین بہت زیادہ مجلسی آدمی نہیں تھے مجمع سے الگ تھلگ تنہا بیٹھنے









میں لذت محسوس کرتے تھے۔

۲۔ احتشام صاحب اتنے انکسار پسند اور سادہ مزاج تھے کہ وہ خود سے کم عمر اور کم رتبہ افراد سے مخاطب ہونے میں پہل کرتے ہوئے عار نہیں محسوس کرتے تھے۔

۳۔ وہ نئے سے نئے اور معمولی سے معمولی لکھنے والوں کے نام ذہن میں محفوظ رکھتے تھے اور اُن کی بابت جاننے کے خواہش مند رہتے تھے۔

۴۔ اُن کی شخصیت میں کشش تھی اور اُن کی باتیں مسحور کن ہوتی تھیں۔

۵۔ اُن میں نقادوں کی انانیت اور آمریت نہیں تھی۔

۶۔ وہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے تھے اور انھیں مشورے دیتے تھے۔

۷۔ وہ اتنی سادگی اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے کہ اُن سے مل کر اُن کی عظمت کے ساتھ ساتھ اپنی بڑائی کا بھی احساس ہوتا تھا۔

یہ بات میں نے آج سے چالیس سال پہلے کہی تھی کہ احتشام صاحب ہر نئے لکھنے والے کی تحریر پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بعد کے دنوں میں اس کا ثبوت کچھ اور زیادہ ہی ملتا رہا۔ انھوں نے بالکل نئے لکھنے والوں کی کتابوں پر دیباچے لکھے۔ بالکل نئے حتیٰ کہ معمولی لکھنے والوں تک کی ہمت افزائی کے لیے بڑی توصیفی رائیں دیں۔ انھوں نے جب ہندی میں اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ لکھی تو اس میں نئے لکھنے والوں کے لیے ایک علیحدہ باب مقرر کیا اور اُن کے کارناموں کو سراہنے میں کسی تکلف یا RESERVATION سے کام نہیں لیا۔ مجھے بار بار اپنا ذکر کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا، احتشام حسین کی رواداری اور ذہنی کشادگی کے اظہار کے لیے اپنا ذاتی تجربہ پیش کرنے میں چنداں ہرج بھی نہیں۔ ۵۶ء کے بعد کم و بیش بارہ سال تک احتشام حسین صاحب سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اس دوران خط و کتابت بھی بمشکل دو یا تین بار ہوئی ہوگی لیکن جب بھی میرے کلام پر رائے دینے کا سوال آیا یا ہندی میں اُردو ادب کی تاریخ لکھنے کا، انھوں نے "زمان و مکان" کے فاصلے کے باوجود کبھی مجھے نظر انداز نہیں کیا۔ حالانکہ ان کی نسل کے دوسرے ناقدین (خواہ وہ اُن سے کم تر ہی کیوں نہ ہوں) اس معاملے میں کچھ زیادہ فراخ دل ثابت نہیں ہوئے۔

نئے سے نئے غیر معروف لکھنے والوں کی تحریروں پر بھی نگاہ رکھنا، اُن کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا، اُن کے عروج و زوال سے باخبر ہونا، انھیں مشورے دینا، اُن کا حوصلہ بڑھانا۔ یہ خصوصیات میں نے اُن کی نسل کے ادیبوں میں صرف احتشام حسین میں پائیں۔

اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'تنقید اور عملی تنقید' کے دیباچے میں احتشام حسین نے جس طرز و انداز سے عبدالمغنی کی پذیرائی کی ہے اور کلیم الدین احمد کی تنقیدی سخت گیری کے مقابلے میں عبدالمغنی کے تنقیدی خیالات کو سراہا ہے اس سے احتشام حسین صاحب کے معروضی رویے اور صحیح معنوں میں اُن کے غیر مشروط ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ بات آج سے کم و بیش چونتیس پینتیس سال پہلے کی ہے جب عبدالمغنی کی تنقید نگاری بالکل ابتدائی دور میں تھی۔ اس مضمون کو احتشام حسین نے "احسن مجادلہ" کہنے کے باوجود اپنی تنقید نگاری پر بہترین مضمون قرار دیا۔

احتشام حسین ترقی پسند تھے، مارکسی نقطۂ نظر رکھتے تھے اور اپنے نظریات کے اظہار میں کسی جھجک یا تکلف سے کام نہ لیتے تھے۔ لیکن وہ اپنے سیاسی یا ادبی نظریات کو دوسرے لکھنے والوں کی تحریروں کی پرکھ اور تنقید میں اس حد تک حاوی نہ ہونے دیتے تھے کہ معروضیت فنا ہو جائے۔ عبدالمغنی جماعت اسلامی کے مکتبۂ فکر سے متاثر ہیں اور اُن کے نظریات کی تشکیل بھی اسی مکتبۂ فکر کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ مگر احتشام حسین نے بالکل متضاد ادبی نظریہ رکھنے والے ایک ناقد کی پذیرائی کرنے میں اپنے ذہنی تعصبات کو آڑے نہیں آنے دیا۔

جدیدیت کے فروغ کے دوران بھی احتشام حسین نے اپنے سیاسی اور ادبی مسلک سے سرِ مو انحراف نہیں کیا اور اسی لیے اکثر جدید ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کے اعتراضات اور طنز و تشنیع کا نشانہ بنتے رہے۔ اس سلسلے میں عمیق حنفی سے اُن کے مناظرے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کی یاد اب بھی ہم میں سے بہتوں کے ذہن میں تازہ ہے۔ لیکن ٹھہریئے اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے کی تفصیلات پیش کروں، ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

> "اس سے انکار نہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے، ہمارے علوم بدل گئے ہیں، طرزِ فکر بدل گیا ہے۔ ہم اپنے خیالوں کی کال کوٹھری سے نکل کر بین الاقوامی احساسات کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ ... اس لئے نئی شاعری کا لہجہ اگر پرانے لہجے سے مختلف ہو جائے تو چونک کر منہ نہ پھیر لینا چاہئے بلکہ چونک کر اسے غور و فکر کا نقطۂ آغاز بنا لینا چاہئے۔

یہ تحریر کس کی ہے؟ خلیل الرحمٰن اعظمی کی؟ وحید اختر کی؟ وہاب اشرفی کی؟ گوپی چند نارنگ کی؟ شمس الرحمٰن فاروقی کی؟ جی نہیں یہ بیان احتشام حسین کا ہے اور آج سے کم از کم پچاس سال پہلے کا۔ احتشام حسین نے یہ بات جدیدیت سے پہلے کی جدید شاعری کے سلسلے میں کہی تھی۔ احتشام حسین اُن ناقدوں میں ہیں جنھوں نے ہمیشہ اپنے ذہن کے دروازے وا رکھے اور جہاں انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار میں کسی رورعایت سے کام نہیں لیا، وہاں دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اُن کی جانب ہمدردانہ رویہ رکھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

آیئے ذرا عمیق حنفی اور احتشام حسین کے مناظرہ کی ایک جھلک بھی پیش کی جائے۔ "شب خون" کے پہلے شمارے (جون ۶۶ء) میں احتشام حسین کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا: "نئے تیشے، نئے کوہکن" اس مضمون میں جدید شاعری سے متعلق بعض سوالات اٹھائے گئے تھے اور انھیں اپنے طور پر سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ جہاں جدید شاعری کے روشن پہلوؤں کو سراہا گیا تھا وہاں خامیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی بھی کی گئی تھی۔ خصوصاً ترسیل کی ناکامی سے متعلق اس مضمون کے جواب میں عمیق حنفی کا ایک خط "شب خون" ۳ (اگست ۶۶ء) میں شائع ہوا، جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ کہا گیا تھا۔

"احتشام حسین نے بہت سے جدید نظم نگاروں کے یہاں ابہام اور اہمال کی تشخیص فرمائی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لاشعوری، داخلی، ذاتی اور رویائی علامتوں کے تجربات کرنے والے جدید شاعر بہت کم ہیں۔ ذاتی طور پر میں اظہار کے ترسیلی امکانات کو جان بوجھ کر تنگ اور کند کرنا پسند نہیں کرتا۔۔۔ لیکن اظہار کی ترسیلی صلاحیت بڑھانے کے لئے کسی نظام فکر، تصور حیات یا شعور کی اطاعت تجویز کرنا شاعری کی فنی دیانت داری اور اس کی فکری وسیع النظری کے حق میں نہیں۔۔۔ جدید شاعر تخلیقی عوامل سے گزرتے ہوئے اپنے ذہن کو غیر مشروط رکھتا ہے۔"

"احتشام صاحب نے کہا ہے کہ جدید شاعر کو ہر وقت اس جواب دہی کے لیے تیار رہنا چاہئے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اور کیسے کہتا ہے اور یہ جواب دہی اپنے دل کی عدالت میں نہیں عام پڑھنے والوں کی عدالت میں ہوگی۔ عدالت کے استعارے کا استعمال اس نفسیاتی نکتے کی غمازی کرتا ہے کہ جدید شاعری مجرم نہیں تو ملزم ضرور ہے عام پڑھنے والوں کی پنچایت کے فیصلے سے پہلے ہی احتشام صاحب یہ EX-PARTE DECISION تو دے ہی چکے ہیں کہ "اس وقت اس کا دائرہ محدود اور مستقبل تاریک۔" اور پھر سوال یہ ہے کہ عام پڑھنے والا ہے کون؟ جواب دینے سے پہلے سوال کرنے والے کی حیثیت دیکھی جائے گی۔ یہ دیکھنا لازمی ہوگا کہ عام پڑھنے والے نے جدید شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے یا نہیں، عام پڑھنے والے کے لئے تو میر تقی میر تھے نہ غالب اور نہ اقبال۔ میں مانتا ہوں کہ شاعر کو قاری سے بے نیاز نہیں ہونا چاہئے لیکن قاری کا ایسا نیاز مند بھی نہ ہونا چاہئے کہ شاعری وعظ، تبلیغ، صحافت، خطابت یا اشتہار بن جائے۔ کیوں نہ احتشام صاحب اور جدید شاعر عدالت اور پنچایت کے باہر ہی COMPROMISE کریں۔

اپنے خط کے آخر میں عمیق حنفی نے یہ دعویٰ کیا تھا۔

جدید شاعری ہی آج شاعری ہے۔ باقی سب تقلید، نقالی، بھٹائی، ڈھنڈورچی پن، اشتہار بازی، منافقت، مجاوری، مصلحت کوشی اور دنیاداری ہے، بازی گری اور شعبدہ بازی ہے، غیر ادبی مقاصد کے حصول کی بیساکھی ہے۔"

"شب خون" کے اسی شمارے میں احتشام حسین کا جواب بھی شائع ہوا جس کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔

"انھیں (عمیق حنفی کو) میری نیت پر شک نہیں لیکن وہ مجھے غلط فہمی اور کم بینی کا شکار ضرور پاتے ہیں۔ ۔۔۔ انھیں میرے خیالات میں جدید شاعری کو جرم قرار دینے کی، شاعر سے اس کی آزادی، خیال سلب کر لینے کی، قاری کے نقطۂ نظر کو اہمیت دے کر شاعر کو اس کی بلندی سے نیچے اتار لینے کی اور کس طرح جدید شاعروں کو صرف قدما کی نقالی کرتے رہنے کی تلقین و تبلیغ کرنے کی کوشش نظر آئی۔ اول تو یہ کہ میرے مختصر مضمون میں اُن میں سے کسی بات کا ذکر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان باتوں کی طرف ذہن کا منتقل ہونا خود بعض جدید شعرا کی فنی کمزوریوں، ذہنی الجھنوں، خود پرستیوں اور انانیتی جدت طرازیوں کی غمازی کرتا ہے۔ میں نے اس کے خلاف آواز بلندی کی ہے۔ انھیں یاد کرانا

چاہتا ہوں کہ جب وقت آیا ہے تو میں نے قدیم مضبوط قلعوں پر بھی شب خون مارا ہے۔"

"میں نے اپنے کسی جملے میں یہ تجویز نہیں پیش کی ہے کہ شاعر کسی نظامِ فکر تصورِ حیات یا منشور کی اطاعت کرے اور بقول عمیق حنفی صاحب اپنی فنی دیانت اور فکری وسیع النظری کا گلا گھونٹ دے۔ یہ سب دل کے چور ہیں جو باہر آتے ہیں۔ وہ ذہن کبھی "غیر مشروط" نہیں ہو سکتا جسے صرف یہ فکر ہے کہ وہ "غیر مشروط" نہیں ہے۔ وہی لوگ جو ایسی آزادی کے بلند آہنگ دعوے کرتے ہیں، اپنی ذاتی زندگی میں ہر قدم پر قاعدے قانون کی پابندیاں چاہتے ہیں، سماجی رشتوں میں غلاموں کی طرح بندھے ہوتے ہیں۔ آرام سے آسودہ اور تکلیف سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ تعریف کرنے والے سے خوش اور اختلاف کرنے والے سے بیزار رہتے ہیں۔ لباس، رہن سہن، چلنے پھرنے، ملنے جلنے میں رسم و رہِ عالم کے پابند ہوتے ہیں۔ صرف شاعری کے لئے ایسی آزادی چاہتے ہیں جو غیر مشروط ہو۔ ...... میری تو صرف اتنی گزارش تھی کہ شاعر اپنی ذات اور ضمیر سے، زندگی کے خوب صورت بنانے والے عناصر سے، حُسنِ نظر، حسنِ خیال اور حسنِ حیات کی سحر آفرینیوں سے، انسانی بہبود کے عام تصور سے یکسر بے نیاز رہ کر اپنی آزادی کا استعمال نہ کرے تو اچھا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھے کہ اس کے پاس کچھ اور لوگ ہیں جن کے پاس بھی تھوڑی بہت عقل، تھوڑی سی شعر و ادب کو سمجھنے کی صلاحیت، تھوڑی سی زندگی کی واقفیت ہو سکتی ہے۔ غیر مشروط آزادی کے نام پر کوئی شخص "خشکہ باگندہ بیروزہ اگرچہ گندہ لیکن ایجادِ بندہ" پر عمل کرنا چاہے تو اور بات ہے۔"

"خط پڑھ کر مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ جدید شاعر خود ایک پیرِ تسمہ پا بن کر قاری پر سوار ہونے کی فکر میں لگا ہوا ہے اور اسے ایسے ریگزاروں میں بھٹکائے رکھنا چاہتا ہے جہاں نہ نخلستان ہے، نہ ٹھنڈے پانی کے چشمے، وہ تو ابھی سے گویا اس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ اپنی شاعری کے سوا سارے ادبی سرمایے کو تقلید، نقالی، بھٹائی، دھبٹی، ڈھنڈورچی پن، اشتہار بازی، منافقت، مجاوری، مصلحت کوشی، دنیاداری، بازی گری، شعبدہ بازی اور غیر ادبی مقاصد کے حصول کی بیساکھی قرار دیتا ہے۔ یہ دعوا اس وقت ہے جب ابھی پوت کے پاؤں پالنے میں ہیں، آگے کیا ہوگا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے دعوے اور ایسے حملے ہر شخص کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے۔ اس کی کسوٹی وہ عمل ہوگا جو ثبوت میں پیش کیا جائے۔ ایسے دعووں سے کھوکھلے پن کی بو آتی ہے اور اسے عام زبان میں خود فریبی بھی کہتے ہیں۔"

"ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ عمیق حنفی صاحب کے جدید شاعروں کی فہرست میں کون شامل ہے اور کون نقال، منافق، بھاٹ اور شعبدہ باز ہے۔ مجھے بہت سے جدید شاعر پسند ہیں۔ انھیں پڑھتا اور سمجھتا ہوں، ان کے کلام سے حظ اور کیف حاصل کرتا ہوں۔ بعض ایسے ہیں جن کی کچھ ہی تخلیقات سے لطف اندوز ہو سکا ہوں۔ بعض کی نظمیں مجھے محض ذہنی اور لفظی کرتب نظر آتی ہیں۔ یہاں میں نے جدید شاعری کا لفظ جہاں بھی استعمال کیا ہے، اس سے صرف وہ شاعر مراد ہیں جن کے لیے میں نے کہا تھا، "یہ بات صرف ان نئے شاعروں پر منطبق ہوتی ہے۔ ... الخ" (شب خون، جون ۶۶ء صفحہ ۸۸) اس میں وہ نئے شاعر شامل نہیں ہیں جن سے اُردو شاعری کی تاریخ کا دامن وسیع ہو رہا ہے۔ صرف ان کا ذکر ہے جن کے لیے میں نے کہا تھا کہ اس وقت ان کی شاعری کا دائرہ محدود ہے اور مستقبل تاریک!"

بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ شب خون ۵ (اکتوبر ۶۶ء) میں عمیق حنفی کا دوسرا خط شائع ہوا۔ اس کے خاص اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں:۔

میں سمجھ نہیں رہا ہوں کہ احتشام صاحب نے میرے خط کے اقتباسات میں چھیڑی گئی ادبی بحث کو مناظرے میں کیوں بدل دیا؟ ان کا احترام ہی ایسی کسی بد ارادگی سے مجھے باز رکھنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن انھوں نے میرے بعض نہایت واضح

معروضات کو عبارت آرائی اور طنز نگاری کے ذوق کی تسکین کے لئے کچھ اتنا حُلیہ بگاڑ کر پیش کیا ہے کہ مجھے اپنی صفائی کے لئے بحث کو طول دینا پڑ رہا ہے۔

"روایتی تنقید کا سب سے بڑا حربہ یہی ہے کہ فریق ثانی کے جملوں کو سیاق وسباق سے نوچ کر نئے رنگ میں اس طرح پیش کیا جائے کہ یا تو بات کا بتنگڑ بن جائے یا اصل بات سے توجہ ہٹ جائے۔ مغالطات، فقرے بازی اور مبادیات کو متنازعات کی صورت دینے کے داؤ پیچ بھی روایتی تنقید کا خاصہ ہیں۔"

"جی ہاں" یہ بات میں نے کہی ہے اور پھر دُہراتا ہوں کہ جدید شاعری ہی آج کی شاعری ہے۔ باقی جو کچھ ہے نقالی، بھٹی، مجاوری، بازی گری، شعبدہ بازی وغیرہ ہے۔ وہ لوگ جو بیسویں صدی میں رہ کر کسی اور صدی میں سوچتے اور محسوس کرتے ہیں، میرے لیے انتہائی مضحک ہیں۔ میں اور تمام جدید شاعر رفتگاں کے فکر و فن کے قدرداں ہیں اور اپنے قدیم ادبی سرمائے کا احترام بھی کرتے ہیں۔ لیکن آج کے قدامت پرستوں اور رفتگاں کے نقالوں اور بے مغز مقلدوں کو اس عزت واحترام کا مستحق نہیں سمجھتے۔ کیا احتشام صاحب کو یہ نٹ، بھانڈ، نقال، مسخرے خلاق یا فن کار نظر آتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر خفگی کیوں؟ معافی چاہتا ہوں کہ اُن اُگلے ہوئے نوالے چبانے والوں کے لیے اور زیادہ سخت اور شدید الفاظ استعمال نہیں کر سکا۔"

"میں تو حیران ہوں کہ احتشام صاحب محسوس کر رہے ہیں کہ جدید شاعر پیر تسمہ پا ہے! وہ جدید شاعر جو اپنی شاعری کو ایک خاص ذہنی سطح اور ہم عصر ادبی ذوق رکھنے والے بیدار مغز قارئین کے حلقے تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ ایسا کرنا غماز ہے جدت کے خوف کا۔ یہ خوف اُس وقت طاری ہوتا ہے جب فرسودگی اور قدامت پرستی کی فصیلیں جدت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سے تھرّانے لگتی ہیں۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ قدامت پرستی کے غلیظ اور ناپاک خون میں جدت اپنے ہاتھ کبھی نہ رنگے گی اور اسے اپنی فطری موت مرنے کا پورا موقع دے گی۔ مرتے ہوئے کو مارنا جدت کا شیوہ نہیں ہے۔ البتہ MERCY KILLING کے بارے میں ابھی سوچا ہے۔"

"تنقید و تدریس کی حمایت اور اعانت کے بغیر بھی جدید شاعری میں دلچسپی لینے والے ذہن ومزاج کا فروغ ہو رہا ہے اور اس کے قارئین کا ایک اچھا خاصہ حلقہ بنتا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ حلقہ شاعروں کو تفریح و تماشا نہیں بلکہ قابلِ مطالعہ سمجھتا ہے اور رنڈی اور شراب کا بدل نہیں بلکہ ذہن و روح کی غذا مانتا ہے۔ جدید شاعری کو اس تنقید سے توقعات بھی کیا ہو سکتی ہیں جس نے ابھی یگانہ اور شاد عارفی کا حق بھی ادا نہیں کیا ہے اور میراجی، راشد، تصدق حسین خالد، اختر الایمان اور مجید امجد کی طرف بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ہے۔ اُردو تنقید کی سند حاصل کرنے کے لئے نہ صرف مرنا بلکہ مر کر کم از کم ۳۰، ۴۰ برس پرانے ماضی کا حصہ بننا ضروری ہے۔

عمیق حنفی کے اس طویل خط کے جواب میں اتمام حجت کے طور پر احتشام حسین کا ایک نسبتاً مختصر خط "شب خون" کے اسی شمارے میں شامل ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے طور پر مناظرہ ختم کر دیا ہے۔ میں اس خط کو من وعن نقل کر رہا ہوں۔

"ویسے تو میں ماہناموں میں ایسی ادبی بحثوں کو نامناسب اور غیر مفید سمجھتا ہوں جو صرف دو شخصوں کے لیے مناقشہ کی شکل اختیار کر لیں اور اصول سے ہٹ کر ذاتیات تک پہنچ جائیں۔ لیکن اپنی طرف سے اسے ختم کرنے کے لئے چند سطریں لکھتا ہوں۔ گفتگو سنجیدہ، علمی اور مدلل ہو تو بحث گوارا بھی ہو سکتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ عمیق حنفی صاحب کے اس خط کا کیا جواب ہو سکتا ہے جو اس کٹھ حجتی پر مبنی ہے کہ میں کہتا ہوں کہ جدید شاعری ہی شاعری ہے، اور صرف وہی جدید شاعر ہے جسے موصوف کی دی ہوئی سند حاصل ہو۔ میں نے اگر اس طرح کے ذہنی رویّے کو خود فریبی کہا تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے! خوش قسمتی سے جن کتابوں سے آن کا بک ریک مزین ہے، ان میں سے تقریباً سبھی کتابیں میں نے بھی پڑھی ہیں۔

ان کے علاوہ میں نے اقبال، جوش، فراق، فیض، ملّا، مخدوم، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، روش صدیقی، وحید اختر، باقر مہدی، فارغ بخاری، محمود ایاز، شہاب جعفری وغیرہ کو بھی جدید شاعر سمجھ کر پڑھا ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عمیق حنفی کی فہرست سے ان ناموں کا غائب ہونا ہی اس غیر مشروط آزادیٔ ذہن کا غماز ہے جس سے وہ مدعی ہیں۔ اتنا پابند ذہن، ذہنی آزادی کا دعوا کرے تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ وہ مشروط طور پر صرف چند شاعروں کو شاعر مانتے ہیں۔ باقی سب نٹ، نقال، بھانڈ اور منافق وغیرہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

"میں تو اپنی کم فہمی اور بے بضاعتی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ چکا ہوں کہ جدید شاعری کا ایک حصہ نہ مجھے جدید معلوم ہوتا ہے اور نہ شاعری۔ یہ کسی بدنیتی یا کسی سے عناد کی بنا پر نہیں کہتا، اس لئے کہتا ہوں کہ اس میں نہ خیال اور جذبہ ہے، نہ حُسن کاری اور فن، نہ روایت کی پابندی ہے نہ بغاوت۔ ابھی تک کسی نے اس شاعری کی وہ خوبیاں واضح نہیں کیں، جنھیں دوسرے سمجھ سکیں اور اس شاعری کے حسن اور عظمت سے متاثر ہوں۔ صرف یہ کہنا تو کافی نہیں کہ یہ بیسویں صدی کی شاعری ہے۔ بیسویں صدی میں پیدا ہونا ہی تو بیسویں صدی کا ذہن نہیں بنا دیتا! اگر بیسویں صدی میں صرف وہی ہے جو "مطلق فرد" کی داخلیت کا ترجمان ہے تو اس پر اصرار کیوں ہے کہ اسی کو اس بیسویں صدی کی ترجمانی سمجھا جائے جس کی علمی، عقلی اور آفاقی فتوحات اور بھی ہیں اور جس کے سامنے سیکڑوں مسائلِ حیات ہیں۔

"عمیق حنفی صاحب کے بھونڈے طنز اور علمی مزعومات کا جواب کہاں ممکن ہے! کوئی مدلل بات کہی گئی ہوتی تو کچھ ضرور لکھتا اور اگر ضرورت ہوئی تو آئندہ لکھوں گا بھی۔ خط وکتابت کی شکل میں اس بحث کا دروازہ بند کرنا ہی اچھا ہوگا۔ عمیق حنفی صاحب کو لکھیے کہ وہ جدید شاعری کی فکری اور فنی خصوصیات پر ایک عام فہم قسم کا مضمون لکھ دیں۔ شاید وہ زیادہ کارآمد ہو۔ صرف میرے جہل اور غلط خیالوں پر طنز کرنے سے ادب کو یا دوسروں کو کیا فائدہ ہوگا۔"

جدیت کی تاریخ میں احتشام حسین اور عمیق حنفی کے مناظرے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان طویل اقتباسات کے پیش کرنے کا جواز یہی ہے۔ احتشام صاحب اپنی سنجیدگی اور وضع داری کے لئے مشہور تھے۔ اور غیر ضروری بحث ومباحثہ اور خصوصاً مناظرہ سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اور تبلیغ میں ہمیشہ بے باکی سے کام لیا ہے۔ شاید اب بھی بہت سے قارئین کو وہ بحث یاد ہو جو حالی کے شعر۔

حالی اب آؤ پیروِی مغربی کریں   بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

کے سلسلے میں احتشام حسین اور احسن علی تلہری کے مابین ہوئی تھی۔ احتشام صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے تنقید نگار تھے۔ وہ اپنے لہجے میں حتی الوسع تلخی نہ آنے دیتے تھے، لیکن اُن باتوں کے لئے جنھیں وہ غلط سمجھتے تھے، ضرور ٹوکتے تھے اور اس میں کبھی کبھی ان کے تکدر کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے مئوناتھ بھنجن کے اس کنونشن میں جس کا ذکر میں نے اس مضمون کے آغاز میں کیا ہے شاہد صدیقی مرحوم نے بعض ناقدوں کی غیر ذمہ دارانہ روش پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ احتشام صاحب نے آل احمد سرور کے مجموعۂ کلام پر بڑا مبالغہ آمیز دیباچہ لکھا ہے۔ یہ سُن کر احتشام صاحب کے تیور بدل گئے اور انھوں نے خفگی بھرے لہجے میں کہا کہ "میں نے سرور صاحب کے کسی مجموعے پر دیباچہ نہیں لکھا اور نہ ان کے مجموعۂ کلام کا مجھے علم ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ بغیر پڑھے اعتراض کرنے لگتے ہیں؟"

احتشام حسین اور عمیق حنفی کے مکتوبات سے دو مختلف نسلوں کے مزاج اور رویے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ احتشام صاحب کے ادبی نظریات کے باعث عمیق حنفی نے یہ فرض کر لیا کہ انھوں نے کسی خاص نظامِ فکر یا تصورِ حیات کے پیشِ نظر ادب کی تخلیق کا مشورہ دیا ہے۔ جس زمانے میں یہ خط وکتابت ہوئی، اس وقت جدیدیت اپنے آپ کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ ممکن ہے جدیدیت، صرف و محض ترقی پسندی کے ردعمل کے طور پر معرضِ وجود میں نہ آئی ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسندی کی ادعائیت، غیر ادبی نقطۂ نظر اور ایک مخصوص نوع کی وابستگی پر اصرار نے جدیدیت کے لئے فضا ہموار کی تھی۔ ایسی صورت میں احتشام صاحب کی

تحریر سے غلط فہمی کا پیدا ہونا ایک حد تک فطری تھا۔ پھر احتشام صاحب نے جدید شاعروں میں اقبال، جوش، فراق، فیض، ملا، مخدوم، سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید شاعری کی گفتگو ان دنوں ایک خاص سیاق و سباق میں کی جاتی تھی، اس لئے ان شعرا کو "جدید" کہنا مناسب نہ ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک وسیع تناظر میں انھیں بھی جدید تسلیم کیا جائے۔ پھر اپنے زمانے میں تو حالی بھی جدید کہلاتے تھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کی شاعری بھی جدید کہلاتی تھی۔ عمیق حنفی نے جن معنوں میں "جدید" استعمال کیا ہے، شاید اس کے لیے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ احتشام صاحب کو غلط فہمی ہوئی یا انھوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا یا محض اپنے حریف کو شکست دینے کے خیال سے انھوں نے بعض بڑے ناموں کی فہرست پیش کر دی۔ واقعہ جو کچھ بھی ہو، یہ صحیح ہے کہ آج ایک مخصوص معنی میں اقبال، جوش یا فیض کو جدید شاعر تسلیم کرنے کی کوشش ایک کارِ عبث ہے۔

احتشام حسین ایسی آزادی کے حق میں نہیں تھے "جو زندگی کو خوبصورت بنانے والے عناصر سے، حسنِ نظر، حسنِ خیال اور حسنِ حیات کی سحر آفرینیوں سے، انسانی بہبود کے عام تصور سے یکسر بے نیاز بنا دے۔" احتشام صاحب چوں کہ ترقی پسند تھے، اس لیے وہ ادب میں مقصدیت اور وابستگی کے قائل تھے۔ جدید ادب اور شاعر بھی زندگی میں حُسن دیکھنا چاہتا ہے، وہ بھی خیر و شر کی آویزش میں خیر کے ساتھ ہے، لیکن اس کا ادب لازمی طور پر مقصد کے تابع نہیں۔ وہ ادب کے جمالیاتی اور فن کارانہ پہلوؤں پر زیادہ نگاہ رکھتا ہے۔ اور حیات و کائنات کے ان تمام مسائل کو اپنی جولانگاہ قرار دیتا ہے جو اسے متاثر، مطمئن یا پریشان کرتی ہیں۔ وہ خیر اور نفاست کی تلاش میں شر اور غلاظت کی راہوں سے گزرتے ہوئے اپنی ناک پر رومال نہیں رکھ لیتا۔ میرا خیال ہے ترقی پسندی اور جدیدیت کا یہ بھی ایک نمایاں فرق ہے۔

احتشام صاحب "وفاداری بہ شرطِ استواری" کے قائل تھے، اس لئے جدیدیت کی ہم نوائی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اس کا مطالبہ بھی ان سے نہیں کرنا چاہیے۔ وہ آخر عمر تک اپنے ادبی مسلک پر قائم رہے۔ ممکن ہے اسے ان کے مزاج کے "بے لچک پن" پر محمول کیا جائے، لیکن اس سے ان کی ایمان داری اور دیانت داری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پھر احتشام صاحب کے ان خطوط کی روشنی میں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اشتعال انگیزی اور الہ آباد کی موسمی تپش کے باوجود بڑی حد تک ایک رکھ رکھاؤ، سنجیدگی، وقار، نرمی اور متانت کو برابر برقرار رکھا اور علمی سطح پر گفتگو کی۔ عمیق حنفی نے اندور[1] کی معتدل آب و ہوا کے باوجود اپنے لہجے کو اکثر گرم رکھا اور احتشام صاحب کو "قدامت پسند تنقید" کا ایک جزو سمجھ کر اُن کی قبیل کے دوسرے ناقدین کی اچھی خاصی سرزنش کی۔ انھوں نے اپنے بعض دعووں کو منوانے کے لئے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ مختلف دور، نسل اور عمر کے تفاوت کا بھی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

احتشام صاحب کی بڑائی اس میں تھی کہ وہ نئی نسل سے مکالمے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے عمیق حنفی سے بحث و مباحثہ کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کی، ہر چند کہ وہ احتشام صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ البتہ جب انھوں نے محسوس کیا کہ بحث میں ذاتی مناقشت کا رنگ آ رہا ہے تو اُن کی متانت اور شرافت نے مناسب سمجھا کہ یہ سلسلہ بند کر دیا جائے۔ پھر بھی انھوں نے یہ کہہ کر کہ اگر ضرورت ہوئی تو آئندہ لکھوں گا، وہ دروازہ کھلا رکھا جہاں سے بحث و تمحیص کی ہوائیں اندر داخل ہو سکیں۔

احتشام صاحب نے "یک طرفہ جنگ بندی" کر دی۔ حریف کے لیے بھی خاموشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا، لیکن خاموش ہونے سے پہلے عمیق حنفی نے "شب خون" ۲۲ (دسمبر ۱۹۶۷ء) میں ایک مختصر خط شائع کرایا، جس کے ابتدائی جملے یہ تھے:

> "احتشام صاحب سے تبادلۂ خیالات کا امکان کم از کم "شب خون" کے اوراق پر ختم سا ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ مجھ سے زیادہ دانش مند اور نکتہ رس ہیں جو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قدامت اور رجعت پرستی سے مکالمہ بے سود ہی نہیں، فضول بھی ہے، بلکہ ناممکن ہے۔"

میرا خیال ہے کہ احتشام صاحب کے بدترین دشمن بھی انھیں قدامت پسند اور رجعت پسند کے القاب سے نہیں نوازیں گے۔ وہ جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن قدامت اور رجعت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ عمیق حنفی کا بیان اسی جارحانہ پن کا نمونہ ہے جس کی شکایت اکثر جدیدیت نوازوں سے کی جاتی ہے۔

---

[1] عمیق حنفی [illegible]

احتشام حسین کی تنقیدوں میں وہ خشونت نہیں ہے جو رجعت پسندی کا خاصہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے نظریات کی وضاحت کے لئے اُن کی پُرانی کم و بیش پچاس سال پرانی تحریروں سے دو اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا۔

(۱)

نئی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس میں حسب ذیل باتوں میں سے کسی ایک کا یا کئی ایک کا اظہار ہوتا ہو۔

۱۔ شعر اور نظم کی صورت میں کسی طرح کی تبدیلی، ہئیت میں ایسا تغیر جو شاعروں کی عام روایتوں سے مختلف ہو۔

۲۔ نئے سماجی اور سیاسی شعور کی بنا پر موضوع، مواد اور طرزِ فکر میں تغیر۔

۳۔ تخیل اور مبالغہ پرستی سے زیادہ واقعیت اور حقیقت پر زور دینا۔

۴۔ اس احساس کا اظہار کہ جمالیاتی عنصر مواد کی خوبی ہی کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ مواد اور اسلوب میں ایک گہرا تعلق ہے جسے ایک ساتھ سوچنا ضروری ہے۔"

(۲)

"نئے شاعروں میں مختلف خیال اور مختلف رجحان کے لوگ ہیں۔ ان کے علم کی سطحیں بھی بہت مختلف ہیں۔ وہ مختلف سیاسی اور سماجی مقاصد کو سامنے رکھتے ہیں۔ اُن میں وہ بھی ہیں جن کے پاس کوئی فلسفۂ حیات ہے۔ دنیا میں جو تغیرات ہو رہے ہیں، ان کا علم ہے۔ اور وہ بھی ہیں جن کی آنکھیں اپنے ہی اندر کھلی ہوئی ہیں۔ وہ باہر کی دنیا کو نہیں دیکھتے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو پُرانی ہی شراب نئی بوتلوں میں بھرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو نئی شراب کو بھی پرانی بوتلوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔

ان ہی نئے شاعروں میں روایت پرست بھی ہیں اور قدامت شکن بھی پھر آسانی کے ساتھ ایک ہی جملے میں پوری نئی شاعری پر کوئی رائے جو تجزیے پر مبنی نہ ہو کیوں کر صحیح سمجھی جا سکتی ہے۔"

ان اقتباسات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ادبی رفتار کے عواقب و عواطف پر غیر متعصبانہ نظر رکھتے تھے۔ احتشام حسین نے اس نسل کی شاعری کا جائزہ لیا ہے جو اپنے زمانے میں نئی تھی اور خود احتشام صاحب اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خیالات تقریباً پچاس سال پہلے کی شاعری کو پیشِ نظر رکھ کر ظاہر کئے گئے ہیں۔ آج کی تنقید ان کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں کرے گی۔ لیکن آج کی جدید شاعری پر بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ ان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

اس آخری اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب اپنی نسل کی ساری شاعری سے مطمئن نہیں تھے اور وہاں بھی انھیں روایت پرستی کی مثالیں دکھائی دیتی تھیں۔ اور یہ بھی کہ ان کے خیال میں بغیر تجزیہ و تحلیل کے کوئی صحیح رائے نہیں دی جا سکتی۔

یہاں اس مضمون کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو احتشام صاحب نے سردار جعفری کی نظم "رومان سے انقلاب تک" کے جواب میں لکھا تھا۔ جعفری نے شاعروں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ قلم پھینک کر بندوق اٹھالیں۔ احتشام صاحب نے اس نقطۂ نظر سے شدید اختلاف کر کے فن کار کے منصب پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ شاید اسی لیے احتشام صاحب نے کہا ہے کہ "جب وقت آیا ہے تو میں نے قدیم مضبوط قلعوں پر بھی شب خون مارا ہے۔"

احتشام حسین ترقی پسند رہے ہوں یا مارکسسٹ، وہ رجعت پسند ہوں یا کہولت کی منزل سے گزر کر ضعیفی کی سرحد میں داخل ہو گئے ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ نئی نسل کے لیے کبھی تبرک نہیں بنے۔ نئی نسل کے اُن سے اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن نئی نسل نے انھیں ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا، انھیں ناقابل اعتنا نہیں سمجھا۔

احتشام حسین کو نئی نوجوان نسل سے کتنی محبت اور موانست تھی، اس سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود کا یہ بیان پیش کرنا چاہوں گا۔

"یونی ورسٹی پہنچ کر میں نے دیکھا کہ احتشام صاحب طالب علموں میں بے انتہا مقبول ہیں اور ہر قسم کے طالب علم ان کو گھیرے رہتے ہیں۔ میرے ساتھیوں میں سے کسی کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو وہ سیدھا احتشام صاحب کے پاس پہنچتا اور احتشام صاحب ہر مسئلے کا جواب تھے علمی سوالوں سے لے کر دستِ سوال تک۔"

اور پھر یہ کہ:۔

(وہ) ہر طالب علم کی طرف پوری طرح متوجہ اور اس کے نجی حالات تک سے واقف رہتے تھے۔"

احتشام حسین صرف طالب علموں کے ہی نہیں بلکہ ہر نئے لکھنے والے کے نجی حالات سے بھی واقف ہونا چاہتے تھے اور کرید کرید کر اس کے حالات

دریافت کرتے تھے۔ احتشام حسین اور جدیدیت کے تعلق سے ڈاکٹر نیر مسعود کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے۔

"ان کے چہرے پر بشاشت کے ساتھ افسردگی کی ایک ہلکی سی رمق ہمیشہ تھی، مگر الہ آباد آنے کے بعد اس پر کبھی کبھی ایک اور رمق بھی نظر آنے لگی۔ یہ تکدر کی رمق تھی۔ اس تکدر کے اسباب میں غالباً الہ آباد کے ماحول کی بعض ناخوش گواریوں کے علاوہ ادب میں جدیدیت کا فروغ بھی تھا جس سے اُن کو نظریاتی اختلاف تھا اور وہ اس نئی کروٹ کو ادب اور معاشرے دونوں کے لئے نہایت مُضر خیال کرتے تھے تاہم انھوں نے اس سے اغماض کرنے کے بجائے اس کا گہرا مطالعہ کیا، بلکہ خود بھی اس رنگ کو آزما کر دیکھا۔ ا۔ح۔ نورازل کے نام سے شائع ہونے والی جدید نظمیں احتشام صاحب ہی کے قلم سے بتائی جاتی ہیں۔"

اُن کی وفات کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے جو تاثرات قلم بند کیے تھے، اُن کے مندرجہ ذیل اقتباسات، میرا خیال ہے، جدید نسل کی جانب احتشام حسین کے رویّے کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

"احتشام صاحب کی موت کے بعد ان سے تعلق یا قرابت کا دعویٰ کرنے والے کوئی مخصوص یا نئے دعویدار سامنے نہیں آئے ان سے ملنے والا ہر شخص خود کو ان سے اور اُن کو خود سے اتنا قریب سمجھنے لگتا تھا کہ دُور و نزدیک کی تفریق و تخصیص ہی ہٹ گئی تھی۔۔ شہرت اور غیر معمولی قبولیت عام کا بوجھ احتشام صاحب کے کندھوں پر جتنا ہلکا معلوم ہوتا تھا، اس کی مثال کم سے کم میری نظر میں نہیں ہے۔"

"احتشام صاحب ترقی پسند تھے اور خاصے ترقی پسند تھے۔ ادب میں نئی تبدیلیوں سے وہ بہت خوش نہ تھے۔ لیکن جدید ادب کی طرف سے ان کی بے اطمینانی اُن بے خبر لوگوں کی بے اطمینانی نہ تھی جو محض سنی سنائی پر اپنے فیصلے کی دیوار قائم کرتے ہیں۔ نئے ادب کا بیشتر حصہ ان کی نظر میں تھا اور اس کے جن پہلوؤں کو وہ پسند کرتے تھے، ان کا ذکر کرنے میں انھیں کوئی مصلحت آمیز تکلف بھی نہ تھا۔ ان کی غالباً آخری تحریر جدید افسانہ پر ایک ریڈیائی تقریر ہے جو ان کے انتقال کے کچھ دنوں بعد نشر ہوئی۔ اچھے نئے افسانوں کی طویل فہرست جو اس مضمون میں انھوں نے کسی ظاہری کاوش اور چھان بین کے بغیر مرتب کی ہے، ان کے مطالعے کی وسعت اور مزاج کی منصفی کا ایک معمولی نمونہ ہے۔

"وہ ترقی پسند نظریہ ساز اور ادب میں سماجی شعور کے علم بردار ہونے کے ساتھ ساتھ (بلکہ شاید اس سے پہلے) شاعر اور شعر فہم بھی تھے، جیسا کہ ہر اعلیٰ درجے کے سخن شناس کا قاعدہ ہے۔ وہ شاعری سے تخیلی سطح پر معاملہ کرتے تھے نہ کہ عقلی اور نظریاتی سطح پر۔"

"جدیدیت کے حامیوں کے نظریات میں شدت آنے کے ساتھ ساتھ احتشام صاحب کی ذہنی مقاومت بھی بڑھ گئی مگر اس میں ذاتی ناراضگی کا شائبہ نہ تھا۔ وارث علوی کے کچھ مضامین میں ایسے خیالات کا اظہار تھا جن سے ترقی پسند تصورات اور علی الخصوص احتشام صاحب پر ضرب پڑتی تھی۔ لیکن مجھ سے یا کسی سے اظہارِ ناخوشی تو بڑی بات ہے، جب بعض لوگوں نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی بچکانہ کوشش میں ان مضامین کی بُرائی کی تو انھوں نے کہا کہ کیا حرج ہے اگر نئے نئے خیالات سامنے آئیں۔ یہ بھی ایک طرزِ تحریر ہے۔ مجھ سے گفتگو کے دوران ان کا لہجہ نہ صلح جوئی کا ہوتا تھا اور نہ مزاحمت کا۔ وہ میری باتیں پوری خاطر جمعی سے سنتے تھے اور اپنی باتیں وضاحت اور اطمینان سے کہتے تھے۔ سچ پوچھئے تو میرے ان کے درمیان بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ فرق صرف تاکید اور اضافی اہمیت کا تھا۔"

□□

قطعہ

قید رہنا ہے مُصیبت کے حصاروں میں مجھے
پہلے پھرتا تھا میں آزاد ہواؤں کی طرح
عُمر کے لمحے گزرنے لگے صدیاں بن کر
زیست ہے اب کسی مجرم کی سزاؤں کی طرح

[illegible]

غزلیں

وہ ستم ہم پر نئے ڈھانے کو ہیں
پھر کسوٹی پر کسے جانے کو ہیں
گھونٹنے کو پھر گلا انصاف کا
وقت کے منصف ادھر آنے کو ہیں
دیکھ زنداں میں سجے دار و رسن
جشنِ گُل کی پھر خبر لانے کو ہیں
یہ مصائب کے ہزاروں آفتاب
موم جیسے جسم پگھلانے کو ہیں
پھر اٹھا وہ دیکھ مشرق سے دھواں
اب گھٹائیں آگ برسانے کو ہیں

سبلانی سیوتے

۸۔ مومن پورہ جنسی جہانگیر آباد
بھوپال (ایم پی)

گُل بھی وہی چمن بھی وہی باغباں کہاں
میکش ہیں میکدہ ہے مئے ارغواں کہاں
تکیہ کیا تھا جس پہ وہی شاخ جل گئی
اب کس کو کیا بتائیں کہ ہے آشیاں کہاں
تھی آرزوئے دید کہ وحشت کا زور تھا
ہم نے انھیں پکارا نہ جانے کہاں کہاں
ہر ایک سمت آگ کے شعلے بلند ہیں
اب تو بتا کہ جائیں دلِ ناتواں کہاں
جانا ہے بس یہ سوچ کے ہم ساتھ ہو لیے
زاہد یہ کیا پتہ کہ رُکے کارواں کہاں

زاھد لکھنوی

۴۲۹/۹۴ گردھاری لعل ماتھر روڈ
مصاحب گنج لکھنؤ
۲۲۶۰۰۳

جنوں زدہ میں نہیں فتح مندِ ہوش ہوں میں
بہ فیضِ عشق غمِ دو جہاں بدوش ہوں میں
وہ زندگی تھی کہ طوفان سے میں لڑتا تھا
یہ موت ہے مری ساحل پہ اب خموش ہوں میں
سمجھ نہ پائے گا شاید کوئی نوا میری
ہزار قصے سناتا ہوں گو خموش ہوں میں
نہیں ہے اہلِ تصنع سے کچھ مرا رشتہ
کہ کج کلاہوں کی بستی میں سادہ پوش ہوں میں
بشر ہوں میں کہ سمجھتا ہوں خود کو اے توقیر
زمیں پہ رہتا ہوں لیکن فلک بدوش ہوں میں

توقیر جمال نجیب آبادی

۱۴۔ نیا گاؤں (ایسٹ)
لکھنؤ

بدلتے وقت میں انساں بدل گئے کہ نہیں
نئے مزاج کے سانچے میں ڈھل گئے کہ نہیں
دلوں میں اپنے جو شمعِ یقیں جلائے تھے
حدودِ یاس سے باہر نکل گئے کہ نہیں
سلگتے لمحوں کے احساس کی حرارت سے
جو منجمد تھے وہ جذبے پگھل گئے کہ نہیں
بہت ضروری تھیں کچھ ٹھوکریں بھی رستے میں
بتاؤ گرنے سے پہلے سنبھل گئے کہ نہیں
تمہارے ذہن میں گمنام سے تھے کچھ پیکر
تخیلات کے سائے میں پل گئے کہ نہیں
بہت دنوں سے اسی جستجو میں ہوں ساجد
دیئے خوشی کے ان آنکھوں میں جل گئے کہ نہیں

ساجد خیر آبادی

جی آئی ایس گروپ۔ ایل۔ بی۔ آفس
آرڈی نینس کلودنگ فیکٹری شاہجہانپور

آبِ حیات اور نہ ستم دیکھتے رہے
ساقی کی ہم نگاہِ کرم دیکھتے رہے
علم و ہنر سدا رہے پیشِ نظر مرے
کچھ لوگ تھے جو جاہ و حشم دیکھتے رہے
محدود جن کی فکر تھی محدود تھی نگاہ
خود کو زیادہ اوروں کو کم دیکھتے رہے
حق پر تھے جو انھیں کو ملیں سربلندیاں
باطل کا سر ہمیشہ ہی خم دیکھتے رہے
موڑا جنھوں نے ظلم و ستم کی کلائی کو
منزل انھیں کے زیرِ قدم دیکھتے رہے

عبدالقیوم شرقت

۱۵/۴ ٹیڑھی بازار، مولوی گنج
لکھنؤ

شکیل صدیقی

ایم آئی جی ۳۱۶، فیز ۲، بکیٹ رائے بریلی
سوان روڈ، لکھنؤ ۱۷

ہندی کہانی: ایک صدی کا سفر

زبان، اسلوب، موضوع اور تکنیک کے مختلف تجربوں سے گزرتی ہوئی ہندی کہانی کا سفر جو ۱۹۰۰ء میں کشوری لال باجپئی کی کہانی "اندومتی" سے شروع ہوا تھا، اپنی عمر کی تقریباً ایک صدی پوری کرنے والا ہے۔ یہ سفر اب اس مقام پر آپہونچا ہے جہاں اسے بلا شبہ ہندستان کے افسانوی ادب کا بہترین سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اپنے اس طویل سفر میں ہندی کہانی نے مختلف موڑوں پر ٹھہر ٹھہر کر پیچھے کی طرف نگاہ ڈالی ہے اور پیش روؤں کے ادبی سرمائے کا بہ نظر غائر جائزہ لیا ہے۔ اس لیے ہندی کہانی میں وقت گزرنے کے ساتھ خوش گوار تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ۱۹۱۶ء میں جب ماہ نامہ "سرسوتی" میں چندر دھر شرما گلیری کی شہرۂ آفاق کہانی "اُس نے کہا تھا" شائع ہوئی تو ہندی کہانی کے خد و خال واضح ہو چکے تھے۔ یہ کہانی اس بات کی بشارت تھی کہ ہندی کہانی کی زمین بہت زرخیز ہے اور یہ بشارت صحیح ثابت ہوئی۔ اس کہانی کے بعد ہندی کہانی کی قوت برابر بڑھتی رہی۔ گلیری کے فوراً بعد جے شنکر پرشاد، سدرشن، جی۔ پی۔ سریواستو وغیرہ کی بہترین کہانیاں منظر عام پر آئیں۔ ہندی کہانی کے اُفق پر نئے نئے دیے روشن ہونے لگے۔ پریم چند اس عہد کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ اس عہد میں انھوں نے اپنی بہترین کہانیاں تخلیق کیں اور کہانی کو داستانی اسلوب نیز طلسمی فضا سے نکال کر اسے واقعیت اور حقیقت کے قریب کر دیا۔ واقعیت اور حقیقت کی عکاسی پریم چند کے یہاں اس کمال اور پر اثر طریقے پر ہوئی ہے کہ فن کہانی کے اظہار کا ایک طاقت ور وسیلہ بن گیا۔

پریم چند کی کہانیاں، ان کے موضوعات اور کردار سب ہماری زبانوں پر ہیں۔ ان پر یہاں اظہار خیال ضروری نہیں۔ اس محل پر صرف یہ بتانا ہے کہ پریم چند ہندی کہانی کے سفر میں کس موڑ پر کس طرح نمودار ہوئے ہیں۔

ان کے معاصر دوسرے اہم کہانی کار ہیں جے شنکر پرشاد، جو بہت اچھے شاعر اور ڈرامہ نگار بھی تھے، تجربے کی بنیاد پر پرشاد کی کہانیاں پریم چند سے مختلف ہیں۔ پرشاد نے کہانی میں اپنے فلسفیانہ شعور کو شاعرانہ قالب میں ڈھالنے کا ناقابل فراموش تجربہ کیا اور کہانی میں شعریت کی آمیزش کر کے اسے نیا انداز عطا کیا۔ پریم چند اور جے شنکر پرشاد کے زیر اثر جن کہانی کاروں نے اس ادبی سفر کو آگے بڑھایا، ان میں وشمبھر ناتھ کوشک، سدرشن، جوالا دت شرما اور اچاریہ چتر سین کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ ہندی کہانی کا پہلا دور ہے۔

ہندی کہانی کا دوسرا دور ۱۹۳۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں مغربی ادب سے کہانی کاروں کی واقفیت بڑھنے لگی۔ فکشن کے عالمی شہ پارے اور نظریاتی نکتے گفتگو کا موضوع بننے لگے، جس کا اثر یہ ہوا کہ ہندی کہانی کار گاؤں کی زندگی سے نکل کر شہری زندگی کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی کہانیوں میں شہر متحرک ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ اب کہانی میں کسان کی بدحالی اور معصومیت کے بجائے شہری انسان کی چالاکیوں اور عیاریوں کو موضوع بنایا جانے لگا اور خاندانی زندگی سے متعلق مسائل کی نفسیاتی موشگافیاں ہونے لگیں۔ جے نیندر کمار، بھگوتی چرن ورما اور بھگوتی پرساد باجپئی اس سلسلے کے ابتدائی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے کہانی کو پریم چند کے بنائے ہوئے دائرے سے باہر نکالا اور اسے نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ جے نیندر کمار کی 'کانک بوا'، بھگوتی چرن ورما کی 'پرائشچت'، 'مغلوں نے سلطنت بخش دی' اور 'دو بانکے' ایسی نفسیاتی اور طنزیہ کہانیاں ہیں جنھوں نے ہندی کہانی میں فرد اور معاشرے کی نئی تعبیروں کو پیش کیا۔

جے نیندر کمار کے بعد الا چندر جوشی اور اگیے کی کہانیوں میں

انسانی نفسیات پہ زیادہ توجہ صرف کی جانے لگی، اور کرداروں کی نیرنگیوں اور بوالعجبیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش میں بعض اچھی کہانیاں منظر عام پر آئیں۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ زبان و اسلوب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئی تکنیکیں بھی اختیار کی گئیں۔ غرض کہ تجربہ کی سطح پر کہانی میں تنوع پیدا ہوا اور اس تنوع نے اپنے عہد میں ایک ممتاز رجحان کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن سماجی حقیقت نگاری کی روایت بھی قائم رہی۔ ترقی پسند تحریک بھی کہانی کو متاثر کر رہی تھی۔

جے نیندر اور اگیے کی کہانیوں نے جو صورت حال پیدا کی اس میں پریم چند کی اہمیت اور معنویت بڑھنے لگی اور کہانی میں سماجی مسائل کی عکاسی میں پریم چند کے موضوعات کی تجدید ہونے لگی، یہ تجدید اس طرح ہوئی کہ پریم چند کے موضوعات میں نئے زاویوں اور رخوں کو دریافت کیا جانے لگا ان نئے رخوں اور زاویوں نے کہانی کو سماجی اور سیاسی موضوعات کی پیشکش کے باوجود اسے پریم چند کے اصل سروکار سے مختلف کردیا۔ کہانی کو اس دور میں نئی شناخت دینے والوں میں بھگت سنگھ کے ساتھی ادیب یش پال کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے پریم چند کے سماجی شعور کو نئی معنویت میں ڈھالنے کی کوشش کی اور ڈپٹی صاحب، دھرم رکچھا، پردہ، پھولوں کا کرتا وغیرہ جیسی کہانیاں لکھ کر سماجی تضادات پر کڑی اور بے رحم تنقید کی۔ فنی سطح پر یش پال کی کہانیاں پریم چند سے زیادہ چست اور تحیر آمیز نظر آتی ہیں۔ انھوں نے زبان اور اسلوب کے متعدد کامیاب تجربے بھی کیے۔

ان رجحانات کے درمیان کہانی لکھنے والوں کا ایک اور اہم قبیلہ بھی موجود تھا۔ اوپندر ناتھ اشک، بھیرو پرشاد گپت، چندر کرن، سون رکشا رادھا کرشن، وشنو پربھاکر، رانگے راگھو، امرت لال ناگر، دیویندر ناتھ مشرا، نرگن وغیرہ نے سماجی و نفسیاتی مسائل کی بیک وقت عکاسی کی ہے اور ہندی کو بعض اہم اور معنی خیز کہانیاں عطا کی ہیں۔ علاوہ اس کے سمترا نندن پنت، مہادیوی ورما، نرالا، نریندر شرما اور ہرونش رائے بچن جیسے شاعروں نے بھی قابل ذکر کہانیاں لکھی ہیں۔ سبھدرا کماری چوہان نے بھی کئی اچھے کہانیاں لکھ کر اپنی موجودگی کا احساس کرادیا۔

آزادی کے بعد ہندی کہانی کا منظر نامہ بہت بدل گیا۔ آزادی سے قبل ملکی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے بعض لرزہ خیز واقعات نے فکری و ذہنی رویوں کو بدل دیا۔ زندگی کے اعلا اقدار پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا خوف، بے یقینی، مایوسی، عدم تحفظ، رائگانی اور زیاں کا احساس بڑھنے لگا۔ اب افکار و اقدار کی نئی طرح سے تعبیر کی جانے لگی۔ اس دور میں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے کئی رجحانات سامنے آئے۔ ایک طرف ایسے فن کار تھے جنھوں نے ان تبدیلیوں کا اثر اس طرح قبول کیا کہ وہ اپنے وجود میں سمٹ کر اپنے اندرون میں برپا ہونے والے انتشار کو پیش کرنے لگے دوسری طرف وہ فن کار تھے جنھوں نے مسائل کی سنگینی سے آنکھیں چار کیں اور حقیقت کو اس کے تمام تنوعات میں دیکھنا شروع کیا۔ حقیقت نگاری کی یہ تعریف بدل گئی کہ کسی واقعے کا من وعن بیان ہی حقیقت نگاری ہے۔ بلکہ یہ کہا جانے لگا کہ کسی واقعے کی تہ میں موجود عناصر کی عکاسی ہی کسی تخلیق کو حقیقی بناتی ہیں۔ مثالیت سطحی جذباتیت اور ناصحانہ انداز ہماری کہانیوں سے غائب ہوگیا اور واقعات کرداروں کو ان کے اصل اور حقیقی پس منظر میں پیش کیا جانے لگا۔ ان الگ الگ سے نظر آنے والے رجحانات میں ایک مشترک بات یہ تھی کہ ہندی کہانی روایتی کہانی سے یا تو مختلف ہونا چاہتی تھی یا روایت کی اس طرح توسیع کرنا چاہتی تھی کہ مروجہ موضوعات میں نئے نئے پہلو پیدا ہو جائیں۔ ان رجحانوں کے زیر اثر لکھی جانے والی کہانیوں میں زبان اور اسلوب کے نئے نئے تجربے کیے گئے۔ قصہ گوئی کی تجدید کی گئی۔ بیانیہ اور کہانی پن پر زور دیا جانے لگا اور موضوع کی پیش کش کیلئے فنی اسالیب کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔

اس طرح تقسیم وطن کے بعد ہندی کہانی نئے آفاق و جہات سے روشناس ہوئی۔ اس بدلے ہوئے منظر میں ہندی کہانی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے زمانے پر محیط ہے اور دوسرا دور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک۔ ان دونوں ادوار کے فرق کو اس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ پہلے دور کے بزرگ اور مشاق افسانہ نگاروں نے تجربوں کی جو زمین ہموار کی تھی دوسرے دور میں پھنیشور ناتھ رینو، موہن راکیش، امرت لال ناگر، امرکانت، کملیشور، راجیندر یادو، بھیشم ساہنی اور مارکنڈے وغیرہ افسانہ نگاروں نے کہانی میں زبان، اسلوب موضوعات اور تکنیک کے جو تجربے کیے تھے نئے قلم کاروں نے ان سے استفادہ کیا اور گزشتہ دو دہوں میں ان قلم کاروں نے ایسی کہانیاں تخلیق کیں جو ہندی کہانی کے روشن ترین افق کا اشاریہ ہیں۔

لیکن افق کی اس روشنی میں کچھ حصہ نرمل ورما، ہری شنکر پرسائی امرت رائے اور شیکھر جوشی کا بھی ہے۔ اتفاق سے چاروں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور کچھ معاملوں میں تو ایک دوسرے کی ضد بھی۔ ٹھیک اسی طرح کرشنا سوبتی بھی اپنے ہم عصروں سے الگ طرح کی کہانیاں لکھ رہی تھیں۔ ان کی بھیشم ساہنی اور موہن راکیش کی کہانیوں پر تقسیم وطن کے المیہ کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں اپنے پہلے کے کہانی کاروں سے الگ شناخت بنانے کی جو شدت نظر آتی ہے وہ ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ کہانی کے میدان میں تحریکیں تو ۱۹۷۰ء کے بعد بھی چلیں لیکن ۱۹۵۰ء کے تھوڑے وقفے کے بعد نئی کہانی کی جو تحریک چلی اس نے بڑے بڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس تحریک کو شروع تو کیا تھا ترقی پسند تحریک سے وابستہ کہانی کاروں نے لیکن شام ڈھلتے ڈھلتے اس کی کمان راجیندر یادو، موہن راکیش اور کملیشور سنبھال چکے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان کے بعد آنے والے کہانی کاروں نے عام طور پر نئی کہانی تحریک کی کمان سنبھالے ان حضرات کا اتنا اثر نہیں لیا جتنا کہ پریم چند کی روایات کو آگے بڑھانے والے افسانہ نگاروں کا۔

پھر ۱۹۷۰ء کے بعد سیاسی و سماجی، خاص کر نکسلی تحریک کا پورے ادب پر بہت اثر پڑا۔ کہانی بھی ان سب سے متاثر ہوئی۔ نتیجے میں کمٹ منٹ وابستگی، عوام دوستی، انقلاب اور سماجی تبدیلی جیسے نظریات کا کہانی میں کافی زور بڑھ گیا۔ نئی کہانی کے جواب میں 'اکہانی'، 'سچیتن کہانی' اور 'سمانتر کہانی' کے آندولن بھی ہندی میں چلے۔ مگر کہانی کی روایتی شکل کو اور اس کے خدوخال میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جا سکی۔ اتنا ضرور ہوا کہ زندگی کے ساتھ کہانی کے رشتے زیادہ مضبوط ہو گئے۔ اس دور میں کئی ایسی اہم اور بامعنی کہانیاں لکھی گئیں جو نہ صرف ہمیشہ زندہ رہیں گی بلکہ جن کے ذکر کے بغیر ہندی کہانی کی تاریخ ادھوری مانی جائے گی۔ ان میں قابلِ ذکر کہانیاں یہ ہیں:

دوپہر کا بھوجن	امرکانت
سطح سے اٹھتا آدمی	مکتی بودھ
لال پان کی بیگم	رینو
بھوسے پہلے	امرت رائے
ہنسا جائی اکیلا	مارکنڈے
ننھو	شیو پرشاد سنگھ
بھولارام کا جیو	ہرسائی
وانگچو	بھیشم ساہنی
جہاں لکشمی قید ہے	راجیندر یادو
پرندے	نرمل ورما
ملبے کا مالک	موہن راکیش
بادلوں کے گھیرے	کرشنا سوبتی
کوسی کا گھٹوارا	شیکھر جوشی
گھنٹا	گیان رنجن
دوزخی	شانی

ہندی کے نئے افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں رجحانات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ان تیزی سے بدلتے رجحانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دہے میں ہندی کہانی میں نئی فکر اور نئے رجحانات سامنے آ رہے ہیں اور ہر آنے والا دہا ہندی کہانی کو پہلے سے زیادہ بامعنی، متنوع اور قوی بناتا جا رہا ہے۔ پچھلے دو دہوں میں ہندی کہانی میں نئے اسالیب سامنے آئے ہیں۔ تکنیک کے نئے تجربے ہوئے ہیں اور موضوعات کا افق پہلے سے زیادہ وسیع ہوا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد قلم کاروں کی جو نئی نسل سامنے آئی اس نے کہانی کو نئے رنگوں اور آہنگوں سے روشناس کرایا۔

فنی سطح پر بیانیہ کی واپسی اور کہانی پن کی تجدید نے کہانی کو کہانی کے روپ میں دوبارہ مضبوط کیا اور اس طلسم کو توڑنے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا کہ ایک نئی طرح کی اسلوب سازی ہی نئی افسانہ نگاری ہے جیسا کہ چند افسانہ نگاروں نے کہانی کے دوسرے دور میں اسلوب سازی اور تجربے کے نام پر مبہم کہانی کو رواج دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کو خواب شرمندہ بنا دینے والی ۱۹۷۰ء کے بعد لکھی جانے والی کہانی میں زندگی کے ٹھوس حقائق بھی موجود ہیں۔ وجود کی معنویت اور لغویت بھی نظر آتی ہے سماجی تضادات بھی جلوہ گر ہیں اور وہ موضوعات بھی ہیں

جو اس سے قبل کی کہانی میں جگہ حاصل نہیں کر سکے تھے۔ ان دہوں میں کہانی زندگی سے زیادہ قریب ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماقبل کی کہانی زندگی سے زیادہ قریب نہیں تھی۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب کہانی کار نے زندگی کو اپنی تمام شکلوں میں دیکھنے کی کوشش کی اور ان شکلوں کو طرح طرح کے اسالیب میں بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے بلکہ بعض شکلوں کے اسالیب کی انفرادیت ہی نے ان شکلوں کو زیادہ اجاگر کیا ہے' آج کا کہانی کار جن موضوعات پر لکھ رہا ہے بظاہر وہ سامنے کے موضوعات ہیں لیکن کہانی کار کے انفرادی رویے اور اس کے تجربے کی ندرت نے ان سامنے کے موضوعات کے معنوی تاثرات کو بدل دیا ہے' اسی لیے ان موضوعات سے نئی جہتیں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی نئے کہانی کار کا کارنامہ ہے۔

شہری تہذیب کا کھوکھلا پن، سماجی نظریوں کی بے معنویت، وجود کی شکست و ریخت، صداقت کی تضحیک، فلسفوں کا ٹکراؤ، جڑوں کی تلاش استحصالی قوتوں کا کھیل، غربت، افلاس، فرقہ واریت، بنیاد پرستی، بڑی طاقتوں کی دراندازی، نیا عالمی نظام، طبقاتی و علاقائی شورش، دہشت گردی، علاحدگی پسندی، عورتوں کے حقوق، نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان بڑھتی دوری، اقدار کے جھگڑے، کنزیومر کلچر، کھلے بازار کی ثقافت، میڈیا کا تشدد اور تیز رفتار زندگی میں ٹوٹتے ہوئے خواب ——— یہ ہیں آج کی نئی ہندی کہانی کے موضوعات۔

شیکھر جوشی، ممتا کالیا، مدرا ارکشش، اوشا پریودا، راجی سیٹھ مہیپ سنگھ، کاشی ناتھ، کرشن بلدیو وید، دودھ ناتھ سنگھ، کاشی ناتھ سنگھ روبیندر کالیا، گری راج کشور، منو بھنڈاری، ابراہیم شریف، ہردیش، اصغر وجاہت، بادشاہ حسین رضوی، نمیتا سنگھ، وجے موہن سنگھ وغیرہ کے بعد جو نسل ان متذکرہ خصوصیات کی حامل ہے اس میں مرنال پانڈے پنکج بشٹ، وشنو ناگر، موہن تھپلیال، شکیل صدیقی، سنجیو، للت کارتیکے شنکر، ہری بھٹناگر، اُدے پرکاش، سرینجے، پریم کمار منی، اکھیلیش، مدن موہن، عبدل بسم اللہ، شیو مورتی، ششانک، منظور احتشام، سیوم پرکاش اور شیلیندر ساگر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ رما کانت، چترا مدگل، اوم پرکاش والمیکی، جیا جدوانی بھی اس دور کی قابل ذکر کہانی کار ہیں۔

اس دور میں جن کہانیوں نے اہم مقام حاصل کیا، ان میں: منڈبیڑ (مدرا ارکشش)، ترشنکو (منو بھنڈاری)، رکت پات (دودھ ناتھ سنگھ)، صدی کا سب سے بڑا آدمی (کاشی ناتھ سنگھ)، کارلو جیشی کا صندوق (رما کانت)، آپ کی چھوٹی لڑکی (ممتا کالیا)، کیک (اصغر وجاہت)، کیا تم نے کسی سردار کو بھیک مانگتے دیکھا ہے (سیوم پرکاش)، ٹوٹتا ہوا بھنے (بادشاہ حسین رضوی)، زمین کا آخری ٹکڑا (ابراہیم شریف)، سالومن کے غنڈے (موہن تھپلیال)، ترچھ (اودے پرکاش) قابل ذکر ہیں۔ تریا چرتر (شیو مورتی)، نیل گائے کی آنکھیں (نمیتا سنگھ)، گھنٹی (ششانک)، چٹھی (اکھیلیش)، واپسی (اوشا پریودا)، توتنے (ہردیش) کامریڈ کا کوٹ (سرینجے)، پھانس (گووند مشرا) اور سدیش دیپک نے 'بال بھگوان' جیسی کہانیاں لکھ کر ہندی کہانی کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا اور اسے نئے تخلیقی تجربوں سے مالامال کیا۔ کہانی کی زبان کافی بدل گئی۔ نئی علامتوں اور استعاروں کا چلن تیز ہوا۔ نئی کہانی کے تقاضے پرانی زبان میں ادا بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۹۸۰ء کے بعد موضوعات کی سطح پر بہ طور خاص بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ صنف نازک کے مسائل، آزادی نسواں کے تناظر میں، برابری کے لیے دلتوں کی جدوجہد، کنزیومر کلچر کے پیدا کردہ خطرے اور اس کے تضادات اور فرقہ واریت کے خلاف اقلیتوں کی حمایت کے شعور نے عصری کہانی میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ ایک طرح سے ہم اسے مقصدیت اور ادب کے سماجی رول کی زیادہ بامعنی تجدید کہہ سکتے ہیں۔ آج کی کہانی اسی سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سلسلے میں سیوم پرکاش کی پارٹیشن، شیو مورتی کی ترشول، اصغر وجاہت کی سب سے مشکل کام، اودے پرکاش کی اور انت میں پرارتھنا، اکھیلیش کی جل ڈمرو مدھیہ اور اوم پرکاش کی والمیکی۔ دودھ ناتھ سنگھ، نمیتا سنگھ للت کارتیکے، چتی سنگھ، ہری بھٹناگر، بادشاہ حسین رضوی، الکا سراوگی، کاشی ناتھ وغیرہ کی کہانیوں نے کافی شہرت اور اہمیت حاصل کی ہے۔

ان تمام کہانیوں کو پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کہانی فن افسانہ کی تمام سمتوں میں مائل بہ ارتقا ہے۔ آنے والی صدی میں جو ترقی کی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہوگی۔ لیکن کہانی کا چہرہ کافی کچھ بدل جائے گا۔ (باقی صفحہ ۴۸ پر)

افسانہ

نسیم بن آسی
محلہ چھارہ، مغل سرا، یوپی

شوپور کی کنچنی

جب سے تتھاگت نے کہا تھا، اس کے سامنے شمشان اُگ آیا تھا — کھوپڑیاں ناچ رہی تھیں ۔ — وہ دیر تک پیڑ کے نیچے بیٹھا اس مارے تتھاگت کے اپدیشوں پر وچار کرتا رہا ،

"اے بھکشوؤ ! مرگھٹ پر جاؤ اور وہاں اس شریر کا اصل روپ دیکھو — بدن کی سُندرتا اور اس کی چمک دمک دیکھو — اور سوچو یہاں آکر یہ تن کیا سے کیا ہو جاتے ہیں ۔ اور ان کا رنگ رُوپ کہاں چلا جاتا ہے ۔ یوون اور سُندرتا مایا کے جال ہیں، جن میں ہم پھنستے ہیں اور دُکھ پاتے ہیں — اس سنسار کے دکھ کا کارن یہی موہ مایا ہے ۔ !"

اس نے آنکھیں کھولیں، چاروں طرف اسے گھور سناٹا نظر آیا سنگھ کے بھکشو ابھی تک نہیں لوٹے تھے ۔ سارے جنگل پر سکوت طاری تھا اور شام کسی بیوہ کی مانگ کی طرح اُجاڑ تھی — اس کے سامنے پھر شمشان اُگ آیا ۔ کھوپڑیاں اس کے گرد ناچ رہی تھیں ۔ وہ ان میں بُری طرح گھِر گیا تھا ۔ کبھی اس کے دل کی دھڑکن مدھم ہو جاتی، کبھی یکایک تیز ۔ سب کچھ بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا ۔ جیسے کوئی پہاڑی ندی بارش ہونے سے پہلے کسی گہرے کھڈ میں ڈوب گیا ہو ۔ !

کھوپڑیاں ناچ رہی تھیں

گاؤں میں طرح طرح کی بھوتوں اور پریتوں کی کہانیاں اس نے سُنی تھیں چھوٹے بچے جب دیر تک گھر نہ لوٹتے تو ان کے گھر والے بھوتوں اور پریتوں کا بیان کر کے انھیں ڈراتے تھے — اس نے پریتوں کو دیکھنے کے لیے ایک بار شمشان میں جانے کی کوشش بھی کی تھی ۔ وہ گیا بھی — لیکن اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنوؤں کو دیکھ کر وہ سہم گیا — شاید بھٹکتی ہوئی آتمائیں منڈلا رہی ہوں — اس کی ہڈیوں میں بھئے سما گیا تھا ۔ پھر وہاں وہ کبھی نہیں گیا — لیکن اتنے دنوں بعد تتھاگت کے اپدیش نے اس کے سامنے پھر شمشان اُگا دیا تھا — اور کھوپڑیاں ناچ رہی تھیں !

آنند نے پھر سنگھ کے بھکشوؤں کو یاد کیا ۔ جو اب تک نہیں لوٹے تھے ۔ اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا ۔ اسے چنتا ہونے لگی — اس نے سوچا، آج کیا بات ہے، بھکشو اب تک کیوں نہیں لوٹے ؟ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا — سنگھ کے بھکشو جب بھی کبھی باہر جاتے تھے، شام ہونے سے پہلے ہی لوٹ آتے تھے ۔ نرجن بن میں اس کا اکیلا من بھئے سے کانپنے لگا ۔ اس نے سامنے دیکھا، جنگل کے گھنے پیڑوں میں اندھیرا اُترتا جا رہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سارا جنگل ڈوبتا جا رہا ہے ۔ اس نے سوچا ۔ یہ اندھیرا بھی کیسا ہے جو ہر جگہ ایک جیسا نہیں ہوتا ہے — شہروں کے اندھیرے میں زندگی انگڑائی لیتی ہے ۔ لوگ اس میں کچھ پلوں کے لیے کھو جاتے ہیں، روشنی سے اکتا کر ان اندھیروں میں کچھ پلوں کے لیے آرام اور شانتی ملتی ہے گاؤں کے اندھیرے میں چوپال جاگتے ہیں اور اس میں کہانیاں جنم لیتی ہیں ۔ کہانیاں جو اندھیروں کو دُور کرتی ہیں اور روشنی پھیلاتی ہیں پہاڑوں کے اندھیروں میں گھور سناٹا ہوتا ہے، جن میں پہاڑ کسی رشی منی کی طرح دھیان میں مگن نظر آتے ہیں — دُور تک کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی ہے، جس سے رشیوں کے دھیان میں کوئی وگھن نہ پڑے ۔ — لیکن جنگلوں کا اندھیرا — ہے پربھو ! جنگلی جانوروں ہی کی طرح ہوتا ہے ۔ بھیانک اور ڈسنے والا — !!

جب سبھا سنگھ کے بھکشو بھی آگئے ۔ آنند نے کہا،
"بندھوؤ ! تم اتنی دیر تک کہاں رہے ؟ جب سے تتھاگت ہمارے بیچ سے گئے ہیں، ہم اپنی راہ سے بھٹک گئے ہیں — اُن کے اُپدیشوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں رہا ۔ انھوں نے ہمارے لیے جو نیم بنائے تھے،

ان کا کوئی پالن نہیں کر رہا ہے۔ اب ہم ناریوں کی طرف دیکھتے ہیں اور ان سے بولتے ہیں۔ ناریاں جو دُکھ دیتی ہیں۔ انھیں سے ہم لو لگانے لگے ہیں۔ تتھاگت نے بتایا تھا کہ ناریاں تریاچرتر والی ہیں۔ ان کے پھندے میں مت پھنسو! لیکن بندھوؤ! کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم تتھاگت کی باتوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ جب ہم ہی ان کے نیموں کا پالن نہیں کریں گے تو دوسرے ان نیموں پر کیسے چلیں گے؟ بندھوؤ! میں کب سے تمھاری باٹ دیکھ رہا ہوں، اور تم لوگ اب آ رہے ہو۔! سچ سچ بتاؤ۔ اتنی دیر سے آنے کا کیا کارن ہے؟

ایک بھکشو بولا۔

"ہے بندھو! ہم لوہے اور پتھر کے نہیں بنے ہیں۔ ہمارے ہاڑ اور مانس ہیں جس کے اندر ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ جو ہر سمے دھڑکتا رہتا ہے۔ اور اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ ہم سنگھ کے بھکشو ایک گاؤں سے بھکشا لے کر لوٹ رہے تھے کہ ہمیں ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ گھنگھرو اور کسی ناری کی مدھر آواز سنائی دی۔ ہم نے دیکھا، گاؤں کے باہر ایک جن باسا لگا ہوا ہے۔ اس کے باہر اور بھیتر لوگوں کی بھیڑ جمع ہے۔ ناری کی آواز کے ساتھ گھنگھرو کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ ہم پر عجب جادو سا ہو رہا تھا۔ دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔ آخر ہم اسی طرف مڑ گئے۔ وہاں دیکھا، ایک سندر اور کومل گاؤں والی ناری تھرک تھرک کر ناچ رہی ہے۔ آنکھیں ہرنی جیسی، بھنویں کمان جیسی، مکھ چندر ماسا، کمر پتلی، لٹ لمبے۔ اس چھریرے بدن والی اپنے گورے گورے انگوں کا ایسا پردرشن کر رہی تھی کہ آنکھیں بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ ہارمونیم اور طبلوں کی تھاپ پر اس نے اپنے عجب عجب کرتب دکھائے۔ جب ہی بھیڑ میں سے کسی نے پان کا ایک بیڑا دکھایا، پھر بھی اس نے ادھر دھیان نہیں دیا۔ تب اس منچلے نے نوٹ بھی دکھایا۔ اس پر وہ ہاؤ بھاؤ سے چل کر اس کے پاس آئی، اور اپنی دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اسے طرح طرح سے رجھانے لگی۔ کچھ دیر تک تو اس منچلے نے اسے بہت پریشان کیا۔ پھر اس نے پان کا بیڑا اور نوٹ دے دیا۔ جنھیں لے کر وہ ویشیا اپنی جگہ پھر آگئی۔ ہارمونیم اور طبلے کے سُر پھر ایک ہونے لگے۔ سورج نے لجا سے اپنا منھ چھپا لیا، اور اندھیرا ہونے لگا۔ ہم بڑی مشکل سے اپنے من پر پتھر رکھ کر وہاں سے چلے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ ہے بندھو! جو کچھ ہم نے دیکھا، وہ اس سنسان جنگل میں کہاں دیکھنے کو ملتا ہے؟ اس ناری نے ہم پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ اب تک ہم اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ ہے بندھو! تو گنی اور گیانی ہے اور ہمارے سنگھ کے بھکشوؤں میں سب سے بہتر ہے اب تو ہی ہمیں راستہ دکھا کہ ہم اپنا پتہ پالیں۔ من بہت بیاکل اور اشانت ہے۔!"

سنگھ کے باقی بھکشوؤں نے بھی ایک ساتھ کہا۔ "ہاں بندھو ہم سب کی ایک ہی گت ہے۔ اور ہم سب بہت دکھ میں ہیں۔!"

یہ سُن کر آنند نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ وہ دیر تک یوں ہی آنکھیں بند کیے رہا۔ ایک بھکشو نے کہا۔

"ہے بندھو! تم اپنی آنکھیں کھولتے کیوں نہیں؟ ہم اندھیرے میں ہیں، اور بھٹک رہے ہیں۔"

آنند نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ دیر تک بھکشوؤں کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور کہا۔

"مترو! یہ سب اس کارن ہے کہ تم تتھاگت کے بتائے ہوئے نیموں کو بھول گئے ہو۔ تم اپنے اندر دیکھنے کی بجائے باہر دیکھنے لگے ہو۔ جہاں ترشنا ہے۔ تم ہر چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھتے ہو، وہاں جاتے ہو، اور پیاسے لوٹتے ہو۔"

بھکشوؤں نے آنند کی باتوں کو دھیان سے سُنا اور چپ ہو رہے جنگل کے اندھیرے میں انھیں اپنے بھیتر گھور سناٹا محسوس ہوا۔ انھوں نے دیکھا جنگل کے اونچے اونچے پیڑ اپنے سروں کو جھکائے اندھیرے میں اونگھ رہے ہیں۔ اور ہوائیں کسی بچے کی طرح ضد پکڑ چکی ہیں اور چلنے کا نام نہیں لے رہی ہیں۔ اس پر بھی کبھی کبھی کوئی پتہ کھڑک جاتا اور جنگل کے سکوت میں ایک بھیانک آواز پیدا ہو جاتی۔ جب ہی انھوں نے کوئی گرج دار آواز سنی۔ پھر چنگھاڑنے کی آواز۔ اس کے بعد جنگلی جانوروں کی ایک ساتھ بہت سی بولیاں۔ جن سے سارے بھکشو یکایک سہم گئے۔ اور وہ ایک دوسرے پر گرنے پڑنے لگے۔ آنند نے کہا۔ "مترو! سنگھ کی دُردشا پر اب چنتا ہونے لگی ہے۔!"

"بندھو! چنتا کا کارن؟"

آنند نے سر اُٹھایا اور کہا — جو جنگلی جانور ہمارا سمّان کرتے تھے اپنی پونچھوں اور پیروں سے ہمارے آشرم کی صفائی کرتے تھے، وہی ہمیں دیکھ کر اب گرجتے برستے ہیں۔ جو بندر ڈال پہ بیٹھ کر ہمارے اپدیشوں کو دھیان سے سنا کرتے تھے، وہی اب ہمیں منہ چڑھاتے ہیں۔ متروا ہم جنگل میں گیان دھیان کے لیے آئے تھے لیکن اب ہم گاؤں اور شہروں کو دیکھنے لگے ہیں۔!"

آنند نے یہ کہا اور چپ ہو گیا — بھکشو سر جھکائے کچھ دیر بیٹھے رہے — اس کے بعد ان میں سے ایک بھکشو بولا —

"ہے بندھو! جو کچھ تم نے کہا۔ وہ ہماری کھوپڑی میں نہیں دھنس رہا ہے۔ جب سے ہم نے اس ناری کا نرت دیکھا ہے، مدرا جیسا نشہ ہونے لگا ہے۔ بندھو! چت بیاکل ہے۔ اب تمھیں ہمیں کوئی پرکاش دکھاؤ۔"

آنند نے اپنے ہاتھ کو اٹھا کر کہا۔

"متروا شانت رہو۔ بُدھ دیو کو یاد کرو۔ دھیرج رکھو، اور جو میں کہتا ہوں، اسے من سے سنو۔ جو ناری کے بس میں ہوتا ہے، اس کے سر میں بھینسے کی بدھی لگ جاتی ہے اور اس کی متی ماری جاتی ہے پھر وہ بھینسے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا ہے۔ سو وہی تمھاری دشا ہے اب تم تتھاگت کے اپدیشوں کو یاد کرو۔ کہ تمھیں دشا ملے۔!"

"ہے بندھو! تتھاگت نے کیا کہا تھا، یہ تو اب ہمیں یاد نہیں رہا۔" ایک بھکشو نے کہا۔

آنند نے کہا — "یہ بہت دُکھ کی بات ہے۔ اچھا سُنو۔"

آنند کے سامنے پھر شمشان اُگ آیا اور کھوپڑیاں ناچنے لگیں۔ اس نے کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بولا،

"متروا آج تتھاگت ہمارے بیچ نہیں ہیں، لیکن ان کا بتایا ہوا مارگ آج بھی ہمارے سامنے ہے جس پر چل کر ہم سپھل ہو سکتے ہیں۔ تتھاگت نے کہا تھا، ہے بھکشوؤ! مرگھٹ پر جاؤ اور وہاں اس شریر کا اصل روپ دیکھو۔ یہ یوون اور سندرتا چھن بھر کے لیے ہیں۔ ایک دن انھیں نشٹ ہونا ہے۔ سو تم اپنی آنکھیں بند کر لو اور مت دیکھو ان کی طرف۔!"

آنند اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک بھکشو بولا:

"بندھو! تم ہم میں سب سے بدھیمان اور گیانی ہو۔ تم جو کہتے ہو اس کا ہم پالن کریں گے۔ لیکن بندھو! یہ بہت کٹھن کام ہے۔ پرکرتی کا نیم ہے کہ جو چیز سُندر دکھائی پڑتی ہے اُدھر من اپنے آپ چلا جاتا ہے — اس سے کوئی نر ناری اپنے آپ کو روک نہیں سکا ہے —!"

آنند نے کہا: "ہے مترا ایسا نہ کہو۔ سنسار میں ایسے بہت سے جن ہیں جنھوں نے اِن نیموں کا پالن کیا ہے۔"

"پر بندھو! ہم اُن میں سے نہیں ہیں، وہ مہا پرش تھے اور ہم چھوٹے لوگ ہیں۔"

"کوئی منش چھوٹا یا بڑا جنم سے نہیں ہوتا ہے — سب اپنے کرموں کا پھل ہے!"

"لیکن بندھو! یہ ہمارے لیے بہت کٹھن ہے۔"

"کچھ کٹھن نہیں!" آنند نے کہا۔

اس پر ایک بھکشو کو تاؤ آگیا، اور وہ کھڑا ہو کر بولا۔

"ہے گُنی گیانی اور مہان! تمھیں اپنے گیان دھیان پر بہت ابھیمان ہے تو سنو — شوپور میں ایک کنچنی رہتی ہے۔ وہ اپنے ڈھنگ کی صرف ایک ہی کنچنی ہے، وہ اتنی سُندر ہے کہ جو کوئی اسے دیکھتا ہے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں، آج تک کوئی اس کے جادو سے بچ نہیں سکا ہے — ایک بار تم وہاں جاؤ ہمیں وشواس ہے، تم بھی اس کے جادو سے بچ نہیں سکتے —!"

آنند نے کہا۔ "پکّی بات ہے! میں ضرور وہاں جاؤں گا۔"

ایک دن آنند نے اپنا بھکشا پاتر لیا اور سوچا، آج اسی گاؤں میں چلنا چاہیے۔ ابھی تک وہ اس گاؤں میں نہیں گیا تھا۔ دیکھنا چاہیے وہ کنچنی کیسی ہے۔ لوگ اس کے جال میں کیسے پھنستے ہیں۔ جنگل سے باہر آکر اس نے ایک پتھک سے شوپور کا راستہ پوچھا۔ پتھک نے ہاتھ کے اشارے سے راستہ بتایا، اور وہ اسی طرف چل پڑا۔ اس نے سمے کا اندازہ لگایا، دوپہر ڈھل چکی تھی۔ کالے کالے بادلوں کی چھایا پڑنے سے کھیتوں کی ہریالی اور گہری ہو گئی تھی — کھیتوں میں اس نے گاؤں کی کچھ الھڑ ناریوں کو دیکھا جو اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے

جھونکوں سے ان کی ساری کا پلّو ان کے سروں سے ڈھلک ڈھلک جاتا تھا جس سے ان کی ناگن جیسی لمبی چوٹیاں کمر تک لٹکتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں جیسے برسات کی پریاں آکاش سے دھرتی پر یکایک اتر آئی ہوں — آنند نے من میں کہا — "ہے بدھ دیو! ہے تتھاگت! شانتی ...... شانتی ...... شانتی ..!
اس نے مُڑ کر پھر ان کی طرف نہیں دیکھا۔

اس نے وچار کیا، ہر منش کے بھیتر کوئی ناری چھپی رہتی ہے۔ کیا اس کے اندر بھی کوئی ناری ہے —؟ اس نے اپنے من کو بہت ٹٹولا پر اس کے بھیتر کوئی ناری تھی ہی نہیں — جب وہ سنگھ میں آیا تھا، اُس کے بھیتر سے ناری نکل چکی تھی۔ اس نے جانا کہ اس کا دل پتھر ہے جہاں کوئی کومل چیز پاس نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی پتھر پر بھی دوب جم جاتی ہے — ایسا نہ ہو، وہ جس پریکشا کے لیے جا رہا ہے، اس میں وہ اسپھل ہو جائے۔ اس نے تتھاگت کے بتائے ہوئے اپدیشوں کو یاد کیا پھر بھی من میں ایک شک بنا رہا — وہ جانتا تھا کہ بڑے بڑے رشیوں منیوں کی تپسیا ان ناریوں نے بھنگ کر دی ہے اور وہ اپنے پتھ سے بھٹک گئے ہیں! اس نے پھر من میں بُدھ دیو کو یاد کیا۔

"ہے پربھو! میری لاج تمھارے ہاتھ میں ہے۔ میری رکشا کرنا۔!"

شام ہوتے ہوتے وہ شو پور پہونچ گیا۔ سورج کی سنہری کرنیں گاؤں کے چاروں طرف پھیل رہی تھیں — اور آس پاس کے ہرے بھرے کھیت اس میں نہا رہے تھے — گاؤں کے نر ناری اپنے کام کاج میں لگے ہوئے تھے۔ آنند بھکشوؤں کے بتائے ہوئے پتے پر اس کنجنی کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا — اس نے دروازے کی سانکل کھٹکھٹائی — کچھ دیر بعد ایک کنجنی بنی سنوری اپنی ڈیوڑھی پر آکر کھڑی ہو گئی — آنند نے اس پر ایک نگاہ ڈالی — صرف ایک نگاہ — اور پھر اپنی آنکھوں کو جھکا لیا — بھکشوؤں نے جیسا بتایا تھا، وہ کنجنی بالکل ویسی ہی تھی۔ وہ اپنا بھکشا پاتر لیے اس کے سامنے کھڑا رہا — کنجنی اسے ایک ٹک دیکھتی رہی — اس ڈیوڑھی پر جانے کتنے آئے اور گئے، لیکن اتنا سندر اور سجل نوجوان اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا — وہ خود اتنی سندر تھی کہ اپنے آگے وہ کسی کو کوئی استھان نہیں دیتی تھی — لیکن آج وہ اس بھکشو کو دیکھ کر خود اس پر موہت ہو گئی۔!

"ناری! جلدی کرو۔ سندھیا ہو گئی ہے اور ہمیں لوٹنا بھی ہے!"
آنند نے بھکشا پاتر اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔

کنجنی بولی۔ "یہ تو ٹھیک ہے، لیکن بھکشو جی! آج کی رات تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ میں تمھاری سیوا کرنا چاہتی ہوں۔!"

آنند کے سامنے پھر شمشان اُگ آیا — اور کھوپڑیاں ناچنے لگیں — اور ان میں وہ بُری طرح گھر گیا۔ اس نے کہا:

"جب سمے آئے گا، تو میں ضرور آؤں گا۔ پر آج نہیں!"

کنجنی یہ سُن کر بہت حیران ہوئی اور بولی — "بھکشو جی! اب وہ سمے کب آئے گا۔ میں نہیں سمجھ رہی ہوں، تم کس سمے کے انتظار میں ہو؟"

"جب وہ سمے آئے گا تو میں خود آ جاؤں گا۔ یہ میرا وچن ہے!"

کنجنی چُپ ہو گئی اور سوچنے لگی۔ "لوگ میرے یہاں ٹھہرنے کے لیے ترستے ہیں، میں انھیں گھاس تک نہیں ڈالتی، لیکن یہ کیسا مورکھ ہے۔؟" وہ اندر گئی اور ڈھیر سے من سے بھکشا لاکر اس کے پاتر میں ڈال دیا۔!

آنند کے جانے کے بعد وہ کنجنی بہت اُداس ہوئی۔ آج کسی نے اس کے رُوپ کو ٹھکرا دیا تھا — اس میں کیا کمی ہے جس کے کارن بھکشو نے اس کے ہاں ٹھہرنے سے انکار کر دیا — وہ سوچ میں پڑ گئی — کیا یہ جوانی پھر آنے والی ہے —؟ بھکشو کو ابھی کس سمے کا انتظار ہے وہ بیاکل من کے ساتھ اپنے کمرے میں لگے ہوئے قدآدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگی۔ اس نے آئینے میں ہر زاویے سے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہی یوون، وہی جوبن — کہ اس کے سامنے آئینہ بھی شرما رہا تھا۔ اس رات اسے نیند نہیں آئی — وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی۔!

سمے کو پنکھ ہوتا ہے — اور وہ اُڑتا رہتا ہے۔ کہیں ٹھہرنے کا نام بھی نہیں لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کی عمر میں سے روز ایک دن کم بھی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھاپے کی دہلیز پر پہونچ جاتا ہے، جہاں وہ خود بھکاری ہوتا ہے، دوسرے بھیک دینے والے ہوتے ہیں۔ اور اکثر بھیک دینے والے کتراتے ہیں — سمے کے ساتھ

اس ویشیا کی جوانی بھی ڈھلتی گئی ــ اور ایک دن وہ بوڑھی ہوگئی ــ اس نے اس بھکشو کو یاد کیا اور من میں کہا ــ "میں تو بوڑھی ہوگئی پر وہ اب تک نہیں آیا ــ اس نے جھوٹا وچن دیا تھا ـ اور اب وہ آکر بھی کیا پائے گا"

وہ پہلے جیسی کنچنی رہی، نہ وہ جوانی کا روپ رنگ ــــ وہ اپنے بدن کو دیکھتی تو اسے بہت دُکھ ہوتا۔ کومل بدن کی جگہ بڑھاپے کی آڑی ترچھی جھرّیوں نے لے لی تھی ـ اس کے ساتھ ہی اسے کوڑھ کا روگ بھی لگ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس پاتی تھی کہ ایک مکھی بھی نہیں اڑا سکتی تھی ــ اس کے بدن پر ہر وقت مکھیاں بھنبھناتی رہتی تھیں۔ اس نے کمرے میں رکھے ہوئے آئینے کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس کھینچی ــ اس کے جسم کی طرح آئینے پر بھی کب کی گرد جم چکی تھی ــ! جو لوگ اسے ایک نگاہ دیکھنے کے لیے ترستے تھے، وہی اب اس سے نفرت کرنے لگے تھے!

لوگوں نے دیکھا، اس ویشیا کے بدن سے کوڑھ اور گندگی کی وجہ سے دُرگندھ اُٹھ رہی ہے جس سے آس پاس کے لوگوں کا رہنا بھی دوبھر ہوگیا ہے ـ کتنے ہی اس ویشیا کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے اور بھگوان کو یاد کرتے ــ پھر ایک دن لوگوں نے اٹھا کر اسے گاؤں سے باہر ایک میدان میں کر دیا۔ گرمی کے دن تھے ـ وہ بوڑھی ویشیا اکیلی ایک پیڑ کے نیچے لیٹی پیاس سے تڑپ رہی تھی ـ کوئی اسے پانی پلانے والا نہ تھا ــ دُھوپ تیز ہو تو ہر چیز آگ کا گولا معلوم ہوتی ہے ـ دوپہر کی اس دُھوپ میں بوڑھی ویشیا کو ہر طرف آگ ہی آگ نظر آ رہی تھی، جیسے ہر طرف چتا دہک رہی ہو ــ یہ کیسا سمے تھا کہ وہ لوگوں کو چاہ رہی تھی اور لوگ اس سے دُور بھاگ رہے تھے ـ لیکن جب وہ جوان تھی تب وہ لوگوں سے دُور بھاگتی تھی ــ تب لوگ پیاسے تھے اور آج وہ خود پیاسی ہے ــ وہ شو پور کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی ـ جس سے اس کی ایک ایک یادیں وابستہ تھیں اور جو صرف اسی کے نام سے مشہور تھا ــــ وہ تصور میں اپنے کمرے کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی ـــ جسے دیکھ کر اب آئینہ بھی ہنس رہا تھا ـ!

اسے اپنے حلق کے پاس کانٹا سا چبھتا ہوا محسوس ہوا اور وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگی ــ پھر دل میں کہا ـ "ہائے کوئی ہوتا جس سے وہ پانی کے لیے کہتی! جب ہی اس نے اپنی طرف کسی کو آتے دیکھا ـ ـــــ جب انسان اکیلا اور دُکھ میں ہو تو کسی بھی آدمی کو دیکھ کر اسے بہت کچھ امید ہو جاتی ہے اور وہ اس کے بارے میں سوچنے لگتا ہے وہ دل میں بہت خوش ہوئی ـ جیسے اِس بھری دوپہر میں اسے بادل کا کوئی ٹکڑا دکھائی دے گیا ہو ـ وہ آدمی اس کے بالکل قریب آگیا۔

بوڑھی ویشیا نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولی:

"تم کون ہو ـ؟"

"میں وہی بھکشو ہوں جو کبھی تمھاری ڈیوڑھی پر آیا تھا ـ میں نے سمے آنے پر آنے کا وچن دیا تھا، سو آیا ہوں ـ"!

"پہلے مجھے پانی پلاؤ ــ پیاس سے میرا دم نکل رہا ہے ـ"

آنند نے اِدھر اُدھر دیکھا، میدان میں کنواں تو ہے، لیکن کوئی ڈور بالٹی نہیں ہے جس سے وہ پانی نکال سکے ـ وہ گاؤں میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد پانی لے کر واپس آگیا۔ ویشیا پیاس سے نڈھال تھی آنند نے اپنے ہاتھوں سے اسے پانی پلایا۔ پانی پینے کے بعد بوڑھی ویشیا کی آنکھوں میں ٹھنڈک آئی اور گلا تر ہوا تب وہ بولی ـ

"بھکشو جی! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی!"

اس پر آنند نے کہا "میں نے وچن دیا تھا، جب سمے آئیگا تو آؤں گا، آج وہ سمے آگیا ہے ـ"

ویشیا حیرت میں ڈوب گئی ــ بولی ـ "بھکشو جی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو اصل سمے تو وہی تھا، جب میں جوان اور سُندر تھی!

آنند کے سامنے پھر شمشان اُگ آیا اور کھوپڑیاں ناچنے لگیں ـ وہ ان میں بُری طرح گھر گیا ــ بولا:

"نہیں کنچنی! اصل سمے وہ نہیں تھا، جب تو جوان اور سُندر تھی ـ جب لوگ تیری ایک ایک ادا پر مرتے تھے ـ وہ تو ایک دھوکا اور چھلاوا تھا۔ جوانی اور سُندرتا کچھ سمے کے لیے ہوتی ہے، پھر ان کا بھی ایک دن انت ہوتا ہے اور منش کا اصل روپ سامنے آجاتا ہے ـ آج تمھارا بھی اصل روپ سامنے آگیا ہے ـ ذرا یاد کرو، پہلے تم کیا تھیں اور اب کیا ہو؛ تمھارا وہ رنگ روپ تمھاری وہ جوانی، تمھاری وہ سندرتا سب کیا ہوگئیں ــ، کیا اب بھی تمھارے چاہنے والے ہیں جو پہلے تھے ـ؟" ــــ آنند یہ کہہ کر چپ ہوگیا ـ لیکن وہ بوڑھی

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "حجابؔ امتیاز علیؒ: حیات اور ادبی کارنامے"
مُصنف: مجیب احمد خاں قیمت: اسّی رُوپئے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

مجیب احمد خاں نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ "حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے" ایم فِل کی ڈگری کے لیے سپردِ قلم کیا ہے۔ جو ۱۲ ابواب اور ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

حجابؔ امتیاز علی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ حجاب بہ یک وقت افسانہ نگار، ناول نویس، انشا پرداز، ڈرامہ نگار اور شاعرہ کی حیثیت سے ہندوپاک میں کافی مشہور و معروف رہی ہیں جنھوں نے ۱۱½ سال کی عمر میں اپنا پہلا رومانی افسانہ "میری ناتمام محبت" تحریر کیا تھا۔ انھیں ادبی ماحول ورثے میں ملا تھا بعد میں سید امتیاز علی تاجؔ جیسے بلند پایہ ادیب کی اہلیہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ گھر کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتے ہوئے انھوں نے تحریر و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور مشہور رسالہ "تہذیبِ نسواں" کی ادارت بھی بحسن و خوبی انجام دیتی رہیں۔ ان کی تخلیقات دُنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری سے عبارت اور رومانیت و منظر نگاری کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔

مجیب احمد خاں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی بے پناہ تلاش و جستجو اور محققانہ کاوش سے اس معروف و مشہور ادیبہ کی حیات اور شخصیت کو اجاگر کرنے میں جو گرانقدر خدمت انجام دی ہے وہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔ کتابت طباعت اور گٹ اپ کے اعتبار سے یہ اچھی کتاب ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کو ادبی حلقے میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوگی۔

——— سلمان علی خاں

نام کتاب: حنظل (افسانوی مجموعہ)
مصنف: بیگ احساس قیمت: ساٹھ روپے
ملنے کا پتہ: ۲/۶۵۹-۳-۶ کپاڈیہ لین۔ سوماجی گوڑہ حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

بیگ احساس کے بارہ افسانوں کا مجموعہ "حنظل" پڑھنے کے بعد ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے آج کے دور میں جب کہ بیشتر افراد کو شکوہ ہے کہ ان کو وہ عزّت و شہرت نہیں ملی جس کے وہ حقیقی طلب گار تھے، بیگ احساس بڑی دیانت داری سے لکھتے ہیں:

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے جتنا لکھا اس سے کہیں زیادہ مجھے شناخت ملی"۔

وجہ یہ ہے کہ بیگ احساس ایک سچے اور کھرے فن کار ہیں، زندگی کی تلخ حقیقتوں کو سمجھنے اور ان کو خوشگوار بنانے کی کوشش کو ہی کامیابی سمجھتے ہیں اسی لیے کامیابیاں ان کی ہم رکاب ہیں۔

عہدِ حاضر کے افسانوی ادب میں جن نئے ناموں کا اضافہ ہو رہا ہے ان میں بیگ احساس بھی بہت جلد اپنا نام شامل کروالیں گے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے اس بات کا یقین ہوتا ہے۔

حنظل میں جو بارہ افسانے شامل ہیں ان میں سب سے کامیاب افسانہ "اجنبی اجنبی" ہے جس سے بیگ احساس کی فن کاری جھلکتی ہے اس میں وہ سب کچھ ہے جو آج کے ایک کامیاب افسانہ نگار سے طلب کیا جاسکتا ہے وہ اگرچہ بیانیہ انداز میں کہانی نہیں لکھتے لیکن ان کی وہی کہانیاں زیادہ موثر ہیں جو کہ بیانیہ ہی ہیں۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ ان کی ہر کہانی بنیادی طور پر کہانی ہوتی ہے۔ اکثر وہ تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں، علامتوں سے کام چلاتے ہیں مگر ان کی زبان ہمیشہ سبک، رواں اور عام فہم رہتی ہے وہ اگر اسی روش پر چلتے رہے تو کامیابیاں ان کے قدم چومتی رہیں گی۔

حنظل نئے افسانہ نگاروں کی روش، رفتار اور سمت کو سمجھنے میں بڑی حد تک معاون ہو سکتی ہے۔

——— احمد ابراہیم علویؔ

نام کتاب۔ "دانت ہمارے ہونٹ تمہارے"
مصنف: رمیش منتری، مترجم: محمد اسد اللہ، قیمت ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ: محمد اسد اللہ معرفت ایم۔ آئی۔ قاضی، پلاٹ نمبر ۱ احباب کالونی
ناگ پور۔ ۱۳

"دانت ہمارے ہونٹ تمہارے" مراٹھی مصنف رمیش منتری کی ۱۰ مقبول مزاحیہ وطنزیہ کہانیوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ غالباً مراٹھی زبان کے کسی ادیب کی منتخب مزاحیہ کہانیوں کا اُردو میں شائع ہونے والا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ مراٹھی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے ترجمہ کے محاسن ومعائب کی نشاندہی کرنا اور یہ فیصلہ کرنا کہ مترجم کہاں تک مصنف کی روحِ تخلیق تک رسائی حاصل کر سکے ہیں ممکن نہیں ہے لیکن مترجم کی تحریر رواں، شگفتہ اور دلچسپ ہے اس میں مزاح کی چاشنی اور طنز کی نشتریت موجود ہے۔

کہانیوں میں عصری مسائل، سیاسی پستی وبے حسی، دفتر شاہی، مفاد پرستی، معاشرتی ناہمواری اور زوال پذیر تہذیبی اقدار وغیرہ پر دلچسپ تیکھے انداز میں اور معنی خیز اشاروں میں طنز وظرافت کے تیر چلا کر اصلاح کی کوشش اور لطیف انداز میں سماج کے ہر طبقے کی کمزوریوں کو اجاگر کر کے خود احتسابی اور اصلاح معاشرہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

اُردو ادب کے دامن کی کشادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں مختلف علاقائی وصوبائی زبانوں کے تراجم کا اضافہ بہرحال مستحسن قدم ہے۔

—— عرفان عباسی

نام کتاب: "مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر"
مصنف: علیم صبا نویدی   قیمت: اسی روپے
ملنے کا پتہ: ۲۹۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماونٹ روڈ
مدراس ۶۰۰۰۰۲

علیم صبا نویدی جانے پہچانے ادیب وشاعر ہیں۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی اشاعت بیشتر رسائل میں ہوتی رہی ہے۔ "مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر" ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ نویدی نے باقر آگاہ کے نثری دیباچے اور غزلوں کا انتخاب کر کے اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔

باقر آگاہ پر نویدی کا تنقیدی مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، جس سے دلچسپ اور اہم گوشے سامنے آتے ہیں۔

"آگاہ شمالی ہند کے اپنے معاصرین میں سودا کو اپنے سے کمتر گردانتے تھے۔ انھوں نے آزاد بلگرامی جیسی ادبی جید شخصیت سے مورچہ لیا۔"

اُردو ادب میں علمی وادبی معرکے تو بہتوں کے درمیان ہوئے ہیں، یہ کوئی سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ باقر آگاہ اپنے دور کے گراں قدر شاعر وادیب بھی تھے اور ایک نقاد بھی لیکن ان کے ادبی کارناموں پر کوئی جامع کتاب تو کیا، بیشتر تذکرہ نگار بھی خاموش ہیں۔ یہ ایک سوالیہ نشان ضرور ابھرتا ہے جس کی وجہ کچھ بھی ہو، پھر بھی آگاہ کے علمی وادبی مقام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نثری دیباچے ان کے تنقیدی شعور اور نقطۂ نظر کی نشاندہی کرتے ہیں مگر ان کے معاصرین کے مقابلے میں ان کی غزلیں دل کو نہیں چھوتیں لیکن ان کی رباعیاں اور مثنویاں اپنی اہمیت کا ضرور احساس دلاتی ہیں جن میں مضامین کے تنوع کے ساتھ تخیل کی ندرت بھی ہے اور زبان وبیان کی برجستگی بھی۔

علیم صبا نویدی کی یہ تدوین طالبان ادب کے لیے ایک اہم وگراں کارنامہ ہے جس سے آگاہ شناسی کے لیے نئی راہیں روشن ہوں گی۔

—— اختر مہدی

نام کتاب: نعت رنگ (نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ)
ترتیب وتالیف: صبیح رحمانی   قیمت ۱۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: پنجاب بک ہاؤس۔ اُردو بازار۔ کراچی
(پاکستان)

نعت گوئی اُردو شعر وادب کا ہمیشہ سے اہم ترین اور مقدس ترین موضوع رہا ہے۔ عربی وفارسی کے دامن میں نعتوں کا سرمایہ زیادہ سہی مگر اُردو شاعری نے بھی اپنی کم عمری کے باوجود اس کارِ خیر میں کوتاہی نہیں کی۔ قدیم وجدید شعراء میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے بارگاہ رسالت میں نعتیہ اشعار کا نذرانہ نہ پیش کیا ہو۔

ضرورت تھی کہ نعتیہ ادب کا پوری علمی دیانت اور ایمانی بصیرت کے ساتھ تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اس کی مذہبی اور ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے ساتھ "جادۂ نعت" کے پیچ و خم کی نشان دہی بھی کی جائے تاکہ نعت گوئی کے رجحان میں اضافے کے ساتھ اسے انحرافات سے بچایا جاسکے۔

صبیح رحمانی نے اس موضوع پر کتابی سلسلہ قائم کرکے بلاشبہ ایک مبارک کام کیا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ (نمبر ۲) ایک جریدہ ہونے کے باوجود مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں نعت گوئی سے متعلق بصیرت افروز مقالے بھی شامل ہیں اور مختلف اسلوب و ہیئت میں نعتوں کا قابلِ قدر انتخاب بھی۔ ساتھ ہی ساتھ شعراء کے نئے تجربے بھی اس کا وقار بڑھا رہے ہیں۔ البتہ ہندستانی شعراء کی نمائندگی برائے نام ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تالیف کو ایک ہی حلقے کے اہلِ قلم میں محدود رکھا گیا ہے جو ایک وسیع النظر قاری کو کھٹکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ترتیب کار کے مکتبۂ فکر کی بھی مجبوری ہو۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ یہ مفید سلسلہ اپنی افادیت کے ساتھ نعت گو شعراء کی تربیتِ فکر و فن کا ذریعہ بھی ہے۔ مؤلف کی اس خدمت کا اعتراف نہ کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

——— ڈاکٹر پیام اعظمی

نام کتاب: ماہنامہ گلہائے خنداں رامپور (اکتوبر ۱۹۹۶ء)
قاضی مشتاق احمد: فن اور شخصیت نمبر
مدیر: ذکی قیصر — قیمت: پندرہ روپے
ملنے کا پتہ: گلہائے خنداں۔ محلہ کلکتہ۔ رامپور ۲۴۴۹۰۱
(یو۔پی)

قاضی مشتاق احمد ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے ہندستان کے مشہور رسائل میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔

ان کے افسانوں میں عام زندگی کے مسائل بھی ہیں۔ ماحول کی عکاسی بھی اور روزانہ پیش آنے والے واقعات بھی۔ موضوع کی اسی ہمہ جہتی نے ان کو شہرت ہی نہیں مقبولیت بھی دی ہے۔ قاضی صاحب نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ان کی فنی حیثیت کا تعین کیا جائے مدیر "گلہائے خنداں" کا یہ عمل قابلِ تحسین ہے کہ ان کی کاوشوں سے قاضی مشتاق احمد فن اور شخصیت نمبر منظرِ عام پر آیا۔

ابتدا میں مدیر نے اپنی بات کہی ہے جس میں قاضی صاحب کا مختصر سوانحی خاکہ اور ان کے فن کا تجزیہ ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں پانچ مضامین ہیں جن میں قاضی صاحب کا خاندانی پس منظر بھی ہے سوانحی نقوش بھی اور ان کے افسانوں کا تجزیہ بھی۔ جوگیندر پال اور انیس دہلوی وغیرہ کے تاثرات بھی۔ کچھ مشاہیر کے خطوط بھی ہیں، جن سے قاضی صاحب کے فن پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ چند قطعات کے ذریعہ دلدار ہاشمی نے قاضی صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے آخر میں مدیر نے ان کے تین نمائندہ افسانے بھی شائع کردیئے ہیں تاکہ قارئین خود ان کو پڑھ کر اپنی رائے قائم کریں۔ امید ہے کہ یہ شمارہ مقبولیت حاصل کرے گا حالاں کہ کہیں کہیں ناقص طباعت احساسِ جمال کو مجروح کرتی ہے۔

——— شکیب رضوی

نام کتاب کلامِ قمر (نعتیہ کلام)
شاعر: قمر مصطفوی شمس آبادی — قیمت: دس روپئے
ملنے کا پتہ: شبیر احمد قریشی متصل جامع مسجد بہران پور کٹرہ
شاہ جہاں پور

کلامِ قمر، قمر شمس آبادی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جس میں نعتیں سلام اور بزرگانِ دین کے اوصاف پر کہی گئی نظمیں شامل ہیں۔ ان کے دوسرے نعتیہ کلام کے مجموعے 'توشۂ آخرت'، 'سامانِ جنت'، 'گنجینۂ ارم'، 'رحمتِ عالم'، 'شعلۂ عشق'، 'جذبۂ دل' اور 'نغماتِ قمر' شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں جو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔

تصنیف میں شہیدانِ کربلا اور درشانِ حضرت معین الدین چشتی اجمیری کے بارے میں بھی نظمیں موجود ہیں کچھ قطعات بھی شامل کتاب ہیں۔ کلام سلیس اور عام فہم ہے جو جذبۂ عقیدت سے پُر ہے۔

دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

وجود تھا کن فکاں سے پہلے ظہور تھا ہر عیاں سے پہلے
جمالِ احمدؐ چمک رہا تھا زمیں سے پہلے زماں سے پہلے

صاحبِ نورِ یزداں پہ لاکھوں سلام
ہادیٔ اہلِ قرآں پہ لاکھوں سلام

——— ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

نام کتاب : "نوائے امروز"
شاعر : ناوک حمزہ پوری قیمت : ۱۵ روپئے
مرتب : حکیم رازی ادیبی اشرفی
ملنے کا پتہ : تکلم پبلی کیشنز ۵۷۲، ساچاپیر اسٹریٹ
پونہ۔ ۴۱۱۰۰۱

ناوک حمزہ پوری بزرگ شاعر ہیں۔ رباعی گو کی حیثیت سے وہ خاصے معروف ہیں۔ صنفِ رباعی نہ صرف مشکل صنف ہے بلکہ قادر الکلامی کی بھی متقاضی ہے۔ کچھ مدت سے اس طرف شعراء نے پھر اپنی توجہ مبذول کی ہے اور رباعی کے مجموعے منظرِ عام پر آنے لگے ہیں۔ ویسے تو حیات و کائنات کی تمام وسعتیں اس صنف میں سمٹی ہوئی ہیں۔ مگر ہنگامی واقعات و حالات کا عکس کم ملتا ہے۔ نوائے امروز کی بیشتر رباعیاں اسی عکس سے جگمگا رہی ہیں۔ بعض مسئلوں کو طنز و ظرافت کے ذریعہ ابھارا گیا ہے۔ آغاز میں حمد، نعت اور منقبت کے زیرِ اثر رباعیات ہیں۔ جیسے یہ نعتیہ رباعی ؎

تخلیق کا بے مثال شہکار رسولؐ
توحید کا پُر جلال اظہار رسولؐ

روشن ہے حضورؐ سے شعاعِ ہستی
لاریب ہیں سرچشمۂ انوار رسولؐ

نوائے امروز کا مطالعہ قاری کو زندگی کی ظاہری چمک دمک اور مادیت کے غلبے سے پیدا ہونے والے مضر اثرات سے باخبر کرتا ہے۔ یہی شاعر کی کامیابی ہے۔

——— جاوید جمشیدی

نام کتاب : "وارث اور محبت"
مصنف : امیر حمزہ اعظمی قیمت : پندرہ روپئے
ملنے کا پتہ : ایس ایس ساؤنڈ سروس۔ آستانہ روڈ، دیوی شریف
بارہ بنکی

اسلام نے اپنے پرستاروں کی تعلیم کی بنیاد محبت پر رکھی ہے اور محبت ہی کے سبب انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسلام اور رسولِ اسلامؐ نے محبت کا جو پیغام دنیا کو دیا ہے حاجی وارث علی شاہؒ اسی محبت کا عملی نمونہ تھے۔ وہ بغیر کسی بھید بھاؤ کے انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔ ان کا قول تھا، "محبت کرو ... بے محبت خدا نہیں ملتا... اگر محبت کامل ہے تو ایمان بھی کامل ہے اور اگر محبت ناقص ہے تو ایمان بھی ناقص ہے"۔

حضرت وارث علی شاہ کے اسی پیغامِ محبت کو مزاح نگار، شاعر اور خطاط امیر حمزہ اعظمی نے کتابی شکل دی ہے۔ حضرت وارث علی شاہ کی حیات اور ان کے پیغامات سے متعلق مختلف کتابیں اب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ لیکن امیر حمزہ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس مخصوص موضوع کے شایانِ شان اسلوبِ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ ان کی زبان میں صوفیانہ شان ہے۔ یعنی سیدھی سادی، تکلف سے پاک زبان لیکن نہایت ہی دل نشین انداز میں بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں دستیاب تقریباً تمام کتابوں سے ان اقوال کے سلسلے میں استفادہ کیا گیا ہے جو حضرت وارث علی شاہ سے منسوب ہیں اور عشق و محبت سے متعلق ہیں۔

حاجی وارث علی شاہ قومی اتحاد کے کتنے بڑے علمبردار تھے اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ان کا مزارِ پاک آج بھی قومی اتحاد کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہمارے ملک کو قومی اتحاد کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ کچھ طاقتوں نے نفرتوں کا زہر پھیلا کر ملک کے ماحول کو آلودہ کرنا اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ ایسے ماحول میں امید ہے صاحبانِ دل محبت کے پیغام پر مشتمل اس کتاب کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

——— شیبا افتخار

رپورٹ : مسز شہانہ سلمان
اے - ۳/۳ ، پیپر مل کالونی ، لکھنؤ - ۶

اسرار الحق مجاز کی اکتالیسویں برسی کی ایک جھلک :

ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا طلب گار ہوں میں

عشق ہی عشق ہے دُنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

اسرار الحق — ایک ایسی پُر اسرار شخصیت کا نام ہے جس نے "مجاز" ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ حقیقت کو شرمندۂ وجود کیا۔ مجاز کی زندگی اور موت دونوں میں دوسرے ہندسوں کو برابر کا دخل حاصل ہے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں وفات ہوئی اور چوالیس برس کی عمر پائی۔ لیکن اس عمر میں وہ "شاعرِ رومان"، "شاعرِ انقلاب"، "شاعرِ شہر نگاراں" اور جانے کن کن القاب و آداب سے نوازے گئے۔ ترقی پسند تحریک کی شمولیت نے ان کی مقبولیت اور شہرت میں مزید چار چاند لگا دیئے۔

۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء مجاز کا یومِ وفات ہے جس کی مناسبت سے مشہور ادبی، ثقافتی اور سماجی تنظیم "اُردو سماج" ہر سال ۵ر دسمبر کو "یومِ مجاز" کا انعقاد کرتی ہے۔ امسال مجاز کی ۴۱ ویں برسی کے موقع پر بھی ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ تقریب دو حصّوں پر مشتمل تھی، پہلے شرکاء اردو سماج کے دفتر اے - ۳/۳ پیپر مل کالونی میں جمع ہو کر نشاط گنج قبرستان میں مجاز کی قبر پر فاتحہ خوانی اور گل پوشی کے لیے پہونچے تو ایسا محسوس ہوا کہ ان کی تنہائی میں خلل پڑ گیا ہو۔ حالانکہ وہاں بھی وہ تنہا نہیں ہیں۔ داہنے پر ان کی والدہ ماجدہ اور بائیں ان کی دلاری بہن صفیہ اختر (زوجہ جاں نثار اختر مرحوم) انھیں لوریاں دے کر سلاتی رہتی ہیں۔ درحقیقت مجاز کی آنکھیں سوتی رہتی ہیں لیکن ان کا دل ہمیشہ جاگتا رہتا ہے اور انکی قبر پر آویزاں سنگی کتبہ چیخ چیخ کر زبانِ حال سے ہر وقت یہ صلائے عام دیتا رہتا ہے ؎

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

یومِ مجاز کا دوسرا حصّہ ان کی زندگی، سیرت، شخصیت، فن اور کلام کے تجزیے سے متعلق تھا۔ یہ دونوں جلسے اس لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئے تھے کہ ان میں مجاز کے دیرینہ دوست، ہم عصر، ہمدرد اور صحیح معنوں میں مداح جناب منظر سلیم نے از اوّل تا آخر اپنی قلبی بیماری کو دیگر شرکاء سے پردۂ اخفا میں رکھ کر شرکت کی اور ۷ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو آخر اس بیماریٔ دل نے "اُن کا کام تمام کیا"۔

منظر صاحب نے اپنے سلسلۂ کلام کے دوران مجاز کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی معصومانہ بیباکی اور بہادری کی مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے بتایا کہ مجاز کی شاعری کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء تک کے عرصے میں صرف ایک نظم لکھی۔ لیکن ان کے کلام کی تازگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کسی اُردو شاعر کو اپنی زندگی میں اتنی زبردست مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

جلسے کے صدر مسٹر جسٹس سید حیدر عباس رضا نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہیگل اور مارکس نے سماج کی تشکیل کا جو نظریہ پیش کیا اس کے تحت انسانی فکر کے تضاد سے سماج کا قیام عمل میں آیا۔

ورڈس ورتھ کی نیچرل شاعری اور کیٹس کی غنائیت سے بھرپور شاعری اور بائرن کی جذبات سے مغلوب شاعری نے مجاز کے ذہن و فکر پر بہت گہرے

تاثرات چھوڑتے ہیں۔ انھوں نے مجاز کی نظم "رات اور ریل" کا شیلی کی نظم "اسکائی لارک" سے موازنہ کرتے ہوئے نظم کا تجزیہ یوں کیا کہ زمین کو نیچے چھوڑ کر آسمان کی سمت بڑھ رہی ہے۔ بالکل اسی طرح ریل رات میں تمام سماجی برائیوں، معاشرے کی خرابیوں اور خامیوں اور ماحول کی کثافتوں کو پس پشت ڈال کر چیختی، چنگھاڑتی، انقلاب کی سمت لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ جسٹس حیدر عباس نے مزید کہا کہ میرے خیال میں مجاز کی شاعری رومان اور انقلاب کا عطر مجموعہ ہے جس کو ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

اُردو سماج کے بانی جنرل سکریٹری اور یوم مجاز کے منتظم ڈاکٹر سلمان عباسی نے مجاز کی خوش سلیقگی، خوش اطواری، خوش اخلاقی اور ان کی بذلہ سنجی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اپنا بھرپور خراج عقیدت پیش کیا اور کارروائی کو آگے بڑھانے کے لیے محترمہ پروین طلحہ (آئی اے ایس) کو اظہار خیال کی دعوت دی جو اس جلسے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں روسی زبان کی پروفیسر اور ہندستانی وغیر ملکی زبانوں کے انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹر ڈاکٹر صابرہ حبیب، مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر بشیشر پردیپ، پروفیسر اشفاق احمد (سبک دوش صدر شعبۂ اُردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) نے بھی مجاز کی حقیقت کو اپنے لفظوں کے ذریعے آئینہ دکھاتے ہوئے انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔ شعبۂ عربی و عرب کلچر کے استاد ڈاکٹر شاہ عبدالسلام فاروقی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، محترمہ زیبا صلاح الدین، محترمہ صفیہ قدوائی، روشن تقی، خان محمد عاطر، عبدالرؤف خاں مولانا شاہد اور قمر گونڈوی نے مجاز کی شاعری میں جا بجا بکھری ہوئی خوبیوں اور خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اسے جذبے کی صداقت اور جوش و خروش کا ایک ہمہ رنگ گلدستہ قرار دیا۔

ہندی کہانی

صفحہ ۳ کا بقیہ

اسے بچانے کے لیے کہانی کاروں کو زبردست جدوجہد کرنی ہوگی، کیونکہ کہانی کئی طرح کے خطرات سے گھرتی نظر آرہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہانی طویل ہو کر ناول بن جائے اور ناول کے امکان کمزور پڑ جائیں۔ کہانی مختصر ہو کر افسانچہ کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے۔ موجودہ دور میں دونوں ہی شکلوں کی معنویت اور افادیت ہے۔ غالباً اسی سبب سے چند بہت اہم کہانی کاروں نے ادھر کے سالوں میں اس طرح کے تجربوں کو رواج میں لانے کی کوشش کی ہے۔

بہر حال اُردو افسانہ کی مانند ہی ہندی کہانی کو بھی الیکٹرانک میڈیا کے شدید حملوں اور قاری کے قحط کا سامنا ہے۔ پریم چند اب بھی اس کے لیے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ □□

غزل

دل کیا کیا کہتا ہے، کیا کچھ پاتا ہے
اس عالم میں سب کچھ بھولا جاتا ہے

تیرے راہی تھک کر گرتے جاتے ہیں
تو اوروں کی راہ میں پھول بچھاتا ہے

حیرت سے کیا دیکھیں تیری جانب ہم
صادق، سچی باتوں کو جھٹلاتا ہے

لوٹائے جاتے ہیں سب دریوزہ گر
کس کا دامن ہے جو پھیلا جاتا ہے

چپ رہنے والے بھی مارے جاتے ہیں
چلّانے والا بھی جان گنواتا ہے

خالد عبادی

ایڈیٹر 'زبان و ادب' بہار اُردو اکادمی
اشوک راج پتھ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

جلد ۵۱ نمبر ۱۲



عنوانات

اپنی بات ـــــــ ایڈیٹر ـــــــ ۲

کوئی دستک نہیں دیتا لیکن (نظم) ـــــــ باقر مہدی ـــــــ ۳

یادوں کی رہ گزر (۹) ـــــــ علی جواد زیدی ـــــــ ۴

ہونے اور نہ ہونے کے درمیان (نظم) ـــــــ فیاض رفعت ـــــــ ۱۲

تنقید غالب کا ایک فقرہ ـــــــ عابد پیشاوری ـــــــ ۱۳

غزل ـــــــ ولی الحق انصاری ـــــــ ۱۵

غزل ـــــــ تبیکل آتاہی ـــــــ ۱۵

اختر الایمان کے خطوط ـــــــ غلام رضوی گردش ـــــــ ۱۶

بہانے (نظم) ـــــــ شورش صدیقی ـــــــ ۲۵

ثلاثی (نظم) ـــــــ اس زیدی ـــــــ ۲۵

اخبار بینی (نظم) ـــــــ غضنفر ـــــــ ۲۵

آسودہ حالی (افسانہ) ـــــــ ترجمہ: احمد نسیم صدیقی ـــــــ ۲۶

عبدالباری فرنگی محلی اور موتی لال نہرو ـــــــ ظفر حیدری ـــــــ ۳۰

مہوش (کہانی) ـــــــ سید انور سعید ـــــــ ۳۹

امرتا پریتم سے ایک ملاقات ـــــــ سید احمد قادری ـــــــ ۴۲

سنہرا خواب (نظم) ـــــــ سمیر نگہ بھدوریا ـــــــ ۴۳

نقد و تبصرہ

بنت مسعود ۔ اقبال مجید ۔ شبنم نقوی ـــــــ ۴۴

عشرت ظفر ۔ امیر احمد صدیقی ـــــــ تا

ایس۔ ایم۔ عامر، ناظم جعفری ـــــــ ۴۷

شمس الرحمان فاروقی کو سرسوتی اعزاز ـــــــ سید امجد حسین ـــــــ ۴۸

اپنی بات

یہ موسم بہار ہے۔ خزاں رخصت ہوئی، نئی کونپلیں پھوٹیں اور شگوفوں سے چاروں طرف فضا مہک اٹھی۔ اس بہار کو مزید پُرمسرت بنانے کے لیے رنگوں کا تہوار منایا جاتا ہے جسے ہولی کہتے ہیں۔ یہ اتفاق بھی تاریخی طور پر ہمارے ملک میں بڑا معنی خیز ہے کہ حق و صداقت کے پیکر کو آگ نہیں جلا سکی۔ اب یہ چاہے سرزمینِ عرب کا واقعہ ہو یا اپنے ملک ہندستان میں بھگت پرہلاد کی کہانی ہو۔ یہ واقعہ اس اٹل سچائی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیاوی آگ جل بجھ کے خاک ہو جاتی ہے لیکن حق و صداقت کی شمع روشن رہتی ہے۔

یہ تہوار ایک رُخ سے بہت ہی اہم ہے۔ رنگ و نغمہ کا یہ تہوار ہمارے اُردو شعراء کے لیے بھی ہمیشہ دل کش رہا، چنانچہ اہم شعراء میں میر صاحب نے ع ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر والی مثنوی لکھی۔ اودھ کی سرزمین کا یہ امتیاز بھی یادگار رہے گا کہ یہیں کے حکمراں نے اپنی ہولی کو ایسی اہمیت عطا کی کہ اُردو کا شاعر اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ عوامی سطح پر جب بھی ہولی قریب آتی ہے تو نظیر اکبرآبادی ع پھر دیکھ بہاریں ہولی کی سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محترم علی جواد زیدی کا لافانی مصرع "وہ ہولیاں ہی اور تھیں" سیاسی تناظر میں پوری تاریخ سُنا دیتا تھا۔ پیار و محبت سے گلے ملنے کا اور رشتوں کے خوش گوار اظہار کا یہ تہوار سب کو مبارک!

اسی مہینے میں ایسٹر اور گڈ فرائی ڈے کے تہوار بھی پڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریبات کے موقع پر بھی یہی دُعا ہے کہ یہ دونوں تہوار صرف عیسائی بھائیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے لیے امن و آشتی کا پیغام بن کر آئیں۔

ماہ و سال کی گردش میں نیا دور نے جس طرح پوری ادبی دُنیا کو متوجہ کیا ہے وہ ہمارے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔ صوری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ اس کی اشاعت میں باقاعدگی آ گئی ہے۔

"فراق، صدی کی آواز" کے بارے میں فی الحال صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ یادگاری مجلہ اُردو صحافت کی تاریخ میں منفرد اور ممتاز سمجھا گیا اور یقینی طور سے یہ صدی کی آواز بن گیا۔

"جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں"

پروفیسر منظر اعظمی (جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے) اُردو تحقیق کا روشن ستارہ تھے۔ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر بھی رہ چکے تھے اور وہیں سے سبک دوش بھی ہوئے تھے مگر شعبہ سے یو. جی. سی کے پروجیکٹ کے تحت وابستہ تھے تمثیل نگاری اور علامت نگاری کے موضوع پر وہ مستند عالم تھے۔ ان کا اچانک سانحۂ ارتحال پوری اُردو دنیا کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ادارہ نیا دور ان کے پس ماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہے اور دُعا کرتا ہے کہ خداوندِ عالم انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ایڈیٹر

کوئی دستک نہیں دیتا لیکن ؟

(سلطانہ ایمان کے نام)

باقر مہدی

اے/۱۔ سعدی کاٹیج
کاٹر روڈ
باندرہ
ممبئی ۔ ۴۰۰۰۵۰

بند دروازے ہیں
اور ـــ جالی پہ لگا ہے تالا
میں گزرتے ہوئے لمحوں کی طرح
رُک رُک کے چلا جاتا ہوں !
جب مکیں ہی نہ رہا
کون بُلائے گا مجھے ـــ !

پھر بھی بے چینی سی رہتی ہے مجھے
کیا پتا کوئی صدا آجائے !
"آؤ ـــ اندر آؤ ـــ اک نظم سُنو
ابھی پُوری نہیں ـــ میں پھر بھی سُناتا ہوں تمھیں !"

کتنے دن بیت گئے ـــ آئی نہ کوئی آواز ؟
اور میں رُک کے کھڑا ہوں ـــ کب سے ؟

گزرے لمحے ـــ مجھے پہچان کے
آواز بھلا کیوں دیتے ؟
اک خلش باقی ہے ـــ دل میں اب تک
ـــ کاش ـــ سلطانہ بُلالے مجھ کو
یہ بھی معلوم نہیں
جانے وہ کب آئے گی ؟

(یہ نظم اختر الایمان کی پہلی برسی کے موقع پر لکھی گئی ـــ ب۔م)

علی جواد زیدی
۱۸۹/۳- وشواس کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

یادوں کی رہ گزر

—— (۹) ——

جیل میں ایک قیدی کی موت' اور وہ بھی ایسے مرحلے پر جب وہ میعاد قید تمام کر کے، دو چار دن میں رہا ہونے والا تھا' یقیناً ایک بڑا المیہ تھا۔ اس نے ہم کو گہری فلسفیانہ سوچ پر مجبور کیا۔ دو چار دن تک جرم و سزا پر فلسفیانہ اور نظریاتی بحثیں ہوتی رہیں۔ قیدیوں میں کچھ گاندھیائی فلسفہ سے متاثر تھے۔ ہم جیسے نوجوانوں پر مارکسیت کا اثر نسبتاً زیادہ تھا گاندھیائی کہتے کہ مقصد تو نیک ہونا ہی چاہیے لیکن حصول مقصد کے لیے جو ذرائع استعمال کیے جائیں انھیں بھی صالح ہونا چاہیے۔

مارکسی کہتے کہ نیک مقصد کے حصول کے لیے جو ذریعہ یا رویّہ استعمال کیا جائے وہ درست ہے اگر درشت یا بادی النظر میں غیر صالح رویّہ اختیار کیے بغیر ظلم و استحصال کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور کوئی حکمت عملی ناگزیر ہو جاتی ہے تو اس کے اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے مقصد اور وسیلے یا ذریعے کی یہ بحث پرانی ہو چکی ہے لیکن اس موقع پر بھی یوں اُٹھی کہ عام قیدیوں سے قریبی رابطے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان میں کچھ ایسے تھے جنھوں نے کوئی جرم حالات سے مجبور ہو کر کیا تھا یا وقتی طور پر۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا مجرم مستحق سزا نہیں ہے۔

ضمناً یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ہمیں جرم سے نفرت کرنا چاہیے مجرم سے نہیں۔ میں نے شیخ سعدیؒ کا یہ مقولہ بھی بحث میں پیش کر دیا کہ:

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"

(جس سچ سے فتنہ اُٹھ کھڑا ہو' اس سے تو وہ جھوٹ بہتر ہے جو مصلحتاً بولا گیا ہو!)۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ جو سماج یا طبقہ ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ ارتکاب جرم کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تو سماج مجرم ہے یا بیمار ہے اس لیے سماج یا تو علاج یا پھر سزا کا مستحق ہے۔ فرد اور سماج کی ذمہ داریوں کا سوال بھی اٹھایا گیا۔ قیدی کی حسرتناک وفات نے ذہنوں کو چند لمحوں کے لیے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسی کی طرف نظم کے چند اشعار میں اشارہ تھا۔

ہے ایک گوشے میں ناچار قیدیوں کا ہجوم
غم و طرب کا جسے فرق بھی نہیں معلوم
ستم کی گرد، الم کا غبار ہے جس پر
کئی صدی کی غلامی کا بار ہے جس پر

مصیبتوں کا جو رہتا ہے سلسلہ جاری
سلگتی رہتی ہے ہر دل میں ایک چنگاری
نظام کیا ہے جب ایسا گناہگار ملے
کہ بے قصور ہو لیکن سزائے دار ملے

گر ایسا جرم کیا ہے جو احتیاجی ہے
گناہ ہو بھی تو ذاتی نہیں سماجی ہے
ہر ایک زخم جو ناآشنائے مرہم ہے
تو خیر و شر کا پرانا نظام برہم ہے
مگر یہ فلسفہ زندانِ عام کیا سمجھے!
خرد کی بات ہے ظالم نظام کیا سمجھے!

خیر و شر کا نظام سماج کے پس منظر میں بنتا بگڑتا رہا ہے اور بڑی حد تک یکساں خطوط پر چلتا رہتا ہے۔ نیا نظام جو بنا اس میں بھی افراط و تفریط' بلند و پست عناصر موجود تھے' البتہ ایک ایسے نظام کا تصور اُبھر چکا تھا جہاں ہر طرح کی ناانصافی کا خاتمہ ہو اور عدل و مساوات

کا وقدر معدد۔ یہ باتیں عام سیاسی منظر نامے کا حصہ اور کم و بیش آفاقی تھیں۔ ہر مذہب، ہر قانون ایسی پابندیاں لگاتا ہے لیکن سماج قابو میں کم آتا ہے۔ فرد ہی گرفت میں آتا ہے۔ اگرچہ مصلحین مذاہب و سیاست نے سماج پر بھی ہمیشہ کڑی نظر رکھی ہے لیکن سماج میں طاقت ور، مخرب عنصر موجود رہتے ہیں جن کی نظر میں مفاد پرستی سب سے بالاتر ہے۔

مختصر یہ کہ قیدی کی موت نے سب کو جھنجھوڑ دیا تھا اور یہی اس نظم کی محرک بھی ہوئی تھی لیکن اس موضوع پر میری پسندیدہ نظم "لاش" بعد میں وجود میں آئی جو مہادیو دیسائی کی موت پر لکھی گئی اور جس کا ذکر کسی پچھلی قسط میں سروجنی نائیڈو کے ذکر کے ضمن میں آچکا ہے۔ مہادیو دیسائی کی موت قلعہ احمد نگر میں ہوئی جہاں وہ گاندھی جی کے ساتھ قید تھے! اکثر ناقدین نے اسے بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔

قیدی کی موت یقیناً بڑا حادثہ تھی، لیکن اس سے بڑا حادثہ عالمی جنگ کی صورت میں ہو رہا تھا، جہاں انسان چیونٹیوں اور مچھروں کی طرح مارے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی طاقتیں نبرد آزما تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم فسطائیت اور نا تسلیت سے لڑ رہے ہیں اور جمہوری اقدار اور آزادی کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن صورت یہ تھی کہ ہندستان جیسا وسیع، سر برآوردہ ملک اور دلیر قوم مدتوں سے جنگِ آزادی میں مصروف تھی اور یہی نام نہاد جمہوری طاقتیں اس کو جمہوریت اور آزادی سے محروم رکھے ہوئے تھیں۔ ہم نے اسی آزادی کے حصول اور غلامی سے نجات کے لیے گھر بار تجا تھا، اسکولوں اور ملازمتوں کو ترک کر کے اور عواقب کی پروا نہ کر کے اس سامراجی جنگ کی مخالفت کی تھی اور اپنے عزیزوں اور چاہنے والوں اور محبوبوں سے دور آج قید خانے کی چار دیواری میں بند تھے۔ اس قربانی پر روح خوش تھی، ضمیر مطمئن اور عزم پائدار تھا، لیکن ذاتی طور سے قید، جو پابندیاں عائد کر دیتی ہے اس کی اذیت محسوس کرنا بھی تقاضائے فطرت تھا۔ اسی تناظر میں یہ نظم قلم سے اُبل پڑی۔ اس میں ہندی آمیز لہجے کا ایک تجربہ کیا گیا تھا۔ نظم کا عنوان تھا "جیل کی ایک رات"۔ کچھ شعر پیش ہیں۔

کل جیل میں آ پہنچی تھیں جیون کی سندر راتیں
بیتے لمحوں کی یادیں، بیتے سپنوں کی باتیں

نیلی سی حدِ نظر پر تاروں کی جھلمل ہوتی
ماتھے پہ تمھارے جیسے بن جائے پسینہ موتی

جاڑے کی تیز ہوائیں کُہرے سے گلے ملتی تھیں
خوشبو تھی مست ہواؤں، ٹانو کلیاں کھلتی تھیں

سڑکوں کا بھیانک منظر اور ہم تم چلتے جاتے
سردی کے سخت تھپیڑے بھی ہم کو روک نہ پاتے

پیروں کی چاپ ہوا میں یوں فوجی بینڈ بجاتی
تم ڈر ڈر کے تھم جاتیں اور مجھ کو اک یاد آتی

یہ فوجی بینڈ کی باتیں یادوں میں کہاں سے آئیں
بے سائے کی جیلوں میں کیا جنگ کی ہیں پرچھائیں

ساہتیہ[1] پہ بھی یورش ہے اس جنگ کی جانے کب سے
یہ جنگ نہیں ملکوں سے، یہ جنگ تو ہے ہم سب سے

یہ جنگ اُدب سے فن سے، یہ جنگ رسیلے پن سے
یہ جنگ ہر اک خلوت سے، یہ جنگ ہر اک آنگن سے

تم کو میری باہوں سے ہاں کس نے، ابھی ہے چھینا
کیا ٹھنڈا ہو جائے گا، ایسے ہی دہکتا سینہ

یہ جنگ ہماری کب ہے، پر جنگ کسی کی کب ہے؟
پھر بھی ہم کو لڑنا ہے پھر بھی ہم کو مطلب ہے

کیا جیل کے سناٹے میں گم ہی ہو کر سو جاؤں گا؟
میں جنگ کا دشمن تھا ہی، اب اور بھی ہو جاؤں گا!

عباسی اور جعفری کی رہائی

جیل میں نظمیں تو اور بھی بہت سی لکھی ہیں لیکن صرف دو اور اقتباسات ضروری ہیں۔ ایک کا تعلق قاضی جلیل عباسی سے ہے جو سردار جعفری کی طرح مجھ سے چند دن پہلے رہا ہو گئے تھے۔ قاضی کی حیات نے ابھی ابھی دغا دی اور وہ مدتوں کا ساتھ لمحوں میں چھوڑ گئے۔ وفات سے چند دن پہلے میں ان کے دولت کدے پر گیا تھا۔ وہ گرم جوشی سے، قہقہوں اور بلند آواز گفتگو سے استقبال کرنے والا نیم بے ہوشی کے عالم میں

---

[1] مانوہ یہ مانو گویا [2] ساہتیہ ادب

حیات وموت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دوائیں اور غذا نلکی کے ذریعے دی جارہی تھی۔ صاحبزادے موجود تھے اور اتفاق سے بھانجے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی بھی آگئے۔ میرے ساتھ میری بیوی شہناز اور بہو سلطانہ زیدی بھی تھیں۔ گھر کی عورتیں بھی قریب آگئیں۔ یاد الٰہی اور سوگواری کی فضا تھی۔ ڈاکٹر تقریباً جواب دے چکے تھے۔ ان کے بیٹے نے بلند آواز سے میرے آنے کی اطلاع دی۔ آواز پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ مسکن دوائیں نیم بیداری کی کیفیت پیدا کیے ہوئے تھیں۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور ایک ہاتھ اٹھایا۔ بیٹے نے بتایا کہ یہ معانقہ کا اشارہ ہے میں نے ہاتھ بڑھایا انھوں نے اس عالم میں بھی، بچی کھچی طاقت سے اس طرح تھاما کہ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کچھ بولنے کی کوشش بھی کی، جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ غالباً سلام کیا ہوگا۔ کچھ حال کہنا چاہا ہوگا۔ کچھ میرا حال پوچھنا چاہا ہوگا۔ یہ ہر وقت چہکنے والا بلبل اس کشمکش حیات میں بھی کچھ بولنے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اس کی محبت بھری جرأت مندی تھی۔ محبت زندہ باد، قاضی جلیل زندہ باد! ہاں تو اس وقت مجھے وہ نظم یاد آئی جو میں نے ان کی رہائی کے وقت لکھی تھی ؎

مبارک باد عباسی کو کیا میں دوں رہائی پر
کہ آنکھوں میں اتر آتا ہے خوں بے دست و پائی پر

پنپنے ہی نہیں دیتے یہاں نخل جوانی کو
جکڑ رکھا ہے زنجیروں میں ساری زندگانی کو

ہر اک گوشے پہ قید و بند کے قانون حاوی ہیں
یہاں نوعیتیں آزاد و قیدی کی مساوی ہیں

دلِ صیاد کو ہر دم خیال صید رہتا ہے
رہائی میں بھی یہ پیغامِ قید و بند رہتا ہے

ہمارا ملک اک زندانِ بے دیوار ہے ہمدم!
یہاں ہر اک قدم پر امتحانِ دار ہے ہمدم!

یہاں جو نظمیں وجود میں آئیں وہ پہلے مجموعے "رگِ سنگ" دوسرے مجموعے "دیارِ سحر" تیسرے مجموعے "تیشۂ آواز" میں نظرثانی کے بعد دوسری نظموں کے پہلو بہ پہلو شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سب مجموعے ختم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ (انجمن ترقی اردو (ہند) کے شائع کیے ہوئے "تھا" "سلسلہ" میں شامل ہیں اور اب وہی بازار میں موجود ہے۔ زندانی نظمیں "ورق ورق زنجیر" کے عنوان سے الگ بھی جمع کرلی ہیں اور ان پر از سر نو ایک نظر ڈالی گئی ہے اور شاید جلد یا بدیر ہدیۂ ناظرین ہوں گی۔

عباسی ہی کی طرح علی سردار جعفری بھی مجھ سے کچھ پہلے جیل سے رہا ہو گئے تھے۔ جیل ہی میں یہ خبر ملی کہ وہ رہا ہوتے ہی نظر بند کر دیئے گئے اس سلسلے میں بھی ایک نظم لکھی تھی، اور جب وہ اسّی برس کے ہو گئے تو بمبئی یونیورسٹی کی جانب سے ایک تقریب ہوئی جس کی صدارت کا خوشگوار فریضہ مجھے انجام دینا پڑا۔ اس موقع پر وہ نظم سنائی گئی جو اتنا زمانہ بیتنے کے بعد بھی سننے والوں کے دلوں کو چھو گئی۔ 'افکار' کراچی کے سردار جعفری نمبر میں شدید اصرار پر میں نے ایک تاثراتی مضمون تحریر کیا۔ اس میں بہت سی یادیں سمیٹ لی ہیں۔ ہم دونوں کی گہری دوستی اور ذہنی یگانگت مستحکم عارضی نظریاتی اختلافات اور حوادث روزگار میں گھرے رہنے کے باوجود استوار ہوتی رہی ہے اور غالب کی 'تصویر بتاں' کی طرح میری یادوں کا ناقابل فراموش حصہ ہے اسی لیے ان یادوں کے اعادہ سے گریز کرتا ہوں صرف ان کی رہائی پر "ہمدم کی نظر بندی" کے عنوان سے خاصی طویل نظم لکھی تھی۔ شاید چند شعر آپ بھی سننا چاہیں ؎

سنتے ہیں حکم نظر بندی ملا سردار کو
محفلِ زنداں بنا لیا ہے دیارِ یار کو

پھر بھی گھر میں بند ہو جانے سے گھبرائیں گے کیا
سرفروشی سے بھلا ہم لوگ باز آئیں گے کیا

ہم شہنشاہی کو یہ سمجھائیں کس عنوان سے
جو سمندر میں رہے ڈرتا نہیں طوفان سے

یہ وہ سینہ ہے جو تیروں کا نشانہ یوں بھی تھا
ہم سے آزادوں کو تو گھر قید خانہ یوں بھی تھا

ہاں مگر پہلے جب اپنے گھر سے گھبراتے تھے ہم
لکھنؤ کے جشنِ طوفاں میں چلے آتے تھے ہم

گھر تو گھر تھا ہم نے پر دلیسے حکومت بھی نہ کی
ہم تھے وہ محشر بدل فکرِ قیامت بھی نہ کی

ہم نے جانا ہی نہیں کیا شے ہے دریا کا تھماؤ
ہم تھے ٹوٹی ناؤ تھی اور تیز دھارے کا بہاؤ

محفلِ شعر و سخن سے بزمِ حسن و ناز تک
شورشِ راہِ جنوں سے غمزۂ غمّاز تک

انتخابی کشمکش سے 'انقلابی راہ' تک
وصفِ محنت کش سے لیکر نقدِ شاہنشاہ تک

ہم قدم ہو کر چلے ہیں رازداں ہو کر چلے
لوگ چھپتے تھے جہاں ہم واں عیاں ہو کر چلے

زیست کی یکسانیت سے بچ نکلنے کے لیے
لڑ بھی لیتے تھے مزا منہ کا بدلنے کے لیے

نظریاتی اختلافات ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی نیتوں پر کبھی شک نہیں کیا، حملہ کیوں کرتے؟ یہ اختلاف دانش مندانہ اور پُرخلوص تھا. اور آج بھی ہوتا رہا ہے۔ شکر ہے کہ ابھی اتنی ذہنی توانائی باقی ہے دوستی بھی۔ سردار کے یہاں زیادہ حد بندیاں ہیں جو بعض اوقات ذاتی تعلقات پر بھی اپنی پرچھائیاں ڈال سکتی ہیں، لیکن عملی طور پر ایسا ہوا نہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔!

جیل کے نئے ساتھی،

میں لکھنؤ سے دور تھا۔ جیل تک باہر کی خبریں بھی کم پہنچتی تھیں، لیکن اتنا سنا تھا کہ ہماری گرفتاری پر یونیورسٹی میں ہڑتال ہوئی۔ یہ تو فطری تھا۔ عباسی اور سردار کی گرفتاری پر بھی طلبا نے اسٹرائک کر دی تھی. طلبا کی تحریک بدستور زوروں پر تھی۔ یونیورسٹی میں اب محمد جعفر صدر یونین تھے اور بڑا فعال کردار ادا کر رہے تھے۔ چندر مولی اور اوستھی (اب شاید ہردوئی میں ہیں) یونیورسٹی یونین کے سکریٹری تھے اور جعفر کے پہلو بہ پہلو تحریک میں آگے آگے تھے۔ دوسری طرف شفیق نقوی اور ہریش تیواری وغیرہ بھی مصروفِ کار تھے۔ ان میں سید محمد جعفر سے آپ پچھلی قسط میں کسی قدر متعارف ہو چکے ہیں۔ ان کے والد حامد صاحب تحصیلدار تھے، سرکاری ملازمت کے باوجود برابر ان کی سرپرستی کرنے سے باز نہیں آتے، سمجھایا ضرور کرتے تھے۔ آخر، محبت کرنے والے باپ کا دل تھا، پسیج جاتا تھا۔ جعفر کا میرا ساتھ کالون ہائی اسکول محمود آباد سے شروع ہو گیا۔ یہ مجھ سے کوئی تین جماعت پیچھے رہے ہوں گے۔ ایک خاص انداز سے ہاتھ اٹھا کر کھلے منہ سے بات کرنے کا انداز آج بھی نہیں بدلا.

یہ طریقہ انھوں نے پیٹنٹ کرا لیا ہے۔ ختم تعلیم کے بعد وہ کچھ دنوں یو۔پی حکومت میں، پھر مشہور کانگریسی اور سیکولر لیڈر گوپی ناتھ سریواستوا کے انگریزی اخبار "ہندستان" میں اور پھر انڈین ایکسپریس میں کام کرنے لگے۔ آج کل ٹائمس آف انڈیا میں اقتصادیات کے نامہ نگار خصوصی ہیں۔ تحریک سے متعلق پہلے ایک ناول "ہار جیت" لکھا، جس پر مجھ سے مقدمہ لکھوایا۔ اس کے بعد ایک اور ناول "قافلے بہاروں کے" بھی لکھا۔ دونوں ہی نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئے لیکن اب دونوں کا ایک نسخہ بھی نہ میرے پاس ہے نہ جعفر کے پاس اور نہ ہی مالکان نسیم بکڈپو کے پاس! دونوں ہی مقبول ہو گئے۔ شاید کسی لائبریری میں کوئی نسخہ موجود ہو تو اور بات ہے۔!

ہماری رہائی سے چند دن پہلے یہ بھی جیل میں آ پہونچے۔ حکومت کے خلاف مسلسل ہنگامہ آرائیوں کے بعد اور جاتے بھی کہاں! اسی زمانے میں یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا کہ لکھنؤ یونیورسٹی یونین پر پولیس والوں نے چھاپہ مارا۔ اس چھاپے میں یونین کے دفتر اور لائبریری سے تحریکِ آزادی سے اور اشتراکیت سے متعلق بہت سا لٹریچر اٹھا کر لے گئی۔ بڑا ہنگامہ ہوا۔ طلباء اور پولیس میں مقابلہ ہوا۔

اس دور میں ریتا ڈے اور سرجیت کور نے طلبا کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور آخرکار "ہندستان چھوڑدو" (QUIT INDIA) تحریک میں سزایاب ہوئیں اور قید و بند کے شدائد جھیلے ؎

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

ان کے ساتھ طالبات کا خاصا گروہ تحریک میں شامل ہو گیا۔ ریتا ڈے آئی سی ایس کے رکن آر۔این۔ ڈے کی عزیز تھیں۔ ریتا کی سیاسی سرگرمیوں کا اثر ان پر بھی پڑا اور برطانوی حکومت کے عتاب نے انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا ؎

پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلہ دراز عشق

یہیں یہ ذکر بھی ہوتا چلے کہ اسی طرح کا معاملہ لکھنؤ کے باہر یو۔پی میں

آئی اے ایس کے امیر حیدر صاحب اور آئی پی ایس کے ریاض الدین
صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا۔
لکھنؤ سیاسی لیڈروں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا، انھیں میں ریلوشری
کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر شومیندر ٹیگور بھی تھے جن کا لکھنؤ میں برابر آنا جانا
لگا رہتا تھا۔ سی پی آئی کے دوست ان کو ٹراٹسکائٹ (TROTSKYIST)
کہا کرتے تھے۔ ایک اچھا خاصا گروہ طلبا اور طالبات کا نظریاتی
اعتبار سے ان کے ساتھ ہو گیا تھا، یہ گروہ یونیورسٹی ہی میں محدود نہیں تھا
بلکہ شہر کے طالب علموں اور طالبات کے کالجوں کا بھی تھا ٹیگور
کے ساتھیوں میں پنیہ پریہ داس گپتا بھی تھے جن سے بعد میں دلی
میں ملاقات ہوئی جب وہ انڈین ایکسپریس میں شامل ہو گئے تھے۔
ریتا ڈے کے شوہر دلیپ مکرجی ٹائمس آف انڈیا میں چلے گئے اور
وہاں نام کمایا۔ یہ بھی تحریک میں حصہ لیتے تھے۔ احمد آباد کی ایک
سرمایہ دار خاتون سروجنی ہٹھی سنگھ بھی طلبا کی تحریک سے وابستہ
تھیں مگر ان کا جھکاؤ بائیں بازو کی ریولیوشنری کیمونسٹ پارٹی (شومیندر
ٹیگور) کی طرف تھا۔ ایم۔ این۔ بنتھیا لکھنؤ میں ان کے ساتھی تھے
ایس۔ کے۔ بچلو صحافت میں بھی تھے اور سرگرم مجاہد آزادی بھی۔
مولانا عبدالماجد دریابادی کے خویش اور بھتیجے محمد ہاشم قدوائی بھی لکھنؤ
اور یو پی اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کرتے تھے اور پریس سے
رابطہ قائم کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ سب کے سب قریبی ساتھی
تھے لیکن سب کی الگ الگ خصوصیتیں کہاں تک گنائی جائیں۔ بڑا متنوع
مجمع اور مخلص کارکن طلبا کی تحریک نے پیدا کئے۔ اس تحریک کے بارے
میں [illegible] تفصیل سے غیر جانب دارانہ طور سے کچھ نہیں لکھا گیا
[illegible] غیر جانب دارانہ اور معروضی
انداز سے کچھ لکھنا ممکن بھی نہ ہو۔ ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سطحی اور بڑی
حد تک جانبدارانہ اور آدھا ادھورا ہے کہ 'علم تاریخ' کی حدوں کو چھونے لگا
ہے۔ ان نام گنانے کا مقصد نام شماری نہیں ہے بلکہ تحریک کی
پہلوداری کو واضح کرنا ہے اور آنے والے مؤرخ کے لیے کسی حد تک
ابتدائی مواد کا ہلکا سا پرتو پیش کر دینا ہے اور بس۔ طلبا کی تحریک
میں شامل ہونے والوں پر حکومت کی ملازمت کے بھی دروازے بند تھے

اس لیے یہ سب ساتھی یا تو وکالت کی طرف رجوع کرتے یا پھر صحافت
کی طرف۔ سب بے حد ذہین، فعال اور ایمان دار شخصیتوں کے مالک تھے
اگر ہندستان آزاد ہوتا تو انھیں ملک کی ترقی اور بہبود کے کاموں میں
حصہ لینے کا موقع ملتا۔ لیکن یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ آزادی کے
چند سال کے اندر اندر ایمان دار افراد کا سیاست میں رہنا بھی مشکل
ہو گیا اور اچاریہ نریندر دیو جیسی شخصیت بھی الگ تھلگ رہی۔
چند ہی دنوں بعد جیل میں انصار ہروانی اور بلرام سنگھ بھی
آ گئے۔ آج یہ دونوں ہم میں موجود نہیں صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی
ہیں، طلبا کی تحریک نام کی کوئی چیز اب باقی نہیں رہ گئی کیونکہ محرکات
بدل گئے، حالات تبدیل ہو گئے۔ سبھاش چندر بوس کے بھتیجے اروند بوس
اور انصار ہروانی جیسی فعال اور تاریخی ہستیوں کی ابدی جدائی پر بھی
ایسی خاموشی چھائی رہی گویا یہ بے ننگ و نام شخصیتیں رہی ہوں۔ کچھ
ایسے ہی جذبے کا تاثر غالب کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے ؎

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

انصار ہروانی آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دوسرے جنرل سکریٹری
اور بہت اچھے مقرر تھے۔ انگریزی اور اردو خطابت میں کئی اعزازات
و انعامات جیتے تھے۔ زندگی بھر فرقہ واریت اور تنگ نظری کے خلاف
جنگ کرتے رہے۔ جب سبھاش بابو نے فارورڈ بلاک کی تشکیل
کی تو انھوں نے اس میں سرگرم حصہ لیا۔ بعد میں پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔
بمبئی کرانیکل، نیشنل ہیرالڈ۔ امرت بازار پتریکا جیسے اخبارات سے
نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ [illegible] اس وجہ سے کہ
میں [illegible] طلبا کی تحریک [illegible] مجاز کے حقیقی بھائی انصار
کے تعلق سے گہرے تعلقات ہو گئے تھے، کوئی اہم موضوع سامنے
آتا تو مجھ سے [illegible] شائع کرتے۔ طلبا کے
چند [illegible] مشترک ایڈیٹر تھے۔
مجاز [illegible] تھے۔ مگر نسبتاً
[illegible] میں کھڑے ہو گئے
[illegible] جو دراصل
[illegible]

نے اپنی ڈگر الگ ہی بنائی۔ عذاب وثواب کا حال تواللہ جانے لیکن اخلاقی روایات کی قدر کرتے تھے، سیکولر تھے، قوم پرور تھے اور ترقی پسند !۔ اس دور میں یہی بہت تھا۔ ہم کوئی محتسب تو نہیں جو ادھیڑبُن کریں۔ انصار ہروانی طلبا رکی تحریک کے ہر اول دستے میں آگے آگے رہے۔ عام قومی سیاست اور صحافت میں بھی ماہرین کی صف میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان سب کے باوجود کس خاموشی سے گزر گئے لکھنؤ کے اُردو اخبارات نے بھی مناسب نوٹس نہیں لیا۔ اگرچہ انصار ہروانی کے نام سے انھوں نے ایک چھوٹی سی سوانحی کتاب بھی لکھی تھی مگر نثر نگاروں کو عام طور سے لوگ خاطر میں کب لاتے ہیں۔!!
نثر نویس یہ سوچ کے خوش ہو سکتے ہیں کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ایک علمی شخصیت

جیل کی جن بیرکوں میں ہم سیاسی قیدیوں کا اجتماع تھا، وہاں دوسرے قیدی کم آتے تھے۔ بنارس سنٹرل جیل مرکزی قید خانہ تھا، جب کسی قسم کی تحریکیں چلتی تھیں تو یہ سماجی یا سیاسی قیدیوں سے چھلکنے لگتا تھا۔ آج کل جنگ آزادی کے قیدیوں کا مرکز تھا۔ اس تحریک کے سرفروش اکثر و بیشتر اس کی رونق بڑھاتے رہتے تھے۔ بعض اوقات دوسری تحریکوں کے نمایاں افراد بھی ادھر آنکلتے تھے۔ میری رہائی کے دن قریب آرہے تھے اور قید خانے کی تنہائی میں جو لکھنے پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا اس سے پورا فائدہ میں نے اٹھایا، اب جلدی جلدی اس کو سمیٹنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ قاضی جلیل عباسی اور سردار جعفری کی رہائی کے بعد باہم ملنا جلنا بھی کم ہو گیا تھا۔ ایک روز معلوم ہوا کہ شہر کے مشہور عالم مولانا عبدالشکور صاحب تشریف لائے ہیں۔ اتفاق کہ آج تک ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں ان کی بعض کلامیہ تصانیف دیکھ چکا تھا اور ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کا شوق تھا۔ اب وہ میرے کمرے سے صرف دو یا تین کمروں کی دوری پر تھے۔ میں نے کبھی کبھی ان کے اخبار "آفتاب" کو بھی دیکھا تھا جس کے مدیر اسلم لکھنوی میرے دوست تھے [illegible]

خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ پاس بٹھایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ مجھ پر ان کی خوش اخلاقی کا خوش گوار اثر پڑا۔ دو ایک بار اور بھی جانا ہوا شیعہ سُنی تعلقات پر بھی روا روی میں گفتگو آگئی تو محسوس ہوا کہ وہ اس صورتِ حال سے خوش نہ تھے۔

دوسری مصروفیات

میری یادوں کے سلسلے کے ایک قاری نے دریافت کیا کہ آخر جیل میں آپ لوگوں کا وقت کیسے گزرتا تھا؛ انبوہ کی موت کو بھی فارسی میں جشن کہا گیا ہے۔ یہاں تو ہم دیدہ و دانستہ آئے اور آزادی کی دیوی کی زلفِ دراز کے اسیر تھے کہ

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ہولی آئی تو ہم نے خوب ہولی کھیلی اور بعض یاروں نے تو "ٹھنڈائی" کا بھی لطف لیا۔ بنارس کی ٹھنڈائی کی بڑی شہرت ہے۔ ایک بار خدا بخشے میرے مشہور سوشلسٹ دوست راج نرائن کو کہ انھوں نے ایک کشتی کرائے پر لی اور دوسرے طالب علمی محاذ پر کام کرنے والوں کو گنگا کی سیر کرائی۔ اس متبرک پانی سے جو روحانی سرور حاصل ہوا وہ تو ظرف پر منحصر تھا لیکن اس کی موجوں پر ٹھنڈائی کی دعوت ہوئی۔ راج نرائن نے وضاحت کی کہ اس کا اثر مختلف مزاجوں پر مختلف ہوتا ہے بعض تو "گم گم" ہو جاتے ہیں کہ بالکل خاموش اپنے باطن میں کھو جاتے ہیں نہ بولتے ہیں نہ کھیلتے ہیں اور بعض "آسمان تڑاکا" ہو جاتے ہیں کہ ہنستے ہیں تو ہنستے ہی چلے جاتے ہیں، گاتے ہیں تو ان کی آواز دور دور جاتی ہے اور سننے والوں کو خوش کر جاتی ہے، بعض رونے لگتے ہیں تو چُپ ہونے کا نام نہیں لیتے۔ میں کہ اس وادی سے نابلد تھا یہ سن کر ڈر گیا اور پینے کے بجائے شعر سنانے پر تل گیا۔ ایک دوست نے کہا کہ تم پر آسمان تڑاکا جیسا اثر ہوا۔ سب پینے میں ایسا مست اور بعض میرے شعر سننے میں ایسا محو تھے کہ انھوں نے یہ دیکھا بھی نہیں کہ گلاس گنگا جی کے پانی کو چڑھا دیا گیا۔ بعض حضرات نے زیادہ پی لی تھی خیر، ذہن اس طرف چلا گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ ہم بنارس میں موجود رہتے ہوئے بھی کاشی گھاٹ سے کافی دور تھے۔ پھر بھی ہولی کے موقع پر جیل کے اندر یاروں نے خوب ہولی کھیلی اور ٹھنڈائی بھی چھانی گئی۔ یہ در حقیقت [illegible]

ٹھنڈائی بادام وغیرہ کے شربت میں تھوڑی سی بھنگ ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ لوگ مجھے طعنہ دیتے تھے کہ تم دریا میں رہ کر بھی دامن تر نہ کر پائے۔ میں اپنی پرہیزگاری کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ میں تو گناہگاروں میں ہوں لیکن بھنگ کبھی نہیں پی۔ بڑے مزے کی ہولی رہی، لیکن بے مزہ سی۔ دور دور تک صنفِ نازک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ رہی تھی۔

نماز گزار نمازیں پڑھتے تھے۔ بعض تو اوراد و وظائف کے بھی پابند تھے۔ پوجا پاٹھ بھی ہوتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ لمبے لمبے دن اور لمبی لمبی راتیں فرض عبادت میں تو نہیں کٹ سکتیں۔ آپس میں ملتے جلتے، بحثیں کرتے، سیاسی نظریاتی، کچھ فلسفیانہ، کچھ ادبی۔

اس زمانے میں ہندی، اُردو کا زور تھا اور ہمارے دوست وینکٹیش نرائن تیواری نے ایک مختصر سا ہندی رسالہ "ہندی بنام اُردو" چھاپا تھا۔ یہ پہلے کانگرس وزارت میں پارلیمانی سکریٹری تھے۔ اچھے قانون داں تھے اور کچھ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ رسالے میں انھوں نے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ ہندی اُردو سے بہتر ہے۔ بحث تو پرانی ہو چکی تھی لیکن انھوں نے مجھے جب رسالہ دیا تو از سر نو اٹھی۔ اتفاق سے موہن لال سکسینہ لکھنؤ کا نستھ تھے، اردو سے واقف تھے اور اُردو اخباروں میں پہلے لکھتے بھی تھے۔ پنڈت بشمبھر دیال ترپاٹھی کھلے ذہن کے آدمی تھے۔ آزاداً غیر علمی سطح پر بحث شروع ہوئی۔ جب اُردو رسم الخط کی بات چلی تو میں نے کہا کہ جتنی آوازوں کو ادا کرنے کی گنجائش اُردو میں ہے، وہ ہندی میں نہیں بعض الفاظ تو ہندی کے حروفِ تہجی میں سلتے ہی نہیں۔ وینکٹیش نرائن اپنی بات پر اَڑے رہے تو میں نے کہا کہ ہندی میں کوئی کلاسیکی رتبے کی کتاب نہیں ہے تو پنڈت بشمبھر دیال ترپاٹھی نے "رام چرت مانس" (تلسی داس کی رامائن) کا نام لیا۔ میں نے بحث برائے بحث کہا کہ وہ اودھی میں ہے، ہندی میں نہیں۔ وہ بولے کہ اودھی ہندی سے الگ نہیں۔ میں نے کہا کہ اُردو سے بھی الگ نہیں۔ غرض بات یوں ہی تمام ہو گئی۔ لیکن یہ بات میرے دل کو لگ گئی کہ میں نے اب تک رام چرت مانس کیوں نہیں پڑھی۔ فوراً بازار سے نول کشور پریس لکھنؤ کی چھپی ہوئی باترجمہ منگوائی اور اس کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ "گنگا جی کی کتھا" کا جو ابتدائی حصہ ہے اس کا منظوم ترجمہ بھی اس التزام سے کرنے لگا کہ کوئی لفظ چھوٹنے نہ پائے

یہ کام وہاں سے شروع ہو کر رہائی کے بعد تمام ہوا۔

اس کے علاوہ یار لوگ تاش اور شطرنج سے بھی دل چسپی لیتے تھے اور ان کی تعداد کافی تھی۔ ایک صاحب (نام یاد نہیں) چوپڑ بھی کھیلتے ہوئے پائے گئے۔ اس کا کچھ ذکر پہلے آ چکا ہے، لیکن ہم لوگ ذہنی اور فکری دلچسپیوں میں مگن رہتے تھے۔ اگر ان کھیلوں میں شریک بھی ہوئے تو منہ کا مزہ بدلنے کے لیے۔

دسترخوان

مزے کی بات آئی تو اس مس (MESS) کی یاد بھی آ گئی جو ہم لوگوں نے اپنی بیرکوں میں قائم کیے تھے۔ یوں تو ہم سب ایک تھے لیکن کھانے پینے پہننے، مادری زبان بلکہ بولیوں کے معاملے میں ضمنی اختلافات فطری تھے۔ ان اختلافات نے ہمیں عطرِ مجموعہ بنا دیا تھا۔ کئی مس تھے؛

۱. خالص ترکاری کا، جس میں پیاز کا استعمال بھی ممنوع تھا۔

۲. خالص ترکاری مگر پیاز شامل۔

۳. نان وتج۔ آخر الذکر میں مچھلی، مرغ وغیرہ کے علاوہ وہ ترکاری خور بھی شامل تھے جو ترکاری کے علاوہ انڈے بھی کھا لیتے تھے مؤخر الذکر صف میں پنڈت وینکٹیش نرائن تیواری بھی تھے۔ انھیں اس پر اعتراض نہ تھا کہ ماسا ہاری بھی اسی دسترخوان پر موجود ہوں۔ ایک روز مُرغ پکایا گیا۔ عین دسترخوان پر مولوی نصیر چونکے:

"یہاں ذبح کیسے ہوا ہوگا۔؟"

چیتن سنگھ گریوال نے کہا: "میں نے گردن مروڑ کر قصہ تمام کیا۔"

اب جھٹکے اور ذبیحہ کا مسئلہ ایسا اٹھا کہ وہ ڈش ہی دسترخوان سے آہستہ سے اُٹھا دی گئی اور انڈے اور ترکاری کی ڈشوں سے کام چلایا گیا۔ کتنی وسیع النظری تھی اس دور کے مجاہدینِ آزادی میں کہ اگر وہ ایک دوست نہیں کھاتے تو ہم بھی نہ کھائیں گے۔ کسی نے اس کو مسئلہ بننے نہیں دیا۔ مولانا نے سب سے معافی مانگی کہ ان کی وجہ سے یہ صورتِ حال ہوئی لیکن وہ شرعی قباحت کی وجہ سے مجبور تھے۔ اگر دل صاف ہوں تو بڑے سے بڑا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ مس کا انتظام برابر بدلتا رہتا تھا ہفتہ پندرہ دن بعد ہمارا کوئی دوسرا ساتھی یہ ذمہ داری سنبھال لیتا۔ کبھی کوئی یہ بھی چھوڑتا کہ ایک صاحب چائے کی پیالی میں شکر زیادہ لے

لیتے ہیں۔!

رِہائی

ان دوستوں کی آمد کے چند ہی ماہ بعد میں بھی رہا ہوا، لیکن گھر کے لیے کوئی ٹرین فوراً نہیں تھی اس لیے دوسرے دن روانگی ہوئی۔ جیل کے ساتھی کیڈیا جی کے یہاں دوسرے رہا ہونے والے دوستوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا ہوا۔ انھوں نے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھلایا۔ ذہن میں یکایک یہ حقیقت چمک اٹھی کہ جنگِ آزادی میں ایسے حضرات بھی شریک تھے۔ سبھی ہم جیسے متوسط اور غریب طبقے کے لوگ نہیں تھے۔ ایک دوست نے بتایا کہ چاندی کے برتنوں میں چھوت نہیں مانی جاتی، طہارت کے بعد استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے مخلوط مجمعوں میں چاندی کے برتن میں کھلایا جاتا ہے، اظہارِ دولت کے لیے نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں۔ خیر اظہارِ دولت کے لیے نہ سہی، اظہارِ طہارت کے لیے تو تھا ہی چاندی کے برتنوں کا استعمال۔ میں نے بچپن میں سُنا تھا کہ چاندی کے برتنوں میں کھانا مکروہ ہے لیکن چوں کہ نیا تجربہ تھا اس لیے مجھے کوئی کراہت محسوس نہیں ہوئی۔ فقہی کراہت فقر دوستی کی بنا پر رہی ہوگی۔

گھر پہونچے تو وہاں ماموں جان نے اپنے زمیندارانہ خیالات کے باوجود میرے استقبال کی پوری تیاریاں کر لی تھیں۔ پلیٹ فارم پر خورشید بھائی اور صمد انصاری صاحبان پھولوں کے ہار لیے موجود تھے اور باہر سواری کے لیے ہاتھی۔ غرض میرے ننہال میں میرا شاہانہ استقبال ہوا۔ میں نے سب سے پہلے حضرت شمس الدینؒ عرف میر شمسی صاحب (متوفی ۱۲۰۴ھ) کے مزار مبارک پر حاضری دی۔ وہ ہمارے ننہالی مورثِ اعلیٰ تھے اور صوفی صافی تھے، سات حج پیادہ کیے تھے، کرہاں انھیں کا بسایا ہوا ہے۔ اسی مزار کے ایک گوشے میں والد مرحوم کی ابدی آرام گاہ بھی ہے۔ میں نے گلے میں ڈلے ہوئے ہار ان کی قبر پر عقیدت سے چڑھا دیے۔ اس طرح میری وہ پیش گوئی صحیح نکلی جو دسمبر ۱۹۳۹ء میں میری ایک نظم "والدِ مرحوم سے" میں کی گئی تھی ؎

اب بھی تجھ کو یاد کرتا ہے وہ دورِ صبح و شام
جب چھلکتے تھے محبت کے تری آنکھوں سے جام
کھیلتا تھا پیار سے تیرے لبوں پر میرا نام

آج آکر اپنی کھیتی کا لہکنا بھی تو دیکھ
پھول بن کر اپنے غنچے کا مہکنا بھی تو دیکھ
میرا گلزارِ بغاوت میں چہکنا بھی تو دیکھ

ناگوارِ خانداں ہے میرا طرزِ بود و باش
ان کے طعنوں سے پڑے ہیں میرے دل میں سو خراش
مجھ سے کہتے ہیں حکومت کی غلامی کر تلاش

میں جواں ہو کر بنا ہوں نوجوانِ انقلاب
دوش پر لے کر نکلتا ہوں نشانِ انقلاب
لاؤں گا کرہاں بھی اک دن کاروانِ انقلاب

پھول تیری قبر پر اس دن چڑھائے جائیں گے
میری پامردی کے افسانے سُنائے جائیں گے
تیری لے میں انقلابی گیت گائے جائیں گے

میر شمسی صاحبؒ کے مزار پر پہلے ہی فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ ایک بار پھر عقیدت مندانہ سلام کیا اور سیدھے ماموں جان کی بنوائی ہوئی نئی کوٹھی "خورشید مہدی منزل" کا رُخ کیا، جہاں ایک چھوٹا سا اجتماع میرے استقبال اور حب الوطنی کے جذبۂ صالح پر مبارک باد دینے کے لیے یکجا ہو گیا تھا۔ چلیے زندگی کے ایک اہم دور کا اختتام ہوا اور جدوجہدِ آزادی میں نئے عزم و عمل کا آغاز۔!

اندر میری دُنیا بھر سے پیاری ماں میری منتظر تھیں۔ میں نے ان کے قدموں کو چھونا چاہا، کیونکہ بقول انیس ؎

سُنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے

لیکن انھوں نے گلے سے لگا لیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ منتیں اُتاری گئیں، دُعائیں پڑھی گئیں۔ جیل کی دُنیاوی فضا سے نکل کر گھر کی رُوحانی فضا میں واپس آ گیا۔ گاؤں کی پاک و صاف اور محبت بھری آب و ہوا میں ایک بار پھر سانس لینے کا موقع ملا۔ خُدا ان یادوں کی طرح اس گاؤں کو سدا بہار رکھے۔

(باقی)

□□

ہونے اور نہ ہونے کے درمیان

ایک نظم

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
ان کے لیے جو ہمارے لیے
بالکل انجان تھے
جنھیں ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا
کبھی چھوا نہیں،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
ان کے لیے جو ہماری
رگِ جاں کے قریب تھے
جن کے ہونے کا احساس
نہ ہونے میں بدلتا رہا،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
اُن کے لیے، جو ہماری رفاقتوں کے
جھوٹے دعوے دار تھے
جن کی نام نہاد محبتیں غیر مشروط تھیں،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
ان کے لیے جو بند مٹھی جیسے
لمحوں کے سیاہ خانوں میں
قیدِ گناہ کا ارتکاب کر رہے تھے
اور بالاعلان منبر پر کھڑے ہو کر
اپنی طہارت و پاکیزگی کا
نقّارہ پیٹ رہے تھے۔

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
تمھارے لیے ان لمحوں کی نظم
جو کبھی دائرۂ انفاس کی قید
میں نہ آسکے،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
تمھارے حسن کی تعریف میں
جو میری آنکھ کا جگنو بنا ہی نہیں،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
تمھارے روشن وجود کی تائید میں
جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں
جیا بھی نہیں،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
اس نظم کی یاد میں
جو ہونے کے ملال میں
کبھی ہو نہ سکی،

میں نظم کہنا چاہتا ہوں
اس حادثے کی یاد میں
جو کبھی گھٹا ہی نہیں!
کیا تم سُن رہی ہو؟
تم نظم کا موضوع ہو کر بھی
نہیں ہو ——
کیا تمھارے ہونے اور نہ ہونے
کے درمیان کوئی نظم ہوگی
کہ تم جب تھیں تب بھی
نہیں تھیں،
اور اب نہ ہوتے ہوئے بھی ہو!
کیا تم سُن رہی ہو؟
زندگی کی طرح
یہ نظم ہو کر بھی نہ ہوگی
اور شاعری کی تمام تر آسمانی کتابیں
تمھاری موت کا نوحہ رقم کرتی
رہیں گی۔
مگر سوال یہ ہے!
کیا تم واقعی مر چکی ہو
یا پھر جینے کی طرح تمھارا مرنا بھی
ایک مفروضہ ہے!
—— کیا تم سُن رہی ہو۔

□□

فیّاض رفعت

دُور درشن کیندر
۲۴۴ - اشوک مارگ
لکھنؤ

عابد پشاوری
پروفیسر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی
جموں - ۱۸۰۰۰۴

تنقیدِ غالبؒ کا ایک فقرہ

پروفیسر کلیم الدین نے ٹھیک ہی کہا تھا: "اردو میں تنقید کا وجود معشوق کی موہوم کمر کی طرح ہے"۔ آج کے ناقد شاید اس حقیقت سے انکار کریں لیکن کلیم الدین صاحب نے جب یہ بات کہی تھی اس وقت تک اردو میں، تنقید نہ ہونے کے برابر تھی۔ آج بھی جب تنقید فنی اعتبار سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ یوروپی تنقید کے جتنے نظریے اور دبستان ہیں ان سب کو اردو میں اپنایا گیا ہے، پھر بھی تنقید کی غرض و غایت میں شاید کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ اس فن میں بہت سے ناموں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے ناقد بالعموم شاعر ہوتے تھے۔ ان کے لیے شعر کی تنقید گویا داد دینے کا ایک انداز تھا یا پھر فن شعر سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار۔ اس لحاظ سے آج کا ناقد بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی قاری پر اپنے علم و معلومات کا رعب ڈالتا ہے۔ فن پارے کی اتنی تاویلیں اور تعبیریں کی جاتی ہیں کہ شعر فہمی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہیں ہو پاتا۔ یوں بھی آج ناقد کا مقصد قاری کی رہنمائی سے زیادہ اس کی گمراہی ہوتا ہے۔ وسعتِ مطالعہ اور قوتِ استدلال کے اظہار کی دھن میں وہ محو خود کلامی غالب کے اس مصرعے پر صاد کرتا نظر آتا ہے ؎

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

تنقید کے اس رویے کی ابتدا غالباً عبدالرحمان بجنوری سے ہوئی۔ بجنوری مرحوم بہت ذہین و فطین آدمی تھے۔ مغربی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مغربی علم کی روشنی میں غالب کو پرکھنے کی سعی کی، وہ بلیغ تھی یا نہیں، کہنا مشکل ہے۔ ان کو کلام غالب میں دنیا کا ہر نغمہ خوابیدہ یا بیدار صورت میں نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے وہ کلام غالب سے زیادہ اپنے بیان کے آئینے میں اپنا جلوہ دیکھ کر کہہ رہے ہوں، کہ اللہ رے میں بلکہ واہ رے میں!

اردو میں تنقید کے نام پر دو مقدمے مشہور ہیں۔ پہلا مقدمہ شعر و شاعری جو حالی نے اپنے دیوان پر لکھا اور دوسرا محاسن کلام غالب جو بجنوری نے غالب کے قدیم دیوان پر لکھا۔ یہ دونوں مقدمے چونکہ ان دیوانوں سے خاصے بے میل تھے جن پر وہ لکھے گئے تھے، اس لیے دونوں الگ سے شائع ہو کر مشہور ہوئے: ایک "مقدمۂ شعر و شاعری" کے نام سے اور دوسرا "محاسن کلام غالب" کے نام سے۔ حالی کا مقدمہ اپنے دیوان کی خوبیوں، خامیوں یا حالی کے نظریۂ شعر کے بجائے اردو میں نظریاتی تنقید کا مقدمہ یا پیش خیمہ ثابت ہوا اور بجنوری کا مقدمہ غالب کی مشکل گوئی کے پیچ و پیچاک کھولنے کے بجائے خود اک نہ سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا معمہ بن کے رہ گیا۔ اردو کے ایک عام قاری یا طالب علم کی بات یا اوقات ہی کیا ہے، خواص اور علماء میں بھی شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو جرمن زبان و ادب سے کما حقہ، واقف ہوگا۔ کاش کوئی ایسا عالم ہوتا تو جیسے کلام غالب کی درجنوں شرحیں لکھی گئی ہیں اسی طرح "محاسن کلام غالب" کی بھی ایک شرح لکھ دیتا جس سے بہتوں کا بھلا ہوتا۔ اب تک تو یہ مقدمہ گونگے کا گڑ ہی ہے۔ دیکھیں کب کوئی مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

چلیے! ہم نہ جرمن زبان جانتے ہیں نہ جرمن کے ادب اور ادیبوں ہی سے واقف ہیں، لیکن اپنی اردو فہمی میں تو شاید ہی کسی اردو والے کو شک ہو۔ اس کے باوجود، آج تک کسی نے محاسن کلام غالب، کا یہ ابتدائی جملہ سمجھا اور نہ سمجھایا:

"ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: ایک وید مقدس دوسری دیوانِ غالب۔"

مجھے اپنی کم فہمی اور نادانی کا اعتراف ہے کیوں کہ میرے سوا غالباً سب

اہلِ اُردو اس نقرے کو مجذوب سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کے ذہن میں تو اس کے متعلق شک پیدا ہوتا، اور جب شک پیدا ہوتا تو اس پر کچھ لکھتا بھی۔ میری معلومات میں ایسا کوئی مضمون آج تک سامنے نہیں آیا۔ میری سمجھ میں تو اس مادّے سے جملے کا کوئی مطلب ہی نہیں آتا۔ میں نے سادہ سا جملہ کہا ہے محض سادہ کہا ہے اور نہ سیدھا سادہ۔ اس لیے کہ ایک سیدھے سادے جملے کے سیدھے سادے معنی بھی ہوتے ہیں جو بغیر کسی خاص کوشش یا کاوش کے سمجھ میں آجاتے ہیں، لیکن یہاں؟!

" ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالبؔ"

دیوانِ غالبؔ تو خیر ہندستان میں لکھا گیا لیکن وید؟ قطعاً نہیں! خواہ اس سے آپ آج کا ہندستان مُراد لیں یا وہ ہندستان جس کی سرحدیں انڈونیشیا، جاوا سماٹرا، برما (موجودہ میاں مار اور رنگون) سنگاپور، سیام (تھائی لینڈ) سیلون (موجودہ سری لنکا)، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ وغیرہ ممالک کو چھوتی تھیں۔ یہ عین ممکن ہے کوئی حصّہ بہت ہی چھوٹا حصّہ، مذکورہ صدر علاقوں میں سے کسی ایک میں بھی تخلیق ہوا ہو یا نازل ہوا ہو۔ پھر یہ ہندستان کی الہامی کتاب کیونکر ہوئی؟ اگر واقعی ہندستان میں وجود پذیر ہونے والی کتاب ہی سے غرض تھی تو بجنوری نے گیتا کا نام کیوں نہیں لیا؟ حالانکہ گیتا ہندستانی بھی ہے اور الہامی بھی۔ لیکن اگر اس سے یہ مُراد ہے کہ اہلِ ہندستان وید کو مانتے ہیں تو یہ بھی ادھوری سچائی ہے، اس لیے کہ ہندستان میں کئی قومیں آباد ہیں جو اگرچہ سب ہندستانی کہلاتی ہیں اور ہندستانی ہیں، پھر بھی سب کا مذہب الگ ہے اس لیے سب اپنی اپنی الہامی کتاب کو مانتے ہیں، وید کو نہیں۔ ہندستان میں ایک اور کتاب بھی وجود پذیر ہوئی — گرنتھ صاحب۔ لیکن بجنوری اسے بھی دیوانِ غالبؔ کا مقابل قرار نہیں دیتے۔ اہلِ ہند کا ایک بہت بڑا طبقہ قرآن کو مانتا ہے، اور ایک طبقہ بائبل کو۔ پھر بجنوری نے ان الہامی کتابوں کا نام کس مصلحت سے نہیں لیا؟ کیا خوفِ فسادِ خلق سے؟ لیکن ٹھہریے! ابھی ایک الجھن اور باقی ہے۔ بجنوری کہتے ہیں کہ ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ہماری الجھن یہ ہے کہ وید خود چار ہیں، پھر دو کتابیں کہنے کا جواز؟

علاوہ بریں، وید کو مقدس کہا گیا ہے، جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وید ہی کی طرح دیوانِ غالبؔ بھی مقدس ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی بات ہے کہ دیوانِ غالبؔ کو مقدس جاننے یا ماننے والا طبقہ بھی بہت محدود ہوگا، اگر ہوگا تو! میں غالبؔ کا پرستار ہوں اور معنی آفرینی کے اعتبار سے انھیں اُردو کا سب سے بڑا غزل گو مانتا ہوں۔ میں اس قول کا بھی قائل ہوں کہ غالبؔ نے اُردو شاعری کو ذہن دیا۔ اس کے باوجود دیوانِ غالبؔ کو وید بلکہ ویدوں کا حریف نہیں ٹھہرا سکتا۔ ویدوں میں جو فکر و فلسفہ ہے، جو علم و معلومات کا ذخیرہ ہے تسکینِ قلب اور خیر و برکت کا جو خزانہ ہے، دیوانِ غالبؔ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ یہ تسلیم کہ ویدوں میں بھی شاعری ہے اور بہت اچھی شاعری ہے اس میں حسنِ بیان اور زبان کے جوکھے ہیں، کلامِ غالبؔ گنجینۂ معنی کا طلسم ہونے کے باوجود ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔ یہ معمّہ اب بھی حل طلب ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ فقرہ کیا سوچ کر لکھا؟ سوچ کر بھی لکھا یا پھر یہ محض وقت پر سوجھ جانے والی ایک بات تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ غالبؔ کا یہ شعر اس کا محرک ہوا ہو —

غالبؔ فنِ شعر اگر دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اور اس کے نشے میں بجنوری مرحوم نے یہ غیر معتبر جملہ تراش لیا ہو۔ یہ تو دیسا ہی نظر فریب، دل فریب بلکہ دماغ فریب فقرہ ہے جیسا یہ:

" شبلیؔ پہلے یونانی ہیں جو ہندستان میں پیدا ہوئے"۔

یہ قولِ محال شاعری تو ہو سکتا ہے لیکن معنویت کی کسوٹی پر کھرا نہیں اُتر سکتا۔ مجھے یہ ادنیٰ ترمیم غالبؔ ہی کے ایک مصرعے پر اپنی بات ختم کرنے کی اجازت دیجیے کہ —

اے اہلِ "ذوق" کوئی تو بولو خدا لگی

□□

دو شعر

بہتر نگر نابینا ہے
زہر ہلاہل پینا ہے
دیکھ مرا حق چھینا ہے
میرا جینا جینا ہے

—— اختر عمر آفاق
گورونگر، لکھنؤ

غزل

تاریکیوں میں آبِ بقا کی نہ کر تلاش
عرفاں کے نُور میں ولیؔ تا حشر زندہ باش

پاکیزہ تر بنا اسے انساں اگر ہے تو
مت کر ہلاک نفس کو اور بن نہ زندہ لاش

انساں کے واسطے ہے دلِ گرم لازمی
بیکار سینے میں جو ترے برف کی ہو قاش

دونوں میں حالِ دلِ درد آشنا ہیں کون
زہّادِ پاک باز یا رندانِ بد قماش

اس میں شرابِ عشق کی رنگینیاں تو دیکھ
سنگِ ہوس سے شیشۂ دل کر نہ پاش پاش

نے "یادِ رفتگاں" ہے نہ "عشقِ بتاں" نہ ہے اب
حاوی دل و دماغ پہ ہے بس "غمِ معاش"

جلوؤں کو جن کے دیکھ کے آئے خدا کی یاد
کرتا ہے بُت گری ہی، تو ایسے صنم تراش

اس کو نہ جان پائیں جو، خود کو تو جان لیں
ان مورکھوں میں اتنی جو آ جائے عقل کاش

منصور کی طرح سے نہ کم ظرف بن ولیؔ
دل جس کی جائے گاہ ہے کر وہ نہ راز فاش

□□

محمد ولی الحق انصاری

غزل

وہ تو میرے رگِ گلو میں رہا
اور میں اُس کی جُستجُو میں رہا

نام میرا اُسے پسند نہیں
پھر بھی میں اُس کی گفتگو میں رہا

ہر چمن کا وقار مجھ سے تھا
ہاں وہی میرے رنگ و بُو میں رہا

جس سے کچھ ربط و رابطہ بھی نہیں
عمر بھر اُس کی آرزو میں رہا

اُس کی سانسوں سے میری سانسیں ہیں
خون اس کا مرے لہو میں رہا

یار! کل اِک گنوار بیکل کا
تذکرہ خوب لکھنؤ میں رہا

بیکل اُتساہی

بلرامپور - گونڈہ
(یو۔پی)

غلام رضوی گردش
منشی پورہ، مئوناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱

اختر الایمان کے خطوط

غلام رضوی گردش کے نام

(۱)

۵۵۔ بینڈ اسٹینڈنگ بلڈنگ
باندرہ۔ بمبئی

عزیزم!

آپ کا خط ملا۔ ابھی تک میں بالکل اچھا نہیں ہوا ہوں۔ بیماری؟ نزلہ بگڑ گیا ہے جس کے سبب چکر آتے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں بہتر ہوں۔ اگر وقت ہو تو آیئے اور اگر ممکن ہو تو "سر و ساماں" کے مسودے پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ ممکن ہے مزید غلطیاں نکلیں۔ "ایک بات" اور "یادیں" میں نے ابھی دیکھی نہیں۔ کیا غلطیاں رہ گئیں۔ آپ نے ابھی نشان دہی نہیں کی۔

اختر الایمان
۵ نومبر ۱۹۷۹ء

۱۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور چند مشورے دیئے مثلاً "جیونی" میں دس بند تھے، میں نے عرض کیا کہ نظم آگے نہیں بڑھتی۔ یہ GROW نہیں کرتی۔ اس وقت تو خاموش رہے لیکن جب کتاب چھپ کر آئی تو دیکھا پہلے بند کے بعد سارے بند حذف کر دیئے ہیں۔

——— گردش

(۲) عزیزم رضوی!

آپ کا نامہ مل گیا تھا۔ کچھ مصروفیات ایسی تھیں فوراً جواب نہیں دے پایا۔ "جیونی" تو وقت طلب ہے۔ ڈراما میں نے پڑھا۔ اسٹیج نہیں کرے گا کوئی، ایسا میرا خیال ہے۔ نظموں کے جو ٹکڑے استعمال کیے گئے ہیں اور وہ جس عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں ’’بھیس‘‘ ’’مشت زنی‘‘ وہ پڑھنے کی حد تک تو درست ہیں اسٹیج نہیں۔
انگریزی کا مضمون نہیں پڑھ پایا۔ آج کوشش کروں گا۔ باقی باتیں آپ جب آئیں گے تب۔

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

اختر الایمان
۱۰ دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۔ میرا ایک بابی ڈراما "میراجی" جو ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ میں غالباً فروری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

۲۔ خوشونت سنگھ نے "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" میں میرا ایک انگریزی کا مضمون 'ASSASSINATED WRITERS' ۴ جون ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔

——— گردش

(۳) عزیزم گردش!

آپ کا نامہ مل گیا تھا۔ ترجمہ کی ہوئی نظمیں کئی بار پڑھیں اور پڑھوا کر سنیں مجھ میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ انگریزی زبان کے محاورہ سے پوری طرح واقف نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا آدمی ساتھ ہو جو زبان کے محاورہ سے بخوبی واقف ہو۔ سلیم مولاڈینا سے آپ کی ملاقات ضروری ہے مگر زیادہ بہتر اور موزوں آدمی میرے خیال میں شام لال ہیں۔ آپ کچھ اور ترجمہ کر لیں تو میں شام لال کو بھجوا دوں اور ان کی رائے لوں۔ مراد آپ کی صلاحیت پر شک نہیں اپنی کوتاہی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تو تمہارات کا ایک پہلو، دوسرا پہلو وہ ہے جس کا آپ کی توقعات سے تعلق ہے۔ جو محنت آپ کر رہے ہیں وہ محض عاشقی کا دریوزہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی توقعات کا اندازہ مجھے ہو جائے تو کام آگے بڑھانے اور پڑھوانے میں [illegible] کی ذمہ داری میری۔

میں اچھا ہوں۔ اپنی خیریت بھی لکھیے۔

اختر الایمان

۱۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء

۱؎ کسی مقامی کالج میں انگریزی کے لکچرر۔ نومبر ۱۹۶۶ء میں کیرتی کالج سے وابستگی کے بعد دوسرے کالجوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا مگر موصوف سے کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ ممکن ہے میری علیحدگی کے بعد تقرر ہوا ہو۔

۲؎ 'ٹائمز آف انڈیا' کے ایڈیٹر

۳؎ میں نے چند نظموں کے ترجمے محض تفنن طبع کے لیے کیے تھے مگر اختر صاحب چاہتے تھے کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں اور کلیات کا ترجمہ مکمل کر دوں۔ حق الاجرت کے بارے میں جب بھی گفتگو کرتے میں خاموش ہو جاتا۔ میرے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس لگ رہی تھی مگر وہ مصر تھے کہ میں پیسے کی بات کروں۔ ایک دن فرمایا، خط میں ضرور لکھیے گا

——— گردش

(۴) عزیزم گردش!

عروس البلاد کا ترجمہ ملا اور باقی خطوط بھی مل گئے تھے۔ اتنا تو شاید نہ دے پاؤں جتنا روپیہ آپ نے لکھا ہے۔ مگر وہ بات طے ہو جائے گی۔ ضروری چیز ترجمہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں جہاں تک آپ نے کیا ہے اب اس کام کو یہیں تک رہنے دیجیے۔ ایک نئی فائل بنا کر مجھے پھر سے تمام ترجمے دے دیجیے میں انہیں ٹائپ کرا دوں گا اور شام لال کو بھیج دوں گا۔ شام لال کا پتہ باقر مہدی کے پاس ہوگا۔ آپ نہ لا پائیں تو میں لے لوں گا۔ شام لال ان ترجموں پر کیا رائے دیتے ہیں اس کی روشنی میں معاملہ کی بات کریں گے مولاڈینا کو فون کروں گا اور یہ ترجمے دکھاؤں گا ——— ان کی رائے بھی لیں گے

"قفقاز" کاکیشش پہاڑ کو کہتے ہیں۔

اختر الایمان

۲ر جنوری ۱۹۸۰ء

۱؎ معاملہ کی کوئی بات نہ ہو سکی کیوں کہ اس کے بعد میں نے بمبئی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ مگر ایک بار جو ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی قائم ہوئی وہ آخری ایام تک برقرار تھی۔ اب تک کے سارے خطوط بمبئی سے پچاس میل دور گنیش پوری (وجریشوری) کے پتے پر موصول ہوئے جہاں میں ان دنوں صفدر آہ کے ساتھ مقیم تھا۔

——— گردش

(۵) عزیزم گردش

آپ کے خط مسلسل آتے رہے۔ میری صورت حال یہ ہے کہ ایک پاؤں گھر میں تو دوسرا اسپتال میں۔ تفصیل میرے حالات کی یہ ہے کہ ۱۴ر جنوری کو منجھلی لڑکی اسما کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ پہلے سے ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ کوئی پریشانی لاحق ہوگی مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ بچہ آپریشن کر کے نکالنا پڑے گا۔ زچگی کے لیے اس نرسنگ ہوم میں جہاں بچہ ہوا تھا، انتظامات خاطر خواہ نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیپٹک ہو گیا۔ خیر خدا خدا کر کے وہ وقت گزرا اور اسما ٹھیک ہو کر گھر آ گئی۔ مگر اس کے چند ہی روز بعد اسے پھر تکلیف شروع ہوئی۔ میں پھر اسپتال لے گیا۔ معلوم ہوا آنتوں میں چھید ہو گیا ہے۔ دوسرا آپریشن ہوا۔ شومئ قسمت کہیے کہ آٹھ انچ آنت کاٹ کر جب ٹانکے مارے گئے، تو ایک ٹانکہ چھوٹ گیا اور یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب آپریشن کو کئی دن گزر گئے تھے۔

اب ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے لڑکی اسپتال میں ہے۔ کل دوسرا سرجن بلوایا تھا۔ اس نے کہا آٹھ دس دن دیکھتے ہیں زخم خود بخود بند نہ ہوا تو پھر آپریشن کر کے ٹانکا مارنا پڑے گا۔

اسی دوران میں ایک موٹر کی ٹکر کا شکار ہو گیا۔ صبح سویرے حسب معمول سیر سے پلٹ رہا تھا کہ ایک موٹر والے نے ٹکر مار دی۔ دس پندرہ (دن) اس میں الجھا رہا۔ چوٹ بہت نہیں آئی تھی مگر جتنی پریشانی اس کے سبب بھی وہ ہی بہت تھی۔

آپ کے خط برابر آتے ہیں۔ مجھے اتنا وقت بھی نہیں ملتا کہ کسی خط کا جواب دے سکوں۔ لکھنا پڑھنا سب بند ہے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

اختر الایمان

۳۰ر اپریل ۱۹۸۰ء

---

(۶) ۱۴ر اگست ۱۹۸۰ء

عزیزم گردش!

آپ کے متعدد خط ملے۔ "مناجات" میں "مظہر (ہے) یا خدا کا"

دوسرے مصرعے کا ٹکڑا پہلے مصرعے کے ساتھ ملاکر پڑھیے۔ مفہوم بھی واضح ہو جائے گا اور مصرع کی صحت کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔

"میں — ایک سیارہ" میں ٹھ

دورِ جمہور میں کیا کیا رہی بیداد کیں

ذرت ہے —

میراجی کی پیدائش ۲۵ رمئی ۱۹۱۲ء کی ہے۔ دن سنیچر تھا اور (تاریخ) وفات ۳ رنومبر ۱۹۴۹ء ہے۔ میری پیدائش ۴ رمحرم ۱۳۳۴ھ ہے، دن جمعہ کا تھا۔ عیسوی سال ۱۲ رنومبر ۱۹۱۵ء ہے۔ جگہ موضع قلعہ ہے — نجیب آباد شہر (سے) ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر۔ وہاں نجیب الدولہ کا قلعہ ہے، اسی نام پر بستی کا نام ہے۔ ضلع بجنور ہے۔

"سر و ساماں" کی اشاعت وقت لے گی: "شب خون" میں جو نظمیں چھپی ہیں نظر سے گزریں؟ نئی ہیں۔ اسمار دام چلی گئیں۔ خیریت سے ہیں۔ اکتوبر میں آئیں گی۔ بچہ میرے پاس ہے۔ خاکہ کی ایک نقل بھجوائیے۔

اخترالایمان

۱؎ کارڈ پر پتہ میرا تحریر کردہ ہے۔ میں نے جوابی پوسٹ کارڈ بھیجا تھا۔

گردش

(۷) عزیزم گردش!

آپ کا نامہ مل گیا تھا۔ میں چھوٹی لڑکی رخشندہ کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا ۹ اکتوبر کو اس کام سے بھی فراغت ہو گئی۔ اس کے بعد شادی میں آئے مہمانوں میں الجھا رہا۔ اب سناٹا ہو گیا۔ شہادت پورہ میں آپ کی جراحی کا سلسلہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کو تو کسی بہانے مرنا ہی ہے۔ ہاں آپ کی جراحی کا قائل اس وقت ہو جاؤں گا جب یہ عمل مجھ پر ہوگا۔ اس ۱۲ رنومبر ۱۹۸۲ء کو ۶۷ سال کا ہو گیا۔ کسی بھی سناک مسیحا کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

آپ خیریت سے ہیں، بال بچوں میں خوش ہیں، مزید یہ کہ معاشی پریشانی بھی اب کوئی نہیں رہی۔ یہ پڑھ کر میں بہت مطمئن ہوا۔ حالاں کہ اپنی پریشانیوں کا آپ نے کبھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا تھا، مگر جب آئے مجھے کئی بار محسوس ہوا آپ کے لیے کوئی باقاعدہ کام کا سلسلہ ہونا چاہیے جو اب ہو گیا۔

"سر و ساماں" چھپانا چاہتا ہوں۔ دوبارہ کمپوز کرانی پڑے گی۔ کوئی مناسب کاتب مل جائے تو یہ کام شروع کراؤں۔ دو ایک روز میں شمس الرحمن فاروقی کو فون کروں گا۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ الہ آباد (بھی) جاکر بیٹھ جاؤں۔

اپنی خیریت لکھتے رہیے۔ میں اچھا ہوں۔

اخترالایمان

۲۱ رنومبر ۱۹۸۲ء

۱؎ شہادت پورہ، ضلع مئو، اترپردیش۔

۲؎ خاندان میں طبابت کی روایت بھی عرصۂ دراز سے چلی آرہی تھی۔ بمبئی سے واپسی کے بعد اس پیشے سے دلچسپی پیدا ہوئی اور دو تین سال تک اسے ذریعۂ معاش بنائے رہا۔ پھر اسے بھی ترک کر دیا۔

گردش

(۸) عزیزم گردش!

آپ کا خط مل گیا تھا۔ جواب دینے کی نیت ضرور ہوتی ہے مگر اسے عمل میں لاتے لاتے وقت گزر جاتا ہے۔ خاکہ ضرور سننا چاہوں گا۔ کسی ذریعہ سے بھجوائیے۔ آپ بہت مصروف رہتے ہیں، مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے۔ ایک زمانے میں خیال آیا تھا آپ سے کہوں میری سوانح لکھیے۔ میں شروع کرتا ہوں اور دس بیس صفحات کے بعد کوئی ایسی مصروفیت نکل آتی ہے کہ لکھنا پڑھنا منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر شروع کرتا ہوں تو نئے سرے سے۔ اس ذہنی ساخت کا نتیجہ یہ ہے کہ سب کچھ روزِ اوّل کی منزل سے باہر نہیں آتا مگر اب آپ اور دلیں ہم اور دلیں!

آپ کے مفصل خط کا انتظار تھا وہ ابھی تک نہیں آیا۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں اچھا ہوں۔

اخترالایمان

۱۵ رمارچ ۱۹۸۳ء

۱؎ اختر صاحب کا خاکہ جو پہلے "نئی آواز" لکھنؤ میں شائع ہوا، اور بعد میں کچھ رد و بدل کے بعد آل انڈیا ریڈیو، گورکھپور سے نشر ہوا۔

۲؎ اگر زندگی نے وفا کی تو ان کی یہ تمنا ضرور پوری کروں گا۔ "خود نوشت" کے باوجود سوانح کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

گردش

(۹) عزیزم گردش !

آپ کے سب خط مل گئے مگر بعد از وقت۔ میں تین چار ہفتہ سے کراچی، اسلام آباد اور لاہور وغیرہ گیا ہوا تھا۔ پرسوں واپس آیا تو آپ کے خط ملے۔ امید ہے کہ آپ کی شام یا وہ شام جو آپ سے منسوب تھی اچھی گزری ہوگی۔ میری دعائیں اور نیک خواہشات ہمیشہ دوستوں کے لیے ہیں۔ آپ کے لیے بھی ہیں۔ آپ ادب کے افق پر تاباں اور روشن ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

میں اچھا ہوں۔ اخترالایمان

۲۷ر مئی ۱۹۸۴ء

نوٹ: نہرو کلچرل سوسائٹی مئو نے "گردش کے ساتھ ایک شام" کا انعقاد کیا تھا جس کی اطلاع میں نے انھیں دی تھی۔

گردش

(۱۰) عزیزم گردش !

آپ کا خط ملا۔ ایک خط کچھ مہینے پہلے بھی ملا تھا۔ میرے حالات کی تفصیل یہ ہے کہ مارچ میں انجائنا کے درد میں مبتلا ہوا۔ دو ڈھائی مہینے مختلف اسپتالوں میں گزرے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق دل کی تین نالیاں بند تھیں۔ ایک والو (VALVE) بھی ٹھیک نہیں تھا۔ طے پایا کہ ہیوسٹن (امریکہ) جاؤں اور دل کی جراحی کراؤں۔ مئی کے آخر میں امریکہ گیا اور دل کا آپریشن کیا۔ دل کی پانچ نالیاں بدلی گئیں۔ ایک والو بدلا گیا۔ ایک مہینہ اسپتال میں گزارنا پڑا۔ اب ٹھیک ہوں۔ بیس پچیس پاؤنڈ وزن کم ہو گیا۔ خیر جو ہوا کم ہے۔ جو نہیں ہوا اچھا ہوا۔ آواگون کے حساب سے پچھلے جنم میں کچھ ایسا کیا ہوگا جس کی سزا یہ تکلیف تھی۔ ایک مرتبہ ایک پنڈت نے کہا تھا یہ تمہارا انوکش (آخری) جنم ہے۔ اگلا پچھلا حساب برابر ہو جائے تو اچھا ہے۔

نئی کتاب "سر و ساماں" چھپ گئی ہے۔ کلیات سمجھو۔ بمبئی آؤ تو ملو۔ اپنی خیریت لکھتے رہا کرو۔

اخترالایمان

۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۹ء

(۱۱) عزیزم گردش !

آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں اچھا ہوں۔ اکتوبر نومبر میں بمبئی سے باہر رہوں گا۔ ۶ر اکتوبر سے ۱۰ر اکتوبر تک دلی میں ہوں۔ ساہتیہ اکادمی کا ایک پروگرام ہے۔ وہاں سے ایک دو روز کے لیے شاید علی گڑھ جاؤں۔

نومبر کے پہلے ہفتہ میں یا دوسرے ہفتہ میں بھوپال جاؤں گا۔

مدھیہ پردیش حکومت نے "اقبال اعزاز" سے نوازا ہے۔ میں اچھا ہوں۔ اپنی خیریت لکھتے رہا کیجیے۔

اخترالایمان

۲۸ر اگست ۱۹۸۸ء

(۱۲) عزیزم گردش !

پرانے خطوں میں تمہارا ایک خط ملا۔ یاد نہیں آیا جواب دے دیا تھا یا نہیں۔ ۹ر دسمبر کو نشر ہونے والا پروگرام نہیں سن سکا۔ وہ تقریر تمہارے پاس ہو تو بھیج دو۔ اس کی ایک کاپی ٹورنٹو (کینیڈا) بھی بھیج دینا۔ بیدار بخت کے پاس۔ وہ کچھ مضامین اکٹھے کر کے کتاب کی صورت میں چھاپنا چاہتے ہیں۔ ان کا پتہ درج ذیل ہے:

BAIDAR BAKHT
21, WHITE LEAF ERES
SEAR BOROUGH, QNT.
CANDA, MIV 391

اپنی خیریت لکھتے رہا کرو۔ میں اچھا ہوں۔

اخترالایمان

۳ر مارچ ۱۹۸۹ء

(۱۳) عزیزم !

آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں پچھلے دنوں زیادہ تر بمبئی سے باہر رہا۔ خط کا جواب التوا میں پڑ گیا۔ پڑھنے والوں نے اس شاعری کو قبولیت کی سند دی۔ اس بات سے مجھے بھی بڑا اطمینان ہوا۔ زندگی لایعنی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ادھر بہت دن سے آپ کا بمبئی کا دورہ نہیں ہوا۔ میں کچھ دن پہلے لکھنؤ گیا تھا۔ آپ وہاں نہیں تھے۔ لکھنؤ میں اور بھی کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خیر پھر کبھی سہی۔

"زمین زمین" کے نام سے نئی کتاب ترتیب دی ہے۔ چھپ جائیگی تو بھیجوں گا۔ آجکل پریس میں ہے۔

اپنی خیریت لکھتے رہا کرو۔

اخترالایمان

۳؍مئی ۱۹۹۰ء

---

(۱۴) عزیزم گردش!

تمہارا خط ملا۔ آج سے تین سال پہلے "گیان پیٹھ" کے لیے میرا نام تجویز ہوا تھا۔ اسلوب احمد انصاری نے مجھے لکھا تھا کہ آپ کو گیان پیٹھ مل رہا ہے اور میں نے انہیں جواب میں لکھا تھا کہ وہ انعام مجھے نہیں ملے گا۔ سبب یہ ہے کہ یہ انعام اکثر ایسے لوگوں یا لکھنے والوں کو ملتا ہے جن کی تخلیقات میں ہندوستان کے عہد قدیم یا اس دور کے کلچر کا اعادہ یا تذکرہ ہو، جیسے "آگ کا دریا" میں ہے یا مراٹھی، گجراتی یا اس ملک کی دوسری مقامی زبانوں میں ہوتا ہے۔ ان زبانوں کا تو محبوب موضوع ہی یہ ہے۔ ہم اکثر قومی اعتبار سے، ماضی کا سہارا لے کر لکھتے ہیں۔ تخلیقی کام کم ہوتا ہے۔ قرۃ العین کو ملا بہت اچھا ہوا۔ وہ بھی اس کی مستحق تھیں۔ بلاشبہ ان کا شمار ہمارے عہد کے بڑے لکھنے والوں میں ہے۔

نئی کتاب "زمین زمین" چھپ گئی۔ "سروساماں" اور "زمین زمین" تمہارے لیے بھیجوں گا۔

اپنی خیریت لکھتے رہا کرو۔ تمہارے پچھلے خط (کے جواب) میں تاخیر کا سبب میری دائیں آنکھ کا آپریشن تھا۔ آپریشن کے ایک مہینہ بعد تک لکھنے پڑھنے پر قدغن تھا۔

اخترالایمان

۲۸؍جولائی ۱۹۹۰ء

---

(۱۵) عزیزم!

خط ملا۔ شاید حضرت علی نے کہا تھا، "دُنیا میں کچھ نیا نہیں" کسی نہ کسی سے خیال کا ٹکراؤ ہو جائے، یہ بات قرینِ قیاس ہے۔ تمھیں "اور اب سوچتے ہیں" میں ٹیمی سن نظر آیا مگر میں کبھی اس شاعر کا دلدادہ نہیں رہا۔ طالب علمی کے زمانے میں تھوڑا بہت پڑھا ضرور تھا ورنہ تو اس نظم میں میرے ہی ایک مصرع کا اعادہ ہے

بازگشت کنا چاہیے ؎

بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں بوئی تھیں

تمہارا خیال درست ہے، یہ کاتب غلطیاں بہت کرتا ہے مگر بالکل صحیح کام کرنے والا ابھی تو ابھی تک ہاتھ نہیں آیا کوئی ؎

"بھلے بُرے یہی سب لوگ اپنی دُنیا ہیں"

انہیں سے کام چلانا پڑتا ہے۔

میراجی کے تعلق سے جو تم نے لکھا ہے وہ دُرست نہیں۔ میری شاعری سے متعلق جو مضمون "تخلیقی تنقید۔ ایک مثال" کے عنوان سے چھپا ہے وہ پہلے چھپ چکا ہے غالباً "سوغات" میں۔ یہ پرچہ بنگلور سے محمود ایاز نکالا کرتے تھے۔ شاید تمہاری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کتاب میں جس بنا پر شامل کیا وہ تنقید کا تخلیقی پہلو ہی ہے۔ میری رائے میں میراجی بہت شگفتہ نثر لکھتے تھے اور ان کا اعادہ کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ حیات تھے اور ہم دونوں تھوڑے بہت جوان بھی تھے، شاعری سے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ میری معلومات تو شاعری سے متعلق واجبی واجبی ہیں مگر میراجی سے بہتر شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے والا آدمی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

'پیش لفظ' میں جو دو صفحے شامل کیے گئے ہیں وہ ایک طرح کا کفّارہ ہے۔ یہ دو صفحے اس سے پہلے اس لیے استعمال نہیں کیے جا سکے کہ اس کی شکل پورے مضمون کی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ میرے ذہن سے نکل بھی گئے تھے۔ ایسی نامکمل، ان کی بہت سی تحریریں میرے پاس ہیں، خاص طور پر ان کی سوانح سے متعلق۔ "زمین زمین" جب چھاپنے کی نیت کی اور پرانے کاغذوں کے پلندے اُلٹ پلٹ کیے تو یہ دو صفحے سامنے آ گئے۔ تلاش نامکمل نظموں کی تھی مگر یہ ملے تو ذہن میں آیا پیش لفظ کا آغاز ان ہی سے کیوں نہ کر دوں اور کر دیا۔

جہاں تک میراجی کے نام اور شہرت کا تعلق ہے وہ تو اسی وقت مشہور ہو گئے تھے جب "ادبی دنیا" کا حصّۂ نظم ترتیب دیا کرتے تھے۔ جو نظموں کا مجموعہ لندن سے چھپا ہے وہ سب نظمیں میری مہیا کی ہوئی ہیں۔ میراجی بمبئی میں کم و بیش میرے ہی پاس رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے دو مجموعے ترتیب دیے تھے "تین رنگ" اور "سہ آتشہ"۔ اپنی زندگی

میں کوشش کرتے رہے مگر کہیں چھپ نہیں سکے۔ جن دنوں بینڈ اسٹینڈ پر رہتا تھا میری طبیعت خراب ہوگئی۔ اچھا ہوا تو خیال آیا کل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس خیال سے وہ نظمیں نقل کر کے کچھ جمیل جالبی کو بھجوا دیں کچھ رسالہ "سیپ" کو۔ انہیں کو اکٹھا کر کے ان کا مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ پھر بھی میرا خیال ہے کچھ نظمیں رہ گئیں۔ اس لیے میں یہ دونوں مجموعے چھاپنے کی نیت کر رہا ہوں۔ کب تک چھاپ سکوں گا، نہیں کہہ سکتا۔ [5]

سوانح لکھنا شروع کی تھی۔ کچھ لکھی بھی مگر پھر اٹک گیا۔ جھوٹ لکھنا نہیں چاہتا اور سچ لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ بہت سے دوست، افرادِ خاندان اور اہلِ خاندان ان یادوں سے جڑے ہوئے ہیں جو سوانح کا حصہ ہیں۔ "کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کاٹے"۔ [4]

اس کا پہلا باب [5] بھارت بھون بھوپال سے جو کتابیں چھپی ان میں کہیں چھپا ہے۔ غالباً ہندی میں۔

"زمین زمین" تمہیں پسند آئی مجھے خوشی ہوئی۔ دیباچہ تھوڑا طویل ہوگیا مگر جو ہوگیا رفت گزشت ہوا۔

میں اچھا ہوں، اپنی خیریت لکھتے رہا کرو۔ تم میری بہت ہمت افزائی کرتے ہو۔ تمہارے خط کا انتظار رہتا ہے۔

اختر الایمان

۲۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء

[1] "زمین زمین"

[2] زندگی میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

[3] "خودنوشت" جس کے لیے میں بار بار انہیں اکساتا تھا۔

[4] غالباً دلّی کا محاورہ۔ میر امن نے "باغ و بہار" میں لکھا ہے:

"اونٹ چڑھے کتا کاٹے"

[5] "خودنوشت"۔

گردش

(۱۶) عزیزم گردش!

آپ کا یہ خط بھی جو ۲۶ر مئی کو لکھا گیا ہے ملا اور پچھلے خطوط بھی۔ میں بمبئی سے باہر تھا۔ کچھ دن کراچی میں رہا، پھر لاہور چلا گیا۔ لاہور سے "سر و ساماں" چھپ رہی ہے۔ وہ مسودہ ایک نظر دیکھنا تھا۔ کتابیں آئیں تو آپ کے لیے بھجواؤں گا۔ لاہور سے انگریزی ترجمہ بھی چھپا۔ تقریباً سو نظمیں ہیں۔ بیدار بخت، لیزلی لوین اور لیزلی میسگر، تینوں نے مل کر کیا ہے۔

ادھر عدن جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے اطلاع دے دوں گا۔ جشن کا مضمون میں نے دیکھا نہیں۔ ابوالکلام قاسمی کا دیکھا تھا اس شاعری کو سمجھنے کی کوشش نظر آئی مجھے اس مضمون میں۔ "لاوے کا سمندر" کے نام سے شکیل الرحمان نے ایک کتاب لکھی تھی۔ میں نے ان سے کہا اس پر نظر ثانی کر کے دوبارہ چھاپیں، مگر اب وہ وزیر ہوگئے۔ ادب خودرو برد ہوگیا ہے۔

اسی سفر میں گوپی چند نارنگ کراچی میں مل گئے تھے۔ کہہ رہے تھے اب آپ کی شاعری پر کتاب لکھی جانی چاہیے۔ "تم پہل کرو۔" میں نے جواب میں کہا۔

لاہور میں فرح سعید نام کی لڑکی نے مجھے اپنا تھیسس دیا۔ میں نے پوچھا: "بے بی! مجھ پر یہ سب کیسے لکھ لیا تم نے؟" بولی: "آپ کے دیباچے پڑھ کر۔" سمجھ لو کیا اہمیت ہے تھیسس کی۔ ترویچی یونیورسٹی کی ایک رفعت النساء ہیں جو آجکل میسور میں پڑھاتی ہیں۔ انھوں نے بھی تھیسس لکھا ہے مجھ پر۔ ان کا کام بھی منگوایا ہے میں نے۔

نئے لکھنے والوں میں زبان کی شگفتگی اور جزرسی کا بڑا فقدان ہے بس کاتا اور لے دوڑے والا رجحان ہے۔ اللہ انھیں سمجھ دے۔

آپ کی بچیاں اب کیا کر رہی ہیں۔ اپنی خیریت لکھیے۔

میں اچھا ہوں۔

اختر الایمان

۲ر جون سنہ ۱۹۹۱ء

---

(۱۷) عزیزم گردش!

آپ کا خط ملا تھا اور مجھے مسلسل ایسا خیال رہا کہ میں نے جواب دے دیا ہے مگر یقین نہیں تھا۔ دوبارہ بھی لکھ رہا ہوں تو اچھی ہی بات ہے۔

پچھلا پروگرام تو سردست ملتوی ہوگیا۔ شاید اکتوبر کے آخر تک امریکہ جاؤں۔ سر سید احمد سے متعلق واشنگٹن میں ایک اجتماع ہے۔ وہاں بیوی کی طرف سے میرے بھی کچھ عزیز ہیں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا آج کی کچھ نظمیں میرے پاس نہیں انہیں چھاپنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کتابت ہو گئی، باقی کام بھی مستقبل قریب میں ہو جائے گا۔

اختر الایمان

۸ ستمبر ۱۹۹۱ء

1/A-3, Ravi Darshan
off Carter Road
Bandra, Bombay-50

(۱۸) عزیزم!

خط ملا۔ "سروساماں" کا دوسرا ایڈیشن اور انگریزی ترجمہ Taking Stock کے نام سے لاہور سے چھپا۔ دونوں کتابیں ابھی میرے پاس بھی نہیں آئیں۔ آجائیں گی تو کوشش کروں گا بھجوا سکوں یا پھر نیاز احمد کو لکھ دوں گا آپ کو براہ راست بھیج دیں۔ ادارۂ سنگ میل لاہور نے شائع کی ہیں، دونوں کتابیں ہیں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ یوسف ناظم کا پتہ درج ذیل ہے

یوسف ناظم

13, Bandra Reclamation (west)

۱۹۔ الہلال، ۱۳۔ ریکلے میشن (ویسٹ)
باندرہ۔ بمبئی ۴۰۰۰۵۰

اختر الایمان

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۱ء

۱۔ پتہ انگریزی میں خود تحریر کیا ہے۔ عموماً سارے خط لیٹر پیڈ پر لکھے گئے ہیں جس پر پتہ چھپا ہے۔

گردش

---

(۱۹) روی درشن۔ باندرہ
بمبئی۔ ۵۰

عزیزم گردش!

پچھلے ڈیڑھ مہینے کی غیر حاضری کا حساب یہ ہے: ایک مہینہ اسپتال میں آگے پیچھے ایک مہینہ بیماری کا۔ مسلسل خون تھوکتا رہا۔ دل میں ایک مصنوعی 'والو' لگا ہوا ہے۔ بے توجہی سے اس نے خرابی پیدا کردی۔ اب قدرے ٹھیک ہوں۔ البتہ ۱۶ پاؤنڈ وزن کم ہوگیا ہے۔

کتابیں ابھی نہیں آئیں۔ کسی وقت سنگ میل کو لکھ دوں گا کتابیں آپ کو براہ راست بھیج دیں۔

اختر الایمان

۱۴ دسمبر ۱۹۹۱ء

۱۔ مکتبۂ سنگ میل لاہور

---

(۲۰) عزیزم گردش رضوی سلمہٗ

بیشتر وقت بمبئی سے باہر رہا، اس لیے نہیں لکھ سکا۔ لاہور سے کتابیں ابھی تک نہیں چھپی۔ انگریزی ترجمہ بھی نہیں آیا۔ جلد آگیا تو بھجوا دوں گا۔

کل بیدار بخت سے اچانک پٹنہ ایرپورٹ پر ملاقات ہوگئی، کچھ مزید نظموں کے ساتھ میں اب بمبئی سے چھاپ رہا ہوں۔

امید ہے تم خیریت سے ہوگے۔

اختر الایمان

۱۔ خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۹۲ء کو موصول ہوا۔ غالباً ۷ یا ۸ مارچ ۱۹۹۲ء کی تحریر۔

۲۔ "سروساماں"

۳۔ یہ تمنا بھی پوری نہیں ہوگی۔

گردش

---

(۲۱) عزیزم گردش

آپ کا خط ملا۔ ترجموں کی جو کتاب لاہور سے چھپی ہے اس کام کو بیدار بخت اور لیزلی لوین، کینیڈا کی ایک خاتون ہیں، انھوں نے کیا ہے۔ انھوں نے ہی اپنے توسط سے چھپوائی ہے۔ چونکہ کتاب لاہور سے چھپی خود میری دسترس سے باہر ہے۔ کئی بار لکھ چکا ہوں۔ بیدار پٹنہ میں مل گئے تھے، ان سے بھی کہا مگر کتاب نہیں آئی۔ آپ ایسا کیجیے سنگ میل کو براہ راست لکھ دیکھیے۔ وہ بھجوا دیں گے۔ آپ کے وظیفے کام کے لیے یوسف ناظم (سے) کہہ تو دیا ہے فکر کریں گے تو دیں!

پٹنہ جانے سے پہلے آپ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی اس لیے [illegible]

امید ہے آپ [illegible] "TAKING STOCK" [illegible] اگر

میرے پاس پہلے آگئی تو بھجوا دوں گا۔

اختر الایمان

۱۵ر اپریل ۱۹۹۲ء

۱۔ یوسف ناظم کے چند مزاحیہ خاکوں کی ضرورت تھی جو یہاں دستیاب نہیں تھے۔

۲۔ میں نے شاید لکھا تھا اگر پٹنہ کے پروگرام سے مطلع کیا ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، ویسے آپ بھی مئو تشریف لا سکتے تھے۔ بجسرہو کے صرف چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔

گردش

---

(۲۲) عزیزم گردش

کچھ دن پہلے میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ شاید تمھیں نہیں ملا۔ اس کا جواب نہیں آیا۔ خیریت تو ہے نا؟ میں شاید ۱۲ر اپریل کو لکھنؤ آؤں۔ ٹیلی فون نمبر 242396 پر فون کرکے دریافت کر لینا۔

ایک مدت سے ملاقات نہیں ہوئی ہے تم سے۔ میں اچھا ہوں

اختر الایمان

۳۰ر مارچ ۱۹۹۳ء

---

(۲۳) عزیزم!

گردشِ روزگار تو یوں بھی آدمی کا مقسوم ہے۔ اس پر آپ نے "گردش" کہلانا تسلیم بھی کر لیا۔ اب یہ آپ کا پیچھا کیوں چھوڑے گی۔ اپنی خیریت لکھتے رہا کیجیے۔ نامہ و پیام رُک جائے تو تشویش ہوتی ہے۔ اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں۔

اختر الایمان

۱۴ر اپریل ۱۹۹۳ء

---

(۲۴) عزیزم رضوی گردش

اس بار تمھارا خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوا تم اپنے بارے میں زیادہ سوچنے لگے ہو۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں تردد کرنا تو واجب ہے باقی دوسروں پر چھوڑ دو۔

ترجمہ "TAKING STOCK" لاہور سے کتاب آئی تھی۔ ڈاک خانہ والوں نے واپس کر دیا۔ یہ پبلشر کے خط سے معلوم ہوا۔ کیوں؟ یہ نہیں

کہہ سکتا۔ کسی وقت ایسا کروں گا اس کا فوٹو لے کر تمھارے لیے بھجوا دوں گا۔

زاہدہ زیدی نے بھی اشتیاق ظاہر کیا ہے۔

عمر کا یہ حصہ جس سے میں گزر رہا ہوں اس میں لمبی بات کرنے کا دماغ نہیں ہوتا۔ تم بمبئی آنے کا ارادہ کر رہے ہو، ضرور آؤ۔ باتیں کریں گے۔

امید ہے تم خیریت سے ہو گے۔

اختر الایمان

۱۹ر جولائی ۱۹۹۳ء

---

(۲۵) عزیزم گردش!

تمھارا خط ملا۔

کس نے میرے بارے میں کب کیا لکھا اور کیا نہیں لکھا یہ اب کل کی بات ہو گئی۔ اکثر لوگوں کے ایک ہی وقت کئی چہرے ہوتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر چہرہ بدل لیتے ہیں۔ یہ شاید زندہ رہنے کے لیے ضروری بھی ہے۔

میں کچھ دن سے بیمار ہوں Renal Failure کی وجہ سے چار مہینے سے Dialysis پر زندہ ہوں۔ یہ عمل ہفتہ میں دو بار چار چار گھنٹے کے لیے ہوتا ہے۔ "آجکل" (دہلی) کا وہ نمبر جو مجھ سے متعلق ہے اس کے بارے میں محبوب الرحمٰن کو میں نے لکھ دیا تھا، میری توقع سے کم ہے۔

میں نے تمھاری تقریر ریڈیو پر نہیں سنی۔ ضرور اچھی ہو گی۔ جو جس کا بھی خواہ ہوتا ہے اس کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بات کرتا ہے۔ تم میرے بہی خواہ ہو۔ میں شاید نومبر میں لکھنؤ جاؤں۔ میری وہ لڑکی جو سعودیہ میں تھی، واپس آگئی ہے۔

جو فلیٹ میرے پاس ایک زمانے میں تھے وہ میری بیماری میں بک گئے تھے۔ اب کوئی فلیٹ نہیں سوا اس کے جس میں رہتا ہوں۔ وہاں تم آ چکے ہو۔ اپنی خیریت لکھتے رہا کرو۔

اختر الایمان

۵ر مارچ ۱۹۹۴ء

---

(۲۶) عزیزم گردش!

پریشانیاں تو ہم ایسے لوگوں کا مقسوم ہیں۔ اب کس کی کیا شکایت۔

ان Dallysis اب میرا مقسوم بن گیا ہے۔ ہفتہ میں دوبار، چار چار گھنٹے کے لیے اسپتال میں حاضری دیتا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں جو لکھنے کا کام ہے وہ ختم ہو جائے تو آرام کا سانس لوں۔ خودنوشت کا کچھ حصّہ رہ گیا ہے اور "سر و ساماں" بھی شائع کرنی ہے۔ پہلی کاپیاں ختم ہو گئیں۔

ایک کتاب بیدار بخت نے ترتیب دی ہے "راستے کا سوال" وہ دلّی سے چھپ رہی ہے۔ ایک صفحہ پر اردو ہے۔ سامنے والے صفحہ پر اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ چھپ جائے تو تمھیں بھجواؤں۔

علی جواد زیدی کی کتاب[1] میں نے دیکھی ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تنقید کا صحیح تصوّر بالغ نہیں ہوا ہے۔ جو جس کے جی میں آتا، بغیر ادب اور شاعری کی طرف کوئی ذمہ داری محسوس کیے، لکھ مارتا ہے۔ ایسی کتابوں پر سنجیدگی سے بات کرنا بے کار ہے۔

باقر مہدی خیریت سے ہیں اور اپنا کام کیے جاتے ہیں۔

تمھیں ان سے بھی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

تم آجکل کیا لکھ رہے ہو؟ وہ بتاؤ۔

امید ہے تم خیریت سے ہو گے۔

اخترالایمان
۳۱ر جولائی ۱۹۹۴ء

[1] زیدی صاحب کی کتاب "History of Urdu Literature"

گردش ________

(۲۷) عزیزم رضوی!

تمھارا ۲۰ر نومبر کا خط ملا۔

مجھے یاد نہیں تمھارے کسی پچھلے خط کا جواب میری طرف نکلتا ہے مگر سہو کا امکان بھی ہے۔ تم ضرور میرے حق میں دعا کرتے رہو۔ تھوڑا بہت کام رہ گیا ہے، وہ بھی پورا ہو جائے تو اچھا ہے۔

بیدار اس مہینے آنے والے ہیں۔ رائے اینڈ کمپنی نے "راستے کا سوال" جنوری میں چھاپنے کو کہا تھا۔ بیدار آئیں تو اس کی تصدیق ہو۔ میں پہلے سے بہتر ہوں۔ ایک انجکشن ہے جو نیویارک ہی میں بنتا ہے بیدار نے منیب الرحمان کو لکھ کر منگوا دیا تھا۔ انجکشن مہنگا ہے۔ ایک پندرہ سو کا ہے۔ مجھے ہفتے میں دو کی ضرورت ہے۔ چھ ہزار روپے ہر مہینہ

Dallysis پر خرچ ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اسّی سال کے آدمی پر اتنا خرچ ٹھیک نہیں۔ صرف ڈائی لیسس پر ہی اکتفا کرنا چاہتا تھا مگر لڑکیوں کو معلوم ہوا تو مجھ سے آ کر لڑنے لگیں۔ میں بودا آدمی تو ہوں ہی، ہتھیار ڈال دیے لڑکیوں کے سامنے۔

اب کتابیں چھاپنے کے لیے بھاگ دوڑ میرے بس کی نہیں۔ شاہد علی خاں آجکل بمبئی آئے ہوئے ہیں۔ انھیں فون کر کے کہا وہ چھاپ لیں۔ بعد کی نظمیں بھی "سر و ساماں" ہی میں شامل کر لیں۔ اب وہ اتوار کو میرے پاس آئیں گے۔ اطہر فاروقی دلّی میں ہندی اڈیشن چھپوا رہے ہیں "خودنوشت" دلی اردو اکادمی چھاپ رہی ہے۔ جو کتاب پہلے چھپ جائے گی تمھیں پتہ چل جائے گا۔

امید ہے تم خیریت سے ہو گے۔ بیدار کا رات فون آیا۔ وہ ۲۶ر دسمبر کو آ رہے ہیں۔

اخترالایمان
۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء

---

(۲۸) عزیزم غلام رضوی گردش

یہ تمھارے خط کا جواب نہیں اس کی رسید ہے۔ لکھنا پڑھنا مشکل ہے۔ آنکھ جواب دے گئی ہے۔ نئے نمبر کے لیے آج ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔

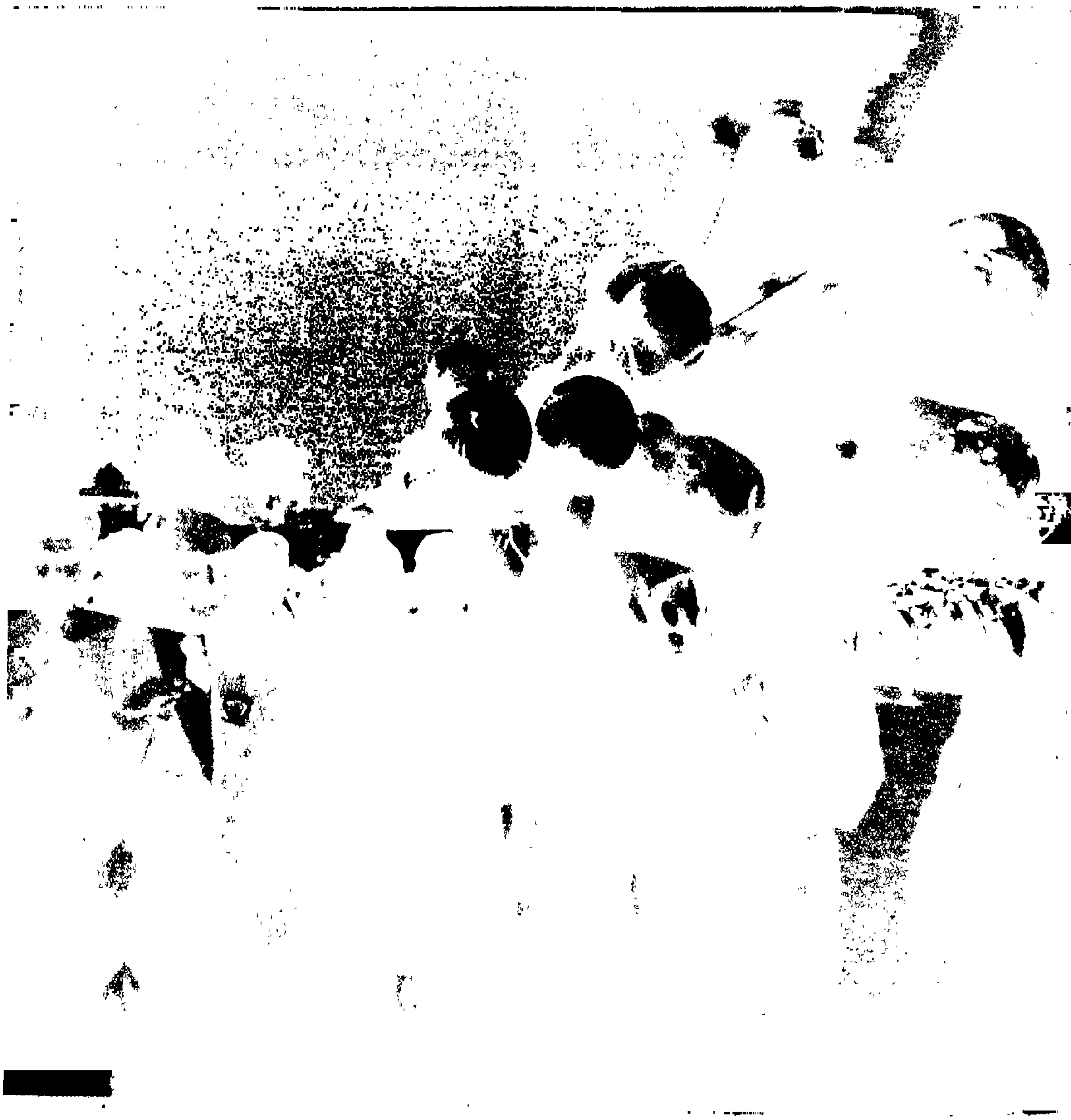
Quarry of the Road کے لیے بیدار بخت نے روپا پبلیکیشن کو لکھ دیا ہے۔ کتاب چھپتے ہی تمھیں بھجوا دیں گے۔ شاید جون کے پہلے دوسرے ہفتے تک آ جائے۔

امید ہے تم خیریت سے ہو گے۔

بیٹی کی شادی مبارک۔ میں اچھا ہوں۔ ان دنوں کے حساب سے۔

اخترالایمان
۲۲ر مئی ۹۵ء

□□









گورنر شری رمیش بھنڈاری موہن لال گنج میں بخار کے مریضوں کو دیکھتے ہوئے

بہانے

بے بسی اجتناب بن ہی گئی
پھر بھی صدم اک خلش سی ہے
اک نظر تم کو دیکھ لینے کی
دل بہانے تلاش کرتا ہے
غیر کی ہو کے کیسی لگتی ہو !

ماسوا یہ بھی ایک اُلجھن ہے
روشنی دل کی گھٹتی جاتی ہے
یادِ ماضی بھی ہو گئی دُھندلی

نغمے بے رنگ و بے مزا سے ہیں
دل میں کچھ درد ہی جگا لاؤں
تاکہ نغموں کی آگ جل جائے
زندگی اور تھوڑی چل جائے
بے رُخی یا کہ دل نوازی ہو
تیرے چہرے کی دلکشی ہی سے
اپنا ماضی سمیٹ لاؤں گا
تاکہ جلتا رہے دیا دل کا

ماسوا اس کے کچھ نہیں لینا
بس تمہیں پھر سے دیکھ آنا ہے

شورش صدیقی
ڈی ۲/۲ میپسرل کالونی
لکھنؤ

ثلاثی

سنورنے والے مقدر سنور گئے کب کے
وہ بے قرار امیدوں کے ساتھ بیٹھا ہے !
نوازشات کے موسم گزر گئے کب کے

○

حصارِ ابر سے پہنچی زمیں کی باہوں میں
ہر ایک بوند سفر کو تمام کرتی ہے !
سکون لیتی نہیں ہے طویل راہوں میں

○

خواب بے چین ہو چکے ہیں بہت
کوئی تعبیر مل نہیں پائی !
قیمتی وقت کھو چکے ہیں بہت

○

ہم زمینوں سے منہ چُراتے ہیں
آسمانوں کی بات کرتے ہیں !
زندگی مُفت میں گنواتے ہیں

○

ٹھہر جاؤ کہ رات باقی ہے
آؤ سوچیں ہم ایک دل ہو کر !
کون سی اور بات باقی ہے

□□

آس زیدی سکندرپوری
۴۹۴ سیکٹر ۵
وکاس نگر
کرسی روڈ
لکھنؤ

اخبار بینی

پھر فلسطین پر بم گرا،
اَن گنت لوگ مارے گئے۔
کوسی ندی کے سیلاب میں،
سیکڑوں بے مکاں ہو گئے۔
پھر بنارس میں سوکھا پڑا،
بھوک کی آگ میں جسم و جاں جل گئے۔
شہر شملہ میں بس
یاتری سب کے سب موت کے غار میں۔
شر پسندوں کی گولی سے پھر درجنوں
بے گناہ چل بسے۔
خوف و دہشت کی پھر ایک آندھی اُٹھی،
کل زباں نام کا اک تماشہ ہوا
لفظ لوگوں کے گھر کھا گئے ___

اور بھی اس طرح کی
کئی سرخیوں سے
ہمارا تعلق
فقط اس قدر
کہ ہمیں صبح کی چائے کی طرح
اخبار بینی کی عادت بھی ہے !!

غضنفر
اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر
۱۰۔ اے، مدن موہن مالویہ مارگ
لکھنؤ

انگریزی افسانہ

گی ڈی. موپاساں

ترجمہ: ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی
شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

آسودہ حالی

چلتے کا وقت تھا اور ابھی لیمپ روشن کر کے نہیں لائے گئے تھے۔ ٹیلہ سے سمندر کا پورا منظر نظر آرہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے آسمان کو سنہرے گوٹے والی لال چادر کی شکل دے دی تھی۔ بحر روم مکمل سکوت کی حالت میں وارنش شدہ دھات کی وسیع سطح کی مانند نظر آرہا تھا۔

دور بہت دور دائیں جانب مغربی سمت کے ارغوانی رنگ میں اپنی کالی فلک بوس بلندیوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہاڑ موجود تھے۔

وہ لوگ ایک قدیم عشقیہ افسانے کو دہرا رہے تھے جس کے ہر پیچ وخم کو کئی کئی مرتبہ بیان کیا جا چکا تھا۔ اداس تاریکی میں کبھی کسی مرد کی آواز میں لفظ محبت اور کبھی کسی عورت کی بلند اور واضح آواز میں کہا گیا یہ لفظ اس چھوٹے سے کمرے کو جیسے محبت کے جذبے سے پُر کیے دے رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ 'محبت'، کسی روح کی مانند کمرے میں چکر لگا رہی ہے۔

"کیا کوئی شخص مسلسل اتنے برسوں تک محبت کر سکتا ہے۔؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔!" بعض لوگوں نے تائید کی۔

"نہیں" کچھ لوگوں نے اس کے برخلاف رائے ظاہر کی۔

انھوں نے مختلف واقعات کو نوعیت اور حالات کی بنیاد پر علاحدہ علاحدہ انداز میں پیش کیا۔ وہاں موجود تمام مردوں، عورتوں کے لبوں پر ایسی یادیں مچلنے لگی تھیں جن سے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ان سب نے دو افراد کے درمیان پائے جانے والے اس پراسرار جذبے اور زبردست دلچسپی کی برتری کو تسلیم کر لیا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک شخص نے دوسروں کو متوجہ کیا جس کی نگاہیں دور کے ایک منظر پر لگی ہوئی تھیں۔

"ارے! دیکھو! وہ کیا ہے؟"

سمندر کے اس طرف دھند کی لگار پر کوئی بھوری بے شکل شے اُبھر رہی تھی۔

عورتیں کھڑی ہو گئی تھیں اور اس حیرت انگیز شے کو بغیر سمجھے ہوئے دیکھے جا رہی تھیں۔ ان میں سے شاید کسی نے ایسا حیرت انگیز نظارہ اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔

"یہ کورسیکا (CORISCA) ہے۔" کوئی بولا۔ "اسے سال میں محض دو یا تین مرتبہ غیر معمولی ماحولیاتی حالات میں دیکھا جا سکتا ہے جب ہوا اتنی صاف وشفاف ہوتی ہے کہ پانی کی دھند اس میں شامل نہ ہو جو دور کی اشیاء کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتی ہے۔"

وہ لوگ اس وقت پہاڑوں کی چوٹیاں الگ الگ دیکھ سکتے تھے۔ اور خواہش کر رہے تھے کہ چوٹیوں پر جمی برف بھی دیکھ سکیں۔ ان میں سے ہر شخص متحیر تھا، پریشان تھا اس دنیا کے اچانک نمودار ہونے سے خوف زدہ تھا۔ ایسے حیرت انگیز نظارے انھوں نے ہی دیکھے تھے جو کولمبس کی طرح غیر معروف سمندروں میں پھرتے رہے تھے۔

تبھی ایک بوڑھا شخص، جو اب تک خاموش تھا، یوں مخاطب ہوا۔

"حیرت ناک طور پر اس جزیرے نے مجھے ایک واقعہ کی یاد دلا دی ہے جس کا تعلق ان باتوں سے ہے، جو کچھ دیر قبل ہم لوگ کر رہے تھے، میں ایک ایسے جوڑے کے قریب رہ چکا ہوں جو وفا کی نایاب مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ محبت وفاشعاری ہی کا نہیں بلکہ شادمانی کا بھی نمونہ تھی۔

پانچ برس قبل میں کورسیکا گیا تھا۔ یہ بیابان جزیرہ امریکا کے

مقابلے میں ہم سے زیادہ دور اور زیادہ غیر معروف ہے اس حقیقت کے باوجود کہ اسے فرانس کے ساحل سے آج کی طرح وقتاً فوقتاً دیکھا جاسکتا ہے۔

تصور کرو بے ترتیبی سے بھری ایک ایسی دنیا کا جہاں پہاڑوں کے طویل سلسلوں کو علاحدہ کرنے والی انتہائی تنگ گھاٹیاں ہوں اور جھاگ اڑاتے ہوئے تیز رو آبشار گر رہے ہوں، جہاں برائے نام بھی مسطح زمین نہ ہو بلکہ گرینائٹ کے بڑے اور ہیبت ناک تودے بکھرے پڑے ہوں جن پر گنجان پود سے اور چیڑ نیز شاہ بلوط کے جنگلات پھیلے ہوں۔ زمین غیر مزروعہ ہے اور آبادی سے خالی قطعات ہیں حالاں کہ یہاں وہاں اکا دکا کسی گاؤں کا نشان پایا جاسکتا ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر چٹانوں کے ڈھیر کی مانند نظر آتا ہے۔ وہاں کوئی تہذیب، کوئی صنعت اور کوئی فن نہیں ہے۔ تراشیدہ لکڑی یا سنگ تراشی کا کوئی نمونہ نہیں ملتا جس سے کسی تہذیب کی وراثت کے مزاج کا یا خوبصورت اشیاء کے تئیں کسی دل چسپی کا پتہ چلتا ہو اس پُر آسائش ملک میں یہی چیز سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ یہاں اس مسحور کُن دل کشی کے تئیں موروثی طور سے بے اعتنائی پائی جاتی ہے جسے عرفِ عام میں فن کہتے ہیں۔

اٹلی، جہاں ہر محل فن پاروں سے پُر ہے، بذات خود ایک شہ پارہ ہے، جہاں سنگ مرمر، لکڑی، جستہ، لوہا بلکہ تمام دھاتیں اور ہر قسم کے پتھر انسانی عقل کے ثبوت پیش کرتے ہیں، جہاں قدیم مکانات میں چھوٹی سے چھوٹی موروثی چیز خوبصورتی کے تئیں روحانی نظریے کا اظہار کرتی ہے۔ ایسا ملک ہم سب کے لیے مقدس اور محبوب ہے کیوں کہ یہ تخلیقی صلاحیت کی حکمرانی، طاقت، شان و شوکت اور عظمت و رفعت کے اثر کا نہ صرف مظاہرہ کرتی ہے بلکہ ثبوت بھی پیش کرتی ہے۔

اس کے برعکس کورسیکا اپنی اسی شکل و صورت میں آج بھی واقع ہے جیسا کہ ابتدائی ایام میں تھا۔ یہاں آدمی اپنے بدہیئت مکان میں رہتا ہے، ایسی تمام باتوں سے بے اعتنائی برتتا ہے جو اس کے وجود یا اس کے خاندانی جھگڑوں پر اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔ وہ یہاں غیر مہذب اقوام کی خامیوں اور صفات کے ساتھ زندہ رہا ہے۔ وہ تشدد کی حد تک نفرت کرتا ہے، جبلّی طور پر خون کا پیاسا ہے لیکن ساتھ ہی وہ مہمان نواز، فیاض، تقدس کا حامل، سادہ لوح، ہر راہ گیر کے لیے اپنے دروازے کھولنے والا اور معمولی سی ہمدردی دکھانے پر بھی دوستی کے لیے جان دینے والا ہے۔

ایک ماہ تک میں اس حیرت انگیز جزیرے میں گھومتا رہا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں دنیا کے آخری سرے پر ہوں۔ وہاں کوئی سرائے، مسافر خانہ یا کوئی سڑک نہیں ہے۔ خچروں کے ذریعے ان مواضعات تک پہنچا جاتا ہے جو پہاڑوں کے سلسلوں کے پہلو میں ہیں اور جن کی بلندیوں سے بل کھاتی ندیاں نظر آتی ہیں جن کی گہرائی سے اُبلنے والے پانی کے فوارے شام کی خاموشی میں ایک موسیقی پیدا کرتے ہیں۔

مسافر مکانات کے دروازوں پر رات گزارنے کی درخواست کے ساتھ دستک دیتا ہے اور دوسرے دن تک کے لیے کھانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے وہ سادہ سی کھانے کی میز پر کھاتا ہے اور معمولی سی چھت کے نیچے سوتا ہے اور صبح دم اپنے میزبان کا ہاتھ ہلا کر اسے بیدار کرتا ہے جو اس کو گاؤں کے باہر تک وداع کرنے جاتا ہے۔

ایک شام تقریباً دس گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد میں ایک چھوٹے سے ایسے مکان کے پاس پہنچا جو ایک تنگ وادی کی گہرائی میں واقع تنہا مکان تھا۔ یہ وادی آگے جاکر سمندر پر ختم ہوتی تھی۔ پہاڑ کی دو رویہ ڈھلانیں دو غم آلود دیواروں کی مانند تھیں جو اس ناقابل بیان غم گیں تنہائی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

جھونپڑی کے اطراف میں چند بیلیں پھیلی ہوئی تھیں، ایک چھوٹا باغیچہ تھا اور کچھ فاصلہ پر شاہ بلوط کے اتنے درخت تھے جو گزارے کے لیے کافی ہوتے اور جو اس قطعہ آراضی میں سرائے کی حیثیت رکھتے تھے۔

دروازہ کھولنے والا شخص بوڑھا، سخت نقش و نگار والا صاف پوش مرد تھا جو وہاں کے لیے ایک غیر معمولی بات تھی۔ بید کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بغیر ایک لفظ بولے بیٹھ گیا۔

"براہِ مہربانی انھیں معاف کریں۔" اس کی بیوی نے مجھ سے کہا۔ "اب یہ بہرے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۲ برس ہے۔"

وہ بہترین فرانسیسی بول رہی تھی۔ میں حیرت زدہ تھا۔

"آپ لوگ کورسیکا کے اصل باشندے نہیں ہیں؟" میں نے

اس سے دریافت کیا۔

"نہیں۔" اس نے بتایا: "ہمارا تعلق برٹش ... سے ہے۔ لیکن ہم لوگ یہاں گزشتہ پچاس برسوں سے آباد ہیں۔"

شہروں اور انسانوں کی زندگی سے اتنی دور اس تاریک جھونپڑی میں گزارے گئے پچاس برسوں کے تصور نے میرے اندر دہشت اور کرب کے احساسات پیدا کر دیئے تھے۔ ایک بوڑھا گڈریا اندر داخل ہوا اور ہم رات کے کھانے کے لیے میٹر 'سوپ' کھانے لگے جس میں آلو، خشک گوشت اور بندگوبھی کو ایک ساتھ اُبال کر تیار کیا گیا تھا۔

جب یہ مختصر کھانا ختم ہو گیا تو میں باہر جا کر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ میرا دل اس تاریک و اُداس قطعۂ آراضی کی وحشت ناکی سے بُری طرح افسردہ ہو رہا تھا۔ میرے اوپر غمگینی کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی مسافر کو ویران مقامات پر اداس شاموں میں اکثر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام چیزیں خاتمہ کی طرف جا رہی ہیں حتیٰ کہ بذاتِ خود زندگی اور کائنات بھی۔ ایسی زندگی جس میں مکمل تنہائی ہو، ہر شے کا فقدان ہو اور دلوں میں ویرانی کا احساس ہو اور جو فریب اور خوش آئند خوابوں کی دنیا کی سیر کراتی رہے، یہاں تک کہ موت آجائے۔

وہ بوڑھی عورت بھی میرے قریب آ بیٹھی تھی اور جستجو کے اس جذبے سے جو مایوس ترین شخص کے دل میں بھی موجود رہتا ہے اس نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔

"اچھا تو تمھارا تعلق فرانس سے ہے۔؟"

"ہاں! میں سیر و تفریح کے لیے نکلا ہوں۔"

"تم شاید پیرس کے باشندے ہو؟"

"نہیں، میں نینسی (NANCY) میں رہتا ہوں۔"

اس موقع پر مجھے محسوس ہوا جیسے اس پر غیر معمولی جوش کا غلبہ ہو گیا ہو۔ مجھے اس کا احساس کیسے ہوا یا میں نے یہ کیسے دیکھا، میں نہیں سمجھ سکتا۔

"تم نینسی سے ہی آئے ہو۔؟" اس نے اپنا سوال دُہرایا۔

اس کا شوہر دروازے پر دکھائی دیا۔ وہ دوسرے تمام بہرے افراد کی طرح لاتعلق نظر آ رہا تھا۔

"اس کی آمد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "وہ سن نہیں سکتا۔"

پھر چند لمحات کے بعد وہ مخاطب ہوئی۔

"تو تم نینسی کے لوگوں کو جانتے ہو گے؟"

"ہاں کیوں نہیں، تقریباً سبھی کو۔"

"سینٹ الائزے (SAINTE - ALLAIZE) خاندان کو بھی؟"

"ہاں بہت اچھی طرح۔ وہ لوگ میرے والد کے دوست تھے۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو وہ مجھے بغور دیکھتی رہی۔ پھر ایسی ضعیف آواز میں بولی جو یادوں کے جھرمٹ سے نکلتی ہے۔

"ہاں ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور برزینو (BRISENAVES) خاندان کا کیا ہوا۔؟"

"وہ سب مر چکے ہیں۔"

"آہ! اور سرمانٹس (SIRMONTS)، کیا تم انھیں جانتے ہو؟"

"ہاں۔ ان میں سے سب سے چھوٹا ایک جنرل ہے۔"

یہ سُن کر، مجھے نہیں معلوم کہ کس زبردست جذبے سے متاثر ہو کر، جوش سے کانپتے ہوئے وہ اپنے دل کے تمام راز بتانے کے لیے تیار ہو گئی جنھیں اس نے اب تک بڑی گہرائی میں چھپا رکھا تھا اور ان افراد کے نام بھی جو اس نے اپنے دل کی گہرائی میں بند کر رکھے تھے۔

"ہاں۔ ہینری دی سرمانت۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اور اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

بہت پہلے اشراف کی بستی لورین میں ایک بہت بڑا اسکینڈل ہوا تھا۔ ایک نوجوان، خوبصورت اور امیر لڑکی سوزان دی سرمانت اس رجمنٹ کے ایک نان کمیشنڈ افسر کے ساتھ فرار ہو گئی تھی جس کے کمانڈر خود اس کے والد تھے۔

وہ ایک دلکش نوجوان تھا۔ اس کے والدین کسان تھے۔ لیکن وہ خوش پوشی کے لیے نیلی فوجی صدری پہنتا تھا جس نے اپنے کرنل کی

میڈ کا دل جیت لیا تھا۔ بے شک اس نے اسے دیکھا تھا اور اسکواڈرن کے مارچ پاسٹ کے موقع پر اس کی راہ میں کھڑی رہی تھی اور اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ لیکن کیسے اس نے اس سے بات کی تھی اور کیسے وہ دونوں ملاقات کر سکے تھے اور کیسے ان دونوں میں رضامندی ہوئی تھی؟ کیسے اس نے اس نوجوان کو محسوس کرانے کی ہمت کی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔؟ یہ باتیں کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکی تھیں۔

کسی بات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور نہ ہی آنے والے واقعات کو کوئی دیکھ سکا تھا۔ ایک شام جب سپاہی اپنی ڈیوٹی پوری کر چکا تو وہ اسے لیکر فرار ہو گیا۔ ان کی تلاش کی گئی مگر وہ نہیں ملے۔ ان کے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں مل پائی اور اس کے بارے میں سوچ لیا گیا کہ وہ مر چکی ہے۔

اور اس دن اس طرح میں نے اسے اس ویران وادی میں پا لیا تھا۔

پھر میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا،

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ مِس سوزان ہیں۔"

اس نے سر کو حرکت دے کر حامی بھری۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پھر جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہوئے بے حس و حرکت بوڑھے کی جانب نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے بولی،

"یہ وہی ہیں۔"

اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ آج بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اب بھی اسے محبت میں اندھی ہو کر دیکھتی ہے۔

کم سے کم آپ دونوں نے پُرمسرّت زندگی گزاری۔؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

اس نے دل کی گہرائی سے نکلنے والی آواز میں جواب دیا:

"ہاں بہت خوش۔ انھوں نے مجھے بہت خوشی دی۔ مجھے اپنے فیصلے پر کبھی پشیمان نہیں ہونا پڑا۔"

میں نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ میں محبت کی طاقت پر کچھ ملول، متحیّر اور عجیب احساسات کے غلبہ میں تھا۔ یہ امیر لڑکی اس آدمی ـــــ اس کسان کے پیچھے چلی آئی تھی۔ اس نے ایک ایسی زندگی کا انتخاب کیا تھا جس میں دل کشی، آسائش یا کسی قسم کی نفاست کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے خود کو مکمل طور پر ایک سادہ زندگی کا عادی بنا لیا تھا، اور وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ معمولی کپڑوں کی ایک اسکرٹ اور ٹوپی کے ساتھ اس دیہاتی گنوار کی بیوی بن گئی تھی۔ وہ بید کی کرسی پر بیٹھتی تھی اور بے ڈھنگی سی میز پر مٹی کے برتن میں آلو، بند گوبھی اور گوشت سے تیار سادہ کھانا کھاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ پیال پر سوتی تھی۔

اس نے اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے زیورات، عمدہ ملبوسات، نئے فیشن، آرام دہ کرسیوں کی راحت، خوشبودار رنگین پردوں والے کمروں اور دھنس جانے والے آرام دہ بستروں کے نہ ہونے پر کبھی افسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے اس کے علاوہ کبھی کسی دوسری چیز کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ صرف وہ وہاں رہے، اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں چاہتی تھی۔

اپنی نوجوانی میں اس نے زندگی کی آسائش اور دنیا کی دلچسپیوں نیز ان لوگوں کو بھی چھوڑ دیا تھا جنھوں نے اسے پیار دیا تھا، اس کی پرورش کی تھی، وہ اس کے ساتھ تنہا یہاں اس بیابان وادی میں چلی آئی تھی۔ وہ اس کے لیے سب کچھ تھا، وہ سب کچھ جس کی تمنّا ایک عورت کرتی ہے اور جس کا خواب دیکھتی ہے۔ جس کی وہ ہمیشہ منتظر رہتی ہے، اور وہ سب کچھ جس سے وہ کبھی مایوس نہیں ہوتی ہے۔ اس نے اس کے (سوزان کے) وجود کو شروع سے آخر تک خوشیوں سے بھر دیا تھا۔

وہ اس سے زیادہ خوشی حاصل نہ کر پائی ہوتی۔ میں پوری رات اس حیرت انگیز اور جرأت مندانہ قدم، اس کی اتنے کم لوازمات پر مبنی اتنی مکمل و بھرپور خوشی کے بارے میں غور کرتا رہا جبکہ مجھے اس کے قریب لیٹے ہوئے بوڑھے سپاہی کی بھاری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی جس نے اس کا اس حد تک ساتھ دیا تھا۔

اگلی صبح میں اس بوڑھے جوڑے سے ہاتھ ملا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔"

کہانی سنانے والا خاموش ہو گیا تھا۔ ایک عورت بولی،

"اس کے باوجود کہ اس کا آدرش اتنا سہل الحصول، اس کی ضروریات اتنی کم اور ابتدائی زندگی سے اس کے مطالبات اتنے سادہ تھے کہ وہ ضرور ایک بے وقوف لڑکی رہی ہوگی۔"

ایک دوسری عورت دھیرے سے بولی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ خوش تھی نا۔؟"

"دنیا کے کنارے پر کورسیکا رات میں دور ہوتا جا رہا تھا اور واپس سمندر

ظفر حیدری
(ہمدانیہ کالونی۔ بمنہ۔ سری نگر، کشمیر)
۱۹۰۰۱۰

ہندستان کے دو ممتاز مذہبی اور سیاسی رہنما

عبدالباری فرنگی محلی اور موتی لال نہرو

لکھنؤ میں ایّام گزشتہ میں فرنگی محل علم و اخلاق، فضل و کمال، زُہد و ورع، ایمان و معرفت، درس و تدریس اور مذہبی امور میں فتوے صادر کرنے میں مشہور تھا۔ یہاں کے علما علم و فقہ اور قرآن و حدیث میں بے نظیر تھے۔ متاخرین میں مولوی عبدالحیُ کے بعد حضرت قیام الدین مولوی حاجی محمد عبدالباری فرنگی محلی کی ذاتِ گرامی قابلِ فخر تھی۔ موصوف نے مولوی عبدالحیٗ صاحب کے شاگرد خاص مولوی عین القضاۃ سے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر حجاز گئے وہاں سے حدیث کی سند حاصل کی، ملک شام کا سفر کیا، علما سے فیض اٹھایا، مدینہ سے ہندستان واپس آئے اور خدام کعبہ میں پر جوش تقریر کی۔ پھر مجلس خلافت اور جمعیۃ العلماء کی تاسیس میں حصّہ لیا۔ فرنگی محل میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد رکھی جو اب تک قائم ہے۔ ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس و مطالعہ اور تحریر و تالیف اُن کے روز مرّہ مشاغل تھے۔ فقہ حنفی کے پُرجوش حامی تھے اور ان کی قلمی و علمی کوششیں زیادہ تر اسی کے متعلق صرف ہوتی تھیں۔ انھوں نے کم و بیش سّو چھوٹی بڑی تصنیفات و رسائل کی فہرست یادگار چھوڑی۔ ان میں سب سے مفید کتاب تفسیر تھی جو نا تمام رہی۔ وہ عالم متبحر تھے اس لیے محمد علی جوہر انھیں اپنا پیر و مرشد سمجھتے تھے۔

عبدالباری صاحب ترکِ موالات اور آزادیِ ہند کے زبردست حامی تھے۔ وہ مکمّل آزادیِ ہند کے علمبرداروں میں تھے۔ اس کا اظہار اس شکل میں ہوا تھا کہ انھوں نے ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی، جس کا کھلا ہوا نصب العین مکمل آزادی تھا، اصولی تائید کی تھی۔ بقول مولوی آزاد سُبحانی فرنگی محلی اس تائید کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد کا خاندان فرنگی محل اور علمائے فرنگی محل کے ایک ممتاز رکن کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہو گئے تھے۔

مولوی عبدالباری صاحب ۹ ربیع الثانی ۱۲۹۵ ھجری (اپریل ۱۸۷۸ء) کو بروز یکشنبہ عالم ظہور میں آئے اور اکیاسویں سال میں ابھی آپ نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ۲ رجب ۱۳۴۴ھ (۱۷ جنوری ۱۹۲۶ء) کو ان پر فالج کا زبردست حملہ ہوا۔ ۵۶ گھنٹے اس مرض میں مبتلا ہو کر ۴ رجب یعنی ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء کو سوا گیارہ بجے شب میں انتقال کیا۔ تدفین ۵ رجب (۲۰ جنوری) دوپہر کو باغ مولوی انوار میں اپنے والد ماجد مولوی عبدالوہاب کے پائیں سنگ مرمر کے ایک کٹہرے میں ہوئی جو پہلے سے ہی تیار تھا۔ جلوسِ جنازہ میں لوگوں کا بڑا اجتماع تھا۔ ان کی وفات پر ان کے مخالفین نے بھی زبردست صدمے کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بقول آزاد سُبحانی تین زبردست یادگاریں چھوڑیں: (۱) مسند علم و روحانیت (۲) خدام الحرمین (۳) مکمل آزادیِ ہند کی آرزو و تائید

مولوی آزاد سُبحانی فرنگی محلی کو بھی مرحوم سے بعض امور میں اختلاف تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے رنج و الم کے عالم میں مرحوم کی رُوح کو درج ذیل اشعار میں خراج عقیدت پیش کیا تھا ؎

تری وداع پہ ہے خلق اشکبار بہت
کہ تھی تو خادمِ خلق اور وفا شعار بہت
تو ذی کمال تھی اور تیرے عزم عالی تھے
ترے عمل سے تھے آباد کاروبار بہت
تو فتح و خوبی و انجام پر بھی قابض تھی
زمانہ یعنی رہا تجھ سے [illegible] بہت

تو بے قرار تھی اور بے قرار رکھتی تھی
تری روش میں تھا انداز روزگار بہت
شعور میں ترے تھوڑے ہی عزم ابھرے ہیں
دبے ہوئے ہیں بہ حسرت تہ مزار بہت
تھی معرفت تری دشوار مثل رمز عمیق
زبسکہ تھی تری تعبیر کہنہ دار بہت
کریں گے قدر تری آگے چل کے اہلِ زماں
ترے ارادوں کے جب ہوں گے رازدار بہت
مٹی نہیں ہے تو دنیا سے بھی کسی صورت
کہ تو نے چھوڑی ہیں اشکال یادگار بہت
رکھے گا زندہ انہیں یہ عزمِ شبحانی
وہ اپنے دوش پہ رکھتا ہے گرچہ بار بہت

موتی لال نہرو

پنڈت جی عبد الباری مرحوم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ دونوں میں گہرے روابط اور پائدار دوستی کے علاوہ مراسلت بھی جاری تھی۔ پنڈت جی کو مرحوم سے بڑی عقیدت تھی اور اہم سیاسی امور میں ان سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ پنڈت جی سن ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دہلی کے کوتوال تھے۔ اپنے والد کی وفات کے تین چار ماہ بعد یتیم ہی پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر تک وہ مکتب میں عربی فارسی پڑھتے رہے اس کے بعد ان کے بڑے بھائی نندلال نے کان پور آکر گورنمنٹ ہائی اسکول کان پور میں ان کا داخلہ کرا دیا۔ یہاں سے وہ انٹرنس پاس کر کے میور کالج الہ آباد میں داخل ہو گئے اور چار سال تک اسی کالج میں پڑھتے رہے، بی۔ اے میں ناکام ہونے کے بعد میں وکالت کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوئے۔ ۱۸۸۳ء میں کان پور میں ہی وکالت شروع کی۔ ۱۸۸۶ء میں الہ آباد گئے۔

پنڈت جی دو بار کانگرس کے صدر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں امرتسر کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک موالات سے متاثر ہو کر اس تحریک میں شامل ہو گئے اور وکالت کا پیشہ ترک کیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کو پنڈت جی کو سزا ہو گئی۔ ۱۹۲۳ء میں اسمبلی کانگرس پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ الہ آباد میں ایک عالیشان محل "آنند بھون" تعمیر کیا جو بعد میں "سوراج بھون" کے نام سے مشہور ہو گیا اور کانگرس کے لیے وقف کر دیا۔

فروری ۱۹۳۱ء کے آغاز میں انتقال کیا۔ پنڈت جی کی لاش قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر سے الہ آباد لائی گئی۔ گاندھی جی خود ان کی لاش کے ساتھ موجود تھے اور اپنے ہاتھ سے ان کی چِتا پر چند لکڑیاں رکھ کر اپنی دلی محبت کا اظہار کیا۔ لچھمن پرشاد تخلص صدر نے تاریخ کہی ؎

لکھی صدرِ نیم جاں نے عیسوی تاریخ
ہو گئی بے وقت موتی لال نہرو کی وفات

پنڈت جی کی وفات پر کئی شاعروں نے مرثیے لکھے۔ ان میں آنند نرائن مُلّا اور برج موہن دتاتریہ کیفیؔ قابلِ ذکر ہیں۔ ذیل میں کیفیؔ کے چند بند درج کیے جاتے ہیں ؎

آج ماتم کدہ کیا صرف ہے آنند بھون
مرغِ بسمل ہے ترے سوگ میں ہر اہلِ وطن
چاک ماتم میں نہیں کون سا ہے وہ دامن
لارڈ اِروِن کو بھی صدمہ ہے رنج و محن
زندگی ہو تو یہ۔ اور موت ہو تو ایسی ہو
یار و اغیار کا دل جس کے لیے زخمی ہو

قید اور بند میں دن جن کے گزر جاتے ہیں
وہی آزاد بندھی قوموں کو کر جاتے ہیں
وہ نہیں مرتے نہ سمجھو کہ وہ مر جاتے ہیں
سنگِ بنیاد وہ آزادی کا دھر جاتے ہیں
خدمتِ قوم میں جو رنج و الم سہتے ہیں
وہ شہیدانِ وطن ہی تو امر رہتے ہیں

حبِّ قومی و تدبّر کا ہوا تجھ سے نام
تھے لیاقت کے تری "مالک تحریر" غلام
غمزدہ کیوں نہ ترے ہجر میں ہو ملک تمام
کیوں نہ کل ہند میں ماتم سے مچا ہو کہرام
بحر اور کوہ سے نکلیں گے بہت موتی لال
دوسرا ہند میں پیدا ہو تو ہو موتی لال

موتی لال نہرو کے دادا پنڈت راج کول فارسی کے عالم تھے۔ موتی لال بھی فارسی شعر و ادب سے خاصی دل چسپی رکھتے تھے۔ عربی سے بھی آشنا تھے اور گھر کی زبان اُردو تھی۔ مشرقی علوم اور اسلامی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کا ایک فال نامہ بعنوان "لسان الغیب" ستمبر ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دوسرے صفحہ پر ناشر نے موتی لال نہرو کا تعارف درج ذیل الفاظ میں کرایا ہے :

"لسان الغیب یعنی فالنامہ جس کو صاحب فہم و ذکا
پنڈت موتی لال کول عرف نہرو طالب علم گورنمنٹ ہائی اسکول
کان پور سلمہ اللہ تعالیٰ نے بغرض جنتری ہذا شہنشاہ نپولین کے
مشہور فالنامہ انگریزی سے ترجمہ کیا۔ ماہ ستمبر ۱۸۸۶ء۔"

رسالہ کے سرورق پر یہ عبارت مرقوم ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم
لسان الغیب / معروف بہ / فال نامہ۔ ۱۳۰۴ ہجری

لسان الغیب حافظ شیرازی کا خطاب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی نے دیوانِ حافظ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

تیج بہادر سپرو (م ۱۹۴۹ء) نے کشمیری پنڈتوں کی فلاح و بہبود اور فروغ تعلیم کے حصول کے لیے الٰہ آباد میں ایک اُردو رسالہ "کشمیر درپن" کے نام سے جنوری ۱۹۰۲ء میں جاری کیا۔ اس کے متعدد شمارے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ اس میں جو کشمیری لکھتے تھے ان میں سے چند نام یہ ہیں، برج موہن دتاتریہ کیفی، پنڈت منوہر لال زتشی، آنریبل بشمبر ناتھ، جگ موہن رینہ شوق، شیونرائن بہار، برج نرائن چکبست، دوارکا ناتھ تکو، پنڈت موتی لال نہرو۔

کشمیر درپن الٰہ آباد جلد ۵، شمارہ ۳ ضمیمہ مارچ ۱۹۰۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو کا طویل خطبۂ صدارت جو انھوں نے اُردو میں "الٰہ آباد میں انڈین نیشنل کانگرس کی پہلی صوبائی کانفرنس میں پڑھا تھا، شائع ہوا۔ خطبہ تقریباً سولہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کا عنوان ہے: "پنڈت موتی لال نہرو ایڈوکیٹ ہائی کورٹ صدر نشین جلسہ کی افتتاحی تقریر"۔ پورا خطبہ گویا کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان میں لکھا گیا۔ اس میں کوئی ہندی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ فارسی اور اُردو اشعار موصوف نے موقع کی مناسبت سے درج کیے ہیں۔ مثلاً

لِلّٰہِ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زُنّار کہتے ہیں

یا یہ شعر دیکھیے

چھو لیا دھوکے سے دامان صبا تو نے تو کیا
غنچۂ گل! کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

ذیل میں خطبے کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :

(الف) "حضرات! آپ نے صوبجات متحدہ کی پہلی پراونشل کانفرنس کا پریسیڈنٹ منتخب کر کے جو عزت مجھے بخشی ہے اس کا میں تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ساتھ ہی اس کے جب میں اپنے اردگرد دوستوں کو بیٹھے ہوئے دیکھتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے فرائض کو مجھ سے بدرجہا بہتر انجام دے سکتا ہے، تو مجھ کو بار بار اپنی بے بضاعتی کا خیال آتا ہے، لیکن میں آپ کے انتخاب کو فرمان قومی سے تعبیر کرتا ہوں اور اس کی تعمیل کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہوں اور محض یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک ایسی عزت کو قبول کر لیا ہے جس کے قابل میں اپنے تئیں نہیں سمجھتا۔"

(ب) "ہز مجسٹی امیر کابل ابھی تھوڑے دن ہوئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کی عزت جیسے کہ مسلمانوں نے کی ویسی ہی ہندوؤں نے کی۔ اس مشرقی بادشاہ نے جس فراخ دلی کا اظہار کیا اس پر کسی مغربی حکمران کو ناز ہو سکتا ہے۔ ہز مجسٹی امیر کابل نے ایک آن واحد میں کل معاملہ کو سمجھ لیا اور بار بار ہندو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق پر زور دیتے رہے۔ کلکتہ میں انھوں نے ایک پشتو کا شعر پڑھا تھا، جس کے معنی ہیں کہ کوئی گلی کوچہ کوئی جگہ ایسی نہیں کہ جہاں ہندو مسلمان مل کر نہ رہ سکتے ہوں۔

اس شعر کا جو مطلب ہے ظاہر ہے۔ اس قول کی صداقت اظہر من الشمس ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم ایسے کام کرنے والے نہیں پاتے۔ اس اصلی قول پر عمل کرنے میں اور اس اعلیٰ خیال کو عمل میں لانے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس بات کا یقین اعتقاد کے درجے تک کہ ہندستان قعرِ ذلت سے نکل کر ضرور ترقی کرے گا۔"

(ج) "وہ کون سی بات ہے جو دو بھائیوں کو خوشی خوشی ملنے اور پیاری ماں کی خدمت کے لیے تیار ہونے سے مانع آتی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کہ حکام والاشان سے خوشنودیِ مزاج کے پروانے حاصل کیے جائیں اور کچھ نہیں ہے اور جیسی جیسی ذلتیں کہ اس جد و جہد میں نصیب ہوتی ہیں اس کا حال کچھ چوٹ کھائے دلوں سے پوچھیے۔ اے مرے مسلمان دوستو! ذرا اپنے عنایت فرماؤں سے ہوشیار رہنا۔ گو دو چار اعلیٰ عہدے آپ کے ہم مذہبوں کو مل گئے تو کیا ہوا۔ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اس میں نفع نہیں ہے بلکہ نقصان ہے۔ قومی ترقی سرکاری عہدوں کے بھروسے نہیں ہو سکتی۔ اس کا راستہ دوسرا ہے۔"

(د) "حضرات! اب تک میں نے آپ کے عزیز وقت اور گراں بہا توجہ پر مداخلت بیجا ایسے امور کے متعلق کی ہے جنھیں اندرونی یا داخلی کہہ سکتے ہیں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے ہم اپنے گھر کا انتظام درست کریں اور اس کے بعد خارجی اصلاحات شروع کی جاویں۔ آپ نہایت قابلیت کی تقریریں، مختلف تجاویز کی تائید میں جو کانفرنس کے سامنے پیش ہوں گی، سنیں گے۔ اس لیے میں نہایت ضروری مسائل زیر غور پر اس وقت مختصر سی بحث کرنا کافی تصور کرتا ہوں۔"

(ہ) "حضرات! مجھے خوف ہے کہ میں نے آپ کے صبر و تحمل کی انتہا کر دی ہے۔ لیکن میں التجا کرتا ہوں کہ تھوڑی اور عرض کرنے کی اجازت ہو۔ اس وقت ہمارا کام اور ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم ایک ایسی قوم بنا کر تیار کریں جو اقوامِ دنیا میں معزز رتبہ [illegible] آسان ہے لیکن کرنا مشکل ہے کیوں کہ

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاص قومی کریکٹر بنا دیا جائے۔ افراد اور فرقوں کے اختلاف مٹا دیئے جائیں اور مشترکہ خیالات کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جائے جو کُل اقوام اور مذاہب پر حاوی ہو۔ اور جس میں اختلافات کی گنجائش نہ ہو۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ملکی معاشرتی اور تمدنی ترقی کی کوشش کی جائے۔"

(و) "تاریخ انگلستان کا وہ نہایت قابلِ فخر دن جو اس کے لیے خاص شوکت کا باعث اور قوم برطانیہ کی اعلیٰ ترین میراث ہوگا، اب محض خوابِ خیال نہیں ہے۔ تقدیر ہم کو روز بروز اس دن سے قریب لیے جا رہی ہے۔ طبقۂ حکام کو اس صبح صادق کے نور سے آنکھ نہ چرانی چاہیے اور نہ ہمارے ہم وطنوں کو غلطی سے اس کو آفتابِ نصف النہار قیاس کر لینا چاہیے بلکہ دونوں کو متفق ہو کر تیرہ اختری کی سیاہی کو شمع خاوری کے سامنے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے دونوں کو جھک کر مؤدبانہ سحر طالع کا استقبال کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ ؎

اے آمدنت باعث آبادیِ ما

ذیل میں وہ خطوط درج کیے جاتے ہیں جو پنڈت موتی لال نہرو نے مولانا عبدالباری صاحب کو اُردو میں لکھے تھے:

۱۲ر اپریل ۱۹۱۹ء

جناب مولانا صاحب! تسلیم و نیاز

بندہ آج بغرض شرکت میٹنگ کونسل الہ آباد سے آیا ہے اور جناب راجہ صاحب محمود آبادؒ کی کوٹھی پر مقیم ہے کل صبح الہ آباد واپس جانے کا ارادہ ہے۔ باعث تکلیف دہی یہ امر ہے کہ زیارت جناب کا خواستگار ہے جو وقت بعد ۵ بجے شام کے آج عنایت ہو۔ اس وقت حاضر ہوں گا۔

فقط۔ موتی لال نہرو

---

(۲) ۲۸ر اپریل ۱۹۱۹ء

مخدوم جناب مولانا صاحب! تسلیم و نیاز

والا نامہ مورخہ ۱۷ رجب ۱۳۳۷ھ میری عدم موجودگی میں صادر ہوا تھا۔ میں کل سفر بمبئی و احمد آباد و دہلی سے واپس آیا ہوں۔ جناب کے مضامین مطبوعہ اخوت شاہان عرب الوطنی پہنچے ہیں۔ فوراً سید حسن صاحب ایڈیٹر "انڈیپنڈنٹ" کے حوالے کر دیئے گئے اور وہ ان کا ترجمہ خود کر رہے ہیں۔ یقین کہ دو ایک روز میں شائع ہو جاوے گا بشرطیکہ انڈپنڈنٹ (INDEPENDENT) بھی اس عرصہ میں قضائے ناگہانی ڈیفنس آف انڈیا کا شکار نہ ہو جائے۔ آج کل ہر دم غنیمت ہے۔ بعد بمبئی کرانیکل کے غالباً انڈپنڈنٹ ہی کی باری ہے۔ یہاں تو آپ کی رہنمائی کیس یہ مقولہ ہے گا

ہر چہ باد ا باد ما کشتی در آب انداختیم

زیادہ نیاز

کمترین موتی لال نہرو

(۳) الہ آباد۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۲۰ء

جناب مولانا صاحب مکرم بندہ زاد الطافہ

تسلیم۔ والا نامہ بمقام بمبئی ایسے موقع پر ملا، جب دو دو تین تین جلسے روزانہ ہو رہے تھے۔ اور صبح سے آدھی رات تک فرصت دشوار تھی۔ اس درمیان گاندھی صاحب تشریف لے آئے اور ان کی ہمراہی میں ناسک اور پونا جانے کا اتفاق ہوا۔ ان مقامات پر اور بھی زیادہ عدیم الفرصتی رہی۔ ان وجوہات سے والا نامہ کے جواب میں تاخیر ہوئی، خواستگار معافی ہوں۔ جناب کی تحریر کئی مرتبہ نہایت توجہ کے ساتھ پڑھی اور سفر ناسک میں معظم علی صاحب جو ساتھ تھے، گاندھی جی کو بھی سنائی اور اس کی نسبت کچھ عرصہ تک گفتگو رہی۔ غالباً گاندھی صاحب اس کے متعلق براہ راست تحریر کریں گے۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی موقع جلد حاصل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور زبانی عرض کروں۔ مگر اس کا کہنا فی الفور ضروری ہے کہ جو افواہ جناب تک پہنچی ہے اس میں شاعری کی حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے۔ میں ایسا ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں کہ ایک قصد مصمم کو مہینوں کے غور اور فکر کے بعد مستحکم طور پر قائم کر کے ایک آن واحد میں ترک یا تبدیل کر دوں۔ آپ اطمینان فرما دیں کہ مجھ کو کسی ایسے امر میں جس پر مجھے رائے زنی کا منصب ہے، آپ سے اختلاف نہیں ہے جو باعث کبیدگی ہو اور اگر بالفرض ہوتا بھی تو میں ہندو مسلمان کے بیش بہا اتحاد کو اس اختلاف پر نثار نہیں کر سکتا۔

احکام شرع شریف کو معتبر کرنا آپ کا حصہ ہے، مگر جو معاہدہ ہمارے اور آپ کے درمیان ہے اس پر بے شک ہر فریق کو بحث کرنے کا منصب ہے۔ جو کچھ عرض کرنا ہے وہ اس معاہدہ کے متعلق ہوگا اور امید قوی ہے کہ بعد گفتگو محض لفظی فرق رہ جائے گا کہ جس کا نفس معاہدہ اور تعلقات باہمی پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ گاندھی صاحب کا مقصد ۱۷ر خواہ ۱۸ر نومبر کو یہاں تشریف لانے کا ہے۔

زیادہ نیاز

نیاز مند موتی لال نہرو

پنڈت موتی لال نہرو کے خط کا جواب عبد الباری صاحب مرحوم نے درج ذیل الفاظ میں دیا تھا،

"کرم فرمائے مخلصان! دامت معالیہ

بعد آداب التماس ہے کہ نامہ مکرمت مورخہ ۱۱ر نومبر موصول ہوا۔ مجھے خود اطمینان تھا کہ جواب میری تحریر کا بوجہ سفر و خدمات قومی کے نہیں بھیجا جا سکا ہے، اس وجہ سے خود کوئی خیال نہ تھا، مگر مختلف افواہ برابر مسموع ہوتی رہتی تھیں جن کے باعث دل چاہتا تھا کہ جواب آ جاوے تو یکسوئی ہو جاوے۔ مجھے جیسی توقع تھی ویسا ہی جواب ملا۔ میں خود چاہتا ہوں کہ جلد تر گاندھی صاحب سے ملوں۔ مگر ۱۲ر ربیع الاول تک قاصر ہوں۔ جیسے ہی موقع ہوا لوں گا۔ گاندھی صاحب کی تحریر نہایت معقولیت سے شائع ہوئی ہے مگر ابھی براہ راست مجھے کوئی تحریر ان کی موصول نہیں ہوئی ہے۔ امید ہے کہ مخلصانہ مشورے کے بعد کوئی

امر غیر اطمینان باقی نہ رہے ؟

(۴) آنند بھون۔ الہ آباد
۱۹ر جنوری ۱۹۲۱ء

جناب مولانا صاحب مکرم! تسلیم

قاصد مرسلہ بخیریت تمام پہنچا۔ رام چندر کو بالفعل یہاں رہنے کا ارادہ ہے۔ آئندہ حسب ضرورت ان سے کام لیا جائیگا باقی حالات بدستور ہیں۔ کلکتہ کے طلبا کی ہمت و جوش قومی کا حال آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ گاندھی جی ۱۹ر نومبر کو بمبئی سے کلکتہ روانہ ہونے والے ہیں۔ شاید میں بھی جاؤں کیوں کہ اس نے بلایا ہے بنارس میں یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ تدبیر معقول ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ جنوری کے آخر تک کھل جاوے۔ زیادہ نیاز

کمترین موتی لال نہرو

(۵) رام گڈھ ضلع نینی تال
۱۵ر جون ۱۹۲۱ء

جناب مولانا صاحب مخدوم

تسلیم۔ والا نامہ بدریافت حال صحت نیازمند موصول ہو کر باعث مشکوری و ہمدردی جناب والا ہوا۔ میری طبیعت عرصے سے ٹھیک نہیں تھی، مگر بوجہ مصروفیات اس کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکایک دمہ کا سخت دورہ ہوا، جو قریب دو ہفتے تک جاری رہا اور اب تک اس کا خیازہ باقی ہے۔ الموڑہ سے کل یہاں پہنچا۔ عنقریب دو ہفتہ یہاں کی آب و ہوا کا امتحان کرنے کا ارادہ ہے۔ امید ہوتی ہے کہ اس عرصے میں ضعف بھی رفع ہو جاوے گا اور دمہ کا بھی اندفاع ہو جائے گا۔

زیادہ نیاز
نیازمند موتی لال نہرو

(۶) ۳ر اگست ۱۹۲۱ء

مکرمی مولانا عبدالباری صاحب

تسلیم۔ ایک امر اخلاقی کے متعلق آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ ہر مسلمان جو ہم ترک موالات میں کچھ حصہ لے اور بالخصوص جس پر کوئی مقدمہ قائم ہو اس کو خطاب 'مولانا' دے دیا جائے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اور ہر شخص اس تعظیم کا مستحق نہیں ہے کہ وہ مولانا کہا جائے۔ سوراج کی کوشش میں معمولی آداب والقاب کو میری رائے میں ترک کرنا مناسب نہیں ہے اور لفظ 'مولانا' ہرگز بمنزلہ لفظ 'مسٹر' نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسی نہ کسی تعظیمی یا اخلاقی لفظ سے ہر شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، یاد کیا جانا چاہیے۔ ہندی میں لفظ شری یوت۔ یا۔ شریمان ایسے جامع ہیں کہ جو ہر شخص کی نسبت سے استعمال کیے جا سکتے ہیں، کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں رکھتے۔ اسکے علاوہ لالہ، بابو، پنڈت اور بہت سے الفاظ ہیں جو خاص خاص ہندوؤں کی جماعت کی نسبت بلا لحاظ قابلیت یا درجہ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی خاص لفظ 'مسلمان صاحبان کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ مولوی یا منشی بھی ہر شخص کو کہا جا سکتا ہے میرے خیال میں لفظ 'صاحب' نام کے اخیر میں قریب تر لفظ 'مسٹر' کے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آپ کی رائے جاننے کی ضرورت ہے۔

فقط
موتی لال نہرو۔

(۷) آنند بھون' الہ آباد
۲۳ر ستمبر ۱۹۲۱ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا صاحب زاد لطفکم

آداب عرض ہے۔ متفقہ فتوئ علمائے ہند پر جناب کے بھی دستخط ہیں۔ اس کے جواب ۲ صفحہ کی نقل جو متعلق کونسل ہے، ہمرشتہ ارسال خدمت ہے۔ جہاں تک میں اس جواب کو سمجھا ہوں' اس کا تعلق ایسی کونسلوں سے ہے کہ جن میں جا کر معاونت حکومت کی جائے۔ دوران تحقیقات کمیٹی سول نافرمانی بعض صاحبان نے اس غرض سے کونسلوں میں جانے پر زور دیا ہے کہ وہاں ہر امر کی جو گورنمنٹ کی طرف سے پیش ہو مخالفت کی جائے بشرطیکہ کثرت ایسے ممبروں کی ہو کہ تارکین موالات ہیں۔ اس کا

اثر ڈالے یا گورنمنٹ کی طرف سے جو قانون یا تجویز پیش ہوگی، اس کو کونسل کثرتِ رائے سے خارج کر سکے گی۔ مگر یہ صحیح ہے کہ گورنر یا گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ کثرت رائے ممبران کے خلاف کسی قانون یا تجویز کو اپنے حکم سے بعض صورتوں میں نافذ کر دے یا نافذ ہونے سے روک دے مگر اس میں ممبران کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔

ایسی حالت میں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ فتویٰ علمائے کرام کونسل میں اس غرض سے بھی جانے کا مانع ہے۔ وہاں جاکر ہر امر میں خواہ اچھا ہو یا بُرا گورنمنٹ کی مخالفت کی جائے اور اسی طرح سے گورنمنٹ کی کل کاروائی جو بذریعہ کونسلوں کے ہوتی ہے مسدود کر دی جائے۔ جن صاحبوں نے اس غرض سے کونسلوں میں جانے کی رائے دی ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ یہ عمل عین ترکِ موالات ہے جو فریق ثانی کے گھر میں گھس کر کیا جائے گا اور کسی طرح داخل معاونت حکومت نہیں ہے۔ اس کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے زیادہ تر مجھے جناب کی رائے کی اپنے اطمینان کے لیے ضرورت ہے لیکن اگر اجازت ہوگی تو اس کا حوالہ رپورٹ کمیٹی سول نافرمانی میں جو میں تجویز کر رہا ہوں دیا جائے گا۔ اس قدر اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ بعض اہلِ اسلام صاحبان نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فتوے علما سدِّ راہ نہ ہو تو ان کو کونسل میں جاکر گورنمنٹ کی مخالفت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوسرا امر غور طلب فقرہ حرف (د) جواب مذکور کا ہے اس کا اس قدر مضمون کہ حکومت کی وفاداری اور طاعت شعاری و بہی خواہی کی قسم کھانا بھی ضروری ہے صحیح نہیں ہے قسم وفاداری بادشاہ نہ کہ حکومت کی کھانی لازمی ہے۔ یہ قسم اس حالت موجودہ میں کہ تجویز آزادی کامل پیش کردہ مولانا حسرت موہانی تینوں جماعتوں سے (یعنی کانگریس مسلم لیگ و خلافت) نامنظور ہو چکی ہے، ظاہر و ممنوع ہے۔ جب آزادی کامل پر استدلال کرنے کا وقت آئے گا غالباً نہ کونسلوں میں جانے کی ضرورت رہے گی اور نہ قسم کھانے کی۔ اس کے متعلق براہ کرم جواب سے جلد سرفراز فرمایئے۔

رائے عالی سے مطلع فرمایئے۔ زیادہ شوق

خاکسار موتی لال نہرو

اقتباس از متعلقہ فتویٰ بہ ترک کونسل کے حسب ذیل ہیں،

(الف)، "کونسل قانون اجیا اشکام ہے اس کا مقصد قیام حکومت کا استحکام و انصرام ہے جو کھلم کھلا حکومت کی معاونت ہے"

(ب)، "کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں جس کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرت مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ وَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ

(ترجمہ، خدا کے رسولؐ نے فرمایا کہ تم میں جو بھی منکرِ خدا کو دیکھے تو چاہیے اس کو بدل دے اپنے ہاتھوں سے اور اس پر قادر نہ ہو تو اپنی زبان سے بدل دے اور اس پر بھی قادر نہ ہو تو اپنے دل سے بدل دو۔")

مگر مسلم ممبران کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شواہد واقعات ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے۔"

(ج)؛ "کونسل میں قوم انگریزی بھی ہوتی ہے جو ظالم دشمن دین ہے اور ایسی قوم کے ساتھ اعزازی نشست شرعاً حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

(پس یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا) سورۂ انعام

(د)، "کونسل میں ممبران کے لیے حکومت کی وفاداری و اطاعت شعاری و بہی خواہی کی قسم کھانا بھی ضروری ہے اور حالت موجودہ میں اپنی خوشی اور اختیار سے حکومت کی وفاداری اور طاعت و بہی خواہی مسلمانوں پر حرام ہے۔ اس لیے وفاداری کی قسم شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔"

جواب از مولانا عبدالباری صاحب:

"کرم فرمائے فقیر زیدت معالیہ

بعد ما وجب عرض ہے کہ کرم نامہ موصول ہوا۔ فقیر فتویٰ پر دستخط

نہیں کرتا ہے۔ ایک خط تحریر میں فتویٰ پر عمل کرنے کی غرض سے
لکھا تھا جس کو حضرات علمائے فتویٰ کے ساتھ ثبت فرمایا ہے
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتیوں سے مفاہمت کرلی جائے' ان کے
ارشادات کی تعمیل ہوگی۔ رہا تحریک نان کوآپریشن میں تعین امور جس
طرح کی گئی ہے اسی طرح اخراج بھی ممکن ہے۔ امید ہے کہ جناب
بخیریت ہوں گے۔"

(۸) آنند بھون، الہ آباد
۷ر جولائی ۱۹۲۲ء

جناب مولانا صاحب۔ تسلیم

نوازش نامہ مورخہ ۲۹ر جون بعد واپسی لاہور ملا۔ میں نہایت
خوشی کے ساتھ صدارت کانفرنس بارہ بنکی قبول کرتا۔ مگر چونکہ
مجھ کو آل انڈیا سول نافرمانی تحقیقاتی کمیٹی کے ساتھ برابر دورہ کرنا
ہے۔ اس وجہ سے موجودگی میری اس صوبے میں ممکن نہیں ہے اور
شرکت سے بھی مجبوری ہے۔ امید ہے کہ آپ صاحبان کی سعی و
کوشش سے کانفرنس مذکور کو پوری کامیابی ہوگی۔ فقط

موتی لال نہرو

میں نے پنڈت جی کے خطبۂ صدارت اور ان کے خطوں کے بعض
الفاظ کے نیچے خط کھینچے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف الفاظ کے
حسنِ انتخاب' روزمرہ و محاورات کی صحت اور خوبصورت تراکیب استعمال
کرنے میں کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ زبان کا ایک ایک جملہ فصاحت و
بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ کوئی لفظ یا محاورہ بھرتی کا استعمال
نہیں ہوا ہے۔ بات بات میں شکوہِ الفاظ کا مظاہرہ کیا ہے۔ زبان کی
متانت و پاکیزگی' خیالات کی بلندی، عبارت کا تسلسل اور جملوں کی بیساختگی
قابلِ تعریف خوبیاں ہیں۔ روزمرہ بول چال کے فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش
جو ہماری تہذیب میں سنگم کی حیثیت رکھتی ہے اس کا برمحل اور صحیح استعمال
اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ ؎

جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

اگر موصوف کے خطبے اور خطوط سے ان کا نام ہٹا دیا جائے تو کسی
عالم متبحر اور صاحب طرز انشا پرداز کی نگارشات کا دھوکا ہوگا۔

پنڈت موتی لال نہرو کو اُردو سے والہانہ محبت تھی، وہ اس کے
فروغ کے لیے ہمہ تن کوشاں تھے۔ پیارے لال شاکر میرٹھی اپنے اُردو
رسالہ "العصر" لکھنؤ جلد ۲ نمبر ۱ و ۲ بابت جنوری و فروری ۱۹۱۴ء میں
لکھتے ہیں:

"حال ہی میں ایک ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ
(ELEMENTARY EDUCATION LEAGUE)
الہ آباد میں قائم ہوئی ہے جس کا ایک خاص موقف یہ بھی تھا
کہ اُردو ہندی دونوں زبانیں ہر مدرسے میں پڑھائی جائیں
اور لیگ کا صدر دفتر الہ آباد میں قائم کیا جائے۔ لیگ میں ہر فرقہ
اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ لیگ کا پہلا ریزولیوشن
سر تیج بہادر سپرو نے پیش کیا تھا۔ قریب ۸۰ اصحاب شریک
لیگ ہوئے جن میں الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، بنارس، فیض آباد،
بریلی، گورکھپور، علی گڑھ اور دیگر اضلاع کے حضرات شامل تھے۔
پنڈت موتی لال نہرو صاحب لیگ کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے
اور راجہ سر محمد علی محمد خاں والیِ ریاست محمود آباد وائس پریسیڈنٹ
علاوہ آپ کے مدن موہن مالویہ، پنڈت بشن نرائن در آنریبل، رائے
بہادر گنگا پرشاد ورما اور ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی وائس پریسیڈنٹ
منتخب کیے گئے تھے۔ لیگ کے سکریٹری پنڈت ہردے ناتھ
کنزرو تھے۔"

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو کے خاندان کی زبان
اُردو تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو جب کشمیر آتے تھے تو صاف اُردو میں تقریریں
کرتے تھے۔ یہی حال اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا بھی تھا۔ جناب قاضی
عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ:

"مسز کملا نہرو کے بھائی کول عرصے تک ان کے
پڑوس میں رہے ہیں اور کول صاحب یہ کہتے تھے کہ ان کے
گھروں میں عورتیں اُردو کے سوا کوئی زبان جانتی ہی نہیں۔"

ایک ماہرِ اقبالیات عبدالرحمان طارق صاحب کا ذیل کا شعر اس بیان کی تائید

کرتا ہے کہ نہرو خاندان کی زبان اُردو تھی ۔

کون کہتا ہے کہ نہرو کی زبان اُردو نہیں
اور ان کی گفتگوئے خانداں اُردو نہیں

□□

حواشی :

۱؎ خادم الحرمین ۔ ۱۹۲۵ء میں ابنِ سعود نجدی نے شہرِ مدینہ پر حملہ کیا تھا جس کے خلاف مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا مفتی محمد عنایت اللہ ندوہ کے علماء دیوبند کے فقیہ، جامعہ ملیہ کے استاد، پھلواری کے خانقاہ نشیں، حسرت موہانی، شیخ مشیر حسین قدوائی، راجہ سلیم پور، راجہ نواب مسلی خاں وغیرہ کے اتحاد سے خادم الحرمین کی تحریک شروع ہوئی، عبدالباری صاحب اس کے سالارِ لشکر تھے ۔ ابنِ سعود کے حامیوں میں محمد علی جوہر اور شوکت علی پیش پیش تھے ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جناب عبدالباری صاحب کے بنا کردہ عربی مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے محمد علی اور شوکت علی کو آنریری "مولانا" کی ڈگری سے نوازا گیا تھا ۔ اب خادم الحرمین اور خلافت پارٹی (جس کی قیادت محمد علی جوہر کر رہے تھے) میں نظریاتی جنگ چھڑ گئی تھی ۔ (تفصیلات کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب " محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق [صفحہ ۲۲۶ ۔ ۲۸۸] جلد اول دیکھی جا سکتی ہے) ۔

۲؎ راجہ صاحب محمود آباد، سر محمد علی محمد امیر کبیر ہونے کے علاوہ علم و ادب اور اہلِ فن کے قدر دان تھے ۔ بڑے ذی حوصلہ، سیر چشم، فیاض اور مہمان نواز رئیس تھے ۔ ان کی حیات میں لکھنؤ کی بارہ دری قیصر باغ میں جو کوئی علمی اور سیاسی جلسہ ہوتا تھا اس کے تمام اخراجات ان ہی کے ذمے ہوتے تھے ۔ والسرائے، ہزہائی نیس آغا خاں، گاندھی جی، موتی لال نہرو، محمد علی جناح، سر تیج بہادر سپرو، محمد علی جوہر وغیرہ کو ان کی مہمان نوازی پر ناز تھا ۔ موصوف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بنارس ہندو یونیورسٹی، کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ وغیرہ کو مالی امداد سے نوازا ۔ محمد علی جوہر، عبدالماجد دریابادی، ریاض خیرآبادی، عزیز لکھنوی، میر جالب دہلوی، ثاقب لکھنوی اور خاندان میر انیس کے افراد وغیرہ کی کفالت کی تھی ۔ محمود آباد ہوسٹل لکھنؤ یونیورسٹی، امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ، اسلامیہ کالج لکھنؤ، شملہ ہاؤس وغیرہ یادگاریں ان کے نام سے منسوب ہیں ۔ راجہ صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بھی تھے ۔ ان کا کتب خانہ مشہور ہے ۔ ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا ۔ مادۂ تاریخ ہے

" اٹھا جہاں سے صد افسوس اک امیر کبیر " ۔ [illegible]

۳؎ مظہر علی ۔ محمد علی جوہر کے سالے بیرسٹر ایٹ لا اور گاندھی جی کی جانی پہچانی شخصیت اور کانگرس کے کارکن تھے ۔

۴؎ اُردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریکِ آزادیِ ہند کے اولوالعزم اور ممتاز مردِ مجاہد تھے ۔ ۱۹۰۸ء میں انھیں قیدِ سخت کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں ۔ ان کا قیمتی کتب خانہ نیلام کر دیا گیا ۔ حسرت پہلے شخص تھے جنھوں نے ۱۹۱۷ء میں ہندستان کی مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا ۔ کئی مرتبہ جیل بھی گئے ۔ سچے اور ایماندار جاں نثار محبِ وطن تھے ۔ آزادی کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے ۔ فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ افسوس کہ ان کی کوئی یادگار قائم نہیں کی گئی ۔

مآخذ

۱ ۔ مرقع لکھنؤ (ایڈیٹر وصل بلگرامی) بابت مارچ ۱۹۲۶ء صفحہ ۹ تا ۱۱
۲ ۔ زمانہ کانپور ۔ بابت فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۶
۳ ۔ کشمیری درپن ۔ الٰہ آباد، بابت مارچ ۱۹۰۷ء (ضمیمہ) (ایڈیٹر تیج بہادر سپرو)
۴ ۔ نقوش لاہور جلد ۲ نمبر ۳ نومبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۹۲۹
۵ ۔ خطوط نمبر (نقوش) جلد اول ۱۹۶۸ء صفحہ ۴۳
۶ ۔ ڈسکوری آف انڈیا ۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۴۴ء
۷ ۔ اخبار روزنامہ قومی جنگ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۳ء (مضمون نگار حکیم محمد حسین خاں شفا)
۸ ۔ محمد علی : ذاتی ڈائری کے چند ورق ۔ از عبدالماجد دریابادی جلد اول صفحہ ۳۱۹ مطبوعہ ۱۹۵۴ء
۹ ۔ زمانہ کانپور بابت ۱۹۳۴ء
۱۰ ۔ العصر لکھنؤ (ایڈیٹر پیارے لال شاکر) نمبر ۱، ۲ ۔ جلد ۲ بابت جنوری و فروری ۱۹۱۴ء
۱۱ ۔ خدا بخش لائبریری جرنل صفحہ ۱۶۹ شمارہ ۱ مطبوعہ ۱۹۷۷ء
۱۲ ۔ ہماری زبان دہلی مطبوعہ ۶ جون ۱۹۴۶ء

کہانی

سید انور سعید
رجسٹرار، جامعہ اردو۔ علی گڑھ

مہوش

جنوری کی وہ ٹھنڈی شام آج بھی مجھے جب یاد آتی ہے میرا وجود بری طرح ہل جاتا ہے. جب اچانک میری نگاہ اس پر پڑی تھی. لمبا قد، صاف و شفاف بدن چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ ساتھ بے پناہ معصومیت، خوبصورت سیاہ زلفیں کسی ڈری اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اس کی خوبصورت غزالی آنکھیں جس نے میرے سوئے ہوئے افسردہ وجود کو اچانک جگا دیا۔ تنہائی میں اکثر اس کا چہرہ میرے سامنے آجاتا اور میں گھنٹوں اس کے خیال میں ڈوبا رہتا. کون تھی وہ جو ایک بادِ صبا کے جھونکے کی طرح آئی اور میرے دل کے ستاروں کو ہلا گئی. جس کے پہننے، دیکھنے اور چلنے میں ایک الگ سا انداز تھا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ وہ نظر آئی اور میری شامیں اس کے تصور میں مصروف ہو گئیں.

پھر ایک شام اچانک ایسی بھی آئی جب ٹیلی فون پر اس سے رابطہ قائم ہوا۔ فون پر میری طرف سے شروعات میرے مزاج کے برخلاف دل خراش تھی مگر اس کے جواب میں اس کا مہذبانہ انداز اور نغمگی آواز نے مجھے نادم اور شرمندہ کر دیا. جس کا قلق آج بھی مجھے رہتا ہے. کہ آخر کیوں میں نے اتنی معصوم اور حساس لڑکی سے اس انداز میں گفتگو کی. بس یہ سوچ کر سکون ہو جاتا ہے. کہ اس بہانے اس سے گفتگو کا ایک سلسلہ تو شروع ہوا۔

جب معلوم ہوا کہ اس کا نام مہوش ہے تو یقین آگیا کہ اسکا نام اس کے نازک اندام وجود کی عکاسی کرتا ہے. سچ مچ مجھے وہ چاند کی طرح خوبصورت لگی. چاند بہت خوبصورت ہوتے ہوئے بھی پتھر کا ہے. مہوش بھی بہت حسین ہے مگر سنگ دل. اس کا سنگ دل ہونا بھی اس کی شخصیت کا ایک [illegible] یہ پتھر کیوں بنا اس کے پیچھے چھپی ہوئی اس مالی کی بھی داستان [illegible] اس بیدردی سے الگ کیا کہ مالی کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ پھول نازک ہے اس کی پنکھڑیاں بکھر جائیں گی ٹوٹ جائیں گی اور جسے یہ پھول سونپا جائے گا اس کے ناقدر ہاتھوں میں یہ مرجھا جائے گا کچھ ایسا مہوش کے ساتھ ہوا.

مجھے بعد میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ شادی شدہ ہے لیکن میرے دل میں اس کی محبت کا پودا پروان چڑھتا رہا. محبت کا پودا دل کی زمین پر اگتا ہے تو صرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے. ایک وقت یہ بڑھ کر تناور درخت بن جاتا ہے اور اگر اسے محبت سے نہ سینچا جائے تو ایک دن یہ اپنی جڑ سے اکھڑ کر گر پڑتا ہے اور اس کی لکڑیاں کاٹ کاٹ کر سپردِ آتش کر دی جاتی ہیں.

کبھی کبھی مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے۔ مہوش کی بھی یہی مجبوری تھی. وہ بالکل اس ہیرے کی طرح خوبصورت تھی. جس کو دیکھا تو جا سکتا ہے مگر فرطِ محبت سے چوما نہیں جا سکتا. چونکہ ہیرے سے اس والہانہ محبت کا انجام سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے. میرا اور مہوش کا شاید یہی رشتہ تھا. میرا دل اسے چومنے کو بیقرار تھا. چاہے اس کا انجام موت ہی کیوں نہ ہو۔

مہوش کی شادی تو ہوئی لیکن اس طرح جیسے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگا دیا گیا ہو۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنی شریکِ حیات کو تنہا چھوڑ کر سات سمندر پار جا بیٹھتے ہیں اور یہ پرواہ کیے بغیر ان کی تنہائی اسے لمحہ لمحہ کسی ناگن کی طرح ڈس رہی ہو گی. سونے چاندی کی دیوار کھڑی کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں. مہوش کے ساتھ ایسا کیوں ہوا کیا قصور تھا اس کا. بس یہی کہ وہ ایک معصوم، حساس، شریف اور اپنے والدین کی ایک فرمانبردار بیٹی تھی اسی لیے وہ ایک غزال کی طرح قید کر لی گئی.

انسان آخر اتنا مجبور کیوں ہے؟ کہ وہ اپنی خوشی سے جینے کا بھی حق

نہیں رکھتا تھی بھی یہ احساس، یہ وفا، یہ فرمانبرداری مجھے بکواس لگتے ہیں اگر اس کا انجام اور انعام یہی ہے جو مہوش کو اس کے لڑکی ہونے کے جرم میں اسے دیا گیا۔

مہوش کی ایک خوبصورت سی سات آٹھ سالہ بیٹی بھی تھی جسے اس نے اپنے انداز میں سنوارا تھا اس کا نام گلوش تھا مہوش نے اپنے اندر کا تمام تر حسن اپنی اس ننھی سی جان پر نچھاور کر دیا تھا خدا کرے گلوش کو کبھی ذرا خراش بھی نہ آئے۔ کیونکہ گلوش مہوش کی زندگی ہے اور مہوش میری زندگی ہے۔

یہ کون سا جیون ہے جو سیلاب بن کر مجھے مہوش کی طرف۔ بول کھینچے لیے جاتا ہے آخر اس کا انجام کیا ہے؟

کل ہی کی تو بات ہے جب کہ اس کی شادی کو چند سال بھی نہ گزرے تھے اس نے اپنی ننھی سی بچی کو ختم کر دیا تھا وہ تنہا اپنی بچی کو لے کر تیز برسات میں ہوسٹل سے بھیگتی ہوئی اپنے گھر پہنچی تھی۔ جب کہ اس تصور سے ہی میرا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ تو مہوش پر کیا گزری ہو گی۔ اس کے جسم کو ہی صرف تکلیف نہیں پہنچی تھی بلکہ اس کے جذبات اور تمام خواب جو اس نے دیکھے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ تیز برسات کے پانی میں اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو بھی کوئی نہیں دیکھ پاتا ہو گا۔ وہ سب لوگ کہاں گئے تھے جنہوں نے مہوش کو پیدا کیا تھا اور وہ لوگ کہاں تھے جو گلوش کی دنیا میں آمد کا باعث تھے۔ وہ کہاں تھا جس نے مہوش کو پیدا کیا تھا اور وہ کہاں تھا جس نے گلوش کو پیدا کیا تھا۔ اس کے دل میں مردوں کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کے دل میں یہ نفرت ایک فطری بات تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ کیوں کہ ان مظالم کے پیچھے ان مردوں کا ہی ہاتھ تھا۔ محبت کے اس سیلاب میں میرا وجود ڈوب کر نہ رہ جائے۔ میں کیا کروں کس سے کہوں کہ مجھے مہوش سے اپنی زندگی سے زیادہ محبت ہو گئی تھی۔ آج پر فریب دنیا میں شاید کسی کو اس کا یقین بھی نہ آئے کہ مہوش میرے دل کی دھڑکن بن کر مجھے زندہ رکھے ہوئے تھی۔

مہوش وہ لڑکی تھی جسے یہ احساس رہتا تھا کہ اس کی تکلیف سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے دل میں زمانے نے درد کے اتنے تیر پیوست کر دیے کہ آخر کار اسے اپنے درد کا احساس ختم ہو گیا۔ اس کی خاموش چیخیں نہ کسی نے سنیں نہ سننا چاہیں۔ مہوش کی شادی ۱۴/۱۵ سال کی عمر ہو گئی تھی اس کی شادی کو گیارہ بارہ سال ہو چکے تھے لیکن آج بھی وہ کسی غیر شادی شدہ لڑکی کی طرح دکھتی تھی۔ اس نے شادی کے بعد کا یہ لمبا سفر جن اذیتوں میں گزارا ہو گا یہ اس کا اپنا دل ہی جانتا ہو گا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور اس کا خوددار وجود زہر کے گھونٹ پیتا رہا۔ اتنا سب کچھ ہونے پر بھی قدرت نے اس کے اندر وہ ہمت بخشی تھی کہ وہ دوسروں سے اپنے آپ کو چھپا لیتی تھی۔ دوسروں کی ہمدرد نگاہوں کو بھی اس نے اپنے وقار کے خلاف سمجھا وہ مجھ سے محبت تو نہیں کر سکی لیکن پھر بھی مجھے اتنا اپنا سمجھا کہ اپنے دل کا حال صرف مجھ کو سنا دیا۔ یہی اس کا میرے لیے خراج عقیدت تھا کہ اس نے مجھے اپنا سمجھا۔ اور میری محبت نے اس کے اس خلوص کے سامنے اپنا سر خم تسلیم کر دیا۔ مہوش عام لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں تھی۔ اس کی اپنی ایک الگ انفرادیت تھی۔ شاید یہ سچ ہو کہ میری زندگی میں مہوش ایک الگ سے انداز میں آئی۔

مہوش کبھی اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ہند بھی گئی تھی۔ اس نے کئی بار بلندیوں کی پرواز کی مگر اپنے شوہر کو کبھی بلند ذہن نہ پا سکی۔ ایک وہ دن تھا جس دن مہوش دلہن بن کر ہزاروں ارمان سجائے اپنے شوہر کے گھر آئی تھی۔ لیکن خود شوہر کے سلوک نے اسے یہ بتا دیا کہ یہ ارمان اس کے ریت کے گھروندے تھے۔ جو ایک نفرت کی ٹھیس سے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ مہوش ٹوٹتی رہی بکھرتی رہی لیکن اپنی بچی کی شکل میں اپنے آپ کو بار بار جوڑتی رہی۔ اسے سنوارتی رہی۔ خود غموں سے جتنا قریب رہی اپنی بچی کو ہر غم سے اتنا ہی دور رکھا۔

اسی قسم کی ایک داستان میرے پیچھے اپنے ایک لمبے سیاہ سائے کی طرح کھڑی ہے۔ جس نے مجھے قدرتی طور پر مہوش کی طرف کھینچنے پر مجبور کر دیا۔

محبت کے بھی الگ الگ انداز ہیں۔ کبھی چاہ کر بھی نہ چاہنا کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی چاہ لینا۔ یہ محبت کا پیچیدہ فلسفہ ہے۔ جس میں مہوش اور میں بری طرح الجھ کر رہ گئے تھے مہوش کے لیے میری یہ دیوانہ وار محبت ایک چکرویو بن کر رہ گئی تھی۔ جس کے اندر پہنچ کے میرا باہر نکلنا مشکل تھا مہوش ایک بحر بیکراں کی طرح سے تھی جس کی انتہا، گہرائی میں

سچے موتیوں کا خزانہ تھا۔ لیکن گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے ایک باظرف اور جانفشاں شخص کی ضرورت تھی، جو مہوش کے نصیب میں نہیں تھا۔ اور وہ خود اپنے اندر چھپے ہوئے خزانے سے بے خبر تھی۔ جس کا دل محبت کا ایک گہوارہ تھا اس کی آنکھوں میں سچائی، مروت، محبت مگر کرب کا احساس صاف صاف نظر آیا تھا۔ وہ شیشے کا ایسا خوبصورت پیکر تھی جس کو کسی نے بے رحمی سے پتھر پر اچھال دیا تھا۔ میں نے مہوش کو بہت کم وقت میں اس سے کہیں زیادہ اس کو سمجھ لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرے احساسات اور جذبات اس کے درد کی ترجمانی کرتے تھے۔

پیار کی قیمت کبھی دولت سے نہیں لگائی جا سکتی۔ نسیم جو خود کو اس کی زندگی کا مالک و مختار سمجھتے تھے اس کی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے لگے اور اپنے کمتر وجود کو برتر ثابت کرنے کے لیے مہوش کو خود اس کی نظروں میں گرانے لگے۔ اس کے حسن صورت اور حسن سیرت کو اس لیے چھپانے لگے کہ کہیں اس کی روشنی میں زمانے کو ان کے عیب نظر نہ آ جائیں۔ لیکن چاند پر دھول پھینکنے سے کبھی چاند میلا نہیں ہوتا۔ مہوش بھی اسی چمکتے ہوئے چاند کی طرح تھی جس کا اپنا خود ایک وجود تھا جس کی چاندنی نے زمانے بھر کو منور کر رکھا تھا۔ لیکن وہ آسمان جس سے اس چاند کا وجود تھا۔ رات کی سیاہی میں گم رہتا تھا۔ چاند کی روشنی سے آسمان کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوتا کیونکہ آسمان کا اپنا خود کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ صرف نظروں کا ایک دھوکا ہے۔

مہوش کی چاہت میرے دل میں اس قدر بڑھی کہ میں نے دنیا سے سمٹ کر خود کو اپنے گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا تھا۔ اب تو بس مہوش ہو ورنہ پھر کوئی نہ ہو۔ مہوش کا تصور ہی میری زندگی ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے رنگ ضرور ہے لیکن اس کی یاد میرا مقصد ہے وہ چلی گئی اور چھوڑ گئی میرے لئے یادوں کا بحر بیکراں۔

انجانے میں کسی سے محبت ہو جانا بھی ایک خود پر بڑا ستم ہے۔ مہوش کہاں چلی گئی مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ بس ایک درد ہے جو مہوش کو پکارتا ہے۔ اور فضاؤں سے ٹکرا کر اپنی جگہ لوٹ آتا ہے۔ مہوش کیسی ہوگی میرا انجام کیا ہوگا۔ بس یہی دعا دل سے نکلتی ہے کہ مہوش جہاں بھی رہے خوش رہے۔ اور اپنی انا کو پروان چڑھا کر اپنے وجود کو دوبارہ زندہ کر دے۔

□□

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۹۵۶ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ)
کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق
ماہنامہ **نیا دور لکھنؤ**
کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جا رہی ہیں

۱۔ مقام اشاعت : لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہوار

۳۔ پرنٹر کا نام : شری راجیو اروڑا
قومیت : ہندستانی
پتہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، گوتم بدھ مارگ لکھنؤ

۴۔ پبلشر کا نام : شری انوپ چندر پانڈے
قومیت : ہندستانی
پتہ : ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : شری سیّد امجد حسین
قومیت : ہندستانی
پتہ : ایڈیٹر نیا دور محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش لکھنؤ

۶۔ ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا اسکے تمام سرمایہ کے ایک فی صد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں : نیا دور سرکاری جریدہ ہے

میں انوپ چندر پانڈے اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط)

(ڈاکٹر) انوپ چندر پانڈے
ڈائرکٹر
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش
لکھنؤ

سید احمد قادری
نیو کریم گنج۔ گیا (بہار)

امرت رائے سے ایک ملاقات

کچھ عرصہ گزرا، میں اپنی ایک کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں الہ آباد گیا ہوا تھا۔ میں جس شہر میں بھی جاتا ہوں، میری خواہش ہوتی ہے کہ میں اس شہر کے تمام ادیبوں اور شاعروں سے ملوں، ان کے خیالات، ان کے افکار و نظریات جانوں ـــــ اس سلسلے میں، میں نے الہ آباد کے کئی لوگوں سے ملاقات کی۔ میری فہرست کے کئی ناموں میں ایک نام امرت رائے کا بھی تھا ـــــ ان سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میری اس مشکل کو حل کیا ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے۔

جب میں ایک عالی شان مکان کے گیٹ کے اندر داخل ہوا اور میرے ساتھی ڈاکٹر فاطمی نے بتایا کہ یہی مکان امرت رائے کا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا ـــ پوری زندگی مفلسی کی حالت میں بسر کرنے والے پریم چند کے بیٹے امرت رائے کا یہ مکان! لیکن یقین جانیے کہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ـــ خواہ مخواہ ادیب و شاعر کی مفلسی کے قصے مشہور ہیں۔

چند لمحوں بعد باہر کے شان دار برآمدے سے کال بیل کی مترنم آواز سُن کر ایک نوکر باہر آیا۔

کون صاحب ہیں؟ ـــ کیا کام ہے؟ ـــ کس سے ملنا ہے؟

صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے! ـــــ لیکن تھوڑی دیر بعد ایک گورا چٹا، دُبلا پتلا، ادھیڑ عمر کا ایک خوبرو شخص ریشمی چادر میں لپٹا ہوا باہر آیا ـــ انداز سے میں نے سمجھ لیا کہ اس شخص کو پریم چند کا بیٹا ہونے کا فخر حاصل ہے ـــ پریم چند کے سلسلے کی ایک ایک تحریر ابھر کر ذہن میں آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد چائے بھی آگئی ـــ اس درمیان اجنبیت کی کچھ دیواریں کسی حد تک گرگئی تھیں۔ چائے کی چسکیوں کے درمیان میں نے انٹرویو لینے کی خواہش ظاہر کی، جسے امرت رائے نے کچھ ردوکد کے بعد قبول کرلیا اور میرے سوالات کے جواب ٹھہر ٹھہر کر، سوچ سوچ کر دینے لگے۔ میرا پہلا سوال تھا ـــــ

قادری: امرت رائے جی! پریم چند سے متعلق جتنے سیمنار، مباحثے، گفتگو اور خاص نمبر وغیرہ سامنے آئے انھیں دیکھ کر آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

رائے: بہت اچھا لگتا ہے۔ ان سب کاموں میں بہت کچھ اچھا بھی ہوا اور کچھ فضول بھی ہوا۔ جس پیمانے پر ہوا یہ دیکھ کر اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ خیال تھا کہ اس نوعیت کے دو چار جلسے بس ہوتے حالاں کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہر جگہ GRASS ROOT پر کام ہوتا۔ ایک جلسے میں ایک صاحب نے کہا کہ پریم چند نے عوام کو چھوا ہے، یہ کون سی نئی بات ہوئی ـــــ اب بھی پریم چند پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ کئی ایسے گوشے ہیں جنھیں سامنے آنا چاہیے اور جواب تک نہیں آسکے۔ اب تک ان کے تمام افسانے اور کئی کام کی باتیں سامنے نہیں آسکی ہیں۔ ۲۶۶ افسانوں سے بات آگے نہیں بڑھی ہے۔ اب سے ۲۰ سال پہلے جو شکل پکڑا دی تھی میں نے، وہی اب بھی ہے۔ پریم چند پر، سود پر روپیہ لگانے کا الزام ہے۔ حالاں کہ یہ کسی نے نہیں لکھا کہ منشی جی دانے دانے کو محتاج تھے۔

قادری: کیا آپ کے خیال میں پریم چند کو اُردو اور ہندی ادب میں وہ مقام ملا، جس کے وہ مستحق تھے۔؟

رائے: اب ملا ہے، قبل نہیں ملا تھا۔ وقت کے لحاظ سے ان کی IMAGE بڑی ہوئی ہے، لیکن ہندی میں ہوئی ہے۔ اُردو میں کچھ عجیب سی بحثیں چھیڑ رکھی ہیں لوگوں نے۔

قادری: آپ بھی افسانے لکھتے ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ صلاحیت

آپ کو ورثے میں ملی ہے؟

رائے: یہ تو میری دکھتی رگ ہے۔ یہ کوئی پرچون کی دکان نہیں ہے جو ورثے میں ملی ہے۔ ہاں مجھے ماحول ملا ہے، اس کا اثر میں نے قبول کیا ہے۔ اگر ورثے میں ملتا رہتا تو سارے کے سارے ادیبوں کے لڑکے رائٹر WRITER بن جاتے۔ میری پوری عمر لگ گئی، منشی جی کے سائے سے نکلنے کے لیے۔ پریم چند نے بات جہاں چھوڑی تھی، وہاں سے میں نے شروع کی ہے۔ پریم چند سوشلزم کے پیروکار تھے۔ میری فکری سطح مارکسزم سے شروع ہوتی ہے۔ پریم چند سے متاثر ہونے والوں کی ایک پوری جماعت ہے۔ باپ کا اثر بیٹے پر بھی ہو، یہ کوئی ضروری نہیں ہے ایک واقعہ سنیے، ۱۹۵۲ء میں میں چین گیا تھا۔ پارٹی سکریٹری پیرین تھیں۔ پہلا پڑاؤ شنگین میں ہوا۔ وہاں لوگوں سے تعارف کراتے ہوئے پیرین نے میرے بارے میں کہا:

"یہ پریم چند کے صاحبزادے ہیں"۔

مجھے بڑا طیش آیا، میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا اس وقت۔ ہوٹل واپس آیا اور پیرین سے کہا۔ "آج یہ پہلا موقع ہے کہ تم نے پریم چند کے حوالے سے میرا تعارف کرایا۔ میرا تعارف میرے حوالے سے کراؤ۔ پریم چند گیا۔ اچھا برا جیسا لکھا اپنے ساتھ لے گیا۔"

ہاں، میں نے دوسری طرح سے اثر لیا ہے۔ ادیب بھی ایک معمولی انسان ہوتا ہے۔ میں نے منشی جی کے ساتھ ساتھ ٹالسٹائی، چیخوف وغیرہ سے بھی سیکھا ہے۔ نقل کسی کی بھی نہیں کی۔ شعوری طور پر کبھی ریپیٹ REPEAT نہیں کیا۔ نام سے تخلیق نہیں پہچانی جاتی ہے بلکہ تخلیق سے نام پہچانا جاتا ہے۔ منشی جی سے میں نے ڈسپلن سیکھی ہے۔ وہ لکھ رہے ہیں۔ ہم لوگ ادھم مچا رہے ہیں۔ لوگ ملنے آ رہے ہیں لیکن وہ ڈسٹرب نہیں ہوتے۔ کوئی ملنے آیا، چشمہ اتارا، کئی گھنٹوں تک بات چیت کی، آنے والے شخص کو محسوس نہیں ہونے دی اپنی بے چینی۔ وہ شخص جاتا ہے، اور پھر وہ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

قادری: پریم چند نے اپنی زندگی تنگدستی میں گزاری، کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اردو کے ادیب نہ ہوتے تو یہ تنگ دستی نہ ہوتی۔؟

رائے: پریم چند پچیسی کے وقت تنگ دست تھے۔ ہندی میں جانے کے بعد بھی حالت نہیں سدھری۔ ان کے پاس اپنے علاج تک کے لیے پیسے نہیں تھے۔

قادری: کہا جاتا ہے کہ پریم چند کی شہرت اور مقبولیت نے ہندی والوں کو انھیں اپنانے پر مجبور کیا، اور اب تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ پریم چند بنیادی طور پر ہندی کے ادیب تھے۔؟

رائے: نہیں یہ غلط ہے۔ پریم چند نے "رنگ بھومی" سے ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا۔

سید احمد قادری: آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا، اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

امرت رائے: آپ کا بھی شکریہ کہ آپ اتنی دور سے تشریف لائے۔

□□

سنہرا خواب

آزاد ہند کی وہ آزاد زندگی تھی
آزاد تھی حکومت آزاد بندگی تھی

آزاد آسماں تھا، آزاد تھیں ہوائیں
لہروں کو چومتی تھیں جے ہند کی صدائیں

نیتا تھا، دیوتا تھا وہ رہنما ہمارا
تھا مادرِ وطن کی آنکھوں کا ایک تارا

گونجا تھا جس کے دم سے وہ انقلاب نعرہ
قسمت نے دے دیا تھا نیتا سبھاش پیارا

سمیر سنگھ بھدوریا
نٹراج سدن۔ ساکیت پلی
لکھنؤ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : سَوادِ رنگ (شعری مجموعہ)
شاعر : محمد احمد رمز قیمت : سو روپے
ملنے کا پتہ : ادارۂ ہم قلم۔ خانقاہ شریف دلوامیاں
بیگم گنج۔ کان پور

سوادِ رنگ محمد احمد رمز کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۲۰۰۳۵ سال کے فکر و فن کا گراں بہا سرمایہ ہے یہ مجموعہ منتخبہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ خود رمز نے غزل کو ایک شگفتہ گلاب اور خوشبو کا ایک جھونکا کہا ہے شعر میں خوشبو پیدا کرنا کوہکن کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ ہمیں ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ احساس ملتا ہے، گو انھوں نے نہایت انکساری سے کہا ہے ؎

مری خوشبو کوئی مجھ میں نہ ڈھونڈے
ہوں اپنی ناف سے باہر ابھی میں

جس طرح دیے سے دیا جلتا ہے کڑی سے کڑی جُڑتی ہے۔ غزل کا یہ روایتی سلسلہ رمز تک آیا ہے، اس سلسلے میں وہی آوازیں اُبھری ہیں جنھوں نے فن کی نزاکتوں کو سمجھا اور خیال سے شعر کو بلند آہنگ بنایا۔ سنجیدہ فکر اور رچے ہوئے مذاق کی شاعری میں جو چیز رمز کی شناخت بنتی ہے وہ غنائیت اور لفظ شناسی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ مفاہیم کے نئے پیکر تراشتے ہیں ؎

کون پوچھے مجھ سے مری گوشہ گیری کا سبب
کون سمجھے در کو بھی دیوار کر لینا مرا

اس چوتھے درویش کی غزلوں میں غزل کا علامتی اور استعاراتی اظہار جا بجا ملتا ہے لیکن یہ علامتیں معنی کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتیں البتہ ایک منفرد لہجے سے ضرور متعارف کراتی ہیں، جیسے آسانی کے ساتھ سماعت قبول کرتی ہے اور سامع پر اس کا خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے۔ شعر یوں نکھر کر سامنے آتا ہے جیسا رمز چاہتے ہیں یعنی محبوب کا دُھلا دُھلا، نکھرا نکھرا چہرہ ؎

رات زخمی ہو رہی ہے لمحہ لمحہ میرے ساتھ
پھڑپھڑاتے ہیں پرندے آشیانوں میں کہیں

"سوادِ رنگ" اردو شاعری کا ایک تحفہ ہے اور غزل کے اس رمز آشنا کے سیر و سفر اور تجربوں کا شعری گلدستہ۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

——— بنتِ مسعود

نام کتاب : "منڈیر پر بیٹھا پرندہ" (افسانوی مجموعہ)
مصنف : احمد صغیر۔ قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتہ : ترسیل پبلی کیشنز۔ مسی مسجد۔ گیوال بیگھ
گیا (بہار)

احمد صغیر کے بیس مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ پچھلی ایک دہائی کے درمیانی وقفے میں تحریر کیے گئے ان کے مختصر افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ سب ہی افسانے عام طور پر چار پانچ صفحات کے طول ہی میں اختتام کو پہنچ جاتے ہیں اور قاری کو اختتام کے لمبے انتظار سے بچا لیتے ہیں۔ اس موقع پر یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اگرچہ مختصر افسانے کا فن اس کے اختصار سے بھی منسوب ہے لیکن یہ اختصار افسانے کی وحدتِ تاثر کی قوت کو مجروح کر کے برتا جائے تو وہ بجائے خوبی کے نقص ہی تصور کیا جائے گا۔ "منڈیر پر بیٹھا پرندہ" کے چند افسانوں پر اس لحاظ سے غور کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر افسانہ نگار اس قید پر اتنی مستعدی اور پابندی سے عمل نہ کرتا تو شاید افسانے کا مرکزی خیال اور بھی کچھ نکھر کر نکلتا اور ہم افسانہ نگار کے اس افسانوی تجربے کی دھار کو زیادہ شدت سے محسوس کر سکتے۔ یہ احساس اس مجموعے کے افسانے شہر چھوڑتا نہیں اور اپنا اپنا بوجھ میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

ان بیس افسانوں میں کچھ افسانے جیسے منڈیر پر بیٹھا پرندہ، بے پناہ جنگل اور وجود، شہر چھوڑتا نہیں، مجوبہ، کرفیو کب لگے گا، دھیمو کے دوالند

پر ایک ہی طرح کے انجان خوف و ہراس کا قفل لگا ہوا ملتا ہے۔ اس خوف و دہشت اور اس کے ساتھ ایک انجانی اور غیر واضح سراسیمگی اور اس سراسیمگی کے ایک جیسے اسباب چند جملوں یا بیانوں یا مکالموں میں دہرائے گئے ہیں لیکن ان دروازوں پر لگے تالوں میں سے کسی تالے کے کھلنے کی نوبت نہیں آتی اور قاری نہ تو اس برائے نام خوف سے خائف ہوتا ہے اور نہ اس دہشت سے وحشت زدہ۔ لہٰذا کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مصنف کے دل و دماغ میں بسا ہوا خوف یا دہشت یا سراسیمگی قاری کے لیے اہم نہیں ہوتی بات تو جب بنتی ہے جب وہ خوف افسانوی تجربے کا پراثر حصہ بن کر قاری کے تجربے کا بھی ایک حصہ بن جائے، کہتے ہیں کہ خوف کا وجود باہر نہیں ہمارے اندر ہی ہوتا ہے۔ وہ باتیں جو ہمیں خوف زدہ کرچکی ہیں یا کرتی رہتی ہیں ان کو دہرانا افسانوی حقیقت میں شامل نہیں بلکہ افسانوی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے خائف ہونے لگیں جو بظاہر خوف زدہ کرنے والی نہیں۔ لگتا ہے افسانہ نگار اس حقیقت سے واقف ہے اور اس نے اپنے ایک افسانے میں منڈیر پر بیٹھے ایک پرندے کے ذریعہ یہ کام کرنا بھی چاہا ہے۔ مگر افسوس وہ پرندہ بھی خوف کو مہمیز کرنے میں خود کو ایک مثبت قوت نہ بنا سکا۔

تاہم ان افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنی تخلیقات کے بہانے آج کے داخلی اور بیرونی خوف و ہراس کو موضوع بنا کر مختصر افسانے کے طاقت ور، موثر اور تہ دار محاورے سے مکالمہ قائم کرا کے اسے گرفت میں لینے اور سمجھنے سمجھانے کی بے غرض کوشش کرتا ہے۔ اگر نظرِ ثانی ذرا توجہ سے کی جاتی تو کہیں کہیں زبان و بیان کی جو غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں ان سے بھی یہ مجموعہ پاک ہو جاتا۔

——— اقبال مجید

نام کتاب: سبزۂ معنیِ بیگانہ (شعری مجموعہ)
شاعر: فضا ابن فیضی   قیمت: درج نہیں
ملنے کا پتہ: مکتبۂ توحید، ۳-سی ۱۹۱ جوگا بائی
نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵

آزادی کے بعد اردو شعری ادب کی معتبر و معروف شخصیت کا نام فضا ابن فیضی ہے ان کا تخلیقی سفر گزشتہ کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ کئی شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ "سبزۂ معنیِ بیگانہ" ان کا تازہ مجموعۂ کلام ہے۔

فضا ابنِ فیضی یوں تو ذاتی طور پر کم آمیز اور کم سخن آدمی ہیں لیکن ان کے قلم میں بلا کی شدت ملتی ہے وہ ہر رنگ و آہنگ میں شعر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے حساس لمحوں اور اس کے کرب کو قریب سے محسوس کیا ہے۔

فضا کی شاعری میں کلاسیکی اسلوب و فکر اور عربی و فارسی شعر و ادب کی گہری پرچھائیں نظر آتی ہے جس سے عام قاری کو شعر تک پہونچنے میں ترسیل کی ناکامی کا احساس ہو سکتا ہے لیکن ان کے ہاں قدیم و جدید رجحانات کا ایسا سنگم ہے کہ روایت کی پاسداری اور تہ داری کے ساتھ عصری حسیت اور جدید لب و لہجے کا وہ اندازِ فکر ملتا ہے جہاں زندگی کی سچائی کی تلخیاں بھی ہیں اور حقیقتوں کی چبھن بھی۔ ان کی تخلیقات میں جو دھڑکتا ہوا دل ملتا ہے وہ حساس بھی ہے اور نکتہ چیں بھی۔ اور یہی فضا کی اپنی پہچان ہے جو انھیں بہتوں سے نمایاں کرتی ہے ؎

تم اس کہانی کے کردار تھے مگر میں نے
تمھارے نام کو عنوان میں نہیں رکھا

———

یوں معانی سے بہت خاص ہے رشتہ اپنا
زندگی کٹ گئی لفظوں کو خبر کرنے میں

———

بہت قریب رہا مجھ سے وہ مگر، پھر بھی
یہ فاصلہ سا مرے آس پاس کیسا ہے

———

بدن کے زندہ سفر میں قائم
نفس نفس بادبان اس کا

———

اس کی قربت کا نشہ کیا چیز ہے
ہاتھ پھر جلتے توے پر رکھ دیا

میں اپنے تمام دلی تاثرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علمی و ادبی حلقوں میں "سبزۂ معنیِ بیگانہ" کا بھرپور استقبال ہوگا۔

——— شبنم نقوی

نام کتاب "اودھ کے تاریخ نگار"
مرتب : انور حسین اکبر پوری   قیمت : ۱۴۰/- روپئے
ملنے کا پتہ : دانش محل ۔ امین الدولہ پارک
لکھنؤ

اس عہد میں جبکہ ہماری نئی نسل کو ماضی کی طرف دیکھنا گوارا نہیں ہے بڑی حد تک وہ اپنے ماضی سے واقف بھی نہیں ہے۔ مکروہاتِ زمانہ کے دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ انور حسین اکبر پوری نے اودھ کے تاریخ نگار جیسی اہم کتاب مرتب کر کے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ گویا تشنگانِ علم کے لیے ایک چشمۂ آب خنک و شیریں فراہم کیا۔ یہ کتاب جسے انھوں نے اگرچہ مرتب کیا ہے لیکن اس میں تصنیف جیسی شان پیدا کی ہے۔ تاریخ نگارانِ اودھ کے بارے میں جو تفصیلات انھوں نے پیش کی ہیں ان سب کا ایک ہی کتاب میں جمع کرنا دراصل ایک تحقیقی کام ہے۔ اس طرح اس کتاب کو ترتیب تہذیب تخلیق اور تحقیق ہر میدان میں ایک نمایاں اہمیت حاصل ہے ایک بسیط منظر نامہ اودھ کے اس عہد کا جواب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے مگر بے حد روشن ہے جس میں عمیق سیاسی تدبر، تہذیبی پیچ و خم، عروج و زوال کیا نہیں ہے۔

۲۲۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں انور حسین اکبر پوری نے ایک مبسوط دیباچہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں اودھ اور اس کا دارالسلطنت لکھنؤ یعنی عروس البلاد کس انداز سے سیاسی تباہی و بربادی سے ہمکنار ہوا ہے' باقاعدہ روشنی پڑتی ہے' اس میں بہت اسرار کھلتے ہیں' ہزاروں انکشافات ہوتے ہیں شروع میں پیش لفظ، عرض حال اودھ کی وجہ تسمیہ' اودھ کی حقیقت' انگریز اور ہندوستان جیسے اہم مضامین ہیں لیکن سب سے پہلے آغا مجو شرف کی کتاب افسانۂ لکھنؤ کا نام آتا ہے جو مثنوی ہے اور انیسویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے' یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے تاریخ نگاری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور تمام صفحات کو عبور کرتا ہوا یوگیش پروین تک پہونچا ہے جنھوں نے لکھنؤ نامہ' داستانِ اودھ اور داستانِ اودھ جیسی اہم کتابیں لکھیں جن کا زمانہ ۱۹۸۸ء ہے۔

کتاب کے آخری چند صفحات کتابیات کے ہیں جو فہرست ہے تاریخ نگارانِ اودھ کی جس میں ان کی دیگر تصنیفات کا ذکر بھی ہے کیونکہ ان میں سے بیشتر شعرا تھے یا پھر دیگر اصنافِ ادب کے شیدائی تھے چنانچہ اس حوالے سے بھی وہ اہمیت کے حامل تھے اس طرح یہ کتاب تاریخ کی شاہراہ پر ایک روشن سنگ میل بن جاتی ہے۔ ایک ایسا سنگِ میل جو آئندہ نسلوں کے لیے منارۂ نور ہے اور اکتساب و استفادہ کا نقطہ ارتکاز بھی۔

——— عشرت ظفر

نام کتاب "بال آئینوں کے" (افسانوی مجموعہ)
مصنف : مضطر انصاری   قیمت : اسی روپئے
ملنے کا پتہ : مضطر انصاری ۔ محلہ کٹرہ کلاں
شاہجہاں پور

مضطر انصاری ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں اور تقریباً نصف صدی سے اس فن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں متوسط اور غریب طبقے کی سچی تصویر کشی ملتی ہے۔ موجودہ دور میں ہماری اعلیٰ قدروں کے رو بہ زوال ہونے پر مضطر انصاری نہ صرف غمزدہ ہیں بلکہ ان کے نتائج سے بھی ہم کو باخبر کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہے۔

"بال آئینوں کے" مضطر انصاری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ جو ہماری زندگی کا پوری طرح محاسبہ کرتا ہے اور قاری کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے فن افسانہ نگاری کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی گہری گرفت ہے۔ طرز بیان رواں، شگفتہ اور عام فہم ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸ افسانوں پر مشتمل ہے جن میں متعدد افسانے ملک کے مختلف جرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان افسانوں میں "انصاف" "پھول کا زخم" "بال آئینوں کے" اور "ماڈرن عشق" بہت ہی دلچسپ اور قاری کے دل کو چھو لینے والے ہیں۔ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مضطر انصاری کو افسانہ نگاری میں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق ہیں۔

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں "بال آئینوں کے" کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور مضطر صاحب کی صلاحیتوں کو سراہا جائے گا۔

——— امیر احمد صدیقی

نام کتاب، مکتوباتِ نعمانی
مرتب، مولانا محب الحق   قیمت ۲۵/- روپیہ
ملنے کا پتہ، کتب خانۂ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد
دھلی

مکتوبات نعمانی ان خطوط پر مشتمل ہے جو مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے الحاج اخون عزیز الٰہی خاں حسن پوری کو تحریر فرمائے تھے۔ منظور نعمانی صاحب تعارف کے محتاج نہیں۔ مرادآباد (یوپی) کے ایک قدیم اور مردم خیز قصبہ سنبھل کے محلہ دیپا سرائے میں پیدا ہوئے اور بلا مبالغہ پوری دنیا کے اسلامی ممالک میں اپنے علوم و فیوض و برکات سے لوگوں کے دلوں کو مجلّی فرمایا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

آخون عزیز الٰہی خاں صاحب حسن پور ضلع مرادآباد کے نواب خاندان میں پیدا ہوئے اور اسی قصبہ حسن پور کو آپ نے ہی آباد کیا جن کا مزار ملتان میں ہے، یہ خاندان عہد شاہ جہاں میں پشاور سے وارد ہند ہوا اور دہلی میں سکونت اختیار کی اور اپنی شرافت و انسانیت اور خداداد لیاقت کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ کی نگاہ میں معزز ہوا۔ شاہ جہاں نے چندیانہ کی جاگیر تفویض کی۔ شاہ عالم بادشاہ نے محمد مستقیم خاں، جو عزیز الٰہی خاں کے والد محترم ہیں "آخون" کے خطاب سے نوازا۔ عزیز الٰہی خاں کا تعلق مولانا رشید احمد گنگوہی سے لے کر آج تک کے جتنے عالم و فاضل ہیں سب سے رہا۔ مولانا نعمانی نے جو مکتوبات مولوی عزیز الٰہی خاں صاحب کو تحریر فرمائے ہیں ان سب کو مولانا محب الحق صاحب نے یکجا فرمایا ہے۔ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل مکتوبات کی تعداد ۱۲۴ ہے جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کو عزیز الٰہی صاحب سے دلی تعلق تھا۔

——— ایس۔ ایم۔ عامر

نام کتاب، "گنجِ شہیداں"
شاعر، بہار حسین آبادی۔ مرتب، جابر حسین
ملنے کا پتہ، اردو مرکز۔ عظیم آباد، قیمت، دس روپے
(بہار)

میرے سامنے بہار حسین آبادی کا مرثیہ گنج شہیداں ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد شاعر کی کہنہ مشقی اور واقعہ نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے، گو کہ ان کے مرثیے میں روایتی بندشوں کی پابندی بدرجہ اتم موجود ہے پھر بھی ایک نئی جہت اور نئے اندازِ بیان سے واقعہ کربلا کو نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیان کرتے وقت ان کی روانی اور سلاست میں کوئی کمی نہیں آنے پائی مگر کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے یوں کہا ہوتا، ایسا کہا ہوتا تو خوب ہوتا۔ مرثیہ کے چودھویں بند سے بیسویں بند تک جو واقعہ نظم کیا ہے وہ تاریخ میں تو مل جاتا ہے مگر شاعر نے مسئلے کو نظم نہیں کیا ہے۔ وہ کیا مسائل تھے جو شاعر لے کر آیا تھا اور امام حسین نے اسے کس طرح نظم فرمایا۔ اگر کچھ بند اور بڑھا کر اسے بھی نظم کیا جاتا تو تشنگی باقی نہ رہتی۔ جو اس واقعہ سے واقف نہیں ہے اس کے ذہن میں سوالیہ نشان ابھرتا ہے۔ حالانکہ مرثیے کے ابتدائی حصّے میں عبادت سے حسنین کی رغبت کو پوری طرح نظم کیا ہے اور بہار حسین آبادی جذبات نگاری میں پوری طرح قادر نظر آتے ہیں ؎

کی دستِ ادب جوڑ کے تب دونوں نے تقریر
فرمایئے ہے موت کی مدّت کوئی تحریر
حضرت نے کہا جانتا ہے مالکِ تقدیر
سُن کر یہ سخن کہنے لگے شبّر و شبّیر
بچپن میں جو موت آئی تو کیا پائیں گے نانا
اس اجر کا ارمان لیے جائیں گے نانا

اس بند میں جذبات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ لفظوں کی نشست اور بچوں کی زبان سے ادا کیے گئے جملے بے حد خوبصورت ہیں۔ یہ درست ہے کہ بہار حسین آبادی کے مرثیوں میں روایتی انداز دیکھنے کو کم ملتا ہے۔ مصائب بھی ویسے نہیں ہیں جیسے انیس و دبیر کے یہاں ملتے ہیں۔ مرثیوں کے اجزائے ترکیبی میں جو فرق پیدا کیا ہے وہ ایک نئی راہ کی طرف نمایاں اشارہ ہے۔ آنے والی نسل اس سے کس قدر متاثر ہوتی ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

امید ہے کہ اہلِ علم و دانش شاعر کی کوششوں کو ستائش کی نظر سے دیکھیں گے۔

——— ڈاکٹر ناظم جعفری

شمس الرحمٰن فاروقی کو سرسوتی اعزاز

اِک شعاع کرن اور جگمگانے لگی!

ساری دنیا میں اُردو والوں کے لیے اور خصوصاً ہمارے اترپردیش کے لیے یہ انتہائی مسرّت انگیز خبر ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کا سب سے بڑا علمی اعزاز پانچ لاکھ روپے کا "سرسوتی سمان" محترم شمس الرحمٰن فاروقی کو ملا ہے۔

بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت اُردو تنقید کے لیے ایک ادارے اور ایک اسکول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بھی ایک خوبصورت ادبی اتفاق ہے کہ اُردو تنقید کا نقطۂ آغاز میر تقی میر کی "نکات الشعراء" ہے، اور اُردو کے اس سب سے بڑے نقاد نے میر صاحب ہی کے اشعار کی شرح اور عملی تنقید "شعر شور انگیز" میں کی ہے جس پر انھیں یہ اعزاز ملا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی ہشت پہل شخصیت کے مالک ہیں "شب خون" کی بنیاد ڈالنے کی بنا پر انھیں صحافی بھی کہا جا سکتا ہے، وہ شاعر بھی ہیں اور 'شعر، غیر شعر اور نثر' سے ان کی تنقیدی شخصیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت ہندستان میں عروض کے چند ماہرین میں سے وہ ایک ہیں۔ فارسی ادبیات پر ان کی گرفت بے مثال ہے اور ان سب کے ساتھ وہ سنسکرت شعریات کے بھی عالموں میں سے ہیں۔

محترم فاروقی صاحب بہترین تعلیمی ریکارڈ رکھتے ہیں۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے انگریزی میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں تک تدریس سے وابستہ رہے۔ پھر آئی۔اے۔ایس میں منتخب ہوئے اور ایک شان دار دورِ ملازمت گزارنے کے بعد آج کل وہ مختلف ادبی موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ ان کا دائرۂ تحقیق کلاسیکی ادبیات سے لے کر جدید ادبیات تک پھیلا ہوا ہے اور ہندستان سے لے کر امریکہ تک ان کی تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیاں روشنی عطا کر رہی ہیں۔ اس سے قبل انھیں اترپردیش اُردو اکادمی کا مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ وغیرہ بھی مل چکے ہیں

وہ بے حد خوش اخلاق، نرم خو، نیک، مخلص اور علمی شخصیت کے مالک ہیں۔ راقم الحروف کو بھی ان کی بے پایاں شفقتیں حاصل ہیں۔

ادارہ نیا دور تہِ دل سے انھیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

——— امجد حسین



